جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو
(حضرت والا دامت برکاتہم)

حضرت والا کے سامنے مجلس میں کی گئی اشعار کی تشریحات و تقریرات کا مجموعہ

عرفانِ محبت

شرح

فیضانِ محبت

جلد اوّل



مجموعہ کلام

شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

شارح
حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند
استاذ الحدیث دار العلوم آزاد ول جنوبی افریقہ

خلیفہ و مجاز بیعت
شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو
(حضرت والا دامت برکاتہم)

حضرت والا کے سامنے مجلس میں کی گئی اشعار کی تشریحات وتقریرات کا مجموعہ

عرفانِ محبت

شرح

فیضانِ محبت

جلد اوّل



مجموعہ کلام

شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

شارح

حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند
استاذ الحدیث دار العلوم آزادول جنوبی افریقہ

خلیفہ و مجازِ بیعت
شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

فہرست

افتتاحیہ

۱۲؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ

اس طرح دردِ دل بھی تھا میرے بیاں کے ساتھ
جیسے کہ میرا دل بھی تھا میری زباں کے ساتھ
اخترؔ

احقر کا مجموعۂ کلام بعنوان ''فیضانِ محبت'' جس کے تقریباً نوّے فیصد اشعار میری زندگی کے ۶۶ سال کے بعد اچانک قلب کی آہ وفغاں کے ساتھ زبان ترجمان دردِ دل سے نمودار ہوئے اور بعض راتوں میں بے ساختہ آنکھ کھل گئی اور نیند غائب ہوگئی اور بغیر محنت وکاوشِ دماغی محض عطائے رحمتِ حق تعالیٰ شانہٗ سے یہ اشعار موزوں ہوگئے۔ جو درحقیقت اس مضمون کے حقیقی ترجمان ہیں ؎

دیکھ کے اپنے ضعف کو اور قصورِ بندگی
آہ و فغاں کا آسرا لیتی ہے جان ناتواں
اخترؔ

راقم الحروف
حکیم محمد اختر عفا اللہ تعالیٰ عنہٗ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلماتِ دعائیہ

حضرت اقدس عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

محبی المکرّم مفتی محمد امجد صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ نے میرے اشعار کی تشریح قرآن وحدیث سے مدلل کی ہے قابل وجد ہے اور اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر تشریح کوئی نہیں کرسکتا تھا یہ صرف مفتی صاحب ہی کا حصہ ہے اس تشریح سے عوام کے لیے ان اشعار کا سمجھنا اور عمل کرنا آسان ہوگیا اور اشعار میں جو ابہام ہوتا ہے جس سے عوام الناس اشکالات کا شکار ہوجاتے ہیں قرآن وحدیث کے حوالوں سے وہ رفع ہوگیا اور الحمدللہ ثابت ہوگیا کہ ہر شعر حدود شریعت وسنت کے دائرہ میں ہے اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ اشعار منجانب اللہ قلب پر وارد ہوئے ہیں بالقصد موزوں نہیں کیے گئے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی محنتوں کو قبول فرمائے اور پورے اشعار کی تشریح کی باحسن وجوہ تکمیل فرمائے اور قیامت تک کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

محمد اختر عفا اللہ تعالیٰ عنہ
۲۸ رشعبان المعظم ۱۴۳۰ھ
مطابق ۲۰ راگست ۲۰۰۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا یونس پٹیل صاحب دامت برکاتہم (سابق) صدر جمعیت علماء جنوبی افریقہ نیٹال

فیضانِ محبت کے افتتاحیہ میں سیدی ومرشدی عارف باللہ حضرت شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم نے تحریر فرمایا ہے کہ اس مجموعہ کلام کے تقریباً نوے فیصد اشعار حضرت اقدس کی زندگی کے ۶۶ رسال کے بعد اچانک قلب کی آہ وفغاں کے ساتھ زبان ترجمان دردِ دل سے نمودار ہوئے یہ بھی فرمایا کہ یہ اشعار بغیر محنت وکاوش دماغی محض عطائے رحمت حق تعالیٰ شانہٗ سے موزوں ہوگئے اس کے بعد اب ان اشعار کے الہامی ہونے میں ہم لوگوں کو کیا شک ہوسکتا ہے۔

بہرحال حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا علامہ یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر سینکڑوں اکابر علماء حق محدثین مفسرین مشائخ طریقت نے حضرت اقدس کی پاکیزہ زندگی، بلند خیالی، حسنِ ذوق، عظیم نسبت مع اللہ اور کمال درجہ کے عشق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت دی ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلیفہ ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس دامت برکاتہم کو ایسا کیف باطن عطا فرمایا ہے جو دوسروں کے لیے بھی کیف آفریں ہے۔

بہرحال حضرت دامت برکاتہم کا فیضان محبت میں حمد باری تعالیٰ ہو یا نعتیہ کلام ہو یا نظمیں ہوں سب دل پر عجیب اثر اور کیفیت پیدا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت اور اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، عشق مجازی سے نجات ملتی ہے اور عشق حقیقی کا حصول ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی امجد صاحب دامت برکاتہم نے حضرت اقدس کے روحانی اور الہامی اشعار کی جو تشریح کی یہ انہی کا کمال ہے بلکہ بہت سے مقامات میں تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی تشریح ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت اقدس کی پوری توجہ دعاؤں اور فیض کی وجہ سے قلم اور زبان تو حضرت مفتی امجد صاحب دامت برکاتہم کی ہے لیکن مضامین اور تشریح حضرت اقدس دامت برکاتہم کی ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی اس محنت اور عظیم خدمت کو بے انتہا شرف قبولیت بخشیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت سیدی ومرشدی دامت برکاتہم کا سایہ تادیر صحت وعافیت کے ساتھ ہم لوگوں کے سروں پر سلامت رکھیں، آمین۔

محتاج وطالب دعا

احقر یونس یوسف پٹیل غفرلہٗ

۲۵ رشعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۷ راگست ۲۰۰۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم آزادوِل جنوبی افریقہ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْكَرِیْمِ

حضرت مفتی امجد صاحب، عارف باللہ رومی وقت مجدد زمانہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے خصوصی خلفاء میں سے ہیں اور ساؤتھ افریقہ سے حضرت والا کی خدمت میں برابر حاضری دیتے رہتے ہیں حضرت والا کی مجالس میں جب حضرت کے کوئی خصوصی خلیفہ یا مہمان ہوتے ہیں تو حضرت والا ان سے بیان کرواتے ہیں۔

حضرت مفتی امجد صاحب نے حضرت والا کے اشعار کی تشریح شروع کی اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت رہی اور حضرت والا کی خصوصی توجہ سے عجیب وغریب تشریح ہوتی رہی جس میں خاص بات یہ رہی کہ ہر شعر کو قرآن وحدیث سے ثابت کرتے ہیں حضرت والا کو یہ تشریحات بے حد پسند آئیں اور دعا دیتے رہے اور حاضرین مجلس پر بہت زبردست اثر ہوتا رہا حاضرین بہت اہتمام سے کیسٹ لیتے رہے اور سنتے اور سناتے رہے چاروں طرف سے تقاضے ہوئے بلکہ اصرار تک کی نوبت پہنچی کہ ان تشریحات کو قلم بند کیا جائے تو یہ مرحلہ طے ہوا اور آپ کے ہاتھ میں ان تقاریر وتشریحات کا سنہرا مجموعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو حضرت مفتی صاحب کے حق میں قبول فرمائے بار آور فرمائے نجات کا سامان اور آخرت کا ذخیرہ بنائے اور ہم سامعین وقارئین کے لیے مشعل راہ بنائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے قبول فرمائے۔

جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ

(مولانا) عبدالحمید (صاحب دامت برکاتہم)
مہتمم دارالعلوم آزادول، جنوبی افریقہ

پیش لفظ از شارح کتاب

توفیق الٰہی و فضل الٰہی اور میرے محبوب شیخ و مرشد عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خاص دعاؤں اور توجہات کا ثمرہ و نتیجہ ہے کہ احقر سے حضرت والا کی کتاب فیضانِ محبت کے اشعار کی تشریح و توضیح کا کام ہوگیا ورنہ حقیقت حال تو یہ ہے کہ احقر نہ تو علمی لحاظ سے اس قابل تھا اور نہ ہی عملی اعتبار سے لیکن بہرحال جب اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو پھر اس کے لیے اسباب بھی بنتے چلے جاتے ہیں کیونکہ جس طرح اسباب سے نتائج امرِ حق کے تابع ہیں اسی طرح اسباب بھی اپنے وجود میں امرِ الٰہی کے پابند ہیں۔

چنانچہ صورتِ حال یہ ہوئی کہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۰۰۷ء میں احقر کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ مدرسہ سے چھٹی لے کر ایک لمبی مدت کے لیے اپنے شیخ کی صحبت میں رہنا چاہیے کیونکہ ہمارے تقریباً تمام ہی دیوبند وسہارنپور کے بزرگانِ دین اپنے مشائخ کی صحبتوں میں طویل عرصہ کے لیے قیام کیا کرتے تھے اور تزکیہ نفس وتصفیہ اخلاق کے باب میں ان سے مستفید ہوتے تھے صرف مدارس سے سندِ فراغت لینے کو اپنے لیے کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنے قال کو حال میں بدلنے کے لیے کوشاں رہتے تھے حسبِ ارشاد مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

تو اسی جذبۂ وارادہ کے تحت احقر نے اپنے دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی اور اس میں صاف صاف لفظوں میں اپنا مقصود پیش کردیا۔ بحمداللہ تعالیٰ حضرت مہتمم صاحب نے نہ صرف یہ کہ ایک سال کی رخصت منظور فرمائی بلکہ بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار فرمایا اور مقاصد میں کامیابی کے لیے اپنی خاص دعاؤں سے نوازا۔

اب دوسری جانب اہل وعیال کی شرعی ذمہ داری کا معاملہ سامنے تھا تو احقر نے توفیق الٰہی سے ایسی صورت اختیار کی کہ اس ذمہ داری کی شرعی واخلاقی حدود کی تکمیل کے ساتھ ساتھ حضرت والا کے پاس رہنا میسر ہوگیا اور اسی نظام کے تحت اواخر شوال میں کراچی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کی سعادت میسر آگئی اور حضرت والا سے اپنا مقصد سفر پیش کردیا کہ اصلاحِ باطن اور تزکیہ نفس کے لیے حاضری ہوئی ہے جس پر حضرت والا بھی بہت خوش ہوئے البتہ فوراً یہ سوال کیا کہ مجالس کے علاوہ دیگر اوقات میں کیا مشغلہ رہے گا تو احقر نے عرض کردیا کہ حضرت کی مختلف کتابوں اور اپنے اکابر کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کرتا رہوں گا۔

جہاں تک فیضانِ محبت کی باقاعدہ شرح کا معاملہ ہے تو اس وقت اس کا کوئی خاص ارادہ ذہن میں نہیں تھا

اور نہ کوئی نظم وترتیب پہلے سے سامنے تھی ہاں وقتاً فوقتاً جب فیضانِ محبت کے اشعار سنتا تو یہ خیال دل میں آتا تھا کہ ان اشعار میں اس قدر جامعیت اور افادیت ہے کہ ان کو شرح بسیط کے ساتھ آیات واحادیث کے ساتھ مدلل کیا جانا چاہیے تاکہ عوام وخواص سب کے لیے اس کی افادیت عام وتام ہو جائے اس لیے کہ بلا شک وشبہ حضرت کے کلام کی تاثیر کو دیکھ کر فارسی کا یہ جملہ زبان پر آجاتا ہے ''از دل خیزد بر دل ریزد'' شعر ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہ ہو طاقت پروازمگر رکھتی ہے

اور میرے محبوب شیخ حضرتِ والا دامت برکاتہم کا شعر ہے ؎

جو درد دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرح محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

ایک ایک شعر اس قدر معرفت ومحبت خداوندی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس قدر مؤثر اور نصیحت آموز ہے کہ کیسا ہی بے درد ہو اس کو سننے کے بعد درد آشنا ہو جائے اور اہل دل کے دلوں کو تڑپا کر رکھ دے جیسا کہ حضرت خالد اقبال تائب صاحب اس کی ترجمانی کچھ یوں کرتے ہیں ؎

یہ نہیں کہتے کہ یکدم باخدا ہوجائے گا
کم سے کم بے درد یاں درد آشنا ہوجائے گا

بہرحال دل میں گذرنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی ایک صورت غیب سے وجود میں آگئی۔ وہ اس طرح کہ احقر کے بعض احباب نے حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ حضرت یہ اشعار پڑھنا جانتے ہیں اس لیے ان سے اپنا کلام فیضان محبت ہمیں سنوا دیجئے اگرچہ اپنا معمول خانقاہ میں اپنے شیخ کے سامنے کان بن کر رہنے کا تھا زبان بن کر نہیں کیونکہ کان بن کر رہنا زیادہ مفید اور اسلم واحوط راستہ ہے اور اپنے اکابر ومشائخ کا طریقہ ہے اس لیے برسوں سے یہی معمول رہا کہ خانقاہ حاضر ہوتا اور حضرت کی مجالس میں شریک ہو کر استفادہ کرتا تھا اور اس میں بڑا لطف وحلاوت ملتی تھی اور مقصود اصلی جو کہ صحبت شیخ ہے وہ حاصل ہو جایا کرتا تھا مگر اس مرتبہ خود حضرت والا نے اپنے اشعار سنانے کا حکم فرمایا۔ احقر نے حضرت کا کلام ''سکونِ دل در مجلس اہلِ دل'' پڑھ کر سنایا جو بعینہٖ احقر نے حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ہردوئی میں سنایا تھا اور اس کی اجمالی طور پر شرح پیش کر دی جس سے حضرت والا اور دیگر اہل مجلس بہت ہی مسرور ہوئے اور پھر الامر فوق الادب کے اصول کے تحت حضرت والا کے حکم سے روزانہ مجلس میں اشعار فیضانِ محبت پڑھنے اور ان کی شرح کرنے کی ذمہ داری احقر کو سونپ دی گئی۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے تقریباً پوری کتاب کے اشعار پڑھ کر حضرت والا کے سامنے ان کی تشریح کا کام اسی مجلس عوام وخواص میں پورا ہو گیا۔ اور اگر کسی مقام پر بندہ کو شبہ ہوا تو حضرت

میر صاحب دامت برکاتہم سے اس کو رفع کرلیا گیا اس لیے دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت میر صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی تَوْفِیْقِہٖ وَکَرَمِہٖ وَاِحْسَانِہٖ۔

دوسری جانب مسلسل خصوصی وعمومی احباب ان تشریحات کو کتابی شکل میں لانے کے لیے فرمائش پیش کرنے لگے کبھی یہ درخواست حضرت میر صاحب دامت برکاتہم سے کی جاتی اور کبھی یہی بات احقر کے کانوں تک پہنچتی یہاں تک کہ حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کے داماد اور خلیفہ حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب نے بھی اپنے سفر کراچی کے موقعہ پر ان تشریحات کو سن کر حضرت مولانا مظہر صاحب دامت برکاتہم سے فرمایا کہ ان تشریحات کو کتابی شکل میں لانا چاہیے۔ ہوتے ہوتے یہ بات حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے سامنے پہنچی اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی طباعت وترجمہ عربی وانگریزی کی بھی بعض حضرات نے ذمہ داری لے لی۔ ان وجوہات کی بنیاد پر احقر نے اس جانب توجہ کی۔ اس سلسلہ میں محترم مولوی ومفتی محمد طاہر اور برادر مکرم جناب عارف بلوچ دل کی گہرائیوں سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی ترتیب کے ساتھ تمام تشریحات کو کیسٹوں میں جمع کررکھا تھا۔ احقر نے ان سے رابطہ کیا اور پھر بعض ایسے حضرات تیار ہوئے جو ان کیسٹوں سے نقل کرنے کا کام انجام دیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں مولوی عبدالولی (زرولی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ہمارے خصوصی محسن ومشفق محترم ومکرم جناب عبداللہ فیروز میمن صاحب کی خاص سعی وکوشش رہی کہ انہوں نے اپنے احبابِ خاص میں سے چند نقل کرنے والوں کو تیار کیا اور ماشاء اللہ انہوں نے بہت جلد یہ کام انجام دے دیا اور بِفَضْلِہٖ تَعَالٰی وَتَوْفِیْقِہٖ وَکَرَمِہٖ وَاِحْسَانِہٖ آج یکم رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۳/اگست ۲۰۰۹ء جلد اوّل کا کام مکمل ہوا اور جناب مفتی محمد عاصم کا کمپوزنگ کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس جلد اوّل میں فیضانِ محبت کے شروع کے پانچ عنوانات کی مکمل تشریح ہے (۱) حمد باری تعالیٰ (۲) مناجات (۳) نذرانہ عقیدت (۴) منقبت صحابہ (۵) درمدح شیخ۔ اور فیضانِ محبت کا آخری حصہ بنام ''کلام معرفت ومحبت'' میں سے شروع کی چند نظمیں ہیں جس میں حضرت والا کے دردِ دل اور سوزِ دروں کی تشریح ہے اور بقیہ نظموں کی تشریحات ان شاء اللہ جلد ہی ترتیب وتعلیق اور تصحیح وتنقیح کے مراحل سے گذر کر وہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ شارح ومرتب اور جملہ معاونین کو اخلاص کامل کی دولت عطا فرما کر اس شرح کو نفع خلق اور رضائے خالق کا ذریعہ بنادے اور ہم سب حضرت والا کے خدام ومتعلقین کو حضرت کی صحیح قدردانی اور حضرت کے فیوض سے پورے طور پر مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمادے۔

راقم السطور: محمد امجد قاسمی استاذ دارالعلوم آزادوِل، جنوبی افریقہ

مقیم حال خانقاہ امدادیہ اشرفیہ گلشن اقبال کراچی

یکم رمضان المبارک ۱۴۳۰ مطابق ۲۳/اگست ۲۰۰۹ء

مقدمہ از شارح کتاب

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ

شعر گوئی قرآن وسنت کی روشنی میں

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَۃً﴾
(صحیح البخاری، کتاب الادب)

کہ بے شک بعض شعر حکمت آمیز ہوتے ہیں جو لوگوں کے لیے نافع ہوتے ہیں عام طور پر لوگ اشعار کے بارے میں اس مغالطہ کا شکار رہتے ہیں کہ اشعار کا پڑھنا پڑھانا بے کار لوگوں کا کام ہے اور شعروشاعری اچھی چیز نہیں ہے بلکہ ان میں لگنا اپنے قیمتی اوقات حیات کو ضائع کرنا ہے کوئی خاص دینی نفع اشعار کے پڑھنے پڑھانے میں وابستہ نہیں ہے اسی لیے وہ ایسی مجالس سے دور رہتے ہیں جہاں حمد ونعت اور اصلاحی اشعار وغیرہ پڑھے جاتے ہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر بعضوں سے تو یہ سنا گیا ہے کہ یہاں کوئی وعظ و بیان تو ہے نہیں اور یہ تو مشاعرہ ہورہا ہے اس لیے اس میں شرکت کیوں کریں اور بعضوں نے تو اس حد تک تجاوز عن الحد کیا کہ یہ شعر وشاعری اور نظم ونعت خوانی یہ تو بریلوی اور بدعتی لوگوں کا کام ہے اپنے اہل حق علماء دیوبند کا اس سے کیا تعلق۔

یہ غلط فہمی ٹھیک اسی طرح ہے جیسے بعض اچھے خاصے دیندار اگر کسی عالم کو اپنی حفاظت ودفاع کی خاطر بندوق وپستول کی بات کرتے سنیں تو بڑی حیرت وتعجب سے کہتے ہیں کہ مولانا آپ بندوق اور پستول کو کیا کروگے یہ تو بدمعاش اور غنڈے لوگوں کا کام ہے مگر افسوس کہ اس کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اسلحہ جب بدمعاشوں اور غنڈوں کے ہاتھ میں ہوگا تو اس سے بدمعاشی اور غنڈہ گردی پھیلے گی اور جب اہل صلاح واہل دین کے ہاتھوں میں ہوگا تو اس سے صلاح اور دین پھیلے گا۔

بس بالکل ایسا ہی معاملہ اشعار کا ہے کہ جب اشعار میں اللہ تعالیٰ کی محبت ومعرفت پیش کی جائے گی اور فنائے دنیا وزوالِ حسن عارضی پیش ہوگا تو پھر سامعین کے قلوب انوار محبت سے منور اور روشن ہوں گے۔ دراصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت سے بعض حضرات کو دھوکہ ہوا اور غلط فہمی ہوئی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پوری آیت نہیں پڑھی احقر اس آیت کو مع اس کی تفسیر کے پیش کیے دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ o اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ o﴾
(سورۃ الشعرآء، آیۃ: ۲۲۵-۲۲۴)

مفسرین اور شراح بخاری نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے تین مشہور شاعر صحابہ حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم تو شعر کہتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگلا جملہ بھی تو پڑھو اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یعنی اس سے ان شعراء کو مستثنیٰ کر دیا گیا جو کہ مؤمن اور صالح ہیں تب وہ مطمئن ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہے ہیں کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح اختیار کیا اور اللہ کا بکثرت ذکر کیا اور ظلم کے بعد بدلہ لیا (یعنی کسی کی ہجو اس وقت کی جب پہل کسی اور نے کی ایسی صورت میں ان کی جوابی ہجو مورد عتاب نہیں)

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ نے الادب المفرد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے:

﴿اَلشِّعْرُ مِنْهُ حَسَنٌ وَمِنْهُ قَبِيْحٌ خُذِ الْحَسَنَ وَدَعِ الْقَبِيْحَ وَلَقَدْ رَوَيْتُ مِنْ شِعْرِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَشْعَارًا مِنْهَا الْقَصِيْدَةُ فِيْهَا اَرْبَعُوْنَ بَيْتًا﴾

یعنی اشعار میں اچھے برے دونوں طرح کے ہوتے ہیں تم اچھوں کو لے لو اور برے اشعار کو چھوڑ دو اور میں نے کعب بن مالک کے اشعار نقل کیے اس میں ایک قصیدہ چالیس اشعار پر مشتمل تھا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صحابی حضرت شرید بن سوید الثقفی رضی اللہ عنہ کا فرمان نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سنا تا رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے:

﴿قَالَ هِيهْ فَاَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيهْ ثُمَّ اَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيهْ حَتّٰى اَنْشَدْتُهُ مِأَةَ بَيْتٍ﴾

(صحیح مسلم ،کتاب الشعر)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزید سنانے کی فرمائش کرتے رہے اور میں مزید سنا تا رہا یہاں تک کہ میں نے ایک ایک کر کے سو شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائے۔ حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ:

﴿عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ جَالَسْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثَرَ مِنْ مِّاَةِ مَرَّةٍ فَكَانَ اَصْحَابُهٗ يَتَنَاشَدُوْنَ الشِّعْرَ وَ يَتَذَاكَرُوْنَ اَشْيَآءَ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَهُوَ سَاكِتٌ فَرُبَمَا يَتَبَسَّمُ مَعَهُمْ﴾

(سنن الترمذی، ج: ۲، ص: ۱۱۲)

حضرت جابر بن سمرۃ فرماتے ہیں کہ میں سو مرتبہ سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھا تو دیکھا کہ حضرات صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اشعار اور زمانہ جاہلیت کی باتیں سنایا کرتے حضور انہیں منع نہیں فرماتے تھے البتہ کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔

بے شک بعض روایات سے اشعار کہنے کی مذمت اور شعر گوئی میں اشتغال کی قباحت معلوم ہوتی ہے تو دراصل ان تمام روایات کا محمل و مطلب ایسے اشعار ہیں کہ جن میں بے ہودگی، جھوٹ اور فحاشی ہو یا اس شخص کے بارے میں ہے کہ جو شعر و شاعری کو اپنی زندگی کا مقصد و مشغلہ اس طرح بنالے کہ دوسرے واجبات وفرائض کی ادائیگی میں مخل ہو۔

چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے لان یمتلی جوف احدکم قیحا خیر له من ان یمتلی شعرا کہ تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے یہاں تک کہ اس کو خراب کردے یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کا پیٹ شعر سے بھرا ہو۔ اس حدیث پاک کے تحت ترمذی کے حاشیہ پر ہے کہ المراد کثرته بحیث یشغله عن القرآن وذکر الله والعلوم الشرعیة یعنی شعر گوئی کی یہ مذمت اس وقت ہے کہ جب ان میں اس قدر اشتغال ہو جائے کہ جو آدمی کو تلاوت کلام اللہ اور ذکر اللہ سے غافل کردے اور علوم دینیہ وشرعیہ سے دور کردے۔ (سنن الترمذی، جلد:۲، صفحہ:۱۱۲، کشف الباری، کتاب الادب)

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ فی نفسہ شعر گوئی معیوب اور بری چیز نہیں ہے۔ اس لیے بہت سے صحابہ شاعر تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اشعار سنا کرتے تھے اور حضرت حسان کے لیے تو باقاعدہ مسجد میں منبر لگایا جاتا تھا اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ہر شئے کو اس کی اسلامی حدود میں رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور افراط وتفریط سے محفوظ رکھے، آمین۔

راقم السطور

محمد امجد قاسمی عفا اللہ تعالیٰ عنہ، استاذ دار العلوم آزادوِل، جنوبی افریقہ

شعر و شاعری اور میرے شیخ عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

احقر کا اول اصلاحی تعلق حضرت مولانا مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا اس کے بعد باضابطہ حضرت والا سے اصلاحی تعلق ہوا اور اپنے مختصر سے اصلاحی تعلق کے زمانہ میں حضرت والا کی صحبت میں رہنے کا موقعہ ملا اور حضرت کے اشعار کو سننے اور پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تو یہ اندازہ ہوا کہ ان اشعار کی حقیقت بالکل اس طرح ہے کہ جیسے کوئی درد و تکلیف میں مبتلا شخص بلا کسی تمرین و مشق اور بغیر کسی تصنع و تکلف کے اپنا درد و تکلیف بیان کرتا ہے ٹھیک اسی طرح حضرت والا کے قلب مبارک میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد پیدا ہوا تو حق تعالیٰ نے زبان ترجمان دردِ دل بھی عطا فرمادی اسی لیے حضرت والا نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

تم اصلاح کی اس میں کوشش نہ کرنا
یہ ہے داستاں دردِ دل کی ہماری
میری شاعری بس میرا دردِ دل ہے
لغت پا سکے گی اسے کیا تمہاری

حضرت والا کی زندگی کے پہلے شعر کو ملاحظہ کیجئے اور مضمون بالا کا اندازہ لگائیے ؎

دردِ فرقت سے میرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت میں اک ماہی بے آب ہے

حقیقت یہ ہے کہ علوم و معارف اور اسرار و حکم شرعیہ قلب پر وارد ہوتے چلے گئے اور بلا کسی دماغی کد و کاوش کے اشعار کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے اور تمام اشعار پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ہر ہر شعر کا بنیادی سبق اور مرکز و محور دین و شریعت کی تبلیغ اور تصوف و تزکیہ کی تلقین اور خوف و خشیت خداوندی اور معرفت و محبت الٰہی کی تعلیم ہے۔

غیر اللہ سے دل لگانے کا خطرناک اور مہلک انجام عشق مجازی کی تباہ کاریاں بڑے مؤثر اور پرکشش انداز میں بصورت اشعار پیش فرمائی ہیں اس لیے ہر شعر احقر کے ناقص علم کے مطابق قرآن کریم کی کسی آیت یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کی تشریح نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے مولانا رومی کی مثنوی کے متعلق کہے گئے شعر کی توجیہ میں ارشاد فرمایا ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زباں پہلوی

یعنی مثنوی قرآن کریم کی طرح وحی نہیں ہے مگر ایک الہامی کلام ہے جو منجانب اللہ مولانا رومی کے قلب پر

وارد ہوا ہے اور اہل دل اہل اللہ کے کلام کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے چنانچہ حضرت شاہ عبد الغنی پھولپوری جب حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی سے کچھ نئے اشعار سننا چاہتے اور اس کی فرمائش کرتے تو یوں ارشاد فرماتے کہ کچھ آیا ہو تو سنا دیں یہ نہ فرماتے کہ کچھ اشعار بنائے ہوں تو سنا دیجئے اور فرماتے کہ کچھ تازہ وارد ہوا ہو تو پیش فرما دیں۔

اسی لیے ان حضرات کے مجموعۂ کلام کے ایک ایک شعر میں گھنٹوں گھنٹوں کے وعظ کی تاثیر ہوا کرتی ہے جیسا کہ حضرت والا سے ایک مرتبہ کسی نے حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی کا ایک شعر سنا تو اپنے وطن جا کر حضرت کو لکھا کہ اس شعر میں مجھے گھنٹوں کے وعظ کا مزہ آیا اور وہ شعر یہ تھا کہ ؎

نہیں رہتے ہیں ہم کیوں چاہیے ہم کو جہاں رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہاں رہنا وہاں رہنا

حضرت علامہ یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت والا کی مثنوی کو دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ مجھے مولانا رومی کے اور ان کے کلام میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔ ایران کے ایک عالم علامہ محی الدین زاہدی قاسمی حضرت والا کی معارف مثنوی دیکھ کر ارشاد فرمایا ”ہر کہ مثنوی اختر را بخواند او را مثنوی مولانا روم پندارد لاریب کہ مولانا شاہ حکیم محمد اختر رومی عصر اند“

اس لیے حضرت والا کے ان اشعار کو عام شعر و شاعری کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلا ریب اشعار فیضان محبت علم و عرفان اور توحید و تصوف کا خزانہ ہے جن کو سن کر سامعین اپنے ایمان میں تازگی اور حلاوت محسوس کرتے ہیں اور ان کو اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے طبائع گناہوں سے متنفر اور طاعات کی جانب مائل دکھائی دینے لگتی ہیں بالخصوص حسن بتاں کے عشق کی خطرناک دلدلوں میں پھنسے ہوئے لوگ بآسانی ان سے نکل آتے ہیں جیسا کہ ہزاروں عشاق مجازی حضرت والا کے خاص انداز تربیت کے ذریعہ اس دلدل سے نکل کر اپنے مولیٰ کی محبت کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔

اور اس کی خاص وجہ وہی ہے کہ ان اشعار کی شاعری کا عنصر گل و بلبل کی داستاں یا ساغر و صہبا اور قلقل و مینا کی حکایت نہیں بلکہ درس توحید و توقیر رسالت، دردِ محبت، نورِ معرفت، تسلیک و تربیت ہے اور حضرت والا نثر کے بجائے نظم میں دردِ محبت سے آشنا بناتے ہیں اور معرفت الٰہی کا راستہ دکھاتے ہیں اور دلکش طریقہ سے سالکین کی تربیت فرماتے ہیں جس کے قلب میں محبت الٰہی کی ذرا سی چسک ہو اور راہ سلوک سے کسی قدر ذوق ہو تو وہ بخوبی محسوس کر سکتا ہے کہ ہر ہر شعر میں ایسا جذب و کیف ہے اور نسبت باطنی کے تذکرے ایسے دلسوز انداز سے فرمائے گئے ہیں کہ جو کیسے ہی نا آشنائے درد کو آشنائے درد اور بسمل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ حقائق ہیں کہ حضرت والا کے کلام کی شرح پڑھ کر قارئین خود ان کا اندازہ لگالیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت والا کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے اور تادیر ہمارے اوپر حضرت کا سایہ قائم رکھے اور ہر قول و فعل میں کمال اخلاص و للہیت عطا فرمادے، امین۔

راقم السطور

محمد امجد قاسمی استاذ دار العلوم آزاد وِل، جنوبی افریقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ زمیں جیسے ہے آسماں میں

جس سے ہیں آپ خوش اس جہاں میں وہ شب و روز ہے گلستاں میں
دیکھ کر میرے اشکِ ندامت ابرِ رحمت کی بارش ہے جاں میں
آپ کا سنگِ در اور مرا سر حاصلِ زندگی ہے جہاں میں
سارے عالم کی لذت سمٹ کر آگئی ہے ترے آستاں میں
لذتِ ذکرِ حق اَللہ اَللہ اور کیا لطف آہ و فغاں میں
کیا کہوں قربِ سجدہ کا عالم یہ زمیں جیسے ہے آسماں میں
برق گرنا مگر رخ بدل کر آہ سنتا ہوں میں آشیاں میں
عالمِ غیب کا یہ کرم ہے چشمِ بینا دیا قلب و جاں میں
درسِ تسلیم و خونِ تمنا ہے نہاں عشق کی داستاں میں
لذتِ قربِ بے انتہاء کو کس طرح لائے اختؔر زباں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ گلستان: باغ۔ اشک: آنسو۔ ابر: بادل۔ سنگِ در: چوکھٹ۔ آستان: اللہ تعالیٰ کا در۔ آہ و فغاں: گریہ وزاری۔ برق: بجلی۔ آشیاں: گھونسلہ، عالمِ غیب: اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ چشمِ بینا: دیکھنے والی آنکھ۔ درسِ تسلیم: اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہنے کا سبق۔ خونِ تمنا: حرام خواہشات پر عمل نہ کرنا۔ نہاں: پوشیدہ۔ داستان: کہانی۔

رضائے الٰہی لطفِ دو جہاں کی ضامن ہے

جس سے ہیں آپ خوش اس جہاں میں
وہ شب و روز ہے گلستاں میں

اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ مومن کے اصلی مقصدِ حیات کو پیش فرما رہے ہیں کہ جب بندہ مومن اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے تو اس نے اپنی زندگی کے اصلی مقصد کو پالیا اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے راضی اور خوش ہونے کی بنیاد پر اس کی دنیوی حیات بھی پرلطف کر دی جاتی ہے اور وہ ہر وقت ایسا شاداں اور فرحاں رہتا ہے جیسے کہ وہ ہر گھڑی کسی گلشن و پارک (Park) کی پر کیف بہاروں میں جی رہا ہو اور اس کے لیل ونہار بڑی مسرت اور شادمانی سے گذرتے ہیں خود قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۹۷)

ترجمہ: جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو (کیونکہ کافر کے اعمال صالحہ مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو دنیا میں تو بالطف زندگی دیں گے اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔ (معارف القرآن جلد:۵،ص:۳۸۶)

ناموافق حالات سے اولیاء اللہ کیوں متاثر نہیں ہوتے

اگرچہ بشری نوعیت کے احوال ومسائل سے اللہ والا بھی گذرتا ہے اور اسے بھی دنیوی تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے اور مسرت وخوشی اور رنج وغم کے ملے جلے احوال سے وہ بھی الگ تھلگ نہیں رہتا ہے مگر یہ جملہ اقسام کے مسائل بس اس کے جسم کے اوپر ہوکر گذرتے ہیں اور دل ان کے اثر سے متاثر نہیں ہوپاتا ہے اور اگر متاثر ہو بھی جائے تو بس اس حد تک کہ یہ سب کچھ میرے محبوب کی طرف سے ہے اور وہ محبوب بھی ایسا کہ جو حاکم بھی ہے اور حکیم بھی ہے اس لیے بے چین وپریشان ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ اپنے محبوب کی رضاء میں راضی اور خوش رہتا ہے تو ان احوال سے اس کے قلب کا چین وسکون بے چینی وبے سکونی سے تبدیل نہیں ہوتا اور ہر گھڑی اس کا دل اپنے مولیٰ کی محبت میں باغ وبہار رہتا ہے جس کے نتیجہ میں اسے وہ حلاوت ولذت عطا ہوتی ہے کہ جس کی اہل دنیا کو ہوا بھی نہیں لگی ہوتی۔ اس لیے حضرت والا اس شعر میں ایک ایسا سبق پڑھا رہے ہیں کہ جو دونوں جہاں کی سلامتی وعافیت اور عزت وراحت اور فرحت ومسرت کا ضامن ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ ہم اپنے مولیٰ کو راضی کریں خواہ ہمارا نفس ناخوش ہو اور ایسے امور سے دور رہیں کہ جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ ناراض وناخوش ہوتا ہے اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہماری زندگی میں اعلیٰ درجہ کا تقویٰ ہو اور گناہوں سے کلی طور پر اجتناب وپرہیز ہو کیونکہ حدیث پاک میں یہ مضمون موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ گناہوں اور نافرمانیوں سے ناراض ہوتے ہیں اور اس پر دنیا وآخرت میں نوع بنوع عذاب دیئے جاتے ہیں اور جب گناہوں سے مکمل اجتناب ہوتا ہے تو پھر یہ دنیا ہی ایک طرح کی جنت بن جاتی ہے۔

دنیا وآخرت کی جنت

چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ کریم کی آیت وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ کے تحت یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ:

﴿وَقَالَ بَعْضُ الصُّوْفِيَةِ جَنَّةٌ مُعَجَّلَةٌ فِي الدُّنْيَا بِالْحُضُوْرِ مَعَ الْمَوْلٰى وَجَنَّةٌ مُؤَجَّلَةٌ فِي الْاٰخِرَةِ بِلِقَآءِ الْمَوْلٰى وَالدَّرَجَاتِ الْعُلٰى﴾

(المرقاۃ، ج:۵،ص:۲۱۳، مطبوعۃ: المکتبۃ الحقانیۃ)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے عاشقوں کو ایک جنت دنیا میں عطا فرماتے ہیں اور ایک جنت آخرت میں۔ دنیا میں جنت تعلق مع اللہ تعالیٰ کی لذت ہے اور آخرت کی جنت لقائے مولیٰ اور دیدارِ حق کی لذت ہے اور حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں یعنی جو شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر حساب و کتاب سے ڈرتا ہے اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے خوف کے معنی یہ ہیں کہ جلوت و خلوت میں اور ظاہر و باطن کے تمام احوال میں اس کو یہ دائمی مراقبہ رہتا ہو کہ مجھے ایک روز حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا اور اعمال کا حساب دینا ہے اور ظاہر ہے جس کو ایسا مراقبہ ہمیشہ رہتا ہو وہ گناہ کے پاس نہیں جائے گا اور قرطبی وغیرہ بعض حضراتِ مفسرین نے مقامِ رب کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر قول و فعل اور خفیہ و علانیہ پر نگراں اور قائم ہے ہماری ہر حرکت اس کے سامنے ہے حاصل اس کا بھی وہی ہوگا کہ حق تعالیٰ کا یہ مراقبہ اس کو گناہوں سے بچادے گا۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۲۶۱)

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کا ارشادِ گرامی

اسی مضمون کو حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت ج:۲،ص:۱۷۶ پر کچھ یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس ایمان و یقین اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس صحیح تعلق اور مخلوق سے آزادی اور قلب سے وارستگی اور بے تعلقی کے بعد انسان کو وہ سکینت و سرور حاصل ہوتا ہے کہ اس زندگی ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے (جیسا کہ ابن قیم نے نقل کیا ہے) خود ایک بار فرمایا کہ:

﴿اِنَّ فِی الدُّنْیَا جَنَّۃً مَنْ لَّمْ یَدْخُلْھَا لَمْ یَدْخُلْ جَنَّۃَ الْاٰخِرَۃِ﴾

دنیا میں (مومن کے لیے) ایک ایسی جنت ہے کہ جو اس میں یہاں داخل نہ ہوا آخرت کی جنت سے بھی محروم رہے گا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے مخلص بندوں کو اس زندگی میں بھی لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ کی دولت عطا فرماتا ہے اور وہ اس کا نمونہ (بقدرِ وسعتِ دنیا) یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یہی مضمون ہے جس کو حضرت والا نے اس مذکورہ شعر میں ذکر فرمایا ہے اور دوسرے مختلف اشعار میں بھی مختلف انداز سے یہ ذکر فرمایا ہے، جیسے ارشاد فرمایا کہ ؎

جو خوش ہیں آپ تو ہر سو بہار کا عالم
وگرنہ سارا یہ عالم ہی عالمِ غم ہے
جو خوش ہیں آپ تو عالم ہمارا عالم ہے
وگرنہ اپنا بھی عالم تباہ و برہم ہے
جس طرف کو رخ کیا تو نے گلستاں ہوگیا
تونے رخ پھیرا جدھر سے وہ بیاباں ہوگیا

توبہ روح کی ٹھنڈک ہے

دیکھ کر میرے اشکِ ندامت
ابرِ رحمت کی بارش ہے جاں میں

حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں یوں اپنے لیے پریشانی وندامت کا اظہار فرمایا کہ:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۲۳)

ترجمہ: دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا (کہ پوری احتیاط اور تأمل سے کام نہ لیا) اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے۔
(معارف القرآن، ج:۳،ص:۵۳۱)

اور اپنی اس ادا سے بارگاہِ الٰہی میں مقبول قرار پائے اور شیطان نے اپنے کیے پر ندامت وشرمندگی کے بجائے مزید اکڑ اور تکبر میں آ کر یوں کہا کہ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ بالآخر ہمیشہ کے لیے بارگاہِ الٰہی سے مردود قرار پایا۔

اس لیے قرآن وحدیث میں توبہ کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہ ادا بڑی محبوب اور بہت پسند ہے اور جگہ جگہ توبہ پر دنیا وآخرت کی نعمتوں کا حصول موعود ہے اسی مضمون کو حضرت والا پیش فرما رہے ہیں کہ جب توفیقِ الٰہی سے مجھے اپنے گناہوں اور غفلتوں پر نادم وشرمندہ ہوکر آنسو گرانے کی سعادت ملتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے رگ وریشہ میں رحمتِ الٰہی کی بارش کی تری پہنچ کر میرے قلب وجگر کو سیراب کر رہی ہے اور میرے بدن کا رواں رواں فرحت ومسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسان جتنی اللہ تعالیٰ کی معرفت ومحبت میں ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے قلب میں عظمتِ باری تعالیٰ بڑھتی جاتی ہے تو پھر اسے اپنا کیا ہوا سب کچھ ہیچ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ سوچتا رہتا اور بزبانِ حال یوں کہتا رہتا ہے کہ اے خدا مجھے جیسی تیری معرفت حاصل کرنی چاہیے تھی میں نہ کر سکا اور جیسا تجھ پر فدا ہونا چاہیے تھا میں نہ ہوسکا۔

اس طرح نادِم وشرمندہ ہوکر بارگاہِ الٰہی میں اشکِ ندامت گراتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب وجاں کو مسرور کر دیتے ہیں اور اس کے دل ودماغ کو باغ وبہار کر دیتے ہیں اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے جسم کے رگ وریشے میں بارانِ رحمتِ خداوندی کے ذریعہ صفائی وطہارت ہوکر مشامِ جان معطر ہو رہے ہیں اور سکون واطمینان کی لہریں اس کے جسم کے روئیں روئیں میں دوڑنے لگتی ہیں اور اس کے دل ودماغ سے جملہ قسم کے غموم وہموم اور آلام وافکار کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔

توبہ کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر معارف القرآن میں سورہ تحریم، پ:۲۸ میں توبۃً نصوحًا کے ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے سوال کیا کہ توبہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا جس میں چھ چیزیں جمع ہوں (۱) اپنے گذشتہ برے عمل پر ندامت (۲) جو فرائض وواجبات اللہ تعالیٰ کے چھوٹے ہیں ان کی قضا (۳) کسی کا مال وغیرہ ظلماً لیا تھا تو اسکی واپسی (۴) کسی کو ہاتھ یا زبان سے ستایا اور تکلیف پہنچائی تھی تو اس سے معافی (۵) آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم وارادہ (۶) اور یہ کہ جس طرح اس نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے اب وہ اطاعت کرتے ہوئے دیکھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو شرائط توبہ بیان فرمائی ہیں وہ سبھی کے نزدیک مسلّم ہیں بعض نے مختصر بعض نے مفصل بیان کر دیا ہے۔

بہرحال اشکِ ندامت گرانا یہ ایسا نسخہ ہے کہ جو قربِ الٰہی کے لیے اکسیر ہے اور امت کے تمام اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی زندگی کا حصہ بن کر رہا اور پھر ان کی زندگیوں میں وہ بہار آئی کہ ساری دنیا نے اس کو دیکھا۔

حاصلِ زندگی

آپ کا سنگِ در اور مرا سر
حاصلِ زندگی ہے جہاں میں

ارشاد فرماتے ہیں کہ میری زندگی کا حاصل اور میرا مقصدِ حیات یہ ہے کہ ہر وقت آپ کے حکم کے سامنے سرنگوں اور آپ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر اپنا اظہار بندگی کروں اور میرے مولیٰ کا جو بھی حکم ہو اس پر دل وجان سے قربان ہو جاؤں نہ تو اس کی خاطر مجھے اپنے منافع ومصالح کے فوت ہو جانے کا رنج وغم ہو اور نہ کسی سے کسی قسم کے خوف وملامت کی پرواہ ہو اور اس کے لیے اگرچہ مجھے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے لیکن میں ایک پل جھپکنے کے برابر بھی اپنے اللہ کو ناراض نہ کروں خواہ سارے اہلِ دنیا ناراض ہوتے ہوں ورنہ اگر میں نے مخلوق کا خیال کر کے اپنے مولیٰ کی حکم عدولی کر لی تو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے در سے ہٹ گیا اور مقصودِ حیات میں ناکام ہو گیا۔

غرض کہ میں سب سے کٹ کر بس آپ کا ہو رہوں اور درحقیقت یہی کامل عبدیت اور کلمہ لاالٰہ الاّ اللہ کی روح ہے اور اس کا سب سے اہم سبق ہے اور جب بندۂ مومن کی زندگی میں یہ بات پیدا ہو جائے اور اسے بجز رضائے مولیٰ کسی نفع وضرر کا خیال دل میں نہ رہے تو بس سمجھو کہ کلمہ اس کی زندگی میں رچ بس گیا ہے اور ہر مومن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہی چاہا ہے کہ میرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو اپنے منافع ومضار کا خیال دل سے نکال باہر کرو پھر دیکھو کہ کیسے باری تعالیٰ کی نصرت ومدد ہر قدم پر ہمارے شاملِ حال ہوتی ہے اور مشکلاتِ حیات کیسے

سہل اور آسان ہوتی جاتی ہیں، جن کو حل کرنے کے لیے آج کا انسان اپنی ساری عمر کو بے انتہا بے چینی و پریشانی میں گزار دیتا ہے۔ حسنِ ظن یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے شیخ دامت برکاتہم العالیہ کو یہی مقامِ بندگی عطا کیا ہے جیسا کہ اس پر حضرت والا کی پوری زندگی شاہد ہے۔

اور حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جب انسان اس طرح اللہ تعالیٰ کے در پر مرمٹنا اختیار کرتا ہے اور مشکلات و پریشانیوں میں خدا کے حکم کو نہیں چھوڑتا اور راہِ خدا کا ہر غم برداشت کرنے لگتا ہے تو پھر حق تعالیٰ اسے اپنی راہ کی عجیب لذت وحلاوت نصیب فرماتے ہیں اور اسے وہ کیفِ ایمانی عطا ہوتا ہے کہ جس پر دونوں جہاں کی راحتیں فدا وقربان ہوتی ہیں اور اگر ہم بغور دیکھیں تو قرآنِ کریم کی آیت جس میں مقصدِ تخلیق جن وانس کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اس شعر میں مذکور ہے کیونکہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾

(سورۃ الذّاریات، آیت: ۵۶)

ترجمہ: اور میں نے جن وانس کو (دراصل) اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۱۷۱)

عبادت کی حقیقت صرف اتنی نہیں ہے کہ بس مسجد کے اندر نماز ادا کرلی یا صوم وصلاۃ وحج وزکوٰۃ کا اہتمام کرلیا اور باقی شعبہائے زندگی میں دین سے صرف نظر کیے رہا بلکہ درحقیقت عبادت کے مفہوم میں زندگی کے تمام شعبوں میں ہر ہر قدم پر خدا کا حکم بجالانا اور اس کی فرمانبرداری کرنا شامل ہے اور یہی کامل اسلام ہے جو ہم سے مطلوب ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً اے مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ مسجدوں میں ہو یا گھروں میں، بازاروں میں ہو یا صحراؤں میں اور صحت میں ہو یا مرض میں، راحت میں ہو یا مصیبت میں، خوشی میں ہو یا غم میں بس جس حال کا جو حکم ہے اس حالت میں اس حکم کو بجالانا یہی کامل طاعت وبندگی ہے اور یہی حضرت والا کے شعر کا خلاصہ ہے کہ ہر آن میں اپنے مولیٰ کے سامنے سرنگوں رہوں۔

لذّاتِ عالم کا کیپسول (Capsule)

سارے عالم کی لذت سمٹ کر
آگئی ہے ترے آستاں میں

اگر غور کریں تو اس سے پہلے شعر میں اور اس شعر کے درمیان ایک عجیب مناسبت اور ربط ہے اور وہ یہ ہے کہ اول شعر کے مضمون سے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہر وقت مولیٰ کے سنگِ در پر سر رکھنا اور ہر گھڑی حکمِ الٰہی کا خیال رکھ کر زندگی گذارنا یہ تو بڑا مشکل اور دشوار کام ہوگا اور اس کے نتیجہ میں تو پھر ہم زندگی کے مزوں سے محروم ہو جائیں گے اور لذاتِ دنیویہ کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔

بے شک آخرت تو بن جائے گی اور وہاں کا لطف وعیش تو میسر ہو جائے گا لیکن دنیا کے باغ وبہار اور

راحت وآرام سے محروم ہونا پڑے گا اور بالفاظِ مختصر پھر تو ہماری دنیوی زندگی بالکل بے مزہ ہو کر رہ جائے گی۔

تو اس شعر میں حضرت والا نے گویا اسی سوال کا جواب پیش فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے در پر مر مٹنے میں جو لطف اور مزہ ہے اس کے سامنے دنیا کے مزے اور لذتیں ہیچ ہیں، حق تعالیٰ نے اپنے در پر جھکنے اور اپنی فرمانبرداری میں ایسی لذت رکھی ہے کہ جس کو چکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کا چین وسکون اپنے در پر رکھ دیا ہے جملہ لذاتِ عالم کو اپنے آستاں میں سمو دیا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ یہ ایک ایسا کیپسول (Capsule) ہے کہ جس کے اندر حق تعالیٰ نے سارے عالم کی لذتوں اور مزوں کے وٹامن (Vitamin) جمع کر دیئے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا بے بنیاد ہے کہ دین وشریعت کی تابعداری سے دنیوی زندگی بے کیف ہو جائے گی۔ بلکہ حقیقی کیف و مزہ اس کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

لطفِ طاعات حاصل نہ ہونے کی وجہ

جو لوگ یہ سوچتے ہیں اس کی وجہ اور بنیاد ان کے حواس پر چڑھا ہوا وہ زہر ہے جس کے بعد وہ قوت اپنا کام صحیح نہیں کر پاتی ہے جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور اس کے اعضاء پر اس کا زہر چڑھ گیا ہو تو اسے اب کڑوی چیز میٹھی معلوم ہونے لگتی ہے کیونکہ اس کی جسمانی صحت کا نظام بگڑ چکا ہے۔

بالکل اسی طرح گناہوں اور نافرمانیوں کا معاملہ ہے کہ ایک عرصہ تک ان میں مبتلا رہنے سے نہ ہماری قوتِ ذائقہ صحیح رہتی ہے اور نہ قوتِ شامہ درست رہتی ہے نہ دل ودماغ صحیح کام کرتے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ اس امت میں مسخ الوجوہ (چہروں کا مسخ ہونا) تو نہ ہوگا لیکن مسخ القلوب (دلوں کا) مسخ باقی رہے گا تو گناہوں کی نحوست سے دل ودماغ کے سوچنے سمجھنے کا انداز اور طور طریقہ بدل جاتا ہے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے لگتا ہے گناہوں اور نافرمانیوں میں مزہ آتا ہے اور عبادات وطاعات میں سستی وکاہلی اور بدذوقی کا شکار رہتا ہے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ حضرات انبیاءِ علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے کامل ظاہری وباطنی صحت وسلامتی والے اعضاء دے کر دنیا میں بھیجا ہے جن کا ادراک واحساس اور ذوق ووجدان بالکل صحیح اور درست ہوتا ہے اور ان کے قول کو اس باب میں حجت ودلیل سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ اشیاء کی صحیح کیفیت وحالت اور اعمال کی حقیقی تاثیر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ﴾

(سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، ج ۲، ص ۹۳)

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، یعنی جو سرور وانبساط اور لطف ومزہ مجھے نماز میں ملتا ہے وہ کائنات کی کسی بھی چیز میں نہیں ہے اس لیے نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

تو گویا اس ارشاد نبوی سے نماز کے اصل مزاج وطبیعت کا علم حاصل ہو گیا کہ اصل نماز کی یہ شان ہے کہ

اس سے سرور واطمینان اور لذت وفرحت حاصل ہوتی ہے لیکن اگر کسی کو نماز میں لگ کر ایسا محسوس نہ ہو تو درحقیقت اسے اپنے باطن کی گندگی و بیماری کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہیے کہ جس کے سبب ایسا ہو رہا ہے اور اس کا ادراک متغیر ہے نہ یہ کہ وہ نماز کی اس تاثیر کے متعلق کسی شک وشبہ میں پڑ جائے۔ آخر حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے تھے تو ان کے نماز میں محو ہونے، کھو جانے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان پر تیر برسائے جاتے اور ان کے بدن سے خون نکلتا رہتا تھا مگر ان کے بدن میں ذرا جنبش نہ ہونے پاتی تھی اور وہ مثلِ ستون کے کھڑے رہتے تھے بالآخر پوچھے جانے پر جواب یہ ہوتا تھا کہ اس سورت قرآن کی تلاوت نے مجھے نماز توڑنے سے روک دیا اور اس کے مضامین میں غور وفکر اور استحضارِ عظمتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ملنے والا لطف وحلاوت اس درد وتکلیف سے بڑھ کر تھا جو مجھے تیروں کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

آج جو ذکر وتلاوت اور صلاۃ ومناجات میں لذت نہیں ہے درحقیقت اس کی وجہ ہم میں خود اپنے اندر ہے ورنہ جیسے حضرت والا نے ارشاد فرمایا ہے کہ سارے عالم کی لذت اللہ تعالیٰ نے اپنے در پر جھکنے اور سرنگوں ہونے میں رکھ دی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نماز کے بعد بیٹھے رو رہے تھے، جب حضرت سے سبب دریافت کیا تو ارشاد فرمایا کہ بیس سال سے میری تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی تھی مگر آج فوت ہوگئی ہے اس کا اتنا صدمہ ہوا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہونے میں ان کو کیا کچھ ملتا تھا کہ اس کے چھوٹ جانے کے سبب ایسا رو رہے ہیں جیسے ایک عظیم دولت چھوٹ گئی ہو۔

حلاوتِ ذکر کی حکمت

لذتِ ذکرِ حق اللہ اللہ
اور کیا لطف آہ فغاں میں

یہ شعر عربی کی اصطلاح کے اعتبار سے گویا کہ **تخصیص بعد التعمیم** ہے کہ اوّل تو حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے در پر جھکنے میں پوری حلاوت ہے۔ اب خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی حلاوت کو پیش فرما رہے ہیں کہ بس کیا بیان کروں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کیسی حلاوت ولذت ملتی ہے کہ دنیا ومافیہا کے مزے اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں اور اس کو حضرت والا نے مختلف مواقع پر مختلف انداز سے سمجھایا ہے کہ جو خدا ساری کائنات کی لذیذ ترین چیزوں کا خالق ہے اور شمس وقمر کو جمال بخشنے والا ہے خود اس کے نام کی لذت کا کیا عالم ہوگا، اسی کو ایک دوسری نظم میں یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

ارے یارو! جو خالق ہو شکر کا
جمال شمس کا نور قمر کا

نہ لذت پوچھ پھر ذکر خدا کی
حلاوت نام پاک کبریاء کی

اوراسی کودوسرے انداز میں یوں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام ان کے عشاق کے لیے جام ومینا کی طرح ہے ۔

اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے
عاشقوں کا مینا اور جام ہے

اس کے نامِ مبارک کی حلاوت ومٹھاس کے سامنے دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی لذیذ چیز بھی کیا حقیقت رکھتی ہے۔ چنانچہ اپنے وقت کے بڑے عالم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مضمون کے متعلق شعر یاد آیا ۔

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیرِ دورِ جام ہے

اور درحقیقت یہ ایسا معاملہ ہے کہ جیسے اگر کوئی یوں کہے چینی میٹھی اور شہد وسیب بھی میٹھا مگران میں کیا فرق ہے؟ تو ہم اور آپ اس فرق کو بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ بس اس کے جاننے کی ایک ہی آسان صورت ہے کہ اس کو کھاؤ اوران میں فرق کا پتہ لگالو، تو بالکل اسی طرح کسی اللہ والے کی صحبت میں چند دن اللہ اللہ کر کے اس کی حلاوت کا پتہ چلتا ہے۔

مقامِ قربِ سجدہ کی حکمت

کیا کہوں قربِ سجدہ کا عالم
یہ زمیں جیسے ہے آسماں میں

حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے جس مضمون کو ذکر فرمایا ہے وہ مضمون قلبی ادراک واحساس اور کیفیاتِ روحانیہ سے تعلق رکھتا ہے، جس کا لفظوں سے سمجھنا سمجھانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ لغت محض معانی کو تعبیر کرتی ہے اس پر حضرت والا کے اشعار ہیں ۔

جو لفظوں سے ہوئے ظاہر معانی
وہ پا سکتے نہیں دردِ نہانی
لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک طویل زمانہ گزارا اور شب وروز کے معمولات دیکھے خاص طور پر وہ آہِ سحر گاہی اور نالہ نیم شبی کے حسین

ودلکش مناظر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے طویل سجدوں کی حلاوت ولذت اور اس میں ملنے والے قربِ خداوندی کا مزہ چکھا ہے اور اپنے شیخ کی ذکر وتلاوت کے دوران نکلنے والی آہوں کی چاشنی ومٹھاس کو خود چکھا ہے۔ حدیثِ پاک کا مضمون ہے:

﴿اَقْرَبُ مَایَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ وَھُوَ سَاجِدٌ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب ما یُقال فی الرکوع والسجود، ج: ۱، ص: ۱۹۱)

بندہ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب جبھی ہوتا ہے جبکہ وہ حالتِ سجود میں ہو اور خاص طور پر جوخشوع وخضوع اور عظمتِ باری تعالیٰ کے استحضار کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہوتا ہے اور اپنے دل سے ہر قسم کے غیر اللہ کو نکال کر دل کو پاک وصاف کر چکا ہوتا ہے تو پھر اس کے سجدے اگرچہ اس زمین پر ہوں مگر اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں اللہ کے بالکل سامنے سربسجود ہوں اور یہ زمین آسمان میں ہے اور وہ مقامِ شہود میں ہوتا ہے اور گویا کہ اس وقت بندہ اور خدا کے درمیان سے سارے حجابات اٹھ چکے ہوتے ہیں اور یہ محض خیالی ووہمی درجہ کی چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں پر خصوصی فضل فرماتے ہیں اور وہ مجاہدات کی بھٹی سے گذرتے ہیں تو ان کو یہ صفت درجۂ حقیقت میں حاصل ہوجاتی ہے اور اس صفت کا تذکرہ حدیثِ جبرئیل میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ کہ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ جیسے تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یہ اعلیٰ درجہ کا مقام ہے جسے مقامِ مشاہدہ کہتے ہیں، اور اگر اتنا نہ ہوسکے تو کم سے کم اتنا تو سوچو کہ وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں اور یہ مقامِ مراقبہ ہے۔

آہ! آج ہمارے سجدے

اب رہ گیا یہ ذہنی خلجان کہ سجدے تو ہم بھی کرتے ہیں مگر ہمیں یہ سب صفات حاصل نہیں اور نہ کوئی قرب کی حلاوت ولذت کا ادراک واحساس ہوتا ہے آخر کیا ہمارا سجدہ سجدہ نہیں ہے؟

اس سلسلہ میں یہ ذہن میں رکھنے کی چیز ہے کہ ایک تو سجدہ وہ ہے کہ سر کو زمین پر رکھ دیا مگر دل ودماغ مختلف قسم کے حسین چہروں اور نقشوں کی تصویروں میں ڈوبے ہوئے ہیں یا دولت وثروت، جاہ ومنصب اور سلطنت وحکومت کے مختلف بتوں کے اردگرد گھوم رہے ہیں اور مخلوقات سے طرح طرح کی امید وخوف کے درمیان اٹکے ہوئے ہیں تو گو کہ یہ سجدۂ صلوٰۃ ہے اور صحتِ صلوٰۃ کے لیے کافی ہے مگر اس میں کیا شک ہوسکتا ہے اور اس حقیقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ جس سجدہ میں زمین پر سر رکھنے کے ساتھ ساتھ دل ودماغ بھی متحضر ہوں اور دل ودماغ بھی اسی طرح بارگاہِ رب العزت کی عظمت کے سامنے جھکے ہوئے ہوں تو اس سجدہ کی حالت وتاثیر بالکل جداگانہ ہوگی ورنہ جب دل میں ہزاروں قسم کے غیر اللہ بھرے ہوئے ہوں تو پھر سجدہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس کو ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شعر میں یوں پیش کیا ہے کہ ؎

میں جو سر بہ سجدہ کبھی ہوا تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مختلف اقسام کے غیر اللہ جب دل میں رچے بسے ہوتے ہیں تو بس سر تو سجدہ میں پڑا ہوتا ہے مگر اس کے دل و دماغ اِدھر اُدھر کھوئے ہوئے رہتے ہیں تو گو کہ نماز ادا ہو جائے گی مگر ایسے شخص سے زمین بھی زبانِ حال سے یوں گویا ہوتی ہے کہ ارے غیر اللہ سے آشنا انسان تو پہلے دل سے اس کو نکال کر باہر کر پھر سجدہ کی حلاوت پالے اس کے بغیر تجھے اس سجدہ سے کچھ ملنے والا نہیں ہے جو قربِ خداوندی کی حلاوت اور جو سر بسجود ہونے کا مزہ مومن موحد کو نصیب ہوتا ہے وہ ایسے شخص کا حصہ کہاں ہو سکتا ہے۔

بس یہی وہ چیز ہے کہ جو ان دو سجدوں کے اثرات و نتائج میں فرق پیدا کر دیتی ہے اول سجدہ بارانِ رحمتِ خداوندی کا سبب ہوتا ہے اور مشامِ جان قربِ خداوندی کے انوار سے منور اور خوشبو سے معطر ہو کر مہکنے لگتے ہیں اور یہ سجدہ بندۂ مومن کے لیے دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی کا ضامن اور آلام و افکارِ دو جہاں سے حفاظت کا کفیل ہے اسی کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے شعر میں یوں پیش فرمایا ہے کہ ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ اٹھتی تھی
تڑپ رہے ہیں اسے آج منبر و محراب

ایذائے اولیاء اللہ، اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنا ہے

برق گرنا مگر رُخ بدل کر
آہ سنتا ہوں میں آشیاں میں

کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی محروم القسمت ہوتے ہیں اور ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جو نبیوں اور ولیوں کے دشمن ہوتے ہیں اور ان کو ستانے اور ان کی ایذاء کے درپے رہتے ہیں اور ان کے ظلم سے نہ عوام الناس بچتے اور نہ وہ اللہ والوں کا خیال کرتے ہیں جب کہ اس پر سخت وعید آئی ہے اور حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے کسی ولی کو ستانے اور ایذا پہنچانے پر اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اتنی سخت وعید ہے کہ پوری شریعت میں سوائے دو گناہوں کے تیسرے کسی بھی گناہ پر نہیں آئی ہے ایک تو سود کا مال کھانے اور استعمال کرنے پر اور دوسرے کسی خدا کے ولی کو ستانے اور تکلیف پہنچانے پر۔ چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

﴿قَالَ الْاَئِمَّۃُ لَیْسَ فِی الْمَعَاصِیْ مَنْ تَوَعَّدَ اللہُ اَرْبَابَھَا بِاَنَّہٗ مُحَارِبُہٗ اِلَّا ھٰذَا وَ اٰکِلَ الرِّبَا قَالَ تَعَالٰی فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللہِ وَرَسُوْلِہٖ وَھٰذَا یَدُلُّ عَلٰی مَا فِیْ ھَاتَیْنِ الْخَصْلَتَیْنِ مِنْ عِظَمِ الْخَطَرِ اِذْ مُحَارَبَۃُ اللہِ لِلْعَبْدِ تَدُلُّ عَلٰی سُوْءِ خَاتِمَتِہٖ لِاَنَّ مَنْ حَارَبَہُ اللہُ لَا یُفْلِحُ اَبَدًا﴾

(المرقاۃ، ج ۵، ص ۱۰۴، مطبوعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

خلاصہ یہ ہے کہ گناہوں میں اتنی سخت وعید والا گناہ کوئی بھی نہیں ہے اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں کس قدر خطرہ کی بات ہے کیونکہ خدا جب کسی سے جنگ کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا خاتمہ برا ہوگا اس لیے کہ خدا کا فریق جس سے خدا جنگ کر رہا ہو وہ کبھی بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا ہے اس لیے حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اے ظالم ذرا سنبھل اور غور کر تو جدھر ظلم کرنے چلا ہے یہ ان خدا کے بندوں کا آشیاں ہے جس میں وہ صبح وشام اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے آہیں بھرتے ہیں اور ایسے خدا ترسوں کے آشیانہ کو اجاڑ کر اپنی تباہی و بربادی کا سامان نہ کر اور اپنے ظلم کے رخ کو پھیر دے اور اس سے باز آجا۔

بصارت وبصیرت دو عظیم نعمتیں

عالمِ غیب کا یہ کرم ہے
چشمِ بینا دیا قلب و جاں میں

ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے میرے قلب و جان میں چشمِ بینا اور بصارت کی حفاظت سے بصیرتِ قلب عطا فرمائی ہے اور ظاہری آنکھوں کے ساتھ ساتھ باطنی آنکھیں بھی مرحمت فرمائی ہیں جو کہ اصل ہیں اور اہم ہیں اگر وہ نہ عطا ہوں تو پھر ان ظاہری آنکھوں کے ہونے کے باوجود انسان گویا کہ اندھا ہوتا ہے کیونکہ ان کو صحیح مقصد کے لیے استعمال نہیں کر پاتا ہے اور جس غرض ومقصد کے لیے یہ قوتیں عطا ہوتی ہیں اس کے خلاف استعمال ہونے کی وجہ سے بجائے نفع کے ضرر کا سامان ہوتی ہیں اور جب ممنوع اور حرام جگہوں سے بصارت کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ حرام خوشیاں اور لذتیں درآمد نہیں کی جاتی اور قدرتِ خداوندی کے مظاہر ومعالم پر نظر ڈال کر معرفتِ الٰہی حاصل کی جاتی ہے تو پھر اسے دل کی آنکھیں عطا ہوتی ہیں اور یہ ایسا تحفۂ الٰہی ہے کہ جب یہ مل جاتا ہے تو پھر اس کے لیے کائنات کا ذرہ ذرہ معرفتِ خداوندی میں اضافہ کا ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ہر شی میں اپنے مولیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اسی پر حضرت والا کا ایک دوسرا شعر ہے ۔

جب بصارت کی حفاظت سے بصیرت مل گئی
ہو کے نادیدہ بھی اس کی آنکھ نادیدہ نہیں

صاحبو! یوں تو سارا بدن اور بدن کے سارے اعضاء باری تعالیٰ کی عظیم نعمت ہیں، حق تعالیٰ نے تین اعضاء کو اپنی بڑی نعمتوں میں شمار فرمایا اور انسان کو اس کا احساس دلایا تا کہ وہ ان اعضاء کو مولیٰ کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۷۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تا کہ تم شکر کرو۔ (معارف القرآن، ج:۵،ص:۳۶۸)

اعضاء کے غلط استعمال پر دنیوی واخروی سزا

اور دوسری آیت میں ان کے استعمال کا طریقہ اور پھر اس کے خلاف ہونے پر باز پرس کیے جانے کی خبر بھی دے دی گئی ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾

(سورۃ بنی اسرآئیل، آیت:۳۶)

ترجمہ: اور جس بات کی تم کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل مت کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب سے (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی۔ (معارف القرآن، جلد:۵،ص:۴۶۹)

آنکھ اور کان کا استعمال کس کس کام میں کیا ہے اور بے دلیل بات کا خیال دل میں کیوں جمایا؟ اور پھر اسی کے مطابق اس کی سزا ہوگی جو آخرت میں ملے گی اور نقد سزا جو دنیا میں ملتی ہے وہ قرآن کی دوسری آیت میں مذکور ہے کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ان کے اعمال کے سبب ان کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے اور ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾

(سورۃ الحج، آیت:۴۶)

ترجمہ: آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۶،ص:۲۷۳)

اور دلوں کا اندھا ہونے اور آنکھوں پر پردہ پڑنے اور سمع وبصر پر مہر لگنے کی نوعیت احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں یہ ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں مسلسل لگا رہتا ہے حرام خواہشات اور لذات میں پڑا رہتا ہے حسین لڑکے لڑکیوں کے ساتھ حرام عشق بازی اور گانے باجوں کی حرام لذتوں میں پڑ کر اپنا دل بہلاتا رہتا ہے تو پھر دل پر سیاہ نکتے لگتے لگتے پورا دل بالکل سیاہ اور تاریک کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کے دل ودماغ میں قبولِ حق کی صلاحیت ہی ختم ہوجاتی ہے اور وہ بالکل ویسا ہوجاتا ہے جس کو قرآن نے یوں تعبیر فرمایا ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾

(سورۃ الاعراف، آیت:۱۷۹)

ترجمہ: ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۴،ص:۱۲۳)

اور اب نہ تو ان کے کان وآنکھ کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقعہ کو سن کر عبرت ونصیحت حاصل کرتے ہیں اور نہ ان کا دل کسی کی خیر خواہی ونصیحت کی باتوں کو قبول کرتا ہے بلکہ عقل ایسی الٹی ہوجاتی ہے کہ اسے دوست دشمن اور

دشمن دوست معلوم ہونے لگتا ہے اور اس کا کتنا ہی قریبی مخلص ومحسن دوست ہو مگر اب حق گوئی کی وجہ سے وہ اسے اپنا دشمن دکھائی دینا شروع ہوجاتا ہے بالفاظ مختصر یہ کہ مسخ الوجوہ تو نہیں لیکن مسخ القلوب کا نقد عذاب اس دنیا میں دے دیا جاتا ہے اور وہ زبانِ حال سے اپنے ہر مخلص خیر خواہ دوست کو یہ کہنے لگتا ہے کہ ؎

ناصحا! مت کر نصیحت دل میرا گھبرائے ہے
میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

ان آیات کو پیش کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ حضرت والا نے اس شعر میں جس بصیرت قلب کا تذکرہ فرمایا ہے وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے اور اس کا کسی کو مل جانا بہت بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہے اور جتنا قیمتی تحفہ ہوتا ہے اس کی حفاظت بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے بصیرت کی حفاظت کا اہم ہونا بھی ظاہر ہے جو زبان وکان اور قلب ونظر کی حفاظت پر موقوف ہے۔

بصیرتِ قلبی جملہ مسائل کا حل ہے

ان شاء اللہ اس بصیرتِ قلبی کی برکت سے مشکل سے مشکل مسائل آسان ہوجاتے ہیں اور کیسے ہی پیچیدہ اور نازک مسائل ہوں بڑی آسانی سے صحیح وغلط میں امتیاز ہوجاتا ہے اور دوست ودشمن کی صحیح پہچان ہوجاتی ہے اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نفس وشیطان ہمارے دشمن ہیں ان کی اتباع وپیروی باعثِ خسران وموجبِ حرمان ہے اور اللہ ورسول ہمارے دوست ہیں ان کی اطاعت واتباع ہماری سعادتِ ابدی اور فلاحِ دنیوی واخروی کی ضامن ہے اس کے لیے اللہ ورسول کے احکام واوامر پر امتثال والتزام اور نفس وشیطان کے مکروفریب سے اجتناب واحتراز آسان ہوجاتا ہے۔

اسی لیے مجدد تھانوی نوراللہ مرقدہ نے ایک جگہ پر ارشاد فرمایا کہ اس قلبی بصیرت کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ دل پر ایسے علوم اور اسرار وحکم وارد فرماتے ہیں اور ایسے حقائق علمیہ وکونیہ عطا ہوتے ہیں کہ حاملینِ علومِ ظاہرہ ان کو سن کر حیران اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور وہ کتابوں سے اخذ کیے ہوئے یا علماء سے سن کر حاصل کیے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت فیاضِ حقیقی علیم ذات کا فیضان ہوا کرتے ہیں جیسا کہ بہت سے اسلاف ان علوم کے حاملین گذرے ہیں۔

جامع شریعت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کھلا ہوا معجزہ ہے

انہیں میں سے ایک امت کے جلیل القدر عالم اور محدث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلبِ بینا پر ایسے اسرار ومعارف اور علوم وخزائن عطا فرمائے کہ انہوں نے پوری مفصل کتاب بنام ''حجۃ اللہ البالغۃ'' تصنیف فرمادی یہ کتاب علم اسرار الشریعۃ وحکمہا پر ایسی مفصل وجامع اور بے مثال کتاب ہے کہ یکجا

طور پر بمشکل ایسی کوئی دوسری کتاب ہوگی اور گویا اس کتاب کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ثابت کردیا کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ شریعت خود اپنی جگہ آپ کا ایک عظیم معجزہ ہے کیونکہ ایک انسان جو کہ امی لقب ہو اور کسی جامعہ ومدرسہ اور کسی یونیورسٹی اور کالج میں زیرِ تعلیم نہ رہا ہو اور اجتماعی وانفرادی طور پر کوئی اس کا معلم استاذ بھی نہ ہو لیکن اس کے باوجود اس نے ایسی جامع ومکمل شریعت اور اسرار وحکم سے لبریز مکمل نظامِ حیات عطا کردیا ہو یہ بدون اس کے ممکن نہیں ہے کہ وہ مرسل من اللہ اور مؤید من اللہ ہیں، اسی سے ہر منصف وعادل انسان یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ واقعی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم بلاشک اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور آپ کا دین وشریعت اس علیم وخبیر ذات کی دین ہے تو غرض یہ کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے یہ سارے علوم اسی قلب بیناء اور بصیرت خاصہ سے نکلے ہوئے ہیں اسی لیے یہ بڑی عظیم نعمت خداوندی ہے اور اس کا عطا ہوجانا اللہ تبارک وتعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔

تسلیم ورضا کا عظیم فائدہ

درسِ تسلیم و خونِ تمنا
ہے نہاں عشق کی داستاں میں

بندۂ مومن کے کمال ایمان کے اہم ترین وصف کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ اپنے مولیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہنا اور جس حال میں وہ رکھیں اسی حال کو اپنے لئے نافع اور مفید سمجھنا اور اپنی تمام تجویزوں کو چھوڑ کر اپنے جملہ امور ومسائل اللہ تبارک وتعالیٰ کو سونپ دینا اسی کو تسلیم ورضا کہتے ہیں اور یہی تفویض وتوکل ہے جس کے متعلق اتنی بات کافی ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بندہ کو کسی طرح کی بدنی ومالی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تو اگر وہ اس پر راضی وخوش رہتا ہے تو پھر حق تعالیٰ بھی اس سے راضی ہوجاتے ہیں اور جو وہ اظہار ناراضگی کرتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس پر ناراض ہوجاتے ہیں:

﴿إِنَّ اللهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ﴾

(سننُ الترمذی، کتابُ الزهد، باب الصبر علی البلاء، ج: ۲، ص: ۶۵)

تو حضرت والا اس شعر میں تسلیم ورضا اور تفویض وتوکل کی تعلیم دے رہے ہیں۔

تکمیلِ عشق اور خونِ تمنا

اور دوسری بات کہ عشق ومحبت کی تکمیل بغیر حسرتوں کی پامالی اور تمناؤں کا خون کئے ہوئے ممکن نہیں ہے جب تک کہ انسان تمام حرام وممنوع کاموں سے پوری ہمت کے ساتھ اپنی نفسانی خواہشات اور آرزوؤں اور ناجائز تعلقات ودوستیوں کو پامال نہیں کرتا ہے تب تک وہ سچا خدا کا عاشق نہیں کہلائے گا اور محبت خداوندی کی داستاں بغیر

خون حسرت پئے ہوئے مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ گناہ اور حرام لذتیں انسان کو طبعی طور پر مرغوب رکھی گئی ہیں اور ان سے وقتی لذت ولطف ملنا یہ اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن ایک عاشق کیلئے جب حکم الٰہی سامنے آتا ہے تو اس پر کتنا ہی زور پڑے مگر وہ اسی وقت سب کچھ چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی عقلی دلیل

اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تسلیم ورضا کے مضمون کو بڑے پیارے معقول انداز سے پیش فرمایا ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں تو جب وہ حاکم اور ہم محکوم ہیں اور وہ مالک اور ہم مملوک ہیں تو اللہ تعالیٰ کو مکمل اختیار ہے کہ وہ جیسے چاہیں تصرف کریں، ہمیں کسی بھی طرح کا کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی پریشان اور حیران ہونے کی ضرورت ہے اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں تو ان کی حکمتِ کاملہ وبالغہ کا مقتضاء یہ ہے کہ ضرور اس پیش آمدہ حالت میں ہمارے لئے کوئی بھلائی اور خیر پوشیدہ ہوگی ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی شانِ حکیمی کے خلاف ہوگا اور پھر حضرت تھانوی نے اسی کو بڑے معقول ومنطقی انداز سے مدلل طور پر ثابت کیا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ دیکھو! جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر کوئی حالت پیش آتی ہے تو عقلی طور پر اس میں چار احتمال ہوتے ہیں۔(۱) یا تو یہ کہ ہمیں کسی مصیبت اور تکلیف وپریشانی میں ڈال کر اللہ تعالیٰ سو فیصد اس سے متنفع ہونا چاہتے ہیں۔(۲) یا بندہ کو سو فیصد نفع پہنچانا مقصود ہے۔(۳) یا پھر اس میں آدھا بندہ کا اور آدھا اللہ تعالیٰ کا نفع ہے۔(۴) اور یا تو کسی کا بھی کوئی نفع نہیں ہے۔ تو اس میں عقلی طور پر یہی چار احتمال ہیں۔

اب ہر ایک احتمال پر نظر ڈالیں سو اول تو اس لئے محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اِنتفاع باحدٍ سے بالکل پاک ہے ورنہ احتیاج الی الغیر لازم آتی ہے، جو باطل ہے۔ صورتِ ثالثہ بھی اسی دلیل سے باطل وممنوع ہے اور صورتِ رابعہ اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا لغو عمل کیا کہ جس میں کسی کا بھی نفع نہیں ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کے منافی ہے۔ لہٰذا دوسری صورت ہی مقرر ومتعین ہے کہ ضرور اس میں صرف بندہ ہی کا نفع ہے۔ تو عقلی طور پر بھی ثابت ہوتا ہے کہ مصیبت میں بندہ کو اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا چاہیے اور یہی عقیدہ رکھے کہ ضرور میرے مولیٰ کی طرف سے اس کے اندر میرے لئے کوئی خیر ونفع ہے، خواہ مجھے معلوم ہو یا نہ ہو۔ اسی کو حضرت شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی بڑے پیارے انداز میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ؎

بے کیفی میں بھی ہم نے تو اک کیف مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اثقل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے چلتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھنے کی حکمت

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس موقعہ پر بڑی ہی پیاری اور عمدہ تعلیم دی ہے اور نہایت صبر و تسلی اور سکون و اطمینان کا جملہ ہمیں عنایت کیا ہے کہ جب کوئی حادثہ پیش آئے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھو کیونکہ اس جملہ کے مفہوم میں تسلیم و رضا کا درس ہے کہ جیسے میرے ساتھ یہ حالت پیش آئی ہے تو یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور چونکہ ہم سب حق سبحانہ وتعالیٰ کے ہیں تو مولیٰ کو کامل اختیار ہے کہ وہ جو چاہے تصرف کرے اس لئے اے خدا میں تیرے فیصلے پر کوئی چوں و چراں نہیں کرتا ہوں بلکہ مکمل طور پر راضی اور خوش ہوں اور اسی پر یہ بھی انعام ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ مَاذَا قَالَ عَبْدِیْ میرے بندے نے اس مصیبت کے موقعہ پر کیا کہا تو فرشتے کہتے ہیں کہ حَمِدَ وَ اسْتَرْجَعَ کہ اے اللہ! آپ کی تعریف بیان کی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا تو اس پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ اسی طرح تسلیم و رضا کے مضمون پر مشتمل کلمہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ہے۔ جب بندۂ مومن زمین پر رہتے ہوئے اس کو پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ آسمان میں اس کے تذکرے کرتے ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿اَسْلَمَ عَبْدِیْ وَاسْتَسْلَمَ ای انقاد و ترک العناد ... وفوّض امور الکائنات الی اللہ﴾

(المرقاۃ، ج: ۵، ص: ۱۵۰، مطبوعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

یعنی میرا بندہ میرے سامنے جھک گیا۔ اور مخالفت ترک کر کے میرا مطیع ہو گیا۔ اور اپنے تمام امور میرے حوالے کر دیئے۔ اور یہی تسلیم و رضا کی حقیقت ہے اور اگر بحیثیت بندہ ہونے کے عقلاً اس پر غور کیا جائے تو اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ جو مالک و آقا ہمیں عمر بھر عزت و راحت چین و سکون کے حالات میں رکھتا ہو اگر وہ کبھی ناموافق حالات لے آئے تو بندگی کا تقاضہ ہے کہ ہم اس پر بھی راضی رہیں۔ جیسے میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ایک واقعہ سنایا کہ ایک غلام تھا اس کے آقا نے ایک دن اسے کڑوی ککڑی کھانے کیلئے پیش کی اس غلام نے بڑے شوق و ذوق کے ساتھ اس کڑوی ککڑی کو کھا لیا۔ تو آقا نے بڑے تعجب سے دریافت کیا کہ یہ ککڑی کڑوی تھی تم نے بڑے اطمینان اور شوق و ذوق سے اس کو کیسے کھا لیا؟ تو اس غلام نے بڑا دانشمندانہ جواب دیا کہ جو آقا مجھے ہمیشہ میٹھی ککڑی کھلاتا رہا ہو۔ اور ایک دن وہ کڑوی ککڑی پیش کر دے اور میں اس پر منہ بناؤں تو یہ غلامی اور وفاداری کے خلاف ہے۔

اس لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنے غلام سے دریافت کیا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ اور تم کیا کھانا پینا پہننا پسند کرو گے۔ اس پر غلام نے جواب دیا کہ آقا! غلاموں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ جس نام سے ان کا آقا ان کو پکارے وہی ان کا نام ہے اور جو کھانا پینا دیدے، وہی ان کا کھانا ہے۔ ان کی اپنی کوئی تجویز نہیں ہوتی۔ تو حضرت حسن بصری بے ہوش ہو گئے اور جب ہوش آیا تو کہنے لگے کہ اے غلام! تو نے مجھے آج غلامی اور بندگی سکھادی۔

صاحبو! ان سب واقعات اور دلائل سے میرا مقصود یہ ہے کہ بندہ اگر یہ سوچے کہ مجھ پر جو بھی حالات آئے موافق ہوں یا ناموافق وہ خود نہیں آئے بلکہ وہ میرے محبوب علیم وحکیم اللہ کی طرف سے لائے گئے ہیں۔

تو خود اس کا دل تسلیم ورضاء کے جوہر سے مالا مال ہوجائے گا اور وہ ہر حال میں نہایت فرحاں وشاداں رہے گا نہ وہ کسی طرح کی مایوسی واداسی کا شکار ہوگا اور نہ وہ کسی طرح کے ٹینشن (Tension) اور ڈیپریشن (Depression) میں بیمار ہوگا اور وہ زبان حال سے ہر گھڑی یوں کہے گا جس کو حضرت والا نے اس شعر میں بیان فرمایا۔

کیف تسلیم ورضاء سے ہے بہارِ بے خزاں
صدمہ و غم میں بھی اختؔر روح رنجیدہ نہیں

کیوں کہ مومن کا کام ہر گھڑی باری تعالیٰ کے سامنے سرنگوں رہنا ہے اور اپنے ہر معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے اور ہر خوشی اور غم میں اسی کو پکارنا اور اسی کے در پر حاضری دینا ہے خواہ در کھلتا ہوا نظر آئے یا نہ آئے خواہ ہماری فہم وسمجھ ان واقعات وحالات کی حکمتوں سے باخبر ہو یا نہ ہو جیسا کہ اسی مضمون کو خواجہ صاحب نے یوں بیان کیا ہے ۔

ضربیں کسی کے نام کی دل پہ یونہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ در یونہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اس پر ہو کیوں تیری نظر
تو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

اور تمام انبیاء کرام اور اولیاء عظام کا یہی دستور حیات رہا ہے۔

لذت قرب بے انتہاء کو
کس طرح لائے اخترؔ زباں میں

ساری کائنات کی لذتیں اور سارے عالم کے حسن وجمال بلکہ دونوں جہان کی حسیناؤں کے حسن کی چمک دمک کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی راہ طے کرکے اللہ کو پاتا ہے اور اس کے قرب کی لذت سے آشنا ہوتا ہے تو دن بدن اسے اس میں ترقی اور اضافہ نظر آتا رہتا ہے اور جب وہ پہلے کے مقابلے میں دوسرے مقام قرب کی لذت چکھتا ہے تو اس سے پہلا مقام اسے بے کیف محسوس ہونے لگتا ہے اور یہ سلسلہ الی النہایہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ انسان دنیا سے اسی حال میں رخصت ہوتا ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اس لیے حضرت والا نے قرب بے انتہا کا لفظ استعمال فرمایا یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ جو اللہ کے قرب کی اعلیٰ منازل طے

کیے ہوئے تھے وہ بھی اپنی مناجات اور دعاؤں میں اللہ کے سامنے یونہی فریاد کناں ہوتے ہیں کہ خدایا ساری عمر غفلت میں گزری اور مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ وَمَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ کہہ کر اپنے عجز وقصور کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جن مقاماتِ قرب پر رہتے ہیں ان کی لذتوں میں وہ ایسے محو اور کھوئے رہتے ہیں کہ دنیا انہیں ایک ویران خانہ معلوم ہوتی ہے یہ اس کیف وسرور اور لذت وفرحت کے سمندر میں تیرتے ہیں کہ لغتیں ان کی تعبیر سے تنگ اور قاصر ہیں، لغت میں یہ دم نہیں کہ وہ ان کے لذتِ قرب کو بیان کر سکے اور زبان وقلم سے اس کو سمجھایا جاسکے۔ اسی لیے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے فرمایا کہ میری زبان اس قرب بے انتہا کی لذت کے بیان سے قاصر وعاجز ہے۔

آپ کو پا گیا اپنی جاں میں

ذکر سے جب ملا نور جاں میں — سینکڑوں جاں ملی میری جاں میں
چار سو ان کی نسبت کی خوشبو — پھیل جاتی ہے سارے جہاں میں
کس طرح سے چھپاؤں محبت — راز ظاہر ہے آہ و فغاں میں
چشم غماز ہے دردِ نسبت — عشق مجبور ہے گو بیاں میں
نیم جاں کر دیا حسرتوں نے — رہ کے صحرا میں ہوں گلستاں میں
آپ کی راہ میں جان دے کر — آپ کو پا گیا اپنی جاں میں
یوں تو دنیا سے جانا ہے مجھ کو — کام کچھ نیک کر لوں جہاں میں
تیری توفیق کا آسرا ہے — ورنہ رکھا ہے کیا خاکداں میں
مثلِ خورشید چمکا دے یاربّ — دردِ مخفی ہے جو میری جاں میں
تیری رحمت کے صدقے میں اختر — کیا عجب ہوگا باغِ جناں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ نسبت: اللہ تعالیٰ کو بندے سے اور بندے کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جانا۔ آہ وفغاں: اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا اپنے گناہوں پر ندامت سے رونا۔ چشمِ غمّاز: ......۔ نیم جاں: آدھی جاں۔ خاکداں: ......۔ مثلِ خورشید: سورج کی طرح۔ مخفی: پوشید۔ باغ جناں: ......۔

ذکرِ قلبی حیاتِ حقیقی کا ضامن ہے

ذکر سے جب ملا نورِ جاں میں
سینکڑوں جاں ملی میری جاں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی حیات کا بقاء جسم اور روح کی سلامتی پر رکھا ہے اگر ان دونوں میں سے کسی ایک میں بگاڑ اور خرابی پیدا ہوجائے تو وہ انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جس طرح جسم کی بقاء اور سلامتی کے لیے اس کا امراضِ جسمانی سے محفوظ رکھنا ضروری ہے اسی طرح قلب اور روح کی سلامتی اور صحت کے لیے ان کو بھی امراضِ روحانی سے محفوظ رکھنا ضروری ہے پھر جسم کی طاقت اور قوت کے لیے جس طرح غذائے جسمانی کی ضرورت ہے اسی طرح روح کی قوت اور طاقت اور صفائی ستھرائی کے لیے روحانی غذا کی ضرورت ہے حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ صَقَالَةٌ وَصَقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللهِ﴾

(المشكوة، باب ذكر الله عزّوجلّ والتقرّب اليه، ص: ۱۹۹)

ہر چیز کے لیے اس کو صاف کرنے اور زنگ دور کرنے کے لیے کوئی چیز ہوتی ہے اسی طرح دل کا زنگ اور میل کچیل دور کرنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے اور دل سے ظلمت وتاریکی دور کرکے اسے منور اور روشن کرنے کے لیے اللہ کی یاد اور اس کا ذکر لازم اور ضروری ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان کے دل پر چپکا اور جما رہتا ہے لیکن جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب غافل ہوتا ہے تو پھر وسوسہ ڈالنا شروع کردیتا ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلشَّيْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَكَرَ اللهَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ﴾

(المشكوة، باب ذكر الله عزّوجلّ والتقرّب اليه، ص: ۱۹۹)

اسی مضمون کو مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہٗ یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ خود جسم کی صحت وقوت کا دارومدار روح کے نشاط اور سرور پر ہے تو جب اللہ کی یاد سے روح منور اور روشن ہوتی ہے اور دل مسرور رہتا ہے تو اس کے اثرات دل ودماغ کے ساتھ ساتھ بدنی ظاہری صحت پر بھی پڑتے ہیں۔

گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ذکر جس طرح قلبی نشاط وسرور اور روحانی قوت وطاقت کا سبب ہے ٹھیک اسی طرح جسمانی قوت وطاقت کے لیے بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اسی لیے آج کل ڈاکٹرز اور اطباء ذہنی ٹینشن (Tension) اور دماغی الجھنوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے ڈیپریشن (Depression) اور اداسی ومایوسی کو

بڑی تعداد میں جسمانی مہلک امراض کا سبب قرار دے رہے ہیں اور دنیا بھر میں ایسے مریضوں کی تعداد بے شمار پائی جاتی ہے جن کو لاحق ہونے والی خطرناک نوعیت کی بیماریوں کا سبب صرف اور صرف ذہنی ٹینشن (Tension) اور ڈیپریشن (Depression) ہے جو کہ قلب وروح کو اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دلوں کے چین وسکون کو اور دنیوی واخروی بالطف زندگی کو صرف اپنی یاد میں منحصر کیا ہے بس اسی مضمون کو حضرت والا اس شعر میں بیان فرمارہے ہیں کہ جب اللہ کی یاد سے میرے قلب وجگر روشن ہوئے اور بدن کے رگ وریشے میں انوارِ ذکر سرایت کر گئے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھے ہر ہر آن ہر ہر گھڑی ایک نئی زندگی کا لطف محسوس ہورہا ہے اور نئی حیات عطا ہورہی ہے اور ہر ملنے والی حیات پہلی حیات سے زیادہ بالطف اور لذیذ تر ہے۔

نسبت کی خوشبو خود مہک اٹھتی ہے

چار سو ان کی نسبت کی خوشبو
پھیل جاتی ہے سارے جہاں میں

جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو اپنا خصوصی قرب اور نسبت ولایت خاصہ عطا فرما کر اپنا محبوب بناتے ہیں تو اس بندے کی خلوت وجلوت یادِ الٰہی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور اس کی ایک گھڑی بھی اللہ سے غفلت میں نہیں گزرتی اور وہ زندگی کی تمام خواہشات اور آرزوئیں کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان کر ڈالتا ہے اور اس کے دل ودماغ میں اللہ تعالیٰ کی یاد رچ بس جاتی ہے اور اس کے قلب وجگر اللہ تعالیٰ کی نسبتِ خاصہ کی خوشبو سے معطر ہوجاتے ہیں اور اس کی خلوتیں جلوتوں کی طرح یادِ الٰہی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ ٹھیک اسی طرح اس کی نسبت کی خوشبو سارے عالم میں پھیلا دیتے ہیں اور ہر چہار اطراف عالم میں رہنے اور بسنے والے اس کی اس خوشبو سے معطر ہوجاتے ہیں جیسا کہ ظاہری خوشبو اپنے اردگرد رہنے والوں کو معطر کرنے میں کسی تقریر وبیان اور ایڈوٹائز (Advertise) کی محتاج نہیں ہوتی۔

ہائے جس دل نے پیا خون تمنا برسوں
اس کی خوشبو سے یہ کافر بھی مسلماں ہوں گے

مقبولیتِ اہل اللہ کا راز

اسی مضمون کو حضرت نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ قَالَ فَیُحِبُّهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللهَ یُحِبُّ فُلَانًا

فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيْلَ فَيَقُوْلُ اِنِّيْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَيُبْغِضُهُ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَيُبْغِضُوْنَهُ ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِي الْاَرْضِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ الادب، باب اذا احب اللہ عبدا، ج: ۲، ص: ۳۳۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو محبوب بناتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم فلاں شخص سے محبت رکھتے ہیں تم بھی اس شخص سے محبت رکھو پس جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر جبرئیل علیہ السلام آسمان میں نداء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو چاہتے ہیں تم سب اس سے محبت رکھو سو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر اہل زمین میں اس شخص کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کو کسی شخص سے بغض ہوتا ہے تو اسی ترتیبِ مذکور سے اہلِ زمین کے قلوب تک اس کی مبغوضیت آجاتی ہے روایت کیا اس کو مسلم نے اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ جب بندے کو اللہ تعالیٰ کا قرب اور رضاء وقبول مل جاتا ہے تو پھر اہلِ زمین کے قلوب میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے اور پھر لوگ بلا تفریق قوم ووطن اور بلا امتیاز رنگ ونسل اس سے اللہ کی محبت سیکھتے ہیں اور یہ صفت بدرجہ اتم واکمل سب سے پہلے ہمارے پیغمبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی کہ آپ کی خوشبو مکہ سے مدینہ اور پھر وہاں سے مشرق ومغرب، شمال وجنوب تک پھیل گئی۔

محبت کی ترجمانی آہ وفغاں کی زبانی

کس طرح سے چھپاؤں محبت
راز ظاہر ہے آہ و فغاں میں

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے دل کو اپنا دردِ محبت عطا فرماتے ہیں تو پھر اس کی آہ وبکاء اور گریہ وزاری کی صورت میں دل میں چھپا ہوا دردِ محبت ظاہر فرما دیتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جب بیمار کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور ڈاکٹر اس سے اس کا حال پوچھتا ہے تو اسے اپنا حال بتانے کے لیے کسی تقریر وبیان کی مشق اور پریکٹس (Practice) کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کا درد اور تکلیف خود اسے درد کا بیان سکھا دیتا ہے اور اس کی آہ وبکاء اور رنج وغم دیکھنے والے پر اس کی حالت کی ترجمانی کرتا ہے تو اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت کا غم جس دل میں ہوتا ہے تو وہ اس کی آہ وفغاں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے حضرت والا نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم جب دل میں راسخ ہوتا ہے اور اس کا دل قرب ومعرفت کی تجلیات وانوار سے معمور ہوتا ہے تو یہ انوارات چہرے پر چمکنے اور آنکھوں سے چھلکنے لگتے ہیں خود چھپانے سے بھی چھپتے نہیں بقول سید جگر مرادآبادی مرحوم۔

لاکھوں میں جگر اس نے پہچان لیا تم کو
چھپتی ہے چھپائے سے کب آنکھ محبت کی

جن کے دلوں میں قساوت اور سختی پائی جاتی ہے اور وہ دردِ محبت خداوندی سے آشنا نہیں ہوتے وہ آہ و فغاں اور گریہ وزاری کی حلاوت سے بھی محروم رہتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور اس سے محرومی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مقامِ مذمت میں ذکر فرمایا ہے۔

آنکھوں کا خشک ہونا قساوتِ قلبی کی علامت ہے

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۷۴)

ترجمہ: پھر تمہارے دل سخت ہوگئے اس کے بعد، سو وہ ہوگئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہے نہریں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے۔

حضرت مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور افادہ مقصود نہایت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے یعنی بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہوجاتی ہیں جن سے مخلوق خدا فائدہ اٹھاتی ہے اور ان یہودیوں کے دل ایسے بھی نہیں کہ مخلوق خدا کی مصیبت وتکلیف میں پگھل جائیں اور بعض پتھروں میں ان سے کم تاثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے یہ پتھر بنسبت اول کے کم نرم ہوا اور ان کے قلوب درجہ دوم کے ان پتھروں سے بھی سخت ہیں اور بعض پتھروں میں گو اس درجہ کا اثر نہیں مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے کہ خوف خدا سے نیچے گر آتے ہیں گو درجہ میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہے مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین جذب وانفعال بھی نہیں۔ (معارف القرآن، ج:۱، ص:۲۴۸)

اور مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ج:۱، ص:۹۷ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہودیوں کے دلوں کی قساوت کو ذکر فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کو منع فرماتے ہیں کہ کہیں تمہاری حالت ان کی طرح نہ ہوجائے اور پھر آگے ایک روایت مرفوعاً نقل کی ہے:

﴿اَرْبَعَةٌ مِّنَ الشَّقَآءِ: جُمُوْدُ الْعَيْنِ، وَقَسْوَةُ الْقَلْبِ، وَطُوْلُ الْاَمَلِ، وَالْحِرْصُ عَلَى الدُّنْيَا﴾

(فتح الباری، کتاب الرقاق، باب فی الأمل وطوله، ج:۱۱، ص:۲۳۷، دار المعرفة، بیروت)

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت ہے کہ چار چیزیں شقاوت سے ہیں (۱) آنکھوں کا خشک

ہو جانا یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنکھوں سے آنسو نہ نکلے (۲) دل کا سخت ہو جانا یعنی کسی کی کیسی ہی مصیبت وتکلیف دیکھ کر دل میں کوئی اثر نہ ہو اور کوئی وعظ ونصیحت دل پر اثر انداز نہ ہو (۳) امیدوں کا لمبا ہو جانا یعنی دنیا سے متعلق طویل منصوبے اور مختلف نوع کی لمبی امیدیں اور پلاننگ (Planning) میں لگے رہنا مال ودولت جاہ ومنصب کے فروغ اور ترقی کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام بنانا (۴) دنیا کی حرص وطمع یعنی ہر وقت اس کی حرص و ہوس اور فکر ولگن اور دھن اور دھیان میں لگے رہنا۔

صاحبو! ان آیات واحادیث سے معلوم ہوا کہ رقتِ قلبی اور آہ وزاری گریہ وبکاء بارگاہِ الٰہی میں بندۂ مومن کی سعادت اور نیک بختی کی علامت اور نشانی ہے اور دل میں محبتِ الٰہی کے رچ بس جانے اور نسبت مع اللہ کے راسخ ہو جانے کی پہچان ہے۔

محبت کی غماز آنکھیں

چشم غماز ہے درد نسبت
عشق مجبور ہے گو بیاں میں

ارشاد فرماتے ہیں کہ آنکھوں سے نکلنے والا آنسو دل میں چھپے ہوئے درد محبت کا ترجمان ہے اور جب دنیا میں بھی کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو وہ اس کی یاد اور اس کے تذکرے عنوان بعنوان کرنے پر مجبور ہوتا ہے اسی لیے عربی کا مقولہ ہے مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ یعنی جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کے تذکرے کے لیے بے قرار اور مجبور ہوتا ہے اور بہانے ڈھونڈتا ہے تاکہ بار بار میں اپنے محبوب کا تذکرہ کروں ٹھیک اسی طرح وہ لوگ جو اپنے سینوں میں اللہ کی محبت سے لبریز دل رکھتے ہیں وہ کسی بھی طرح کی محفل ومجلس میں ہوں اور کیسی ہی حالت اور موقعہ ہو وہ اپنے محبوب اللہ کا تذکرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور کسی نہ کسی عنوان سے محفل کے رنگ کو وہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں اور پوری محفل کو اپنے محبوب کے تذکرے کی خوشبو سے مہکا دیتے ہیں اسی کو عارف ہندی حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کہا ہے ؎

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگ محفل دیکھ لیتے ہیں

صحرا میں گلستان کا مزہ

نیم جاں کر دیا حسرتوں نے
رہ کے صحرا میں ہوں گلستاں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ کو غفلتوں کے ساتھ جینا اور بے خوف ہو کر دنیا کے عیش وعشرت میں پڑ جانا پسند نہیں ہے۔ ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْحَبْرَ السَّمِیْنَ﴾

(المرقاۃ، باب صلوۃ اللیل، ج ۳، ص ۱۱۲، مطبوعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے عالم کو جو خوفِ آخرت سے بے خوف اور فکرِ عقبیٰ سے بے فکر ہوکر زندگی گزارتا ہے اوراس کی وجہ سے اس کے بدن پر موٹاپا آتا ہے تو ایسا عالم خدا کو محبوب نہیں کیوں کہ جب انسان ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کے احکام کا خیال رکھ کر اور اپنی حرام آرزوؤں اور ناجائز تمناؤں کا خون کرکے چلتا ہے تو گو کہ اس کے بدن پر موٹاپا نہ ہو لیکن اس کی روح نہایت طاقتور اور مضبوط ہوتی ہے تو ظاہری طور پر تو وہ شخص نیم جان ہوتا ہے مگر اپنے باطن سے وہ سیکڑوں جان والوں سے زیادہ قوی اور مضبوط رہتا ہے اسی لیے وہ صحرا و جنگل میں رہ کر گلستاں کے مزے پاتا ہے اوراس کے مشامِ جاں حق تعالیٰ کی محبت ونسبت کی خوشبو سے معطر رہتے ہیں اوراس کے دل ودماغ کو اللہ تعالیٰ ایسا گلستاں بنادیتے ہیں جس میں اس کی یادوں کی بہاریں ہر وقت آتی رہتی ہیں اور اسے کبھی خزاں لاحق نہیں ہوتی بظاہر ایسے شخص کے پاس جسمانی عیش وعشرت کے سامان فراوانی کے ساتھ موجود نہیں ہوتے اور صورتاً اہلِ دنیا کی نگاہوں میں وہ غموں اور حسرتوں والی زندگی گذارتا ہے لیکن اہلِ حقیقت کی نگاہ میں وہ بڑی پُرکیف زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔

قلبِ مومن کی تجلیاتِ الٰہیہ

آپ کی راہ میں جان دے کر
آپ کو پاگیا اپنی جاں میں

حدیثِ قدسی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَا وَسِعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ یَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ﴾

(المرقاۃ، ج ۱، ص ۳۹۹، مطبوعۃ المکتبۃ الحقانیۃ)

مجھ کو نہ میری زمین سموسکی اور نہ میرا آسمان لیکن مجھے میرے مومن بندے کے دل نے سمالیا۔ جب بندہ مومن اپنی نفسانی خواہشات اور حرام آرزوؤں اور تمناؤں کو اپنے مالک کی مرضی پر فدا کرتا ہے اور اپنے دلی جذبات اللہ تعالیٰ کے حکم سے دباتا ہے اور دل کی اُمنگوں کو شریعت وسنت کے سانچے میں ڈھال کر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے دل میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی اور کو جگہ نہیں دیتا نہ وہاں دنیا کے مال ومتاع کی رغبت و حاجت باقی رہتی ہے اور نہ نام ونمود کی خواہش وتمنا دل میں باقی رہتی ہے بلکہ صرف اپنے مولیٰ کو راضی کرنے کی فکر لگی رہتی ہے اور غیر سے کسی نوع کا کوئی تعلق قائم نہیں رہتا تو پھر اللہ اس دل کو اپنا مسکن بناتے ہیں اور مسکن اس طرح بناتے ہیں کہ وہ اپنی جان میں اپنے مولیٰ کو ٹھیک اسی طرح محسوس کرتا ہے جیسا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں ذکر کیا۔

اللہ تعالیٰ کے کان اور آنکھ بن جانے کا مطلب

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ج ۲، ص ۹۶۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص میرے مقبول بندے سے عداوت کرے میں اس کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں اور میرا بندہ مجھ سے کسی ایسے ذریعے سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک اداءِ فرائض سے زیادہ محبوب ہو اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں پھر جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اس کا پاؤں ہوجاتا ہوں جس وہ چلتا ہے مطلب یہ کہ اکثر اس کے ان جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا اِلَّا بِعَارِضٍ لَا یَدُوْمُ۔

درحقیقت ان اعضا و جوارح کا اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہوجانا اور منشاءِ خداوندی اور مرضی الٰہی کے خلاف کچھ ہوجانے سے دل کا بے چین اور پریشان ہوجانا یہی حقیقت ہے اس درجہ ولایت کی کہ جس کو صوفیاء اپنی اصطلاح میں نسبت سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی حدیث سے ہم اس مسئلے پر بھی استدلال کرسکتے ہیں کہ اولیاء اللہ اگرچہ معصوم نہیں ہوتے لیکن محفوظ ہوتے ہیں یعنی عصمت تو انبیاء کے ساتھ خاص ہے لیکن حفاظت کا وعدہ اولیاء اللہ سے بھی ہے جیسا کہ اس حدیث کے ترجمہ وتشریح سے ظاہر ہوا اور اسی کی تعبیر حضرت والا نے اپنے دوسرے ایک شعر میں یوں فرمائی ہے ؎

وہ شاہِ جہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کے پائے

اور جب سر سے پیر تک تمام اعضاء بدنیہ ظاہرہ و باطنہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و اطاعت میں ڈوب جائیں اور پلک جھپکنے کے برابر بھی غفلت و معصیت کا شکار نہ ہوں اور یا ہوتے بھی ہوں تو معاً ندامت و توبہ کا مزاج بن جائے تو سمجھ لو کہ مولیٰ دل میں آچکے ہیں اسی کو حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شعر میں فرمایا ؎

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

دنیا ایک مسافر خانہ ہے

یوں تو دنیا سے جانا ہے مجھ کو
کام کچھ نیک کر لوں جہاں میں

اس شعر میں حضرت والا یہ مضمون بیان فرمارہے ہیں کہ دنیا سے ایک دن مر کے جانا ہے اور یہ دنیا درحقیقت مسافر خانہ ہے یہاں کوئی مستقل ٹھہرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ یہاں جو بھی آیا ہے وہ اگلی زندگی کے لیے کچھ عبادات وطاعات اور معرفت ومحبت خداوندی کا ذخیرہ لے کر ساتھ جانے کے لیے آیا ہے ہر دم ہم دنیا سے دور اور آخرت سے قریب ہورہے ہیں اور دنیا عمل کا گھر ہے حساب کا نہیں اور آخرت حساب کا گھر ہے عمل کا نہیں اس لیے دنیا میں انسان رہتے ہوئے آخرت کے لیے کچھ نیک کام کر لے یہی اس کی سمجھداری اور عقلمندی ہے اور اللہ تعالیٰ دنیا میں نیک کاموں میں اسی کو وابستہ کرتے اور لگاتے ہیں جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت سے پہلے دنیا میں بندے کو نیک کاموں کی توفیق ملنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بندہ بارگاہِ الٰہی میں پسندیدہ ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا اسْتَعْمَلَہٗ فَقِیْلَ کَیْفَ یَسْتَعْمِلُہٗ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ یُوَفِّقُہٗ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء ان اللہ کتب کتابا، ج ۲، ص: ۳۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے بھلائی کے کام کراتا ہے۔ پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ بھلائی کے کام کیسے کراتا ہے یارسول اللہ۔ فرمایا موت سے پہلے اس کو عمل نیک کی توفیق مرحمت فرماتا ہے۔

تو حضرت والا کے اس شعر میں جہاں دنیا کے زوال اور فنائیت کے استحضار کی تعلیم ہے وہیں دوسرے مصرعے میں دنیا کا صحیح مصرف اور اس دنیوی حیات کو گذارنے کی صحیح صورت بھی مذکور ہے کہ دنیا کو صرف نیک کاموں کی کھیتی بنانا چاہیے جو لوگ دنیا میں رہ کر صرف اپنی دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

دنیا کی حقیقت کی ایک مثال

ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کراچی کے شہر کا سفر کرنے والا مسافر دوران سفر ہی زیب وزینت اور آرائش وزیبائش کی چیزوں میں اپنا سارا راس المال خرچ کر کے سعودی عرب پہنچے اور وہاں رہنے کے لیے اس نے پیشگی کوئی انتظام نہ کیا ہو اور نہ کچھ اپنے ساتھ لے گیا اور نہ وہاں اس کا کوئی یار و مددگار ہو نہ رشتہ دار موجود ہو تو ظاہر ہے ایسے شخص کی مشکلات اور پریشانیوں کا کوئی علاج ممکن نہ ہوگا ٹھیک اسی طرح جو شخص دنیا میں رہ کر صرف دنیا کی فکر

میں لگا رہا ہو اور آخرت کے لیے پیشگی کچھ نہ بھیجا ہو تو پھر اس شخص کی حسرت وافسوس اور تکلیف وپریشانی کی کوئی انتہا نہ ہوگی اور وہاں پہنچ کر وہ یوں کہے گا کہ کاش میں اعمال کا ایک عظیم توشہ یہاں لایا ہوتا وہ ایسے وقت میں بہت کچھ تمنا کرے گا جبکہ وہ تمنا اس کو نافع نہ ہوگی جیسا کہ قرآن انسانوں کی حسرت وافسوس کو یوں نقل کرتا ہے یٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡبِ اللّٰہِ ہائے افسوس! میں نے اللہ کے حقوق میں کیوں کوتاہی برتی اور دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا یَا لَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ اے کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی بھیجا ہوتا۔ حضرت والا کے اس شعر میں ایسی تعلیم ہے جس پر عمل کر کے انسان آخرت کی اس حسرت وندامت سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

انسان بلا ایمان ایک خاکدان ہے

تیری توفیق کا آسرا ہے
ورنہ رکھا ہے کیا خاکداں میں

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ مَازَکٰی مِنۡکُمۡ مِنۡ اَحَدٍ اَبَدًا﴾

(سورۃ النور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کر کے) پاک صاف نہ ہوتا۔

(معارف القرآن، جلد: ۶، ص: ۳۶۹)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری ایک آیت میں ارشاد فرمایا وَمَابِکُمۡ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ جو بھی نعمت تمہیں حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اسی لیے حضرت والا اس شعر میں یہی مضمون ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میں کچھ نہیں ہوں اور نہ مجھ میں اس کی طاقت ہے کہ بغیر تیری توفیق شاملِ حال ہوئے میں کوئی نیک کام کر سکوں یا تیری محبت کی راہ میں قدم رکھ سکوں اور جو کچھ بھی مجھے حاصل ہے وہ صرف تیری عطا ہے اور میری حیات تیرے فضل وکرم کے سہارے پر قائم ہے اسی کو حضرت والا دوسرے موقعہ پر یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

اور ارشاد فرمایا۔

کام بنتا ہے فضل سے اختؔر
فضل کا آسرا لگائے ہیں

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی معرفت ومحبت سے دل خالی ہو اور ایمان وعمل زندگی میں نہ ہو اور اطاعت واتباع کی توفیق شامل نہ ہو تو پھر یہ انسان محض مٹی کا ایک ڈھیر ہے جس کو عارضی طور پر احساس وادراک اور عقل

وشعور دے کر دوسرے مٹی کے ڈھیر سے ممتاز اور علیحدہ کیا گیا ہے۔

اور یہ عارضی مدت ختم ہوتے ہی یہ اپنی حقیقت کی طرف لوٹ کر پھر مٹی میں مل جائے گا یہی تو وجہ ہے کہ جب انسان اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا اور کفر وشرک کی راہ اختیار کرتا ہے تو حق تعالیٰ کی نگاہ میں اس کا درجہ نہ صرف یہ کہ انسانیت سے گر جاتا ہے بلکہ حیوانوں اور جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔

مثلِ خورشید چمکا دے یارب
دردِ مخفی ہے جو میری جاں میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے تعلق ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہاں کرتی تھیں ؎

لَنَا شَمْسٌ وَ لِلْاٰفَاقِ شَمْسٌ
وَ شَمْسِیْ اَفْضَلُ مِنْ شَمْسِ السَّمَاءِ
فَاِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ بَعْدَ فَجْرٍ
وَ شَمْسِیْ تَطْلُعُ بَعْدَ الْعِشَآءِ

ہمارا ایک سورج ہے اور دنیا جہاں والوں کا ایک سورج ہے اور میرا سورج آسمان کے سورج سے افضل ہے کیوں کہ آسمان کا سورج فجر کے بعد طلوع ہوتا ہے اور میرا سورج عشاء کے بعد طلوع ہوتا ہے۔

صاحبو! جس طرح یہ آسمان کا سورج دنیا جہاں کے ظاہر کو روشن کرتا ہے اور اس کی روشنی سے کائنات کی اشیاء اشجار ونباتات اور نوع بنوع بری اور بحری مخلوقات مستفید ہوتی ہیں اور بہت سی اشیاء کی صحت وسلامتی اور ان کا بقاء اس روشنی پر منحصر اور محدود ہے اس سے کہیں زیادہ آفتاب وماہتاب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی کرنوں سے اس عالم کا وجود اور پوری کائنات کی بقاء وابستہ اور جڑی ہوئی ہے اور اس سورج کی روشنی سے کہیں زیادہ اہل دنیا کے ظاہر وباطن اور ان کے حال اور مستقبل اور ان کی صورت وسیرت کو منور اور روشن کرنے والی وہ روشنی ہے جو ڈائریکٹ (Direct) حق سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں آفتابِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں عطا کی ہے کیوں کہ جس دن روئے زمین پر کوئی اللہ اللہ کرنے والا نہ رہے گا تو اس کائنات کے سارے نظام کو درہم وبرہم کر کے قیامت کو قائم کر دیا جائے گا۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں یہی دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! جس طرح تو نے محض اپنی توفیق سے میری جان میں اپنا دردِ محبت مخفی فرمایا تو مجھے یہ توفیق بھی دے دے کہ ان معرفت ومحبت کے انوار سے اور

تیری یادوں اور ترے تذکروں سے مثل آفتاب دنیا کے پورے عالم کو روشن کر دوں اور یہ چھپا ہوا دردایسا نورِ معرفت ومحبت بن کر میرے سینے سے نکلے کہ جو بھی میرے قریب ہو اس کا دل چمک اٹھے اور وہ خود بھی حامل دردِ محبت ہو جائے اور مجھے اس شعر کا مصداق بنادے ؎

جو بشر بھی سن لے میری آہ کو
بس تڑپ جائے وہ تری چاہ کو

اور حضرت والا نے یارب کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اے خدا! جبکہ میرے ظاہر وباطن کی تربیت آپ ہی کے قبضے میں ہے اور جو بھی کچھ ملتا ہے یا ملا ہے سب آپ کی دین ہے، تو میرے بندہ ہونے اور آپ کے رب ہونے کا مقتضیٰ بھی یہ ہے کہ آپ میری یہ مراد بھی پوری فرمادیں۔

دخولِ جنت محض رحمتِ خداوندی سے ہوگا

تیری رحمت کے صدقے میں اخترؔ
کیا عجب ہوگا باغِ جناں میں

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی کی بھی مغفرت اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں محض اعمال کی بنیاد پر کسی کی مغفرت نہ ہوگی۔

اس پر صحابہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ کی بخشش بھی اس بنیاد پر نہیں ہوگی؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں نہ میری بخشش اس بنیاد پر ہوگی الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سائے میں ڈھانپ لے۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید قائم کر کے یہ عرض کر رہے ہیں کہ اگرچہ میں اس کا مستحق نہیں ہوں لیکن میں اپنے اللہ سے پوری امید رکھتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں جگہ عطا کر دیں گے ایک حدیث قدسی ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے اَنَا عِنۡدَ ظَنِّ عَبۡدِیۡ بِیۡ میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان قائم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے ہر مومن کو یہی گمان رکھنا چاہیے کہ جب اس نے دنیا میں بلا استحقاق وبلاسوال اہل ایمان اور اہل اسلام کے گھر میں پیدا فرما کر نعمت ایمان واسلام سے مشرف کیا ہے تو ان شاء اللہ مرنے کے بعد آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ فضل فرما کر اہل جنت کا ساتھ عطا فرمادیں گے۔

جنتی اور جہنمی ہونے کا فیصلہ جائز نہیں

اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی کے جنتی اور جہنمی ہونے کا حتمی اور قطعی علم صرف اللہ کو ہے اگر کوئی انسان فسق وفجور کی آخری سرحدوں کو پار کر چکا ہو اور ظلم وزیادتی میں بہت آگے جا چکا ہو تب بھی اس کے لیے جہنمی

ہونے یا جنتی ہونے یا بد بخت ہونے وغیرہ کا فیصلہ کرنا یا اس کو ان الفاظ سے پکارنا جائز نہیں اسی طرح اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی دوستی اور للّٰہیت اور معرفت ومحبت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا ہو اور بظاہر وقت کا بہت اونچا شیخ، مصلح، عالم، داعی، مجاہد غرض یہ کہ جملہ صفات بندگی اس میں اعلیٰ درجے پر پائی جاتی ہوں مگر اس کے لیے بھی حتمی اور قطعی طور پر جنتی ہونے کی بات کرنا جائز نہیں ہاں بے شک وہ لوگ کہ زبانِ نبوت سے جن کے متعلق جنتی اور جہنمی ہونے کی خبر دی جا چکی ہے وہ اس اصول سے مستثنیٰ ہیں دنیا میں رہتے ہوئے صرف حسنِ ظن قائم کیا جا سکتا ہے قطعی علم صرف عالم الغیب اللہ کے پاس ہے اسی لیے حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی کے مزکّی اور مجلّٰی ہونے یا ولایت اور بزرگی کے مقامات میں کسی خاص مقام پر فائز ہونے کی بات کرنے کو ممنوع قرار دیا جیسا کہ التکشف، ص:۳۸۶ پر حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے حدیث شریف نقل کی ہے اور اس سے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ مَادِحًا اَخَاہُ فَلْیَقُلْ اَحْسَبُ فُلَانًا وَ اللّٰہُ حَسِیْبُہٗ وَلَا یُزَکِّیْ عَلَی اللّٰہِ اَحَدًا اَحْسَبُ فُلَانًا کَذَا وَکَذَا اِنْ کَانَ یَعْلَمُ مِنْہُ ذٰلِکَ اخرجه الشیخان وابو داؤد﴾

ترجمہ: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اپنے مسلمان بھائی کی ضرور ہی مدح کرنا ہو تو اس طرح کہنا چاہیے کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ہے آگے خدا کافی جاننے والا ہے اور خدا کے نزدیک کسی کے پاک ہونے کا دعویٰ نہ کرے اور یہ جو کہے گا کہ فلاں شیخ میرے گمان میں ایسا ایسا ہے وہ بھی اس شرط سے کہ اس کے علم میں بھی وہ شخص ایسا ہو۔ (ورنہ اس عنوان سے بھی مدح جائز نہیں) روایت کیا ہے اس کو بخاری ومسلم وابو داؤد نے۔

جیسا کہ اکثر اس میں بے احتیاطی ہے البتہ اگر ظناً کہہ دے تو مضائقہ نہیں اور بہتر یہ ہے کہ اس کی ظنیت کی تصریح بھی کر دے لیکن اگر اعتماداً علی قرینۃ المقام والکلام تصریح نہ بھی کرے تب بھی مضائقہ نہیں ہاں شیخ کہنا کسی کو جزم سے بھی جائز ہے کیونکہ مشیخیت امر مشاہد ہے یعنی طریق تربیت کا جاننا بخلاف ولایت کے کہ امر غیبی ہے یعنی مقبول عند اللہ ہونا۔ (التکشف، ص:۳۸۶ مطبوعہ: کتب خانہ مظہری)

ترے در پر ترا بندہ بہ امید کرم آیا

کرم سے ان کے میرے سامنے ان کا حرم آیا
ہماری زندگی کا وقت وقتِ مغتنم آیا

کرم سے ربِ کعبہ کے دعا یاں رد نہیں ہوتی
نظر کے سامنے قسمت سے میری ملتزم آیا

یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ انوارِ کعبہ ہے
یہ مالک کا کرم ہے اس پہ جو اس کے حرم آیا

اگرچہ پرخطاء ہے پر کہاں جائے ترا بندہ
ترے در پر ترا بندہ بہ امید کرم آیا

زبانِ شکر قاصر ہے لغت میں دم نہیں اختؔر
مری اُمید سے زیادہ نظر ان کا کرم آیا ۔

مُشکل الفاظ کے معنی:۔وقتِ مغتنم: قدر کے قابل وقت ۔ ردّ: نامقبول ۔ مظهر: ظاہر ہونے کی جگہ۔ پُرخطاء: گنہگار۔ قاصِر: معذور۔دم: سانس۔

حاضریٔ حرمین،غنیمت جانیں

کرم سے ان کے میرے سامنے ان کا حرم آیا
ہماری زندگی کا وقت وقتِ مغتنم آیا

اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے بیت اللہ کا حج وعمرہ اور اللہ کے گھر کی حاضری ہے اور دنیا بھر کی تمام مساجد میں سب سے افضل مسجد مسجدِ حرام پہنچنا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو یہ سعادت عطا فرمائے اسے اس وقت کو غنیمت جان کر اس کی قدر کرنی چاہیے کیوں کہ یہ لمحات زندگی میں گنے چنے ہوتے ہیں اور یہ قیمتی فرصتیں ہمیشہ آسانی سے میسر نہیں ہوتیں ۔ اس لیے حضرت والا کے اس شعر میں ایک نصیحت تو یہ ہے کہ وہاں کی حاضری کو اپنے مال ودولت اور سعی وکوشش کی طرف منسوب نہ کرے کیوں کہ کتنے بڑے بڑے اغنیائبیت اللہ کی حاضری سے محروم رہتے ہیں اور کتنے ہی خالی ہاتھ تنگ دست فضلِ الٰہی کے نتیجے میں وہاں کی حاضری سے بار بار مشرف ہوتے رہتے ہیں ۔

اسی طرح دوسری نصیحت اس شعر میں یہ ہے کہ اپنے ان اوقات کی قدر کرے اور ان کو غنیمت جانے لایعنی اور بے فائدہ کاموں میں بلا وجہ ضائع نہ کرے حتی کہ کوشش یہ کی جائے کہ دنیوی مباح کاموں میں بھی نہ پڑے

تا کہ یہ اوقات حرم کے اندر رہ کر زیادہ سے زیادہ ذکر و عبادت میں خرچ کیے جائیں یوں تو حدیث شریف میں مذکور ہے کہ ساری ہی عمر موت سے پہلے غنیمت ہے مگر خاص طور پر حرم کی ساعتیں اور بھی زیادہ اہم ہیں کیوں کہ وہاں نیکیوں کا اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔

شعائر اللہ کی اہمیت

کرم سے ربِ کعبہ کے دعائیں رد نہیں ہوتی
نظر کے سامنے قسمت سے میری ملتزم آیا

حضرت والا ان اشعار میں حرم محترم کے مقدس مقامات میں دعاؤں کی قبولیت کا تذکرہ فرما رہے ہیں چنانچہ ملتزم، مقام ابراھیم، صفا و مروہ یہ سارے ہی مواقع دعاؤں کی مقبولیت کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور اسی لیے ان شعائر اسلام کا احترام قرآن کی مختلف آیات اور مختلف احادیث میں مذکور ہے مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃُ بِخَیْرٍ مَا عَظَّمُوْا ھٰذِہِ الْحُرْمَۃَ حَقَّ تَعْظِیْمِھَا فَاِذَا ضَیَّعُوْا ذٰلِکَ ھَلَکُوْا﴾

(المشکوٰۃ، باب حرم مکۃ حرسہا اللہ تعالیٰ، ص:۲۳۸)

ترجمہ: یہ امت جب تک مکہ کی حرمت کا پورا پورا احترام اور عظمت کرتی رہے گی تب تک خیر پر قائم رہے گی لیکن جب قوم اس کو ضائع کرے گی تو ہلاک ہو جائے گی۔

ایک اور روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ الْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللہِ اِنْ دَعَوْہُ اَجَابَھُمْ وَاِنِ اسْتَغْفَرُوْہُ غَفَرَ لَھُمْ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب المناسک، ص:۲۲۲)

ارشاد فرمایا کہ حج و عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اگر وہ اللہ سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول کرتے ہیں اور اگر وہ خاص طور سے مغفرت کی دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ ربِ کعبہ، کعبہ پر اسی کو بلاتا ہے جس کو کچھ نوازنا ہوتا ہے ہاں جو خود ہی لینا نہ چاہے تو بات اور ہے۔ اس لیے یہ سب اللہ تعالیٰ نے نوازنے اور عطا کرنے کے بہانے رکھے ہیں۔

مالِ حرام اور حج و عمرہ

صاحبو! حرم کے مقدس مقامات میں دعاؤں کا مقبول ہونا اس میں تو کوئی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ دعاؤں کی قبولیت حرام مال کھانے کے ساتھ ممکن نہیں اگر چہ کوئی انسان ملتزم سے چمٹ کر اور بیت

اللہ کے دروازے سے لپٹ کر بھی دعا کرتا رہے حدیث پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بعض ایسے لوگ جو بالکل پراگندہ حال اور گرد آلود ہوتے ہیں دور دراز کا سفر کئے ہوئے (یعنی جن کی ظاہری حالت ایسی ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر مخلوق کو بھی رحم آجائے) آتے ہیں اور دعا کرتے ہیں یارب یارب لیکن چونکہ ان کا کھانا حرام پینا حرام لباس حرام اور ان کا نشو ونما حرام سے ہوا ہے تو بھلا ایسے شخص کی دعا کیوں کر قبول کی جاسکتی ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مال حرام کی نحوست اور عند اللہ اس کی شناعت وقباحت کس قدر شدید ہے کہ ارحم الرحمین کی رحمت کو اس کی وجہ سے روک دیا گیا اس لیے اس مقدس سفر کو طے کرتے وقت اپنے مصارف سفر اور اخراجات اہل خانہ اور پورے اپنے معیشت کے نظام کو حرام سے پاک کرنے کی فکر کرنی چاہیے اور اگر کہیں کسی طرح کی کوئی کمی پائی جائے یا مالی حقوق ذمے ہوں تو پہلے ان کی ادائیگی کرنی چاہیے نہ کہ سفر حج وعمرہ اس لیے کہ اصل عبادت اور بندہ مومن کا مقصود رضاء الٰہی ہے اور بس۔ اور مال حرام کے ساتھ سفر حج کرنے پر حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے مقبول نہ ہونے کی وعید سنائی ہے تو بھلا ایسے سفر سے سوائے اپنے جی خوش کرنے کے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔

قبولیتِ دعا کا مطلب اور غلط فہمی کا ازالہ

دوستو! بارگاہِ الٰہی سے دعا کا رد نہ ہونا یہ امر یقینی ہے کیوں کہ اللہ اور اس کے وعدے بالکل حق اور سچ ہیں لیکن قبولیت کا معنیٰ اور مطلب سمجھ لینا چاہیے سو اس سلسلے میں علماء نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کبھی بندے کو وہی چیز عنایت کردی جاتی ہے اور کبھی بندے کے مصالح کے پیش نظر اس کی دعا آخرت میں اس کے لیے جمع کردی جاتی ہے اور کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ آنے والے حوادث سے اس کو بچالیتے ہیں اس لیے قبولیت کا صرف یہی معنیٰ نہیں ہوتا کہ ہم جو مانگ رہے ہیں ہم کو بعینہٖ وہی چیز دے دی جائے بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں اور بالآخر جب وہ یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں ہمارا مانگا ہوا مطلب نہیں مل رہا ہے تو وہ دعا چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لیے کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یُسْتَجَابُ لِاَحَدِکُمْ مَالَمْ یَعْجَلْ یَقُوْلُ دَعَوْتُ فَلَمْ یُسْتَجَبْ لِیْ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب یستجاب للعبد ما لم یعجل، ج: ۲، ص: ۹۳۸)

کہ دعا قبول ہوتی رہتی ہے جب تک کہ بندہ عجلت بازی نہ کرے صحابہ نے پوچھا یہ عجلت بازی کیا ہے ارشاد فرمایا کہ دعا کرتا رہے اور جب یہ دیکھے کہ قبول نہیں ہے تو چھوڑ بیٹھے۔

پھر بندہ مومن کے لیے دعا کی حیثیت ایک مستقل عبادت کی ہے اور گویا دعا کرنے کا معنیٰ اللہ کے دروازے کو کھٹکھٹانا ہے اور بندے کی شان یہ ہے کہ وہ دروازہ برابر کھٹکھٹاتا رہے اگر کھلے تو بھی اور اگر نہ کھلے تو بھی، کیوں کہ وہ بہر دو صورت اپنا فریضہ بندگی ادا کر رہا ہے یعنی اللہ کا قرب اور اس کی رضا والے عمل میں مشغول ہے جس کو حضرت مولانا رومی یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

از دعا نبود مرادِ عاشقاں
جز سخن گفتن باآں شیریں دہاں

دعا کرنے سے عاشقوں کی مراد یہ بھی ہوتی ہے کہ میری حاجت پوری ہو جائے مگر مولانا رومی فرماتے ہیں کہ ان کی ایک اور بڑی پیاری نیت ہوتی ہے کہ اسی بہانے اللہ تعالیٰ سے گفتگو کا موقعہ ملتا ہے، عاشقوں کی مراد دعاؤں سے صرف حاجت روائی نہیں ہے بلکہ ایک مقصد اور ہے ۔

جز سخن گفتن باآں شیریں دہاں

کہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی اور بات چیت کا شرف مل جائے عاشقوں سے پوچھو اس کا مزہ کہ اپنے محبوب سے گفتگو میں کیا مزہ آتا ہے ۔ (درسِ مثنوی، ص:۲۰۸)

دوسرے مصرعے میں حضرت نے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے کہ میری خوش نصیبی ہے اور سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری نگاہوں کے سامنے بیت اللہ کیا ہوا ہے اور میں ان قیمتی لمحات زندگی کو اللہ کے گھر کے سامنے حدودِ حرم میں گزار رہا ہوں کیوں کہ بیت اللہ کے سامنے صرف بیٹھنے والا اور عظمت و محبت کے ساتھ بیت اللہ کا دیدار کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارشوں سے سیراب ہوتا رہتا ہے ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُنْزِلُ اللہُ کُلَّ یَوْمٍ عَلٰی حُجَّاجِ بَیْتِ الْحَرَامِ عِشْرِیْنَ وَمِاْۃَ رَحْمَۃٍ سِتِّیْنَ لِلطَّائِفِیْنَ وَاَرْبَعِیْنَ لِلْمُصَلِّیْنَ وَعِشْرِیْنَ لِلنَّاظِرِیْنَ رَوَاہُ ابْنُ حِبَّانَ فِی الضُّعَفَآءِ وَالْبَیْہَقِیُّ فِی الشُّعَبِ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ وَالطَّبْرَانِیُّ فِیْ مَعَاجِمِ الثَّلٰثَۃِ وَاَبُوْ ذَرِّ الْھَرَوِیُّ وَالْاَزْرَقِیُّ﴾

(الترغیب والترھیب، ج:۲، ص:۶۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے گھر کا حج کرنے والوں پر روزانہ ایک سو بیس رحمتیں نازل کرتا ہے ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں کے لیے اور چالیس نماز پڑھنے والوں کے لیے اور بیس کعبہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے والوں کے لیے۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ محض بیت اللہ پر نظر ڈالنے والے پر بھی اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے یعنی جو محبت و شوق سے بیٹھا ہوا کعبہ کو صرف دیکھ رہا ہو رحمتوں میں سے حصہ اسے بھی ملتا ہے کیونکہ کعبہ کو محبت کی نظر سے دیکھنا در حقیقت خدا ہی سے محبت کا نتیجہ ہے دوسرے کسی چیز کا دیکھنا خود اس کی محبت پیدا کرنے کا ایک موثر کامیاب طریقہ ہے کسی چیز کو محبت کی نظر سے جتنا زیادہ بار بار دیکھا جاتا ہے اس قدر اس کی محبت دل میں گھر کرتی ہے اور دل اس طرف کھنچتا ہے اور کعبۃ اللہ کو چونکہ خدا کا گھر ہونے کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اس لیے اسے دیکھنا

گویا خدا ہی کی تجلیات کا مشاہدہ کرنا ہے ؎

آں زماں کہ آرزوئے دیدن جانم باشد
در نظر نقش رخ خوب تو تصویر کنم

حرم کا ذرّہ ذرّہ تجلّیاتِ الٰہی کا مظہر ہے

یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ انوارِ کعبہ ہے
یہ مالک کا کرم ہے اس پہ جو اس کے حرم آیا

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ حرم مکی کے ذرہ ذرہ میں کعبہ معظّمہ کے انوارات نمایاں نظر آتے ہیں اور یہاں کا ہر ہر ذرہ تجلیاتِ الٰہیہ کا مظہر ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے بھی کعبۃ اللہ کے اردگرد قبائل عرب کا آپس میں قتل وقتال باہمی معاہدوں کے تحت ممنوع تھا یہ درحقیقت اس عظمتِ خداوندی کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ بیت اللہ کے اوپر ہر آن نازل فرماتے رہتے ہیں اسی لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاللهِ اِنَّكِ لَخَيْرُ اَرْضِ اللهِ وَاَحَبُّ اَرْضِ اللهِ اِلَى اللهِ وَلَوْلَا اَنِّيْ اُخْرِجْتُ مِنْكِ مَاخَرَجْتُ ﴾

(المشکوٰۃ، باب حرم مکۃ حرسہا اللہ تعالٰی، ص:۲۳۹)

خدا کی قسم تو اللہ کی سب سے زیادہ بہترین اور اللہ کی سب سے زیادہ پسندیدہ زمین ہے اور اگر میں تجھ سے نہ نکالا جاتا تو میں نہیں نکلتا اس لیے درحقیقت یہ پوری ہی سرزمین مقدس اور محترم ہے۔

گناہ گاروں کا ایک ہی در ہے

اگرچہ پرخطاء ہے پر کہاں جائے ترا بندہ
ترا بندہ ترے در پر بہ اُمید کرم آیا

اللہ کے گھر پہنچ کر انسان اپنے عجز، احتیاج، فقر، اور درماندگی کو پیش کرتا ہے اور اپنے گناہوں اور غفلتوں میں ڈوبے ہوئے ہونے کا اقرار کرتا ہے اور تائب و نادم ہو کر اپنے رب کے حضور پیش ہوتا ہے اور تمام سہاروں اور اعتمادوں کی نفی کر کے ایک اللہ کی ذاتِ عالی کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر رحمتِ الٰہی جوش میں آتی ہے اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب حج وعمرے والا اللہ کے گھر سے لوٹ کر جاتا ہے تو وہ ایسے ہی گناہوں سے صاف ستھرا ہوتا جاتا ہے جیسے کہ آج ہی اس کی ماں نے اس کو جنا ہو۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کی روایت ہے کہ:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ وَقَالَ الْعُمْرَةُ اِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب المناسک، ص:۲۲۱)

خلاصہ یہ ہوا کہ جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور بے حیائی اور فسق وفجور کے کاموں سے بچا تو وہ ایسے

لوٹے گا جیسے اس کی ماں نے اسکو آج ہی جنا اور ایک عمرے سے لے کر دوسرے عمرے تک انسان سے جتنی خطائیں صادر ہوتی ہیں وہ ان سب کا کفارہ ہوتا ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے۔

صاحبو! انسان کتنا ہی گناہ گار ہو لیکن اسے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس کا صراحۃً حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾

(سورۃ الزمر، آیت ۵۳)

ترجمہ: کہہ دیجئے اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتی کی ہے اپنی جان پر آس مت توڑو اللہ کی مہربانی سے۔

(معارف القرآن، جلد: ۷، ص: ۵۶۷)

ایک دوسری جگہ پر ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾

(سورۃ یوسف، آیت ۸۷)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو بے شک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

(معارف القرآن: جلد: ۵، ص: ۱۱۵)

حضرت والا کے اس شعر میں دونوں باتوں کو یکجا کرلیا گیا ایک طرف اپنے قصور کا اقرار اور دوسری طرف اللہ کے کرم کی بھر پور امید اور ان دونوں باتوں کو پیش کرنے کا انداز ایسا جاذبِ رحمتِ الٰہی ہے کہ اس میں پوری عبدیت اور عاجزی کے ساتھ عفو ودرگزر کی درخواست پیش ہے کہ الٰہی میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ میں نے گناہ نہیں کیے بے شک میں قصوروار مجرم ہوں اور میں جرم کر کے تیرے در سے بھاگنا بھی نہیں چاہتا بلکہ خود مجرم بن کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تو کریم ہے جس کا معنی ہے اَلَّذِیْ یُعْطِیْ بِدُوْنِ الْاِسْتِحْقَاقِ وَالْمِنَّۃِ اس لیے مجھے اپنے استحقاق کا دعویٰ نہیں مگر تیری شانِ کریمی اور رحیمی سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھ کو معاف کردیں گے کیوں کہ دنیوی حکومتوں کے نظام وقوانین میں بھی یہ امر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ اگر مجرم خود عدالت میں پیش ہو تو اس کے اوپر سے بہت سی سزائیں اٹھالی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ خصوصی سلوک اور برتاؤ کیا جاتا ہے۔

اقرارِ قصور اور ادائے شکر

زبانِ شکر قاصر ہے لغت میں دم نہیں اخترؔ
مری اُمید سے زیادہ نظر ان کا کرم آیا

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی بے شمار نعمتوں کا شکریہ بڑے ہی بلیغ انداز میں ادا کررہے ہیں کہ الٰہی مجھے تیرے در پہ آکے جو کچھ ملا اور جو نعمتیں حاصل ہوئیں اور جس طرح کی آپ کے رحم وکرم کی بارش میرے اوپر برسی وہ اتنی زیادہ ہے کہ جس کی میں نے امید بھی قائم نہ کی تھی اس پر

میں جتنا شکر ادا کروں کم ہے، لغتیں اس شکر کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں جو میرے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے اور زبان تعبیرِ شکر کے لیے جن لغات والفاظ کی محتاج ہے وہ لغتیں میری ادائیگی شکر کی اس سطح کو نہیں پہنچ سکتی کہ اس کے بعد میں خیال کرسکوں کہ میں نے آپ کی طرف سے ملنے والی بے حساب نعمتوں کا شکر ادا کرلیا کیوں کہ لغات محدود ہوتی ہیں ان کے معانی ومطالب ایک حد پر جا کے ختم ہو جاتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں میں رچی بسی ہوئی کیفیاتِ تشکر وعبدیت اتنی اونچی ہوتی ہے کہ وہاں تک لغت نہیں پہنچ سکتی اور بالاخر انسان یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے مَاشَکَرْتُکَ حَقَّ شُکْرِکَ.

صاحبو! کمالِ عبدیت یہی ہے کہ انسان کرتا رہے اور ڈرتا رہے اپنی پوری ہمت واستطاعت کے مطابق بھر پور انداز سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بعد بھی بارگاہِ ربُّ العزت میں یونہی اپنے جذباتِ بندگی پیش کرنے چاہیے کہ اے میرے مولیٰ! مجھے تیرا جیسا شکر ادا کرنا چاہیے ویسا میں تیرا شکر ادا نہ کرسکا اور نہ معلوم میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کی بارگاہ میں قبول ہے یا نہیں حضرات صحابہ کرام کی قرآن نے یہی حالت پیش کی ہے اور اسی صفت پر اللہ تعالیٰ کی دریائے رحمت کو جوش آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش برسنے لگتی ہے۔

اے مرے خالقِ حیات

اے میرے خالق حیات! تیری خوشی ہے صد حیات
آپ کی ناخوشی سے ہے میری حیات صد ممات

ذکر سے تیرے مل گئی دل کو ہمارے صد حیات
بلکہ ترے ہی نام سے زندہ ہے ساری کائنات

تیرے بغیر میں ہی کیا مردہ ہے ساری کائنات
تیرے کرم سے حشر تک زندہ ہے ساری کائنات

عارضی حسنِ گل پہ ہیں بلبل کی ساری ہزلیات
فانی بتوں کو دل نہ دے یہ ہیں ہماری غزلیات

شمس و قمر کی روشنی ادنیٰ سی بھیک ہے تری
روح میں تیرے نور سے کتنے ہیں ماہِ کائنات

نفس کا جو غلام ہے غرق ہے وہ گناہ میں
کیوں نہ کہوں کہ زندگی کتنی ہے اس کی واہیات

اُس کا سکون چھن گیا کتنی ہے تلخئ حیات
جس نے چکھے ہیں دوستو فانی بتوں کے نمکیات

توبہ کریں گناہ سے لیکن ہو صدقِ دل سے بھی
حشر میں ہوں گے فائزوں بیبیاں ہوں گی فائزات

ہیں تو خدا سے دور دور لیکن زباں پہ ہے ضرور
دعوئ علمِ ارضیات دعوئ علمِ فلکیات

جس کو خدا نے بخش دی لذتِ ذکر فضل سے
اخترؔ وہ پاگیا ہے بس حاصلِ لطفِ کائنات

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **خالقِ حیات**: زندگی دینے والا۔ **صدحیات**: سینکڑوں جان۔ **صدممات**: سینکڑوں اموات۔ **گُل**: پھول۔ **ہزلیات**:......۔ **فانی بتوں**: مرنے والی نامحرم عورتیں اور حسین لڑکے۔ **شمس وقمر**: چاند وسورج۔ **ماہ**: چاند۔ **واھیات**:......۔ **تلخئ حیات**: زندگی کی کڑواہٹ۔ **صدقِ دل**: سچے دل سے۔ **فائزوں**: کامیاب مرد۔ **فائزات**: کامیاب عورتیں۔

رضائے مولیٰ کے ساتھ زندگی زندگی ہے

اے میرے خالقِ حیات! تیری خوشی ہے صد حیات
آپ کی ناخوشی سے ہے میری حیات صد ممات

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا ہے اگر انسان اس مقصد کو پورا کررہا ہو تو گویا وہ اپنے خالق ومالک کو راضی کررہا ہے اور اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر عمل کی غرض وغایت مرضی الٰہی ہونی چاہیے اور وہ عمل جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہو اس سے بچنا چاہیے اور اگر ایسا نہ تو پھر وہ زندگی زندگی کہلانے کے قابل نہیں اس کو یوں سمجھئے کہ کسی کے پاس بہترین عمدہ قسم کی گن (Gun) ہو اور اس کا مالک اسے دشمنوں کے مقابلے میں اس کی اصل وضع کے مطابق استعمال نہ کرتا ہو مثلاً خدا اور رسول کے دشمن کے وجود سے زمین کو پاک کرنے کے لیے تو پھر وہ گن (Gun) اس لائق نہیں ہے کہ اس کو گن (Gun) کہا جائے بلکہ مثل لاٹھی اور ڈنڈے کے ہے بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی بدتر ہے کیوں کہ لاٹھی کے ماہرین اس سے جو مقاصد حاصل کرسکتے ہیں وہ اس گن (Gun) سے نہیں ہوسکتے۔ ٹھیک اسی طرح جس زندگی کا رخ اپنے مولیٰ کی رضا کی طرف نہ ہو حیات ننگِ صد ممات ہے کیوں کہ وہ زندگی نہ صرف یہ کہ رضائے الٰہی کا ذریعہ نہیں بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے غضب وعقاب کی موجب ہے اور اس کی سخط اور ناراضگی کا باعث ہے اسی لیے حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اے میرے مولیٰ! اگر تو مجھ سے راضی ہے پھر تو میری حیات رشکِ صد حیات ہے اور اگر آپ ناخوش ہوں تو پھر سینکڑوں موت سے بدتر ہے۔

ذکر سے تیرے مل گئی دل کو ہمارے صد حیات
بلکہ ترے ہی نام سے زندہ ہے ساری کائنات

آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس طرح بدن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں سے کچھ غذائیں اتاری ہیں اسی طرح روح اور قلب کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف النوع اذکار کی شکل میں غذاؤں کا انتظام کیا ہے اور دل کی حقیقی حیات ذکر کے ساتھ وابستہ اور جڑی ہوئی ہے اسی لیے مردہ اور زندہ دل کی تعبیرات کا استعمال کیا جاتا ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے **اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا** کی آیت میں احیائے زمین سے مراد دلوں کا زندہ کرنا لیا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے التکشف، ص: ۲۸۸ پر اس آیت کو ذکر کرکے ارشاد فرمایا:

﴿فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی (اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ یُلَیِّنُ الْقُلُوْبَ بَعْدَ قَسْوَتِھَا فَیَجْعَلُھَا مُخْبِتَۃً مُنِیْبَۃً وَکَذٰلِکَ یُحْیِ الْقُلُوْبَ الْمَیِّتَۃَ بِالْعِلْمِ وَالْحِکْمَۃِ وَاِلَّا فَقَدْ عُلِمَ اِحْیَاءُ الْاَرْضِ بِالْمَطَرِ مُشَاھَدَۃً﴾

(تفسیرُ الْخازن، ج:۴، ص:۲۳۰، دارُ المعرفۃ، بیروت)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا کہ اللہ تعالیٰ قلوب کو ان کی قساوت کے بعد نرم کر دیتا ہے پھر ان کو خشوع وانابت کے ساتھ موصوف کر دیتا ہے یعنی مردہ دلوں کو علم وحکمت کے ساتھ زندہ کر دیتا ہے ورنہ زمین کا بارش سے تر وتازہ ہونا تو مشاہدہ سے معلوم ہے اس عنوان پر ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک شعر ذکر کیا ہے ؎

رَأَیْتُ الذُّنُوْبَ تُمِیْتُ الْقُلُوْبَ
وَ قَدْ یُوْرِثُ الذِّلَّ اِکْثَارُھَا

ترجمہ شعر: میں نے دیکھا کہ گناہ دلوں کو مردہ کر دیتے ہیں اور ان کی کثرت کبھی ذلت کا باعث بھی ہوتی ہے۔

اگلے مصرعہ میں حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ساری کائنات کی حیات اور بقا ہی اللہ کے نام سے جڑی ہوئی ہے جس طرح ذکر اللہ سے دل کو حقیقی لطف وحیات حاصل ہوتا ہے اس طرح اس دنیا جہاں کے بقاء وبَکاؤ کا سامان بھی ذکر اللہ ہے اسی لیے ایک روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اللّٰهُ اللّٰهُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان فی اٰخر الزمان، ج: ۱، ص: ۸۴)

قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ روئے زمین پر کوئی ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا باقی رہے گا۔ اسی مضمون کو مزید وضاحت کے ساتھ حضرت والا اگلے شعر میں بیان فرماتے ہیں۔

ہر شے کی تسبیح اس کے مناسب حال ہے

تیرے بغیر میں ہی کیا مردہ ہے ساری کائنات
تیرے کرم سے حشر تک زندہ ہے ساری کائنات

ارشاد فرمایا کہ اے خدا! تیرے بغیر نہ میں زندہ رہ سکتا ہوں نہ ساری کائنات زندہ رہ سکتی ہے اس لیے کہ درحقیقت کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول رہتا ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ﴾

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت: ۴۴)

ترجمہ: کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ ان کی تسبیح (پاکی بیان کرنے) کو سمجھتے نہیں ہو۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، ص: ۴۷۴)

دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ کہ ہر شی نے اپنی نماز وتسبیح کو جان لیا حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے ایک وعظ میں ذکر فرمایا کہ

حضرت شاہ رفیع الدین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ درخت بھی اپنی نماز میں مشغول ہیں اوران کی نماز ان کا قیام کی حالت میں کھڑا رہنا ہے چوپائے بھی اپنی نماز میں مشغول ہیں ان کی نماز ہر وقت رکوع میں رہنا ہے اسی طرح حشرات الارض کی نماز ہر وقت حالتِ سجدہ میں رہنا ہے اور پہاڑوں کی نماز ہر وقت قاعدے کی حالت میں رہنا ہے اورحق سبحانہٗ وتعالیٰ نے مومنین کوان ساری مخلوقات کی صلوات کی جامع صلاۃ عطا فرئی ہے اگرچہ ہم باقی مخلوقات کی صلوٰۃ وتسبیح کی کیفیت حتمی اوریقینی طور سے ذکرنہیں کرسکتے اور نہ ہی ہم اس کے مکلّف ہیں لیکن ان آیات سے اتنا ثابت ہوجاتا ہے کہ ہر ذرۂ کائنات مختلف انداز سے باری تعالیٰ کے ذکرویاد میں مشغول ہے اوراسی ذکرسے اس کائنات کی زندگی اورحیات ہے۔

حیاتِ نباتات وجمادات اورشبہے کا ازالہ

رہ گیا ذہن میں آنے والا یہ شبہ کہ کیا شجروحجر وغیرہ جمادات ونباتات کوایسا ادراک واحساس عطا ہوا ہے کہ وہ ذکراللہ کرسکیں سواس سلسلے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہرشی کا ادراک اس کے مناسب جدا جدا ہے۔ چنانچہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اورموقعہ پرارشادفرمایا جس کومجدد تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے التکشف، ص:۳۷۰ پرارشادفرمایا ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ قَالَ نَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی اُحُدٍ فَقَالَ اِنَّ اُحُدًا جَبَلٌ یُّحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل احد، ج:۱، ص:۴۲۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ احد ایسا پہاڑ ہے کہ اس کوہم سے محبت ہے اورہم کواس سے محبت ہے۔

فائدہ: چونکہ کوئی دلیل حقیقت سے متصرف کرنے کی نہیں ہے اس لیے حدیث میں لفظ یُحِبُّنَا کوحقیقت پرمحمول کرکے اس سے اس مسئلہ کشفیہ پراستدلال کریں گے کہ جمادات میں بھی ایک گونہ شعور ہے کیونکہ حب موقوف ہے شعور پرجیسا کہ نُحِبُّہٗ بالاتفاق حقیقت پرمحمول ہے باقی مسئلہ ظنیہ ہے داخلِ عقائدنہیں۔ (التکشف، ص:۳۷۰)

اسی طرح اس روایت سے بھی اس پراستدلال کیا جاسکتا ہے:

﴿عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ کَانَ جِذْعٌ یَقُوْمُ عَلَیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا وُضِعَ لَہُ الْمِنْبَرُ سَمِعْنَا لِلْجِذْعِ مِثْلَ اَصْوَاتِ الْعِشَارِ حَتّٰی نَزَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَوَضَعَ یَدَہٗ عَلَیْہِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ، باب الخطبۃ علی المنبر، ج:۱، ص:۱۲۵)

جس میں حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے تنے سے علیحدگی اختیارکی، منبرپرتشریف فرما ہونے کے بعد توکھجور کا وہ تنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی سے رونے لگا تھا اوراسی لیے قرآنِ کریم میں ایک دوسرے مقام پرہے ایمان سے محروم شخص کومردہ اورمومن کوزندہ قراردیا ہے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ کہ جومردہ تھا ہم

نے اس کو زندہ کیا یعنی ایمان عطا کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ:

﴿مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِیْ لَا یَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ تعالٰی ج ۲، ص: ۹۴۸)

اللہ کو یاد کرنے والے اور اللہ کو یاد نہ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے مردہ اور زندہ۔

غرض یہ کہ اس مضمون سے ثابت ہو گیا کہ اللہ کی یاد کے ساتھ کائنات کے ذرے ذرے کو گہرا ربط ہے اسی لیے جب اس نظامِ عالم کو درہم برہم کرنا ہو گا تو اس عالم سے اللہ اللہ کہنے والوں کو مکمل طور پر اٹھا لیا جائے گا اور پھر قیامت قائم کر دی جائے گی اور اس وقت اس روئے زمین پر شرارِ خلق (بدترین) مخلوق موجود ہو گی جو معاصی اور نافرمانیوں میں انتہائی درجہ کو پہنچے ہوں گے اور گدھوں کی طرح دھنگامستی میں لگے ہوں گے تو ان پر قیامت قائم کر دی جائے گی۔

بلبل کی چشمِ غمناک اور ایک سبق

عارضی حسنِ گل پہ ہیں بلبل کی ساری ہزلیات
فانی بتوں کو دل نہ دے یہ ہیں ہماری غزلیات

حقیقت تو یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر شے خوبصورت ہو یا بدصورت ادنیٰ ہو یا اعلیٰ چھوٹی ہو یا بڑی پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ غرض کہ ہر ذرۂ کائنات اور حکومت وسلطنت کو پائداری ہے نہ رونقِ محفل، حسینوں اور جوانی کے نشے میں چور لڑکے لڑکیوں اور دیوانہ اور مست کر دینے والی حسیناؤں کو کوئی گردشِ ایام سے بچا سکا ہے اور نہ بچا سکے گا۔ بالآخر چند دن کی عارضی رنگت و رونق کچھ ہی ایام گزرنے پر ڈھل کر تنگِ دشت و دمن ہو جاتی ہے کل تک دل و جان فدا کرنے والے کو ایک نظر جھانکنا بھی گوارا نہیں، ساری محبت وفدائیت کا دعویٰ کرنے والے اور حسن و جمال کی تعریف میں غزلیں اور واہ واہ کہنے والے اور مدحِ محبوب اور محبوبہ میں شب و روز دیوانے رہنے والے بڑی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ کفِ افسوس ملتے نظر آتے ہیں، ساری دیوانگی کا نشہ جھڑ چکا ہوتا ہے اور ٹھیک اس بلبل کی طرح مایوس اور اداس پھرتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں کہ جس طرح بلبل موسمِ بہار میں آنے والی درختوں کی بہار اور شادابی اور گلشن مہکنے والے پھولوں کی تروتازگی پر فدا اور مست ہو کر جھومتی اور چہچہاتی پھرتی ہے اور اسے اس کے مستقبل کی اس وقت کوئی خبر نہیں ہوتی کہ عنقریب موسمِ خزاں آ کر اس چمن کی ساری رنگت اور تازگی کو اور اس کی پر فضاء بہاروں اور خوشنما و دلکش حسین نظاروں کو ختم کر کے رکھ دے گا اور ان حسین مناظر کو دل دینے پر حسرت و افسوس کے ساتھ روتی پھرتی ہے اور اس وقت اس کی حالت حضرت والا کے اس شعر کا مصداق ہوتی ہے ؎

درسِ عبرت ہے چشمِ عنادل
کس طرح نم ہے غم سے خزاں میں

اسی طرح حضرت والا کا ایک دوسرا سبق آموز شعر ہے جس کو ایک مرتبہ حضرت والا دامت برکاتہم نے حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا جبکہ حضرت والا مفتی صاحب کے ساتھ رکشے میں سوار تھے مفتی صاحب نے شعر پسند فرمایا۔

جو چمن سے گزرے تو اے صبا! تو یہ کہنا بلبلِ زار سے
کہ خزاں کے دن بھی ہیں سامنے نہ لگانا دل کو بہار سے

درحقیقت ان مثالوں کا مقصد کسی مضمون کو سمجھانے میں تفہیم اور تقریب الی الفہم ہوتا ہے یعنی آسانی سے اور جلد بات سمجھ میں آجائے تو حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ جس طرح حسرت وافسوس اور ندامت اور پشیمانی بلبل کو ہوتی ہے اور اس کی یہ ساری داستان فرحت ومسرت رنج وغم کی شکلوں میں تبدیل ہوجاتی ہے اور بالآخر اسے اپنے کیے پر پچھتانا پڑتا ہے تو اے وہ انسان! جوان فنا ہونے والے بتوں یعنی نامحرم حسین لڑکیاں اور امرد بے ریش لڑکوں پر دل دے کر اپنے دل کو تباہ وبرباد کرنے والے اور ان کے عشق ومحبت میں گھل گھل کر اپنے عمرِ عزیز کو ضائع کرنے والے تو بلبل کی اس حالتِ زار سے سبق لے اور عبرت حاصل کر کہ ان حسینوں کو دل دینے سے کل تجھے بھی اسی طرح ندامت وشرمندگی کے آنسو بہانا پڑیں گے مرض زیادہ بڑھنے سے خدا نہ کرے کہ آخرت میں خون کے آنسو گرانا پڑے جو چمک دمک اور رونق وتازگی تجھے ان کی صورتوں پر دکھائی دے رہی ہے یہ بظاہر باندازِ بہار آئی ہے مگر درپردہ یہ خزاں لیے ہوئے ہے اسی کو عارفِ ہندی حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ لکھنو کے سفر میں شہر لکھنو سے گزرتے ہوئے (جبکہ لکھنو کو دلہن کی طرح وائسرے کی آمد پر خوب بجلیوں اور قمقموں سے سجایا گیا تھا) ساتھیوں سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

رنگ رلیوں پہ زمانے کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بہ اندازِ بہار آئی ہے

نورِ شمس وقمر کی حقیقت

شمس و قمر کی روشنی ادنیٰ سی بھیک ہے تری
روح میں تیرے نور سے کتنے ہیں ماہِ کائنات

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ اور اس میں ہونے والے واقعات اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کا مظہر ہے۔ شمس وقمر کی روشنی بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ نور کا مظہر ہے اور ساری کائنات کا حسن وجمال اللہ تعالیٰ کی صفتِ جمیل کا مظہر ہے اور مخلوقات کی باہمی رحمتیں ومہربانیاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مظہر ہے۔ حضرت والا اس شعر میں فرمارہے ہیں کہ شمس وقمر کو جو روشنی عطا ہوئی ہے اس کو اس روشنی سے کچھ نسبت

نہیں ہوسکتی جو خالقِ شمس وقمر کے دل میں آنے سے حاصل ہوتی ہے اور جس طرح دل و جان منور اور روشن ہو جاتے ہیں اور قلب وروح میں انوارات وتجلیاتِ الٰہیہ کی کرنیں پڑتی ہیں۔

یہ دنیا کا ظاہری چاند وسورج اگر سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوکر روشنی ڈالے تو بھی ان انوارِ الٰہیہ کے سامنے وہ پھیکی اور ماند پڑ جائے گی۔اسی کو حضرتِ والا نے اپنے ایک دوسرے شعر میں یوں ارشاد فرمایا۔

خالقِ شمس و قمر جس دل میں بھی آجائے ہے
اس کے نورِ قلب سے شمس و قمر شرمائے ہے

گناہ کرنا نفس دُشمن کی غلامی ہے

نفس کا جو غلام ہے غرق ہے وہ گناہ میں
کیوں نہ کہوں کہ زندگی کتنی ہے اس کی واہیات

حضرت والا دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو انسان دنیا میں خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی کرکے زندگی گزارتا ہے اور گناہوں میں مستغرق رہتا ہے،اس کی زندگی انتہائی بے کار اور واہیات گزرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نہ اسے دنیا کا کوئی لطف آتا ہے اور نہ وہ آخرت کی نعمتوں اور راحتوں سے مستفید ہوسکے گا۔

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا سب سے بڑا دُشمن تمہارا نفس ہے جو تمہیں بُرے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل وخوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار کرتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز واکرام کرو، کھانا کھلاؤ اور کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلا اور مصیبت میں ڈال دے اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! اس سے زیادہ بُرا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا۔آپ نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔

دوزخ میں جنت کی خواب گاہیں ڈھونڈنا

اُس کا سکون چھن گیا کتنی ہے تلخی حیات
جس نے کچھے ہیں دوستو! فانی بتوں کے نمکیات

جو انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ سے دل لگاتا ہے، بالخصوص نامحرم عورتوں یا حسین امرد لڑکوں کے ساتھ عشق ومحبت لڑاتا ہے، وہ کبھی چین اور سکون سے زندگی نہیں گزار سکتا۔اس کا سکونِ دو جہاں چھین لیا جاتا ہے اور اس کی زندگی اس پر تلخ کردی جاتی ہے کیونکہ سکون کو اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد کے ساتھ منحصر کردیا ہے جبکہ اللہ کا

عاصی اور نافرمان اللہ تعالیٰ کا ذاکر نہیں کہلا سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اللہ کی یاد میں مشغول سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے کُلُّ مُطِیْعِ اللّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ کہ ہر اللہ کی اطاعت کرنے والا اللہ کا ذاکر ہے۔

حدیث شریف میں مضمون آیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے اللہ کی ناراضگی اور غصہ اُترتا ہے، اس لئے خدا کو ناراض کر کے کسی کو چین اور سکون مل جائے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لطفِ حیات کی ضمانت اللہ کی یاد اور ایمان وعملِ صالح میں منحصر ہے۔ حضرت والا نے اپنی کتاب ''روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج'' صفحہ: ۲۸ میں ایسے لوگوں کے واقعات ذکر کیے ہیں جن سے ان کی زندگی کی کڑواہت اور تلخی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ واقعہ نمبر تین میں ہے کہ ایک ڈاکٹر کا لڑکا انجینئرنگ کی ڈگری لندن سے لے کر احقر کے پاس آیا اور بتایا کہ میں لندن میں عشقِ مجازی کا شکار ہوا اور بالکل نامرد ہو چکا ہوں، علاج کیا مگر نفع نہیں ہوا۔ باپ نے شادی کی، عورت نے ایک ہفتہ کے اندر میری نامردی سے مایوس ہو کر طلاق لے لی اور اب منہ چھپائے گھر کے اندر رہتا ہوں، ہر طرف سے موت نظر آرہی ہے، مگر موت بھی نہیں آتی۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ دوزخی کو ہر طرف سے موت نظر آئے گی مگر وہ مرنے نہیں پائے گا۔

توبہ نصوح پر جنت کا وعدہ

توبہ کریں گناہ سے لیکن ہو صدق دل سے بھی
حشر میں ہوں گے فائزوں پیمیاں ہوں گی فائزات

حضرتِ والا دامت برکاتہم گناہوں کے بحرِ ظلمات میں ڈوبے ہوئے اور حلاوتِ زندگی سے محروم فانی بتوں کے عشاق کے لئے راہِ عافیت وراحت اور ان ظلمات سے بچ نکلنے کا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں اور وہ طریقہ بارگاہِ الٰہیہ میں صدقِ دل سے توبہ کرنا ہے جس کی برکت سے حیاتِ دنیویہ بھی بالطف ہو جاتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو جائے گی۔ پر یہ توبہ صدقِ دل سے ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾

(سورۃ التحریم، آیت: ۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، ص: ۵۰۴)

یعنی دل میں گناہ پر کامل ندامت ہو اور آئندہ اس کے نہ کرنے کا پختہ قصد ہو۔ اس میں تمام احکامِ دین، فرائض وواجبات بھی داخل ہو گئے کہ ان کا چھوڑنا گناہ ہے اور تمام محرمات اور مکروہات بھی آگئے کہ ان کا کرنا گناہ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ آدمی اپنے گزشتہ عمل پر نادم ہو اور پھر اس کی طرف نہ لوٹنے کا پختہ ارادہ اور عزم رکھتا ہو اور کلبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ زبان سے استغفار کرے اور دل میں نادم ہو اور اپنے بدن اور اعضا کو آئندہ اس گناہ سے روکے۔ (معارف القرآن، ج: ۸، ص: ۵۰۵)

ایسی توبہ پر اللہ تعالیٰ جنت دینے کا وعدہ فرما رہے ہیں اور ایسی توبہ پر نعمتوں کا ملنا قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے۔

حقیقتِ علم اور جدید علوم

ہیں تو خدا سے دور دور لیکن زباں پہ ہے ضرور
دعویٔ علمِ ارضیات دعویٔ علمِ فلکیات

صاحبو! اصل حقیقی علم وہ ہوتا ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف راہ دکھلائے اور جس کو حاصل کر کے مرضیات و نامرضیاتِ مولیٰ کا علم حاصل ہوتا کہ جن باتوں سے خدا راضی ہو ان پر عمل کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی نامرضی والے اعمال سے بچا جائے اور یہی ہمارا حقیقی مقصدِ تخلیق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہمیں بھیجنے کے بعد اور ہمیں ایک مقصد کی تکمیل کا حکم دے کر اس کی صورتیں اور شکلیں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائیں اور ہر دور میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قوموں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے رہے اور ان کو خدا کی مرضی و نامرضی سے مطلع کرتے رہے۔ یہی حقیقت ہے علمِ وحی کی اور حقیقت میں علم اسی کو کہتے ہیں ؎

علمے کہ راہ بحق نہ نماید جہالت ست

جو علم اللہ کی راہ نہ دکھلائے وہ در حقیقت جہالت ہے اور خدا سے دوری اور بُعد کا سبب ہے۔ اسی لئے اس علم پر قرآن و حدیث میں مذکور فضائل مرتب کرنا اور ان کو اس کا مصداق قرار دینا یا اس کے لئے احادیث اور آیات استدلال میں پیش کرنا یہ سراسر دین میں تحریف کے مترادف ہے۔

چنانچہ آج کل سائنس کی جدید معلومات اور ترقیات کے حصول کے خاطر اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنا بلاشبہ جائز بلکہ بعض اوقات مستحب اور مزید آگے بڑھ کر بعض احوال میں فرض ہو جاتا ہے جیسا کہ مثلاً کسی اسلامی ملک کو خود کفیل بننے کے لئے اور کفار کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے لئے ایسی جدید مشینری (Machinery)، اسلحہ اور نئی قسم کی دفاعی نوعیت کی چیزیں درکار ہوں تو پھر اس ملک کے کچھ افراد پر اس ضرورت کو پورا کرنا فرض ہے تاکہ کفار کی غلامی سے رہائی اور چھٹکارا حاصل ہو، اس لئے ایسے علوم کی علی الاطلاق مخالفت کرنا یا اُن کے سیکھنے اور پڑھنے پڑھانے سے روکنا درست نہیں ہے۔

ہاں! البتہ ان علومِ فلکیات وارضیات اور جدید نوعیت کے دیگر فنون کے سیکھنے، سکھانے اور پڑھنے پڑھانے پر علمِ دین کے فضائل منطبق کرنا یا ان علوم کو سیکھ کر علمِ دین سیکھنے کی ضرورت سے انکار کرنا قطعاً غلط اور تحریف کے مترادف ہے۔

مسلمان بحیثیت مسلمان کے اولاً قرآن و سنت کے علوم سیکھنے کا مکلّف ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت اور بارگاہِ الٰہی میں مقرب و مقبول ہونے کا واحد راستہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر علم سیکھے دنیا و آخرت کی فلاح ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے قرآن پاک کی آیت:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾
(سورۃ التحریم، آیت: ۶)

ترجمہ: اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۵۰۱)

اس کی تفسیر کے ضمن میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا کہ حضراتِ فقہا نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میرے بیوی بچو! تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری زکوٰۃ، تمہارا مسکین، تمہارا یتیم، تمہارے پڑوسی۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔

تمہاری نماز، تمہارا روزہ وغیرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں، ان کو خوشی اور پابندی سے ادا کرو اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دین سے جاہل اور غافل ہوں۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۵۰۲)

حاصلِ لطفِ کائنات

جس کو خدا نے بخش دی لذتِ ذکر فضل سے
اخترؔ وہ پاگیا ہے بس حاصلِ لطفِ کائنات

اللہ تعالیٰ کے قرب اور فلاحِ دنیوی واخروی کے لئے علمِ دین کا سیکھنا کتنا اہم ضروری ہے؟ اس پر اوپر کے شعر میں کچھ عرض کیا گیا۔ اب حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں علم کے ساتھ ذکر کی اہمیت کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور گویا دونوں شعروں کے مجموعے سے بات مکمل اور پوری ہوگئی کہ علم وذکر جب یہ دونوں اکٹھے ہوں گے۔ تو پھر انسان کی دین ودنیا دونوں ہی بالطف ہوجائیں گی۔ اگر کسی کے پاس صرف علم ہو لیکن اس کے ساتھ ذکر وفکر، خوف وخشیت، تقویٰ للّٰہیت نہ ہو تو درحقیقت بظاہر وہ علم ہے، مگر اصلاً نہ تو وہ قرآن وسنت کے علم کا مصداق ہے نہ ہی مقصود کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:

﴿مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنْ تَجَمَّعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَكَمَّلَ﴾

ترجمہ: جس کے پاس صرف ظاہری علم ہو اور تقویٰ وپرہیزگاری سے عاری ہو، تو فسق وفجور کی وادی میں جاگرے گا اور جس کے پاس بغیر دین کے علم کے طریقت وتصوف ہو تو وہ زندیق، بے دین ہوجائے گا، ہاں جو دونوں کا جامع ہو وہ کامل اور بامراد ہوگا۔

اس تشریح کی روشنی میں کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح حضرت کے یہ دونوں شعر علم وذکر کے باہمی ارتباط اور

تعلق کی اہمیت پر باہم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ٹھیک اسی طرح ان دونوں اخیری شعروں میں گویا کہ پوری نظم میں بیان کردہ مضامین کی تحصیل کے طریقے کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے سالک!علم وذکر کومضبوطی سے پکڑلو!تو دنیاوآخرت کے جملہ مقاصد بحسن وخوبی اور بعافیت وراحت حاصل ہوسکیں گے۔باقی ذکر کی حلاوت ولطف کے مضامین کتاب میں دوسرے مواقع پر مذکور ہے اوراسی کوشاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مختصراور جامع لفظوں میں یوں ارشادفرمایاذکرذاکرکومذکورتک پہنچادیتاہے۔

کوئی حاجت ہورکھتاہوں تری چوکھٹ پہ سراپنا

الٰہی اپنی رحمت سے تو کر دے باخبر اپنا
نہ انجم ہیں ہمارے اور نہ یہ شمس و قمر اپنا

سوا تیرے نہیں ہے کوئی میرا سنگِ در اپنا
کوئی حاجت ہو رکھتا ہوں تری چوکھٹ پہ سر اپنا

خداوندا محبت ایسی دے دے اپنی رحمت سے
کرے اخترؔ فدا تجھ پر یہ دل اپنا جگر اپنا

میں کب تک نفس دُشمن کی غلامی سے رہوں رُسوا
تو کرلے ایسے ناکارہ کو پھر باردِگر اپنا

چھڑا کر غیر سے دل کو تو اپنا خاص کر ہم کو
تو فضلِ خاص کو ہم سب پہ یاربّ عام کر اپنا

بہ فیضِ مرشدِ کامل تو کردے ہنس زاغوں کو
کہ وقفِ خانقاہِ شیخ ہے قلب و جگر اپنا

تغافل سے جو کی توبہ تو ان کی راہ میں اخترؔ
ہمہ تن مشغلہ ہے ذکر کا شام و سحر اپنا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ انجم: ستارہ۔شمس وقمر: سورج وچاند۔ہنس: چڑیا۔زاغوں: کوے۔
تغافل: غفلت۔ہمہ تن:......۔

اپنے خالق کی معرفت مقصدِ حیات ہے

الٰہی اپنی رحمت سے تو کردے باخبر اپنا
نہ انجم ہیں ہمارے اور نہ یہ شمس و قمر اپنا

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایاالرَّحمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا کہ رحمٰن کے متعلق کسی باخبر بندے سے پوچھ لو۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾
(سورۃ الذاریات،آیت: ۵۶)

ترجمہ:اور میں نے جن وانس کو(دراصل)اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔(معارف القرآن،ج:۸،ص:۱۷۱)

بعض مفسرین جیسے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لِیَعْبُدُوْنِ یہاں لِیَعْرِفُوْنِ کے معنی میں ہے تو گویا دنیا میں پیدا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے باخبر ہونا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہر مؤمن کے لئے لازم اور ضروری ہے۔ رہ گیا قرآن میں عبادت سے تعبیر کرنا تو وہ اس لئے ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں وہی معرفت معتبر ہے جو عبادت کی راہ میں ہو اور سنت وشریعت پر عمل کرکے ہی اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ممکن ہے۔ محض عقلی دلیلوں اور فلسفی بحثوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ تک رسائی ممکن نہیں۔

حضرتِ والا نے اس شعر میں یہی دعا کی ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنے باخبر بندوں میں شامل کرلے اور اپنی معرفت دے دے۔ پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے صاف لفظوں میں گویا کہ یہ اعلان فرمادیا ہے کہ اے لوگو! اگر تم اللہ کو جاننا چاہتے ہو تو پھر اس کے لئے سہل اور آسان صورت یہ ہے کہ کسی باخبر بندے سے اپنا جوڑ پیدا کرلو اور اس سے معلوم کرلو اور پھر اگلی آیت میں باخبر بندوں اور عبادالرحمٰن کی صفات بھی بتادی گئی ہیں تاکہ اللہ کے باخبر، نیک صالح بندوں کے معیار اور کسوٹی کا علم ہوجائے اور اپنی دینی رہنمائی کے لئے غلط ہاتھ نہ بڑھائے اور گمراہی سے محفوظ ہوجائے۔

سائنسی تحقیقات وایجادات ضرورت ہے مقصد نہیں

صاحبو! آج کل اگر ہم اپنی حالت پر غور کریں تو پتہ چل جائے گا کہ اب ہمارا مبلغِ علم ومعرفت، محورِ سعی و کوشش اور منتہاءِ جدوجہد بس صرف ماہ وانجم اور شمس وقمر کی تحقیقات میں پڑ جانا اور نوع بنوع دنیوی اشیا کی کھوج اور جستجو میں بالکل محو ہونا اور مٹ جانا اور اس میں لگ کر ایسا کھو جانا اور گم ہوجانا ہے کہ اپنے خالق ورب سے بالکل ناواقف اور اس کی مرضیات ونامرضیات سے بالکل بےخبر اور ناآشنا رہنا۔

چنانچہ اکثر صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے اردگرد اور ماحول کی جملہ اشیا کے متعلق بڑی تفصیلی

معلومات اور بڑی گہری جزئیات کی معرفت رکھتے ہیں اور نئی ایجادات اور مشینوں کا علم اور سائنسی دنیوی علم میں مہارت کی جستجو رکھتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سب علوم پر فخر کرنا ایک کمال سمجھتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں دنیا وآخرت کے کسی موڑ پر کام آنے والی نہیں ہیں۔ جیسا کہ اپنے جملہ نوع کے متعلقین کے تعلق اور اس کے تقاضے اور ان کی تفصیلات کا بڑی حد تک علم رکھتے ہیں اور ان تعلقات اور تقاضوں کو پورا کرنے پر ہم اپنے تعلقِ خداوندی کو قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا عبدیت کا تعلق ہے۔ باپ، بیٹا، شوہر، بیوی، ڈاکٹر، مریض، چچا، تایا، خالو، پھوپھا، پھوپھی، ماموں، ممانی وغیرہ وغیرہ ان سب رشتوں کو ہم بخوبی سمجھتے اور جانتے ہیں اور ان میں باہمی نسبتوں کا پاس ولحاظ بھی رکھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ سے ہمارا مالک ومملوک، حاکم ومحکوم، خالق ومخلوق، آقا وبندہ ہونے کا جو تعلق ہے، کیا ہم نے کبھی اس تعلق اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی؟ اور پھر اس پر عمل پیرا ہوئے یا نہیں ہوئے؟

تمام انبیائے کرام علیہم السلام انسانوں کو ان کے خالق سے یہ رشتہ بتانے اور پھر اس کے تقاضوں کی تفصیلات سے آگاہ کر کے بندہ کو اللہ سے جوڑنے کے لئے آئے۔ اس لئے جن قوموں نے خدا کے باخبر بندے یعنی نبیوں کی اطاعت واتباع اختیار کی وہ فلاح اور کامیابی پاگئے۔ جنہوں نے روگردانی کی اور منہ موڑا وہ ناکام ونامراد ہوئے۔ اب جبکہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ باقی نہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے قوی تعلق اور نسبتِ خاصہ حاصل کرنے اور اُس ذاتِ عالی کی معرفت کے لئے اس دور کے باخبر بندوں یعنی علماءِ صالحین کاملین کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنے اور ان کے ساتھ رہ پڑنے کی ضرورت ہے تبھی انسان اللہ تعالیٰ کا باخبر بندہ بن سکتا ہے۔

یک در گیر محکم گیر

سوا تیرے نہیں ہے کوئی میرا سنگِ در اپنا
کوئی حاجت ہو رکھتا ہوں تری چوکھٹ پہ سر اپنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اپنی معرفت اور قرب کی دولت اس لئے بھی عطا کردے کہ نہ دنیا کے ماہ وانجم میرے کام کے ہیں اور نہ چاند وسورج سے مجھے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی پوری کائنات میں کوئی در میرے جذباتِ نیازمندی پیش کرنے کا مرکز ہے اور نہ سوائے تیرے کسی در سے میری حاجت روائی اور مشکل کشائی کا امکان ہے۔ اے میرے اللہ! میرا سر صرف تیرے در پر جھکتا ہے اور میں صرف تیرے سامنے سربسجود ہو کر اپنی حاجت وضرورت پیش کرتا ہوں۔ میں نے سوائے تیرے کسی کو اپنا نہیں بنایا کیونکہ کہ تیری ہی ذات سے میری تمام اُمیدیں وابستہ ہیں۔ جب بھی مجھے دنیوی یا اخروی کوئی حاجت درپیش ہوتی ہے۔ رنج وغم اور حزن وملال پیش آتا ہے تو میں تیری ہی بارگاہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ﴾

(مناجات مقبول)

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے برادرانِ یوسف سے کہا تھا اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اور جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

(سورۂ الانعام، آیت: ۱۶۲)

ترجمہ: فرما دیجئے! کہ (اس دین کا حاصل یہ ہے کہ) بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لیے ہے جو مالک ہے سارے جہاں کا۔ (معارف القرآن، ج:۳،ص:۵۰۷)

غرض یہ کہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی موت و حیات اور خوشی اور غم اور اپنی ہر نوع کی حاجت اور ضرورت کو ہر گھڑی بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا اور عبدیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جیسی بھی حالت ہو ہم خدا کی طرف رجوع رہیں۔

اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے در کو اس مضبوطی سے پکڑتا ہے اور اس پر جمتا ہے اور کسی بھی حال میں اللہ کا در چھوڑ کر غیر اللہ کی طرف نظرِ التفات بھی نہیں کرتا اور نہ غیر سے کوئی اُمید و خوف وابستہ رکھتا ہے تو پھر یاد رکھئے کہ وہ خدا اتنی غیرت اور اتنی رحمت والا ہے اور ایسی قدر دانی کرنے والا ہے کہ جب کوئی شخص اس کے در پر روتا رہتا ہے اور اس کے در پر ذلیل ہوتا ہے اور صرف اُسی کے در پہ جھکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُسے مخلوق کے در پہ رونے اور جھکنے اور ان کے سامنے ذلیل ہونے سے محفوظ کر دیتے ہیں۔

اسی لیے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو سارے غموں کو چھوڑ کر اپنا ایک غم بناتا ہے یعنی آخرت کا غم اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے تمام غموں کی طرف سے کافی ہو جاتے ہیں اور جس کو مختلف غموں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہو تو پھر اللہ کو پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کون سی وادی میں ہلاک ہو جائے۔

اسی مضمون کو فارسی کے مقولے میں بزرگوں نے یوں ذکر کیا ہے ''یک در گیر محکم گیر''، یعنی ایک اللہ کے در کو پکڑو اور مضبوطی سے پکڑو تو یہ باقی سارے دروں سے چھٹکارا پانے کا آسان راستہ ہے۔

اللہ کی محبتِ اشد ہونا اہلِ ایمان کی نشانی ہے

خداوندا محبت ایسی دے دے اپنی رحمت سے
کرے اخترؔ فدا تجھ پر یہ دل اپنا جگر اپنا

اس سے پہلے شعر میں ارشاد فرمایا تھا مجھے جو بھی حاجت ہوتی ہے تو میں آپ کی ذات ہی سے مانگتا ہوں۔ اے میرے خدا! میری جملہ حاجات میں سب سے بڑی حاجت تیری محبت ہے، میں تجھ سے اس کی بھیک مانگتا

ہوں، تُو مجھ پر خصوصی فضل فرما کر مجھے اپنی ایسی محبت عطا فرما کہ میرے لئے میری سب سے قیمتی چیز یعنی میرا جان و دل تجھ پر قربان کرنا آسان ہو جائے۔ اے اللہ! صرف تیری رحمت ہی سے مجھے ایسی محبت حاصل ہو سکتی ہے اور بس صرف تیرے فضل و کرم ہی سے میں اس کی بھیک مانگتا ہوں، اس لئے نہیں کہ اختر کو اس کے استحقاق کا دعویٰ ہے اور یہ تیری عظیم ترین نعمت ہے جو بھی نعمت بندے کو حاصل ہوتی ہے محض تیرے فضل و کرم سے ہوتی ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری ہے وَمَا بِکُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ کہ تمہیں جو بھی نعمت پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ تم کو جو بھی خیر اور خوبی پہنچی سو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اللہ کی محبت کا مانگنا سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

چنانچہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ کی محبت کو مانگا۔ دعا میں ہے اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ کہ اے اللہ! مجھ کو اپنی محبت دے دیجیے! اور پھر وہ محبت بھی ایسی ہو کہ میں اپنا جاں و دل تجھ پر قربان کر دوں یعنی تو مجھے ہر شئے سے زیادہ محبوب ہو۔ حتیٰ کہ میری جان و دل سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

چنانچہ اسی طرح کی دعا حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں مانگی ہے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَآءِ اِلَیَّ اے اللہ! مجھے اپنی محبت تمام چیزوں میں زیادہ محبوب کر دے۔ اسی کے ضمن میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ دوسری چیزوں کی محبت بُری نہیں بلکہ اتنی محبت بُری ہے کہ جو ہمیں اپنا جان و مال اللہ کے راستے میں قربان کرنے سے روک دے۔

چنانچہ حضرتِ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ سے استدلال کر کے ارشاد فرمایا کہ اہلِ ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ سے اشد ہوتی ہے تو دوسری چیزوں کی محبت انچاس اور اللہ کی محبت اکیاون فیصد بھی ہو تو بھی اللہ کی محبت غالب اور اشد ہوئی اور جب بندے کے قلب میں اللہ کی محبت اشد ہو تو پھر اپنی جان و مال اور اہل و عیال سب کچھ اللہ کے لئے قربان کرنا اس کو آسان ہو جاتا ہے اور جب ان چیزوں کی محبت زیادہ ہو تو پھر اللہ و رسول کے احکام کو چھوڑ دینا اور ان سے بے اعتنائی اور لاپرواہی برتنا مشکل معلوم نہیں ہوتا اور نہ دل پر گراں اور دشوار گزرتا ہے بلکہ شدہ شدہ اس کے گناہ ہونے کا شعور اور احساس ہی دل سے نکل جاتا ہے۔ غیر اللہ کی محبت اللہ و رسول کی محبت کے مقابلے میں زیادہ ہونے پر ہی قرآنِ کریم کی یہ وعید مذکور ہے فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ایسے لوگ دنیا و آخرت کے چین و سکون سے محروم کر دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب و عقاب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اس لئے اللہ و رسول کی ایسی محبت اور خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کر دینے کا جذبۂ صادقہ ہی حضرتِ والا کے اس شعر میں مذکور دعا کا مصداق ہے۔

نفس وشیطان کی فرمانبرداری رسوائی کا باعث ہے

میں کب تک نفس دُشمن کی غلامی سے رہوں رُسوا
تُو کرلے ایسے ناکارہ کو پھر بارِدگر اپنا

نفس و شیطان کے دُشمن ہونے کا احساس وشعور ہونا اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ قرآنِ پاک میں ارشادفرماتے ہیں اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا کہ شیطان تمہارا دُشمن ہے، اس کو ہمیشہ دُشمن سمجھ کے رہنا اور فرمانِ نبوت ہے اِنَّ أَعْدٰی عَدُوِّکَ بَیْنَ جَنْبَیْکَ تمہارا سب سے خطرناک دُشمن تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان میں ہے اور نفس وشیطان بُرائی اور بے حیائی اور معصیت ونافرمانی کی دلدل میں انسان کو پھنسا کر اس کو ذلیل وخوار کر کے جنت کی نعمتوں سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایسی خصلت و عادت سے ہمیں آ گاہ کیا اور ارشادفرمایا اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْن اور ارشادفرمایا وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا

خلاصہ یہ کہ شیطان تمہارا صریح دُشمن ہے اور اس کے سب وعدے مکر وفریب اور دھوکہ ہیں اور نفس بُرائی کی طرف ہانک کر لے جانے والا ہے۔ یہی نفس نفسِ امارہ کہلاتا ہے، اس لئے جو نفس کا غلام بن کر رہے اور خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی کرتا رہے تو اس کی رسوائی اور ذلت وتباہی میں کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش نہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے متعلق یہ عرض پیش کررہے ہیں کہ اے خدا! میں نفس دُشمن کی غلامی سے نکلنا چاہتا ہوں اور پھر تیرا بننا چاہتا ہوں، اب تک جو کچھ ہوا سو ہو چکا، اب تجھ سے جدا رہنا برداشت وہمت سے باہر ہے اور اب حال یہ ہے ؎

دردِ فرقت سے مرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت میں ایک ماہیٔ بے آب ہے
تلخ تراز فرقتِ تو ہیچ نیست
بے پناہت غیر پیچا پیچ نیست

اصلاحِ قلب ہی اصل تزکیہ ہے

چھڑا کر غیر سے دل کو تو اپنا خاص کر ہم کو
تو فضلِ خاص کو ہم سب پہ یارب عام کر اپنا

ارشادفرماتے ہیں کہ اے اللہ! میرے دل سے اپنے غیر کو نکال کر صاف ستھرا کردے اور مجھے اپنے خاص بندوں میں شامل کرلے چونکہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے قبضے میں لیا ہوا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَا ... وَجَوَارِحَنَا بِیَدِکَ لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْھَا شَیْئًا﴾

اے اللہ! ہمارے دل، ہماری پیشانیاں اور اعضاء و جوارح آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ آپ نے ہمیں ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں بنایا۔

اس لئے آپ ہی سے یہ التجاء ہے کہ میرے دل سے سارے غیر اللہ کو نکال کے باہر کردے اور علائقِ دنیویہ سے میرے قلب کو بے تعلق کردے کہ دل میں سوائے آپ کے اور کوئی نہ رہے اور اس طرح میں آپ کے خاص بندوں میں شامل ہو جاؤں اور یہ چیز بغیر آپ کے فضلِ خاص اور رحم و کرم کے ممکن نہیں ہے، اس لئے آپ جبکہ میرے ربّ ہیں، میرے ظاہر و باطن کی تربیت کرنے والے ہیں تو مجھ پر اور میرے دوستوں پر اپنے فضل کو عام فرما کر سب کو تزکیہ عطا فرمادے، آمین۔

اس شعر میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دل غیر سے وابستہ نہ رہے۔ اگرچہ دل سے باہر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں اور آسائش کی چیزوں سے مستفید ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایک حد تک یہ ضروری ہیں جیسا کہ پانی کشتی کے چلنے کے لئے لازم اور ضروری ہے لیکن اگر پانی کشتی کے اندر جائے تو پھر وہ پانی اُس کشتی کو غرق کر کے تمام مسافروں کی تباہی اور بربادی کا سبب ہوگا، اس لئے حضرتِ والا نے دل کو غیر اللہ سے چھڑانے کی دعا کی ہے۔ جب تک دل میں غیر ہوتا ہے تو باقی جسم پر بھی غیر کی حکومت چلتی ہے لیکن جب دل میں صرف اللہ ہو تو پھر پورے بدن کا ہر ہر عضو حق تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرتِ والا کے کلام میں اکثر دل کو مخاطب بنایا گیا اور حضرت کی محنت کا میدان بھی زیادہ تر یہی دل ہے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کلامِ مبارک سے ہوتا ہے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، ج: ۱، ص: ۱۳)

بلاشبہ انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو! وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔

معلوم ہوا سارے جسم کی اصلاح اور فساد کا مدار دل کی اصلاح اور فساد پر ہے، اس لئے دل کی پاکیزگی اور صفائی سارے جسم کی پاکیزگی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تاثیرِ صحبت ایک امرِ فطری ہے

یہ فیضِ مرشدِ کامل تو کردے ہنس زاغوں کو
کہ وقفِ خانقاہِ شیخ ہے قلب و جگر اپنا

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سنت جاری ہے کہ انسان جس طرح کی صحبت میں رہتا ہے اسی نوع کے اخلاق و عادات اس میں آنے لگتی ہیں۔ اگر صالحین کی صحبت میں رہے تو طبیعت میں صلاح کا اثر محسوس ہونے لگتا ہے اور اگر بُرے لوگوں کی صحبت میں رہے تو طبیعت کا میلان اور رغبت برائیوں اور معصیتوں کی طرف ہونے لگتی ہے۔ دنیا بھر کی تقریروں، تحریروں اور وعظ و بیان کی بنسبت صحبت کی تاثیر کچھ اور ہی ہے۔ چنانچہ فارسی میں ایک شعر ہے ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کنند
صحبتِ طالح ترا طالح کنند

یعنی نیک کی صحبت تجھ کو نیک بنادے گی اور بُرے کی صحبت بُرا بنادے گی۔

قدرتُ اللہ اور سنتُ اللہ کا فرق

صاحبو! قدرتُ اللہ اور سنتُ اللہ میں بہت فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں اور ناممکن نہیں، اسی لئے حق تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی حجت تام کرنے اور اپنی قدرتِ کاملہ کو بیان کرنے کے لئے قرآنِ کریم میں انسانوں کی چار طرح کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی قدرتِ کاملہ کا مظہرِ تام بنایا۔ چنانچہ بغیر ماں اور باپ کے صرف مٹی سے پیدا کیا گیا۔

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾
(سورۃ النسآء، آیت: ۱)

ترجمہ: اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی نے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔ (معارف القرآن، جلد:۳، ص:۲۷۷)

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرتِ حوا کو پیدا کیا تو بغیر والدہ کے صرف والد سے اولاد کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی دلیل ہے اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے صرف حضرتِ مریم سے پیدا کیا۔ یہ بغیر باپ کے تخلیق کی مثال ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ۝مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

(سورۂ مریم، آیت: ۳۴-۳۵)

ترجمہ: یہ ہے مریم کا بیٹا سچی بات جس میں لوگ جھگڑتے ہیں، اللہ ایسا نہیں ہے کہ رکھے اولاد، وہ پاک ذات ہے۔ جب ٹھہرالیتا ہے کسی کام کا کرنا، سو یہی کہتا ہے وہ اس کو کہ ہو سو وہ ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۲۹)

جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرماتے ہیں تو ارادہ کرتے ہی مراد وجود میں آجاتی ہے۔ یہ سب انواعِ تخلیق پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے پیدا کرسکتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کسی عورت کو بغیر شوہر کے اور شوہر کو بغیر عورت کے اولاد حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ اللہ اس پر قادر ہے۔ اس طرح کی سوچ غیر اسلامی ہے، بے بنیاد اور غلط ہے کیونکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کی باہمی طور پر خصوصی ملاقات کے نتیجے میں اولاد وجود میں آتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں آتی اور ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی سنت کو دیکھنے ہی کے مکلّف ہیں کیونکہ وہی ہمارے لئے خدائی شریعت اور ضابطہ حیات ہے۔ اُس سے بال برابر ہٹنا حدودِ شریعت سے تجاوز کرنا اور انحراف ہے۔ جیسے کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور توکل اختیار کرے مگر حدودِ توکل سے تجاوز کر جائے اور اپنے اونٹ اور جانوروں کو باندھ کر محفوظ جگہ میں رکھنے کے بجائے ایسا ہی کھلا چھوڑ دے اور یوں کہے کہ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے تو یہ توکل نہیں بلکہ سراسر تعطل ہے جس کی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔

چنانچہ ایک صحابی کو حکم دیا قَيِّدْ وَتَوَكَّلْ پہلے اونٹ کو باندھو، پھر بھروسہ کرو! یعنی پہلے سببِ حفاظت اختیار کرو، پھر اس کا نتیجہ اللہ کو سونپ دو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر اونٹ کو باندھے ہوئے اس کی حفاظت پر قادر ہے، مگر ہم دنیا میں رہتے ہوئے قدرتُ اللہ کی طرف دیکھنے کے مکلّف نہیں بلکہ سنتُ اللہ کے مکلّف ہیں۔

صحبتِ شیخ سے متعلق ایک سوال کا جواب

صاحبو! اس طرح کی تمہید سے میرا مقصود اصل میں بعضوں کے ذہن میں اُبھرنے والے اس سوال کا یہ جواب دینا ہے کہ ہمیں شیخ اور دینی مشیر اور مصلح اور مرشد کی ضرورت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ بغیر شیخ کے ہماری اصلاح فرمادیں۔ بس کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ پڑھ کر ہم اپنے مقصود کو پاسکتے ہیں۔ کسی شیخ سے تعلقِ اصلاحی کی کوئی حاجت نہیں۔

درحقیقت اس سوال کا منشاء وہی مضمون ہے جو اوپر عرض کیا گیا کہ سنت اللہ اور قدرتُ اللہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی سنت قوموں کی رشد و ہدایت اور ان کی اصلاحِ حال کے لئے یہی جاری ہے کہ کتابُ اللہ کے ساتھ رجالُ اللہ بھی بھیجے گئے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کتابیں نازل فرمائیں۔ تو اُن کتابوں پر عمل کرانے اور ان کو زندگیوں میں معمول بنانے کے

لئے رجالُ اللہ یعنی انبیاء بھی بھیجے ورنہ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھے کہ صرف اپنی کتاب آسمان سے نازل کر کے قوموں کو اس کے پڑھنے کا مکلّف بنایا جاتا اور پھر وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کو پالیتے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اور آگے بڑھ کر یہ عرض ہے کہ اگر سائل کے سوال کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس پر اُن سے پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھے؟ کہ بغیر نبیوں کے اور بغیر کتابوں کے اور بغیر احکام کا مکلّف بنائے اور بغیر دنیا میں نوع بنوع مصائب و آلام کی تکلیف دیے، اپنا قرب دیتے اور جنت میں بھیج دیتے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن اس بات سے ہرگز صرفِ نظر نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نظام، قانون اور سنت وشریعت کے تحت پیدا کیا ہے۔ اُسی کی اتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے لہٰذا اس گفتگو کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ زندگیوں میں تبدیلی اور قوموں کی اصلاح و تربیت جس طرح بغیر انبیاء علیہم السلام کے ممکن نہ تھی۔ آج کے دور میں بغیر انبیاء کے وارثین کی صحبت اور تعلق کے ممکن نہیں جس طرح انبیاء زندگیوں میں نمونہ بنتے اور ان سے ان کی قوم دین سیکھا کرتی تھی، آج کے دور میں بھی اسی طرح اولیاءِ کاملین اور علماءِ ربانیین کی صحبتوں میں رہ کر دین سیکھا اور سمجھا اور اپنایا جاتا ہے۔

صحبتِ شیخ سے متعلق حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد

اصلاح وتزکیہ کی یہ صورت گویا کہ عین سنتِ انبیاء ٹھہری اور یہی وجہ ہے کہ حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے کامل متبع شریعت اولیاء اللہ کی صحبت اور ان سے تعلق کو فرضِ عین قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اصلاحِ نفس اور تزکیہ فرض ہے اور اس دور میں بغیر اہلُ اللہ کی صحبت کے یہ ممکن نہیں۔

حضرتِ والا اس شعر میں یہی دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے میرے شیخ کی دعاؤں اور توجہات اور ان کی تعلیمات وارشادات پر عمل واتباع کی برکت سے نیک اور صالح بنادے۔ میری حالت تو اس وقت مثل زاغ یعنی کوّے کے ہے، تُو اس حالت کو بدل کر مجھے ہنس کی طرح کردے۔ کوّا مردار پر گرتا اور مرتا ہے جبکہ ہنس پرندہ قیمتی موتی اُٹھاتا پھرتا ہے تو اے میرے اللہ! اس دنیاءِ فانی ومردار کی محبت کو مرے دل سے نکال اور اس کے شوق و رغبت سے مرے دل کو خالی کردے اور مجھے اس مردار اور فانی دنیا پر مرنے کی بجائے اپنی ذاتِ حی وقیوم کی خاطر مرنا نصیب کردے۔ سوائے تیری محبت ومعرفت اور تیرے تذکروں اور تیری یادوں کے سب کچھ فانی ہے اور مردار ہے۔ تیری یادیں اور تیرے تذکرے، میرے لئے گویا کہ موتی بلکہ اُس سے بڑھ کر ہیں اور اے خدا! اگرچہ میں تو کسی لائق نہ سہی لیکن میں نے جس ولیِ کامل کے قدموں میں اپنے کو ڈالا ہے۔ تیری محبت و رضاء کے حصول کی خاطر جس خانقاہِ شیخ میں میں نے اپنے دل وجان کو وقف کیا ہے اور جس کی آہ وزاری سے مجھے آہ وزاری کا مزہ ملا ہے۔ اس کی برکت سے میری حالت کو بدل دے کیونکہ تیرا وعدہ ہے۔

﴿وحبتْ محبتی للمتحابین فیّ والمتجالسین فیّ والمتزاورین فیّ والمتباذلین فیّ﴾

(المشکوۃ، باب الحب فی اللہ ومن اللہ، ص:۴۲۶)

میری محبت ان کے لیے واجب ہو جاتی ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے میرے لئے محبت کرتے اور میری خاطر ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور میرے لئے آپس میں ملتے اور میرے لئے مال خرچ کرتے ہیں، الٰہی میری اس محبت کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے، اس لئے تو مجھے اپنے محبوبین میں شامل کر دے۔

تکمیلِ توبہ استقامت علی الطاعۃ سے ہے

تغافل سے جو کی توبہ تو ان کی راہ میں اخترؔ
ہمہ تن مشغلہ ہے ذکر کا شام و سحر اپنا

اولیاء اللہ کسی مقام پر پہنچ کر بھی اپنے آپ کو یہ نہیں سمجھتے کہ میں قرب اور ولایت کے انتہائی مقام پر پہنچ چکا ہوں اور غفلت کے تمام حجابات اُٹھائے جا چکے ہیں، اب میری عبادت و معرفت درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے بلکہ ہر گھڑی وہ اپنے پہلے حال کو اگلے حال کے مقابلے میں غفلتوں میں ڈوبا ہوا سمجھتے ہیں اور مرتے دم تک یہی حالت چلتی رہتی ہے، اسی لئے توبہ و استغفار میں دوسرے لوگوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اپنی طاعات پر بھی وہ لرزاں اور ترساں ہوتے ہیں اور ہر نئے لمحہ حیات کو پچھلے لمحاتِ زندگی سے زیادہ قیمتی بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا منتہاء اس پر ہوتا ہے کہ وہ بزبانِ حال یہ کہتے ہوئے ہوتے ہیں:

﴿ماعرفناک حقّ معرفتک وما عبدناک حقّ عبادتک﴾

اور یہی کمال درجے کی عبدیت اور بندگی ہے جو کہ انبیاء و اولیاء کا سب سے بڑا کمال ہے کہ پورے تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود وہ اپنے کئے پر نادم اور پشیمان رہتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں عاجزی اور تواضع کے جذبات پیش کرتے رہتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کچھ نہ کر سکے اور ہم نے عمر غفلتوں میں گزار دی۔ ہمارے پاس تیری رحمت کی اُمید کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔ اس سب کے ساتھ ساتھ ان کے لیل و نہار اور شب و روز اللہ کے تذکروں اور یادوں میں اور اس کی عظمت و محبت کی باتوں میں گزرتے ہیں، مگر اُن کا بھروسہ اس پر نہیں ہوتا وہ اس پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اپنی مغفرت کی اُمید اور بخشش کا سہارا رحمتِ الٰہی پر رکھتے ہیں۔ جیسے کہ حضرتِ والا کا ایک دوسرا شعر اسی مضمون پر ہے ؎

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

صاحبو! توبہ کی توفیق کی شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ جن غفلتوں اور معصیتوں کا صدور ہوا، ان پر ندامت کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا عزم ہو۔ اس لئے حضرتِ والا فرماتے ہیں کہ اب میرا حال یہ ہے کہ میرے

بدن کا ہر ہر عضو صبح و شام یادِ خدا میں مصروف ہے، اس لئے کہ ذکر صرف زبان سے اللہ اللہ کرنے کا نام نہیں بلکہ اعضاءِ بدن کو اللہ کے حکم کے سامنے جھکا دینا اور پورے قلب و قالب سے اللہ کا مطیع ہو جانا یہ بھی اللہ کا ذکر ہے۔

اس لئے فرمایا گیا کُلُّ مُطِیْعِ اللہِ ذَاکِرٌ اس لئے ذکر کا معنی یاد کرنا ہے تو جب ہمارے اعضاءِ بدن ہاتھ، پیر، آنکھ، کان، زبان کسی بھی عمل کے لیے حرکت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کو یاد کریں تو یہ دلیل ہے کہ یہ اعضاء ذکرِ الٰہی میں مشغول ہیں۔

مفسرین نے ذکر کی چار تفسیریں کی ہیں: (۱) ذکرِ لسانی (۲) ذکرِ فکری (۳) ذکرِ قلبی (۴) ذکرِ عملی۔

زبان سے اللہ کا ذکر اور دل ہی دل میں اللہ کی یاد اور پوری کائنات اور اللہ کی مخلوق میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کو پہچاننا اور ذرّے ذرّے میں فکر و تدبر سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا، یہ ذکرِ فکری ہے اور طاعاتِ الٰہیہ پر عامل ہونا یہ ذکرِ عملی ہے۔

اس لئے حضرتِ والا نے اپنے کلام میں یہ لفظ استعمال فرمایا کہ میں نے جب سے توبہ کی ہے تو اب ہمہ تن اللہ کی یاد میں صبح و شام مشغول رہتا ہوں۔ کبھی اللہ اللہ زبان پر ہوتا ہے، کبھی وعظ و تقریر اور درس و بیان کے ذریعے عظمت و معرفتِ خداوندی کے تذکرے ہوتے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور معصیتوں کے سمندر سے اُمتِ مسلمہ کو نکالنے کی تجاویز اور نسخے پیش کرنے میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ صبح و شام خدا کو یاد کرنا ہے۔

تجھے مشکل ہے کیا غم کو میرے زیر وزبر کرنا

تجھے مشکل ہے کیا غم کو میرے زیر و زبر کرنا
ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کرنا

تری قدرت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہوگا اے مالک
کہ ہم سے دُور اُفتادوں کو پھر نزدیک تر کرنا

ترے دستِ کرم کی کیمیا تاثیر کیا کہیے
کسی ذرّے کو تیرا دم میں خورشید و قمر کرنا

جو تیری راہ میں روباہ خصلت سے ہیں پسماندہ
تجھے مشکل نہیں ایسوں کو رشکِ شیرِ نر کرنا

یہی ہے راستہ اپنے گناہوں کی تلافی کا
تری سرکار میں بندوں کا ہر دم چشم تر کرنا

تجھے مشکل نہیں مسکیں کو سلطانِ جہاں کر دے
کرم سے اپنے اختر کو ترا شمس و قمر کرنا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **زیروزبر کرنا**: ختم کرنا۔ **رشکِ سحر**: صبح کا رشک کرنا۔ **ادنیٰ کرشمہ**: ……۔ **دُور اُفتادوں**: دور پڑے ہوئے یعنی گنہگار۔ **دستِ کرم**: فضل وکرم کا ہاتھ۔ **کیمیاتاثیر**: ……۔ **خورشیدوقمر**: سورج اور چاند۔ **رُوباہ خصلت**: لومڑیانہ عادت۔ **پسماندہ**: گرے ہوئے، نااہل۔ **رشکِ شیر نر**: شیروں کا رشک کرنا۔ **تلافی**: تدارک یعنی معافی۔ **چشم تر کرنا**: آنسوں بہانا۔

راہِ خداوندی کے غموں میں خوشیاں مضمر ہیں

تجھے مشکل ہے کیا غم کو میرے زیر و زبر کرنا
ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کرنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میں بظاہر غم زدہ اور دل ٹوٹا ہوا ہوں اور تیرے غموں کو دل پر اُٹھائے ہوئے ہوں، لیکن چونکہ یہ غم تیرے راستے کے غم ہیں اور حرام آرزوؤں اور تمناؤں کا خون پینے اور حسرتوں کا غم ہے، اس لئے میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ میرے اس غم کو حقیقی غم کی شکل میں تبدیل کردے جو انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام کی وراثت ہے اور جس غم پر دونوں جہاں کی ہزار خوشیاں قربان ہیں کیونکہ اس غم میں مجھے آپ کے قرب کا مزہ اور جینے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اے میرے اللہ! میرے شامِ غم کو رشکِ سحر بنادے کیونکہ دنیا کی خوشیوں

والے اور لذاتِ حیات میں مست اور دنیا کے دھوکوں میں پڑ کر دیوانے ہونے والے ساحل پہ پہنچ کر بھی طغیانی کے عالم میں رہتے ہیں اور میں تیرے لئے اُٹھائے ہوئے غموں کے سمندر کی موجوں کی طغیانی میں بھی ساحل کا مزہ پاتا ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ راہِ الٰہی میں کسی طرح کا مجاہدہ کرتا ہے اور من چاہی کو چھوڑ کر ربّ چاہی پر چلنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اسے ہر قدم پر منزلیں ملتی جاتی ہیں یعنی اللہ کے وہ وعدے جن کا خلاصہ دنیا و آخرت کی زندگی کو بالطف بنانا ہے اور حیاتِ طیبہ کا ملنا ہے تو وہ ہر قدم پر اپنی زندگی میں لطف اور حلاوت پاتا ہے۔

جیسا کہ مثلاً حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام حسن سے نظر بچانے پر حلاوتِ ایمانی حاصل ہونے کا وعدہ فرمایا تو جب ہمت و جرأت کے ساتھ اپنی نگاہ کو بچانے کا غم اُٹھائے گا تو اسی وقت اُسے حلاوتِ ایمانی نصیب ہو کر گویا اُس کی منزل مل جائے گی اور اسی طرح ہوتے ہوتے ایک دن وہ اپنی آخری منزل جنت میں پہنچ جائے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا، کا مستحق قرار پائے گا۔

جذب ہی دلیلِ قبولیت ہے

تری قدرت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہوگا اے مالک
کہ ہم سے دُور اُفتادوں کو پھر نزدیک تر کرنا

حضرتِ والا اپنی مناجات میں ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! آپ قادرِ مطلق ہیں، میں تو غفلتوں کی دلدلوں میں پھنسا ہوا ہوں لیکن آپ کی قدرت سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا قرب عطا فرما دیں گے۔ میں اپنی غفلتوں کی وجہ سے تیرے قرب کی منزل سے بہت دُور ہوں، مگر تو جب کسی کو چاہتا ہے تو اس قابل بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ فارسی میں ایک شعر ہے ؎

دادِ اُو را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد اوست

اے اللہ! تیرے دینے کے لئے اور تیری عطاء کے لئے قابل ہونا شرط نہیں بلکہ اے خدا! تیری عطاء ہی دلیلِ قابلیت ہے، اسی لئے قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾
(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۱۳)

ترجمہ: اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے (یعنی دینِ حق قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے) اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، ص: ۶۷۵)

قرآنِ کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اور اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتے ہیں خاص فرماتے ہیں۔

شعر کا خلاصہ یہ نکلا کہ بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی نالائقی اور اپنے نااہل اور ناکارہ ہونے کو پیش کر کے بدونِ استحقاق اللہ تعالیٰ کے فضل کی بھیک مانگے اور دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کا قرب مانگا جائے کیونکہ کسی عاشق کے لئے اپنے محبوب سے دوری ایک عذاب ہے۔ راہِ خدا کی کتنی ہی منازل طے کر لینے کے باوجود پھر بھی اولیاء اللہ اپنے کو دور اُفتادہ ہی میں شمار کرتے ہیں کیونکہ بقول حضرت اقدس: ''یہ سمندر ہے وہ جس کا ساحل نہیں''

اللہ کی ایک نظرِ کرم رشکِ خورشید وقمر بنا دیتی ہے

ترے دستِ کرم کی کیمیا تاثیر کیا کہیے
کسی ذرّے کو تیرا دم میں خورشید و قمر کرنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے خدا! تیرے لئے مجھے اپنا قرب دے دینا اور دولتِ معرفت ومحبت سے مجھے مالا مال کر دینا اور مجھ ذرّۂ ناتواں کو اپنی ایک نظرِ کرم سے رشکِ خورشید وقمر بنا دینا، بہت ہی آسان اور سہل ہے۔ تیرے کرم کی نگاہ جس ذرّے پر پڑ جاتی ہے وہ یکدم میں خورشید وقمر بن جاتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

(سورۂ یٰس، آیت: ۸۲)

ترجمہ: جب وہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، ص: ۴۱۱)

جب کسی کی قسمت کا خورشید چمکنا ہوتا ہے تو یکدم میں وہ شقاوتوں کی تنگ وتاریک وادیوں سے نکال کر ہدایت کا خورشید وقمر بنا دیا جاتا ہے اور شقاوت وبدبختی کی ظلمتوں سے نکال کر سعادت ونیک بختی کی منزل پر پہنچا دیا جاتا ہے۔

جوش میں آئے جو دریا رحم کا
گبرِ صد سالہ ہو فخرِ اولیاء

چنانچہ تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات منقول ہیں کہ کفر وفسق میں نہایت شدید وسخت اور اسلامی دُشمنی و دینی عداوت میں پیش پیش اور دنیا جہاں کی برائیوں اور معائب سے بھرا ہوا انسان ہوتا ہے، لیکن اللہ کی ایک نظرِ کرم سے کوئی معمولی سا واقعہ اور معمولی سی بات اس کے دل پر چوٹ مار دیتی ہے اور اس کی دینی ہدایت کا سامان بن جاتا ہے۔ پھر وہ قربِ الٰہی کی اونچی منازل طے کر کے آفتاب وماہتاب کی طرح چمکنے لگتا ہے اور اپنی زندگی میں دینِ اسلام کے لئے ایسی قربانیاں پیش کرتا ہے، مجاہدات وریاضات کی چکی میں اپنے کو ایسا پیستا ہے کہ جس کا اس سے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سکونِ قلبی کے متعلق ایک عبرت آموز واقعہ

چنانچہ ایک مرتبہ احقر دعوت وتبلیغ کے کام پر عرب جماعت کے ساتھ ساؤتھ افریقہ میں وقت لگا رہا تھا۔ مغرب کے بعد اپنے ایک عرب ساتھی کی ترجمانی کے لئے احقر گشت میں ساتھ گیا تو اس موقعہ پر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امریکا میں گزرا ہوا ایک واقعہ یوں سنایا:

''ایک عرب ساتھی مع اپنے چند احباب گشت کرنے کے لئے امریکہ میں کسی پارک (Park) میں نکلا۔ ساتھیوں نے مختلف حضرات سے وہیں ملاقاتیں کیں لیکن وہ کہنے لگا کہ میں ذرا تھکا ہوا ہوں، کچھ دیر یہیں بینچ (Bench) کے اوپر لیٹ کر سو جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ دوسری جانب یہ ہوا کہ ایک انگریز عیسائی اپنے فلیٹ (Flat) سے اُس کو دیکھ رہا تھا۔ جب اُسے یہ لگا کہ یہ شخص پارک میں شور شرابے کے باوجود آرام سے سویا ہوا ہے تو وہ اُتر کر اس کے پاس پہنچا اور اُس کے بیدار ہونے پر اُس سے یوں پوچھا: ''آخر اتنے شور میں اور لوگوں کی بھیڑ میں تمہیں لیٹ کر نیند کیسے آ گئی اور تم نے اُس کے لئے کون سی ٹیبلیٹ (Tablet) لی ہے جس سے تمہیں اتنی آرام سے نیند آ گئی کیونکہ میں اپنے شاندار ایئر کنڈیشنڈ (Airconditioned) کمرے میں دوائی لینے کے باوجود مشکل سے سو پاتا ہوں۔'' مگر وہ باہم ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتے تھے۔ جب دوسرے ساتھی گشت سے واپس ہو رہے تھے تو اس ساتھی کے پاس آئے اور پھر ایک دوسرے کی ترجمانی کی اور جواب ان کو یوں دیا کہ ہم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ کے ماننے والے ہیں اور اس کلمہ کا ماننے والا بالکل مطمئن اور پُرسکون ہوتا ہے۔ ذہنی ٹینشن (Mental Stress) اور ڈیپریشن (Depression) کا مریض نہیں ہوتا، اس لئے اُسے بغیر کوئی دوائی کھائے ہر جگہ نیند آتی ہے۔

چنانچہ اُس انگریز کو اس وقت اس بات سے بہت حیرت ہوئی اور تعجب سے اس نے پوچھا کہ کیا میں بھی اس کو پڑھ سکتا ہوں اور سیکھ سکتا ہوں؟ تو ساتھیوں نے بتایا کہ کیوں نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ مسجد چلیں۔ چنانچہ اس نے نظم بنایا اور ان کے ساتھ مسجد میں گیا۔ وہاں پر تعلیم ہو رہی تھی، ساتھیوں نے اُس کو وہاں بٹھا دیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کو نیند آنی شروع ہو گئی تو امیر صاحب نے کہا کہ ان کو لے جا کر آرام سے کمرے میں سلا دو، وہ کمرے میں لیٹ کر پانچ چھ گھنٹے آرام سے سوتا رہا جب سو کے اُٹھا تو بہت خوش نہایت مطمئن تھا۔ پھر اُسے غسل کرا کر کلمہ پڑھایا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اُسے اتنی خوشی اور اتنی فرحت و مسرت ہوئی کہ مارے خوشی کے وہ جماعت کے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ میں تم لوگوں کے لئے کتنے ڈالر کا چیک (Cheque) کاٹ کر پیش کروں؟ تو ساتھیوں نے جواب دیا کہ ہمارا یہ کام پیسوں وغیرہ کے لئے نہیں ہے اور اس شخص نے پھر بہت سے مساجد اور مکاتبِ دینیہ قائم کیے اور جید مسلمان بن گیا۔

سن لے اے دوست! جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

کسی کی تحقیر جائز نہ ہونے کی دلیل

صاحبو! اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ اجتباء واصطفاء کا یہی معاملہ ہے کہ جب وہ کسی کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں تو اس کو ظلمات سے نور کی طرف اور کفر سے اسلام کی طرف اور فسق وفجور سے طاعت ونیکی کی طرف اور غفلتوں سے اپنی یادوں کی طرف یکدم میں نکال کر اُس کو ہدایت کا آفتاب وماہتاب بنا دیتے ہیں۔

یہی تو وہ راز ہے جس کو اُمت کے تمام اولیاء اللہ نے بخوبی سمجھا اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلم کی تحقیر فی الحال اور کافر کی تحقیر کو فی المآل حرام قرار دیا ہے۔ قرآن میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مردہ سے زندہ یعنی کافر سے مؤمن اور زندہ سے مردہ یعنی مؤمن سے کافر کو پیدا کیا اور اپنی مشیت تامہ اور قدرتِ کاملہ کا ظہور فرما کر ان امور میں کسی انسان کے کسی درجے کے اختیار کو کلی طور پر بے اصل وبے معنی قرار دے دیا۔ نہ کسی نبی کو ان معاملات میں کوئی قدرت واختیار عطا ہوا اور نہ ہی کسی ولی کو بلکہ قرآن نے یہ اعلان کر دیا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ صرف میرے ہی لئے پیدا کرنا اور حکم دینا ہے۔

جیسا کہ حضرتِ والا کبھی ان اشعار کو پڑھتے ہیں جو گلزارِ ابراہیم کے ہیں ؎

کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو لاوے بت خانہ سے وہ صدیق کو
اہلیہ لوط نبی ہو کافرہ زوجۂ فرعون ہووے طاہرہ
زادۂ آزر خلیل اللہ ہو اور کنعاں نوح کا گمراہ ہو
دیر کو مسجد کرے مسجد کو دیر غیر کو اپنا کرے اپنے کو غیر
فہم سے بالا خدائی ہے تری عقل سے برتر خدائی ہے تری

سلوک ہمت سے طے ہوتا ہے محض آرزوؤں سے نہیں

جو تیری راہ میں روباہ خصلت سے ہیں پسماندہ
تجھے مشکل نہیں ایسوں کو رشکِ شیرِ نر کرنا

حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ پورے تصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ مامورات کے اوپر ہمت وقوت کو استعمال کر کے عمل کرنا اور منہیات اور معاصی سے پوری ہمت کے ساتھ اجتناب اور دوری اختیار کرنا۔

اسی کو حضرتِ والا نے یوں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر تقویٰ فرض کیا ہے تو تقویٰ کی ہمت بھی دی

ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ہمیں تقویٰ کی ہمت نہ دیتے تو پھر ہم پر تقویٰ بھی فرض نہ کرتے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ قدرت و وسعت سے زیادہ بندے کو احکام کا مکلّف نہیں بناتے۔

ان اشعار میں درحقیقت گناہوں سے بچنے اور طاعات پر جمنے کے سلسلے میں ہمت و جرأت، قوت و طاعت اور شجاعت و دلیری کی ضرورت ہے کہ جب خواہشاتِ نفس سے ٹکراؤ اور مقابلہ ہو تو ہمت سے، جرأت سے اس کا مقابلہ کرے اور اس کو پچھاڑ دے۔ یہی ہے شیرِ نر کی خصلت کہ وہ اپنی جرأت و دلیری سے اپنے ہر مدّمقابل کو پچھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ اور جو خواہشاتِ نفسانیہ کے تقاضوں کے مقابلے میں جرأتمندانہ اور دلیرانہ قدم نہیں اُٹھاتا بلکہ بے ہمتی اور بزدلی دکھا کر ان کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے اور لومڑیانہ خصلت کا شکار ہو جاتا ہے تو ایسا انسان اللہ کی راہ کو طے نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ راہ دلیری اور جرأت مندی سے طے ہوتی ہے، اسی لئے حقیقی بہادر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں وہ شخص ہے کہ جب حالت غضب میں ہو تو وہ اپنے اوپر قابو پالے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

﴿لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب، ج ۲، ص ۹۰۳)

بہادر اور پہلوان وہ شخص نہیں ہوتا جو اپنی جسمانی قوت سے کسی کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر اور پہلوان وہ شخص ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پالے اور اس کو کنٹرول (Control) میں رکھے۔

حضرت والا دامت برکاتہم اس شعر میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتے ہیں کہ اے خدا! جو تیری راہ کے مجاہدات اور ریاضتیں اختیار کرنے کے سلسلے میں کمزور اور بے حوصلہ ہیں اور نفس وشیطان کے مقابلے میں بزدل اور روباہ خصلت ہیں۔ تیری ذاتِ عالی سے یہ عرض ہے کہ ایسوں کو جرأت و ہمت کا پہاڑ بنا دے اور ایسی جرأت مندی اور دلیری عطا کر دے کہ ان کی بہادری اور جرأت رشکِ شیرِ نر بن جائے اور اے خدا! تیرے لئے ایسا کر دینا کوئی مشکل نہیں حضرتِ والا کے اس شعر میں سالکین کے لئے ایک سبق یہ ہے کہ ہر سالک کو چاہئے کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں اپنی عاجزی ہی پیش کرتا رہے، اپنے کو نہ تو شیر سمجھے اور نہ ایسا سمجھ کر بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو تو یہ صفتِ فقر واحتیاج اور اپنے کو عاجز اور درماندہ بنا کر پیش کرنا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرت و ہمت عطا ہونے کا ذریعہ ہے۔ اگر کبھی کبھی کوئی لومڑیانہ حرکت ہو جائے تو نہ اُس سے دلگیر ہو اور نہ مایوس ہو بلکہ برابر نفس سے ٹکر لیتا رہے اور اس پر غالب آنے کی فکر کرتا رہے جیسا کہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

نہ چت کر سکے نفس کے پہلواں کو
تو یوں ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے نہ ڈالے
ارے اس سے کشتی تو ہے عمر بھر کی
کبھی وہ دبا لے کبھی تُو دبا لے

اللہ کی شانِ مغفرت

یہی ہے راستہ اپنے گناہوں کی تلافی کا
تری سرکار میں بندوں کا ہر دم چشم تر کرنا

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لئے غَافِر، غَفُوْر اور غَفَّار تینوں الفاظ کا استعمال فرمایا۔ جیسا کہ بندے کے لئے ظَالِم، ظَلُوْم اور ظَلَّام بندے کے ظلم کی ان تینوں حالتوں کے مقابلے میں ویسے ہی تین الفاظ توبہ ومغفرت کے مضمون کے ارشاد فرمائے۔

صاحبو! آہ! ہمارا اللہ کیسا پیارا ہے اور کس قدر بندوں پر رحم کرنے والا ہے کہ بندے کو کسی بھی حالت میں اپنے در سے مایوس نہیں کیا بلکہ اعلان کر دیا کہ اے بندے! اگر تو ظَالِم ہے تو میں غَافِر ہوں۔ اگر تو ظَلُوْم ہے تو میں غَفُوْر ہوں اور اگر تو ظَلَّام ہے تو میں غَفَّار ہوں۔ کسی بھی حال میں میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ کیسے ہی بڑے بڑے گناہ کئے ہوں اور تو میری بارگاہ میں توبہ وندامت اور آہ وزاری کے ساتھ حاضر ہو تو میں صرف اتنا ہی نہیں کہ تیری ساری خطاؤں کو مٹا کر ختم کر دوں گا بلکہ ان کو حسنات سے مبدل کر دوں گا۔ خاص طور پر جبکہ توبہ کے ساتھ گریہ وزاری اور اشکِ ندامت بھی شامل ہو جائیں، اس لئے اللہ کے خوف سے اپنے گناہوں پر رونے کی احادیثِ مبارکہ میں بڑی فضیلت آئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوْعٌ وَإِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ ثُمَّ يُصِيْبُ شَيْئًا مِنْ حُرِّ وَجْهِهٖ اِلَّا حَرَّمَ اللهُ عَلَى النَّارِ﴾

(المشکوٰۃ، باب البکاء والخوف، ص:۴۵۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آنکھ سے اللہ کے خوف سے آنسو نکل کر اس کے چہرے پر گرتا ہے، اگرچہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ اس چہرے پر آگ کو حرام کر دیتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ حرم شریف میں آخرِ شب استغفار میں اس طرح روتے تھے کہ کلیجہ سننے والوں کا پھٹا جاتا تھا اور ایک رات صرف اس شعر کو سجدے میں پڑھتے رہے اور روتے رہے۔

اے خدا! ایں بندہ را رسوا مکن
گر بدم من سرِّ من پیدا مکن

اے خدا! اس بندے کو میدانِ محشر میں رسوا مت فرمانا۔ اگرچہ ہم بُرے اور گناہ گار ہیں، آپ ہمارے عیوب کو مخلوق پر ظاہر نہ فرمائیے گا۔

چار گواہوں کی گواہی

صاحبو! اللہ تبارک وتعالیٰ توبہ کے ذریعے گناہوں کی ایسی تلافی فرماتے ہیں کہ گناہ کرتے وقت جو چار گواہ قائم ہوئے تھے ان سب کی گواہیوں کو مٹادیا جاتا ہے۔ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس وقت اس کی حرکت پر قرآن کی روشنی میں چار گواہ ہوجاتے ہیں۔

(۱) یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَاo اس روز زمین اپنی سب (اچھی، بری) خبریں بیان کرنے لگے گی۔ (سورۂ زلزال، پارہ:۳۰)

صحابہ کرام نے سوال کیا کہ زمین کیا خبریں بیان کرے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زمین پر جو اعمال کئے جاتے ہیں زمین اس کی گواہی دے گی۔

حضرت علامہ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ نے اپنے وصایا میں فرمایا کہ جس جگہ کوئی گناہ ہوجائے وہاں کچھ استغفار اور نیک عمل کرلو تاکہ وہ زمین تمہارے لئے نیکی کی بھی گواہ بن جائے۔

(۲) وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْo اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ (سورۂ تکویر، پارہ:۳۰)

(۳) كِرَامًا كَاتِبِيْنَo يَعْلَمُوْنَ مَاتَفْعَلُوْنَo عزت والے، عمل لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ (سورۂ انفطار، پارہ:۳۰)

(۴) چوتھی گواہی جن اعضاء سے اعمال ہوتے ہیں یہ اعضاء بھی قیامت کے دن اپنا عمل بیان کریں گے۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَo آج ہم مہر لگادیں گے ان کے منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے ان کے پاؤں جو کچھ وہ کماتے تھے۔ (سورۂ یٰسین، پارہ:۲۲)

تاثیرِ توبہ کا کرشمہ

اب توبہ کی برکت دیکھئے! صدقِ دل اور ندامت سے توبہ کرلینے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کے عزمِ مصمم سے یہ انعام ملتا ہے کہ گناہوں کے پہاڑ کے پہاڑ توبہ کی برکت سے اُڑ جاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی بارود جو مخلوق ہے پہاڑوں کو اُڑادیتی ہے تو حق تعالیٰ کی رحمت کی کیا شان ہوگی۔ گناہوں کے پہاڑ کیوں نہ اُڑادے گی۔ توبہ کی برکت اور اس کی تاثیر کا کرشمہ دیکھئے کہ حق تعالیٰ جس کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں تو اس کے تمام گناہوں کی شہادتوں کو مٹادیتے ہیں۔

اس مضمون کے ذیل میں اپنے وعظ کے اندر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں جس کو التشرف فی احادیث التصوف میں بھی تحریر فرمایا:

﴿اِذَا تَابَ الْعَبْدُ اَنْسَى اللّٰهُ تَعَالٰى الْحَفَظَةَ ذُنُوْبَهٗ وَاَنْسٰى ذٰلِكَ جَوَارِحَهٗ وَ مَعَالِمَهٗ مِنَ الْاَرْضِ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ تَعَالٰى وَلَيْسَ عَلَيْهِ شَاهِدٌ مِّنَ اللّٰهِ بِذَنْبٍ﴾

(المرقاۃ، ج: ۵، ص: ۹، المکتبۃ الحقانیۃ)

ترجمہ: جب بندہ توبہ خالص کرتا ہے جو مقبول ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو ملائکہ حافظین اور کاتبینِ اعمال کو بھی بھلا دیتا ہے اور اس زمین سے بھی اس کے نشانات بھلا دیتا ہے جس جگہ اس نے وہ گناہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس پر اس کے گناہ کا کوئی گواہی دینے والا نہیں ہوتا۔

مجددالملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ اکبر کیا شانِ رحمت ہے؟ دنیا کے سلاطین مجرموں کو معاف کرنے کے باوجود ان کے جرائم کے کاغذات کو عدالتوں میں محفوظ رکھتے ہیں لیکن وہ ارحم الراحمین اپنے مجرمین کو اس طرح معاف فرماتے ہیں کہ ان کے جرائم کی تمام یادداشتوں کو بالکلیہ محو اور فنا کرا دیتے ہیں۔ فرمایا کہ فرشتوں سے یہ کام نہیں لیتے، براہِ راست خود اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ کام کرتے ہیں تاکہ بروزِ محشر فرشتے ہمارے گناہ گار بندوں کو طعنہ نہ دیں کہ نامۂ اعمال تو تمہارے خراب تھے، ہم نے تمہارے سیئات اور بُرائیوں کو مٹا دیا۔ حق تعالیٰ کی ان رحمتوں پر قربان جائیے۔ (روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج، صفحہ:۴۴)

میرے دوستو! اس مذکورہ بالا گفتگو سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کیسے ہی بڑے سے بڑے گنہگار کے لئے بھی جائز نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مایوس ہونے کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔

چنانچہ ایسا وعظ و بیان اور تقریر جس سے لوگوں میں مایوسی اور نا اُمیدی کی کیفیت پیدا ہو مناسب نہیں ہے۔ اس لئے حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی رحمہ اللہ نے غالب کے اس شعر کی اصلاح کی، جس میں رحمتِ خداوندی سے مایوسی کا مضمون تھا۔ اور وہ شعر یہ ہے ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

حضرت شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کا شعر یہ ہے ؎

میں اسی منہ سے کعبہ جاؤں گا
شرم کو خاک میں ملاؤں گا
روؤں گا خوب گڑ گڑاؤں گا
توبہ کر کے انہیں مناؤں گا
ان کی مرضی پہ اب چلوں گا میں
منہ کو اپنے منہ بناؤں گا

(عرفانِ محبت)

قدرتِ الٰہی کے سامنے کوئی ناممکن ناممکن نہیں

تجھے مشکل نہیں مسکیں کو سلطانِ جہاں کردے
کرم سے اپنے اخترؔ کو ترا شمس و قمر کرنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! جب تو کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر بظاہر ناممکن دکھائی دینے والی چیز بھی ممکن ہی نہیں بلکہ موجود نظر آتی ہے۔ جب تو چاہتا ہے تو یتیم و مسکین کو دنیا کا بادشاہ بنا ڈالتا ہے اور جب چاہتا ہے تو بے کس و بے بس یتیم و لاوارث انسان کو عزت و عظمت کا تاج پہنا کر سربلندی دے دیتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب کنویں میں بظاہر بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے اور مصر کے بازاروں میں بیچے جارہے تھے۔ ایک معصوم لاوارث، بے سہارا اور یتیم بچے کی شکل میں آپ کا وجود متعارف تھا، مگر جب نظامِ قدرتِ خداوندی حرکت میں آیا تو مشیتِ باری تعالیٰ سے مصر کی حکومت آپ کو حاصل ہوئی اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ آپ نے شاہی انداز سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا استقبال کیا۔

جیسا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی خبر کی وجہ سے اور انہی کو قتل کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے تمام بچوں کے قتل کا حکم دیا، مگر جب مشیتِ باری تعالیٰ نے چاہا تو خود فرعون ہی کے گھر میں حضرت موسیٰ کی تربیت ہوگئی اور وہ قتلِ فرعون سے محفوظ رہے۔ اسی کو ایک شاعر نے بڑے پیارے انداز سے تعبیر کیا۔

فَمُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاهُ جِبْرَئِیْلُ کَافِرٌ
وَ مُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاهُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلٌ

جس موسیٰ (اس دور کا ایک شخص جس کا نام موسیٰ تھا) کو خدا نے ڈائریکٹ (Direct) بغیر کسی انسان کے واسطے کے پالا وہ تو کافر بنا، اور جو خود اپنے دُشمن فرعون کے زیرِ سایہ پلے وہ پیغمبر بنے تو حضرت والا دامت برکاتہم دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میں تو اخترؔ (ستارہ) ہوں تو جیسے تو مسکین کو سلطانِ جہاں بنا سکتا ہے، ایسے ہی اخترؔ کو بھی شمس و قمر یعنی علم و ہدایت کا آفتاب و ماہتاب بنا دے۔

ہمارے درد کو یاربّ تو دردِ معتبر کر دے

ہمارے درد کو یاربّ تو دردِ معتبر کر دے
ہمارے سر کو ہر لمحہ تو وقفِ سنگِ در کر دے

مری آہوں کو لطفِ خاص سے تو با اثر کر دے
کرم سے میری جانِ بے خبر کو باخبر کر دے

اور اپنی راہ میں ہم سالکوں کو تیزتر کر دے
مزاجِ روبہی کو تو مزاجِ شیرِ نر کر دے

ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کر دے
شبِ دیجور کو تو رشکِ خورشید و قمر کر دے

ہماری خشک آنکھوں کو خدایا چشمِ تر کر دے
مرے اشکوں میں شامل خونِ دل خونِ جگر کر دے

ہماری غفلتوں کی نیند کو آہِ سحر کر دے
ہماری سرد آہوں کو تو آہِ گرم تر کر دے

اور ہم سے دور اُفتادوں کو تو نزدیک تر کر دے
ہمارے وسوسوں کو دردِ دل دردِ جگر کر دے

کرم سے نفسِ امارہ کو میرے بے ضرر کر دے
تقاضائے گنہ کو فضل سے زیر و زبر کر دے

عطاءِ نسبتِ عالی سے شاہِ بحر و بر کر دے
ثریا سے مرے ذرّے کو مالک فوق تر کر دے

ثنائے خلق کی نعمت سے مجھ کو بہرہ ور کر دے
ذلیل و خوار کو تو دم میں شاہِ کرّ وفر کر دے

منور نورِ تقویٰ سے مری شام و سحر کر دے
دلِ گم کردۂ منزل کو شمعِ رہ گذر کر دے

ہمارے ذرّۂ خاکی کو تو رشکِ گُہر کر دے
مری توبہ سے میرے شر کو تو رشکِ بشر کر دے

مرے ہر شعر میں شامل مری آہِ سحر کردے
قیامت تک تو ان کو یادگارِ بحر و بر کردے

زمینِ سجدہ کو اشکِ ندامت سے تو تر کردے
فلک کی کہکشاں کو خاک پر زیرِ نظر کردے

سرِ محشر بھی اختؔر پر کرم کی اک نظر کردے
اور اپنے فضل سے وہ آخری مشکل بھی سر کردے

مشکل الفاظ کے معنی:۔ دردِ معتبر: اللہ تعالیٰ کی محبت کا مقبول درد۔ وقفِ سنگِ در: اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ پر پڑ جانا۔ لطفِ خاص: خاص رحمت۔ سالکوں: اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھنے والے۔ مزاجِ رُوبھی: لومڑیانہ مزاج۔ مزاجِ شیرِ نر: شیرانہ مزاج۔ شبِ دیجور: اندھیری رات۔ آہِ سحر: تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور فریاد کرنا۔ سرد آھوں: بغیر آنسوؤں کے رونا۔ آہِ گرم تر: ......اللہ تعالیٰ کی محبت میں درد وغم کے ساتھ رونا۔ دور اُفتادوں: دور پڑے ہوئے۔ نفسِ امارہ: نفس کی وہ حالت جس میں وہ گناہوں کا بہت زیادہ تقاضہ کرتا ہے۔ بے ضرر: جس سے نقصان نہ پہنچے۔ عطاء نسبتِ عالی: اللہ تعالیٰ کا خاص تعلق مل جانا۔ شاہِ بحر و بر: خشکی اور سمندر کا بادشاہ۔ ثریا: ستاروں کا جھرمٹ۔ فوق تر: بلند۔ ثنائے خلق: مخلوق کا تعریف کرنا۔ بھرہ ور: ......۔ شاہِ کرّوفر: ......۔ منوّر: روشن۔ دل گم کردۂ منزل: یعنی اللہ تعالیٰ کو کھویا ہوا دل۔ شمع رہ گذر: اللہ تعالیٰ کے راستے کی روشنی۔ ذرّۂ خاکی: مٹی کا ذرہ۔ رشکِ گُھر: جس پر موتی رشک کرے۔ یادگارِ بحر و بر: یعنی پوری دنیا اس سے فائدہ اٹھائے۔ اشکِ ندامت: ندامت کے آنسو۔ فلک: آسمان۔ کھکشاں: ستارے۔ خاک: مٹی۔ زیرِ نظر: ......۔ سرِ محشر: قیامت کے دن۔ سر کردے: پار کردے۔

وقفِ سنگِ در ہونے کی حقیقت

ہمارے درد کو یاربّ تو دردِ معتبر کردے
ہمارے سر کو ہر لمحہ تو وقفِ سنگِ در کردے

ارشاد فرماتے ہیں کہ یوں تو دنیا میں جسے دیکھو وہ خدا سے محبت کا دعویدار ملے گا اور اپنے زعم اور گمان میں وہ اپنے کو خدا پر صحیح یقین وایمان رکھنے والا شمار کررہا ہوگا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے دردِ محبت اور تقویٰ اور للّٰہیت کا کچھ معیار مقرر فرمایا ہے۔ اگر وہ اس معیار پر پورا اُترے تب تو وہ بارگاہِ الٰہی میں معتبر ہے ورنہ تو رد ہے۔
اس کا معیار قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے ہر قدم پر اتباعِ سنت وشریعت پیشِ نظر ہو اور بال برابر

بھی طریقۂ نبوت سے خارج نہ ہو ورنہ نہ وہ ایمان ایمان ہے اور نہ وہ محبت محبت ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے:

ایک شخص اپنے ذہن میں تقویٰ کا اونچا معیار مقرر کرتے ہوئے اپنی حلال بیوی کا بھی حق ادا نہیں کرتا ہے اور اُسے حقوقِ زوجیت سے محروم کر کے بڑے جوش وخروش کے ساتھ خانقاہوں یا جماعتوں یا جہادی تنظیموں میں اپنی زندگی وقف کئے ہوئے ہے جبکہ کوئی نفیرِ عام (جس کی مختلف صورتیں ہیں) بھی نہ ہو اور بڑی تکلیفوں اور مشقتوں کو سہتا ہوا پھر رہا ہو یا مثال کے طور پر حاجی بڑے خشوع وخضوع اور گریہ وزاری اور آہ وبکا کے ساتھ یومِ عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں جانے کے بجائے بیت اللہ سے چمٹا ہوا ہو تو اس کا یہ دردِ محبت بارگاہِ الٰہی میں مقبول ومعتبر نہیں۔ اسی لئے حضرت والا دامت برکاتہم یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے ایسا درد عطا فرما جو تیرے نزدیک معتبر ہو اور جس سے مجھے تیرا قرب اور رضا حاصل ہو۔ جس کا خلاصہ اور نچوڑ اگلے مصرعہ میں یوں مانگ رہے ہیں کہ میں ہر گھڑی تیرے حکم کے سامنے سرنگوں رہوں اور جس وقت جس حال میں جو حکم ہو میں اس کو بجالاؤں، یہی حقیقت ہے ہر لحہ سر کو وقفِ سنگِ در کرنے کی۔

آہوں کی کیمیا تاثیر

مری آہوں کو لطفِ خاص سے تو باثر کردے
کرم سے میری جانِ بے خبر کو باخبر کردے

جب بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی محبت میں اور آخرت کے خوف سے آہیں بھرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُن آہوں کو بہت باثر کر دیتے ہیں، اسی لئے ایک ایسے شخص کا وعظ کہ جس کی زبان آہوں سے اور اُس کی آنکھ آنسوؤں سے آشنا نہ ہو تو اس کے وعظ کے درمیان اور اس شخص کے وعظ کے درمیان جو منبر پر آہ وزاری سے بیان کرتا ہو۔ تاثیر اور نفع رسانی میں بہت ہی بیّن اور واضح فرق ہوتا ہے۔ اسی کو حضرتِ والا نے ایک شعر میں یوں فرمایا ہے ؎

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

بہت مرتبہ کا یہ تجربہ ہے کہ وہ اولیاء اللہ جو اپنے سینوں میں قلبِ منیب اور قلبِ سلیم کی دولت رکھتے ہیں۔ جب وہ زبان سے آہ وفغاں کرتے ہیں اور ان کی آنکھیں خوفِ خداوندی سے اشک بار ہوتی ہیں تو باوجود یہ کہ ان کا بیان اور تقریر نہ تو بہت فصیح وبلیغ اور نہ ہی اتنی مفصل ومدلل اور نہ ایسے علوم ومعارف پر حاوی ہوتی ہے نہ ہی انداز ایسا فصیحانہ وبلیغانہ۔ مگر تاثیر ایسی ہوتی ہے کہ سامعین کو اپنے دلوں سے غیر اللہ کی محبت نکلتی اور اللہ کی محبت داخل ہوتی نظر آتی ہے اور گناہوں سے وحشت ونفرت اور طاعات سے اُنس ومحبت پیدا ہونے لگتی ہے۔ دل اپنے کئے ہوئے پر پشیمانی وندامت کے جذبات سے بھر آتا ہے۔

اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ بغیر آہ وزاری کے اور بغیر گریہ وتضرع اور خوف وخشیتِ خداوندی کے کوئی کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، مگر اس کے جان ودل لذتِ قربِ خداوندی سے ناآشنا ہوتے ہیں اور وہ خود عباد الرحمٰن کا فرد بننے سے محروم رہتا ہے۔

اس لئے حضرتِ والا نے دعا مانگی کہ خدایا! میری آہوں میں اپنے فضل وکرم سے تاثیر دے کر میری جانِ ناآشنا کو اپنی آشنائی ومعرفت کی دولت دے دے۔

سلوک طے کرنے کے لئے ہمتِ مردانہ چاہیے

اور اپنی راہ میں ہم سالکوں کو تیزتر کردے
مزاجِ روبہی کو تو مزاجِ شیرِ نر کردے

اس شعر کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! ہم پست ہمت اور کم حوصلہ ہیں، ہمیں اپنی راہ اس طرح طے کرادے کہ ہم جلد واصل منزل ہوجائیں اور خواہشاتِ نفسانیہ کے مقابلے میں ہماری لومڑیانہ طبیعت اور بزدلانہ مزاج کو مزاجِ شیرِ نر کردے کہ جب بھی حرام آرزوؤں اور نفسانی خواہشات سے مقابلہ ہو تو ہم جرأتمندانہ اور دلیرانہ مقابلہ کرکے اُس پر غالب آجائیں اور خواہشاتِ نفسانیہ پر کنٹرول (Control) کرلیں تاکہ احکامِ الٰہیہ کی اتباع اور منہیاتِ الٰہیہ سے اجتناب آسان ہوجائے اور یہی حقیقی صورت ہے جس سے راہِ سلوک طے ہوتی ہے ورنہ جو بعض لوگ یوں سوال کرتے ہیں کہ فلاں گناہ چھوڑنے کے لئے کوئی وظیفہ بتادو تو اس پر حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے کہ اگر پھر وہ وظیفہ ہمت کرکے نہ پڑھا جائے تو اس کے لئے مزید ایک وظیفہ کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ چلتا رہے گا۔ بالآخر بات یہیں آکے ٹھہرے گی کہ بلا ہمت وجرأت کے استعمال کے اللہ والا بننا ممکن نہیں۔

اس لئے حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ پورے تصوف کا نچوڑ اور خلاصہ ہمت کو استعمال کرکے طاعات پر عمل اور معاصی سے اجتناب ہے۔

قلوبِ اولیاء رشکِ خورشید وقمر ہیں

ہماری شامِ غم کو فضل سے رشکِ سحر کردے
شبِ دیجور کو تو رشکِ خورشید و قمر کردے

اللہ تعالیٰ کے لئے اُٹھائے ہوئے اس کے راستے کے رنج وغم ضرور رنگ لاتے ہیں۔ بظاہر غموں کا مارا ہوا، چاک گریباں معمولی پوشاک میں ملبوس دنیا کے رنگ ومحفل سے الگ تھلگ خدا کی محبت سے سرشار اور راہِ خدا کا دیوانہ گوکہ صورتاً اس کے یہاں خوشیاں اور رونقیں نظر نہیں آتی اور ظاہری رونقیں اور چمک دمک دکھائی نہیں دیتی۔

لیکن خداوند قدوس اپنے وعدوں کے مطابق ایسے اپنے تمام بندوں کے دل میں وہ کیف وسرور اور زندگی میں وہ چین وسکون عطا فرماتے ہیں اور ان کے فیوض و برکات سے دنیا کو ایسا منور اور روشن کرتے ہیں اور رات کے اندھیروں میں تڑپنے والے دل کو ایسا روشن اور چمک دار بناتے ہیں کہ اُن کی یہ شامِ غم رشکِ سحر بن جاتی ہے اور ان کے یہ راتوں کے اندھیرے رشکِ خورشید وقمر ہو جاتے ہیں کیونکہ خورشید وقمر سے دنیا کا ظاہر روشن ہوتا ہے لیکن ایسے حضرات سے اہلِ جہاں کے قلوب منور اور روشن ہوتے ہیں۔

آنسوؤں کے ساتھ خونِ جگر کا شامل کرنا

ہماری خشک آنکھوں کو خدایا چشمِ تر کر دے
مرے اشکوں میں شامل خونِ دل خونِ جگر کر دے

حضرت والاؒ کی یہ دعا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے ماخوذ اور مستنبط ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا مانگی **اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ ھَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ** اے اللہ! عطا فرمادے ایسی آنکھیں جو موسلا دھار بارش کی طرح آنسو بہانے والی ہوں جو میرے دل کو سیراب کر دے خوف وخشیت کے آنسو بہا کر اور حضرت والا نے ساتھ ساتھ یہ بھی دعا فرمائی کہ اے خدا! میرے ان آنسوؤں کے ساتھ میری حسرتوں اور آرزوؤں کا خون بھی شامل کر لے کہ میں نے تیری ہی توفیق سے حرام کی ہوئی تمام خوشیوں سے بچ کر اور ناجائز تمناؤں اور آرزوؤں کو چھوڑ کر دل پر جو غم اُٹھائے ہیں اور ضبطِ غم کی تکلیفیں سہ کر دل کا خون کیا ہے اور ہر نوع کے حرام تقاضوں پر تیرے حکم کو غالب رکھتے ہوئے ہر قسم کی تکلیفوں اور پریشانیوں کی راہ سے گزرا ہوں۔

اے اللہ! میرے آنسوؤں میں میرا خونِ دل شامل ہو۔ یہی اشک اشکِ معتبر ہے اور یہی آنسو اللہ کی رحمت کو کھینچنے والے ہیں۔ اگر صرف آنسو تو ہوں مگر گناہوں اور معصیتوں سے بچ کر آرزوؤں کا خون اُن میں شامل نہ ہو تو اس کو سوائے ایک کیفیت عارضہ مفیدہ کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص دعاؤں، مناجات وغیرہ میں خوب روتا دھوتا ہو لیکن نہ اسے شرعی پردہ کا اہتمام ہو نہ نامحرم عورتوں سے اختلاط میں کوئی کمی ہو اور نہ ٹی وی (T.V)، وی سی آر (V.C.R) اور حرام سودی مال کے استعمال سے اجتناب ہو تو پھر گو کہ وہ آنسو مفید تو ہیں مگر بارگاہِ الٰہی میں ان کا وہ مقام نہیں کہ جو مقام وحیثیت ان اشکِ ندامت کی ہے کہ جن میں خونِ دل خونِ جگر شامل ہو۔ یعنی تمام حرام کاموں سے کلی اجتناب ہو اور اس کا سبب یہ ہے کہ دراصل توبہ وندامت اللہ تعالیٰ کے یہاں جبھی معتبر ہوتی ہے جبکہ ندامت کے ساتھ گناہوں کا ترک بھی ہو۔

اس لئے حضرتِ والا کے شعر کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ کے سامنے آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ تمام حرام

کاموں کو کلی طور پر ترک کر دیا جائے خواہ دل پر کتنا ہی گراں اور دشوار کیوں نہ ہو۔

آہِ سحر گاہی اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

ہماری غفلتوں کی نیند کو آہِ سحر کر دے
ہماری سرد آہوں کو تو آہِ گرم تر کر دے

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اولیاء عظام اور جملہ سلفِ صالحین کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اپنے رات کے اخیری حصوں کو انابت اور تضرع الی اللہ کے لئے خاص رکھتے تھے۔ اپنی غفلت کی نیندوں کو اللہ کی یاد میں بیداری سے بدل دیتے تھے۔

اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ دابُ الصّالِحِیْن ہے صالحین اور نیک لوگوں کی عادت ہے۔ اسی کے تحت ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنے ایک وعظ میں یہ نکتہ ارشاد فرمایا کہ رات کے اخیری حصہ میں اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہونے والے زبانِ نبوت سے صالحین کا مصداق قرار پاتے ہیں۔ یہ حضرات پوری اُمت کی اُس دعا میں شامل ہوجاتے ہیں جو نمازی اپنی ہر نماز میں قعدۂ اخیرہ میں پڑھتا ہے اور جس کو معراج کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا اور وہ دعا یہ ہے اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِیْنَ۔

اسی پر ایک واقعہ یاد آیا جو مکتوباتِ مجدد الف ثانی میں نقل ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور اُن سے حال دریافت کیا تو ارشاد فرمایا:

﴿طَاحَتْ تِلْکَ الْاِشَارَاتُ وَغَابَتْ تِلْکَ الْعِبَارَاتُ وَفَنِیَتْ تِلْکَ الْعُلُوْمُ وَنَفِدَتْ تِلْکَ الرُّسُوْمُ وَمَا نَفَعَنَا اِلَّا رَکَعَاتٌ کُنَّا نَرْکَعُهَا فِی الْاَسْحَارِ﴾

سب تقریریں بیکار ہوگئیں اور سب نکات و لطائف جاتے رہے بس جو چند رکعتیں رات کے درمیانے حصے میں پڑھی تھیں وہی کام آ گئیں۔

اور واقعہ یہی ہے کہ آہِ سحر گاہی کے بغیر مقاماتِ ولایت طے نہیں کئے جا سکتے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

عطّار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

استغفارِ سحری پر جنت کا وعدہ ہے

اور قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے سحر میں استغفار کرنے والے حضرات کو متقین کی فہرست میں شامل کیا ہے اور ان کے لئے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ اس لئے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اُمت کے تمام سلفِ صالحین کا عام معمول رہا ہے کہ وہ رات کے اس حصے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ و استغفار اور ذکر و مناجات میں گزارتے ہیں۔

احادیث میں اس وقت کی بہت فضیلتیں مذکور ہیں۔خود قرآن پاک میں ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے جس میں جنتیوں کی صفات کا تذکرہ ہے:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾

(سورۃ الذّٰریٰت، آیت: ۱۸،۱۷)

ترجمہ: وہ رات میں بہت کم سوتے تھے اور اوقاتِ صبح میں استغفار کرتے تھے۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، ص: ۱۵۷)

''اسحار'' سحر کی جمع ہے۔ رات کے آخری چھٹے حصے کو سحر کہا جاتا ہے اور اس آخری حصۂ شب میں استغفار کرنے کی فضیلت اس آیت میں بھی ہے۔ دوسری آیت وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ میں بھی۔

صحاحِ حدیث کی سب کتابوں میں یہ حدیث مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کو آخری تہائی حصے میں آسمان دنیا پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں (جو ان کی شان کے مناسب ہے) اس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں اور اعلان فرماتے ہیں ہے کوئی توبہ کرنے والا جس کی میں توبہ قبول کروں، ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اُس کی مغفرت کروں۔ (ابن کثیر)

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس استغفارِ سحری میں ان متقین کا بیان ہو رہا ہے جن کا حال اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ رات کو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، بہت کم سوتے ہیں۔ ان حالات میں استغفار کرنے کا بظاہر کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ طلبِ مغفرت تو گناہ سے کی جاتی ہے جن لوگوں نے ساری رات عبادت میں گزار دی وہ آخر میں استغفار کس گناہ سے کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو چونکہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کو پہچانتے ہیں اور اپنی ساری عبادت کو اس کے شایانِ شان نہیں دیکھتے اس لئے اپنی اس تقصیر و کوتاہی سے استغفار کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، ج: ۸، ص: ۱۶۰)

یہی دعا حضرتِ والا نے اس شعر میں مانگی کہ اے اللہ! میری غفلت کی نیند کو آہِ سحر میں تبدیل کر دے اور میرے سینے میں اپنی محبت کی ایسی حرارت عطا کر دے کہ جو میری سرد آہوں کو گرم تر آہوں میں بدل دے۔ صاحبِ کیفیات زکی کیفی صاحب بن مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ خوب کہتے ہیں ؎

ستارۂ سحری دیکھ کر نہ جانے کیوں
ہماری آنکھ میں آنسو مچلنے لگتے ہیں

وساوس اور راہِ سلوک

اور ہم سے دُور اُفتادوں کو تو نزدیک تر کردے
ہمارے وسوسوں کو دردِ دل دردِ جگر کردے

اے اللہ! اپنے قرب ومعرفت کے وہ مقامات جوتو نے اپنے خاص مقربینِ بارگاہ کو عطا کئے ہیں ہم جیسے ابھی تک ان سے بہت دور ہیں اور اس دوری اور بُعد کا دل میں بڑا احساس ہے اور اب دل تیرے فراق میں بے تاب ہے۔اے خدا! میرے دل میں گزرنے والے جذباتِ محبت کو اور خیالاتِ لذتِ الفت ومحبت کو دردِ دل اور دردِ جگر میں تبدیل کردے کیونکہ اب میری جدائی بہت شاق گزر رہی ہے اور تیرے بغیر میرا جینا مشکل ہورہا ہے۔ انہیں احساسات اور جذبات کی بھرپور تر جمانی حضرتِ والا کے اس شعر (جوزندگی کا پہلا شعر ہے) سے بھی ہوتی ہے۔

دردِ فرقت سے میرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت میں اِک ماہیٔ بے آب ہے

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ طے کرتے وقت اور منازلِ سلوک سے گزرتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے اور محبتِ کاملہ راسخہ کے حصول اور نسبتِ خاصہ کے ملنے سے پہلے انواع واقسام کے وساوس وخیالات سے سالک گزرتا ہے۔اب اگر وہ ان وساوس کے مقابلے میں ڈٹا اور جما رہے تو پھر اگلی منزل رسوخِ نسبتِ کاملہ اور حصولِ محبت تامّہ کی ہوتی ہے۔یہی وہ کیفیت ہے جس کو حضرتِ والا دردِ دل دردِ جگر سے تعبیر کرتے ہیں اور بقول حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ جسے اللہ تعالیٰ اعلیٰ مقام دینا چاہتے ہیں اُسے ان راہوں سے گزارتے ہیں۔

جیسا کہ اشرف السوانح میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خود اپنے احوال دیکھنے اور مطالعے سے یہ معلوم ہوگا کہ حضرت خود ان مراحل سے گزرے ہیں۔

اولیاء معصوم تو نہیں محفوظ ہیں

کرم سے نفسِ امارہ کو میرے بے ضرر کردے
تقاضائے گنہ کو فضل سے زیر و زبر کردے

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ ارشادفرماتے ہیں اَلنَّفْسُ هِيَ الْمَرْغُوْبَاتُ الطَّبْعِيَّةُ غَيْرُ الشَّرْعِيَّةِ یعنی نفس ''مرغوبات طبعیہ غیر شرعیہ'' کا نام ہے۔نفسِ امارہ جو بہت زیادہ برائی کی طرف اُبھارنے والا اور حکم کرنے والا ہو۔علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاصہ کا سایہ ہوتا ہے۔وہ نفس کی شرارت و خباثت سے محفوظ رہتے ہیں۔

چنانچہ حضرت تھانوی نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ انبیائے کرام کے نفوسِ قدسیہ اس سے مستثنیٰ ہیں

اور وہ معصوم ہیں چونکہ اولیاء اللہ پر بھی حق تعالیٰ کی رحمت کا خاص سایہ ہوتا ہے، اس لئے وہ نفس کے شرور سے محفوظ رہتے ہیں۔ احیاناً صدورِ خطاء پر ان کو فوراً توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔ (کشکول معرفت، صفحہ:۵۵۱)

اس لئے اولیاء اللہ معصوم تو نہیں محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی مسئلے کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ یوں تحریر فرماتے ہیں کہ اولیاء کے محفوظ ہونے کی دلیل یہ حدیث قدسی ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے:

﴿فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرِّقاق، باب التواضع، ج:۲، ص:۹۶۳)

اللہ تعالیٰ کے کان اور آنکھ بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ان جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا۔ **الالعارضٍ لایدوم** یعنی کسی عارض سے ہو جاتا ہے تو وہ پھر تائب ہو جاتے ہیں۔ اس سے مسئلہ محفوظیتِ اولیاء ثابت ہو گیا۔ (التکشف، ص:۳۷۱)

حضرت والا نے جو ارشاد فرمایا کہ اے اللہ! میرا نفسِ امارہ بے ضرر ہو جائے تو اس کی صورت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری خاص حفاظت ہو اور میں اولیاء اللہ کے زمرہ میں شامل ہو جاؤں اور میری حالت یہ ہو جائے کہ تمام گناہوں کے تقاضے مغلوب ہو کر رہ جائیں اور جملہ اعضاءِ ظاہرہ و باطنہ سے اللہ تعالیٰ کے رضاء والے اعمال صادر ہو رہے ہوں۔ یہی صورت نفسِ امارہ کے ضرر سے بچنے کی ہے۔ یاد رکھیں گناہوں کے تقاضے کو ختم کر دینا مطلوب نہیں ہے بلکہ تقاضائے معصیت رہتے ہوئے معصیت نہ کرنا، کمالِ ایمان ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب انسان خوف کی وجہ سے باوجود تقاضے کے گناہ نہیں کرتا تو وہ ملائکہ سے درجے میں بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ملائکہ میں تقاضائے گناہ ہی نہیں۔

چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ خواص مؤمنین خواصِ ملائکہ سے اور عوام مؤمنین عام ملائکہ سے افضل ہیں۔

مقامِ بندگی کی رفعتیں

عطائے نسبتِ عالی سے شاہِ بحر و بر کر دے
ثریا سے مرے ذرّے کو مالک فوق تر کر دے

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے میرے اللہ! تو میرے قلب کو ایسی نسبتِ عالیہ عطا کر دے کہ کائنات کی قیمتی سے قیمتی چیز بھی اس کے برابر نہ ہو سکے اور برّ و بحر ارض و سماء غرض یہ کہ دونوں جہاں اس کے برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ وہی دولت ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین اور جانشین علمائے عظام کو عطا ہوئی۔ حق تعالیٰ نے ان کو اپنے قربِ خاص کا وہ مقام عطا فرمایا اور اپنے ساتھ وہ نسبتِ عالی بخشی کہ جس کے نتیجے میں انسان کو خود بخود ساری

کائنات کی بادشاہت مل جاتی ہے۔ پھر اس ذرّۂ خاک کو اللہ تعالیٰ وہ مقام عروج عطا کرتے ہیں کہ اس کی پہنچ اور رسائی ثریا سے مافوق عرشِ ربّ کریم اور عظیم ملک الملوک کی بارگاہِ عالی تک ڈائریکٹ (Direct) ہوجاتی ہے۔ یہی مقام عروجِ انسانیت ہے جس کا مادی ترقی اور ظاہری عروج و رفعت سے کوئی تعلق و ربط نہیں بلکہ اس کا مدار دل کی اس نسبتِ خاصہ پر ہے جو انسان کو زمین پر رہتے ہوئے آسمان کی بلندیوں سے آگے اور فرش پر رہتے ہوئے عرش کے سامنے کردیتی ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ مقامِ قرب و بندگی یعنی سجدے کے وقت اپنے کو عرشِ الٰہی کے سامنے پاتا ہے۔

صاحبو! اگر غور سے دیکھو تو یہ پتہ چلے گا کہ جسے اللہ اپنا بناتے ہیں اور علوم نبوت عطا فرما کر اپنی تجلیاتِ جذب سے اُسے اپنا خصوصی قرب عطا کرتے ہیں تو ان کو کائنات کی حقیقی بادشاہت مل جاتی ہے۔ انسان تو انسان جانور، چرند پرند حتیٰ کہ سمندر میں مچھلیاں ان کے لئے دعائیں کرتی ہیں۔ شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

مچھلیاں پانی میں ذرّے خاک میں برگ و شجر
نیک عالم کو دعا دیتے ہیں ہر شام و سحر

اندازہ لگایئے! نہ صرف انسان بلکہ دوسری مخلوقات تک ان کے لئے دعاگو ہیں، اس لئے اصل کمالِ انسانی اور ترقیٔ مؤمن کا راز حق تعالیٰ کے ساتھ اس قوی تعلق پر ہے۔

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اِک تو نہیں میرا تو کوئی شے نہیں میری

لوگوں میں نیک نامی نعمتِ خداوندی ہے

ثنائے خلق کی نعمت سے مجھ کو بہرہ ور کردے
ذلیل و خوار کو تو دم میں شاہِ کرّ وفر کردے

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے مخلوق میں نیک نامی عطا فرما اور خلق میں میری ذلت کو عزت سے بدل دے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَرَاَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَیْرِ وَیَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَیْهِ قَالَ تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب اذا اثنی علی الصالح فهی بشری، ج: ۲، ص: ۳۳۲)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ ایسے آدمی کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ ذرا مجھ کو بتا دیجیے کہ ایک شخص عملِ خیر کرتا ہے اور اس پر لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا۔ ارشاد فرمایا یہ تو مؤمن کے لئے جلد یعنی دنیا میں بشارت ہے۔

تو معلوم ہوئی یہ بات کہ لوگوں میں نیک نامی اور مدح و ثناء یہ بُری چیز نہیں بلکہ اس پہلو سے اچھی ہے کہ

لوگوں کی زبان و دل کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حسنِ ظن اور مدح و تعریف میں لگا دیا جس سے اُمید ہے کہ ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی آپ کا نام نیکوں اور اچھوں میں لکھا ہوگا۔

اس لئے قرآن کریم کی آیت لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ کا ایک معنیٰ یہی ہے کہ دنیا میں بشارت سے مراد ثناءِ حسن اور لوگوں میں نیک نامی ہے۔

اسی لئے حضرتِ والا یہ دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے لوگوں میں نیک نامی دے دے اور میری ذلت کو عزت سے بدل دے اور مجھے دلوں پر ایسی بادشاہت عطا کر دے کہ پھر میں ترا نام بڑی عظمتوں کے ساتھ سناتا پھروں اور لوگ عزت و عظمت کے ساتھ ترا نام سننے کے لئے ارد گرد جمع ہوں۔

دو باتوں کا فرق

صاحبو! دو باتوں میں بہت فرق ہے۔ اپنی طاعات و عبادات کے ذریعے سے لوگوں میں اپنا نام و مقام اور جاہ و شہرت کا طالب ہونا اور لوگوں سے اپنی تعریفیں چاہنا اور بُرائی و عیب سامنے آنے پر منہ بنانا، یہ انتہائی مذموم اور بُرا ہے اور حبطِ عمل کا سبب ہے لیکن یہی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مانگنا اور چاہنا یہ عبادت ہے، بارگاہِ الٰہی میں مطلوب ہے۔

اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں یہ دعا مانگی ہے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا کہ اے اللہ! مجھے میری نگاہ میں چھوٹا بنا دے اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دے۔

اور دوسرے موقعہ پر یوں دعا کی ہے وَفِيْ نَفْسِيْ لَكَ فَذَلِّلْنِيْ وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِيْ کہ اے میرے ربّ! تو مجھے میری نگاہوں میں اپنے لئے ذلیل کر دے اور لوگوں کی نگاہوں میں مجھے عظمت دے دے۔

تقویٰ بصیرتِ قلبی کا ضامن ہے

منور نورِ تقویٰ سے مری شام و سحر کر دے
دلِ گم کردۂ منزل کو تو شمعِ رہ گذر کر دے

ارشاد فرمایا کہ اے اللہ! میری شام و سحر کو تقویٰ والے اعمال سے مزین کر کے مرے ظاہر و باطن کو منور اور روشن کر دے کہ میرا ہر عضوِ بدن تیرے حکم کو بجالانے میں مصروف ہو۔ ایک لمحہ بھی کسی عضو سے کوئی معصیت صادر نہ ہو۔ اس طرح میں سراپا طاعت بن جاؤں اور میرا دل بھی ایسا منور اور روشن ہو کہ اس کے ظلمات اور اندھیرے چھٹ جائیں۔ وہ گم شدہ راہ سے راہِ حق کی طرف لوٹ جائے اور جہاں خود روشنی حاصل کرے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کے لئے بھی روشنی فراہم کر کے مشعلِ راہ ثابت ہو۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہر عضو کو منور و روشن کرنے کے لئے یوں دعا فرمائی ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَعَنْ يَمِيْنِيْ نُوْرًا وَعَنْ يَسَارِيْ

نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّاَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا۞

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء اذا انتبہ باللیل، ج ۲، ص ۹۳۵)

اس دعا کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! میرے جملہ اعضاءِ ظاہرہ و باطنہ کو اپنے خاص نور سے منور کر دے یہاں تک کہ سراپا مجھے نور بنا دے۔ اس نورِتقویٰ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اس کو راہِ نجات اور راہِ حق صاف اور واضح دکھائی دیتی ہے۔ اسی کو حضرتِ والا نے اپنے ایک شعر میں یوں ارشاد فرمایا۔

برکتِ تقویٰ سے جس کے ساتھ ہے فضلِ خدا
اُس کے پیچیدہ مسائل کوئی پیچیدہ نہیں

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں تقویٰ کے اور فضائل بیان فرمائے۔ ان میں ایک مبارک اہم فائدہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فہم میں ایک ایسی بصیرت اور نور عطا فرماتے ہیں کہ جس سے حق و باطل میں امتیاز کرنا سہل اور آسان ہوجاتا ہے۔ ارشادِ باری ہے اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا کہ اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا فہم اور بصیرت عطا فرمائیں گے کہ جس سے حق و باطل میں فرق کر سکو گے اور صحیح اور غلط کو سمجھ سکو گے۔ آج لوگوں نے اپنے اپنے ذہنوں میں اپنی منزلیں طے کر رکھی ہیں اور ان کے دل و دماغ عیشِ آب وگل کے حصول میں گم کردۂ منزل ہیں اور اپنی حقیقی منزل دل و دماغ سے غائب کئے ہوئے ہیں جبکہ مؤمن کی حقیقی منزل ہر قدم پر رضائے مولیٰ ہے جس کو پا لینے کے بعد وہ دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنتے ہیں۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اپنی قوموں کو آکر ان کے دلوں کے رُخ کو دنیا کے جھمیلوں سے اور مٹی کے کھلونوں اور گورکھ دھندوں سے نکلوا کر ان کا رُخ خالقِ کائنات کی طرف جوڑا اور یہی سب نبیوں کا مشترکہ مشن (Mission) اور کام رہا۔

توبہ اور یہ ذرّۂ خاکی

ہمارے ذرّۂ خاکی کو تو رشکِ گہر کردے
مری توبہ سے میرے شر کو تو رشکِ بشر کردے

جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بشر کو حقیقی ایمان عطا فرماتے ہیں تو پھر یہ ذرّۂ خاکی بارگاہِ الٰہی میں کتنا قیمتی ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیامت کے دن جہنم کے عذاب سے چھٹکارے کے لئے اگر کفار ساری زمین اور اس میں بھرے ہوئے خزانوں کو کئی گنا کر کے بھی پیش کریں گے تو بھی ان کو چھٹکارا حاصل نہ ہوگا جبکہ ایک مؤمن اپنے ایمان کی وجہ سے جہنم سے چھٹکارا پا کر جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے گا۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ باری تعالیٰ کی نگاہ میں اس ایمان والے ذرّۂ خاکی کی قیمت پوری کائنات اور اس کے خزانے بھی نہیں ہو سکتے لیکن یہ اُسی وقت ہے کہ جب اس ذرّۂ خاکی میں ایمان صحیح اور معتبر موجود ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ مخلوق میں سب

سے بدتر اور جہنم کا ایندھن ہے۔ کائنات کی ہر شئے سے زیادہ اللہ کی نگاہ میں حقیر و ذلیل اور بے وقعت ہو جاتا ہے ہاں مگر اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں کتنا ہی بڑا کافر اور مشرک اور فاسق و فاجر جب تائبانہ اور نادمانہ حاضر ہو تو پھر اللہ تعالیٰ توبہ صادقہ کے طفیل ہر شر کو معاف فرما کر اس کو رشکِ بشر بنا دیتے ہیں۔ پھر بالفاظِ نبوت یہ خدا کا محبوب اور چہیتا ہو جاتا ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ کہ توبہ کرنے والا خدا کا محبوب ہوتا ہے۔ پھر وہ خدا کے اس اعلان کا بھی مستحق قرار پاتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ کہ بلاشک اللہ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔

حضرتِ والا کی ایک دعا اور آثارِ قبولیت

مرے ہر شعر میں شامل مری آہِ سحر کردے
قیامت تک تو ان کو یادگارِ بحر و بر کردے

حضرتِ والا اپنے اشعار کے لئے دعا فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! میرے اشعار محض شعر و شاعری بن کر نہ رہیں بلکہ ان میں ایسا درد پیدا کردے اور ایسی تاثیر عطا کردے جو دلوں کے اندر سے غفلتوں کو نکال کر تیری یاد دلانے والے ہوں اور جس کے ہر ہر شعر میں آہِ سحر گاہی کا رنگ شامل ہو۔ اس کو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے نافع بنا کر میرے لئے صدقۂ جاریہ بنا دے اور اے اللہ! کوئی صورت پیدا کردے کہ بحر و بر کے تمام مقامات پر تیری محبت والفت کی داستانیں پیش کررہے ہوں۔ ہر چہار سو اطرافِ عالم میں مرے اشعار میرے دردِ دل کی ترجمانی کررہے ہوں اور اہلِ ایمان کے دِلوں کو حیاتِ ایمانی بخش رہے ہوں۔

اسی طرح کی دعا حضرتِ والا نے دوسرے مقام پر یوں فرمائی ہے ؎

جو بشر بھی سن لے میری آہ کو
بس تڑپ جائے وہ تیری چاہ کو

اپنے کلام کے متعلق خود حضرتِ والا کا ایک اور جگہ ارشاد ہے ؎

تم اصلاح کی اس میں کوشش نہ کرنا
یہ ہے داستاں دردِ دل کی ہماری
مری شاعری بس مرا دردِ دل ہے
لغت پاسکے گی اسے کیا تمہاری

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حضرتِ والا کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعا پوری پوری قبول ہوئی کہ دنیا بھر سے لوگ حضرت کی خدمت میں مسلسل حاضری دے کر اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھتے ہیں اور ہر چہار اطرافِ عالم میں ان اشعار اور

حضرت والا کی دوسری کتب سے جو انقلاب برپا ہورہا ہے وہ نا قابلِ بیان ہے۔

چنانچہ بے شمار ممالک میں مختلف زبانوں میں حضرتِ والا کی کتابوں کے تراجم مسلسل شائع ہورہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک سعودی النسل عالم شیخ خالد مرغوب صاحب نے جو کہ حضرت سے مجازِ بیعت ہیں اور ماشاء اللہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کلیۃ الحدیث کے سینئر (Senior) استاد ہیں۔ انہوں نے حضرت کی کتابوں اور مواعظ سے متاثر ہوکر حضرت کے کچھ حالاتِ زندگی کو ایک کتاب میں جمع فرمایا اور مختصر سی سوانح مرتب کی جس کا نام ہے:

''عبقات العنبر و نسمات المسک الأذفر

فی التعریف بالشیخ محمد اختر

ومقتطفات من مواعظ لہٗ حول حلاوۃ الایمان''

حضرت والا کے مختصر حالات پر تالیف کی ہے۔ عرب وعجم کے مختلف ملکوں میں حضرت کی کتابیں اور اشعار کی تشریحات کو پڑھ کر استفادے کے لئے کثیر مجالس منعقد ہورہی ہیں۔

اور بحمد اللہ! آج کل حضرتِ والا کی مجالس انٹرنیٹ (Internet) کے ذریعے دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے مقامات پر روزانہ سنتے ہیں اور اس کی افادیت کے متعلق مختلف ملکوں سے بذریعہ فون (Phone) وخطوط اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ گویا اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیوی آلے اور ذریعے کو حضرتِ والا کی تعلیمات کے دور دراز تک پھیلنے کا ذریعہ بنادیا ہے۔

کہکشاں کو اشکوں سے کیا نسبت؟

زمینِ سجدہ کو اشکِ ندامت سے تو تر کردے
فلک کی کہکشاں کو خاک پر زیرِ نظر کردے

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے ایسے سجدے عطا فرمادے کہ میں تیرے سامنے زمین پر گر کر زمین کو ندامت کے آنسوؤں سے تر کردوں اور اس زمین پر اتنے آنسو گراؤں کہ جیسے آسمان ستاروں سے چمک رہا ہے۔ یہ زمین میرے آنسوؤں سے چمک اُٹھے اور میرا ستارۂ بندگی ویسا ہی زمین پر چمک جائے جیسے آسمان پر ستارے چمکتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ زمین پر گرنے والے ندامت کے آنسوؤں کو آسمان کے ستاروں سے تشبیہ دینا تقریب الی الفہم کے لئے ہے ورنہ ستاروں کو ان آنسوؤں کی قیمت سے کیا نسبت؟ اس لئے کہ ستارے چمکتے اور روشن ہوتے ہیں اور آسمان کی زینت بنتے ہیں۔ لیکن یہ ندامت کے آنسو جہنم کی شدید شعلہ زن آگ کو بجھا کر جنت میں ایسے محلات ملنے کا ذریعہ ہوتے ہیں کہ جن کی چمک دمک اور زیب وزینت اور آسائش وآرائش بے مثل

ہوگی۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ ان آنسوؤں کی چمک اور روشنی سے دونوں جہان کا خالق و مالک راضی اور خوش ہوجاتا ہے اوران آنسوؤں کے عوض اللہ تعالیٰ کی محبوبیت نصیب ہوجاتی ہے۔

جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے کہ دو قطرے اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔(۱) ایک تو وہ قطرہ خون کا جو اللہ کے راستے میں بہتا ہے۔(۲) اور دوسرا آنسوؤں کا قطرہ جو اللہ کے خوف سے نکلتا ہے۔ اسی کو حضرت نے ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا ؎

جو گرے ادھر زمین پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اُٹھا فلک پر مری بندگی کا تارہ

اولیاء کا خوفِ روزِ جزاء

سرِ محشر بھی اخترؔ پر کرم کی اک نظر کردے
اور اپنے فضل سے وہ آخری مشکل بھی سر کردے

حضرت والا کا مقطعہ ہے، اس میں دعا فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! انسان کی منازلِ حیاتِ اخرویہ میں سب سے آخری منزل میدانِ محشر میں حساب وکتاب کے لئے پیش ہونا ہے۔ جس کی ہولناکیاں اور سنگینیاں آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ میں جابجا مذکور ہیں۔ یہ ایسا دن ہے کہ جس کے خوف سے اولیاء اللہ لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔

چنانچہ قرآنِ کریم کی یہ آیت وَامۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّھَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ پڑھ کر ایک مرتبہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پوری رات روتے رہے اور یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جب اللہ اس دن مجرمین ومؤمنین کو الگ الگ کردیں گے تو میں نہیں جانتا کہ میرا شمار مجرمین میں ہوگا یا مؤمنین میں؟ اور حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ اسی دن کے خوف سے ایک رات پوری سجدے میں رو رو کر یہ شعر پڑھتے رہے ؎

اے خدا! ایں بندہ را رسوا مکُن
گر بدم من سرّ من پیدا مکُن

خود قرآن کریم میں جگہ جگہ اس دن کی سنگینی اور ہولناکی کو جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس سے اس دن کی احوال کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس دن بھائی بھائی سے، بیٹا اپنے ماں اور باپ سے، دوست دوست سے، باپ اپنے بیٹوں سے غرض یہ کہ ہر ایک تعلق والا دوسرے تعلق والے سے دور بھاگ رہا ہوگا۔ باپ بیٹے کے کام نہ آئے گا اور بیٹا باپ کے کام نہ آئے گا۔ بجز خدا کے نیک صالح بندوں کے اور اولیاء اللہ کے، ان کو یوں کہہ دیا جائے گا یٰعِبَادِ لَاخَوۡفٌ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ وَلَآ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ کہ اے میرے بندو! آج نہ تمہیں ڈرنے کی ضرورت

ہے نہ غمگین ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اُمت کے تمام اولیاء اس دن سے بہت ڈرتے کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔ یہی دعا حضرت نے ایک دوسرے شعر میں یوں کی ہے ؎

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

دعا

ایسی صورت جو مجھے آپ سے غافل کردے
اے خدا! اس سے بہت دُور مرا دل کردے
اپنی رحمت سے تو طوفان کو ساحل کردے
ہر قدم پر تو مرے ساتھ میں منزل کردے
اے خدا! دل پہ مرے فضل وہ نازل کردے
جو مرے دردِ محبت کو بھی کامل کردے

حقیقتِ غفلت

ایسی صورت جو مجھے آپ سے غافل کردے
اے خدا! اس سے بہت دور میرا دل کردے

اس دعا کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! اس دنیائے فانی کے ظاہری نقش و نگار اور رنگ و بو میں پڑ کر دل کے غافل ہونے سے میری حفاظت کردے کیونکہ انسان کے لئے وہ گھڑی جو یادِ الٰہی سے خالی ہو، آخرت میں باعثِ حسرت و افسوس ہوگی۔ اسی لئے اولیاء اللہ دل سے ایک لحظہ بھی اللہ سے غافل نہیں رہتے اور ولایت و تقویٰ کا یہی آخری مقام ہے کہ جو چیز تمہیں اللہ کی یاد سے غافل کردے۔ اس سے احتراز و اجتناب کیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس کا تعلق قلب سے ہے۔ اگر جسم دنیا کے عیش و آرام میں ہو، مگر دل غافل نہ ہو تو یہ حالت مضر نہیں، اسی لئے حضرتِ والا نے غفلت سے پناہ مانگ کر دل کو اُس سے محفوظ رکھنے کی دعا کی۔

مومن کے لیے ہر قدم پر منزل ہے

اپنی رحمت سے تو طوفان کو ساحل کردے
ہر قدم پر تو میرے ساتھ میں منزل کردے

حضرتِ والا دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! زندگی کے ہر موڑ پر خواہ کیسے ہی حالات ہوں، موافق ہوں یا

ناموافق، خوشی ہو یا غم، مشکل ہو یا کہ آسان، راحت ہو یا مصیبت غرض یہ کہ جملہ احوال میں مجھے اپنی رضا پر قائم رہنے کی توفیق دے کیونکہ یہی میرا ساحل اور یہی میری منزلِ مقصود ہے۔ خوشی اور مسرت کے حالات میں شکر کے راستے سے اور مصیبت و پریشانی کے حالات میں صبر کے راستے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

جیسا کہ حدیث شریف میں یہ مضمون اس طرح وارد ہوا ہے کہ حضورِ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَنْ صُهَيْبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزهد، ج: ۲، ص: ۴۱۳)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کی شان عجیب ہے۔ اس کے تمام کام اس کے لئے خیر ہیں اور یہ شان صرف مؤمن کے ساتھ مخصوص ہے کہ اگر اس کو خوشی حاصل ہو (یعنی فراخیٔ رزق، خوشحالی، چین اور توفیقِ طاعت وغیرہ نعمتیں) شکر کرتا ہے۔ پس یہ شکر اس کے لئے خیر ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچے (یعنی فقر، مرض اور رنج) صبر کرتا ہے۔ پس یہ صبر بھی اس کے لئے خیر ہے۔ (دنیا کی حقیقت، صفحہ: ۱۷۹)

اس لئے حضرتِ والا نے جو ہر قدم پر منزل ملنے کی دعا کی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خوشی کے حالات میں اللہ کو بھولنے نہ پاؤں اور تکبر اور خلافِ شرع چیزوں سے بچا رہوں۔ ضرر اور غم کی حالت میں شکوہ اور شکایت نہ ہو۔

اخص الخاص ولایت

اے خدا! دل پہ مرے فضل وہ نازل کردے
جو مرے دردِ محبت کو بھی کامل کردے

اللہ تعالیٰ کی ولایت کے تین درجات ہیں ایک درجۂ ولایت جملہ مؤمنین کو حاصل ہے جو ''ولایت عامہ'' کہلاتی ہے۔ اسی کو قرآن پاک نے یوں ارشاد فرمایا وَاللهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ کہ اللہ مؤمنین کا ولی اور دوست ہے۔ اس میں سب اہلِ ایمان شامل ہیں۔ کفار مشرکین اور منافقین اس ولایت سے خارج ہیں۔ دوسری ولایت ولایتِ خاصہ ہے کہ جو مؤمنین تمام گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں اور تمام طاعات پر عمل کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی ولایتِ خاصہ میں شامل ہیں۔ اور تیسری ولایت ''اخص الخاص'' ہے، یہ وہ اہلِ ایمان ہیں جو خاص مقربین بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں اور جو ہر اُس چیز سے بچتے ہیں کہ جو ان کو یادِ الٰہی سے غافل کر دینے والی ہو اور وہ کسی آن اور کسی لحظہ اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ اسی کو حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی نے یوں فرمایا ہے کہ ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہو گیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہو گیا

حضرتِ والا اس شعر میں اپنے لئے اسی درجہ کی دعا فرما رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ ولایتِ خاصہ اور قربِ کامل کا مقام کسی بھی انسان کو اپنے عمل سے نہیں مل سکتا۔ اس کا راستہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہی ہے۔

جیسا کہ قرآنِ کریم میں آیت موجود ہے وَاللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ جسے اللہ چاہتے ہیں اپنے فضل سے یہ مقام عطا فرماتے ہیں اور ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد و نصرت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دنیا کی مختلف فکروں اور غموں اور انواع و اقسام کے جھمیلوں سے دور رکھتے ہیں اور ان کو نفس و شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ فرماتے ہیں جس حفاظت کا تذکرہ قرآنِ کریم کی مختلف آیاتِ کریمہ اور احادیثِ شریفہ میں کیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ مگر اللہ کے مخلص بندے اغوائے شیطانی سے محفوظ رہیں گے اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد اور حمایت و حفاظت اللہ کے متقی اور مخلص و نیک صالح بندوں کے ساتھ ہوتی ہے۔

یاربّ کرم سے اپنے تو دونوں جہان دے

یا رب کرم سے اپنے تو دونوں جہان دے
جو مستحق غضب کا ہے اس کو امان دے

اور اپنے فضل سے مجھے صدقِ لسان دے
اور اپنی محبت کی بھی اک خاص شان دے

یا رب مجھے زمان اور ایسا مکان دے
جس میں تری ہی یاد ہو ایسی ہر آن دے

کوئی ہمارے کان میں ایسی فغان دے
جس سے ہمارا ہر بنِ مو تجھ پہ جان دے

اور اپنی معرفت کی مجھے ایسی شان دے
ہر ذرّہ کائنات کا تیرا نشان دے

اپنا پتہ دے مجھ کو یوں اپنا نشان دے
جاؤں جہاں بھی دل مرا بس تجھ پہ جان دے

آہوں کو میرے درد کا وہ ترجمان دے
تیرا بیان ہر زماں جس سے زبان دے

ہمت کی میری خاک کو وہ آن بان دے
دل کو جو میرے شوکت ہفت آسمان دے

توفیق کا کرم سے وہ تیر و کمان دے
جو ہر عدو سے ہر زماں مجھ کو امان دے

مالک مری زباں کو وہ سحرِ بیان دے
جو میری بات سن لے وہ بھی تجھ پہ جان دے

اخترؔ کو اپنے غم کی وہ مخمور جان دے
جو تیرے درد و غم کا ہمہ سُو بیان دے

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **مستحق غضب**: غصہ کے لائق۔ **امان**: سلامتی۔ **صدقِ لسان**: سچی زبان۔ **ہر آن**: ہر لمحہ۔ **فُغان**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آواز۔ **ہر بنِ مو**: بال بال۔ **معرفت**: پہچان۔ **آن بان**: شان وشوکت۔ **شوکت ہفت آسمان**: ساتوں آسمان کی شان۔ **عدو**: دشمن۔ **سحرِبیان**: جادو کی تاثیر۔ **مخمور جان**: اللہ تعالیٰ کی محبت کے نشہ میں مست جان۔ **همه سُو**: ہر طرف۔

دنیا کی عافیت مانگنا زہد کے خلاف نہیں

یا ربّ کرم سے اپنے تو دونوں جہان دے
جو مستحق غضب کا ہے اس کو امان دے

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندوں کو دعا مانگنا بھی سکھایا اور دعا کے غلط طریقے پر تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ۝ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّ فِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۰۱-۲۰۰)

ترجمہ: پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔

(معارف القرآن، ج:۱،ص:۴۷۶)

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت یہاں فرما کر بجائے اس کے خیرِ دارین طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں۔ سو بعضے آدمی جو کہ کافر ہیں ایسے ہیں جو دعا میں یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں جو کچھ دینا ہو دنیا میں دے دیجیے۔ بس! سو ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل جائے گا اور ایسے شخص کو آخرت میں بوجہ انکارِ آخرت کے کوئی حصہ نہ ملے گا۔ بعضے آدمی جو کہ مؤمن ہیں ایسے ہیں جو کہ دعا میں یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بہتری دیجیے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچائیے۔ سو یہ لوگ اوپر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو دونوں جہان میں بڑا حصہ ملے گا۔ (معارف القرآن، ج:۱،ص:۴۷۹)

آگے صفحہ: ۴۹۱ پر حضرت مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسمِ حج اور مقاماتِ مقدسہ میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراضِ دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے صرف کرتے ہیں۔ اگر ہمارے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولتمند لوگ یہاں بھی جو وظائف واوراد کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف ودعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت، اغراضِ دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے۔ وہ بہت سے وظائف اور نوافل پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے۔ بہت سے حضرات زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے۔ دنیا کی

آفات دور ہوں گی۔ مال میں برکت ہوگی ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہے۔ معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ علیم وخبیر ہے۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے کہ وظائف، نوافل اور دعا و درود سے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے؟ اس آیت کے آخری حصے میں کم نصیب محروم القسمت لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۰۰)

یعنی دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس میں لفظ حسنۃ تمام ظاہری و باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے۔ مثلاً دنیا کی حسنۃ میں بدن کی صحت، اہل وعیال کی صحت، رزقِ حلال میں وسعت و برکت، دنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ، علمِ نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستگی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادت میں اخلاصِ کامل سب داخل ہیں اور آخرت کی حسنۃ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔ الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں جہاں میں سکون و راحت میسر آتا ہے۔ آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دعا مانگا کرتے تھے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ اور حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مسنون ہے۔ اس آیت میں اُن جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا کرنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے۔ انسان اپنے وجود اور بقاء اور عبادت و طاعت سب میں ضروریاتِ دنیوی کا محتاج ہے۔ وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعا مانگنے کو زہد و بزرگی کے خلاف سمجھے۔ وہ مقام انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے۔ ہاں صرف دنیوی حاجات اسی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے۔ اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔ (معارف القرآن، ج:۱، ص:۴۹۲)

اگر ہم غور سے دیکھیں تو حضرتِ والا کی یہ دعا جس میں دونوں جہان کی بھلائی اور خیر مانگی گئی۔ قرآنِ کریم کی اسی دعا سے ماخوذ اور مستنبط ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس سے دنیا و آخرت دونوں مانگی جائے، اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُمت کو یہ تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ سے دونوں جہان کی عافیت

اور خیر مانگے اور ارشاد فرمایا سَلُو ا اللہَ الْعَافِیَۃَ۔

حقیقتِ دنیا اور علی گڑھ کا ایک واقعہ

صاحبو! بعض حضرات فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً سے یہ دھوکہ کھاتے ہیں کہ دنیا بھی مانگی گئی اور آخرت بھی مانگی گئی، اس لئے جس درجے اور جتنی فیصد آخرت مطلوب ہے اتنے ہی درجے دنیا بھی مطلوب ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ احقر کے ساتھ پیش آیا کہ ایک مرتبہ علماء کی جماعت کے ساتھ چلّے میں علی گڑھ یونیورسٹی جانا ہوا تو وہاں کی ایک مسجد میں ایک شخص نے ہم تبلیغی ساتھیوں پر بھی اعتراض کیا کہ آپ لوگ ہر وقت تبلیغ تبلیغ کی بات کرتے ہو حالانکہ قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے دنیا آخرت دونوں کی مانگنے کی بات کہی ہے تو تم صرف کیوں آخرت ہی کی بات کرتے ہو؟ تو اس کا ایک الزامی جواب تو اس وقت ان کو دیا گیا کہ تبلیغ میں نکلنے کے لئے تو صرف مہینے میں تین دن کی بات کی جاتی ہے اور سال میں چلّے کی بات ہوتی ہے جبکہ یہ تو آدھا بھی نہیں چوتھائی بھی نہیں ہے۔ تو پھر یہ کہنا کہ ہر وقت آخرت آخرت کی بات کرتے ہو، درست نہیں۔

اور اس کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے مانگنے کی بات نہیں کی بلکہ دنیا میں حسنہ مانگنے کی بات کہی ہے۔ یعنی دنیا ظرف ہے اور حسنہ مظروف جیسے کوئی یوں کہے کہ مجھے ایک گلاس (Glass) میں دودھ دے دو تو اس کا معنی گلاس مانگنا نہیں بلکہ گلاس میں دودھ مانگنا ہے۔ سو اسی طرح یہاں دنیا کا سوال نہیں ہے بلکہ دنیا کے اندر حسنہ کا سوال ہے اور یہ دو الگ الگ شئے ہیں۔ دنیا تو کہتے ہی اللہ سے غافل ہونے کو ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

جبکہ دنیا میں حسنہ الگ شئے ہے جیسا کہ اوپر گزرا اور اس کا مانگنا ہی مطلوب ہے نہ کہ دنیا کا۔ پھر اگلے مصرعے میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اے اللہ! ایسے اعمال ہو جانے کے باوجود کہ جو تیرے غصے اور غضب کے داعی ہیں اور جن سے تیرا عذاب اُترتا ہے تُو اپنے فضل و کرم سے ہمیں امن دے دے اور اپنے غضب سے محفوظ فرما۔ کوئی کتنا ہی مستحقِ غضب ہو جب وہ اپنے جرم کا اقرار کر کے اللہ تبارک و تعالیٰ سے اس کے عفو و کرم اور سلامتی و عافیت کی بھیک مانگتا ہے تو وہ اس کو ضرور عطا ہوتی ہے۔

سب سے بڑی صدق اللسانی

اور اپنے فضل سے مجھے صدقِ لسان دے
اور اپنی محبت کی بھی اک خاص شان دے

اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم بدنِ انسانی کے دو اہم اعضاء یعنی قلب ولسان کے متعلق دعا کررہے ہیں۔ دل کے متعلق تو یہ دعا کہ اے اللہ! مجھے اپنی محبت کی ایک خاص شان عطا فرما اور زبان کے متعلق یہ دعا کہ میری زبان کو سچائی کی صفت عطا فرما۔

قرآن وسنت کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دل کو انسانی بدن میں بادشاہت کا مقام حاصل ہے۔ اسی کے حکم کے مطابق باقی اعضاء سے اعمال وافعال صادر ہوتے ہیں۔ اور زبان بھی درحقیقت ترجمانِ حالِ دل ہوتی ہے، اس لئے جو کچھ انسان کے دل میں ہوتا ہے، اسی کی ترجمانی اُس کی زبان کرتی ہے تو جب دل اللہ تعالیٰ کی خاص محبت سے بھرپور ہوگا تو پھر زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت ورحمت کی باتیں اور عشق ومحبت کی سچی داستانیں بیان ہوں گی کیونکہ دنیا میں سب سے بڑی سچائی ایمان واسلام اور اطاعت وانقیادِ باری تعالیٰ کی دعوت میں منحصر ہے۔ یہی راز ہے کہ علمِ وحی خلافِ حقیقت باتوں پر مشتمل نہیں ہوسکتا تو جو زبان ترجمانِ ایمان واسلام ہوگی وہ سب سے زیادہ سچی اور صادق ہوگی اور وہ شخص صادق اللسان ہوگا۔ اگرچہ صدقِ لسانی اور بھی بہت سارے معاملات وواقعات کے سلسلے میں مطلوب ہے، لیکن خاص طور پر یہ بیانِ محبتِ الٰہی اور معرفت وقربِ خداوندی سب سے بڑی صداقت ہے کیونکہ دنیا کی محبتیں اور تعلقات حقیقت میں ایک دھوکہ ہے کہ بظاہر تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ دنیا ہماری وفادار دوست ہے، مگر یکدم ہمیں اپنے اندر سے نکال کر پھینک دیتی ہے، اس لئے کائنات کی سب سے بڑی سچائی باری تعالیٰ کا وجود اور رسالتِ رسول کی حقانیت ہے اور پھر اس کی دعوت میں زبان کا استعمال سب سے بڑی صدق اللسانی ہے۔

یا رب مجھے زمان اور ایسا مکان دے
جس میں تری ہی یاد ہو ایسی ہر آن دے

حضرتِ والا نے اس شعر میں بڑی ہی قیمتی دعا فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنی یاد کے لئے ایسے فرصت کے ایام عطا کردے اور دنیا کے جھمیلوں اور رنگ رلیوں سے محفوظ ایسی جگہ جس میں رہ کر میرے شب وروز تیری یادوں میں گزر رہے ہوں۔ جیسا کہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا ہے ؎

تمنا ہے کہ اب ایسی جگہ کوئی کہیں ہوتی
اکیلے بیٹھے رہتے یاد ان کی دلنشیں ہوتی

کیونکہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو دی ہوئی عمر کے متعلق باز پرس اور سوال کریں گے کہ کس چیز میں عمر گزاری اور جو گھڑی اللہ کی یاد سے غفلت میں گزری ہوگی، اس پر ان کو حد درجہ افسوس ہوگا۔ اسی لئے حدیث پاک میں ارشاد ہے:

﴿عَنْ ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّم نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی لا عیش الا عیش الآخرۃ، ج:۲، ص:۹۴۹)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو نعمتیں ہیں جن کے معاملے میں بہت سے لوگ (ان کی قدر کماحقہٗ نہ کرنے کے سبب) خسارہ اور نقصان میں ہیں (۱) ایک صحت اور (۲) دوسری فراغ۔

پھر جب آدمی صحت اور تندرستی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کو خالی اوقات بھی میسر آتے ہیں تو اس وقت تو ان کو لہو ولعب اور بیکار کاموں میں گزار دیتا ہے لیکن جب وہ اوقات گزر چکے ہوتے ہیں تب وہ حسرت وافسوس کے ساتھ کفِ افسوس ملتا ہے، لیکن اس وقت افسوس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح کچھ لوگ لہو ولعب میں تو نہیں لیکن دنیا کے فانی اور بے سود مشاغل میں اس قدر منہمک اور مصروف ہوتے ہیں کہ انہیں اللہ کی یاد اور دینی مشاغل کے لئے وقت خالی نہیں ملتا، بلکہ جب بھی کوئی دینی کام سامنے آتا ہے اور اس کے لئے وقت درکار ہو تو ان کی طرف سے یہی جواب ہوتا ہے کہ ابھی میں بہت بزی (Busy) ہوں پھر بعد میں دیکھوں گا، مگر وہ ''بعد'' کبھی آتا نہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کا آخری وقتِ موعود آپہنچتا ہے اور پھر وہ زبانِ حال سے یوں کہتے ہوئے ہوتے ہیں:

﴿لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْ اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

(سورۃ المنافقین، آیت:۱۰)

اے میرے پروردگار! مجھ کو اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے دیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا، مگر اس وقت اس کی یہ تمنا اور حسرت اس کے لئے مفید نہ ہوگی، کیونکہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلا دیا کہ موت کے آجانے کے بعد کسی کو مہلت نہیں ملتی، یہ تمنائیں سب لغو اور فضول ہیں۔

(معارف القرآن، ج:۸، ص:۴۵۹)

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی ایک جامع نصیحت

اسی لیے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کو حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ حضرت کوئی ایسی جامع نصیحت ارشاد فرما دیں کہ جو میں اپنے احباب اور متعلقین کو خاص طور پر بتا سکوں جو کہ مختصر ہو مگر جامع ہو تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا ہے کہ زندگی کے ہر لمحہ کو آخری لمحہ اور ہر گھڑی کو آخری

گھڑی سمجھو کہ اگر ملک الموت آ جائے تو اس وقت حسرت و افسوس سے ہم یہ نہ کہتے ہوئے ہوں کہ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ کاش! اگر ذرا سا اور وقت مل جاتا اور مہلت عطا کر دی جاتی تو میں بہت سے نیکی کے کام کرتا۔ اس وقت اس حسرت و افسوس سے کوئی نفع نہ ہوگا، اس لئے اس تصور کے ساتھ زندگی گزارے کہ ؎

شاید ہمیں نفس نفسِ آخری بود
شاید زندگی کا یہی سانس آخری ہو

صاحبو! یہ حسرت و افسوس کے جملے تو کفار و مشرکین بھی مرنے کے بعد بولیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات میں ان کی طرف سے نقل کیا ہے۔ ایک موقعہ پر ارشاد ہے:

﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ﴾

(سورۃ المؤمنون، آیت: ۱۰۷)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے (اور دوبارہ دنیا میں بھیج دیجئے) پھر اگر ہم دوبارہ (ایسا) کریں تو ہم بے شک پورے قصوروار ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۶،ص:۳۳۳)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ﴾

(سورۃ السجدۃ، آیت: ۱۲)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو بھیج دے کہ ہم کریں بھلے کام، ہم کو یقین آ گیا۔
(معارف القرآن، ج:۷،ص:۶۳)

اور کہیں پر اس حسرت و افسوس کو اللہ تعالیٰ نے یوں تعبیر کیا:

﴿یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ﴾

(سورۃ الانبیاء، آیت: ۹۷)

ترجمہ: ہائے کمبختی ہماری! ہم بے خبر رہے اس سے نہیں، پر ہم تھے گنہگار۔ (معارف القرآن، ج:۶،ص:۲۲۶)

اور کسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ○﴾

(سورۃ الفرقان، آیت: ۲۸-۲۹)

ترجمہ: ہائے خرابی میری! کاش کہ نہ پکڑا ہوتا میں نے فلانے کو دوست، اس نے تو بہکا دیا مجھ کو نصیحت سے مجھ تک پہنچ چکنے کے بعد، اور ہے شیطان آدمی کو وقت پر دغا دینے والا۔ (معارف القرآن،۶،ص:۴۶۸)

غرض یہ کہ اس وقت تو کافر اور مشرک بھی افسوس کریں گے، لیکن ان کی حسرت و افسوس اس وقت ان کو نفع نہ دے گی اور بالآخر عذاب کی شدت کو دیکھ کر یوں کہہ اُٹھے گا یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا اے کاش! کہ میں مٹی ہوتا۔

اس لئے زندگی کی ہر گھڑی آخرت کے اُن حالات کو سامنے رکھ کر گزارنی چاہیے تا کہ پھر اس حسرت و افسوس سے بچا جا سکے اور گویا حضرت کا یہ شعر اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ اس دعا میں یہی چیز مانگی گئی ہے کہ میں جس جگہ بھی رہوں اور جو بھی وقت ہو، فضاؤں میں ہوں تو، اور زمین پر ہوں تو، اور سمندر میں ہوں تو، اور شہروں میں ہوں تو، پہاڑوں اور جنگلوں میں ہوں تو، ہر جگہ اور ہر قدم تیری ہی یادوں میں مست رہوں، تیری یاد ہی میری رضا ہو۔

جی چاہتا ہے ایسی جگہ میں رہوں جہاں
جیتا ہو کوئی درد بھرا دل لئے ہوئے

چھوٹی سی اسلامی حکومت اور ہم

کوئی ہمارے کان میں ایسی فغان دے
جس سے ہمارا ہر بنِ مو تجھ پہ جان دے

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً اے ایمان والو! تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ پورا بدن سر سے پیر تک اور بدن کا ہر ہر عضو اللہ کے حکم کے تابع ہو اور اس کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، وہ اُسی مقصد کے لئے استعمال ہو رہا ہو۔ زبان صرف وہاں اُٹھے جہاں بولنے کی شریعت نے اجازت دی ہو۔

جب غیبت اور گالی، لعنت اور ملامت، چغل خوری اور بیہودہ گوئی، فحش و بے حیائی کی گفتگو کے مواقع سامنے آئیں تو فوراً زبان کو بند کر دے۔ دنیا کا کیسا ہی حسین، حسینہ سامنے آئے، مختلف میگزین (Magazines) اور رسالوں، وی سی آر (V.C.R) اور ٹیلی ویژن (Television)، انٹرنیٹ (Internet) اور موبائل فون (Mobile phone) پر عریاں اور ننگی تصاویر سامنے آئیں تو فوراً اپنی نگاہوں کو بند کر لے۔ غرض کہ جملہ اعضائے بدن پر حکمِ الٰہی نافذ ہو رہا ہو، زبان و کان، آنکھ و دل اور تمام حواسِ ظاہرہ و باطنہ باری تعالیٰ کی اطاعت میں لگے ہوں۔ یہی حقیقت ہے ہر بنِ مو کے اللہ پر جان دینے کی۔ اس پہ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ احقر نے ایک مرتبہ اپنے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ سے خط میں سوال پوچھا کہ حضرت! میں عشقِ الٰہی چاہتا ہوں جس سے میں اللہ تعالیٰ کا کامل ولی بن جاؤں۔ اس پر حضرت والا نے جواب تحریر فرمایا تھا۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی نورِ حق برما بخند

یعنی اپنی آنکھ، کان اور ہونٹوں کو بند کر لو! اگر تم خدا کا نور نہ دیکھو تو تم ہمارے اوپر ہنسنا یعنی ہمارا مذاق بنانا، منشاء یہ ہے کہ ان سب اعضاء کو حرام اور گناہوں سے بند کر دو۔

تو پھر قلب میں اللہ تعالیٰ کا نور ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کرسکتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارا یہ جسم ہم کو ایک چھوٹی سی حکومت کی شکل میں عطا کیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں دیکھیں گے کہ ہم نے اس حکومت پر اللہ تعالیٰ کے احکام جاری ونافذ کئے ہیں یا نہیں؟ اور اس کو ایک اسلامی حکومت بنایا ہے کہ نہیں، سر سے پیر تک کے تمام اعضاء پر حکمِ الٰہی جاری وساری ہے یا نہیں؟ اور اس میں ان لوگوں کے لئے بڑا درسِ عبرت ہے کہ جو مختلف ملکوں میں رہ کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ اسلامی حکومت بنانے کے نعرے لگاتے ہیں اور اس کا شور مچاتے رہتے ہیں جبکہ خود ان کی زندگی کا ہر باب اور ان کا ہر قول وفعل اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں ہوتا، وہ اپنے اس چھوٹے سے بدن پر احکامِ اسلامی نافذ کر کے اس پر حکومت اسلامی قائم نہیں کرپاتے تو بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ کہ وہ خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ کہ جو حکومت ان کے قبضے میں ہے اور اس پر اسلام کے نفاذ سے ان کو کوئی روکنے والا نہیں تو جو غیر اختیاری ہے اس پر اسلامی حکومت کا دعویٰ مکر اور فریب ہے۔

اس گفتگو سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ جس شخص نے سر سے پیر تک اسلامی احکام اپنے اوپر نافذ نہ کئے ہوں تو اسے اللہ کی راہ میں اپنی جان دینے کی باتیں کرنا یا کسی اسلامی حکومت کے قیام اور بقاء کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینا یہ اچھی بات نہیں۔ ایسا ہرگز نہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ جس دن وہ اس اچھی نیت سے راہِ خدا میں نکلتا ہے تو اسی وقت اس کی برکت سے اس کی ماضی کی زندگی کی تمام ظلمت اور تاریکیاں روشنی سے بدل جاتی ہیں، کیونکہ اس غرض سے اللہ کی راہ میں قدم اُٹھا کے چلنا اس بات کی نشانی ہے کہ وہ اب تائب ہو کر اپنا پورا جسم سر سے پیر تک اللہ تعالیٰ کو پیش کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس لئے اس گفتگو سے دھوکہ کھا کر یہ نہ کہنا چاہیے کہ جب اس کا ایمان نہیں بنا اور اس کی اصلاح نہیں ہوئی تو اسکا جان دینے کے لئے نکلنا درست نہیں۔

فغانِ غیبی اور صدائے قلبی

حضرتِ والا کا یہ فرمان کہ ہمارے کان میں کوئی ایسی فغان دے یعنی دل میں کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو اور ایسی غیبی آواز کانوں کو سنائی دے کہ جس سے میں سب کچھ تجھ پر قربان کردوں۔ خیر کے ایسے جذبات کا دل میں آنا اور دل پر کسی ایسی چوٹ کا لگنا کہ جو زندگی کی کایا پلٹ دے اس کے متعلق حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ فرشتے کی طرف سے دل میں ڈالا جاتا ہے:

﴿وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ اٰدَمَ وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً فَاَمَّا لَمَّةُ الشَّيْطَانِ فَاِيْعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَكْذِيْبٌ بِالْحَقِّ وَاَمَّا لَمَّةُ الْمَلَكِ فَاِيْعَادٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ فَلْيَعْلَمْ اَنَّهُ مِنَ اللّٰهِ فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ الْاُخْرٰى فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ثُمَّ قَرَاَ (اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ)﴾

(المشکوٰۃ، باب فی الوسوسہ، ص: ۱۹)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان کے دل میں کچھ تصرف کرتا ہے اور فرشتہ بھی کچھ تصرف کرتا اور شیطان کا تصرف شر پر وعدہ دلانا اور ابھارنا اور حق کی تکذیب کرانا ہے اور فرشتے کا تصرف خیر پر وعدہ دلانا اور ابھارنا اور حق کی تصدیق کرانا ہے پس جو اس کو پائے تو سمجھ لے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور جو دوسرے کو پائے تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اور پھر یہ آیت پڑھی: ''شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی اور بُرے کاموں کا حکم دیتا ہے اور اس کے لیے اکساتا ہے۔''

تو دل میں یہ جذبات اور دواعی کہ میرا بال بال اللہ پر فدا ہو۔ درحقیقت یہی لَمَّۃُ مَلَکٍ ہے (فرشتے کا تصرف) اور اس کی قدر کرتے ہوئے فوراً اس پر عمل کرنا چاہیے۔ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ اس کو ایک بڑی پیاری مثال سے بیان کرتے تھے کہ اگر تمہارے در پر کوئی مہمان آئے اور تم اس کی اچھی مہمان نوازی کرو، اس کا خوب خیال رکھو تو پھر وہ بار بار آتا ہے۔ اس طرح یہ نیکی کا داعیہ دل میں آتے ہی اس پر عمل کرنا اس کی قدردانی کرنا ہے تو پھر یہ مہمان بھی بار بار آئے گا اور اگر التفات نہ کیا تو پھر وہ سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔

اور اپنی معرفت کی مجھے ایسی شان دے
ہر ذرّہ کائنات کا تیرا نشان دے

حضرتِ والا اس شعر میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے جو دعا مانگ رہے ہیں۔ یہ اُس چیز کی دعا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی ذی عقل وشعور اور سمجھدار لوگوں کی صفات میں ذکر کیا ہے کہ سمجھدار لوگ وہ ہوتے ہیں جو چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے غرض کہ ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہیں۔ زمین وآسمان کی تخلیق میں غور کر کے یوں پکار اُٹھتے ہیں کہ اے خدا! تو نے اس نظامِ عالم کو بیکار اور عبث پیدا نہیں کیا اور آپ کی ذات اس سے پاک ہے۔ وہ دلائلِ انفس اور دلائلِ آفاق میں تدبر اور غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور ذرہ ذرہ ان کو اللہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کا قول ہے ؎

وَ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

اور ہر چیز میں ان کی نشانی ہے جو اس بات پر رہنمائی کر رہی ہے کہ وہ خالقِ کائنات ایک ہے اور فارسی میں یہ شعر بھی اسی حقیقت کا ترجمان ہے ؎

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ گوید

جو گھاس زمین سے اُگتی ہے اس کے اُگنے کی حالت بتا دیتی ہے کہ وہ بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ اللہ آپ اکیلے ہیں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

صاحبو! کائنات میں اس طرح غور وفکر کرنا اس کو ''ذکرِ فکری'' کہتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں یہ بھی بڑی عبادتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس شعر میں حضرتِ والا نے اسی ذکرِ فکری کو مانگا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان مؤمنانہ نظر سے غور کرے نہ کہ معاندانہ ومشرکانہ تو پھر ہر شئے اُسے خدا کا پتہ بتا دیتی ہے۔ جیسا کہ عارفِ ہندی حضرت خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ اسی کو اپنے اشعار میں یوں تعبیر کرتے ہیں ؎

جہاں میں ہر سو ہے اس کا جلوہ کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے
وہ ذرّہ ذرّہ میں جلوہ گر ہے مگر کوئی دیدہ ور نہیں ہے

وجودِ ربّ کائنات پر ایک الہامی دلیل

اسی لئے غور و تدبر کے نتیجے میں حق تعالیٰ کی طرف سے احقر کو عطا ہونے والا ایک مضمون پیشِ خدمت ہے۔ جیسے بہت سے مواقع پر بیانات میں بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ انسانوں کے سوا کائنات میں بے شمار مخلوقات بستی ہیں۔ کیڑے، مکوڑے، پرندے درندے، چرندے، بری بحری مخلوق، پھر الگ الگ نوع کی مخلوقات جن کے پاس باقاعدہ مال و دولت جمع کرنے یا اپنی روزی کو کسی معین قابلِ اعتماد جگہ سے وقتِ مقرر پر لینے اور حاصل کرنے کا کوئی نظم وانتظام نہیں ہوتا بلکہ رات کے کھانے کے بعد صبح کے کھانے اور صبح کے کھانے کے بعد رات کے کھانے کے لئے ان کے پاس کوئی مخصوص ذخیرہ نہیں ہوتا اور نہ ان کے بینک بیلنس (Bank balance) نہ ذخیرہ اندوزی اور نہ ہی اور کوئی حتمی اور قطعی ان کی غذاء اور روزی کا نظام ہوتا ہے۔

تو دوستو! احقر عرض کرتا ہے کہ اگر اس کائنات کا کوئی خدا، کوئی خالق و مالک، کوئی ربّ اور پالنے والا نہ ہوتا اور اپنی ہر مخلوق کی حاجت کو جان کر اُسے پوری کرنے والا نہ ہوتا تو مجھے اور آپ کو راستوں اور سڑکوں پر، پہاڑوں اور جنگلوں میں کتنے ہی پرندے اور درندے اور کتنی ہی مخلوقات مردہ پڑی ہوئی ملا کرتیں کہ کھانا میسر نہ آنے کے سبب شدتِ بھوک سے ان کی موت واقع ہو جایا کرتی۔ مگر آپ بھی غور کریں اور احقر نے بھی بہت غور کیا لیکن پوری عمر گزر جانے کے باوجود کوئی ایک واقعہ بھی ایسا آج تک نظر نہیں آیا چہ جائیکہ روزانہ واقعاتِ کثیرہ سامنے آتے۔

تو کیا یہ بات اسی حقیقت کی ترجمان نہیں ہے کہ یہ سارا نظامِ عالم خود رواں دواں نہیں اور اپنے طور پر جاری وساری نہیں بلکہ اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ ایک ربِّ عظیم کی عظیم حکومت و بادشاہت کے ماتحت ہے اور وہی اس کے پورے نظام کو چلانے والا ہے اور اسی کے فیصلوں سے موت وحیات و بقاء وفنا وجود و عدم، عزت و دولت، غناء و فقر، خوشی و غم، راحت و مصیبت، وابستہ اور جڑی ہوئی ہے۔ یہی وہ تدبر اور غور ہے کہ جس کے نتیجے میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ توحیدِ باری تعالیٰ کا نشان بن جاتا ہے۔ یہی وہ ذکرِ فکری ہے جس کی قرآن میں جگہ جگہ تعریف مذکور ہے۔

اس کے برعکس صورتحال کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ يَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهَا وَهُمۡ عَنۡهَا مُعۡرِضُوۡنَ﴾

(سورۃ یوسف، آیت:۱۰۵)

ترجمہ: اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر گذر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے۔

(معارف القرآن، ج:۵، ص:۱۴۰)

خالق کا ذکر اور مخلوق میں فکر کیجئے!

میرے دوستو! کائنات میں غور کر کے اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور ہر ذرّہ کائنات پر عبرت کی نگاہ ڈالنا تو مطلوب و محمود ہے، لیکن خود خالق کے اندر غور کرنا جائز نہیں۔ اسی لئے قرآن میں ہے یَتَفَكَّرُوۡنَ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ آیا ہے یعنی مخلوقات میں غور کرنے کا حکم ہے، لیکن ذاتِ خالق میں غور کرنا منع ہے، خالق کا ذکر کرنا ہے اور مخلوق میں فکر کرنا ہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے تَفَكَّرُوۡا فِىۡ اٰلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَكَّرُوۡا فِى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرو، اللہ میں غور و فکر نہ کرو! اور اس کی حکمت واضح ہے کہ اللہ کی ذات لامحدود ہے اور ہماری عقل محدود ہے۔ اسی لئے فلسفیوں کو آج تک راہِ حق نصیب نہ ہو سکی، کیونکہ انہوں نے عقل کی راہ سے خدا کو جاننا چاہا۔ اسی کو شاعر نے یوں کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

اور یہ خود خدا کے ایک خدا ہونے کی دلیل ہے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تری پہچان یہی ہے

ذاتِ خداوندی پر اعتماد ہر مسئلے کا حل ہے

آہ! اے انسان! اس مذکورہ بالا تقریر کی روشنی میں اے انسان! کیا تیرا یہ فریضہ نہیں کہ تو بھی اپنے ربّ پر بھرپور اعتماد اور بھروسہ کرنے والا ہو اور صبح و شام، رات و دن اور آج و کل کی جملہ حاجات اور ضروریات کے سلسلے میں اُسی اللہ کو کافی سمجھنے والا ہو کہ پھر نہ تو کسی حرام کی طرف میلان ہوگا اور نہ حق و باطل اور حلال و حرام، صحیح اور غلط، جائز و ناجائز سے بے فکری اور لاپرواہی ہو سکے گی نہ تو کسی کے حقوق ضائع کرنے والا ہوگا اور نہ ہی کسی کے مال و دولت پر ناجائز اور غاصبانہ قبضہ کر کے اُسے اپنی ملک قرار دینے والا ہوگا۔ پھر تیرا اعتماد بینک بیلنس (Bank balance) اور مال و دولت کے ذخیروں پر ہوگا اور نہ ہی تو کسبِ مال کو حرصِ مال میں تبدیل کرے گا، نہ ہی بخل و

اسراف کا وبال اپنے کندھے پر اُٹھانے والا ہوگا، نہ بینک (Bank) کے سودی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوگا، نہ ہی مشاغلِ کثیرہ کے ہجوم میں پھنس کر حقوقِ اہل وعیال اور اقرباواعزا خدمتِ والدین ومشائخ کی سعادتوں سے محروم رہے گا، نہ ٹینشن (Tension)، ڈیپریشن (Depression)، مایوسی، اُداسی، ذہنی تناؤ اور کھچاؤ اور تفرق، وتشتت کی تلخ اور کڑوی زندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بلکہ میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ پھر اُس کی زندگی زندگی ہوگی اور اس کا عیش عیش ہوگا۔ اس کی راحت راحت ہوگی اور اس کو وہ پُر کیف پُر بہار بالطف زندگی ملے گی کہ جس کے سکون اور اطمینان کے سامنے وہ سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہے گا۔ مگر اس گفتگو سے ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح کائنات کی دوسری مخلوقات کو اللہ تبارک وتعالیٰ بغیر کسب ومحنت رزق عطا کرتے ہے تو ہم بھی اسی طرح کمانے کے لئے جدوجہد کرنا چھوڑ دیں اور اللہ پر بھروسہ کرلیں۔

اوپر کی گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حدیثِ پاک میں ارشاد فرمایا کہ اگر تم اللہ پر ویسا توکل کرنے لگو جیسا حق ہے تو تمہیں اس طرح رزق دیا جائے جس طرح پرندوں کو کہ وہ صبح سویرے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھونسلوں میں جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنے مناسب حال محنت کرتے ہیں کہ صبح کو چلتے ہیں۔

﴿عَنْ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا﴾

(سنن الترمذی، ابواب الزھد، ج: ۲، ص: ۲۰)

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جو شخص توکل کا مفہوم یہ سمجھے کہ بس زمین پر پڑا رہے اور تدابیر اور کسبِ معاش نہ کرے تو وہ جاہل ہے۔ اس لئے حدیثِ پاک سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ تدبیر نہ کریں کیونکہ چڑیوں کا باہر نکلنا بھی تدبیر ہے اور ہر انسان کے لئے اس کے مناسب تدبیر ہوگی۔ البتہ بھروسہ تدبیر پر نہ کرے، تدبیر صرف بھیک کا پیالہ ہے اور دینے والے حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔“

اس لئے احقر کی گفتگو کا منشاء یہ نکلا کہ ہر خیر کے اور اچھے کام کے لئے اور کسبِ معاش وغیرہ کے لئے مناسب تدابیر اختیار کر کے نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں چھوڑ دے اور نہ اختیارِ تدابیر میں بہت حرص اور مبالغہ سے کام لے اور نہ خلافِ تدبیر نتیجہ آنے سے رنج وغم میں مبتلا ہو۔ بس یہی توکل کی جان اور روح ہے۔

پھر مزید برآں یہ بھی ایک بات ہے جو احقر کو ایک خط کے جواب میں شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمائی تھی کہ ”ان جانوروں وغیرہ کا رزق نظامِ تکوینی کے ساتھ وابستہ ہے اور ہم تشریع کے مکلّف ہیں۔ اس میں کمانے کا حکم بھی موجود ہے۔ اس لئے ہرگز ان کو سامنے رکھ ترکِ اسباب وتدابیر جائز نہیں۔

میری جان آپ پر نثار

اپنا پتہ دے مجھ کو یوں اپنا نشان دے
جاؤں جہاں بھی دل مرا بس تجھ پہ جان دے

حضرتِ والا اس شعر میں کمالِ معرفتِ خداوندی اور تقربِ بارگاہِ الٰہی کی دعا کر رہے ہیں کہ مجھے اتنا قربِ خصوصی عطا کر دیجیے کہ میں جس سمت میں بھی نکلوں بس تیرے ہی گیت گاؤں اور میرے قلب و جان تیرے اوپر فدا ہوں نہ شہروں کے پُر کیف بنگلے نہ گلشنوں کی پُر کیف فضائیں اور نہ قصور و محلات کی بارونق در و دیوار نہ سیر گاہوں اور تفریح گاہوں کی پُرکشش مناظر کوئی بھی میرے دل کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ نہ مال و دولت کی صورت میں طغیانی اور سرکشی میں مبتلا ہوں اور نہ فقر و فاقہ اور رنج و مرض میں تجھے بھولوں۔ میں جس حال میں بھی اور جہاں بھی ہوں بس تیرے ہی حکم پہ جان دوں۔

ماشاء اللہ! حضرتِ والا کو اللہ تعالیٰ نے یہ خاص صفت عطا فرمائی ہے کہ جہاں بھی تشریف لے جاتے ہیں۔ ہر وقت تبلیغِ احکامِ خداوندی امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں اس طرح مشغول رہتے ہیں کہ خلوتیں ہوں یا جلوتیں بس بیانِ محبتِ الٰہی ہی شغل رہتا ہے اور عشقِ مجازی کی تباہ کاریاں اور بربادیاں اور اس کے مضراتِ دنیویہ اور دینیہ اپنے پُرکشش اور خاص انداز میں پیش فرماتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی کی کوئی رعایت نہیں فرماتے اور نہ ذرا بھی مداہنت سے کام لیتے ہیں بلکہ مختلف انداز اور طریقوں سے عشقِ مجازی کے نقصانات اور محبتِ خداوندی کے انعامات پیش فرماتے رہتے ہیں اور یہی حقیقت ہر جگہ اللہ پر جان دینے کی ہے۔ اسی کو دوسرے شعر میں حضرتِ والا نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

میں جہاں بھی رہوں جس فضاء میں رہوں
میرا تقویٰ ہمیشہ سلامت رہے

دردِ دل اور زبانِ ترجمانِ دردِ دل

آہوں کو میرے درد کا وہ ترجمان دے
تیرا بیان ہر زماں جس سے زبان دے

حضرتِ والا اس شعر میں یوں دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! جس طرح آپ نے میرے قلب میں اپنی محبت کا درد و غم عطا کیا ہے۔ تو میں تجھ سے بھیک مانگتا ہوں کہ اے اللہ! مجھے اُس دردِ محبت کی ترجمانی کے لئے ایسی زبان عطا فرما دے کہ جس کے ذریعے میں ایسا بیان دوں کہ جو آہ و فغاں سے پُر ہو اور بااثر ہو اور میری زبان اس دردِ محبت اور آہ و فغاں کی ترجمانی کے لئے ہر وقت مصروفِ عمل رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کے دل کو دنیا کی محبت سے پاک وصاف کرتے ہیں اور اُس میں اپنے علوم اور حکمتیں عطا فرماتے ہیں۔ پھر ان کے

بیان کے لئے زبان بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ جسمانی مرض کی صورتحال ایسی ہی ہے کہ جب کوئی انسان کسی درد و تکلیف میں مبتلا ہو اور پھر ڈاکٹر (Doctor) سے اس کو اپنا درد بتانا ہو تو اس کے لئے کسی تقریر و بیان کی پریکٹس (Practice) اور مشق نہیں کرنی پڑتی بلکہ وہ خود ہی اس کی پوری پوری اور صاف ترجمانی کر دیتا ہے۔ تو اسی طرح اللہ کی محبت کے درد و غم کا بھی حال ہے۔

چنانچہ اسی مضمون کو ایک روایت میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ ذَرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَازَھِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلاَّ اَنْبَتَ اللہُ الْحِکْمَۃَ فِیْ قَلْبِہٖ وَاَنْطَقَ بِھَا لِسَانَہٗ وَبَصَّرَہٗ عَیْبَ الدُّنْیَا وَدَائَھَا وَدَوَائَھَا وَاَخْرَجَہٗ مِنْھَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلاَمِ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب الرّقاق، ص: ۴۴۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بندہ نے دنیا میں زہد اختیار کیا (یعنی دنیا سے بے رغبتی کی) اللہ تعالیٰ نے اس کی دل میں حکمت پیدا کی اور حکمت کے ساتھ اس کی زبان کو گویا کیا اور دنیا کے عیوب اور اس کی بیماریاں اور اُن بیماریوں کا علاج اس کو دکھایا اور نکالا اُس کو حق تعالیٰ نے دنیا سے سالم دارالسلام کی طرف۔ (دنیا کی حقیقت، صفحہ: ۷۰)

اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ جب بندہ کا دل غیر اللہ کی محبت سے صاف کر دیا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس کے قلب میں اپنے علوم اور حکم عطا فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زبانِ ترجمانِ دردِ دل بھی عطا ہوتی ہے جس سے وہ ان علوم اور حکم کو ظاہر کرتا ہے۔ اُس درد و محبت کو بیان کرتا ہے جبکہ یہ ڈائریکٹ (Direct) اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے تو پھر اس کی تاثیر عام خطیبوں کی خطابت اور مقررین کی تقریر اور واعظین کے وعظ و بیان سے کچھ الگ ہی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کچھ ایسی جادو بیانی عطا کرتے ہیں کہ جو دوسروں کے دلوں کی کایا پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔

ہر عضو کو اس کے صحیح مقصد میں لگانا ہی اس کا شکریہ ہے

جب کسی بندے کو اللہ تعالیٰ نے زبان عطا فرما کر قوتِ گویائی نصیب کی ہو تو اُس کا صحیح شکریہ یہی ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اُس کی عظمت و محبت کے بیان میں خرچ کرے جو کہ زبان کے ملنے کا حقیقی مقصد ہے اور جب انسان اپنے اعضاء کو حقیقی مقصد میں صرف کرتا ہے تو وہ اس عضو کا حق ادا کر رہا ہے۔ ورنہ ان کے غلط استعمال کی صورت میں قیامت کے دن اس سے مواخذہ ہوگا۔ اسی لئے قرآنِ پاک میں مختلف آیتوں میں مضمون موجود ہے کہ انسان کے اعضائے بدن جب خدا کی نافرمانی میں استعمال ہوئے ہوں تو وہ قیامت کے دن اُس عاصی کے خلاف گواہی دیں گے اور ان کو اللہ اپنے قدرتِ خصوصی سے گویائی عطا فرما دیں گے۔ اس طرح اُن پر حجت قائم کریں گے، اس لئے حضرت والا اللہ تعالیٰ سے ان اعضاء کے صحیح استعمال کی دعاء کر رہے ہیں۔

دعائے ہمت اور عطائے ہمت

ہمت کی میری خاک کو وہ آن بان دے
دل کو جو میرے شوکتِ ہفت آسمان دے

حضرتِ والا یوں دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میں ایک خاکدان ہوں تو مجھے اپنے دین پر چلنے کے لئے ایسی ہمت عطا فرمادے کہ جس کے نتیجے میں مجھے ساتوں آسمانوں کی بادشاہت عطا ہو جائے۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر اتنی مضبوطی اور ہمت سے عمل کرنے والا ہوں کہ جس سے تیرے نزدیک محبوب بن جاؤں اور پھر ساتوں آسمانوں کے فرشتے اور اہلِ زمین مجھ سے محبت اور الفت کرنے لگیں۔ جیسا کہ یہ مضمون ایک روایت کے اندر بھی مذکور ہے۔

صاحبو! ہمت اور قوت کا استعمال اس راہِ سلوک میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ جیسا کہ حضرت قاری امیر حسن صاحب دامت برکاتہم خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں مجلس میں ایک حاضری کے موقعہ پر یوں ارشاد فرمایا اَلْاِنْسَانُ یَطِیْرُ بِھِمَّتِہٖ کَالطَّیْرِ یَطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ کہ انسان اپنی ہمت سے اس طرح اُڑتا ہے جس طرح کہ پرندہ اپنے بازوؤں سے اُڑتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سالک کو اس راہ میں ترقی کے لئے قوی الہمت ہونا ضروری ہے۔ سست بن کر کچھ نہ کرنا اور محض بزرگوں سے بیعت ہو جانے اور تعلق کر لینے کو کافی سمجھنا بے حقیقت اور بے بنیاد سوچ ہے۔

جیسا کہ حضرتِ والا کے وعظ میں خود یہ مضمون ہے کہ اگر پچاس سال بھی کوئی خانقاہ میں رہے اور اپنے شیخ کی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہو تو اُسے کوئی ترقی نہ ہوگی بلکہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ عطائے ہمت بھی توفیقِ باری تعالیٰ ہی سے ہوتی ہے، اس لئے حضرتِ والا نے ہمت کی دعا فرمائی ہے۔

توفیقِ الٰہی بڑی شے ہے

توفیق کا کرم سے وہ تیر و کمان دے
جو ہر عدو سے ہر زماں مجھ کو امان دے

اس شعر میں حضرتِ والا نے بہت اہم دعا فرمائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے میں ہر قسم کے دُشمنوں سے محفوظ رہ سکتا ہوں اور مجھے امن مل سکتا ہے۔ نفس و شیطان جو ہمیشہ کے دُشمن ہیں اور مرتے دم تک ہر وقت ساتھ ہیں، ان کی دُشمنی کی سازشوں اور پلاننگ (Planning) کو فیل (Fail) کر کے ان سے حفاظت دے دینا یہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ممکن ہے، اسی کے ضمن میں بہت اہم بات سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ جو لوگ نفس دُشمن کے تقاضوں پر عمل کرتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہیں وہ دراصل توفیقِ الٰہی سے محرومی کا نتیجہ

ہے۔ اس لئے جب ہم ان پر نظر ڈالیں تو ذرہ برابر بھی تحقیر دل میں نہیں لانی چاہیے۔ یا ان کو بے وقوف، گدھا، احمق، پاگل، خبیث نہ کہنا چاہیے بلکہ مثل دنیوی بیمار کے ان کو بیمار سمجھ کر ان پر رحم کھانا چاہیے۔ اسی مضمون کو مولانا رومی نے یوں ارشاد فرمایا۔

ہیچ کافر را بخواری منگرید
کہ مسلماں بودنش باشد اُمید

کسی کافر کی بھی تحقیر جائز نہیں کہ ابھی موت سے پہلے پہلے اس کے مسلمان ہونے کی اُمید ہے۔ اسی لئے کتنے ہی بڑی بڑی عقل وفہم والے اور دنیوی امور میں نہایت ہشیار اور عقل مند اور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں نئی نئی ایجادات کے موجد مگر ایمان سے خالی اور عاری اور مزید برآں یہ کہ اپنے ہی ہاتھوں سے بتوں کو تراش کر پوجنے والے اپنی عقل کو صحیح رُخ پر استعمال کر کے اتنا نہیں سمجھ پاتے کہ بھلا جو خود عاجز محتاج کہ ایک مکھی بیٹھے تو نہ اُڑا سکے تو اس کے پوجنے اور عبادت سے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔

تاثیرِ بیان عظیم نعمت ہے

مالک میری زبان کو وہ سحرِ بیان دے
جو میری بات سن لے وہ بھی تجھ پہ جان دے

اس شعر میں کی گئی دعا کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اللہ! جس طرح زبانِ ترجمانِ دردِ دل کا عطا کرنا تیرا کام ہے، ٹھیک اسی طرح اس ترجمانی کی تاثیر بھی تیری ہی جانب سے آتی ہے۔ اس لئے مجھے اپنے اوپر کوئی اعتماد نہیں اور مجھے اپنے بیان اپنی مدح وتعریف یا اپنی بڑائی اور بزرگی یا اور کسی نوع کے مالی یا جاہی فوائد مقصود نہ ہو بلکہ خلق کو خالق سے جوڑنا اور عباد کا رخ ربّ العباد کی طرف پھیرنا مقصود ہے کہ اُس وعظ و بیان کو سن کر ہر شخص تیرے احکام کو ماننے والا تیری نافرمانیوں سے بچنے والا اور تجھ پر اپنی جان قربان کرنے والا ہو۔

گویا اس شعر میں حضرتِ والا نے اپنی زندگی بھر کے بیانات کے لئے تاثیر اور پھر ان میں اخلاص کی دعا کی ہے کیونکہ جو علم اور وعظ و بیان لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے یا اپنا مقام لوگوں میں پیدا کرنے کے لئے ہو یا اپنی عظمت و بڑائی اور علمی صلاحیت وقابلیت کو لوگوں سے منوانے کے لئے ہو تو پھر یہ جنت کے بجائے دوزخ اور رضائے مولیٰ کی بجائے ناراضگیٔ خداوندی کا سبب ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! یہ تاثیر جبھی پیدا ہوتی ہے اور لوگ وعظ و بیان سن کر اللہ تعالیٰ کے ہر ہر حکم پر عمل پیرا اسی وقت ہو سکتے ہیں کہ جب واعظ خود بھی گناہوں سے بچنے میں جان کی بازی لگا دیتا ہو۔ اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کی خصوصیات میں سے یہ ہے جس بات کی آپ دعوت دیتے ہیں اُس پر اس سے زیادہ خود عامل ہوتے ہیں۔

اسی لئے حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا بیان سن کر تم یوسف کے ہوئے تو یہ مفید نہیں بیکار رہا اور اگر اللہ کے ہوئے تو یہ مفید ہے اور یہی بیان کا حاصل ہے۔

شرابِ خداوندی اور اس کا نشہ

اختر کو اپنے غم کی وہ مخمور جان دے
جو تیرے درد و غم کا ہمہ سُو بیان دے

اس مناجات کا یہ آخری شعر ہے جس میں حضرتِ والا یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اپنی شرابِ محبت اتنی پلا کہ میرا قلب و جگر اور خون کا قطرہ قطرہ اُس محبت کی شراب سے ایسے نشے میں ہو اور میں اُس کے اثر سے ایسا تر ادیوانہ بن جاؤں کہ بس میری زبان پر ہر چہار سو تیری ہی محبت کا نعرہ ہو۔

میں جدھر بھی جاؤں تو میرا محورِ گفتگو محض تیرے درد و غم کے اندر دائر رہے جس طرح جب کوئی کسی کا دیوانہ ہوتا ہے تو وہ ہر گھڑی اُسی کے گیت گاتا ہے۔ ہر وقت عنوان بہ عنوان مختلف پہلوؤں اور مختلف طریقوں سے اپنے محبوب کا تذکرہ چھیڑ دیتا ہے۔ اسی کو عارف ہندی حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یوں فرمایا۔

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل دیکھ لیتے ہیں

تو اسی طرح جب انسان اللہ کی محبت کے نشے میں مست ہوتا ہے تو پھر وہ بھی جدھر کا رُخ کرتا ہے اور جہاں ہوتا ہے تو کسی نہ کسی عنوان سے اپنی اللہ کی محبت پیش کرتا رہتا ہے۔ یہ مخمور جان جبھی انسان کو ملتی ہے جبکہ وہ اس شرابِ محبت کو بھرپور اور وافر مقدار میں پیئے۔ گویا سر سے پیر تک مجسم عبدیت بنا ہوا ہو اور سارا غیر دل سے نکال کر بس اس کا ہُو رہے اور یہی تقویٰ و ولایت کا آخری درجہ ہے کہ جس میں انسان کو مقامِ حضوری رہتا ہے۔

پورے عالم میں حضرت والا کی کتابوں کے پھیلنے اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم کے شائع ہونے اور اطرافِ عالم سے جوق در جوق لوگوں کے حضرت والا سے اصلاح و استفادے کے تعلق سے بالخصوص علماءِ اہلِ حق کے رجوعِ عام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا کی یہ تمنا اور اس شعر میں مذکور دعا قبول فرمالی ہے۔ اسی دعا سے ملتی جلتی حضرتِ والا کی یہ تمنا بھی ہے جس کو دوسرے شعر میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

سارے عالم میں پھر پھر کے یاربّ
تیرا دردِ محبت سنائیں
تیرا دردِ محبت سنا کر
سارے عالم کو مجنوں بنائیں

سارے عالم کو مجنوں بنا کر
میرے مولیٰ ترے گیت گائیں

توحید وسنت......کمالِ بندگی

آپ کے نام پر جان دے کر زندگی زندگی پائی ہے
چل کے نقشِ قدم پر نبی کے بندگی بندگی پائی ہے

ارشاد فرماتے ہیں کہ پورے دینِ اسلام کا خلاصہ اور نچوڑ دو باتوں میں منحصر ہے۔ اگر اُن میں سے کسی ایک میں بھی خلل ہو تو پھر اُس کا ایمان ایمان نہیں، اس کی بندگی بندگی نہیں۔ یعنی بارگاہِ الٰہی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ماننا اور اللہ کی ذات پر ایمان لانا، اُسی صورت میں معتبر ہے جبکہ اس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر بھی صحیح ایمان ہو۔ اس لئے اسلام کی سواری دو پہیوں پر چلتی ہے۔ (۱) توحیدِ خداوندی اور (۲) رسالتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

بالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ماننا انہی طریقوں کے ساتھ اور اسی طرزِ زندگی کے ساتھ معتبر ہے جو نبی کی زندگی سے بطورِ نمونہ ہم کو ملیں ہیں اور اللہ پر یقین ویسا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو ملا۔

اسی لیے قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تمام لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہ جو خدا سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں یوں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو۔ (معارف القرآن، ج:۲، ص:۵۳)

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی شخص کا یہ کہنا کہ میں خدا سے بہت محبت کرتا ہوں اور مجھے اللہ کا بہت خوف ہے اور میں اللہ پر بہت پختہ ایمان رکھتا ہوں اور میں خدا تعالیٰ کو ہر وقت یاد کرتا ہوں جبکہ اس کی زندگی کے تمام طور طریقے اور رہن سہن، معاشرت، معاملات، اخلاق و عادات، اتباعِ سنت سے عاری اور مغربیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو تو اُس کا یہ دعویٰ فضول اور عنداللہ غیر معتبر ہے۔ اس لئے کمالِ بندگی توحید وسنت دونوں کا جامع ہونا ہے۔ اگر ان میں کسی ایک چیز میں بھی خلل ہو تو نجات کے لئے کافی نہیں۔ جہاں توحیدِ خداوندی پر ایمان لازم اور ضروری ہے وہیں رسالتِ رسول پر بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اسی لئے دنیا میں اللہ کے وجود کے منکرین لوگ بہت ہی کم تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اکثریت خدا کے ماننے والوں کی ہے لیکن چونکہ وہ رسول کی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے اس لئے وہ کافر قرار دیئے گئے ہیں۔

اسی کو حضرتِ والا اپنے خاص انداز میں یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں آپ کے نام پر اپنی زندگی کو قربان کر کے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چل کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی واقعی زندگی ہے اور

میری عبدیت و بندگی واقعی معنی میں عبدیت و بندگی ہے۔ اسی کو ایک دوسرے مقام پر حضرتِ والا نے بڑے پیارے انداز سے یوں ذکر فرمایا۔

نقشِ قدم نبی ﷺ کے ہیں جنت کے راستے
اللہ جل جلالہٗ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

اور اسی کو فارسی کے ایک شاعر یوں ارشاد فرماتے ہیں ۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے کے خلاف جس نے کوئی راہ اختیار کی وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا، اس لئے قرآنِ پاک میں ایک دوسرے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۶)

ترجمہ: اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا (گو وہ دنیا ہی کی بات کیوں نہ ہو وجوبا) حکم دے دیں کہ (پھر) ان (مومنین) کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار (باقی) رہے اور جو شخص (بعد حکم وجوبی کے) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔ (معارف القرآن، ج: ۷، ص: ۱۴۹)

اس لئے ہر مؤمن کو زندگی کے تمام شعبوں میں اعتقادیات ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا معاشرت و اخلاق ہوں، ہر لائن میں اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع لازم اور ضروری ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت میں کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا۔ اس امر کی وضاحت کر دی گئی کہ اب کوئی طریقہ اور راستہ دینِ اسلام کے خلاف معتبر نہیں۔

جیسا کہ حدیث شریف میں یہ مضمون ان الفاظ میں وارد ہوا ہے۔

﴿مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جورٍ فهو ردٌّ، ج: ۱، ص: ۳۷۱)

کہ جو ہمارے اس دین کے معاملے میں کوئی بھی ایسی نئی بات پیدا کرے جو کہ اس دین میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے، اس لئے کہ اگر کوئی اور طریقہ بارگاہِ الٰہی میں پسند ہوتا تو ضرور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا کیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء والرسل ہیں اور احبُّ الخلائق ہیں۔ ظاہر ہے جو دستورِ حیات اور نظامِ زندگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے، وہ بھی افضل الطرق ہونا چاہیے۔ یعنی زندگی گزارنے کے

تمام طریقوں میں سب سے افضل اور محبوب طریقہ۔

اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے سے ذرا بھی ہٹ جانا اسلام میں بدعت اور گمراہی قرار دیا گیا ہے جو کہ انسان کو جہنم تک کھینچ کے لے جانے والا ہے۔

یہ صبح مدینہ یہ شام مدینہ

یہ صبح مدینہ یہ شام مدینہ مبارک تجھے یہ قیام مدینہ
بھلا جانے کیا جام و مینائے عالم ترا کیف اے خوش خرام مدینہ
مدینہ کی گلیوں میں ہر اک قدم پر ہو مدِ نظر احترام مدینہ
مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ بڑا لطف دیتا ہے نام مدینہ
نگاہوں میں سلطانیت ہیچ ہوگی جو پائے گا دل میں پیام مدینہ
سکون جہاں تم کہاں ڈھونڈتے ہو سکون جہاں ہے نظام مدینہ
ہو آزاد اختر غم دوجہاں سے جو ہو جائے دل سے غلام مدینہ

مشکل الفاظ کے معنی:۔جام و مینائے عالم: دنیاوی شراب کے مٹکے۔ کیف: مزا۔ خوش خرام: ......۔ ہیچ ہو گی: گر جائے گی۔ پیامِ مدینہ: مدینہ کا پیغام، مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اتباع کے ساتھ۔ غمِ دوجہاں: دنیا و آخرت کا غم۔

قیام مدینہ ایک نعمت عظمیٰ

یہ صبح مدینہ یہ شامِ مدینہ
مبارک تجھے یہ قیامِ مدینہ

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفاً و عظمۃً) میں گذرنے والے شب و روز کی رونقیں اور برکتیں اور قیامِ مدینہ کے دوران صبح و شام میں روضہ پاک کی حاضری اور صلاۃ وسلام پیش کرنے کی سعادتیں اور اپنے محبوب سے قربِ قلبی کے ساتھ ساتھ ملنے والے قربِ جسمانی کی فرحتیں اور لذتیں ان چند اشعار میں پیش فرمار ہے ہیں اور قیامِ مدینہ کے لمحاتِ بابرکات کو مغتنم سمجھنے کی نصیحت پیش فرمار ہے ہیں اور یہ بات محض کوئی شوق و محبت اور جذبہ ولگن کی نہیں ہے بلکہ اس کی مستقل فضیلتوں کا ذکر حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿اَلْمَدِیْنَۃُ خَیْرٌ لَّھُمْ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ لَا یَدَعُھَا اَحَدٌ رَغْبَۃً عَنْھَا اِلَّا اَبْدَلَ اللہُ فِیْھَا مَنْ ھُوَ خَیْرٌ مِّنْہُ وَلَا یَثْبُتُ اَحَدٌ عَلٰی لَأْوَائِھَا وَجَھْدِھَا اِلَّا کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا اَوْ شَھِیْدًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینۃ، ج: ۱، ص: ۴۴۰)

مفہوم وخلاصہ یہ ہے کہ مدینہ ان لوگوں کے لیے جو مدینہ میں رہتے ہیں بہتر ہے یعنی مدینہ کا قیام دنیا وعقبیٰ کی بھلائی کا ضامن ہے بشرطیکہ وہ اس کی بھلائی وبہتری کو جانیں تو اس شہر کی اقامت کو ترک نہ کریں اور دنیا کے آرام وراحت کے لیے اس کو چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیں جو بھی شخص بے رغبتی کے ساتھ یعنی بلا ضرورت اس شہر کو چھوڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ کسی دوسرے ایسے شخص کو مقیم کردے گا جو اس سے بہتر ہوگا یعنی بے رغبتی کے ساتھ مدینہ کو چھوڑنا مدینہ کے لیے نقصان دہ نہ ہوگا بلکہ خود اس کے لیے نقصان دہ ہوگا کہ اس شخص کی جگہ کوئی اس سے بہتر شخص آ کر مقیم ہوگا ہاں ضرورت ومجبوری کے تحت مدینہ کو چھوڑنا اس حکم میں داخل نہیں اور جو بھی شخص مدینہ میں سختیوں اور بھوک پر ثابت قدم رہے گا یعنی وہاں کی ہر تنگی وپریشانی پر صبر کرے گا تو میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس کی اطاعت کا گواہ بنوں گا۔

مغرب زدہ ایک سعودی کا حال

حدیث شریف کے اس ٹکڑے سے جہاں مدینہ میں رہنے والوں کے لیے خاتمہ بالخیر کی سعادتِ عظمیٰ کی بشارت ہے وہیں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ بعض ظاہری پریشانیوں کی وجہ سے مدینہ کو چھوڑ کر دوسری جگہوں کی عیش وعشرت والی رہائش گاہوں کو ترجیح نہ دے اور وہاں سے ترکِ مدینہ کر کے مال ودولت اور عیش وعشرت کی بنا پر دوسرے ملکوں میں سکونت اختیار نہ کرے جیسا کہ آج کل بعض مغربیت زدہ نادان بھائی مکہ معظمہ مدینہ منورہ کی سکونت کو چھوڑ کر امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کی طرف رخ کر رہے ہیں اور ان کے پیشِ نظر صرف اپنے معاشی اور دنیوی مفادات اور مال ودولت کی بہتات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سکون وچین اور اطمینان وراحت کی زندگی کا دولت کی کثرت وبہتات سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل سکون واطمینان غنائے نفس کے حاصل ہونے سے میسر ہوتا ہے اور یہ دولت اللہ تعالیٰ صرف اولیاء اللہ کو عطا فرماتے ہیں۔

اس پر ایک عبرتناک واقعہ یاد آیا چنانچہ احقر رمضان المبارک میں ایک ٹیکسی ڈرائیور (Taxi dirver) کے ساتھ مکۃ المکرّمۃ سے جدہ سفر کر رہا تھا تو اس ڈرائیور (Driver) سے کچھ دینی گفتگو شروع کی اور اسی گفتگو کے ضمن میں احقر نے اس سے دریافت کیا کہ تم تو عربی اور انگلش دونوں زبانیں بول رہے ہو اس لیے تم مجھے بتاؤ کہ تمہاری نیشنلٹی (Nationality) کہاں کی ہے تو اس نے جواب دیا کہ سعودی بریطانی یعنی اصلاً سعودی کا رہنے والا ہوں مگر میری نیشنلٹی (Nationality) برطانیہ کی ہے تو پھر احقر نے اس سے یہ پوچھا کہ تمہیں سعودی زیادہ پسند ہے یا برطانیہ تو اس پر اس نے بڑے فخر سے جواب دیا کہ اَنَا اُحِبُّ بَرِیْطَانِیَۃَ کہ مجھے سعودی کے مقابلے میں برطانیہ زیادہ محبوب ہے تو احقر اس جواب پر متعجب وحیران رہ گیا۔

مدینہ قربِ محبوب کی دولت

بھلا جانے کیا جام و مینائے عالم
ترا کیف اے خوش خرام مدینہ

حضرت والا دامت برکاتہم مدینہ منورہ میں رہنے والے کیلیے ارشاد فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کو ظاہری و باطنی خوبیوں اور برکتوں سے مالا مال فرمایا ہے اور یہاں کی پر بہار فضاؤں اور دلکش نظاروں اور مسرت آمیز محفلوں اور پر رونق مجلسوں کا کیا ہی کہنا ہے اور لوگ دنیا کے جام و مینا کی مستیوں اور لذتوں سے اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے کچھ کیف و سرور حاصل کرتے ہیں مگر وہ اس لذت ونشاط اور فرحت و مسرت کو کیا سمجھ سکتے ہیں جو مدینہ منورہ میں رہنے والوں کو حاصل ہے۔ اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لیے ظاہری و باطنی ہر نوع کی برکتوں، راحتوں، مسرتوں اور خوشیوں کی دعا فرمائی ہے حتی کہ مدینہ کی آب وہوا کی اصلاح اور بہتری کیلیے بھی دعا فرمائی ہے جیسا کہ روایتِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں موجود ہے کہ:

﴿اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْمَدِیْنَۃَ کَحُبِّنَا مَکَّۃَ اَوْ اَشَدَّ حُبًّا وَصَحِّحْھَا وَ بَارِکْ لَنَا فِیْ صَاعِھَا وَمُدِّھَا وَانْقُلْ حُمَّاھَا فَاجْعَلْھَا بِالْجُحْفَۃِ﴾

(صحیح البخاری، باب مقدم النبیا و اصحابہ المدینۃ،ج۱،ص:۵۵۹)

اے اللہ! مدینہ کو ہمارا محبوب بنادے جس طرح تو نے مکہ کو ہمارا محبوب بنایا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ اور مدینہ کی آب وہوا درست فرمادے اور مدینہ کے صاع و مد میں ہمارے لیے برکت عطا فرما نیز مدینہ کے بخار کو یعنی بخار کی کثرت اور وباء کو یہاں سے نکال کر جحفہ میں منتقل کردے۔

پھر محبت کے اصول سے اگر اس پر یوں غور کیا جائے کہ ایک عاشقِ رسول مسلمان کے لیے اس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ اس کو قیامِ مدینہ کی صورت میں اپنے محبوب کا قرب نصیب ہوتا ہے جب دنیا کے ناپاک وناپائدار عشق میں یہ چیز بڑی لذت بخش تصور کی جاتی ہے تو بھلا محبوبِ حقیقی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق کے لیے قیامِ مدینہ سے بڑی اور کیا دولت ہوسکتی ہے اور دل کے باغ و بہار ہونے کے لیے اپنے محبوب کے قرب کا تصور ہی ایک عظیم ترین دولت ونعمت ہے اس لیے سچے عشاقِ رسول جب مدینہ میں رہتے ہیں تو وہ اپنے محبوب کی یادوں میں ایسے گم اور کھوئے رہتے ہیں کہ جیسے کہ وہ کسی دوسرے عالم میں رہتے ہوں اور ان کو مدینہ کا چھوڑنا انتہائی دشوار ہوتا ہے مگر خود اپنے محبوب نبی کے دین وشریعت کی تبلیغ وتعلیم کے لیے ظاہری دوری مجبوراً اختیار کرتے ہیں اور جسماً اگرچہ مدینہ سے دور رہتے ہوں مگر قلب وروح سے ہر وقت مدینہ منورہ کی پرکیف بہاروں میں گھومتے رہتے ہیں جیسا کہ حضرت والا نے ایک مقام پر اپنے شعر میں یوں ارشاد فرمایا ہے ؎

اے اخترؔ مرے قلب وجاں ہیں وہاں
مدینے سے گو دور رہتے ہیں ہم

احترامِ مدینہ اور اس کے تقاضے

مدینہ کی گلیوں میں ہر اک قدم پر
ہو مد نظر احترامِ مدینہ

مدینہ منورہ کوئی سیر وسیاحت کا شہر نہیں ہے کہ جس میں محض سیر وتفریح کے لیے سفر کر کے ہوٹلوں (Holtels) میں کچھ شب وروز عیش وعشرت کے ساتھ گذار لیے جائیں اور بس مقصود پورا ہو جائے بلکہ یہ مقدس وپاکیزہ شہر ہے کہ جس کی حرمت کے لیے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے دعائیں نکلیں اور جس کی عظمت اواحترم کے لیے آپ نے بہت سی ہدایت جاری فرمائی ہیں۔ چنانچہ ایک دعا آپ نے یہ فرمائی ہے جو اس حدیثِ پاک میں مذکور ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ حَرَّمَ مَکَّۃَ فَجَعَلَھَا حَرَمًا وَ اِنِّیْ حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَۃَ حَرَامًا مَابَیْنَ مَاْزِمَیْھَا اَنْ لَّایُھْرَاقَ فِیْھَا دَمٌ وَلَا یُحْمَلَ فِیْھَا سِلَاحٌ لِقِتَالٍ وَلَا تُخْبَطَ فِیْھَا شَجَرَۃٌ اِلَّا لِعَلْفٍ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینۃ ودعاء النبی، ج: ۱، ص: ۴۴۳)

ارشادِ نبوی ہے کہ حضرت ابراہیم نے مکہ کو بزرگی دی اور اس کو حرم قرار دیا یعنی انہوں نے مکہ کی بزرگی اور حرمت کو ظاہر کیا اور میں نے مدینہ کو بزرگی دی ہے اور مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان کی بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تو اس میں خون ریزی کی جائے اور نہ وہاں جنگ کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں اور نہ اس کے درخت کے پتے جھاڑے جائیں البتہ جانوروں کے کھانے کے لیے جھاڑے جاسکتے ہیں۔

اگرچہ مدینہ منورہ کی حرمت وتعظیم سے متعلق وہ تمام احکام ثابت نہیں ہوتے ہیں جو کہ مکۃ المکرّمۃ کے لیے ثابت ہیں لیکن باقی بہت ساری چیزوں میں مدینہ منورہ کا احترام بھی اسی طرح واجب وضروری ہے جیسا کہ مکۃ المکرّمۃ کے لیے ہے اور خاص طور پر ایک مردِ مومن کے لیے بس اتنی بات عظمتِ مدینہ کے لیے کافی دلیل ہے اس کے محبوب کا شہر ہے اور یہاں محبوبِ رب العالمین آرام فرما ہیں اور اس کی گلیوں میں حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمِ مبارک پڑے ہیں اور اس زمینِ مدینہ سے آپ کے جسدِ اطہر کا تعلق ہے اور اس کو آپ کے شہر ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ مدینہ پاک کا وہ خاص حصہ کہ جہاں آپ کا بدنِ مبارک مس کر رہا ہے وہ کائنات کے ذرہ ذرہ حتیٰ کہ کعبہ وعرش وکرسی سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے اس لیے قدم قدم پر مدینہ منورہ کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔

صاحبِ مظاہر حق ج:۲، ص:۸۰۰ پر حرمت مدینہ کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ فضائل مدینہ کے سلسلہ

میں یہ بات بھی بطور خاص قابلِ لحاظ ہے کہ اس مقدس شہر کی عظمت و بزرگی ہی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس شہر کے رہنے والوں کی تعظیم وتکریم کی یہ وصیت کی تھی میری امت کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ میرے ہمسایوں یعنی اہل مدینہ کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں ان سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ کریں اور اس وقت تک ان کی خطاؤں سے درگذر کریں جب تک کہ وہ کبائر سے اجتناب کریں۔ یادرکھو! جو شخص ان کے احترام وحرمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے گا میں قیامت کے دن اس کا گواہ اور شفاعت کرنے والا ہوں گا اور جو شخص اہل مدینہ کے احترام وحرمت کو ملحوظ نہیں رکھے گا اسے طینۃ الخبال کے سیال سے پلایا جائے گا (دوزخیوں کا ایک حوض ہے جس میں دوزخیوں کی پیپ اور لہو جمع ہوتا ہے)

چنانچہ اولیاء اللہ سے اس نوع کے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ انہوں نے مدینہ منورہ کا بے حد احترام کیا اور پھر اس کی برکات حاصل کیں۔

لطفِ نامِ مدینہ اور اس کی حکمت

مدینہ مدینہ مدینہ
بڑا لطف دیتا ہے نامِ مدینہ

حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت اس بستی کا نام یثرب تھا مگر بعد ہجرتِ نبی علیہ السلام نے اس کا نام مدینہ رکھا۔

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرٰى يَقُوْلُوْنَ يَثْرِبُ وَهِيَ الْمَدِيْنَةُ تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب فضل المدینۃ وانها تنفی الناس، ج:۱، ص:۲۵۲)

تو معلوم ہوا کہ یہ نام بھی پیارا ہے اور معنیٰ خیز ہے اور خود نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو بڑا محبوب تھا اسی لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ یثرب کہے تو اسے چاہیے کہ وہ دس مرتبہ مدینہ کہے تا کہ اس مقدس شہر کا ممنوع نام لینے کا تدارک اور اس کی تلافی ہو جائے نیز ایک روایت یہ بھی ہے کہ جو شخص یثرب کہے وہ استغفار کرے۔ (مظاہر حق، ج:۲، ص:۷۹۱)

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اصل اصولی بات تو یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا عاشق ہوتا ہے تو اس کا نام لینا اور سننا اور اس کا تذکرہ کرنا ہی ایک بہترین محبوب مشغلہ ہوتا ہے اسی لیے ریت پر بیٹھا ہوا جب مجنوں لیلیٰ کا نام لکھ رہا تھا اور اس سے سوال کیا گیا کہ کیا کرتے ہو تو اس نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا کہ ؎

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ می کنم
خاطرِ خود را تسلی می دہم

کہ میں لیلیٰ کے نام کی مشق کررہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں اس لیے ظاہر ہے کہ ایک سچا عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کا نام لینے میں جو لذت محسوس کرے گا اور جو لطف و مسرت اس کو حاصل ہوگی اس کی لفظوں میں تعبیر بھی مشکل بلکہ محال ہے اس لطیف و پرنور محبت کا مزہ اس راہ سے گذرنے والے کو ہی ہوسکتا ہے اس لیے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ مدینہ کا نام لینا بڑا لطف و مزہ دیتا ہے۔

سچے عاشق کے لیے پیامِ مدینہ

نگاہوں میں سلطانیت ہیچ ہوگی
جو پائے گا دل میں پیامِ مدینہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی غلامی اور تابعداری میں دونوں جہاں کی حکومت و بادشاہت سے بڑھ کر لطف و مزہ رکھا ہے کہ جب انسان اس حقیقت کو سمجھتا ہے تو پھر وہ ہی ہوتا ہے جو حضرت والا نے دوسرے مقام پر بڑے موثر و دل سوز انداز میں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ ؎

بہت سے سلاطیں ہوئے گھر سے بے گھر
دلوں میں جب ان کے کیا عشق نے گھر
مزہ ان کو آیا جو اس سنگ در پر
تو پایا فقیری کو شاہی سے بہتر
وہ دل جس میں جلوہ تمہارا نہیں ہے
وہ دل سب کا ہو پر تمہارا نہیں ہے

اور مجلس میں ایک روز احقر نے جب یہ شعر پڑھا تو اس پر حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے حضرت والا کا یہ ملفوظ سنایا کہ ایسی تو سینکڑوں مثالیں ہیں کہ دنیا کے ملوک و سلاطین نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اپنی حکومت و سلطنت کو چھوڑ دیا لیکن اس کی ایک بھی مثال نہیں ہے کہ کسی صاحبِ نسبت، ولی کامل نے دنیا کی حکومت و بادشاہت کی خاطر اپنی ولایت کو چھوڑ دیا ہو اور وہ اس کے بدلے حکومت لینے پر راضی ہوا ہو۔

بس یہی وہ پیامِ مدینہ تھا کہ جو صحابہ کے دلوں میں گھر کرگیا تھا اور جس کی بدولت پھر ان کا نعرہ یہ ہوتا تھا کہ نَحۡنُ قَوۡمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالۡاِسۡلَامِ کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ جن کی تمام تر عزت اور سربلندی صرف اسلام میں رکھی گئی ہے اور دنیا کی حکومتیں اور بادشاہتیں صحابہ کے ایمان و معرفت کا سودا نہ کرسکتی تھیں حضرت والا فرماتے ہیں کہ سچے عاشقِ رسول ہونے کے نتیجہ میں دنیا کی سلطنتیں اور حکومتیں بے حیثیت ہوجاتی ہیں پھر تو مرنا اور جینا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لیے ہوا کرتا ہے اور یہی حقیقی پیامِ مدینہ ہے۔

نظامِ مدینہ میں سکون کی حکمت

سکونِ جہاں تم کہاں ڈھونڈتے ہو
سکونِ جہاں ہے نظامِ مدینہ

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ عطا ہوا اور جو دین دیا گیا وہ قیامت تک کی تمام قوموں اور نسلوں کی فلاح وکامیابی کا ضامن ہے اور جس طرح اس دین کا ماننے والا آخرت میں کامیاب وکامران قرار پائے گا اسی طرح اس کو اس دنیا میں جینے کا حقیقی لطف اور زندگی کا حقیقی چین وسکون بھی حاصل ہو کر رہے گا۔

کیونکہ یہ دین خدا تعالیٰ کا دیا ہوا نظامِ زندگی اور دستورِ حیات ہے اس میں کسی انسانی عقل وفہم کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ عالم الغیب والشہادۃ، علیم وخبیر اور حکیمِ مطلق کی عطاء ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی حکمِ الٰہی ایسا موجود ہے اسی لیے اس دین کو کامل اور مکمل دین کہا جاتا ہے جب حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنی مدنی زندگی میں پورے مدینہ منورہ میں اس کو نافذ اور جاری فرمایا تو یہ مدینہ چین وسکون کا گہوارہ بن گیا جان ومال عزت وآبرو اور دین وایمان غرض کہ سب کچھ محفوظ ومامون ہو گیا اور دنیا کے جس خطہ میں اس نظامِ مدینہ کی جھلک دیکھنے کو ملی اور کسی درجہ میں یہ نظام زندہ ہوا تو وہاں فوراً ایسی سکون واطمینان کی فضائیں قائم ہو گئیں اور پورا ملک امن کا گہوارہ بن گیا کیونکہ یہ نظام افراط وتفریط کی بے اعتدالیوں سے بالکل پاک اور محفوظ ہے اور حکیمِ مطلق کی طرف سے حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرا ہوا ہے اور ہر طرح کے نقص وکمی سے خالی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا نے اپنے ذہن سے اختراع کیے ہوئے نظاموں کو دنیا میں رائج کر رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں بھی امن واطمینان اور چین وسکون میسر نہیں ہے بلکہ ہر جگہ بے اطمینانی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے اور نہ جان ومال محفوظ ہے اور نہ عزت وآبرو محفوظ ہے۔

مدینہ کی غلامی غمہائے دوجہاں سے آزادی

ہو آزاد اختؔر غمِ دوجہاں سے
جو ہو جائے دل سے غلامِ مدینہ

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اختر! اگر تو دونوں جہاں میں سرخروئی اور عزت وسکون اور عافیت وراحت چاہتا ہے تو دل وجان سے مدینہ کا غلام ہو جا اور مدینہ والے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے نمونہ حیات کو پورے طور پر زندگی کے ہر گوشہ میں اختیار کر لے اور حقیقی غلامی اپنا لے کہ جس طرح غلام اپنی تمام چاہتوں کو اپنے مولیٰ کے تابع کر کے زندگی گذارتا ہے تو تو بھی اسی طرح اپنے محبوب کے دین وشریعت کے مطابق اپنی تمام چاہتوں کو ڈھال لے اور تابع بنا دے تو پھر یہ سعادتیں دنیا وآخرت میں مقدر ہو کر رہیں گی اس پر ایک واقعہ یاد

آیا جس کو حضرت والا نے اپنے ایک بیان میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک غلام تھا اس سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نام پوچھا تو اس پر اس نے جواب دیا کہ غلاموں کا کیا نام ہوگا جس نام سے ان کو آقا پکارے وہی ان کا نام ہوتا ہے پھر انہوں نے یہ پوچھا کہ تم کیا کھاتے اور کیا پیتے ہو تو اس پر غلام نے یہ عرض کی کہ غلاموں کا کیا کھانا اور پینا ان کو جو کچھ آقا کھلا دے وہی ان کا کھانا ہوتا ہے۔

بس اس غلام کے یہ جوابات سن کر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو یہ ارشاد فرمایا کہ اے غلام تو نے تو آج ہمیں غلامی اور بندگی کی حقیقت سمجھا دی ہے کیونکہ آج ہم لوگ حکمِ الٰہی اور سنتِ نبوی کے مقابلے میں اپنی تجویزیں اور اپنی پسند کو رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، جب کہ اصل غلامی کا مقتضیٰ یہ تھا کہ ہماری اپنی کیا تجویز ورائے بس جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اس پر ہماری جان ودل فدا ہے یہی پوری غلامی کی حقیقت ہے، جب یہ حالت ہو جائے تو پھر غمِ دوجہاں سے آزادی کا وعدہ ہے اور یہ بات قرآن وحدیث میں مختلف مواقع پر مذکور ہے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر یوں مذکور ہے کہ:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۹۶)

ترجمہ: اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم کھول دیتے ان پر نعمتیں آسمان اور زمین سے۔

(معارف القرآن، ج:۴، ص:۱۱)

اور ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۹۷)

ترجمہ: جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو (کیوں کہ کافر کے اعمال صالحہ مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔ (معارف القرآن، ج:۵، ص:۳۸۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ جس حیات میں راحت وحلاوت نہ ہو گو صورتاً موت نہ ہو مگر معنیً حیات بھی نہیں ہے جیسا کہ آخرت میں جہنمی کی حالت قرآن نے یہی ذکر کی ہے کہ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کہ باوجود حسی زندگی کے پھر بھی فرمایا گیا کہ اس زندگی کو زندگی نہیں کہا جاسکتا ہے اور موت بھی نہیں ہے کہ عذاب ومصیبت سے نجات ہو تو غرض یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی فلاح وکامیابی کے لیے احادیثِ مبارکہ میں اپنے افعال واقوال کے ذریعہ جو راستہ بتایا ہے صرف اور صرف وہی راہ راہِ نجات ہے اور آپ کی سچی غلامی ہی دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی کی ضامن ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اس مضمون پر حیاتُ المسلمین کے حاشیہ میں ایک بڑی تعداد آیاتِ قرآنیہ کی پیش فرمائی ہے کہ جن پر دونوں جہاں میں مصائب وآلام سے حفاظت اور نصرت ومدد کے وعدہ کا مضمون ہے اور سکون وراحت کی بشارتیں ہیں۔

رنگ لائیں گی کب میری آہیں

رنگ لائیں گی کب میری آہیں	پھر مدینہ کی جانب کو جائیں
جب نظر آئے وہ سبز گنبد	کہہ کے صل علی جھوم جائیں
جب حضوری کا عالم عطا ہو	ان کو افسانۂ غم سنائیں
اب نہ جانا ہو گھر ہم کو واپس	چپکے چپکے یہ مانگیں دعائیں
تیرے در پر مرا سر ہو یارب	جان اس طرح تجھ پر لٹائیں
مجھ کو اپنا بنا لو کرم سے	ملتزم پر یہ مانگیں دعائیں
دونوں عالم کی کیا ہے حقیقت	جتنے عالم ہوں تجھ پر لٹائیں
سارے عالم میں پھر پھر کے یارب	تیرا دردِ محبت سنائیں
تیرا دردِ محبت سنا کر	سارے عالم کو مجنوں بنائیں
سارے عالم کو مجنوں بنا کر	میرے مولیٰ ترے گیت گائیں
لذتِ قرب پا کر تری ہم	لذتِ دوجہاں بھول جائیں
دربدر ڈھونڈتا ہے یہ اخترؔ	اہلِ دردِ محبت کو پائیں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ افسانۂ غم: داستانِ غم۔ مجنوں: اللہ تعالیٰ کا دیوانہ۔ دربدر: ہر جگہ۔ اہلِ دردِ محبت: اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد رکھنے والے۔

مدینے میں جینے اور مرنے کی فضیلت

رنگ لائیں گی کب میری آہیں
پھر مدینہ کی جانب کو جائیں

دنیا میں کسی بھی خطہ اور سرزمین پر بسنے والا مسلمان ہو اور کسی بھی رنگ ونسل اور کسی بھی قوم اور گروہ سے وابستہ ہو لیکن قلبی طور پر وہ مدنی اور حجازی ہوتا ہے اور اس کے دل ودماغ میں اپنے اسلامی اور ایمانی مرکز سے ایسی محبت اور ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے وہ پوری عمر کوشش اور دعائیں کرتا رہتا ہے اور آہ وزاری کے ساتھ اپنا مطلوب بارگاہِ رب العزت میں پیش کرتا رہتا ہے اور وہاں جینے مرنے کے لیے کوئی صورت نکلتی ہے تو اپنی

قسمت پر نازاں ہوتا ہے اور فرحت ومسرت سے جھوم اٹھتا ہے کیونکہ وہ ہمارے دل وجان سے زیادہ محبوب حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے اور آپ کا مسکن اور دارالھجرۃ ہے اور یہ محض شوق وجذبات کی بات نہیں بلکہ خود لسانِ نبوت کے ذریعہ مدینہ منورہ میں جینے اور مرنے کے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں موجود ہے کہ:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَّمُوْتَ بِالْمَدِیْنَۃِ فَلْیَمُتْ بِھَا فَاِنِّیْ اَشْفَعُ لِمَنْ یَّمُوْتُ بِھَا﴾

(سنن الترمذی، باب ماجآء فی فضل المدینۃ، ج:۲، ص:۲۲۹)

خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہ سکے تو اسے چاہیے کہ وہ مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہے تا آنکہ اس کی موت اسی مقدس شہر میں واقع ہو اور میں اس کی شفاعت کروں بایں طور کہ اگر وہ گنہگار ہوگا تو میں اسے بخشواؤں گا اور اگر نیکوکار ہوگا تو اس کے درجات بلند کراؤں گا واضح رہے کہ یہاں شفاعت سے مراد وہ خاص شفاعت ہے جو صرف مدینہ میں رہنے والوں ہی کو حاصل ہوگی اور کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوگی البتہ شفاعتِ عام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر مسلمان کو حاصل ہوگی۔ لہٰذا افضل یہ ہے کہ جس کی عمر زیادہ ہو جائے یا کشف وغیرہ کے ذریعہ سے معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ مدینہ منورہ میں جا رہے تا کہ وہاں مرنے کی وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ خاصہ کی اس سعادتِ عظمیٰ کا حق دار ہو جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ دعا کیا ہی خوب ہے کہ:

﴿عَنْ عُمَرَ قَالَ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِکَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب کراھیۃ النبی ا ان تعری المدینۃ، ج:۱، ص:۲۵۳)

اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب کرا اور اپنے رسول کے شہر میں مجھے موت دے۔ (مظاہر حق، ج:۲، ص:۷۹۷)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا کے دونوں جز بارگاہِ الٰہی میں کیسے قبول ہوئے کہ نہ صرف مدینہ بلکہ مدینہ کے بھی سب سے مقدس حصہ روضۂ اقدس کے ساتھ حضور کے پہلو میں دفن ہونے کی سعادت میسر ہوئی اسی کے ساتھ ساتھ احادیثِ مبارکہ میں دوسرا مضمون یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جو میرے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد میری قبر کی زیارت کرے گا تو وہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی اور پھر اس کے لیے شفاعت کا استحقاق ہو گیا۔ چنانچہ روایات میں ہے:

﴿عَنْ حَاطِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ﴾

(سنن الدارقطنی، باب المواقیت)

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ﴾

(سنن الدارقطنی، باب المواقیت)

﴿مَنْ زَارَنِیْ بِالْمَدِیْنَۃِ مُحْتَسِبًا کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا اَوْشَھِیْدًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾

(الترغیب والترھیب مع تعلیق مصطفی محمد عمارۃ، ج:۴، ص:۴۳۵)

ان مجموعہ روایات کو الترغیب والترہیب کے حاشیہ میں نقل کیا گیا ہے اور ان کے مجموعہ سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بعد الوفات آپ کی زیارت فی الحیات کی طرح ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی شفاعت حاصل ہوگی اس لیے حضرت والا اس شعر میں جو مضمون پیش کررہے ہیں وہ درحقیقت ہر مومن کا مطلوب و مقصود ہونا چاہیے اور مدینہ کی حاضری کے لیے ہر مومن کو تڑپنا اور بے قرار رہنا چاہیے یہ اس کی ایمانی حالت کا اثر ہے۔

ایک عاشقِ مدینہ کی کرامت

جب نظر آئے وہ سبز گنبد
کہہ کے صلِ علیٰ جھوم جائیں

چونکہ سبز گنبد پر نظر پڑتے ہی مکینِ سبز گنبد کی یادیں تیز ہوجاتی ہیں اور حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کے سامنے حضوری پر تحفۂ درود وسلام پیش کرنے کے تصور سے روح مست ہوجاتی ہے اور دل ودماغ خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیے اس لیے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زیارت آپ کی حیات میں زیارت کی طرح ہے کیونکہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں جیسا کہ روایت میں موجود ہے کہ اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ امام بیہقی نے اس کی تصحیح حاشیہ ترغیب منذری، ص: ۲۳۵ پر کی ہے۔

اسی لیے ایک واقعہ مختصر تفسیر ابن کثیر للصابونی میں بھی مذکور ہے اور حاشیہ ترغیب منذری، ص: ۲۴۰ پر بھی ہے کہ عتبی کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس تھا تو ایک اعرابی آیا اور عرض کیا کہ:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ سَمِعْتُ اللّٰہَ یَقُوْلُ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَآءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُو اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا وَقَدْ جِئْتُکَ مُسْتَغْفِرًا مِّنْ ذَنْبِیْ مُسْتَشْفِعًا بِکَ اِلٰی رَبِّیْ ثُمَّ اَنْشَأَ یَقُوْلُ۔

یَاخَیْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ اَعْظُمُہٗ
فَطَابَ مِنْ طِیْبِھِنَّ الْقَاعُ وَالْاَکَمُ
نَفْسِی الْفِدَاءُ لِقَبْرٍ اَنْتَ سَاکِنُہٗ
فِیْہِ الْعَفَافُ وَفِیْہِ الْجُوْدُ وَالْکَرَمُ

(مختصر تاریخ دمشق)

پہلے صلوٰۃ وسلام پیش کیا اور اور پھر یہ آیتِ کریمہ پڑھی جس کا مضمون یہ ہے کہ یہ لوگ اگر ظلم کرکے آپ کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ سے خود بھی استغفار کرتے اور آپ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو تواب ورحیم پاتے۔

اے اللہ! کے رسول! میں آپ کے پاس ان دونوں صفتوں کو جمع کر کے آیا ہوں میں اللہ سے بھی اپنے گناہوں کی معافی (آپ کے وسیلہ سے) چاہتا ہوں اور آپ کے ذریعہ بھی اپنے رب کے سامنے اپنے حق میں شفاعت کا طلب گار ہوں اور پھر یہ دو شعر پڑھے (کہ اے وہ ذات! جو ان تمام انسانوں میں سب سے افضل ہے کہ جن کی ہڈیاں ہموار زمین میں دفن کی جا چکی ہیں اور جن کی خوشبو سے ہموار زمین اور ٹیلے مہک اٹھے ہیں میری ذات ایسی قبر پر فدا ہے کہ جس میں آپ سکونت پذیر ہیں اور جس میں پاکدامنی اور جود وسخاوت موجود ہے) اور یہ اشعار آج تک روضۂ اقدس کی مواجہہ والی دیوار پر لکھے ہوئے ہیں۔

بس وہ اعرابی یہ سب پڑھ کر واپس ہوئے اور میری آنکھ لگ گئی تو میں نے نیند میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے عتبی! جاؤ اعرابی سے ملو اور ان کو یہ خوشخبری سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بخش دیا ہے ترغیب منذری، ص: ۲۴۱ کے حاشیہ پر اور نشر الطیب، ص: ۳۰۲ بحوالہ مواهب امام ابو المنصور صباغ ابن النجار ابن عساکر ابن الجوزی محمد بن حرب ہلال کی روایت کہ وہ قبر کے پاس بیٹھے تھے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ان محمد بن حرب کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی ہے غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں ہے پس حجت ہو گیا اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی مدینہ منورہ سے قریب ہو جائے اور وہاں کے در و دیوار اور شجر و حجر پر نظر پڑیں تو درود شریف کی کثرت شروع کر دے۔

حاشیہ ترغیب منذری، ص: ۲۳۹ پر ہے کہ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مدینہ منورہ سے ایسی محبت تھی کہ جب آپ باہر سے تشریف لاتے تھے اور مدینہ کے در و دیوار نظر آتے تو اپنی سواری کو تیز دوڑا دیا کرتے تھے ترمذی شریف میں روایت ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنَظَرَ اِلٰى جُدُرَانِ الْمَدِيْنَةِ اَوْضَعَ رَاحِلَتَهٗ وَاِنْ كَانَ عَلٰى دَابَّةٍ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا﴾

(سنن الترمذی، ابواب الدعوات عن رسول اللہ، ج: ۲، ص: ۱۸۲)

یعنی جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی سفر سے واپس ہوتے تو مدینہ منورہ کی دیواریں یعنی اس کی عمارتیں دیکھ کر اپنے اونٹ کو دوڑانے لگتے اور اگر گھوڑے یا خچر پر سوار ہوتے تو اس کو تیز کر دیتے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ کو مدینہ سے محبت تھی تو جب ہمارے محبوب حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ سے ایسی محبت تھی تو ہمیں بھی مدینہ منورہ سے والہانہ محبت ہونی چاہیے اور غایتِ محبت سے، یادِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں، آپ پر درود و سلام کی کثرت کا ہونا ایک فطری بات ہے اسی کو حضرت والا نے اپنے مخصوص انداز میں ذکر فرمایا ہے کہ جیسے ہی میرے محبوب نبی کے مسکن کی نشانی گنبد خضراء نظر آئے تو پڑھ کے صلِّ علیٰ جھوم جائیں۔

روضہ پر حاضری اور آپ ﷺ سے ہم کلامی

جب حضوری کا عالم عطا ہو
ان کو افسانۂ غم سنائیں

چونکہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبرِ مبارک میں زندہ ہیں اور یہ حیات بھی تحقیقی قول کے مطابق محض روحانی نہیں بلکہ جسمانی ہے کیونکہ رزق اور صلوٰۃ اجسام کے خواص ہیں اسی لیے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و السلام کے روضۂ اقدس پر حاضری کے وقت آپ سے مخاطب ہوکر اپنے متعلق کوئی بات پیش کرنا اور دعا کی درخواست کرنا اقرب الی الاجابت ہے۔

چنانچہ نشر الطیب، ص:۲۴۷ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ مشکوٰۃ روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسد کو کھا سکے پس خدا کے پیغمبر زندہ ہوتے ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے روایت کیا اس کو ابنِ ماجہ نے۔

فائدہ: پس آپ کا زندہ رہنا بھی قبر شریف میں ثابت ہوا اور یہ رزق اس عالم کے مناسب ہوتا ہے اور گو شہداء کے لیے بھی حیات اور مرزوقیت وارد ہے مگر انبیاء علیہم السلام میں حیات ان سے اکمل واقویٰ ہوتی ہے۔

اس لیے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے جاکر صلاۃ وسلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے دعا کی درخواست کرنا بھی باعث سعادت ہے اور حضرت والا نے جو افسانۂ غم سنانے کی بات کی ہے اس کے سلسلہ میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے نشر الطیب میں صفحہ:۳۰۳ پر تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ابوالجوزاء سے روایت ہے کہ مدینہ میں سخت قحط ہوا لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شکایت کی آپ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کو دیکھ کر اس کے مقابل آسمان کی طرف ایک منفذ کردو یہاں تک کہ اس کے اور آسمان کے درمیان حجاب نہ رہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو بہت زور کی بارش ہوئی۔

اسی مضمون کو مجددِ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ ان لذت وفرحت بخش اشعار کے ذریعہ اپنی کتاب نشر الطیب ص:۲۵۰ پر پیش فرمارہے ہیں۔

تَا اللہِ اُقْسِمُ مَا وَافَاکَ مُنْکَسِرُ
اِلَّا وَاَصْبَحَ مِنْہُ الْکَسْرُ یَنْجَبِرُ

میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ کے پاس مزار شریف پر کوئی شکستہ حال دعا کے لیے عرض کرنے کو نہیں پہنچتا مگر اس کی شکستگی کی اصلاح ہوگئی اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا۔

وَلاَ احْتَمٰی بِحِمَاکَ الْمُحْتَمِیُ فَزَعًا
اِلَّا وَعَادَ بِأَمْنٍ مَالَهٗ خَضَرُ

اور نہ کسی پناہ چاہنے والے نے گھبرا کر آپ کے دربار میں پناہ لی مگر کہ امن دامان کے ساتھ واپس ہوا، اس حالت سے اس کو اپنی حاضری پر شرمندگی نہیں ہوئی جیسا کہ ناکام لوٹ جانے میں ہوتی ہے۔

وَلاَ اَتَاکَ فَقِیْرُ الْحَالِ ذُوْاَمَلٍ
اِلَّا وَفَاضَ مِنَ الْاِ ثْرِ لَهٗ نَهَرُ

اور نہ آپ کے پاس مزار شریف پر کوئی فقیر حال امیدوار دعا کے لیے عرض کرنے کو حاضر ہوا مگر کہ اس کے نشانِ قدم ہی سے اس کے لیے نہر تکمیلِ حوائج کی جاری ہوگئی اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا۔

وَلاَ اَتَاکَ امْرَأٌ مِّنْ ذَنْبِهٖ وَجِلٌ
اِلَّا وَعَادَ لِعَفْوٍ وَهُوَ مُغْتَفَرُ

اور نہ آپ کے پاس مزار شریف پر کوئی شخص اپنے گناہ سے ڈرتا ہوا دعائے مغفرت کے لیے عرض کرنے کو آیا مگر کہ وہ عفو کے ساتھ بخشا ہوا گیا اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا۔

وَلاَ دَعَاکَ لَهِیْفٌ عِنْدَ نَازِلَةٍ
اِلَّا وَلَبَّاهُ مِنْکَ الْعَوْنُ وَالْیُسْرُ

اور نہ کسی مغموم نے کسی حادثہ کے وقت آپ کو مزار شریف پر حاضر ہوکر مدد کے لیے پکارا مگر آپ کی جانب سے عون اور آسانی نے اس کو جواب دیا اس طرح سے کہ حیاتِ برزخیہ کے سبب آپ نے سن کر دعا فرمائی اور وہ کامیاب ہوگیا یہی وہ مضمون ہے کہ جس کو حضرت والا نے اپنے اس شعر میں ذکر کیا ہے کہ جب آپ کے پاس روضۂ اقدس پر حضوری ہو تو آپ کو اپنا سب حال دردوغم پیش کرکے آپ سے دعا کی درخواست کریں اور یہ چیزیں ہیں کہ جن سے اہل اللہ کو حظِ وافر نصیب ہوتا ہے اور یہ لمحات ان کی زندگی کے نہایت ہی قیمتی ہوتے ہیں۔

اسی سے اس بات پر تنبیہ بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ڈائریکٹ (Direct) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی حاجت وضرورت کا پیش کرکے مانگنا تو جائز نہیں ہے مگر وہاں حاضر ہوکر اپنی دینی شرعی ضرورت کے لیے بارگاہِ نبوت میں دعا کی درخواست پیش کرنا گویا کہ قبولیت کے دروازہ کو کھول دینا ہے کہ ان شاء اللہ دعا رد نہ ہوگی۔

غمِ فراقِ مدینہ ایمانی مقتضیٰ

اب نہ جانا ہو گھر ہم کو واپس
چپکے چپکے یہ مانگیں دعائیں

عشاق کا وطن وہی ہوا کرتا ہے جہاں ان کا محبوب ومعشوق موجود ہو اور وہاں کی ہر شئی ان کو لذیذ ہو جایا کرتی ہے وہیں جینا اور وہیں مرنا مرغوب ہوتا ہے اسی لیے تو مجنوں اپنی لیلیٰ کے کوچوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ؂

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی
اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَ ذَا الْجِدَارَ
وَ مَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ
وَ لٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَ

مجنوں کہتا ہے کہ میں لیلیٰ کے کوچوں پر گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور میرے دل میں دراصل کوچے کے درودیوار نے کوئی جگہ نہیں بنائی ہے بلکہ اس گلی کے رہنے والے کی محبت نے جگہ بنائی۔ (اکابر دیوبند، ص:۱۰۱)

پورے عالم میں شاید کوئی مسلمان ہو کہ جس کی یہ تمنا نہ ہو کہ اس کی موت مدینہ میں آئے اور وہ وہاں دفن ہو اور ظاہر ہے کہ اس کی اصل صورت اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہاں کے قیام کو لازم پکڑ لے اور وہاں سے نہ نکلے جیسا کہ بہت سے مشائخ علماء اولیاء اللہ نے ایسا کیا اور اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور قیامت تک کے لیے مدینہ پاک کا حصہ بن گئے اسی کو حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ حاضر ہونے کے بعد اپنے گھر واپسی کی نہ آرزو ہے اور نہ اس کا خیال ہے بس یہی ایک تمنا ہے کہ بس مدفن بھی اور مستقل قیام کی نیشنلٹی (Nationlity) مدینہ پاک میں نصیب ہو جائے کیونکہ حرمین میں رہنے اور یہیں موت واقع ہونے پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ خاصہ کا وعدہ ہے جیسا کہ اوپر گذرا ہے اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں:

﴿اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَصْبِرُ اَحَدٌ عَلٰی لَأْوَائِہَا فَیَمُوْتُ اِلَّا کُنْتُ لَہٗ شَفِیْعًا اَوْ شَہِیْدًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِذَا کَانَ مُسْلِمًا﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، باب الترغیب فی سکنی المدینۃ، ج:۱، ص:۴۴۳)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ مدینہ میں اس کی مشقتوں اور تنگیوں پر کوئی صبر نہیں کرے گا مگر میں اس کی شفاعت یا اس کے حق میں قیامت کے دن گواہ ہوں گا جبکہ وہ مسلمان ہو۔

اس لیے ہر مومن کی دلی تمنا یہی ہوا کرتی ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ مدینہ میں سکونت اختیار کرے اور اس کی موت یہیں پر ہو البتہ جو لوگ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے کام سے اور آپ کے دین کی اشاعت وصیانت اور تبلیغ وتعلیم کے لیے دنیا کے دوسرے کونوں میں آباد ہیں اور ان کے دل وجان دیارِ محبوب سے فراق وجدائی میں تڑپتے رہتے ہیں تو وہ بھی اپنے مرتبہ میں بڑے اونچے ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کچھ اولاد اپنے باپ سے دور ہو جائے اور وہ خود باپ ہی کے کام سے دور گئے ہوں اور اپنے والد کے حکم سے گئے ہوں تو ظاہر ہے جس طرح والد کے پاس رہنے والے والد کی نگاہوں میں محبوب ومقرب ہوں گے بالکل اسی طرح وہ بھی نہایت عزیز ومحبوب ہونگے جو کہ بکارِ والد ہی دور گئے ہوتے ہیں اور والد کی محبت میں دور رہ کر فراق کا غم اٹھا رہے ہوں۔

اپنے مولیٰ پر مرٹنا ہی مقصدِ حیات ہے

تیرے در پر مرا سر ہو یا رب
جان اس طرح تجھ پر لٹائیں

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے جس محبوب بندے کو اپنے در پر بلاتے ہیں اور اس کو اس کی توفیق ملتی ہے تو اس کے دل کے جذبات یہی ہونے چاہیے کہ میں کس طرح ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں در رحمتِ خداوندی پر سربسجود رہوں اور اللہ کے سامنے سربسجود ہونا ہی حق تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے سجدہ کی حالت اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ قرب کی حالت ہے کیونکہ اس حالت میں مومن اپنے سب سے قیمتی عضو یعنی سر کو زمین پر رکھ کر اپنے اللہ کے سامنے غایتِ تذلّل پیش کرتا ہے اور یہ عبادت کی ایسی ادا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے بھی مشروع نہیں ہے اور غیر اللہ کو سجدہ کرنا اعمالِ شرک میں شمار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں اور اپنے اولیاء کو سجدہ میں وہ حلاوت نصیب کرتا ہے کہ اگر دنیوی حاجات اور بشری تقاضے ان کے ساتھ لگے ہوئے نہ ہوتے تو وہ کبھی سجدہ سے سر نہ اٹھاتے بلکہ ہر آن در مولیٰ پر ان کے سر رکھے ہوئے ہوتے چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طویل سجدے کیا کرتے تھے اور آپ کے سچے غلام اور عشاق کے حالات میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ پوری رات سجدہ میں سر رکھ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور آخرت کے خوف سے آہ وزاری کرتے رہے۔

اور غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تو درحقیقت مومن کا اصلی مقصدِ حیات ہے اور وجہِ تخلیقِ نوعِ بنی آدم ہے جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ کہ میں نے جنات اور انسانوں کو بس عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے اصل کامیابی جبھی ممکن ہوگی کہ انسان اپنی زندگی کی ہر ساعت اس مقصد میں صرف کرے بجز ان اوقات کے کہ جن میں انسان اپنی بشری طبعی حاجات کو بوجہ تقاضائے بشریت

بمطابق حکمِ الٰہی ادا کرتا ہے اور اس کو حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عبادت ہی میں شمار فرمایا ہے اسی لیے جب کوئی مثلاً نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بیت الخلاء جانا اور وضو کرنا سب ہی عبادت میں شمار ہوں گے اس طرح اگر کوئی شخص صبح سویرے تہجد پڑھنا چاہتا ہے اور اس مقصد سے آرام کرنے کے لیے سوتا ہے تاکہ جب اٹھوں تو طبیعت میں قوت ونشاط ہو اور پھر اللہ کے سامنے قیام وقعود اور رکوع وسجود کرسکوں تو پھر اس کا یہ سونا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے۔

بلکہ ہم قربان جائیں اپنے رحیم وکریم اللہ کے رحم وکرم پر کہ عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کی صورت میں جب کوئی عشاء پڑھ کر سوتا ہے اور پھر صبح کی نماز باجماعت ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو پوری رات عبادت کرنے والا شمار کیا جاتا ہے۔

اور درحقیقت یہ شعر حضرت والا کے جس جذبہ کی ترجمانی کررہا ہے یہی حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں کا حال تھا کہ وہ ہر وقت اور ہر گھڑی اللہ تعالیٰ پر اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے اور بلکہ امتِ محمدیہ کی عمریں کم ہونے پر ان کو یہ افسوس لاحق تھا کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے پہلی امتوں کی طرح عمریں نصیب نہ ہوں گی ان کی یہ سوچ اور تمنا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خدا پر مر مٹنے کے جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسا بنادے۔

مولیٰ سے مولیٰ مانگئے!

مجھ کو اپنا بنا لو کرم سے
ملتزم پر یہ مانگیں دعائیں

ملتزم پر دعاؤں کا قبول ہونا منصوص ہے اور احادیث میں اس مقام پر دعاؤں کی خاص قبولیت کا تذکرہ ہے چنانچہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ لوگ بڑی دل کی گہرائی سے اور بہت آہ وزاری سے اس جگہ پر دعا کرتے ہیں اور اپنی اپنی حاجات اپنے اپنے مخصوص انداز سے بارگاہِ رب العزت میں پیش کرتے ہیں لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دل کے سوز وگداز کے ساتھ دعا کس طرح مانگی جائے یہ اللہ والوں سے سیکھنے کی چیز ہے اور دعا میں کیا مانگا جائے کہ جس سے دنیا وآخرت کی ساری نعمتیں حاصل ہوجائیں چنانچہ اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگی ہے وہ ساری دعاؤں اور مرادوں اور جملہ آرزوؤں اور تمناؤں کا حاصل اور خلاصہ ونچوڑ ہے کیونکہ اس شعر میں حضرت والا نے اللہ تعالیٰ سے اللہ کو مانگا ہے اور جب کسی کو اللہ مل جائے اور اسے خدا تعالیٰ سے محبت وتعلق عطا ہوجائے اور وہ محبوب ومقرب عنداللہ ہوجائے تو پھر وہ اس شعر کا مصداق ہے حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار ہیں۔

ہوا محسوس جیسے مل گئی کونین کی دولت
مقدر سے تیرے پہلو میں جب میں نے جگہ پائی
میں اس پر جان ودل سب کچھ کروں قرباں نہ کیوں آخر
کرم سے جس کے میں نے اپنے دردوں کی دوا پائی

نیز یہ شعر بھی ۔

دل میں خدائے پاک کی لذت کو کیا کہوں
جیسے مری زمیں ہے اور اور ہے میرا آسماں

اوراسی نوع کی دعا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بیت اللہ پر آکر کیا کرتے تھے کہ ۔

تو کر بے خبر ساری خبروں سے مجھ کو
الٰہی رہوں اک خبردار تیرا
کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

اوراسی مضمون پر مشتمل حضرت والا کا یہ دعائیہ شعر ہے کہ ۔

ذوقِ طلب بھی مختلف دہر میں دیکھتا رہا
اختؔر بے قرار نے تیرا سوال کردیا

اور یہ ایسی جگہ ہے کہ اس پر مانگی ہوئی دعا بارگاہِ الٰہی میں رد نہیں ہوتی ہے جب کہ شرائطِ قبول متحقق ہوں جن میں سب سے اہم شرط مالِ حرام سے پرہیز ہے اور نہ ملنے پر مانگنا چھوڑ کر نہ بیٹھ جانا ہے۔ اور یہ ملتزم ایسا مقام ہے کہ جہاں پر کھڑے ہوکر کوئی شخص کتنا ہی سنگ دل کیوں نہ ہو مگر اس کی بھی گریہ وزاری شروع ہو ہی جاتی ہے اور چند منٹ کے لیے اپنے مولیٰ کے سامنے اپنے گناہوں اور غفلتوں پر اظہارِ ندامت وشرمندگی کا بڑا قیمتی موقعہ نصیب ہوتا ہے اور خوب دل کھول کر اللہ تعالیٰ سے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو مانگنے اور جھولی بھرنے کا مقام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے مانگنا سیکھئے

لیکن جیسے احقر نے عرض کیا ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے مانگنا بھی سیکھنا چاہیے جس میں سب سے پہلے تو وہ دعائیں ہیں کہ جو حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مواقع اور حالات میں اور خاص خاص مقامات میں ماثور ومنقول ہیں تو آدمی کو اولاً تو انہیں دعاؤں کو مانگنا چاہیے ان کے معانی ومطالب سمجھ کر حق تعالیٰ کی عظمت کا خیال کرکے دل کی حقیقی عاجزی وتضرع کے ساتھ دعائیں مانگیں صرف ان ماثور ومنقول دعاؤں کے زبانی پڑھنے پر

اکتفاء نہ کریں کہ رٹے رٹائے کلمات زبان سے جاری ہوں اور دل و دماغ کسی اور عالم میں ڈوبا ہوا اسی پر احقر کو اپنے سامنے پیش آمدہ ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک شخص ملتزم پر کھڑا ہوا بجائے دعا کرنے کے خود اللہ تعالیٰ کے دربار میں آ کر اللہ کی شکایت کر رہا ہے اور احقر نے اردو زبان میں ان کو یوں کہتے ہوئے سنا کہ اے اللہ! یہ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے میری ساری دنیا کو آپ نے برباد کر دیا ہے اور آپ نے کیوں مجھ سے میری ساری دنیا لے لی ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اپنے طور پر انسان کو اللہ تعالیٰ سے عافیت و راحت مانگنے کے ساتھ ساتھ وہاں سے آنے والی ہر حالت پر تسلیم و رضا کا ثبوت پیش کرنا چاہیے جو کہ مومن کا شعار اور اللہ والوں کی پہچان ہے۔

اس لیے آدمی جب دیارِ محبوبِ حقیقی کے سفر کا عزم کرے تو اولاً یہ سب چیزیں علمائے ربانیین کی صحبت میں رہ کر سیکھنی چاہیے اور پھر اپنے محبوب کے گھر اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیار کا رخ کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ محبوبیت

دونوں عالم کی کیا ہے حقیقت
جتنے عالم ہوں تجھ پر لٹائیں

حضرت والا نے اس شعر میں اللہ تبارک تعالیٰ کی شانِ محبوبیت کا اپنے خاص انداز میں ذکر فرمایا ہے کہ اس پر سارے محبوب قربان ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے خدا! تیرے راضی کرنے کے لیے اور تجھے پانے کے لیے اگر ساری کائنات کی بادشاہت اور ہفت اقلیم کی سلطنت بھی چلی جائے اور اس کے بدلہ میں آپ کا قرب و رضا نصیب ہو تو سودا سستا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر صحیح مومنانہ بات تو وہ ہے جو حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ درحقیقت دونوں عالم کی نعمتیں اور عیش و آرام بھی خدا کی مرضی پر فدا اور قربان ہے اور اللہ تعالیٰ کی شانِ عجیب کا کیا کہنا کہ دو عالم ہوں یا ہزار عالم ہوں اور انسان ان کو باری تعالیٰ پر قربان کرے تو خدا تعالیٰ اس بندہ سے راضی ہوتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ تو نے اپنا مال میری راہ میں قربان کیا تو نے اپنی جان میری راہ میں دی ہے تیرا عظیم اجر میرے پاس موجود ہے جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سارے عالم بھی تو درحقیقت عطاءِ الٰہی ہے، کیا ہی رحمت ہے میرے ربِ رحیم و کریم کی کہ خود ہی جان و مال دے کر اپنے کو ان کا خریدار فرما رہے ہیں اور پھر اس کے عوض جنتوں کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ﴾

ترجمہ: بلاشبہ اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔
(معارف القرآن، ج:۴،ص:۴۶۵)

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک جذباتی مفروضہ یا غلبۂ شوق میں کہی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے

قرب میں اوراس کو پا لینے میں ایسا مزہ ہے کہ اس پر سب کچھ فدا کرنے کو جی چاہتا ہے اوراس کی ایک دلیل جو احقر کے ذہن نارسا میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شہدائے کرام بارگاہِ الٰہی میں جس عزت وسرخروئی سے ہم کنار ہوں گے اور جو عیش وعشرت اورراحت وفرحتِ ابدی ان کو حاصل ہوگی وہ اس قدر ہوگی کہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے مگر جب شہید سے شہادت کے بعد سوال ہوگا اوراس کو پوچھا جائے گا کہ کوئی تمنا رکھتے ہو اور کوئی خاص آرزو دل میں ہو تو بتاؤ تو وہ کہیں گے کہ اے اللہ! آپ نے سب کچھ دے دیا ہے بس اب کوئی آرزو وتمنا باقی نہیں ہے ہاں اتنی تمنا ضرور ہے کہ دوبارہ تیری راہ میں شہید کیا جاؤں اور پھر تیرے پاس آؤں تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کو جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ لذیذ اللہ کی راہ میں کٹنا اور مرنا ہے بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ شہید ذاتِ الٰہی پر جنت کی نعمتوں اور دنیا کی تمام راحتوں کو قربان کردیتا ہے اور یہی راہِ الٰہی میں شہید ہونے کی تمنا تین تین مرتبہ زبانِ نبوت سے صادر ہوئی ہے اور حضرت والا نے اس شعر کی مناسبت سے ایک بڑی قیمتی بات ارشاد فرمائی کہ اگر تم یہ نیت کرلو کہ اے خدا! اگرچہ میرے پاس اس وقت حکومتیں اور سلطنتیں نہیں ہیں لیکن اگر مجھے دونوں جہاں کی ساری نعمتیں بھی حاصل ہوں اور میں پورے عالم کا بادشاہ بنوں تو اے خدا اس ساری بادشاہت کو تیری خاطر قربان کر ڈالوں گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اسے اس کی نیت کے مطابق عنداللہ اجر ملے گا۔

شانِ دیوانگی ومقامِ دیوانہ گری

سارے عالم میں پھر پھر کے یارب تیرا دردِ محبت سنائیں
تیرا دردِ محبت سنا کر سارے عالم کو مجنوں بنائیں
سارے عالم کو مجنوں بنا کر میرے مولیٰ تیرے گیت گائیں

ان اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اشاعتِ حق اور تبلیغِ دین کی تمنا اوراس کے سلسلہ میں اپنی دلی تڑپ کو پیش کررہے ہیں کہ بس اب تو دل کے اندر ایک ہی فکر لگی ہے کہ میں پورے عالم میں پھر پھر کر اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کو پیش کروں اوراس کی محبت کی حلاوت ومٹھاس چکھا کر دنیا کی حرام محبتوں کی، حرام لذتوں کے نشہ سے چھڑاؤں اور ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت حاصل ہوجائے کہ ہم آپ کے عشق ومحبت میں مجنوں اور دیوانے بن جائیں کہ ہروقت اور ہر گھڑی ہمارے ہر قول وفعل اور ہماری ہر نقل وحرکت میں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اوراس پر ایمان واعتماد کی تعلیم وتلقین ہو اور یہی وردِ زبان ہو اور دنیا اوراس کی فانی لذتوں سے نہ کوئی دل چسپی ہو اور نہ اس کے تذکرے زبان پر ہوں اور دنیا کی ساری فکروں سے بالکل آزاد ہو کر رضائے مولیٰ کی فکر سے سرشار ہوں اور قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ مسلمان کی ذمہ داری جس طرح اپنی اصلاح کرنا ہے اسی طرح دوسرے اپنے بھائیوں کی اصلاح کی فکر کرنا بھی اہم ترین ذمہ داری ہے اسی کو قرآن امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے اور کہیں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی فکر وہ فکر ہے کہ جو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ جماعتِ تبلیغ کے قلب پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے القاء فرمائی تھی اور انہوں نے اپنی تڑپ اور لگن اور درد دِکڑھن سے پورے عالم میں ایمان واسلام کی تبلیغ اور امتِ محمد یہ کو ان کی دینی و مذہبی ذمہ داری یاد دلانے کا کام شروع کیا اور اللہ تعالیٰ ہمارے ضعف اور کمزوری کو جانتے ہیں اس لیے اگر ہم نہ کرسکے تو بھی ہماری نیت کے مطابق ہمارے نامۂ اعمال میں اجر وثواب لکھ دیتے ہیں اور اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کی شکلیں پیدا فرما رہے ہیں۔

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بے چینی اور تڑپ

چنانچہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ کام شروع فرمایا تو کوئی ان کی بات سننے والا نظر نہ آتا تھا مگر بحمد اللہ وہ وقت بھی آ گیا اور آج ہم سب کے سامنے ہے کہ واقعی یہ کہنا خلافِ واقع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم میں یہ آوازِ حق وصداقت بلند فرمادی ہے اور ایسی ایسی کفر وشرک کی ظلمات میں ڈوبی ہوئی جگہیں کہ جہاں کوئی اللہ اور رسول کا نام لینے والا نہ تھا وہاں مساجد ومکاتب اور مدارس وجامعات وجود میں آچکے ہیں تو اسی طرح حضرت والا نے اس شعر میں جس دلی تمنا اور آرزو کا ذکر فرمایا ہے اور پورے عالم کی نیت فرمائی ہے بظاہر آثار ایسے معلوم ہورہے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت والا کے اس ارادہ کو پورا فرمادیا ہے اور یہ نیت قبول فرمائی ہے۔

چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں اسلامی ہوں یا غیر اسلامی ہوں حضرت والا کی تعلیمات اور دعوت وتبلیغِ دین کے فریضے انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں اور بہت سی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے شائع ہورہے ہیں اور بڑے بڑے علماء مشائخِ وقت اپنی اصلاح وتربیت کے سلسلہ میں حضرت والا سے رجوع کیے ہوئے ہیں حتیٰ کہ بلادِ عربیہ میں بھی بکثرت حضرت والا کے متعلقین خلفاء ومجازین موجود ہیں اور افاضۂ باطنی میں مصروف ومشغول ہیں اور جو تعبیر شعر میں اختیار فرمائی گئی ہے اور جس دیوانگی کی دعا مانگی گئی ہے وہ درحقیقت اسلاف کرام کی سنت وعادت رہی ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت میں ایک مقام پر یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ کسی نے ایک بزرگ سے ہمارے اور صحابہ کرام کے درمیان نسبت کا سوال کیا اور یہ کہا کہ ہم میں اور ان میں کیا فرق تھا؟ تو اس پر انہوں نے یوں ارشاد فرمایا کہ بس اتنا فرق تھا کہ اگر تم ان کو دیکھ لیتے تو انہیں مجنوں اور پاگل کہتے اور وہ اگر تمہیں دیکھتے تو مسلمان کہنا گوارا نہ کرتے اور نہ ہمیں سلام کرتے یعنی مطلب یہ کہ جب بندۂ مومن اپنے ایمانی تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے لگتا ہے تو پھر اہلِ دنیا کی نگاہوں میں وہ مجنوں نظر

آنے لگتا ہے کیونکہ اس کی ہر نقل وحرکت اور اس کا ہر قول وفعل دنیا سے بے رغبتی اور دنیوی عیش وعشرت سے دوری اور فکرِ آخرت اور اندیشۂ عاقبت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے کتنے ہی اہم اور ضروری دنیوی معاملات اس کی نگاہوں میں بے وقعت اور بے حیثیت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور وہ دنیوی زندگی میں ہر قدم اس طرح اٹھاتا ہے کہ جیسے کوئی شخص خاردار راستہ پر بہت احتیاط سے اور دیکھ بھال کر قدم رکھتا ہے کہ ذرا خطا ہونے سے اس کو نقصان پہنچ جائے گا کیونکہ اس کی فکر وسوچ کا محور اپنی آخرت اور اللہ کے سامنے حاضری اور میدانِ قیامت میں اپنے کیے کا جواب دہی جیسے امور ہوتے ہیں اسی لیے جنہوں نے یہ کہا ہے تو بجا کہا ہے کہ وہ مخلوق میں رہتے ہوئے بھی مخلوق سے فاصل اور خدا تعالیٰ سے واصل ہوتے ہیں کیونکہ ان کے قلب کا عالم بالکل الگ ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اس دل کو خالقِ دل سے آباد کیے ہوتے ہیں۔

اسبابِ سکون اور سکون میں فرق

لذتِ قربِ پا کر تیری ہم
لذتِ دو جہاں بھول جائیں

دنیا وآخرت کی تمام نعمتیں خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور ان نعمتوں سے ملنے والی لذت اور راحت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ جسے یہ نعمتیں حاصل ہوں تو وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہو اور اسے وہ لذت وفرحت اور وہ کیف وسرور بھی مل رہا ہو کہ جو ان نعمتوں کا اصل خاصہ اور اثر ہے بلکہ ہم نے دنیا میں بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ ہزاروں نعمتوں اور دولتوں میں رہتے ہوئے بے چین وبے سکون نظر آتے ہیں اور اپنی پریشانی وبے چینی کو بیان کرتے رہتے ہیں اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ درحقیقت یہ اشیائے دنیا اسبابِ لذت وراحت اور اسبابِ چین وسکون تو ہیں مگر ان کو چین وسکون سمجھنا بالکل خطا اور غلط ہے جیسا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ چین وسکون الگ چیز ہے اور اسبابِ چین وسکون الگ ہے یہ دنیا کے ساز وسامان اسبابِ راحت تو ہیں مگر عینِ راحت نہیں ہیں چنانچہ اسبابِ راحت وسکون تو بازاروں میں بکتے ہیں مگر چین وسکون دنیا کی مارکیٹوں (Markets) اور بازاروں میں فروخت نہیں ہوتا ہے اس لیے بارہا یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اللہ والے جن کے پاس یہ سب اسبابِ راحت، دولت وثروت جمع نہیں ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ انہیں اپنے قربِ خاص کی ایسی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں کہ پھر وہ دو جہاں کی لذت کو بھی کچھ نہیں سمجھتے ہیں اور ایسی پرسکون زندگی گزارتے ہیں کہ جو دوسروں کے لیے نمونہ اور قابلِ رشک ہوتی ہے اور ان کے پاس بیٹھنے ہی سے راحت وسکون ملنا شروع ہو جاتا ہے اس لیے یہ کہنا بالکل درست اور صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت جملہ لذاتِ عالم کی جان اور روح ہے اگر یہ نہ ہو تو ساری لذتیں بے جان ہیں صرف صورت ہے مگر روح نہیں، جیسے بلا روح کے جسم اور بلا خوشبو کے

پھول ہوتو وہ بے کار مردہ اور لاش ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس نعمت سے مالا مال فرما دیں، امین ۔

تلاشِ رجال اللہ

در بدر ڈھونڈتا ہے یہ اختر
اہلِ دردِ محبت کو پائیں

یہ حضرت والا کا مقطع ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ اور رجال اللہ کی تلاش اور جستجو سالک کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے کلیدی اہمیت کی حامل ہے اس لیے اختر قربِ الٰہی کے حصول کے لیے در بدر ایسے لوگوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ جو قرب والے ہیں تا کہ ان کی صحبت ومعیت اور ان کی خدمتوں اور دعاؤں کی بدولت میں بھی یہ دولت پا جاؤں اور ان کے ساتھ چل کر اس راہ کو بآسانی طے کروں اور اللہ والا بن جاؤں اس کو یوں سمجھئے جیسا کہ مٹھائی مٹھائی والوں سے ملتی ہے اور کباب کباب والے سے ملتا ہے اور چائے چائے والے سے ملتی ہے بس ٹھیک اسی طرح اللہ بھی اللہ والوں سے ملتا ہے اس لیے جو لوگ راہِ قربِ خداوندی پر چل کر اس کو طے کیے ہوئے ہیں وہ اس راہ کے نشیب وفراز اور اس کے پیچ وخم سے خوب واقف ہوتے ہیں اور مکائدِ نفس وشیطان سے نمٹنے کے لیے مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ نفس وشیطان کس کس حیلہ وبہانہ سے اور کس کس عنوان سے سالک پر حملہ آور ہو کر اس کو راہِ حق سے ہٹاتا ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اس لیے جب کوئی راہ رو ایسے تجربہ کار ماہر رہبر کے ساتھ اس راہ کو طے کرتا ہے تو وہ بڑی جلدی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور صاحبِ نسبت بن جاتا ہے جس کی حقیقت بالفاظِ مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہٗ دوامِ طاعت اور کثرتِ ذکر ہے اور پھر اس کے لیے یہ دنیا ہی جنت کا سا لطف دینے لگتی ہے اور وہ صرف ولی نہیں ولی گر بن جاتا ہے اور یہ مضمون حضرت والا کے مختلف دوسرے اشعار کے ذیل میں مزید تفصیل کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔

آپ کا ذکر ہے دو جہاں میں

آپ کا مرتبہ اس جہاں میں جیسے خورشید ہو آسماں میں
دوستو! یہ ہے شہرِ مدینہ جس سے اسلام پھیلا جہاں میں
گر نہ صلِّ علیٰ ہو زباں پر کیا اثر ہوگا آہ و فغاں میں
وَ رَفَعْنَا کا انعام یہ ہے آپ کا ذکر ہے دو جہاں میں
شرطِ توحید کامل یہی ہے عشق ہو آپ کا قلب و جاں میں
کوئی سمجھے گا کیا غیرممکن آپ کا رُتبہ دونوں جہاں میں
سبز گنبد پہ جس کی نظر ہو وہ بھلا جائے کس گلستاں میں
نام کیسا ہے پیارا محمد ﷺ جن کے صدقے میں ایماں ہے جاں میں
یہ ہے فیضانِ نورِ نبوت جو ہے اسلام سارے جہاں میں
کیا کہوں رفعتِ شانِ گنبد کچھ نہیں دم ہے اختؔر زباں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ خورشید: سورج۔ آہ و فغاں: رونا دھونا۔ وَ رَفَعْنَا: ہم نے بلند کیا آپ کے ذکر کو۔ (الآیۃ) توحیدِ کامل: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت۔ گلستان: باغ۔ فیضانِ نورِ نبوت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا فیض۔ رفعتِ شانِ گنبد: گنبدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کی بلندی۔

آفتابِ نبوت کو آفتابِ جہاں کے ساتھ تشبیہِ بلیغ

آپ کا مرتبہ اس جہاں میں
جیسے خورشید ہو آسماں میں

حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال واوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُفَخَّمًا يَتَلَأْ لَأُ وَجْهُهُ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ﴾

(شمائل الترمذی، ص: ۲)

کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بڑی عظیم اور بلند تھی اور لوگوں میں آپ عظیم المرتبت تھے اور آپ کا چہرۂ مبارک ایسے چمکتا تھا کہ جیسے چودھویں رات کا چاند چمکتا ہے۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ اس شعر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی اور آپ کے بلند مرتبہ ہونے کو آسمانوں میں چمکتے ہوئے سورج سے تشبیہ دے رہے ہیں۔

اوّل تو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ تشبیہ محض انسانوں کو نظر آنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ قریب

الی الفہم چیز کے ساتھ دی گئی ہے ورنہ درحقیقت سورج کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نسبت نہیں بلکہ آپ کا معاملہ تو یہ ہے کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور تقریب الی الفہم کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ جس طرح اس دنیا میں رفعت و بلندی کے لحاظ سے اور روئے زمین پر بسنے والی جملہ مخلوقات کے ساتھ مادی افادیت کے تعلق کے لحاظ سے سورج کو نہایت قوی اور مضبوط نسبت حاصل ہے اور اگر سورج کی روشنی مفقود ہوجائے تو کسی ذی روح کا بقاء ممکن نہ رہے گا اور ہر ذی روح اپنی حیاتِ دنیوی سے محروم ہوجائے گا کیونکہ سورج کی روشنی کو بہت سے مضر جراثیم کے خاتمہ میں اور زندگی کے لئے ضروری غذاؤں کی تیاری میں بڑا دخل ہے تو اسی طرح گویا ہر مخلوق بالواسطہ یا بلا واسطہ سورج کے فیض سے مستفیض ہے۔

بس اسی طرح حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ نبوت سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ مستفیض ہو رہا ہے جہاں تک اہلِ ایمان کا تعلق ہے تو وہ تو بالکل ظاہر ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو کفار و مشرکین اور فساق و فجار بھی آپ کی نبوت کی برکات سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، اس لئے کہ اُمت مسلمہ میں جتنے اعمالِ خیر ہیں، وہ تمام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے اور آپ کے واسطہ سے اُمت کو ملے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی انسانوں اور اللہ کے درمیان واسطہ ہیں تو اس لحاظ سے یہ سب اعمالِ خیر آپ کا صدقہ ہوئے اور اعمالِ خیر کے وجود میں آنے سے روئے زمین پر طرح طرح کی برکتیں اُترتی ہیں اور آسمان و زمین سے برکتیں انڈیل دی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں برکتوں میں خود انسانوں کی حیات اور ان کو غذاء کا ملنا اور کھانا و پینا میسر ہونا بھی ہے اور آسمان سے بارشیں برستی ہیں اور زمین سے پھل اُگتے ہیں اور طرح طرح کے عذابات اور قتل و غارت گری سے اُمت محفوظ ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوائد صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی برابر درجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ جب تک دنیا قائم رہے گی تو یہ اسی طرح حاصل ہوتے رہیں گے۔ اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ساری مخلوقات ہی اس سے مستفیض ہو رہی ہے کیونکہ زمین اگر قحط سالی کا شکار ہوجائے تو کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

تشبیہ کا ایک دوسرا پہلو

اس کو دوسرے انداز سے یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جس طرح سورج کی روشنی اور کرنوں سے ظاہری حیات وابستہ ہے اور حیاتِ ظاہری کے لئے وہ ضروری ہے، بس ٹھیک اسی طرح سے پوری دنیا میں جہاں بھی کوئی خدا کا بندہ ہے اور ایمانی حیات جس کسی کو بھی حاصل ہے تو وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا فیض ہے اور جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی کرنیں نہیں پہنچ سکیں اور جو ان سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا تو وہ اس حقیقی حیاتِ ایمانی سے محروم ہے۔ بڑے بڑے اولیاء، اقطاب و ابدال اور صدیقین و صالحین کو جتنے مراتب قربِ بارگاہِ

ربّ العزت میں حاصل ہوتے ہیں۔ انہیں خوف وخشیت اور زہد وتقویٰ اور قرب ومعرفت کی جتنی منزلیں حاصل ہوئی ہیں وہ سب کی سب آپ کے فیضانِ نبوت سے ہے۔ ان میں سے کسی کا اپنا کمال نہیں اور وہ آپ سے جدا ہوکر قرب کی ادنیٰ منزل کو بھی نہیں چھوسکتا جبکہ آسمانوں میں سورج کی روشنی کے فیض سے ہی چاند کی روشنی ہے اور کواکب وسیّارات کی روشنی بھی اسی کی مرہون منت ہے۔ اگر پیچھے سے سورج ہٹا دیا جائے تو یہ سارے اجسام بے نور ہوکر رہ جائیں گے۔

اس لئے اس تشبیہ میں مختلف وجوہ سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور ہر وجہ سے یہ تشبیہ نہایت بلیغ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کی توضیح وتشریح کے لئے بہت ہی جامع اور مکمل ہے۔

اشاعتِ اسلام کا بنیادی مرکز

دوستو! یہ ہے شہرِ مدینہ
جس سے اسلام پھیلا جہاں میں

حضرتِ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کل عمر نبوت تئیس سال ہے جن میں تیرہ سال مکۃ المکرّمہ کی زندگی کا عرصہ ہے اور دس سالہ زندگی مدنی زندگی ہے۔ مکۃ المکرّمۃ میں کفار میں ایمان کی دعوت کا سلسلہ قائم ہوا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے کفار ومشرکین حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ حالات ایسے بنتے چلے گئے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے اصحاب کو وہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہوگیا۔

چنانچہ اس کے متعلق سیرت وحدیث کی کتابوں میں چھوٹے اور بڑے تمام واقعات مفصل مذکور ہیں۔ بس مجھے تو شرحِ شعر کے عنوان سے یہ مضمون عرض کرنا ہے کہ جس کو حضرت نے اس میں ذکر فرمایا ہے اور وہ بہت ہی اہم ہے کہ اصل اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا کام بڑی قوت وطاقت کے ساتھ مدینہ منورہ میں شروع ہوا اور ہر طرف سے وفود کی آمد کا سلسلہ اور پھر قبولِ اسلام کی خبریں ہر سمت سنائی دینے لگی اور اللہ کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے والے اور اس امانت کو پوری اُمت تک پہنچانے کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگا کر ہر طرف دُشمنانِ اسلام سے جانبازی کا عمل زور وشور کے ساتھ سنائی دینے لگا اور اللہ کے بندے اپنی جانیں راہِ خدا میں قربان کر کے اسلام کے کلمہ کو سربلند کرتے رہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہیے کہ جہاد کا عمل شروع ہوا اور دینِ اسلام بڑی سرعت وتیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہوا۔ ہر طرف غزوات وسرایا کی دھوم تھی اور اللہ کے دیوانے اپنی جانوں کو لے کر اسلام یا جزیہ یا تلوار کا اعلان کرتے ہوئے کلمۂ اسلام کی سربلندی میں مصروف ہوگئے۔ یہاں تک کہ مکۃ المکرّمہ میں رہ کر جو قلیل تعداد مسلمان ہوئی تھی اب وہ بڑی کثیر تعداد میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ کتاب ''عہدِ نبوت کے ماہ وسال'' کے مصنف حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صفحہ: ۳۵۵ پر تحریر فرماتے ہیں ''حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

رفاقت میں جو حضرات مکہ میں داخل ہوئے، ان کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تھی۔ یہ تعداد ان مسلمانوں کے علاوہ تھی جو مکہ ہی میں رہائش پذیر تھے اور جو یمن سے حضرت علی اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ہمراہ آئے تھے۔''

(بحوالہ زرقانی شرح مواہب)

غرض یہ کہ مدینہ منورہ کو دینِ اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے لئے ایک مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ کوئی بھی مشن (Mission) اور تحریک ہو اس کو مفید و نافع بنانے کے لئے کسی مرکز کا ہونا لازم اور ضروری ہے۔

اتباعِ سنت کی اہمیت

گر نہ صلِّ علیٰ ہو زباں پر
کیا اثر ہوگا آہ و فغاں میں

دین کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی وعبادت حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری محبت وعشق ہو اور یادِ خداوندی اور ذکرِ الٰہی کے ساتھ ساتھ زبان حضور صلی اللہ علیہ وسلم پُرنور پر درود وسلام کی لذت سے آشنا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے یہاں محبوبیت کا معیار اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾

(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ (لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعمِ خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو۔ (معارف القرآن، ج:۲، ص:۵۴)

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تفسیرِ عثمانی میں اس آیت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں: ''جو شخص جس قدر حبیبِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلتا ہے اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے۔ اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ خدا کی محبت کے دعوی میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعویٰ میں سچا ہوگا اتنا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔''

اس کے علاوہ دوسری اہم بات یہ کہ جب تک درود شریف کے ورد سے زبان آشنا نہ ہو تو اپنی دعاؤں کی قبولیت بھی معلق رہتی ہے اور جب اوّل وآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جاتا ہے تو پھر دعائیں قبول ہوتی ہیں اور آہ وفغاں بارگاہِ ربّ العزت میں پہنچ کر پُرتاثیر ہوتی ہے۔

رفعتِ نام محمد ﷺ

وَرَفَعْنَا کا انعام یہ ہے
آپ کا ذکر ہے دو جہاں میں

حضرتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ عظمت و رفعت کو ذکر کرتے ہوئے حضرتِ والا قرآنِ کریم کی آیتِ شریفہ وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر عظمت و شہرت اور رفعت و بلندی عطا فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپ کا نامِ مبارک مقرون ہوگیا ہے۔ کَذَافِی الدُّرِّ الْمَنْثُوْرِ مَرْفُوْعًا قَالَ اللہُ تَعَالٰی اِذَا ذُکِرْتُ ذُکِرْتَ مَعِی کہ جہاں میرا ذکر ہوگا آپ کا ذکر بھی میرے ساتھ ساتھ ہوگا۔ (رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم وفی روح المعانی، ج:۳۰،ص:۱۶۹)

''جیسے خطبہ میں، تشہد میں، نماز میں، اذان میں، اقامت میں اور اللہ کے نام کی رفعت و شہرت ظاہر ہے، پس جو اس کے قرین ہوگا رفعت و شہرت میں وہ بھی تابع رہے گا اور تمام اسلامی شعائر میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نامِ مبارک لیا جاتا ہے تو ساری دنیا میں میناروں اور منبروں پر اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے ساتھ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ پکارا جاتا ہے اور دنیا میں کوئی سمجھدار انسان آپ کا نام بغیر تعظیم کے نہیں لیتا ہے۔ اگرچہ وہ مسلمان نہ بھی ہو۔'' (معارف القرآن، ج:۸،ص:۷۷۱)

اس لئے اگر اللہ تعالیٰ کے بعد اس کی مخلوق میں کسی کا مرتبہ و مقام ہے تو سب سے اونچا مقام و مرتبہ دنیا و آخرت میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ آپ کا نام اور آپ کا مقام اور آپ کا کام سب عظمتوں والے ہیں۔ جہاں سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی پہنچ ختم ہو جاتی ہے اس سے بھی آگے والا مقامِ قرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے اور سیرت نگاروں نے اس ذکرِ دو جہاں کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

تلازمِ توحید و رسالت

شرطِ توحید کامل یہی ہے
عشق ہو آپ کا قلب و جاں میں

کلمۂ اسلام دو جزؤں پر مشتمل ہے۔ اول جزء لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اور دوسرا جزء مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مانا جائے اور اسی کو خالق و مالک، نفع و ضرر، عزت و ذلت، خوشی و غم، نفع و نقصان غرض یہ کہ تمام حالات و انقلاباتِ زندگی کا مالک سمجھا جائے اور ہر طرح کے جذباتِ عبادت صرف اسی کے ساتھ خاص مانے جائیں۔

یہ ماننا نبی کی نبوت و رسالت کی تصدیق کے ساتھ ہو اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ

سے مانا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں میں کامیابی وکامرانی کی ضمانت اور دنیوی واُخروی فلاح کے یقین واعتماد کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جائے۔ اگر اوّل جزءِ کلمہ موجود ہو مگر ثانی نہ ہو تو قرآن صاف طریقہ پر اعلان کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان میری بارگاہ میں معتبر نہیں ہے اور ایسوں کی توحید صحیح توحید نہیں ہے۔

اس لئے تو اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ کا ایمان غیر معتبر قرار پایا ہے کہ وہ خدا کے وجود کو مانتے ہیں اور اللہ کی ذات پر اپنے مفروضہ نظریات کے تحت ایمان لاتے ہیں اور جنت وجہنم کا خود کو مستحق ہونے کو (اپنے منحرف شدہ دین کے مطابق) تسلیم کرتے ہیں لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی ورسول تسلیم نہیں کرتے ہیں تو قرآن نے اعلان کر دیا ہے کہ ان کا ایمان میرے یہاں معتبر نہیں ہے۔

اس لئے فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللہِ الْاِسْلَامُ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ اور معتبر دین اب صرف اسلام ہے اور ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ﴾

(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۸۵)

ترجمہ: اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ (دین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول (ومنظور) نہ ہوگا اور (وہ شخص) آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔ (یعنی نجات نہ پائے گا۔)

(معارف القرآن، ج:۲، ص:۱۰۱)

حضرتِ والا کے اس شعر میں ان اہلِ اسلام کے لئے بھی ایک بڑی نصیحت ودرسِ عبرت ہے کہ جو لوگ کلمۂ توحیدِ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کو مانتے ہیں مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا عشق مطلوب اور مامور بہ ہے وہ درجۂ عشق ان کو حاصل نہیں تو ایسے لوگ سمجھ لیں کہ ان کی توحید کامل نہیں ہے۔

بلکہ جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق دل کی گہرائیوں میں اُترتا جائے گا، اتنا ہی زیادہ ایمانی حلاوت وجلاء، رگ وریشے میں سرایت کرتا چلا جائے گا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بغیر ایمان واسلام اور توحید وتصدیق ناقص ہی رہتی ہے اور احادیث مبارکہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی شدید محبت ہونی چاہیے کہ وہ محبت اپنی ماں باپ اور اپنی حقیقی اولاد اور اُس کی خود اپنی جان سے بھی زیادہ بڑھ جائے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ج:۱، ص:۷)

کہ تم میں سے کوئی مؤمن کامل یقین والا نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ جس کی پہچان اور نشانی یہ ہے کہ جب اولاد و بیوی کی کوئی فرمائش یا والد و والدہ کا کوئی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے خلاف ہو تو بندۂ مؤمن طریقۂ نبی کو نہیں چھوڑتا

ہے خواہ یہ سارے ناراض ہو جائیں اور کتنے ہی فوائد اور منافعِ دنیویہ سے اس کو محروم رہنا پڑے اور بڑی تلخ ملامتیں سننی پڑیں۔ پھر بھی اپنے نبی کے طریقہ سے سرمو نہیں ہٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ایسی کامل اتباع عطا فرمادے۔

حضور ﷺ کا مقامِ عالی

کوئی سمجھے گا کیا غیر ممکن
آپ کا رُتبہ دونوں جہاں میں

کسی کی تعریف کی آخری حد یہی ہوتی ہے کہ میری استطاعت وقدرت سے باہر ہے کہ میں اپنے محبوب کی تعریف کرسکوں اور اس کے مقامِ عظمت و بزرگی کو سمجھ سکوں۔ جیسا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی حمدِ باری تعالیٰ میں یہ مضمون سکھایا ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ لاَ نُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، ج: ۱، ص: ۱۹۲)

تو حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حقیقی اور آخری بات تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقامِ عظمت کو پہچاننا اور اس کو پورے طور پر سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے اس کو اپنے الفاظِ محدودہ، ناقصہ سے تعبیر و بیان کرنا ممکن نہیں۔

بھلا وہ ذات کہ جس کی مدح خود اس کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ کر رہا ہو تو اس کی حقیقت تک مخلوق کی رسائی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ خود ہی حضور صلی علیہ وسلم کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ اور فرمایا کہ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور ارشاد فرمایا کہ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہ اے نبی! ہم نے تم کو سارے جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور ہم نے آپ کو اخلاقِ عظیمہ پر فائز کیا ہے۔

اس لئے ایک مخلوق کے ذہنِ نارسا کی پہنچ ان کمالات و اوصافِ نبوت تک کہاں ہوسکتی ہے؟ جو آپ کو عطا ہوئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ لغتیں قاصر و عاجز اور بے بس ہو کر رہ جائیں گی، مگر آپ کی توصیف وثناء کا حق ادا نہ ہوگا۔

گلستانِ نبوت کی بہاریں

سبز گنبد پہ جس کی نظر ہو
وہ بھلا جائے کس گلستاں میں

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت وتعلق اور دلی وابستگی پیدا ہونے کے بعد دنیا کا کوئی شہر اور کوئی مقامِ سیاحت اور کوئی گلستان و بوستان نظروں میں نہیں بھاتا ہے۔ پھر آپ کے دیار سے جدا ہونے کے بعد اداسی اور بے چینی اور دلی افسردگی کا خمار چھا جاتا ہے، کیونکہ وہ ایسی جگہ ہے اور وہ ایسا مقدس مقام ہے کہ جہاں

خالقِ کائنات کی رحمتیں ہر آن بارش کی طرح برستی رہتی ہیں اور ہر غم زدہ کے دل پر خوشی و مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔

یہ گلستانِ نبوت وہ گلستان ہے کہ جس کو کبھی خزاں نہیں چھوتی۔ وہاں ہر گھڑی بہار ہی بہار کا عالم رہتا ہے خواہ دنیا میں موسمِ بہار ہو یا موسمِ خزاں لیکن وہاں اس کا گذر نہیں ہے۔

حضرت والا جس عالی مضمون کی طرف اشارہ فرماتے ہیں وہ بہت ہی اونچا اور عالی مضمون ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وتعلق کے بعد دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہوں وحکمرانوں اور دولت وثروت والوں کے در کی طرف اس کا کوئی التفات قائم نہیں رہتا ہے اور صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا والوں سے علائق بے جا ختم کرنے کے لئے انتہائی نافع اور مفید ہے۔ اس در سے پھر وہ سب کچھ ملتا ہے کہ اس کے بعد ان کو کوئی در اچھا نہیں لگتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ دربارِ نبوت میں آپ کی حیاۃِ طیبہ میں حاضر ہو جایا کرتے تھے تو پھر وہ آپ کے ایسے غلام اور اسیر ہوتے تھے اور آپ پر ایسے فدا ہوتے تھے کہ ساری کائنات ان کی نظروں میں نہیں بھاتی تھی۔ دوست تو دوست دُشمنوں تک کا یہی معاملہ ہوتا تھا۔

نامِ محمد اور وجوہِ محبت

نام کیسا ہے پیارا محمد ﷺ
جس کے صدقے میں ایماں ہے جاں میں

دوستو! یہ اصولِ فطرت ہے کہ جب کسی انسان کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اس کی ہر شئے اچھی اور بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کا نام بھی محبوب ہو جاتا ہے اور اس کا تذکرہ بھی لطف آمیز ہو جاتا ہے۔

غرض کہ جو بھی چیز اس سے کسی طرح وابستگی اور تعلق رکھتی ہو، وہی محبوب اور پسندیدہ ہو جاتی ہے۔ اور بھلا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر مؤمن کی محبت میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے کیونکہ آپ کی ذاتِ عالی میں محبت کی جملہ وجوہ جمع ہیں جمال ونوال وکمال وقرابت۔ چنانچہ آپ کو ایسا جمال عطا ہوا کہ جس کی صحیح ترجمانی سے زبان وقلم قاصر و عاجز ہیں۔ بس اس کو سمجھنے کے لئے شاعرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ شعر کافی ہے ؎

وَاَحۡسَنَ مِنۡکَ لَمۡ تَرَ قَطُّ عَیۡنٌ
وَاَجۡمَلَ مِنۡکَ لَمۡ تَلِدِ النِّسَآءُ
خُلِقۡتَ مُبَرَّاً مِنۡ کُلِّ عَیۡبٍ
کَاَنَّکَ قَدۡ خُلِقۡتَ کَمَا تَشَآءُ

آپ سے زیادہ خوبصورت کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ عرب وعجم کی کسی عورت نے آپ سے زیادہ خوبصورت

جنا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے جس طرح خود اپنے کو چاہا اسی طرح ہر عیب ونقص سے خالی آپ کو پیدا کیا گیا۔ اور جہاں تک آپ کے کمالات کا تعلق ہے تو آپ کو علمی وعملی دونوں نوع کے کمالات اعلیٰ اور اتم درجے میں عطا کئے گئے۔

اس لئے آپ کا دین اکمل الادیان، آپ کی شریعت اکمل الشرائع اور آپ کی اُمت افضل الامم قرار پائی اور آپ کا مرتبہ تمام اوّلین وآخرین میں سب سے افضل اور اعلیٰ قرار دیا گیا۔ اس لئے آپ کو افضل الانبیاء والرسل کہا جاتا ہے۔ اور آپ کی عطا کا یہ عالم ہے کہ قیامت تک آنے والی تمام اُمت کا ایمان ویقین صرف آپ کا صدقہ ہے اور آپ کی عطائے ظاہری کا بھی یہ عالم تھا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں آپ رمضان کے مہینے میں تیز ہواؤں سے بھی زیادہ سخاوت میں مال اُڑانے والے ہوتے تھے۔ اور قرابت کے لئے اتنا سمجھنا کافی ہے کہ قرآن میں اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت: ۶)

ترجمہ: نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مومنین کے ساتھ تو ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیبیاں ان (مومنین) کی مائیں ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۸۵)

مزید ان چاروں وجوہِ محبت کو سمجھنا ہو تو سیرت کی کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ چنانچہ ایک مختصر مضمون میں علامہ عینی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے: ''حبِ طبعی جو میلانِ قلبی ہے وہ کبھی حسین صورت یعنی جمال اور کبھی باطنی خصائل یعنی کمال اور کبھی نوال یعنی احسان اور کبھی قرابت کی بناء پر ہوتی ہے اور یہ چاروں حبِ طبعی کا منشاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کامل طور پر والدین سے بھی بڑھ چڑھ کر متحقق ہے۔ جمالِ ظاہری تو اتنا ہے کہ چہرۂ انور بدر سے بھی زیادہ چمکتا نظر آتا تھا۔ لَنَا شَمْسٌ وَلِلْاٰفَاقِ شَمْسٌ، کمالِ باطنی تو یہاں تک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور احسان، رأفت ورحمت اس درجے میں ہے کہ آپ کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ اور ارشاد باری تعالیٰ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ اور قرابت کے متعلق قرآن کہتا ہے اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ کہ نبی کو ایمان والوں سے ان کی جان سے زیادہ تعلق ہے لہٰذا اگر یہ کہہ دیا جائے کہ نبی مؤمنین کے حق میں بمنزلۂ باپ بلکہ اس سے بھی بمراتب بڑھ کر ہے تو بے جا نہ ہوگا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قرأت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ کے الفاظ کے ساتھ اس کی صراحت موجود ہے:

﴿وَفِیْ قِرَاءَةِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ"﴾

(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج:۱۲، ص:۱۰۶، دار الاحیاء التراث العربی)

اور اسی طرح ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں ہے، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿انما انا لکم بمنزلۃ الوالد﴾

(سنن ابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب کراھیۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ، ج: ۱، ص: ۳)

یعنی میں تمہارے لیے والد کے درجے میں ہوں۔

اس مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ سمجھنا بالکل آسان ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمارے محبوب ہیں تو آپ کا نام بھی ہمیں محبوب اور پیارا ہوگا۔ حق تعالیٰ نے آپ کا نام محمد رکھ کر خود اس میں محبوبیت کی شان رکھ دی ہے۔ اس لئے کہ محمد وہ ذات ہوگی جس کی بہت تعریف کی گئی ہو، خالق ومخلوق دونوں نے آپ کی تعریفیں کی ہیں اور آپ خود بھی اللہ کی ایسی حمد وثناء کرنے والے ہیں کہ وہ حمد اوّلین وآخرین میں سے کسی کو عطا ہوئی اور نہ ہوگی۔ اسی لئے آپ کا دوسرا نام ''احمد'' بھی ہے اور ان ناموں کے ساتھ کتبِ سابقہ میں بھی آپ کا تذکرہ موجود ہے۔

اگرچہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی دو نام نہیں بلکہ احادیثِ شریفہ میں مختلف مواقع پر آپ کے اور بہت سارے نام مذکور ہیں جن سے متعلق حضرت مولانا موسیٰ خان صاحب روحانی بازی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''البرکاتُ المکیّۃ فی الصلوات النبویّۃ'' کافی مفصل کتاب ہے۔

دوستو! جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک اور آپ کے نام مبارک سے پیار نہ ہو خوب خوب محبت نہ ہو تو نہ کوئی ولی ولی ہے، نہ کوئی بزرگ بزرگ ہے اور اللہ تعالیٰ تک رسائی بغیر محبتِ رسول کے ممکن نہیں۔ اسی طرف حضرتِ والا نے شعر میں توجہ دلائی ہے۔

نورِ نبوت کی کرنیں

یہ ہے فیضانِ نورِ نبوت
جو ہے اسلام سارے جہاں میں

پہلے زمانے میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مخصوص قوموں اور متعین جگہوں اور محدود زمانے کے لئے دنیا میں بھیجے جاتے تھے اور جب ایک نبی دنیا سے چلے جاتے تو اللہ تعالیٰ دوسرے نبی کو بھیج دیتے جن کی تعداد کا علم صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے۔ بجز ان انبیاء ورسل کے جن کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ مِنْھُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ وَمِنْھُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ﴾

(سورۃ المؤمن، آیت ۷۸)

ترجمہ: ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعضے تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے (اجمالاً یا تفصیلاً) بیان کیا ہے اور بعضے وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۶۱۸)

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے عالم کے لئے

قیامت تک کے واسطے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور آپ پر ایمان لائے بغیر کسی کو نجات حاصل نہیں ہوگی۔

جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ مَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا کہ ہم نے آپ کو پوری انسانیت کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہ ہم نے آپ کو دنیا جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

الغرض یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ پورے عالم میں جہاں بھی اللہ کا دین ہے اور خدا کے ماننے والے ہیں وہ سارا آپ کی نبوت کا فیض ہے اور آپ کی نورِ نبوت کی کرنوں سے سارا عالم روشن اور منور ہے۔ جس تک یہ روشنی نہ پہنچی اور وہ آپ کی نبوت پر ایمان نہ لایا اگرچہ وہ اللہ کے وجود اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو تب بھی اس کا کوئی قول و فعل اللہ کی بارگاہ میں معتبر نہیں۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللهِ الْاِسْلَامُ کہ معتبر دین اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف اسلام ہے۔ یعنی آپ کا لایا ہوا دین و مذہب ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ کہ جو اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کو اپنا دین بنانا چاہے گا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

اس شعر میں یہ نکتہ بھی مخفی ہے کہ پورے عالم میں جہاں بھی ایمان و اسلام کے لئے جس نوع کی بھی محنتیں ہو رہی ہیں خواہ وہ دعوت و تبلیغ کی شکل سے ہو یا تعلیم و تدریس اور اصلاح و تزکیہ کے قبیل سے اور جہاد و قتال کی لائن سے ہو یا تصنیف و تالیف اور وعظ و تقریر کی صورت میں ہو یہ تمام کی تمام محنتیں اور کوششیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ نبوت کا فیضان ہے۔

سب خدّامِ دین کو اُسی آفتاب و مہتابِ نبوت سے روشنی ملی ہے اور آپ ہی کی تعلیمات و ارشادات پوری اُمت کے خدّامِ دین کے لئے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی خدمتوں سے دینِ اسلام جہاں بھی پھیلے گا تو بلاشبہ اُس سب کو آپ ہی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔

اسی لئے اگر کوئی سرِمو آپ کی تعلیمات و ہدایات سے روگردانی کرے تو پھر اس کا وہ عمل عند اللہ مقبول نہیں ہوتا، اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ آپ کی نبوت کے صدقے ہمیں اسلام کی دولت میسر آئی اور اپنے خالق و مالک کے یہاں سرخروئی حاصل کرنا آپ ہی کے واسطے سے نصیب ہوا۔ اس لئے حضرتِ والا نے فرمایا کہ سارے جہان کا اسلام آپ کا فیضانِ نبوت ہے۔

مدحِ نبی اور اعترافِ عجز

کیا کہوں رفعتِ شانِ گنبد
کچھ نہیں دم ہے اخترؔ زباں میں

مکان کی محبت دراصل مکین کی محبت سے ناشی ہوتی ہے۔ دراصل رفعتِ شانِ گنبد سے اُس ہستی کی رفعتِ شان کی طرف اشارہ ہے جو اس گنبدِ خضراء کا مکین ہے یعنی ہمارے محبوب نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خلاصۂ شعر یہ ہے کہ میں ایک مخلوق ہوں، میری زبان مخلوق ہے، میری لغت مخلوق و محدود ہے تو بھلا اُس ذات کی مدح و ثنا میری محدود لغت اور قاصر و عاجز زبان کیا کرسکتی ہے کہ جس کی ثناء خود خالقِ جلّ وعلاء نے کی ہو، اس لئے ان مذکورہ اشعار میں جو کچھ ثناء گوئی ہوئی اُس سے آپ کی رفعتِ مقام کا بیان کماحقہٗ نہ تو ہوسکا اور نہ ہی اس کا دعویٰ ہے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کیا اثر تھا رسالت کی شاں میں

کیا تجلی تھی تیرے بیاں میں — نورِ سنت ہے کون و مکاں میں
کیا اثر تھا رسالت کی شاں میں — عبد و سلطاں کھڑے ایک صف میں
کس طرح سے مٹایا جہاں میں — فرق کالے و گورے کا تو نے
شانِ سلطانیت شُتر باں میں — یہ تھا تیری غلامی کا صدقہ
گل بداماں تیرے بوستاں میں — جس نے کانٹے بچھائے تھے دیکھا
کامراں ہے وہ دونوں جہاں میں — جو چلا تیرے نقشِ قدم پر
آپ تھے محفلِ اختراں میں — ہو قمر جیسے انجم میں روشن
کس طرح لائے اخترؔ بیاں میں — آپ کی شانِ بے انتہا کو

مشکل الفاظ کے معنی:۔ کون ومکاں: دنیا۔ شانِ سلطانیت: بادشاہوں والا مزاج۔ شُتر باں: اونٹ چرانے والے۔ گل بداماں: ...... بوستاں: باغ۔ کامراں: کامیاب۔ قمر: چاند۔ انجم: ستارے۔ محفلِ اختراں: یعنی اپنے اصحاب کی محفل میں۔

تجلی کون ومکاں کا راز

نورِ سنت ہے کون و مکاں میں
کیا تجلی تھی تیرے بیاں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکمل نظامِ حیات دے کر دنیا میں بھیجا، اس لئے زندگی کے ہر شعبے میں آپ کے طریقے اور آپ کی سنتیں ہماری رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔

پیدا ہونے سے مرنے تک اور اس سے ماقبل اور مابعد کے لئے دینِ اسلام میں مخصوص ہدایات اور تعلیمات موجود ہیں جو ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ جو بندۂ خدا سنتوں کی اتباع کر کے زندگی گزارتا ہے تو اس کی زندگی نورِ سنت سے منور ہو جاتی ہے اور اس کے قلب وجگر انوارِ سنت سے روشن ہو جاتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہدایت کے راستے کو سنت کی راہوں میں منحصر کر دیا ہے اور اپنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو سنتِ نبوی کی اتباع میں منحصر فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ کہ اے اللہ ورسول کے محبت کے دعویدارو! اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو میرے نبی کی اتباع کرو، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع معیارِ عشقِ خدا ورسول ہے۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خواب کہا ہے ؎

دل میں لگا کے ان کی لو کردے جہاں میں نشرِ ضوء
شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

ضوء سے مراد سنت کی روشنی ہے۔ اس لئے جتنا آپ کی سنتوں کا چلن ہوگا اتنے کون ومکان روشن ہوں گے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گفتگو دن ورات کی باتیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب کو مزکّی ومجلّی کر دیتی تھیں جن کانوں میں آپ کی باتیں پہنچی ان کے قلوب کو ایسی تجلّی حاصل ہوئی کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو لکھ دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی وَکَانُوْٓا اَحَقَّ بِھَا وَاَھْلَھَا کہ اللہ نے کلمۂ تقویٰ کو اس پر لازم کر دیا اور وہ اس کے مستحق اور اس کے اہل تھے۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ اپنے تو اپنے غیر بھی جب آپ کی گفتگو سنتے تھے تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اسی بیان وتربیت کا اثر تھا کہ جس نے دُشمنوں کو دوست بنالیا۔ اس لئے آج بھی اہلِ ایمان اپنے قلب وجگر اور ظاہر وباطن کو روشن کرنا چاہیں تو سنتوں کی پابندی کریں۔

رسالتِ محمدی ﷺ کی ایک خاص شان

کیا اثر تھا رسالت کی شان میں عبد و سلطاں کھڑے ایک صف میں
کس طرح سے مٹایا جہاں میں فرق کالے و گورے کا تو نے

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیماتِ سماویہ کا یہ اثرِ خاص تھا کہ جس نے غلام اور آقا کو اللہ کے سامنے بندگی پیش کرنے میں ایک صف میں لا کھڑا کیا اور فضیلت و برتری کا مدار صرف اللہ تعالیٰ کے مقرب و محبوب ہونے پر رکھا گیا جس میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق و امتیاز پیشِ نظر نہیں اور دنیا کی تمام نسبتیں محض ظاہری نظم و انتظام کے لئے تو روا رکھی گئیں۔ لیکن اللہ کے مقرب اور محبوب ہونے میں ان کو کسی طرح کا دخل نہیں، اس لئے بادشاہ اور اس کا خادم، آقا اور اُس کا غلام سب ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، یہ صرف تعلیماتِ نبویہ کا اثر ہے ورنہ دنیا میں بادشاہ اپنی برتری اور بڑائی اور عزت و عظمت میں اپنے کو غلام سے بدرجہا بڑھ کر تصور کرتا ہے۔ غلام کی تحقیر و تذلیل اور اُس کے ساتھ بے جا سلوک روا سمجھتا ہے تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ کہلائے گا کہ آپ کی تعلیمات کے اثر سے بادشاہوں کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی اور اپنی عاجزی و پستی اس درجے قائم ہو جائے کہ ان کو غلام کے برابر کھڑے ہونے میں کوئی عار محسوس نہ ہو اور نہ کسی گورے کو کالے سے نہ ہی عربی کو عجمی سے اپنی فضیلت و برتری کا احساس باقی رہے۔

جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے جانثار صحابہ رضی اللہ عنہم کے عظیم مجمع میں خاص الوداعی نصیحتوں میں یہ نصیحت فرمائی کہ:

﴿الا لا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى﴾

(مسند احمد، ج ۵، ص ۴۱۱، دار الباز للنشر والتوزیع، مکۃ المکرمۃ)

اے میرے صحابہ! نہ تو کسی عربی کو عجمی پر فضیلت، نہ عجمی کو عربی پر اور نہ گورے کو کالے پر، نہ کالے کو گورے پر مگر تقویٰ کے ذریعہ۔

جو اس میں مبتلا ہو تو شانِ نبوت نے اس کو عصبیۃ جاھلیۃ میں سے قرار دے کر اس کے اس عمل کو ناپسندیدہ فرمایا جس عصبیت جاہلیت کا تحقق عموماً ان چار شکلوں میں ہوتا ہے۔ قوم وطن اور رنگ و زبان لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے دل و دماغ میں ایسی اُخوتِ ایمانی قائم فرما دی کہ یہ تمام عصبیتیں حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور آپ کے ماننے والوں کے دلوں سے بالکل ختم ہو گئیں۔ ایک مؤمن دوسرے مؤمن بھائی کے لئے بالکل حقیقی بھائی کی طرح بن گیا، اس لئے بلا شبہ اس کو آپ کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

حضور ﷺ کی غلامی سے صحابہ کو کیا ملا

یہ تھا تیری غلامی کا صدقہ
شانِ سلطانیت شُتر باں میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ شریف کی جس قوم میں مبعوث فرمایا وہ اس قدر جاہل اور اجڈ اور تہذیب وتمدن سے عاری قوم تھی کہ اُس دور میں اس پر کوئی حکومت کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وہ اونٹوں کو چرانے والے جنگ وجدل کے عادی اور تعلیم وتربیت سے بے بہرہ اور آدابِ زندگی سے یکسر ناآشنا لوگ تھے جن کے دستورِ حیات میں عورتوں کو جینے کا حق ہی نہ تھا اور جو معمولی معمولی باتوں پر صدیوں تک لڑتے رہتے تھے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس قوم میں بعثت ہوئی اور آپ نے ان کو تعلیماتِ الٰہیہ سے روشناس کرا کر اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی کا سبق پڑھایا اور جہالت دور فرما کر ان کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کے دلوں میں خدائے وَحْدَهٗ لاَ شَرِيْكَ لَه پر ایمان ویقین کی فضاء قائم کی اور ان کو رہنے سہنے، مرنے جینے اور زندگی گزارنے کے عادات و اطوار سکھائے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پورے طور پر ان کو پہنچایا تو پھر یہی قوم بارگاہِ الٰہی میں ایسی معزز ومقبول قرار پائی کہ ان کی مقبولیت ومحبوبیت کا حق تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ اعلان کیا اور اپنی رضا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا سرٹیفکیٹ (Certificate) ان کو عطا فرمادیا۔

صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ صحابہ کو یہ شانِ سلطانیت اور مقامِ محبوبیت کیسے اور کیونکر ملا؟ اور اُن میں ایسی بے مثال عدل وانصاف کے اصولوں پر مبنی حکومت کرنے والے بادشاہ وسلاطین کیسے ہوئے کہ جن کے رعب و دبدبے سے اس وقت کی حکومتوں کے مہذب اور تعلیم یافتہ کہلانے والے امراء وسلاطین کانپ اُٹھتے تھے اور اُن کے تذکرے ہی سے ان کے دلوں پر رعب قائم ہو جاتا تھا۔

بات دراصل یہی سامنے آئے گی کہ انہوں نے اللہ کی بندگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو دل و جان سے قبول کیا اور اُس کی خاطر اپنے تن، من، دھن کی بازی لگادی اور ہر طرح کی قربانیوں میں آگے آتے رہے تو حق تعالیٰ نے ان کو وہ عزت وسربلندی عطا فرمائی جو اللہ تعالیٰ کی سنت تھی، ہے اور رہے گی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور جیسا کہ فرمایا گیا فَلَنْ يَّصْلُحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا کہ اس اُمت کا آخر انہی باتوں سے درست ہوگا جن سے اس اُمت کا اوّل درست ہوا ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

آپ ﷺ کے خُلقِ عظیم کا اثر

جس نے کانٹے بچھائے تھے دیکھا
گل بداماں تیرے بوستاں میں

سابقہ کتبِ سماویہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں اور دُشمنوں سے دوستوں جیسا سلوک کرتے ہیں اور یہ پوری اسلامی معاشرت کی جان لبِ لباب اور نچوڑ ہے کہ ہماری ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے بلکہ راحت وآرام پہنچے اور اگر کسی سے ہم کو تکلیف پہنچ جائے تو ہم اُس سے اس کا بدلہ نہ لیں بلکہ اس کو آرام پہنچانے کی فکر میں لگیں جو ہمارے راہوں میں کانٹے بچھائیں اور ہم پر پتھر برسائیں، ہم ان کی راہوں میں پھول بچھائیں اور پھول کی بارش کریں جو ہمیں گالی دیں ہم اُسے بدلہ میں دعائیں دیں۔ کیا ہی خوب کہا۔

گالیاں عمر بھر جن سے کھاتے رہے
آپ ان کے لئے دُکھ اُٹھاتے رہے

حقیقت یہ ہے کہ تمام اولیاء اللہ کے اندر یہ صفت بھرپور طریقے سے پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ملاّ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابرار یعنی نیک لوگوں کی تعریف ہی اس طرح کی ہے:

﴿ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْذُوْنَ الذَّرَ وَلَا يَرْضَوْنَ الشَّرَ ﴾

(عمدةُ القاري شرح صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم المسلمون)

کہ جو خود تکلیف سہتے رہتے ہیں اور نقصان اُٹھاتے رہتے ہیں، مگر چیونٹی تک کو بھی تکلیف نہیں دیتے۔ اس حسنِ معاشرت کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کل تک ان کے دُشمن تھے وہ دوست بن جاتے ہیں جو ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے وہ آج اُن پر پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک کا اعلان:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴾

(سورة حمٓ سجدة، آيت: ۳۴)

ترجمہ: آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے پھر یکا یک (آپ دیکھیں گے کہ) آپ میں اور جن شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۶۴۹)

اس پر بزرگوں کے بہت سارے واقعات ہیں کہ جن میں ان کا حسنِ سلوک اپنے دُشمنوں کے ساتھ کرنے پر وہی دُشمن تائب ہو کر زندگی بھر کے لئے ان کے غلام اور دوست بن گئے۔

اتباعِ سنت فلاحِ دو جہاں کی ضامن ہے

جو چلا تیرے نقش قدم پہ
کامراں ہے وہ دونوں جہاں میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اللہ تعالیٰ نے دونوں جہاں کی کامیابیوں کو مضمر رکھا ہے۔ بدونِ اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں چین وسکون نصیب ہوسکتا ہے اور نہ آخرت میں۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں محبوبیت ومغفرت کا وعدہ اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾

(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ (لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو۔ (معارف القرآن، ج:۲،ص:۵۴)

اور ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت: ۷۱)

ترجمہ: جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔ (معارف القرآن، ج:۷،ص:۲۳۸)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قَالُوْا وَمَنْ یَّاْبٰی قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی﴾

(صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء، ج:۲،ص:۱۰۸۱)

میری تمام اُمت جنت میں داخل ہوگی سوائے ان کے جنہوں نے اعراض کیا۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا: یارسول اللہ! اعراض کرنے والا کون ہے؟ تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی تو تحقیق اُس نے اعراض کیا۔ (اور اس اعراض کی وجہ سے وہ جہنم کا مستحق قرار پایا۔) حضرتِ والا نے کیا ہی خوب فرمایا ہے ؂

نقشِ قدم نبی ﷺ کے ہیں جنت کے راستے
اللہ ﷻ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لئے نبی بنا کے بھیجے گئے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو

ایسے طریقے زندگی گزارنے کے عطا فرمائے اور ایسی سنتیں آپ کے لئے مشروع فرمائیں جو بلاتفریقِ قوم و وطن اور بلا امتیازِ رنگ و نسل ہر دور اور ہر زمانے کے لئے کامیابی و کامرانی کی ضامن ہے۔ اس لئے بعض جاہل اور نادان مسلمان اس دور میں سنتوں پر چلنے کو مشکل قرار دے کر چھوڑ بیٹھتے ہیں اور بزبانِ حال گویا کہ وہ یوں دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ اس زمانے میں سنتوں پر عمل کرنے سے کام نہیں چلے گا اور یہ تو پہلے زمانے کی چیزیں ہیں اور گویا وہ اپنے عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کو اس دور کے لئے ناکافی اور غیر ضروری قرار دیتے ہیں جو سراسر ضلال اور گمراہی اور باعثِ شقاوت و بدبختی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾

اور جو اللہ و رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

ہو قمر جیسے انجم میں روشن
آپ تھے محفلِ اختراں میں

اس شعر کی تشریح سمجھنے کے لئے اس سے پہلی نظم کا شعر: ''آپ کا مرتبہ اس جہاں میں'' کے تحت مراجعت فرمالیں۔

آپ کی شانِ بے انتہا کو
کس طرح لائے اختؔر بیاں میں

دیکھئے گزشتہ نظم کا یہ شعر: ''کیا کہوں رفعتِ شانِ گنبد''

سوئے طیبہ چلے جب نبی ﷺ کے قدم

میری قسمت کہاں یہ طوافِ حرم — جس زمیں پر چلے تھے نبی کے قدم
جس سے چپکے تھے کل سینۂ انبیاء — میرے سینے کو حاصل ہے وہ ملتزم
معجزہ ہے کہ آلاتِ پیمانہ تھے — وسطِ دنیا میں ہے کعبۂ محترم
اور بنوایا گھر اپنا یوں مختصر — سہل ہو تاکہ سب کو طوافِ حرم
ورنہ مالک اگر گھر بناتا بڑا — کھا کے غش گرتے سب زائرانِ حرم
اپنے کعبہ کا پھیرا کیا مختصر — صاحبِ بیت کی ہے یہ شانِ کرم
گو حرم کے پہاڑوں پہ سبزہ نہیں — ہیں مگر دوستو! پاسبانِ حرم
ورنہ حاجی درختوں میں بیٹھے ہوئے — کیمرے میں لیا کرتے باغِ حرم
ربّ کعبہ سے بھی اور کعبہ سے بھی — دور کردیتے ہم کو جبالِ حرم
ان پہاڑوں پہ بھی حفظِ توحید کا — ربّ کی جانب سے ہے انتظامِ حرم
یہ بھی ہجرت کا اک رازِ تکوین ہے — ورنہ روضہ بھی ہوتا جوارِ حرم
قلبِ عاشق کے دو ٹکڑے ہوتے یہاں — درمیانِ حرم روضۂ محترم
جاکے طیبہ میں دے سبز گنبد پہ جاں — اور مکہ میں ہوجا فدائے حرم
بت وطن کے بھی ہجرت سے سب گر گئے — سوئے طیبہ چلے جب نبی کے قدم
آپ کے گھر میں اخترؔ کی یہ حاضری — ایک نااہل پر ہے خدا کا کرم

مشکل الفاظ کے معنی:۔ آلاتِ پیمانہ: پیمائش کرنے کے آلات۔ سہل: آسان۔ غش کھانا: بے ہوش ہونا۔ زائران: زیارت کرنے والے۔ صاحبِ بیت: اللہ تعالیٰ۔ سبزہ: ہریالی۔ پاسبان: حفاظت کرنے والا۔ جبال: پہاڑ۔ حفظِ توحید: وحدانیت کی حفاظت۔ رازِ تکوین: یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ جوار: پڑوس۔ بت وطن: یعنی وطن کی محبت۔ سوئے طیبہ: مدینہ شریف کی طرف۔

اے خوشا! قسمت میری

میری قسمت کہاں یہ طوافِ حرم
جس زمیں پر چلے تھے نبی کے قدم

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴾
(سورۃ الحج آیت: ۲۷)

ترجمہ: اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چل کر اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آئیں راہوں دور سے۔ (معارف القرآن، ج:۶ ص:۲۵۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلان کا اثر ہے کہ ہر چہار اطرافِ عالم سے لوگ جوق در جوق بیت اللہ کی طرف رُخ کرتے ہیں اور گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس آواز پر جو اللہ تعالیٰ نے اُن تک پہنچائی وہ لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ ادوارِ سابقہ میں جبکہ بیت اللہ تک پہنچنا بہت ہی مشقت اور تکلیف کا باعث تھا اور لمبے لمبے سمندری سفر طے کر کے آنا پڑتا تھا مگر پھر بھی ہر زمانے میں لوگ بڑی کثرت کے ساتھ بیت اللہ پر حاضری دے کر حج بیت اللہ سے مشرف ہوتے تھے۔ یہ درحقیقت اللہ کے بندوں کی خوش نصیبی اور سعادت کا حصہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے گھر تک بلالیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

کیونکہ یہ بیت اللہ احکم الحاکمین اور ملک الملوک کا گھر ہے، اس لئے اُس احکم الحاکمین کا اپنے بے کس بے بس ماءِ مھین سے وجود میں آنے والے بندے کو اپنے در پر حاضری کی سعادت بخشنا یہ صرف اُس اللہ کے فضل ہی سے ممکن ہے اور بلاشبہ خوش نصیبی اور سعادت مندی کی ایک علامت اور پہچان ہے۔

محض روپیوں، پیسوں اور دولت کی بھرمار ہو جانے سے یہ ضروری نہیں کہ بندہ وہاں حاضری دے سکے اور اللہ کے گھر کے طواف سے مشرف ہو۔ چنانچہ کتنے ہی اغنیاء و روٴساء دنیا میں رہ کر اس حسرت کو اپنے دل میں لئے چلے جاتے ہیں مگر انہیں یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔

اس لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم پہلے ہی شعر میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل خاص کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ مجھ جیسے ناکارہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی سرزمین پر اپنے گھر بلا کر اُس کے طواف کرنے کی سعادت بخشی، یہ میری خوش قسمتی اور سعادت ہے ورنہ مجھ میں کیا استحقاق اور کون سی خوبی اور کمال کہ میں یہاں پہنچ کر اللہ کے گھر کا طواف کروں۔

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو شکر کی حقیقت یہی ہے کہ بندہ دل سے اس بات کا معترف ہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو نعمتیں میسر آئی ہیں میں ان کا مستحق نہیں ہوں بلکہ بلا استحقاق اللہ نے عطا کی ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ شیطان نے جب حضرتِ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور حضرتِ آدم علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے بلند و برتر ہونے کا دعویٰ اور استحقاق پیش کیا کہ آدم مٹی سے بنے ہیں اور میں آگ سے بنا ہوں اور آگ کی خصوصیت اونچا اور بلند ہونا ہے اور مٹی کی خصوصیت نیچا اور پست ہونا ہے۔ تو میں اس کا مستحق ٹھہرا کہ آدم مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ اس کو قرآن نے ''استکبار'' سے تعبیر کیا اور شیطان کو متکبر فرمایا۔

یاد رکھئے! تشکر اور تکبر میں تضاد ہے جو متکبر ہوگا وہ شاکر نہیں ہوسکتا اور جو شاکر ہوگا وہ متکبر نہیں ہوگا، اس لئے ہمیشہ ہر حاصل ہونے والی خیر اور بھلائی کو بلا استحقاق محض اللہ کا فضل و کرم سمجھنا چاہیے۔

جیسا کہ حضرت نے اس عظیم نعمت (طوافِ بیت اللہ) کو محض اپنے اوپر اللہ کا فضل اور احسان قرار دیا تو اس کے نتیجے میں اللہ تبارک و تعالیٰ بندے پر اپنی نعمتوں میں مزید اضافہ فرماتے ہیں جس کا وعدہ قرآن پاک میں ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ.

مقامِ ملتزم اور آداب

جس سے چپکے تھے کل سینۂ انبیاء
میرے سینے کو حاصل ہے وہ ملتزم

بیت اللہ کا وہ حصہ کہ جو بیت اللہ کی چوکھٹ اور حجرِ اسود کے درمیان میں ہے ملتزم کہلاتا ہے اور یہ دعا کی قبولیت کے مقامات میں سے ایک اہم ترین مقام ہے۔ اس لئے حجاج اور معتمرین وہاں پر حاضر ہو کر دعا کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس میں شک بھی کیا ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ایسا مقام ہے جہاں انبیاءِ کرام علیہم السلام اور اولیاءِ عظام اور اُمت کے اسلاف و اکابر چمٹ کر دعائیں مانگتے تھے اور اپنی مرادوں اور مقصودوں میں کامیاب ہوتے تھے۔

البتہ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آج کل عام طور پر لوگ ملتزم پر خوشبو لگا دیتے ہیں، اس لئے احرام کی حالت میں نہ تو ملتزم کو ہاتھ لگائیں اور نہ چمٹیں بلکہ ملتزم کے سامنے جتنا قریب ممکن ہو خوب الحاو زاری سے دعا کریں۔ ہاں! اگر آپ احرام کی حالت میں نہ ہوں تو اس وقت ملتزم سے چمٹ کر خوب دعائیں مانگنی چاہیے لیکن اس میں بھی یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ کسی مسلمان بھائی کو اپنی جانب سے ایذاء پہنچانا یا کسی نامحرم عورت سے اپنے بدن کو ملانا باعثِ حرمان و خسران ہے۔ آج کل کثرت سے ایسا دیکھنے میں آرہا ہے کہ لوگ دوسرے کی تکلیف کی پرواہ کئے بغیر اور عورتوں سے دھکم پیل ہو جانے کی پرواہ کئے بغیر ملتزم سے چمٹنے کو بڑی نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ ایذائے مسلم اور نامحرم عورت سے بدن کا لگانا یہ دونوں بدترین گناہ ہیں تو محض ایک مستحب پر عمل کرنے کے

لئے حرام کا ارتکاب قطعاً جائز نہیں۔ اس لئے اگر ان دو باتوں کا خیال کر کے بآسانی ملتزم سے چمٹنا میسر ہو تو اس سعادت سے ضرور بہرہ ور ہونا چاہیے جس کی آسان صورت یہی ہے کہ ایسے اوقات کا پتہ لگائیں جن میں ملتزم کے پاس زیادہ ازدحام نہیں ہوتا اور اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

کعبہ کا وسطِ دنیا میں ہونا آپ ﷺ کا معجزہ ہے

معجزہ ہے کہ آلات پیمانہ تھے
وسط دنیا میں ہے کعبۂ محترم

یہاں سے حضرتِ والا خانۂ کعبہ اور اس کے اطراف کے جائے وقوع اور اندازِ وقوع اور کیفیت وقوع کے حکم ومصالح کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں جن حکم ومصالح پر غور کرنے کے بعد ہمیں یہ بات روزِ روشن کی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ واقعی یہ گھر علیم وحکیم ذاتِ عالی کا گھر ہے۔

لیکن اللہ کا طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں پر بہت سے اسرار وحکم کھول دیتے ہیں اور اپنے احکام کے مصالح وفوائد ان کے قلوب پر القا فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ مختلف احادیثِ مبارکہ میں یہ مضمون مذکور ہے۔ چنانچہ جن حکمتوں کا حضرتِ والا تذکرہ فرما رہے ہیں وہ اسی طرح حضرتِ والا کے قلبِ مبارک پر اللہ تعالیٰ نے القاء فرمائی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ان مصالح وحکم کا انحصار بس انہی چند پر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ہر معاملے اور فیصلے کے پیچھے اس قدر حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں کہ جن کا علم صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرتِ والا ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ جس خانۂ کعبہ کو اہلِ اسلام کا قبلہ قرار دیا گیا اور جس کی جانب رُخ کرنا ہر نماز میں فرض اور اس کا طواف ادائیگیٔ حج کے لئے لازم قرار دیا گیا تو اس خانۂ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے پوری روئے زمین کے وسط میں بنایا ہے۔ اگر چاروں طرف سے زمین کی پیمائش کی جائے تو بیت اللہ کا جائے وقوع بالکل سینٹر (Centre) اور وسط میں ہے۔

صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں نہ تو جدید نوعیت کے آلات پیمائش تھے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی تعلیمی ادارے سے پڑھ کر اس نوع کے مسائل کو باقاعدہ سیکھے ہوئے تھے بلکہ تاریخی دلائل سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے سامنے رہ کر اس سے کچھ نہیں پڑھا۔ اسی لئے آپ کا لقب اُمّی ہے اور یہی اُمّی ہونا آپ کے لئے باعثِ شرف وعزت اور آپ کی نبوت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل تھا۔ جس سے ہر ذی عقل وشعور بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اُمّی ہونے کے باوجود آپ کو اس قدر علوم عطا کیا جانا کہ قیامت تک آنے والے ذہین وفطین انسان ان کی شرح وبسط کرنے میں اپنی عمریں خرچ کر ڈالیں مگر پھر

بھی حق ادا نہ ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی ایک واضح دلیل ہے، ز کی کیفی نے خوب کہا ہے ۔

عمر گزری ترے جلووں کا فسانہ کہتے
اور اب تک ترے جلووں کا بیاں باقی ہے

لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ وقبلہ خود آپ کی نبوت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل اور معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے ایک غیر مسلم محقق ریسرچ کرنے والے (Researcher) نے اپنی تحقیق میں یہ بات پیش کی ہے کہ پوری دنیا کا بالکل وسط اور سینٹر مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا گھر چھوٹا کیوں؟

اور بنوایا گھر اپنا یوں مختصر
سہل ہو تا کہ سب کو طوافِ حرم

اس شعر میں حضرتِ والا بیت اللہ کے مختصر ہونے کی حکمت بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خانۂ کعبہ کو اس لئے مختصر فرمایا تاکہ میرے بندوں کے لئے میرے گھر کا طواف آسان ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ دینی احکام دے کر اپنے بندوں کو حرج وتنگی میں ڈالنا نہیں چاہتے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی حرج اور تنگی نہیں رکھی اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾

(سورۃ النساء، آیت: ۲۸)

ترجمہ: اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے، اور انسان بنا ہے کمزور۔ (معارف القرآن، ج:۲، ص:۳۷۴)

اس لئے حدیثِ پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ اَمَّ قَوْمًا فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ وَالْمَرِيْضَ وَذَالْحَاجَةِ﴾

(مسند احمد بن حنبل، ج:۳، ص:۲۱۲، دار النشر مؤسسۃ قرطبۃ)

جو کسی قوم کی امامت کرے تو مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز میں تخفیف کرے، آسانی کرے کیونکہ ان میں ضعیف، عمر رسیدہ، بیمار اور ضرورت مند لوگ ہوتے ہیں۔

ورنہ مالک اگر گھر بناتا بڑا — کھا کے غش گرتے سب زائرینِ حرم
اپنے کعبہ کا پھیرا کیا مختصر — صاحبِ بیت کی ہے یہ شانِ کرم

صاحبو! میرا مقصود ان آیات اور حدیث سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑے رحیم ہیں اور مشروعیتِ احکام میں اپنے بندوں کے ضعف وکمزوری کا لحاظ فرماتے ہیں، اس لئے اس پسِ منظر میں اس حکمت کا

سمجھنا آسان ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے گھر کو بڑا بناتے تو پورا طواف تو کیا طواف کا ایک پھیرا بھی اتنا مشکل ہوتا کہ یہ ضعیف وکمزور انسان غش کھا کر گر جاتا، اس لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا فضل وکرم فرمایا کہ اپنے گھر کو مختصر بنایا تاکہ بیت اللہ کا طواف سہل اور آسان ہو جائے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرتِ والا سے یوں سوال کیا کہ حضرت! اللہ تعالیٰ کا گھر تو بہت بڑا ہونا چاہیے کیونکہ جو جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے وہ اپنا محل بھی اتنا ہی عظیم الشان اور بڑا بناتا ہے۔

چنانچہ سلاطینِ دنیا بڑے طویل وعریض رقبے میں اپنے شاہی محلات تعمیر کرتے ہیں۔ اس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ارشاد فرمایا کہ میاں! اگر اللہ تعالیٰ اپنا گھر بڑا بنا دیتے اور مانو کہ کراچی سے جدہ تک کے طویل وعریض رقبے میں اللہ کا گھر ہوتا تو طواف کے ایک ہی پھیرے میں تمہاری کمر ٹوٹ جاتی۔ اسی کو حضرتِ والا نے شعر میں فرمایا ؎

سادگیٔ حرم کی جغرافیائی صورتحال

گو حرم کے پہاڑوں پہ سبزہ نہیں ہیں مگر دوستو! پاسبانِ حرم
ورنہ حاجی درختوں میں بیٹھے ہوئے کیمرے میں لیا کرتے باغِ حرم
ربِ کعبہ سے بھی اور کعبہ سے بھی دور کردیتے ہم کو جبالِ حرم
ان پہاڑوں پہ بھی حفظ توحید کا رب کی جانب سے ہے انتظامِ حرم

یہاں سے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ حرم کے اردگرد کے پہاڑوں کی جغرافیائی (Geographical) صورتحال پر خاص حکیمانہ انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں جو اللہ نے حضرتِ والا کے قلبِ مبارک پر اس کی خاص حکمت ومصلحت القاء فرمائی۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پہاڑوں کو جو حرم کے اردگرد ہیں سیدھا سادہ بنایا اور سرسبز وشاداب مناظر اور حسین اشجار وانہار سے بھرپور خوبصورت، دلکش نظارے سے آراستہ وپیراستہ نہیں کیا اور نہ ان کو دنیا کے بہت سے حسین پہاڑوں کی طرح حسن وخوبصورتی کا پیکر بنایا اور دل کو لبھانے والی سینری (Scenery) بنایا کیونکہ اگر ایسا کر دیا جاتا تو پھر لوگ حرم میں آکر وہاں کے سرسبز وشاداب مناظر کی تصویر کشی میں اپنے قیمتی اوقات کو ضائع کرتے اور اُس خانۂ کعبہ میں پہنچ کر بھی جو کہ مرکزِ توحیدِ خداوندی ہے اس سے اپنے اللہ کی یاد اور اس کے تذکروں کو چھوڑ کر ان پہاڑوں کے رنگ برنگ نظاروں میں کھوئے رہتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اللہ کے گھر میں آکر اللہ سے اور کعبہ میں آکر ربِ کعبہ سے دور ہو جاتے، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے گھر کے اردگرد کو ظاہری زیبائش وآرائش سے خالی رکھا تاکہ دل ایک اکیلے اللہ کی طرف رہے جو کہ ایک سچے موحد اور مؤمن بندے کی شان ہے تو گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان پہاڑوں کو ظاہری خوبصورتی اور رونق سے خالی کر کے اپنے

بندوں پر بڑا فضل فرمایا اور ہماری حفاظتِ توحید کا بھرپور انتظام کیا۔

جبکہ ہر مؤمن کو حرم کے یہ پہاڑ انتہائی عزیز اور محبوب ہوتے ہیں، اسی لئے قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے شعائر اللہ کی تعظیم کو مؤمن کے ایمان اور اس کے تقویٰ کی نشانی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾

(سورۃ الحج، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۲۶۱)

اس لئے حرم کا ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی پاکی اور بزرگی کا ترجمان ہے۔ اسی لئے حدودِ حرم میں نیکی کا اجر و ثواب بڑھا دیا جاتا ہے اور گناہ پر سزا بھی بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسا کہ "**مُعلِّم الحجّاج**" کے مصنف صفحہ: **۳۱۳** پر فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اگر میں طائف میں پچاس گناہ کروں وہ مکہ مکرمہ میں ایک گناہ کرنے سے میرے نزدیک اچھے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کسی شہر میں صرف ارادے پر عمل کرنے سے پہلے مؤاخذہ نہیں ہوتا لیکن مکہ مکرمہ میں ارادے پر بھی مواخذہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

(سورۃ الحج، آیت: ۲۵)

ترجمہ: اور جو اس میں چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے، اسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک۔

(معارف القرآن، ج:۶، ص:۲۵۱)

صاحبو! حرم، حدودِ حرم اور جبالِ حرم ان سب کی تعظیم و احترام مؤمن پر لازم اور ضروری ہے۔ تقریرِ بالا سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان پہاڑوں کو ظاہری زیب و زینت سے خالی رکھنے کا راز خود بندوں کے فوائد و مصالح کا لحاظ رکھنا ہے تاکہ زائرینِ حرمِ پاک کلی طور پر یکسو ہو کر اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ رہیں اور اللہ کے گھر میں رہ کر قلب و نظر کا محور و مرکز بس ایک اکیلے اللہ کی ذات ہو۔

ہجرت کا ایک تکوینی راز

یہ بھی ہجرت کا اک رازِ تکوین ہے　　ورنہ روضہ بھی ہوتا جوارِ حرم
قلبِ عاشق کے دو ٹکڑے ہوتے یہاں　　درمیانِ حرم روضۂ محترم
جا کے طیبہ میں دے سبز گنبد پہ جاں　　اور مکہ میں ہوجا فدائے حرم

حضرتِ والا دامت برکاتہم یہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمانے کا ایک تکوینی راز بیان فرمارہے ہیں جو کہ بالکل وہبی اور الہامی ہے۔ احقر راقم السطور نے اس راز کو نہ کبھی کسی سے سنا اور نہ کسی کتاب میں نظر سے گزرا۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے مدینے ہجرت فرمانے کا حکم اس لئے دیا تا کہ آپ کے بعد جب لوگ بیت اللہ پر حاضری دیں تو ان کے دل و دماغ پر انوارِ بیت اللہ چھائے رہیں اور وہ پورے طور پر یکسوئی کے ساتھ اللہ کے گھر کے طواف کرنے میں مشغول رہ کر اپنے جذباتِ محبت وعقیدت بارگاہِ ربّ العزت میں پیش کرتے رہیں اور خدا کا گھر اس کو خدا کی یاد میں منہمک رکھے اور گھر کے سامنے کھڑے ہو کر گھر والے کی یاد سے دل و دماغ کو معمور رکھے اور اس کا قلب کسی دوسری جانب مائل و راغب ہو کر منقسم نہ ہو جبکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت نہ فرماتے تو آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کا روضہ (قبرِ مبارک) یہاں حرمِ مکی میں ہوتا تو جب آپ کے عشاق یہاں حاضر ہوا کرتے تو ان کے جذباتِ محبت وعقیدت دو حصوں میں بٹ کر رہ جاتے اور قلب وجگر کے دو ٹکڑے ہوتے جس کو حضرت یوں فرماتے ہیں کہ ''درمیانِ حرم اور روضۂ محترم'' قلبِ عاشق کے دو ٹکڑے ہو جاتے نہ تو وہ پوری یکسوئی کے ساتھ دربارِ رسالت میں گنبدِ خضراء پر فدا ہو پاتا اور نہ ہی تجلیاتِ الٰہیہ اور بیت اللہ کے انوارات سے پورے طور پر متجلی اور مستفید ہو پاتا کیونکہ ایک مسلمان کے لئے یہ دونوں اس کے جذباتِ محبت وعقیدت فدا کرنے کے مرکز ہیں کہ ہر مؤمن کے دل میں ان سے صرف تعلق ہی نہیں بلکہ انتہائی درجے کی محبت اور گہری وابستگی پائی جاتی ہے، اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے کہ دونوں مقامات کو ایک مخصوص فاصلے پر رکھا یہ ایک ایسا فطری و ذوقی معاملہ ہے کہ جس کو ہر مؤمن بغیر کسی دلیل کے بآسانی محسوس کر سکتا ہے۔

وطن کی محبت پر اللہ کے حکم کو ترجیح

بت وطن کے بھی ہجرت سے سب گر گئے
سوئے طیبہ چلے جب نبی ﷺ کے قدم

اس شعر میں ہجرت کی ایک دوسری حکمت کو ذکر کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ (زاد ھمَا اللہُ شرفًا و عظمةً) کی طرف ہجرت فرما کر اُمت کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ وطن پرستی کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ اسلام وطنی عصبیت کو عصبیۃ جاہلیۃ قرار دیتا ہے۔ صرف اخوت فی الاسلام اور تناصر علی الحق (حق پر ایک دوسرے کی مدد کرنا) کا قائل ہے اور انصارِ مدینہ کے ساتھ ہجرت کے بعد پوری زندگی گزار کر آپ نے اُمت کے لئے ایک بہترین اُسوۂ چھوڑا کہ وطن کی محبت اگرچہ فطری امر ہے لیکن اللہ کے حکم اور اس کے دین کے تقاضوں کی راہ میں آڑ نہ بننی چاہیے۔ ورنہ اُسے لاَ الٰہ الاَّ اللہ کی دو دھاری تلوار سے ذبح کر دو تا کہ وہ راہِ خداوندی میں رکاوٹ نہ بنے اور جب بھی دین کی خاطر ترکِ وطن کی نوبت آئے تو وطن کی محبت کو پیچھے ڈال دے۔

حاضریٔ حرم، محض اللہ کا کرم

آپ کے گھر میں اخترؔ کی یہ حاضری
ایک نااہل پر ہے خدا کا کرم

حضرتِ والا نے اس نظم کی ابتداء و انتہاء دونوں میں اپنے نااہل ہونے اور حاضریٔ حرمین شریفین کی نعمتِ عظمیٰ کے غیر مستحق ہونے کے باوجود اپنے اللہ کی عظیم نعمت اور اس کے فضل و کرم کو ذکر فرمایا ہے کہ اس نعمت کے حصول کا یہ بندۂ ناکارہ بالکل مستحق نہ تھا بس اللہ نے فضل فرما کر مجھے یہ سعادت بخش دی۔

قرآن میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ کہ تمہیں جو بھی نعمت حاصل ہورہی ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے: مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ کہ تمہیں جو بھی بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تمہارے اپنے کمال کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

حضرت تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بندے کو ہر وقت یہ سوچنا چاہیے کہ جو بھی خوبی مجھ کو حاصل ہوئی ہے تو اولاً تو یہ میری ذاتی نہیں بلکہ محض عطائے الٰہی ہے۔ ثانیاً اس کے قبولیت کی کوئی ضمانت اور گارنٹی (Guarantee) نہیں، شاید بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو یا نہ ہو۔ ثالثاً اخیر تک اس پر بقاء اور ثباتِ قدمی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ جب یہ تین باتیں ذہن میں رہیں گی تو ان شاء اللہ عجب و کبر سے حفاظت رہے گی، اس لئے اہل اللہ اس سے غافل نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ اخیر میں بھی حضرت نے ارشاد فرمایا کہ حاضریٔ حرمین شریفین کی نعمت محض فضلِ خدا تعالیٰ ہے۔

شرقی ہوں یا غربی، دل مرا حجازی ہے

دل تڑپتا ہے میرا سینے میں
ہائے پہنچوں گا کب مدینے میں
قلب جس کا نہ ہو مدینے میں
اس کا جینا ہے کوئی جینے میں

چونکہ ہر مؤمن کا ایمانی اور روحانی رشتہ جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہے، اگرچہ وہ رنگ و نسل، شکل و صورت کے اعتبار سے کسی بھی قوم و وطن سے تعلق رکھتا ہو، مگر اپنے اس رشتے کے اعتبار سے وہ مدنی و حجازی ضرور ہے۔ ہندی ہو یا پاکستانی، ترکی ہو یا ایرانی، مشرقی ہو کہ مغربی شمالی ہو کہ جنوبی دل و دماغ کے اعتبار سے اور سوچ و فکر کے اعتبار سے اس کے لیے مدنی و حجازی ہونا ایک ضروری امر ہے۔ اس لئے کہ مدینہ منورہ ہمارے محبوب و پسندیدہ دینِ اسلام کا مرکز اور ہماری جانوں سے زیادہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن اور وطن ہے جن

سے محبت کرنا ہر مؤمن کے ایمان کا جز ولازم ہے کہ جس کے بغیر کمالِ ایمانی ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان، ج: ۱، ص: ۷)

تم میں سے کوئی شخص مؤمنِ کامل نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ میں اس کو اس کے والد و اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

صاحبو! ایک مسلمان کو مدینہ سے محبت ہونے کے لئے اور اس کو مدینہ سے دلی وابستگی اور تعلق کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ مدینہ منورہ ہمارے محبوب آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے کیونکہ محبت کا فطری اصول ہے کہ محبوب کی ہر شئے عزیز ہو جاتی ہے۔ جگر نے کہا ہے ۔

بھول سکتا ہوں کہیں ان کی محبت کے مزے
میری آنکھوں میں وہ ایک ایک ادا پھرتی ہے

بالخصوص جبکہ فرمانِ نبوی کے مطابق مدینہ پہنچ کر روضۂ اقدس کی زیارت کرنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی زیارت کرنے والا۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

﴿عَنْ حَاطِبِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ وَمَنْ مَاتَ بِاَحَدِ الْحَرَمَیْنِ بُعِثَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾

(شعب الایمان للبیہقی، فضل الحج والعمرۃ، ج: ۳، ص: ۴۸۹، مکتبۃ دار الباز، مکۃ المکرمۃ)

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری وفات کے بعد میری (قبر کی) زیارت کی۔ اُس نے گویا میری زندگی ہی میں مجھ کو دیکھا اور جو حرمین (مکہ مکرّمہ یا مدینہ منورہ) دونوں میں سے کسی میں وفات پائے گا قیامت کے دن ان لوگوں کے ساتھ اُٹھایا جائے گا جو خدا کی حفظ وامان میں ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ مسلمان عمر بھر اس تمنا میں گزار دیتا ہے کہ کاش! مجھے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت میسر آجائے تو جبکہ روضۂ اقدس کی زیارت پر اُس کے دل کی یہ مراد بر آتی ہے تو پھر کیوں ہر مسلمان کا دل مدینہ جانے کے لئے بے قرار نہ ہوگا۔ کیا ہی خوب کہا ۔

وہ دن خدا کرے کہ مدینے کو جائیں ہم
خاکِ درِ رسول کا سرمہ بنائیں ہم

اور ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی بدنصیبی اور محرومی کیا ہوسکتی ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

کے بغیر زندگی گزار رہا ہو تو نہ اُسے مکین کی محبت ہے نہ مکان کی۔ نہ اُس کے دل میں زیارتِ مدینہ کا شوق ہے اور نہ لقائے آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کا، یہ زندگی کوئی زندگی کہلانے کے قابل نہیں۔ اس لئے حضرت والا نے ارشاد فرمایا۔

قلب جس کا نہ ہو مدینے میں
اس کا جینا ہے کوئی جینے میں

فیضانِ مدینہ ہے یہ فیضانِ مدینہ

ساحل سے لگے گا کبھی میرا بھی سفینہ — دیکھیں گے کبھی شوق سے مکہ و مدینہ
مؤمن جو فدا نقشِ کفِ پائے نبی ہو — ہو زیرِ قدم آج بھی عالم کا خزینہ
گر سنتِ نبوی کی کرے پیروی اُمت — طوفاں سے نکل جائے گا پھر اس کا سفینہ
یہ دولتِ ایمان جو ملی سارے جہاں کو — فیضانِ مدینہ ہے یہ فیضانِ مدینہ
جو قلب پریشاں تھا سدا رنج و الم سے — فیضانِ نبوت سے ملا اُس کو سکینہ
جو دردِ محبت کا ودیعت تھا ازل سے — مؤمن پہ ہوا کشف وہ مدفون خزینہ
اے ختمِ رُسل! کتنے بشر آپ کے صدقے — ہر شر سے ہوئے پاک ہوئے مثلِ نگینہ
خالی تھا جو انوارِ محبت کی رمق سے — اِک آگ کا دریا سا لگے ہے وہی سینہ
صدقے میں ترے ہوگیا وہ رہبرِ اُمت — جو کفر کی ظلمت سے تھا اک عبدِ کمینہ
اے صلِ علیٰ آپ کا فیضانِ رسالت — جو مثلِ حجر تھا وہ ہوا رشکِ نگینہ
جو ڈوبنے والا تھا ضلالت کے بھنور میں — اب رہبرِ اُمت ہے وہ گمراہ سفینہ
جو کفر کی ظلمات سے تھا ننگِ خلائق — ہے نورِ ولایت سے منوّر وہی سینہ
اخترؔ کی زباں اور شرفِ نعتِ محمد ﷺ — اللہ کا احسان ہے بے خون و پسینہ

مشکل الفاظ کے معنی: سفینہ: کشتی۔ فدا نقشِ کفِ پائے: جو اتباعِ سنت میں جان کی بازی لگا دے۔ زیرِ قدم: قدموں کے نیچے۔ خزینہ: دولت۔ سدا: ہمیشہ۔ رنج و الم: دکھ و درد۔ سکینہ: چین۔ ودیعت: امانت۔ اِزل: پہلے سے۔ کشف: کھل گیا۔ مدفون: دفن کیا ہوا۔ مثلِ حجر: پتھر کی طرح۔ رشکِ نگینہ: موتی بھی رشک کرنے لگا۔ ضلالت: گمراہی۔ بھنور: ڈوبنے کی جگہ۔ ننگِ خلائق: جو مخلوق کو شرما دے۔ منوّر: روشن۔

اللہ سے حسنِ ظن عبادت ہے

ساحل سے لگے گا کبھی میرا بھی سفینہ
دیکھیں گے کبھی شوق سے مکہ و مدینہ

ایک حدیثِ قدسی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرد علی الجھمیة وغیرھم التوحید، ج: ۲، ص: ۱۱۰۱)

کہ میں بندے کے ساتھ ویسا معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان کرتا ہے۔ اس لئے کسی بھی مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں سے کسی بھی حال میں مایوس و نا اُمید نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہر نیک تمنا کو پورا کرنے کے لئے اُس کے ضروری اسباب اختیار کرتا رہے اور اُس کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے **فضل** وکرم کا اُمیدوار رہے۔ خواہ بظاہر ہماری کوششیں کیسی ہی معمولی اور کمزور ہوں، مگر کبھی بھی اپنی سعی وکوشش پر نظر نہ کرے بلکہ اس اللہ کی قدرت وقوت پر مکمل بھروسہ اور اعتماد رکھے کہ جس کی قدرت کا یہ عالم ہے اِذَا اَرَادَ شَیْئًا قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْن کہ جب اللہ کسی چیز کو چاہتے ہیں تو اُس سے کہتے ہیں کہ تو ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر اُمید رکھنے میں کبھی بھی دل میں اس طرح کے خیالات کو جگہ نہ دے کہ کیسے ہوگا؟ کب ہوگا؟ کہاں سے اور کیونکر ہوگا؟ اقوالِ سلف، جلد: ۶، صفحہ: ۵۵۸ پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ کام میں لگئے اور تجویز کو فنا کیجئے یہ نہ سوچئے کہ کام اس طرح کرنا ہے، اس طرح ہونا چاہیے، اس وقت جو اختیار میں ہے شروع کر دیجئے کیا نتیجہ ہوگا؟ کیونکر ہوگا؟ کس طرح ہوگا؟ ان باتوں سے ہمت میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ اگر مگر اور شاید وغیرہ نوع کے اندیشوں اور وہموں کو دل میں جگہ نہ دے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ مجھ سے پُر اعتماد طریقے پر اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کی بھیک مانگے اور دل میں قبولیت کے یقین کے ساتھ میرے سامنے ہاتھ پھیلائے اور مجھ سے مانگنے کے بعد بے فکر اور مطمئن ہو جائے۔ کیونکہ میں حکیم ہوں، میرا ہر عمل حکمتوں پر مبنی ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کس بندے کی مطلوبہ حاجتیں کب پوری کرنے میں اس کے لئے حکمت و مصلحت ہے۔

ہمارا کام در کھٹکھٹانا ہے

کسی کو جلدی، کسی کو تاخیر سے دینے میں، کسی کو زیادہ کسی کو کم دینے میں، کسی کو اس کی مطلوبہ شئے اور کسی کو اُس کا نعم البدل دینے میں غرض یہ کہ تم اپنا کام کرو اور میں اپنا کام کروں گا۔ اسی کو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

ضربیں کسی کے نام کی دل پہ یونہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ در یونہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اس پہ ہو کیوں تری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

یعنی بندے کا کام بندگی کرنا اور مانگنا ہے۔ مسلسل اللہ کے دروازے کو کھٹکھٹاتے رہنا ہے۔ خواہ اس کو جواب مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو۔ درحقیقت مختصر لفظوں میں اسی کو توکل کہتے ہیں کہ بندہ اسباب اختیار کر کے نتیجے کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے۔ پھر اللہ کی طرف سے جو بھی فیصلہ ہواُسے اپنے لئے خیر سمجھے۔

اس مختصر سی تمہید کی روشنی میں حضرت والا کے شعر کا خلاصہ یہ ہوا کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے در سے اُمید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ ان شاء اللہ عنقریب وہ دن آئے گا کہ جب ہماری اُمیدوں اور تمناؤں کے مرکز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ حاضری کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا اور ہمیں حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوگی۔ پھر ہم فرطِ محبت سے مکہ اور مدینہ کا دیدار کریں گے۔ فرحت ومسرت کے ساتھ اپنے جذباتِ عقیدت ومحبت بارگاہِ رسالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ بارگاہِ ربّ العزت میں سربسجود ہو کر اپنی آہوں اور نالوں سے خدائے وحدہٗ لاشریک کو رو رو کر منائیں گے۔ اپنی بگڑی حالت سنواریں گے اور اپنے مولیٰ سے رو رو کر مولیٰ کو مانگیں گے۔ اللہ والوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بیت اللہ پہنچ کر بڑی آہ وزاری اور درد وتڑپ کے ساتھ اللہ سے اللہ کو مانگا کرتے تھے جیسے کہ مچھلی بغیر پانی کے تڑپ رہی ہو اور یہ شعر پڑھتے تھے۔

کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

یہ تڑپنے کی ادا اللہ والوں ہی سے ملتی ہے۔ چنانچہ ہمارے حضرت والا کی زندگی کا سب سے پہلا شعر ہے۔

دردِ فرقت سے مرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت پر اِک ماہیٔ بے آب ہے

عقلمند اپنے دوست کی اتباع کرتا ہے نہ کہ دشمن کی

مؤمن جو فدا نقشِ کفِ پائے نبی ہو
ہو زیرِ قدم آج بھی عالم کا خزینہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو ہدایت وضلالت کے راستوں کو پہچاننے اور سمجھنے کے لئے دل ودماغ اور نظر وفہم عطا فرمایا۔ اس کے سامنے دونوں راستوں کے نفع وضرر کو واضح کر دیا ہے۔ ایک رحمٰن کا راستہ ہے جو بندے کو اُس کے خالق سے ملاتا ہے اور ایک شیطان کا راستہ ہے جس پر چل کر بندہ اپنے خالق و مالک کے عتاب وعقاب، غصہ اور غضب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۰۸)

ترجمہ: اور مت چلو قدموں پر شیطان کے بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (معارف القرآن، ج:۱، ص:۴۹۷)

اور دُشمن کے نقشِ قدم پر چل کر سوائے تباہی و بربادی کے کچھ بھی حاصل نہیں اور اللہ اہلِ ایمان کا دوست ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جانوں سے زیادہ ہمارے قریب ہیں اور ہمارے ایمان و ہدایت اور اصلاحِ حالت اور جہنم سے نجات کے بہت حریص اور فکر مند ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہ اللہ اہلِ ایمان کے دوست ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ اور فرمایا حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ لہٰذا دانشمندی اور عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم شیطان کا کہنا نہ مانیں بلکہ رحمٰن کی فرمانبرداری کریں اور شیطان کے نقوشِ قدم کی اتباع نہ کریں بلکہ نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اگر چہ آپ کی اتباع میں ہمیں اپنی جان و مال فدا کرنا پڑے تو ان شاء اللہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا عالم اور اُس کے خزانے اور بڑے بڑے ملوک وسلاطین آپ کی غلامی کی بدولت مغلوب ومقھور رہوں گے اور دنیا بھر کے خزانے زیرِ قدم نظر آئیں گے۔ اور وہ دُشمنانِ عالم کی تمام سازشیں اور مکروفریب ایسے ہی صاف ہوتے نظر آئیں گے۔ جیسے مکڑی کے جالے کو ایک معمولی سی جھاڑو سے صاف کر دیا جاتا ہے اور اس کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔

گر سنتِ نبوی کی کرے پیروی اُمت
طوفاں سے نکل جائے گا پھر اس کا سفینہ

یہی وہ مضمون ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس تاریخی ارشاد میں ذکر فرمایا نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ ہم وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راستے سے عزت بخشی ہے اور وہ راہِ اسلام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل تابعداری اور آپ کے نقشِ قدم کی پیروی ہی عزت و رفعت کی ضامن ہے۔ اسی کو حضرت والا اپنے اس شعر میں فرما رہے ہیں۔

ہر رشد و ہدایت کا اصلی مرکز مدینہ منورہ ہے

یہ دولتِ ایمان جو ملی سارے جہاں کو
فیضانِ مدینہ ہے یہ فیضانِ مدینہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے کفار و مشرکینِ مکہ کو جب دعوتِ توحید و رسالت پیش فرما رہے تھے تو وہ لوگ آپ کو اور آپ کی دعوت قبول کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں کو بہت ستایا کرتے تھے اور بڑی ایذائیں اور تکلیفیں پہنچایا کرتے تھے جن کا بیان کرنا یہاں مقصود نہیں۔ بس اتنا عرض ہے کہ اس طرح وہ آپ کو کھل کر دعوت دینے سے مانع اور رکاوٹ بنتے تھے۔ جس کے نتیجے میں آپ کو اس راہ میں بڑی تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر ایک دن وہ آیا کہ آپ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم مل گیا اور آپ فوراً اس کی تعمیل میں اپنے وطنِ عزیز کو خیر باد کہہ کر اپنے رفیقِ سفر و حضر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفرِ ہجرت کے لئے مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر اشاعتِ اسلام اور تبلیغِ حق کا کام بڑے زور و شور سے شروع فرما دیا۔ بلادِ مختلفہ سے مختلف قبائل کے سرداران وفود کی شکل میں جوق در جوق پہنچنا شروع ہوگئے۔ انسانی فلاح و نجات کی دولت (دولتِ ایمان) سے مشرف ہو کر واپس اپنے قبیلوں اور ملکوں میں اس کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔

جہاں جہاں رکاوٹیں پیش آتی گئیں اور دُشمنانِ اسلام اس راہ میں آڑے آئے تو حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر ان رکاوٹوں کو بزورِ قوت و طاقت ہٹانے میں مصروف ہو گئے اور دُشمن کو اسلام یا جزیہ، یا موت پر مجبور کر دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ حکمِ جہاد بلا کسی خوف و خطر جرأت و ہمت اور بڑی دلیری کے ساتھ انجام دیا اور خدائی الفاظ میں اُولٰئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ کہلائے اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ کا خطاب پائے مگر تبلیغِ اسلام کا حق ادا کر دیا۔ دنیائے کفر و ضلالت کو ظلمتوں اور ذلتوں سے نکال کر اسلام کے نور سے منور کر دیا اور حقیقی عزت و عظمت کی راہوں سے روشناس کرا دیا۔

بلا کسی شک و شبہ کے آج راقم السطور سمیت تمام مسلمانانِ عالم اسی مرکزِ رشد و ہدایت، مدینہ منورہ کے فیضان سے مسلمان کہلا رہے ہیں اور مذہبِ اسلام سے آشناء ہیں۔ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ وَثَبَّتَنَا اللّٰہُ عَلَیْہِ حَتّٰی نَلْقَاہُ۔

بعثتِ نبوت اور نزولِ سکینہ

جو قلب پریشاں تھا سدا رنج و الم سے
فیضانِ نبوت سے ملا اُس کو سکینہ

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت پوری قوم انتہائی تباہی و بربادی میں ڈوبی ہوئی اور کفر وشرک کی تاریک ترین وادیوں میں حیراں وسرگرداں قتل وقتال اور خوں ریزی کی آگ میں جلتی ہوئی بے چینی اور بے سکونی کی زندگی گزار رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تعلیماتِ الٰہیہ اپنی قوم کو پیش کیں کہ جس پر عمل پیرا ہو کر دُشمنی دوستی میں، عداوتیں محبتوں میں اور نفرتیں الفتوں میں بدل گئیں۔ تڑپتا ہوا دل اور بے چین روح قرار وسکون پا گئی کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سکون اپنی محبت وتعلق میں رکھا ہے۔ اللہ سے محبت وتعلق وہی معتبر ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات واتباع کے ساتھ ہو اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا وآخرت کے ہر نوع کا چین وسکون اور سلامتی ظاہر وباطن اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں منحصر کردی ہے۔

جیسا کہ حدیث پاک کا حصہ ہے اَسْلِمْ تَسْلَمْ کہ مکمل طور پر اللہ کے حکموں کے سامنے جھک جاؤ! تو تمہیں ہر طرح کی سلامتی اور قلبی چین وسکون اور دنیوی واخروی آفات وبلیات سے حفاظت نصیب ہوجائے گی۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ دورِ نبوت سے لے کر آج تک جس قدر پُرسکون اور بالطف زندگی غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور عاشقانِ دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی ہے، دنیا داروں کو اس کی ہوا بھی میسر نہیں آئی۔ یہ سب کچھ اُسی فیضانِ نبوت کا اثر ہے اور اُس گلشنِ مدینہ کے پھولوں کی خوشبو ہے جس نے سارے عالم کو معطر کردیا۔

عہدِ الست کا تمام بنی آدم پر غیر شعوری اثر

جو دردِ محبت کا ودیعت تھا ازل سے
مؤمن پہ ہوا کشف وہ مدفون خزینہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا میں پیدا کرنے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر یکجا فرمایا اور اُن سے یہ عہد لیا کہ ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں۔ ''قَالُوْا بَلٰى'' تو سب پکار اُٹھے کہ کیوں نہیں بے شک آپ ہمارے ربّ ہیں۔ جس کو ''عہدِ الست'' کہا جاتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۱۷۲)

ترجمہ: اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب بولے ہاں ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۱۰۷)

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لاکر اپنی اپنی قوموں کو اس عہد کی یاددہانی کراتے رہے تاکہ اللہ کے سامنے بندوں کے لئے کوئی عذر و دلیل باقی نہ رہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہمیں یہ عہد یاد نہ تھا، اُسی سلسلے کی آخری کڑی ہمارے محبوب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے۔ آپ نے دنیا میں تشریف لاکر اُس درِ محبتِ الٰہی کو جو عہدِ الست کی شکل میں طبائع میں مرکوز کیا گیا تھا اور خزانۂ معرفتِ خداوندی کو جو دل کے نہاں خانوں میں دفن کیا گیا، اُمت پر کھولا اور واضح کیا اور اس عہد کی یاددہانی کرائی۔

صاحبو! اسی پُرانی چوٹ اور محبت کی چنگاری اور اقرارِ ربوبیتِ خداوندی کا ایک اثر یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر لوگ اپنے اندرونِ باطن ایک ایسا شعوری اور غیر شعوری جذبۂ عبدیت و نیازمندی رکھتے ہیں کہ جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس کا رُخ صحیح ہونے کی صورت میں وہ اپنے جذباتِ عبدیت اور ادائے بندگی صرف ایک اکیلے اللہ کے لئے خاص کرتے ہیں اور اگر ان کا رُخ غلط ہو جائے تو پھر وہ مختلف شکلوں میں غیر اللہ کو اپنا معبود و مسجود بناڈالتے ہیں اور مختلف مصائب و حالات میں حلِ مشکلات کے لئے انہی کو پکارتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس عہدِ الست کا اثر غیر شعوری طور پر ایسے لوگوں میں بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ جو اپنی زبان سے خدا کے وجود کے منکر اور دھریہ ہوتے ہیں کہ کسی سمندری طوفان یا فضائی حادثے کے خطرات یا اور مصائب و آلام کی صورت میں وہ اپنے آہ و نالوں سے کسی غیر معین اور غیر مرئی طاقت سے نصرت و مدد کے طالب ہوتے ہیں جس سے اس بات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ اُس عہدِ الست کا اثر پوری کائنات کے بسنے والے انسانوں میں مختلف انداز سے موجود ہے۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اشارہ کردیا۔

دل ازل سے تھا کوئی آج کا شیدائی ہے
تھی جو اِک چوٹ پُرانی وہ اُبھر آئی ہے

حضور ﷺ اور فکر اصلاح وایمان امت

اے ختمِ رُسل! کتنے بشر آپ کے صدقے
ہر شر سے ہوئے پاک ہوئے مثلِ نگینہ

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کے طفیل ساری بشریت کو شرور و فتن سے بچنے اور باطن کی گندگیوں اور غلاظتوں سے پاک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت:۱۲۸)

ترجمہ: (اے لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں (کہ تم کو نفع حاصل کرنا آسان ہو) جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے۔ (معارف القرآن جلد:۴،ص:۴۹۵)

خلق کا خالق سے رابطہ آپ کی رسالت کا مرہونِ منت ہے اور ہر بشر کے لئے خالقِ بشر کی معرفت بدون آپ کی رسالت پر ایمان لائے ممکن نہ تھا۔ اللہ کی رضاء اور ناراضگی کے کاموں کا علم آپ کے بغیر ناممکن ومحال تھا۔ اس اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی بندوں کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار پائی۔ پھر آپ کی شانِ نبوت ختمِ نبوت ختمِ زمانی ومکانی دونوں لحاظ سے ہے، اس لئے تا قیامت تمام اہلِ ایمان اور اہلِ دل، اہلُ اللہ کا تعلق اور قرب مع اللہ سب آپ ہی کی نبوت ورسالت کا فیضان ہے۔

خالی تھا جو انوارِ محبت کی رمق سے
اک آگ کا دریا سا لگے ہے وہی سینہ

اللہ تعالیٰ کی محبت جب دل میں راسخ ہوتی ہے اور نسبت مع اللہ تام اور کامل ہوجاتی ہے تو بندے کو اس کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بقول مجدد تھانوی قدس سرہٗ: ''جس طرح بالغ کو اپنے بلوغ کی خبر ہوجاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق اور نسبتِ خاصہ کا دل کو احساس ہونے لگتا ہے۔'' جس کا خاصہ بالفاظِ حکیم الامت دوامِ طاعت اور کثرتِ ذکر ہے۔ اسی کو حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے پیارے انداز میں فرمایا۔

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

اور اس نسبت کے حصول کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ بندے کو طاعات سے رغبت اور معاصی سے نفرت ہوجاتی ہے اور بتقاضائے بشریت صدورِ معصیت پر جلد ندامت وتوبہ کے ذریعے درجاتِ قرب کی منزلیں طے کرلیتا ہے اور یہ دردِ محبت اور سوزِ باطن اور سینے میں گرمیٔ عشقِ الٰہی ہر شخص کو اس کے مجاہدات کے بعد الگ الگ عطا کی جاتی ہے اور اُسی اعتبار سے اس کے دل کو جلاء وروشنی عطا ہوتی ہے۔

جیسا کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے اہل اللہ کے قلوب کی جلاء وروشنی اور گرمیٔ محبت کو سمجھاتے ہوئے یہ مثال پیش کی ہے کہ بعض آئینے سورج کے سامنے کر کے ان کا عکس کاغذ پر ڈالنے سے محض روشنی حاصل ہوتی ہے اور دوسرے بعض آئینے کاغذ میں آگ لگادیتے ہیں اور وہاں دھواں اُٹھنے لگتا ہے بعینہٖ یہی صورتِ حال اولیاء اللہ کے دلوں کی ہے کہ ان کے اردگرد بیٹھنے والوں کے دلوں پر ان کے قلوب کا عکس اسی طرح پڑتا ہے کہ بعض اپنے سینے میں آگ کا ایک دریا رکھتے ہیں تو سامنے بیٹھنے والوں کے قلوب کو اس محبتِ خداوندی کی آگ سے جلا کر رکھ دیتے ہیں اور بعض محض روشنی ڈالنے کی حد تک محدود رہتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرتِ والا فرمارہے ہیں کہ اب اللہ کی محبت کے انوار سے سینہ ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی آگ کا دریا ہو جبکہ پہلے اس میں انوارِ محبت کی رمق بھی نہ تھی۔

بزبانِ نبوت صحابہ نجوم ہدایت ہیں

صدقے میں ترے ہوگیا وہ رہبر اُمت
جو کفر کی ظلمت سے تھا اک عبد کمینہ

وہ لوگ جو کفر وشرک کی ظلمتوں میں بھٹک رہے تھے اور شقاوت و بدبختی کی راہوں کو طے کررہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارکہ کی بدولت اور آپ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ وہ اندھیروں سے نکل کر اُجالوں میں آ گئے بلکہ دوسروں کو تاریکی سے نکال کر روشنی دکھانے والے بن گئے۔ صرف راہرو منزل ہی نہیں بلکہ راہبرِ منزل بھی بن گئے اور ایک دو ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری جماعت کو ایسا بلند مرتبہ اور عالی مقام حاصل ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ﴾
(المشکوٰۃ، باب مناقب الصحابۃ ﷺ، ص: ۵۵۴)

کہ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں، تم ان میں سے جس کی اتباع کرلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

آپ کے صدقے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نجومِ ہدایت کا مقام حاصل ہوا۔ بالخصوص خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّۃِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ﴾
(المشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ص: ۳۰)

تم میرے طریقے اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑے رہنا۔

اے صلِ علیٰ آپ کا فیضانِ رسالت
جو مثلِ حجر تھا وہ ہوا رشکِ نگینہ
جو ڈوبنے والا تھا ضلالت کے بھنور میں
اب رہبرِ اُمت ہے وہ گمراہ سفینہ

ان دونوں اشعار میں قدرِ مشترک یہی مضمون مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کی بدولت جو لوگ پتھر کی طرح تھے ان کی قیمت وحیثیت دونوں جہان میں اتنی ہوگئی کہ وہ رشکِ نگینہ بن گئے اور جن کا سفینہ ظلمت وضلالت کے بھنور میں ڈوب رہا تھا، اب وہی رہبرِ اُمت بن گئے۔ جو لوگ مخلوق کے لئے باعثِ ننگ وعار تھے اب ولایت وتقویٰ کے نور سے وہی منور اور روشن ہو کر رشکِ آفتاب و ماہتاب بن گئے۔

مدحِ محمد ﷺ کی توفیق فضلِ خداوندی ہے

اختر کی زباں اور شرفِ نعتِ محمد ﷺ
اللہ کا احسان ہے بے خون و پسینہ

کسی شخص کی زبان وقلم کا حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں استعمال ہونا اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور احسان ہے۔ محض توفیقِ الٰہی کا نتیجہ ہے ورنہ وہ ذاتِ عالی تو اتنے اونچے مقام کی حامل ہے کہ خود خالق نے جس کی تعریف کی ہے تو بھلا مخلوق کی کیا جرأت کہ وہ اس کی مدح وثناء کے لئے زبان کھولے۔ حضرت والا ارشاد فرمارہے ہیں کہ میرا کوئی کمال نہیں، یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اُس نے بے خون و پسینہ ہمیں یہ نعمت عطا فرمائی۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کسی بھی نعمت کو محض اس کے فضل وکرم کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اپنے مجاہدوں اور ریاضتوں کی طرف سے اس کی نسبت کرنا یہ کفرانِ نعمت ہے۔

چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بعض لوگ اپنے کمالات کو اپنے مجاہدات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ سراسر کفرانِ نعمت ہے اس لئے بندہ خواہ کسی بھی مقام پر پہنچ جائے اور اُسے خواہ کتنا ہی اونچا کمال ہو جائے۔ مگر یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کی آیت ہے کہ:

﴿وَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰـكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ﴾

(سورۃ النُّور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک وصاف کردیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۶، ص:۳۶۹)

یہ آہِ سحر کا اثر دیکھتے ہیں

یہ آہِ سحر کا اثر دیکھتے ہیں مدینے کے شام و سحر دیکھتے ہیں
جسے آپ کا باخبر دیکھتے ہیں اُسے غیر سے بے خبر دیکھتے ہیں
غلامی سے تیری غلاموں کا رُتبہ ملائک سے بھی فوق تر دیکھتے ہیں
تجلی جو ہے سبز گنبد پہ ہر دم اُسے رشکِ شمس و قمر دیکھتے ہیں
مدینہ کا جغرافیہ دیکھ کر ہم عجب حالِ قلب و جگر دیکھتے ہیں
تصور میں آتا ہے جب سبز گنبد تو ایمان کو گرم تر دیکھتے ہیں
بفرطِ محبت بشوقِ نظر ہم مدینے کے دیوار و در دیکھتے ہیں
ابوبکر و فاروق و عثمان و حیدر تصور میں ہم اُن کے گھر دیکھتے ہیں
جو روضے پہ حاضر سلاطیں ہوئے ہیں تو پندار زیر و زبر دیکھتے ہیں
جو جالی پہ صلِّ علیٰ کہہ رہے ہیں اے اخترؔ انہیں چشمِ تر دیکھتے ہیں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **آہِ سحر**: تہجد کے وقت رونا۔ **ملائک**: فرشتے۔ **فوق تر**: بہت اونچا۔ **تجلی**: روشنی۔ **رشکِ شمس و قمر**: جس پر سورج اور چاند بھی رشک کرتے ہوں۔ **جغرافیہ**: نقشہ۔ **عجب**: کیف، مزا۔ **بفرطِ محبت**: شدت محبت کے ساتھ۔ **پندار**: تکبر۔ **زیر و زبر**: ریزہ ریزہ۔ **چشمِ تر**: آنسو بہانے والی آنکھ۔

دیدارِ مدینہ آہِ سحر گاہی کا اثر ہے

یہ آہِ سحر کا اثر دیکھتے ہیں
مدینے کے شام و سحر دیکھتے ہیں

مدینہ منورہ دنیا کے دوسرے شہروں کی طرح کوئی سیر وتفریح کی جگہ اور سیاحت کا شہر نہیں بلکہ مدینہ منورہ کی حاضری ایک مسلمان کے لئے اہم ترین عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے اور ہر مسلمان کی انتہائی اور آخری درجے کی اُمیدوں میں سے ایک اُمید ہے۔ اس لئے دنیا بھر میں مسلمان یہاں آنے کے لئے مضطرب اور بے قرار رہتے ہیں اور بارگاہِ ربُّ العزت میں یہاں کی حاضری کے لئے آہ وزاری کرتے رہتے ہیں۔

اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کو حضرتِ والا دامت برکاتہم نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کا اثر قرار دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے مانگی ہوئی ایک مراد پوری ہونے پر خوشی ظاہر فرما رہے ہیں۔ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ اس حاضری کو ایک عظیم نعمت سمجھ کر اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اس کو اپنی دعاؤں کا حصہ بنانا چاہیے۔

آپ ﷺ کی محبت دل سے ہر غیر کو نکال دے گی

جسے آپ کا باخبر دیکھتے ہیں
اُسے غیر سے بے خبر دیکھتے ہیں

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ جب تک غیر اللہ قلب سے پورے طور پر نہیں نکلتا اس وقت تک اللہ تبارک وتعالیٰ کا قوی تعلق حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے آدمی پوری لگن دُھن اور دھیان کے ساتھ کوشاں نہیں ہوتا۔ تب تک اُسے محبتِ الٰہیہ حاصل نہیں ہوتی۔ ہر ماسوا اللہ سے پورے طور پر صرفِ نظر کر کے ایک اللہ پر اپنا سب کچھ فدا اور قربان کرنے کا جذبہ ہی خدا تک پہنچانے والا ہے اور ہر غیر سے بے خبر ہوکر ہی اللہ سے باخبر ہونا ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تک پہنچنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ جتنا ہم حضور سے باخبر ہوں گے اتنا ہم اللہ سے باخبر ہوں گے اور جتنی حضور سے محبت ہوگی اتنی اللہ سے محبت ہوگی اور غیروں کی محبت سے دل خالی ہوکر رہ جائے گا۔

چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق بنے تو ہر غیر سے ایسے بے خبر ہوئے کہ آپ کی محبت پر نہ اپنے مال و دولت کی کوئی پرواہ کی اور نہ اپنے اقرباء واہلِ خاندان گراں گزرے بلکہ سب کچھ خوشی خوشی اپنے محبوب کے اشاروں پر لٹاتے چلے گئے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نظریں پڑنے کے بعد اور آپ کے وصال کے بعد کون ایسا ہوسکتا ہے کہ جن پر نظرِ التفات بھی ڈالی جائے، اس لئے آپ کے باخبر کیونکر غیروں کی خبر رکھیں گے۔

غلامی سے تیری غلاموں کا رُتبہ
ملائک سے بھی فوق تر دیکھتے ہیں

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی غلامی کی بدولت آپ کے عاشقوں اور غلاموں کا مقام ملائکہ سے بھی اونچا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ خواصِ ملائکہ سے خواصِ مؤمنین اور عام ملائکہ سے عام مؤمنین افضل ہیں۔ چونکہ اللہ کے بعد سب سے اونچا مرتبہ پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے آپ کے متبعین کاملین کا مرتبہ باقی سب سے بڑھ کر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو خَیْرُ الْخَلاَئِقِ بَعْدَ الْاَنْبِیَآءِ کہا جاتا ہے۔ جو کہ پوری اُمت میں باتفاق اہل السنۃ والجماعۃ سب سے افضل ہیں کیونکہ اشیاء کی قیمتیں نسبت سے بڑھتی اور گھٹتی ہیں۔

تجلیاتِ جمالیہ اور روضۂ اقدس ﷺ

تجلّی جو ہے سبز گنبد پہ ہر دم
اُسے رشکِ شمس و قمر دیکھتے ہیں

روضۂ اقدس پر ہر آن اور ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات کا نزول ہوتا رہتا ہے جن کے سامنے سورج اور چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ اس لئے کہ سورج اور چاند سے کائنات کا ظاہر روشن ہوتا ہے اور یہ تجلیاتِ الٰہیہ باطن کو ایمان و معرفت کے نور سے منور کرتی ہیں۔ انسان کی فلاح و نجات کے لئے اور اس کو ظلمات سے نکالنے کے لئے اصل چیز باطن کا منور ہونا ہے۔ اس لئے وہ لوگ کہ جن کے قلوب مزکّٰی مجلّٰی ہیں وہ اپنے دل میں ان انوار و تجلیات کو محسوس کر کے اپنے ایمان و معرفت میں اضافہ پاتے ہیں۔ اسی لئے حضرتِ والا نے فرمایا کہ سبز گنبد پر نازل ہونے والی تجلیات رشکِ شمس و قمر ہیں۔

مدینہ پر نظر پڑتے ہی دل فرطِ محبت سے جھوم اٹھتا ہے

مدینہ کا جغرافیہ دیکھ کر ہم عجب حالِ قلب و جگر دیکھتے ہیں
تصور میں آتا ہے جب سبز گنبد تو ایمان کو گرم تر دیکھتے ہیں
بفرطِ محبت بشوقِ نظر ہم مدینے کے دیوار و در دیکھتے ہیں

کوئی بھی عاشق جب اپنے معشوق اور محبوب کے وطن کا تصور کرتا ہے یا اُس کا تذکرہ کرتا ہے یا اُس کی نظروں کے سامنے دیارِ محبوب کے آثار و نشانات آجاتے ہیں تو اُس کا حال وہی ہوتا ہے جو حضرتِ والا نے ان اشعار میں ذکر کیا کہ میرے قلب و جگر کا حال کچھ اور ہی نظر آیا۔ میرے ایمان کی حرارت و گرمی شدت و تیزی اختیار کر گئی اور بڑے والہانہ انداز سے فرطِ محبت میں جھوم جھوم کر مدینے کے در و دیوار پر نظریں پڑیں۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی
اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَ ذَا الْجِدَارَ
وَ مَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ
وَ لٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَ

میں لیلیٰ کے شہر سے گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اُس دیوار کو چومتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے میرے دل کو شہروں کی محبت نے نہیں موہ لیا بلکہ ان لوگوں کی محبت نے جو شہروں میں رہنے والے ہیں۔

آہ! مجنوں کو گر بتوں کے عشق کے بجائے حقیقی عشق کا مزہ مل جاتا تو وہ ان مٹی کے کھلونوں اور خاک کا ڈھیر بن جانے والے حسین اور حسیناؤں پر جان نہ چھڑکتا۔

ابوبکر و فاروق و عثمان و حیدر
تصور میں ہم اُن کے گھر دیکھتے ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا مقتضی یہ ہے کہ آپ کے اصحاب سے بھی محبت ہو کیونکہ اصولی بات یہی ہے کہ حبیبُ الحبیبِ حبیب محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوا کرتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنے محبوب تھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

﴿اللہ اللہ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ﴾

(سنن الترمذی، باب فی من سبّ اصحاب النبی ﷺ، ج: ۲، ص: ۲۲۵)

کہ میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرو! میرے بعد ان کونشانہ نہ بناؤ اور جو ان سے محبت رکھے گا تو وہ میری محبت ہی کی وجہ سے رکھے گا اور جو اُن سے بغض رکھے گا تو وہ میرے بغض ہی کی وجہ سے بغض رکھے گا۔ اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کے دوران جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ ہوتی ہے، اسی طرح حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بالخصوص خلفائے راشدین کی یادیں بھی تازہ ہو جاتی ہیں، ان کا رہنا سہنا حضور کی مجلس میں آنا، آپ کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا وغیرہ جیسے احوال یاد آنے لگتے ہیں۔

روضۂ اقدس ﷺ پر سلاطین دنیا کی حالت

جو روضے پہ حاضر سلاطیں ہوئے ہیں
تو پندار زیر و زبر دیکھتے ہیں

اپنے اپنے وقت کے بڑے بڑے بادشاہ جب روضۂ اقدس پہ حاضری دیتے ہیں اُن کی حالت ایسی متواضعانہ اور عاجزانہ ہوتی ہے کہ جس کو دیکھ کے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی حکومت وسلطنت کا نشہ آپ کے سامنے حاضر ہو کر دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے اور ان کی انانیت کی بوتک محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ آپ کے دربار میں پہنچ کر بڑے سے بڑا انسان نیاز مندانہ شان میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ آدابِ حضوری پورے طور پر بجالانے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے اور نجات وفلاح کا اُمیدوار ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت والا نے فرمایا کہ آپ کے دربار میں حاضر ہونے کے بعد بڑے بڑے امرا اور سلاطین کے پندار و گھمنڈ زیروزبر ہو جاتے ہیں۔

روضۂ اقدس ﷺ پر حضرت والا کی حالت

جو جالی پہ صلِّ علیٰ کہہ رہے ہیں
اے اختر انہیں چشمِ تر دیکھتے ہیں

حضرتِ والا نے اس شعر میں حضور کے سچے عشاق کا حال بیان فرمایا ہے کہ جب ان کو فراقِ طویل کے بعد وصال حبیب میسر آتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے سامنے جی بھر کر اپنی جدائی کے صدمے کو آنکھوں سے آنسو بہا کر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ دوستوں نے یہی حال حضرتِ والا کا اسی سال سفرِ مدینہ میں مشاہدہ کیا جو مئی ۲۰۰۸ء میں ہوا کہ حضرت والا وہاں اپنے احباب کے ساتھ حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل شاملِ حال ہوا کہ روضۂ اقدس پر نگرانی کرنے والے عرب علماء نے ازخود حضرت کی وہیل چیئر (Wheel chair) کو سامنے کیا اور دیر تک حضرت بڑی گریہ وزاری کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پیش فرماتے رہے اور ان حضرات نے اپنے عام عادت کے خلاف حضرتِ والا کو وہاں ٹھہرنے دیا جس کے بارے میں ساتھیوں نے بتایا کہ تقریباً چالیس منٹ (Minutes) حضرتِ والا نہایت تضرع اور بڑی توجہ وحضوری کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پیش فرماتے رہے۔

گلستانِ طیبہ سے مسرور ہوں گا

عجم کے بیاباں سے مفرور ہوں گا
گلستانِ طیبہ سے مسرور ہوں گا

میں دیدارِ گنبد سے مخمور ہوں گا
کبھی نور ہوں گا کبھی طور ہوں گا

گناہوں سے اپنے میں رنجور ہوں گا
بفیضِ شفاعت میں مغفور ہوں گا

اڑے گی ہوا سے جو خاکِ مدینہ
میں ایسے غباروں میں مستور ہوں گا

میں روضہ پہ صلِ علیٰ نذر کر کے
بہ دل نور ہوں گا بہ جاں نور ہوں گا

مدینہ کے انوارِ شام و سحر سے
سراپا دل و جاں سے مسرور ہوں گا

میں ممنون ہوں گا خدا کے کرم کا
کبھی دل میں اپنے نہ مغرور ہوں گا

ہر اک امر میں راہِ سنت پہ چل کر
خدا کے کرم سے میں منصور ہوں گا

اُحد کے شہیدوں کے خونِ وفا سے
سبق لے کے پابندِ دستور ہوں گا

مدینہ میں جب قلب و جاں چھوڑ آیا
میں مہجور ہو کر نہ مہجور ہوں گا

قبا کی زیارت و نفلوں سے اخترؔ
ہر اک راہِ سنت سے مخمور ہوں گا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **عجم:** عرب کے علاوہ زمین۔ **بیابان:** ویرانہ۔ **مفرور:** بھاگ جانا۔ **گلستان طیبہ:** مدینہ شریف کے باغ۔ **مسرُور:** خوش۔ **مخمور:** مست و سرشار۔ **طور:** پہاڑ، یعنی کبھی میں طور پہاڑ کی طرح ریزہ ہو جاؤں گا۔ **رنجور:** غم زدہ۔ **بفیضِ شفاعت:** یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے صدقے میں۔ **مغفور:** جس کی مغفرت کر دی گئی ہو۔ **غباروں:** گرد۔ **مستور:** چھپا ہوا۔ **نذر:** پیش کر کے۔ **سراپا:** سر سے پاؤں تک۔ **ممنون:** احسان مند۔ **مغرور:** متکبر۔ **منصور:** مدد کیا ہوا۔ **پابندِ دستور:** پابند سنت۔ **مہجور:** دور ہو کر۔

بیابانِ عجم اور گلستانِ طیبہ

عجم کے بیاباں سے مفرور ہوں گا
گلستانِ طیبہ سے مسرور ہوں گا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچا عشق رکھنے والے کے لیے دیارِ حبیب سے دور رہ کر زندگی گزارنا اگرچہ بڑے بڑے بنگلوں اور شاہی محلات میں ہوں بالکل ایسا ہی ہے جیسے بستی کو چھوڑ کر بیاباں میں رہنا اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں سارے عجم کو بیابان سے تعبیر کیا اور اپنے محبوب کے وطن مدینہ طیبہ کو گلستان طیبہ کے پیارے نام سے موسوم کیا اور جس طرح انسان جنگل و بیابان سے بھاگ کر آبادی کا رخ کرتا ہے اسی طرح ایک مومن اس عجم

کے بیابان سے بھاگ کر گلستانِ مدینہ پہنچنے کے لیے بے تاب رہتا ہے اور اس کو خوشی اور مسرت کا ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت کا یک لازمی اثر ہے اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

میں دیدارِ گنبد سے مخمور ہوں گا
کبھی نور ہوں گا کبھی طور ہوں گا

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس بقعۂ ارض، خطۂ زمین میں آرام فرما ہیں اس پر قائم گنبد خضریٰ دور سے نظر آنے لگتا ہے اور جیسے ہی اس پر آپ کے امتی کی نظر پڑتی ہے تو اس کو ایک طرح کا وجد طاری ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ مدہوش کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے وہ اپنے کو ایک ایسے عالم میں پاتا ہے جہاں اس کو اپنی امیدوں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آتا ہے اور اسے یکلخت اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت کی شکل میں حاصل ہونے والی نعمتِ عظمیٰ پر جذباتِ تشکر سے اس کا دل بھر آتا ہے اور اس کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے ۔

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

احقر کو یہی معنویت لیے ہوئے بے ساختہ بچپن میں پڑھا ہوا ایک کلام یاد آیا ۔

کعبے پر پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گئے
یوں ہوش وخرد مفلوج ہوئے دل ذوق تماشا بھول گیا

جب مومن کی نظر گنبدِ خضریٰ پر پڑتی ہے تو اس کا دل انوارِ تجلیات سے منور ہو جاتا ہے کبھی اس کی حالت مثلِ طُور کے ہوتی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی تجلیات پڑنے کی صورت میں ریزہ ریزہ ہو گیا اسی مناسبت کا ایک شعر جو خود صاحبِ کلام یعنی حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے آج ہی سنایا اور صورت یہ ہوئی کہ راقم السطور حضرت سے ملنے کے لیے دارالعلوم کراچی گیا اور استفسار کیا کہ اللہ تعالیٰ کے دل میں سمانے کا کیا مطلب ہے تو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تجلیاتِ الٰہیہ کا قلب میں آنا ہے نہ کہ خود اللہ کا دل میں آنا ہے جیسا کہ میرا شعر ہے ۔

بسا لینا کسی کو دل میں دل ہی کا کلیجہ ہے
پہاڑوں کو تو بس آتا ہے جل کر طور ہو جانا

گنہگاروں کا بڑا سہارا آپ ﷺ کی شفاعت ہے

گناہوں سے اپنے میں رنجور ہوں گا
بفیضِ شفاعت میں مغفور ہوں گا

اپنے گناہوں پر رنج وغم اور حزن وملال اور ندامت وشرمندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور حقیقی ولی کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ کرتے رہنا اور ڈرتے رہنا اور ان کو اپنی طاعات بھی اللہ جل شانہٗ کی عظمتِ شان کے سامنے سیئات محسوس ہوتی ہیں اس لیے وہ کانپتے لرزتے رہتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی امید کو اپنا اصل سہارا سمجھتے ہیں اس پر ایک بڑا عبرتناک واقعہ یاد آیا ایک شخص جو بظاہر دین کا بہت پابند نہ تھا مگر اس کے دل میں ایمان کی چنگاری تھی اور گناہوں میں بھی مبتلا رہتا تھا چنانچہ ایک دن اس کے ایک غیر مسلم دوست نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر دی تو اس نے اسی وقت اس کی گردن پر بوتل (Bottle) مار کر اسے مار ڈالا اور جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ جن کی شفاعت کی امید پر میں گناہ کیا کرتا تھا اس شخص نے ان کو برا کہا تو میں اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے گناہگاروں کے لیے حقِ شفاعت کا ملنا اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاقی قول ہے اس کے علاوہ دوسری شفاعتیں بھی احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہیں جیسے کہ شہداء اور حفاظِ کرام اور علماء کی شفاعت وغیرہ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت مومن کے لیے ایک بڑی امید کا سامان ہے۔

عاشقِ رسول اور خاکِ مدینہ

اڑے گی ہوا سے جو خاکِ مدینہ میں
تو ایسے غباروں میں مستور ہوں گا

اس شعر میں ذکر کردہ مضمون اس خاص محبت کی کیفیت کا ترجمان ہے جو تمام اہلِ محبت کا خاصہ ہے کہ محبوب کے در و دیوار، گلی کوچے اور گرد وغبار کے اندر اسے محبوب کی جھلک نظر آتی ہے اسی لیے اگر دیارِ حبیب کا گرد وغبار بھی بدن پر آ لگتا ہے تو وہ ان کو دنیا بھر کے مختلف نوع کے کریم (Creams) اور پاؤڈر (Powders) عمدہ قسم کی خوشبوؤں سے بھی زیادہ محبوب ہوتا ہے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا عشقِ مدینہ

اسی قلبی کیفیت کی ترجمانی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت اور وابستگی کا حال حضرت مولانا قاسم نانانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قصیدہ بہاریہ میں یوں فرمایا ؎

امیدیں لاکھ ہیں لیکن بڑی امید یہ ہے
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار

جیؤں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار
ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں بن کے تیرے غبار

اس پر احقر کو اپنے ساتھ پیش آمدہ ایک قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک ڈاکٹر (Doctor) کے یہاں بیٹھے بیٹھے دورانِ گفتگو کچھ دینی مسائل پر تبادلۂ خیال ہونے لگا تو اس نے احقر کے سامنے یہ اشعار پڑھے اور کہنے لگا کہ میں ایک عرصہ تک تمہارے علماء کے متعلق بدگمانی کا شکار تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ تمہارے دیوبندی علماء کو عشقِ رسول حاصل نہیں ہے لیکن حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدۂ بہاریہ پڑھنے کے بعد میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں اپنے اس غلط خیال اور بدگمانی سے تائب ہوا اور بہت سے اپنے مکتبِ فکر کے حضراتِ ائمہ مساجد اور علماء مدارس کو یہ اشعار دکھا کر مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عشقِ رسول کا ذکر کیا کہ یہ پورا قصیدہ تو عشقِ رسول کا کیا عمدہ ترجمان ہے تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

اور اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے حضراتِ اکابر اہل اللہ کو نہ صرف یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی درجے عشق تھا بلکہ آپ کے شہر کے در و دیوار اور اٹھنے والے غبار تک شاہوں کے تاجوں کے موتیوں سے زیادہ محبوب تھے حتیٰ کہ حضرت علامہ رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق مشہور بات ہے کہ مدینے سے آئی ہوئی کھجوروں کی گھٹلیوں کو پیس کر ان کا سفوف بنا کر کھایا کرتے تھے ان کو پھینکنا گوارا نہ تھا اللہ تعالیٰ راقم السطور اور اس کے جملہ متعلقین اور تمام مومنین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اور اطاعت کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

صلوٰۃ وسلام کی برکات

میں روضہ پہ صلِ علیٰ نذر کر کے
بہ دل نور ہوں گا بہ جاں نور ہوں گا

ظاہر ہے کہ جب ایک مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر پہنچ کر صلوٰۃ وسلام کا تحفہ پیش کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ڈائریکٹلی (Directly) بالمشافہ اس کو جواب عنایت فرماتے ہیں تو اس کے دل و جان کے روشن ہونے اور اس کا نصیب چمک اٹھنے میں کیا تردد ہوسکتا ہے ۔

جمال حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس کے لیے

میری شفاعت واجب ہوگئی اور جن اہل اللہ کا قلب مثلِ آئینہ کے صاف شفاف ہوتا ہے تو ان کے دلوں پر روضہ اقدس سے نکلنے والے انوار وتجلیات اور فیوض وبرکات کا عکس صاف اور واضح طریقے سے منعکس ہوجاتا ہے۔

مدینہ کے انوار شام و سحر سے
سراپا دل و جاں سے مسرور ہوں گا

ہر مسلمان وہاں جا کر صبح وشام رات دن توبہ واستغفار صلاۃ وسلام اور ذکر وتلاوت وغیرہ میں مشغول رہتا ہے اور عام طور پر دوسرے علائقِ دنیویہ سے یکسو اور خالی الذہن ہوجاتا ہے تو اس لیے خاص طور پر مدینے میں رہ کر ان عبادات کی کثرت ہوتی ہے جس سے دل وجان میں خوشی اور مسرت اور خاص کیف وسرور کا آنا ایک امرِ لابدی ہے اسی کو حضرت والا نے اس شعر میں ذکر کیا ہے ۔

میں ممنون ہوں گا خدا کے کرم کا
کبھی دل میں اپنے نہ مغرور ہوں گا

صاحبو! روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور کسی بھی نعمت کے ملنے پر ہر مسلمان کو یہی سوچنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے عطا کی ہے میرا اس میں کوئی استحقاق نہ تھا تو ان شاء اللہ وہ عجب وکبر اور غرور اور گھمنڈ سے محفوظ رہے گا اسی کو حضرت والا نے اس شعر میں ارشاد فرمایا کہ مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ مجھے گلستانِ طیبہ میں حاضری کی سعادت میسر آئی۔

دو شرطوں کے ساتھ قبولیت ونصرت موعود ہے

ہر اک امر میں راہِ سنت پہ چل کر
خدا کے کرم سے میں منصور ہوں گا

علمائے کرام نے لکھا ہے کہ مکۃ المکرّمۃ میں حاضری کے دوران ذکر لا الٰہ الّا اللہ کی کثرت اور مدینہ منورہ میں حاضری کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کا اہتمام رکھنا چاہیے اور آپ کی ایک ایک سنت پر عمل کرنے کی فکر اور لگن رہنی چاہیے اور وہاں سے یہ عزم کر کے اپنے وطن لوٹے کہ اپنی زندگی کے صبح وشام اور لیل ونہار کو آپ کی سنتوں کے نور سے منور کر کے زندگی گزاروں گا۔ یہی راستہ اصلاح وفلاح کا ضامن اور نصرت وتائیدِ الٰہی شاملِ حال ہونے کا ذریعہ ہے۔

صاحبو! راہِ سنت پر اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سنت کے مطابق عمل پر اللہ تعالیٰ کی مدد جب آئے گی جب کہ اس میں دو باتیں پائی جائیں نمبر ا۔ وہ عمل حدودِ شریعت سے باہر نہ ہو یعنی افراط وتفریط سے خالی ہو اور نمبر ۲۔ اس عمل کے کرنے میں مکمل اخلاص ہو ان دونوں شرطوں میں سے اگر کوئی شرط مفقود ہو تو پھر وہ

عمل نہ تو بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت آتی ہے نفس وشیطان جو ہمارے ازلی دشمن ہیں کبھی دین کے رنگ میں ہمیں ایسی راہ پر ڈال دیتے ہیں جس کی صورت تو دین ہوتی ہے اور ہم اس کو دین سمجھ کر کرتے رہتے ہیں مگر ان دو باتوں میں سے کسی ایک کے نہ پائے جانے کی وجہ سے بجائے قربِ خداوندی حاصل ہونے کے دن بدن ہم اللہ سے دور ہوتے جاتے ہیں اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

کوئی شخص خوب صدقہ وخیرات کرنے کا جذبہ رکھتا ہے اور جو بھی آتا ہے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے مگر شریعت نے اس پر اہل وعیال اور بیوی بچوں کا صرفہ ونفقہ جو لازم کیا ہے اس کو ادا نہیں کرتا ہے تو یہ عمل حدودِ شریعت سے متجاوز ہونے کی وجہ سے عنداللہ مقبول نہ ہوگا خواہ اس کے دل میں کتنا ہی اخلاص ہو اسی طرح وہ شخص کہ جو خوب مال ودولت اللہ کی راہ میں لٹاتا ہو اور اس کے ایڈورٹائز (Advertise) وتشہیر یعنی اپنے نام ونمود کے روشن ہونے اور چمکنے کی نیت دل میں رکھتا ہو تو گو کہ یہ عمل شریعت وسنت کے مطابق ہو مگر اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے اس پر نصرت وتائیدِ الٰہی کا وعدہ نہیں ہے۔

شہدائے اُحد کا درسِ صدق ووفا

احد کے شہیدوں کے خونِ وفا سے
سبق لے کے پابندِ دستور ہوں گا

اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہدِ الست سے وفا کا آخری درجہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کی راہ میں اپنی جان پیش کر دے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دامنِ احد میں ستر جانیں پیش کر کے اس عہدِ وفا کو پورا کر دکھایا اور اپنی جانوں کے عوض وہ جنت کے محلات اور اپنے مولیٰ کی رضا کے مستحق قرار پائے اور قیامت تک آنے والی امت کو یہ سبق دے گئے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جان ومال اہل وعیال گھر وکاروبار سب کچھ قربان کر دینا ہی حقیقی اسلام کی روح ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنے خالق ومالک کے حکم پر فدا ہو جانا اور اس پر مضبوطی سے جمے رہنا سچے مسلمانوں کا شیوہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں کا طریقہ ہے اپنی خواہشات و آرزؤں کا خون کر دینا اور انقیاد وفرمابرداری کے زیور سے آراستہ ہونا دنیا وآخرت کی سرخروئی کا ذریعہ ہے اور شہدا احد وغزوۂ احد کے متعلق تفصیلات سیرت کی کتابوں میں موجود ہے بس اس شعر میں حضرت والا نے ان کی اس فدائیت وجانثاری سے ملنے والے سبق کو ذکر کیا ہے۔

مدینہ سے دوری صرف جسمانی ہے

مدینہ میں جب قلب و جاں چھوڑ آیا
میں مجبور ہو کر نہ مہجور ہوں گا

مدینہ کی زیارت کی دولت سے مالا مال ہونے والا مسافر جب اپنے سفر کی آخری ساعات گزار رہا ہوتا ہے تو وہاں سے جدائی کے تصور سے اس کو جتنا بھی صدمہ اور رنج وغم ہو وہ کم ہے کیونکہ اس کائنات میں آپ سے زیادہ محبوب کوئی پیدا نہیں ہوا، اپنے محبوب سے جدائی ہر شخص کے لیے شاق ہوتی ہے اسی لیے بالآخر مسافرِ مدینہ یوں کہتے ہوئے رخصت ہوتا ہے جیسے ہمارے محترم تائب صاحب جونپوری کہتے ہیں ؎

اپنی پلکوں پہ تارے سجائے ہوئے
اور دلوں میں لیے بے کلی آگئے
وہ مدینہ وہ روشن نگر چھوڑ کر
پھر سے ہم شہر تیرہ شبی آگئے

اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں ہر سچے مسلمان کے دل کی حالت کی ترجمانی کی ہے کہ اگرچہ مدینہ سے جدائی پر ظاہر کے اعتبار سے تو ہم نے مدینہ چھوڑ دیا ہے اور جسم وقالب کے لحاظ سے ہم نے ہجران اختیار کرلیا لیکن ہمارے دل ودماغ اور قلب وروح مدینے کے ساتھ وابستہ ہیں اس لیے حقیقۃً ہم نے مدینے کو نہیں چھوڑا جیسا کہ حضرت والا نے دوسرے مقام پر اسی کو فرمایا ؎

اے اختؔر مرے قلب وجاں ہیں وہاں
مدینے سے گو دور رہتے ہیں ہم

قیامِ مدینہ اور اس کی یادوں کی دل سے وابستگی کے عنوان پر جگر مرحوم نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

بھول سکتا ہوں کہیں ان کی محبت کے مزے
میری آنکھوں میں وہ ایک ایک ادا پھرتی ہے

مسجد قبا میں نماز پڑھنا عمرہ کے برابر ہے

قبا کی زیارت و نفلوں سے اختؔر
ہر اک راہِ سنت سے مخمور ہوں گا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الصَّلٰوۃُ فِیْ مَسْجِدِ قُبَاءٍ کَعُمْرَۃٍ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی الصلوۃ فی مسجد قباء، ج:۱، ص:۷۳)

﴿كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي مَسْجِدَ قُبَاءٍ رَاكِبًا وَمَاشِيًا زَادَ ابْنُ نُمَيْرٍ فَيُصَلِّي فِيهِ رَكْعَتَيْنِ﴾

(صحيح البخاري، كتاب التهجد، باب اتيان مسجد قباء راكبا وماشيا، ج ۱، ص ۱۵۹)

یعنی مسجدِ قباء کی ایک نماز اجر وثواب میں ایک عمرے کے برابر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی پیدل اور کبھی سوار مسجدِ قباء میں تشریف لاتے تھے اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس میں دو رکعت نماز بھی پڑھتے تھے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا رخ کیا تو اول اول مدینہ سے باہر جنوبی غربی جانب بنوعمرو بن عوف کی بستی قباء میں قیام فرمایا تھا یہ مدینہ منورہ سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے پھر چند روز بعد مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تھے اس محلے میں جس مقام پر آپ نماز پڑھا کرتے تھے وہاں مسجد تعمیر کی گئی۔

جس کی دیوار قبلہ کا رخ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے درست کیا اور بنیاد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے لیے پتھر ڈھونڈنے میں شریک رہے اسلام کی یہ سب سے پہلی مسجد تھی آپ اکثر ہفتہ کے روز اس مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھتے تھے متعدد روایتوں میں اس کی فضلیت آئی ہے

مدینہ منورہ میں حاضر ہونے والوں کو اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو مسجدِ قباء میں حاضر ہو کر کوئی نماز یا تحیۃ المسجد ضرور ادا کرنی چاہیے۔

در منزلے کہ جاناں روزے رسید باشد
باخاکِ آستانش داریم مرحبائے

دیارِ مدینہ

نظر ڈھونڈتی ہے دیارِ مدینہ
ہیں دِل اور جاں بے قرارِ مدینہ

وہ دیکھو اُحد میں شجاعت کا منظر
شہیدوں کے خونِ شہادت کا منظر

وہ ہے سامنے سبز گنبد کا منظر
اسی میں تو آرام فرما ہیں سرور

ابو بکرؓ و فاروقؓ و عثمانؓ و حیدرؓ
یہیں تھے یہ پروانۂ شمعِ انور

یہیں سے تو اسلام پھیلا جہاں میں
مدینہ کا شہرہ ہے ہفت آسماں میں

نشانِ نبی ہے یہ مسجد قبا کی
ہے قندیل طیبہ نبی کی ضیاء کی

مدینہ کے دیوار و در دیکھتے ہیں
عجب حال قلب و جگر دیکھتے ہیں

یہ مسکن ہے شاہِ مدینہ کا اخترؔ
فلک بوسہ زن ہے یہاں کی زمیں پر

مشکل الفاظ کے معنی:۔ دیارِ: گھر۔بے قرار: بےچین۔اُحد: پہاڑ کا نام۔شجاعت: بہادری۔ شُہرہ: شہرت۔ ہفت آسماں: ساتوں آسمان۔قندیل: دِیا۔ضیاء: روشنی۔مَسکن: رہائش گاہ۔ فلک: آسمان۔بوسہ زن: چوم لینا۔

جوارِ محمد ﷺ میں رہتے ہیں ہم

زمیں پر مدینہ کی رہتے ہیں ہم
فلک پر مگر ناز کرتے ہیں ہم

نہ پوچھو کہ کیا ہے ہمارا شرف
جوارِ محمد ﷺ میں رہتے ہیں ہم

کرم ہے یہ مالک کا اے دوستو!
مدینے کی بستی میں بستے ہیں ہم

مدینے کی نسبت ہے قیمت مری
وگرنہ حقیقت میں سستے ہیں ہم

مدینہ میں مرنا مقدر میں ہو
خدا سے دعا یہ بھی کرتے ہیں ہم

یہ نالائقوں پر ہے رب کا کرم
محمد ﷺ کی نگری میں رہتے ہیں ہم

شفاعت محمد ﷺ کی بھی ہو نصیب
دعا رات دن یہ بھی کرتے ہیں ہم

مدینے میں ہر سال ہو حاضری
خدا سے یہ فریاد کرتے ہیں ہم

پس اے ساکنانِ مدینہ مجھے
نہ بھولو گذارش یہ کرتے ہیں ہم

اے اخترؔ مرے قلب وجاں ہیں وہاں
مدینے سے گو دور رہتے ہیں ہم

مشکل الفاظ کے معنی:۔ فلک: آسمان۔ناز: فخر۔شرف: نصیب۔ جوار: پڑوس۔ نسبت: تعلق۔مقدر: تقدیر میں ہو۔ نگری: گلی۔ساکنانِ مدینہ: مدینہ میں رہنے والے۔

فدا تجھ پہ میں خاکِ شہرِ مدینہ

مبارک تجھے ہو اے ارضِ مدینہ — نبی کا شہر ہے یہ شہرِ مدینہ
ترے پاس جب سیدِ دوجہاں ہے — نہ کیوں رشکِ افلاک ہو پھر مدینہ
ترے سبز گنبد پہ عالم فدا ہے — فلک جیسے چومے زمینِ مدینہ
ترا ذرّہ ذرّہ نشانِ نبی ہے — فدا تجھ پہ میں خاکِ شہرِ مدینہ
اُحد کے یہ دامن میں خونِ شہیداں — سبق دے رہا ہے وفائے مدینہ
نشانی ہے اسلام کی عظمتوں کی — صحابہ کے قدموں سے خاکِ مدینہ
وفاداریوں پر صحابہؓ کی اخترؔ — ہے تاریخ روشن یہ شہرِ مدینہ

مشکل الفاظ کے معنی:۔ ارض: زمین۔ افلاک: فلک کی جمع، آسمان۔ فدا: قربان۔ اُحد: پہاڑ کا نام۔ دامن: بیچ میں۔

یا جبال الحرم یا جبال الحرم

میری نظروں میں تم ہو بڑے محترم — یا جبال الحرم یا جبال الحرم
یہ دعائے حرم لذتِ ملتزم — ہو عطا سب کو یہ نعمتِ مغتنم
اے خدا ہے فقط آپ کا یہ کرم — کر رہے ہیں جو ہم سب طوافِ حرم
آگیا سامنے روضۂ محترم — جس کی زیارت کو یارب ترستے تھے ہم
رحمتِ دوجہاں کا ہے فیضِ اتم — جن کے صدقے میں مسلم ومومن ہیں ہم
آپ ہی کے شرف سے یہ رُتبہ ملا — امتِ مسلمہ ہے جو خیر الامم
ہیں سلاطینِ عالم بھی احرام میں — بن کے حاضر ہوئے ہیں گدائے حرم
میرے مالک یہ اخترؔ کی سن لے دعا — ہو مقدر میں ہر سال دیدِ حرم

مشکل الفاظ کے معنی:۔ جبال الحرم: حرم کے پہاڑ۔ نعمتِ مغتنم: قابلِ قدر نعمت۔ فیضِ اتم: کامل فیض۔ خیرُ الامم: بہترین اُمت۔ سلاطینِ عالم: دنیا کے بادشاہ۔ گدا: فقیر۔ دید: زیارت۔

لذتِ ذکرِ نامِ خدا ہے چمن

لذتِ ذکرِ نامِ خدا ہے چمن
اور غفلت کی دنیا ہے دشت و دمن

کی ہے جس نے بھی ہجرت ترے نام پر
پا گیا پا گیا وہ بہارِ وطن

ہے ضروری گناہوں کو بھی چھوڑ دے
اصل ہجرت نہیں صرف ترکِ وطن

یہ ہے فیضانِ آہ وفغاں دیکھ لو
دامنِ کوہ میں دل ہے کیسا مگن

بالیقیں پائے گا نسبتِ اولیاء
جس کے دل کو لگی ہے خدا سے لگن

شہرِ محبوب ہو گا جہاں بھی کہیں
عاشقوں کا سنا ہے وہی ہے وطن

پھر مدینے کی لذت کو میں کیا کہوں
کاش ہوتا مدینے میں میرا وطن

کس طرح میں کہوں دل سے اے دوستو
زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن

ہیں وطن میں مگر دل مدینے میں ہے
اے مدینہ! فدا تجھ پہ ہوں صد وطن

نیک لوگوں میں ہو صاحبِ دردِ دل
ہے چمن میں کوئی جیسے رشکِ چمن

روز و شب ہے یہ اختؔر کی آہ و فغاں
بخش دے روزِ محشر مجھے ذوالمنن

مشکل الفاظ کے معنی: چمن: باغ۔ دشت: جنگل۔ دمن: کوڑا پھینکنے کی جگہ۔ دامنِ کوہ: پہاڑ کے نیچ میں۔ مگن: مست۔ فیضانِ آہ وفغاں: اللہ تعالیٰ کی محبت میں رونے پر جو رحمت برستی ہے۔ بالیقیں: یقیناً۔ نسبتِ اولیاء: ولایت۔ لگن: دھن۔ صد وطن: سینکڑوں وطن۔ ذُو المنن: اللہ تعالیٰ۔

نامِ خدا کی لذت وحلاوت

لذتِ ذکرِ نامِ خدا ہے چمن
اور غفلت کی دنیا ہے دشت و دمن

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ دلوں کو اطمینان ملنے اور لذت وسرور حاصل ہونے کا محض ایک ہی راستہ ہے اور وہ اللہ کی یاد ہے یعنی مومن بندہ ہر حال کے حکم کو اپنے اوپر نافذ کرلے اور اللہ کے احکام کو سر سے پیر تک اس طرح اوڑھ لے کہ جس طرح مچھلی پوری کی پوری پانی میں رہ کر قرار پاتی ہے اس لیے تفسیرِ مظہری کے مفسر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بذکر اللّٰہ میں جو باء ہے یہ فی کے معنی میں ہے اور اس کی مثال میں فرماتے ہیں کَمَا اَنَّ السَّمَکَۃَ تَطْمَئِنُّ فِی الْمَآءِ لاَ بِالْمَآءِ۔ اللہ کا نام لینے میں بندے کو وہ کیف وسرور ملتا ہے جو دل کو باغ وبہار کردیتا ہے اسی کو حضرت والا نے فرمایا ؎

اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے
عاشقوں کا مینا اور جام ہے

اور بالفاظِ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام
شیر و شکر می شود جانم تمام

اور اس نام کی لذت وحلاوت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ؎

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیرِ دورِ جام ہے

صاحبو! بعض لوگ اس شک وشبہ میں پڑے رہتے ہیں کہ صرف اللہ اللہ کا ذکر مشروع نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن میں یہ نہ فرماتے:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾

(سورۃ المزمل، آیت:۸)

ترجمہ: اور پڑھے جا نام اپنے رب کا اور چھوٹ کر چلا آ اس کی طرف سب سے الگ ہوکر۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۵۸۴)

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ اسم سے معلوم ہوا کہ تنہا اللہ کے اسم ذات کا ذکر بھی مشروع ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اللّٰهُ اللّٰهُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان فی اٰخر الزمان، ج:۱، ص:۸۴)

کہ جب تک اللہ اللہ کہنے والا کوئی زمین پر باقی ہوگا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی کہ اس میں صرف اللہ اللہ اسمِ ذات کا ذکر مشروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

جبکہ اس کے بالمقابل اللہ کی یاد سے غافل رہنے والے انسان کا دل ویران اور اجاڑ ہوجاتا ہے جیسا کہ جنگل کی ویرانی اور بربادی اور اسے کسی کل سکون نہیں ملتا جیسا روزمرہ پیش آنے والے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر خودکشی کرنے والے اور ڈیپریشن (Depression) اور ٹینشن (Tension) کے بیمار بڑے بڑے بنک بیلنس (Bank Balance) کے مالک ہوتے ہیں اور مادی اسبابِ عیش وعشرت کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں ہوتی مگر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے الفاظ میں وہ اسبابِ سکون کے مالک ہوتے ہیں مگر سکون سے عاری ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں الگ ہیں سامانِ سکون بازاروں میں ملتا ہے مگر سکون نہیں ملتا ہے وہ صرف اللہ کی یاد میں ہے جیسا کہ اسی کو حضرت والا نے دوسرے مقام پر یوں فرمایا ؎

سکونِ دل اترتا ہے فلک سے اہلِ تقویٰ پر
بدوں حکمِ خدا سائنس داں پھر کیسے پا جاتا

اگر پٹرول کے مانند ہوتا یہ سکونِ دل
زمیں میں کرکے بورنگ اس کو ہر کافر بھی پا جاتا

حقیقتِ ہجرت پر ہی وطن کی بہار ملتی ہے

کی ہے جس نے بھی ہجرت ترے نام پر
پاگیا پاگیا وہ بہارِ وطن
ہے ضروری گناہوں کو بھی چھوڑ دے
اصل ہجرت نہیں صرف ترکِ وطن

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ہجرت کے فرض ہونے کے بعد اپنے وطن وقوم اور اپنے اہل وعیال اور اقرباء واعزاء اور اپنی تجارت وکاروبار کو اللہ کے نام پر چھوڑ دیا حتی کہ خود اللہ کے لیے اللہ کے گھر کو چھوڑ دیا اور جو گھر کو گھر والے کی خوشی میں چھوڑ دے تو گھر والا اس کو بغیر گھر کے مل جاتا ہے۔

صاحبو! اس گفتگو سے شریعت کا انتہائی قیمتی اصول سامنے آتا ہے کہ ہر عمل سے مومن کا مقصود خود عمل نہیں بلکہ اللہ کی ذات ہوتی ہے اسی لیے جب اللہ کا حکم بیت اللہ کو چھوڑنے کا ہو تو پھر اس کا چھوڑنا ہی عبادت ہے جب اللہ کا حکم صوم وصلوٰۃ نہ کرنے کا ہو تو نہ کرنا ہی عبادت ہے کیونکہ اللہ کی رضا بندے کو نہ کرنے سے مل رہی ہے اور سبحان اللہ کیا ہی مبارک آج کا دن ہے کہ ذوالحجہ کی نو تاریخ ہے جبکہ یہ مضمون لکھا جارہا ہے تمام حجاج کرام بیت اللہ کو چھوڑ کر ٹھیک اسی وقت اللہ کے سامنے آہ وزاری اور گریہ وبکاء میں مصروف ہیں اگر آج کوئی حاجی اللہ کے گھر کے عشق میں بیت اللہ سے چمٹا رہے اور عرفات نہ جائے تو دوستو! نہ اس کا حج صحیح ہوگا نہ اس کو اللہ کی رضا حاصل ہوگی اسی سے یہ اصول نکل کر سامنے آیا کہ ہجرت کی اصل حقیقت حق تعالیٰ کی ناراضگی کے کاموں کا ترک کرنا ہے محض ترکِ وطن نہیں جب جو حکم ملے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کردے اسی لیے نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

﴿وَ الْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، ج: ۱، ص: ۶)

کہ حقیقی مہاجر اللہ کے ممنوعات ومحرمات یعنی گناہوں کو چھوڑنے والا ہے۔ اسی کو حضرتِ والا نے اگلے شعر میں پیش کیا ہے ۔

ہے ضروری گناہوں کو بھی چھوڑ دیں
اصل ہجرت نہیں صرف ترکِ وطن

دل میں یادِ الٰہی سکونِ دائمی کی جڑ ہے

یہ ہے فیضانِ آہ و فغاں دیکھ لو
دامنِ کوہ میں دل ہے کیسا مگن

کسی مومن کے دل سے آہ وفغاں جب ہی نکلتی ہے جب اس کا دل غفلت وقساوت کے میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں تو پھر وہ جس جگہ میں رہے اور جس فضا میں رہے اس کا دل یادِ خداوندی میں مست ومگن رہتا ہے اور وہ دنیا کے غموم وافکار سے بےفکر وبےغم کر دیا جاتا ہے، اس لیے اسے پہاڑ کے دامن میں بھی وہی لطف آتا ہے جو کسی شاندار بنگلے اور عالی شان محل میں آیا کرتا ہے کیونکہ اس کے دل کی مستی وکیف وسرور کا تعلق بیرونی عیش وعشرت کی چیزوں سے نہیں ؎

جائیے کس واسطے اے دردؔ میخانے کے بیچ
اور ہی ہستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

اللہ سے اللہ کا سائل محروم نہیں رہ سکتا

بالیقیں پائے گا نسبتِ اولیاء
جس کے دل کو لگی ہے خدا سے لگن

حضرت تھانوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو اپنے اللہ سے اللہ کو مانگے گا اللہ اس کو ضرور ملیں گے بس اس مقصد کے لیے دھن اور دھیان، تڑپ اور لگن کی ضرورت ہے پھر جوش میں آ کر حضرت یہ شعر پڑھتے تھے ؎

عاشق نشد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ! درد نیست وگرنہ طبیب ہست

کہ کوئی اللہ کا عاشق ایسا نہیں گزرا کہ جس نے صدقِ دل سے اللہ کو مانگا ہو اور اللہ نے اس کے حال پر نظرِ کرم نہ فرمائی ہو اے میرے پیارے! تم میں درد ہی نہیں ورنہ طبیب تو ہے جو درد کا درماں کرے گا۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے اس کی جستجو میں اس سے بھی زیادہ مضطرب وبےقرار رہنے کی ضرورت ہے جس طرح کوئی شدید بھوک وپیاس کا شکار آدمی کھانے اور پانی کی تلاش میں بےچین رہتا ہے اور یہ راہ تھک کر بیٹھنے والی راہ نہیں بلکہ اس راہ پر چلنے والا ہر قدم پر اپنی منزل کو پا رہا ہے اگر کبھی ٹھوکریں لگ کر گر جائے اور نفس وشیطان کے اثر سے طبیعت میں کچھ تاثر آئے اسے فوراً ہی یہ کہہ کر دفع کر دے جیسا کہ شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ پڑھا کرتے تھے ؎

ہم نے طے کی اس طرح سے منزلیں
گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا اتنا عرصہ ہوا ذکر وفکر میں مجھے مقصود حاصل نہیں ہوا کیا بنے گا حضرت نے فرمایا اے میاں! یہ طلب ہی اصل مقصود ہے جس میں تم لگے ہو، جلدی نہ کرو اور پھر جوش میں آکر یہ شعر پڑھا ؎

یابم او را یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں جستجو تو ہے وہ مجھے ملتے ہیں یا نہیں میری آرزو تو ہے شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ نے فرمایا ؎

اگر ہیں آپ صادق اپنے اقرارِ محبت میں
طلب خود کر لیے جائیں گے دربارِ محبت میں

اس لیے مرتے دم تک گرتے پڑتے جیسے بھی ہو اللہ کو پانے کی جستجو میں لگا رہنا ہی اصل طریق اور روحِ سلوک ہے اور قلب میں نسبتِ اولیاء اللہ کامل جانے کا ذریعہ ہے۔

جہاں میرا محبوب وہی میرا وطن

شہرِ محبوب ہو گا جہاں بھی کہیں
عاشقوں کا سنا ہے وہی ہے وطن
پھر مدینے کی لذت کو میں کیا کہوں
کاش ہوتا مدینے میں میرا وطن
کس طرح میں کہوں دل سے اے دوستو!
زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن
ہیں وطن میں مگر دل مدینے میں ہے
اے مدینہ! فدا تجھ پہ ہوں صد وطن

ان تمام اشعار میں مدینہ منورہ کو اپنے محبوب کے وطن ہونے کی نسبت سے ذکر کرکے اس سے دل کی وارفتگی اور تعلق کا ذکر کیا گیا ہے اور ایک عجیب نکتے کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ میں مدینے کے سوا کسی جگہ کے لیے دل سے زندہ باد کیسے کہہ سکتا ہوں جبکہ میرا دل سوائے مدینے کے کسی اور جگہ ہے ہی نہیں۔

نیک لوگوں میں ہو صاحب دردِ دل
ہے چمن میں کوئی جیسے رشکِ چمن

وہ اللہ کا نیک بندہ جو اپنے سینے میں خدا کی محبت میں تڑپنے والا دل رکھتا ہو اور اس کی آنکھیں اللہ کے خوف سے اشکبار رہتی ہوں تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے پورے چمن میں کوئی درخت ایسا ہو جو سارے چمن کے لیے قابلِ رشک ہو اس لیے مطلق نیک ہونا الگ بات ہے اور اس مقام ومرتبے پر پہنچنا جو اولیائے صدیقین کو حاصل ہوتا ہے یہ خاص مقربین بارگاہِ الٰہی کی شان ہوتی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کے تین درجے ذکر فرمائے ہیں۔

ہم جیسوں کے لیے بڑی اُمید افزا آیت قرآنی

﴿فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾

(سورۃ الفاطر، آیت: ۳۲)

ترجمہ: پھر کوئی ان میں برا کرتا ہے اپنی جان کا اور کوئی ان میں ہے بیچ کی چال پر اور کوئی ان میں آگے بڑھ گیا ہے لے کر خوبیاں اللہ کے حکم سے۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۳۳۹)

تو گویا تین درجے ہوئے ظالم، مقتصد، سابق، علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ظالم سے مراد کہ واجبات کی ادائیگی کے ساتھ وہ بعض گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور مقتصد وہ کہ واجب ادا کرتا ہے ساتھ ہی سنت کا اہتمام بھی کرتا ہے لیکن بعض مکروہات اور ناپسندیدہ چیزوں میں ابتلاء رکھتا ہے اور سابق وہ کہ جو بعض جائز چیزوں اور مباح امور کو اس وجہ سے ترک کر دیتا ہے کہ اس سے عبادت میں خلل پڑتا ہے یا اس میں شبہ حرام کا ہوتا ہے یعنی مشتبہات سے پرہیز کرتا ہے تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ تینوں قسم کے حضرات مغفور اور جنتی ہیں ان شاء اللہ دوسری بات اہم نکتے کی یہ ہے جو مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے کہ آیت کی ابتداء میں اَلَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا اس سے امت محمدیہ کی عظیم فضیلت ظاہر ہے کیونکہ لفظ اِصۡطَفَیۡنَا قرآن کریم میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے لیے وارد ہوا ہے اور ملائکہ کے لیے جیسے اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا اور اَللّٰهُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا البتہ انبیاء کا اِصۡطَفَیۡنَا اور انتخاب اعلیٰ درجے کا اور مومنین کا اصطفاء اس سے کم درجے کا ہے۔

ساری آہ وفغاں کا نچوڑ مغفرت کا نصیب ہو جانا ہے

روز و شب ہے یہ اخترؔ کی آہ و فغاں
بخش دے روزِ محشر مجھے ذوالمنن

نظم کے اخیر میں حضرت والا ایک دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! شب و روز کے تمام آہ و نالوں کا ایک ہی مقصد اور بس اتنا نچوڑ ہے کہ جب یہ بندہ کل روزِ محشر جب آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو تو آپ نظرِ رحمت ڈال کر اس

کے لیے مغفرت کا فیصلہ کردیں کہ آپ کی شان یہ ہے کہ آپ ذوالمنن ہیں اور بلا استحقاق عطا کرنے والے کریم بلکہ اکرم الاکرمین ہیں اس لیے امید ہی نہیں بلکہ آپ کی ذاتِ عالی سے یہ یقین ہے کہ آپ مجھے بلا استحقاق نعمتِ مغفرت بھی عطا فرمادیں گے جیسا کہ حضرت والا کے ایک دوسرے شعر میں ہے ؎

روزِ محشر اے خدا! رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

اور ؎

یارب! تیرے کرم سے یہ کچھ بھی نہیں بعید
رحمت بروزِ حشر تیری بے شمار ہو

اور فرمایا ؎

اپنے کرم سے بھیک مجھے مغفرت کی دے
بندہ تیرا محشر میں نہ یہ شرمسار ہو

منقبتِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

سینہ دیدہ میں پوشیدہ جمالِ حق کی تابانی
صحابہ کے دلوں کو جس نے بخشا نورِ یزدانی

وہ سلطانِ جہاں تھے قلب میں تھا فقر پنہانی
مقامِ عبدیت کے ساتھ تھی ان کی جہاں بانی

خدادیدہ نظر کو چونکہ دیکھا تھا صحابہ نے
وہ ایماں آج کیسے پاسکے گا کوئی ربانی

تجلی گاہ جو جاں تھی اسی روح منور سے
ہر اک مومن کو ہوتی تھی عطاء معراجِ روحانی

مبارک ان کی آنکھوں کو کہ جن آنکھوں نے دیکھے تھے
نبی کے چہرۂ انور پہ جلوہ ہائے ربانی

جنہوں نے مال و زر بھی آبرو بھی جان بھی دے دی
کوئی جانے گا کیا ان کا مقامِ کیفِ احسانی

ہمیشہ ہر صحابی راہِ سنت کا تھا شیدائی
وہ دیوانے تھے لیکن خاک پا تھی ان کی فرزانی

یہ کیسا معجزہ تھا دوستو! شانِ رسالت کا
شتر بانوں کو بخشے جس نے آدابِ جہانبانی

خدا ان سے ہے راضی اور وہ رب سے ہوئے راضی
شہادت اس حقیقت پر ہیں خود آیاتِ قرآنی

بھلا غیرِ صحابی پا سکے گا مرتبہ اُن کا
کہ ہے منصوص اُن پر رحمت حق فضلِ رحمانی

صحابہ کی محبت کو بھی ہم ایمان سمجھتے ہیں
کہ اُن کے دم سے اُمت کو ملی تعلیم قرآنی

صحابہ کی حیاتِ باوفا تاریخ ایماں ہے
جو اخترؔ دے رہی ہے رات دن پیغامِ ایمانی

مشکل الفاظ کے معنی: سیہ دیدہ: آنکھ کی سیاہ پتلی۔ جمالِ حق: اللہ تعالیٰ کا جمال۔ تابانی: روشنی۔ نورِ یزدانی: اللہ تعالیٰ کا نور۔ سلطانِ جہاں: دنیا کے بادشاہ۔ پنہانی: چھپا ہوا۔ عبدیت: بندگی۔ جہاں بانی:......۔ خُدا دِیدہ نظر: جس آنکھ نے خدا کو دیکھا ہو۔ ربّانی: اللہ والا۔ مال وزر: مال ودولت۔ آبرو: عزت۔ کیفِ احسانی: اللہ تعالیٰ کی حضوری کی لذت۔ شیدائی: دیوانہ۔ خاکِ پا: پاؤں کی خاک۔ فرزانی: عقل۔ شُتربانوں: اُونٹ چرانے والے۔ منصوص: جس کی تائید قرآن پاک میں ہو۔ رحمتِ حق فضلِ رحمانی: اللہ تعالیٰ کی رحمت اوراس کا فضل۔

قلوبِ صحابہ کی تابانی عکسِ جمالِ یزدانی ہے

سیہ دیدہ میں پوشیدہ جمالِ حق کی تابانی
صحابہ کے دلوں کو جس نے بخشا نورِ یزدانی

یہ اشعار حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح اوران کی عظمت ومحبت کے بیان میں ہے جس شخص نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں ایمان کے ساتھ دیکھا ہو اور اسی پر اس کی موت واقع ہو اسے صحابی کہا جاتا ہے حدیث کی کتابوں میں حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل ومحامد کے سلسلے میں باقاعدہ ابواب قائم کئے گئے ہیں بنیادی طور پر اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام اللہ کی پسندیدہ اور محبوب جماعت ہے اوران سے جو اختلافات ومشاجرات واقع ہوئے ہیں وہ سب اجتہاد پر مبنی ہیں اس لیے سب برحق ہیں اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ کی بشارت سنائی اور ایک جگہ فرمایا کہ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الۡاِیۡمَانَ کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کولکھ دیا ہے اور بہت سی آیات اوراحادیث اس معنیٰ میں موجود ہیں۔

ان کے مقام کا اندازہ اس امت کے جلیل القدر محدث مفسر مجاہد حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے اس قول سے بخوبی ہوسکتا ہے جس میں ان سے پوچھا گیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کس کا مرتبہ زیادہ بڑھ کر ہے تو جواب ارشاد فرمایا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جو جہاد کیا ہے اس میں استعمال ہونے والے گھوڑے کے پیروں کے نیچے سے اڑنے والے غبار کے برابر بھی میں عمر بن عبدالعزیز کو نہیں سمجھتا اس لیے باتفاقِ امت کوئی بڑے سے بڑا ولی خواہ وہ کسی بھی درجے پہ پہنچ جائے ادنیٰ سے ادنی صحابی کے درجے کو بھی نہیں پہنچ سکتا اور شرفِ صحابیت نبوت کے بعد اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑا شرف اور سعادت ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلافات کو بیان کرنا اوران کی تنقیص یا ان پر تنقید کرنا اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے خلاف ہے جوایسا کرے وہ فاسق وفاجر اور بددین ہے حضرت والا

ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے جمالِ حق کا مشاہدہ کرایا جس کے نتیجے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا ایسا خاص نور راسخ ہوا کہ جس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا مرتبہ انبیاء کے بعد سب سے اونچا ٹھہرا اور اس صحبت کی برکتوں سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مراتب ودرجات اتنے اونچے قرار پائے کہ کوئی ولی کتنے ہی مجاہدات وریاضتیں کرکے بھی اس درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔

نہ پائیں گے کبھی اہلِ جنوں کی شان یکتائی
کریں اہلِ خرد تاعمر چاہے خامہ فرسائی

شرف صحابیت کی برکت سے فقر میں سلطنت کا ملنا

وہ سلطانِ جہاں تھے قلب میں تھا فقر پنہانی
مقامِ عبدیت کے ساتھ تھی ان کی جہاں بانی

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑے اونچے درجے کا مقامِ عبدیت عطا فرمایا تھا اس لیے مسکنت اور عاجزی، تواضع اور فنائیت جیسے اوصاف ان میں بے شمار تھے فقیری میں رہ کر اللہ تعالیٰ نے ان کو بادشاہت عطا فرمائی تھی اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو اللہ کے سامنے اپنے کو مٹاتا ہے اور مکمل طور پر خدا کا ہوجاتا ہے تو پھر سارا عالم اس کا ہوجاتا ہے۔

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اک تو نہیں میرا تو کوئی شئے نہیں میری

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو یعنی اس کے تقاضوں پر ثابت قدم رہتے ہو اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾

(سورۃ النور: آیت: ۵۵)

ترجمہ: (اے مجموعہ امت) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں (یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نور ہدایت کا کامل اتباع کریں) ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمادے گا جیسا ان سے پہلے (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۴۳۸)

جانوروں پر صحابہ کی حکمرانی

اللہ تبارک تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے صدقے ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ کفار بادشاہ ان کے ناموں سے کانپتے اور لرزتے تھے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان کی آواز میں ایسا اثر رکھا تھا کہ جب وہ اللہ کی عظمتوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا واسطہ دے کر سمندروں اور دریاؤں درند اور چرند کو پکار کر خطاب کرتے تھے تو وہ بھی ان کے سامنے مطیع نظر آتے تھے چنانچہ جب حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک لشکر افریقہ کے جنگلات میں پہنچا اور وہاں کے درندوں اور کیڑوں مکوڑوں کو یوں خطاب کیا:

﴿أَيَّتُهَا الْحَشَرَاتُ وَالسِّبَاعُ نَحْنُ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْحَلُوْا عَنَّا، فَإِنَّا نَازِلُوْنَ فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ قَتَلْنَاهُ﴾

(معجم البلدان، حرف القاف والیاء وما یلیھما، ج:۳، ص: ۴۲۱، دار الاحیاء التراث العربی)

نبوت کے بعد شرفِ صحابیت کا مرتبہ ہے

خدا دیدہ نظر کو چونکہ دیکھا تھا صحابہ نے
وہ ایماں آج کیسے پاسکے گا کوئی ربانی

اس شعر میں بڑے قیمتی نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ایک ایسی خصوصیت حاصل ہے کہ جو کسی دوسرے کو ہو ہی نہیں سکتی اور وہ یہ کہ ان کی نظریں اس ہستی پر پڑیں جس کو معراج کے موقعہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا۔

تو جس نے خدا دیدہ نظر کو دیکھا ہو اور اس ہستی کی نگاہیں جس پر پڑی ہوں اس کے برابر بعد میں آنے والا کوئی بڑے سے بڑا ولی اللہ کیسے ہوسکتا ہے اس لیے کہ نظر کی تاثیر ایک مسلّم حقیقت ہے جس کو ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں پیش کیا ہے کہ اگر نظرِ بد کی تاثیر برحق ہے تو اللہ والوں کی اچھی نظر میں کیوں اثر نہ ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ عنایت کا کیا ہی کہنا ڈاکٹر عارفی کا فرمودہ ہے ؎

نہ جانے کس ادا سے میری جانب اس نے دیکھا تھا
ابھی تک دل میں تاثیرِ نظر محسوس ہوتی ہے

صاحبو! جب اللہ والوں کی زیارت کا یہ اثر حدیثِ پاک میں موجود ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللهُ یعنی جب ان کو دیکھا جاتا ہے تو اللہ کی یاد آتی ہے تو پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیدار کی جو بھی فضیلت اور اہمیت ذکر کی جائے وہ کم ہے اسی لیے چند لمحہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت بحالتِ ایمان شرفِ صحابیت

ملنے کا باعث قرار پائی خواہ طویل صحبت نہ رہی ہو گویا اس شعر میں اسی راز کو بیان کیا گیا ہے کہ محض اللہ کے نبی کا دیدار کیوں اس قدر فضیلت کا باعث ہے۔

تجلیات نبوت اور معراج روحانی

تجلی گاہ جو جاں تھی اسی روح منور سے
ہر اک مومن کو ہوتی تھی عطاء معراجِ روحانی

یعنی اللہ تبارک تعالیٰ کی تجلیات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلبِ مبارک پر پڑتی تھی اور آپ سے آپ کے متحابین اہلِ ایمان ان تجلیات و انوار سے منور اور روشن ہوتے تھے اور آپ کی صحبت کے نتیجے میں ہر مومن کو معراجِ روحانی عطا ہوتی تھی کیونکہ جس طرح آفتابِ دنیا کے نور سے روشن ہونے والا آئینہ کا عکس ارد گرد کو روشن کرتا ہے تو ضرور بضرور اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیات سے متجلی ہونے والا قلب دوسرے قلوب کو منور اور روشن کردے گا اس لیے آپ کی تعلیمات وہدایات اور آپ کی خاص عنایات وتوجہات کی بدولت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو معراجِ روحانی نصیب ہو جاتی تھی یعنی ان کا جسم اگرچہ زمین پر موجود ہے مگر ان کا دل ودماغ عرشِ اعظم پر اللہ سے ملاقات کررہا ہوتا ہے۔

مبارک ان کی آنکھوں کو کہ جن آنکھوں نے دیکھے تھے
نبی کے چہرۂ انور پہ جلوہ ہائے ربانی

اس شعر میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بحالتِ ایمان زیارت کی اہمیت کو ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کی حقانیت کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بہت سے سچے عشاق کے چہروں پر اپنی خاص تجلیاتِ جذب رکھی ہیں یعنی ان چہروں پر انسان نظر ڈالتے ہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ چہرے والا جس مذہب کا ماننے والا ہے وہ مذہب ضرور سچا اور حق ہے۔

چنانچہ ایسے مختلف واقعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں پیش آئے کہ آپ کے چہرۂ انور پر نظر پڑتے ہی آپ کی جان کا دشمن کافر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا اور اس نوع کے واقعات ہمارے بہت سے اکابر کے ساتھ بھی پیش آتے رہے۔ چنانچہ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ لندن (London) تشریف لے گئے تو جب ائیر پورٹ (Airport) پر اتر کر امیگریشن (Immigration) سے نکل رہے تھے تو وہاں کے عملے کے بہت سے غیر مسلم مرد و عورتیں آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے اور انگریز آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ انسان عام انسانوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ جزز (Jesus) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معلوم ہوتے ہیں اسی طرح میرے استاذ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور میرے شیخ حضرت مولانا شاہ

حکیم محمد اختر صاحب مدظلہم کے ساتھ بھی اس نوع کے قصے پیش آئے اور بعضوں نے یہ کہتے ہوئے اسلام قبول کیا کہ جس مذہب کے یہ شخص ہیں وہ مذہب جھوٹا نہیں ہوسکتا اس لیے میں بھی اس میں داخل ہوتا ہوں۔

جان و مال کی قربانی پر مقامِ احسانی کا ملنا

جنہوں نے مال و زر بھی آبرو بھی جان بھی دے دی
کوئی جانے گا کیا ان کا مقامِ کیفِ احسانی

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے ایمان اور اسلام کو بچانے کیلیے اللہ کی راہ میں ہر اس چیز کی قربانی پیش کی جس کی قربانی متصور ہوسکتی ہے اور جو انسان کو محبوب اور پیاری اشیاء ہوتی ہیں جان و مال و اولاد عزت و آبرو سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کردیا اور اپنے دل سے اللہ و رسول کی محبت کے علاوہ باقی ہر شے کی محبت کو نکال ڈالا اسی لیے قرآن میں اللہ نے ارشاد فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی اور یہی وہ لوگ ہیں یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے آزمالیا یہی وجہ ہے کہ جب دین و دنیا کا تقابل ہوتا ہے تو دنیا کا چھوڑنا ان کے لیے بالکل آسان تھا جس کے نتیجے میں انہوں نے دین کی خاطر اپنی جان کو بھی لٹادیا اور یہ مقامِ احسانی جان کی قربانی ہی سے حاصل ہوتا ہے اس لیے قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَرَضُوْا عَنْہُ کے الفاظ استعمال فرمائے اور ان کے لیے جنت اور اپنی رضامندی کی بشارت سنائی۔

راہِ سلوک دیوانگی سے طے ہوتی ہے فرزانگی سے نہیں

ہمیشہ ہر صحابی راہِ سنت کا تھا شیدائی
وہ دیوانے تھے لیکن خاک پاتھی ان کی فرزانی

حضرات صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر اس قدر مضبوطی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ کوئی سنت ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی سے چھوٹتی نہ تھی یہاں تک کہ لوگ ان کو مجنوں اور دیوانہ کہتے تھے اسی لیے قرآنِ پاک میں ہے کہ منافقین نے ان کو بے وقوف کہا اور حدیث شریف میں یہ مضمون آیا کہ تم مومنِ کامل نہیں بنو گے جب تک کہ تم اللہ کا اس کثرت سے ذکر نہ کرو کہ لوگ تمہیں مجنوں کہنے لگیں اس لیے اسلام کا یہ راستہ اور منزلِ مقصود بغیر دیوانگی کے طے نہیں ہوتا یہ دیوانگی بڑی کام کی ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں دیوانگی کا عاشق ہوں عقل کے بہت گھوڑے دوڑائے پر کام بنا نہیں دور اندیش عقل کو میں نے بہت آزمایا برسوں لیکن کچھ کام نہ آئی یہ عقل و خرد کی باتیں اور۔

بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

پھر سب نے اپنے کو دیوانہ کہا تو اسی سے کام بنا۔

جب بھی نازک کوئی مقام آیا
میرا دیوانہ پن ہی کام آیا

ایسے اللہ کے دیوانوں اور مستانوں کی دیوانگی پر ہزاروں فرزانوں کی فرزانگی رشک کرتی ہے اور خاک بن جاتی ہے جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے کہ جو پورے طور پر اللہ کا بندہ بن کر اللہ کو راضی کرنے کی فکر کرتا ہے تو ان کے قدموں میں دنیا ذلت کے ساتھ آتی ہے۔

شتربانوں کی جہانبانی حضور ﷺ کا معجزہ ہے

یہ کیسا معجزہ تھا دوستو! شانِ رسالت کا
شتربانوں کو بخشے جس نے آدابِ جہانبانی
خدا ان سے ہے راضی اور وہ رب سے ہوئے راضی
شہادت اس حقیقت پر ہیں خود آیاتِ قرآنی

اوّل شعر کی تشریح ماقبل مفصلاً ذکر ہو چکی اور دوسرے شعر میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اُس منصوص فضیلت کا ذکر ہے جس پر صراحۃً نصِ قرانی موجود ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾

(سورۃ الفتح، آیت: ۲۹)

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدہ میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی نشانی ان کی ان کے منہ پر ہے سجدے کے اثر سے۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۸۷)

صحابہ کی دو اہم خصوصیتیں

بھلا غیرِ صحابی پا سکے گا مرتبہ اُن کا
کہ ہے منصوص اُن پر رحمتِ حق فضلِ رحمانی
صحابہ کی محبت کو بھی ہم ایمان سمجھتے ہیں
کہ اُن کے دم سے اُمت کو ملی تعلیمِ قرآنی

اوّل شعر میں حضرت والا نے صحابہ کرام کے بلند مقام کی جانب خاص طریق سے توجہ دلائی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اُن کی فضیلت آسمانوں سے قرآن کے پاروں میں خود

اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی ہے تو اُن کی فضیلت کا منصوص ہونا یہ ایسی فضیلت ہے جو بعد کے اولیائے اُمت کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

اور دوسری اہم فضیلت حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ ہے کہ پورے قرآن وسنت کے نقل ہونے کا مدار حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نفوس قدسیہ ہیں۔ انہی کی بدولت ہم تک سارا قرآن وحدیث کا ذخیرہ منتقل ہوا۔ اس لیے اُن کی تعظیم وتکریم اور اُن پر اعتماد وبھروسہ کرنا ایمان کا جزِ واہم ہے۔ ورنہ ہماری صلاح وفلاح کی دونوں بنیادیں یعنی قرآن وسنت کا غیر معتبر اور غیر مستند ہونا لازم آئے گا اس لیے یہ حضرات پوری اُمتِ مسلمہ کے محسن ہیں۔ ان کے بارے میں زبان درازی کرنا یا ان کے اختلافات کو تقریر یا تحریر میں اُچھالنا جائز نہیں ہے اور ایسا کرنے والا فاسق ہے۔

صحابہ کی حیاتِ باوفا تاریخ ایماں ہے
جو اختر دے رہی ہے رات دن پیغامِ ایمانی

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اللہ تبارک تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت و رفاقت کو اس طرح نبھایا کہ اُس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ چنانچہ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب تبوک کے موقعہ پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ اے صدیق! تم نے اپنا سب کچھ اللہ کے راستے میں دیا۔ گھر میں کیا چھوڑا؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا ایمان افروز جواب دیا کہ جو ہر مومن کو دل کی تختی پر لکھ لینا چاہیے کہ میں نے اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے پوری امتِ مسلمہ کے لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جاں نثاریوں سے بھری تاریخ کا ایک ایک ورق اور ان کی زندگی کا ہر باب رات ودن، ایمان واسلام، صدق وفاء، ایثار واحسان کی کھلی دعوت دے رہا ہے۔

بیادِ حضرت شیخ پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ

بتاؤں کیا کیا سبق دیئے ہیں تیری محبت کے غم نے مجھ کو
ترا ہی ممنون ہے غم دل اور آہ و نالہ دلِ حزیں کا
جفائیں سہہ کر دعائیں دینا یہی تھا مجبور دل کا شیوہ
زمانہ گذرا اسی طرح سے تمہارے در پر دلِ حزیں کا
جو تیری جانب سے خود ہی آئے پیامِ الفت دلِ حزیں کو
تو کیوں نہ زخمِ جگر سے بہہ کر لہو کرے رخ تیری زمیں کا
نہیں تھی مجھ کو خبر یہ اخترؔ کہ رنگ لائے گا خوں ہمارا
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مشکل الفاظ کے معنی:۔ممنون: احسان مند۔حزیں:غم زدہ۔ جفائیں:ظلم ۔ سہنا: برداشت کرنا۔ شیوہ: عادت۔پیامِ الفت : محبت کا پیغام۔لہو: خون۔

ایذائے خلق پر صبر انبیاء واولیاء کی سنت اور فتوحات کی کنجی ہے

بتاؤں کیا کیا سبق دیئے ہیں تیری محبت کے غم نے مجھ کو
ترا ہی ممنون ہے غم دل اور آہ و نالہ دلِ حزیں کا

ان اشعار کو سمجھنے سے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھنا ضروری ہے کہ جب حضرت والا اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کے ساتھ ان کی خدمت میں رہتے تھے تو اللہ کے غیبی تکوینی نظام کے تحت وہاں کچھ حاسدین پیدا ہوگئے جو حضرت والا کے متعلق خلافِ واقعہ غلط باتیں کہتے رہتے تھے تا کہ حضرت والا کو ایذاء وتکلیف پہنچے اور برداشت نہ کر کے حضرت کا ساتھ چھوڑ دیں چنانچہ حضرت والا کو حاسدین اس طرح کے جملے کہا کرتے تھے مالٹا چوسی، مرغی کھائی شیخ کو چھوڑ کے کاہیں کو جائیں (پوربی جملہ) اور اشارہ کر کے چڑایا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک مرتبہ بعض نادان حضرت والا کے شیخ سے آ کر کہنے لگے کہ آپ اپنی امانتیں وغیرہ ان کے پاس جمع نہ کیا کریں کیونکہ یہ ابھی جوان ہیں کہیں یہ خرد برد نہ کردیں تو حضرت پھولپوری رحمہ اللہ نے ان کو غصہ میں فرمایا کہ یہ جوان صاحب نسبت ہیں اس کے لیے ایک روپیہ اور ایک کروڑ روپیہ برابر ہیں اور جاؤ دو رکعت نماز پڑھ کے توبہ کرو ورنہ کسی صاحبِ نسبت سے بدگمانی سوئے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے بتایا کہ صوفی غلام سرور صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مولانا شاہ ابرارالحق رحمہ اللہ حضرت والا سے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ بہت سے لوگ اب آپ کی جان کے دشمن ہوگئے ہیں اس لیے اب آپ یہاں سے کچھ دنوں کے لیے چلے جائیں تو اس پر حضرت والا نے جواب دیا کہ میں ایک اللہ والے سے اخیر عمر میں اس طرح داغ بے وفائی

نہیں دے سکتا جبکہ اس وقت حضرت کو میری خدمت کی ضرورت ہے اور موت کا ایک وقت مقرر ہے جس میں ذرا تبدیلی ممکن نہیں اور حضرت کو صورتِ حال کا علم نہیں اس لیے اللہ کے ولی سے بے وفائی کا تصور بھی مجھ سے ممکن نہیں بالآخر وہ وقت آیا کہ خود ان لوگوں کو پاکستان چھوڑ کے جانا پڑا اور حضرت والا بسلامت وعافیت اللہ کی طرف سے حفظ وامان میں رہے اور میر صاحب مدظلہم سے ہم نے یہ بات سنی کہ حضرت حبیب الحسن خاں شیروانی رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ حضرت پھولپوری نوراللہ مرقدہٗ نے حضرت والا کے لیے فرمایا کہ انہوں نے شیخ کی خدمت میں جس طرح سولہ سال گزارے ہیں ہم جیسے ایک دن بھی نہیں گذار سکتے تھے انہی مضامین کو حضرت ان چار اشعار میں پیش کر رہے ہیں کہ اے میرے شیخ! میں نے آپ کی محبت سے بہت کچھ حاصل کیا ہے کیونکہ یہ محبت ایک اللہ والے سے اللہ کے لیے تھی تو اس کے نتیجے میں دلِ حزیں اور اس دل کو آہ ونالہ کی نعمت میسر آئی جو اللہ کے نبیوں کی میراث ہے اور حق تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے۔

جفائیں سہہ کر دعائیں دینا یہی تھا مجبور دل کا شیوہ
زمانہ گذرا اسی طرح سے تمہارے در پر دلِ حزیں کا

لوگوں کی طرف سے جفائیں ایذائیں اور حضرت والا کی طرف سے ان کے حق میں دعائیں کرنا یہ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کا حصہ ہے اسی ادا کے ساتھ حضرت پھولپوری کی چوکھٹ پر حضرت والا کی سولہ سالہ زندگی کا ایک بڑا حصہ گزرا ہے۔

جو تیری جانب سے خود ہی آئے پیامِ الفت دلِ حزیں کو
تو کیوں نہ زخمِ جگر سے بہہ کر لہو کرے رخ تیری زمیں کا

مرید کو بے شک شیخ سے محبت ہوتی ہے لیکن حقیقی شیخ وہی ہوتا ہے جو خود اپنے مرید سے ایسی محبت رکھتا ہو کہ مرید کا دل شیخ کی جانب کھنچتا چلا آئے اور اس کی ہر ادا مرید کو پیامِ الفت دے رہی ہو یہی معاملہ حضرت والا کے ساتھ ان کے شفیق شیخ حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اسی کی جانب اس مذکورہ بالا شعر میں اشارہ کیا۔

نہیں تھی مجھ کو خبر یہ اختؔر کہ رنگ لائے گا خوں ہمارا
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اے اللہ! مجھے یہ علم نہ تھا کہ میرے یہ مجاہداتِ اختیاریہ اور غیر اختیاریہ (جن سے گزرنا محض آپ کے فضل وکرم سے ہوا) رنگ لائیں گے اور میں اپنے آہ ونالوں کا اثر اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دشمن کی زبانِ خنجر بند بھی ہوجائے تو میری آستین سے بہنے والا خون خود میرے زخم ودرد کی پکار بنے گا اور رنگ لائے گا چنانچہ آج اس کا مشاہدہ ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام خاردار راہوں سے گزارنے کے بعد مہکتے ہوئے پھولوں کے گلزار تک پہنچا دیا ہے اور سارے عالم میں حضرت والا کو ایک خاص عزت کا مقام عطا فرمایا ہے۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ.

سفرِ بنگلہ دیش

بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار جانفزاء آئی
کہ بنگلہ دیش میں خوشبوئے اشرف کو صباء لائی

بیانِ سنتِ نبوی سے بنگلہ دیش روشن ہے
کہیں سنبل کہیں نسریں کہیں ریحان و سوسن ہے

شبِ تاریک روشن ہوگئی انوارِ سنت سے
جسے دیکھو وہی مسرور ہے اذکارِ سنت سے

مدرسے اک منٹ کے اور یہ انوار سنت کے
جہاں میں عام ہوجائیں یہ سب گلزار سنت کے

تری تقریر سے بادل چھٹے ظلمات بدعت کے
ملے ہیں طالبوں کو ہر طرف لمعات سنت کے

اولو العزمی تری دیکھی برائی کو مٹانے میں
نہیں دیکھی ہے ہم نے ایسی جرات اس زمانے میں

اثر فرما کسی کا خوف تجھ پر ہو نہیں سکتا
مزاجِ شیرِ نر روباہ ہر گز ہو نہیں سکتا

جہاں ہر نامناسب خو پہ شانِ احتسابی ہے
وہیں عفو و کرم کی شان بھی کیا بے مثالی ہے

تری شفقت سے ہم سب ناقصاں امید رکھتے ہیں
بحمداللہ شبِ تاریک میں خورشید رکھتے ہیں

یہ اختؔر خاک تیرہ بے زباں بے سازوساماں ہے
مگر مٹی پہ بھی فیضِ شعاعِ مہرِ تاباں ہے

میری یہ گرمی ایماں ترے آتش فشاں سے ہے
مرے کانٹوں پہ شانِ گل بھی تیرے گلستاں سے ہے

مجھے احساس ہے تیرے چمن میں خار ہے اختؔر
مگر خاروں کا پردہ دامنِ گل سے نہیں بہتر

چھپانا منہ کسی کانٹے کا دامن میں گلِ تر کے
تعجب کیا چمن خالی نہیں ہے ایسے منظر سے

مشکل الفاظ کے معنی: جانفزاء:...... خوشبوئے اشرف: مراد اس سے حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ صباء: صبح کی تازہ ہوا۔ سنبل، نسریں، ریحان و سوسن: پھولوں کے نام۔ شبِ تاریک: اندھیری رات۔ مسرور: خوش۔ ظُلماتِ بدعت: بدعت کی گمراہی۔ طالبون: چاہنے والے۔ لمعات: روشنی۔ اُولوالعزمی: پکا ارادہ۔ مزاجِ شیرِ نر: شیرانہ مزاج۔ رُوباہ: لومڑی۔ خو: عادت۔ شانِ احتسابی: سرزنش کی شان۔ عفو و کرم: درگذر و عنایت۔ بے مثالی: جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ ناقصان: نالائق۔ خورشید: سورج۔ خاک تیرہ:...... فیضِ شعاعِ مہرِ تاباں: چمکتے ہوئے سورج کی کرن کا فیض۔ آتش فشاں: لاوا۔ خار: کانٹا۔ گلِ تر: تر و تازہ پھول۔

حضرت ہردوئی اور گلشنِ سنت کے پھولوں کی بہار

بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار جانفزاء آئی
کہ بنگلہ دیش میں خوشبوئے اشرف کو صباء لائی
بیانِ سنتِ نبوی سے بنگلہ دیش روشن ہے
کہیں سنبل کہیں نسریں کہیں ریحان و سوسن ہے
شبِ تاریک روشن ہوگئی انوارِ سنت سے
جسے دیکھو وہی مسرور ہے اذکارِ سنت سے

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ بنگلہ دیش کا سفر فرمایا اور وہاں خاص طور پر احیائے سنت کے لیے قدم بقدم اہلِ علم کے بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب فرمایا اور سنتوں کی اتباع کی اہمیت اور اس کے فوائد بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک منظم حکمتِ عملی اہلِ بنگلہ دیش کو مرتب فرما کر دی اور اس کے لیے حضرت والا مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے حضرت ہردوئی رحمہ اللہ کے ان علوم و فیوض کو ایک کتابچے کی شکل میں مرتب فرمایا جس کا نام ایک منٹ کا مدرسہ ہے جو دنیا بھر کی مختلف مساجد میں روزانہ پابندی کے ساتھ ایک منٹ کے لیے پڑھ کر سنایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں پورا بنگلہ دیش انوارِ سنت سے روشن ہوگیا اور ہر سمت ایسی پر کیف بہاریں محسوس ہونے لگیں کہ جیسے کسی حسین اور خوبصورت باغ میں مختلف قسم کے پھولوں کی خوشبو مہک رہی ہو، بدعت کی تاریکیاں چھٹ گئیں اور لمعاتِ سنت روشن ہوگئیں، شمعیں روشن ہوگئیں جیسا کہ حضرت نے اگلے دو شعروں میں یہی بات ذکر فرمائی۔

حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک امتیازی شان

مدرسے اک منٹ کے اور یہ انوار سنت کے
جہاں میں عام ہوجائیں یہ سب گلزار سنت کے
تری تقریر سے بادل چھٹے ظلمات بدعت کے
ملے ہیں طالبوں کو ہر طرف لمعات سنت کے
اولو العزمی تری دیکھی برائی کو مٹانے میں
نہیں دیکھی ہے ہم نے ایسی جرات اس زمانے میں
اثر فرما کسی کا خوف تجھ پر ہو نہیں سکتا
مزاجِ شیرِ نر روباہ ہرگز ہو نہیں سکتا

حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خاص صفت مشہور تھی کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے بلکہ بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ منکر کو دیکھ کر فوراً ہی نکیر فرماتے تھے بڑے ہی صاحبِ عزیمت بزرگ تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ منکر پر نکیر بلاتحقیر ہونی چاہیے عرب وعجم میں کہیں بھی کسی مقام پر تشریف لے جاتے اور کوئی منکر دیکھتے یا خلافِ سنت کوئی چیز نظر آئی تو اس پر نکیر کیے بغیر نہ رہتے تھے یہ صفت یعنی منکر پر نکیر کرنا اور بھلائی کا حکم دینا قرآنِ کریم میں اللہ نے مومن کی صفت بتائی ہے دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث تحتانی میں خود راقم السطور نے حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے دورانِ وعظ یہ بات سنی حضرت نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾
(سورۃ التوبۃ، آیت: ۷۱)

ترجمہ: اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں سکھلاتے ہیں نیک بات اور منع کرتے ہیں بری بات سے۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۴۲۰)

اس پر ارشاد فرمایا کہ جس طرح حکومت کے بہت سے ڈیپارٹمنٹ (Departments) شعبے ہوتے ہیں اور ہر شعبے والوں کی الگ الگ علامتیں ہوا کرتی ہیں پولیس (Police) کی الگ علامت ہوتی ہے فوج کی الگ علامت ہوتی ہے اسی طرح اہلِ ایمان کی خاص پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ باہم دوست ہوتے ہیں اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کرتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں بہت سی آیات واحادیث امر بالعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت پر موجود ہیں۔ بہرحال حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شانِ عزیمت اللہ نے عطا فرمائی تھی کہ بڑے سے بڑے موقعہ پر مصلحت کا شکار نہ ہوتے جو حق ہوتا بلاخوف

لومۃ لائم بیان فرما دیتے۔

جہاں ہر نامناسب خو پہ شانِ احتسابی ہے
وہیں عفو و کرم کی شان بھی کیا بے مثالی ہے
تری شفقت سے ہم سب ناقصاں امید رکھتے ہیں
بحمداللہ شب تاریک میں خورشید رکھتے ہیں

یعنی حضرت ہردوئی رحمہ اللہ کی شانِ تربیت بڑی عالی اور نرالی تھی کہ ہر نامناسب پر احتساب فرماتے لیکن دوسری جانب غایت درجہ شفقت اور بے انتہا عفو درگزر سے کام لیتے تھے اس لیے ہم جیسوں کے لیے حضرت والا کی ذاتِ عالی ایسی تھی جیسے شبِ تاریک میں خورشید فروزاں ہو۔

شیخ کے کمالات میں مرید کے عیوب چھپ جاتے ہیں

یہ اختر خاک تیرہ بے زباں بے ساز و ساماں ہے
مگر مٹی پہ بھی فیضِ شعاعِ مہر تاباں ہے

حضرت والا فرما رہے ہیں کہ میری حیثیت مٹی کا ڈھیر ہے جس کے پاس تقریر و بیان ہے نہ ذکر عبادت کا خاص ذخیرہ ہے لیکن جس طرح چمکتا سورج ایک خالی بے آب و گیاہ زمین پر روشنی بکھیرتا ہے تو اس مٹی پر پھول و پھل اُگ آتے ہیں۔

تو اسی طرح ان شاء اللہ میں آپ کی صحبت و معیت میں رہ کر اپنی خاک تیرہ کو روشن کر کے اس پر اللہ کے قرب اور اس کی محبت و معرفت کے پھول اُگاؤں گا۔

میری یہ گرمی ایماں ترے آتش فشاں سے ہے
میرے کانٹوں پہ شانِ گل بھی تیرے گلستاں سے ہے
مجھے احساس ہے تیرے چمن میں خار ہے اخترؔ
مگر خاروں کا پردہ دامنِ گل سے نہیں بہتر
چھپانا منہ کسی کانٹے کا دامن میں گلِ تر کے
تعجب کیا چمن خالی نہیں ہے ایسے منظر سے

حضرت والا غایت درجہ تواضع کے طور پر اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی اور کمتر ہونے کو اپنے شیخ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ مجھے جو ایمانی حرارت اور احسانی کیفیت حاصل ہو رہی ہے اس کی بس اتنی

حقیقت ہے کہ جیسے کسی آتش فشاں کے پاس کی چیزیں اس کی حرارت سے گرم ہوجاتی ہے اسی طرح اے میرے شیخ! میرے ایمان میں جو گرمی ہے وہ اسی آتش فشاں کا اثر ہے جو آپ کے سینے میں موجود ہے اور جس طرح تنہا کانٹا ناگوار و ناپسندیدہ ہوتا ہے لیکن گلستان میں کسی پھول کے دامن میں بسے ہوئے ہونے کی وجہ سے اس کانٹے کے عیب پر پھول کے ذریعے پردہ پڑ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے اور پھر اس پھول کی قیمت کے ساتھ کانٹوں کی قیمت لگتی ہے، ایسے منظروں سے چمن خالی نہیں ہے، یہی روزمرہ ہم دیکھتے ہیں، ٹھیک اسی طرح میرا حال ہے کہ میں بھی ایک کانٹے کی طرح عیبوں سے بھرا ہوا ہوں کمالات وخوبیوں سے تہی دامن میرے عیبوں کا پردہ آپ کی معیت پاکر اسی طرح ہوجاتا ہے جس طرح وہ کانٹے گلوں کے دامن میں منہ چھپائے ہوئے ہیں ہم بھی اللہ والوں کے دامن میں آکر چھپ جائیں تو کیا عجب کہ ستاری ہوجائے آہ! مولانا روم بہت بڑے آدمی ہیں فرماتے ہیں ؎

آں خاری گریست کہ اے عیب پوش خلق

کہ ایک کانٹا رو رہا تھا کہ خدایا آپ نے مجھے خار بنایا لوگ ہم کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں اور چمن بدر کردیتے ہیں ہمارے لیے انتظامِ چمن کردیجئے کہ ہم نہ نکالے جائیں ؎

شد مستجاب دعوت او گلعذار شد

اللہ نے اس خار گلستاں کی فریاد رسی فرمائی اور اس پر ایک گل اُگا کر اس کو چھپادیا اب دامنِ گل میں چھپ گیا اور مالی کی نظر سے مستور ہوگیا تو صدا چمنستان میں رہتا ہے گلوں کی معیت کی برکت ہے یہ دوستو!

فیضانِ شیخ

دورِ نشاط چل بسا گردش جام ہوچکی
صبح بہار وصل کی فرقت شام ہوچکی

عشق بھی تام ہوچکا عقل بھی تام ہوچکی
زندگی بے نظام کی زیر نظام ہوچکی

دیکھو تو فیض شیخ سے زاغ بھی ہنس ہوگیا
زندگی اک ہلال سے ماہ تمام ہوچکی

نشۂ کبر وجاہ تھا سیرت نفور عشق تھی
عاشق میکدہ ہے وہ خوگر جام ہوچکی

اے مرے خالق حیات تجھ پہ فدا ہو صد حیات
تیری رضا سے بندگی میری تمام ہوچکی

اخترؔ بے نوا کو گر تیرا کرم کرے معاف
سمجھوں گا مجھ پہ اے خدا رحمت تمام ہوچکی

مشکل الفاظ کے معنی:۔ دورِ نشاط: خوشی کا زمانہ۔ چل بسا: ختم ہوگیا۔ گردش: حرکت۔ جام ہونا: رُک جانا۔ بہارِ وصل: ملاقات کی بہار۔ فرقت: جدائی۔ تام: مکمل۔ بے نظام: بے ڈھنگ۔ زیرِ نظام: ڈھنگ والی۔ زاغ: کوا۔ ہنس: چڑیا۔ ہلال: نامکمل چاند۔ ماہِ تمام: مکمل چاند۔ سیرت:......۔ نفور:......۔ عاشقِ میکدہ:......۔ خوگر:......۔ بے نوا:......۔

اس نظم کے تمام اشعار حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ کی توجہ خاص سے ہوئے کہ حضرت والا نے ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم کو یہ مصرعہ عطا فرمایا۔

دورِ نشاط چل بسا گردشِ جام ہوچکی

اور اس پر اشعار کہنے کی فرمائش کی تو حضرت والا نے یہ اشعار کہے جس میں حضرت ارشاد فرما رہے ہیں کہ فرحت ونشاط کا زمانہ گذر گیا جو کہ اصل زمانہ تھا دینی علمی سرگرمیوں کا ہمت عالی اور قویٰ مضبوط تھے وہ دور چلا گیا اور جو وصلِ محبوب کی بہاریں تھیں کہ اپنے شیخ سے فیوض وبرکات سے مالا مال ہوتے تھے ان بہاروں کی صبح، شام میں بدل چکی ہے اور اللہ نے اپنے فضل سے بدنظم اور بے ڈھنگ زندگی کو منظم بنادیا اور اپنی رحمت سے کمالِ عشق اور وفورِ عشق کی دولت عطا فرمادی۔

آہ! صحبتِ شیخ کا کیا کہنا ہے کہ جو لوگ زاغ تھے ہنس ہوگئے، پہلے مُردوں پر مرتے اور جان دیتے تھے اب حیّ وقیوم اللہ پر فدا ہونے لگے اور کیا ہی کہنے ہیں کہ اب صحبتِ شیخ کی برکت سے ایک ہلالِ ناتمام ماہِ تمام بن گیا جو کبر و جاہ کے نشے میں چور تھا اور اللہ کے عاشقوں سے دور تھا وہ اس میکدہ اشرفی سے ایسا آشنا ہوا کہ بس عاشق بن گیا اور محبتِ خداوندی کے جام و پیمانوں کا خوگر ہوگیا اے وہ ذاتِ خداوندی! جس نے مجھے حیات بخشی اگر مجھے سو زندگیاں بھی ملیں تو وہ بھی تجھ پر قربان کردوں، مجھے ایسی شانِ بندگی عطا کردے کہ تو مجھ سے راضی ہوجائے اور یہ تیرا اختؔر بے یار و مددگار اور بے سہارا ہے، بس تیرے عفو وکرم کا سہارا لگائے ہوئے ہے، تو مجھ پر کرم فرما کر مجھ کو معاف کردے تو بس یہی اس کی پہچان ہوگی کہ مجھ پر آپ کی رحمت تام ہوچکی۔

سامنے جلوے ہیں ان کے کو بہ کو

دردِ دل کے واسطے کر جستجو ‏ زخمِ حسرت اور خونِ آرزو
غم سے ٹکڑے ہو گئے دل کے مگر ‏ دل کے ہر ذرّہ میں ہیں انوارِ ھو
ان کی جانب سے محبت کا مرے ‏ امتحاں ہے ہر شکستِ آرزو
اے خدا تجھ پر فِدا ہو ہر زماں ‏ میری دولت میری جان و آبرو
حسرتوں کے غم اگر ہیں راہ میں ‏ سامنے جلوے ہیں ان کے کو بہ کو
ایسی شکلوں کو نہ میں دیکھوں کبھی ‏ آپ سے جو دور کر دے خوبرو
تجھ کو کیوں مشکل ہے یہ صرفِ نظر ‏ دیکھ اے ظالم شہیدوں کا لہو
شکر کرتے ہیں غمِ حسرت پہ ہم ‏ دیکھ کر یاربّ ترے جام و سبو
دیدۂ اختؔر ہے گو حسرت زدہ ‏ دیدۂ دل دیکھتی ہے نورِ ھو

مشکل الفاظ کے معنی:۔جستجو: تلاش۔زخمِ حسرت اور خونِ آرزو: اللہ تعالیٰ کی محبت میں حرام خواہشات کا خون کرنا۔انوارِ ھو: اللہ تعالیٰ کے انوار۔کو بہ کو:.......۔ خوبرو: حسین چہرے۔ صرفِ نظر: نظر ہٹانا۔لہو: خون۔جام و سبو: مرادحلاوتِ ایمانی۔دیدہ: آنکھ۔

رضائے محبوب میں آرزوؤں کا پورا نہ کرنا امتحانِ محبت ہے

درد دل کے واسطے کر جستجو
زخم حسرت اور خون آرزو
غم سے ٹکڑے ہوگئے دل کے مگر
دل کے ہر ذرّے میں ہیں انوارِ ھو
ان کی جانب سے محبت کا مرے
امتحاں ہے ہر شکستِ آرزو

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی شدید اور قوی محبت جو دل و جان میں راسخ ہو اس کے حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دل میں جتنی ناجائز خوشیاں اور حرام لذتیں ہیں ان سب کو چھوڑ دے چاہے دل پر کتنا ہی زور پڑے اور کتنی ہی مشقت اٹھانی پڑے جب تک کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے لیے حرام خوشیوں کو پامال کرنے پر آمادہ اور تیار نہیں ہوتا اگرچہ وہ طاعات پر پابند ہو مگر گناہوں میں پڑ کر کچھ نفس کو مزے بھی دیتا رہتا ہو تو ایسے آدمی کو دردِ دل عطا نہیں ہوتا اس لیے کہ دل پر غم اٹھانے سے اللہ تعالیٰ نے مل جانے کا وعدہ فرمایا ہے اور خاص انوارات وتجلیات نصیب ہونے کی بشارت سنائی گئی ہے۔

اور اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ کسی ماں کے چار بچے ہوں اور ایک ان میں سے بیمار ہو اور گھر پر عمدہ قسم کا مرغن کھانا اور کباب و بریانی وغیرہ تیار کی گئی ہو لیکن اس بیمار بچے کے لیے ڈاکٹر کی طرف سے اس طرح کے کھانے سے پرہیز بتایا گیا ہے اس لیے ماں اپنے اس بیٹے سے یہ درخواست کرتی ہے کہ بیٹا تم میرا کہنا مانو اور ابھی ان کھانوں کے قریب مت جاؤ کیونکہ یہ تمہاری صحت کے لیے مضر ہیں اس پر بیٹا جواب دیتا ہے کہ امی جان میری طبیعت پر بہت زور پڑے گا اور برداشت کرنا بڑا مشکل ہوگا اور میرا دل بہت ٹوٹے گا لیکن چونکہ آپ کا فرمان ہے تو دل کا توڑنا گوارا ہے اور دل پر غم اٹھانا منظور ہے مگر آپ کا حکم نہیں توڑوں گا چنانچہ وہ بیٹا ان کھانوں کے قریب نہیں جاتا اس کے نتیجے میں امی جان قریب آکر اور بڑی پیار بھری حالت میں اشکبار ہو کر بچے کو گود میں اٹھاتی ہے اور اسے مبارک باد دے کر کہتی ہے کہ بیٹا میرا حکم نہ توڑنے کی وجہ سے عنقریب جب تیری صحت ہوجائے گی تو میں تجھے ان سب کھانوں سے لذیذ کھانے بنا کر کھلاؤں گی تو اس بچے کی سعادت وخوش نصیبی کا کیا کہنا اور ماں کے نزدیک اس کے قرب اور پیار کا کیا عالم جس کو حضرت والا نے اس طرح فرمایا ہے ؎

میرے حسرت زدہ دل پر انہیں یوں پیار آتا ہے
کہ جیسے چوم لے ماں چشم نم سے اپنے بچے کو

یا ایک دوسری مثال سے اس طرح سمجھئے کہ جب کبھی کسی ملکی ضرورت سے کچھ لوگوں کے مکانات توڑنے پڑ جاتے ہیں تو حکومت وقت کی طرف سے یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ جس جس کا مکان حکومت کی ضرورت کے لیے توڑا گیا ہے ایسے لوگوں کے لیے شاہی خزانے سے عمدہ قسم کے حسب منشاء و پسند مکانات بنائے جائیں کیونکہ انہوں نے حکومت کی ضرورت کی وجہ سے اپنے مکانات توڑنے کی اجازت دی ہے بس ٹھیک بالکل دل کا معاملہ بھی اسی طرح ہے کہ جو بندہ اپنا دل اپنے اللہ کے لیے توڑتا ہے تو پھر اس ٹوٹے ہوئے دل کی تعمیر حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے خزانۂ قرب ومعرفت سے فرماتے ہیں اور جتنا جس درجہ میں اس نے دل پر غم اٹھایا اور اس کو اللہ کے لیے توڑا اور ذرہ ذرہ کر دیا اتنے ہی اس میں انوار خداوندی سرایت کر جاتے ہیں اور اس سے نسبت مع اللہ کی خوشبو مہکنے لگتی ہے اسی کو حضرت والا نے اپنے خاص اسلوب و انداز میں یوں تعبیر فرمایا۔

تیرے ہاتھ سے زیرِ تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

اللہ تعالیٰ پر جائز محبتیں بھی قربان کر دینی چاہیے

اے خدا تجھ پر فدا ہو ہر زماں
میری دولت میری جان و آبرو

صاحبو! دردِ دل حاصل کرنے کے لیے صرف ناجائز اور حرام خواہشات اور تمناؤں کو چھوڑ دینا اور اللہ کی مرضی پر قربان کر دینا جس کا معنی یہ ہے کہ ایک لمحہ گناہ کر کے اللہ کو ناراض نہ کرنا یہ تو مومن بندے کے لیے لازم اور ضروری ہی ہے لیکن اللہ کے خاص مقرب بندوں کے لیے اس سے بھی آگے کا درجہ یہ ہے کہ ان کی جو جائز آرزوئیں اور تمنائیں ہوں ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر جب تقاضہ سامنے آجائے تو بلا چوں و چراں قربان کر دے اور اپنی مصالح کے فوت ہونے کی طرف نظر نہ اٹھائے مثال کے طور پر اللہ کے دین کے لیے گھر سے ہجرت کرنا پڑے تو اس وقت بیوی بچوں کی محبت رکاوٹ نہ بنے چلتے ہوئے شاندار کاروبار کی منفعت آپ کے اور آپ کے ارادوں کے درمیان حائل نہ ہوں وطن میں رہنے والے دوست واحباب سے تعلق اور اپنی جائے پیدائش کے ساتھ انس اور لگاؤ غرض یہ کہ یہ سب جائز محبتیں ہیں لیکن دل پر کتنا ہی زور پڑے اور ٹوٹ کر چورا چورا ہو جائے بس مومن بندے کی شان یہ ہونے چاہیے کہ امرالٰہی آنے پر سب کو خیرآباد کہہ دے۔

صحابہ کرام کی زندگی پڑھ لینے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی ہر نوع کی تمنائیں اور خواہشیں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاروں پر اس طرح قربان کر دیں تھی کہ اس کے خلاف ان کے دل میں سوچنے کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی کامیابی اور سرخروئی اور

عزت و رفعت کا راز ہی یہی تھا اور آج بھی اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح قائم ہے کہ جو بندے اپنا سب کچھ اللہ پر قربان کرتے ہیں اور دل میں اس کے برخلاف خیال بھی نہیں لاتے تو آخرت کی عزتوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی ان کو چمکا دیتے اور روشن کردیتے ہیں۔

حسین شکلوں پر نظر ڈالنا اللہ سے دور کر دیتا ہے

حسرتوں کے غم اگر ہیں راہ میں
سامنے جلوے ہیں ان کے کو بکو
ایسی شکلوں کو نہ دیکھوں میں کبھی
آپ سے جو دور کردے خوبرو

انسان کے اندر گناہ کرنے کے تقاضے فطری طور پر رکھے گئے ہیں اور شہوت بطن اور شہوت فرج یہ دونوں شہوتیں گناہوں کا سرچشمہ اور مرکز ہیں اس لیے ایسی نامحرم عورتوں اور لڑکیوں کی یا بے ریش امرد لڑکوں کی شکل و صورت دیکھنے اور ان سے میل جول اور تعلقات میں نفس کو حرام لذت ملتی ہے اور انسان اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے کیونکہ جب دل میں حسین مردوں کی شکلیں موجود ہونگی تو اللہ تعالیٰ سے قرب کا تصور و خیال بھی فضول اور بے کار ہے لہٰذا ایسی شکلوں کو ہرگز نہ دیکھے جتنا بھی دل پر زور پڑے اور حسرتیں ہوں برداشت کرتا جائے تو اس کو اللہ کے قرب کی لذت اور اس کی تجلیات خاصہ دل میں محسوس ہونے لگیں گی لیکن جب تک کوئی خوب رو ہمارے دل میں موجود رہے گا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بہت غیرت والے ہیں جہاں کوئی دوسرا موجود ہو وہاں اللہ نہیں آتے اسی لیے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ میں پہلے غیر اللہ کو دل سے نکالنے کی بات کی گئی ہے پھر اللہ تعالیٰ کو پالینے کا ذکر ہے جیسا کہ حضرت والا کا شعر ہے ۔

لا الٰہ ہے مقدم کلمۂ توحید میں
غیر حق جب جائے ہے تب دل میں حق آجائے ہے

اس لیے خاص طور پر ایسی حسین اور خوب رو شکلوں سے اپنے دل کو بچانا از حد ضروری ہے ورنہ اس گناہ کے نتیجہ میں آج کے زمانے میں کئی جوان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

شہیدوں کے خون سے عبرت

تجھ کو کیوں مشکل ہے یہ صرفِ نظر
دیکھ اے ظالم شہیدوں کا لہو

یعنی وہ بندہ جو اللہ کی راہ میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہے اور اس کو راہِ حق میں قربان کر دیتا ہے تو اس کو دیکھ کر سبق حاصل کرنا چاہیے اور یہ نتیجہ نکال لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اتنے محبوب اور پیارے ہیں کہ آرزوؤں کا لہو پی جانا یہ تو معمولی بات ہے کیونکہ اللہ پر تو جان بھی قربان کرنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ شہدا اس محبوب اللہ کے لیے اپنی گردنیں کٹا کر خون بہا دیتے ہیں بس مردِ مومن کے لیے ہمت مردانہ کی ضرورت ہے تو پھر کچھ بھی مشکل نہیں جو لوگ مشکل سمجھتے ہیں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر استحضار کے درجہ میں یقین نہیں رکھتے ورنہ جو آدمی مثال کے طور پر یہ جانتا ہو کہ میرے سامنے ایک فوجی افسر ہتھیاروں سے مسلح کھڑا ہوا ہے اور پاس سے اس کی حسین بیٹی گزر رہی ہے اور وہ فوجی تاک لگائے ہوئے غور سے دیکھ رہا ہے کہ کون ہے جو میری بیٹی پر ذرا نظر ڈالے تو میں اس کا کام تمام کر دوں تو بتائیے کہ یہ شخص اس فوجی کے کھڑے ہونے کے باوجود اس کی بیٹی پر نظر ڈالنے کی احمقانہ حرکت کر کے اپنی موت کو دعوت دے گا؟ کبھی بھی نہیں تو پھر قرآن میں اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی اور ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ یعنی کہ تم کو پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ گھات میں ہیں تو اگر یہ عقیدہ استحضار کے درجے میں دل میں موجود ہو تو پھر حسین شکلوں کو دیکھنا فوراً چھوٹ جائے گا۔

مجاہدۂ قلیل پر انعامِ کثیر

شکر کرتے ہیں غمِ حسرت پہ ہم
دیکھ کر یارب ترے جام و سبو
دیدۂ اختر ہے گو حسرت زدہ
دیدۂ دل دیکھتی ہے نورِ ھُو

یعنی اللہ تعالیٰ اس قدر شاکر و شکور ہیں، اتنا قدر کرنے والے ہیں کہ بندے کی طرف سے تھوڑا ہونے پر خوب نوازتے ہیں جب کہ اس کی توفیق بھی خدا ہی عطا فرماتے ہیں تو جو بندہ ذرا قوت و ہمت سے اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کی لذتوں کو چھوڑتا ہے اسے حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی شرابِ محبت کے ایسے جام و سبو عطا ہوتے ہیں کہ پھر وہ بندہ غمِ حسرت اٹھانے کی توفیق دئے جانے پر حق تعالیٰ کا خوب شکر ادا کرتا ہے۔

خاص طور پر یہ اشعار جنوبی افریقہ میں جوہانسبرگ سے نیروبی تک طیارے میں موزوں ہوئے ہیں اور

جہازوں میں انگریز ننگی جوان لڑکیاں پھرتی رہتی ہیں تو ایسے موقعہ پر نہ ان کی طرف دیکھنا نہ ان سے مسکرا کر باتیں کرنا گو ظاہری طور پر آدمی کو حسرت میں مبتلاء کرے گا اور دیکھنے والے یہ محسوس کریں گے کہ نا معلوم یہ شخص کیوں اداس اداس محسوس ہو رہا ہے لیکن حضرت والا فرماتے ہیں کہ ظاہری اداسی اور آنکھوں کا حسرت زدہ ہونا یہ دیدۂ دل میں روشنی اور اجالا پیدا کرتا ہے اور اس کو انوارِ حُو سے منور کر دیتا ہے جس سے دل میں تازگی اور فرحت وسرور اور انبساط ونشاط پیدا ہو جاتا ہے۔

ہائے لمحات غفلتِ دل کے

آرزو میری خاک میں مل کے لطف لیتی ہے عشقِ کامل کے
مٹ گئے رنج راہِ منزل کے پاس آئے ہیں جب سے وہ دل کے
رنج حسرت ہے راہ میں لیکن لطف شامل ہیں ان کی منزل کے
کیا کہوں ان کے قرب کا عالم کتنے عالم ہیں عالمِ دل کے
فرطِ لذّت سے جھوم جاتا ہوں کتنی خوشیاں ہیں آپ سے مل کے
اب خزاں دل سے دُور ہے کیونکہ پاس رہتے ہیں وہ مرے دل کے
جب یہ لذت ہے دل کے طوفاں میں کیا کہوں کیف دل میں ساحل کے
کیا خبر تھی کہ خوں بہا ہیں آپ ہائے لمحات غفلت دل کے
ایسے ویسے بھی ہو گئے کیسے فیض کیسے ہیں شیخِ کامل کے
جان ان پر فِدا کرو اخترؔ سرخ رو ہو گے خاک میں مل کے

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **خاک میں ملنا**: فنا کر دینا۔ **فرطِ لذّت**: شدت لذت۔ **کیف**: مزا۔ **خوں بہا**: حرام خواہشات کا خون کرنے کا بدل۔ **ھائے**: افسوس۔ **سرخ رُو**: کامیاب۔

حرام آرزوئیں خاک میں ملانے سے مولیٰ ملتا ہے

آرزو میری خاک میں مل کے
لطف لیتی ہے عشقِ کامل کے

حضرت والا دامت برکاتہم ان اشعار میں جس مضمون کو ارشاد فرما رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں مختلف قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں رکھتا ہے جن میں سے بعض حرام اور ناجائز خواہشات ہوتی ہیں جن کو پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ کچھ جائز اور مباح تمنائیں ہوتی ہیں جن کو پورا کرنا من جانب اللہ مبغوض اور ناپسندیدہ نہیں ہوتا، مگر ان آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اس دنیا کے جھمیلوں میں زیادہ

منہمک اور مشغول ہونا پڑتا ہے تو اللہ اپنے خاص بندوں کو اپنا خاص مقامِ قرب عطا فرما کر، جس طرح حرام خواہشات سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اس کے سامنے مختلف قسم کے موانع اور رکاوٹیں ان کی تکمیل کی راہ میں سدِّ باب ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جائز اور مباح آرزوؤں اور تمناؤں میں بے حد انہماک اور اشتغال سے بھی اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ فرماتے ہیں اور جب اس طرح ان کی اُمیدیں خاک میں ملتی ہیں اور ان کی ذہنی مادی اسکیمیں اور نقشے اور دنیوی ترقی کے پروگرام فیل ہوتے رہتے ہیں تو پھر اُنہیں اپنے مولیٰ کے عشقِ کامل کا مزہ حاصل ہوتا ہے۔

اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ ایک جوان لڑکا اپنی جوانی کے نشے میں کسی نامحرم سے دوستی اور عشق لڑانے کے لیے اس سمت میں چلا اور ابتدائی مرحلے ہی میں اس کو اپنی اُمیدوں میں ناکامی نظر آنے لگی۔ اس کو بظاہر اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ دوسری جانب سے اُسے مثبت اشاروں کے بجائے منفی جوابات ملنے لگے تو اس موقعہ پر اس کی یہ حرام خواہشات اور ناجائز اُمیدیں خاک میں ملتی نظر آئیں۔ جن حرام کاریوں کی لذتوں کا نقشہ اپنے ذہن میں سوچے ہوئے تھا اور جن اُمیدوں کا محل اپنے خیال میں تعمیر کیے ہوئے تھا، وہ سب ڈھیر ہو کر خاک میں ملتا نظر آیا۔ اب یہ اپنے اس حسرت زدہ دل میں بآسانی اپنے مولیٰ کی محبت کے مزے حاصل کر سکتا ہے۔

یہی دلیل ہے اس بات کی کہ اس بندے سے اللہ تعالیٰ کو غایت درجہ محبت ہے کہ اپنے بندے کو اس کی ناجائز حرکتوں اور حرام کاموں سے بچا کر زبردستی اس کی پیشانی پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔

اتفاق سے ایسا ہوا...... کی حقیقت

صاحبو! کس قدر نادانی اور غفلت کی بات ہے کہ آج ہم اس طرح کے معاملات کو اتفاقات سے تعبیر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اتفاق سے ایسا ہوا کہ میں نے جس سے عشق بازی کی تھی وہ میرے ارادوں پر پانی پھیر گئی یا پھیر گیا۔ مجھے اس تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ پہلے ہی دن جب فون پر رابطہ کیا یا ایس۔ایم ایس (S-M-S) بھیجا تو اس کے یا میرے والدین کو خبر ہو گئی یا کسی اور طریقے ہمارے عشق کا راز فاش ہو گیا اور محبت کی گاڑی نہ چل سکی۔ مزید یہ کہا جاتا ہے کہ کسی بزرگ کی مجلس میں جانا ہوا تو اس عشقِ مجازی اور ناجائز محبت کی نحوست ولعنت کا پتہ چلا تو سارے ارمان دل سے نکل گئے اور تمام تمنائیں خاک میں ملا ڈالیں اور حالت یہ ہو گئی کہ دنیا کی بڑی سے بڑی حسین وجمیل لڑکی بھی سامنے آجائے اور اس کو دیکھنے کی دل میں کتنی ہی تمنا پیدا ہو تو ہر تمنا خاک میں ملا ڈالی۔ اب اس کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھوں اور نہ دل کو اس کے ناپاک خیال سے گندہ کروں۔ بس یہی وہ مقام ہے جس کو حضرتِ والا ارشاد فرماتے ہیں کہ سالک کو اس مقام پر پہنچ کر عشقِ کامل کا لطف میسر آتا ہے۔

اس لیے میرے بھائیو! صورتاً یہ ناکامی ہے اور درحقیقت کامیابی ہے۔ بظاہر یہ محرومی ہے، مگر درحقیقت مقصد بر آری ہے اور کہنے کو یہ بدنصیبی اور بدقسمتی ہے، مگر دراصل یہ سعادتمندی اور خوش نصیبی ہے۔

ایک عبرت ناک واقعہ

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو دارالعلوم دیو بند میں ہمیں ہمارے استاد مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے سنایا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایک خادم تھے۔ اُن کے لیے ان کا کھانا روزانہ کسی کے گھر سے آیا کرتا تھا، مگر آہستہ آہستہ گھر کی خاتون سے سلام دعا شروع ہوئی۔ پھر شُدہ شُدہ آپس میں خیر خیریت کی باتیں ہونے لگی اور ہوتے ہوتے آپس میں تعلق اور محبت پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ باضابطہ ناجائز مقصد کی تکمیل کے لیے ایک رات کا مخصوص حصہ طے ہوگیا۔ چنانچہ خادم اس مقصد کی تکمیل کے لیے چل دیئے تو صورتِ حال یہ ہوئی کہ ابھی وہ تھوڑا ہی چلے تھے کہ راستے میں شدید آندھی وطوفان اور بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ اتنی دیر تک قائم رہا کہ ان کا وعدہ کیا ہوا وقت ختم ہوگیا۔ بالآخر وہ خادم آگے بڑھنے کے بجائے واپس پیچھے لوٹ گیا، کیونکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے تہجد میں اُٹھنے کا وقت ہو چکا تھا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ غلط ارادے نہیں کیا کرتے۔

تو دوستو! کیا آپ اس واقعے کو محض ایک اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ نہیں نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی حفاظت کا ایک خاص انتظام ہے۔ اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اولیاء اللہ کے خادموں پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظرِ عنایت اور حفاظت ہوتی ہے کہ جس سے نظامِ عالم حرکت میں آجاتا ہے۔ کیا کوئی عقل مند انسان اس ناکامی اور محرومی کو واقعی ناکامی اور محرومی قرار دے سکتا ہے؟ بالکل نہیں، بلکہ یہ تو عین کامیابی اور سعادت مندی ہے۔

رہ گئی وہ آرزوئیں اور تمنائیں جو گو کہ حرام نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں خوب مال و دولت جمع کروں اور خوب عیش و عشرت کی زندگی گزاروں۔ شاندار عمارتیں، اونچے محلات، اعلیٰ درجے کی گاڑیاں غرض یہ کہ ہر قسم کے سامانِ عیش و عشرت کو جمع کرلوں، مگر جب اللہ تعالیٰ کو اس بندے سے محبت ہوتی ہے تو دنیا میں انہماک سے اور عیش و عشرت میں اشتغال سے اس کو اس طرح بچا لیتے ہیں کہ اس کے لیے بظاہر مال و دولت کے تمام راستے ناکامیوں سے بھرے نظر آتے ہیں۔ بالآخر وہ سب اُمیدوں کو چھوڑ کر تعلیم و تعلّم اور دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس کی راہ کو اختیار کرتا ہے اور اُس کا مرنا جینا صرف دین کے لیے رہ جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے ایک استاد فرماتے تھے میں ایک خالص مدرّس ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ دنیاوی کاروبار کی طرف لگنا چاہا، پر اکثر ناکامی ہی سامنے آئی اور نفع کے بجائے نقصان اُٹھانا پڑا تو بالآخر میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ سے یکسوئی اور پورے انہماک کے ساتھ دین کی خدمت لینا مقصود ہے۔ چنانچہ ماشاء اللہ آج وہ استاد بخاری و ترمذی کے مدرّس اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ درحقیقت یہ سب اللہ تعالیٰ بندوں کے فائدے کے لیے کرتے ہیں ورنہ اللہ کو ہم سے کوئی منفعت مقصود نہیں ہے۔ اصغر گونڈوی کا شعر ہے ؎

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغرؔ
کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

شانِ ربوبیت کی ایک جھلک

بھائیو! یہ سب اللہ کی شانِ ربوبیت ہے جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے جسم کے رب ہیں اور اس کو آفات و بلیات سے بچاتے ہیں اسی طرح وہ ہمارے قلب وروح کے بھی ربّ ہیں کہ ان کو امراض اور بُرائیوں سے بچاتے ہیں۔ اس لیے بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ خواہ کتنا ہی دل پر زور پڑے اور اس کو کیسا ہی رنج وصدمہ پہنچے، مگر وہ پختہ فیصلہ کرلے کہ اللہ کے حکم کو توڑنا منظور نہیں۔ تو یاد رکھیے پھر اس ٹوٹے ہوئے دل میں اللہ تعالیٰ اپنی خاص تجلیات کے ساتھ متجلی ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ اس ٹوٹے ہوئے دل کو ایسی لذت اور حلاوت عطا فرماتے ہیں کہ دونوں جہان کی نعمتیں بھی اُس کے سامنے ہیچ ہیں۔

حلاوتِ قربِ خداوندی اور اس کی خاص حکمت

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حلاوتِ قربِ خداوندی کو حضرتِ والا نے جس خاص انوکھے انداز سے بیان فرمایا اس کو نہ پہلے کہیں سنا اور نہ کہیں پڑھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بھوکا انسان اپنے سامنے رکھے ہوئے عمدہ اور لذیذ قسم کے کھانے اور مختلف انواع و اقسام کے حلوہ جات میں سے خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش! مجھے مزید بھوک ہوتی تو اور مزید لذیذ اشیاء سے اپنا پیٹ بھرتا اور جو چیزیں کھانے سے رہ گئی ہیں ان میں سے بھی کھاتا۔ خواہ اس نے خوب سیر ہوکر کھایا ہو پھر بھی اگر اُسے یہ علم ہو جائے کہ بہت لذت وفرحت بخش قسم کی مٹھائی وغیرہ ابھی باقی ہے تو اس کی تمنا ہوتی ہے، کاش! پیٹ کے اندر کوئی جگہ نکل آئے تاکہ وہ اس کو بھی کھا سکے تو غرض یہ کہ اس کی آخری درجے کی سیرابی کبھی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ جو حسینوں کا عاشق ہوتا ہے۔ بالفرض اگر اس کو ساری دنیا کی حسین اور حسینائیں دکھادی جائیں اور پھر بھی اُسے یہ پتہ چلے کہ ابھی کسی خطے کا حُسن اُس نے نہیں دیکھا تو وہ اس کی تمنا کرے گا کہ کاش! اُسے دیکھوں اور اُس کے بغیر اُسے چین وسکون میسر نہیں ہوگا اور دوسرا وہ بھوکا شخص جس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے وہ کھانا ڈھونڈتا رہتا ہے تاکہ اس کے ذریعے اپنی بھوک دور کرے۔

اگر آپ غور فرمائیں تو یہ معلوم ہوگا کہ جس طرح یہ بھوکا کھانے کا محتاج ٹھہرا۔ اسی طرح وہ سیراب شخص بھوک کا خواہشمند اور متلاشی ٹھہرا تو ایک لحاظ سے یہ دونوں ہی محتاج ہوئے اور اپنے دل کے قرار واطمینان اور تسلی اور تشفی کے لیے ایک کھانے کا محتاج تو دوسرا مزید بھوک کا متمنّی تاکہ اور مزید لذیذ اور مزیدار چیزیں کھا سکے۔ جبکہ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی ذات جس کے قلب میں سماجائے تو گویا اس نے لذاتِ عالم کا کیپسول (Capsule) کھالیا کیونکہ سارے عالم کی لذتوں کا خالق اور مرکز لذاتِ عالم اللہ کی محبوب ذات ہے تو اس کو دل میں بسالینا اور

دل کو اس کی محبت سے سرشار کر لینا خلاصہ اور نچوڑ ہے تمام لذتوں کے پالینے کا۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنے نام میں بھی ایسے ہی لذت وحلاوت رکھ دی ہے، اس لیے جب بندہ مؤمن اللہ کا نام دل کی گہرائیوں کے ساتھ لیتا ہے تو مؤمن کی ساری جان شیر وشکر بن جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنے دل میں مزید کسی فانی لذت کی تمنا نہیں پاتا اور نہ اطمینان وسکون کے لیے اُسے مزید کسی شئے کی حاجت رہتی ہے بلکہ دونوں جہان کی ساری نعمتیں مل جانے سے بھی بڑھ کر اس نعمتِ قربِ خداوندی میں اُسے خاص لطف اور مزہ نصیب ہوتا ہے۔ جس کو حضرت والا نے اپنے اِن اشعار میں بیان فرمایا۔

وہ شاہِ دو جہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کر پائے
ارے یارو جو خالق ہو شکر کا
جمالِ شمس کا نورِ قمر کا
نہ لذت پوچھ پھر نامِ خدا کی
حلاوت نامِ پاکِ کبریا کی

انبیاء علیہم السلام کے قلوب کا دنیا کی طرف مائل نہ ہونے کا ایک قیمتی راز

دراصل یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبھی دنیا کے منصب وعہدوں اور اس کی فانی لذتوں اور مزوں کی طرف مائل نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی نظر میں اصحابِ دولت وثروت کی کوئی قیمت واہمیت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ دنیا کے حقیر خزانوں کی طرف وہ للچائی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

تقریباً یہی حالت اُن کے نائبین علماء اور اولیاء اُمت کی ہوتی ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں اور عہدے داروں کو خاطر میں نہیں لاتے اور اُمراء ورؤساء سے تعلقات اور دوستی کو خطرے کی گھنٹی سمجھتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جس کو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ترمذی کی شرح میں ذکر فرمایا کہ شام کے ایک عالم جو بڑے درجے کے محدث تھے، ایک مسجد میں معتکف رہتے اور وہیں حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک دن بادشاہ ان کی خدمت میں ملنے کے لیے حاضر ہوا تو وہ جس طرح پیر پھیلائے بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ جب لوگوں نے عرض کیا حضرت! سامنے سے بادشاہ آرہے ہیں۔ تو ارشاد فرمایا کوئی حرج نہیں آنے دو۔ چنانچہ جب وہ آگئے تو شیخ نے ان کے سامنے دنیا کی بے ثباتی اور اس کی فنائیت وغیرہ کا تذکرہ کیا جس سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور وہاں سے چلا آیا۔ پھر اپنے پاس سے اپنے ایک خادم کے ذریعے اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی ہدیے میں بھیجی۔ جب خادم نے آکر وہ تھیلی ان اللہ والے کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے قبول کرنے سے منع کر دیا اور خادم سے

یہ فرمایا کہ بادشاہ سے جا کر یہ کہہ دینا اِنَّ الَّذِیْ یَمُدُّ رِجْلَیْهِ لَا یَمُدُّ یَدَیْهِ یعنی کہ جو شخص اپنے پیروں کو پھیلایا کرتا ہے وہ اپنے ہاتھوں کو نہیں پھیلاتا۔

شیخ کی توجہات کا اثر

میرے دوستو اور بھائیو! یہ احقر جو اشعار کی تشریح پیش کر رہا ہے۔ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور ہمارے حضرت والا کی دعاؤں اور توجہات کا نتیجہ اور سامعین، اہلِ مجلس کی طلب صادق کا اثر ہے۔ احقر نہ اس کا اہل ہے اور نہ اپنے کسی کمال کا اس میں دخل ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ جب میرے شیخ و مرشد کا حکم ہوتا ہے تو اس کی تعمیل میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اشعار کی تشریح کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔ توفیقِ الٰہی سے جو مضامین کتاب و سنت کی روشنی میں دل میں آتے رہتے ہیں ان کو پیش کرتا ہوں۔ اگر اس موقعہ پر احقر اشعار اور ان کی تشریح پیش کرنے سے پہلوتہی اور اعراض کرے اور کسی حیلے بہانے سے بچنا چاہے تو وہ درحقیقت خود رائی ہوگی اور شیخ کی حکم عدولی ہوگی جو سالک کے لیے بے حد مضر اور نقصان دہ ہے اور بلکہ آگے بڑھ کے یہ کہیے کہ خود رائی یعنی اپنی رائے پر چلنے کا شوق جو کہ دل کی ایک بیماری ہے، اس کو تواضع سمجھنا نادرست اور غلط ہے بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ جب اپنے بزرگوں اور بڑوں کی طرف سے کسی کام کا حکم ہو تو اس کی بجا آوری کو اپنی سعادت سمجھے۔ تقریباً بعینہٖ یہی صورتِ حال احقر کے پیشِ نظر ہے کہ حضرتِ والا کا حکم ہے اس کو پورا کرنے کے لیے زبان بنتا ہوں، ورنہ ایک مدت سے کان بن کے رہتا تھا اور دل میں اُس کی تمنا ابھی بھی ہے اور فی نفسہٖ اپنے شیخ کے پاس کان بن کر رہنا ہی زیادہ مفید اور نفع بخش ہے۔

شیخ کا دل خوش کرنا عبادت ہے

چونکہ مرید کو اپنے شیخ سے جو محبت ہوتی ہے وہ للہ محبت ہے جس کی حدیثوں میں بڑی فضیلت موجود ہے۔ شیخ اپنے مرید کو اللہ کی طرف راہ دکھلاتا ہے، اس لیے اپنے شیخ کے دل کو خوش کرنا بھی اسی طرح عبادت قرار پائے گا جس طرح کہ نبی کے دل کو خوش کرنا عبادت ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ نبی اور نائب نبی دونوں کا دل خوش کرنا عنداللہ محمود اور پسندیدہ ہے حتیٰ کہ ملا علی قاری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مطلق مؤمن کے دل کو خوش کرنا من جملہ عبادت کے ہے، جبکہ خالصتاً بوجہ اللہ ہو اور اس میں دنیوی غرض شامل نہ ہو۔

اس مضمون کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بحوالہ ایک روایت ذکر فرمایا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم مجھ کو گزشتہ شب میں دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ میں تمہارا قرآن سن رہا تھا واقعی میں تم کو داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی کا حصہ عطا ہوا ہے۔ روایت کیا ہے اس کو بخاری و مسلم اور ترمذی نے اور برقانی کی روایت میں مسلم سے اتنا اور زیادہ ہے کہ حضرت

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! واللہ اگر مجھ کو معلوم ہو کہ آپ میرا قرآن سن رہے ہیں تو میں آپ کی خاطر اس کو خوب بناتا، سنوارتا۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس سے استنباط فرمایا کہ بزرگوں کا دل خوش کرنے کے لیے اگر کوئی طاعت یا خدمت اچھی طرح کی جائے کہ مخلی بالطبع (خالی الذہن) ہو کر اس طرح نہ کرتا تو ظاہر میں اس میں شبہ ریاء کا معلوم ہوتا ہے، مگر چونکہ تطییب قلب اہل اللہ بلکہ قلبِ مسلم خود عبادت ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک عبادت کو دوسری عبادت کے واسطے اچھی طرح کرتا ہے، اس لیے ہرگز یہ ریاء نہیں ہے۔ حدیث میں اس کے استحسان پر صاف دلالت ہے۔ سبحان اللہ! حکیم الامت جیسا عالم اپنے وقت کے مجدّد کیا خوب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس نادان کو مدتوں یہ شبہ رہا کہ اکثر کسی کی فرمائش سے جو قرآن عمدہ طرح پڑھنے کی عادت ہے۔ شاید یہ اچھا نہ ہو۔ الحمدللہ! کہ اس حدیث کا سرِّ دقیق جس کی ابھی تقریر کی گئی ہے، قلب میں فائز ہوا اور یہ شبہ بالکل رفع ہو گیا۔ پھر اس حدیث پر نظر پڑنے سے اس کی اور تائید ہوگئی۔

حدیث میں دوبارہ غور کرنے سے مقبولانِ الٰہی کی بڑی فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ ان کی طلب ورضاء مثلِ رضاءِ حق تعالیٰ کے ہے جبکہ دونوں میں تعارض نہ ہو اور راز اس میں یہی ہے کہ ان کی رضاء کو رضاءِ حق کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور مطلوب بالذّات طلب رضائے حق تعالیٰ ہی ہے۔ (التکشف، ص: ۴۵۷)

اور شارح مشکوٰۃ ملاعلی قاری رحمہ اللہ اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

«اِدْخَالُ السُّرُوْرِ فِی قَلْبِ الْمُؤْمِنِ اَفْضَلُ مِنْ عَمَلِ الثَّقَلَیْنِ»

(المرقاۃ، ج: ۳، ص: ۴۳)

یعنی ایک صاحبِ ایمان کے دل خوش کر دینا یہ ثقلین یعنی جن وانس کے عمل اور عبادت سے افضل ہے۔

صاحبو! کیا کوئی مسلمان یہ جرأت کرسکتا ہے کہ صحابیٔ رسول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ریاء کار اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر بنا سنوا کر پڑھنے کو ریاء کاری کہے۔ ظاہر ہے یہ بات ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے بعض ظاہر بیں اس طرح کی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ بس اللہ کو راضی کرنے کے لیے جو عمل ہو وہ ہی اخلاص ہے۔ کسی اور کی رضاء کو پیشِ نظر رکھنا یہ ریاء اور شرکِ اصغر ہے، مگر ان کے سامنے یہ بھی رہنا چاہیے کہ مقبولانِ الٰہی کو راضی کرنے کی نیت یہ خود ایک ایسا عمل ہے جو اللہ کی رضاء کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ عمل بھی اخلاص ہی کہلائے گا، لہٰذا خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ اولیاء اللہ اور مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے دلوں کو خوش کرنا ایک نیک اور پسندیدہ عمل ہے۔ ہاں! رؤساء واغنیاء اور امراء وحکام سے مال ودولت وعہدے اور منصب کی حرص وطمع میں ان کو خوش کرنے کی کوشش کرنا اور محض ان کی خوشنودی کے لیے جائز وناجائز کی پرواہ کیے بغیر ان کے حسبِ منشاء معاملات انجام دینا یہ بڑے درجے کا گناہ ہے اور شریعت کی نگاہ میں سخت وعید کا سبب ہے۔ جیسا کہ مختلف روایات میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر وعیدیں سنائی ہیں۔

اولیاء اللہ کے پاس بیٹھنا گویا مجالست مع اللہ ہے

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ التکشف، صفحہ:۴۲۳ پر ایک حدیث شریف نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عائذ بن عمرو سے ایک حدیثِ طویل میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک قصہ میں جس میں حضرت ابوبکر نے حضرت سلمان اور صہیب اور بلال کو کچھ نصیحت کی تھی جس سے ایک رئیس کی طرفداری کا شبہ ہوتا تھا) فرمایا اے ابوبکر! کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کردیا ہے، اگر ان کو ناراض کردیا تو بس اپنے ربّ کو ناراض کردیا۔ حضرت ابوبکر ان کے پاس آئے اور کہا اے میرے بھائیو! میں نے تم کو شاید ناراض کردیا ہو۔ انہوں نے کہا نہیں اے بھائی! اللہ تعالیٰ تم کو بخشے۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔ (المشکوٰۃ، ص:۵۶۸)

حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں اس قول کی روشنی میں کہ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّجْلِسَ مَعَ اللہِ فَلْیَجْلِسْ مَعَ اَھْلِ التَّصَوُّفِ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد لَئِنْ اَغْضَبْتَھُمْ سے معلوم ہوا کہ مقبولانِ الٰہی کے ساتھ جو معاملہ کیا جاوے گا وہ گویا حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس اس بناء پر یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ مقبولانِ الٰہی کے ساتھ مجالست ایسی ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجالست اور لفظ ''مجالست'' کا اذن دوسری حدیث میں ہے:

﴿اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾
(شعب الایمان)

اس حدیث پاک کی تشریح یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ذاکر کے جلیس ہیں تو جو ذاکر کے پاس بیٹھا ہے وہ اللہ کے ساتھ بیٹھا ہے اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ اس لیے یہ مضمون یہاں ضمناً آ گیا ہے کہ بس احقر حضرتِ والا کے اس کلام کی تشریح کی جرأت حضرت والا کی موجودگی میں اس لیے کرتا ہے کہ ایک تو حضرت کا حکم ہے اور دوسرے حضرت کے قلب کا خوش ہونا ان شاء اللہ میرے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشی کا باعث ہوگا۔

محبوبِ حقیقی کو پالینا سارے غموں کو مٹا دیتا ہے

مٹ گئے رنج راہِ منزل کے
پاس آئے ہیں جب سے وہ دل کے

جس طرح اس دنیا میں جو لوگ کسی کے عشق (درحقیقت فسق) میں گرفتار ہوتے ہیں اور پھر اپنے معشوق و محبوب تک رسائی کے لیے بڑے بڑے دشوار گزار مراحل اور مختلف نوع کے مصائب وآلام سے گزر جانے کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ بالآخر جب ان کو اپنے محبوب تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے تو جملہ مصائب وآلام ان کے لیے

ایک افسانہ بن کر رہ جاتے ہیں۔انہیں بزعم خود ایسا سرور ونشاط اور عارضی کیف ولذت ملتی ہے کہ اس راہ کے تمام رنج وغم بھلا دیئے جاتے ہیں۔''بزعم خود''اس لیے عرض کیا ہے کہ عشقِ مجازی یعنی فسق میں حقیقی چین وسکون اور قلبی لذت وفرحت میسر ہو ہی نہیں سکتی۔

غرض اس مثال سے یہ سمجھانا ہے کہ سالک کو بھی اسی طرح اللہ کی راہ میں کچھ رنج وغم اٹھانے پڑتے ہیں۔ جیسے نظر بچانے میں دل پر غم اُٹھانا چھوٹے بڑوں کی تلخ اور کڑوی ناموافق باتیں سن کر اس کو سہنا، ایذائے خلق پر تحمل و برداشت کر کے کر کے دل پر صدمہ جھیل جانا اور تمام ہی قسم کی خواہشاتِ نفس کی پیروی سے بچنے اور من چاہی کے خلاف ''ربّ چاہی'' پر عمل کرنے میں جو تکالیف اور مشقتیں اُٹھائی ہیں۔ جب مردِ مؤمن کو ان کے نتیجے میں اللہ ملتا ہے اور پھر حق تعالیٰ کی طرف سے سارے عالَم میں عزت وعظمت اور ہر قسم کی عافیت وراحت عطا ہوتی ہے تو پھر راہِ منزل کے سارے رنج وغم مٹ کر صاف ہو جاتے ہیں۔ گو کہ ایسے لوگ اپنے ظاہر کے اعتبار سے کیسی ہی بے سروسامانی اور فقر وفاقے کے عالم میں ہوں اور صورتاً ہر چہار طرف سے ان کو ناموافق حالات نے گھیرا ہو، مگر تب بھی ان کے دلوں میں سرور ونشاط کا وہ عالم ہوتا ہے کہ عام اہلِ دنیا تو کیا سلاطینِ عالم کو بھی اس کی ہوا نہیں لگتی۔ وہ اپنے اللہ کی یادوں میں ایسے مست وسرشار اور کھوئے رہتے ہیں کہ ان کے ظاہری دنیوی نوع کے رنج وغم ان کے حق میں بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں، کیونکہ ان کی نظر ہر وقت اپنے حاکم وحکیم اللہ پر رہتی ہے۔ ان کے پیشِ نظر ہر گھڑی یہ عقیدہ مستحضر رہتا ہے کہ میرے اللہ کا ہر فیصلہ میرے حق میں خیر ہی خیر ہے کیونکہ محبوب اپنے محبوب کے لیے بُرائی نہیں چاہتا، اس لیے وہ رضاء بالقضاء کے ذریعے فرحاں وشاداں رہتے ہیں۔

اسی پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا جس کو حضرت والا نے اپنے مواعظ میں کسی مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ ایک بزرگ غالباً خواجہ بہلول رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ جب اُن سے کسی نے پوچھا کیا حال ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا بہت اچھا ہے۔ پورا عالَم میری منشاء کے مطابق چل رہا ہے۔تو کسی نے پوچھا حضرت! آپ کی منشاء کے مطابق پورا عالَم کیسے چل سکتا ہے؟ آپ تو ایک مخلوق اور بندے ہیں۔ عالَم تو ربّ العالمین کے منشاء اور مشیت کے تحت چل رہا ہے۔تو خواجہ صاحب نے کیا جواب ارشاد فرمایا دراصل میں نے اپنی منشاء کو اللہ کی منشاء میں فنا کر دیا ہے، اس لیے عالَم میں جو کچھ بھی ہو گویا کہ میری بھی منشاء اُسی طرح ہے۔اس لیے ولی کامل مردِ مؤمن حق تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہوگا تو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہر حالت کو اپنے لیے خیر اور رحمت سمجھے گا اور ہر حال میں وہ راضی بہ قضاء رہے گا۔

مومن کی شان ہر حال میں راضی برضاء رہنا ہے

حضرت شاہ احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں ؎

بے کیفی میں بھی ہم نے تو ایک کیفِ مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے چلتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اثقل دیکھا ہے

خود ہمارے حضرت والا نے اس مضمون کو اپنے دوسرے شعر میں فرمایا ؎

کیف و تسلیم و رضاء سے ہے بہارِ بے خزاں
صدمہ و غم میں بھی اختؔر روح رنجیدہ نہیں

احقر نے ایک مرتبہ حضرت والا کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا تھا جس میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے دل کے بہت زیادہ رنجیدہ اور غمزدہ ہونے کا تذکرہ کیا تھا۔ احقر نے یہ بھی لکھا تھا کہ کثرت سے حَسْبُنَا اللہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ کا وظیفہ پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پر حضرت والا کی طرف سے جو جواب موصول ہوا اُسے پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی اور بڑا نفع ہوا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ایک مؤمن بھائی کی تکلیف و پریشانی سے دوسرے مؤمن بھائی کو تکلیف و پریشانی لاحق ہو کیونکہ جنابِ نبی کریم علیہ السلام نے سب مؤمنین کی مثال ایک جسم کی طرح بیان کی ہے جس طرح جسم کے کسی عضو کو تکلیف پہنچنے سے دوسرے اعضاء بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی مؤمن بھائی کی تکلیف و پریشانی سے دوسرے مسلمان کا تکلیف محسوس کرنا کمالِ ایمانی کی نشانی ہے، مگر حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح ہر مؤمن پر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح اللہ کے ہر فیصلے پر راضی رہنا بھی فرض ہے۔ یعنی راضی بہ قضائے خداوندی رہنا ایمان کا جزء اور حصہ ہے، اس لیے ایسا حد سے بڑھ کر غم کہ جو صحت وطبیعت کو متاثر کر دینے والا ہو رضاء بالقضاء کے مقتضی کے خلاف ہے اور دین ہونے کے بجائے بے دینی ہے۔

سبحان اللہ! یہی وہ معاملات ہیں جن میں انسان کسی شیخ و مرشد کا محتاج ہوتا ہے کہ جس چیز کو وہ بظاہر عین دین و ایمان سمجھ رہا ہے بعینہ وہی چیز صحیح شرعی حدود سے نکل جانے کی بناء پر افراط و تفریط کا شکار ہو جانے کے سبب دین نہیں رہتی۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

بمئے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہِ رسم و منزل را

کہ اگر تیرا پیر تجھے کہے کہ تو اپنے سجّادے کو شراب سے رنگین کر دے تو تو ایسا کر دینا کیونکہ جو راہ طے کیا ہوا شیخ کامل ہے وہ راستے کے نشیب و فراز اور اس کے اُتار و چڑھاؤ سے واقف ہے۔ وہ کبھی غلط مشورہ دے کر تمہیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔

اتباعِ شیخ حدودِ شریعت میں منحصر ہے

اس شعر کے ظاہری معنی پر ہر طالب صادق کو ایک اعتراض پیدا ہوگا کہ شریعت کا مسلّمہ اصول اور ضابطہ ہے لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ کسی مخلوق کی اطاعت کی کوئی گنجائش نہیں جبکہ اللہ کی معصیت اور اس کی نافرمانی ہوتی ہو تو پھر آخر کسی شیخ کے کہنے پر شراب سے سجّادے کو رنگین کیسے کیا جا سکتا ہے؟ بالفاظِ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ کہ اصل مقصود بالذات اطاعتِ باری تعالیٰ ہے حتیٰ کہ نبی کی اطاعت بھی بوجہ اطاعتِ باری تعالیٰ اور بغرضِ تعمیل اوامرِ خداوندی ہی مقصود ہوتی ہے، اسی لیے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے جگہ جگہ پر یہ بات تحریر فرمائی کہ تصوف صرف وہی معتبر ہے جو سنت و شریعت کے مطابق ہو اور جو چیز سنت و شریعت کے خلاف ہو اس کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اہلِ بدعت کا مخترع ہے۔ اس کی اتباع جہنم تک پہنچانے والی اور اللہ کی ناراضگی اور عذاب کی موجب ہے۔ چنانچہ ''بصائرِ حکیم الامت'' صفحہ: ۵۰ پر درج ہے کہ دوسری اہم چیز جو حضرت کے دل و دماغ میں کاوش و اضطراب پیدا کر رہی تھی، وہ دورِ حاضر کی خانقاہی فقیری و درویشی کی ہیئتِ کذائی تھی۔ جہاں کتاب و سنت سے بالکل بیگانہ اور بے نیاز ہو کر چند جوگیانہ رسم اور طریقۂ نفس کشی ہی کو واصلِ حق ہونے کا ذریعہ اور چند ملحدانہ عقائد کو حاصلِ تصوّف و سلوک سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک عالمگیر فتنہ تھا جس میں اکثر دینی رجحان رکھنے والے نادان عوام مبتلا تھے۔ بس اس سب کی حضرت نے مدلل اصلاح فرمائی ہے۔ القصہ مختصر یہ کہ کتاب و سنت سے ہٹا ہوا تصوف جہالت و ضلالت ہے تو پھر اس شعر میں شراب کے سلسلے میں پیر کی ماننے کی بات کس طرح درست ہو سکتی ہے۔

''بمئے سجادہ رنگین کن'' کی شرح از حضرت تھانوی قدس سرہٗ

چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے جواب ارشاد فرمایا ہے کہ دراصل اس شعر میں مے سے مراد امرِ مباح ہے، مگر چونکہ بعض امورِ مباح فی نفسہٖ ہوتے ہیں لیکن وہ بظاہر عقل و شرع کے خلاف معلوم ہوتے ہیں تو اس وقت انسان ان پر عمل کرنے سے جھجکتا ہے تو ایسے امور کے متعلق اس شعر میں خطاب ہے کہ ان میں اپنے شیخِ کامل عالمِ ربانی کی بات مان لینا چاہیے، اپنی رائے پر عمل نہ کرنا چاہیے اور پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک مثال پیش فرمائی ہے جیسے بعض اوقات زیادہ ذکر و عبادت کی وجہ سے کوئی سالک روحانی قبض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا شیخ الوقت اس کو بہت سے وظائف اور عبادات سے روکتا ہے۔ اچھے کھانے پینے اور لوگوں کے ساتھ دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق سیر و تفریح وغیرہ امور کا حکم دیتا ہے تو ایسے موقعہ پر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے یہ شخص مجھے بہت سی عبادات اور راتوں میں جاگنے رونے سے منع کر رہا ہے۔ سیر تفریح وغیرہ کا حکم دے رہا ہے تو یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ بس اس موقعہ پر سالک کو چاہیے کہ اپنے شیخ کی بات کو قبول کر لے۔

اس کی ایک اور مثال میرے ذہن میں آئی کہ حضرت مفتی رفیع عثمانی دامت برکاتہم ہمارے یہاں دارالعلوم آزادوِل جنوبی افریقہ میں تشریف لائے تھے۔ حضرت کا بیان ہوا تھا تو اس میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ ہم نے جب حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب سے تعلق اصلاحی قائم کیا تو ہر ہفتہ حضرت کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ ایک دن مجلس کے بعد ہمیں الگ لے جا کر یہ فرمایا بھائی! آپ لوگ اِدھر اُدھر تقریریں وغیرہ نہ کیا کریں۔ آپ بیانات کے لیے نہ جایا کریں اور ریڈیو وغیرہ پر بھی نہ جایا کریں اور اخبارات ورسائل میں بھی مضامین نہ لکھا کریں۔ تو اب بظاہر یہ دین کے کاموں سے روکنا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے جو خود حضرت مفتی رفیع عثمانی نے بیان فرمائی کہ ایک دن حضرت نے اندر کمرے میں لے جا کر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ کے بہت سے خطوط دکھائے جو انہوں نے صرف ہم دو بھائیوں کے بارے میں حضرت کو لکھے تھے کہ یہ دونوں صاحبزادے بے حد ہونہار ہیں۔ دیکھیں ان کو ضائع ہونے سے بچالینا اور فرمایا کہ دیکھو وہاں مدینے سے یہ حضرت شیخ کے اتنے خطوط ہیں اور ایک لمبے عرصے تک اجازت نہ دی۔ پھر جب اجازت دی تو فرمایا کہ بھائی! رسمی بیانات نہ کرنا بلکہ جہاں جاؤ زخم پر مرہم رکھو یعنی جو مرض وہاں پھیلا ہوا دیکھو اس کی اصلاح سے متعلق بیان کرو۔ چنانچہ پھر بعد میں اجازت دے دی، مگر ایک مخصوص مدت تک بیانات وغیرہ پر بالکل پابندی لگی رہی۔ ان حضرات نے جو خود اتنے بڑے علماء ہیں اس کو قبول کیا تو آج آپ اور ہم سب دونوں بھائیوں کو ماشاء اللہ دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ نے کیسا چمکایا ہے۔

راہِ حق میں منزل کا مزہ

رنج و حسرت ہیں راہ میں لیکن
لطف شامل ہیں اُن کی منزل کے

یعنی جب بندۂ مؤمن اللہ کی راہ میں اپنی حرام آرزوؤں کا خون کر کے اس خونِ حسرت کو پیتا ہے اور رضاءِ حق تعالیٰ کے لیے تلخ سے تلخ اور کڑوے سے کڑوے گھونٹ کو شیر وشکر سمجھ کر پی جاتا ہے۔ جذباتِ شہوت ہوں یا جوشِ غضب ہو سب کے اوپر اللہ تعالیٰ کے حکم کو غالب رکھتا ہے اور مرضی مولیٰ کے مطابق اپنی خواہشات کو لگام دیتا ہے اور حرام محبتوں کے جذبات کی گاڑی پر اپنے مولیٰ کے حکم کے مطابق بریک لگا دیتا ہے تو اُسے ہر قدم پر منزل یعنی قربِ حق تعالیٰ کا مزہ ملتا ہے اور اس کو نقد اور کیش (Cash) ایسے بے شمار لطف و مزے ملتے ہیں جن کا قرآن و حدیث میں جگہ جگہ وعدہ کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کی اس دنیوی حیات کو حیاتِ طیبہ یعنی بالطف زندگی کر دیا جاتا ہے اور جس طرح جنت میں پُر بہار بارونق زندگی نصیب ہوگی اور عیش ہی عیش اور راحت ہی راحت ہوگی۔ ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں اس کی ایک جھلک دکھا دیتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نظر کی غیر محرم سے حفاظت پر نقد حلاوتِ ایمان کا وعدہ فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ نے ایمان اور عملِ صالح پر

اسی دنیا میں حیاتِ طیبہ کے دینے کا قرآن میں تذکرہ کیا ہے اور اللہ کے باغی اور نافرمانوں کے لیے اسی دنیا کو ان پر تنگ اور تلخ کیے جانے کی وعید مذکور ہے۔ حضرت والا نے دونوں قسم کے لوگوں کی اپنے خاص انداز میں اس شعر میں ترجمانی کی ہے۔

دُشمنوں کو عیشِ آب و گِل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا
ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

اسی طرح حضرت تائبؔ صاحب نے اس مضمون کو یوں پیش کیا۔

ایماں کی حلاوت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
نظروں کی حفاظت کا اور ہی کچھ ہے
ہر پل غم حسرت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
ہر لمحہ شہادت کا مزہ اور ہی کچھ ہے

حلاوتِ ایمانی کی ایک الہامی دلیل

اس مضمون کی ایک عجیب وغریب دلیل جو حق تعالیٰ نے قلب کو عطا فرمائی اور جس کا ماخذ وہ حدیث شریف ہے جس میں شہداء راہِ خداوندی کا ذکر کیا گیا کہ جب شہید بارگاہِ الٰہی میں پہنچتا ہے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ جنت کی ان ساری نعمتوں کے ساتھ ساتھ تیری کوئی اور تمنا ہو تو بتا تو وہ بارگاہِ ربّ العزت میں عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! آپ نے سب کچھ عطا فرما دیا۔ اب کوئی تمنا باقی نہیں ہے، مگر یہی سوال اس سے بار بار کیا جاتا ہے تو بالآخر وہ یہ عرض کرتا ہے کہ بس اگر کوئی تمنا ہے تو یہی ہے کہ مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے اور میں آپ کی راہ میں لڑتا لڑتا پھر سے شہید ہو جاؤں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود شہید ہونے میں اُسے وہ لطف ومزہ اور اعزاز واکرام حاصل ہوا ہے کہ جس کی تحصیل کے لیے وہ جنت کی نعمتیں چھوڑنے کے لیے تیار اور راضی ہے۔ پھر سے اس راہِ عشق ووفا سے گزر کر اور طریقِ صدق وصفاء کے گلی کوچوں میں قدم رکھ کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہونے کا متمنّی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت اور اپنے بندوں پر بڑا احسان اور کرم ہے کہ اپنے دین کا غم اُٹھانے والوں کو آخرت کے اجرِ عظیم کے ساتھ ساتھ دنیا ہی میں پرسکون اور بالطف حیات عطا فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۹۶)

ترجمہ: اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم کھول دیتے ان پر نعمتیں آسمان اور زمین سے لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۱)

اگر یہ اہلِ بستی ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان سے برکتوں کے دھانے کھول دیتے۔

اور ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَظَمَ غَیْظًا وَّهُوَ یَقْدِرُ عَلٰی اِنْفَاذِهٖ مَلَأَ اللّٰهُ جَوْفَهٗ اَمْنًا وَّ اِیْمَانًا﴾

(تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۳۱۹)

جس شخص نے غصے کے مقتضیٰ پر عمل کی قدرت ہونے کے باوجود اس کو قابو میں رکھا تو اللہ اُس کے باطن کو امن چین و سکون اور ایمان سے بھر دیں گے۔

صاحبو! ذرا غور تو کرو کہ ہمارے مہربان اللہ کی کیسی نعمتِ عظمیٰ ہے کہ غصے کے پینے پر آخرت میں عظیم اجر ملنے کے وعدے کے باوجود اسی وقت کیش اور نقد دو عظیم الشان نعمتیں عطا فرما رہے ہیں دل کا امن اور کمالِ ایمان۔ جو اتنی بڑی نعمتیں ہیں کہ ان کو لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا اور جس کے حصول کے لیے آج دنیا والے سارے عالم میں بے چین و پریشان ہیں۔ بس یہ مذکورہ تفصیل ہی حضرت والا کے اس شعر کی تشریح ہے کہ اس راہ میں رنج و حسرت تو ہیں، مگر یہ ایسی قیمتی راہ ہے کہ جس کا راہی چلتے چلتے لطفِ منزل پا لیتا ہے۔ بس کسی درجہ صاحب ذوقِ سلیم ہونا چاہیے تو پھر اپنی آنکھوں سے ان چیزوں کا مشاہدہ کرے گا۔ جیسا کہ لذیذ پھلوں کو کھا کر ان کی صحیح لذت کا ادراک کر لیا جاتا ہے۔

حیاتِ اولیاء رشکِ صد حیات ہے

کیا کہوں ان کے قرب کا عالم
کتنے عالم ہیں عالمِ دل کے

جب کسی دل کو اللہ تبارک و تعالیٰ کا قرب نصیب ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں ایسی بہاریں آتی ہیں اور اُسے ایسی حیات عطا ہوتی ہے کہ جس پر سیکڑوں اور ہزاروں حیات قربان کی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

جب کبھی وہ اِدھر سے گزرے ہیں
کتنے عالم نظر سے گزرے ہیں

اور اس حقیقت کا صحیح ادراک و احساس اس کے حاصل ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ جیسا کہ شہد و شکر کو میٹھا تو کہا جا سکتا ہے، مگر ان دونوں کے مٹھاس میں فرق و امتیاز ان کو چکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ عربی زبان کا مقولہ ہے

مَنْ لَّمْ یَذُقْ لَمْ یَدْرِ کہ جو کسی چیز کو نہ چکھ لے اس کو صحیح ادراک نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت اولیاء اللہ کے قلوب کا کیا عالم ہوتا ہے اور خالقِ دو جہاں ربِ کائنات کی معیتِ خاصّہ حاصل ہونے کے نتیجے میں ان کے قلب میں کتنے عالم جمع ہوتے ہیں۔ اس کو جاننا سمجھنا بس اس شخص کا حصہ ہے جس کو قلبِ سلیم عطا ہوا ہو کیونکہ اللہ کو پالینے سے دل و دماغ ہزار ہا عالم کی لذتوں کا مرکز و سرچشمہ بن جاتا ہے۔

فرطِ لذت سے جھوم جاتا ہوں
کتنی خوشیاں ہیں آپ سے مل کے

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی حرام اور ناجائز خواہشات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور قرب و حضوریٔ خاص سے جو خوشی عطا ہوتی ہے اُس کے سبب میں فرطِ لذت سے جھوم اُٹھتا ہوں۔ چنانچہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس خصوصی ملاقات اور معیت کا وعدہ اپنے متقی اور نیکوکار بندوں سے یوں فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت:۱۲۸)

ترجمہ: اللہ ساتھ ہے ان کے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۴۰۶)

چنانچہ اہلِ تقویٰ اور خاصانِ خدا کو اس کے اثراتِ خاصہ کا ادراک و احساس قدم بقدم ہوتا رہتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت و مدد اُترتی ہوئی دیکھتے ہیں اور مشکل سے مشکل مرحلے پر خصوصی فہم و بصیرت ان کو عطا ہوتی رہتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان انعام ہے۔

تقویٰ کا ایک عظیم الشان انعام

اس انعام کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾

(سورۃ الانفال، آیت:۲۹)

ترجمہ: اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو اللہ سے تو کر دے گا تم میں فیصلہ اور دور کر دے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۲۱۶)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ ایک فیصلے کی چیز دے گا، اس میں ہدایت اور نورِ قلب ہے جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوتا ہے اور غلبہ علی الاعداء اور نجاتِ آخرت ہے۔ جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوگا۔

حضرت مفتی شفیع صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے والوں کو فرقان عطا

ہونے کا اکثر مفسرین صحابہ کے نزدیک یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد اور حفاظت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ کوئی دُشمن ان کو گزند نہیں پہنچا سکتا اور تمام مقاصد میں کامیابی ان کی رفیق ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ''فُرْقَان'' سے مراد اس آیت میں وہ عقل و بصیرت ہے جس کے ذریعے حق و باطل میں کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہو جائے تو معنی یہ ہوا کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت و فراست عطا فرما دیتے ہیں کہ ان کو اچھے بُرے میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۳۱۸)

اولیاء کے لیے حفاظت کا وعدہ ہے نہ کہ عصمت کا

اسی معیتِ خصوصیہ اور حفاظتِ خاصہ کو حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ روایت میں ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا﴾

(صحیحُ البخاری، کتابُ الرِّقاق، باب التواضع، ج:۲، ص:۹۶۳)

حدیثِ قدسی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے مقبول بندے سے عداوت کرے میں اس کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں اور میرا بندہ مجھ سے کسی ایسے ذریعے سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ادائے فرائض سے زیادہ محبوب ہو اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں۔ پھر جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اُس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے مطلب یہ کہ اکثر اُس کے جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا الا لعارض لایدوم۔

مسئلہ محفوظیت اولیاء مشہور ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور اولیاء محفوظ كُنْتُ سَمْعَهُ الخ کی جو تقریر ترجمہ میں لکھی گئی ہے۔ اس کے اعتبار سے حدیث اس کا اثبات کرتی ہے۔ (التکشف، صفحہ:۳۷۰)

اس حدیث سے اندازہ لگائیں کہ جب بندہ نیکی اور تقویٰ اختیار کر کے اللہ کا مقرب بندہ بنتا ہے تو پھر ہر وقت اس کے ساتھ اللہ کی کیسی خصوصی رحمت معیت و نصرت شامل رہتی ہے، اس لیے کیوں نہ وہ فرطِ لذت سے جھوم اُٹھے۔

بہارِ قربِ خداوندی پر خزاں نہیں آتی

اب خزاں دل سے دور ہے کیونکہ
پاس رہتے ہیں وہ میرے دل کے

اس شعر کے اندر گویا کہ جو بہار دل کو حاصل ہوئی تھی، اُس کے دوام کو بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کے بعد قلب میں ایسا موسمِ بہار آیا ہے جس کو اب کبھی خزاں لگنے والی نہیں جبکہ دنیا کی محبتوں میں اگر لقائے محبوب سے بظاہر نفس کو کچھ حظ اور سرور مل بھی جائے تب بھی وہ ایسا سرور اور خوشی ہوتی ہے کہ جب تک وہ اپنے محبوب کے ساتھ ہے تو بظاہر خوشی محسوس کررہا ہے۔ جیسے ہی جدائیگی ہوتی ہے تو پھر اُسی معشوق ومحبوب کی جدائیگی اس کے عاشق کی بے چینی و پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ گو کہ اس کا معشوق بڑی خوشی اور بے فکری سے اپنے بستر پر خراٹے لے کر سورہا ہو، مگر ادھر اُس کا عاشق بے چین و بے قرار ہوکر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ کبھی رات کی تنہائیوں میں پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گھومتا نظر آتا ہے تو کبھی چھتوں پر سگریٹ نوشی کے ذریعے گھوم پھر کر اپنا غم بھلانا چاہتا ہے۔ حق تعالیٰ کی عظیم نعمت نیند کی حلاوت ومٹھاس سے محروم رہتا ہے اور اس کا سکونِ زندگی بالکل تباہ وبرباد ہوچکا ہوتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے فراق اور جدائیگی میں اس قدر بے قرار اور بے چین رہتا ہے کہ نہ تو وہ پڑھنے لکھنے کے قابل نہ ہی وہ کسی کاروبار کے قابل رہتا ہے نہ گھر میں اُسے چین وسکون ملتا ہے اور نہ مسجد و مدرسہ میں اس کو یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بقول حضرت والا یوں کہیے کہ اس کے دل کا قبلہ بدل جاتا ہے۔ یعنی جس طرح نمازوں میں کسی اللہ والے اور جملہ اہلِ ایمان کے دلوں کا رُخ قبلے کی طرف ہوتا ہے۔ اس طرح اُس عاشق کا دل ہر وقت اپنے سامنے اس معشوق کی صورت دیکھتا رہتا ہے اور اس کا قلب ہر گھڑی اُس کے اردگرد گھومتا رہتا ہے اور یوں اس کو کسی کلی سکون میسر نہیں آتا۔ جیسا کہ حضرت مولانا اسعد اللہ مظاہری خلیفہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں ؎

عشقِ بتاں میں اسعد کرتے ہو فکرِ راحت
دوزخ میں ڈھونڈتے ہو جنت کی خواب گاہیں

اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے عشقِ مجازی کی لعنت میں گرفتار ہونا یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عذاب ہے اور یہ ایک لعنتی فعل ہے۔ گویا دنیا میں اس کو مظہرِ غضبِ خداوندی و ناراضگی الٰہی قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ نصوصِ مختلفہ اس پر دال ہیں جبکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت ایسی پاکیزہ اور صاف شفاف ہے اور قربِ خداوندی سے قلب کو ایسی بہار حاصل ہوتی ہے کہ پھر خزاں اس سے ہمیشہ دور رہتی ہے اور اُس کے شب وروز

کا ایک لمحہ بھی خزاں کا شکار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر آن اپنے مولیٰ کے ساتھ واصل رہتا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی جدائی کے غم اور صدمے سے دوچار نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے ویسے ہی اللہ بھی اس کو یاد کرتے ہیں اور اس کی پوری زندگی کو سراپا چین وسکون بنا دیتے ہیں۔ اس پر عنایاتِ الٰہیہ کی ہر آن بارش برستی رہتی ہے۔ بس شرط اس کے لیے یہ ہے کہ ہمارے قلب میں غیر اللہ کے سوا کسی کا گذر نہ ہو جو کہ ہمارے کلمۂ توحید کی اساس و بنیاد اور اُس کا مغز اور نچوڑ ہے کیونکہ غیر اللہ کے دل میں رہنے سے اللہ تعالیٰ دل سے دور ہو جاتے ہیں تو پھر یہ کیفِ جاوداں اس کو حاصل نہیں رہتا۔ اس کے دل کو خزاں کا موسم آ کر ساری بہار ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بعض پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ معلومات کی وسعت تو خوب ہے، مگر غیروں سے قلب کی حفاظت نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو اہمیت دیتے ہیں۔ امردلڑکوں سے بلا دریغ اختلاط اور میل جول اور غیر محرم عورتوں سے بلا تکلف ہنسی مذاق وغیرہ کا سلسلہ رکھتے ہیں اور حفاظتِ قلب کا اہتمام نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے قلب کو اپنے قرب کی لذت سے محروم رکھتے ہیں۔ حقیقی علم بھی جو کہ قلب کی ایک روشنی اور جلا ہے۔ ایسے لوگوں کو عطا نہیں ہوتا۔ اس نوع کے بعض قصے حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج'' کے شروع میں بھی ذکر فرمائے ہیں حتیٰ کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا جس مرد سے اگرچہ وہ امرد نہ بھی ہو گفتگو کرنے میں اُس کی آواز میں اور اُس کے نقشے اور چہرے اور آنکھوں کی رنگت و بناوٹ میں نفس کو لطف ملنا شروع ہو تو فوراً اس سے ہٹ جائے اور دور ہو جائے۔

موجوں کی طغیانی میں ساحل کا لطف

جب یہ لذت ہے دل کے طوفاں میں
کیا کہوں کیف دل میں ساحل کے

یعنی یہ جو دل میں حرام خوشیوں کو چھوڑنے میں دل پہ زور پڑتا ہے اور رضاءِ مولیٰ کی خاطر ناجائز لذتوں کو چھوڑنے میں طبیعت پر گرانی ہوتی ہے۔ کبھی مخلوق کے تلخ اور کڑوے جملے سن کر دل چڑتا نظر آتا ہے۔ بسا اوقات ناموافق اور ناخوشگوار حالات کی صورت میں اور مصائب و آلام سے دوچار ہونے کی حالت میں دل کو سخت صدمہ اور رنج اُٹھانا پڑتا ہے تو عین اس طوفانِ رنج وغم اور طغیانی کے عالم میں میں اپنے دل کو حاصل ہونے والی لذت اور روح کا سکون اور حلاوت ومٹھاس بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اسی کو حضرت والا دل کے طوفانوں میں ملنے والی لذت فرما رہے ہیں۔ یعنی خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرتے ہوئے بھی جبکہ ابھی منزل پر نہیں پہنچا۔ اُسے ہر قدم پر منزل کا مزہ اور لطف ملنا شروع ہو جاتا ہے تو کیا ہی خوش نصیب ہے وہ بندہ جو اس راہ کے کانٹوں کو پھول سمجھ کر برداشت کرے اور کیا ہی خوب اس کی بہاروں اور خوشیوں کا عالم ہوگا جب اس کی کشتی ساحل پہ جا لگے گی۔

اور اس کا سِر اور راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ ہے اور ہماری حقیقت جسم اور روح سے مرکب ہے اور قلب وقالب کا مجموعہ ہے تو اس ربّ العالمین اللہ نے جس طریقے سے جسم کے لیے غذاؤں کا انتظام فرمایا اور انہیں بقائے حیات کا ذریعہ بنایا۔ پھر ظاہری اور جسمانی زیب وزینت اور ترقی کے لیے طرح طرح کی نعمتیں پیدا فرمائی ہیں تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی روح کی حیات کے لیے اور قلب کے سرور وانبساط کے لیے بالفاظِ دیگر روحانی حیات قائم رکھنے کے لیے اپنے ذکر اور اپنی یاد کو ذریعہ قرار دیا۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں ذاکر اور غیر ذاکر کو زندہ اور مردہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روحانی حیات کے لیے غذاء ذکر اللہ ہے، اس لیے اللہ کی راہ میں دل پر غم اور صدمے اُٹھانے سے اور اپنی حرام آرزوؤں کا خون کرنے سے دل کو حقیقی حیات میسر ہوتی ہے۔ وہ زندہ کہلانے کے قابل ہوتا ہے۔ یہی راز ہے دل کے طوفانوں میں لذتِ قربِ خداوندی حاصل ہونے کا۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کا ایمان افروز واقعہ

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ جب شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمۃ مالٹا کی جیل میں قید تھے۔ گھر والوں کی طرف سے ایک خط پہنچا جس میں حضرت سے گھر والوں نے درخواست کی تھی کہ حضرت آپ اپنے موقف میں تھوڑا نرمی کا پہلو اختیار کریں اور آ کر گھر والوں کی خیر خبر لیں کیونکہ بعض ناموافق حالات کا سامنا تھا اور ایسی آزمائشیں مسلسل آ رہی تھیں جو درحقیقت انبیاء اور وارثینِ انبیاء کو پیش آیا کرتی ہیں۔ اس پر حضرت مدنی علیہ الرحمۃ نے خط کا جواب لکھتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

مصائب میں اُلجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا
تیرے عشق میں کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

کوئی اس شعر سے اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ مصائب کا مانگنا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے تو پھر اس طرح کا جملہ کیسے درست ہے کیونکہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا مقصد مصائب وحوادث کا مانگنا نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے غیر اختیاری طور پر پیش آمدہ مصائب وحوادث کے سلسلے میں اپنے ایمانی جرأت وشجاعت پر مبنی موقف سے پیچھے نہ ہٹنے کے سلسلے میں اپنے عزم وارادے کا اظہار ہے جو کہ تاریخ میں رجال اللہ اصحابِ دعوت وعزیمت کی سنت رہی ہے۔ پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ خاصانِ خدا اور مقبولانِ بارگاہ پر جب بھی ایسے حالات آئے تو وہ اللہ کے وعدوں پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے تمام صعوبتوں اور دشواریوں کو برداشت کرتے رہے۔

احقر راقم السطور اس واقعے سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان اولیاء اللہ کو ایسے سخت سے سخت حالات میں بھی دل دل میں اپنے مولیٰ کی محبت کا لطف اور مزہ آتا رہتا ہے، اس لیے وہ اس سے پیچھے ہٹنے اور چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔اس کے لیے احقر کے ذہن میں اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی واضح مثال عطا فرمائی کہ بسا اوقات بندہ مؤمن اپنی بعض حاجات اور مشکلات کے لیے اللہ کے سامنے ہاتھ اُٹھا کر روتا رہتا ہے اور عین رونے کی حالت میں باوجودیکہ ابھی تک وہ مشکلات دور نہیں ہوتی وہ اپنے دل میں ایک خاص قسم کا سکون محسوس کرتا ہے۔اس ناچیز کا یہ بارہا کا تجربہ ہے۔

تمام حرام خواہشات کو قربان کرنا اللہ کو پالینا ہے

کیا خبر تھی کہ خوں بہا ہیں آپ
ہائے لمحاتِ غفلتِ دل کے

جو بندے اپنے دل وجان سے اللہ پر فدا ہوتے ہیں اور ہر لمحۂ حیات اپنے مولیٰ پر قربان کردیتے ہیں۔ ان کی ہر گھڑی کا شغل ذکر اللہ اور یادِ الٰہی ہوتی ہے اور گناہوں میں پڑنے اور اپنے مولیٰ کو ناراض کرنے سے اس قدر دور رہتے ہیں، جیسے کہ آگ کی چنگاری اور شعلے سے انسان دور بھاگتا ہے۔قدم بقدم ان کو ایک ہی فکر اور غم لاحق رہتا ہے کہ اپنے ہر عمل سے اللہ کو راضی کرنا ہے اور اُس کی ناراضگی سے بچنا ہے تو وہ ضرور اپنے مولیٰ کو پاکر رہتے ہیں۔حق تعالیٰ سے نسبتِ خاصہ کا پھل ان کو ضرور عطا ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو حضرت والا ایک بہت ہی عمدہ مثال کے ذریعے سمجھا رہے ہیں۔اگر مقتول کے ورثاء اس بات پر راضی ہوجائیں کہ قاتل ان کو خون بہا دیدے اور قاتل اس کے لیے تیار ہو تو اس جان کی طرف سے جو اُس نے لی ہے، یہ بری الذمّہ ہوجاتا ہے اور پھر اس سے اس کے بدلے میں قصاص یعنی اس کی جان نہیں لی جاتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ خون بہا دے کر جان محفوظ کرلی گئی اور اس کو قصاصاً قتل ہونا نہیں پڑا۔ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے بندہ اپنی تمام ناجائز خواہشات اور حرام آرزوؤں کا خون کرتا ہے تو وہ اپنے مولیٰ کو اپنے دل میں پاتا ہے۔بس شرط یہ ہے کہ اپنے دل سے غفلت کو پورے طور پر نکال دے اور جس حال کا جو حکم ہو، اس کو اپنے اوپر لاگو کرے۔تمام اعضاءِ بدن سر سے پیر تک جن اغراض و مقاصد کے لیے عطا ہوئے ہیں، ان کو اس پر لگادے۔یہی اصل حقیقت ہے اللہ پر فدا ہونے کی، اسی لیے فرمایا گیا کُلُّ مُطِیْعِ اللہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ کہ جو بھی اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگا ہوا ہے وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا ہے، کیونکہ اگر اُس کے دل میں اللہ کی یاد نہ ہوتی تو وہ اپنی زندگی کو اپنی جی چاہی پر ڈھال دیتا اور اس کا چال چلن عرف و رواج کے مطابق ہوتا اور گناہوں سے بچ کر خونِ آرزو پینے کی اس کو حاجت نہ ہوتی، اس لیے عاصی اور گنہگار کو عین گناہ اور نافرمانی کے وقت میں

ذاکر نہیں کہا جائے گا۔

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ ہائے افسوس! زندگی کے ان لمحات پر جو آپ کی یاد سے غفلت میں گزرے ہیں ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر لمحۂ حیات آپ پر فدا کرتا اور اس کے نتیجے میں آپ کو پاجاتا، اس لیے ہر انسان کے لیے موت کے وقت میں وہ گھڑیاں بہت باعثِ حسرت وافسوس ہوں گی جو اُس نے اپنے مولیٰ سے غافل ہوکر نفس وشیطان کی غلامی میں گزاری ہوں۔

غفلتِ دل پر اولیاء اللہ کی حسرت وندامت

صاحبو! غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت والا اس شعر میں غفلتِ دل پر افسوس کا اظہار فرمارہے ہیں۔ پھر معصیت ونافرمانی اور اللہ کی ناراضگی والے اعمال میں زندگی گذارنے والوں کو اس سے کس قدر عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ ان گذرے ہوئے لمحاتِ حیات پر کس قدر پشیمانی اور شرمندگی کے آنسو گرانے چاہئیں۔

بالکل سچ اور صحیح بات ہے کہ اولیاء صدیقین کے لیے تھوڑی سی دیر اللہ کی یاد سے غفلت ہی بے حد رنج وقلق کی چیز ہوتی ہے اور اگر کبھی بشری تقاضوں کے تحت وہ اس کا شکار ہوجاتے ہیں تو ان کے دل سے ایسی آہ وفغاں نکلتی ہے اور وہ اپنی اس حالت پر اس قدر گریہ وزاری کرتے ہیں کہ پھر ان کو بمقتضائے احادیث شریفہ یہ لمحاتِ غفلت، لمحاتِ ذکر وقرب میں مبدل کردیئے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی شانِ رحیمی اور کریمی ہے کہ توبہ پر صرف گناہوں اور غفلتوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ حسنات سے مبدل کردیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ توبہ مزید تجلیاتِ قربِ خداوندی کا موجب بن جاتی ہے۔

میرے بھائیو! توفیقِ الٰہی اور فضلِ خداوندی سے ابھی ابھی ایک مضمون دل میں آیا۔ فائدے کے لیے عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ یہی حسرت وندامت آج اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ کی بارگاہ میں نعمتِ عظمیٰ ہے، جس کا اندازہ مرنے کے بعد ہوگا۔ از روئے احادیثِ شریفہ ساری زندگی کا ظالم اور پاپی، شرابی اور کبابی، فاسق وفاجر، کافر ومشرک ایک بار حسرت وندامت سے اللہ کے در کو کھٹ کٹائے اور اپنے کیے سے باز آجائے تو سارے سیئات سے بھرے ہوئے رجسٹر حسنات سے مبدل ہوجاتے ہیں۔ جہنم کے کنارے پر کھڑا ہوا انسان یکدم اپنا رُخ بدل کر جنت کے باغات میں پہنچ جاتا ہے۔ دوسری وہ حسرت وندامت ہے جو مرنے کے بعد ہوگی، وہ انسان کے لیے نافع اور کارآمد نہ ہوگی اور اس کی بدولت عذاب سے چھٹکارا نہ ملے گا **یَوْمَئِذٍ یَنْدَمُ الْاِنْسَانُ وَلَا یَنْفَعُهُ النَّدَمُ** جس دن انسان نادم پشیمان ہوگا مگر یہ ندامت اس کو نافع نہ ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر کافروں کی اس حسرت وندامت کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں شدتِ حسرت کا ذکر جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس طرح فرمایا ہے کہ اگر وہ جگہ موت کی ہوتی تو ان کو اس سے موت آچکی ہوتی۔ اس لیے

حضرت والا کے اس شعر میں ہمارے لیے ایک عظیم الشان نصیحت ہے کہ ہم دنیا میں رہتے رہتے زندگی کے ہر لمحے کو خدا کی یاد میں گزاریں اور جو لمحۂ حیات غفلت کے ساتھ گزر گیا ہے اس پر دل سے نادم اور شرمندہ ہوں اور پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ غفلتوں کی دلدلوں سے نکل کر اپنے مولیٰ کی یاد میں لگ جائیں۔ اس رجوع الی اللہ اور توبہ کے عمل پر ایک حدیث قدسی ذہن میں آئی جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَاَنِیْنُ الْمُذْنِبِیْنَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ زَجَلِ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴾

(تفسیر روح المعانی۔ ج: ۳۰)

یعنی گنہگاروں کا اپنے گناہوں اور خطاؤں پر اللہ کے سامنے رونا اور معمولی رونے کی آواز بھی اللہ کے نزدیک اتنی زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے کہ تسبیح کرنے والوں کی آواز بھی اللہ کو اتنی پسند نہیں۔ غور کرنے کا مقام کہ گنہگاروں کے رونے کی آواز تسبیح خوانوں کی آواز کے برابر بھی نہیں بلکہ زیادہ محبوب قرار دیا ہے، اس لیے جو لوگ حرام محبتوں میں مبتلا ہیں اور حسین حسیناؤں کے چکر میں پڑ کر اللہ سے غفلت میں اپنے لمحاتِ حیات ضائع کر رہے ہیں وہ ذرا معصیت کی مجرمانہ لذت سے اپنے کو نکال کر اللہ ربّ العزت کی طرف بڑھیں۔ وہ ایسا لطفِ حیات پائیں گے کہ پھر اپنے ماضی پر پچھتاتے ہوئے اور کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ کہتے ہوں گے کہ ہائے ہمارے غفلتِ دل کے وہ لمحات اور آہ کس قدر تلخ تھی ہم پر ہماری حیات۔

تاثیرِ صحبت اہل اللہ

ایسے ویسے بھی ہوگئے کیسے
فیض کیسے ہیں شیخِ کامل کے

اس شعر میں اہل اللہ کی صحبت میں تاثیر کا ذکر کیا جارہا ہے کہ اہل اللہ کی صحبت و خدمت اور ان کی محبت و اطاعت سے کتنے ہی غفلتوں کے سمندروں میں ڈوبے ہوئے لوگ اس سے نکل گئے اور کیسے کیسے راہ بھٹکے ہوئے راہِ حق پر گامزن ہوگئے اور بے شمار فسق و فجور کی ظلمات اور تاریکیوں میں پھنسے لوگ نورِ حق سے منور ہوگئے۔ خود ہمارے حضرت والا کی خدمت میں بہت سے عشاقِ مجازی کے عشق و محبت کا رُخ ایسا تبدیل ہوا کہ ان کا سارا عشقِ لیلیٰ عشقِ مولیٰ میں بدل گیا اور جو کل شقاوت و بدبختی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یکدم سعادت و نیک بختی والی حیات کی طرف لوٹ آئے۔ بقول حضرت مولانا منصور الحق صاحب ؎

میرے پیارے مرشد سے ملنے سے پہلے
کیا کرتے تھے جو شقاوت کی باتیں
میرے پیارے مرشد سے ملنے کے بعد
اب کیا کرتے ہیں وہ سعادت کی باتیں

یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحبتِ اہلُ اللہ کو فرضِ عین قرار دیا۔ چنانچہ ''بصائرِ حکیم الامت'' مرتبہ ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب صفحہ: ۱۴۶ پر ہے کہ میں تو اس زمانے میں اہل اللہ کی صحبت کو فرضِ عین کہتا ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ اس زمانے میں اہل اللہ اور خاصانِ حق کی صحبت اور ان سے تعلق رکھنے کے فرضِ عین ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ آج کل ایمان کی سلامتی کا ذریعہ صرف اہل اللہ کی صحبت ہے۔ اس تعلق کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ کوئی جادو اثر نہیں کرتا۔ (بحوالہ الافادات الیومیہ)

آج میں حیران ہوتا ہوں کہ اگر آپ لوگوں سے پوچھیں کہ حضرت تھانوی کیسے عالم تھے، کیا وہ مجدد تھے، کیا وہ حکیم الامت تھے اور کیا مفسر اور محدث اور فقیہ تھے تو اہلِ حق طبقے کا تقریباً ہر فرد اس کا جواب ''جی ہاں'' میں دے گا اور اتنا ہی نہیں بلکہ خود حضرت تھانوی کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا، مگر نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ جب حضرت کے اس قول کو پیش کرو تو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

محبتِ عاشقانِ حق مرادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے

صاحبو! راقم السطور آپ سب کو دعوتِ غور و فکر دیتا ہے کہ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعائیہ جملے میں غور فرمائیں:

﴿اَللّٰهُمَّ اِنِّیْۤ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُنِیْۤ اِلٰی حُبِّکَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یَّنْفَعُنِیْ حُبُّهٗ عِنْدَکَ﴾

(مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۱۰۹۳)

غور کرنے کی بات ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے خود اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ کے عاشقوں کی محبت دونوں کو اس حدیث میں کیوں جمع فرمایا۔ اس سے اس بات پر صاف دلالت ہوتی ہے کہ اللہ والوں کی محبت مرادِ رسول ہے اور جو مرادِ رسول ہو وہ مرادِ خداوندی ہوا کرتی ہے، اس لیے اللہ والوں کی محبت حاصل کرنے اور مانگنے کی چیز ہوئی۔ گویا اس دعا میں اُمت کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ اے میری اُمت! اللہ تعالیٰ سے اللہ کی محبت کو بھی مانگو اور اللہ کے عاشقوں کی محبت کو بھی مانگو۔

ایک طالب علمانہ سوال اور اس کا تفصیلی جواب

میرے اہلِ علم دوستو اور عزیز طلبہ! آج ماشاء اللہ جمعہ کی رات ہے۔ مجلس میں بڑی تعداد میں آپ اہلِ علم اور طلبہ موجود ہیں۔ الحمدللہ حضرت والا بھی تشریف فرما ہیں، اس لیے اس مقام پر ایک خاص مضمون اپنی اصلاح فہم اور افادۂ عام کے لیے عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس حدیث شریف اور دوسری بعض احادیثِ شریفہ سے اہل اللہ کی محبت کا مضمون ثابت ہوتا ہے، مگر دراصل جو اہلِ خانقاہ کا مدعا ہے وہ اس سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مدعا محض اہل اللہ کی محبت اور صحبت

نہیں بلکہ یہ ہے کہ کسی ایک متعین شیخ کامل مصلح ومرشد ولی اللہ سے محبت وعقیدت اور بیعت واصلاح کا ایسا تعلق قائم کیا جائے کہ نگاہ دوسرے تمام اولیاء اللہ سے ہٹ جائے۔ بس اسی ایک متعین شیخ سے اس طرح چپک کر رہا جائے کہ نہ کسی اور کی وعظ ونصیحت سنے اور نہ ان کی مجلسوں میں بیٹھے اور نہ ان سے کوئی عقیدت وتعلق اور خاص رابطہ ہو۔ تو بالفاظِ دیگر یہ کہیے کہ خانقاہ میں اہل اللہ کی محبت کی بات نہیں کی جاتی بلکہ شخصیت پرستی کی تبلیغ ہوتی ہے جو اتنا سخت گناہ اور قابلِ نفرت امر ہے کہ یہود ونصاریٰ کو اسی وجہ سے مشرک قرار دیا گیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت: ۳۱)

ترجمہ: ٹھیرالیا انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، وہ پاک ہے ان کے شریک بتلانے سے۔

(معارف القرآن، جلد: ۴، صفحہ: ۳۶۲)

خلاصہ یہ کہ جو مضمون اہل اللہ سے محبت کا احادیثِ شریفہ سے ثابت ہو رہا ہے وہ آپ کا مدعا نہیں جو آپ کا مدعا ہے وہ احادیث سے ثابت نہیں۔

تو میرے اہلِ علم ساتھیو! اس سلسلے میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک مقام پر تقلید کے مسئلے کو ثابت کرتے ہوئے بڑی قیمتی مثال ذکر فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی دل کی بیماری میں مبتلا ہو اور اُسے اس کی دوا استعمال کرنی ہو اب وہ اپنی مرضی سے مختلف ہارٹ انگلش اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پاس جاتا ہے۔ ان سے اپنا مرض بیان کر کے مختلف دوائیاں لے کر گھر چلا آتا ہے۔ پھر بیٹھ کر اپنی رائے اور مرضی سے ڈاکٹر زید کی دوائی جمعے کے دن ڈاکٹر عمرو کی دوائی سنیچر کے دن اور ڈاکٹر خالد کی اتوار اور ڈاکٹر ماجد کی دوا پیر کے دن استعمال کرتا ہے تو کیا ایسا بیمار کبھی شفایاب ہوسکتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ خود اپنے ہاتھوں، اپنی ہلاکت وتباہی کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ ایسا کر کے نہ کبھی کوئی شفا پاتا ہے اور نہ ہی اہل عقل وفہم کی نگاہ میں ایسے شخص کو ہشیار اور سمجھ دار قرار دیا جاتا ہے بلکہ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ آپ ڈاکٹروں کی معلومات کر کے خوب غور وفکر کریں اور ان سے متعلق شفایاب ہونے والے احباب سے دریافت کریں اور تجربے کاروں سے رائے معلوم کریں اور پھر اس سب کے بعد جس ڈاکٹر پر طبیعت میں انشراح ہو تو پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ اُس کے مشورے اور رائے کا اتباع کرے۔ اس کی دی ہوئی دوائی کو پابندی اور اہتمام کے ساتھ استعمال کرے۔ سارے عالم کے تمام عقلاء کا یہی متفقہ فیصلہ ہے اور اسی صورت میں بیماری کا علاج ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ قلب کے دوسرے ماہر ڈاکٹروں میں نقائص اور خرابیاں نکالنا شروع کردے اور لوگوں کے سامنے ان کی کمی، خامی اور کمزوری بیان کرتا

پھرے۔ ایسا کرنا ذی عقل کی نگاہ میں بالکل بے ہودہ اور نازیبا عمل ہوگا۔

شفائے جسمانی وروحانی کے لیے ایک ماہر طبیب کی اتباع لازم ہے

اب خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ جس طرح دنیوی معاملے میں ایک معین ڈاکٹر کو اپنے احوال کی صحیح اطلاع اور اس کے مشوروں کی اتباع صحت جسمانی کے لیے لازم اور ضروری ہے۔ ٹھیک بالکل اسی طرح اپنی اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس اور شفائے روحانی کے لیے ایک متعین طبیبِ روحانی عالمِ ربّانی کی اتباع لازم اور ضروری ہے۔ ہاں! البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہم اس عالمِ ربانی اور شیخ ومرشد کو قرآن وسنت کی روشنی میں اور وقت کے علماء وصلحاء کے ان کی نسبت حسنِ ظن رکھنے اور ان کے شیخ برحق ہونے کی تائید کرنے کے نتیجے میں جانچنے اور پرکھنے کے مکلّف ہیں۔ پھر یہ کہ اس کے پاس بیٹھ کے اللہ کی یاد دل میں آنا اور دنیا سے دوری اور آخرت کی رغبت کا پیدا ہونا اور گناہوں سے نفرت وتوحش اور طاعات کی طرف رغبت وتوجہ کا پایا جانا یہ سب علامات شیخ برحق ہونے کی ہیں، لہٰذا ایسے شیخ کامل سے تعلق کے بعد اس کی تعلیمات پر عمل کرنا اور اس کی ہدایات کی اتباع کرنا لازم اور ضروری ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح وہ جسمانی بیمار اپنے متعین ڈاکٹر کی بات مانے بغیر شفاء نہیں پاسکتا۔ اسی طرح یہ سالک کبھی بھی منزلِ سلوک طے کر کے واصل الی اللہ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ تجربہ اس پر شاہد ہے اور جس طرح وہاں دنیوی معاملے میں دوسرے ڈاکٹروں کی تنقیص جائز نہیں۔ اسی طرح یہاں دینی معاملے میں بھی ہم دوسرے مشائخ سے نہ تو بدظنی رکھیں اور نہ ان کو کمتر سمجھیں۔ اسی طرح نہ تو ان کی تحقیر جائز ہے اور نہ ہمیں ان کی تنقیص کا حق حاصل ہے۔ ہر ایک سے حسنِ ظن رکھنے کے ساتھ اپنے شیخ کو اپنے لیے سب سے زیادہ نافع سمجھے۔ اس میں نہ کوئی حرج ہے اور نہ شرعی قباحت ہے کیونکہ نفع کا مدار مناسبت پر ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کو ہر ایک سے مناسبت ہو، اسی لیے مشائخ اہلِ حق نے لکھا ہے کہ جس کو جس سے مناسبت ہو۔ اسی سے بیعت وارشاد کا تعلق قائم کیا جائے جس کی باتوں سے طبیعت زیادہ مانوس ہو اور امورِ دینیہ میں نفع زیادہ ہو رہا ہو، اس کے مواعظ ومکاتیب سے روز بروز دین میں ترقی محسوس ہو رہی ہو اور اس کے وعظ وتقریر سے دل پر زیادہ اثر ہوتا ہو تو یہ ان سے مناسبت کی دلیل ہے۔

باہمی مناسبت فطرت میں ودیعت رکھی گئی ہے

یہ طبیعتوں کی مناسبتوں کا اتفاق واختلاف ایک فطری وقدرتی عمل ہے۔ ایسا ممکن ہے کوئی شخص اپنے زمانے کا بڑا ولی اللہ ہو اور تقویٰ وللّٰہیت کے مرتبۂ عظمیٰ پر فائز ہو، لیکن دوسرے شخص کو اس کے ساتھ مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے نفع نہ پہنچ رہا ہو۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ:

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَ مَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ﴾

(مشكاةُ المصابيح، كتابُ الآداب، باب الحب في الله ومن الله، ص ۴۲۵، قديمي كتب خانه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ارواح لشکر کے لشکر ہیں جو (عالمِ ارواح میں) مجتمع تھیں جن میں وہاں جان پہچان ہوتی ہے ان میں یہاں بھی باہم الفت ہے اور جن میں جان پہچان نہیں ہوتی ان میں اختلافِ مزاج ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تحت اسی مزاجی مناسبت کے اختلاف کو ذکر کیا ہے کہ اشتراط تناسب شیخ ومرید در نفع یہ امر تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوضِ باطنی کے لیے پیر ومرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ اس حدیث کے عموم میں یہ مناسبت بھی داخل ہے کیونکہ نفع عادۃً موقوف ہے الفت پر اور الفت بنصِ حدیث موقوف ہے تعارفِ عالم ارواح پر جو حقیقت ہے مناسبتِ فطری کی اور یہی مناسبت ہے جس کے نہ ہونے پر مشائخ طالب کو اپنے پاس سے دوسرے شیخ کے پاس جس سے مناسبت مظنون یا مکشوف ہو بھیج دیتے ہیں۔

(التکشف، صفحہ: ۳۲۸، مطبوعہ: کتب خانہ مظہری)

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج جو دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں ایک مشرق کے رہنے والے انسان کو کسی مغرب میں رہنے والے سے اور شمال میں رہنے والے کو کسی جنوب میں رہنے والے سے محبت وتعلق اور انس ولگاؤ ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ان میں بہت گہری دوستی اور محبت ہو جاتی ہے تو درحقیقت یہ اسی عالمِ ارواح میں باہمی تعارف وتقارب کا اثر ہے، اسی لیے دینی افادے واستفادے کے لیے بھی یہ مناسبت ضروری ہے کیونکہ اگر مناسبت نہ ہو تو سالہا سال گزر جانے کے باوجود سالک کو نفع نہیں ہوتا، اسی لیے احقر کے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ نے ایک خط کے جواب میں یوں ارشاد فرمایا کہ خواب پر مدار اعتماد واعتقاد کا رکھنا لا حاصل ہے۔ مکاتبت کے ذریعے مناسبت کا علم کرلیا جائے اور پھر اصلاحی تعلق قائم کیا جائے۔

دراصل اس پوری تفصیل کا منشاء یہ ہے کہ جس طرح ظاہری جسمانی ڈاکٹروں میں حصولِ صحت وشفایابی کے لیے ایک مناسبت والے ڈاکٹر کو تجویز کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح اصلاحِ نفس اور تزکیۂ قلب کے لیے ایک شیخ ومرشد کا انتخاب از حد ضروری ہے، اسی لیے یہ مسئلہ اُمت کے تمام اولیاء کاملین کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ پوری تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس مردِ مؤمن عالمِ دین نے کسی ایک متبعِ سنت وشریعت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو پھر وہ خود رجلِ کامل ہی نہیں بنا بلکہ رجال گر بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس سے دین کا خوب کام لیا۔

نظامِ خانقاہی پر شخصیت پرستی کے الزام کی حقیقت

اب رہ گیا شخصیت پرستی کا لفظ تو اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اس پر روشنی ڈالی جائے جس سے واضح ہو جائے گا کہ مشائخ اہلِ حق سے تعلق کے لیے یہ تعبیر اختیار کرنا یا تو بعض دُشمن عناصر کی شرارت کا نتیجہ ہے یا بعض نادان دوستوں کی جہالت ونادانی کا ثمرہ ہے۔

آپ غور فرمائیں اس میں دو لفظ ہیں۔ نمبر۱ شخصیت اور نمبر۲ پرستی۔ سو شخصیت کا معنی اور مطلب تو بالکل واضح ہے یعنی ایک معزز ذات اور قابلِ قدر بزرگ ہستی اور پرستی کا مطلب ''پوجنا'' اور کسی کی عبادت کرنا تو دونوں لفظوں کو ملا کر اس کا مفہوم و مطلب یہ ہوا کہ کسی بڑی معزز ہستی کو پوجنا اور اس کی عبادت کرنا۔

اب سوال یہ ہے کہ معترض کا یہ کہنا کہ خانقاہ میں شخصیت پرستی ہوتی ہے۔ اس سے اُس کی کیا مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو مراد ہو نہیں سکتی کہ جس طرح ہندو اپنے مندروں میں بتوں کی پوجا کرتے ہیں، ان کے سامنے جھکتے اور سجدہ کرتے ہیں تو اس سے تو بدیہی طور پر مشائخ اہلِ حق کی خانقاہیں خالی ہیں اور اس طرح کی کسی عبادتِ غیر اللہ کا وہاں نام و نشان نہیں ہے، لہٰذا یہ تو مراد نہیں ہوسکتی تو غالباً اس جملے سے ان کی مراد یہ ہے کہ لوگ ایک شخصیت کے اردگرد ہر وقت جمع رہتے ہیں اور ایک بڑا جم گھٹا اکھٹا رہتا ہے۔ پھر اس کی مدح وثناء حد سے بڑھ کر تعریفیں کرتے ہیں اور اس کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں اور اس کی بات کو قرآن وحدیث کی طرح حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور اُس سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جتنی اللہ سے کرنی چاہیے اور جو ذکر واذکار وہ بتائے، اس میں کمی زیادتی کو ناجائز وحرام سمجھتے ہیں جبکہ یہ حقِ تشریع غیر نبی کو حاصل نہیں ہوتا اور جس سے وہ روک دے رُک تے ہیں اور جس کو کرنے کو کہیں تو کرتے ہیں حالانکہ تحریم حلال اور تحلیل حرام کا حق بھی صرف نبی کو ہے۔

تعظیم اولیاء اور حق تشریع دو الگ چیزیں ہیں

اسی خرابی کی وجہ سے تو یہود و نصاریٰ کو شرک فی الربوبیت کا مرتکب قرار دیا گیا۔ چنانچہ اسی نوع کا اعتراض ایک مرتبہ میرے سامنے ایک سعودی ساتھی نے کیا کہنے لگا کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ شیخ نے ذکر بتایا، اس کو پورا کرلو یہ غلط ہے۔ دلیل یہ پیش کی کہ شیخ کو حقِ تشریع نہیں ہے جو مقدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے اس میں کمی زیادتی کا کسی کو حق نہیں۔ انہوں نے برجستہ یہی آیت پڑھی جس میں یہود و نصاریٰ کے متعلق یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے جو نصِ صریح حرام ہے۔ احقر نے ان کو تو الزامی جواب دے کر خاموش کردیا اور وہ یہ کہ میں اور آپ اس وقت دعوت وتبلیغ میں نکلے ہوئے ہیں تو صرف چھ نمبروں میں دین کو محدود کردینے کا حق واختیار اکابرِ مرکز کو دینا کیا یہ غیر نبی کو تشریع کا حق دینا نہیں؟ مگر اس کا تحقیقی جواب سمجھنے سے پہلے چند باتیں بطورِ تمہید عرض کرتا ہوں۔ نمبر۱ ہماری شریعتِ اسلامیہ میں علمائے کرام کا مرتبہ بہت عظیم قرار دیا گیا ہے اور ان کا احترام وتعظیم دین کا ایک حصہ شمار کیا جاتا ہے کیونکہ علماء نائبین انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہوتے ہیں، اس لیے ان کی تذلیل وتحقیر کرنا یا ان کے ساتھ بے ادبی و بے اکرامی کا معاملہ کرنا بڑا گناہ ہے۔

چنانچہ مشہور عالمِ ربانی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ نے ''اسلامی سیاست'' صفحہ: ۱۵۱ پر یہ حدیث نقل کی ہے:

﴿اُخِذَ عَلَيْنَا الْعَهْدُ الْعَامُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نُكْرِمَ الْعُلَمَآءَ وَنُبَجِّلَهُمْ وَنُوَقِّرَهُمْ وَلَا نَرٰى لَنَا قُدْرَةً عَلٰى مُكَافَاتِهِمْ وَلَوْ اَعْطَيْنَا هُمْ جَمِيْعَ مَا نَمْلِكُ اَوْخَدَمْنَاهُمُ الْعُمْرَ كُلَّهُ وَهٰذَا الْعَهْدُ قَدْ اَخَلَّ بِهِ الطَّالِبُ طَلَبَةُ الْعِلْمِ وَ الْمُرِيْدُوْنَ طَرِيْقَ الصُّوْفِيَآءِ﴾

(لواقع الانوار القدسية فی بیان العھود المحمدیة)

یعنی حضرت شیخ فرماتے ہیں علامہ عبدالوہاب شعرانی جو اکابر صوفیاء میں سے ہیں انہوں نے عہودِ محمدیہ کے سلسلے میں ایک کتاب لکھی ہے یعنی جن جن باتوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے عہد لیا ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انہیں میں سے اوپر ذکر کردہ عہد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہم لوگوں سے اس بات کا ایک عام عہد لیا گیا کہ علماء کا اکرام واعزاز کریں اور ان کی تعظیم کریں۔ ہم میں یہ قدرت نہیں ہے کہ ان کے احسانات کا بدلہ ادا کرسکیں۔ چاہے ہم وہ سب کچھ دے دیں جو ہماری مِلک میں ہے اور خواہ مدتُ العمر ان کی خدمت کرتے رہیں، اس معاہدے میں بہت سے طلبہ اور بہت سے مریدین کوتاہی کرنے لگے ہیں حتیٰ کہ ہم کو ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اپنے اُستاد کے حقوقِ واجبہ ادا کرتا ہو۔ یہ دین کے بارے میں ایک بڑی بیماری ہے جس سے علم کی اہانت کا پتہ چلتا ہے اور اس ذات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ساتھ لاپرواہی کا پتہ چلتا ہے جس نے اس کا حکم فرمایا ہے۔ (اسلامی سیاست صفحہ ۱۵۱، بحوالہ لواقع الانوار القدسیة فی بیان العھود المحمدیة)

اس تحریر سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ معترض نے اپنے شیخ کی جس محبت وعقیدت اور تعظیم وتکریم کو شخصیت پرستی سمجھا ہے وہ تو عین شریعت میں محبوب ومطلوب ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے مامور بہ ہے، اس سلسلے میں مزید احادیث دیکھنی ہوں تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب ''التکشُّف'' کی طرف مراجعت کریں لہٰذا ہمارا مدعا ثابت ہوگیا کہ یہ شخصیت پرستی نہیں ہے۔

اپنے شیخ کی حد سے زیادہ تعریف اور مزاج شریعت وسنت

البتہ معترض کا دوسرا اعتراض کہ ہر شخص اپنے شیخ کو سب سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے تو اس سلسلے میں، میں اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرسکتا ہوں کہ معترض کسی حد تک حق بجانب ہے۔ اس کا یہ اعتراض کسی درجہ درست اور صحیح ہے کیونکہ بہت سے ناداں غالی قسم کے لوگ دین کے جس شعبے میں بھی داخل ہوتے ہیں تو اس میں حدود سے تجاوز کرکے افراط وتفریط کا شکار ہوجاتے ہیں اور خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، اس لیے اس سلسلے میں قولِ فیصل وہ ہے جس کو مجدد الملت حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے شیخ کو اپنے نفع کے لیے پوری دنیا میں سب زیادہ انفع خیال کرے، لیکن دوسروں پر ترجیح یا تقابل درست نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت نے اس پر شدید نکیر فرمائی ہے یہاں تک کہ ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے پیر یا دوسرے کسی بزرگ کی ثناء میں حد سے زیادہ مبالغہ نہ کرے۔ اور اس کے متعلق ایک روایت نقل فرماتے ہیں:

﴿عَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهٗ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الآداب، باب المفاخرة والعصبية، ص ۴۱۲، قديمي كتب خانه)

حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو اتنا مت بڑھاؤ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا (کہ ان کو الٰہ اور ابن اللہ کہنے لگے) میں تو بندہ ہوں سو تم لوگ مجھ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔ اللہ کا عظیم الشان رسول کہہ کر کہ میرے سب فضائل اس عنوان میں داخل ہو گئے اسی واسطے تفصیلِ فضائل کے وقت بھی انہیں فضائل پر اکتفاء کرنا واجب ہے کہ اس سے آگے مرتبۂ الوہیت ہے تجاوز درست نہیں۔

اس کے تحت حضرت تھانوی بطورِ فائدہ کے تحریر فرماتے ہیں کہ اصلاحِ ترکِ مبالغہ در ثناء شیخ حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے پیر یا دوسرے کسی بزرگ کی ثناء میں زیادہ مبالغہ نہ کرے کہ حدِّ کذب یا شرک تک پہنچ جائے کیونکہ جب صاحبِ نبوت کے لیے اس کی ممانعت ہوئی تو صاحبِ ولایت کے لیے کیسے جائز ہوگا۔ (التکشف ص ۳۸۶)

میرے دوستو! غور کرنے کا مقام ہے کہ اوّل تو خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلامِ مبارک سے تعریف میں حد سے زیادہ مبالغے کی مذمت صاف صاف معلوم ہوگئی۔ پھر اپنے وقت کے حکیم الامت مجدد الملت کی تشریح و توضیح سے اس کی قباحت و شناعت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے تو پھر آگے کسی کے لیے بھی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ کسے باشد کہ وہ اس قبیح فعل کا مرتکب ہو۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْيَمَ کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور بشر ہونے میں سب کے ساتھ شریک ہوں۔ میرا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس سے آگے بڑھانا کہ خدا تعالیٰ کی صفات میں مجھے شریک قرار دے دو یہ غلو ہے۔ تم نصاریٰ کی طرح کہیں اس غلو میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور یہودی و نصاریٰ کا یہ غلو فی الدین صرف انبیاء ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ انہوں نے جب یہ عادت ہی ڈال لی تو انبیاء علیہم السلام کے حواریین اور متبعین اور ان کے نائبین کے مقابلے میں بھی یہی برتاؤ اختیار کیا۔ رسول کو تو خدا بنا دیا تھا۔ رسول کے متبعین کو معصوم کا درجہ دے دیا۔ پھر یہ بھی تنقید و تحقیق نہ کی کہ یہ لوگ حقیقتاً انبیاء کے متبع اور ان کی تعلیم پر صحیح طور سے قائم بھی ہیں۔ یا محض وراثۂ عالم یا شیخ سمجھے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں ان کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو خود بھی گمراہ تھے اور ان کی گمراہی کو اور بڑھاتے تھے۔ دین اور تدیّن ہی کی راہ سے ان کا دین برباد ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی اُمتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا ہے۔ اس لیے ہمارے آقا و مولیٰ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو اس وبائے عظیم سے بچانے کے لیے مکمل تدبیریں فرمائی۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿عن ابن عباس قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غداۃ جمع ھلم القط لی فلقطت لہ حصیات من حصی الخذف فلما وضعھن فی یدہ قال نعم بامثال ھؤلاء وایاکم والغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین﴾

(مسند احمد، رقم الحدیث ۱۷۵۴)

کہ حج کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمیٔ جمرات کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ آپ کے واسطے کنکریاں جمع کرلائیں۔ انہوں نے متوسط درجے کی کنکریاں پیش کردیں۔ آپ نے ان کو بہت پسند فرمایا کہ دومرتبہ فرمایا بمثلھنَّ بمثلھنَّ یعنی ایسے ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رمی کرنا چاہیے۔ پھر فرمایا وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ فَاِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالْغُلُوِّ فِی الدِّیْنِ یعنی غلو فی الدین سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پہلی اُمتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک وبرباد ہوئیں۔

اس حدیث سے چند اہم مسائل بھی معلوم ہوگئے۔

(۱) اوّل یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں ان کی حدِ مسنون یہ ہے کہ وہ متوسط ہوں نہ بہت چھوٹی ہوں نہ بہت بڑی۔ بڑے بڑے پتھر اُٹھا کر پھینکنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

(۲) دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی حدِ شرعی وہ ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے متعین فرمادی، اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

(۳) تیسرے یہ واضح ہوگیا کہ غلو فی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حدِ مسنون سے تجاوز کیا جائے۔

علماء ومشائخ کی تعظیم واتباع میں راہِ اعتدال

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگے صفحہ:۶۲۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب ''حُجَّۃ اللہِ البالغۃ'' میں یہ فرمایا ہے کہ تحریفِ دین کے دنیا میں کیا کیا اسباب پیش آتے ہیں اور شریعتِ اسلامیہ نے ان سب کے دروازوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا ہے کہ کسی سوراخ سے یہ وباء اس اُمت میں نہ پھیلے۔

ان اسباب میں سے دین کے بارے میں تعمُّق وتشدد یعنی غلو فی الدین کو بڑا سبب قرار دیا، مگر افسوس ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر اہتمام اور شریعت کی اتنی پابندیوں کے باوجود آج اُمتِ مسلمہ اسی غلو کی بُری طرح شکار ہے۔ دین کے سارے ہی شعبوں میں اُس کے آثار نمایاں ہیں۔ ان میں سے بالخصوص جو چیز ملت کے لیے مہلک اور انتہائی مضر ثابت ہورہی ہے وہ دینی مقتداء اور پیشواؤں کا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت تو اس طرف گئی ہے کہ مقتداء اور پیشواء اور علماء وعرفاء کوئی چیز نہیں کتابُ اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ جیسے وہ اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم رجال ونحن رجال یعنی وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوسناک جو نہ عربی زبان سے واقف ہے نہ قرآن کے حقائق ومعارف سے نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے بیان وتفسیر سے محض قرآن کا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو قرآن کا عالم کہنے لگے۔ قرآن کریم کی جو تفسیر وتشریح خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بلا واسطہ شاگرد یعنی صحابہ کرام سے منقول ہے۔ اس سب سے قطع نظر جو بات ذہن میں آ گئی، اس کو قرآن کے سر تھوپ دیا حالانکہ اگر صرف کتاب بغیر معلم کے کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی کہ کتاب کے نسخے لکھے لکھائے لوگوں تک پہنچا دیتے۔ رسول کو معلم بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔

اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات صرف کتابُ اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں کسی بھی علم وفن کی کتاب کا محض ترجمہ دیکھ کر کبھی کوئی شخص اس فن کا عالم نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹری یا طبِ یونانی کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر آج تک کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بنا۔ انجینئری کی کتابیں دیکھ کر کوئی انجینئر نہیں بنا۔ کپڑے سینے یا کھانے پکانے کی کتابیں دیکھ کر کوئی درزی یا باورچی نہیں بنا بلکہ ان سب چیزوں میں تعلیم وتعلّم اور معلّم کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ مگر افسوس کہ قرآن وسنت ہی کو ایسا سرسری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے کسی معلّم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ چنانچہ ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت تو اس طرف غلو میں بہہ گئی کہ صرف قرآن کے مطالعے کو کافی سمجھ بیٹھے۔ علماء وسلف کی تفسیروں اور تعبیروں کو اور ان کی اقتداء واتباع کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔

دوسری طرف مسلمانوں کی ایک بھاری جماعت اس غلو میں مبتلا ہوگئی کہ اندھا دھند جس کو چاہا اپنا مقتداء اور پیشوا بنالیا۔ پھر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی نہ یہ معلوم کہ جس کو ہم مقتداء و پیشوا بنا رہے ہیں یہ علم وعمل اور اصلاح وتقویٰ کے معیار پر صحیح بھی اُترتا ہے یا نہیں اور نہ پھر اس طرف کوئی دھیان کیا کہ جو تعلیم یہ دے رہا ہے، وہ قرآن وسنت کے مخالف تو نہیں؟ شریعتِ اسلام نے غلو سے بچا کر ان دونوں کے درمیان طریقہ کار یہ بتلایا کہ کتابُ اللہ کو رجالُ اللہ سے سیکھو اور رجالُ اللہ کو کتابُ اللہ سے پہچانو یعنی قرآن وسنت کی مشہور تعلیمات کے ذریعے پہلے ان کو پہچانو جو کتاب وسنت کے علوم میں مشغول ہیں اور ان کی زندگی کتاب وسنت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ پھر کتاب وسنت کے ہر اُلجھے ہوئے مسئلہ میں ان کی تفسیر وتشریح کو اپنی رائے سے مقدم سمجھو اور ان کا اتباع کرو۔ (معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۴۲۳)

اولیاء اللہ میں تقابل وتفاضل کسی کو جائز نہیں ہے

میرے دوستو! اولیاء اللہ میں تقابل وتفاضل تو کیا؟ کسی کے متعلق یقین سے اس کی بزرگی اور ولایت کا قائل ہونا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی اس حدیثِ پاک سے استدلال فرماتے ہیں:

﴿عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ مَادِحًا اَخَاہُ فَلْیَقُلْ اَحْسِبُ فُلَانًا وَ اللّٰہُ حَسِیْبُہٗ وَلَا یُزَکِّیْ عَلَی اللّٰہِ اَحَدًا اَحْسِبُ فُلَانًا کَذَا وَ کَذَا اِنْ کَانَ یَعْلَمُ مِنْہُ ذٰلِکَ

اخرجہ الشیخان وابو داؤد﴾

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو اپنے بھائی مسلمان کی ضرور ہی مدح کرنا ہو تو اس طرح کہنا چاہیے کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ہے آگے خدا کافی جاننے والا ہے۔ اور خدا کے نزدیک کسی کے مزکیٰ ہونے کا دعویٰ نہ کرے اور یہ جو کہے گا کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ایسا ہے۔ وہ بھی اس شرط سے کہ اُس کے علم میں بھی وہ شخص ایسا ہو ورنہ اس عنوان سے بھی مدح جائز نہیں۔ روایت کیا اس کو بخاری و مسلم و ابوداؤد نے۔

حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اصلاح ترکِ جزم بولایتِ کسے'' حدیث کے عموم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو بدونِ نص کے محض گمان سے قطعاً ولی کہنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ اکثر کو اس میں بے احتیاطی ہے۔ البتہ اگر ظناً کہہ دے تو مضائقہ نہیں ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس ظنّیت کی تصریح بھی کر دے لیکن اگر اعتماداً اعلیٰ قرینۃ المقام والکلام تصریح نہ بھی کرے تب بھی مضائقہ نہیں۔ ہاں! شیخ کہنا کسی کو جزم سے بھی جائز ہے کیونکہ مشیخت امرِ مشاہد ہے یعنی طریقِ تربیت کا جاننا برخلاف ولایت کے کہ امرِ غیبی ہے یعنی مقبول عند اللہ ہونا۔ (التکشف، صفحہ:۳۸۶)

صاحبو! یہ دونوں حدیثیں اور پھر بزبان حضرت تھانوی اس کی تشریح ہمارے مدعا پر کس قدر واضح اور صریح دلیل ہیں، اس لیے جو آج کل بعض لوگوں نے اپنے مشایخ کے متعلق یہ عادت قائم کر لی ہے کہ ان کی تعریف میں حد سے تجاوز اور مشائخ کے درجات میں باہمی ترجیح و تقابل والا انداز یا ایسے طریق پر گفتگو جس سے بعضوں کی تنقیص ہوتی ہو، یہ سب باتیں شرعی طور پر بے بنیاد اور غلط ہیں۔ بڑے افسوس اور دُکھ کی بات ہے کہ مشائخ اور بزرگانِ دین سے تعلق کا اصل مقصود یعنی ان کی تعلیمات وارشادات پر چل کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا کہ خود انہوں نے جن باتوں پر چل کر اللہ کو راضی کیا۔ یہ مقصد لوگوں کے ذہن سے غائب ہو گیا۔ ہاں! بزرگوں کی خدمت اور ان کی تعظیم و توقیر کی جائے اور ان کی صحبتوں اور دعاؤں سے خوب نفع اُٹھایا جائے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرتا۔

آمدم برسرِ مطلب

اب احقر اصل اعتراض اور اِس کے جواب کی طرف لوٹتا ہے کہ جو لوگ بزرگوں کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ درحقیقت ہمارے اکابر اولیاء اللہ کی تعلیمات پر حقیقی طور پر عامل نہیں ہیں اور نہ ہی صحیح معنی میں اہلِ حق مشائخ سے مخلصانہ طور پر جڑے ہوئے ہیں ورنہ وہ کبھی اس طرح کے ممنوعات و محرمات میں مبتلا نہ ہوتے، اس لیے بعض لوگوں کی اس جہالت و نادانی اور غلو کی وجہ سے پورے سلسلۂ طریقت اور مشائخِ سلسلہ پر اعتراض درست نہیں۔

راقم السطور بشرح صدر یہ بات عرض کرتا ہے کہ تصوف اور طریقت کا جو مسئلہ قرآن وسنت سے بال برابر بھی ہٹا ہوا ہو اُس کا ہمارے اہلِ حق بزرگوں کے یہاں طریقت سے کوئی جوڑ نہیں۔ اللہ بہت بہت جزائے خیر دے

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو خصوصاً اور دوسرے ہمارے اکابر کو عموماً کہ ایسے جوگیانہ اور جاہلانہ تصوف کو اسلامی تصوف سے بالکل الگ اور صاف صاف کر دیا۔ بزبانِ اہلِ اردو ''دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا''

البتہ اپنے شیخ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ یہ روئے زمین پر میرے لیے سب سے نافع ہے، ضروری ہے کیونکہ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو تو نفع تو ہوگا لیکن مکمل اور تام نفع نہ ہوگا، اسی لیے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی مجلس میں جنید و شبلی ہوں اور حاجی صاحب بھی ہوں تو ہم جنید و شبلی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ بس حاجی صاحب ہی کی طرف اپنی نگاہ رکھیں۔ ہاں! حاجی صاحب کا جی چاہے وہ ان کی طرف دیکھیں ہم تو کسی کی طرف بھی نہ دیکھیں گے۔ (پسندیدہ واقعات، صفحہ:۱۸۶)

شیخ و مرشد بنانے پر اہلِ عرب کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب رہ گیا تیسرا اہم اعتراض جو عام طور پر عربوں کو ہوا کرتا ہے کہ ہم نے ان مشائخ کو حقِ تشریع دے رکھا ہے جو غیرِ نبی کے لیے جائز نہیں ہے، لیکن اس سلسلے میں دراصل غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ ایک تو حقِ تشریع ہے یعنی شریعت و قانون سازی اور تحلیل و تحریم کا اختیار کسی کو سونپنا۔

دوسری چیز ہے کہ نائبینِ انبیاء کو محض تربیت و اصلاحِ باطنی کے سلسلے میں اپنا معتمد اور بڑا سمجھ کر اس کی باتوں پر مشوروں پر عمل کرنا اور اس کو اپنا راہبر و راہنما تسلیم کرنا ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکہ پہلے کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ گویا مرید اپنے شیخ و مرشد کو اس بات کا مجاز اور مختار قرار دے رہا ہے کہ وہ اس کے لیے جو چاہے جائز کر دے اور جو چاہے ناجائز اور جس کو چاہے حلال یا حرام کر دے اور پھر اس کے لیے اُس کے خلاف کرنا ممنوع اور ناجائز سمجھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا معاملہ کسی اہلِ حق شیخ کے یہاں موجود نہیں ہے جو بات مشائخ اہل اللہ کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ شیخ و مرشد اپنے مرید کے احوال کے اعتبار سے اس کے لیے مختلف اذکار و اشغال ماثورہ و منقولہ متعین اور مقرر کر دیتا ہے۔ نہ تو اس کے خلاف کرنے کو حرام و ناجائز سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی اُس کی پابندی کو عقیدے کے لحاظ سے لازم اور ضروری سمجھا جاتا ہے تو یہ ٹھیک اس طرح ہوا جیسے کوئی بیمار شخص اپنی بیماری کے لیے طب کی کتاب دیکھ کر مختلف دوائیوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے بجائے کسی بڑے ماہر ڈاکٹر سے اپنے لیے دوائی تجویز کراتا ہے۔ اس لیے خلاصہ یہ نکلا کہ سلسلۂ طریقت کی یہ پوری کڑی از قبیلِ تربیت ہے نہ کہ از قبیلِ تشریع ہے۔

دیکھئے! مثلاً جماعتِ تبلیغ کے چھ نمبر ہیں اور تمام دعوت و تبلیغ میں لگنے والے حضرات کو اس کا پابند کیا جاتا کہ وہ ان چھ نمبروں ہی کے اندر اپنے کام کو محدود رکھیں اور باقی باتوں کو نہ چھیڑیں اور ہم سب بلا کسی اشکال و اعتراض اس کی پابندی کرتے ہیں نہ کسی عربی کو اعتراض ہوتا ہے نہ عجمی کو، اسی لیے احقر نے اپنے ساتھ دعوت و تبلیغ

میں نکلے ہوئے ایک عرب ساتھی کو، ان کے اوپر ذکر کیے ہوئے اشکال کا یہی الزامی جواب دیا اور ان سے عرض کیا مَا هُوَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا تو اس پر وہ خاموش ہوگئے۔ اس لیے ہمارے اکابر علماء دیوبند میں اکثر حضرات کا کسی نہ کسی شیخِ کامل سے اصلاحی تعلق قائم رہا ہے جس کی برکت سے اللہ نے ان کو سارے عالم میں چمکایا اور اُن کے ایمانی و عملی فیض سے سارا عالَم روشن ہوا۔ اسی لیے میں یہ بات بڑی شرح صدر سے کہتا ہوں کہ ہمارے اکابر اور بزرگوں میں جنہوں نے دینی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں، ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اہلُ اللہ کے ساتھ وابستہ نہ رہا ہو۔ یہی حضرت والا کے اس شعر کا سبق ہے جس کی تشریح چل رہی ہے ؎

ایسے ویسے بھی ہوگئے کیسے
فیض کیسے ہیں شیخِ کامل کے

جان فدا کرنا سرخروئی اور کامیابی کا راستہ ہے

جان ان پر فدا کرو اختؔر
سرخ رو ہوگے خاک میں مل کے

اللہ تعالیٰ کی مرضی پہ اپنی خواہشات کو قربان کرنے والا اور اپنے دل و جان کو اللہ تعالیٰ پر فدا کرنے والا جس دن اس مسافر خانے سے نکل کر آخرت کی طرف چلے گا تو اُسے بڑی قیمتی حیات نصیب ہوگی اور کامیابی اور سرخروئی اس کا مقدر بنے گی اور گو کہ بظاہر اس کا جسم خاک میں مل جائے گا، مگر اس کے لیے وہ کسی قید خانے سے نکل کر آزادی پانے اور جیل سے رہائی حاصل ہونے کے مترادف ہوگا۔ جیسے تائبؔ صاحب کا ایک شعر ہے ؎

زندوں کو ہے پیغام جو زنداں میں ہیں اب تک
آزاد جو ہونا ہے تو میدان کھلا ہے

لیکن اس سرخروئی کے لیے یہ شرط ہے کہ اپنی حرام خواہشات پر شیروں کی طرح دلیرانہ جرأتمندانہ حملہ کرے اور ہمت سے وار کرے صرف تمنّاؤں سے اور آرزوؤں سے اور محض جاں فدا کرنے کے جذبے سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ جیسا کہ حضرت خواجہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی فکر کے اہتمام سے ہوگی

پھول مرجھا گئے ذرا کھل کے

کون رخصت ہوا گلے مِل کے — شامیانے اجڑ گئے دل کے
حُسن فانی ہے عِشق بھی فانی — پھول مرجھا گئے ذرا کھل کے
کیسا چہرہ بدل گیا ان کا — دام کچھ بھی نہیں رہے تِل کے
کی نہ توبہ اگر گناہوں سے — دونوں روئیں گے خاک میں مِل کے
صدق توبہ و چشم گریاں سے — سامنے ہیں نشان منزل کے
ناؤ گزری ہے جو بھی طوفاں سے — لطف ملتے ہیں اس کو ساحل کے
اے خدا آپ کے کرم سے سب — کٹ گئے دن ہمارے مشکل کے
بعد مدت کے بزمِ ساقی میں — میر خوشیاں منا گلے مل کے
میں کہاں اور شاعری میری — فیض ہوتے ہیں شیخ کامل کے
آج اخترؔ ہے مجمعِ ابرار — آؤ کر لیں ذرا دعا مل کے

مشکل الفاظ کے معنی:۔شامیانے: تنبو۔دام: قیمت۔ صدق توبۃ: سچی توبہ۔ چشم گریاں: آنسو بہاتی ہوئی آنکھ۔ناؤ: کشتی۔بزمِ ساقی: شیخ کی محفل۔مجمعِ ابرار: صالحین کی جماعت۔

شیخ کے گلے ملنے سے دل کی حالت بدل گئی

کون رخصت ہوا گلے مل کے
شامیانے اُجڑ گئے دل کے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل اللہ کی صحبت اوران کی ملاقات اور خدمت ورفاقت میں عجیب کیمیا تاثیر رکھی ہے کہ ان سے ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی چلی جاتی ہے اور دنیا کی محبت نکلتی نظر آتی ہے صرف ان کی زیارت ودیدار سے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے ان سے معانقہ کرنا اور گلے ملنا اندرون قلب عجیب انقلاب برپا کردیتا ہے اس لیے حضرت والا یہاں یہ بات بیان فرمارہے ہیں کہ میرے شیخ سے گلے ملنے کے بعد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کے شامیانے اور تانے بانے ٹوٹ گئے جس کے نتیجے میں قرب خداوندی کی لذت دل میں محسوس ہونے لگی۔

کھلا ہوا حسن عنقریب مرجھانے والا ہے

حسن فانی ہے عشق بھی فانی
پھول مرجھا گئے ذرا کھل کے
کیسا چہرہ بدل گیا ان کا
دام کچھ بھی نہیں رہے تل کے

سبحان اللہ! حسن فانی کی فنائیت اور خرابی کو ایک عجیب وغریب تشریح کے ذریعے سے سمجھایا ہے کہ اے میرے نادان دوست اگر تو حسن فانی پر عاشق ہو رہا ہے تو یہ بات نہ بھولنا کہ جس طرح پھول تھوڑی دیر کے لیے کھلتا ہے اور پھر مرجھا کر خاک میں مل جاتا ہے اور اس کے بعد کسی کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی یہ حسن فانی کی رنگت و رونق بھی جلد زوال پذیر ہے تو تیرا یہ عشق بھی عنقریب رخصت ہوتا دکھائی دے گا۔

اس لیے فانی سے دل لگانا انجام کی تباہی اور بربادی ہے کیسے کیسے خوبصورت چہرے اب بگڑے ہوئے نظر آرہے ہیں اور جو بدن پر تل کے نشانات تھے جنہیں حسن کے ترازو میں تولا جاتا تھا اور جس کی بناء پر عشق کی گرم بازاری ہوتی تھی آج سارا بازارِ عشق ماند پڑ گیا ہے نہ تل کی کوئی قیمت رہی اور نہ تل والے چہرے کی۔ سب پھولوں کی عارضی رنگت تھی جو مرجھا کر ختم ہوگئی لہٰذا سمجھداری کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسی ذات پاک کے ساتھ عشق ومحبت کا رشتہ قائم رکھئے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے نہ وہ خود فنا ہونے والی نہ اس سے کی ہوئی محبت زائل ہونے والی بلکہ تمام ایسے موقعوں پر جہاں سب سہارے ٹوٹتے دکھائی دیں وہاں اس ذات کا سہارا رہتا ہے تو وہ عشق ومحبت ہر حال میں کام آنے والی ہے اور بالآخر دائمی وصال محبوب تک پہنچا دیتی ہے۔

ظالم وظلام وظلوم بندہ......غافر وغفار وغفور اللہ

کی نہ توبہ اگر گناہوں سے
دونوں روئیں گے خاک میں مل کے
صدق توبہ و چشم گریاں سے
سامنے ہیں نشان منزل کے
ناؤ گزری ہے جو بھی طوفاں سے
لطف ملتے ہیں اس کو ساحل کے

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے لیے ہر حالت میں گناہوں سے توبہ کا راستہ باقی رکھا ہے خواہ وہ گناہ کر کے کیسی ہی آخری حد تک پہنچ گیا ہو اس لیے کسی بھی حال میں اللہ کی رحمت سے ناامیدی حرام ہے تو عشق مجازی میں

گرفتار دونوں فریق اور حسن مجازی کے شیدائی عاشق و معشوق جنہوں نے اپنے اللہ کی نافرمانی میں بہت کچھ اپنی صلاحیتیں برباد کی حضرت والا ان کو توبہ کی دعوت دیتے ہیں اور توبہ نہ کرنے کا خطرناک انجام ذکر کرنے کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمارہیں کہ توبہ کرنے کی صورت میں منزل کے نشانات بالکل سامنے ہیں۔

قربان جائیں ہم اپنے اللہ کی ذات رحیمی و کریمی پر کہ بندوں پر اتنا رحم کرنے والے اور معاف کرنے والے ہیں کہ قرآن میں اپنے لیے تینوں الفاظ ذکر فرمائے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اے میرے بندے اگر تو ظالم ہے تو میں غافر ہوں اگر تو ظلاّم ہے تو میں غفار ہوں اگر تو ظلوم بھی ہے تو بھی مایوس نہ ہو میں تیرے لیے غفور ہوں یعنی درجہ بدرجہ قدم بہ قدم اگر تو گناہ میں بڑھتا چلا گیا اور بحرِ عصیان میں غرق ہوتا اور ڈوبتا چلا گیا تو تو جس حد تک بھی جارہا ہے اور پھر مجھے تو پکارے تو میں تجھے اس سمندر سے نکال کر ایسا پاک وصاف کردینے والا ہوں کہ تیرے اوپر کسی قسم کا کوئی اثر ہی باقی نہیں رہے گا حتیٰ کہ جو چار گواہ تیرے گناہ کرتے وقت میں نے قائم کیے تھے ان کی گواہی کو بھلا دوں گا تا کہ تجھے کل قیامت میں کسی قسم کی ندامت نہ ہو۔

لیکن بس شرط یہ ہے کہ صدقِ دل سے توبہ کر اور اگر ہو سکے تو میرے سامنے کچھ ندامت کے آنسوؤں کے قطرے بھی گرادے اور نہیں تو کم سے کم رونے والوں کی صورت بنالے اور مجھے پکار میں تجھے ظلمت کے سمندر سے سے نکال کر ساحل تک پہنچادوں گا۔

اے میرے بندے! اگر تو ساری زندگی اپنی تمام صلاحیتیں اور قوتیں اور جسم کے تمام اعضاء شب وروز اور رات ودن میری نافرمانی پر خرچ کردے یہاں تک کہ تو نافرمانی کرتے کرتے تھک جائے کہ اب مزید تجھ سے کچھ نہ ہو سکے اور تو پھر میرے سامنے ندامت وشرمندگی کے ساتھ ایک آہ نکالے اور تائب ہوکر میری بارگاہ میں آئے تو بھی تو مجھے معاف کرنے والا پائے گا اپنی مراد میں محروم نہیں رہے گا۔

اور اگر ایسا نہیں تو پھر یاد رکھنا چاہیے کہ دونوں عاشق ومعشوق اپنے انجامِ بد کے لیے تیار رہیں جس دن دونوں کے جنازے خاک میں ملیں گے اور توبہ کا موقعہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گا پھر رونے دھونے اور حسرت و افسوس اور پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہے، لہٰذا اگلی سیکنڈ سے پہلے بندے کو اللہ کی طرف رجوع ہوکر سرخروئی اور کامیابی کے راستے پر چل پڑنا چاہیے وہ انسان عقل مند نہیں کہلاتا جو ہاتھ کو اس لیے آگ میں جلا رہا ہو کہ اس کے پاس بہت اچھا مرہم رکھا ہوا ہے یہی معاملہ اس شخص کا ہے جو توبہ کی امید پر گناہوں میں مبتلاء ہو۔

گوکہ جو شخص عشقِ مجازی کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور اسے حرام لذتوں کا چسکا لگ جاتا ہے تو اس کے لیے اسے چھوڑنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس کی کشتی طوفانوں سے گزری ہوتی ہے اس کو ساحل کے لطف بھی خوب ملتے ہیں تو یہ بندہ اگر طبیعت پر خوب زور ڈال کر اور راہِ حق میں مجاہدے اٹھا کر پورے عزم اور قوت سے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اسی درجہ میں اسے اللہ کا قرب اور لذت بھی عطا کی جاتی ہے۔

نیکی کا اچھا اور برائی کا ناگوار لگنا ایمان کی نشانی ہے

اے خدا آپ کے کرم سے سب
کٹ گئے دن ہمارے مشکل کے
بعد مدت بزم ساقی میں
میر خوشیاں منا گلے مل کے

اے اللہ! آپ نے اپنے کرم سے منازل سلوک طے کرنے کی توفیق بخشی اور مختلف حالات میں ہمیں ثابت قدم رکھا اور آپ ہی کا کرم ہے کہ اب ہمیں ساحل کا مزہ مل رہا ہے اب اللہ تعالیٰ کے کرم سے ایسے حالات عطا ہوئے ہیں کہ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں میسر ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں اعلان ہے ''کہ اللہ نے ایک مشکل کے ساتھ دو آسانیاں رکھیں ہیں'' اور بھلائی اور نیکی کے حصول پر خوشیاں منانا مومن کی نشانی ہے جیسا کے ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے پوچھا کہ ایمان کی علامت کیا ہے ارشاد فرمایا کہ:

﴿عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَ سَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان،ص:۱۶، قدیمی کتب خانہ)

یعنی جب نیکی سے دل خوش ہو اور برائی سے دل میں رنجیدگی ہو اور ناگواری ہو تو یہ ایمان کی نشانی ہے۔

میں کہاں اور شاعری میری
فیض ہوتے ہیں شیخ کامل کے
آج اختر ہے مجمع ابرار
آؤ کرلیں ذرا دعا مل کے

فرماتے ہیں کہ میں کوئی فنی شاعر نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے شاعری سیکھی ہے بس اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر ان کی دعاؤں اور توجہات کی برکت سے دل کی حالت بدل گئی اور اس میں ایسا درد سا قائم ہو گیا کہ جس سے میں بیان درد پر مجبور ہو جاتا ہوں اور یہ بیانِ درد اشعار کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ بس میری شعر و شاعری کی یہ حقیقت ہے اس لیے یہ جو کچھ بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کا کرم اور شیخ کامل کا فیض ہے۔

اور اسی کی برکت ہے کہ آج اختر کو مجمع ابرار نصیب ہے اور جہاں اللہ والے موجود ہوں تو دعاؤں کی قبولیت کی زیادہ امید ہو جاتی ہے۔ اس لیے مل کر کے دعا کر لی جائے اور اللہ سے اپنی مرادیں مانگ لی جائیں۔

یہ مستی دردِ دل کی اشرف مینائے عالم ہے

یہ مستی دردِ دل کی اشرف مینائے عالم ہے
ہر اک جام محبت اشرف صہبائے عالم ہے

بہت گلشن ہیں دنیا میں مگر سب ہیچ و فانی ہیں
یہ گلشن دردِ دل کا افضلِ گلہائے عالم ہے

بہت تحفے ملے دنیا میں لیکن کیا کہوں اے دِل
یہ تحفہ دردِ دل کا حاصلِ نعمائے عالم ہے

جسے دیکھو اسی کے سر میں ہے سودا کسی شے کا
مگر سودائے جاناں اکبرِ سودائے عالم ہے

بس اک ہنگامہ دردِ عشق حق کا گرم رہتا ہے
سوا اس کے ہمہ فانی ہر اک غوغائے عالم ہے

خوشی پر ان کی مرنا اور جینا ہی محبت ہے
نہ کچھ پروائے بدنامی نہ کچھ پروائے عالم ہے

ہے روح بندگی بس ان کی مرضی پر فدا ہونا
یہی مقصودِ ہستی ہے یہی منشائے عالم ہے

ہماری خاک اس لمحہ میں ہے رشکِ فلک اخترؔ
وہی لمحہ جو میرا ذاکرِ مولائے عالم ہے

مشکل الفاظ کے معنی:۔مستی دردِ دل: اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کی لذت۔ **اشرف**: سب سے بہتر۔ **مینائے عالم**: دنیا جہاں کے شربت۔ **جام محبت**: محبت کا پیالہ۔ **صہبائے عالم**: صبح کے وقت پی جانے والی شراب۔ **گلشن** : باغ۔ **ہیچ وفانی**: حقیر اور ختم ہوجانے والے۔ **گلہائے عالم**: دنیا جہاں کے پھول۔ **نعمائے عالم**: دنیا جہاں کی نعمتیں۔ **سودائے جاناں**:......۔ **اکبر**: بڑا۔ **غوغائے عالم**:......۔ **مقصودِ ہستی** ، **منشائے عالم**: دنیا کا مقصد اصلی۔ **فلک**: آسمان۔

قلبِ عارف کی کیف ومستی کا عالم

یہ مستی دردِ دل کی اشرفؔ مینائے عالم ہے
ہر اک جامِ محبت اشرفؔ صہبائے عالم ہے

ارشادفرمایا کہ اللہ کی محبت کی شراب کو پی کر جو مزہ اور لطف اور کیف وسرور حاصل ہوتا ہے وہ دنیا کی شرابوں سے کہیں اونچا عمدہ اور صاف ستھرا ہے اور جس طرح انسان دنیا کی شراب پی کر بے ہوش ہوجاتا ہے اور بے ہودہ قسم کی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور گندگیوں میں جاکے منہ ڈالتا ہے۔ اس کے برخلاف اللہ کی محبت کی شراب کے نشے میں وہ عظمتِ خداوندی اور عشقِ مولیٰ کے گیت گانے میں اور اللہ کی بڑائی اور کبریائی کی باتوں میں دیوانہ وار لگ جاتا ہے اور اُس کے تقاضوں پر بلاخوف لومۃ لائم جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ بالآخر وہ ایسا جامِ محبت پیتا ہے کہ خود بھی مست ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی مست کردیتا ہے۔

گلشنِ دردِدل کے پھولوں کی خوشبو کا اثر

بہت گلشن ہیں دنیا میں مگر سب ہیچ و فانی ہیں
یہ گلشن دردِدل کا افضلِ گلہائے عالم ہے

دنیا میں زیب زینت اور خوبصورتی کی بہت سی جگہیں اور مختلف قسم کے پھولوں سے سجے ہوئے گلشن اور حسین خوبصورت پارک (Park) ہیں لیکن وہ سارے فانی اور ہیچ ہیں اور اہلِ حقیقت کی نگاہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ ان پر ایک دن خزاں آنے والی ہے اور وہ فنا ہوکر ختم ہوجائیں گے، مگر اللہ کی محبت ومعرفت اور قرب و نزدیکی کے پھولوں سے سجے ہوئے گلشن پر کبھی خزاں نہیں آتی اور وہ کبھی فنا نہیں ہوگا۔

اس گلشن کا کمال یہ ہے کہ یہ بارہ مہینے میں ہر دن اور چوبیس گھنٹے میں ہر لحہ شگفتہ اور معطر رہتا ہے۔ اور اس صاحبِ گلشن کے روح اور جسم کو بہار دیتا رہتا ہے۔ شاید آپ کو تعجب ہو لیکن ایک سچی حقیقت یہ ہے کہ اللہ والوں کو نیند میں بھی ایک عجیب لطف ولذت حاصل رہتی ہے جو اہلِ دنیا کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہی تو وجہ ہے کہ رات دن دنیا کے چکر میں پریشان رہنے والا اور حرام محبتوں میں مزے لینے والا چین وسکون کی نیند نہیں سو پاتا ہے۔

چنانچہ بعض بزرگوں کو احقر نے اس حال میں دیکھا کہ مختصر سوتے اور آرام فرماتے، مگر ایسی پُرسکون نیند میسر آتی کہ معمولی سے وقت میں دو دو دن کی تعب وتھکان دور ہوجاتی۔ چنانچہ ایک بار حضرت مسیح الامت حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر تھا تو دورانِ مجلس حضرت نے ارشاد فرمایا کہ دو تین دن سے باقاعدہ سویا نہیں ہوں۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے مسلسل مجالس اور خط وکتابت کا سلسلہ اور دوسرے اصلاحی کاموں میں مشغول تھے۔ بس تھوڑی دیر اونگھ آئی ہے، اللہ نے اسی میں پوری نیند کا آرام دے دیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اس گلشنِ دردِ دل کے افضل و برتر ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ انسان دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اس دردِ دل اور قربِ باری تعالیٰ کو اپنے ساتھ ساتھ بارگاہِ الٰہی میں لے کر جائے گا۔ اسی لیے قرآن میں قلبِ منیب اور قلبِ سلیم والے لوگوں کے لیے جنت میں داخلہ موعود ہے کیونکہ موت سے ظاہر دنیوی جسم تو خاک میں مل جاتا ہے، مگر روح باقی رہتی ہے اور اس عالم سے عالم ارواح میں منتقل ہو جاتی ہے تو جن اوصاف و کمالات اور انوار و تجلیات کے ساتھ یہاں سے نکلتی ہے، اسی طرح بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتی ہے۔ اسی لیے عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ اس گلشنِ دردِ دل کو موت کے بعد بھی خزاں لاحق نہیں ہوتی۔

تحفۂ دردِ دل کی کوئی مثال نہیں

بہت تحفے ملے دنیا میں لیکن کیا کہوں اے دل
یہ تحفہ دردِ دل کا حاصلِ نعمائے عالم ہے

ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں بہت سی نعمتیں حاصل ہوئیں لیکن اللہ کی محبت کا مل جانا ان ساری نعمتوں میں سب سے بڑھ کر ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنی بھی نعمتیں آپ کو حاصل ہوسکتی ہیں وہ سب مخلوق ہیں اور اپنے خونِ حسرت کو پی کر حرام خوشیوں کا خون کر کے جس دل میں اللہ تعالیٰ اپنی تجلیات کے ساتھ آئے ہیں۔ وہ خالق ہیں تو ظاہر ہے خالق اور احکم الحاکمین اللہ کو پالینا مخلوق کو اس سے کیا نسبت ہوسکتی ہے اور قرآنِ کریم سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ سب سے بڑی نعمت مسلمان کے لیے اللہ کی رضاء اور اس کا قرب ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰىٓ ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝﴾

(سورۃ اللیل آیت: ۲۰-۱۹)

ترجمہ: اور نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا بدلہ دے مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے۔

(معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۷۵۸)

یعنی سب سے بڑی نعمت اپنے مولیٰ کی رضامندی کو چاہنا ہے۔ اس کو آپ دوسرے انداز میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی محبت اور معرفت کا پالینا گویا مقصدِ حیات کو پالینا ہے کیونکہ ہماری تخلیق کا مقصد ہی یہی ہے کہ ہم اپنے اللہ کو پہچانیں اور ذکر و عبادت کے ذریعے اُس کا قرب حاصل کریں۔ جیسا کہ کسی مسافر کی سب سے بڑی خوشی کا سامان یہی ہوتا ہے کہ اُس نے جس مقصد کے لیے سفر کا آغاز کیا تھا وہ اس مقصد میں کامیاب ہو کر واپس لوٹ گیا۔

مولیٰ سے مولیٰ کو مانگنا سیکھیے

جسے دیکھو اُسی کے سر میں ہے سودا کسی شئے کا
مگر سودائے جاناں اکبرؔ سودائے عالم ہے

دنیا میں جتنے ذی شعور اہلِ عقل حضرات ہیں ان میں سے ہر ایک کسی مقصد کے حصول کی خاطر تگ ودو اور جدوجہد میں مصروفِ عمل ہیں اور ہر صبح اُٹھ کر اُس کو پانے کے لیے سعی وکوشش میں لگ جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک ہے:

﴿كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا اَوْمُوْبِقُهَا﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الطهارة، ص ۳۸، قديمي كتب خانه)

یعنی ہر انسان صبح کو اُٹھ کر اچھے یا بُرے کاموں میں لگ جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اس کی خاطر بیچنے والا ہوتا ہے۔ پس بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو جہنم سے آزاد کرنے والے ہوتے ہیں اور بعض اپنی غلط حرکتوں کے نتیجے میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ حضرت والا ارشاد فرمارہے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں کسی شئے کا سودا ہے اور اُس کو اسی کی دھن اور اسی کا دھیان ہر وقت لگا رہتا ہے اور وہ اس کے لیے اپنی ہر قسم کی بدنی قوت وصلاحیت اور دماغی فکر وسوچ خرچ کرتا ہے۔ بڑی تعداد تو لوگوں کی وہ ہے کہ جو دنیا کی چیزیں زمین وجائیداد واور مال ودولت جاہ ومنصب کے حصول کے لیے صبح سے شام تک اپنی ہر طرح کی صلاحیتوں کو خرچ کررہے ہیں اور اس کے لیے مختلف طرح کی اسکیم اور پلاننگ بناتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اسی پر خرچ کر کے زیرِ زمین پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن اللہ والے اور خدا کے سچے عاشق اپنے ہر لمحۂ حیات کو اور اپنی ہر قسم کی صلاحیتوں اور کاوشوں کو مولائے کائنات کو پانے میں خرچ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس جانِ جاناں کی خاطر اپنی جان دینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ بالآخر جب وہ اپنے مولیٰ کو پالیتے ہیں۔ پھر کائنات کی ہر مخلوق اُن سے محبت کرنے لگتی ہے۔ آسمانوں میں ان کے چرچے ہونے لگتے ہیں، زمین وآسمان کا ہر ذرّہ انہیں اپنا دکھائی دیتا ہے ؎

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اِک تو نہیں میرا تو کوئی شئے نہیں میری

تفصیلی روایت ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ وَاَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَتّٰى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب العلم، ص ۳۴، قديمي كتب خانه)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اہلِ دل علماءِ ربّانیین کے حق میں چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں پانی میں دُعا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

مچھلیاں پانی میں ذرّے خاک میں برگ و شجر
نیک عالم کو دُعا دیتے ہیں ہر شام و سحر

اس کا راز واضح ہے کہ اللہ والوں کی باتوں اور ان کی تعلیمات و ہدایات سے عالم میں خیر پھیلتی ہے۔ لوگوں میں رُشد و ہدایت عام ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اس وقت معاشرے پر اللہ کی رحمتیں برستی ہیں جس کا نفع کائنات کی ہر مخلوق کو پہنچتا ہے تو پھر مخلوقات اُس کے لیے دُعا کرتی ہے۔

صاحبو! صحیح عقلمندی اور دانشمندی یہی ہے کہ ہمارے دل و دماغ میں ''سودائے جاناں'' ہو اور ہماری سعی و کوشش کا مقصد و محور خالقِ کائنات کو پالینا ہو۔ اسی لیے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مشترک مشن اور غرضِ دعوت انسانوں کا رُخ مخلوق سے خالق کی طرف اور عباد سے ربّ العباد اور کائنات سے ربِّ کائنات کی طرف پھیرنا تھا۔ چنانچہ یہ دعوت **یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہ** ان سب کی مشترکہ دعوت تھی جس کا لُبِّ لباب اور نچوڑ یہی ہے کہ ایک اکیلے اللہ کی طرف اپنا رُخ پھیرلو۔

میرے دوستو! جب بندہ اللہ کو پالیتا ہے اور محبوب بارگاہِ ربّ العزت بن جاتا ہے تو پھر ہر قدم پر خود اللہ ربُّ العزت اُس کے حامی و ناصر بن جاتے ہیں۔ ساری اُمت اگر اس کو نقصان پہنچانے پر اکھٹی ہو جائے تب بھی اس کا کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے اُس کے حامی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیثِ قدسی ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الرّقاق، باب التواضع، ج: ۲، ص: ۹۶۳)

کہ جو شخص میرے مقبول بندے سے عداوت کرے میں اس کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں اور میں ان کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہوں تو بھلا ظاہر ہے جس کا خدا حامی بن کر کھڑا ہو جائے پھر اُس کے مدِ مقابل کی تباہی و بربادی میں کیا شک ہے؟

چنانچہ بعض وہ لوگ جنہوں نے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ کی شان میں گستاخیاں کی تھیں۔ حضرت کی وفات کے بعد اس قدر خراب حالات سے دوچار ہوئے اور ایسی تباہی و بربادی کا شکار ہوئے جو ناقابلِ بیان ہے حتیٰ کہ بعضوں نے حضرت کی قبر پر جا کے معافی مانگی کہ حضرت معاف کرو، ہم مٹ رہے ہیں، تباہ ہو رہے ہیں۔

بجز عشقِ حق سب فانی و ہیچ ہے

بس اک ہنگامہ دردِ عشقِ حق کا گرم رہتا ہے
سوا اس کے ہمہ فانی ہر اک غوغائے عالم ہے

اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے عشق کی گرمی سے دل میں اک جوش سا اُٹھتا رہتا ہے جو کہ اپنے دل پر اللہ کی راہ کے غم اُٹھانے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی غذائے اولیاء ہے۔ اسی سے روح کو تازگی اور فرحت ملتی ہے اور عبد کا

رشتہ معبود سے اور مخلوق کا خالق سے قوی اور طاقت ور ہوتا ہے۔ یہی سرمایہ نجات اور سامانِ بخشش ہے۔ باقی سارا عالم اور اس کی لذتیں اور رونقیں دنیا کا محض ایک شور شرابہ اور ہاؤ ہو ہے۔ جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں یکدم انسان ان کو چھوڑ کر اپنے کو بالکل بے سہارا دیکھتا ہے اور سارے سہارے ٹوٹتے نظر آتے ہیں جبکہ حاملین دردِ دل اللہ کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں جو جیتے مرتے ہر گھڑی ساتھ ہے جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا سہارا ٹوٹتا نہیں ہے لہٰذا تم اُسے مضبوطی سے پکڑو، چھوڑو نہیں۔ جیسے آپ کسی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور وہ رسی بھی مضبوط ہو تو پھر وہ رسّی ٹوٹے گی نہیں اور آپ کو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اللہ کی رسّی اور سہارے کو مضبوطی سے پکڑنا یہ ہے کہ ایک سانس بھی اُس کی حکم عدولی نہ کی جائے اور ایک لمحہ گناہ کر کے اللہ کو ناراض نہ کیا جائے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی نافرمانیوں میں لگے رہنے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ایمان پکا ہے۔ ہم اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔

عاشق صادق کے لیے محبوب کی مرضی ہی سب کچھ ہے

خوشی پر ان کی مرنا اور جینا ہی محبت ہے
نہ کچھ پروائے بدنامی نہ کچھ پروائے عالم ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾
(سورۃ الانعام، آیت: ۱۶۲)

ترجمہ: تو کہہ کہ میری نماز میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو پالنے والا سارے جہاں کا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۵۰۶)

اس آیت کا سبق ہم سب کے لیے یہ ہے کہ ہماری موت وحیات ہماری خوشی اور غمی، ہمارا چلنا پھرنا غرض یہ کہ ہر قول وفعل اور فکر وسوچ کا رُخ صرف ایک اکیلے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کو راضی کرنا ہو۔ خواہ اس راہ میں ہمیں اپنوں اور غیروں کے طعنوں اور ملامتوں کا شکار ہونا پڑے۔ یہی انبیاء اولیاء کا خصوصی امتیازی وصف ہے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی اتنی قدر ومنزلت ہے کہ جہاں قرآن کریم میں دین سے پھر جانے والے یعنی مرتدین کے مقابلے میں محبوبین باری تعالیٰ کا ذکر ہوا ہے تو اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس وصفِ خاص کو اپنے ایسے بندوں کے لیے ذکر فرمایا ہے کہ جو دین سے مرتد نہ ہوں گے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾
(سورۃ المائدۃ، آیت: ۵۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب لائے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں، نرم دل ہیں مسلمانوں پر، زبردست ہیں کافروں پر، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے، یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے، اور اللہ کشائش والا ہے خبردار۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۱۶۶)

اس آیت کی تفسیر کے تحت حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اوصاف اپنے ایسے عاشقوں کے ذکر فرمائے جن کو مرتدین کے مقابلے میں لائے ہیں۔ اس سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ ان اوصاف کے حاملین ارتداد سے محفوظ رہیں گے کیونکہ پورے طور پر مقابلہ جبھی متحقق ہوگا جبکہ مقابل یعنی مرتدین کا وصفِ ارتداد ان میں نہ پایا جائے۔

یہی بات حضرت والا اس شعر میں ارشاد فرمارہے ہیں میری محبت کا معیار یہی ہے کہ اپنے اللہ کی خوشی پر ہی میرا مرنا اور جینا ہو چاہے سارا عالم میرا مخالف ہو، اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔

ملامت کی پرواہ کرنا دل کا نہایت خطرناک مرض ہے

صاحبو! ملامت کی پرواہ کرنا اور لوگوں کے طعنوں سے بچنے کی فکر میں رہنا دل کا ایسا خطرناک مرض ہے کہ بسا اوقات سعادت کو شقاوت میں بدل دیتا ہے اور کفر و شرک کو چھوڑ کر دائرۂ ایمان میں داخل ہونے سے مانع بن جاتا ہے۔ چنانچہ دورِ نبوت کا مشہور واقعہ ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچا ابو طالب کو زندگی کے آخری لمحات میں دعوتِ ایمان پیش کی تو یہی طعن و تشنیع کا خوف ایمان سے رکاوٹ بن گیا۔ وہ کہنے لگے کہ بھتیجے! اگر مجھے میری قوم کی ملامت اور طعن زنی کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کلمے کو پڑھ کر تیری آنکھ کو ٹھنڈی کرتا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اسی ملامت کے خوف نے کتنی بڑی سعادت اور ابدی فوز و فلاح سے محروم رکھا۔ اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے رسومات کی پابندی کو اس پہلو سے بہت خطرناک قرار دیا کیونکہ رسومات کی پابندی کے پیچھے قوم و معاشرے کی طعن و تشنیع کا خوف کارفرما ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اگر ہم ایسا ایسا (خلافِ شرع) کام نہ کریں تو ناک کٹ جائے گی۔ لوگوں میں ذلیل ہو جائیں گے۔

اصلاحی مجالس کا انعقاد کس نیت سے ہونا چاہیے

اس ضمن میں اللہ نے دل میں بات ڈالی کہ اگر شیخ نے کسی کو خلافت و اجازت عطا کی اور اس کو حکم دیا کہ اپنے مقام پر اصلاحی مجالس کا آغاز کرو اور اُس نے حکم کے مطابق مجالس کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر ابتداءً یا تو کوئی خاص توجہ لوگوں کی طرف سے نہ ہوئی اور حاضرینِ مجلس کی تعداد بہت کم رہی یا گو کہ مجلس میں آنے والے حضرات تو متوجہ ہوئے، مگر مقامی بعض حضرات کی طرف سے مختلف نوع کے طنزیہ جملے سننے کو ملے اور بعضوں کی طرف سے مذاق بنانے والی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تو اس موقعہ پر بھی لوگوں کی ان باتوں کی طرف خیال کر کے اور ان کے

اس طرح کے جملوں کے خوف سے مجلس نہیں چھوڑنی چاہیے بلکہ اللہ کی رضاء کے لیے شیخ کے حکم کے تحت برابر اصلاحی مجلس کرتا رہے۔ اس سلسلے میں استقامت اختیار کرے اور خود اپنی اصلاح پر نظر ہو اور محض رضاءِ الٰہی کے لیے اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ بالآخر ان شاء اللہ شُدہ شُدہ آپ کی مجالس سے خوب فیض جاری ہو جائے گا۔ لوگوں میں اللہ کی طرف سے خود بخود مقبولیت ڈال دی جائے گی۔

حاصل یہ نکلا کہ اپنے خالق پر نظر ہو مخلوق کی طرف مثبت و منفی کسی نوع کا خیال نہ ہو کیونکہ ہمارا مقصود اللہ کے لیے دین پھیلانا ہے۔ چنانچہ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی کے ایک خلیفہ نے حضرت کو خط لکھا کہ حضرت آپ نے مجھے اصلاحی مجلس کرنے کے لیے فرمایا ہے، مگر یہاں لوگوں کو کوئی خاص توجہ نہیں ہے اور کبھی کوئی شریک نہیں ہوتا۔ کبھی بہت کم لوگ شریک ہوتے ہیں، اس لیے مجھے بڑا عجیب محسوس ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں مجلس چھوڑ دوں۔ اس پر حضرت رحمہ اللہ نے جواب تحریر فرمایا اوہو! افسوس ابھی تک مخلوق ہی پر نظر ہے جب شیخ کا حکم ہے تو خود اپنی اصلاح کے لیے اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے مجلس جاری رکھو۔ لوگ کم شریک ہوں تو بھی یہی نیت رہے اور لوگ زیادہ شریک ہوں تب بھی اسی نیت سے کام میں لگے رہو اور مخلوق سے نظر اُٹھالو۔

حکمِ شیخ کے سامنے خود رائی نہیں چاہیئے

اس ضمن میں ہم سالکین طریقت کے لیے ایک اہم نکتہ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس راہ میں خود رائی یعنی اپنی رائے پر چلنا بے حد مضر ہے۔ اگر اپنا شیخ و مرشد کسی کام کے لیے حکم دے تو پھر اس طرح کے خیالات دل میں لانا کہ میں اس قابل نہیں ہوں اور میں ایسا نہیں کر سکتا، یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے، میرے اندر ایسی کوئی خوبی نہیں، میں تو معمولی آدمی ہوں، اصلاحی مجالس قائم کرنا یا لوگوں کو بیعت کرنا جیسے دینی کاموں کے لیے میں اپنے اندر صلاحیت نہیں پاتا ہوں، یہ سب باتیں شیخ کے حکم دینے کے بعد خود رائی ہے۔ اس کو اپنے دل سے نکال کر کام میں لگ جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ احقر تقریباً سات سال سے حضرت والا سے اصلاحی تعلق قائم کیے ہوئے اور جیسا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شیخ کے پاس کان بن کے رہنا چاہیے نہ کہ زبان۔ یعنی زیادہ بولنے کی بجائے خاموشی کے ساتھ شیخ کی باتیں سنتا رہے اور اپنے اوپر تطبیق دیتا رہے۔ بندہ بھی چند سال تک اسی طرح حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوتا اور خاموشی سے وقت گزار کر چلا جاتا، لیکن بعض دوستوں کی طرف سے حضرت والا کو میرے متعلق یہ خبر دی گئی کہ حضرت والا ان سے اشعار پڑھوائیں اور اس کے بعد حضرت نے احقر کو حکم دیا تو فوراً وہی مذکورہ سب خیالات دل میں آنا شروع ہوئے، مگر پھر توفیقِ الٰہی سے حضرت تھانوی کی یہ بات دل میں آئی کہ شیخ کے حکم کے بعد اس طرح کے خیالات ''خود رائی'' پر مبنی ہیں، اس لیے اب کان بننے کی بجائے زبان بننا ہی اصولِ طریقت کے مطابق ہے۔ چنانچہ بندہ کھڑا ہو جاتا ہے اور حسبِ حکمِ شیخ اشعار پڑھ کر ان کی تشریح شروع کر دیتا جس

کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے احقر سے ''فیضانِ محبت'' کی تشریح کا یہ کام لیا۔ تقریباً تمام تشریحات کا یہ مجموعہ خود حضرت والا کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھے جانے والے کلام کا ہے جو بلاشک محض توفیقِ الٰہی اور شیخ کی دعاؤں اور توجہ کا نتیجہ ہے۔

مرضی خداوندی کا حصول روح بندگی ہے

ہے روحِ بندگی بس ان کی مرضی پر فدا ہونا
یہی مقصودِ ہستی ہے یہی منشاءِ عالم ہے

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی کریں اور اللہ کو راضی کرنے والے تمام کام انجام دیں۔ اللہ کی ناراضگی سے بچیں، یہی کامل عبدیت ہے اور یہی مقصدِ تخلیقِ بنی آدم ہے جس کے لیے کل کائنات کا نظام قائم ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۹)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۱، صفحہ: ۱۷۰)

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾

(سورۃ الجاثیۃ، آیت: ۱۳)

ترجمہ: اور کام میں لگا دیا تمہارے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں سب کو اپنی طرف سے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۷۷۸)

یعنی خلاصہ یہ کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام نعمتیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ خود انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا، اس لیے صحیح بندہ وہی ہے جو ہر گھڑی اپنے اللہ کی مرضی پر فدا ہوتا رہے۔ گویا اُس نے اپنے دنیا میں آنے کے مقصد کو پورا کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے استعمال کا حق ادا کر دیا۔

ذکرِ مولیٰ میں گزرنے والا لمحہ سب سے قیمتی ہے

ہماری خاک اس لمحے میں ہے رشکِ فلک اختر
وہی لمحہ جو میرا ذاکرِ مولائے عالم ہے

حدیثِ قدسی ہے جس میں اللہ فرماتے ہیں:

﴿اَنَاجَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾

(شعب الایمان)

جو مجھے یاد کرتا ہے میں اُس کا ہمنشیں ہوتا ہوں۔ گویا اللہ کو یاد کرنے کے وقت میں بندے کا رشتہ اپنے اللہ سے اور مخلوق کا ربط خالق سے اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ خود خالق سبحانہ وتعالیٰ نے ذاکر کے ہمنشیں ہونے کی خبر دے دی تو پھر کیوں نہ یہ لمحاتِ حیات رشکِ افلاک ہو جائے۔ حتیٰ کہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کے سامنے ایسے بندوں کے تذکرے ہوتے ہیں اور اس سے بڑی سعادت مؤمن کے لیے کچھ نہیں ہوسکتی کہ اللہ اُس کا ہمنشیں ہو۔ لفظ ''خاک'' بول کر حضرت والا نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ یہ انسان اگر اللہ تعالیٰ سے غافل ہوکر زندگی گزارے گا تو بارگاہِ ربُّ العزت میں اس کی کوئی قیمت نہیں بلکہ یہ خاک کا ایک ڈھیر ہے اور بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہیے کہ خاک سے بھی بدتر اور فروتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کے نتیجے میں اور اس کی نافرمانی اور حکم عدولی کی وجہ سے اس پر خدا کا غصب اور غصہ برستا ہے اور یہ مستحقِ عذاب وعقاب قرار پاتا ہے، اس لیے کافر قیامت کے دن یہ تمنا کرے گا کہ اے کاش! کہ میں مٹی ہوتا کیونکہ اس کو سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ اور خاک ومٹی پر خدا تعالیٰ کا غضب نہیں ہے۔

عروجِ بندگی

نہ گلوں سے مجھ کو مطلب نہ گلوں کے رنگ و بو سے
کسی اور سمت کو ہے مری زندگی کا دھارا
جو گرے ادھر زمیں پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اُٹھا فلک پر مری بندگی کا تارا

سبق دیتی ہے ہر دم اہلِ دل کی داستاں مجھ کو

جہاں دے کر ملا ہے دل میں وہ جانِ جہاں مجھ کو
بہت خونِ تمنّا سے مِلا سُلطانِ جاں مجھ کو

نظر آتا ہے اپنے دل کا جب زخمِ نہاں مجھ کو
تو اپنا درد خود کرتا ہے مجبورِ بیاں مجھ کو

بیانِ دردِ دل آساں نہیں ہے دوستو لیکن
سبق دیتی ہے ہر دم اہلِ دل کی داستاں مجھ کو

زبانِ عشق کی تاثیر اہل دل سے سُنتا ہوں
مگر مسحور کرتی ہے محبت بے زباں مجھ کو

قفس کی تیلیاں رنگین، دھوکہ دے نہیں سکتیں
کہ ہر دم مضطرب رکھتی ہے یادِ گلستاں مجھ کو

مری صحرا نوردی اور میری چاک دامانی
بہت مجبور کرتی ہے مری آہ و فغاں مجھ کو

کہاں تک ضبطِ غم ہو دوستو راہِ محبت میں
سُنانے دو تم اپنی بزم میں میرا بیاں مجھ کو

ملا کرتی ہے نسبت اہلِ نسبت ہی سے اے اختؔر
زباں سے ان کی ملتا ہے بیانِ دُرفشاں مجھ کو

مشکل الفاظ کے معنی:۔جانِ جہاں: سارے جہان کی جان، مراد اللہ تعالیٰ۔سُلطانِ جاں: مراد اللہ تعالیٰ۔زخمِ نہاں: اللہ تعالیٰ کی محبت میں کھایا ہوا پوشیدہ زخم۔مسحور: جادو جیسا اثر۔محبت بے زباں: خاموش محبت۔قفس: پنجڑا مراد دنیا۔ رنگین تیلیاں: حرام لذات۔مضطرب: بے چین۔ یادِ گلستاں: یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد۔صحرا نوردی :......۔ چاک دامانی:......۔بزم: محفل۔ نسبت: تعلق مع اللہ۔ اہلِ نسبت: اولیاء اللہ۔بیانِ دُرفشاں:......۔

اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ پر لٹا دینا گویا کہ سارا جہان دیدینا ہے

جہاں دے کر ملا ہے دل میں وہ جانِ جہاں مجھ کو
بہت خونِ تمنا سے ملا سلطانِ جاں مجھ کو

جب بندہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردے تو اللہ تعالیٰ اس کو سارا جہان قربان کرنے کے برابر قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے وہ سب قربان کر کے یہ بات ثابت کردی کہ اگر سارا جہان بھی اس کے پاس ہوتا تو وہ اس کو بھی قربان کردیتا خاص طور پر ہر انسان اپنے دل میں بہت سی تمنائیں رکھتا ہے اور گویا دل دل میں تمناؤں کا ایک عالم سجا ہوا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے اللہ کا سچا عاشق بندہ ان سب تمناؤں کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور بس ایک ہی آرزو لے کر دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور وہ یہ کہ مجھے میرا مولیٰ مل جائے اور میں اپنے اللہ کے قرب کو حاصل کرلوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تم میرے غیر کو دل سے نکالو تو پھر میں تمہیں مل جاؤں گا۔

بس اتنی بات ہے کہ بعضوں کو اس کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اور اپنے بہت سے علائق دنیویہ پر ضرب کاری لگانی پڑتی ہے اور ان کے راہ خداوندی میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے ان کو راستہ سے ہٹانا پڑتا ہے تو ان کو اسی درجہ کا قرب نصیب ہوتا ہے جیسے بعض لوگ کہ جو عاشق مزاج ہوتے ہیں اور غیر اللہ کے عشق میں مبتلاء ہوتے ہیں اور غیر حق تعالیٰ کو دل دیے رہتے ہیں تو ان کو بہت خونِ تمنا کا دریا عبور کر کے ساحل ملتا ہے لیکن بہر حال اللہ تبارک وتعالیٰ کا ملنا اور اس کی قرب کے لذت کا حاصل ہونا لازمی اور یقینی ہے بس آدمی کو یہی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اپنا سب کچھ جو موجود ہو قربان کردے اور آئندہ کے لیے دل میں یہی نیت رکھے کہ راہِ خداوندی میں جو کچھ بھی رکاوٹ بنے میں اسے اللہ کی راہ میں لگادوں گا۔

میرا بیان میری داستانِ محبت ہے

نظر آتا ہے اپنے دل کا جب زخمِ نہاں مجھ کو
تو اپنا درد خود کرتا ہے مجبورِ بیاں مجھ کو
بیانِ دردِ دل آسان نہیں ہے دوستو لیکن
سبق دیتی ہے ہر دم اہلِ دل کی داستاں مجھ کو

اس کا حاصل صرف اتنی بات ہے کہ درد والا جب ڈاکٹر کے سامنے اپنا درد اور بیماری بیان کرتا ہے تو اسے کسی تقریر کی مشق (Practice) کی ضرورت نہیں پڑتی بس اسی طرح جب اللہ اپنا دردِ محبت کسی کے دل میں عطا فرماتے ہیں تو اس کو ایسی زبان بھی دے دیتے ہیں جس سے وہ اس درد کو بیان کرے۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف

میں اس کا ذکر کیا گیا ہے جو اسی کتاب میں احقر نے دوسرے مقام پر ذکر کی ہے۔

بس اس شعر میں یہ سبق ملتا ہے کہ جو لوگ دین کی دعوت کا کام کرنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت پھیلانا چاہتے ہیں تو انہیں اس کے ساتھ ساتھ کہ وہ بیانات حفظ کریں اور ان کی (Practice) کریں یہ بات بھی لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دل میں اللہ کی محبت وعظمت پیدا کریں اور اس کے عشق کی آگ دل میں لگالیں تو خود بخود بیان کرنے کی شکلیں سامنے آتی چلی جائیں گی اور ایسا بیان کا ملکہ اور قوت نصیب ہوگی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور علوم بھی ایسے عطا ہونگے کہ جن کا تصور محض کتابوں کو پڑھ کر ممکن نہیں ہے اور ایسے دل کو اللہ تعالیٰ وہ اسرار وحِکَم عطا فرماتے ہیں کہ جن کو عام عقلیں سمجھنے سے بھی قاصر ہوتی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا سمجھنا اسی شخص کے لیے آسان ہوتا ہے جس کا دل خود حاملِ دردِ محبت ہو اور ایسے خاصانِ خدا کے دل میں گذرنے والے بعض اونچے علوم بہت سے ظاہری عقل رکھنے والوں کے لیے باعثِ فتنہ بن جاتے ہیں کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ لغت کا ایک محدود دائرہ ہے اور اس کی تعبیرات انسان کی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق ہوتی ہیں اور اہل اللہ کے دل میں آئی ہوئی اللہ تعالیٰ کی محبت کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے تو لغت کچھ خاص معنی تو بتاسکتی ہے لیکن دل میں گزرنے والی صحیح کیفیات محبت کا بیان اس سے ممکن نہیں اس لیے حضرت والا نے یہ بات فرمائی ہے کہ بیانِ دردِ دل آسان نہیں ہے جیسا کہ حضرت والا کے ایک دوسرے شعر میں ہے۔

جو لفظوں سے ہوئے ظاہر معانی
وہ پا سکتے نہیں دردِ نہانی
لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

محبت کی تاثیر بلا زبان جادو کی طرح ہے

زبانِ عشق کی تاثیر اہلِ دل سے سنتا ہوں
مگر مسحور کرتی ہے محبت بے زباں مجھ کو

یعنی اللہ کے عاشقوں کی زبان اور اہلِ دل کے بیانات کی تاثیر جو عشق ومحبت خداوندی کے سلسلے میں ہو لوگوں کے دلوں کی کایا پلٹ کے رکھ دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیدا ہوجانا ان کی ذات پر ہر چیز فدا کرنے کی دعوت دے رہا ہے تو دلوں میں اللہ کی محبت کا آنا انسان کے مکمل دین پر آجانے کی جڑ ہے اس لیے اگر کسی کو آسانی کے ساتھ پورے دین پر لانا ہو تو اس کے دل کو محبت خداوندی کا چسکا لگادو وہ خود بخود اس کو جادو کی طرح اللہ کی طرف کھینچ کر لے آئے گی اور پھر اس کی ہر ادا منشاء خداوندی کے

مطابق ہوگی کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے محبت ہو جاتی ہے اس کی اطاعت کا جذبہ بھی دل میں آ جاتا ہے اور اس کا کہنا مان کر چلنا آسان ہی نہیں بلکہ مزیدار ہو جاتا ہے اسی لیے اہل اللہ کے لیے دین کی ان باتوں پر عمل کرنا بالکل سہل اور آسان ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے لیے جن پر عمل کرنا بہت گراں اور دشوار ہو پھر ان کو تقریروں اور بیانات کی حاجت نہیں رہتی اور نہ ہی وہ زیادہ دلائل و براہین کے طلب گار رہتے ہیں بلکہ محبت خود انہیں اپنے محبوب پر فدا ہونے کی دعوت دیتی ہے یہی محبت بے زباں کا مسحور کرنا ہے۔

مومنِ صادق دنیا کی زیب و زینت سے دھوکہ نہیں کھا سکتا

قفس کی تیلیاں رنگین، دھوکہ دے نہیں سکتیں
کہ ہر دم مضطرب رکھتی ہے یادِ گلستاں مجھ کو
میری صحرانوردی اور میری چاک دامانی
بہت مجبور کرتی ہے میری آہ و فغاں مجھ کو

جو پرندہ گلستان میں اڑنے پھرنے والا ہو اور وہاں کی باغ و بہار کا شیدائی ہو اگر اسے کسی قفس اور پنجرے میں بند کر دیا جائے اور اس قفس کی تیلیاں بڑی رنگین اور خوبصورت ہوں لیکن اس کے باوجود جو پرندہ گلستاں کی باغ و بہار کا عادی ہو اس کو یہ رنگین تیلیاں دھوکے میں نہیں ڈال سکتیں وہ ہر دم مضطرب اور بے قرار رہے گا اور اسے یادِ گلستاں اس پنجرے میں بے چین رکھے گی گو کہ ظاہری طور پر وہ بہت خوبصورت اور نہایت عمدہ ہو۔

میرے دوستو! میری یہ بات یاد رکھئے جس اللہ والے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت آ جاتی ہے اور جس مومن کے قلب میں صحیح ایمان راسخ ہو جاتا ہے پھر اس کو یہ دنیا کی رنگ رلیاں اور ظاہری زیب و زینت کسی قیمت پر فریب نہیں دے سکتیں۔ وہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت میں ایسا مست رہتا ہے کہ یہ ظاہری زیب و زینت اسے ایسی ہی نظر آتی ہیں جس طرح اس پرندہ کے لیے قفس کی رنگین تیلیاں، اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ مصنوعی مزین گھر میرے رہنے کی جگہ نہیں ہے میرا میدانِ زندگی اور میرے سکون کی جگہ وہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کی باتیں ہو رہی ہوں اور یادِ الٰہی کی باغ و بہار قائم ہو کیونکہ آخرت کی نعمتیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا مزہ اور اس کے قرب کی لذت وحلاوت کے سامنے یہ دنیا اور اس کی ساری باغ و بہار کچھ بھی نہیں اور بلا شک ایک سچے ایمان والے کے لیے دنیا جی لگانے کی جگہ نہیں ہے یہ تو ایک مسافر کی گذرگاہ ہے مومن کا دل تو ہر وقت اپنے اللہ تعالیٰ کی یادوں میں اٹکا رہتا ہے اسے اس کی فرصت ہی کہاں کہ وہ ان چیزوں کو دل دے اور لطف اندوز ہو اور ان میں ایسا منہمک ہو جائے کہ جیسا یہی مقصد حیات ہو مگر یہ بات جب ہی پیدا ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت کا چسکا دل کو لگا ہوا ہو اور اسی صورت میں اس طرح کے اشعار کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے اسی لیے تو حضرات صحابہ کرام رضوان

اللہ علیہم اجمعین کتنے ہی مال دار رہے ہوں لیکن جب اللہ کے لیے جان دینے کی باری آتی تھی تو ایسا ہی لگتا تھا کہ جیسے یہ اس دنیا کے پنجرے سے نکل کر آخرت کے گلستاں کی طرف بھاگنا چاہتے ہیں۔

بالآخر ایسے اہل اللہ کے دل میں اللہ کے عشق و محبت کی آگ ایسی لگی ہوتی ہے اور ان کی زبانوں سے رات و دن ایسی آہ وفغاں نکلتی ہے کہ وہ اپنے ظاہر کو بنانے اور اس کا خیال رکھنے کی طرف اگر التفات کرنا بھی چاہیں تو وہ اندرونی محبت خداوندی کی حالت اور رات و دن گریہ و بکاہ اور آہ و فغاں ان کو ظاہری زیب و زینت سے دور رکھتی ہے اور انہیں اپنی صحرا نوردی اور اپنی چاک دامانی میں مست رکھتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی اس دل کی حالت کی وجہ سے دنیا کی طرف التفات نہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں بھی تو ان کی طبیعت اس طرف نہیں چلتی اس لیے حضرت والا نے یہ فرمایا کہ میری بے سروسامانی اور ظاہری پراگندہ حالی میری اسی آہ و فغاں کا ثمرہ ہے اور کیوں نہ ہو کہ جب انسان ظاہر کی فکر میں پڑتا ہے تو وہ باطن سے غافل ہو جاتا ہے اور جسے اللہ اپنے باطن کی فکر دیتے ہیں پھر اسے ظاہر کی پرواہ نہیں رہتی اور یہی خاصانِ خدا کی حالت اور ان کی عادت ہوتی ہے۔

نسبت، نسبت والوں ہی سے ملتی ہے

کہاں تک ضبطِ غم ہو دوستو راہِ محبت میں
سنانے دو تم اپنی بزم میں میرا بیاں مجھ کو
ملا کرتی ہے نسبت اہلِ نسبت ہی سے اے اخترؔ
زباں سے ان کی ملتا ہے بیانِ دُرفشاں مجھ کو

جب اہل اللہ کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی نسبتِ خاصہ عطا ہوتی ہے اور محبتِ قویہ دل میں راسخ ہوتی ہے تو پھر خود بخود بیانِ دُرفشاں نصیب ہو جاتا ہے اس لیے ان کے ساتھ رہ کر، قلب میں اللہ کی محبت کے موتی آجاتے ہیں تو ایک عاشق کا بیان بس انہیں موتیوں کو بکھیرتا ہے اس لیے محبت والا جب بیان کرنے بیٹھتا ہے تو وہی اپنی محبت کی کہانی دہراتا ہے اور حضرت والا نے اس میں ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ فرمادیا کہ جس طرح سبزی سبزی والوں سے ملتی ہے، اور مٹھائی مٹھائی والوں سے اور کباب کباب والوں سے ملتا ہے اور سونا سونے والوں سے بس اسی طرح محبت، محبت والوں اور نسبت، نسبت والوں سے ملتی ہے۔ اور اس کا ماٰخذ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ مَعْدِنٌ وَمَعْدِنُ التَّقْوٰى قُلُوْبُ الْعَارِفِيْنَ﴾

(الجامع الصغير للسيوطي، ج: ۲، ص: ۱۲۵)

یعنی ہر چیز کی ایک کان ہوتی ہے جو وہاں سے ملتی ہے اور تقویٰ کی کان اہل اللہ کے دل ہیں اگرچہ اس حدیث پر محدثین نے کلام کیا ہے لیکن بقول حضرت شیخ الحدیث مولانا یونس مظاہری اس کا مضمون درست اور صحیح ہے

تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محبت، محبت والوں سے اور نسبت، نسبت والوں ہی سے حاصل ہوگی اسی کی طرف حضرت والا نے اس میں اشارہ فرمایا ہے۔

موت کا کارنامہ

قضا کے بعد ہوئی سرد نفس کی دنیا
نہ حُسن و عِشق کے جھگڑے نہ مال و دولت کے

میری زندگی کا پہلا شعر

دردِ فرقت سے مرا دل اس قدر بے تاب ہے
جیسے تپتی ریت پر اک ماہی بے آب ہے

دل پر آرزو رکھتے ہوئے بے آرزو رہنا

حقیقت میں تو رہنا ہے یہی باحق و ھو رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہ محوِ رنگ و بو رہنا

علامت جذبِ پنہاں کی یہی معلوم ہوتی ہے
تری خاطر مری ہر سانس وقفِ جستجو رہنا

یہ دعوت بے زباں بھی ہے مگر آتش فشاں بھی ہے
گریباں چاک ہوکر عشق حق میں کوبہ کو رہنا

حقیقت بندگی کی ہے یہی اے دوستو سن لو
دل پر آرزو رکھتے ہوئے بے آرزو رہنا

مرے احباب مجلس سے کوئی پوچھے مزہ اس کا
بشرحِ دردِ دل اخترؔ کا محوِ گفتگو رہنا

مشکل الفاظ کے معنی: باحق و ھو: اللہ تعالیٰ کی خوشی اور اس کی یاد۔ محوِ رنگ و بو: دنیوی عیش میں مگن ہونا۔ جذبِ پنھاں: اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی طرف کھینچنا۔ وقفِ جستجو: تلاش میں لگے رہنا۔ آتش فشاں: بڑھکتی ہوئی آگ۔ کوبہ کو:...... بے آرزو: خواہش کا پورا نہ کرنا۔ احباب مجلس: حاضرین مجلس۔ بشرحِ دردِ دل: اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کی شرح کرنا۔ محوِ گفتگو: بیان میں مگن۔

اصل حیات ذکر اللہ ہے

حقیقت میں تو رہنا ہے یہی باحق و ھو رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہ محوِ رنگ و بو رہنا

ارشاد فرماتے ہیں کہ حقیقت میں جس زندگی کو زندگی کہا جاسکتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں گزرے اور یہی باحق وہو رہنے کی حقیقت ہے۔ گو کہ ان کے ارد گرد دنیا کی چیزیں اور ساز و سامان موجود ہو، مگر جس وقت اللہ کا جو حکم متوجہ ہو اس سے غافل نہیں رہتے اور تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اپنے وقت پر انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے تمام طاعات وعبادات کو مظاہرِ ذکرِ الٰہی قرار دیا ہے اور جملہ معاصی کو اللہ سے غفلت کے مظاہر ٹھہرایا ہے، اس لیے دین کے پانچوں شعبوں میں یعنی اعتقادات، عبادات، معاملات، معاشرت واخلاق ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ کے جو احکام ہیں اُن پر پورے طور پر عمل پیرا ہونا کامل اسلام ہے۔ ایسا کرنے والا اللہ کا ذاکر ہے اور جو شخص اس سے غافل ہو گو کہ وہ زبان سے اللہ اللہ کرتا ہو تو وہ نہ پورے طور پر مسلمان ہے اور نہ ہی وہ حقیقت میں ذاکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہم سے یہی ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں پورے طور سے داخل ہو جاؤ، تمام دین کے شعبوں میں اللہ کے احکام کی پابندی کرو اور سر سے پیر تک تمام اعضاءِ بدن کو صرف اس کام کے لیے استعمال کرو جس کے لیے اللہ نے استعمال کا حکم دیا ہے۔ دنیا کی ظاہری زیب وزینت پر فریفتہ ہونا اور اس عالمِ صد رنگ و بو میں محو رہنا کوئی رہنے میں رہنا نہیں ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ذاکر کو زندہ اور غافل کو مردہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت والا کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

مجھے اس عالمِ صد رنگ و بو سے کیا مطلب
میری حیات تو بس آپ ہی کا اک غم ہے

اور حضرت والا نے کیا ہی خوب فرمایا ؎

نہ گلوں سے مجھ کو مطلب نہ گلوں کے رنگ و بو سے
کسی اور سمت کو ہے میری زندگی کا دھارا

حضرت خواجہ صاحب اسی کو یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

رنگ رلیوں پہ زمانہ کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو باندازِ بہار آئی ہے

دنیا کا رنگ و بو اور اس کی عیش وعشرت زیب وزینت بجز دھوکے کے اور کچھ نہیں۔ ہمارے محبوب جنابِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی اس حقیقت کو مختلف اسلوب اور مختلف انداز سے اُمت کو سمجھایا تاکہ اس کے دھوکے

سے اُمت کو بچایا جا سکے، اس لیے یہی کام آپ کے سچے وارثین، علماءِ ربّانیین انجام دیتے ہیں۔

دنیا کی حقیقت کی مثالیں اور اس کی حکمتیں

اس میں یہ حکمت اور راز مخفی ہے کہ انسان فطری طور پر مختلف مزاج اور طبیعتوں پر پیدا ہوا ہے۔ اسی طبیعتوں کے اختلاف کے پیشِ نظر ایک ہی بات کو مختلف انداز سے پیش کرنا زیادہ مؤثر اور نافع اور اقرب الی القبول ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

﴿عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِيْ جَسَدِهٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ يَا رَسُوْلَ اللهِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَا لِيْ وَ لِلدُّنْيَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الرقاق، ص: ۴۴۲)

مجھے دنیا سے اور دنیا کو مجھ سے کچھ تعلق نہیں ہے، میری مثال تو بس ایسی ہے جیسے ایک مسافر راستہ سے گزرتا ہے، کسی درخت کے نیچے تھوڑی دیر اُس کے سائے میں آرام کرے اور پھر فوراً وہاں سے آگے چلتا ہے۔ کسی مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الرقاق، ص: ۴۴۱)

اگر دنیا کی حیثیت اللہ کی نگاہ میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ کسی کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نہ پلاتے اور بعض مقامات پر دنیا کی حقیقت سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی اپنی انگلی کو سمندر میں ڈالے اور ڈال کر نکالے اور دیکھے کہ اس پر کتنا پانی لگ کر آیا ہے۔ پھر فرمایا کہ دنیا کی نسبت آخرت کے مقابلے میں حقیقت کے اعتبار سے اتنی بھی نہیں جتنی اس پانی کو سمندر سے نسبت ہے۔

ایک دوسری جگہ دنیا کی حقارت اور دنائت کو سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایک مردار ناقص الخلقت بکری کے بچے کے متعلق صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم میں سے کوئی اس کو ایک درہم میں لینے کو تیار ہوگا؟ صحابہ کرام نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ! نہیں کیونکہ یہ بالکل بے کار ہے۔ پھر اس مثال کو سامنے رکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی حقیقت اس سے بھی زیادہ گئی گزری ہے اور اس کی حیثیت اللہ کی نگاہ میں اتنی بھی نہیں ہے۔

دنیا کے محبوب عند اللہ نہ ہونے کا ایک خاص راز

غور کرنے کی بات ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس دنیا کے رنگ و بو اور اس کی عیش و عشرت کی کوئی اہمیت اور وقعت ہوتی تو پھر یہ دنیا سب سے زیادہ اس طبقہ اور گروہ کو دی جاتی جس کو اللہ کے یہاں سب سے اونچا

مقام حاصل ہے۔ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ محبوب ہے اور وہ انبیاء کی جماعت ہے اور ان کے بعد نائبینِ انبیاء ہیں حالانکہ سب اہلِ ایمان جانتے ہیں کہ سیّدالانبیاء جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے عیش و عشرت سے بالکل نفرت تھی اور مختلف احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی دنیوی بے سروسامانی کا ذکر موجود ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمان مشہور ہے کہ میں نے ایک چاند پھر دوسرا پھر تیسرا چاند مسلسل اس طرح دیکھا کہ میرے گھر میں چولہا نہیں جلا۔

غرض اس تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے۔ بس اتنی بات ذکر کرنی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ کو دنیا کی لذتوں اور عشرتوں سے دور رکھا جانا اور خود ان کا دور رہنا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ کی نگاہ میں دنیا کی کوئی قدر و وقعت نہیں ہے، اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بیمار کو (بعض خاص بیماریوں استسقاء وغیرہ میں) پانی سے بچاتا ہے۔

اس سے ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے دنیا کے حالات تجارت و ملازمت، زراعت اور صنعت و حرفت حکومت اور بادشاہت وغیرہ میں ہماری تمنا کے مطابق سہولتیں اور راحتیں حاصل ہوتے رہنا اللہ کے یہاں ہمارے محبوب ہونے کی دلیل نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے اور خاص بندوں کے لیے ایسی صورتحال خاص طور پر پیدا فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کے ان گورکھ دھندوں، کھیل تماشوں اور بیکار لہو ولعب میں اپنی عمرِ عزیز ضائع نہ کرنے پائیں تو گو کہ وہ لوگ بظاہر ناموافق اور نامساعد حالات سے دوچار رہتے ہیں، مگر وہ قلبی طور پر ایمان میں قوی سے قوی تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے صبر و تقوی اور رضاء بالقضاء کی وجہ سے وہ محبوب عنداللہ ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نگاہوں میں بھی معزز و موقر اور ہر دلعزیز کر دیئے جاتے ہے۔ حسبِ تصریحِ حدیثِ شریف دنیا ان کے پاس ان کی ضرورت کے مطابق خود ذلیل ہو کر آجاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ کے نیک بندوں کی پوری تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے۔ اُمت کے تمام علماء و صلحاء، اولیاء اتقیاء کے ساتھ آج تک اللہ تعالیٰ کی یہی سنت قائم رہی ہے۔

اسبابِ گناہ سے بچنا لازم ہے

دنیا کی ایسی مجلسیں اور محفلیں جہاں دل کو بہلانے والی ظاہری نقش و نگار کی چیزیں اور خوبصورت شکلیں اور پُر بہار مناظر اور پُر رونق حسین و دلکش مواقع ہوں، خاص طور پر آج کل کے زمانے میں شادیوں کی تقریب اور سمندروں کی تفریح کی جگہیں، اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور مختلف قسم کے گناہوں اور بیہودہ اور لغو قسم کے منکرات سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ کہیں فحش و بے حیائی عام ہوتی ہے، تو کہیں تصویر کشی جیسے گناہ ہوتے

ہیں، گانا بجانا اور میوزک وغیرہ خرافات کے ذریعے خوشی منائی جاتی ہے۔ ایسی جگہوں میں اپنا دل بہلانے کے لیے جانا اور ایسی خوشیوں میں شریک ہونا یہی دنیا کے رنگ و بو میں محو ہونا ہے۔ خدا کا نیک اور سچا بندہ ایسی جگہوں میں جا کر اپنے دل کو خوش کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔

ہاں! اگر مجبوراً کسی خاص صلہ رحمی کے پیشِ نظر اس کی رعایت بھی کرنی پڑ جائے ورنہ بصورتِ عدم شرکت رشتہ داری کے ٹوٹنے کا خطرہ اور قرابت داری میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو تو پھر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی نصیحت کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا جائے کہ ایسی تقریب سے اوّل یا بعد میں اہلِ تقریب سے مل کر حقِ قرابت ادا کرلیا جائے۔ اگر کچھ ہدیہ تحائف پیش کرنے ہوں تو پیش کر دیے جائیں تاکہ اس ناجائز تقریب میں شریک سے حفاظت بھی ہو جائے اور اپنے اللہ کی نافرمانی سے بھی بچا جا سکے۔ پھر دو ایک مرتبہ آمد و رفت رکھے تاکہ عدمِ شرکت کا اثر قرابت داروں کے دل سے کلّی طور پر زائل ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کی محفل میں شرکت نہ کرکے اللہ کو تو راضی کر ہی لیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کو بھی اس سے راضی کر دیتے ہیں۔ اب اس کو دنیا و آخرت کی کامیابی ملتی ہے اور جو مخلوق کی رضا کی خاطر گناہوں کا ارتکاب کرکے خالق کو ناراض کر دیتا ہے تو حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ اُس نے اللہ کو تو ناراض کر دیا، عنقریب اللہ تعالیٰ لوگوں کو بھی اس سے ناراض کر دیں گے اور وہ اس طرح کہ اُس کے بُرے اعمال لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آتے جاتے ہیں اور وہ لوگوں میں پھیلا دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ لوگ اس کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔

لفظ ''محو'' کے استعمال کی وجہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا ان آیتوں سے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ اس دنیا کی طیبات اور حلال چیزیں ہماری خاطر بنائی گئی ہیں، اس لیے ان عمدہ اور لذیذ چیزوں کا استعمال اور اللہ کی حلال کی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہونا اچھی غذائیں کھانا، اچھے کپڑے پہننا، اچھی سواری پر سوار ہونا اور خوبصورت مکانات بنانا بلا شک و شبہ صحیح اور درست ہے اور جو اس میں کچھ قباحت سمجھے تو ایسا شخص غلو فی الدین کا مرتکب ہے۔ چنانچہ بہت سے اکابر اولیاء اُمت کے اس نوع کے واقعات ان کے حالات میں موجود ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ خوب اعلیٰ درجے کے ہر دن نئے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ خود حضرت تھانوی اور حضرت گنگوہی وغیرہ اپنا کھانا پہننا بہت عمدہ رکھتے تھے، اس لیے کہ ہمیں ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرح ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی گئی کہ وہ اپنے اوپر بہت سی کھانے پینے کی حلال چیزوں کو حرام کر دیتے تھے۔ چنانچہ دیوبند میں ہمارے پڑھنے کے زمانے میں ہندوؤں کے ایک مندر میں ہندو مذہب کا پیروکار ایک جوگی رہتا تھا جس نے دسیوں سال سے اپنے اوپر بولنے کو حرام کر رکھا تھا جو کچھ کہنا ہوتا وہ لکھ کر دیتا تھا۔

ایک دوسرا جوگی تھا جو ایک مدت سے زمین پر بیٹھا نہیں تھا۔ مستقل کھڑے ہونے کے مجاہدے میں مصروف تھا۔ اُس نے ایک رسّی لٹکا رکھی تھی اور اس پر اگر ضرورت پیش آتی تو لٹکتا تھا، زمین پر بیٹھتا نہیں تھا۔ اس نوع کے بے شمار واقعات ہیں لیکن میرا اصل بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا کی نعمتوں کا استعمال کرنا نہ تو بُرا ہے نہ زہد وتقویٰ کے خلاف ہے۔ البتہ اس میں محو اور مگن ہو جانا اور ایسا دھن اور دھیان کے ساتھ لگ جانا کہ ہر وقت دنیا کی چیزوں ہی کی حرص لگی رہے اور رات و دن انہی کے پیچھے دوڑتا رہے نہ تو حق و باطل کی تمیز رہے نہ جائز و ناجائز کا امتیاز رکھتا ہے۔ شب و روز اُسی کی فکر سوار ہے۔ اس طرح دنیا میں لگنا اپنے دین و ایمان اور دنیا و آخرت کو برباد کرنا ہے اور یہ بلاشک دینی طور پر ہلاک ہو جانے کے مترادف ہے ورنہ جب تک دنیا اور اس کی حلال نعمتیں ہمارے اردگرد تو موجود ہوں اور استعمال کرنے اور برتنے میں تو آتی ہوں لیکن دل سے باہر ہوں تو پھر یہ اس کشتی کی طرح ہے جس کے چلنے کے لیے پانی ضروری تو ہے لیکن اس کے اندر پانی کا داخلہ پوری کشتی اور اُس کے مسافروں کے لیے تباہی اور بربادی کا سبب ہے۔ جتنی روایتوں میں زہد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے سب کا خلاصہ اور مطلب یہی ہے۔ اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قمار و نقرہ و فرزند و زن

ہاں! مؤمن غیر مؤمن کا یہ فرق ہے کہ مؤمن بندہ جب ان نعمتوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کو محض اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾

(سورۃ ابرھیم، آیت:۷)

ترجمہ: اور جب سنا دیا تمہارے رب نے، اگر احسان مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۲۱۷)

اور اس طرح شکر کے راستے سے ان نعمتوں کا استعمال بھی اُسے اللہ تعالیٰ کے قریب کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو نعمتیں عطا فرماتے ہیں تو یہ پسند فرماتے ہیں کہ اُس کے جسم پر اُن نعمتوں کے آثار ظاہر ہوں، اس لیے اللہ کی نعمتوں کا استعمال کرنا اور برتنا اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مزید قربِ خداوندی کا ذریعہ ہے۔

تقویٰ کے تین درجات

علامت جذبِ پنہاں کی یہی معلوم ہوتی ہے
تری خاطر مری ہر سانس وقفِ جستجو رہنا

تفسیرِ بیضاوی میں قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے تقویٰ کے تین درجات بیان فرمائے ہیں نمبر ایک کفر و شرک سے بچنا۔ نمبر دو تمام معاصی اور گناہوں سے بچنا۔ نمبر تین ہر ایسی چیز سے بچنا جو اللہ کی یاد سے غافل کردے۔ اوّل درجہ عام، دوسرا خاص اور تیسرا اخصُ الخواص، مقرّبانِ بارگاہِ الٰہی کا ہے کہ وہ ایک سانس بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ محرمات و مکروہات سے بچتے اور دور رہتے ہیں بلکہ ایسے مباح کاموں میں بھی نہیں لگتے جو ان کو اللہ کی یاد سے غافل اور دور کردیں۔ وہ مخلوق میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، مگر اندرون سے واصل بحق رہتے ہیں۔ وہ اپنے ظاہری جسم کے اعتبار سے فرش پر ہوتے ہیں، مگر اپنے قلبی احوال و کیفیات کے اعتبار سے وہ عرش پر رہتے ہیں۔ دل دل میں وہ اللہ سے بات کرتے رہتے ہیں۔ اسی کو خواجہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں ؎

تم سا کوئی ہمدم کوئی دمساز نہیں ہے
باتیں تو ہیں ہر دم مگر آواز نہیں ہے
ہم تم ہی بس آگاہ ہیں اس ربطِ خفی سے
معلوم کسی اور کو یہ راز نہیں ہے

سچ تو یہ ہے کہ ان حقائق کا صحیح ادراک واحساس اسی بندے کو ہوتا ہے جو مقاماتِ قرب طے کرکے اللہ کو پالیتا ہے اور اپنے اپنے مجاہدات کے اعتبار سے ایسے لوگ عالمِ حضور و مشاہدے میں رہتے ہیں۔ اسی کو حضرت والا نے اس شعر میں ارشاد فرمایا کہ میری ہر سانس اللہ تعالیٰ کی تلاش و جستجو کے لیے وقف ہے اور یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا عمل نہ ہوجائے جس سے اللہ ناراض ہو اور یہ لوگ اپنے دنیا کے تمام معاملات کے حصول میں معمولی سعی اور جدوجہد کرنے کے بعد نتیجے کو اللہ کے حوالے کرکے بے فکر ہوجاتے ہیں۔ اپنے دلوں میں دنیا کی ہزاروں فکروں کو جمع نہیں کرتے۔ خواہ نتیجہ موافق ہو یا مخالف، بہر صورت وہ اس پر راضی رہتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بڑی عجیب و غریب بات ارشاد فرمائی کہ سبب اختیار کرنے کے بعد نتیجے کے مخالف و موافق ہونے کے ساتھ دل کا اٹکا رہنا یہ توکل کے منافی ہے۔ یہی بات احقر نے حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ کے ملفوظات میں بھی دیکھی تو اگر کسبِ مال کا سبب اختیار کرکے دل کو نتیجے کے ساتھ اٹکائے رکھا سمجھ لو کہ اس کے دل کو مال کے حرص کی بیماری لگ گئی ہے۔ کامل بندہ مؤمن کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کو صرف ایک ہی فکر ہو۔ اگر نتیجہ اپنی تمنا کے مطابق ہو تو بھی اگر اس کے مخالف ہو تو اس صورت میں بھی سب کو اللہ

تعالیٰ کی طرف سے جانے۔ یہی اچھی بُری تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب ہے جو کہ ہمارے ایمان کا جز ہے۔

توفیقِ اطاعت جذبِ پنہاں کا اثر ہے

اس شعر میں حضرت والا نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان جو بھی نیکی کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ جذب کا اثر ہوتا ہے جس کو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے:

﴿اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت:۱۳)

ترجمہ: اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف سے جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع لائے۔

(معارف القرآن، جلد:۷، صفحہ:۶۷۴)

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ﴾

(سورۃ المائدۃ، آیت:۵۴)

ترجمہ: تو اللہ عنقریب لائے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۱۶۶)

اس آیت کے تحت علامہ سید محمود بغدادی رحمہ اللہ تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں فَاِنَّ مَحَبَّتَھُمْ اِیَّاہُ بِفَیْضَانِ مَحَبَّۃِ رَبِّہٖ اِیَّاھُمْ یعنی بندوں کا اللہ سے محبت کرنا یہ خود اللہ کے بندوں سے محبت کرنے کا اثر ہے، اسی لیے یُحِبُّھُمْ کو مقدم کیا گیا یُحِبُّوْنَہٗ پر۔ گویا بندہ اللہ کی طرف جو بھی طاعت کا قدم بڑھاتا ہے اور اس کی رضاء جوئی کے لیے کوشش میں لگتا ہے گو کہ ظاہر میں وہ اُسے خود اپنی کوشش اور اپنی محنت محسوس ہوتی ہے، مگر بباطن اور در پردہ اللہ تعالیٰ کی شانِ جذب و کرم کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لیے علماء نے یہ بات لکھی ہے کہ سالک کو چاہیے کہ جتنے بھی مقامات، سلوک میں طے کرلے اور کیسے ہی مقامِ ولایت و تقویٰ پر پہنچ جائے لیکن اُسے اپنے مجاہدات کی طرف منسوب نہ کرے اور ایسا کرنا عین کفرانِ نعمت ہے۔ اس کے لیے حضرت والا کی کتابوں میں بحوالہ یہ عبارت موجود ہے فَاِنَّ بَعْضَ الْمُغْتَرِّیْنَ یَنْسِبُوْنَ کَمَالَاتِھِمْ اِلٰی مُجَاھَدَاتِھِمْ وَھٰذَا عَیْنُ الْکُفْرَانِ ظاہر ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ خود ان مجاہدات کی توفیق ملنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو پھر اپنی طرف منسوب کرنے کی گنجائش کہاں۔ چنانچہ جہاں نسبتیں موجود ہیں وہ محض ظاہری طور پر بندے کے سبب بننے کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ وہی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ دل میں نیکی کرنے کا داعیہ ڈالتی ہے اور پھر اُسی کی توفیق کے سہارے بندے میں نیکی کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ اس نیکی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ جگر نے کہا ہے ؎

میری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں

اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب انسان کے دل میں کسی خیر اور نیکی کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو اس میں

تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اگر تم نے خیر کے اس داعیہ پر لبیک کہہ کر اسی وقت فوراً عمل کرلیا تو یہ ایسے ہے جیسے کوئی مہمان تمہارے گھر آیا اور تم نے اس کا اچھی طرح استقبال کیا، اس کو عزت سے اپنے یہاں رکھا، کھلایا پلایا تو وہ مہمان بار بار آئے گا ورنہ آنا بند ہوجائے گا۔ ٹھیک اسی طرح اس داعیۂ خیر کا معاملہ ہے کہ اگر اس کی طرف التفات نہ کیا جائے تو وہ پھر بار بار نہیں آتا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنی طرف جذب یعنی کھینچنے کے آثار اور شکلیں ہیں۔

عاشقِ صادق کی دعوتِ حال کی تاثیر

یہ دعوت بے زباں بھی ہے مگر آتش فشاں بھی ہے
گریباں چاک ہوکر عشقِ حق میں کوبہ کو رہنا

جب انسان اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنے کو مٹا ڈالتا ہے تو پھر وہ ظاہری زیب و زینت سے لاپرواہ ہوجاتا ہے اور اس کا دل اپنے ظاہر کو بنانے کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ ظاہر میں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس رہتا ہے چاک گریبان ہونے سے دراصل اسی طرف اشارہ مقصود ہے گویا حق تعالیٰ کی محبت میں اس کا ایک دیوانہ وار انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے جس کو ظاہر کی فکر ہوتی ہے اس کا باطن خالی ہوتا ہے اور جسے باطن بنانے کی فکر ہو وہ ظاہر کی طرف سے پھر لاپرواہ ہوجاتا ہے اور جب انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے تب ہی اسے صحیح عشقِ حق کا مزہ آتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے قلب میں اپنی محبت کا ایسا آتش فشاں عطا کرتے ہیں کہ وہ جدھر جاتا ہے اس سے عشقِ خداوندی کی آگ نکلتی ہے اگر وہ زبان سے بیان و تقریر کرے تب بھی اور اگر وہ خاموشی اختیار کرکے لوگوں کے درمیان موجود ہو تب بھی اس کا حال کسی بیان سے کم نہیں ہوتا جیسا حضرت والا کا ایک شعر ہے ؎

گو میرا وعدۂ بیان نہیں
مجھ سے ملنا بھی کیا بیان نہیں

ایک مقام پر اسی کو حضرت نے یوں فرمایا ؎

میری زبانِ حال بھی میرے بیاں سے کم نہیں
میرا سکوتِ عشق بھی میرے بیاں سے کم نہیں

اسی لیے ایسے حضرات اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنے سے بلا کسی تقریر اور بیان کے لوگوں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں اور چند ہی دن میں سالک صاحب نسبت بن جاتا ہے۔

آرزوؤں کو ختم کر دینا مطلوب نہیں

حقیقت بندگی کی ہے یہی اے دوستو سن لو
دل پر آرزو رکھتے ہوئے بے آرزو رہنا

یعنی سچا کامل بندہ وہی ہے جس کے دل میں سینکڑوں اور ہزاروں تمناؤں کا سمندر موجزن ہو اور طرح طرح کی آرزوئیں دل میں موجود ہوں لیکن جن آرزؤں کی تکمیل اللہ تعالیٰ کی رضا میں مانع اور رکاوٹ بن رہی ہوں وہ ان کو پورا نہیں کرتا فوراً رک جاتا ہے اور گو کے اس کہ دل پر بہت زور پڑتا ہے مگر وہ اپنی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیتا ہے لیکن اپنے مولیٰ کو ناراض نہیں کرتا۔

اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیئے کہ جو لوگ اللہ والے ہوتے ہیں ان کے اندر سے یہ ساری تمنائیں اور آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کا فنا کرنا نہ مقصود ہے اور نہ بحیثیت بشر کے یہ ختم ہوسکتی ہیں بلکہ کمالِ عبدیت یہ ہے کہ ان کو اللہ کے حکم کے مطابق موڑ دے تمناؤں اور آرزوؤں کو ختم کرنے کی فکر میں نہ پڑے اس پر خواجہ صاحب کا شعر یاد آیا۔

بہت گو ولولے دل کے ہمیں مجبور کرتے ہیں
تری خاطر گلے کا گھونٹا منظور کرتے ہیں

اس لیے اصل بات یہ ہے کہ ان آرزوؤں کے تقاضوں پر عمل نہ کیا جائے یہی سب سے بڑا مجاہدہ ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا راستہ طے ہوتا ہے بہت زیادہ اوراد و وظائف پڑھتے رہنا لیکن حرام آرزؤں کو پورا کرنے سے نہ بچنا اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرت والا اگر کسی کے متعلق یہ سنے کہ اس سے بعض اوراد و وظائف میں کمی ہو رہی ہے اور معمولات پورے طور پر ادا نہیں ہو پا رہے ہیں تو حضرت کو اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا احساس اس وقت میں ہوتا ہے کہ جب یہ معلوم ہو کہ یہ گناہوں کے تقاضوں پر عمل کیے جا رہا ہے ورنہ معمولات کے متعلق تو حضرت یہاں تک فرما دیتے ہیں کہ جب طبیعت میں کچھ کمزوری محسوس ہو تو سو مرتبہ والے وظیفہ کو دس مرتبہ پڑھ لو اللہ تعالیٰ اس پر سو مرتبہ پڑھنے کا اجر دے دینگے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو دس گنا لکھتے ہیں ہاں البتہ بالکل چھوڑنا نہیں چاہیے۔ ورنہ اس سے بہت نقصان ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پھر وہ معمولات پورے طور پر چھوٹ جاتے ہیں۔

حضرت والا کی مجلس میں سامعین کا عجب کیف وسرور کا عالم

مرے احباب مجلس سے کوئی پوچھے مزہ اس کا
بشرحِ دردِ دل اخترؔ کا محوِ گفتگو رہنا

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حضرت والا کے قلب مبارک میں اپنا خاص دردِ محبت ودیعت فرمایا اور اس کے ساتھ ساتھ زبانِ ترجمانِ دردِ دل بھی عطا فرمائی تو حضرت ارشاد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب میں اس درد کی تشریح کرتا ہوں تو مجلس میں بیٹھنے والوں پر ایسا کیف وسرور اور لطف ومزہ طاری ہوتا ہے کہ جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور خود حضرت والا نے اس کے متعلق ایک شعر میں یوں ارشاد فرمایا۔

اس درجہ حلاوت ہے میرے طرزِ بیاں میں
خود میری زباں اپنی زباں چوس رہی ہے

اور اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی جوانی کے زمانے میں ایسا بھی ہوا ہے کہ حضرت والا نے رات کو بیان شروع کیا اور پوری رات بیان چلتا رہا جب فجر کی اذان ہوئی تو اچانک لوگ متوجہ ہوئے کہ صبح ہو چکی ہے ظاہر ہے کہ وہ جس خاص لطف وحلاوت کو محسوس کر رہے تھے اسی کی وجہ سے وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا ورنہ فطری طور پر طبیعتیں زیادہ دیر دینی بیان سننے سے اکتاتی ہیں

اور ایسی مجالس جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو اس کی بزرگی اور بڑائی اور عظمت ومحبت کی باتیں بیان ہو رہی ہوں اس میں سکون اور اطمینان یہ ایک حدیثِ صحیح سے ثابت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص سکینہ نازل ہوتا ہے اور ملائکہ ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ان کو ہر طرف سے ڈھانپ لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا اپنے یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔ اس حدیث کے تحت جہاں ذکر وتسبیح کی بات ہے وہیں قرآن وحدیث پر مشتمل دروس اور بیانات یہ بھی اس میں شامل ہیں اس لیے حضرت والا کا یہ فرمانا کہ میرے احباب مجلس کو اس وقت میں بہت لطف آتا ہے جب میں اللہ تعالیٰ کی محبت ان کے سامنے پیش کرتا ہوں، یہ بالکل واضح ہے۔

آہِ صحرا ہو مبارک تیرے دیوانوں کو

ہم نے دیکھا ہے ترے چاک گریبانوں کو
آتشِ غم سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کو

ہم نے دیکھا ہے ترے سوختہ سامانوں کو
سوزشِ غم سے تڑپتے ہوئے پروانوں کو

ہم فدا کرنے کو ہیں دولتِ کونین ابھی
تو نے بخشا ہے جو غم ان پھٹے دامانوں کو

خلوتِ غارِ حرا سے ہے طلوعِ خورشید
کیا سمجھتے ہو تم اے دوستو ویرانوں کو

اہلِ دنیا تو چمن میں ہیں گلوں کے بندے
ان کے دیوانے تو جاتے ہیں بیابانوں کو

اہلِ دنیا کو ہے راس آئی یہ فانی دنیا
نعرۂ عشق و محبت ترے مستانوں کو

حسنِ فانی بتاں پر مرے کرگس لیکن
آہِ صحرا ہو مبارک ترے دیوانوں کو

ہم نے دیوانوں سے سیکھی ہے محبت اختر
ہائے یہ درد کہاں ملتا ہے فرزانوں کو

مشکل الفاظ کے معنی:۔**چاک گریبانوں**: اللہ تعالیٰ کے عشق میں گریبان کھلا رکھنا۔ **آتشِ غم**: یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ۔ **چھلکتے ہوئے**: کسی چیز کا بھر جانا۔ **پیمانوں**: مراد دِل ہے۔ **سوختہ سامانوں**:......۔ **سوزشِ غم**:......۔ **پروانوں**: مراد جو اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ میں اپنے کو جلا دے۔ **دولتِ کونین**: دونوں جہاں کی دولت۔ **پھٹے دامانوں**: مراد اللہ والے ہیں۔ **خلوت**: تنہائی۔ **خورشید**: سورج۔ **ان کے دیوانے**: یعنی اللہ تعالیٰ کے عاشق۔ **بیابانوں**: ویرانہ۔ **کرگس**: گدھ۔ **فرزانوں**: عقل کے پیچھے چلنے والے۔

چھلکتے ہوئے پیمانوں کی قیمت

ہم نے دیکھا ہے ترے چاک گریبانوں کو
آتشِ غم سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کو

دوستو! اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے جب مومن بندہ بارگاہِ الٰہی میں آہ وزاری کرتا ہے اور ندامت کی وجہ سے خوف وخشیت کے آنسو بہاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور یہ مومن کا ایسا وصف ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا مانگی ہے۔ چنانچہ آپ کی دعاؤں میں یہ دعا بھی منقول ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ هَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدُّمُوْعِ مِنْ خَشْیَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَكُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَّ الْاَضْرَاسُ جَمْرًا﴾

(الجامع الصغیر للسیوطی: ج: ۱، ص: ۵۹)

(وفی روایة تسقیان القلب بذروف الدمع کما فی المناجات المقبول)

اے اللہ! مجھے ایسی دو آنکھیں عطا فرما جو خوب آنسو بہانے والی ہوں صرف آنسو بہانے والی آنکھوں کی دعا نہیں مانگی گئی بلکہ مبالغہ کے طور پر بہت زیادہ آنسو بہانے والی آنکھیں کیونکہ ھطا لۃ مبالغے کا صیغہ ہے۔ چنانچہ جب ہم احادیث شریفہ میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کے سلسلے میں روایات کھول کے دیکھتے ہیں تو ان آنسوؤں کی فضیلت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر دنیا کے سارے سمندروں کا پانی کسی جہنمی کی آگ کو بجھانے کے لیے کام میں لایا جائے تو وہ آگ نہ بجھ سکے گی لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرنے والے آنسوؤں کا ایک قطرہ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کردیتا ہے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان آنسوؤں کے قطروں کو شہید کے خون کے قطروں کے برابر قرار دیا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ دو قطرے بارگاہِ الٰہی میں بہت پسندیدہ ہیں نمبر۱...... اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہنے والے خون کا قطرہ نمبر۲...... اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرنے والے آنسوؤں کا قطرہ۔

مبارک ہیں وہ لوگ جن کو ایسی آنکھیں عطا ہوئی ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف میں آنسو بہاتی ہیں اور کتنے قابل حسرت اور افسوس ہیں وہ شقاوتِ قلبی والے لوگ جو اس نعمت وسعادت سے محروم رہے اور دنیا کی کسی لیلیٰ اور محبوب ومحبوبہ کے چکروں میں پڑ کر شقاوتِ قلبی کا شکار ہوگئے اور گو کہ ان کو غمِ فراقِ لیلیٰ میں رونا اور تڑپنا میسر ہوا اور اپنے بستروں پر ان کی جدائیگی کے صدمے میں کروٹیں بدل بدل کر رات گذارنے کی زحمت اٹھانی پڑی مگر اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کی سعادت میسر نہ ہوئی اور دراصل غیر کو دل دینے کی یہ سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رونا میسر نہیں ہوتا کیونکہ اس کے دل کو سخت کردیا جاتا ہے اور قلب کی حالت اتنی خراب ہوجاتی ہے کہ ایک موقعہ پر دارالعلوم آزادول جنوبی افریقہ میں حضرت والا دامت برکاتہم نے اس گناہ یعنی عشق مجازی کی نحوست ولعنت کو ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس گناہ کے نتیجے میں دل کا قبلہ بدل جاتا ہے کہ

انسان نماز میں کھڑا ہوا ہے مگر اس کا دل اپنے محبوب اور محبوبہ کے اردگرد چکر لگاتا رہتا ہے اور دل دل میں اس کے پاس پہنچ کر اس سے باتیں کرتا رہتا ہے اور نماز میں دل نہیں لگتا نہ مناجات اور دعاؤں میں لذت میسر آتی ہے ذکر و تلاوت طبیعت پر دشوار ہوتی ہے نیکی کی طرف دل مائل نہیں ہوتا غرض کہ اس کے خود دنیا میں اس قدر نقصانات ہیں کہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہی اس کو دوزخ کا عذاب محسوس ہونے لگتا ہے اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں جیتا ہے اس لیے جو لوگ اس طرح کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں کو خشک کر دیتے ہیں اور یہ آنکھوں کا خشک کر دیا جانا بطور عذاب کے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو یہ نعمت گریۂ وزاری میسر ہوتی ہے اسی کے نتیجے میں جو لوگ ان کی صحبت میں رہتے ہیں اور چھلکتے ہوئے پیمانوں کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں تو اس کی برکت سے انہیں بھی یہ نعمت عطا کر دی جاتی ہے جیسا کے ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کی خدمت میں ایک طویل مدت تک رہ کر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔

اولیاء اللہ کی استغراقی حالت کا راز

ہم نے دیکھا ہے ترے سوختہ سامانوں کو
سوزشِ غم سے تڑپتے ہوئے پروانوں کو

تمام اللہ والوں کی یہ صفت، مشترک صفت ہے کہ وہ ظاہری ٹپ ٹاپ اور زیب و زینت میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحات ضائع نہیں کرتے ظاہری بے سروسامانی اور چاک گریبانی کے عالم میں رہتے ہوئے اصل دولتِ دوجہاں سے مالا مال رہتے ہیں اور دریائے محبتِ خداوندی میں ایسے غرق رہتے ہیں کہ کبھی کبھی اس استغراقی کیفیت میں اپنے نام تک کو بھول جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالغنی پھول پوری رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ ان کا خادم کسی چیز پر ان سے دستخط کرانے کے لئے حاضر ہوا تو دیر تک حضرت اپنا نام سوچتے رہے اور پھر اخیر میں اپنے خادم سے پوچھا کہ میرا نام کیا ہے اس پر خادم نے حضرت کا نام بتایا تو پھر دستخط فرمائے۔

اور یہ کمال استغراق خود نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ سے ثابت ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا مَنْ اَنْتِ؟ تو کون ہے حضرت عائشہ نے اپنا نام بتایا کہ میں عائشہ ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا من عائشة؟ فرمایا بنت ابی بکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سوال کیا من ابو بکر؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا ابن ابی قحافة۔

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گذر ہوا اور حضرت عمر نے سلام کیا مگر حضرت عثمان نے جواب نہیں دیا حضرت عمر اس کی شکایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے حضرت عثمان نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا ہے۔ چنانچہ وہاں دونوں حضرات جمع ہوئے اور

حضرت ابوبکر نے حضرت عثمان سے یہ سوال کیا کہ آپ نے حضرت عمر کے سلام کا جواب نہیں دیا تو حضرت عثمان نے عرض کیا کہ انہوں نے مجھے سلام نہیں کیا ہے غرض اپنی جگہ پر دونوں سچے تھے مگر سلام کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی دنیا سے رحلت فرما جانے سے پیدا ہونے والے صدمے اور غم میں مبتلاء تھے اور ایک گہری سوچ اور فکر میں مستغرق تھے۔

میرا منشاء ان واقعات کو ذکر کرنے سے یہ ہے کہ اللہ والے اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا کسی اور اہم دینی فکر میں کبھی کبھی اتنے مستغرق اور ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں اس وقت بجز مشاہدۂ حق کے نہ تو کچھ نظر آتا اور نہ ہی کچھ سنائی دیتا ہے اور یہ بات جب ہی حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے دل سے غیرِ حق تعالیٰ کو بالکل صاف کر چکے ہوں اور ظاہری سامانِ عیش وعشرت کے لحاظ سے بالکل بے سروسامانی کی حالت میں ہوں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم اپنے سینے میں لئے ہوئے اللہ تعالیٰ پر فدا ہو رہے ہوں اور جس طرح شمع کی خاطر پروانہ جان دینے کو تیار رہتا ہے وہ بھی اسی طرح پروانہ وار اپنے اللہ تعالیٰ پر سب کچھ لٹانے کو تیار ہوں اور خوش قسمت ہے وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ کے ایسے دیوانوں کی صحبت میسر آ جائے اسی کو حضرت والا فرماتے ہیں کہ بحمد اللہ مجھے ایسے سوختہ جانوں اور اللہ تعالیٰ کے پروانوں کی صحبت وخدمت میسر ہوئی اور ان کی دعائیں اور توجہات حاصل ہوئیں۔

دولتِ کونین بھی خدا تعالیٰ کی قیمت نہیں

ہم فدا کرنے کو ہیں دولتِ کونین ابھی
تو نے بخشا ہے جو غم ان پھٹے دامانوں کو

یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب بندے کو حاصل ہو جائے اور اس کی محبت نصیب ہو جائے یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ مل جائے تو اس کے بدلے دونوں جہاں بھی فدا کر دیے جائیں تو وہ کم ہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ بندے کا اپنے مولیٰ پر دونوں جہان فدا کر دینا بھی اس کے حق کی ادائیگی کے لیے ممکن نہیں اگرچہ ہمارے پاس دونوں جہاں سے بڑھ کر فدا کرنے کو کچھ نہیں ہے اس لئے کہ مخلوق کو خالق سے کیا نسبت ہو سکتی ہے کسی کو خالقِ دونوں جہان مل جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہر نعمت حاصل ہو گئی اور اس کی ہر تمنا پوری ہو گئی جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس لئے جو بندہ اللہ پر دونوں جہان فدا کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنا کچھ بھی اللہ پر فدا نہیں کر رہا ہے کیونکہ اس کی جان ومال اس کے دولت وخزانے اس کی تمام نعمتیں اور راحتیں خدا تعالیٰ ہی کی تو عطا ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا بے انتہا کرم ہے کہ اس کریم نے خود یہ جان ومال ہمیں دے کر جنت کے بدلے میں ہم

سے ان کو خرید لیا ہے اور فرما دیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت: ۱۱۱)

ترجمہ: اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔

(معارف القرآن، جلد: ۴، صفحہ: ۴۶۵)

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ آپ نے کسی کے پاس کوئی کتاب امانت کے طور پر رکھی اور پھر چند دن کے بعد آپ اس سے آ کر اس کتاب کو سو روپے میں خرید رہے ہیں حالانکہ وہ کتاب آپ کی نہیں ہے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ اس خریدار کی طرف سے فضل کا معاملہ ہے اور اس انداز سے آپ کو سو روپے دینا مقصود ہے بس یہی معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ساتھ فرمایا کہ جان و مال خود عطاءِ الٰہی اور اللہ کی دی ہوئی امانت ہے اور پھر اللہ نے ہم سے خرید کر جنت کا وعدہ فرمالیا تو خلاصہ یہ نکلا کہ اس بہانے اللہ ہم کو جنت دینا چاہتے ہیں اسی لیے مولانا رومیؒ نے ارشاد فرمایا کہ اے اللہ دونوں جہان فدا کر کے بھی آپ ملتے ہوں تو یہ آپ کی قیمت نہیں ہے آپ سستے معلوم ہوتے ہیں۔

ایک قیمتی نصیحت

صاحبو! ہمارا مہربان اللہ کس قدر رحیم و کریم ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ پر وہ سب کچھ فدا کردے جس کا وہ مالک ہے جان و مال اور دولت و منصب ظاہری عزت و آبرو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایسا اجر لکھتے ہیں کہ گویا اس نے دونوں جہان کی ساری نعمتیں اللہ پر قربان کر دیں بس دل میں اتنی تڑپ اور لگن رہے اور یہ جذبہ و ولولہ موجود ہو کہ اگر مجھے ساری کائنات کی بادشاہت بھی ملجائے اور ہر طرح کی نعمت و راحت میسر آ جائے اور بڑی اونچی بادشاہت و حکومت حاصل ہو جائے پھر اللہ کے کسی حکم کی خاطر اس کو قربان کرنا پڑے تو میں اسی طرح قربان کر ڈالوں گا جیسا کہ معمولی مال و دولت کو قربان کر رہا ہوں تو پھر اسے اللہ تعالیٰ ویسا ہی اجر دیتے ہیں اس لئے ہم سب کے لئے اس میں یہ عظیم الشان نصیحت ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہو ہم اس کو اللہ پر فدا کر دیں اور یہ تمنا رکھیں کہ اور بھی جو کچھ حاصل ہوگا اور حکمِ الٰہی کا تقاضہ سامنے آئے گا تو اسے بھی بلا تأمل راہِ خداوندی میں صرف کر دینگے تو پھر ہمارا اشمار باعتبار اجر و ثواب مقام اور مرتبے کے دولتِ کونین فدا کرنے والوں میں ہوگا۔

یہی تو وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو مال غزوۂ تبوک کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش فرمایا تھا وہ اس مال سے کم تھا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پیش کیا تھا مگر کیا وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام اور مرتبہ زیادہ قرار پایا؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنا سب کچھ پیش کر دیا تھا جو ان کے پاس تھا اور جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم نے اپنے گھر میں کیا چھوڑا تو جواب عرض کیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول کو گھر میں چھوڑا ہے جب کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ

نے جواب عرض کیا کہ آدھا مال گھر میں چھوڑا اور آدھا لے کر آیا ہوں لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ اگرچہ مقدار اور کمیت میں قلیل ہو مگر اللہ پر سب کچھ قربان کر دینا قربانی و جانثاری اور اخلاص وللّٰہیت میں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

خلوتِ غارِ حرا سے ہے طلوعِ خورشید
کیا سمجھتے ہو تم اے دوستو ویرانوں کو
اہلِ دنیا تو چمن میں ہیں گلوں کے بندے
ان کے دیوانے تو جاتے ہیں بیابانوں کو

ان اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم نے بہت عظیم الشان نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ابتدا کا زمانہ تھا کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کئی کئی دنوں کے لئے غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور آبادی وبستی سے دور پہنچ کر پہاڑ کی چوٹی پر ایک ویرانے میں خلوت ویکسوئی اختیار فرماتے تھے وہیں سے آفتاب و ماہتابِ نبوت طلوع ہوا۔

اسی لیے اہل اللہ اور خاصانِ خدا عام طور پر دنیا کی ظاہری زیب وزینت اور چمک دمک اور رنگ و رونق لیے ہوئے مقامات اور سامانِ عیش وعشرت سے مزین بنگلے اور محلات کو پسند نہیں فرماتے بلکہ ایسی جگہیں کہ جو ظاہری طور پر ویران و بیابان ہوں لیکن اللہ کے ذکر اور یادوں سے آباد ہوں اور علائق دنیویہ سے خالی ہوں ان میں رہنا پسند فرماتے ہیں۔ کیونکہ وہ جگہیں اللہ کے ذکر وتسبیح اور تلاوت ومناجات توبہ واستغفار، گریہ وزاری، آہ وفغاں کی برکت سے رشکِ گلشن ہو جاتی ہیں چنانچہ ہمارے اکابر بزرگانِ دین ہمیشہ سیدھی سادی زندگی کو پسند فرماتے تھے مگر ان بوریا نشین اولیاء اللہ کی عزت وعظمت بارگاہ رب العزت میں اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دنیا کے اصحابِ دولت وثروت بڑی تواضع اور عاجزی نیازمندی کے ساتھ ان کے پاس حاضر ہوتے اور ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے جیسا کہ خود آج کل بھی اہلِ حق مشائخ کی اللہ کی طرف سے ایسی ہی قدر ومنزلت دیکھنے میں آتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ان باتوں سے کوئی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ اللہ والا وہی ہوتا ہے جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر جنگل و بیابان کا رخ کرے اور صحرا اور پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا لے اور اس کے خلاف بستی وآبادی قصبوں اور شہروں میں رہنے کو للّٰہیت اور بزرگی کے خلاف جانے دراصل حضرت والا کا منشاء ان اشعار میں یہ نہیں ہے بلکہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ اہل اللہ کے قلوب دنیا کے چمن اور گلشن اور گلستان و بوستاں کے ساتھ جڑے ہوئے نہیں ہوتے اس لیے اللہ کے ساتھ تعلق میں اور ادائے بندگی پیش کرنے میں ان چیزوں کا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ان کے قلوب ان چیزوں سے مانوس ہوتے ہیں نہ انہیں اس طرف رغبت ہوتی ہے جیسا کہ اہل دنیا انہی چیزوں

کے ساتھ دلوں کی وابستگی کی وجہ سے وابستہ اور جڑے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے جو اولیاء اللہ عمدہ مکانات اور اعلیٰ درجے کے محلوں میں رہتے ہوں ان سے بدظن نہیں ہونا چاہیئے اس لیے کہ ان کا دل ان کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک بزرگ کے یہاں کوئی زیارت کرنے کے لیے حاضر ہوا جب اس نے ان کے حالات دیکھے اور ظاہری طور پر آسائش والے انداز نظر آئے تو وہ ان سے بدظن ہوگئے اور باہر ان کے دروازے پر شعر لکھا۔

نہ مرد انست کہ دنیا دوست دارد

جب ان بزرگ کو خادم کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے باہر دروازے پر یہ شعر لکھا ہے تو انہوں نے خادم سے فرمایا کہ اس کے نیچے یہ مصرعہ لکھ دو۔

اگر دارد برائے دوست دارد

جس کا حاصل یہ ہوا کہ بے شک یہ تو صحیح ہے کہ جو رجال اللہ اور مردانِ خدا ہوتے ہیں وہ دنیا کو دوست نہیں رکھتے لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہے کہ اگر وہ دنیا کو رکھتے ہیں تو دوست کے لئے رکھتے ہیں اپنے نفس کی حرص و ہوا کے تحت اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں رکھتے نہ ہی لطف اندوزی، عیش پسندی ان کا مقصود ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ اہلِ دنیا کی نگاہوں میں اپنی عزت و وقعت تلاش کرتے ہیں۔

دنیا پر راضی و مطمئن ہو جانا مومن کی شان نہیں

اہلِ دنیا کو ہے راس آئی یہ فانی دنیا
نعرۂ عشق و محبت ترے مستانوں کو

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مشرکوں کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی ہے کے وہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی پر راضی اور مطمئن رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ﴾

(سورۃ یونس، آیت:۷)

ترجمہ: البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن ہوگئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۵۰۸)

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دنیوی زندگی کی عیش و عشرت پر راضی و مطمئن ہو جانا یہ ان لوگوں کا خاصہ ہے جو نہ تو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اللہ سے ملنے کا ان کو یقین ہے اس لیے وہ سب کچھ اسی دنیوی زندگی کو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والا نے ایک بیان میں ذکر فرمایا کہ ایک انگریز سے کسی نے یہ سوال کیا کہ تم کس لیے کھاتے پیتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا زندہ رہنے کے لیے پھر جب اس سے پوچھا کہ تم کس لیے جیتے ہو تو اس نے جواب دیا کھانے پینے اور عیش کرنے کیلئے۔ جب کہ مومن اشیاء دنیا کو استعمال کرتا ہے اپنے زندہ رہنے

کے لئے لیکن خود اس کی زندگی، مالکِ زندگی پر فدا ہونے کے لیے ہوتی ہے اس لیے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اے مسلمانوں تمہارا مرنا جینا صرف اللہ کے لیے ہو اور عقل مندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جس نے حیات بخشی ہے اور اس کی بقاء کے لیے سامانِ حیات عطا کیا ہے اسی خالقِ حیات پر قربان ہونا چاہیے یہی اس کے دیوانوں اور مستانوں کی سوچ اور فکر ہوتی ہے اور یہی ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے اگر دنیا کم ہو تو بھی وہ ایسے ہی راضی بہ رضا رہتے ہیں جیسا کے دنیا کی بہتات اور کثرت کی صورت میں ان کے دل میں بڑائی اور تکبر کا گذر نہیں ہوتا۔

مردہ حسینوں پر مرنا کرگس کی خصلت کا ترجمان ہے

حسنِ فانی بتاں پر مرے کرگس لیکن
آہ صحرا ہو مبارک ترے دیوانوں کو

حضرت والا اپنے کلام میں بتوں کا لفظ نامحرم عورت اور حسین امرد لڑکے کیلئے استعمال فرماتے ہیں اور یہ تعبیر حضرات صحابۂ کرام کے کلام میں خواہشات نفسانی کی اتباع کے لیے استعمال کی گئی جیسا کہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ذم الھویٰ میں ذکر کیا ہے اسی طرح قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی اتباع کرنے کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَرَاَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ ﴾
(سورۃ الجاثیۃ، آیت: ۲۳)

ترجمہ: بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرا لیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۷۸۵)

یعنی جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا مطلب یہی ہے کہ ان کی اتباعِ عشقِ مجازی کے متعلق یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ یہ خصلت ایسی ہے جیسی جانوروں میں سے گدھ کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی غذا کے لیے مردار ڈھونڈتا پھرتا ہے اور جہاں اسے مردار نظر آئے تو اس پر مرمٹتا ہے ظاہر ہے جتنے حسین معشوق اور معشوقہ ہیں یہ بھی مر کر گلنے سڑنے والے ہیں تو ان پر جان دینے کی باتیں کرنے والا اور ان کی محبتوں میں مر مٹنے والا اس گدھ سے کم نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے بدتر ہے کیونکہ گدھ اپنی غذا کو استعمال کرتا ہے جو رب العالمین کی طرف سے اس کے لیے مقرر کی گئی اور اس کی وجہ سے اس پر نہ غضب الٰہی اترتا ہے اور نہ وہ اللہ کی ناراضگی کا مستحق قرار پاتا ہے جب کہ ایک مومن کی روح کی غذا اللہ نے اپنی یاد کو مقرر کیا اور اسے یہ تعلیم دی کہ وہ پاک ذات حی وقیوم پر جان دے اور اس پر فدا ہو اور اس کی یاد میں آہ وفغاں کر کے اپنی روح کو تازگی اور دل کو سکون بخشے تو جب وہ اس کے خلاف کرتا ہے تو مستحق عقاب وعذابِ خداوندی قرار پاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان مردار حسین وحسیناؤں پر مرنے والا نہ صرف یہ کے اپنی قبیح خصلت میں گدھ کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔

راہِ خداوندی دیوانگی سے طے ہوتی ہے فرزانگی سے نہیں

ہم نے دیوانوں سے سیکھی ہے محبت اخترؔ
ہائے یہ درد کہاں ملتا ہے فرزانوں کو

دورِ نبوت سے لے کر آج تک تاریخ میں دو طرح کے لوگ رہے ہیں ایک تو وہ لوگ جو اپنے اللہ اور رسول کی بات پر دیوانہ وار فدا ہوتے ہیں اور ان کو اپنی دنیوی مصالح کے فوت ہو جانے کا کوئی رنج و غم لاحق نہیں ہوتا بس ان کا ایک ہی نعرہ ہوتا ہے ۔

تیرے عشق میں کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

وہ اللہ اور رسول کی محبت میں ایسے مست ہوتے ہیں کہ دنیا کے اہل عقل ان کی دنیا فوت ہونے اور مفاداتِ دنیویہ کے متاثر ہونے پر انہیں کتنا ہی بے وقوف اور احمق و پاگل اور دیوانہ و مجنوں کہیں مگر وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے اور نہ ظاہر بیں عقل کی راہ سے چلنے والوں کے طعنہ و ملامت ان پر کچھ اثر ڈالتی ہیں بس یہی وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ کی راہ کے دیوانے ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں ایمان پہاڑ کے مانند مضبوط اور راسخ ہوتا ہے جس کی بدولت حق تعالیٰ انہیں اپنا خاص مقامِ قرب عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے پاس کسی نے آکر اپنے فرزند کے متعلق یہ شکایت کی کہ وہ جب سے آپ کے پاس آنا شروع ہو گیا تو بالکل بے کار اور خراب ہو گیا ہے اور اب کسی کام کا نہیں رہا جیسا کہ آج کل بھی بہت سے لوگ اپنی اولاد کو دین داروں سے اس لئے ملنے نہیں دیتے کہ وہ ان کے گمان میں بے کار ہو جاتے ہیں اور بگڑ جاتے ہیں حالانکہ یہ بگڑنا ہی حقیقت میں بننا ہے اور یہ بیکار ہونا ہی واقعی معنی کے اعتبار سے کارآمد ہونا ہے کیونکہ بزرگوں اور دین داروں کے پاس رہ کر ان کے دلوں کا رخ مخلوق سے خالق کی طرف اور کائنات سے رب کائنات کی طرف پھر جاتا ہے جو اصل کامیابی اور عقل مندی ہے مگر یہ راہ دیوانہ وار طریقے سے طے ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے ان کو یہ جواب دیا کہ میرے یہاں تو اسی طرح لوگوں کو بگاڑا جاتا ہے جسے ہزار بار اپنا بگڑنا منظور ہو بس وہ یہاں آئے ورنہ کہیں اور چلا جائے اور یوں فرمایا ۔

سو بار بگڑنا جسے منظور ہو اپنا
آئے وہ یہاں اور بہ چشم و بسر آئے
فرزانہ جسے بننا ہو جائے وہ کہیں اور
دیوانہ جسے بننا ہو بس وہ ادھر آئے

اور یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ چونکہ دین و دنیا کو جناب نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے دوسوکنوں

کی طرح قرار دیا ہے تو جب ایک آئے گی تو دوسری ضرور بھاگے گی اب یہ بندے پر ہے کہ وہ کس کو چاہتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ دین و دنیا کے تمام مفادات بیک وقت حاصل ہوتے رہیں اور ایک کی وجہ سے دوسرے متاثر نہ ہوں اور صحیح دانش مندی اور عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ آخرت کو اس کے دائمی ہونے کی وجہ سے ترجیح دے اور دنیا کو اس کے فانی و عارضی ہونے کی بنا پر چھوڑ دے یہی تمام انبیاء و اولیاء اور صلحا و اتقیاء کی دعوت اور ان کا مشن رہا ہے ۔حضرت والا نے کیا ہی پیارے انداز سے فرمایا۔

جس دنیا سے ہمیشہ کے لیے جانا
اور پھر لوٹ کر کبھی نہ آنا
اس دنیا سے دل کا کیا لگانا

اور فرمایا۔

میں نے مانا ہے بہار عارضی تجھ کو لذیذ
دائمی راحت کی خاطر عارضی راحت کو چھوڑ

اور جناب تائبؔ صاحب کا شعر ہے۔

ارے عقل مندو تم عاشق نہیں ہو
اگر ہوتے عاشق تو ہوتے دیوانے

مائل غم زندگی دیگراں کرتے ہیں ہم

دردِ دل سے جب کبھی آہ و فغاں کرتے ہیں ہم
اپنی آنکھوں سے بھی اک دریا رواں کرتے ہیں ہم

اپنے سجدوں سے زمیں کو آسماں کرتے ہیں ہم
اپنے اشکوں کو بھی رشکِ کہکشاں کرتے ہیں ہم

خاکِ تن میں دردِ دل کو جب نہاں کرتے ہیں ہم
اپنے آب و گِل کو رشکِ آسماں کرتے ہیں ہم

ان کے غم کی رفعتوں کو یوں بیاں کرتے ہیں ہم
مائل غم زندگی دیگراں کرتے ہیں ہم

اپنے ہر غم کو فدائے جانِ جاں کرتے ہیں ہم
اس طرح سے اپنے غم کو جاوداں کرتے ہیں ہم

رازِ دردِ دل کبھی دل میں نہاں کرتے ہیں ہم
بر سرِ منبر کبھی اس کو بیاں کرتے ہیں ہم

اپنا صحرا ان کے غم سے گلستاں کرتے ہیں ہم
اور خارستاں کو رشکِ بوستاں کرتے ہیں ہم

اہلِ دل کی صحبتوں سے اختؔر خستہ کو بھی
دل ملا ایسا کہ شرحِ دل بیاں کرتے ہیں ہم

مشکل الفاظ کے معنی:۔ **کہکشاں**: ستاروں کا جھرمٹ۔ **خاکِ تن**: بدن۔ **دردِ دل**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد۔ **نہاں**: چھپانا۔ **آب و گِل**: پانی اور مٹی، مراد بدن۔ **رشکِ آسماں**: یعنی آسمان پر رہنے والے فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ **رفعتوں**: بلندیوں۔ **فدائے جانِ جاں**: یعنی اللہ تعالیٰ پر فدا کرتے ہیں۔ **جاوداں**: ہمیشہ رہنے والا۔ **خارستاں**: جہاں کانٹے ہی کانٹے۔ **بوستاں**: باغ۔ **خستہ**:......۔

آہ وفغاں اور آنسوؤں کا دریا ترجمانِ دردِ دل ہے

دردِ دل سے جب کبھی آہ و فغاں کرتے ہیں ہم
اپنی آنکھوں سے بھی اک دریا رواں کرتے ہیں ہم

ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کبھی میں زبان سے آہ وفغاں کرتا ہوں تو اس کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بھی رواں ہو جاتا ہے یہ وہ چیز ہے جو تمام اولیاء واسلافِ امت کی غذا اور ان کا شیوہ وعادت رہی ہے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کثرت کے ساتھ موجود ہے کہ رات کے آخیر حصہ میں اکثر و بیشتر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اٹھ کر اپنے اللہ کو یاد کرتے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہاتے تھے ایک روایت کا مضمون ہے کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں ہوتے اور اس کثرت سے روتے تھے کہ آپ کے سینے مبارک سے رونے کی آواز اس طرح نکلتی تھی جس طرح ہانڈی میں پانی کے کھولنے کی آواز ہوتی ہے حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری فرماتے تھے کہ دعاؤں میں آنسوؤں کا نکل آنا قبولیت کی ضمانت اور اس کی نشانی ہے۔

قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے وقت اگر غور وتدبر سے دیکھا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ کئی ایک مقامات پر جہاں آیاتِ سجدہ آئی ہیں ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر یہ وصف ذکر کیا ہے کہ وہ میرے سامنے جھکتے ہیں اور میرے ہی سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں اور وہ میرے سامنے بڑی عاجزی اور تواضع کے ساتھ آہ وزاری کرتے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے امت کے تمام اولیاء کی خاص صفت رہی ہے حتی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے متعلق یہاں تک منقول ہے کہ وہ اتنا روتے تھے کہ بعضوں نے ان کی حالت دیکھ کر یہ کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جہنم کا خوف انہی دونوں کو ہے حضرت مولانا رومیؒ اسی بات کو بڑے عجیب انداز سے ارشاد فرماتے ہیں ۔

اے دریغا اشکِ من دریا بدے

یعنی میں اتنا اللہ کے خوف سے روتا کہ میرے آنسو روتے روتے دریا بن جاتے۔

سارے عالم کے نفسیاتی مریضوں کو احقر کا ایک اعلان

صاحبو! احقر خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے جس بندے کو اللہ تعالیٰ اپنے سامنے رلاتے ہیں تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کو دوسروں کے سامنے رلائے اور جسے اپنے در کا بھکاری بنا دیتے ہیں تو پھر خدا کی غیرت سے یہ بعید ہے کہ اس کے در کا بھکاری مخلوق کے دروں پر ٹھوکریں کھاتا پھرے اور جسے اپنا غم عطا فرماتے ہیں تو پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ اسے اس مادی دنیا کے چھوٹے چھوٹے فانی غموں میں مبتلاء کردیں اس لیے ایسے لوگ نہ کبھی رسوا و ذلیل ہوتے اور نہ وہ پریشان ومحروم ہوتے اور نہ ٹینشن وڈیپریشن (Tension& Depression) کے بیمار ہوتے

ہیں جس کا آج گھر گھر گلہ وشکوہ ہے خدا کے ایسے بندوں سے یہ سب الجھنیں اور پریشانیاں دور کردی جاتی ہیں ذرا کوئی اس کا مزہ چکھ کر تو دیکھے ہمارے ایک دوست نے اس موقعہ کی مناسبت سے بڑی قیمتی بات فرمائی کہ دنیا کے ان ممالک میں جہاں لوگ خودکشیاں کررہے ہیں اور اس کے لئے مختلف مقامات بنائے گئے ہیں کاش کوئی جا کے وہاں یہ تختی (Board) آویزاں کردے کہ آؤ تمہیں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ گلشن اقبال کا ایڈریس دیتے ہیں وہاں چند دن گزار کر پھر اپنی خودکشی کے ارادے پر نظر ثانی کر لینا احقر اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے اور واقعات و تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کے تذکروں میں اور اس کی محبت کی باتوں میں اسے ایسا سکون میسر آئے گا کہ وہ فوراً ان خیالات سے تائب ہوجائے گا اور اس کی زندگی کا رخ یکسر تبدیل ہوجائے گا جیسا کہ بہت سے ایسے لوگ اس خانقاہ میں رہ کر سکون پا چکے ہیں اور بہترین پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

اپنے سجدوں سے زمیں کو آسماں کرتے ہیں ہم
اپنے اشکوں کو بھی رشکِ کہکشاں کرتے ہیں ہم

جب اللہ والے اپنی پیشانی زمین پر رکھ کر بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زمین پر آنسو گرتے ہیں تو اس وقت میں وہ فرش پر ہوتے ہوئے عرش سے رابطہ کئے ہوتے ہیں اور زمین پر ہوتے ہوئے آسمان کو چھوتے ہیں کیونکہ مومن حالتِ سجدہ میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ اپنے سجدوں کے ذریعے ہم زمین کو آسمان کردیتے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے آنسو آسمان میں چمکتے ہوئے کہکشاں ستاروں کے لیے قابل رشک ہوجاتے ہیں جس طرح آسمان پر وہ ستارے چمکتے ہیں اسی طرح اللہ رب العزت کی نگاہ میں زمین کے اوپر گرے ہوئے یہ اشک ندامت چمکتے رہتے ہیں جیسا کہ حضرت والا کا ایک دوسرے مقام پر شعر ہے ؎

جو گرے ادھر زمیں پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اٹھا فلک پر مری بندگی کا تارہ

اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان آنسوؤں اور اشک ہائے ندامت سے حاصل ہونے والی تجلیات اور انوارات دل کو ایسا روشن اور چمک دار بنادیتے ہیں کہ اس کی روشنی اور چمک کے سامنے آسمان میں چمکنے والے ستاروں اور آفتاب و ماہتاب کی بھی کوئی حیثیت نہیں اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں آنسوؤں کو ستاروں کے برابر قرار نہیں دیا بلکہ رشکِ کہکشاں فرمایا ہے کیونکہ ان آنسوؤں سے بندہ کو توبہ کی حقیقت حاصل ہوتی ہے جس کہ نتیجہ میں بتصریح حدیث شریف قلب میں آنے والے سیاہ اور کالے نکتے زائل ہوجاتے ہیں اور دل چمک اٹھتا ہے اور ایسے ہی دل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے سمانے کی جگہ قرار دیا ہے جیسا کہ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

در دلِ مومن بگنجیدم چوں ضیف

میں مومن کے دل میں مہمان کی طرح سما جاتا ہوں اور بعض احادیث شریفہ میں بھی یہ مضمون صراحت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

کائنات کی کوئی چھوٹی یا بڑی شے ایمان کے برابر نہیں

خاکِ تن میں دردِ دل کو جب نہاں کرتے ہیں ہم
اپنے آب و گل کو رشکِ آسماں کرتے ہیں ہم

یوں تو انسان کی بذاتِ خود کوئی قیمت نہیں لیکن جب اس جسد خاکی میں اللہ تعالیٰ کی محبت آ جائے اور بقول حضرت والا اس خاک تن میں دردِ دل حاصل ہو جائے تو پھر یہ آب وگل رشکِ آسمان بن جاتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہئے کہ پھر اس کی ایسی قیمت ہوتی ہے کہ سارے زمین و آسمان اور اس کے اندر کے تمام خزانے کئی گنا زیادہ کر کے بھی اگر ایمان کا عوض بنایا جائے اور بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے تو وہ قبول نہ ہوگا اسی لیے جو انسان ایمان سے خالی بحالت کفر دنیا سے رخصت ہو جائے گا تو قیامت کے دن اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾
(سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۶)

ترجمہ: جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو، تاکہ بدلہ میں دیں اپنے قیامت کے دن عذاب سے، تو ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے۔
(معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۱۲۴)

اس سے ہم ایمان کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اگر ہم مختصر لفظوں میں یہ کہہ دیں کہ کوئی بھی چھوٹی یا بڑی چیز اس کا بدلہ نہیں بن سکتی اس لئے یہ اہل ایمان اور اہل محبت اس ایمان و محبت کی وجہ سے رشکِ آسمان ہوتے ہیں۔

از دل خیزد بر دل ریزد

ان کے غم کی رفعتوں کو یوں بیاں کرتے ہیں ہم
مائل غم زندگی دیگراں کرتے ہیں ہم

جس وقت حضرت والا دامت برکاتہم اللہ کی محبت کی داستان چھیڑتے ہیں اور اپنے محبوب حقیقی رب کائنات کی راہ میں اٹھائے جانے والے غموں کی رفعتوں اور بلندیوں کو پیش کرتے ہیں تو حضرت والا کو حق تعالیٰ کی طرف سے ایسی زبانِ ترجمانِ دردِ دل عطا ہوتی ہے اور ایسا اندازِ بیان نصیب ہوتا ہے کہ گنہگاروں اور غفلت میں پڑے لوگوں کی زندگیوں میں یک دم تبدیلی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں کیوں کہ دراصل بات یہ ہے کہ تاثیر عمل سے پیدا ہوتی ہے تو حضرت جس بات کو پیش فرماتے ہیں اور جو دردِ محبت بیان کرتے ہیں خود اس کو اپنے سینے میں نہاں

رکھتے ہیں اس لیے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہ ہو طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دردِ محبت جس کو بھی نصیب ہوا ہے وہ اہلِ درد کی صحبت اور ان کی خدمت سے ملا ہے کیونکہ مثل مشہور ہے کہ ''دل را بہ دل راہ ست'' کہ دل کو دل سے راستہ ہوتا ہے یہ چیزیں محض کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی اسی لئے بخاری شریف کی روایت ہے:

﴿ اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ ﴾

(شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس فی جواب)

یعنی العلم المعتبر مراد یہ کہ اللہ کی بارگاہ میں جو علم معتبر ہے وہ تعلم اور سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے محض کتابوں کے پڑھنے سے کوئی عالم نہیں بن سکتا جس طرح دنیا میں دوسری چیزیں سیکھنی پڑتی ہیں اسی طرح علم ومعرفت اور دردِ محبت اہلِ محبت سے سیکھنا پڑھتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے جنہوں نے محض کتابیں پڑھ کر علامہ بننا چاہا گو کہ وہ کتنے ہی ذہانت وزکاوت کے مالک تھے لیکن بلاخر وہ راہ راست اور صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور افراط وتفریط کا شکار ہو گئے یا تو حد درجہ شخصیت پرستی آ گئی یا امت کے تمام بزرگوں سے ہٹ کر ان پر اعتماد نہ کر کے دین کے سلسلے میں ایک نیا راستہ ایجاد کر دیا اس لیے صحیح طریق اللہ کی محبت سیکھنے کا یہ ہے کہ جو لوگ اپنے قلوب میں محبت ومعرفت خداوندی کا خزانہ رکھتے ہیں ان کی صحبت اختیار کی جائے تو بڑی جلدی زندگی میں تبدیلی آتی نظر آئے گی اور منزل جلد حاصل ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی راہ کا غم ہمیشہ کی خوشی میں تبدیل ہو جاتا ہے

اپنے ہر غم کو فدائے جانِ جاں کرتے ہیں ہم
اس طرح سے اپنے غم کو جاوداں کرتے ہیں ہم

دنیا اور اس کی چیزوں کی محبت اور اس سے تعلق ایک دن مٹ کر ختم ہو جائے گا کیونکہ خود وہ چیزیں فنا وختم ہونے والی ہیں لیکن جو لوگ اپنے سینے میں اللہ کی محبت رکھتے ہیں اور اس کو راضی کرنے کا غم رکھتے ہیں یہ ایسی دولت ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ہے اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے سارے غموں کو چھوڑ کر بس اپنا ایک غم بنالیا اور وہ ایسا غم ہے کہ جو ہمیشہ ساتھ رہے گا اور جس کے نتیجہ میں جنت کی ہمیشہ کی خوشیاں حاصل ہوں گی۔ ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم، ص:۳۷)

یعنی جو شخص اپنے سارے غموں کو ایک غم یعنی آخرت کا غم بنا لے اللہ تعالیٰ اس کو دنیا کے دوسرے غموں کی طرف سے کافی ہو جاتے ہیں اور آخرت کے غم بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک کونے میں بیٹھ کر ہاتھ میں تسبیح لے کر اللہ اللہ کرتا رہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قدم پر حکمِ خداوندی پیشِ نظر ہو خواہ گھر میں ہو یا باہر مکان میں ہو یا دکان میں آبادی میں ہو یا جنگل میں خلوت میں ہو یا جلوت میں ہر گھڑی اللہ کا حکم بجالائے جس چیز سے اللہ ناراض ہو اس کو چھوڑ دے مثلاً دکان میں کھڑا ہوا ہے سامان بیچتے وقت نہ جھوٹ بولتا ہے نہ دھوکہ دیتا ہے نہ سامان کی تعریف میں زیادہ مبالغہ کرتا ہے نہ سامان کو بیچتے ہوئے جھوٹی قسمیں کھاتا ہے حتیٰ کہ محض دنیوی مفاد کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاک نام کی سچی قسم سے بھی بچتا ہے تو ایسا بندہ اگرچہ دکان میں کھڑا ہوا ہو مگر حقیقت میں وہ غمِ راہِ خداوندی کا حامل ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذاکر ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے اگر جھوٹی قسم کھائی تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری جانب نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ جیسا کے حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

﴿ثَلٰثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ قَالَ اَبُوْ ذَرٍّ خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهٗ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب المساھلۃ فی المعاملات، ص: ۲۴۳)

تین قسم کے ایسے لوگ ہیں جن سے اللہ قیامت کے دن نہ تو کلام فرمائیں گے اور نہ ان کو نظرِ رحمت سے دیکھیں گے۔ نمبر (۱) اپنی ازار یا پاجامے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانے والا نمبر (۲) احسان جتلانے والا۔ نمبر (۳) اپنے سامان کو جھوٹی قسم سے بیچنے والا۔ اس لئے خواہ سامان فروخت ہو یا نہ ہو لیکن جھوٹی قسم نہیں کھانی چاہیے حتیٰ کے علماء نے لکھا ہے کہ محض دنیوی منفعت کے لئے سچی قسم بھی اگر کھائی جائے تو اس سودے کی برکت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ محض دنیوی منفعت کے لیے ہرگز قسم نہ کھائی جائے۔

غمِ راہِ خداوندی سب غموں کی طرف سے کافی ہے

راز دردِ دل بھی دل میں نہاں کرتے ہیں ہم
بر سرِ منبر کبھی اس کو بیاں کرتے ہیں ہم

اللہ والے اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم سینے میں اٹھائے رکھتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں اپنی شہرت اور ناموری کی کوئی تمنا نہیں ہوتی اس لئے ان کی حالت اس حدیث شریف کا مصداق ہوتی ہے:

﴿نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِي الدِّيْنِ اِنِ احْتِيْجَ اِلَيْهِ نَفَعَ وَاِنِ اسْتُغْنِيَ عَنْهُ اَغْنٰى نَفْسَهٗ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم، ص: ۳۶)

بہت اچھا ہے وہ عالم آدمی کہ جب لوگ اس کے علم کے ضرورت مند ہوتے ہیں تو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے اور جب لوگ اس سے بے نیازی اور لاپرواہی برتتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ان سے مستغنی کر لیتا ہے۔ اس لیے حضرت والا

ارشاد فرماتے ہیں کہ رازِ دردِدل کبھی تو ہم دل ہی میں چھپا کے رکھتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے اور لوگوں میں طلب ہوتی ہے تو اس کو برسرِ منبر بیان کرتے ہیں۔

صاحبو! اپنے بیانات اور تقریروں کے پروگرام بنانے کے سلسلے میں دل میں آرزو اور تمنا رکھنا اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس نیت سے یہ تمنا کرنا کہ لوگوں میں میرا نام پھیلے خوب شہرت اور چرچا ہو ہر طرف میری ہی تقریروں کا غلغلہ مچا ہو اور لوگوں کو پتہ چل جائے کہ میرے سینے میں کتنے علوم چھپے ہوئے ہیں اور میں کتنا دردِ دل رکھتا ہوں اس نیت سے یہ سارے دین کے کام اللہ کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور یہ نیت اخلاص کے منافی ہے۔

ہاں البتہ اسی کا دوسرا پہلو اور حیثیت یہ ہے کہ بندہ اللہ سے درخواست کرتا رہے کہ اے اللہ جو دین کی صلاحیت آپ نے مجھے عطا فرمائی ہے اس کے ذریعے سے مجھ سے کام لے لیجئے اور مجھے ایسے لوگوں میں پہنچا دیجئے جو آپ کے دین کی قدر کرنے والے ہوں تاکہ میں آپ کا دین ان تک پہنچا سکوں اور آپ کی دی ہوئی اس صلاحیت کا شکرادا کرسکوں اس حیثیت سے یہ عنداللہ مطلوب ہے اور تقربِ خداوندی کا ذریعہ ہے اسی لیے صفا و مروہ کے درمیان میں پڑھی جانے والی دعاؤں میں ایک دعا یہ ہے اے اللہ مجھے اپنے دین کے لئے استعمال فرما تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ خدمتِ دین کے لئے راستے کھولتے چلے جائیں گے اور آپ کو ایسے بندوں تک اور ان کو آپ تک پہنچا دیں گے ہمارا اور آپ کا کام اپنے کو گم کرنا اور مٹانا بعد میں اپنے اللہ سے مانگتے رہنا اور اس کے در کو کھٹکھٹاتے رہنا ہے جب اللہ ہماری مصلحت سمجھیں گے تو ایسے مواقع عطا فرمادینگے اپنے دل میں یہ سارا غیر اللہ بسانا نہیں چاہیے جب تک اللہ کی مصلحت نہیں ہے تو ہمیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے اور اللہ کی عبادت اور بندگی میں یکسوئی کے ساتھ مصروفِ عمل رہنا چاہیے در کا کھولنا ہمارا کام نہیں کھٹکھٹانا ہمارا کام ہے۔ اسی کو خواجہ صاحب نے یوں فرمایا۔

کھولیں وہ یا نہ کھولیں در
اس پہ ہو کیوں تری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر
یعنی صدا لگائے جا

یادِ خداوندی سے خارستان رشکِ گلستان ہوجاتا ہے

اپنا صحرا ان کے غم سے گلستاں کرتے ہیں ہم
اور خارستاں کو رشکِ بوستاں کرتے ہیں ہم

صحرا کا معنی یوں تو بیابان اور جنگل کے ہیں لیکن دراصل اس تعبیر کا منشاء یہ ہے کہ بے سروسامانی کے عالم میں ظاہری طور پر خستہ اور شکستہ صورتِ حال ہوتے ہوئے اور خزاں کا منظر نظر آتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی یادوں سے

اس کے صحرا کو گلستاں کر دیا جاتا ہے اور اس کے خزاں کو رشکِ بہار بنا دیا جاتا ہے اور اس کے خارستان کو دنیا کے گلستانوں اور بوستانوں سے زیادہ پُر بہار کر دیا جاتا ہے اس لئے عام طور پر اہل اللہ ظاہری طور پر خستہ حال انداز سے زندگی گزارتے ہیں ان کے رہنے سہنے کی جگہیں تکلّفات سے خالی ہوتی ہیں نہ تو ان کے بدن پر آثارِ تعیش نظر آئیں گے اور نہ ہی ان کے دسترخوانوں پر تنوع اور تکلف دکھائی دیتا ہے لیکن پھر بھی ان کو وہ لذتیں نصیب ہوتی ہیں اور جینے کا وہ مزہ ملتا ہے کہ جو سلاطینِ عالم کو بھی میسر نہیں وجہ صرف یہ ہے وہ اپنے سینوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت رکھتے ہیں اور جو لوگ اس کے بغیر زندگی گزارتے ہیں وہ دنیا کے گلستان اور چمنستان سے اور یہاں کی باغ و بہار سے صرف اپنے ظاہری جسم کو محظوظ کر سکتے ہیں روح کو نہیں کیونکہ روح کی غذا اللہ تعالیٰ نے ذکر اللہ کو قرار دیا ہے۔

صحبتِ مشائخ سے حاملِ درد ہو کر بیانِ درد کا مزہ

اہلِ دل کی صحبتوں سے اخترؔ خستہ کو بھی
دل ملا ایسا کہ شرحِ دل بیاں کرتے ہیں ہم

اس شعر میں ہمارے لیے دو اہم باتیں ہیں ایک تو یہ کہ حضرت والا اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ بندے کو جو کچھ بھی بزرگوں کی خدمت میں رہ کر حاصل ہوتا ہے اسے اپنے مجاہدات اور ریاضتوں کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے بلکہ ظاہری طور پر سبب کے درجہ میں اپنے بزرگوں اور مشائخ کا فیضِ صحبت سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ نے مجھ پر فضل فرمایا کہ مجھے شیخِ کامل کی صحبت میسر ہوئی اور ان کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا تعلق اور معرفت کی دولت حاصل ہوئی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ شعر میں خود اپنے لیے دعویٰ محبت و معرفت کیا جا رہا ہے حالانکہ یہ صحیح اور درست نہیں ہے اس لیے اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضرت تھانویؒ نے ارشاد فرمایا اگر کسی بندے کو حسی طور پر کوئی کمال حاصل ہو تو وہ اپنی طرف اس کمال کی نسبت بطور تحدیثِ نعمت کے کر سکتا ہے لیکن اس کی وجہ سے اپنے افضل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا چنانچہ انفاسِ عیسیٰ کتاب میں حضرت تھانویؒ کا یہ ملفوظ مذکور ہے کہ اپنے کو اکمل سمجھنا جائز ہے اور افضل سمجھنا حرام ہے جیسا کہ ایک حافظ غیر حافظ کے مقابلہ میں یا ایک ایسا ایک حافظ جو عالم بھی ہو صرف حافظ کے مقابلے میں اپنے کو اکمل سمجھے تو یہ جائز اور درست ہے لیکن افضل سمجھنا جائز نہیں کیونکہ اکمل کا تعلق محسوسات سے ہے اور افضل کا تعلق اللہ کے یہاں مقبول ہونے سے ہے اور یہ بات ہماری نگاہوں سے مخفی ہے جبکہ کسی کمال کا حصول ایک ظاہری اور واضح شے ہے اگر بندے کو اس کا بھی ادراک نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں ملنے کے باوجود وہ یہی سمجھتا رہے اور کہتا رہے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ ٹھیک بالکل اسی طرح اس موقعہ پر حضرت والا کا یہ ارشاد ہے اس لیے اس کو دعویٰ نہیں سمجھنا

چاہیے بس اتنی سی حقیقت ہے کہ جو معرفتِ قربِ خداوندی کی دولت جس درجہ عطا ہوئی اس پر اظہار شکر کرنا مقصود ہے۔

دوسری اہم بات جس طرف حضرت والا اشارہ فرما رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل بیان کا مزہ اور وعظ و نصیحت کی حلاوت جب ہی نصیب ہوتی ہے کہ وہ بیان محض رسمی تقریر اور قصہ گوئی نہ ہو بلکہ اندرونِ قلب اللہ کی حقیقی محبت کا درد و غم پیدا ہو جائے اور پھر اس کو ایسی بے تابی اور تڑپ کے ساتھ بیان کیا جائے کہ جس طرح ایک آدمی اگر جسمانی طور پر کسی درد و تکلیف میں مبتلاء ہو اور ڈاکٹر اس سے اس کی تکلیف جاننا چاہے تو اس کے بیان کرنے کے لیے اسے کسی تقریر کی مشق اور Practice نہیں کرنی پڑتی بلکہ بلا تکلف وہ خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے اندر کی درد و کڑھن ڈاکٹر کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

درحقیقت جب کوئی اہل دل منبر پر بیٹھ کر تقریر کرتا ہے تو ایسی ہی شرحِ دل بیان کرتا ہے اور جیسا کہ مثل مشہور ہے کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیۡهِ یعنی ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے اس لیے ایسے دل سے جو خود حاملِ دردِ محبت ہے زبانوں کے ذریعے وہی دردِ محبت ظاہر ہوگا اس لیے ہمیں وعظ و بیان سے پہلے اپنے دل کو اس قابل بنانا چاہیے تاکہ پھر حقیقت میں شرحِ دل کا بیان ہو سکے۔ ورنہ آج کل کی تقریریں محض رسمی تقریریں بن کر رہ جاتی ہیں۔

جمع ضدین خوشی و غم

رضائے دوست کی خاطر یہ حوصلے ان کے
دلوں پہ زخم ہیں پھر بھی یہ مسکراتے ہیں
عجیب مظہرِ اضداد ہیں ترے عاشق
خوشی میں روتے ہیں اور غم میں مسکراتے ہیں

اللہ اللہ عشق کی یہ بے زبانی دیکھئے

ہے زباں خاموش اور آنکھوں سے ہے دریا رواں
اللہ اللہ عشق کی یہ بے زبانی دیکھئے

حشر سے پہلے نہیں کرتے ہیں وعدہ دید کا
ربِّ ارنی پر جلالِ لن ترانی دیکھئے

لب خموشانِ محبت کی نگاہ پاک سے
اک نظر میں مردہ دل کی زندگانی دیکھئے

عاشقانِ زرد رو کی چشم نم میں صبح دم
ان کے جلووں کا یہ رنگِ ارغوانی دیکھئے

جلوہ گاہِ حق دلِ عارف کی آہِ گرم میں
بارگاہِ کبریاء کی ترجمانی دیکھئے

یوں تو عاشق بے زباں معلوم ہوتا ہے مگر
عشق کی تفسیر میں جادو بیانی دیکھئے

عاشقوں کا منبرِ دل پر بیانِ دردِ دل
وعظ میں آمیزشِ دردِ نہانی دیکھئے

داستانِ زخمِ دل اختؔر چھپاتا تھا مگر
روزِ محشر داغِ دل کی گل فشانی دیکھئے

مشکل الفاظ کے معنی:۔دید: زیارت۔ربّ ارنی: (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا) اے اللہ! مجھے اپنی زیارت کرائیے۔ لن ترانی: (تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ لب: ہونٹ۔ خموشانِ محبت: خاموش محبت۔زندگانی: زندگی۔زرد رُو: پیلا چہرہ۔چشم نم: آنسو سے تر آنکھ۔ ارغوانی:......۔عارف: اللہ والا۔بارگاہِ کبریاء: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ۔جادو بیانی: پُر اثر۔ آمیزش: شامل۔ دردِ نہانی: چھپا ہوا درد۔ گل فشانی:......۔

عشق کی بے زبانی آنسوؤں کے دریا کی صورت میں

ہے زباں خاموش اور آنکھوں سے ہے دریا رواں
اللہ اللہ عشق کی یہ بے زبانی دیکھئے

اس شعر میں حضرت والا نے اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایک خاص کیفیت و حالت کو ذکر فرمایا ہے کہ اللہ کے عاشقوں کی ایک خاص حالت یہ ہوتی ہے کہ زبان سے وہ خاموش رہتے ہیں لیکن آنکھوں سے ان کے آنسوؤں کا دریا بہتا رہتا ہے اور یہ اس محبت کی ترجمانی کرتا ہے جو ان کے سینے میں موجود ہے درحقیقت جب زبان خاموش ہوتی ہے تو دل لبریز ہوتا ہے اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم الشان صفت مبارکہ یہ تھی:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَوَاصِلَ الْاَحْزَانِ دَائِمَ الْفِكْرَةِ لَيْسَتْ لَهُ رَاحَةٌ طَوِيْلَ السَّكْتِ وَلَا يَتَكَلَّمُ فِيْ غَيْرِ حَاجَةٍ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذي)

یعنی دیر دیر تک آپ خاموش اور چپ چاپ رہتے تھے اور ہمیشہ دین اور امت کے بارے میں سوچ میں مبتلاء رہتے تھے حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رحمہ اللہ حضرت مولانا الیاس صاحب بانی جماعتِ تبلیغ کے متعلق یہ ارشاد فرماتے تھے کہ میں نے بہت سے مشائخ اور بزرگوں کو دیکھا ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وصف خاص سب سے زیادہ حضرت مولانا الیاس صاحب میں دیکھا کہ بہت غمگین اور سوچ وفکر میں خاموش رہا کرتے تھے لیکن دل کا حال وہی تھا کہ بڑے تڑپ تڑپ کے رات کی تاریکیوں میں یَا حَيُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اور تلاوت قرآن کے وقت آیات جہنم پر چہرے کا رنگ بدل جاتا اور خوب روتے تھے گو کہ حضرت مولانا رسمی مقرر اور واعظ نہیں تھے مگر ان آنسوؤں کے دریاؤں کے ذریعے سینے میں لگی ہوئی عشق کی آگ کا اس طرح اظہار فرماتے تھے کہ اسی میں بڑے بڑے صاحب زبان مقرروں کی تقریروں سے زیادہ تاثیر تھی۔ اسی لیے مشائخ اپنے متعلقین سے یہ فرمایا کرتے ہیں کہ بزرگوں کے پاس محض وعظ ونصیحت سننے کی نیت سے نہ جاؤ بلکہ ان کی زیارت و ملاقات کی نیت رکھو خواہ تقریر ہو یا نہ ہو کیونکہ ان کا بے زبان اور خاموش رہنا بھی پاس بیٹھنے والوں کے لیے نفع سے خالی نہیں ہوتا۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں

حشر سے پہلے نہیں کرتے ہیں وعدہ دید کا
ربِّ ارنی پر جلالِ لن ترانی دیکھئے

حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! مجھے اپنا دیدار کرا دیجئے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی گئی کہ اے موسیٰ تم دنیا میں رہتے ہوئے ان آنکھوں سے میرے دیدار کی طاقت نہیں رکھتے ہو اور اس کی صورت یہ اختیار فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر اپنی خاص تجلّی ڈالی اور حضرت موسیٰ علیہ

الصلاۃ والسلام کو حکم دیا کہ اس کی طرف نظر ڈالو اور دیکھو اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ برقرار رہ جائے تو تم مجھے دیکھ سکو گے لیکن جب اللہ نے اس پہاڑ پر تجلّی ڈالی تو وہ چورا چورا ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام بے ہوشی کی حالت میں گر پڑے اس لیے دنیا میں تو اللہ کا دیدار ممکن نہیں لیکن آخرت میں اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کا دیدار عطا ہوگا جیسا کہ قرآن وحدیث کی مختلف نصوص اس پر دلیل ہیں اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ گمراہ ہیں ہاں البتہ خواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت خاص تجلیات کے ساتھ ممکن ہے جیسا کہ بعض بزرگوں کے صحیح اور سچے واقعات اس سلسلے میں منقول ہیں ایک واقعہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ آپ کا قرب سب سے زیادہ کس چیز کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے تو جواب ملا کہ میرے کلام کے ذریعے سے پھر امام صاحب نے یہ سوال کیا کہ سمجھ کر پڑھنے سے یا بلا سمجھے تو ارشاد ہوا کہ خواہ سمجھ کر پڑھے یا بلا سمجھے مگر ظاہر ہے خواب میں اللہ کے دیدار سے مراد اللہ کی تجلّی کا دیدار ہے۔

اگر نظرِ بد کی تاثیر مسلّم ہے تو نظرِ حق کی تاثیر سے انکار کیسا؟

لب خموشان محبت کی نگاہِ پاک سے
اک نظر میں مردہ دل کی زندگانی دیکھیے

جو لوگ اہل دل اللہ والے ہیں ان کے پاس محض بیٹھنا بھی نفع سے خالی نہیں خاموش رہنے کے باوجود ان کی نظر پڑھنا زندگیوں کی کایا پلٹ دیتا ہے اور مردہ دل کو زندگی بخش دیتا ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اَلْعَیْنُ حَق والی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اگر نظر بد کا لگنا حق ہے تو اہل اللہ کی نظر محبت کا لگنا کیوں حق نہ ہوگا اور اگر نظر بد سے مزاج اور طبیعت میں تغیر وتبدیلی پیدا ہو سکتی ہے تو کسی عارف ولی کامل کی نظر سے کیوں دلوں میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی اسی کو ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنَّهٗ مِنْ حَيْثُ التَّاْثِيْرِ الْاِكْسِيْرِ يَجْعَلُ الْكَافِرَ مُؤْمِنًا وَّالْفَاسِقَ صَالِحًا وَّالْجَاهِلَ عَالِمًا وَّالْكَلْبَ اِنْسَانًا﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الطب والرقی، ج: ۸، ص: ۳۴۵، المکتبۃ التجاریۃ، مکۃ المکرّمۃ)

اور ایک روایت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے یہ بات منقول ہے کہ:

﴿اَلنَّظَرُ اِلَيْكَ وَ الْجُلُوْسُ بَيْنَ يَدَيْكَ وَ اِنْفَاقُ مَالِيْ عَلَيْكَ﴾

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تین چیزیں بہت پسند ہیں نمبر ایک آپ کا دیدار کرنا اور آپ کی مجلس میں سامنے بیٹھنا اور آپ کے اوپر اپنا مال خرچ کرنا! غور فرمائیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تقریر اور بیان سننے کی بات نہیں ذکر کی اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صرف سامنے بیٹھنا اور نائبینِ انبیاء علمائے کرام کی زیارت کرنا کس قدر اہم اور قیمتی چیز ہے چنانچہ ایک مرتبہ احقر کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ہم چند ساتھی دہلی میں حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے تو ایک شخص ہم سے پوچھنے لگے کے یہاں دہلی کس لیے آنا ہوا ہم

نے اس پر یہی بات عرض کی تو انہوں نے اعتراضاً یہ سوال کیا کہ اگر کوئی وعظ و بیان نہیں تھا تو پھر محض ان کی زیارت اور ملاقات سے کیا فائدہ؟ تو بندے نے ان سے یہی عرض کیا کہ اللہ والوں کی محض زیارت و ملاقات بھی نفع سے خالی نہیں اور ان کی پاکیزہ نگاہیں دلوں کی کایا پلٹ کر رکھ دیتی ہیں اگر چہ ان کی زبان خاموش ہو اور استدلال کے طور پر احقر نے عرض کیا کہ ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اللہ کی یہ خاص صفت ذکر فرمائی ہے:

﴿اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللهُ﴾

(تفسیر روح المعانی، تحت سورۃ یونس، آیت: ۳)

یعنی جب ان کی زیارت کی جاتی ہے تو دل میں اللہ کی یاد آتی ہے اور دنیا سے دوری اور بے رغبتی محسوس ہوتی ہے کیا یہ کوئی اہم فائدہ نہیں ہے؟ بالآخر وہ شخص خاموش ہو گئے اس لیے حضرت والا نے یہ بات فرمائی کہ اہلِ محبت کے لب اگر چہ خاموش ہیں مگر ان کی نگاہوں کی تاثیر سے کتنے ہی مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں۔

یادِ الٰہی کے جلووں کا رنگِ ارغوانی

عاشقانِ زرد رُو کی چشمِ نم میں صبح دم
ان کے جلووں کا یہ رنگِ ارغوانی دیکھئے

عام طور پر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اس کی راہ میں غم اٹھانے اور ہر قسم کی قربانی دینے کی وجہ سے ظاہری طور پر جسم میں موٹے اور فربہ نظر نہیں آتے اور رات و دن اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے لرزنے اور کانپنے کے سبب ظاہری طور پر نڈھال اور زرد رُو ہوتے ہیں لیکن ان کی گریہ وزاری کے نتیجے میں ان کے چہرے پر بہنے والے آنسو ہر گھڑی ان کو ایک نئی فرحت و مسرت اور تازگی عطا کرتے رہتے ہیں اور ان کے چہروں پر ایک خاص قسم کی رونق اور نور نظر آتا ہے اور اللہ کی یاد کے جلوے ارغوانی رنگ کی طرح بڑے چمک دار اور خوب صورت نظر آتے ہیں۔

جلوہ گاہِ حق دلِ عارف کی آہِ گرم میں
بارگاہِ کبریاء کی ترجمانی دیکھئے

اللہ والوں کی زبان سے نکلنے والی گرم آہیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کے قلوب جلوہ گاہِ حق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں تجلی فرماتے ہیں اس لیے یہ آہ وفغاں اور یہ گریہ وزاری اسی کی ترجمانی کرتا ہے جیسے کہ کسی جگہ پر اگر آگ موجود ہو تو اس کے ارد گرد حرارت اور گرمی موجود ہوگی اور اگر ہم آگ کو نہ بھی دیکھ رہے ہوں تو حرارت اور گرمی سے ہم آگ کی موجودگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں تو یہ گاہ بگاہ کسی اللہ والے کا اپنے اللہ کی یاد میں آہیں بھرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اللہ کی تجلیاتِ قرب اس کے دل میں سماگئی ہے اور عشقِ خداوندی کی آگ لگی ہوئی ہے اور اس طرح یہ آہیں بارگاہِ کبریاء کی ترجمانی کررہی ہیں یہ مضمون دوسرے مواقع پر مزید تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔

عشق کی جادو بیانی

یوں تو عاشق بے زباں معلوم ہوتا ہے مگر
عشق کی تفسیر میں جادو بیانی دیکھئے

اللہ تعالیٰ کی محبت عطا ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی زبان زیادہ بولنے سے رک جاتی ہے اور بظاہر تصنع اور تکلف کے انداز میں گفتگو کا عادی نہیں رہتا نہ اس کو محض لفاظی کرنے میں مزہ آتا ہے بلکہ وہ صرف وہی بات کہتا ہے جو اس کے اندرونِ دل کی حالت کی ترجمانی کرے جیسا کہ حضرت والا نے ایک مقام پر اس کو یوں فرمایا۔

لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

اس لیے اللہ کا یہ عاشق جب بھی کچھ بولتا ہے تو اپنے دل میں لگی ہوئی آگ سامنے کرتا ہے اس لیے پھر اس کے گفتگو میں اور اس کی داستان عشق میں عجیب وغریب قسم کی جادو بیانی ہوتی ہے کہ جس طرح جادو انسان کے دل کا رخ پلٹ کر رکھ دیتا ہے اسی طرح اس کے بیان کی تاثیرات زیادہ ہوتی ہیں کہ سننے والے کے دل کا رخ اللہ کی طرف پھر جاتا ہے اگر چہ وہ دل میں کتنے ہی غیر اللہ بسائے ہوئے ہو اور کیسے ہی حسین اور حسیناؤں کو اپنا دل دئے ہو لیکن اللہ کے دیوانے جب اپنے دل کی کہانی سنانے کھڑے ہوتے ہیں تو اس میں حق تعالیٰ ایسی تاثیر رکھ دیتے ہیں کہ ایسے مبتلا اور حرام کاریوں میں پھنسے ہوئے لوگ اس دلدل سے نکل کر باہر ہو جاتے ہیں اسی تاثیر کو حضرت والا نے اس شعر میں ذکر فرمایا ہے۔

اہل دل کے وعظ میں سوز وتڑپ کی دلیل

عاشقوں کا منبر دل پر بیانِ دردِ دل
وعظ میں آمیزشِ دردِ نہانی دیکھئے

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی زبان سے نکلنے والے جملوں میں ایک خاص تاثیر ہوتی ہے جس سے اہل مجلس کے دل بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے جملے اپنے اندر دلوں میں چھپے ہوئے درد کو لیے ہوئے ہوتے ہیں اور دل سے نکل کر ڈائریکٹ (Direct) اثر انداز ہوتے ہیں ایسے لوگ اگر چہ بالکل سادہ الفاظ استعمال کریں اور بالکل عام فہم تعبیرات اختیار کریں لیکن پھر بھی ان کی تاثیر بہت زیادہ ہوتی ہے حتیٰ کہ ہم نے یہاں تک دیکھا کہ ایسے اہلِ دل لوگ کبھی ایک ہی مضمون کو بار بار دہراتے رہتے ہیں مگر ہر مرتبہ میں ان کی گفتگو کی تاثیر الگ ہوتی ہے اس کا راز یہی ہے کہ ان کے ان کلمات کے ساتھ دردِ نہانی کی آمیزش موجود ہے۔

چنانچہ مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ حضرت والا جنوبی افریقہ میں حضرت مفتی حسین بھیات رحمہ اللہ کے گھر پر

تشریف لایا کرتے تھے تو ہم لوگ وہاں حاضر ہو جاتے ایک دن ہم میں سے ایک بڑی عمر والے ساتھی آپس میں گفتگو کے دوران یہ کہنے لگے کہ روزانہ کالی گوری ہی کی بات ہوتی ہے اور دوسری تو کوئی بات ہوتی ہی نہیں اور اس سے اچھا بیان تو حضرت کے بیٹے مولانا مظہر دامت برکاتہم کرتے ہیں جب وہ اپنی بات پوری کر چکے تو میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ پھر آپ کو روزانہ مجلس میں جانے کی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت آپ گھر پر آرام کریں تو اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ارے میاں چھوڑو یہ بات تو اپنی جگہ پر مگر ان کے بیان میں لطف بہت آتا ہے اس لیے مجلس میں تو بہر حال جاؤں گا۔ یہی وہ بات ہے جس کو حضرت والا نے اس شعر میں پیش کیا ہے۔

داستانِ زخمِ دل اختؔر چھپاتا تھا مگر
روزِ محشر داغِ دل کی گل فشانی دیکھیے

صاحبو! اصل بات یہی ہے کہ انسان اپنے کمالات اور علمی، عملی صلاحیتوں کو خلق کی نگاہ سے مخفی رکھے تاکہ اخلاص میں خلل نہ پڑ جائے جیسا کہ ہمارے تمام اکابر اپنے حالات رفیعہ کو ہمیشہ چھپایا کرتے تھے اور جتنا انسان اپنے کو اللہ کے لئے مٹاتا اور چھپاتا ہے اتنا ہی اللہ تعالیٰ اس کو ابھارتے اور چمکاتے ہیں اس پر ہمارے تمام اکابرِ دیو بند کے بے شمار واقعات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں خود حضرت والا کا یہ حال تھا کہ تقریباً ساٹھ سال تک اپنے کو اتنا چھپایا کہ نہ کوئی وعظ و بیان نہ کوئی شعر و شاعری اور نہ ہی کوئی تقریر سامنے آئی اکثر اشعار حضرت کے چھیاسٹھ (۶۶) سال کی عمر کے بعد ہوئے اور ایک مدت تک حضرت اس طرح رہتے رہے کہ علامہ یوسف بنوری نے حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کی خدمت میں حضرت والا کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ حضرت پھولپوری کے کوئی عام خادم ہیں کپڑے بھی بالکل عام اور معمولی درجے کے رہتے تھے، حضرت والا بالکل ساکت وصامت رہتے تھے لیکن اندر اندر سے دل اللہ کی محبت کی شراب کے نشے سے مست رہتا تھا اور راہِ خداوندی کے غم اٹھانے کی وجہ سے بڑے اونچے درجے کا دردِ محبت دل میں موجزن تھا کبھی نمایاں ہونے کی فکر نہیں ہوتی تھی اور نہ اپنے حالات ظاہر کرنے کی تمنا تھی۔

اور میر صاحب نے یہ بات بتلائی کہ شروع میں جب حضرت والا کی مجلس شروع ہوئی تو سوائے دو، تین آدمیوں کے کوئی شریک نہ ہوتا تھا جبکہ آج ہماری حالت یہ ہے کہ اندر سے ابھی خالی ہیں اور ظاہر و نمایاں ہونے کی کوششیں جاری ہیں اور روزِ اوّل ہی سے یہ تمنا رہتی ہے کہ مجلس شروع ہوتے ہی لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ ارد گرد اکھٹی ہو جائے یہ سب نیتیں غیر اللہ ہیں دل میں ایسی سوچ رکھ کر مجلسیں کرنا اخلاص پر مبنی نہیں ہے۔

اس لیے مومن کو تو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو مٹانا اور گم کرنا چاہیے اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو شہرت اور نام اور عزت و مقام لوگوں میں عطا فرمادے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا استحقاق سمجھ کر اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ الحمدللہ حضرت والا کی مجالس میں حاضر ہو کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کے قلب مبارک میں اپنی محبت و معرفت کا بڑا وافر حصہ اور عظیم خزانہ عنایت کیا ہے اور راہِ خداوندی میں اٹھائے گئے غموں اور تکلیفوں

کی بدولت دل پر ایسی چوٹیں لگی ہوئی ہیں کہ جس کی صحیح ترجمانی نظم ونثر کی کسی بھی شکل وصورت میں ممکن نہیں حقیقت میں اس کا اندازہ قیامت کے دن ہی ہوگا جب اسے بارگاہ الٰہی میں وزن کیا جائے گا اور پھر اللہ کی طرف سے اس پر خاص انعامات عطا ہونگے۔

جی اٹھو گے تم اگر بسمل ہوئے

سینکڑوں غم سے ملی ان کو نجات — جو تمہارے درد کے حامل ہوئے
تم نہیں حاصل تو کچھ حاصل نہیں — تم ہوئے حاصل تو سب حاصل ہوئے
آپ تک لائی جو موجِ رنج و غم — اس پہ قرباں سینکڑوں ساحل ہوئے
دردِ عشقِ حق بھی تم حاصل کرو — لاکھ تم عالم ہوئے فاضل ہوئے
یک زمانے صحبتِ بااولیاء — جس نے پائی ہے وہی کامل ہوئے
آشنائے دردِ جانِ سوختہ — دیکھ کر رندوں میں ہم شامل ہوئے
دیکھتے ہی دل مرا گھبرا گیا — زاھدانِ خشک جب نازل ہوئے
اخترِ بسمل کی تم باتیں سنو — جی اٹھو گے تم اگر بسمل ہوئے

مشکل الفاظ کے معنی:۔حامل: یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کو اٹھایا۔موج:لہر۔یک زمانے صحبتِ بااولیاء: ایک زمانہ کسی ولی کامل کی صحبت۔آشنائے درد جانِ سوختہ:......۔رندوں:مراد اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب پینے والے۔زاھدانِ خشک:خشک صوفی۔نازل ھوئے: آئے۔ بسمل:زخمی۔

پرسکون زندگی کا آسان نسخہ

سینکڑوں غم سے ملی ان کو نجات
جو تمہارے درد کے بسمل ہوئے

یعنی حضرت والا زندگی گزارنے کا ایک ایسا طریقہ پیش فرماتے ہیں جس سے ہماری زندگی بہت آسان ہوجائے گی اور وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ کو راضی کرلو اور اس کو خوش کرنے کا غم اٹھالو تو سارے غموں سے (Safety) حاصل ہوجائے گی اور یہ طریقۂ حیات غم پروف (Proof) طریقہ ہے یعنی دنیا کے غموں سے چھٹی مل جائے گی اور ہم حضرت والا کا جتنا شکرادا کریں کم ہے کیونکہ یہ وہ مطلوب اور مقصود ہے جس کے پیچھے دنیا کا ہر فردِ بشر دوڑ رہا ہے جتنے لوگ ہم یہاں مجلس میں بیٹھے ہیں آپ سب سے میں یہ سوال کرتا ہوں کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو رات دن کے ٹینشن (Tension) میں رہنا چاہتا ہو اور مختلف قسم کی ذہنی الجھنوں اور دماغی فکروں میں جینے کو پسند کرتا ہو نہ کوئی خوشی اس کے لئے خوشی ہو اور نہ ہی اس کو چین وسکون کی نیند آتی ہو کہیں معاش کی فکر لاحق ہو تو کہیں بیوی بچوں کی

طرف سے مختلف الجھنوں کا سامنا ہو کہیں خاندانی جھگڑے دماغ کو پریشان کیے ہوئے ہوں تو کہیں کورٹ اور کچہریوں کے مقدمات سے شب و روز کا سکون چھن گیا ہو غرض یہ کہ سینکڑوں انواع و اقسام کے غموم و ہموم اور آلام و افکار کا سامنا ہو؟

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی شخص اپنے لیے دانستہ طور پر ایسی زندگی کو پسند کرے گا بلکہ ہر آدمی یہی چاہے گا کہ میں بے فکر ہو کر شب و روز مطمئن اور خوش و خرم رہوں اور اس طرح کی الجھنوں سے میری زندگی خالی ہو بس اس شعر میں ایسی ہی زندگی کے حصول کا نسخہ اور علاج پیش کیا گیا ہے اور دراصل یہ قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾

(سورۃ الطلاق، آیت:۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۴۷۲)

جس کا خلاصہ یہ کہ مجھے ناراض کرنے والے تمام کاموں کو چھوڑ دو اور رضا کے کاموں میں لگ جاؤ تو ہر طرح کی پریشانی سے نجات مل جائے گی اور دنیا اور آخرت کی خوشی حاصل ہوگی اور دوسری آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾

(سورۃ النحل، آیت:۹۷)

ترجمہ: جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہے تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک اچھی زندگی۔
(معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۳۸۶)

جو مومن خواہ مرد ہو یا عورت اعمالِ صالحہ اختیار کر کے زندگی گزارے گا تو ہم یقینی طور پر اس کو بالطف زندگی عطا کریں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب التوکل والصبر، ص:۴۵۳)

فرمایا کے مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے غلام! تم اللہ کی حفاظت کرو یعنی جو اللہ کے احکام ہیں ان کو بجالاؤ جس وقت کا جو حکم ہے اس کو پورا کرو ناراضگی والے عمل سے بچتے رہو اللہ تمہاری حفاظت فرمائیں گے اور تم اللہ کی حفاظت کرو یعنی ہر وقت اللہ کو یاد رکھو تو اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

مشکلات ومصائب کا حل

صاحبو! آج ہم مشکلات اور غموں سے بچنا چاہتے ہیں اور مصائب وحوادث سے حفاظت کے متلاشی ہیں مگر افسوس ناجائز طریقوں غلط سلط حرکتوں اور دین وشریعت کے مقابل راہوں میں تلاش کرتے ہیں کوئی یہ سوچ رہا ہے کہ جتنا میرا کاروبار بڑھے گا خواہ وہ سودی نظام پر مبنی ہو اور ناجائز چیزوں کو بیچنا پڑ رہا ہو اور مرد عورت کے مخلوط

نظام کاروبار کے ذریعے حاصل ہو رہا ہو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کسی کو دھوکہ دے کر بیچ دیا کسی کا قرض ادا نہیں کیا کسی کے ساتھ جھوٹا وعدہ کر کے وعدہ خلافی کر لی کسی کو اصول شریعت کے خلاف سامان فروخت کر دیا غرض یہ کہ جو بھی کرنا پڑا بلا تفریقِ حلال و حرام اور جائز و ناجائز سب کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کو اپنے لیے پرسکون جینے کے واسطے اور مصائب و حوادث سے محفوظ زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل طے شدہ اور مسلم بات ہے کہ اس طرح اللہ کی نافرمانیوں کے راستوں سے یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔

ضمنی طور پر یہ بات عرض کرتا ہوں زیادہ تر لوگ جنت میں اپنے معاملات کے درست ہونے کی وجہ سے داخل ہونگے اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سلوک و تصوف کے باب میں اور اصلاح و تربیت کی راہ میں صحت معاملات پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اس کا بہت اہتمام تھا اور حقیقت میں کسی انسان کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے معاملات بہت اہم ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ کسی کو جانچنا اور پرکھنا ہو تو تین باتوں کے ذریعے سے پرکھو ایک تو اس کے ساتھ معاملہ کر کے دوسرا سفر کر کے اور تیسرا اس کا پڑوسی بن کر اللہ اللہ کر لینا یا کثرت سے نوافل پڑھ لینا ذکر و تسبیح میں آگے بڑھ جانا یہ سب انسان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے اور یہ اس کو جانچنے اور پرکھنے کا معیار نہیں ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس سے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ اللہ کو راضی کرنے کا غم اختیار کرنے سے نہ ہمیں کسی طرح کے کاروبار کی ضرورت نہ زراعت و ملازمت کی ضرورت نہ دوسرے دنیوی کام کرنے کی ضرورت یہ سب کام خود بخود ہوتے چلے جائیں گے ایسا سوچنا دراصل غلط فہمی کا نتیجہ ہے بلکہ منشاء یہ ہے کہ اپنی تجارت و ملازمت اور حرفت و صنعت سب کچھ کرنے کے ساتھ اللہ کے حکم کا خیال دل میں رکھا جائے بس شریعت کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا ہی دل میں اللہ کی محبت کا درد و غم پا جانا ہے۔

مثلاً اس کو ایک مثال سے سمجھیں آپ بہ حیثیت ایک تاجر دکان پر کھڑے ہوئے ہیں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا ایک بڑا خریدار آپ کی دکان پر حاضر ہوا وہ آپ سے ایک بڑی مقدار کا مال خریدنا چاہتا ہے اور آدھے گھنٹے بعد اس کی فلائٹ ہے اب اگر آپ نماز پڑھنے جاتے ہیں اور جماعت کی پابندی کرتے ہیں تو حکمِ خداوندی ادا ہو جاتا ہے اور اگر آپ اس کو سامان بیچنے میں نماز با جماعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تو اگرچہ آپ صبح شام خوب ذکر اللہ کرتے ہوں اور تسبیحات پڑھتے ہوں مگر پتہ چل گیا کہ آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا غم موجود نہیں ہے اور ہر لمحہ اللہ پر فدا ہونے والی صفت سے آپ خالی ہیں۔

اور اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ اس عالم کے سارے معاملات چھوٹے یا بڑے خوشی کے یا غم کے موافق یا

مخالف غرض کہ کائنات کا ہر ذرہ نفع نقصان پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا محتاج ہے تو جو بندہ حق تعالیٰ کو راضی کر لیتا ہے اور جس حال میں بھی اللہ رکھے وہ اس حال کا حکم بجالاتا ہے نعمت کی حالت ہو تو شکر کرتا ہے اور تکلیف کی حالت ہو تو صبر کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سارے فیصلے اس کے حق میں ہوتے ہیں اور وہ دنیا میں بالکل بے غم اور بے فکر ہو کر جیتا ہے۔

جس نے مولیٰ کو پالیا اس نے سب کچھ پالیا

تم نہیں حاصل تو کچھ حاصل نہیں
تم ہوئے حاصل تو سب حاصل ہوئے

دوستو! اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۵۴)

ترجمہ: سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا، بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔

(معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۵۷۱)

اللہ ہی نے ہم کو پیدا کیا ہے اور اسی اکیلا اللہ کا حکم ہمارے اوپر نافذ اور جاری و ساری ہوتا ہے اس لیے ہمیں جو بھی کچھ اسباب سے ہوتا نظر آتا ہے وہ در پردہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے تحت ہو رہا ہے تو بالکل واضح سی بات ہے کہ جس نے ایسے قادر مطلق اللہ کو پالیا تو پھر اس کو سب کچھ مل گیا اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ اگر اس ملک کا صدر کسی کا دوست ہو اور اس سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہو تو اسے اس ملک میں رہنے میں نہ تو کسی بھی موڑ پر کسی سے کوئی خوف و ڈر ہوگا اور نہ وہ کسی مقام پر اپنے کسی بھی مسئلہ میں پریشانی و دشواری محسوس کرے گا کیونکہ ملک کا سارا نظام اور اس کی حکومت کے سارے وزراء اس کے دوست کے (Order) اور فرمان کے تحت کام کرتے ہیں اس لیے اس سے سب ڈریں گے اور ہر طرف اس کے کام بہ آسانی ہوتے چلے جائیں گے اس کو جب بھی کوئی ضرورت پڑے گی تو اپنے صدر دوست کو بذریعہ فون یا کسی اور طریقے سے اس کی اطلاع دے اور سمجھو کے وہ کام فوراً وجود میں آجائے گا۔

جب کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس کی قدرت بھی کامل اس کے خزانے بھی لامحدود اور وہ فیصلوں میں بھی مکمل مختار اور ہم سے اتنے قریب کہ جب ہم چاہیں فوراً پکاریں ہر وقت ہماری پکار کو سننے والا عالم میں بسنے والی تمام مخلوقات اسکے قبضے میں تو پھر اس کو اپنا بنا لینے سے کیوں سب کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے ایک یا دو واقعے نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں واقعات ہیں کہ جنہوں نے سب کچھ اپنا اپنے اللہ پر لٹا کر اللہ تعالیٰ کو اپنا حامی و ناصر بنالیا تو پھر ساری کائنات ان کی ہوگئی وقت کے بڑے بڑے بادشاہ ان کے سامنے سرنگوں ہوگئے اور ان

کے رعب و دبدبے سے کانپ اٹھتے تھے۔

یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جس کو حضرات صحابہ و تابعین نے سمجھا اور بڑی مضبوطی اور خود اعتمادی کے ساتھ اختیار کیا پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتے تھے لیکن ان حضرات کے اس نظریہ اور عقیدے میں ذرا جنبش نظر نہ آتی تھی بلکہ اَلْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِهِمْ كَالْجِبَالِ الرَّاسِيَاتِ (ایمان ان کے دلوں میں مضبوط پہاڑوں کی طرح تھا) کا جملہ ان کے اندرون دل کی حالت کا صحیح ترجمان تھا حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ ایک دن رومیوں سے جنگ کے موقعہ پر اپنے قافلے سے بچھڑ گئے سامنے شیر نظر آیا تو وہ اس کو خطاب کر کے کہتے ہیں اے شیر میں اپنے قافلے سے بچھڑ چکا ہوں تو یہاں آ اور مجھے سواری دے اور قافلے سے جا ملا دے تو وہ شیر دم ہلاتا ہوا حضرت سفینہ کے پاس آیا اور ان کو لے کر چل دیا حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ نے افریقہ کے جنگلوں میں صحابہ کرام کے پہنچنے کو اور وہاں کے درندوں کو اپنے خاص ایمانی لہجے میں خطاب کرنے کو یوں ذکر کیا ہے کہ ایک صحابی جنگل کے درندوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

﴿أَيَّتُهَا الْحَشَرَاتُ وَالسِّبَاعُ نَحْنُ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْحَلُوْا عَنَّا، فَإِنَّا نَازِلُوْنَ فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ قَتَلْنَاهُ﴾

(معجم البلدان، حرف القاف والباء ومایلیہا، ج: ۴، ص: ۴۲۱، دار الاحیاء التراث العربی)

کہ اے حشرات الارض (کیڑوں مکوڑوں) اور درندوں ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی یہاں پڑاؤ ڈال رہے ہیں اس لیے تم یہاں سے ہٹ جاؤ اور اگر ہمارے اس اعلان کے بعد ہم میں سے کسی نے تم کو یہاں پایا تو اسے قتل کر دینگے۔ حضرت شیخ لکھتے ہیں کہ یہ اعلان تھا کہ جو بجلی کے کرنٹ کی طرح پورے جنگل میں دوڑ گیا اور درندوں نے اس جنگل کو خالی کرنا شروع کر دیا یہاں تک کے شیر اور ہاتھی اپنے بچوں کو پشت پر اٹھائے دوڑے جا رہے تھے۔ ان واقعات سے مجھ کو صرف یہ بتانا ہے کہ جب کوئی دل و جان سے اللہ کا ہو جاتا ہے اور سر سے پیر تک اس کا بندہ بن جاتا ہے اور ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع ہوتا اور اسی کو اپنا کارساز سمجھتا ہے تو پھر ساری کائنات کا ذرّہ ذرّہ اسے اپنی حمایت میں دکھائی دیتا ہے۔ ہواؤں اور فضاؤں، جنگلوں اور سمندروں کو اس کی حمایت میں کر دیا جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ساتھ نہیں ہے تو سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہیں اور اگر اللہ ساتھ ہے تو کچھ نہ ہوتے ہوئے سب کچھ ہے۔

آپ تک لائی جو موجِ رنج وغم
اس پہ قرباں سینکڑوں ساحل ہوئے

اس شعر میں بڑا عالی مضمون بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان دنیا کی مادی اور ظاہری ترقی میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور اپنی تمام ناجائز اور حرام خواہشات، آرزوئیں اور تمنائیں پوری کرنے پر اتر جاتا ہے کسی سے حرام محبت اور عشق کا سلسلہ قائم کیا اور اس میں اس کو کامیابی حاصل ہوگئی بلا امتیاز حلال وحرام مال و دولت

کے خزانے اور ڈھیرا کھٹے ہوگئے جاہ و منصب کے تمام خواب شرمندہ تعبیر ہوتے دکھائی دینے لگے غرض یہ کہ جو کچھ اس نے اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا محل اپنے ذہن میں تعمیر کیا تھا وہ اسے حاصل ہوگیا اور اس طرح اس کی کشتی ساحل کو لگ گئی تو اس کے متعلق حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں گو کہ یہ شخص ساحل پر پہنچ گیا اور بظاہر اس کو منزل مل گئی لیکن یہ ساحل پر پہنچ کر بھی طغیانی میں ہے اور منزل پر پہنچ کر بھی محرومِ منزل ہے ہاں وہ اللہ کا دیوانہ کہ اس نے خدا کو راضی رکھنے کے لیے مال و دولت کی زیادتی اور منصب و عہدوں کی پیش کش کو پیچھے ڈال دیا اور حسین حسیناؤں سے اپنے قلب کی پورے طور پر حفاظت کی خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی تکلیف اور مشقت اٹھانی پڑی جس کی وجہ سے اس کی ظاہری حالت خستہ و شکستہ اور فقر و فاقہ کی ہو اور بظاہر کچھ آزمائشوں کے عالم میں ہو لیکن اس سب کے باوجود یہ اللہ کا بندہ ساحل کے مزے لوٹ رہا ہے جیسا کہ حضرت والا کا دوسرا شعر ہے ؎

دشمنوں کو عیش آب و گل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا
ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
ہم کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

ان کو لڑکیاں ملی، ان کو معشوق اور معشوقائیں ملی شاندار ہوٹل اور بنگلے ملے لیکن کوئی ان کے حالِ دل کو جھانک کے دیکھے بے چینی و بے قراری کے عالم میں نظر آئے گا ان کی نیندیں اڑی ہوئی چین و سکون چھنا ہوا محسوس ہوگا یہی ساحل پر طغیانی ہے اور اللہ والے کو رنج و غم کی موجوں میں تیرتے ہوئے ساحل کا مزہ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو مٹانا حقیقی علم کی کنجی ہے

دردِ عشقِ حق بھی تم حاصل کرو
لاکھ تم عالم ہوئے فاضل ہوئے

اس شعر میں خاص طور پر اہلِ علم علماء اور طلباء کے لیے ایک اہم نصیحت ارشاد فرمارہے ہیں کہ مدارس میں پڑھنے پڑھانے سے علمِ نبوت تو مل جاتا ہے لیکن نورِ نبوت حاصل نہیں ہوتا جو کہ نسبتِ باطنی اور خاص تعلق مع اللہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تحفۃ العلماء کتاب میں اور التکشف میں بھی یہ مضمون تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے کہ اصل علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں حاصل ہونے والا ایک خاص نور ہے اور یہی حقیقت میں وراثتِ انبیاء ہے محض معلومات کا ذخیرہ نہیں اس لیے صرف کتابی معلومات پڑھ لینا اور سینوں میں محفوظ کر لینا علماء اور طلباء کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے مٹا کر اپنے دل کو معرفت کے نور سے روشن نہ کر لیں اور اپنے سینوں میں دردِ عشقِ حق حاصل نہ کر لیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ محض معلومات راہِ

سلوک میں ترقی کے لیے رکاوٹ اور آڑ ہے اور وہ حجاب بن کر انسان کو ایک طرح کے گھمنڈ اور بڑائی میں ڈال دیتی ہیں جو حقیقی علم اور نورِ باطنی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ درخواست کی کہ حضرت مجھے نصیحت فرما دیجئے اسی مجلس میں میرے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ بھی موجود تھے حضرت نے یہ واقعہ سنایا کہ حضرت تھانوی نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں اور آپ کو نصیحت تین مرتبہ وہ درخواست کرتے رہے اور حضرت یہی جواب دیتے رہے بالآخر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہم نے تو حضرت حاجی صاحب سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ ہے اپنے کو مٹانا۔ بس یہ سننا تھا کہ وہ علامہ وقت عرب و عجم کے شہرت یافتہ فوراً آب دیدہ ہوگئے اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور پھر اس کے بعد حضرت تھانوی سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کے نتیجہ میں ایسا دردِ محبت حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں بے قرار رہتے اور تڑپتے تھے اس ملاقات اور اس کے بعد کی حالت کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جو بعد میں خود علامہ پڑھتے تھے ؎

ایسے کچھ انداز سے تقریر کی
پھر نہ پیدا شبہ باطل ہوا
آج وہ آیا مزہ قرآن میں
جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا
نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے

اور پھر حضرت تھانوی کے قدموں میں آ کر پڑ گئے اور اپنے کو اللہ کے لیے مٹا ڈالا جس کے نتیجے میں علماء اور اہل اللہ کی نگاہوں میں ان کو بڑا مقام حاصل ہوا بس یہی اللہ کے لیے اپنے کو مٹانے کا نتیجہ ہوتا ہے خواجہ صاحب نے اسی کو فرمایا ہے ؎

ہاں مجھے مثلِ کیمیا خاک میں یوں ملائے جا
شان مری گھٹائے جا رتبہ مرا بڑھائے جا
سب ہوں حجاب برطرف دیکھوں تجھی کو ہر طرف
پردے یونہی اٹھائے جا جلوے یونہی دکھائے جا

اپنے کو مٹانے سے گو کہ ظاہری شان گھٹ جاتی ہے لیکن عند اللہ محبوبیت اور مرتبہ بلند ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں یہ وعدہ مذکور ہے:

﴿مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللہُ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الغضب والکبر، ص: ۴۳۴)

کہ جو اللہ کے لیے اپنی شان گھٹائے گا اور اپنے کو کمتر کرے گا اللہ اسے رفعت و بلندی عطا فرمائیں گے۔

یک زمانے صحبت با اولیاء
جس نے پائی ہے وہی کامل ہوئے
آشنائے دردِ جانِ سوختہ
دیکھ کر رندوں میں ہم شامل ہوئے
دیکھتے ہی دل مرا گھبرا گیا
زاہدانِ خشک جب نازل ہوئے

زہد کی اصل حقیقت دل سے دنیا کی محبت نکال دینا ہے اور غیر اللہ سے دل کو مکمل طور پر خالی کر دینا ہے جو آدمی دینی کاموں میں لگا ہوا ہو اور خوب ذکر و اذکار و تسبیحات کرتا ہو لیکن اجنبی عورتوں اور امرد لڑکوں سے ملنے جلنے سے پرہیز نہ کرتا ہو اور گناہوں سے بچنے کا غم دل پر نہ اٹھاتا ہو اور اپنی حرام آرزوؤں کا خون نہ پیتا ہو یہ حقیقی زہد نہیں ہے اگرچہ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر رات و دن اللہ اللہ کر رہا ہو اس لئے حقیقی زاہد وہ ہے جو دنیا کی چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور تمام شعبوں میں اللہ کی نافرمانی سے مکمل پرہیز کرتا ہے۔ چاہے اس کے لیے کتنا ہی مجاہدہ اٹھانا پڑے۔

اخترِ بسمل کی تم باتیں سنو
جی اٹھو گے تم اگر بسمل ہوئے

جس آدمی نے اللہ کے راستے میں جتنے مجاہدات اٹھائے ہوں اور اپنے دل کو غیر اللہ سے صاف کرنے میں دل کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں قربان کر دی ہوں اور کبھی ایذاءِ خلق کی صورت میں حاسدین کے حسد سے گزرنا پڑا ہو اور کبھی فقر و فاقہ اور معاش کی تنگی کی صورت حال سے دوچار رہا ہو اور حسینوں سے نظریں اور دل بچانے میں جان کی بازی لگا دی ہو اور مجرمانہ حرام لذتیں اور ناجائز خواہشات کے مزوں کے قریب نہ گیا ہو تو ایسا آدمی اس کا مستحق ہے کہ اسے بسمل کہا جائے اس لیے حضرت والا کیونکہ ان حالات سے گزرے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ مشقتیں اٹھائی ہیں تو اپنے کو اختر بسمل سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں تڑپنا اور آہیں بھرنا عطا فرما دیا اور ایک ایسی حیات عطا کر دی جو رشکِ صد حیات ہے تو پھر یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جو حضرت والا کی عشق و محبت کی داستان سنے گا وہ خود اللہ تعالیٰ کی یاد میں تڑپ اٹھے گا اور پھر وہ ایسا مزہ پائے گا کہ اسے محسوس ہوگا کہ مجھے نئی حیات میسر ہوئی ہے اور اپنی گزری ہوئی حیات کو ننگِ صد ممات کہنے پر مجبور ہوگا کیونکہ نافرمانی اور گناہوں کے ساتھ حقیقی لذتِ حیات سے محرومی رہتی ہے جیسا کہ یہ مضمون جگہ جگہ حضرت والا کی کتاب میں موجود ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شیخ و مرشد اور مصلح و مربی جتنے مجاہدات سے گزرا ہوگا اور اس کے قلب میں

جیسی اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ لگی ہوگی تو پاس بیٹھنے والوں کے قلوب بھی اس کی حرارت وگرمی اور نور و تجلی سے اسی قدر متاثر ہونگے۔ چنانچہ ایک مقام پر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ قلوب اولیاء کی مثال پیش کرتے ہوئے اس طرح فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک آئینہ ہوتا ہے جب اسے سورج کے سامنے کیا جاتا ہے اور پھر اس آئینہ کے ذریعے سے سورج کا عکس اور روشنی کسی کاغذ پر پڑتی ہے تو کبھی تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ کاغذ منور اور روشن ہو جاتا ہے اور کبھی اس شیشے کی مزید حرارت وگرمی اور چمک دمک کے نتیجہ میں روشن ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں آگ لگ جاتی ہے اور دھواں اٹھنے لگتا ہے اور پھر ارشاد فرمایا کہ ٹھیک اسی طرح اللہ والوں کے دلوں کی حرارت ہوتی ہے کہ بعض کے دل تو ایسے ہوتے ہیں جو پاس بیٹھنے والوں کے دلوں پر ایسی حرارت اور گرمی پہنچاتے ہیں کہ ان کے دل اس سے روشن ہو جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جو ان کے دلوں میں عشق ومحبت کی آگ لگا دیتے ہیں اس کا مدار اسی پر ہے کہ جتنا جس بزرگ نے مجاہدہ اٹھایا اور دل کو چمکایا اتنا ہی اس کے قلب میں انوار وتجلیات پیدا ہوئیں۔

نہیں آتے نظر لیکن پرِ پرواز آہوں کے

محبت تیرا صدقہ ہے ثمر ہیں تیرے رازوں کے
جو میں یہ نشر کرتا ہوں خزانے تیرے رازوں کے

زمیں پر ہیں مگر کیا رابطہ ہے عرشِ اعظم سے
نہیں آتے نظر لیکن پرِ پرواز آہوں کے

جدھر دیکھو فدا ہے عشق فانی حسن فانی پر
فدا اللہ پر ہیں قلب و جاں اللہ والوں کے

تجھے دھوکہ نہ دے فانی بتوں کی عارضی رنگت
کبھی دیکھو گے تم قبروں میں ابتر حال لاشوں کے

جو اہلِ دل کے جوتوں سے لگے ہیں خاک کے ذرّے
شرف حاصل ہے ان کو موتیوں پر تاج شاہوں کے

چمن میں جیسے ہوتی ہے عنادل کی پذیرائی
کہیں وہ مرتبے ہوتے ہیں صحراؤں میں زاغوں کے

وہ سب کے ساتھ رہ کر بھی خدا کے ساتھ رہتے ہیں
مگر کچھ اہلِ دل ہی آشنا ہیں ایسے رازوں کے

وہ کرگس جو کسی مردہ پہ ہوتا ہے فدا اخترؔ
وہ کیا جانے کہ کیا رتبے ہیں ان کے شاہبازوں کے

مشکل الفاظ کے معنی:۔ ثمر: پھل۔ نشر: بیان۔ **پرِ پرواز آھوں**: آہوں کی پرواز کے پر۔ **عارضی رنگت**: ختم ہوجانے والی خوبصورتی۔ **ابتر حال**: بری حالت۔ **اھلِ دل**: اللہ والے۔ **شرف**: رتبہ۔ **چمن**: باغ۔ **عنادل**: بلبل۔ **پذیرائی**: عزت افزائی۔ **زاغوں**: کوّے۔ **آشنا**: واقف۔ **کرگس**: گدھ۔ **شاھبازوں**: مشہور پرندہ کا نام جو بادشاہوں کی کلائیوں بیٹھتا ہے۔

راہِ خداوندی کے مجاہدات اور ان کا ثمرہ

محبت تیرا صدقہ ہے ثمر ہیں تیرے رازوں کے
جو میں یہ نشر کرتا ہوں خزانے تیرے رازوں کے

﴿ما زهد عبد في الدُّنيا الّا انبت الله الحكمة فيْ قلبه وانطق بها لسانه وبصّره عيب الدُّنيا وداءها ودواءها واخرجه منها سالمًا الى دار السّلام﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص:۴۴۳)

جس کا حاصل یہ ہے کہ جب بندہ زہد اختیار کرتا ہے اور اپنے دل کو غیر اللہ سے صاف کر لیتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے قلب میں خاص علم وحکمت کا درخت پیدا کر دیتے ہیں اور پھر اس کی زبان کو اس کا بیان سکھا دیتے ہیں اور اسے دنیا کی خرابیاں اور بیماریاں دکھا دیتے ہیں اور دنیا سے اس حال میں اٹھاتے ہیں کہ وہ سب سے محفوظ رہتا ہے اس لیے حقیقت میں اللہ والوں کو جو علوم عطا ہوتے ہیں وہ خاص اسرار و حِکَم خداوندی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہونے اور قلب کے مزکّٰی ومجلّٰی ہونے کے بعد عطا کئے جاتے ہیں پھر اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسے وہ نہر جو ایسے سمندر سے وابستہ ہو جائے جس کی کوئی حد اور کنارہ نہ ہو اور ایسے خاص علمی باتیں ان کو عطا ہوتی ہیں کہ جو عام طور پر کتابوں میں لکھی ہوئی نہیں ہوتیں اور پھر ان کا طرزِ بیان بھی ایسا انوکھا اور نرالا عطا کیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

اسی لیے تاریخ گواہ ہے کہ امت میں جب بھی انقلاب آیا تو وہ اولیاءِ امت اور خاصانِ خدا علمائے ربانیین کے ذریعے سے آیا کہ جن کی نگاہوں میں دنیا کے عیوب اور اس کی خرابیاں موجود ہوتی تھیں اور اس لیے وہ دنیا کی چیزوں کو اپنا دل نہ دیتے تھے تو دنیا کی محبت کی بیماری سے وہ محفوظ اور سلامت رہتے تھے یہی بات اس شعر میں مذکور ہے کہ میں نے توفیقِ الٰہی سے جو اللہ کی راہ میں اس کے ناز اٹھائے ہیں تو مجھے اللہ نے ایسی قوی محبت عطا فرما دی اور اپنے دین کے اسرار وحِکَم عطا فرما دیئے ورنہ میں اس قابل نہ تھا اے اللہ! سب کچھ آپ ہی کی عطا ہے۔

فرش پر رہتے ہوئے عرش سے رابطہ

زمیں پر ہیں مگر کیا رابطہ ہے عرشِ اعظم سے
نہیں آتے نظر لیکن پر پرواز آہوں کے

بندۂ مومن زمین پر رہتے ہوئے اپنی ادائے بندگی کے ذریعے عرشِ اعظم سے رابطہ کئے ہوتا ہے خاص طور پر جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اشک بار ہوتا ہے اور آہ وفغاں کرتا ہے تو اس کی یہ آہ وفغاں ڈائریکٹ اسے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیتی ہے جیسا کہ ایک روایت میں ذکر لا الٰہ الا اللہ کے متعلق ارشادِ نبوی ہے کہ:

﴿لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَیْسَ لَھَا حِجَابٌ دُوْنَ اللّٰہِ حَتّٰی تَخْلُصَ اِلَیْہِ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ثواب التسبیح والتحمید، ص ۲۰۲)

لا الٰہ الا اللہ اور اللہ کے درمیاں کوئی حجاب نہیں ہے تو اس طرح بندہ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر عرشِ اعظم سے رابطہ کر لیتا ہے اگر چہ دنیا کی مخصوص چیزوں کی طرح بندہ کی آہ وزاری اور ذکر اللہ میں پر نظر نہیں آتے اس لیے ذاکرین فرش پر ہوتے ہوئے عرش پر ہوتے ہیں۔

عشقِ مجازی ایک وبائی بیماری ہے

جدھر دیکھو فدا ہے عشق فانی حسن فانی پر
فدا اللہ پر ہیں قلب و جاں اللہ والوں کے

عام طور پر دنیا میں اللہ کو نہ ماننے والے ہر دور میں زیادہ رہے ہیں اہلِ ایمان کی تعداد کم رہی ہے جیسے کہ قرآن کی بے شمار آیات میں اس کا تذکرہ موجود ہے پھر ان مومنین میں خاص وہ لوگ جو ہر گھڑی اللہ پر فدا ہوتے ہیں اور اپنے دل و جان کو اللہ کے لیے وقف کیے ہوئے ہوں ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں اس لیے اکثریت کے اعتبار سے یہ بات فرمائی جا رہی ہے کہ جدھر دیکھو تو عشق فانی کا دور دورہ نظر آ رہا ہے خاص طور پر اس زمانے میں جب کے بے حیائی کے آلات واسباب اور ذرائع ووسائل ہر سمت پھیلے ہوئے ہیں گندی فلمیں، ٹی وی پر چلنے والے حیا سوز مناظر اور اخبار ورسائل، انٹرنیٹ وموبائل پر آنے والی نامحرم عورتوں کی تصویریں اور ان کی حرام محبتوں کی داستانیں گھر گھر نظر آ رہی ہیں اور یہی نفس وشیطان کے آلۂ کار کفار اور دشمنانِ اسلام یہود ونصاریٰ کی مسلمانوں کو دین سے دور کرنے اور ان میں بے حیائی اور بے دینی اور فسق وفجور کو رواج دینے کے لیے استعمال کی جانے والی چیزیں ہیں جس کی وجہ سے پورے معاشرے میں یہ عشق مجازی کی بیماری ایک سخت وبائی مرض کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور یہاں تک کے لوگ اس میں پڑ کر اپنے دین وایمان تک کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔

اس لیے اس شعر میں مقصود یہ ہے کہ اللہ کا جو صحیح بندہ ہوگا وہ حسنِ فانی کے چکر میں نہیں آئے گا بلکہ وہ تو خالقِ حسن وحسین کے اوپر فدا ہو کر اپنے قلب و جاں کو سکون دائمی اور راحتِ ابدی کا سامان فراہم کرے گا اور اسی سے یہ سبق بھی نکلتا ہے کہ مصلحین امت کو امت کے حالات سے باخبر رہنا چاہیے تا کہ جو مرض و بیماری معاشرے میں پھیلے قرآن وسنت سے اس کا علاج تلاش کر کے لوگوں میں پیش کیا جا سکے جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ دنیا بھر کے ڈاکٹرز مختلف اوقات میں جسمانی نئی بیماریوں اور ان کے علاج پر تبادلۂ معلومات وتحقیقات کے لیے سارے عالم سے وقتاً فوقتاً جمع ہوتے ہیں اللہ جزائے خیر دے حضرت والا کو کہ حضرت نے اس مرض کی سنگینی کو اور اس کے عموم و شیوع کو امت کے دین وایمان کے لیے زہرِ قاتل سمجھا اور اس سے لوگوں کو بچانے کے لیے سارے عالم میں اپنی کوششوں کا جال بچھا دیا حتیٰ کہ بعض عرب حکومتوں نے حضرت والا کی کچھ کتابیں جو خاص طور پر اس موضوع سے

متعلق تھیں چھاپنے اور ان کے تقسیم کرنے کی باضابطہ سرکاری اجازت عطا کی ہے۔

عشقِ مجازی کا ایک بہترین علاج

تجھے دھوکہ نہ دے فانی بتوں کی عارضی رنگت
کبھی دیکھو گے تم قبروں میں ابتر حال لاشوں کے

اس شعر میں ذکر کردہ مضمون گویا ان لوگوں کے لیے علاج کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اس مرض میں مبتلاء ہیں کہ ایسے حسن کو دل دینا اور فریفتہ ہونا کہ جس کو جلد ہی زوال لاحق ہونے والا ہے اور جس کی چمک دمک عنقریب ختم ہو جانے والی ہے جو قبر میں پہنچ کر گلنے سڑنے والے ہیں جن کو ایک وقت کیڑے مکوڑے کھا رہے ہوں گے تو اس عشقِ مجازی کا انجام اخیر میں پشیمانی اور ندامت و شرمندگی ہے اس لیے عارضی رنگت کو چھوڑ کر اپنے عشق و محبت کا رخ ان کو رنگ و روغن دینے والے اللہ تعالیٰ کی طرف ہونا چاہیے یہ بہترین علاج ہے کہ بندہ اپنے معشوق و معشوقاؤں کے متعلق اس کے گلنے سڑنے اور اس کے اندر کی آلائش اور گندگی کا تصور کرے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ مضمون منقول ہے کہ اگر کسی کے حسن کی طرف نظر پڑ جائے اور دل میں میلان محسوس ہو تو اس کی آلائشوں اور گندگیوں کی طرف خیال کرے۔ خود حضرت والا نے بعض حضرات کو یہ علاج تجویز کیا کہ اگر کسی کی طرف طبیعت میں اس طرح میلان محسوس کرو تو تھوڑی دیر کو یہ تصور کر لو کہ اس کے بدن کی اندر کی گندگی اس کے جسم پر چاروں طرف لگی ہوئی ہے اور اس پر ہزاروں مکھیاں بیٹھی ہیں۔

گو کہ ظاہر میں تہذیب کے دعوے داروں کے لیے یہ بات بڑی خراب اور بھونڈی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایمان کو بچانے کے لیے اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے اس طرح کی کارروایاں بطور علاج کے کرنا انتہائی موثر اور مفید اور لازم و ضروری ہے جیسا کہ اس نوع کے خاص واقعات اللہ تعالیٰ کے بندوں سے ثابت اور منقول ہیں اس لیے کہ ہمارے اکابر نے اس ظاہری حسنِ مجازی سے بچنے کے لیے اس قدر احتیاط اختیار فرمائی کے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق علامہ شامی نے لکھا ہے:

﴿وَ کَانَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ صَبِیْحًا وَّ کَانَ اَبُوْ حَنِیْفَۃَ یُجْلِسُہٗ فِیْ دَرْسِہٖ خَلْفَ ظَهْرِهٖ مَخَافَةَ خِیَانَةِ الْعَیْنِ مَعَ کَمَالِ تَقْوَاهُ﴾

(رد المحتار، کتاب الحظر والاباحۃ)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے امام محمد کی والدہ سے نکاح کیا تھا، امام محمد ان کے سوتیلے بیٹے بھی تھے لیکن پڑھائی کے زمانے میں ان کے حسن کی وجہ سے امام ابوحنیفہ ان کو اپنے پیچھے بٹھاتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب امام محمد رحمہ اللہ کے خوب ڈاڑھی آ گئی اور امام ابوحنیفہ نے چراغ کی روشنی میں ان کی ڈاڑھی دیکھی تو فرمایا کہ اب سامنے بیٹھ جاؤ۔ حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مولوی شبیر علی صاحب رحمہ اللہ سے فرماتے تھے جو

خانقاہ تھانہ بھون کے مہتمم تھے کہ میری تنہائیوں میں بے ریش لڑکوں کو مت بھیجا کرو۔ یہ ہے اللہ والوں کا عمل۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ

جو اہل دل کے جوتوں سے لگے ہیں خاک کے ذرّے
شرف حاصل ہے ان کو موتیوں پر تاج شاہوں کے

حضرت والا کے ایک بیان میں احقر نے سنا کہ علامہ انور کشمیری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اولیاء اللہ کے قدموں کی خاک کے ذرّوں کو بادشاہوں کے سروں پر تاجوں کے موتیوں سے افضل سمجھتا ہوں اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بادشاہوں کے سروں پر رکھا ہوا تاج اور اس کے موتی یہ دنیا کی ظاہری حکومت اور بڑائی اور جاہ ومنصب کی ترجمان ہیں جب کے زمین کے وہ ذرّات اولیاء اللہ کے قدموں سے لگنے اور چپک جانے کے سبب بڑی اونچی نسبت کے حامل ہیں اسی لیے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین جس پر کوئی اللہ والا بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتا ہے قیامت کے دن اس کے حق میں اللہ کے سامنے گواہی دے گی اور یہی تفسیر مفسرین نے قرآن کریم کی اس آیت کی کی ہے:

﴿یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا﴾

(سورۃ الزلزال، آیت: ۴، ۵)

ترجمہ: اس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم بھیجا اس کو۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۸۰۰)

اور حدیث شریف میں یہ بات موجود ہے کہ بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو منجملہ دوسرے امور کے جو میت کو پیش آتے ہیں ایک بات یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ نیک بندے سے زمین یہ کہے گی جب تو میرے اوپر چلتا تھا تو تو مجھے بہت محبوب تھا آج تو دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کتنا اچھا سلوک کروں گی اور اس کے برعکس بدکار آدمی کا معاملہ ہے۔ اس لیے یہ بات بالکل واضح ہے کہ شاہوں کے موتیوں کو خاک کے ان ذرّوں سے کوئی نسبت نہیں۔

زاغ کو بلبل سے کیا نسبت

چمن میں جیسے ہوتی ہے عنادل کی پذیرائی
کہیں وہ مرتبے ہوتے ہیں صحراؤں میں زاغوں کے

چمن میں جو مقام بلبل کا ہوتا ہے وہ پھولوں کی خشبوؤں پر چہچہاتی پھرتی ہے اور چمن کی زینت بنتی ہے وہ مقام اور مرتبہ صحراؤں اور جنگلوں میں رہنے والے زاغ اور کوے کو حاصل نہیں ہوسکتا اس لیے اللہ والے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست وسرشار رہتے ہیں اور اس کے قرب کی لذت اور معرفت کی خوشبو سے آشنا ہوتے ہیں ان کا مقابلہ ان دنیا پرستاروں سے کیا ہی نہیں جاسکتا کہ جن کا کل مطمح نظر اور مقصود جدوجہد دنیا اور اس کی حرام لذتیں ہوتی

ہیں وہ حقیقت میں جہاں مرتے ہیں اور جن پر فدا ہوتے ہیں وہ صحرا و بیابان میں رہنے والے کوؤں اور ویرانوں میں بسنے والے الوؤں سے کم نہیں اور یہ بات محض سمجھانے کے لیے ایک تعبیر اور اصطلاح کے طور پر فرمائی گئی ہے ورنہ اللہ والے جو اللہ کی معرفت کے گلشن میں رہتے ہیں ان کو دنیا داروں کے ویرانوں اور صحراؤں سے تقابل کیا ہی نہیں جا سکتا اس لیے مومن کو چاہیے کہ اپنے آپ کو مثل عنادل و بلبل کے بنائے اور اپنے دل کو اللہ پر فدا کرے۔

مخلوق میں رہتے ہوئے خالق کے ساتھ رہنا

وہ سب کے ساتھ رہ کر بھی خدا کے ساتھ رہتے ہیں
مگر کچھ اہل دل ہی آشنا ہیں ایسے رازوں کے

اہل اللہ کی ایک خاص شان ذکر کی جا رہی ہے ظاہر میں صبح و شام تک کے کیے جانے والے فطری بشری تقاضے پورے کرنے اور کاموں کو انجام دینے میں، اور لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے اور رہنے سہنے میں وہ بالکل عام انسانوں کی طرح نظر آتے ہیں کھانا پینا، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا غرض کہ تمام بشری امور اور تقاضوں میں ہم اپنی نگاہوں سے ان کو عام انسانوں کی طرح دیکھتے ہیں اور خلقِ خدا میں رہ کر اپنا کوئی نیا مقام نئی امتیازی شان اور خاص مرتبہ کے متلاشی نہیں ہوتے مگر جو اہل دل ہوتے ہیں وہ اس راز سے خوب آشنا ہوتے ہیں کہ یہ اللہ کے دیوانے عین اسی وقت میں جب کہ مخلوق کے ساتھ واصل ہیں اللہ سے بھی واصل ہوتے ہیں جسم ان کا خلق کے ساتھ مگر دل خالق کے ساتھ رہتا ہے سو جسم سے واصل مع الخلق اور قلب سے واصل مع اللہ ہیں اس لیے بسا اوقات ظاہری بعض معاملات میں ان سے ایسے اعمال صادر ہو جاتے ہیں جس سے دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نہ معلوم یہ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں جیسا کہ حضرت والا کا ایک شعر ہے ؎

نظامِ ہوش کا اختؔر ہے اب خدا حافظ
ہماری روح کہیں ما وراء عالم ہے

اور یہ ہر بزرگ کا اندرونی اللہ سے تعلق اور فنائیت کے اعتبار سے الگ الگ نوعیت کا معاملہ ہوتا ہے بعضوں کو بکثرت اس حال میں دیکھا جاتا ہے غرض یہ ہے کہ یہ اہل دل سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی خدا کے ساتھ رہتے ہیں دکانوں اور کاروباروں میں بیوی اور بچوں میں غمی اور خوشی میں وہ خلق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں مگر دل میں خالق کے ساتھ جڑے رہتے اور اس کو یاد کرتے اور اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے دینِ اسلام میں یہ تعلیم نہیں ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لوگوں سے علیحدہ ہو جائے اور اقربا و اعزہ اور رشتہ دار اور تعلق والوں سے علیحدہ ہو کر اللہ کو یاد کرے بلکہ کمالِ بندگی یہی ہے کہ ادائے حقوقِ خلق کے ساتھ خالق سے غافل نہ رہے۔

وہ کرگس جو کسی مردہ پہ ہوتا ہے فدا اختؔر
وہ کیا جانے کہ کیا رُتبے ہیں ان کے شاہبازوں کے

گدھ ایک ایسا جانور ہے جس کی غذا مردار ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کو ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اسی پر فدا ہوتا ہے جب کہ شاہباز زندہ جانوروں کا شکار کرتا ہے اور ان کا متلاشی ہوتا اور ان پر فدا ہوتا ہے وہ لوگ جو اس گھٹیا دنیا اور اس کے فانی بتوں معشوق اور معشوقاؤں پر مرتے ہیں اس کی مثال اس گدھ کی طرح ہے اور جو اپنی زندگانی خاص طور پر جوانی کو جوانی کے دینے والے اللہ پر فدا کرتا ہے وہ شاہباز کی طرح ہے اس لیے اس میں یہ سبق ہے ۔

کسی خاکی پہ مت کر خاک اپنی زندگانی کو
جوانی کر فدا اس پر کہ جس نے دی جوانی کو

پریشانئ حسن وشادانئ دیوانۂ حق

ہر حسن مجھے خوابِ پریشاں نظر آیا
دیوانۂ حق بس مجھے شاداں نظر آیا
چھایا ہے جب سے دل پہ تری یاد کا عالم
ہر ذرّہ مجھے منزلِ جاناں نظر آیا

مجھے تو یہ جہاں بے آسماں معلوم ہوتا ہے

گناہوں سے جو ظالم شادماں معلوم ہوتا ہے
مٹانا نفس کا اس کو گراں معلوم ہوتا ہے

جو ڈرتا ہے خدا کی راہ میں خونِ تمنا سے
وہ ظالم ننگ روباہِ جہاں معلوم ہوتا ہے

جو کر لے نفس امّارہ کو قابو میں تو وہ سالک
فقیری میں بھی سلطان جہاں معلوم ہوتا ہے

یہ خاکی ذکر کی برکت سے ہے فوق السماء لیکن
زمیں پر بھی نزول آسماں معلوم ہوتا ہے

دوام ذکر سے سنتا ہوں مل جاتی ہے وہ نسبت
کہ ان کو بھولنا کوہِ گراں معلوم ہوتا ہے

گزرتا ہے کبھی دل پر وہ غم جس کی کرامت سے
مجھے تو یہ جہاں بے آسماں معلوم ہوتا ہے

حقیقت میں ترا ہی آستاں داتا ہے عالم کا
مگر اسباب کا پردہ یہاں معلوم ہوتا ہے

کرم ہے دل پہ مالک کا بہ فیض مرشد کامل
کہ ہر ذرّہ یہاں ان کا نشاں معلوم ہوتا ہے

چمن میں جس کی تھی تنقید ہر دم ہر نشیمن پر
دھواں دیتا اسی کا آشیاں معلوم ہوتا ہے

ہمارے نالۂ درد محبت پر تعجب کیا
یہ انعام نگاہ بزرگاں معلوم ہوتا ہے

خدا کے فضل سے نسبت جسے حاصل ہوئی اخترؔ
پھر اس کا فیض فیض بے کراں معلوم ہوتا ہے

مشکل الفاظ کے معنی:۔شادماں: خوش۔ گراں: مشکل۔ خونِ تمنا: حرام خواہشات کا خون کرنا۔ **نفس امّارہ**: نفس کی وہ حالت جس میں وہ گناہ کا بہت زیادہ تقاضا کرتا ہے۔ **سالک**: کسی مرشد کامل کی صحبت میں اللہ کا راستہ طے کرنے والا۔ **سلطان**: بادشاہ۔ **خاکی**: مٹی سے بنا ہوا، مراد جسم۔ **فوق السماء**: آسمان سے بھی بلند۔ **دوام**: پابندی۔ **نسبت**: اللہ تعالیٰ تعلق خاص۔ **کوہِ گراں**: پہاڑ جیسا بوجھ۔ **آستاں**:......۔ **داتا**:......۔ **تنقید**:......۔ **نشیمن**:......۔ **آشیاں**: گھونسلہ۔ **بے کراں**:......۔

مہربانیاں جیسی قربانیاں ہیں

گناہوں سے جو ظالم شادماں معلوم ہوتا ہے
مٹانا نفس کا اس کو گراں معلوم ہوتا ہے

جس آدمی کو دنیا میں رہ کر اللہ کی نافرمانیوں میں زندگی گزارنے کی عادت ہوجاتی ہے اور اسے اس میں لذت اور خوشی محسوس ہوتی ہے تو پھر اس پر نفس کو مٹانا بڑا دشوار ہوتا ہے تمنا کے باوجود نفس کے تقاضے پر عمل نہ کرنے کی ہمت کمزور پڑ جاتی ہے خطوط میں بکثرت سالکین اس طرح کی باتیں پوچھتے ہیں کہ میں کیا کروں مجھ سے فلاں گناہ چھوڑا نہیں جارہا ہے سو ایسے ظالم کو سمجھ لینا چاہیے کہ گناہوں میں پڑ کر خوشی حاصل کرنے کی جو عادت پڑھ گئی ہے اس کی وجہ سے گناہ چھوڑنے کی ہمت نہیں ہورہی ہے اور جب تک گناہ نہ چھوڑے جائیں اور نفس کو نہ مٹایا جائے خلاف شریعت آرزوؤں کا خون نہ کیا جائے تو اس وقت تک نہ سلوک طے ہوتا ہے اور نہ کوئی خدا کا ولی بن سکتا ہے چاہے کتنے ہی حج وعمرے کررہا ہو اور کیسے ہی چلا کشی میں مشغول ہو لیکن گناہوں کا چھوڑنا ولایت کی اصل اور جڑ ہے۔ اعلانِ خداوندی ہے:

﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾

(سورۃ الانفال، آیت: ۳۴)

ترجمہ: اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو ہیں پرہیزگار۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ: ۲۲۵)

جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوست صرف وہ مسلمان ہیں جو گناہوں سے بچنے والے ہیں اس لیے ترکِ معصیت شرطِ ولایت ہے جو سالک گناہوں کو نہ چھوڑ کر ولایت کا خواب دیکھ رہا ہو تو یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا حضرت والا کے ایک وعظ میں بحوالہ حضرت تھانویؒ اس کی ایک بہترین مثال دی گئی ہے کہ وہ گناہ اس کے لیے عادت بن جانے کی وجہ سے لقمۂ شیریں بن چکے ہیں اس لیے ان کو چھوڑتے ہوئے نفس پر بہت زور پڑتا ہے۔ سو جس طرح کسی کے منہ کو لگا ہوا لذیذ لقمۂ شیریں چھڑانا بڑا مشکل ہوتا ہے اسی طرح اس وقت اس کا گناہ کو چھوڑنا مشکل ہورہا ہے سو ایسی صورت میں اگر یہ مجاہدہ کر کے اور دل پر زور ڈال کر اللہ کے لیے قربانی پیش کرے تو پھر اللہ اس پر اپنے تک پہنچنے کی راہ کھول دیتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(سورۃ العنکبوت، آیت: ۶۹)

ترجمہ: اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں اور بے شک اللہ ساتھ ہے نیکی کرنے والوں کے۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ: ۷۱۲)

صاحبو! بندہ جس درجے کا مجاہدہ اختیار کرتا ہے اس پر اللہ کی طرف سے ویسا ہی انعام ملتا ہے اس لیے

مقولہ ہے ''المشاہدہ بقدر المجاہدہ'' کہ جیسا مجاہدہ ہوتا ہے ویسا ہی مشاہدہ حق عطا ہوتا ہے اس لیے جو گناہوں کا عادی ہے وہ نہ ہمت ہارے اور نہ گھبرائے بلکہ دلیرانہ اور جرأت مندانہ اقدام کر کے گناہ کو بالکل چھوڑ دے تو اسے فوراً اتنا ہی اونچے درجے کا مقام ولایت عطا ہوگا۔

مجھے یاد ہے حضرت والا کا ایک بیان جنوبی افریقہ میں ریڈیو اسلام (Radio Islam) پر ہوا تو احقر سن رہا تھا کہ حضرت یہ خاص بات ارشاد فرما رہے تھے کہ اے جنوبی افریقہ والو! میں سلوک اور تصوف کو بہت آسان کر کے پیش کرتا ہوں اور تم سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ فرائض و واجبات اور سنن موکدہ کی ادائیگی کے بعد (جو کے مختصر ہیں) بس ایک کام کرلو اور وہ یہ ہے کہ نہ کرو (یعنی گناہ نہ کرو) اللہ کی نافرمانی نہ کروتو ولایت اور تقویٰ حاصل ہوجائے گا خود قرآن اس کے تقویٰ کی ضمانت اور سرٹیفکیٹ (Certificate) دے رہا ہے جیسا کہ اوپر آیت گزری ہے نوافل وتسبیحات کی کثرت کیفیات واحوال کا طاری ہونا، کشف وکرامات کا صادر ہونا ولایت نہیں کہلاتا بلکہ ولایت کا مدار اس پر ہے کہ ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی اپنے مولیٰ کو ناراض نہ کیا جائے ایک سانس بھی کسی گناہ اور نافرمانی کی طرف التفات نہ کیا جائے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں ہے:

﴿یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ کُلَّہٗ وَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ﴾

(السنن الکبریٰ للنسائی، کتاب عمل الیوم واللیلۃ، باب ما یقول اذا امسی، ج: ۹، ص: ۲۱۳)

کہ اے اللہ! مجھے پلک جھپکنے کے برابر بھی میرے نفس کے حوالے نہ کرنا یعنی اتنی دیر کے لیے بھی میں آپ سے غافل نہ ہوں اس لیے اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ بہت آسان ہے ہمارے قابو اور قدرت سے باہر نہیں ہے بس ہمت مردانہ چاہیے۔

گناہ گار شادماں معلوم ہوتا ہے مگر ہوتا نہیں

اس تعبیر کو اختیار کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ خدا کی نافرمانی میں ڈوبا ہوا ظالم انسان اور گناہوں میں حرام لذتیں اٹھانے والا اگرچہ دیکھنے میں شاد ماں اور خوش معلوم ہو رہا ہو لیکن حقیقی شادمانی اور خوشی کی اسے ہوا بھی نہیں لگتی ہمیں یہ کہنے میں ادنیٰ درجہ کا بھی شک نہیں۔ چنانچہ رات دن ایسے بے شمار واقعات اور مبتلائے معصیت لوگوں کے خطوط پڑھ کر اور کبھی کبھار اخبار و رسائل پر نظر ڈال کر مسلسل یہ حقائق سامنے آتے رہتے ہیں کہ عاصی و گناہگار اندر سے نہایت پریشان و بے چین رہتا ہے جس کا ظہور بہ کثرت خودکشی کے واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب کہ خودکشی کی واردات اللہ کے نیک بندوں سے کبھی نہیں سنی جاتی کیونکہ انہیں زندگی کی حلاوت نصیب ہوتی ہے اسی لیے بزرگوں نے ایک بڑی قیمتی بات لکھی ہے کہ طاعات کی یہ خصوصیت ہے کہ کرتے وقت میں گو مجاہدہ ہوتا ہے لیکن عین اسی وقت میں روح کو بہت اطمینان اور قرار اور لذت وحلاوت عطا ہوتی ہے اور وہ بعد تک قائم رہتی ہے جب کہ گناہوں اور نافرمانیوں میں کرتے وقت میں ظاہری لذت اور خوشی لیکن کرتے ہی فوراً پریشانی

اور بے چینی شروع ہو جاتی ہے اسی لیے آپ یہ محسوس کریں گے کہ رمضان کے شب و روز گناہوں سے حفاظت کے ساتھ تلاوت قرآن پاک اور ذکر و مناجات کے ساتھ گزارنے والے سال بھر اس کی حلاوت اور لذت روح میں پاتے ہیں اور اس کے بے تابی سے منتظر رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ سے یہ بات سنی تھی کہ ایک رمضان کو اچھی طرح گذارنے کا اثر سال بھر قائم رہتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ روزانہ کے حالات میں اس کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو آدمی خشوع و خضوع کے ساتھ نمازیں پڑھتا ہے اور شب اخیر میں اٹھ کر کچھ آہ و زاری کرنے کا عادی ہے وہ دن بھر اوقاتِ صلوٰۃ اور رات کے اخیر حصہ کا منتظر رہتا ہے ۔

خدا کی سرکشی سے خودکشی ہے مال و دولت میں
کبھی اللہ والوں سے نہیں ایسا سنا جاتا

اور شب اخیر کی لذتِ آہ وفغاں کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ شعر ۔

وعدہ ملنے کا شبِ آخر میں ہے
صبح سے ہی انتظارِ شام ہے

راہِ خداوندی کے لیے مزاج شیرِ نر چاہیے

جو ڈرتا ہے خدا کی راہ میں خونِ تمنا سے
وہ ظالم ننگ روباہِ جہاں معلوم ہوتا ہے

بندۂ مومن کو گناہوں سے بچنے کے سلسلہ میں مزاج شیر نر اور ہمت مردانہ اختیار کرنی چاہیے یعنی بڑی جرات اور ہمت کے ساتھ گناہوں کو چھوڑ دے اور لومڑیانہ خصلت اور مزاج روباہی سے دور رہے جو شخص ایسا کرے گا وہ جلد اللہ کا ولی بن جائے گا کیونکہ یہ راستہ محض تمناؤں سے طے نہیں ہوتا اس لئے بغیر کسی خوف وڈر اور اندیشۂ طعن وتشنیع کے گناہوں کو بالکل چھوڑ دے ورنہ اگر نیکیاں کرتا رہے اور جب کوئی حرام لذت اٹھانے کا وقت آئے تو اپنی اس تمنا کو پوری کر گزرے تو ایسے آدمی کو دل میں حلاوت قرب خداوندی کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے مثلاً ایک بڑی ٹنکی کو آپ نے پانی سے بھر دیا ہو مگر اس ٹنکی میں کسی جگہ چھوٹے بڑے سوراخ موجود ہوں تو ان سوراخوں کے ذریعے سے بتدریج پانی نکلتے نکلتے پوری ٹنکی پانی سے خالی ہو جائے گی ٹھیک اسی طرح طاعات وعبادات سے جو قرب خداوندی میسر آ رہا ہے اور جو انوارات اور تجلیات دل میں حاصل ہو رہی ہیں گناہوں کے چھوٹے بڑے سوراخوں کے ذریعہ سے وہ نکلتے جا رہے ہیں اور دل کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہو رہا ہے جیسے حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ حرمین میں ایک گاڑی میں سفر کر رہے تھے گرمی کی شدت تھی تو حضرت نے ڈرائیور سے یہ سوال کیا کہ تم نے ائیر کنڈیشن کھولا ہے یا نہیں؟ اس پر اس نے جواب دیا کہ جی ہاں کھولا ہے تو حضرت نے

پوچھا کہ گاڑی ٹھنڈی کیوں نہیں ہو رہی ہے تو اس نے جواب دیا کہ حضرت کوئی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اس پر حضرت والا نے اس قصہ سے فوراً ایک سبق نکالا اور یہ فرمایا کہ جو نور عبادتوں کے ذریعے دل میں آتا ہے وہ معاصی کی کھڑکیوں کے ذریعے نکل جاتا ہے کیونکہ معصیت کی ظلمت اور نحوست دل کے نور کو صاف کر دیتی ہے۔

روحِ سلوک احکام کی پابندی ہے کیفیات نہیں

صاحبو! احقر اس سے آگے بڑھ کر یہ عرض کرتا ہے کہ معصیت خداوندی کا اگر کوئی اور نقصان نہ بھی ہو اور بالفرض قلبی حلاوت ولذت متاثر نہ بھی ہو مگر اللہ کے ایک بندے کے لیے گناہ سے بچنے کے واسطے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک پالنے والے اللہ کی بغاوت کر رہا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں اس کا ہر سانس ہر لمحہ کی حیات اور ہر خوشی وغمی ہے اس لیے لذت وحلاوت سے صرف نظر کر کے مومن بندے کی بندگی کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کے قریب بھی نہ جائے۔ اصل ایمان کا تقاضہ یہی ہے۔

اسی لیے حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ بسا اوقات بندے کو عبادت کرنے میں مزہ نہیں آتا نہ تسبیح وتلاوت اور ذکر ومناجات میں دل لگتا ہے جسے سلوک کی اصطلاح میں قبض کہتے ہیں اور یہ صورت پیش آنے پر سالکین اکثر ذہنی الجھن اور پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں اور عبادات چھوڑ بیٹھتے ہیں حالانکہ ہمارا اصل مقصد اللہ کے حکم کی تعمیل ہے چاہے قلب کو کوئی حلاوت ولذت ملے یا نہ ملے اسی کو خواجہ صاحب نے یوں فرمایا۔

کبھی ہے دل میں جلال تیرا
کبھی ہے دل میں جمال تیرا
بس اب ہے دل اور خیال تیرا
کسی کا اس میں گزر نہیں ہے

یعنی دل پر جیسے ہی حالات وکیفیات آئیں خواہ جلالی ہوں یا جمالی پسندیدہ ہوں یا نہ پسندیدہ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں بس ہمارا مقصود تو اللہ کی ذات ہے اس لیے ایک موقعہ پر حضرت والا نے خط کے جواب میں احقر کو لکھا تھا کہ کیفیات محمود تو ہیں مقصود نہیں ہیں بنیادی چیز احکام کی پابندی ہے یہی اصل تصوف کی روح ہے۔

نفس امارہ پر قابو پالینے سے فقیری میں بادشاہی کا مزہ

جو کر لے نفس امارہ کو قابو میں تو وہ سالک
فقیری میں بھی سلطان جہاں معلوم ہوتا ہے

دوستو! نفس امّارہ کی مکاریوں اور چالاکیوں کو سمجھنا اہل اللہ کے پاس رہ کر ہی میسر آتا ہے ورنہ خواہ کتنا ہی عابد وزاہد ہو جائے مگر اس کی شرارتوں میں اس طرح الجھا رہتا ہے کہ جب کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے اور کسی

شیخ برحق کی خدمت میں پہنچتا ہے تو پھر اپنی گزری ہوئی زندگی کی ان حالتوں کو سوچ کر ندامت کے آنسوں روتا اور یہ کہتا ہے کہ ہائے افسوس میری زندگی کی وہ ساعتیں کہ جن میں میں نفس وشیطان کی مکاریوں اور شرارتوں کا شکار ہوتے ہوئے اپنے کو دین دار سمجھا کرتا تھا کیونکہ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی کسی راہ کو طے کیے ہوئے ہو تو اس کے نشیب وفراز اور اتار چڑھاؤ سے خوب واقف ہوتا ہے اور نفس ایسا اندرونی دشمن ہے کہ جو ہر قدم پر انسان کو ہلاکت کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے اسی لیے ایک حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿لَیسَ الشَّدِیدُ بِالصُّرعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیدُ الَّذِی یَملِکُ نَفسَهُ عِندَالغَضَبِ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الغضب والکبر، ص:۴۳۳)

یعنی حقیقی پہلوان اور بہادر وہ شخص نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ ڈالے اور شکست دے دے بلکہ حقیقی پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت میں اپنے نفس پر (Control) اور قابو کر لے ہاں اگر کبھی اس کے تقاضے پر عمل بھی ہو جائے اور نفس ہم پر غالب آجائے تو پھر بھی ہمت ہار کے بیٹھ جانا نہیں چاہیے جس کو خواجہ صاحب نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

نہ چت کر سکے نفس کے پہلواں کو
تو یوں ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے نہ ڈالے
ارے اس سے کشتی تو ہے عمر بھر کی
کبھی وہ دبالے کبھی تو دبالے

اور اسی کو حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی نے یوں فرمایا ؎

ہم نے طے کیں اس طرح سے منزلیں
گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

اس لیے سالک کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کے میں پہلے ہی دن نفس کے تمام تقاضوں کو پامال کر دوں گا اور اس پر قابو پا جاؤں گا اور ذرا بھی کوئی چوک اور خطا مجھ سے سرزد نہیں ہوگی بلکہ یہ عزم رکھے کہ ایسا ہونے تو نہیں دوں گا لیکن اگر ہو گیا تو پھر اللہ سے توبہ کر کے دوبارہ اسی راہ پر چلنا شروع کر دونگا۔

بہر حال حضرت والا فرماتے ہیں جو اپنے نفس امارہ کو قابو میں کر لے گا تو اسے دنیا جنت معلوم ہونے لگے گی اور فقیری میں سلطانی کا مزہ آئے گا گو کہ اس کے پاس ظاہری شان وشوکت، سلطنت وحکومت، مال و دولت جاہ و مرتبہ حاصل نہ ہو لیکن مقصدِ حکومت و دولت یعنی سکون و اطمینان کی زندگی اس کو حاصل ہوگی اور جہاں رہے گا با عزت بن کے رہے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وعدہ ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَتْ نِیَّتُهُ طَلَبَ الْاٰخِرَةِ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِی قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَهُ شَمْلَهُ اَتَتْهُ الدُّنْیَا وَهِیَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ کَانَتْ نِیَّتُهُ طَلَبَ الدُّنْیَا جَعَلَ اللّٰهُ الْفَقْرَ بَیْنَ عَیْنَیْهِ وَشَتَّتَ عَلَیْهِ اَمْرَهُ وَلَا یَاْتِیْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا کُتِبَ لَهُ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب الریاء والسمعة، ۴۵۴)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی نیت و مقصد آخرت کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غناء عطا فرما دیتے ہیں اور اس کے بکھرے ہوئے معاملات کو اس پر سمیٹ دیتے ہیں اور یکجا کر دیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے اور جس شخص کی نیت و مقصد دنیا کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے فقر و محتاجگی کو اس کی نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں اور اس کے معاملات اس پر منتشر ہو جاتے اور بکھر جاتے اور اسے دنیا فقط اس کے مقدر کے مطابق ہی نصیب ہوتی ہے۔

یعنی جو بندہ پورا اللہ کا ہو جاتا ہے دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے لیکن اس مقام پر یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اللہ کا بندہ بننا اور نیک و صالح ہونا اس نیت سے نہ ہو کہ لوگ میرے پاس آئیں ھدایا و تحائف لائیں ہر طرف مجھے عزتیں اور عظمتیں ملیں اور چونکہ میں اللہ والا ہوں تو ان دنیا والوں کو میرے پاس آ کر میرے سارے کام بنانے چاہیے اگر خود کوئی اس نیت سے نیک بنے گا تو حدیث تو اپنی جگہ سچی اور صحیح ہے لیکن اس کی نبت میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے اس کے حق میں یہ وعدہ نہیں ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو مٹا کر اللہ کا بندہ بنا لیا تو پھر انہیں فقیری میں بھی بادشاہت کا مزہ مل گیا۔

نسبت مع اللہ کی حقیقت اور اس کا اثر

یہ خاکی ذکر کی برکت سے ہے فوق السماء لیکن
زمیں پر بھی نزولِ آسماں معلوم ہوتا ہے
دوام ذکر سے سنتا ہوں مل جاتی ہے وہ نسبت
کہ ان کو بھولنا کوہِ گراں معلوم ہوتا ہے

نسبت مع اللہ کا حصول مومن کے لیے بہت عظیم الشان نعمت ہے جس کا طریقہ دوام ذکر اور کثرت طاعت ہے یعنی ایک لمحہ غفلت میں نہ گزرے اور معصیت و نافرمانی غفلت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے اور طاعت و عبادت ذکر کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے حضرت شاہ احمد پرتا بگڑھی نے نسبت مع اللہ کو بیان فرماتے ہوئے ایک شعر میں یوں فرمایا۔

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

یعنی آپ جس حال میں بھی رہیں اور جو کام بھی کریں اس وقت کا جو حکم ہو اسے یاد رکھیں یہی یاد رکھنے کی حقیقت ہے خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ حضرت مفتی شفیع صاحب اور دوسرے بعض حضرات اکابر کو علماء کی مجلس میں باتوں کے ذریعہ سے ہنسایا پھر یک دم سوال کیا کہ بتاؤ کون ہے اس وقت میں جو اللہ کی یاد سے غافل نہ تھا اس پر سب خاموش رہے تو پھر خواجہ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

ہنسی بھی ہے گو لبوں پہ ہر دم
اور آنکھ بھی میری تر نہیں ہے
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

اسی لیے اہل اللہ اگر ہنستے بھی ہیں تو اس میں اتنا حد سے تجاوز نہیں کرتے کہ جو قلبی غفلت کا سبب ہو کیونکہ جو لمحہ ان کا غفلت میں گزرے وہ ان کے لیے کوہ گراں سے کم نہیں ہے اسی لیے جو شخص پوری فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ اگر وہ گناہوں کی محفل سے گزر بھی جائے تو اس کی طبیعت میں کڑھن اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے یا کوئی ایسا معاملہ سامنے آ جائے جس کی وجہ سے اس کے معمولات ذکر و تلاوت وغیرہ متاثر ہوں تو اس پر بہت دشوار گزرتا ہے اور یک گونہ معاصی سے نفرتِ شرعی، عقلی اور طبعی بن جاتی ہے جیسا کہ حضرت گنگوہی نے حضرت حاجی صاحب کے پاس رہنے کی برکت سے ان چار باتوں کے حاصل ہونے کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے طاعات کہ طبعاً مرغوب ہو گئیں اور معاصی سے نفرت پیدا ہو گئی۔

قیامت کے دن مومن کے لیے زندگی کی وہی گھڑی حسرت و افسوس کا باعث ہو گی جو اس نے خدا کی یاد سے غافل ہو کر گزاری ہو خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ جنھوں نے کسی صاحب نسبت کے پاس رہ کر نسبت مع اللہ کا تحفہ حاصل کر لیا اور اپنی قیمتی زندگی کی ایک ایک منٹ سیکنڈ کو غفلت میں گزرنے سے بچا لیا۔

گزرتا ہے کبھی دل پر وہ غم جس کی کرامت سے
مجھے تو یہ جہاں بے آسماں معلوم ہوتا ہے

یہ مضمون بہت سے اشعار کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے اس جگہ حضرت والا کا منشاء یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا عظیم مجاہدہ بندہ اختیار کرتا ہے اور ایسے حالات غیر اختیار یہ سامنے آتے ہیں کہ ان پر صبر کر کے اور ان سے گزر کر دل میں اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا وصل محبوب کے سارے حجابات ہٹا دیے گئے ہوں اس قدر قرب اور نزدیکی کا مزہ ملتا ہے۔

اسباب کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی طاقت کارفرما ہے

حقیقت میں ترا ہی آستاں داتا ہے عالم کا
مگر اسباب کا پردہ یہاں معلوم ہوتا ہے

یعنی جو کچھ بھی عالم میں ہو رہا ہے اور کسی بھی انسان کو جو کچھ مل رہا ہے وہ تن تنہا اللہ وحدہ لاشریک لہ کے در سے مل رہا ہے دوسرے کسی اور در سے نہیں خواہ وہ چھوٹی چیز ہو یا بڑی سب کا تعلق اللہ کے فیصلے سے ہے بظاہر جہاں

سے بھی کچھ ملتا ہوا نظر آتا ہے وہ سب اسباب ہیں مگر ان کے پردے میں اللہ کی طاقت کارفرما ہے ہمیں جو لگتا ہے فلاں نے دے دیا یا فلاں جگہ سے آیا یا فلاں ذریعے سے میرا کام بن گیا سب کے در پردہ اللہ ہی کی قوت ہے جو کرا رہی ہے اور یہ مومن کے ایمان کی جڑ ہے۔

اسی لیے دعوت و تبلیغ کے پہلے نمبر پر اسی کی دعوت دی جاتی ہے اور یہی بتایا جاتا ہے کہ کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے اگر اللہ چاہے بننے کے نقشوں میں بگاڑ دے اور اگر اللہ چاہے بگڑے ہوئے حالات میں سنوار دے اس سے ہمارے لیے ایک نصیحت یہ نکلتی ہے کہ ہمیں اپنی حمایت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو لینے کی فکر کرنی چاہیے اور کسی بھی چیز کے حصول کے ایسے ہی اسباب اپنانے اور اختیار کرنے چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب نہ ہوں اس کے برخلاف کرنے کی صورت میں اگرچہ زبان پر دعویٰ تو ہو کہ کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے مگر نافرمانی کر کے کسی چیز کے حصول کی کوشش اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا اپنے اس دعویٰ پر یقین نہیں ہے۔

کار دین بطریقہ دین معتبر ہے

اس لیے جو لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر دعوت و تبلیغ کے کام میں نکلتے ہیں یا کسی اللہ والے کی خانقاہ کا رخ کرتے ہیں یا کسی اور دینی رفاہی کام سے گھر بار چھوڑ کر جاتے ہیں اور ان کی جوان لڑکیاں اور عورتیں دکانوں پر پھرتی ہیں اور اپنی تجارت کو سنبھالنے کے لیے صبح سے شام تک آفس (Office) اور دکان میں رہتی ہیں خاص طور پر اس صورت میں جب کہ بے پردہ غیر محرموں کے ساتھ ملنا جلنا اور ہنسنا بولنا بھی ہو رہا ہو اور اجنبی کے ساتھ خلوت بھی پائی جا رہی ہو خواہ ایسی گاڑی میں کہ جس کے شیشے کالے (Tinted) ہوں جس میں باہر سے اندر کا اور اندر سے باہر کا نظر نہیں آتا ہو یا ایسے آفس (Office) میں جہاں نوکر اور دکان کا مالک، اس طرح تنہائی میں بیٹھتے ہیں کہ وہ آفس Office لوک (Lock) ہوتا ہے جس کو کھولنے کا بٹن اندر بیٹھے ہوئے مالک کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان کے ارادے اور اختیار کے بغیر کوئی تیسرا آدمی وہاں داخل نہیں ہو سکتا تو یہ صورت اجنبی مرد اور عورت کے خلوت میں ہونے کی - جو شریعت میں قطعی طور پر حرام ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب النظر الی المخطوبۃ، ص: ۲۶۹)

یعنی ایسا کبھی نہیں ہوسکتا یعنی یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی کہ کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ ہو اور وہاں شیطان نہ ہو بلکہ جب بھی کوئی کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہوگا تو ضرور وہاں شیطان بھی موجود ہوگا تو ایسے لوگ جو اس طرح اپنی عورتوں کو شیطان کے جال میں پھانس کر اور اللہ کے احکام کو توڑ کر گھر سے باہر سفر کرتے ہیں ان کا یہ چلے میں جانا یا خانقاہ میں رہنا اور اپنے ذہن میں سوچنا کہ میں دینی مشن (Mission) پر نکلا ہوں بہت بڑی غلط فہمی ہے پھر مزید کھڑے ہو کر تقریر میں یہ کہنا کہ دینے والی ذات اللہ کی ہے خود اپنے کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔

میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کا یہ عقیدہ تھا اور ہونا چاہیے تو آپ نے اپنی بیوی اور جوان بیٹی کو دکان پر کیوں چھوڑا تو آپ جواب میں کہتے ہیں کہ اس کے بغیر دکان نہیں چلتی اور پورے چالیس دن تک دکان کو بند نہیں رکھا جا سکتا اور کوئی بھروسہ کا آدمی نہیں مل رہا ہے اس لیے میں نے اپنی جوان بیٹی کو وہاں کھڑا کر دیا ہے تو اے میرے بھائی غور کرنے کا مقام ہے کے شیطان نے اس وقت ہمیں کتنے بڑے دھوکے میں ڈالا گویا لفظ بدل کر یوں کہیے ایک طرف تو ہم اللہ کے رزاق ہونے کی بات کہہ رہے ہیں اور دوسری طرف دکان کو رزاق سمجھ رہے ہیں ورنہ کسی بھی قیمت پر محض روزی کے لیے حکم خداوندی کو توڑنے کی جرأت نہ ہوتی اور ہمارا یہ فیصلہ ہوتا کہ خواہ کچھ بھی کچھ ہو مگر میں اللہ کے فیصلے کو توڑ کر اس کی ناراضگی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں کرتا کیونکہ ایک حکم الٰہی کو توڑنا زمین و آسمان کے ٹوٹ جانے سے بڑھ کر ہے۔

نافرمانی کے ساتھ روزی کمانا بے برکتی کا سبب ہے

اور اس سے آگے بڑھ کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ کی نافرمانیاں کر کے کمائی ہوئی روزی برکت سے خالی ہوتی ہے اس لیے اس طرح سے جو روزی آپ کو حاصل ہوگی آپ برکت سے محروم رہیں گے اگر آپ اس عرصے میں دکان کو بند رکھتے یا کسی معتمد ذمہ دار شخص کو آفس (Office) یا دکان میں مقرر کر کے جاتے اگرچہ اس کے معتمد ہونے کی وجہ سے دو چار ہزار مزید آپ کو دینے پڑتے لیکن میں یہ سچ عرض کرتا ہوں کہ اس میں ایسی برکت حاصل ہوتی کہ آپ کو لاکھوں ضرورتیں پوری ہوتی ہوئی نظر آتیں یہی برکت کی حقیقت ہے کہ جو قلیل ہو مگر کثیر کے لیے کافی ہے اس لیے ہر بندہ مومن کو یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ سب کچھ دینے والے اللہ ہیں لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت کو چھوڑ کر سوائے محرومی اور ناکامی کے کچھ نہ پاسکوں گا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ مجھے جو کچھ رزق و روزی بہ عافیت حاصل ہو رہی ہے گو کہ وہ دکان کے ذریعے ہے مگر اس کے پردے میں سب اللہ کا فیصلہ کارفرما ہے۔

احقر کا ایک عبرت آموز واقعہ

بحمد اللہ تعالیٰ بندہ ناچیز کے پاس بھی ایک جائز چھوٹا سا کاروبار ہے تو ایک دن ایک عالم ملنے کے لیے دکان پر تشریف لائے اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کی دکان میں سیل مین (Sales man) صرف مرد ہیں تو بہت سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کے طور پر نہ کہ محض مزاحی انداز کے ساتھ بندہ کو یہ نصیحت کرنے لگے کہ میاں تم کو دکان چلانا نہیں آتی اور آپ کو ساؤتھ افریقہ کا اسٹائل (Style) معلوم نہیں ہے آپ دکان پر کسی عورت کو رکھیں اور پھر دیکھیں دکان کتنا چلے گی اور لوگوں کی دکان سے دلچسپی بڑھ جائے گی اور خریداروں کی آمد و رفت میں نمایاں اضافہ ہوگا۔

تو بندے نے توفیق الٰہی سے ان کو یہ جواب عرض کیا کہ بھائی ہم نے دکان روزی کے لیے نہیں کھولی بلکہ

رزاق کے حکم کے تحت کھولی ہے یعنی دکان سے روزی کمانا مقصد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو حکم دیا ہے کہ تم حلال کمائی کے اسباب اختیار کرو میں تمہیں روزی دوں گا اس لیے دکان کسی کو روزی نہیں دیتی یہ محض ایک سبب اور ذریعہ ہے اور میں دکان کو رزاق نہیں سمجھتا اگر دکان چلانے کے لیے ہمیں کسی معصیت اور گناہ کا ارتکاب ضروری ہو جائے اور اس کے بغیر چارہ نہ رہے اسی دن دکان کو بند کر دینگے۔ وہ کون ہے کہ جس نے ہمیں اس وقت تک پالا جب تک کہ ہمارے پاس دکان نہیں تھی اور آج بھی سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو اللہ تعالیٰ بغیر کسی دکان کے پال رہے ہیں۔

صاحبو! ذرا اندازہ تو لگاؤ کہ آج کل نصیحت کرنے والے نہ صرف یہ کہ وہ برائی سے نہیں روکتے بلکہ برائی کا مزید حکم دیتے ہیں جیسا کے ایک روایت میں ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام کو اس بات کی خبر دی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ دینگے تو صحابہ نے بڑے تعجب سے سوال کیا یا رسول اللہ کیا ایسا ہوگا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ **نَعَمْ وَاَشَدُّ مِنْهُ** کہ اتنا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ہوگا کہ لوگ برائی کا حکم دینگے اور بھلائی سے روکے گیں۔ آج کل بظاہر ایسی ہی صورت حال نظر آرہی ہے اس لیے خاص طور پر اس زمانے میں بہت شدید ضرورت ہے کہ دوستوں کا انتخاب صحیح طور پر دین کے معیار پر ہو جو حقیقی نفع ونقصان جانتے اور سمجھتے ہوں اور بوقت ضرورت صحیح نفع اور مفید مشورہ دے سکیں۔ ایسے ہی زمانے کے لیے جناب رسول اللہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی:

﴿بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب السنۃ، ص ۲۹)

مطلب یہ ہے کہ دین اجنبیت کی حالت میں شروع ہوا کہ لوگوں کو دین اور اس کے اعمال عجیب وغریب لگتے تھے اور جس طرح وہ شروع ہوا ہے عنقریب اسی حالت میں لوٹ جائے گا اور جو اس وقت میں اس غریب دین کو اپنے سینے سے لگائیں گے ان کے لیے بڑی خوش خبری ہے جن کا خاص کام یہ ہوگا کہ لوگوں نے جو میری سنتوں اور طریقوں اور دین کے حکموں میں بگاڑ پیدا کیا ہوگا وہ اس کی اصلاح کریں گے اور ایک دوسری حدیث شریف میں ایسے آدمی کے متعلق بڑی فضیلت مذکور ہے ارشاد نبوی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب السنۃ، ص ۳۰)

کہ جس نے امت میں بگاڑ کے وقت میری سنت کو زندہ کیا تو اس کو سو شہیدوں کو ثواب ملے گا ظاہر ہے کہ اتنا عظیم الشان اجر ملنا اسی لیے ہے کہ ایسے پرفتن دور میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر عمل کرنا اور ان کو زندہ رکھنا بہت ہی دشوار اور مشقت پر مبنی ہوگا اپنوں اور غیروں کی ملامت اور طعن وتشنیع کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہر ذرّۂ مخلوق نشانِ خالق ہے

کرم ہے دل پہ مالک کا یہ فیض مرشد کامل
کہ ہر ذرہ یہاں ان کا نشاں معلوم ہوتا ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾
(سورۃ الجاثیۃ، آیت: ۳)

ترجمہ: بے شک آسمانوں میں اور زمین میں بہت نشانیاں ہیں ماننے والوں کے واسطے۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۷۷۵)

اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر بہت سی نشانیاں رکھی ہیں اور خود ہماری ذاتوں کے اندر بہت سی نشانیاں موجود ہیں اگر ہم غور وفکر کریں اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر جب انسان کے دل میں معرفت کا نور آنے لگتا ہے اور غیر اللہ سے وابستگی اور تعلق دل سے دور ہونا شروع ہوتا ہے تو پھر یہ مومن کائنات کے ہر ذرے میں غور وفکر کرتا ہے اور ہر چہار سو عالم کا پورا نقشہ زمین و آسمان چاند و سورج شجر و حجر، جبال و بحار غرض کہ ہر ذرہ عالم اللہ کی طرف رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور قرآن نے حقیقی عقل مندی کا معیار اسی کو قرار دیا ہے کہ عقل مند حقیقت میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو نظامِ عالم میں غور کر کے رب العالمین تک پہنچ جاتے ہیں اور مخلوق میں غور کر کے خالق کو پا لیتے ہیں اور عربی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

وَ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

اور بزبان فارسی یہ شعر ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

اور بالآخر غور وفکر کر کے یہ اہل عقل وفہم لوگ یہ پکار اٹھتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کہ اے ہمارے رب آپ نے یہ سارا نظامِ عالم بے مقصد اور بلا ضرورت پیدا نہیں فرمایا اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز فائدہ سے خالی نہیں بلکہ ایک ایک ذرہ کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کو لئے ہوئے ہے خواہ ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو۔

کاش کہ سائنس داں (How) سے ہو (Who) تک پہنچتے

میرے دوستو! کیا ہم نے کبھی سائنس (Science) اور جدید ٹکنالوجی (Technology) کے علم پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا ہے یا نہیں؟ اگر غور نہیں کیا ہے تو آج احقر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے کہ ہم سب مل کر یہ سوچیں کہ

پوری سائنس از اوّل تا آخر اسی حقیقت کی تو ترجمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرے ذرے کی تخلیق میں کس قدر بے شمار منافع رکھے ہیں۔ سائنس دان کا کام صرف اتنا ہی تو ہے کہ اللہ رب العزت کی طرف سے اشیاء میں رکھی ہوئی قیمتی اور نفع بخش تاثیر سامنے لے آتے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں تو اگر ہم غور کریں تو یہ پتہ چلے گا کہ پوری سائنس (How) کے جواب پر مبنی ہے اے کاش کے یہ سائنسداں اپنی ان جدید تحقیقات کے ذریعے (Who) کا جواب بھی پا لیتے۔

میرا مطلب ان دو جملوں سے یہ ہے کہ دنیا بھر کے سائنسدان اپنی جدید تحقیقات اور ریسرچ کے ذریعے چیزوں میں رکھے گئے فوائد کا پتہ لگا کر اس سے کوئی بھی نفع بخش سامان تیار کر لیتے ہیں مگر ان کو اس کے ساتھ ساتھ اس پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ ان چیزوں میں یہ اثرات اور خصوصیات اور فوائد و منافع کس ذات عالی نے رکھیں ہیں اور ان چیزوں کو اس ذات تک پہنچنے کا ذریعہ بنانا چاہیے اگر اس نقطہ نظر سے غور کرنا شروع کر دیں تو دنیا کے ہر سائنسدان کو ایک احکم الحاکمین علیم وخبیر قادر و مقتدر ذات پر ایمان لانا پڑے گا یہی تمام قرآنی آیاتِ تدبر و تفکر کی دعوت اور ان کا تقاضہ ہے۔ اس پر احقر کو ایک مثال یاد آئی بچپن کا واقعہ ہے جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری والدہ کو ایک بیماری لاحق ہوئی اور بدن کے اندر ایک خاص قسم کی گٹھلی سی محسوس ہوتی تھی تو ایک ہندو ڈاکٹر ہمارے شہر کے سرکاری ہسپتال میں بڑے درجے کی ڈاکٹر تھی اس کا نام تلوار تھا والدہ کا بڑا اکرام کرتی تھی برابر اس بات پر اصرار کرتی رہی کہ اس کا ایک مختصر سا آپریشن کرنا پڑے گا مگر اس کے لیے ہماری والدہ بالکل تیار نہیں ہوئیں بالاخر دیوبند میں ایک حکیم تھے جن کا نام حکیم محمود تھا انہوں نے ہماری والدہ کے لیے یہ تجویز کیا کہ ایک چھوٹا سا درخت ہے جو عام طور پر پانی کی نالیوں کے پاس اگتا ہے اس کا نام اگرچہ ابھی اس وقت راقم سطور کے ذہن میں نہیں مگر انہوں نے اس کے پتے تجویز کیے اور یہ بتایا کہ چند دن ان پتوں کو ان پر تیل لگا کر اور ذرا گرم کر کے رات کو لیٹتے وقت اپنے بدن پر لگا لو چنانچہ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ اندر سے وہ گٹھلی بالکل ختم ہوگئی۔

احقر کا مقصد واقعہ ذکر کرنا نہیں بلکہ بنیادی بات یہ پیش کرنی ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار فوائد رکھے ہیں کچھ پر انسان مطلع ہو پاتے ہیں اور زیادہ پر مطلع نہیں ہو پاتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قیامت آنے تک انسان آتے رہیں گے اور میرے اللہ کی بنائی ہوئی اشیاء عالم سے مختلف انواع کے فائدے اٹھاتے رہیں گے۔ سمجھداری اور عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کے ہم کائنات میں گم ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ اس میں غور کر کے خالق کائنات تک پہنچیں۔ ہائے افسوس آج کا سائنسدان اسی مرض میں مبتلاء ہے کہ وہ کائنات کی ریسرچ (Research) وتحقیق میں ایسا گم ہوا کہ وہ اپنے کو بالکل بھول گیا۔

فکرِ خلق و ذکرِ خالق

اس مقام پر ایک اہم بات یہ بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خلق میں فکر کا حکم ہے اور خالق کے ذکر کا حکم ہے یعنی بندہ مخلوقات میں غور کرے اور خالق کا ذکر کرے کیونکہ اگر بندہ خالق میں غور کرے گا اور اپنی عقل سے سمجھنا چاہے گا تو سوائے الجھنے کے وہ کبھی سلجھ نہیں سکتا اور سوائے بھٹکنے کے اسے کبھی سیدھی راہ میسر نہیں ہو سکتی اسی لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے

﴿تَفَكَّرُوْا فِي خَلْقِ اللهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي اللهِ﴾

(كنز العمال، رقم الحديث: ٥٧٠٨)

یعنی اللہ کی مخلوقات میں غور کرو خود اللہ کی ذات میں غور و فکر نہ کرو یہی تو وجہ ہے کہ فلسفیوں کو آج تک راہِ حق نہیں مل سکی کیونکہ انہوں نے اللہ کو عقل سے سمجھنا چاہا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

غرض یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور کرے تو خالق کو پا جائے گا چنانچہ ایک مرتبہ حضرت والا ساؤتھ افریقہ کے بہت بڑے جنگل "Crugo National Park" تشریف لے گئے تھے تو احباب سے یہ فرمایا کہ تم یہ مت سمجھنا میں وہاں شیر اور ہاتھیوں کو دیکھنے جا رہا ہوں بلکہ میں تو شیروں اور ہاتھیوں کے ذریعے ان کے خالق کو پانے کے لیے جا رہا ہوں اسی لیے فرمایا گیا تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ اَلْفِ سَنَةٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں تھوڑی سی دیر کا تدبر اور تفکر ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

اہل دل پر اعتراض کے بجائے اعتقاد و اتباع لازم ہے

چمن میں جس کی تھی تنقید ہر دم ہر نشیمن پر
دھواں دیتا اسی کا آشیاں معلوم ہوتا ہے
ہمارے نالۂ دردِ محبت پر تعجب کیا
یہ انعامِ نگاہِ بزرگاں معلوم ہوتا ہے

خلاصہ ان اشعار کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے خاص بندوں کے ساتھ ربط و تعلق نہیں رکھتے اور ان کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی تو دور دور رہتے ہوئے ان کے ذہنوں میں اشکالات و اعتراضات آتے رہتے ہیں اور تنقید و تبصرے ان کی زبانوں پر جاری رہتے ہیں لیکن جب ان کو اس راہ سے کچھ مناسبت پیدا ہوتی ہے اور وہ کسی شیخ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس راہ کو طے کرنا شروع کرتے ہیں تو انہیں خود اپنے دلوں کے اندر اللہ کی عشق و محبت کی

آگ لگتی دکھائی دیتی ہے اور پھر اس کے آثار خلق پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں وہ خود زبان حال سے یوں کہتے ہوئے ہوتے ہیں ۔

تو نے مجھ کو کیا سے کیا شوق فراواں کردیا

پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کردیا ○

اس کی گفتار، کردار، رفتار سب بدل جاتی ہیں جو آنکھیں کل تک خشک تھیں انہیں سے نالہ دردِ محبت جاری ہو جاتا ہے اور جو کل تک بالکل گمنامی اور یکسوئی کی زندگی گزار رہا تھا اب چاروں طرف لوگوں میں اس کا فیض جاری و ساری ہو جاتا ہے مگر یہ سب کچھ جب ہی حاصل ہوتا ہے کہ کسی شیخ کامل کے سامنے اپنے کو فنا کردے اور اس کی خدمت و صحبت کو لازم پکڑ لے اور اخلاص و اتباع اور اطلاع و انقیاد کے ساتھ اپنے شیخ کے ساتھ تعلق رکھے تو اگرچہ وہاں بیانات اور تقریریں نہ ہوتی ہوں لیکن شیخ کامل کی صحبت و معیت اور نظر عنایت ہی اس کی ترقی کے لیے کافی ہے کیونکہ اللہ والوں پر جو رحمتیں آسمان سے اترتی ہیں تو ان کے پاس بیٹھنے والے بھی محروم نہیں رہتے۔ چنانچہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ایک خادم تھے اور گرمی کے زمانے میں حضرت کو پنکھا جھل رہے تھے اسی دوران انہوں نے حضرت سے یہ سوال کیا کہ اللہ والوں کے پاس دفن ہونے سے نفع پہنچنے کی کیا وجہ ہے جب کے دونوں اپنی قبر میں الگ الگ لیٹے ہوئے ہیں تو حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے خادم سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ اس وقت تم پنکھا کس کو جھل رہے ہو اور کس کی نیت سے ہوا کر رہے ہو تو اس نے جواب میں کہا کہ حضرت میرا مقصود تو آپ ہیں اس پر حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ جو لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ان کو ہوا پہنچ رہی ہے یہ نہیں اس نے جواب دیا کہ جی ہاں! بالکل پہنچ رہی ہے اور کہنے لگا کہ حضرت میرے سوال کا جواب بھی مجھے سمجھ آ گیا ہے۔

اس لیے اس واقعہ سے مقصد یہ ہے کہ بزرگوں کی نگاہوں اور توجہات اور ان کی صحبتوں اور دعاؤں کے اثرات ساتھ رہنے والے پر ضرور پڑھتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جس محلے اور بستی میں کوئی اللہ والا موجود ہو تو اس کی برکت سے پوری بستی بہت سے فتنوں سے محفوظ رہتی ہے۔

جس دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کو دل میں یہ محسوس ہوا کہ ایک عجیب قسم کی روشنی غائب ہوگئی اور دل بجھ گیا خاص قسم کی دل پر ایک کیفیت محسوس ہوئی خود خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں یہ سمجھ گیا کہ حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ کا وصال ہو چکا ہے اور فوراً گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹھیک اس وقت جب دل کی وہ کیفیت ہوئی تھی وہی حضرت کے وصال کا وقت تھا۔

حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمہ اللہ کی حکومت انتہائی درجہ عدل و انصاف پر قائم تھی جس کا اثر یہ تھا کہ بھیڑیا بکری کو نہ چھوتا تھا مگر جس دن لوگوں نے یہ حالت دیکھی کہ اب بھیڑیا اور بکری ایک جگہ جمع نہیں ہو رہے ہیں تو انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ امیر المومنین حضرت عمر ابن عبد العزیز اب روئے زمین پر موجود نہیں ہیں۔

بہر حال میرا منشاء یہ بتانا ہے کہ جب اہل اللہ کے وجود سے علاقے اور بستی والے محروم نہیں رہتے تو جوان کے ساتھ زندگی گزارے گا وہ کیسے محروم رہ سکتا ہے۔

نسبت مع اللہ کی خوشبو خود مہک اٹھتی ہے

خدا کے فضل سے نسبت جسے حاصل ہوئی اختر
پھر اس کا فیض فیض بے کراں معلوم ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کام اپنے ایسے خاص بندوں سے لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوب اور پسندیدہ ہوں اور ان کی زندگی میں اور موت کے بعد ان کا فیض عام اور تام فرمادیتے ہیں جیسا کہ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں کہ جنھوں نے نسبت مع اللہ حاصل کی اور اولیاء صدیقین کی نسبت پاگئے خواہ وہ اچھے مقرر فصیح و بلیغ متکلم اور فن شعر وشاعری کے ماہر نہ ہوں اور نہ ہی انہوں نے مختلف علوم وفنون پر تصنیف وتالیف کی ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے فیض کو جاری کر کے کفر وشرک اور فسق و فجور کی ظلمتوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو وہاں سے نکال لیا اور معاصی کی ظلمت کو روشنی سے مبدل کر دیا اور ان کے ذریعے بڑے انقلابات رونما ہوئے گفتگو کا سیدھا سادہ انداز دلوں کی کایا پلٹ دینے کے لیے کافی ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کے بارے میں کسی نے کہا تھا۔

مردوں کو زندہ کیا اور زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھو ذرا ابن مریم

اس شعر کا منشاء نعوذ باللہ ابن مریم حضرت عیسیٰ قرار دینا نہیں ہے بلکہ شاعر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے مردوں کو زندگی مل جاتی تھی اسی طرح حضرت شیخ الہند کے ذریعہ مردہ دلوں کو ایمانی حیات نصیب ہوئی اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ حضرت شیخ الہند کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ لوگ میرے استاد کو شیخ الہند کہتے ہیں اور حقیقت میں اس طرح ان کے مرتبہ کو گھٹاتے ہیں وہ صرف شیخ الہند نہیں بلکہ شیخ العالم تھے۔

میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ نسبت مع اللہ حاصل ہونے کے بعد اس کا فیض اللہ تعالیٰ چاروں طرف پہنچاتے ہیں لوگوں کے قلوب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس بندے کی نسبت اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں محبت ڈالتے ہیں تو پھر لوگ جوق در جوق اس کے پاس آ کر دین بھی سیکھتے ہیں اور اس کی عزت واکرام بھی کرتے ہیں اور خود بہ خود اس کے چاہے بغیر مخلوق کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

قرب کیا جانے جو دیدہ اشک باریدہ نہیں

احتسابِ روزِ محشر سے جو لرزیدہ نہیں
ایسے ظالم نفس میں انجام بیں دیدہ نہیں
عشق ظالم سے یہ ناممکن ہے وہ صابر رہے
پھر تعجب کیا جو دردِ عشق سنجیدہ نہیں
کس قدر مسرور ہیں اللہ والے ذکر سے
کوئی بھی ان کے سوا دنیا میں خندیدہ نہیں
نام روشن کر گئے مر کر کے حق پر عارفیں
مر گئے جو مرنے والوں پر وہ حق دیدہ نہیں
پالیا جس نے خدا کو پالیا سارا جہاں
کون کہتا ہے کہ اہلِ دل جہاں دیدہ نہیں
لذت قرب ندامت گریہ و زاری میں ہے
قرب کیا جانے جو دیدہ اشک باریدہ نہیں
جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہوگئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں
جب بصارت کی حفاظت سے بصیرت مل گئی
ہو کے نادیدہ بھی اس کی آنکھ نادیدہ نہیں
برکت تقویٰ سے جس کے ساتھ ہے فضلِ خدا
اس کے پیچیدہ مسائل کوئی پیچیدہ نہیں
اہلِ دل کی صحبتوں سے جو حقیقت بیں ہوا
لذتِ دنیائے فانی کا وہ گرویدہ نہیں
روزِ محشر اے خدا رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں
کیفِ تسلیم و رضا سے ہے بہارِ بے خزاں
صدمہ وغم میں بھی اختؔر روح رنجیدہ نہیں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ احتساب: حساب وکتاب۔ **روزِ محشر**: قیامت کا دن۔ **لرزیدہ**: خوف زدہ۔ **انجام بیں دیدہ**: انجام دیکھنے والا۔ **صابر**: صبر کرنے والا۔ **تعجب**: حیرانگی۔ **مسرور**: خوش۔ **خندیدہ**: خوش وخرم۔ **عارفیں**: اللہ والے۔ **حق دیدہ**: حق دیکھنے والی آنکھ۔ **دیدہ اشک باریدہ**: اشک بہانے والی آنکھ۔ **بصارت**: آنکھ۔ **بصیرت**: مراد حلاوت ایمانی۔ **نادیدہ**: نہ دیکھنے والی آنکھ۔ **پیچیدہ**: مشکل۔ **گرویدہ**: عاشق۔ **کیف تسلیم و رضا**: اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہنے کا مزا۔ **رنجیدہ**: غمگین۔

انجام بیں نظریں کون سی ہیں

احتساب روزِ محشر سے جو لرزیدہ نہیں
ایسے ظالم نفس میں انجام بیں دیدہ نہیں

اس شعر میں ذکر کیا جانے والا مضمون قرآن کریم کے اندر سینکڑوں جگہوں میں مذکور ہے یعنی آخرت کا خوف قیامت میں اللہ کے سامنے پیشی اور حساب وکتاب اور پل صراط سے گزرنے جیسے معاملات کی وجہ سے دل کا لرزنا اور کانپنا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىؕ﴾

(سورۃ النازعات، آیت: ۴۰،۴۱)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرا ہوا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خوش کرنے سے سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانہ۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ٦٦١)

اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جس آدمی کے دل میں روز محشر حساب و کتاب کا خوف نہیں اور جو اس کو سوچ کر کانپ نہیں اٹھتا تو ایسا ظالم انسان ظاہری آنکھیں تو رکھتا ہے لیکن انجام دیکھنے والی آنکھیں اس کے اندر نہیں ہیں۔

دوستو! یوں ظاہری آنکھیں تو اکثر سب کو حاصل ہیں لیکن وہ آنکھیں جو انجام پر نظر رکھنے والی ہوں جسے در حقیقت بصیرت کہتے ہیں وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہے جس طرح کے ایک تو وہ دل ہے جو جسم کی حیات ظاہری کی بقاء کے لئے لازم اور ضروری ہے وہ تو سب انسانوں کو حاصل ہے لیکن ایک وہ دل ہے جس میں اللہ کا خوف ہو اور ایمان و اخلاص ہو ایسا دل بہت کم لوگ اپنے سینوں میں رکھتے ہیں اور جس کے پاس یہ دل نہیں اور بصیرت والی آنکھیں نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ وہ بینا ہوتے ہوئے نابینا ہے اور اس کے سینے میں دل ہوتے ہوئے دل کہلانے کے لائق نہیں اسی کو قرآن میں یوں تعبیر کیا ہے:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾

(سورۃ الحج، آیت: ٤٦)

ترجمہ: سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر اندھے ہو جاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں۔ (معارف القرآن، جلد: ٦، صفحہ: ۲۷۲)

اور اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے اگر وہ اس گناہ سے توبہ کرلے تو اس کے دل سے اس نکتہ کو صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ اس سے باز نہیں آتا تو پھر وہ بڑھتے بڑھتے اتنا سیاہ ہوتا ہے کہ پورا دل بالکل تاریک اور ایسا زنگ آلود ہو جاتا ہے کہ اب قبول نصیحت کے قابل نہیں رہتا بلکہ اگر اسے نصیحت بھی کی جائے تو وہ اس کو اچھی نہیں لگتی یہاں تک کہ ناصح کو اپنا بدخواہ اور دشمن تصور کرتا ہے اور بزبان حال یہ کہتا ہوا ہوتا ہے۔

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے
میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

چنانچہ اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ایک ساتھی تھے جن کا نام سر سید احمد خان ہے دونوں ساتھ پڑھتے تھے وہ خود بہت ذہین تھے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ دین کی بہت سی باتوں میں ان کو سمجھاتے اور نصیحت کیا کرتے تھے کیونکہ انہوں نے بہت سے ایسے عقائد اختیار کیے تھے جو صحیح اسلام سے بالکل متضاد اور منافی تھے مگر ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے حضرت مولانا کو یہی اوپر والا شعر جواب میں لکھا کہ اب آپ مجھے نصیحت کرنا بند کردیں اور اب مجھے نصیحت اچھی نہیں لگتی یہی وہ مقام ہے کہ اس پر پہنچنے کے بعد نصیحت نافع اور کارگر نہیں رہتی اسی لیے دوستو کبھی بھی گناہ یہ سوچ کر نہ کرنا چاہیے کہ بعد میں توبہ کرلونگا اس لیے کہ توبہ کی توفیق ملنا

یہ ہمارا اختیاری معاملہ نہیں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوتے ہوتے گناہ کرنے کی ایسی عادت پڑ جائے کہ پھر دل تاریک ہوتا چلا جائے اور توبہ کی توفیق ہی نہ رہے۔

بہر حال عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ جولوگ اپنے سینوں میں حقیقت میں دل رکھتے ہیں اور بصیرت کی نگاہیں موجود ہیں وہ اللہ سے ڈرتے ہیں اسی لیے حضرات صحابہ کرام کا یہ خاص وصف تھا کہ وہ اللہ سے بہت ڈرنے والے تھے ان کی راتیں اکثر گریۂ وزاری میں گزرجاتی تھیں حتیٰ کہ وہ عشرہ مبشرہ جن کو خود زبان نبوت سے جنت کی بشارت ملی تھی ان کا بھی حال خوف خداوندی میں کم نہ تھا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قصیدہ کوئی پڑھ کر دیکھے اس لیے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیا میں جیتے ہوئے اپنے دلوں میں آخرت کا خوف رکھتے ہیں اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا اور آخرت کے دو خوف اللہ تعالیٰ کسی آدمی پر جمع نہیں فرماتے یعنی جو دنیا میں اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت کے خوف سے بے خوف کردینگے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿ الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ﴾

(سورۃ یونس، آیت ۶۲)

ترجمہ: یاد رکھو جولوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۵۴۵)

عشق ظالم ہے یہ ناممکن ہے وہ صابر رہے
پھر تعجب کیا جو دردِ عشق سنجیدہ نہیں

جولوگ غیر اللہ سے عشق کرتے ہیں اور حرام محبتوں میں پھنستے ہیں ان کا یہ عشق حقیقت میں عشق ہے ہی نہیں بلکہ فسق ہے حقیقی عشق تو وہ ہے کہ بندہ اپنے مالک کو دل دے اور اس پر فدا ہو اور یہ دردِ عشق صرف اہل اللہ کو حاصل ہوتا ہے فساق و فجار حرام عشق بازی کر کے اپنے چین وسکون کو خود اپنے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں اس لیے یہ دردِ عشق سنجیدہ کیسے ہوسکتا ہے۔

حقیقی خوشی اللہ والوں کو ہی حاصل ہے

کس قدر مسرور ہیں اللہ والے ذکر سے
کوئی بھی ان کے سوا دنیا میں خندیدہ نہیں

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اللہ والے بنیں گے اور پورے دین پر عمل کریں گے تو ہماری زندگی کی ہنسی خوشی سب ختم ہوجائے گی جب کہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے کہ اللہ والوں کے سوا دنیا میں کوئی حقیقت میں خندیدہ ہے ہی نہیں اہل دنیا ہنستے تو ہیں لیکن ان کے دل کو ہنسی کا لطف نہیں ملتا خود آپ ان کی زبان سے سنیں گے کہ دل میں ایک طرح کی بے چینی اور پریشانی سے محسوس ہورہی ہے اور طبیعت اداس اور بور (Bore) ہورہی ہے تو

چلو ذرا کہیں جا کے کچھ ہنسی خوشی کریں تا کہ دل بہل جائے اس لیے صورتاً وہ ہنستے نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل میں بے چینی اور پریشانی اور قلق واضطراب کی آگ لگی ہوتی ہے بہت سے لوگ اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اہل اللہ، اللہ تعالیٰ کی خاطر جس گھڑی آنسو بہا رہے ہوتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں چین وسکون کا دریا بہہ رہا ہوتا ہے ان کے چہروں پر دل کے چین وسکون کے آثار بالکل واضح اور نمایاں ہوتے ہیں کبھی بھی ان کے چہروں پر اداسی اور مایوسی کے آثار نظر نہیں آئیں گے ہمیشہ خوش وخرم اور تر وتازہ ہشاش وبشاش دکھائی دیتے ہیں ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ آئے کہ رونے کے ساتھ خوشی کیسے جمع ہوسکتی ہے کیونکہ رونا غم اور فکر کا اثر ہے اور ہنسنا مسرت وشادمانی کا اثر ہے اسی سوال کا جواب حضرت والا نے اس طرح سے دیا ہے کہ دیکھو ہماری آنکھوں میں سیاہ پتلی ہے جس سے ہمیں نظر آتا ہے اور دکھائی دیتا ہے حالانکہ سیاہی اور روشنی میں تضاد ہے بظاہر اس سے نظر نہیں آنا چاہیے تائب صاحب کے ایک شعر میں یہی مضمون اس طرح سے آیا ہے ۔

بے چینیوں نے چین سے رہنا سکھا دیا
جب سے ملا ہے مجھ کو تیرا اضطرابِ غم

اور اگر ہم بغور دیکھیں تو اللہ والوں کی خوشی کا عالم کیا ہوسکتا ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے جس میں یہ مذکور ہے:

﴿اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾
(شعب الایمان)

یعنی جو اللہ کے ذاکر بندے ہیں اللہ ان کا ہم نشین ہے ہمارا اس پر ایمان ہے کہ دنیا کی ساری خوشیوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے تو جس آدمی کا ہم نشین خود اللہ ہو جو سارے عالم کی خوشیوں کا مرکز ہے تو اس کے دل کی خوشی کا کیا عالم ہوگا حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے اگر کسی کمرے میں ایک برف کا بڑا ٹکڑا رکھ دیا جائے اور کوئی آدمی اس کے پاس بیٹھا ہو تو وہ خود بخود اس کی ٹھنڈک کو محسوس کرے گا اور اس کی گرمی سے ہونے والی پریشانی دور ہوجائے گی حالانکہ یہ تو محض ایک برف ہے صرف سمجھنے کے لیے اتنی مثال کافی ہے اس لیے ذکر سے اللہ والوں کو کیا خوشی حاصل ہوتی ہے یہ ہمارے تصور سے باہر ہے قرآن نے اس معاملے میں بڑا صاف اور واضح اعلان فرمایا کہ:

﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾
(سورۃ الرعد، آیت: ۲۸)

ترجمہ: سنتا ہے! اللہ ہی کی یاد سے چین پاتے ہیں دل۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۱۸۲)

یہ اعلان قیامت تک آنے والی تمام انسانیت کے لیے ہے اس لیے حضرت والا کا یہ فرمانا کہ حقیقت میں خوش اور مسرور صرف اللہ والے ہیں بالکل درست اور صحیح ہے۔

اہل اللہ کے بے چین و پریشان نہ ہونے کی بنیادی وجہ

ایک دوسرے انداز سے اس کو اس طرح سمجھئے کہ چونکہ اللہ والے لوگ راضی بہ رضا رہتے ہیں یعنی ان کے مالک اور خالق اللہ کی طرف سے جس طرح کا بھی ان کے حق میں فیصلہ ہو وہ اس پر خوش اور راضی رہتے ہیں تو بھلا ان کو بے چینی اور پریشانی کیسے لاحق ہوسکتی ہے ان کے دل میں ہر وقت یہ عقیدہ حاضر رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اگر صحت دی ہے اس میں کوئی خیر اور بھلائی ہے اور اگر مرض میں مبتلاء کیا ہے میرے لیے اسی میں کوئی خیر چھپی ہے بس ہر وقت عافیت کی بھیک مانگتے رہتے ہیں لیکن پریشان نہیں ہوتے اگر رزق میں وسعت حاصل ہو تو بھی شکر گزار رہتے ہیں اور اگر کچھ تنگی اور کمی کا سامنا ہو تو بھی وہ پریشان نہیں ہوتے ان کے سامنے اپنے اللہ کا کلام اور فیصلہ رہتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَاهُمْ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ ﴾

(سورۃ الزخرف، آیت: ۳۲)

ترجمہ: ہم نے بانٹ دی ان میں روزی ان کی دنیا کی زندگانی میں اور بلند کر دیئے درجے بعض کے بعض پر۔

(معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۷۳۶)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۲۷)

ترجمہ: اور اگر پھیلا دے اللہ روزی اپنے بندوں کو تو دھوم اٹھادیں ملک میں۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۶۹۵)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴾

(سورۃ الحجر، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور اتارتے ہیں اندازۂ معین پر۔ (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۲۷۷)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے خزانوں میں سے روئے زمین پر ہر چیز کی اتنی ہی مقدار اتارتے ہیں جس کا خیر ہونا اللہ کو معلوم ہے اسی طرح حدیث قدسی میں ہے کہ اے میرے بندوں میں یہ جانتا ہوں کہ تم میں سے کس کو کب تک صحت مند رکھنا ہے اور کب تک بیمار رکھنا ہے اور کس کو کب تک غریب رکھنا ہے اور کب اس کو مال دار بنانا ہے بندوں کے لیے جو جس وقت مصلحت ہوتا ہے اس وقت میں اس کو وہی دیتا ہوں میری غرض ان تمام آیات و روایات سے یہ ہے کہ اللہ والے دل سے بے چین کبھی نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ اللہ کے ہر فیصلے پر دل سے راضی رہتے ہیں تو انہیں بے چینی اور پریشانی لاحق کبھی نہیں ہوگی۔

چین وسکون کا قیمتی نسخہ حدیث نبوی سے

حضرت عمر بن شعیب عن ربیہ عن جدہ کی روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

﴿خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا مَنْ نَظَرَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاقْتَدٰى بِهٖ وَ نَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ فَحَمِدَ اللّٰهَ عَلٰى مَا فَضَّلَهٗ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص ۴۴۸)

یعنی جس بندے میں یہ دو باتیں جمع ہوں تو اللہ اسے اپنے یہاں شاکر اور صابر بندہ شمار کرتے ہیں نمبر ایک کہ جو شخص دین کے سلسلے میں تو اسے دیکھے جو اس سے بڑھ کر ہو اور اس کی اقتدا کرے اور دنیا کے سلسلے میں اس کو دیکھے جو اس سے کم درجہ کا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو اس پر فضیلت بخشی ہے اس پر وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے یعنی دین کے سلسلے میں تو وہ بڑے مقربین بارگاہِ الٰہی اور اولیاء صدیقین پر نظر رکھ کر ان کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے اور یہ تمنا کرتا ہے کہ میں بھی ان جیسا بن جاؤں اور دنیا کے سلسلے میں جو اس سے کم درجہ دنیوی مال و دولت رکھتا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے رات دن اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہے اور اس طرح دل کی ایک سنگین بیماری یعنی جمع مال کی حرص سے محفوظ رہتا ہے تو اللہ ایسے بندے کو اپنا شکر گزار بندہ بھی قرار دیتے ہیں اور صبر کرنے والا بھی شمار کرتے ہیں۔

اس کے بالکل برخلاف وہ شخص کہ جو دین کے سلسلے میں تو اس پر نظر رکھے جو اس سے کم درجہ ہے اور دنیا کے سلسلے میں اس پر نظر ہو جو اس سے بڑھا ہوا ہے اور پھر اس سے جو دنیا چھوٹ گئی ہے اور اسے حاصل نہ ہو سکی اس پر افسوس کرتا رہے اس بندے کو اللہ تعالیٰ نہ شاکر لکھتے ہیں اور نہ ہی صابر اور ایسا آدمی کبھی سکون سے زندگی نہیں گزار سکتا خواہ وہ کتنا ہی مال دار اور دولت مند ہو جائے اور کیسا ہی (Millionaire & Billionaire) بن جائے کیونکہ جب وہ ہمیشہ دنیا کے سلسلے میں اوپر والے کو دیکھتا رہے گا تو اس کے دل کو ہر وقت مزید کی فکر لاحق رہے گی اور اس سے ایک طرح کی بے چینی اور پریشانی کا شکار رہے گا۔

آہ! میرے دوستو قربان جائیں ہم اپنے سب سے بڑے محسن، مشفق اور خیر خواہ و ہمدرد حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے اپنی امت کو ہر بھلائی سے آگاہ کیا اور ہر برائی پر متنبہ کیا آپ نے کیا ہی عمدہ سکون سے جینے کا نسخہ عطا فرمایا ہے۔

اس سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بعض لوگ جب ہم ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ تمہارا کیا حال ہے اور وہ زبان سے یہ کہتے ہیں کہ شکر ہے جب کہ دل میں ہر وقت جمع دنیا کی فکر لیے رہتے ہیں اور دنیوی امیدوں کے مکمل طور پر حاصل نہ ہونے سے کف افسوس ملتے رہتے ہیں اور دین کے سلسلے میں (At least) کا جملہ یاد کیے ہوئے ہیں یعنی کہ میں کم سے کم اتنے دین پر تو عمل کرتا ہوں بس یہی میرے لیے کافی ہے۔ ایسے لوگ حقیقت میں شکر گزار نہیں ہیں اور وہ شکر کے معنیٰ اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

نام روشن کر گئے مر کر کے حق پر عارفیں
مر گئے جو مرنے والوں پر وہ حق دیدہ نہیں

یعنی دنیا و آخرت کی سرخروئی اور عزت انہیں لوگوں کا مقدر ہوئی جنہوں نے اپنے خالق و مالک اللہ کی معرفت حاصل کی اور اس کے حکموں پر اپنی ساری آرزوئیں اور تمنائیں قربان کر ڈالیں اور اپنے مالک پر فدا ہو گئے اسی کی محبت کے گیت گاتے سنتے سناتے دنیا سے رخصت ہو گئے اور جو لوگ مرنے والوں پر مرے ہیں وہ مٹی پر مر کر مٹی ہو گئے اور حقیقت میں وہ انجام سے بے خبری کی زندگی گزار کر اپنا سب کچھ خاک میں ملا گئے ظاہر ہے کے ناجائز محبتوں میں رات و دن مرنے والے اور جان دینے والے یا دنیا کے عہدوں اور منصبوں نام و نمود اور شہرت و عزت کی خاطر مرنے والے یہ بھی اپنے آپ کو مٹی میں ملا گئے اور بالآخر جس کے لیے انہوں نے اپنے قیمتی لمحات حیات ضائع کیے مرنے کے بعد وہ سب معدوم و فنا ہو گئے۔

اللہ کامل جانا سارے عالم کامل جانا ہے

پالیا جس نے خدا کو پالیا سارا جہاں
کون کہتا ہے کہ اہل دل جہاں دیدہ نہیں

حضرت والا کی اس نظم کا ایک ایک شعر ایسا ہے کہ اس کی تشریح میں صفحات کے صفحات بھر جائیں اور حضرت والا کی اس نظم کے سب اشعار جنوبی افریقہ میں ہی موزوں ہوئے ہیں اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ جس بندۂ خدا نے اللہ کو پالیا سمجھ لو کہ اس نے سارا جہان پالیا وجہ یہ ہے کہ جس کی کسی ملک کے صدر اور وزیر اعظم سے گہری دوستی ہو جائے۔ تو سمجھو کہ اس ملک کے سارے خزانے اور سرکاری محکمے اس کے ہو گئے ہیں التکشف میں حضرت تھانویؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو اس کی خبر دیتے ہیں کہ اے جبرئیل میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو تو حضرت جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر حکم ہوتا ہے کہ سارے فرشتوں میں اعلان کر دو تو سب فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور بالآخر اہل زمین کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے اسی طرح اس کے برخلاف صورت ہے کہ جب اللہ کسی بندے کو ناپسند کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو بتا دیتے ہیں کہ میں فلاں بندے کو ناپسند کرتا ہوں۔ چنانچہ تم بھی اس کو ناپسند کرو تو حضرت جبرئیل اس کو ناپسند فرماتے ہیں اور پھر اسی طرح فرشتوں میں اعلان کیا جاتا ہے یہاں تک کے تمام فرشتے اس بندے سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور پھر اہل زمین کے دلوں میں اس کی نفرت ڈال دی جاتی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾

(سورۃ مریم، آیت: ۹۶)

ترجمہ: کہ جو مومنین اعمالِ صالحہ اختیار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتے ہیں۔

اسی طرح ایک روایت ترمذی شریف میں آئی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہے:

﴿ما اقبل عبدٌ بقلبہ الی اللہ عزّ وجلّ الا اقبل اللہُ بقلوب اھل الایمان الیہ حتّی یرزقہ مودّتہم ورحمتہم﴾

(الزھد الکبیر للبیہقی)

یعنی جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دلوں کو اس کی جانب مودت و محبت اور الفت و رحمت کے ساتھ پھیر دیتے ہیں یعنی اہلِ ایمان کے دلوں میں اس اللہ والے کے لیے جذباتِ محبت و مودت رکھ دیے جاتے ہیں اور خود اللہ تعالیٰ ہر خیر اور بھلائی اس بندے کی طرف جلد پہنچا دیتے ہیں۔ لوگوں کی زبانوں پر اس کے لیے ثنائے حسن اور تعریفی کلمات اور دعائیہ جملے عطا کیے جاتے ہیں۔

جیسا کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی ایک تفسیر بعض مفسرین کے نزدیک یہی ہے۔ اس لیے بندہ کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ میں دنیا میں رہتے ہوئے اپنی سب حرام آرزؤں کو چھوڑ دوں اور اللہ کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کر کے اللہ کو پا جاؤں اور اس کو راضی کرلوں ہر عمل میں اخلاص اور للّٰہیت اختیار کروں میری خلوتیں اللہ سے آہ وزاری اور گریہ وبکاہ میں گزریں اور میری جلوتیں اس کی عظمت ومحبت کی داستانیں سنانے اور توحید ورسالت کی باتیں پھیلانے میں خرچ ہوں ہماری محنتوں اور کوششوں کا رخ اسی طرف ہونا چاہیے کیوں کہ مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوگیا کہ محبت زمین سے آسمان کی طرف نہیں چلتی بلکہ آسمان سے زمین پر اترتی ہے اس لیے ہمیں ریا کاری کر کے اور اپنے نام کی شہرت کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں عزت تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ورنہ اس کا نتیجہ سوائے خسر الدنیا والاخرۃ کے اور کچھ نہیں یعنی دنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد ہوکر رہ جائے گی۔

اور خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کو راضی کر لینے سے بس یہ سمجھ لو کہ دونوں جہاں اپنے ہوگئے بس اللہ راضی ہوجائے پھر چاہے وہ شہرت دے یا گمنامی، مالداری دے یا فقیری، وسعت دے یا تنگی، صحت دے یا بیماری غرض کہ اصل بنیاد ہماری زندگی کی رضائے الٰہی پر ہے باقی ساری چیزیں اس کے بعد کے درجہ کی ہیں گو کہ ہم کو دنیا میں رہتے ہوئے دنیوی حاجات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم اللہ سے عافیت اور راحت مانگیں۔

لیکن ہر عقل مند جانتا ہے کہ حاجت اور مقصد دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسا کہ کوئی بیت الخلاء میں جا کر بیٹھتا ہے تو وہاں بیٹھنا حاجت ہے مقصد نہیں اس لیے ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد اپنا مزید وقت وہاں بیٹھ کر کوئی ضائع نہیں کرتا۔ بس میرے بھائیو! دنیا کی جتنی چیزیں اور حاجتیں ہیں ان سب کی مثال ٹھیک اسی طرح ہے اور عبادتِ خداوندی اور معرفتِ الٰہی اور رضائے مولیٰ اصل ہماری زندگی کا مقصد ہے تو ہماری پوری توجہ اسی مقصد پر خرچ ہونی چاہیے جس کی بدولت انشاء اللہ ہماری جملہ حاجات خود بخود پوری ہوتی رہیں گی۔

گریہ وزاری میں قرب خداوندی کی ایک خاص مثال

لذت قرب ندامت گریہ وزاری میں ہے
قرب کیا جانے جو دیدہ اشک بار یدہ نہیں

اس مضمون کو ہم ایک حسی مثال سے اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جب چھوٹا بچہ اپنی ماں کے سامنے کسی بات پر روتا اور چلاتا ہے تو ماں اسے محبت وشفقت کے ساتھ گود میں لینے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب تک وہ روتا نہیں تو ٹال مٹول کرتی ہے یہاں تک کہ اگر ماں گہری نیند میں سوئی ہو اور بچہ کو کسی چیز کی طلب ہو تو وہ جب تک بیدار نہیں ہوتی جب تک کہ بچہ رونا شروع نہ کر دے اسی طرح بندے کا اللہ تعالیٰ سے معاملہ یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے سامنے رونے لگتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کو خاص محبت ہو جاتی ہے اور خاص قرب کی لذت محسوس ہوتی ہے دل کو سکون اور ٹھنڈک میسر آ جاتی ہے اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ جن آنکھوں کو اللہ کے لیے رونا نصیب نہیں ہے وہ قرب خداوندی کی لذت کیا جانے۔ چنانچہ ہم نے حضرت والا کی زندگی میں یہ دو باتیں خاص دیکھی ہیں قلب بریاں اور چشم گریاں بکثرت دوران مجلس حضرت والا کے چہرے پر آنسوؤں کے قطرے جاری رہتے ہیں۔

یہی تو وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ تم اللہ کے سامنے رویا کرو اور اگر تم کو رونا نہ آئے تو بہ تکلف رونے والوں کی شکل بنالو اور رونا کیوں نہیں آتا اس کی فکر ہونی چاہیے آج کل عام طور پر عریانیت و بے حیائی کی وجہ سے لڑکے لڑکیوں کی محبت اور ننگی تصویروں، فلموں میں دیکھے جانے والے بے حیائی کے مناظر کی وجہ سے دلوں میں شقاوت پیدا ہوگئی اور غفلت کا زہر چڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے آنکھ آنسو بہانے سے خشک ہے اور حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان گناہوں کی ایک نقد سزا دنیا میں یہ ہے کہ عبادت کی حلاوت اور مناجات کی لذت چھین لی جاتی ہے دل مردہ اور آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ بسا اوقات ہوتے ہوتے فرائض وواجبات کے ترک تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

آنکھیں خشک ہونے کا سبب

اسی طرح آنکھیں خشک ہو جانے کا ایک بڑا سبب فضول کاموں اور لغو باتوں اور لا یعنی حرکتوں میں مشغول ہونا اور اپنے اوقات کو ضائع کرنا بالخصوص عشاء کے بعد دیر تک بیٹھ کر ایسی مجلسیں منعقد کرنا اسی لیے تسامر بالیل سے خاص ممانعت کی گئی ہے کہ رات کو بیٹھ کر ادھر ادھر کے قصے اور قیل وقال میں اپنا وقت بے کار کرنا حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿ لَا تُكْثِرِ الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ ﴾

(ضعیف سنن الترمذی)

یعنی اللہ کے ذکر کے بغیر فضول اور لایعنی باتیں زیادہ نہ کرو کیونکہ اس سے قساوت قلبی پیدا ہوتی ہے اور دل میں سختی آتی ہے اور جو دل سخت ہوتا ہے وہ اللہ سے بہت دور ہے تو جو سخت دل والا ہے وہ بھی دور ہوگا۔ اسی کو عربی کا شاعر کہتا ہے ؎

لِقَآءُ النَّاسِ لَيْسَ يُفِيْدُ شَيْئًا
سِوَى الْهَذْيَانِ مِنْ قِيْلٍ وَّ قَالٍ
فَاَقْلِلْ مِنْ لِقَاءِ النَّاسِ اِلَّا
لِتَعْلِيْمِ عِلْمٍ اَوْ اِصْلَاحِ حَالٍ

یعنی لوگوں سے ملنا سوائے قیل وقال کی بکواس کے اور کچھ فائدہ نہیں دیتا اس لیے لوگوں سے ملاقات کے سلسلے کو کم کردے ہاں اگر علم سیکھنا ہو یا اصلاح وتزکیہ کے لیے ملنا ہو تو ملے۔

اس لیے خاص طور پر ہم خانقاہ میں وقت لگانے والوں کے لیے اس سے بہت شدت سے پرہیز کرنا چاہیے کہ عشاء کے بعد بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنے اوقات کو ضائع کریں اور پھر اس کی نحوست سے جو دل میں سختی پیدا ہو یا تو صبح کو جلد اٹھ کر شب اخیر میں کچھ دعاؤ مناجات کا موقعہ ہی میسر نہ آئے یہ اگر موقعہ بھی مل جائے تو اللہ کے سامنے گریا وزاری کی لذت سے محروم رہے اور یہ چیز مقصد میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اسی لیے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے یہاں خانقاہ میں قیام کے دوران علمی مجالس کی بھی ممانعت رہتی تھی اور حضرت کی خانقاہ کا دار ومدار دو چیزوں پر ہوتا تھا ایک سکوت اور دوسرا سکونِ اول کا تعلق زبان سے ہے اور دوسری کا تعلق قلب سے ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مفتی شفیع صاحب اور حضرت قاری محمد طیب صاحب خانقاہ تھانہ بھون قیام کے دوران بعض علمی مسائل کے سلسلے میں گفتگو کیا کرتے تھے تو اس کی اطلاع حضرت کو ہوگئی بس اس کے بعد بلا کر پابندی لگا دی گئی اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خانقاہ میں رہتے ہوئے خاص طور پر یہ مجالس ہمارے قلب کی حالت کے لیے کس قدر مضر اور نقصاندہ ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بندہ کا مقصود اس گفتگو سے یہ نہیں ہے کہ ہم خانقاہ میں رہتے ہوئے دوسروں کے نقائص اور عیوب پر مطلع ہوں اور ان کی تلاش وجستجو میں لگیں کہ کون اپنا وقت ضائع کررہا ہے اور کون دوسرے کسی نامناسب کام میں لگا ہوا ہے بلکہ محض سامنے نظر آنے والی ایک مضر صورت حال کی طرف خیرخواہانہ اور ہمدردانہ توجہ دلانا مقصود ہے تاکہ ہم سب یہاں رہنے والے حضرت والا کی خدمت میں رہ کر پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں اور خانقاہ سے جانے کے بعد حسرت وافسوس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے عیوب اور نقائص کے تفحص اور تتبع سے ہم کو سختی سے منع

فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے التکشف میں روایت نقل کی ہے:

﴿ لَا تَنْظُرُوْا فِیْ ذُنُوْبِ النَّاسِ كَاَنَّكُمْ اَرْبَابٌ وَانْظُرُوْا فِیْ ذُنُوْبِكُمْ كَاَنَّكُمْ عَبِيْدٌ ﴾

(موطا مالک، کتاب الجامع)

یعنی تم لوگوں کے گناہوں میں اس طرح مت دیکھو کہ تم ان کے مالک ہو اور وہ تمہارے نوکر ہیں اور مالک کو یہ حق ہوتا ہے کہ اگر نوکر میں کوئی خرابی ہو اور وہ کوئی غلط کام کرے تو اس پر اس کو متنبہ کرنا ہوتا ہے بلکہ تم اپنے گناہوں میں دیکھو کہ جیسے کہ تم غلام ہو تم کو کسی مالک کو حساب دینا پڑے گا اور مالک کے سوالات کا سامنا ہوگا تم اپنے گناہوں کو دیکھو اور غور کرو پھر حضور نے ارشاد فرمایا کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہے کہ جو کسی مصیبت و معصیت میں مبتلاء ہیں اور دوسرے وہ ہیں جن کو عافیت دی گئی ہے تو جو بچارے معصیت میں مبتلاء ہیں ان پر رحم کھاؤ اور اگر اللہ نے تم کو عافیت وسلامتی دی ہوئی ہے اور گناہوں سے بچا رکھا ہے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اس لیے گناہ گار پر رحمت و شفقت اور الفت کی نگاہ ڈالنی چاہیے اور اس کو نکیر بلا تحقیر کرنی چاہیے اور اپنے گناہوں سے حفاظت پر اپنا کمال نہ سمجھ کر اللہ کی توفیق پر اسی کا شکر ادا کرنا چاہیے آج یہ ہمارا بڑا مرض ہے کہ کسی بھی دین کے شعبے میں کچھ وقت گزارنے کے بعد اور اس سے کچھ مناسبت ہونے کے بعد جذبات ابھرتے ہیں اور دوسروں کے حالات کے تتبع اور تلاش میں لگ جاتے ہیں اور ان پر تحقیرانہ انداز سے تحریریں اور تبصرے شروع کر دیتے ہیں۔

بہر حال میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دل کو سخت کرنے والی اور آنکھوں کو خشک کر دینے والی باتوں سے ہم پرہیز کریں اور کسی کو کسی بھی نامناسب بات میں اگر دیکھیں تو ان پر نکیر بلا تحقیر کرنے کی عادت ڈالیں اور گریہ و زاری میں جو لذت قرب ہے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کریں۔

توفیق توبہ دلیل مغفرت ہے

جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہوگئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں

خلاصۂ شعر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بندے کو توبہ استغفار کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول بھی کریں گے گویا توبہ و استغفار کی توفیق اسی کو دی جاتی ہے جس کی توبہ اللہ تعالیٰ کو قبول کرنی ہوتی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ڈھیل دینے کا ہوتا ہے اور وہ ڈھیل اس طرح دی جاتی ہے کہ گناہوں میں مشغول ہونے کے باوجود بظاہر سب حالات ٹھیک ٹھاک چلتے رہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم اپنی جس حالت میں مشغول ہیں بالکل ٹھیک ہیں۔ اسی کو قرآن نے یوں ذکر کیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۱۸۲)

ترجمہ: اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی ۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۳۳)

یعنی اللہ کے مبغوض اور ناپسندیدہ بندے کفار اور مشرکین اور فاسق اور فاجر لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس طرح ڈھیل دیتے ہیں کہ ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور جن کو معاف کرنا ہوتا ہے ان کے دل میں ندامت وشرمندگی کی کیفیات پیدا فرماتے ہیں بالآخر وہ بندے تائب ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت:۱۱۸)

ترجمہ: پھر مہربان ہوا ان پر تا کہ وہ پھر آئیں بے شک اللہ ہی ہے مہربان رحم والا۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۴۷۷)

بندے کو ایک مرتبہ حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خط کے جواب میں جس میں احقر نے لکھا تھا کہ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے زندگی کہ جن گناہوں سے کلی طور پر تائب ہو چکا ہوں اور ان کا خیال بھی دل سے نکل چکا ہے۔

لیکن پتہ نہیں کہ یہ توبہ اللہ کی بارگاہ میں قبول بھی ہوئی ہوگی یا نہیں اس پر حضرت نے سختی سے یہ بات لکھی کہ خبردار! اس طرح کی سوچ بھی کبھی دل میں نہ لانا جب اس نے توبہ کی توفیق دی ہے تو ضرور توبہ قبول بھی ہوئی ہے۔

اور اس مقام پر ایک اور بات سمجھ لینی چاہیے کہ توبہ کی حقیقت محض زبان سے یہ کہنا نہیں ہے یا اللہ میری توبہ بلکہ اس کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے نمبر (۱) ماضی میں کیے ہوئے گناہ پر ندامت اور نمبر (۲) آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم اور ارادہ اور نمبر (۳) فی الحال اس گناہ کو چھوڑ دینا اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی قیمتی بات تحریر فرمائی ہے کہ دل میں یہ رکھے کہ اللہ جان دے دوں گا مگر اب تیری نافرمانی نہیں کروں گا لیکن اگر نفس وشیطان کے بہکانے سے مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو فوراً آپ ہی کے در پے آکر آپ ہی سے معافی چاہوں گا اور آپ کو کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔

توبہ میں تاخیر اور ٹال مٹول کرنا شیطانی چال ہے

اور اگر آپ غور کریں تو یہ بات معلوم ہوگی کے یہ تینوں باتیں ایک لمحہ میں پائی جاسکتی ہیں لمبا چوڑا وقت درکار نہیں ہے اسی لیے جو بندہ ابھی مجلس میں بیٹھے بیٹھے کسی گناہ کے چھوڑنے کے سلسلہ میں پختہ فیصلہ کرلے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تائب ہو چکا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مجلس میں جا کر پہلے غسل یا وضو کرے پھر نماز پڑھے پھر توبہ کرے یا یہ کہ میں جمعہ کے دن سے توبہ کروں گا یا رمضان سے توبہ کروں گا یا فلاں بزرگ کے ہاتھ پر جس دن سے بیعت ہونگا اس دن سے تائب ہو جاؤنگا۔

یاد رکھنا چاہیے یہ سب نفس وشیطان کی چالیں ہیں جن کے ذریعے ہمیں توبہ سے دور رکھا جاتا ہے یہاں

تک کے ہوتے ہوتے اسی سوچ میں ہماری ساری عمر گزر کر زندگی کا آخری لمحہ آ پہنچتا ہے جب کے سوائے حسرت اور سوچ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اس مضمون پر وہ قصہ دلیل ہے جس کو ایک روایت میں ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جو ۹۹ قتل کر چکا تھا اس نے ایک راہب سے سوال کیا کیا میرے لیے توبہ ہے تو اس راہب نے جواب دیا کہ تجھ جیسے ظالم اور پاپی کے لیے کہاں توبہ ہوسکتی ہے تو جب اس نے یہ دیکھا کہ توبہ ہے ہی نہیں تو اس راہب کو بھی قتل کر دیا اور پھر وہ ایک عالم کے پاس پہنچا اوران سے یہی سوال کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ تیرے اور توبہ کے درمیان کون حائل ہوسکتا ہے اوران کو یہ ہدایت کی کے تم فلاں بستی میں جاو وہاں اللہ کے خاص نیک بندے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ اس طرف چلنے لگا راستے میں جاتے ہوئے اس کی موت کا وقت آ پہنچا اب روایت میں آتا ہے کہ ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب دونوں میں اس کی روح نکالنے کے سلسلے میں مباحثہ ہونے لگا بالآخر اللہ کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ جس سرزمین سے یہ چلا تھا اور جہاں تک یہ پہنچا تھا اس کی مسافت اور جس سرزمین توبہ وطاعت میں یہ جارہا تھا اس کی مسافت کو ناپا جائے اور ادھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو یہ حکم دیا کہ تو ایک طرف سمٹ جا تو بالاخرارض توبہ وطاعت سے وہ بندہ قریب پایا گیا اور اس طرح ملائکہ رحمت نے اس کی روح نکالی اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس کے توبہ کے پختہ عزم کو اللہ نے اپنے یہاں توبہ شمار کرلیا اس لیے دین کی بات سن کر جب بھی توبہ کا جذبہ پیدا ہوتو اس میں ذرہ برابر تاخیر نہ کرنی چاہیے۔

حفاظت بصارت پر بصیرت ملنے کا وعدہ ہے

جب بصارت کی حفاظت سے بصیرت مل گئی
ہو کے نادیدہ بھی اس کی آنکھ نادیدہ نہیں

جو آدمی اپنی نگاہوں کو حرام جگہ ڈالنے سے بچاتا ہے اوراپنی ظاہری بینائی کو اللہ کے حکم کے خلاف استعمال نہیں کرتا اور چوری چھپے خیانت میں مبتلاء نہیں ہوتا اگرچہ دل میں خوب تقاضہ اور داعیہ پیدا ہو مگر یہ ایک لمحہ کے لیے غلط نظر نہیں اٹھاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بدنظری کرنے سے اللہ کی طرف سے لعنت برستی ہے اور میں رحمت کے سایہ سے نکل کر لعنت کے سایہ میں آجاتا ہوں اور میں اس بری حرکت سے اللہ کی نگاہ میں آنکھ کا زانی قرار پاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑنے والا اور اس کا نافرمان شمار ہوتا ہوں کیونکہ اللہ نے مجھ کو حکم دیا کہ نگاہ کو نیچی رکھو اس لیے اگر میں نے نامحرم پر نگاہ اٹھائی تو میں خدا کا نافرمان قرار پاؤں گا۔

تو گویا نظر بازی کے نتیجہ میں حقیقت کے لحاظ سے مجھے تین برے لقب ملیں گیں (۱) ملعون (۲) آنکھوں کا زناکار (۳) خدا کا نافرمان اس لیے پھر میری تباہی اور بربادی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔

صاحبو! اس دور میں خاص طور پر بصارت کی حفاظت کا معاملہ بہت اہم اور سنگین ہے کیونکہ ہر طرف عریانیت و بے حیائی اور ننگا پن پھیلا ہوا ہے لیکن وہ اللہ کا بندہ جس کے دل میں خوف خداوندی موجود ہو وہ اس سب کے باوجود اپنی نگاہوں کی حفاظت کرتا ہے اور بقول حضرت والا نگاہ بچانے میں جتنا مجاہدہ اٹھاؤ گے اتنی ہی مقدار کا حلوہ ایمانی عطا ہوگا اس لیے ہمت کر کے نگاہوں کی پوری طور پر حفاظت کرنی چاہیے۔

اور غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نگاہ بچانے کا جنت میں داخل ہونے کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے چنانچہ قرآن میں اللہ نے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نگاہ بچانے سے شرم گاہ کی حفاظت ہوگی اور اس کی بدو قلب کی طہارت وصفائی مل جائے گی اور جسے قلب کی صفائی وطہارت مل جائے وہ فلاح وکامیابی پا جائے گا اور جسے فلاح وکامیابی مل گئی اسے جنت میں داخل کر دیا گیا اور جہنم سے بچا لیا گیا تو خلاصہ یہ نکلا کہ نگاہ کا بچانا اتنا قیمتی عمل ہے کہ مومن کو جنت میں داخل کرا دیا اسی لیے حضرت والا نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ جب تم بصارت کی حفاظت کرلو گے تو تمہیں بصیرت مل جائے گی، اسی پر تائب صاحب کا شعر ہے ؎

کر کے بصارتیں فدا ہم کو بصیرتیں ملیں
سوچ خدا کو کیا دیا دیکھ خدا سے کیا لیا

اس لیے کے قلب کی مثال دار الخلافہ اور راجدھانی کی ہے اور نگاہ کی مثال بارڈر کی اور سرحد کی ہے راجدھانی (Capital) کی حفاظت جب ہی ہوسکتی ہے جبکہ ملک کے بارڈر اور سرحدیں پورے طور پر محفوظ ہوں اسی لیے نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ النَّظَرَ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ﴾

(کنز العمال)

یعنی نظر شیطان کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے تو ظاہر ہے کہ نظر بازی کے نتیجہ میں دل میں پہنچ کر دل کی حیات کو ختم کر دے گا اور اسی کا نام بصیرت ہے اس لیے ایسا آدمی ظاہر میں حرام چیزوں کو دیکھنے سے نابینا بن جاتا ہے مگر اللہ کی طرف سے اس کو حقیقی بینائی عطا ہوتی ہے اسی کو بصیرت کہتے ہیں اور یہ دل کا ایک نور اور خاص جلاء وروشنی ہے جو نظر کو بچانے اور گناہوں سے دور رہنے سے حاصل ہوتی ہے اس مسئلہ پر حضرت والا کا مستقل ایک رسالہ ہے جس کا نام ہے ''بدنظری کے چودہ نقصانات'' اس کو خود پڑھنا اور دوستوں کو پڑھوانا چاہیے۔

تقویٰ ہر مسئلے کا حل ہے

برکت تقویٰ سے جس کے ساتھ ہو فضل خدا
اس کے پیچیدہ مسائل کوئی پیچیدہ نہیں

یعنی جو آدمی تقویٰ اختیار کرے گا اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے شامل حال ہوگا تو اس کی ساری مشکلات آسانیوں میں تبدیل ہو جائینگی اور اس کے پیچیدہ مسائل پیچیدہ نہیں رہنگے اور ہر نوع کے الجھے ہوئے معاملات سلجھ جائیں گے اس کا اعلان خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾

(سورۃ الطلاق آیت: ۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۴۷۲)

دنیا کا کوئی تعویذ اور جھاڑ پھونک یا کوئی وظیفہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں تمام مشکلات سے حل کی ضمانت موجود ہو گناہوں میں مبتلاء رہنے کے ساتھ کوئی تعویذ اور وظیفہ اس مقصد کے لیے کارآمد نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ احقر ہندوستان میں ایک جگہ سفر کر رہا تھا راستہ میں ایک جگہ بعض احباب کے یہاں چند منٹ کے لیے ٹھہرنا ہوا تو ان کے کمرے میں دیوار پر ایک تعویذ لٹکا ہوا تھا جس کے اوپر یہ لکھا تھا ''برائے حل جمیع مشکلات'' کہ یہ تعویذ صبح شام دیکھنے سے تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ تعویذ بنا کر بیچنے والا خود اس تعویذ کو صبح شام دیکھ لیا کرے اور اس کی ساری مشکلات حل ہو جائیں تو آخر اسے تعویذ بنانا پھر فریم کرانا پھر لوگوں کو بیچنا ان سب کاموں کی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ سب دھوکہ اور فریب ہے اور اس میں کوئی سچائی نہیں ہے ہاں احقر پورے رسوخ اور یقین کے ساتھ یہ بات کہتا ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرے گا یعنی تمام گناہوں کو چھوڑ کر اور اللہ کے احکام پورا کرتے ہوئے زندگی گزارے گا تو بلا کسی شک وشبہ کے اس کی دنیا اور آخرت کی ہر نوع کی مشکلات آسان ہوکر رہیں گی مگر بات یہ ہے کہ گناہوں سے کلی اجتناب ہو آج کل عام طور پر لوگ نماز روزہ کر لینے کو تقویٰ سمجھتے ہیں جب کہ زندگیوں میں تصویر کشی، نامحرم سے میل جول اور تعلقات، ٹی وی، وی سی آر پر گندے مناظر دیکھنا، سودی کاروبار میں مبتلاء رہنا، رشتوں ناتوں کو توڑ دینا، داڑھی کٹانا اور وغیرہ جیسے گناہ بھی موجود ہیں۔ ورنہ خدا کا یہ فیصلہ شروع سے قیامت تک قائم رہے گا بعض لوگ گناہوں میں مبتلاء رہتے ہیں اور جب ان کو ان کی خرابی بتائی جاتی ہے اور مشکلات ومصائب اور آفات وبلیات سے حفاظت کے لیے گناہ سے بچنے کی بات کہی جاتی ہے تو پھر وہ اللہ کے غفور الرحیم ہونے کی بات کرنے لگتے ہیں اور اس تمنا میں رہتے ہیں کہ گناہوں میں مبتلاء رہنے کے ساتھ ان کو کوئی وظیفہ بتادیا جائے یا کوئی ایسا تعویذ دے دیا جائے جو اندرونی بیرونی مشکلات سے بچنے کے لیے کافی ہو۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو اللہ کے غفور الرحیم ہونے پر ایسا ایمان اور یقین ہے تو اللہ کے رب اور رزّاق ہونے پر ایسا یقین کیوں نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح غرض یہ کہ رات و دن آپ مال و دولت کمانے کے لیے اس قدر سرگرداں و پریشان کیوں دکھائی دیتے ہیں اللہ کے رزاق اور رب ہونے پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کو اپنے ظن وگمان کے مطابق گھر سے باہر نکلنا نہیں چاہیے تھا اس لیے درحقیقت بات اس طرح نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا دھوکہ ہے جس میں ہم مبتلاء ہیں۔

دوسری بات بھی قابل غور ہے کہ بندہ گناہوں کو اس سہارے پر کر رہا ہے کہ اللہ غفور الرحیم ہے تو آخر اللہ تعالیٰ کی صفات میں یہ بھی تو ہے کہ میں قہار اور ذوانتقام، سریع الحساب، شدید العقاب ہوں اور میرا عذاب دردناک عذاب ہے تو پھر ہم نے کس بنیاد پر اپنے لیے یہ طے کرلیا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک صفت والا معاملہ کریں گے دوسری صفت والا نہیں ہاں کوئی اللہ کا نیک بندہ ہو اور گناہوں سے بچتا ہو پھر وہ یہ فیصلہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ دل میں یہی گمان قائم کرے کہ میرے لیے اللہ غفور الرحیم ہونگے تو بے شک اس کی یہ بات درست اور بجا ہوگی کیونکہ اس کی ایک بنیاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ اعلان فرمادیا:

﴿اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ کی رحمت قریب ہے نیک کام کرنے والوں سے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۵۷۵)

اور دوسری قرآن کی آیت کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء پر نہ کوئی رنج ہوگا نہ کوئی غم اور وہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جو اللہ سے ڈرتے تھے۔ نیکی اور تقویٰ کے بغیر نجات وفلاح کی امید رکھنا یہ بے بنیاد آرزوئیں اور تمنائیں کہلاتی ہیں جیسے کہ کوئی شخص نکاح تو نہیں کرتا اور یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے اولاد کا امیدوار ہوں اس لیے اس شعر کا خلاصہ یہ نکلا کہ جس کو ایسی زندگی مطلوب ہو کہ جو مشکلات سے خالی ہے اور الجھنوں سے محفوظ ہے تو وہ تقویٰ اختیار کر لے ایک لمحہ اللہ کو ناراض نہ کرے تو ان شاء اللہ اس کو کسی بھی نوع کی اندرونی اور بیرونی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی اور اگر لاحق ہوگی بھی تو اس کا دل بالکل پریشان اور بے چین نہیں ہوگا بلکہ وہ سب کچھ ترقی درجات کے لیے ہوگا۔

لذاتِ دنیویہ کا گرویدہ ہونا حقیقت بینی نہیں ہے

اہل دل کی صحبتوں سے جو حقیقت بیں ہوا
لذت دنیائے فانی کا وہ گرویدہ نہیں

جو شخص دنیا کے ظاہری نقشوں سے دل نہ لگائے اور ان سے دھوکہ نہ کھائے اور خزاں کو بہار نہ سمجھے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حقیقت کو پا گیا ہے اور دنیا کے اصل رنگ وروپ کو سمجھ گیا ہے اس لیے وہ دنیائے فانی کی لذت پر گرویدہ اور فریفتہ نہیں ہے اور حضرت والا نے جو تعبیر فرمائی ہے (یعنی حقیقت بیں ہونا) یہ نہایت عمدہ تعبیر

ہے کیونکہ دنیا درحقیقت دھوکے کا گھر ہے جیسا کہ قرآن کریم کے اندر جگہ جگہ یہ بات بیان فرمائی گئی ہے اور دھوکے کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز نظر کچھ آرہی ہو اور اندر سے کچھ اور ہو چنانچہ دنیا کا یہی معاملہ ہے کہ بظاہر بہت خوبصورت اور عمدہ نظر آتی ہے اس کی شہرتیں اور عزتیں بڑی اچھی لگتی ہیں اور اس کی چمک دمک دل کو خوب بھاتی ہیں لیکن میں قربان جاؤں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ امت کو اس کے مکر وفریب سے مختلف انداز اور طریقوں سے آگاہ فرمایا ہے بڑے خوش نصیب اور سعادت مند ہیں وہ لوگ جو دنیا سے اپنے منہ موڑ لیں اور اپنی نظریں حقیقت کی طرف پھیر لیں۔

اور تجربہ یہ ہے کہ دنیا کی لذتیں اس قدر جاذب نظر اور پرکشش ہیں کہ ان سے بچنا اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور اولیاء اللہ کی صحبتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے اور عام طور پر جتنے جھگڑے اور فسادات اور آپسی رنجشیں اور اختلافات ہیں ان سب کی جڑ یہی دنیا کی محبت ہے اور اس کے عیش وعشرت میں پڑ جانا ہے اسی لیے میں بہت شرح صدر کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ اللہ کے نبی کے صحابہ میں سے ایک بھی دنیا کے عیش وعشرت کا شیدائی نہ تھا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر یہ نصیحت فرمائی:

﴿ اِیَّاکَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰہِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص [illegible])

اے معاذ عیش وعشرت میں پڑنے سے بچنا کیوں کہ اللہ کے خاص بندے عیش پسند نہیں ہوتے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آرام کی زندگی عطا فرمائے اور عزت وعافیت کے ساتھ رہنا مقدر فرمادے تو یہ کوئی بری چیز ہے بلکہ مقصد اس کا عادی ہوجانا اور اس کے درپے ہوجانا ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ جو رجال اللہ ہیں وہ دنیوی لذتوں کے گرویدہ نہیں ہوتے عمدہ اور اعلیٰ درجے کا کھانا پینا اور رہنا سہنا مل گیا تو بھی الحمد للہ اور اگر سیدھا سادھا میسر آیا تو بھی اسی طرح خوشی کے ساتھ الحمد للہ کہتے ہیں۔

نجات کا سہارا صرف فضل خداوندی ہے

روزِ محشر اے خدا رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں

اس شعر میں حضرت والا ہم سب متعلقین کے لیے عبدیت کاملہ اور حقیقی تواضع کا درس دے رہے ہیں یعنی بندے کو ہر گھڑی اپنے اللہ کے سامنے اسی طرح پیش ہونا چاہیے کہ اے اللہ! جیسی ہمیں آپ کی معرفت حاصل کرنی چاہیے تھی ہم نہیں کرسکے اور جیسی ہمیں آپ کی عبادت کرنی چاہیے تھی ہم نہ کرسکے اور جیسا آپ جیسے رحیم و کریم اللہ پر ہمیں فدا ہونا چاہیے تھا ہم نہیں ہوسکے غرض کے ہماری کوئی ادا اور کوئی عمل اس کا حق دار نظر نہیں آتا کہ جس کہ سہارے اور امید پر ہم یہ تمنا کریں کہ ہماری بخشش ہوگی اور معاف کیا جائے گا بس آپ کی بارگاہ میں اتنا

عرض ہے کہ ہمارا حال تو بہت خراب ہے آپ اپنی شان رحیمی وکریمی سے ہمیں محروم نہ فرمائیے گا اور قیامت کے دن رسوانہ کیجئے گا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت والا کی پوری زندگی کس طرح گزری ہے اور اللہ کی راہ میں کتنے مجاہدات اٹھائے اور کس قدر مشقتیں اور تکلیفیں سہی تین تین اپنے زمانے کے بڑے اولیاء اللہ کی صحبت و خدمت معیت و رفاقت حاصل رہی اور عمر بھر اللہ تعالیٰ کی محبت اور عظمت خلوت وجلوتوں میں بیان کرتے کرتے گزار دی مگر اس کے باوجود جب حضرت والا یہ فرمار ہے ہیں تو ہم حضرت کے خدام اور متعلقین کے لیے اس میں کتنا بڑا اہم سبق ہے اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی حقیقت وفہم عطا فرمائے اور اپنی رحمت سے کامل عبدیت عنایت فرمادے۔

تسلیم ورضا سے بہار بے خزاں ملتی ہے

کیف تسلیم و رضا سے ہے بہار بے خزاں
صدمہ و غم میں بھی اختر روح رنجیدہ نہیں

یہ شعر تفویض وتوکل اور رضا بالقضا کے مضمون پر مشتمل ہے کے اے اللہ میں نے اپنے ہر معاملے کو آپ کے حوالے کر دیا ہے اور سب کچھ آپ کو سونپ دیا ہے جو کچھ آپ کو میرے لیے پسند ہے وہی مجھے بھی پسند ہے جس حالت میں آپ مجھے رکھنا چاہیں میں اس میں خوش ہوں اور میں آپ کے ہر فیصلے سے راضی ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جب آپ ایسے اللہ ہیں کہ جو حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں تو اولاً تو ہمیں آپ کے کسی فیصلے کو چوں و چراں کا حق ہی نہیں کیونکہ ہم آپ ہی کے مملوک ہیں اور غلام کو آقا کے سامنے کچھ اختیار وحق نہیں ہوتا پھر ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ آپ حکیم ہیں آپ کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہے آپ مجھے مالدار رکھیں یا غریب صحت مند رکھیں یا مریض، شہرت دیں یا گمنامی غرض یہ کہ جس حال میں بھی آپ رکھیں میں اس پر راضی ہوں۔

بس اتنی بات ہے کہ میں آپ کی آزمائش اور امتحان کے لائق نہیں ہوں اس لیے آپ سے عافیت اور راحت دنیوی واخروی کی بھیک مانگتا ہوں یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے کہ بندہ اللہ سے عافیت مانگے اور پھر جو کچھ حالت اللہ کی طرف سے آئے اس پر راضی ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ تم اللہ سے کیا دعا مانگتے ہو جب کے ان کا رنگ بالکل زرد اور پیلا پڑ چکا تھا اور ان کی حالت مثل چوزے کے ہوگئی تھی تب صحابی نے یہ بات بتائی کہ میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اگر اے اللہ آپ مجھے سزا دینے والے ہیں تو بس دنیا ہی میں دے دینا آخرت میں نہ دینا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ تم یہ دعا کیوں نہیں کرتے کہ اے اللہ مجھے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی حسنة عطا فرما۔ چنانچہ پھر ان کی حالت درست ہوگئی۔

بہرحال رضا بالقضاء مومن کے لیے پرسکون زندگی گزارنے کے واسطے ایسا نسخہ ہے کہ جو اس طرح زندگی گزارے گا اسکے دل میں کبھی بے چینی اور پریشانی پیدا ہو ہی نہیں سکتی اسی کو حضرت نے بہارِ بے خزاں سے تعبیر کیا ہے کہ دنیا کے چمن و باغوں کو موسم بہار کے بعد موسم خزاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر یہ دل کی ایسی بہار ہے جسے کبھی خزاں لاحق نہیں ہوگی۔

چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے یہ پوچھا کہ کیا حال ہے؟ کہنے لگے کہ بہت اچھا ہے، سارے عالم کا نظام ہماری مرضی کے مطابق چل رہا ہے سننے والوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی مرضی کو اپنے اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے اس لیے جو بھی اللہ کا فیصلہ میں اس پر راضی رہتا ہوں اس لیے گویا سارا عالم میری مرضی کے مطابق چل رہا ہے اس پر حضرت والا نے اپنے ایک بیان میں یہ واقع سنایا کہ حضرت حسن بصری اپنے غلام سے یہ پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ غلام نے جواب دیا کہ غلام کا کوئی نام نہیں ہوتا جس نام سے آقا پکارے وہی نام ہے پھر یہ پوچھا کہ تم کیا کھاتے پیتے اور پہنتے ہو اس نے پھر وہی جواب دیا تو حضرت حسن بصری غلام کا یہ جواب سن کر بے ہوش ہو کر گر گئے جب ہوش آیا تو غلام سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے غلام تو نے ہمیں صحیح معنوں میں بندا اور غلام ہونا سکھا دیا ہم تو اللہ کے ساتھ اپنی بے شمار تجویزیں لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے ویسا ہونا چاہیے یہ ملنا چاہیے وہ ملنا چاہئے درحقیقت یہ سب کچھ تفویض کی شان کے خلاف ہے اور تسلیم و رضا کے منافی ہے۔

میرے طوفانوں میں بھی ساحل رہے

دردِ دل کے فیض یوں شامل رہے
میرے طوفانوں میں بھی ساحل رہے

آہ جو محرومِ دردِ دل رہے
ان کے آب و گل بس آب و گل رہے

بعض ناداں عمر بھر قائل رہے
فائدہ کیا جب نہ وہ گھائل رہے

جو بھی اہل اللہ سے تھے بدگماں
عمر بھر نابالغ منزل رہے

علم کا پندار جن کے دل میں تھا
ہو کے قابل بھی وہ ناقابل رہے

دامن رہبر تھا جن کے ہاتھ میں
بس وہ رہرو فائز منزل رہے

عمر بھر پیتے رہے جو خون دل
راہ الفت میں وہی کامل رہے

راہ حق میں گو بلا آتی رہی
میرے نالے حاصل منزل رہے

میرا جو غم دافع غفلت ہوا
آپ کے غم میں وہ غم شامل رہے

داستانِ درد اے اخترؔ سنو
کس طرح دنیا میں اہل دل رہے

مشکل الفاظ کے معنی:۔**محرومِ دردِ دل**: جو اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کو نہ پاسکے۔ **آب و گل**: یعنی پانی اور مٹی کے جسم پانی و مٹی ہی رہے۔ **قائل**: معتقد۔ **گھائل**: یعنی اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت سے محروم رہے۔ **نابالغ منزل**: یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے محروم رہے۔ **پندار**: تکبر۔ **دامن رہبر**: مرشد کامل کا ہاتھ۔ **رهرو**: سالک۔ **فائز منزل**: یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات مل گئی۔ **خون دل**: اپنے دل کی حرام خواہشات کا خون پیتے رہے۔ **راہِ الفت**: اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کا راستہ۔ **بلا**: مصیبت۔ **نالے**: بہت زیادہ آنسو بہانا۔ **حاصلِ منزل**: یعنی اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص۔ **غم دافع غفلت**: جس غم سے غفلت دور ہوگئی۔ **داستانِ درد**: اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کے حصول کی مشقت و تکالیف کی کہانی۔ **اہلِ دل**: اللہ والے۔

دردِ دل کا فیضانِ خاص

دردِ دل کے فیض یوں شامل رہے
میرے طوفانوں میں بھی ساحل رہے

اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو اس کی بندگی اور اطاعت کی وجہ سے طوفانوں مین بھی ساحل کا مزہ دیتا ہے گو کہ اس کی کشتی مختلف ناموافق حالات کے طوفانوں میں پھنسی ہوئی ہو لیکن اس کے قلب میں اس گھڑی بھی مکمل چین اور سکون رہتا ہے یعنی یہ ایسا انعام ہے کہ جو بندے کو اسی وقت حاصل ہوتا رہتا ہے اور کیوں حاصل نہ ہو جب کے حق تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو بندے میری یاد میں مشغول رہیں گے، ان کے دلوں میں اطمینان ہر وقت

قائم اور باقی رہے گا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾

(سورۃ الرعد، آیت: ۲۸)

ترجمہ: سنتا ہے! اللہ ہی کی یاد سے چین پاتے ہیں دل۔ (معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۱۸۳)

صاحب تفسیر مظہری یہاں پر باء کو فی کے معنی میں لکھتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ دلوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد ہی میں اطمینان میسر آتا ہے جب کہ انسان سر سے پیر تک ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کے حکم میں ڈوبا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ آدھا یا دو تہائی جسم اللہ تعالیٰ کے حکم میں لگا رہے اور جسم کا کچھ حصہ اللہ کی نافرمانی میں مشغول ہو نوافل وتسبیحات تو بہت لیکن بذریعہ فون وانٹرنیٹ یا بذریعہ وی سی آر گندے مناظر دیکھ کر آنکھیں خراب کرتا ہے حسین لڑکے اور لڑکیوں سے باتیں کر کے اپنی زبان اور کان کو خراب کرتا ہے اور دل میں گندے گندے خیالات پکاتا ہے ایسا شخص ساحل پر پہنچ کر بھی طغیانی میں رہتا ہے اور اس کی مثال اس طرح سے ہے کہ جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے نہ کہ پانی کے ذریعے كَمَا اَنَّ السَّمَكَةَ تَطْمَئِنُّ فِي الْمَاءِ لَا بِالْمَاءِ یعنی جس طرح مچھلی اگر پورے طور پر پانی کے اندر ہو تو اسے سکون ملتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ پانی میں ہو اور باقی باہر نکلا ہوا ہو اسے آرام نہیں ملتا چاہے اکثر بدن اس کا پانی میں ڈال دو اس لیے مومن بندے کے اکثر اعضاء بدن طاعت میں لگے ہوں اور کچھ اعضاء معصیت میں مبتلاء ہوں تو ان بعض اعضاء کی نحوست سے اسے چین حاصل نہ ہوگا اور وہ ایسے ہی تڑپے گا جیسے مچھلی بغیر پانی کے۔

آب و گل بلا دردِ دل بے قیمت ہے

آہ جو محروم دردِ دل رہے
ان کے آب و گل بس آب و گل رہے

یعنی جن کے سینے میں اللہ تعالیٰ کا دردِ محبت نہ ہو تو پھر وہ بجز مٹی کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں ہیں اسی لیے قرآن کریم میں ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾

(سورۃ الفرقان، آیت: ۴۴)

ترجمہ: اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۴۷۴)

یعنی وہ لوگ جو اپنے سینے میں ایمان نہیں رکھتے جانوروں کی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ راہ بھٹکے ہوئے ہیں کہ جانور بھی مالک کا اتنا وفادار ہوتا ہے اگر اُسے کہیں چھوڑ دو تو وہ چل کے سیدھا اپنے مالک کے مکان پر پہنچتا ہے کسی دوسرے کے در پر نہیں پہنچتا لیکن یہ انسان جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، غیر اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور اس کو اپنی حاجات کے لیے پکارتا ہے۔

اور اگر ایمان رکھتا بھی ہو مگر اللہ کی سچی محبت دل میں نہ ہو تب بھی وہ اسی طرح ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے اور ناجائز جگہوں پر مرتا ہے جینے کی حلاوت ولذت سے محروم رہتا ہے اس لیے اپنے آب وگل کو قیمتی بنانے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ دل کو اللہ کی محبت سے لبریز کیا جائے اور ہر لمحہ اس کو راضی کرنے کی فکر میں اپنی تمام ناجائز تمناؤں کا خون کردے۔

قائل تو ہو گھائل ہو کے دیکھو

بعض ناداں عمر بھر قائل رہے
فائدہ کیا جب نہ وہ گھائل رہے

یعنی بعض لوگ عمر بھر اس بات کے تو قائل رہتے ہیں کہ واقعی دردِ دل حاصل کرنا چاہیے اصلاحِ نفس اور تزکیہ باطن کرانا چاہیے اور اللہ کی محبت سیکھنی لازم وضروری ہے اس کے بغیر انسان ادھورا اور ناقص رہتا ہے مگر حضرت والا فرماتے ہیں کہ اگر کوئی انسان اس بات کا قائل ہو کہ دہن العود کی خوشبو بہت اچھی ہے، گلاب اور شمامۃ العنبر بہت عمدہ عطر ہے لیکن اس کو استعمال نہیں کرتا اس بات کا قائل رہتا ہے اور مانتا بھی ہے اور زبان سے تسلیم بھی کرتا ہے اور مدح بھی کرتا ہے لیکن وہ عطر اسے کسی طرح کا کوئی نفع نہیں پہنچائے گا جب تک کہ اس کو استعمال نہ کرے بس یہی معاملہ یہاں کا ہے کہ اپنے قلب کو اللہ کی محبت سے گھائل کر کے دیکھے صرف قائل ہونے پر اکتفا نہ کرے۔

بعض اہل علم احباب سے جب ملاقات ہوتی ہے اور اس موضوع پر بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ آپ کی بات بالکل صحیح ہے اور واقعی اللہ کی محبت سیکھے بغیر کام نہیں بنتا اور ہر لحاظ سے تسلیم کرتے ہیں لیکن خانقاہی نظام اور اصلاح وتزکیہ سے پیچھے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ لاحاصل صورتِ حال ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی صداقت وسچائی کا بہت سے کافر اپنی زبان سے اقرار کرتے تھے جب ان کی آپس میں باتیں ہوتی تھیں ایک دوسرے کو یہی کہا کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں تو بالکل صحیح اور برحق ہیں مگر تسلیم وانقیاد سے دور رہتے تھے تو محض ان کا یہ جان لینا ان کے لیے کارآمد اور نافع نہیں ہوا۔

اہل کتاب کے متعلق تو قرآن نے یہاں تک فرمایا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں یعنی جس طرح کسی کا بچہ ہزاروں بچوں میں کھڑا ہوا الگ نظر آتا ہے اور اس کا چہرہ اور شکل تمام بچوں میں بالکل جانا پہچانا ہوتا ہے بس اسی طرح یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو پہچانتے ہیں مگر جب انہوں نے تصدیق نہیں کی اور انقیاد واتباع سے دور رہے تو اس سے انہیں کوئی نفع نہ پہنچا اس لیے معلوم ہوا کہ اصل نفع اس راہ میں قدم رکھ کر اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنے اور دل کو محبت خداوندی سے گھائل

کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

پیاسا ساری عمر پانی کے لیے پکارتا رہے اور بھوکا کھانے کے لیے جب کہ وہ جانتے بھی ہیں کہ اس سے بھوک اور پیاس دور ہوگی مگر جب تک اسے استعمال نہیں کریں گے تو بھوک اور پیاس دور ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس لیے محض کسی چیز کا قائل ہو جانا نافع نہیں اس کو برتنا اور اس سے فائدہ اٹھانا اصل چیز ہے۔

بالغ منزل اور عالم منزل کا فرق

جو بھی اہل اللہ سے تھے بدگماں
عمر بھر نابالغ منزل رہے

ایک ہوتا ہے عالم منزل ہونا اور ایک ہوتا ہے بالغ منزل ہونا دونوں میں بہت بڑا فرق ہے جیسے مثال کے طور پر کوئی شخص یہ جانتا ہے کہ کراچی سے لاہور جانے کے لیے فلاں ٹرین یا ایروپلین (ہوائی جہاز) فلاں وقت میں لاہور کی طرف جاتا ہے یا وہ خود اپنی گاڑی سے جانا چاہتا ہے اور اسے راستے کی تمام تفصیلات کا علم ہے اور اس کے سب نشیب و فراز اور مثبت و منفی احوال سے واقف ہے مگر وہ راستہ پر چلتا نہیں ہے اور اس کو طے کرنا شروع نہیں کرتا تو ایسا شخص عالم منزل تو ہے لیکن پوری عمر کبھی بھی بالغ منزل نہیں ہوسکتا، بالغ منزل جبھی ہوسکتا ہے کہ اپنی گاڑی راستہ پر ڈال دے اور چلنا شروع کردے اور راستہ کے جو بھی موانع اور رکاوٹیں ہیں ان کو ہمت و جرأت سے دور کرتا رہے اور جو رہبر ہے اس کی بات مان کر آگے بڑھتا رہے تو بہت جلد راستہ طے ہو جائے گا اور منزل مل جائے گی۔

اور اگر اپنے راہبر پر اعتماد نہ ہو اور اپنی رائے سے راستہ چلنا شروع کردے جب کہ اسے راستے کے نشیب و فراز سے واقفیت نہیں ہے یا واقفیت ہے مگر اس نے خود چل کر دیکھا نہیں ہے تو راستے میں کہیں نہ کہیں بھٹک جائے گا اس کی سہل اور آسان صورت یہی ہے کہ کسی معتمد رہبر کو ساتھ لے لو اور اس کے کہنے پر اعتماد کرکے چلتے رہو پھر دیکھو کتنی جلدی منزل ہاتھ آتی ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ عالم منزل ہونے میں کیا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ رشید احمد گنگوہی جیسے حضرات کے بارے میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے جن کو ہمارے سارے طبقے متفقہ طور پر اپنا بڑا اور بزرگ تسلیم کرتے ہیں خواہ تبلیغ والے ہوں یا جہاد والے، مدرسے والے ہوں یا خانقاہ والے ان کو سب متفقہ طور پر بزرگ اور بڑا مانتے ہیں آخر کیا وجہ تھی کہ ان کو بھی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک رہبر کی ضرورت پیش آئی اور اہل اللہ کی صحبت کو انہوں نے فرض قرار دیا سچ تو یہ ہے کہ صحبت صالحین کے بغیر جسے ہم منزل سمجھتے رہتے ہیں ان سے جڑنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ابھی تو منزل بہت دور ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ساری عمر کی ہماری دین کے نام پر کی جانے والی محنتیں اخلاص سے عاری اور خالی تھیں تو پھر منزل کا حصول کیسے ممکن اسی لیے خانقاہوں کی سب سے زیادہ

ضرورت اخلاص سیکھنے کے لیے ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ایک بڑے عالم نے سوال کیا کہ تصوف کیا ہے؟ اور وہ اس کے قائل نہیں تھے تو حضرت نے جواب ارشاد فرمایا کہ اس تصوف کی حقیقت تصحیح نیت ہے سلوک طے کر کے اور صحیح اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر ایسا استحضار باری تعالیٰ عطا ہوتا ہے کہ بندہ ہر حال میں اپنے کو ایسا پاتا ہے کہ اگر ملک الموت آ پہنچے تو اب اس کی مزید کوئی آرزو اور تمنا باقی نہیں رہتی جس کے لیے وہ یوں کہے کہ:

﴿لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾

(سورۃ المنافقین، آیت: ۱۰)

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھ کو اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے دیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۴۵۹)

جس کو اس طرح جینا نصیب ہو جائے کہ دنیا میں جیتے جی اس کی کوئی تمنا نہ رہے سمجھ لو کہ اس کو منزل مل گئی ہے اس لیے اس شعر کی تعلیم ہمارے لیے یہ ہے کہ کسی شیخ کامل متبع سنت و شریعت سے اصلاحی تعلق قائم کر کے راہ سلوک کو طے کیا جائے یہی بالغ منزل ہونیکا راستہ ہے اور اگر کسی بزرگ سے مناسبت نہ ہو تو اس سے بدگمان نہ رہے کیونکہ ہر آدمی کو ہر ایک سے مناسبت ضروری نہیں بس اس کو نیک اور صالح سمجھتے ہوئے جہاں مناسبت ہو وہاں رابطہ پیدا کرے مگر صرف عالم منزل ہونے پر اکتفا نہ کرے ایسے شیخ کی تلاش جاری رکھے کہ جس سے باہمی مناسبت ہو کیونکہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اصل نفع کا مدار مناسبت کے اوپر ہے۔

جہاں تک اہل اللہ سے بدگمانی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی سے بھی بدگمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور اہل اللہ سے بدگمانی رکھنا خاص طور پر ناراضگی خداوندی کا باعث ہے جیسا کہ یہ مضمون تفصیل سے دوسرے مقام پر گزر رہا ہے ہاں کچھ باتیں اگر سنت و شریعت کے خلاف معلوم ہوں تو نہ تو ان کی اتباع ہم پر لازم ہے اور نہ ہی اولیاء اللہ معصوم ہوتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان کی شان میں تنقیص اور کمی یا ان سے بدگمانی قائم کی جائے۔

بعض اہل علم احباب ایسے بھی ملتے ہیں جو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس زمانے میں اولیاء اللہ موجود نہیں کہ جن سے ہم اصلاحی تعلق قائم کریں اور جو اصل لوگ تھے وہ تو دنیا سے چلے گئے اس لیے اب نظروں میں کوئی آتا نہیں ہے تو پہلی بات تو یہ عرض کرتا ہوں جب اللہ تعالیٰ نے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کا حکم دیا ہے کہ تم اولیاء صدیقین کے ساتھ رہو تو یہ بات ضروری ہے کہ قیامت تک اولیاء صدیقین کا وجود بھی ہو اگر اولیاء صدیقین کا وجود نہ ہو تو پھر ان کی معیت اور ساتھ رہنے کا حکم بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گا اس لیے اللہ تعالیٰ جب حکم دے رہے ہیں تو ضرور اس کا انتظام بھی فرما دیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے ہمارا کبر اور اپنے گمان میں اپنا ذہن میں سوچا ہوا ایک مقام اور پھر اس

کے مطابق یہ تصور کہ مجھ جیسے کی اصلاح کے لیے ایسا ویسا بزرگ ہونا چاہیے یہ سب چیزیں رکاوٹ بن جاتی ہیں اور پھر ہر طرف خرابیاں اور عیوب ہی نظر آتے ہیں اور بالآخر یہ شخص عمر بھر نابالغ منزل رہتا ہے۔

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی اس طرح تلاش وجستجو کرے جیسا بھوکا کھانے کو اور پیاسا پانی کو چاروں طرف ڈھونڈتا پھرتا ہے اسی طلب کے ساتھ اللہ کی محبت کا پیاسا کسی رہبر ورہنما شیخ کامل کو تلاش کرے تو یہ ناممکن ہے کہ تلاش کے بعد بھی اسے کوئی نہ مل سکے اگر دنیا میں اللہ تعالیٰ نے امراض جسمانی کے لیے ڈاکٹروں کا انتظام کیا ہے تو اسی طرح امراض باطنی وروحانی کے لیے بھی روحانی ڈاکٹروں کا انتظام فرمایا ہے جب ہم تلاش شروع کرتے ہیں اور اللہ ہماری طلب کو دیکھتے ہیں تو پھر راستے کھلتے نظر آتے ہیں اور یہی اللہ کی شان ربوبیت کا مقتضا ہے۔

قابل ہو کر نا قابل رہنا...... کیوں؟

ہم کو پندار جن کے دل میں تھا
ہو کے قابل بھی وہ نا قابل رہے

جو لوگ کتابی معلومات کو اپنے سینے میں جمع کر لینے سے اپنے کو عالم سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور علم کے زعم اور گمان میں رہتے ہیں تو ہوسکتا ہے وہ ظاہری کتابی صلاحیت میں بہت آگے نکل گئے ہوں لیکن ان کی یہ قابلیت بارگاہ خداوندی میں قبول نہ ہونے کی وجہ سے نا قابلیت کے درجے میں ہے حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفۃ العلماء کتاب میں ملفوظات کے تحت یہ باتیں ارشاد فرمائی ہیں کہ اگر علم جمع معلومات کا نام ہوتا تو بہت سے یہود و نصاریٰ جو بڑی بڑی دینی کتابوں کے حافظ ہیں سب سے بڑے عالم ہوتے مگر حقیقت میں عنداللہ نہ وہ قابل ہیں نہ عالم اور بہت سے نصاریٰ نے ہمارے فنِ حدیث کے موضوع پر ایسے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں کہ جس کا تصور بھی ان سے نہیں کیا جاسکتا تھا جیسے مثلاً **المعجم المفهرس** مگر اس کی وجہ سے وہ مقبولین بارگاہ نہیں ہیں تو اگر جمع معلومات ہی سے قابلیت ومقبولیت ہوتی تو پھر تو یہ لوگ بھی مقبول قرار پاتے اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ علم کا پندار اور گھمنڈ خود بڑا حجاب بن جاتا ہے آدمی سوچتا ہے کہ میں تو بڑا قابل ہوں میں کسی اور کے ہاتھ میں ہاتھ کیوں دوں۔

اس پر مجھے واقعہ یاد آیا کہ حضرت مفتی رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ہمارے یہاں دار العلوم آزادول میں ایک بیان میں یہ بات ذکر فرمائی کہ ہمارے والد کی ہم دونوں بھائیوں کے متعلق یہی خواہش تھی کہ ہم ڈاکٹر عبدالحی صاحب سے بیعت ہوں تا کہ ہمارے علم کا غرور ٹوٹے کیونکہ وہ با قاعدہ عالم نہیں تھے اس لیے ہمیں انہیں سے بیعت کرایا یہود و نصاریٰ اپنی علمی قابلیت میں اور معلومات میں کافی زیادہ تھے لیکن قرآن نے ان کے متعلق فرمایا لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش کے وہ علم رکھتے۔

حسرتوں کا خون پیے بغیر دامن رہبر کار آمد نہیں

دامن رہبر تھا جن کے ہاتھ میں
بس وہ رہ رو فائز منزل رہے
عمر بھر پیتے رہے جو خون دل
راہ الفت میں وہی کامل رہے

ان دونوں شعروں میں حضرت والا نے راہ سلوک کے سلسلے میں صحیح مسلک کو پیش کیا اور اعتدال والی راہ ذکر کی یعنی پہلے شعر میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ اگر آسانی کے ساتھ منزل تک پہنچنا ہے تو کسی رہبر کا دامن مضبوطی سے پکڑلو اور دیکھو کہ یہ راستہ آسان ہی نہیں بلکہ لذیذ ہو جائے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازم اور ضروری ہے کہ گناہوں سے مکمل پرہیز ہو اپنے ارمانوں اور حرام تمناؤں کا جتنا بھی خون کرنا پڑے اس میں ذرہ برابر پیچھے نہ ہٹے اگر کوئی کتنے ہی بڑے شیخ کامل سے بیعت ہو لیکن وہ گناہوں اور حرام لذتوں کو نہیں چھوڑتا تو یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ ایسے آدمی کو کچھ حاصل نہیں یہی صحیح اعتدال والی راہ ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر حضرت والا نے یوں فرمایا۔

شیخ کامل سے جو ہے مستغنی
پائے گا کیسے ظل رحمانی
فسق کرتا ہے دور منزل سے
پیر تیرا ہو گرچہ لاثانی

سالک کے لیے کوئی بلا سدِ راہ نہیں

راہ حق میں گو بلا آتی رہی
میرے نالے حاصل منزل رہے

یہ راہِ عشقِ خداوندی طے کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء و آزمائش تو آیا کرتی ہے لیکن نہ تو میں ہمت ہار کے بیٹھتا ہوں اور نہ تو میں مایوس ہوتا ہوں بلکہ رو رو کر اللہ کو مناتا ہوں اور مجھے منزل کا مزہ ملتا ہے کوئی گناہ ہو جائے یا کوئی نامناسب بات پیش آ جائے یا کوئی معمول یا وظیفہ چھوٹ جائے یا کبھی دل میں غفلت آ جائے تو میں اس کی وجہ سے سست ہو کر ہمت ہار کر بیٹھ نہیں جاتا بلکہ مجھے ہر قدم پر منزل کا مزہ ملتا ہے اور وہ اس طرح کہ میں فوراً اللہ کو رو رو کر مناتا ہوں بالآخر وہی پیش آمدہ حالت میری ترقی کا زینہ ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے سالک کو راہ سلوک میں پیش آمدہ آزمائشوں سے گھبرا کر اپنا سفر ترک نہ کرنا چاہیے غالب نے جب یوں کہا۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ شعر نا امیدی دلاتا ہے اور اللہ کی راہ میں چلنے والے کیلئے مایوسی کا پیغام لیے ہوئے ہے اس لیے حضرت شاہ احمد پرتاب گڈھی نے اس کو بدل کے یوں فرمایا۔

میں اسی منہ سے کعبہ جاؤں گا
شرم کو خاک میں ملاؤں گا
ان کو رو رو کے میں مناؤں گا
اپنی بگڑی یونہی بناؤں گا

اس لیے راہِ حق میں جب بھی کوئی آزمائش سامنے آئے تو سالک کو چاہیے کہ ہمت سے آگے قدم بڑھائے اور اللہ کے سامنے کچھ آنسوں گرادے۔

غمِ راہِ خدا سے بے غم رہیے

میرا جو غم دافعِ غفلت ہوا
آپ کے غم میں وہ غم شامل رہے

انسان کو دنیا میں دو قسم کے غم لاحق ہوتے ہیں ایک تو وہ رنج و غم اور حزن وملال جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پیش آئیں یعنی ایسی خوشیاں جو اللہ کو ناراض کردیں ان کو پامال کرنے سے دل کو غم لاحق ہوتا ہے مگر اللہ کا قرب بڑھتا ہے مختلف قسم کے حالات اور مجاہدے جو راہ خداوندی میں بندہ کے سامنے آتے ہیں اور وہ ان پر صبر کر کے ان کو سہہ لیتا ہے یہ سب ایسے غم ہیں جو انسان کے قلب میں لقائے مولیٰ کی خوشی پیدا کرتے ہیں اور ان کو دل پر برداشت کرنے سے بندہ اس حدیث کا مصداق ہوجاتا ہے:

«انا عند المُنكسرة قلوبُهم»

(مرقاة المفاتيح، باب عيادة المريض)

یعنی اللہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتے ہیں تو اس سے قرب و معرفت خداوندی بڑھتی ہے اور یادِ الٰہی نصیب ہوتی ہے اور ظلمت و غفلت دور ہوتی ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ میرا ہر وہ غم جس کے ذریعے دل سے غفلت دور ہو وہ لاکھ خوشیوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ وہ آپ کی راہ کا غم ہونے کی وجہ سے مجھے آپ سے قریب کرتا ہے۔ خواجہ صاحب کا شعر ہے۔

سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے ترے دل شاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لٹا دوں خانۂ دل آباد رہے

اور شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی نے اسی کو یوں کہا ہے ؎

خوشی کو آگ لگا دی خوشی خوشی ہم نے
زہے نصیب کسی کا ملا ہمیں غم ہے

داستانِ دردِ اے اختر سنو
کس طرح دنیا میں اہلِ دل رہے

اس کا مفہوم و مطلب واضح ہے یعنی اہل اللہ کے جینے کا انداز اہل دنیا سے بالکل جدا اور نرالا ہوتا ہے کیونکہ اہل دنیا دنیا کی خوشیوں پر مرتے ہیں اور اپنی زندگی کے قیمتی اوقات انہیں کی نظر کر کے مرجاتے ہیں اور اہل دل اہل اللہ راہ خداوندی کے غم اٹھاتے ہیں اور ہمیشہ کی خوشی حاصل کرتے ہیں اور اپنے غم کو غم جاوداں کرتے ہیں۔

حقیقتِ خانقاہ

اہلِ دل کے دل سے نکلے آہ آہ
بس وہی اختر ہے اصلی خانقاہ

دل نہ وقفِ غمِ مجاز کرو

ناز چھوڑو سر نیاز کرو — نفس کو اپنے شہباز کرو
ان کا دامن اگرچہ دور سہی — ہاتھ اپنا بھی تم دراز کرو
حسنِ فانی سے کیوں ہے سرگوشی — منہ سراپا سکوتِ راز کرو
ان حسینوں پہ ڈال کر نظریں — دل نہ وقفِ غمِ مجاز کرو
حسنِ فانی سے کر کے صرفِ نظر — چشمِ دل کو تم اپنی باز کرو
کیمیاء کی بھی کیا حقیقت ہے — خوفِ حق سے جو دل گداز کرو
نفرتوں کے یہ تذکرے کب تک — واعظو! وعظ دل نواز کرو
دوستو اہلِ دل کی صحبت سے — روح کو آشنائے راز کرو
ہر نفس ذکرِ حق کرو اختر — غفلتوں سے نہ ساز باز کرو

مشکل الفاظ کے معنی:۔ ناز: فخر۔ نیاز: تواضع۔ شہباز: باز شاہی۔ دراز: آگے بڑھانا۔ **حسنِ فانی:** ختم ہوجانے والے حسین نامحرم عورتیں اور امرد لڑکے۔ **سرگوشی:** چھپکے سے ملنا۔ **سراپا:** سر سے پاؤں تک۔ **سکوتِ راز:** اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ۔ **صرفِ نظر:** نظر کی حفاظت۔ **چشم:** آنکھ۔ **باز:** روکنا۔ **کیمیاء:**......۔ **گداز:**......۔ **نواز:** نوازنا۔ **آشنائے:** جاننا۔ **نفس:** سانس۔ **سازباز:**......۔

نیازمندی اور جدوجہد سے منزل سامنے ہے

ناز چھوڑو سر نیاز کرو
نفس کو اپنے شہباز کرو
ان کا دامن اگرچہ دور سہی
ہاتھ اپنا بھی تم دراز کرو

اللہ تعالیٰ کا راستہ دیوانگی کا راستہ ہے یہ نازوں سے طے نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے نیازمندی عاجزی اور تذلل وانکساری کی ضرورت ہے اللہ کے لیے اپنے کو مٹانا اور اللہ پر اپنے کو فدا کرنا کرگس اور گدھ کی خصلتوں سے بچ کر شاہبازی کا راستہ اختیار کرو ایک حی وقیوم اللہ جس پر مر کر حقیقی زندگی نصیب ہوتی ہے اور عزت وسرخروئی ملتی ہے اس پر اپنی زندگی اور جوانی کو فدا کرنا چاہیے مردوں پر مرنا اور حسین حسیناؤں کو دل دینا اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ خاک پر مر کر خود بھی خاک اور مٹی ہو جانا اس لیے حضرت والا ہمیں شاہ بازی سکھا رہے ہیں اور شاہ باز بنانا چاہتے ہیں جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جس نے شاہبازی سیکھی ہے اور جو اس راہ کو طے کئے ہوئے ہے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لو اور انانیت اور خودی کا پندار کچھ وقت کے لیے ختم کردو تبھی اس راستہ کا لطف اٹھاؤ گے جدوجہد اور کوشش سے منزل مل کے رہتی ہے اس لیے اس طرح کے حیلے بہانے پیش کرنا کہ اب زمانے میں ایسے اولیاء اللہ نہیں ہیں جو میرے معیار کے ہوں اور جو میرے معیار کے ہیں ان تک ہماری رسائی مشکل ہے یہ سب بے فائدہ ہے جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں اور کچھ مصالح دنیویہ فوت ہو جانے کی پرواہ کئے بغیر اس طرف قدم بڑھانے سے مقصود ضرور حاصل ہو جائے گا کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے۔

عشق مجازی سے حفاظت کا ایک قیمتی نسخہ

حسن فانی سے کیوں ہے سرگوشی
منہ سراپا سکوت راز کرو
ان حسینوں پہ ڈال کر نظریں
دل نہ وقفِ غمِ مجاز کرو
حسن فانی سے کر کے صرفِ نظر
چشمِ دل کو تم اپنی باز کرو

سبحان اللہ! حضرت والا نے ان شعروں میں عشق مجازی کی بیماری میں مبتلاء لوگوں کو ایسا راستہ بتایا ہے کہ جس پر عمل کر لینے کے بعد بڑے سے بڑا عشق مجازی کا مصیبت زدہ اس کی دلدل میں پھنسا ہوا آسانی نکل سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس پر نظریں ڈالنا بند کردو اور ان سے گفتگو کا سلسلہ بالکل کلی طور پر ختم کردو جب نظریں ڈلتی ہیں تو

اندر سے دل ان کی محبت میں بے چین و پریشان ہوتا ہے اور چونکہ دل پورے بدن کا بادشاہ ہے تو پھر وہ ان سے گفتگو پر زبان کو مجبور کرتا ہے یا نئے انداز سے یوں کہیے کہ sms بھیج کر لطف اندوزی پر مجبور کرتا ہے۔

افسوس ان لوگوں پر جو اپنے محبوب اور محبوبہ سے چپکے چپکے گفتگو کرتے رہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری رازدارانہ گفتگو ہے جس کی کسی کو خبر نہیں اس لیے سلسلۂ گفتگو کو طویل سے طویل تر کرتے ہیں یا چپکے چپکے نظریں ڈال کر دل میں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے محبوب و محبوبہ کو دیکھ لیا ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔

مگر آہ! ان کی نادانی کہ انہیں یہ تک خبر نہیں کہ تمہیں ہر گھڑی کوئی دیکھنے والا اور تمہاری باتوں کا کوئی سننے والا ہے اور انہیں یہ خبر نہیں:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾
(سورۃ ق، آیت: ۱۸)

ترجمہ: نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۱۳۶)

جس زمین پر اللہ کی نافرمانی کا جملہ بول رہا ہے اور عشق مجازی کی حرام باتیں کر رہا ہے وہ زمین کل قیامت کے دن یہاں تک کہ خود وہ زبان گواہ بن کر سامنے آنے والی ہے۔

افسوس اسے اپنے مسلمان ہونے کی بھی خبر نہ رہی کہ میں نے جس دن کلمہ پڑھا تھا اس دن سے میں نے یہ اقرار کیا تھا کہ **لا الہ الا اللہ** جہاں کوئی نہیں وہاں اللہ ہے کوئی نہ سنے مگر اللہ سن رہا ہے کوئی نہ دیکھے مگر اللہ دیکھ رہا ہے جس کے دیکھنے اور سننے کا تجھے خوف اور ڈر ہے اور جس سے تو رازداری کیئے ہوئے ہے وہ تو نہ تیری زندگی کا مالک ہے نہ موت کا، نہ تیری صحت کا مالک ہے نہ بیماری کا، نہ خوشی کا مالک ہے نہ غمی کا، نہ تیری عزت کا مالک ہے نہ ذلت کا، کس قدر افسوس ناک اور غمناک ہے یہ حالت کہ تو نے ان کے ہونے اور نہ ہونے اور جاننے نہ جاننے کی تو پرواہ کی مگر جس کے قبضہ میں تیرا سب کچھ ہے اور جس نے تجھے یہ وجود دے کر دیکھنے اور بولنے کی قوت عطا کی اچھے برے کو سوچنے اور سمجھنے اور نفع نقصان کو پہچاننے کی تمیز کے لیے دل و دماغ عطا کیا...... اس کا تجھے کوئی خیال نہیں۔

کاش! ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرے اور اپنی نگاہ اور زبان اور دل، دماغ کو عشق مجازی کی اس تباہ کن مہلک بیماری سے محفوظ رکھے اور اپنے دل کی آنکھیں کھول کر بصیرت کے نور سے اس کی مضرتوں کو پہچانے جس کا ملنا جب ہی ممکن ہے جب بصارت کی حفاظت ہو جاتی ہے ورنہ دل بھی تاریک اور تاریک تر ہوتا چلا جاتا ہے اور **ظلمات بعضها فوق بعض** کا مصداق ہو جاتا ہے حضرت والا کا شعر ہے۔

جو کرتا ہے تو چھپ کے اہل جہاں سے
کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے

اور حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی کا شعر ہے۔

چوریاں آنکھوں کی اور سینوں کے راز
جانتا ہے سب کو تو اے بے نیاز

وعظ وہ ہے جو خدا سے قریب کردے

کیمیا کی بھی کیا حقیقت ہے
خوفِ حق ہے جو دل گداز کرو
نفرتوں کے یہ تذکرے کب تک
واعظو! وعظ دل نواز کرو

اگر اللہ تعالیٰ کا خوف مومن کے دل میں پیدا ہوجائے تو پھر وہ دل اللہ کے قرب اور معرفت کے انوار سے چمک اٹھتا ہے اور کیسا ہی سخت سے سخت دل ہو وہ کیمیاء کی طرح ہوجاتا ہے صحابہ کرام کو یہ خاص صفت حاصل تھی اس لیے دین پر عمل ان کے لیے بالکل سہل اور آسان ہوگیا تھا تو منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کو بیان کر کے جب دلوں میں خوف اترے گا اور شقاوت وسختی دور ہوگی اور دل گدازی حاصل ہوجائے گی تو پھر یہ منزل بالکل آسان اور سہل ہے اور یہ مومن کے لیے عظیم الشان تحفہ ہے کہ جس کے دل کو خوفِ حق میسر آجائے کیمیاء سے حاصل کیے جانے والے فوائد صرف دنیاوی ہیں اور فانی ہیں مگر خوفِ حق کے نتیجہ میں جو دولت عطا ہوتی ہے وہ ابدی اور دائمی ہے لیکن جب بندوں کے سامنے اللہ کا خوف بیان کیا جائے تو اس کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ دین سے دوری اور نفرت اور اللہ کی رحمت سے مایوسی نہ پیدا ہوجائے اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو صحابہ کو ایک موقعہ پر خطاب کر کے یہ بات ارشاد فرمائی:

﴿اُدْعُوا النَّاسَ وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَ يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا﴾

(صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب بيان ان كل مسكر خمر)

کہ دین کو اس طریقے سے پیش کرو کہ ان لوگوں کے دل مانوس ہوجائیں اور انہیں اللہ کی رحمت سے جوڑ دیا جائے ان میں نفرت اور دوری نہ آجائے اور انہیں یہ محسوس ہوجائے کہ دین پر چلنا مشکل نہیں بلکہ آسان اور سہل ہے اس کو حضرت والا نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ہے کہ اے واعظو ایسا وعظ کرو جو دل لبھانے والا ہو اپنی باتوں کو محبت کے رس میں گھول کر پیش کرو کہ اس کی مٹھاس سے سامعین کے قلب وجگر مٹھاس محسوس کریں اور جس دین کو انہوں نے بہت مشکل سمجھ رکھا تھا انہیں بالکل آسان نظر آنے لگے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اپنے بیان میں گناہوں کا تذکرہ نہ کیا جائے اور گناہوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعید اور عذاب ہیں ان کو نہ بتایا جائے جیسا کہ بعض لوگ اس دھوکے کے شکار ہوگئے اور انہوں نے

کہنا شروع کیا کہ اب امت میں صرف نیکیاں اوران کا اجر بیان کرولوگوں کو گناہ اوران کی نحوستیں اوران پر اللہ کی طرف سے اترنے والا عذاب یہ سب باتیں بیان نہ کرواحقر بڑے ادب سے ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ گناہوں کا بیان اوراس پر وعیدوں اور عذابوں کا بتانا اگر یہ کوئی بری چیز ہوتی تو نہ تو یہ سنت اللہ ہونی چاہیے تھی اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی نہ سلف صالحین کا طریقہ ہوتا جب کہ قرآن پاک کے اندر جہاں طاعات کا ذکر ہے وہاں معاصی اور سیئات سے ممانعت بھی موجود ہے اوران پر عذابوں کا بھی تذکرہ ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں دونوں باتوں کو جمع کر کے ذکر فرمایا ہے۔

یہی وہ راستہ ہے جس سے خوف ورجا کے درمیان توازن اور بیلنس (Balance) برقرار رہ سکتا ہے ورنہ دین محض ایک حصہ کا نام رہ جائے گا اور آدھا دین معاشرہ سے اور زندگیوں سے خارج ہو جائے گا جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدہ ہورہا ہے کہ لوگوں نے دین کے کچھ مثبت کاموں کو سب کچھ سمجھ لیا اور گناہوں میں ابتلاء سے جن شدید نقصانات کا وہ شکار ہیں اوران کی دین ودنیا تباہ ہیں اس کو سن نے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں اسی لیے صحیح بات یہی ہے کہ خداورسول کی مرضی کے مطابق وہی بیان ہوگا جس میں لوگوں کے سامنے دین کی صحیح حقیقت یعنی طاعات اور منکرات کو پیش کیا جائے مگر انداز واسلوب عالمانہ اور حکیمانہ ہواور لوگوں کے مزاجوں اور طبیعتوں کے لحاظ سے جواسلوب اور اندازِ بیان موثر اور نافع ہوا سے اختیار کیا جائے۔

نہی عن المنکر (برائی سے روک ٹوک) پر ایک شبہ اوراس کا جواب

بعض لوگ اس مضمونِ بالا پر یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ ظلمت اور اندھیرا نور اور اجالے سے خود بخود چھٹ جاتا ہے تو آپ دین اور سنتوں کی روشنی لوگوں میں پیدا کر دو تو اندھیرا خود بخود چھٹ جائے گا۔اس لیے بس طاعات آجائیں تو معاصی کا اندھیرا خود چھٹ جائے گا اور روشنی پھیل جائے گی۔

یا بعض لوگ اسی شبہ کو یوں پیش کرتے ہیں کہ اگر کسی کتے نے تمہارے پیر کو پکڑا اور تم اس سے اپنا پیر چھڑانا چاہتے ہو تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کے سامنے گوشت کا ٹکڑا لا کر ڈال دو جب اس کی نظر اس گوشت کے ٹکڑے پر پڑے گی تو وہ خود ہی تمہارا پیر چھوڑ دے گا بس ٹھیک اسی طرح یہ گناہوں کی لذتیں جب مسلمان کے منہ کو شیریں لقمے کی طرح لگی ہوئی ہیں کے اس کو چھڑانے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کے شیریں لقمے یعنی طاعات اور بھلائیاں ان کے منہ کو لگا دو۔

صاحبو! یوں تو بولنے اور سننے میں یہ دونوں مثالیں بہت عمدہ لگتی ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں بہت بڑے دھوکے پر مشتمل ہیں اور اپنے اندر خطرناک زہر لیے ہوئے ہیں جس کو آپ اس طرح سمجھئے کہ اول تو یہ کہ اگر یہ انداز مفید ہوتا تو اللہ اور رسول اس کو اختیار فرماتے دوسری بات اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کے سامنے اپنی رائے چلانا اور قیاس کرنا اگر چہ فی نفسہ وہ صحیح بھی ہولیکن اللہ کے حکم کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے وہ بالکل بعینہ شیطان کے اس قیاس کی طرح ہے جو اس نے حضرت آدم کو سجدہ نہ کرنے کے لیے کیا تھا اور کہا تھا کہ مٹی

کو چاہیے آگ کے سامنے جھکے باعتبار اس کی خصوصیت کے، مگر اس قیاس کی وجہ سے شیطان مردود ہو گیا۔

اس مقام پر بھی معاملہ اسی طرح ہے کہ اللہ نے حکم دیا تم امر بالمعروف او نہی عن المنکر دونوں کرو اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کو صاف صاف واضح فرما دیا کہ منکر سے روک ٹوک کے تین درجے ہیں اول درجہ تو قوت و طاقت کا استعمال اور دوسرا درجہ زبان سے روک ٹوک اور تیسرا درجہ دل سے اس کو برا سمجھنا لہٰذا یہ بات خود اپنی گھڑی ہوئی ہے کہ حکمت کے ساتھ دعوت کا یہ مطلب بیان کیا جانے لگا کہ گناہوں کا تذکرہ بالکل ختم کردو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک شخص بظاہر اپنے کو دین دار سمجھ رہا ہے اور اکثر طاعات اس کی زندگی میں موجود ہیں لیکن دکان میں نامحرم جوان لڑکیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا، سود پر کاروبار کرنا، کاروبار اور زندگی کا انشورنس (Insurance) کرانا جیسے بے شمار خطرناک اور مہلک گناہوں میں مبتلاء ہو کر رات دن پریشانی کے گیت گاتا ہے۔

اس سے بڑھ کر خطرناک بات یہ ہے کہ جو دین کا فائدہ اس نے سنا اور پڑھا تھا کہ دین پر چل کر پرسکون زندگی ملتی ہے اس کو ویسی زندگی نہ ملنے پر اپنے دل میں دین کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات کا شکار ہو جانا اور پھر ہر قسم کے صحیح غیر صحیح عاملوں کے پاس چکر لگاتے پھرنا وغیرہ وغیرہ۔

کاش! اسے کوئی یہ بات بتاتا کہ گناہوں میں مبتلاء ہونے کے نتیجے میں دنیا ہی میں انسان اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کے غضب اور غصے اور ناراضگی کا مستحق قرار پاتا ہے اور ان بداعمالیوں پر کچھ نہ کچھ عذاب اور سزائیں دنیا ہی میں انسان پر ڈالی جاتی ہیں انہیں میں سے ایک سزا یہ ہے کہ زندگی کا چین اور سکون چھین لیا جاتا ہے آخر سوچیے تو صحیح کہ ہمارے محسن و خیر خواہ حضرت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھی کوئی شخص حکمت کے ساتھ دعوت الی اللہ کا م کرسکتا تھا یا آپ سے زیادہ ہمدردی انسانوں کے ساتھ کسی اور کو ہوسکتی تھی یا آپ سے زیادہ تبشیر و تیسیر کا کمال کسی اور کو حاصل ہوسکتا تھا تو پھر کیا وجہ ہے؟ کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے گناہوں کی برائی سے اور ان پر آنے والی لعنت و عذاب سے امت کو آگاہ اور خبردار کیا تاکہ دنیا میں بھی عافیت نصیب ہو اور آخرت میں بھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کبھی گناہوں کے متعلق نہ بتاتے۔

یہی تو وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پورے قرآن پاک کے اندر جہاں جہاں امر بالمعروف کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی نہی عن المنکر کا بھی ذکر موجود ہے اگر اوّل صرف کافی ہوتا تو ثانی کے تذکرے کی ضرورت ہی نہ تھی یہ واضح دلیل ہے کہ یہ فریضہ جب ہی ادا ہوتا ہے جب مامورات کا حکم اور منکرات پر نکیر کی جائے۔ بس اتنی بات ماننے کی نیت سے پڑھنے والے اور غور کرنے والے کے لیے کافی ہے۔

ہر لمحہ اللہ کی یاد روح کی غذا ہے

دوستو اہل دل کی صحبت سے
روح کو آشنائے راز کرو
ہر نفس ذکر حق کرو اختر
غفلتوں سے نہ ساز باز کرو

یہ مضمون حضرت والا اکثر نظموں کے اخیر میں ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق اہل اللہ کی صحبت ہی سے ملتا ہے جس کی بدولت روح کو اس کی غذا ملنی شروع ہو جاتی ہے اور اس کی روح رازِ قربِ خداوندی سے آشنا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہر نفس اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں قائم رہتی ہے اور غفلتیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں دل کے اندر اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھنے والی کیفیت اولیاء صدیقین اور مشائخ عظام کے ساتھ رہ کر عام طور پر حاصل ہوتی ہیں پھر اسے غفلتوں میں زندگی گزارنا گوارا نہیں رہتا شب و روز اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں اس کے تذکرے اس کی روح کی غذا اور دل کا قرار بن جاتا ہے۔

کیا اثر ہے تیری داستاں میں

گر نہ ہو دردِ دل قلب و جاں میں — کیا اثر ہوگا اس کے بیاں میں
لذت ذکر ہے قلب و جاں میں — کیسی لذت ہے آہ و فغاں میں
حسن فانی پہ جو بھی مرا ہے — ہے ندامت اسے دو جہاں میں
درس عبرت ہے چشم عنادل — کس طرح غم سے نم ہے خزاں میں
حیف حسرت ہو یا کیف عشرت — خواب ہے خواب سب اس جہاں میں
قلب جن کا تھا ننگ بیاباں — ان کا شہرہ ہے اب گلستاں میں
آپ کے قرب کا کیف لذت — ہے کہاں عشرت دو جہاں میں
آہ نکلی ہے بے چین ہو کر — کیا اثر ہے تیری داستاں میں
بال میں آ گئی جب سفیدی — کچھ نہیں چہرۂ ارغواں میں
اس جوانی کو پیری میں دیکھا — راکھ تھی راکھ آتش فشاں میں
مجھ کو دھوکہ نہ دے رنگ گلشن — آہ صحرا بھی ہے گلستاں میں
حاصلِ زندگی ہے یہ اختر — ہر نفس یاد ان کی ہو جاں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ دردِ دل: اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد۔ آہ و فغاں: اللہ تعالیٰ کی یاد میں رونا۔ درس عبرت: عبرت کا سبق۔ چشم عنادل: بلبل کی آنکھ۔ نم: تر۔ خزاں: جھاڑ۔ حیف حسرت: خواہش پوری نہ ہونے کا افسوس۔ کیفِ عشرت: آرزو پوری ہونے کی لذت۔ ننگ بیاباں: جو ویرانے کو شرما دے۔ شہرہ: شہرت۔ گلستاں: باغ۔ داستاں: کہانی۔ چہرۂ ارغواں:......۔ پیری:......۔ آتش فشاں: لاوا۔ نفس: سانس۔

داستانِ اہل دل کی تاثیر جدا ہوتی ہے

گر نہ ہو دردِ دل قلب و جاں میں
کیا اثر ہوگا اس کے بیاں میں

اللہ تعالیٰ واعظ اور مقرر کے بیان میں جو تاثیر رکھتے ہیں وہ خود اس کے عمل کے مطابق ہوتی ہے یعنی خود بندہ دین پر جس قدر عمل کرنے والا اور اللہ کی راہ میں جتنے مجاہدے اٹھانے والا ہو اور پھر وہ لوگوں کو دین کی طرف دعوت دے تو پھر اس کے بیان میں بالکل نمایاں تاثیر دکھائی دیتی ہے اور اگر وہ صرف رسمی مقرر ہو اور اس کا دل خون آرزو پیے ہوئے نہ ہو تو اس کا انداز بیان وہ سوز وتڑپ اپنے اندر لئے ہوئے نہیں ہوگا اور نہ اس سے لوگ اتنے متاثر ہونگے یہی خصوصیت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں پائی جاتی تھی کہ آپ کی جتنی دعوت تھی اس سے زیادہ عمل اس لیے جو بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیتے تھے وہ دلوں میں اترتی چلی جاتی تھی۔

لذت ذکر ہے قلب و جاں میں
کیسی لذت ہے آہ و فغاں میں

ذکر اللہ سے قلب و جاں کا لذت پانا یہ قرآن سے ثابت ہے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد ہی کو دلوں کے اطمینان کا ذریعہ قرار دیا ہے گویا جس طرح آدمی اگر اسے ظاہری طور پر کھانا پینا نہ ملے تو وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہوجاتا ہے اسی طرح اگر روح کی غذا نصیب نہ ہو تو اس کی روح بھوکی اور پیاسی ہوجاتی ہے اور ذکر اللہ کے ساتھ ساتھ جب آدمی گناہوں سے بچتا ہے تو پھر اسے آہ وفغاں کی لذت نصیب ہوتی ہے وہ ٹوٹا ہوا دل لے کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو دل کے اندر کی گرمی آہ وفغاں اور گریہ وبکا کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔

عشقِ مجازی کا انجام دو جہاں کی ندامت ہے

حسنِ فانی پر جو بھی مرا ہے
ہے ندامت اسے دو جہاں میں
درسِ عبرت ہے چشمِ عنادل
کس طرح غم سے نم ہے خزاں میں

اب گویا حضرت والا اس شعر میں یہ بتارہے ہیں کہ جن لوگوں کو ذکر میں لذت محسوس نہیں ہوتی اور وہ آہ و فغاں کی لذت وحلاوت سے محروم ہیں تو وہ یہ بات سن لیں کہ حسن مجازی پر فریفتہ ہونا یہ اس دور کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس عاشق مجازی کو نہ ذکر اللہ میں کوئی لذت آئے گی نہ عبادت ومناجات میں کوئی حلاوت نصیب ہوگی بلکہ ایسے لوگوں کی زندگی تنگ اور تلخ کردی جاتی ہے اور اس کا سارا مزہ مکدر ہوجاتا ہے کیونکہ جس زبان سے

اللہ تعالیٰ کا نام لینے میں قلب و زبان لطف محسوس کرتے ہیں اس نے اس زبان اور دل کو گناہوں کا زہر چڑھا دیا ہے تو اب اس کے صحیح ذائقے سے وہ محروم ہو گیا ہے اس لیے حضرت والا نے بڑی حکمت اور خوش اسلوبی کے ساتھ حسن فانی پر مرنے والوں کو ندامت کا سامنا کرنا کیوں پڑے گا اس کو بیان کیا ہے کہ جس طرح فانی اور وقتی موسم بہار آتا ہے اور عنادل یعنی بلبل اپنا آشیانہ اور گھر بنا کر دیوانہ وار خوشی میں جھومتی پھرتی ہے اور اسے ایسا لگتا ہے کہ اب کبھی خزاں سامنے نہیں ہے مگر اچانک جب موسم خزاں آتا ہے تو وہ بڑی اداسی کے ساتھ اور غمناکی کی حالت میں روتی پھرتی ہے اور موسم بہار پر فدا ہونے کی وجہ سے اسے حسرت و ندامت کا سامنا ہوتا ہے بس ٹھیک اسی طرح حسن فانی کا عارضی ہونا دونوں جہاں میں انسان کے لیے ندامت کا باعث ہوگا اور وہ پھر پچتائے گا اور روئے گا مگر اس وقت کا پچھتانا اور رونا اس کے لیے کارگر اور نافع نہ ہوگا اس لیے دنیا میں رہتے ہوئے بلبل کی حالت سے سبق لے کر عاشق مجازی کو اپنی اس حرکت سے باز آجانا چاہیے۔

دنیا کی ہر شئی عارضی ہے

حیف حسرت ہو یا کیف عشرت
خواب ہے خواب سب اس جہاں میں

یعنی دنیا کی ہر شے عارضی ہے خوشی ہو یا غم، حسرت ہو یا عشرت، راحت ہو یا زحمت، سب مثل خواب کے ہے جس طرح ایک سونے والا آدمی خواب کے اندر کسی عمدہ دستر خوان پر بیٹھا ہوا نہایت لذیذ قسم کی غذاؤں کے کھانے میں مصروف ہو اور عمدہ قسم کے جوس اور مشروبات پی کر خوب مزے لے رہا ہو یا اس کے بالکل برخلاف کوئی شخص خواب کے اندر گرفتار ہو کر جیلوں میں بھیجا جا رہا ہو اور اسے پھانسی کی سزا سنائی جا رہی ہے اور انتہائی بے چینی کے عالم میں ہے لیکن بہر دو صورت جیسے ہی سونے والے کی آنکھ کھلے گی تو فوراً اسے پتہ چل جائے گا کہ نہ وہ خوشی خوشی تھی نہ رنج رنج تھا بالکل اسی طرح اس دنیا سے نکلتے ہی محسوس ہو جائے گا کہ سب کچھ خواب ہی خواب تھا اور ساری عزت و ذلت، رنج و غم، راحت و تکلیف، خیالی ہی خیالی تھی یک دم دوسرے عالم میں آنکھ کھلے گی تو حقیقت سامنے آجائے گی جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
رہ گیا عز وجاہ کا جھگڑا
یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی
یہ فقط وقت کا گزرنا ہے

اس لیے دنیا کی خوشی وغمی اور عزت و ذلت اور رنج و راحت کے پیچھے اپنی عمر ضائع نہ کرے۔

قلب جن کا تھا ننگ بیاباں
ان کا شہرہ ہے اب گلستاں میں

جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آئی تو مردہ دل ایسا زندہ ہوا اور فسق و فجور کی تاریکیاں اور ظلمتیں دل سے چھٹتی چلی گئیں اور قلب منور اور روشن ہوگیا اور اس میں اللہ کی معرفت ومحبت کے پھول کھل گئے اور وہ رشک گلستان و بوستاں بن گیا اور اس کی خوشبو ہر چہار طرف پھیلنے لگی جس کی بدولت ہر طرف اس کا چرچہ اور شہرت ہوتی چلی گئی جبکہ کل تک اس کی حالت یہ تھی کہ اس کا دل ننگ بیاباں تھا مگر اللہ کی محبت حاصل ہونے کی بدولت اللہ نے چاروں طرف اس کا چرچہ پھیلا دیا جیسا کہ روایات واحادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوجاتا ہے تو پھر ہر سمت اس کا چرچہ اور نیک نام روشن کردیا جاتا ہے۔

آپ کے قرب کا کیف لذت
ہے کہاں عشرت دو جہاں میں

یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب میں اور اللہ کو پالینے سے انسان کو جو پرسکون زندگی ملتی ہے اور جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ دونوں جہاں کی نعمتیں اور دولتیں ملنے سے بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خالق یعنی اللہ کی ذات عالی مرکز لذات دو جہاں ہے یعنی دنیا و آخرت کی ساری نعمتوں میں لذت اور لطف دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو بھلا جس کو اس کی نزدیکی اور قرب حاصل ہوگیا تو دونوں جہان کی نعمتوں اور عشرتوں کے مل جانے پر بھی وہ بات حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جس کو حضرت والا نے اپنے خاص دل نشیں انداز میں یوں ارشاد فرمایا۔

وہ شاہ دوجہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کے پائے

اور مولانا رومی نے اسی کو یوں ارشاد فرمایا۔

اے دل ایں شکر خوشتر یا آنکہ شکر سازد
اے دل ایں قمر خوشتر یا آنکہ قمر سازد

اس لیے یہ بات بالکل بجا اور درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قرب کی لذت دونوں جہان کی نعمتوں میں ممکن نہیں خواہ کتنا ہی اور کیسا ہی عیش وعشرت حاصل ہوجائے اور سامان راحت وسکون جمع ہوجائے۔

داستانِ انبیاء واولیاء میں چھپے ہوئے سبق

آہ نکلی ہے بے چین ہو کر
کیا اثر ہے تیری داستاں میں

جولوگ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنی تمناؤں کا خون کیے ہوتے ہیں اورغمہائے راہ خداوندی اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں تو انکی داستانیں بھی عجیب وغریب پرتاثیر ہوتی ہیں کہ جب وہ داستانیں لوگوں کے سامنے آتیں ہیں تو کتنے ہی لوگوں کے لیے باعث ہدایت اور وجہ موعظت ونصیحت بن جاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے انبیاء علیہ الصلاۃ والسلام کے واقعات اور قصے اوران کی داستانیں عبرت ونصیحت کے لیے ذکر فرمائی ہیں اوران واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء علیہ الصلاۃ والسلام اللہ کے دین کی خاطر کس طرح تکلیفیں اورغم اٹھاتے رہے اوران کی قوموں کی طرف سے مسلسل ایذاؤں اورتکلیفوں کے باوجود وہ سب کچھ سہتے رہے اور اپنے دل پرغم اٹھاتے رہے تو پھران کی داستانوں میں اللہ تعالیٰ نے عجیب تاثیر رکھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان اوران کا قصہ ہو یا حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ سب کے سب قیامت تک کے آنے والی قوموں اورنسلوں کے لیے رشد وہدایت کا سامان فراہم کرتے ہیں اور ہم قصوں میں اگر غور سے دیکھیں تو اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پالتے ہیں اور کن کن حالات سے گزارا جاتا ہے لیکن ان حالات میں بھی جب بندہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جمارہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس سے چھوٹتی نہیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوان کی والدہ نے حکم الٰہی سے دریا میں ڈال دیا تھا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ سے اس وقت اللہ کی مدد چھٹی ہوئی تھی جب حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں ڈالے گئے تھے تو کیا ہم یہ سوچ بھی سکتے ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی مدد حضرت یوسف علیہ السلام سے چھٹی ہوئی تھی۔ میرے دوستوں نہیں اور ہرگز نہیں۔

تو میرا منشاء عرض کرنے کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے رب ہیں اور ہمیں جس انداز سے پالتے ہیں اور ہماری تربیت فرماتے ہیں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز ہماری مراد اور منشاء ہے اس کے مطابق معاملہ ہوتا ہے اور کبھی ہم خیر سمجھتے ہیں اچھا سمجھتے ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے رب ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے بندے کی مصلحت اس میں نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ہمیں ویسا نہیں دیتے بلکہ اپنی شان ربوبیت، شان رحیمی، شان کریمی کے اعتبار سے لیکر چلتے ہیں اور اللہ وہ چیز دیتے ہیں جو اس سے افضل، اچھا اور بہتر ہو۔

ماں کا محبت کے باوجود بیٹے کی مراد پوری نہ کرنا

ایک ماں، ماں ہونے اور باپ، باپ ہونے کی حیثیت سے اگر اس کا چھوٹا سا بچہ ہو اور وہ بچہ سامنے آگ کا کوئی شعلہ دیکھ کر اس کی طرف لپکے بڑھے اور چلے یا چمکتی ہوئی چھری دیکھے اور اس کو جا کر ہاتھ میں اٹھانا چاہے اور وہ اس کی خاطر رو رہا ہے اور چلا رہا ہے تڑپ بھی رہا ہے خوب رو رہا ہے اس کا رونا بھی مسلّم اس کی آہیں بھرنا بھی مسلّم اور والد و والدہ کی شفقت و محبت بھی مسلّم، کیا کوئی انکار کرسکتا ہے اس کے باوجود آخر وہ والد اور والدہ آگ کا شعلہ یا وہ تیز دھار دار چمکتی ہوئی چھری والی اپنے اس بیٹے کے ہاتھ میں کیوں نہیں دیتے۔ کیا ہم یہ کہیں گے کہ والد کے دل میں شفقت و محبت نہیں یا یہ کہیں گے کہ بچہ ابھی اتنا رویا نہیں جتنا رونا چاہیے۔

بلکہ میرے دوستو اخیر میں ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ ابھی وہ بچہ نادان ہے اور عقل و شعور کے اعتبار سے اسے بلوغ حاصل نہیں وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ یہ چھری اور آگ کا یہ شعلہ ابھی اس کیلئے مضر ہے اور جب وقت آئے گا اور ضرورت ہوگی تو والد خود کہے گا کہ یہ چھری ہے تم اس سے صحیح کام لو، یہ آگ کا شعلہ جہاں ضرورت ہے وہاں اس کو استعمال کرو تو وباوجود والدین کی بہت زیادہ شفقت والفت اور مودت و محبت مسلّم ہونے کے اور باوجود اس بچے کا تڑپنا رونا مسلّم ہونے کے پھر بھی ان کے ہاتھ میں وہ والدین کیوں چھری نہیں پکڑاتے؟ کیوں آگ کا شعلہ نہیں دیتے؟ تو میں اور آپ یہی فیصلہ کریں گے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس کے ہاتھ میں دیدیا تو اس کا انجام تباہی بربادی اور ہلاکت ہے۔

میرے بھائیو! ہم کتنی ہی دعائیں کرتے ہیں کبھی ازالہ مرض اور صحت کی دعا کرتے ہیں تو کبھی وسعت رزق کی دعا مانگتے ہیں اور کتنے ہیں جو اپنے فقر کے ازالے کی دعا کرتے ہیں کہ مال مل جائے کتنے ہیں کہ جو اولاد کے حق میں دعائیں کرتے ہیں اور کتنے کتنے مسائل کے لئے اللہ سے مانگتے ہیں اور روتے دھوتے ہیں اب وہ سمجھتا ہے کہ میں دعائیں کرا بھی رہا ہوں اور کر بھی رہا ہوں صدقہ بھی نکال رہا ہوں سارے کام کر رہا ہوں اور بظاہر معاصی اور نافرمانیوں سے بھی دور ہوں لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ میری مراد پوری نہیں ہورہی ہے تو بس میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انبیاء کرام علیہ السلام کی تربیت فرمائی کہ کچھ وقفہ سال دو سال چار سال، دس سال، بیس سال، چالیس سال صبر آزما حالات رہے اور وقفہ تربیت آیا جو اللہ تعالیٰ کی بہت ساری مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی تھا اور اس وقفہ تربیت میں دل کی سطح قرب خداوندی کو اونچا کرنا تھا جس کے لیے کتنی مدت کی ضرورت تھی اس کا علم اللہ ہی کو تھا۔

مومن کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی

اس لیے مومن بندے کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری تمام دعائیں سنتے ہیں اور حالات کو جانتے ہیں اور ہماری آہ وزاری اور گریہ وبکا پر حق تعالیٰ کی رحمت بھی جوش میں آتی ہے مگر اللہ کے علیم وحکیم

ہونے کی وجہ سے اس کے علم وحکمت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ابھی ہماری وہ دعائیں اور مرادیں ہمیں عطا نہ ہوں کیونکہ اگر ابھی دے دی گئی تو میری وہ خاص رحمتیں وبرکتیں اور نعمتیں، عنایتیں جو اس درمیان اس بندے پر برس رہی ہیں وہ اس سے محروم ہو جائے گے اور اس کی آہ وزاری کی وجہ سے اسے جو قرب ملتا جارہا ہے اور اس کے درجات بلند ہوتے جارہے ہیں جس کا علم اسے آنکھیں بند ہونے کے بعد ہوگا وہ اس سب سے محروم ہو جائے گا۔

لہٰذا حاشا وکلّا...... مومن بندے کو کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ مجھے میری مرادیں نہ ملنا اس لیے ہے کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے یا دعاؤں کے قبول نہ ہونے کے سلسلے میں وساوس کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ دعاؤں کی قبولیت کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہے کہ ہم جو کچھ مانگے وہ فوراً مل جائے جیسا کہ بعض لوگ اس طرح سوچتے ہیں بلکہ قبولیت کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ وہی چیز عطا فرماتے ہیں خواہ فوراً ہو یا کچھ مدت کے بعد ہو یا کبھی اس کا نعم البدل عطا فرماتے ہیں اور کبھی بندے سے بہت زیادہ محبت وپیار ہونے کی وجہ سے اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر لیتے ہیں اور اسی طرح مسلسل اپنے در سے دعاؤں کے بہانے وابستہ کیے رہتے ہیں کیونکہ دعا مستقل خود ایک عبادت ہے جتنی دعا کرتا ہے اتنا عبادت کے ذریعے اس کا قرب اللہ سے بڑھتا رہتا ہے اگر اسے اس کی مراد دے دی جاتی تو ظاہر ہے کہ پھر وہ اس دعا کا مانگنا چھوڑ دیتا تو ایک عبادت سے محرومی ہوتی جس کا نقصان ہونا واضح اور ظاہر ہے یہی تو وجہ ہے کہ بعض اللہ کے ایسے بندے جن سے اللہ کو محبت نہیں ہوتی جب ان کی آواز اللہ تک پہنچتی ہے اور وہ اللہ سے کچھ مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اس کی یہ مراد جلد دے دو کیونکہ مجھے اس آواز سے محبت نہیں ہے اور میں اس کو اپنی بارگاہ میں بار بار سننا نہیں چاہتا اس کے برخلاف جو اللہ کا محبوب بندہ ہے اس کے بارے میں فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ ابھی اس کو اس کی مراد نہ دینا کیونکہ میں اس آواز کے سننے سے محبت رکھتا ہوں اور دعا کے واسطے اس کی یہ آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے۔

قرآن پاک میں انبیاء کے قصوں اور داستانوں کے تذکرے کا منشاء

صاحبو! اصل بات حضرت کے اس جملے سے شروع ہوئی (کیا اثر ہے تیری داستاں میں) اسی کے تحت احقر عرض کررہا ہے کہ جو لوگ مقربین بارگاہ خداوندی ہوتے ہیں یعنی انبیاء اولیاء ان کی داستانوں میں بڑا اثر اور نفع اور بے شمار عبرتیں اور نصیحتیں مخفی ہوتی ہیں یہی راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایسے بندوں کے واقعات قرآن کریم میں باقاعدہ طور پر مقصود بنا کر ذکر فرمائے اس لیے کہ سب سے زیادہ اپنی آرزوؤں کا خون پینے والے اور اللہ کے لیے دل پر صدمہ وغم اٹھانے والے انبیاء کرام علیہ السلاۃ والسلام ہی ہوتے ہیں جنہیں خود ان کی قوموں کی طرف سے بڑی سخت قسم کی ایذاؤں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کی داستانوں میں اہل ایمان کے لیے بڑی موعظت ونصیحت مخفی ہوتی ہے اور دین پر جمنے اور قائم رہنے والوں کے لیے تثبیت قلب (دل کا جماؤ اور قرار و

اطمینان) کے واسطے بڑا سامان موجود ہوتا ہے اور ان کے قصوں میں اللہ تعالیٰ اپنی خاص شان تربیت کے نرالے اورانوکھے انداز ظاہر فرماتے ہیں۔

دیکھئے اور غور کیجئے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ جن کے خطرے اور ڈر سے فرعون بنی اسرائیل کے تمام لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیئے ہوئے ہے اور قتل عام مچائے ہوئے ہے خود حضرت موسیٰ کو اسی فرعون کے گھر میں پالا جارہا ہے اور اس کے لیے ہر طرح کے انتظامات کیے جارہے ہیں کہ خود گھر میں فرعون کی بیوی کہتی ہے کہ یہ بچہ میری اورتمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس لیے اسے قتل مت کرو شاید یہ ہمارے لیے نفع کا سامان بنے اور یہاں اس کو ہم اپنا بیٹا بنا کر رکھیں اور اللہ کے غیبی نظام کے تحت حضرت موسیٰ کی والدہ کا انتظام خود ان کے لیے عجیب وغریب انداز سے کر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی کا دودھ پینے کے لیے تیار نہیں ہوتے بالآخر اس کام کے لیے خود حضرت موسیٰ کو ان کی والدہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ فرعون کے گھر میں ہی فرعون کے سب سے بڑے دشمن کو پالا اس لیے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

فَمُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاہُ جِبْرَئِیْلُ کَافِرٌ
وَمُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاہُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلٌ

ایک اسی دور کا وہ موسیٰ ہے کہ جس کو جبرئیل نے پالا وہ تو کافر بنا اور دوسرے وہ موسیٰ جن کو خدا کے دشمن فرعون نے پالا وہ اللہ کے پیغمبر اور نبی بنے۔

اسی طرح ایک ہلکی سی نظر حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے پر ڈالیں کہ وہی یوسف جن سے ان کے بھائیوں نے حسد کیا اور بہانا بنا کر ان کو کنویں میں ڈال آئے اللہ تعالیٰ نے اپنے غیبی نظام کے تحت ان کو کنویں سے نکال کر مصر کے بازاروں میں بکوا کر اس مقام پر پہنچا دیا کہ مصر کی حکومت و وزارت ان کو عطا ہوئی اور جو کچھ اس دوران حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا یہاں تک کہ زلیخا کی طرف سے غلط اور ناجائز کام کی دعوت دی گئی مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اللہ کا حکم توڑنے کے بجائے صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے اور اس غلط حرکت میں مبتلاء ہونے سے جس کی طرف مجھے بلایا جارہا ہے میرا قید خانہ زیادہ بہتر ہے غرض یہ کہ ایک طویل مدت یہی وقفہ تربیت چلتا رہا بالآخر اللہ تعالیٰ نے وہ دن بھی سامنے دکھائے کہ وہی بھائی سجدے کی حالت میں سامنے گر پڑے اور معافی مانگنے لگے اور اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچ کر دکھایا اور ان سازش اور حسد کرنے والے بھائیوں کو اپنے کئے ہوئے پر پچھتانا اور شرمندہ ہونا پڑا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کی راہ کا قید خانہ اور جیل عاشق کو اپنے آزاد گھر سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اور ایسا بہت سی مرتبہ دیکھا گیا کہ گھر پر رہتے ہوئے دین کے وہ کام نہیں ہوئے جو بسا اوقات جیل خانوں میں بزرگوں سے لئے گئے ہیں۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کا جیل میں ایک ماہ میں حفظِ قرآن

چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ احقر کو یاد آیا کہ جب وہ آزادیِ ہند کی خاطر اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ساتھ انگریز کی جیل میں ڈالے ہوئے تھے اب جیل ہی میں رمضان کا مہینہ آ گیا تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہ پوچھا کہ تراویح میں قرآن سنانے کا کیا نظم ہوگا اس پر حضرت مدنی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت آپ دعا فرمائیں میں ایک پارہ حفظ کر کے روزانہ تراویح میں سنا دوں گا۔ چنانچہ صبح سے یاد کرنا شروع کرتے اور شام تک پورا پارہ یاد کر لیتے اور تراویح میں سناتے تھے۔

غور فرمائیں کہ شروع سے حافظ نہ ہونے کے باوجود جیل میں رہ کر پورے قرآن کے حفظ کا معاملہ آسان ہو گیا ورنہ عامۃً دو سال، تین سال میں حفظ قرآن کی منزل طے ہوتی ہے اس لیے اللہ کی راستہ کی جیل میں بظاہر مشقت ہوتی ہے لیکن بسا اوقات وہ دین کے کاموں کے لیے نافع ثابت ہوتی ہے۔

اب میں اپنی بات کو سمیٹ کر مختصر کرتا ہوں اور پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جو حضرت والا نے شعر میں ذکر فرمایا آہ نکلی ہے بے چین ہو کر یعنی اللہ کی محبت کے عجب عالم اضطراب میں جو آہیں نکلیں گی اور حامل دردِ محبت کے دل کی گہرائی سے جو باتیں ظاہر ہونگی تو پھر اس کی تاثیر ہی کچھ الگ قسم کی ہوا کرتی ہے اور بسا اوقات وہ آہ بے اضطرابی پورے مجمع کے اوپر عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے اور لوگوں کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔

چنانچہ حضرت والا کے وعظ میں احقر نے یہ قصہ سنا کہ ایک بار حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کسی جگہ پر وعظ فرما رہے تھے تو دوران وعظ عجیب قسم کی ایک چیخ نکلی اور بڑے درد بھرے انداز میں آہ بھرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ ''ہائے امداد اللہ'' یعنی اس وقت اتنے مضامین وعلوم دل میں القاء ہو رہے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کون سے بیان کروں کون سے چھوڑ دوں اور یہ سب کچھ حضرت حاجی صاحب سے تعلق ونسبت پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل شامل حال ہوا تھا اور حضرت حاجی صاحب کے فیوض وبرکات تھیں اس لیے اس طرح حضرت نے اظہار فرمایا اور بس یہ آہ نکلنی تھی کہ پورا مجمع رونے لگا اور چیخیں نکل گئیں۔

چنانچہ ایسا ہی ایک قصہ حضرت گنگوہی کے متعلق ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک مرتبہ حضرت سے تقریر کی درخواست کی تو حضرت گنگوہی نے معذرت کر دی اور فرما دیا کہ میں تقریر نہیں کرتا لیکن جب زیادہ اصرار بڑھا تو حضرت نے منبر پر بیٹھ کر حمد وصلوٰۃ کے بعد جب لفظ ''اللہ'' زبان سے نکالا تو کچھ ایسے درد بھرے انداز سے کہا اور ایسی خاص کیفیت اور آہوں کے ساتھ لفظ اللہ زبان پر آیا کہ پورے مجمع پر گریہ طاری ہو گیا اس لیے اصل بات یہ ہے کہ تاثیر کلام آہ وزاری ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

حسن مجازی کی فنائیت کا خاص تذکرہ

بال میں آ گئی جب سفیدی
کچھ نہیں چہرۂ ارغواں میں
اس جوانی کو پیری میں دیکھا
راکھ تھی راکھ آتش فشاں میں
مجھ کو دھوکہ نہ دے رنگ گلشن
آہ صحرا بھی ہے گلستاں میں

ان تینوں اشعار میں حضرت والا نے دنیا کے فنا ہونے اور خوب صورت چہروں کے حسن کے مٹ جانے کا حال ذکر فرمایا ہے کہ بظاہر چمکتا چہرہ بالوں میں سفیدی آنے کے زمانے میں بگڑ چکا ہوتا ہے اور بظاہر سرخ رنگ خوبصورت جوانی کے عالم میں آتش فشاں معلوم ہونے والے چہرے پیری میں پہنچ کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں بس دنیا اور اس کے حسن وخوبصورتی کی اتنی سی حقیقت ہے اور جسے آہ صحرا میسر ہو اور وہ کسی گلشن کے گلوں پر عاشق اور فریفتہ نہ ہو اور رنگ گلشن پر اس نے نظر نہ اٹھائی ہو تو پھر اس کی رونق اور تر و تازگی اسے دھوکہ نہیں دے سکتی۔

حاصل زندگی ہے یہ اختر
ہر نفس یاد ان کی ہو جاں میں

یعنی مومن کے جینے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ کسی لمحہ اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو جس کی صورت یہ ہے کہ جو طاعات ہیں ان پر عمل کیا جائے اور جو معاصی اور گناہ ہیں ان سے بچا جائے اسی طرح دنیا کے ایسے مشاغل سے جو دل کو اللہ کی یاد سے دور کر دیتے ہیں اپنے کو علیحدہ اور یکسو رکھا جائے تا کہ جو اعلیٰ مقام عبدیت و بندگی ہے وہ حاصل ہے جس کو مقام حضور و مشاہدہ کہتے ہیں جسے اس طرح اللہ کی یاد حاصل ہو جائے سمجھ لو وہ مقصد زندگی کو پا گیا۔

عالم خاک ہے آسماں میں

ان کی منزل کبھی گلستاں میں
اور کبھی غم کے کوہ گراں میں
تربیت کا یہ راز نہاں ہے
خار بھی تو ہیں اس گلستاں میں
نغمہ زن ہے بہاروں میں بلبل
اور کبھی چشم نم ہے خزاں میں
عبدیت کا توازن ہے قائم
صبر سے شکر سے اس جہاں میں
دونوں مرکب سے چل کر کے سالک
جا پہنچتا ہے باغ جناں میں
ہے خوشی یاں تو غم بھی ہے اے دل
ایک حالت نہیں اس جہاں میں
ہاں مگر ان کا اک ذرۂ غم
ہر نفس مست رکھتا ہے جاں میں
کیف پایا ہے دونوں جہاں کا
میں نے عاشق کے درد نہاں میں
آب و گِل میں اگر درد دل ہے
عالم خاک ہے آسماں میں
ان کی یادوں کے صدقے میں اخترؔ
پُرسکوں زندگی ہے جہاں میں

مشکل الفاظ کے معنی:۔ گلستاں: باغ۔ کوہِ گراں: بھاری بھرکم پہاڑ۔ نہاں: پوشیدہ۔ خار: کانٹا۔ چشم نم: آنسو سے تر آنکھ۔ عبدیت: بندگی۔

پھول اور کانٹوں کے باہم ہونے میں ایک سبق

ان کی منزل کبھی گلستاں میں
اور کبھی غم کے کوہ گراں میں

تربیت کا یہ راز نہاں ہے
خار بھی تو ہیں اس گلستاں میں

ان اشعار میں حضرت والا یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بندے کی تربیت ہوتی ہے تو اس میں کبھی موافق طبیعت چیزیں پیش آتی ہیں اور کبھی مخالف طبیعت کبھی وہ شادمانی مسرت اور خوشی کے ساتھ رہتا ہے جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرکے اپنی مراد کو پاتا ہے اور کبھی غم کے کوہ گراں میں یعنی کبھی طبیعت کے ناموافق حالات پیش آتے ہیں پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے اور اس پر وہ راضی بقضاء اللہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اللہ کو پاتے ہوئے اپنی مراد میں کامیاب نظر آتا ہے اور حضرت نے فرمایا کہ جس گلستان میں پھول ہوتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں کانٹے بھی ہوتے اور اوپر پھول ہوتے ہیں اور اس کی جڑوں میں کانٹے تو اللہ تعالیٰ کا نظام تربیت بھی اسی طرح ہے کہ ایک طرف پھول ہیں تو دوسری طرف کانٹے ہیں یعنی جب پھول ملیں گے یعنی

خوشیاں پیش آئیں گی تو تو دوسری طرف کانٹے یعنی پریشانی اور طبیعت کے ناموافق حالات بھی پیش آئیں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان دونوں حالتوں سے گزار کر انسان کو گلستان اور آفتاب و مہتاب بناتے ہیں جس کی وجہ سے اس بندے کی خوشبو چہار دانگ عالم میں پھیل جاتی ہے۔

نغمہ زن ہے بہاروں میں بلبل
اور کبھی چشم نم ہے خزاں میں

بلبل پر جب موسم بہار آتا ہے تو وہ بہار میں خوب نغمہ زن ہوتی ہے اور موسم بہار کے وقت گویا کہ اس کی عید آئی ہے اور وہ اس کی خوشی کا سامان ہے لیکن جب موسم خزاں آتا ہے تو وہ چشم نم ہوتی ہے اور روتی پھرتی ہے تو حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا کے نظام پر غور کرو تو تقریباً اسی طرح کی صورت انسانوں کے لیے دنیا کی ظاہری بہار کی ہے کہ وہ اس کو موسم بہار سمجھ کر اس سے دل لگا بیٹھتا ہے لیکن اخیر میں اسے ندامت و شرمندگی کے آنسوؤں سے رونا پڑتا ہے کیونکہ دنیا کے زوال و فنا کے ساتھ ہی اس پر یہ حقیقت عین الیقین کے درجے میں روشن اور واضح ہوجاتی ہے کہ میں نے جس کو بہار سمجھا وہ دراصل موسم خزاں تھا۔

مومن ہر حال میں خدا کو پاتا ہے

عبدیت کا توازن ہے قائم
صبر سے شکر سے اس جہاں میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«عجبًا لامر المؤمن انّ امرہ کلّہ خیرٌ ولیس ذالک لاحد الاّ للمؤمن ان اصابتہ سرّاء شکر فکان خیرًا لہٗ وان اصابتہ ضرّاء صبر فکان خیرًا لہٗ»

(صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقائق، باب المؤمن امرہ کلہ خیر)

یعنی مومن بندے کا معاملہ کیا ہی خوب ہے اگر اسے خوشحالی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور اگر کوئی تنگی اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

تو گویا بندہ دونوں راستوں سے اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے نعمتوں پر شکر کرنے کے ذریعے اور مصیبتوں پر صبر کرنے کے ذریعہ یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے کہ کسی بھی حالت میں بندہ کو محروم نہیں رکھا اس لیے نعمتوں اور راحتوں کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو بھولنا نہیں چاہیے اور پریشانی اور تکلیف کی حالت میں بے صبر ہوکر مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے لیے دونوں قسم کی حالتوں کو خیر جانے اور صحیح عبدیت و بندگی کا توازن برقرار رکھنے کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ اللہ تعالیٰ دونوں طرح کے حالات کا سامنا کرائیں ورنہ عامۃ انسان کی فطرت یہ ہے جیسا کہ حضرت والا نے اپنی کتاب ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی حقیقت'' میں یہ بات لکھی ہے کہ عامۃ انسان کو

جب مال و دولت اور عیش و عشرت ملتی ہے تو وہ تکبر، ریا، بغض، حسد، غرور وغیرہ جیسی بیماریوں میں مبتلاء ہو جاتا ہے اس لیے ایسے موقعہ پر بھی اللہ کی طرف سے بندے کو آزمایا جارہا ہے کہ یہ مجھ سے غافل ہورہا ہے کہ نہیں اور مال و دولت کے نشے میں مجھے فراموش کررہا ہے کہ نہیں۔

اس طرح عامۃ جب انسان پر کوئی مصیبت اور تکلیف آتی ہے یا فقر و فاقہ درپیش ہوتا ہے تو ایسے موقعے پر وہ ناشکری میں مبتلاء ہوتا ہے اور بظاہر اللہ کے فیصلے سے راضی دکھائی نہیں دیتا شکوہ و شکایت کا انداز اختیار کرتا ہے حالانکہ یہ حالتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی ہوئی ہیں خوب بخود کسی کو پیش نہیں آتی اس لیے مومن کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ ہر حال کا حکم بجالائے اور عبدیت کے توازن کو قائم اور برقرار رکھے یعنی کبھی شکر کرے تو کبھی صبر اختیار کرے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا
ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

اس لیے مومن بندے کا کمال یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ کو یاد رکھے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾

(سورۃ ابراھیم، آیت ۷)

ترجمہ: اور جب سنا دیا تمہارے رب نے، اگر احسان مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۲۱۷)

ایمان پر خاتمہ کا قیمتی نسخہ از حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اسی کے ضمن میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان پر خاتمہ کی ایک بہترین صورت تحریر فرمائی ہے کہ اگر بندہ حاصل شدہ ایمان پر روزانہ شکر ادا کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا رہے گا تو گویا حاصل شدہ ایمان میں مزید ترقی ہوتی رہے گی اور ہوتے ہوتے اللہ تعالیٰ اسے کمال ایمان عطا فرمادینگے اور اس طرح اس کو خاتمہ ایمان پر نصیب ہوجائے گا کیونکہ نعمت کا چھین لیا جانا شکر نہ کرنے کی صورت میں ہے لہٰذا ثابت ہوگئی یہ بات کہ ایمان پر شکر کرنے کے نتیجے میں اس کو انشاء اللہ کامل ایمان پر خاتمہ نصیب ہوگا جو کہ ہر مومن کے دل کی آخری اور انتہائی آرزو ہے۔

صاحبو! اس سے ایک نہایت قیمتی بات سمجھ لینی چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندہ مومن کے لیے ہر حالت میں اپنے ملنے کا وعدہ فرمایا اور اپنی رضا کے حصول کا طریقہ بتایا اور تمام حالتوں کے احکام عطا فرمادیے تو پھر مسلمان

مسلمان ہو کر کسی بھی صورت میں ٹینشن اور ڈیپریشن کا شکار نہیں ہوسکتا نہ فخر وغرور کا شکار ہوسکتا ہے اس لیے کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ جب کوئی رنج وغم اور مصیبت وتکلیف مجھ پر ڈالی جارہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے مجھے اللہ اس راہ سے ملے گیں لہٰذا میرا کام اس پر صبر کرنا ہے اور یہ حالات محض اتفاقی نہیں ہیں بلکہ میری کسی خیر اور بھلائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر ڈالے گئے ہیں لہٰذا مجھ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرما رہے ہیں **اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ** کہ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور فرمارہے ہیں **اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ** کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا غرض یہ کہ مجھے ان حالات میں نہ اداس و مایوس ہونے کی ضرورت اور نہ بے چین و پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ اسی بات کو حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلفاء میں سے تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں اس طرح ذکر کیا کہ ''مریض کو مرض میں خدا ملتا ہے اور صحت مند کو صحت میں'' اور مال دار کو مال داری میں خدا ملتا ہے تو فقیر کو فقر میں حاکم کو حکومت میں خدا ملتا ہے تو رعایا کو بلا حکومت ملتا ہے غرض یہ کہ ہر حالت میں اللہ کا ملنا یقینی ہے۔

سبحان اللہ! کیا ہی کریم ہے اللہ کی ذات عالی کہ کسی بھی حالت میں اپنے بندے کے لیے اپنے در کو بند نہیں کیا کہ کوئی بندہ یہ کہہ سکے کہ میں اس حالت میں پہنچ گیا ہوں کہ اس حالت میں پہنچ کر میں اللہ کو راضی نہیں کرسکتا یہاں تک کہ شدید بیماری میں مبتلاء شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس کی صحت میں کیے جانے والے اعمال کے اجر کا وعدہ فرمایا ہے مسجد میں جانے سے معذور شخص کو گھر کے اندر ہی نماز پڑھ لینے پر جماعت سے نماز پڑھنے کا ثواب مقرر فرمایا ہے ، جہاد پر نہ جانے والے معقول عذروں میں مبتلاء حضرات کے لیے اپنے گھر میں رہتے ہوئے ہی جہاد میں شرکت کا ثواب مقرر کیا ہے تو جو بندہ دنیا میں جس حال میں ہے وہ اسی حال میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو پاسکتا ہے اللہ تعالیٰ کا دروازہ پوری زندگی کے چوبیس گھنٹے ہر لمحہ کھلا ہوا ہے

اسی لیے ساری عمر بھر کا کافر ومشرک جب بھی اللہ کے دروازے کو کھٹکھٹادے اور نادم وشرم سار ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اسے دھتکار کر دربار سے نکال نہیں دیتے بلکہ اس کی قدر دانی فرماتے ہیں اور اس کا سب کچھ معاف کردیتے ہیں ورنہ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ تو اتنا بڑا گنہگار ساری عمر کا باغی جا میں اب تیرے لیے اپنا در نہیں کھولوں گا اور تجھے معاف نہیں کروں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک عبرت آموز واقعہ

اس پر مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ یاد آیا جس کو حضرت والا نے اپنے مواعظ میں نقل کیا ہے کہ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دسترخوان پر بٹھا کر کھلانے کے لیے کوئی نہ ملا تو ایک کافر کو پکڑ کر لائے اور

کھانے پر بٹھایا اور اس نے کھانا شروع کیا تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اس سے کہا کہ تم ایمان قبول کیوں نہیں کرتے ہو ایمان لے آؤ تو وہ اس بات کی وجہ سے بھاگ گیا ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر عتاب ہوا اور وحی آئی کہ اے ابراہیم میں اس کافر کو پچاس ساٹھ سال سے کھلا رہا ہوں اور کھلانے کے بدلے میں نے اس سے ایمان کی پیش کش نہیں کی اور آپ نے ابھی ایک لقمہ ہی کھلایا اور فوراً ایمان کی پیش کش کر بیٹھے جاؤ اس کو پکڑ کے لاؤ اور اس کو کھانا کھلاؤ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے لگے اور باہر کسی جنگل سے اس کو پکڑ کر لائے اور اس کو سارا قصہ سنایا کہ تیری وجہ سے مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب نازل ہوا تو اس کافر کے دل کو اس بات کی وجہ سے ایک چوٹ لگی اور کہنے لگا کہ اچھا اللہ تعالیٰ اتنے کریم ہیں کہ مجھ جیسے کافر و نافرمان کی وجہ سے اپنے خلیل پر عتاب نازل کر دیا اور کھانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر کہنے لگا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ اِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلُ اللّٰهِ اس لیے خلاصہ یہ نکلا کہ کسی بھی حال میں بندہ اللہ تعالیٰ سے دور اور اس سے جدا اور کٹا ہوا اور علیحدہ نہیں ہے پس جس حال میں بھی ہو اس حال کے تقاضہ کو اور حکم کو بجا لائے اسے ضرور اللہ تعالیٰ مل جائیں گے۔

فائنل ڈسٹنیشن وایا (Via) صبر ہو یا شکر، جنت ہے

دونوں مرکب سے چل کر کے سالک جا پہنچتا ہے باغِ جناں میں
ہے خوشی یاں تو غم بھی ہے اے دل ایک حالت نہیں اس جہاں میں

سالک کا مطلب ہے جو بندہ اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرنے والا ہے اور اس کے لیے صبر و شکر گویا کہ دو سواریاں ہیں ایک خوشی کے موقعہ پر اور ایک غم کے موقعے پر ان دونوں سواریوں میں سے کسی پر بھی سوار ہو کر سالک اللہ کی جنت و رحمت تک پہنچ جاتا ہے اور جب تک ہم دنیا میں ہیں تو یہ دونوں حالتیں ضرور پیش آتی رہیں گی اس لیے کہ دنیا جنت و جہنم دونوں کا مظہر ہے لہٰذا یہاں خوشی کے ساتھ غم ہے، راحت کے ساتھ مصیبت ہے، سکون کے ساتھ پریشانی ہے، خوشحالی کے ساتھ بدحالی ہے، وسعت کے ساتھ تنگی ہے، اچھائی کے ساتھ برائی ہے، وغیرہ وغیرہ اس لیے اس دنیا میں ایک حالت نہیں ہو سکتی۔

تو جب یہ بات طے ہے کہ اس دنیا میں دونوں قسم کے حالات ہونگے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ ان دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کوئی سواری اور کوئی راستہ ضرور ہوگا اسی کو ہم صبر و شکر سے تعبیر کرتے ہیں اور قربان جائیں ہم اپنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ نے اپنی امت کو ہر چھوٹی بڑی بات سے آگاہ اور خبردار کر دیا کہ ہم اگر واقعی معنی میں حضور کے غلام بن جائیں تو دنیا اور آخرت کی عزت و راحت اور عافیت ضرور مقدر ہو کر رہے گی اور ناکامی اور رسوائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن وکافر کی مثال اس طرح بیان فرمائی:

﴿مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الزَّرْعِ لَا تَزَالُ الرِّيحُ تُمِيلُهُ وَلَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ يُصِيبُهُ الْبَلَاءُ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ شَجَرَةِ الْأَرْزِ لَا تَهْتَزُّ حَتَّى تَسْتَحْصِدَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب مثل المؤمن کالزرع)

کہ مومن کی مثال اس کھیتی کی طرح ہے جس کو ہوائیں ادھر سے ادھر گراتی ہوں اور ادھر سے ادھر تو مومن بھی اپنے حالات میں کبھی ادھر گرتا ہے تو کبھی ادھر مگر پھر سے اٹھ کر ایسے ہی سیدھا کھڑا ہوجاتا ہے جس طرح کہ وہ کھیتی سیدھی ہوجاتی ہے اور منافق وکافر کی مثال صنوبر کے اس درخت کی طرح ہے کہ جو ہلتا نہیں ہے مگر جب ہلتا ہے تو جڑ سے اکھڑ کر گر جاتا ہے اور اس کو کاٹ کر صاف کردیا جاتا ہے جبکہ مومن یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب تکالیف میرے اوپر اس لیے ڈالی جارہی ہیں تاکہ میں اللہ سے اس حال میں ملوں کہ گناہوں سے بالکل پاک وصاف ہوجاؤں جیسا کہ ایک حدیث شریف میں ہے:

﴿لَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ أَوِ الْمُؤْمِنَةِ فِي جَسَدِهِ وَفِي مَالِهِ وَفِي وَلَدِهِ حَتَّى يَلْقَى اللهَ وَمَا عَلَيْهِ مِنْ خَطِيئَةٍ﴾

(مسند احمد)

کہ مسلمان کو اس کی جان اور اس کے مال اور اس کی اولاد کے سلسلے میں ابتلاء آزمائش پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے اوپر ایک گناہ بھی نہیں باقی رہے گا۔

یہاں تک کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی:

﴿يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيضِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی ذھاب البصر)

دنیا میں عیش وعشرت میں رہنے والے لوگ جب مصیبت زدہ لوگوں کے بلند درجات اور عظیم اجر وثواب کو قیامت کے دن دیکھیں گے تو ان کی یہ تمنا ہوگی کہ کاش ان کو دنیا میں ایسی تکلیف ملتی کہ ان کی کھالیں قینچیوں سے کاٹی جاتیں تاکہ آج یہ عظیم اجر وثواب ہمیں حاصل ہوجاتا لہٰذا مومن کو کسی بھی حال میں بے چین اور پریشان اور مایوس وناامید نہیں ہونا چاہیے ان شاء اللہ جس حال میں بھی اللہ نے رکھا ہے اسی کے ذریعے اس کی اللہ تک رسائی ہوجائے گی اور منزل مقصود حاصل ہوجائے گی۔

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ بندے کا تعلق تفویض وتوکل کا ہوجائے اور اپنی تجویزیں اسکی مرضی پر فنا کردے تو اس کو جینے میں بڑی حلاوت نصیب ہوگی خواجہ صاحب نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

اجر لے ناکام ہو کر بھی نہ ربّ کام چھوڑ
وقت ہے جدوجہد کا راحت و آرام چھوڑ
کیا نتیجہ ہوگا کیونکر ہوگا یہ اوہام چھوڑ
کام کر اور جس کا ہے کام اس پہ تو انجام چھوڑ

اہل اللہ سارے عالم سے مست و بے خبر رہتے ہیں

ہاں مگر ان کا اک ذرۂ غم ہر نفس مست رکھتا ہے جاں میں
کیف پایا ہے دونوں جہاں کا میں نے عاشق کے درد نہاں میں
آب و گل میں اگر درد دل ہے عالم خاک ہے آسماں میں

یعنی بندہ مومن جو اللہ تعالیٰ کی راہ کا غم اٹھاتا ہے اور اس کی نافرمانیوں سے بچ کر حرام لذتیں نہ اٹھانے سے دل پر آنے والی حسرت اور صدمہ برداشت کر کے چلتا ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے قلب میں ایسی حلاوت ولذت اور ایسا سرور وکیف عطا فرماتے ہیں کہ جو دونوں جہان کے مزوں سے بڑھ کر ہے جس کے نتیجے میں یہ اللہ کا سچا عاشق ایسا مست اور مگن رہتا ہے کہ اسے کائنات کی چیزوں سے کوئی مطلب واسطہ باقی نہیں رہتا اس کے قلب میں خود ایک عظیم کائنات قائم رہتی ہے اور بڑا عالم رچا بسا ہوتا ہے یہی سب سے عظیم الشان تحفہ ہے اور مومن کو ملنے والا عطیۂ خداوندی ہے جو اللہ کے خاص اولیاء صدیقین کا حصہ ہے جس کی بدولت یہ ذرہ آب وگل فرش پر رہتے ہوئے عرش سے جڑا رہتا ہے اور خاک پر رہتے ہوئے آسمان سے رابطہ کئے ہوتا ہے۔

ان کی یادوں کے صدقے میں اختر
پر سکوں زندگی ہے جہاں میں

یہ بات اس کتاب میں جگہ جگہ ذکر کی گئی ہے کہ مومن کو اس وقت تک سکون نہیں مل سکتا جب تک کہ اس کی زندگی اللہ کی یاد سے دور ہو اور غفلت میں گزر رہی ہو کیونکہ قرآن نے سکون کا ایک ہی راستہ مقرر فرمایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری والا راستہ ورنہ سامان سکون تو جمع ہو سکتے ہیں لیکن سکون میسر نہیں آسکتا۔

انقلاب زندگی

خوبرویوں سے ملا کرتے تھے میر
اب ملا کرتے ہیں اہل اللہ سے
مت کرے تحقیر کوئی میر کی
رابطہ رکھتے ہیں اب اللہ سے

فدا اُن پر کرو ہر لمحہ جاں کو

نہیں پائے گا جو زخم نہاں کو
وہ کیا جانے گا پھر آہ و فغاں کو
ترستا ہے وہ تاثیر بیاں کو
نہ پائے جو محبت کی زباں کو
نہ پاؤ گے خرد کی بندگی سے
جو حاصل ہے گروہ عاشقاں کو
مٹا دے نفس امارہ کو اے دل
اٹھا دیں گے حجاب آسماں کو
یہ ہے ہر لمحہ فرمان محبت
فدا ان پر کرو ہر لمحہ جاں کو
نہ پاؤ گے کبھی جام محبت
نہ ڈھونڈو گے اگر پیر مغاں کو
گناہوں سے نہ باز آئے اگر تم
عطا نسبت نہ ہوگی قلب و جاں کو
جو صحرا میں ہے سناٹے کا عالم
کہاں حاصل ہے یہ ہو گلستاں کو
خداوندا مجھے توفیق دے دے
فدا کردوں میں تجھ پر اپنی جاں کو
گناہگاروں کے اشکوں کی بلندی
کہاں حاصل ہے اخترؔ کہکشاں کو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **زخمِ نہاں**: چھپا ہوا زخم، مراد وہ چوٹ ہے جو اللہ تعالیٰ کے عاشق گناہوں سے بچنے میں اپنے دل پر کھاتے ہیں۔ **آہ و فغاں**: اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا اپنے گناہوں پر ندامت سے رونا۔ **تاثیرِ بیاں**: بیان اور تقریر میں اثر ہونا۔ **خرد کی بندگی**: عقل کی غلامی۔ **گروہِ عاشقاں**: اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کی جماعت۔ **نفسِ امارہ**: نفس کی وہ حالت جس میں وہ گناہوں کا بہت زیادہ تقاضہ کرتا ہے۔ **حجابِ آسماں**: آسمان کا پردہ، مراد اللہ تعالیٰ کی نزدیکی اور قرب کا ملنا ہے۔ **فرمانِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضہ۔ **جامِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب۔ **پیرِ مغاں**: مرشدِ کامل۔ **نسبت**: اللہ تعالیٰ کو بندے سے اور بندے کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جانا۔ **صحرا**: ریگستان۔ **ھو**: سناٹے کی حالت۔ **گلستاں**: باغ۔ **بلندی**: اونچائی۔ **کہکشاں**: ستاروں کا مجموعہ۔

آہ وفغاں اور تاثیرِ بیان اندرونی محبت کی نشانی ہے

نہیں پائے گا جو زخم نہاں کو
وہ کیا جانے گا پھر آہ و فغاں کو
ترستا ہے وہ تاثیر بیاں کو
نہ پائے جو محبت کی زباں کو

یعنی جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی محبت حاصل نہ ہو اور اس کے دل میں گناہوں سے بچنے کا غم زخمِ نہاں کی صورت میں موجود نہ ہو تو پھر اسے آہ وفغاں کا مزہ بھی نہیں ملتا، دراصل یہ آہ وفغاں اسی زخمِ نہاں کا اثر ہوتی ہے جس

نے اللہ کی راہ میں جتنے مجاہدے اٹھائے ہوتے ہیں اور جتنی تکلیفیں سہی ہوتی ہیں اس کو اتنا ہی اللہ تعالیٰ اپنی محبت کا درد عطا فرماتے ہیں اور وہ پھر چہرے سے جھلکنے اور آنکھوں سے چھلکنے لگتا ہے اور یہ اسی دل میں چھپے ہوئے درد کا ترجمان ہے اور جو گریہ وزاری آنکھوں کو عطا ہوتی ہے اور جو آہ وفغاں زبان سے جاری ہوتی ہے اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ بیان میں ایسی تاثیر رکھ دیتے ہیں کہ سننے والوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

اور جو اس دردِ محبت سے خالی ہوا گرچہ اس کو ظاہری فصاحت و بلاغت خوب عطا ہوئی ہو اور لوگوں میں بہت اچھا مقرر جوشیلا خطیب اور بے مثال واعظ جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہو لیکن اس کے بیان کو اللہ تعالیٰ وہ تاثیر عطا نہیں فرماتے اس لیے ایسا آدمی تاثیرِ بیان کے لیے ترستا رہتا ہے وقتی طور پر لوگ اس کے بیان سے خوش اور متاثر ہوتے دکھائی دیتے ہیں لیکن دیرپا اثر زندگیوں میں پیدا نہیں ہوتا۔

حضور ﷺ کی تعلیم وتربیت کی دو خصوصیتیں

اس کی دلیل اور وجہ وہ ہے جس کو شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی نصابِ تعلیم کے موضوع پر لکھی ہوئی کتاب میں یوں ذکر کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ کی دو بنیادی خصوصیتیں تھیں جن سے آج واعظین اور مقررین عام طور پر خالی ہوتے ہیں اس لیے ان کی تعلیمات اور ہدایات یا تو زبانوں پر رہتی ہیں یا تو اوراق کے سپرد ہوتی ہیں وہاں سے آگے نہیں جاتی اور دلوں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی ہے (۱) خصوصیت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بیان فرماتے تھے تو صحابہ کرام کو قریب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر بڑی نرمی اور محبت ومودت شفقت ورحمت اور الفت و پیار رکھا تھا۔ کیسا ہی ناراض کرنے والا اور غصہ دلانے والا واقعہ ہوا و غمگین و بے چین کرنے والی بات ہو لیکن حضور علیہ الصلاۃ والسلام صحابہ کرام کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتے تھے، جیسا کہ ایک موقع پر ایک اعرابی آیا اور مسجد کے اندر کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا جب صحابہ کرام نے دیکھا تو اس کی طرف لپک کر اسے ڈانٹنے ڈپٹنے کا ارادہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں ایسا نہ کرو اور اس وقت اس کے پیشاب کو قطع نہ کرو اور پھر پانی بہا کر اس کو صاف کرا دیا اسی طرح ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ قرض لیا تھا، تو قرض خواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ نامناسب باتیں کہنے لگا جو واقعہ کے خلاف اور غلط تھیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس بات سے منع کر دیا کہ وہ اسے کچھ کہے اور پھر یہ جملہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالاً﴾

(صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب من استسلف شیئاً فقضیٰ خیراً منہ)

یعنی حق والے کو کچھ کہنے کی گنجائش ہوا کرتی ہے۔

اسی طرح ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زنا کی اجازت چاہنے کے لیے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کو بڑے پیارے انداز سے سمجھایا اور ان سے یہ دریافت کیا کہ بتاؤ اگر کوئی تمہاری بیٹی بہن کے ساتھ ایسا معاملہ کرے تو تم گوارا کرو گے تو اس نے جواب دیا ''یا رسول اللہ نہیں''، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو کسی کی بیٹی اور بہن ہے۔

غرض یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑی ہی شفقت و محبت اور نرمی رکھی گئی تھی جس کے نتیجے میں آپ کی دعوت بڑی موثر اور نافع تھی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(سورۃ آل عمران، اٰیۃ: ۱۵۹)

ترجمہ: بعد اس کے (کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے ایسی لغزش ہوئی جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملامت اور مواخذہ کرنے کا حق تھا) خدا ہی کی رحمت کے سبب (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم (خدانخواستہ) تندخو سخت مزاج ہوتے تو یہ (بیچارے) آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے (پھر ان کو یہ فیوض و برکات کہاں نصیب ہوتے)

لہٰذا معلم اور مقرر اور مبلغ و داعی کے مزاج میں سب سے پہلی صفت نرمی اور محبت و مودت ہونی چاہیے اور جس کو یہ چیز عطا ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ من جانب اللہ عطا ہوئی ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ میں اس کو اپنی رحمت خاصہ کا اثر قرار دیا ہے میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ اسی بات کو بڑے پیارے انداز میں یوں فرماتے تھے:

ارے ارے! باپ بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔

شیخ بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔

استاد بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔

شوہر بن تو گئے مگر بننا آتا نہیں۔

اسی طرح چند چیزیں گنتی کرانے کے بعد اخیر میں مختصر لفظوں میں آہستہ سے ارشاد فرماتے تھے کیونکہ شفقت نہیں ہے۔

تعلیمِ قرآن کے ساتھ صفتِ رحمٰن استعمال کرنے کی حکمت

اسی لیے ہمارے حضرت والا کے ایک وعظ میں یہ بات مذکور ہے کہ تعلیم قرآن کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رحمٰن کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝﴾

(سورۃ الرحمٰن، اٰیۃ: ۱-۲)

جب کہ دوسرے اسماء صفات میں سے کوئی اور نام بھی لایا جا سکتا تھا جیسے کہ ''اَللّٰہُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'' ''اَلرَّبُّ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'' ''اَلْخَالِقُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'' وغیرہ۔

لیکن رحمٰن کی صفت تعلیم قرآن کے موقع پر استعمال کرنے میں یہی خاص حکمت و مصلحت مخفی ہے کہ اے معلمین قرآن (اے قرآن کے سکھانے والو) تمہارے اندر قرآن کی تعلیم کے وقت صفت رحمت غالب ہونی چاہیے اگر ایسا ہوگا تو تم آسانی سے تعلیم قرآن کر سکو گے۔ اسی لیے ایسے بہت سے بچوں کے واقعات ہیں کہ جو استاذ کی شفقت والفت اور نرمی و مہربانی نہ ملنے کی وجہ سے اور ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے اثر سے حفظ قرآن چھوڑ بیٹھے مگر پھر ان کو جب کسی مشفق مہربان استاذ کے پاس بھیجا گیا اگر چہ کچھ وقت زیادہ خرچ ہوا مگر انہوں نے عمدگی کے ساتھ قرآن حفظ کرلیا۔

غرض یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت میں نرمی والا پہلو غالب تھا یہ اوّل درجہ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔

اور دوسری خصوصیت یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی دعوت دیتے تھے اس سے زیادہ خود عامل ہوتے تھے جیسے دوسروں کو پانچ وقت کی نمازیں پڑھنے کا حکم دیتے جب کہ خود اشراق و چاشت تہجد و اوابین وغیرہ نمازیں پڑھا کرتے تھے، اسی طرح دوسروں کو چالیسواں حصہ خرچ کرنے کا حکم دیتے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سب کچھ خرچ کر دیتے تھے یہی معاملہ روزہ اور دوسری عبادات کا تھا۔ اس لیے تعلیم اور تربیت میں تاثیر لانے کے لیے خود دین پر اس سے زیادہ عامل ہونا چاہیے جس کی دوسروں کو تعلیم دے رہا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی باتوں میں خاص تاثیر عطا فرماتے ہیں ورنہ حقیقی اور سچی بات یہ ہے کہ تقریر برائے تقریر ہو کر رہ جاتی ہے اور سوائے وقتی اثر اور جزوی نفع کے کوئی خاص انقلاب اور نمایاں تغیر لوگوں کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ اسی کو حضرت والا نے فرمایا ہے کہ جسے محبت کی زبان حاصل نہ ہو اسے تاثیر بیان بھی حاصل نہیں ہوتی وہ اس کے لیے ترستا رہتا ہے۔

راہِ سلوک کے لیے دیوانگی چاہیے نہ کہ فرزانگی

نہ پاؤ گے خرد کی بندگی سے
جو حاصل ہے گروہ عاشقاں کو

حضرت والا کے کلام میں اہل خرد اور اہل عشق کی دو تعبیریں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ ہر وقت ظاہری عقل کے فیصلوں پر چلتے ہیں اور وہ اللہ پر مر مٹنے کا جذبہ نہیں رکھتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے عاشقوں اور دیوانوں کا مزاج ہوا کرتا ہے تو پھر ایسے لوگوں کو قربانیاں دینا اور مجاہدے اٹھانا بڑا مشکل ہوتا ہے اور ان پر اللہ کے لیے مرنا مٹنا دشوار ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس دولت سے محروم رہتے ہیں جو اللہ کے عاشقوں کو نصیب ہوا کرتی ہے۔

اگر اس فرق کو سمجھنا ہو تو ہم حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کو دیکھ لیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے یہی مقام دیوانگی حاصل تھا اس لیے جب جان و مال کی قربانی کا موقع سامنے آتا تو اس پر اپنی ظاہری عقل کے پہلو سے نہیں سوچتے تھے بلکہ وہ اللہ کی راہ کے دیوانے تھے جو بھی تقاضہ سامنے آتا فوراً سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے اور اگر، مگر، کے لفظوں سے ان کے ذہن بالکل پاک وصاف تھے جو درحقیقت بچنے اور پہلو تہی کرنے والوں کے عذر و بہانے کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ ہیں ورنہ مومن کی شان یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا جو بھی حکم سامنے ہو اس پر بلا کچھ سوچے سمجھے، دیوانہ وار قربان ہو جائے۔ نہ کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کا ڈر ہو اور نہ ہی کسی مصلحت و منفعت کے فوت ہونے کا، اندیشہ لاحق ہو یہی مزاج عاشقاں ہوا کرتا ہے اور اسی کی طرف حضرت شعر میں اشارہ فرمار ہے ہیں۔ جس کو حضرت والا نے ایک دوسرے شعر میں یوں ذکر کیا ہے ؎

خرد کے سامنے گرچہ ہیں صد ہزار عالم
نگاہِ عشق میں تیرا ہی ایک عالم ہے

اور فرمایا ؎

رہِ عشق میں عقل کانٹا ہے کانٹا
جو ہے کام کی بس تو دیوانگی ہے

اس پر احقر کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ایک قیمتی ملفوظ یاد آیا جس میں یوں ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی طبیعت کو عقل کے تابع کر دیا اور بحمد اللہ عقل کو شریعت کے تابع کر دیا تو اب طبیعت اور عقل کی چاہت شریعت کی چاہت کے ماتحت ہوتی ہے اور یہی کل پورے دین کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اور شریعت کا حاصل بلا چوں و چرا ان اللہ تعالیٰ کے حکم کی خاطر اپنی جان اور سب کچھ لٹانا ہے۔

مدارِ محبت اتباعِ محبوب اور مخالفتِ نفس پر ہے

مٹا دے نفسِ امارہ کو اے دل
اٹھا دیں گے حجابِ آسماں کو
یہ ہے ہر لمحہ فرمانِ محبت
فدا ان پر کرو ہر لمحہ جاں کو

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِيْ طَاعَةِ اللهِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص ۷)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی طاعت میں اپنے نفس (سے) جہاد کرے۔

انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے جو کہ ہر وقت کا ساتھی ہے اور متعدد روایات میں نفس امارہ کا دشمن ہونا مذکور ہے بالکل ٹھیک اسی طرح جیسا کہ شیطان ہمارا خارجی دشمن ہے، نفس داخلی دشمن ہے اور عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ دشمن کو دشمن سمجھا جائے اس کے ساتھ دوستوں والا سلوک نہ کیا جائے اس لیے ہر موقع پر نفس و شیطان کے تقاضوں کو پامال کرنا چاہیے اور اللہ کے حکم پر جان دینی چاہیے۔

یہی حقیقت ہے نفس امارہ کو مٹانے کی ورنہ اگر کوئی یہ سوچے کہ میرے اندر سے گناہوں اور نافرمانیوں کے تقاضے ختم ہوجائیں اور ان کی طرف طبیعت میں کسی درجہ بھی رغبت باقی نہ رہے تو ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ملائکہ اور فرشتوں کی خصوصیت ہے اس لیے انسان کے لیے اصل یہ ہے کہ سب تقاضوں کے باوجود ان پر کنٹرول کرے خواہ دل پر کتنا ہی زور پڑے اور کیسی ہی تکلیف اٹھانی پڑے کیونکہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں اور معصیتوں کو دنیا کے اندر نفس کی مرغوب غذا بنایا گیا اور طبیعت کی چاہت اور میلان ان کی طرف رکھا گیا ہے اور طاعات کا انجام دینا اور برائیوں سے رکنا یہ طبیعتوں میں ناگوار رکھا گیا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الجنة، وصفة نعیمها واهلها)

یعنی جنت کو ایسی چیزوں سے گھیر دیا گیا ہے جو طبعی طور پر انسان کو ناگوار ہیں اور مشقت آمیز ہیں اور جہنم کو ایسی چیزوں سے گھیرا گیا ہے جو طبعی طور پر انسان کی چاہت ہیں اور اس کو مرغوب ہے۔

لہٰذا اگر مومن بندے کو اللہ تعالیٰ کا قرب چاہیے اور جنت میں داخلہ مطلوب ہو تو نفس امارہ کے تقاضوں کو مغلوب کرنا پڑے گا اس کے بعد اسے خود محسوس ہوگا کہ جیسے بندے اور اللہ کے درمیان سے سارے حجابات اٹھا دئے گئے ہوں بس ہر لمحہ یہ خیال رہے کہ جو بھی میرے محبوب خالق و مالک اللہ تعالیٰ کا حکم ہے میرے دل کے سارے ارمان اسی پر قربان ہیں اور اس کے خلاف ایک قدم اٹھانا مجھے منظور اور گوارا نہیں ہے یہی صورت ہے۔ کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے صحیح محبت کر کے خود اس کا محبوب بن جائے اور یہی تقاضائے دعویٰ محبت بھی ہے کیونکہ محبّ اپنے محبوب کی ہر ادا پر جان دینے والا ہوا کرتا ہے جیسا کہ عربی کا مقولہ ہے کہ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعٌ یعنی محبّ اپنے محبوب کی ہر بات ماننے والا ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو بس زبانی دعویٰ محبت تو ہے لیکن حقیقی محبت نہیں ہے جیسا کہ بہت سے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ان کے شب و روز آپ کی سنتوں اور طریقوں سے ہٹ کر یہود و نصاریٰ کے طریقوں میں گزر رہے ہیں تو یہ دعویٰ محبت بارگاہ خداوندی میں معتبر نہیں ہے۔

صحبتِ شیخ سے عطائے نسبت اجتنابِ معصیت پر موقوف ہے

نہ پاؤ گے کبھی جام محبت
نہ ڈھونڈو گے اگر پیر مغاں کو
گناہوں سے نہ باز آئے اگر تم
عطا نسبت نہ ہوگی قلب و جاں کو

حضرت والا نے اصلاح وتربیت کے لیے اعتدال پر مبنی مسلک وموقف پیش کیا ہے کہ جس طرح راہِ محبت طے کرنے کے لیے گناہوں کا چھوڑنا اور اللہ کی نافرمانیوں سے باز آنا ازحد ضروری ہے اس کے بغیر یہ راہ طے ہو ہی نہیں سکتی اور قلب و جاں کو خاص نسبت مع اللہ نہیں مل سکتی۔ٹھیک اسی طرح نسبت مع اللہ کے حصول اور جام محبت پینے کے لیے کسی شیخ کامل، مرشد برحق کے ساتھ اصلاحی تعلق بھی ازحد لازم وضروری ہے۔

سنت اللہ یہی جاری ہے کہ کتاب اللہ پر عمل رجال اللہ کے ذریعے ہی آسان ہوتا ہے اس لیے بندہ مومن گناہوں کو چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرے اور اپنا ہاتھ کسی اللہ والے کے ہاتھ میں دے دے جب ان دو پہیوں پر آپ کے عشق ومحبت کی سواری چلے گی تو ان شاء اللہ جلد ہی بڑی عافیت اور راحت کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ کر محبوبِ حقیقی سے ملا دے گی اور اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی کمی اور نقصان ہو تو پھر نسبت مع اللہ کے حصول کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔اس لیے جو لوگ اپنی انانیت وتکبر اور عجب وخود پسندی کی بنیاد پر رجال اللہ یعنی اولیاء اللہ سے دور رہتے ہیں اور طرح طرح کے اوہام اور شکوک وشبہات میں مبتلا رہتے ہیں وہ ساری عمر راہ سلوک طے کرنے کے باوجود اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے، کبھی جوش وجذبے میں افراط کا شکار ہوتے ہیں، تو کبھی تفریط کا۔ اس طرح ان کو رسوخ اور بقا حاصل نہیں ہو پاتی اور استقامت کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح دوسری قسم کے وہ لوگ کہ جو کسی شیخ برحق سے وابستہ تو ہیں اور اصلاحی تعلق بھی رکھتے ہیں مگر یہ وابستگی اور تعلق محض برائے نام ہوتا ہے نہ گناہوں کو چھوڑنے کا عزم وارادہ، نہ تعلیمات شیخ کی اتباع کی کوئی فکر، نہ ہی اپنے شیخ کی تعلیمات کو اپنے اوپر منطبق کرکے اپنے حالات کو جانچنے پرکھنے کا کوئی خیال ہوتا ہے بس ایک رسمی انداز سے پیری مریدی کی صف میں اپنے کو لا کر کھڑا کردیا اور اپنے ذہن کی مفروضہ برکتیں حاصل کرنے کا دل میں خیال جمالیا یا کچھ دنیوی منافع کاروبار میں ترقی یا الاؤں بلاؤں کا ٹل جانا اس نوع کے ضمنی اور جزئی فوائد سامنے رکھ کر کسی سلسلے سے وابستہ ہوگئے اور جو بنیادی مقصد تھا اس کو نگاہوں سے اوجھل کردیا تو ایسے لوگ بھی ساری عمر گزر جانے کے باوجود نسبت مع اللہ حاصل نہیں کر پاتے۔

اس لیے حضرت والا نے اس شعر میں دونوں قسم کے لوگوں کی اصلاح فرمائی جس کا حاصل یہ ہوا کہ کسی شیخ

کامل کی ہدایات وتعلیمات کی پوری پوری اتباع اور تمام گناہوں سے مکمل اجتناب ہی عطائے نسبت کا ضامن ہے اگر ان میں سے ایک کا بھی فقدان ہو تو پھر تا حیات حصول نسبت کا تصور محض ایک خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

صحرا میں جو مزہ ہے وہ گلستاں میں نہیں

جو صحرا میں ہے سناٹے کا عالم
کہاں حاصل ہے یہ ہو گلستاں کو

اللہ تعالیٰ کے سچے عاشق دنیا کے رنگ و بو اور اس کی زیب و زینت میں اتنے خوش نہیں ہوتے جتنی خوشی ایسے صحراؤں اور سیدھی سادھی جگہوں میں ہوتی ہے جہاں نہ یہ نقش و نگار ہوں اور نہ انواع و اقسام کے پھول بوٹے ہوں اور نہ وہاں کوئی خاص زیبائش و آرائش ہو یعنی غرض یہ کہ ایسی جگہیں جو علائق دنیویہ سے خالی ہوں ان میں اللہ والوں کا دل زیادہ لگتا ہے اور ایسے مقامات پر بیٹھ کر جب وہ اپنے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو وہ صحرا ان کے لیے رشک گلستان بن جاتا ہے کیونکہ اللہ کی یاد سے وہ حقیقت میں آباد ہوتا ہے اور یہ دنیا کی عیش و عشرت کی جگہیں اللہ کی یاد سے غافل ہونے کی وجہ سے حقیقت میں ویران ہوتی ہیں اس لیے اہل اللہ ہمیشہ ایسی جگہوں سے دور رہتے ہیں کہ جہاں علائق دنیویہ کا شکار ہو جانا پڑے۔

دین کا ہر کام محض توفیق الٰہی کا نتیجہ ہے

خداوندا مجھے توفیق دے دے
فدا کر دوں میں تجھ پر اپنی جاں کو

اللہ تعالیٰ کی راہ کا ایک قدم بھی اس کے فضل و کرم کے بغیر اٹھایا نہیں جا سکتا سارے مدارج سلوک توفیق باری تعالیٰ کے مرہون منت ہیں سو جسے جس درجے میں اللہ تعالیٰ دین پر چلنے کی توفیق دے دے اس کو اسی کا کرم سمجھنا چاہیے اس لیے حضرت والا اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ مجھے تو ہی توفیق دے دے کہ میں اپنی جان تیرے اوپر قربان کر دوں اور ہر لمحہ حیات اپنے دل کی ہر تمنا تیری مرضی کے مطابق ڈھال دوں کیونکہ میں کتنے بھی مجاہدے کر لوں اور اپنی طرف سے کتنی ہی کوششیں کر ڈالوں اور یہ سوچتا رہوں کہ یہ میری کوششیں اور مجاہدے ہیں جن کی وجہ سے میں اس کا مستحق ہوں کہ مجھے آپ کا قرب ملے تو سوائے آپ سے دور ہونے کے کچھ اور حاصل نہ ہوگا کیونکہ میرے مجاہدے اور میری سعی و کوشش درحقیقت آپ ہی کی توفیق کا ثمرہ ہے تو جس طرح آپ سے ہم اپنی منزل مقصود مانگتے ہیں اور آپ کے قرب اور معرفت و محبت کے بھکاری ہیں اسی طرح اس کے حصول کے لیے ہر لمحہ آپ کی ذات عالی پر قربان کرنے کی بھیک بھی ہم آپ ہی سے مانگتے ہیں۔

گناہگاروں کے اشکِ ندامت کی رفعت

گناہگاروں کے اشکوں کی بلندی
کہاں حاصل ہے اختر کہکشاں کو

اس آخری شعر میں حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے گناہوں اور غفلتوں پر گریہ وزاری کرتے ہیں اور ان کی آنکھیں اللہ کے لیے اشک بار ہوتی ہیں تو بارگاہ خداوندی میں ان اشکوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے اور وہ اللہ کی نگاہ میں اس قدر چمکتے موتیوں اور ستاروں کی طرح ہیں کہ آسمان میں جو چمکتے ہوئے کہکشاں ستارے ہیں ان کو بھی ان سے کوئی نسبت نہیں۔

ظاہر ہے کہ ان ستاروں سے صرف ظاہری روشنی حاصل کی جارہی ہے مگر گنہگاروں کے اشکہائے ندامت اندرون مومن روشنی پیدا کررہے ہیں جو دل کو مزکیٰ ومجلیٰ اور صاف ستھرا اور چمک دار وروشن بنادیں گے اور ان کی چمک اور روشنی سے قلب کی تاریکی دور ہوتی ہے اور اللہ کے یہاں بندے کا مقام بندگی عروج پر پہنچ جاتا ہے جو اس کے لیے ہزار اور لاکھ کہکشاں سے بہتر ہے جیسا کہ حضرت والا کا شعر ہے ؎

جو گرے ادھر زمین پر مرے اشک کے ستارے
تو چمک اٹھا فلک پر مری بندگی کا تارا

اس مضمون سے متعلق کتاب میں مختلف مقامات پر احادیث شریفہ مذکور ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ ایک گنہگار بندے کے آنسو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔

کبھی ہے رابطہ آہِ سحر سے

کبھی تو دردِ دل دردِ جگر سے
کبھی ہے رابطہ آہِ سحر سے

نہ ہو دل میں تری یادوں کا جلوہ
تو پھر کیا فائدہ شمس و قمر سے

نہیں محتاج دردِ دل زباں کا
وہ خود ظاہر ہے اپنی چشمِ تر سے

اگر تو چاہتا ہے ان کی منزل
نکل خوف اگر خوف مگر سے

ملا ہے جب سے لطف آہِ صحرا
کہاں وہ ربط ہے پھر اپنے گھر سے

خدا کے نور ہی سے دل ہے روشن
ستاروں سے نہ خورشید و قمر سے

اگر طوفاں کی زد میں ہے سفینہ
دعا مانگے خدائے بحر و بر سے

ہر اک مجبور ہے آہ و فغاں پر
بیاں کرتا ہوں جب زخمِ جگر سے

زباں سے تو بیاں کرتا ہے لیکن
ہوئی نسبت کی بارش بھی نظر سے

چھپاتا ہے وہ اپنا دردِ نسبت
مگر مجبور ہے اپنی نظر سے

جو ان کی یاد سے غافل ہے اخترؔ
ملے گا اس کو کیا شام و سحر سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **دردِ جگر**: مراد وہ تکلیف ہے جو گناہوں سے بچنے میں اللہ تعالیٰ کے عاشق اپنے دل اور جگر پر اٹھاتے ہیں۔ **آہِ سحر**: تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور فریاد کرنا۔ **جلوہ**: روشنی/چمک۔ **شمس و قمر**: سورج اور چاند۔ **چشم تر**: آنسو بہاتی ہوئی آنکھ۔ **خورشید**: سورج۔ **سفینہ**: کشتی۔ **بحر و بر**: تری اور خشکی/سمندر اور زمین۔ **آہ و فغاں**: رونا دھونا۔ **زخمِ جگر**: وہ چوٹ جو اللہ تعالیٰ کے عاشق گناہوں سے بچنے میں غم اور تکلیف کی وجہ سے اپنے جگر پر کھاتے ہیں۔ **نسبت**: اللہ تعالیٰ کو بندے سے اور بندے کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جانا۔ **دردِ نسبت**: اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق کی وجہ سے گناہوں سے بچنے میں دل پر تکلیف اٹھانا۔ **شام و سحر**: رات اور صبح۔

آہ سحر کے ذریعہ اپنے مالک سے رابطہ کیجئے

کبھی تو دردِ دل دردِ جگر سے
کبھی ہے رابطہ آہِ سحر سے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''کہ جو میرے متقی بندے ہیں جن کے لیے میں نے جنت تیار کی ہے ان کی ایک خصوصیت یہ ہے **وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ** کہ میرے یہ خاص بندے صبح سویرے اٹھ کر مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور میرے سامنے گریہ و بکا اور آہ و زاری کرتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝﴾

(سورة الذاريات، آيات ۱۷، ۱۸)

ترجمہ: وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے (یعنی زیادہ حصہ رات کا عبادت میں صرف کرتے تھے) اور (پھر باوجود اس کے اپنی عبادت پر نظر نہ کرتے تھے بلکہ) آخری شب میں (اپنے کو عبادت میں کوتاہی کرنے والا سمجھ کر) استغفار کیا کرتے تھے۔

یھجعون، ھجوع سے مشتق ہے جس کے معنی رات کو سونے کے آتے ہیں، اس میں مؤمنین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذارتے ہیں، سوتے کم ہیں، جاگتے زیادہ ہیں اور وہ اپنا وقت نماز وعبادت میں گذارتے ہیں۔ یہ تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے یہی منقول ہے کہ متقین حضرات رات کو جاگنے اور عبادت کرنے کی مشقت اٹھاتے ہیں، اور بہت کم سوتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جملے کا مطلب حرف ما کو اس میں نفی کے لیے قرار دے کر یہ بتلایا ہے کہ رات کو تھوڑا سا حصہ ان پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں بلکہ عبادتِ نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سب لوگ اس کا مصداق ہوجاتے ہیں، جو رات کے کسی بھی حصہ میں عبادت کرلیں، خواہ شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں، اسی لیے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے اس کا مصداق ان لوگوں کو قرار دیا ہے جو مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ اور امام ابوجعفر باقر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سوویں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ (ابن کثیر)

اسی طرح حدیث پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِيْنَ يَبْقٰى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْاٰخِرُ فَيَقُوْلُ مَنْ يَّدْعُوْنِيْ فَأَسْتَجِيْبَ لَهُ وَمَنْ يَّسْأَلُنِيْ فَأُعْطِيَهُ وَمَنْ يَّسْتَغْفِرُنِيْ فَأَغْفِرَ لَهُ﴾

(صحیح مسلم، كتاب صلوة المسافرين، باب الترغيب في الدعاء والذكر في آخر الليل)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا اللہ ہر رات آخری تہائی حصہ میں سمائے دنیا کی طرف اترتا ہے اور پھر یہ اعلان کرتا ہے، کیا ہے کوئی مجھ سے دعا مانگنے والا؟ کہ میں اس کی دعا قبول کرلوں اور کیا ہے کوئی مجھ سے اپنی کسی ضرورت کا سوال کرنے والا؟ کہ میں اس کو دے دوں اور کیا ہے کوئی مجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہنے والا؟ کہ میں اس کو بخش دوں اور یہ اعلان فجر کے طلوع ہونے تک مسلسل ہوتا رہتا ہے۔

ان آیات اور حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بندہ مومن کو آہ سحر گاہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑا قوی اور مضبوط رابطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ وقت ادائے بندگی کے لیے نہایت مقبول اور خاص وقت ہے کہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں اپنے مومن بندوں پر اترنے کے لیے تلاش میں رہتی ہیں اور گویا خود اللہ تعالیٰ

اپنے بندوں کو نوازنے کے لیے بہانا ڈھونڈتے رہتے ہیں اس لیے اہل اللہ کبھی دل دل میں اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اپنے دردِ دل اور دردِ جگر سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق قائم کئے رہتے ہیں اور ایسے ذکر خفی میں مشغول رہتے ہیں کہ جس کے متعلق حدیث پاک میں آیا ہے:

﴿اَخْرَجَ اَبُوْیَعْلٰی عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَفْضُلُ الذِّکْرُ الْخَفِیُّ الَّذِیْ لَا یَسْمَعُہُ الْحَفَظَةُ سَبْعُوْنَ ضِعْفًا اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ وَجَمَعَ اللّٰہُ الْخَلْقَ لِحِسَابِھِمْ وَجَآءَتِ الْحَفَظَةُ بِمَا حَفِظُوْا وَکَتَبُوْا قَالَ لَھُمْ اُنْظُرُوْا ھَلْ بَقِیَ لَہٗ شَیْءٌ فَیَقُوْلُوْنَ مَا تَرَکْنَا شَیْئًا مِّمَّا عَلِمْنَاہُ وَحَفِظْنَاہُ اِلَّا وَقَدْ اَحْصَیْنَاہُ وَکَتَبْنَاہُ فَیَقُوْلُ اللّٰہُ اِنَّ لَکَ عِنْدِیْ حَسَنًا لَا تَعْلَمُہٗ وَاَنَا اَجْزِیْکَ بِہٖ وَھُوَ الذِّکْرُ الْخَفِیُّ﴾

(ذکرہ السیوطی فی البدور السافرۃ فی احوال الاخرۃ و التکشف ص ۴۲۸)

ترجمہ: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ذکر خفی جس کو حافظانِ اعمال فرشتے بھی نہیں سنتے، ذکر جلی پر ستر حصے فضیلت رکھتا ہے، جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ خلق کو اُن کے حساب کے لیے فرمائیں گے اور حافظانِ اعمال فرشتے اپنی یادداشت اور نوشتۂ اعمال کو لائیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے فرمائیں گے کہ ان صحیفوں میں لکھے ہوئے اعمال کے علاوہ اس شخص کا کوئی عمل تو باقی نہیں رہ گیا۔ وہ عرض کریں گے کہ ہم نے اپنی معلومات اور محفوظات میں سے کوئی چیز بے ضبط کیے ہوئے اور لکھے ہوئے نہیں چھوڑی تب اللہ اُس شخص سے فرمائیں گے کہ میرے پاس تیرا ایک ایسا نیک عمل ہے کہ تجھ کو بھی اس کا اس وقت علم نہیں، اگرچہ دنیا میں جب تجھ سے صادر ہوا تجھے اطلاع تھی، اب میں تجھ کو اس کی جزا دوں گا اور وہ ذکرِ خفی ہے۔ سیوطی نے اس روایت کو **بدور السافرد فی احوال الاخرۃ** میں ذکر کیا ہے۔

اس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہے حتیٰ کہ کراماً کاتبین بھی اس کو نہیں جانتے ہیں اسی طرح کبھی صبح کی آہ وفغاں کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے خالق سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔

اصل قلب کا یادِ خداوندی سے روشن ہونا ہے

نہ ہو دل میں تیری یادوں کا جلوہ
تو پھر کیا فائدہ شمس و قمر سے

ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا کے چاند وسورج سے ظاہری کائنات روشن ہوتی ہے جو خود فانی ہے اور اس کی روشنی بھی فانی ہے اور جس سے صرف ظاہر روشن ہوتا ہے، باطن نہیں اس لیے اس روشنی سے کافر ومومن، فاسق وفاجر سب لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور انوارات جن سے دل کی دنیا روشن ہوتی ہے وہ صرف اہل ایمان کا خاصہ ہے اور وہی اصل دنیا وآخرت میں نجات وفلاح اور کامیابی کی ضامن ہے اس کے بغیر ظاہر خواہ کتنا ہی

روشن و چمکدار ہو مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ دل کی روشنی حاصل کیسے ہوتی ہے اور دل کو منور کس طرح کیا جاتا ہے تو یاد رکھئے کہ دل کی روشنی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد کو ذریعہ بنایا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ صِقَالَةٌ وَصِقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللهِ﴾

(المشکوۃ، باب ذکر اللہ عز وجل والتقرب الیہ، ص: ۱۹۹)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ فرماتے تھے کہ ہر شے کا ایک صیقل ہے (جس سے اُس شے کو صاف کیا جاتا ہے) اور قلوب کا صیقل ذکر اللہ ہے۔

اور دوسری حدیث شریف میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَاُ كَمَا يَصْدَاُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَآءُ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللهِ وَمَا جَلَاءُ هَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ﴾

(مشکوۃ المصابیح ص: ۱۸۱، التکشف: ص: ۴۱۱)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان دلوں کو بھی لوہے کی طرح جبکہ اُس کو پانی پہنچتا ہے، زنگ لگ جاتا ہے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! اور اس کا جلاء کس چیز سے ہوتا ہے۔ فرمایا موت کو بکثرت یاد کرنے سے اور قرآن مجید کی تلاوت سے۔ روایت کیا اُس کو بیہقی نے۔

جس قدر بندہ غیر اللہ کو دل سے دور رکھے اور اپنے اللہ تعالیٰ کو دل میں یاد کرتا رہے اس کا قلب اتنا ہی روشن رہتا ہے اور جتنا دل میں غیر اللہ کو بسائے اور فانی بتوں کے گندے خیالات سے دل کو گندہ کر کے رکھے اتنا ہی وہ دل تاریک اور سیاہ ہو جاتا ہے۔

اس لیے دراصل اس شعر میں حضرت والا یہ سبق دے رہے ہیں کہ مومن بندے کو اپنے قلب کو مزکی و مجلی کر کے اس دل میں اللہ تعالیٰ کی یادوں کو بسانا چاہیے اور اسے تجلیات خداوندی سے روشن کرنا چاہیے جس کے نتیجے میں دل و دماغ چمک اٹھیں گے اور اللہ کی بارگاہ میں اس خاکی کی قیمت بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور زیب و زینت کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے جیسا کہ آج کل ہمارا حال بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم اپنے ظاہر کو بنانے اور اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں اس قدر منہمک اور مشغول دکھائی دیتے ہیں کہ باطن کی طرف التفات اور توجہ بالکل نظر نہیں آتی جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معاملہ بالکل اس کا الٹا تھا بالآخر ہمارے روز و شب ظاہر کے بنانے میں اس طرح خرچ ہوتے ہیں کہ اگر ہم ساری زندگی کا ٹوٹل اور خلاصہ کریں تو معلوم ہوگا کہ پانچ فیصد وقت بھی ہمارا اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کی خاطر دین پر چلنے کے کاموں میں خرچ نہیں ہوا جو کہ ہمارا اصل مقصد حیات تھا اور جس کے لیے اللہ نے ہمیں بھیجا تھا اور جو کام محض ضرورت کے درجے کے تھے ان پر ہم اپنی

زندگی کا پچانوے فیصد سے زیادہ حصہ خرچ کر کے دنیا سے روانہ ہو جاتے ہیں۔

زیب و زینت میں محو ہونا مقصد حیات سے بے خبری کا اثر ہے

صاحبو! ذرا غور تو کرو اور سوچو تو صحیح۔ اگر آقا نے اپنے غلام کو بازار میں دودھ لینے کے لیے بھیجا اور اس کو بازار جانے کے لیے بطور سواری کے ایک گھوڑا دے دیا کہ وہ اس پر سوار ہو کر جلد دودھ لا کر آقا کو پیش کرے اب یہ غلام گھوڑے کو لے کر گھر سے باہر نکلا اور ایک گھنٹہ گھوڑے کے بدن کو خوب صاف کرتا اور چمکاتا رہا اور اس کو نہلا دھلا کر خوب صاف ستھرا کر دیا اس کے بعد لوٹ آیا اب آقا نے سوال کیا کہ میں نے تمہیں دودھ لینے کے لیے بھیجا تھا کیا تم دودھ لے آئے؟ غلام کہتا ہے کہ آقا میں دودھ تو نہیں لا سکا ہوں مگر میں نے آپ کا گھوڑا نہلا دھلا کر خوب صاف ستھرا کر دیا اور نہایت چمکا دیا ہے تو آپ خود فیصلہ کیجئے کہ یہ غلام انعام و اکرام کا مستحق ہوگا یا تعزیر و تنبیہ کا؟ اور کسی جزا اور بدلے کا مستحق ہوگا یا سزا و ملامت کا؟

ظاہر ہے کہ اس نے اپنے آقا کے حکم کی فرمانبرداری نہیں کی جس کی وجہ سے ہر عقل مند آدمی یہی کہے گا کہ وہ سزا کا مستحق اور زجر و توبیخ کے لائق ہے۔ آج ہمارا حال بالکل اسی طرح ہے خاص طور پر وہ مسلمان جو مغربی ملکوں میں رہ کر غیروں کے طریقوں پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کو اپنے ظاہر کو روشن رکھنے اور صاف ستھرا بنانے کی تو فکر ہے لیکن باطن کی کوئی خبر نہیں اور اسی تکلف و تصنع میں اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ خرچ کر دینے کو انہوں نے اپنے ذہنوں میں انسانی تہذیب سمجھا ہے جبکہ انسان کا مقصد پیدائش خود ان کی نظروں سے اوجھل ہے اور وہ بالکل اس اوپر ذکر کردہ مثال میں اس ناسمجھ غلام کی طرح ہیں کہ اپنے آقا کے اصل حکم سے تو صرف نظر کر لیا جس کی خاطر اس کو گھوڑا دیا گیا تھا اور اس کی صفائی و ستھرائی میں لگ گیا۔

سو یہ لوگ بھی اپنے اس مقصد کو تو بھول گئے جس کے ادا کرنے کے لیے ہمیں یہ جسم اور اس کے مختلف اعضاء بڑے مرتب اور منظم شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے تھے اور مقصد سے ہٹ کر اس ظاہری جسم کو بنانے سنوارنے کی فکر میں رات دن لگ کر ساری عمر گزار ڈالی اور انہی ظاہری فکروں میں محو ہو کر رہ گئے بالآخر جب اپنے اللہ کی طرف واپس لوٹے تو ہمارا حال بالکل اس غلام کی طرح تھا جو اس گھوڑے کو چمکا کر آقا کے پاس لے آیا مگر آقا کا حکم پورا نہ کرنے کی وجہ سے مستحق سزا قرار پایا۔

اور اس سے بھی بڑھ کر افسوس اس پر ہے کہ آج کا مغربیت زدہ مسلم جوان نہ صرف یہ کہ اپنی اس حالت کو غلط سمجھ کر اس کی اصلاح کی فکر کرتا بلکہ صورت حال اس سے زیادہ ابتر ہے کہ اسے اپنی اس حالت پر فخر اور گھمنڈ ہے اور وہ اپنے تہذیب یافتہ ہونے کا مدعی ہے جو کہ سراسر دھوکا ہے اور اپنے انجام سے بے خبری اور مقصد حیات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے وہ اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے اپنے مقصد

حیات کو جان لیا تھا اور دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے تھے وہ لوگ تکلف میں سب سے زیادہ کم تھے اور تصنع و بناوٹ سے بالکل پاک تھے اور ظاہری زیب و زینت کی فکروں سے ان کے قلوب خالی تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں ایسا ایمان تھا کہ جو مضبوط بلند پہاڑوں کی طرح ثابت اور راسخ تھا جس کی برکت سے سارے عالم میں انہیں عزت و سرخروئی نصیب ہوئی۔

﴿عن ابن مسعود قال من کان مستنا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا تؤمن علیه الفتنة اولئک اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم کانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها علما واقلها تکلفا اختارهم الله لصحبة نبیه و لاقامة دینه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم علی اثرهم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقهم وسیرهم فانهم کانوا علی الهدی المستقیم﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ارشاد فرمایا جس کو کوئی طریقہ اختیار کرنا ہو تو وہ اُن حضرات کے طریقے کو اختیار کرے جو دنیا سے اسلام اور ہدایت پر وفات پا چکے ہیں کیونکہ زندہ انسان پر فتنے میں مبتلا ہو جانے سے اطمینان نہیں کیا جا سکتا، اور وہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو اس پوری اُمت میں سب سے افضل ہیں، وہ دلوں کے اعتبار سے بہت زیادہ پاکیزہ تھے اور علم کے اعتبار سے بہت گہرائی والے تھے، اور اُن کی زندگیوں میں تکلف بہت ہی کم تھا، اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے منتخب فرمایا تھا لہٰذا تم دوسروں پر اُن کی فضیلت کو پہچان لو اور علم و عمل میں اُن کے نقشِ قدم کی اتباع کرو اور جہاں تک ہو سکے اُن کے اخلاق و عادات کو مضبوطی سے پکڑ لو کیونکہ وہ لوگ راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر تھے۔

نہیں محتاج دردِ دل زباں کا
وہ خود ظاہر ہے اپنی چشمِ تر سے

جو مومن بندہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتا رہتا ہے تو یہ رونا خود اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں اپنا دردِ محبت عطا فرما دیا ہے اسے زبان سے بولنے اور بتانے کی ضرورت نہیں، کتنا بھی ضبط کیا جائے لیکن وقتاً فوقتاً اہلِ دل کی آنکھوں سے خوفِ خداوندی کے نتیجہ میں آنسو بہہ پڑتے ہیں جو دل کی اندرونی حالت کی ترجمانی کرتے ہیں جیسا کہ سو فیصد اہل اللہ کی راتیں اسی حال میں گزرتی ہیں۔

”اگر، مگر“ دل میں شکوک وشبہات کے اندھیروں کا پتہ دیتے ہیں

اگر تو چاہتا ہے ان کی منزل
نکل خوف اگر خوف مگر سے

ارشاد فرماتے ہیں کہ اے سالک اگر تجھے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنا ہے یعنی اللہ کو راضی کر کے جنت کا مستحق بننا ہے تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر پورا یقین اور مکمل اعتماد کر کے اللہ کی طرف فرار اختیار کر اور قوت وہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر اس راہ میں اگر اور مگر تمہیں چلنے سے باز نہ رکھے کیونکہ یہ دونوں لفظ ان لوگوں کا شیوہ اور عادت ہوتی ہے جو صرف آرزوؤں اور تمناؤں سے راستہ طے کرنا چاہتے ہیں اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے غیبی وعدوں پر پورا یقین اور اعتماد نہیں ہوتا ورنہ اعتماد و بھروسہ رکھنے والے لوگ اپنے ظاہری نفع ونقصان کی پرواہ کیے بغیر اور لوگوں کی ملامت وطعن وتشنیع سے صرف نظر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ ایک شادی شدہ شخص ناجائز اور حرام تدبیروں سے بچوں کی پیدائش کی کثرت سے بچنے کے طریقے اختیار کر کے اپنی تمنا پوری کرتا ہے اور جب اس کو کوئی اس برے عمل سے روکتا ہے تو وہ جواب میں یہ کہتا ہے کہ اگر میں یہ طریقہ اختیار نہ کروں اور اولاد کی کثرت ہو جائے تو ان کے معاش کا اور تعلیم وتربیت کا اور دوسرے بہت سے مسائل کا حل میرے ذریعے ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس کی اس غلط سوچ اور فکر پر جب کوئی اللہ کا بندہ اس کو سمجھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول کے وعدوں پر یقین دلاتا ہے تو وہ اپنی ایمان کی کمزوری اور اللہ کے وعدوں پر یقین کی کمی کو لفظ مگر کے ذریعہ اس طرح چھپاتا ہے کہ وہ یوں کہتا ہے۔

مولانا آپ کی بتائی ہوئی آیتیں اور حدیثیں اور ان میں کئے ہوئے وعدے تو اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں مگر میرا معاملہ یوں ہے، مگر میری صورت حال ایسی ہے، اگر میں آپ کی بات مان لوں تو بے شک درست اور صحیح ہے مگر میرے فلاں مسئلے کا کیا ہوگا، فلاں معاملے کا کیا ہوگا، تو غرض یہ کہ اس طرح مگر اور لیکن بول کر انسان محض دین پر عمل سے بچنے کے لیے حیلے اور بہانے تلاش کرتا ہے۔

احقر نے اس کی صرف ایک مثال پیش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین پر پورے طور پر عمل کرنے کی راہ میں اور منکرات اور گناہوں سے مکمل بچنے کی صورت میں زندگی میں قدم بقدم ایسے نازک موڑ آتے ہیں کہ جن میں سچے عاشق کی آزمائش کی جاتی ہے اور اس کو پرکھا اور جانچا جاتا ہے اگر وہ اپنے دل میں یقین کی روشنی رکھتا ہو تو اس کے نور سے اسے صحیح راہ نظر آتی ہے اور وہ اس سے بال برابر بھی ہٹنا گوارا نہیں کرتا اور اگر اس کے دل میں شکوک و شبہات کے اندھیرے ہوں تو پھر وہ اگر مگر کے ذریعہ سے دین کی صحیح راہ سے نکل جاتا ہے اور اپنی منزل کھو بیٹھتا ہے۔

گو کہ اگر مگر کو سمجھنے کی مثالیں بہت ساری ہیں مگر ایک مختصر سی مثال اور عرض کیے دیتا ہوں جب جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں شرکت کے لیے صحابہ کرام سے اعلان فرمایا تو جو دل میں کامل ایمان رکھتے تھے اور انہیں اللہ کے وعدوں پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا تو وہ بلا چوں و چراں فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہہ کر میدان میں نکل آئے اور ان کو دنیوی و اخروی عزت و سرخروئی حاصل ہوئی۔ اس کے برخلاف جو منافقین تھے وہ اپنی اگر اور مگر میں لگے رہے مثلاً کہیں تو یوں کہتے:

﴿وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ﴾

(سورۃ آل عمران، آیۃ ۱۶۷)

ترجمہ: اور ان سے یوں کہا گیا کہ (میدانِ جنگ میں) آؤ (پھر ہمت ہو تو) اللہ کی راہ میں لڑنا یا (ہمت نہ ہو تو گنتی ہی بڑھا کر) دُشمنوں کی مدافعت کرنا (کیونکہ بہت سی بھیڑ دیکھ کر کچھ تو اُن پر رعب ہوگا اور اس سے شاید ہٹ جاویں) وہ بولے کہ اگر ہم ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے (لیکن یہ کوئی لڑائی ہے کہ وہ لوگ تم سے تین چار گنے زیادہ پھر اُن کے پاس سامان بھی زیادہ ایسی حالت میں لڑنا ہلاکت میں پڑنا ہے۔

یعنی اگر ہم واقعی جانتے کہ کوئی جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے مگر چونکہ کوئی واقعی حقیقی با مقصد جنگ نہیں ہے اس لیے ہم تمہارے ساتھ نہیں جاتے اور اسی طرح کے دوسرے اگر مگر کا شکار ہو کر رہ گئے اور ان کے نفاق نے ان کو منزل پر پہنچنے سے روک دیا۔

اور ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس میں ابتلاء عام ہے مثلاً نماز با جماعت کا وقت ہے کوئی آپ کا دوست آپ کو آ کے یہ سمجھاتا ہے کہ اس وقت نماز پڑھو اور دکان کو بند کر دو اگر چہ تمہاری دکان پر لاکھوں کے گاہک کھڑے ہوئے ہوں۔ اس کے جواب میں آپ یوں کہتے ہیں کہ اگر میں دکان بند کر دوں اور آپ کی بات مان لوں تو بے شک بہت اچھا ہے لیکن میرا یہ نقصان فلاں نقصان ہو جائے گا۔ جس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔

پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں جو لوگ اگر مگر کا شکار ہو کر رہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کر کے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے بس اللہ کو پانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کے وعدوں پر پورا یقین کر کے راستہ پر قدم ڈال کر چلنا شروع کر دے چاہے بظاہر سامنے سے راستہ کھلا نظر آئے یا بند نظر آئے جب آپ چلتے رہیں گے خود بخود راستہ سامنے کھلتا جائے گا یہاں تک کے آپ اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

نسبت مع اللہ کا قلب پر ایک خاص اثر

ملا ہے جب سے لطف آہِ صحرا
کہاں وہ ربط ہے پھر اپنے گھر سے

اللہ والے اپنی گھریلو حاجات اور ضروریات پوری تو ضرور کرتے ہیں لیکن ان کے دل و دماغ اس طرف جڑے نہیں ہوتے بلکہ اپنے دل سے ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں محو ہوتے ہیں اور انہیں صحرا و جنگل اور بیابانوں

میں رہ کر جہاں دنیوی مصروفیات سے ذہن بالکل فارغ اور خالی ہو زیادہ لطف اور مزہ آتا ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ جس کے دل کی دنیا اللہ تعالیٰ کی خصوصی تجلیات کے ساتھ آباد ہو جاتی ہے پھر دنیا کی زیب و زینت میں اس کا دل لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لوگ پوری پوری عمریں اپنے گھروں اور بنگلوں کو خوب سے خوب تر کرنے میں خرچ کر دیتے ہیں اور اپنی عمر بھر کی صلاحیتوں کو دنیا کی فانی لذتوں کے حصول اور عیش و عشرت کو پانے کے لیے گنوا دیتے ہیں لیکن ایک صاحب نسبت اللہ والے کے دل کا رخ ہی کسی اور سمت میں ہوتا ہے جیسا کہ خود حضرت والا کا شعر ہے ؎

مجھے اس عالم صد رنگ و بو سے کیا مطلب
میری حیات تو بس آپ ہی کا اک غم ہے

جس کشتی کا ناخدا خود خدا ہے اسے طوفاں کا ڈر نہیں

خدا کے نور ہی سے دل ہے روشن
ستاروں سے نہ خورشید و قمر سے
اگر طوفاں کی زد میں ہے سفینہ
دعا مانگے خدائے بحر و بر سے

مومن کو کسی بھی حال میں مایوس نہیں ہونا چاہیے اگر وہ ناموافق حالات سے دوچار ہوتا رہے اور مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزرتا رہے تو مایوس ہو کر اللہ کے راستے میں چلنا نہ چھوڑ دے اگر کبھی گر پڑے تو پھر سے اٹھے کبھی کوئی خطا و چوک ہو جائے تو پھر سے اپنے اللہ کو پکارے ٹھیک ہے ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آج ہر طرف فسق و فجور اور ظلم و سرکشی عام ہو رہی ہے اور چاروں طرف فتنوں کا ایک طوفان ہے اور ہماری کشتی اس طوفان کی زد میں محسوس ہو رہی ہے تب بھی ہمیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ خداوند قدوس جس کے قبضے میں بحر و بر ہے اسی کے قبضے میں ہماری یہ کشتی بھی ہے ہم اسی قادر مطلق اللہ کو پکارتے رہیں گے اور ان شاء اللہ اسی کی مدد سے بعافیت و سلامت طوفان سے نکل کر ہماری کشتی ساحل پر جا لگے گی اس لیے خواہ کیسے ہی ناخوشگوار حالات ہوں سالک کو گھبرا کر راستہ چھوڑنا نہیں چاہیے۔

بلکہ احقر اس سے آگے بڑھ کر ایک بات عرض کرتا ہے کہ جب کشتی کا ملاح کوئی طوفانی حالت سامنے دیکھتا ہے اور کشتی کے طوفان میں پھنسنے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے تو پھر اسے اور زیادہ مستعد (Alert) اور چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے تاکہ کشتی کو اس سے بچایا جا سکے لہٰذا آج کے زمانے میں معصیت و نافرمانی کا طوفان آیا ہوا ہے تو ہر دین کے چاہنے والے کو لازم اور ضروری ہے کہ وہ پورے طور پر خبردار اور متنبہ رہے تاکہ ہر لمحہ قدم بہ قدم اپنے دین

کے سفینہ اور کشتی کو طوفان سے مکمل طور پر بچایا جا سکے اور ساحل پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی جنتوں و نعمتوں میں مزے لوٹے اور ایسے موقع پر مومن کا متنبہ اور خبردار رہنا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے ایک لمحہ غافل نہ ہو اور ہر گھڑی اسی کو پکارتا رہے کیونکہ وہی ہر مشکل میں کام آنے والا اور ہر پریشانی سے نجات دینے والا اور ہر قسم کے فتنے سے بچانے والا ہے کوئی کتنی ہی مصیبتوں اور الجھنوں میں پھنسا ہوا ہو لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کو پکارے گا تو ضرور اللہ تعالیٰ اس کو نجات عطا فرما دیں گے۔

ہر اک مجبور ہے آہ و فغاں پر
بیاں کرتا ہوں جب زخمِ جگر سے

یعنی جب سامعین میرا بیان سنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس میں کچھ ایسی تاثیر رکھی ہے کہ ہر سننے والا آہ و فغاں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ میں زبانِ محض سے بیان نہیں کرتا بلکہ میرا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے گھائل اور زخمی ہے میں تو بس اس زخم کو پیش کرتا ہوں تو جیسے کوئی شخص کسی درد میں مبتلا انسان کی باتیں سن کر اس کی حالتِ زار پر رحم کھاتا ہے اور اس کے درد میں شریک ہوتا ہے تو میں بھی چونکہ یہ زخمِ محبت کی شرح کرتے ہوئے زبان کھولتا ہوں تو سامعین آہ و فغاں پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی نظر سے نسبت کی بارش

زباں سے تو بیاں کرتا ہے لیکن
ہوئی نسبت کی بارش بھی نظر سے

یعنی کوئی اللہ کا ولی جب بیٹھ کر بیان کرتا ہے تو سننے والے اس کی زبان سے کیا جانے والا بیان سنتے رہتے ہیں لیکن یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ اللہ والوں کی نظر میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ جو کافر کو مومن اور فاسق کو صالح بنا دیتی ہے اور عام مومنین پر وہ نظر پڑنے سے انہیں قلب میں نسبت مع اللہ محسوس ہونے لگتی ہے جیسا کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اَلْعَیْنُ حَقٌّ والی حدیث کی شرح کے تحت یہ بات لکھی ہے کہ جس طرح نظرِ بد برحق ہے اسی طرح نظرِ عارفین کی تاثیر بھی بالکل برحق ہے اور ایک سچی حقیقت ہے:

﴿فَاِنَّهٗ مِنْ حَيْثُ التَّاْثِيْرِ الْاَكْسِيْرِ يَجْعَلُ الْكَافِرَ مُؤْمِنًا وَّالْفَاسِقَ صَالِحًا وَّالْجَاهِلَ عَالِمًا وَّالْكَلْبَ اِنْسَانًا﴾

(مرقاة المفاتيح، كتاب الطب والرقى، ج:۸، ص:۳۲۵ المكتبة التجارية، مكة المكرمة)

ترجمہ: عارفین کی نظر کی تاثیر اس قدر اکسیر ہے کہ جو کافر کو مؤمن اور فاسق کو نیک صالح اور جاہل کو اور کتے کو انسان بنا دیتی ہے۔

چھپاتا ہے وہ اپنا دردِ نسبت
مگر مجبور ہے اپنی نظر سے

اللہ تعالیٰ کا دردِ محبت اور خاص نسبت مع اللہ دل میں حاصل ہوتی ہے اور دل کے احوال و کیفیات مخفی چیز ہیں جو خود بخود ظاہر نہیں ہوتے اور عام طور پر اہل اللہ اپنے دل کے صحیح حالات کو لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ حتیٰ الامکان چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر بقول حضرت والا کہ نظر سے یہ دردِ نسبت ظاہر ہو جاتا ہے لوگ اس پر نظر ڈالیں یا وہ لوگوں پر نظر ڈالیں دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ عجیب و غریب تاثیر رکھ دیتے ہیں جو کہ مجبوراً ظاہر ہو جاتی ہے۔

غافل و ذاکر کی شام و سحر کا فرق

جو ان کی یاد سے غافل ہے اختؔر
ملے گا اس کو کیا شام و سحر سے

یعنی جو لوگ اپنے دنیا کے مشغلوں میں اس قدر مصروف ہیں کہ وہ اللہ کی یاد سے بالکل غافل ہیں تو ان کی شام و سحر اسی طرح غفلت میں گزر جاتی ہے اور قرب کے بجائے بعد ہوتا جاتا ہے لیکن اللہ والے زندگی کے ہر دن میں اور ہر دن کی شام و سحر میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے اور یاد کرتے ہیں جس سے ان کا قرب اور معرفت دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے اس لیے قرآن کریم کے اندر صبح شام کے ذکر کی خاص طور پر تلقین فرمائی گئی اور انہیں اوقات میں غذائے ارواحِ اولیاء کا خاص انتظام ہوتا ہے، اسی لیے تمام اہل اللہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہوئے صبح و شام کے یہ لمحات ذکر اللہ اور توبہ و استغفار اور تلاوت و مناجات میں خرچ کرتے ہیں احادیث شریفہ میں بھی شام و سحر کے مطابق خاص خاص دعاؤں اور اوراد و وظائف کا تذکرہ آیا ہے۔

میں پوچھوں گا شہیدوں کے لہو سے

کوئی پوچھے گلوں کے رنگ و بو سے
میں پوچھوں گا شہیدوں کے لہو سے
وفا کی راہ مت پوچھو خرد سے
مگر عاشق کی راہِ جستجو سے
ملی تاثیر بھی آہ سحر کو
کیا ہے رابطہ جب حق و ہو سے
نہیں ہوتی ہے تکمیل محبت
مگر اے دوست خون آرزو سے
محبت ہو خدا کی یا نبی کی
کوئی سیکھے صحابہ کے لہو سے
کہاں لگتا ہے دل ان عاشقوں کا
انہیں مطلب ہے اپنی ہاؤ ہو سے
نہ پہنچا منزل عشق خدا تک
لگایا جس نے دل کو غیر ہو سے
اگر رہنا ہے اخترؔ ان کا بن کر
لگانا دل نہ فانی خوبرو سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **خرد**: عقل۔ **تاثیر**: اثر کرنا۔ **آہِ سحر**: رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔ **حق وھو**: اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ **تکمیل محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت مکمل ہونا۔ **خونِ آرزو**: اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل کی حرام آرزؤں اور تمناؤں کا خون کر دینا یعنی انہیں پورا نہ کرنا۔ **لھو**: خون۔ **ھاؤ ھُو**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں اللہ کی محبت میں ڈوب کر کرنا یا اللہ تعالیٰ کا محبت کے ساتھ ذکر کرنا۔ **غیر ھو**: غیر اللہ۔ **خوبرو**: خوبصورت، حسین۔

وفا کی راہ خرد سے نہیں دیوانگی سے طے ہوتی ہے

کوئی پوچھے گلوں کے رنگ و بو سے
میں پوچھوں گا شہیدوں کے لہو سے
وفا کی راہ مت پوچھو خرد سے
مگر عاشق کی راہِ جستجو سے

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ بہت اونچا مضمون بیان فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو دنیا کو اپنا دل دئے ہوئے ہیں اور ان کو ہر طرح کی راحت وچین دنیا کے رنگ و بو میں نظر آتی ہے اور ایسی ہی جگہوں میں وہ چین وسکون کو تلاش کرتے پھرتے ہیں اور بظاہر کچھ وقتی لذت اور مزہ پاتے ہیں مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں جان دینے والے شہداء کے خون کے قطروں میں کچھ اور سبق مل رہا ہے میں جب شہیدوں کے لہو سے پوچھتا ہوں داستان کچھ اور ہی ہے مجھے یوں جواب ملتا ہے کہ اللہ کے نام پر اپنی جان قربان کرنے میں اور اس کی رضا کے لیے اپنی خواہشات نفسانیہ کا خون کرنے میں ہی سارا مزہ رکھا ہوا ہے، اسی لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہید کے خون کا قطرہ اور اللہ کے خوف سے ڈرنے والے کے آنسوؤں کا قطرہ یہ دو قطرے اللہ کو بہت پسند ہیں:

﴿لَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَى اللهِ مِنْ قَطْرَتَيْنِ وَاَثَرَيْنِ قَطْرَةُ دُمُوْعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ وَقَطْرَةُ دَمٍ تُهْرَاقُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب فضل الجهاد عن رسول الله ﷺ، ج:۱، ص:۲۹۶)

اس کے خون کا رنگ بظاہر خون کا رنگ ہے لیکن اس کے اندر سے نکلنے والی خوشبو مشک کی خوشبو ہے تو اے دنیا کے پرستارو اور مادی عیش وعشرت کے دیوانو! تم اگر سچا مزہ اور لطف پانا چاہتے ہو تو ان سے پوچھو جنھوں نے دیوانہ وار راہ خداوندی میں چل کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ان کے خون سے یہ سبق سیکھو کہ لطف حیات کس چیز میں ہے تو یہی آواز آئے گی اور یہی جواب ملے گا کہ دنیا وآخرت کا لطف اور مزہ بلا چوں وچراں اپنے اللہ کے حکم پر جان لٹا دینے اور خواہشات کا خون کر دینے میں ہے اگر چہ عقل تمہارے لیے ہزار موانع اور رکاوٹیں راستہ طے کرنے کے سلسلے میں لا کر کھڑا کر دیگی لیکن اللہ کی ذات عالی سے دیوانہ وار تعلق ان سب رکاوٹوں کو ہٹاتے ہوئے اپنے مولا پر فدا ہونے کا سبق دے گا اس لیے یہ راستہ اہل خرد کے لیے دشوار اور اہل جنوں کے لیے آسان ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ میں یہ سبق موجود ہے:

﴿قَالُوْا مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ﴾

(سورہ یٰس: ۱۵)

ترجمہ: وہ بولے تم تو یہی انسان ہو جیسے ہم اور رحمٰن نے کچھ نہیں اُتارا، تم سارے جھوٹ کہتے ہو۔

کہ جب انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کو دعوت دی تو کچھ لوگ تو عقلی دلیل پیش کر کے کہتے تھے کہ تم ہماری طرح ایک بشر ہی تو ہو ہم تمہیں کیوں بڑا تسلیم کر لیں اس طرح بظاہر یہ عقل مندی ان کے لیے وبال جان ہوئی اور جنھوں نے عقل کو پیچھے ڈال دیا اور عشق ومحبت کی راہ سے نبی پر نظر ڈالی ان کو ہر بات کا ماننا اور قبول کرنا آسان ہو گیا اس لیے یہ راہ وفا اہل وفا کی اداؤں کے ذریعہ سے طے ہوتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنے شیخ کے اوپر محض اپنی طرح اپنے انسان ہونے کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں تو وہ حقیقی نفع سے محروم رہتے ہیں۔

کیونکہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اَلشَّيْخُ فِيْ قَوْمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِيْ اُمَّتِهٖ شیخ اپنی قوم میں اس طرح ہوتا ہے جیسے کہ نبی اپنی اُمت میں۔ یعنی باعتبار ادب واحترام اور اکرام وتعظیم کے شیخ کا وہی درجہ ہے جو نبی کا ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے تو باعمل علماء کو نبی کی نیابت عطا کی گئی ہے۔

رابطۂ حق اور تاثیرِ آہِ سحر

ملی تاثیر بھی آہِ سحر کو

کیا ہے رابطہ جب حق و ہو سے

جب اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے تو پھر بندے کو وقت سحر کا انتظار رہتا ہے صبح ہی سے انتظار سحر شروع ہو جاتا ہے کہ وہ گھڑی کب آئے گی جب میں اپنے اللہ سے راز ونیاز کی باتیں کروں گا اور اس وقت کا خاص لطف اور کیف اسے دن بھر اس کی یاد پر بے قرار رکھتا ہے ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشادفرمایا کہ جنت میں داخل ہونے کا آسان راستہ یہ ہے:

﴿أَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلَامَ وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْأَرْحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الزكوة، باب فضل الصدقة)

ترجمہ: اے لوگو! سلام کوخوب پھیلاؤ اور عام کرو اور کھانا کھلاؤ اور رشتے جوڑو اور جب لوگ سوئے ہوں تم راتوں میں نمازیں پڑھوتو تم بسلامت وعافیت جنت میں داخل ہوجاؤ گے۔

یہی مضمون ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ جب لوگ اپنے بستروں میں سونے کے لیے لیٹ جاتے ہیں تو یہ بندہ اٹھ کر نماز پڑھنے لگتا ہے اور مجھ سے فریاد کرنے لگتا ہے۔ اور یہ اُن تین شخصوں میں ہے جن سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں اور روایت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَقَوْمٌ سَارُوْا لَيْلَتَهُمْ حَتّٰى اِذَا كَانَ النَّوْمُ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِمَّا يُعْدَلُ بِهٖ نَزَلُوْا فَوَضَعُوْا رُءُوْسَهُمْ فَقَامَ اَحَدُهُمْ يَتَمَلَّقُنِيْ وَيَتْلُوْا اٰيَاتِيْ﴾

(سنن الترمذي، صفة الجنة عن رسول الله، باب ماجاء في كلام الحور العين)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو رات میں سفر کرتے رہے یہاں تک کہ جب نینداُن کو ہر مقابل شے سے زیادہ محبوب ہوگئی کہ جسے نیند کے برابر قرار دیا جاسکتا تھا یعنی میٹھی نیند ہر چیز سے زیادہ شیریں ہوگئی تو وہ اُترے اور انہوں نے اپنے سروں کو رکھا اور سو گئے لیکن اُن میں سے ایک کھڑا ہو کر میرے قرآن کی آیات پڑھ کر مجھ سے فریاد کرنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کی صفات میں قرآنِ پاک میں یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ وہ رات کو کم سوتے ہیں اور صبح سویرے سحر کے وقت استغفار میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا کہ میں نے جنت اپنے متقی بندوں کے لیے تیار کی ہے اور اُن کی صفات ذکر کرتے ہوئے ارشادفرمایا کہ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ کہ وہ لوگ سحر کے وقت میں استغفار کرنے والے ہوتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر ابن کثیر میں ایک صحابی کے متعلق نقل فرمایا ہے کہ:

﴿سَمِعْتُ رَجُلًا فِي السَّحَرِ فِيْ نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ وَهُوَ يَقُوْلُ يَارَبِّ اَمَرْتَنِيْ فَاَطَعْتُكَ وَهٰذَا السَّحَرُ فَاغْفِرْ لِيْ فَاِذَا هُوَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ﴾

(تفسير ابن كثير، ج۱، ص۲۱۰)

وہ سحر کے انتظار میں رہتے تھے اور جب سحری کا وقت آجاتا تو جلدی سے اٹھتے اور یہ کہتے اَللّٰهُمَّ هٰذَا السِّحْرُ اے اللہ! یہ سحری کا وقت ہے اور آپ نے قرآن میں یہ اعلان فرمایا کہ میرے متقی بندے وہ ہیں جو صبح سویرے اٹھ کر اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں تو میں بھی آپ سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں میرے گناہوں کو معاف کردیں اور مجھے مستغفرین بالاسحار میں شامل فرمادیں۔

نہیں ہوتی ہے تکمیل محبت
مگر اے دوست خون آرزو سے

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ سے کامل اور سچی محبت اسی وقت شمار کی جاتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیا جائے اور جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے ان سے مکمل پرہیز کیا جائے چاہے آرزوؤں اور تمناؤں کے خلاف کر کے ان کا کتنا ہی خون کرنا پڑے اور طبیعت پر بوجھ اور گرانی اٹھانی پڑے۔

محبتِ خدا اور رسول اور صحابہ کا خون

محبت ہو خدا کی یا نبی کی
کوئی سیکھے صحابہ کے لہو سے

اس شعر میں حضرت والا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیوں اور جاں نثاریوں کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آنے کے بعد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اشارہ ملتے ہی اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور کسی تامل اور چوں وچراں کے بغیر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینا ان کے لیے بالکل آسان کھیل تھا چنانچہ بے شمار غزوات اور جنگوں میں صحابہ کرام نے اپنی جانیں پیش کر کے اسلام کے اس باغ کو اپنے خون سے سیراب کیا ہے، اسی لیے قرآن کریم میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بہت ساری جگہوں پر صحابہ کرام کی تعریف کی گئی ہے اور ان حضرات کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا سٹیفکیٹ (Certificate) بارگاہ خداوندی سے حاصل ہوا ہے ستر صحابہ کرام نے دامن احد میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اتنے محبوب اور پیارے ہیں کہ ان کی خاطر اپنی سب سے پیاری چیز یعنی جان بھی قربان کی جاسکتی ہے۔

ایک صحابی حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کو جب اللہ کے راستے میں زخم آئے اور اُن کی شہادت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے اللہ کے لیے جان دے دینے کو اپنی کامیابی سے تعبیر کرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ کہ رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا جس میں ہمارے لیے ایک عظیم الشان سبق یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک کامیابی اور ناکامی کا معیار ان کی دنیا کا بننا اور بگڑنا نہیں تھا یا دنیوی لحاظ سے دشمن پر غالب آجانا ہی کامیابی نہیں سمجھا جاتا تھا جیسا کہ آج کا مسلمان کامیابی اسی کو سمجھتا ہے جو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ مسلمان کے لیے کامیابی تو یہ ہے کہ اس کا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان ہو جائے یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر اس کی عزیز جان بھی اس راہ میں استعمال ہو جائے خواہ دنیا کے اعتبار سے غالب ہوں یا مغلوب فاتح وحکمراں ہوں یا محکوم ورعایا ہوں اور سلطنت وحکومت باقی ہے یا چھوٹے مگر اللہ کا حکم نہ چھوٹے اور نہ ٹوٹے اس لیے

حضرت والا نے فرمایا کہ خدا کی محبت اگر دیکھنی ہو یا محبت رسول سمجھنی ہو تو صحابہ کرام کے لہو سے پوچھ کر دیکھو۔

اللہ کے عاشقوں کا دل قیل وقال کی محفلوں میں نہیں لگتا

کہاں لگتا ہے دل ان عاشقوں کا
انہیں مطلب ہے اپنی ہاؤ ہو سے

بلا شبہ یہ ایک سچی حقیقت ہے محض تکلف اور بناوٹ کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے سچا اور صحیح تعلق رکھنے والے غیر اللہ کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتے اور وہاں ان کا دل نہیں لگتا ہے جیسا کہ آج کل کے جوان کہیں کرکٹ (Cricket) کا میچ ہو، یا سوکر (Soccer) یا اور دوسری قسم کے دنیا کے کھیل تماشے ہو رہے ہوں تو یہ جوان ان جگہوں میں خوب مست رہتے ہیں مگر اللہ والوں کے لیے یہ سب جگہیں ان کا دل لگنے کی نہیں ہیں وہ تو ان سب کو فضولیات قرار دیتے ہیں اور انہیں ان سے وحشت ونفرت اور دوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں انہیں اپنے محبوب کا قرب میسر نہیں آتا ہے۔

اسی لیے اہل اللہ کی ایک شان یہ ہوتی ہے کہ وہ لہو ولہب میں تو کیا محض بے فائدہ باتوں اور کاموں سے بھی دور رہتے ہیں۔ چنانچہ میرے شیخ حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سالک کے لیے لایعنی قول وفعل سے بچنا از حد ضروری ہے جس کی آسان ترکیب یہ ذکر فرمائی ہے کہ جب بھی کوئی بات کرنی ہو یا کوئی کام انجام دینا ہو تو یہ غور وفکر کرے کہ اس میں میرا دینی یا دنیوی نفع کا حصول یا ضرر کا دفع ہو رہا ہے یا نہیں بس یہی معیار ہے اس کے لغو ہونے کو سمجھنے کا اگر اس میں کسی قسم کا دینی یا دنیوی نفع ہو رہا ہو یا دینی یا دنیوی ضرر دفع ہو رہا ہو تو اس کو کر گزرے ورنہ سمجھ لے کہ اس کا یہ قول وعمل لغو وبے کار ہے اس سے اعراض کرے جب انسان سوچ کر کرنے کا عادی ہو جائے گا اور اپنا یہ مزاج بنا لے گا کہ پہلے سوچوں پھر کروں نہ کہ پہلے کروں پھر سوچوں تو ان شاء اللہ بہت جلد فضول اور لغو باتوں اور کاموں سے محفوظ ہو جائے گا جس کا آج کل عام طور پر عوام وخواص سبھی شکار رہتے ہیں اور اس کا چھوڑنا طبیعتوں پر بڑا دشوار ہوتا ہے لیکن اگر حضرت کے اس نسخے پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ بہت جلد اس مرض سے نجات مل جائے گی۔

اور یہ مومن کا بہت بڑا وصف ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے لاکھوں ذخیرۂ حدیث میں سے اپنے بیٹے حماد کو خاص وصیت کے طور پر عمل کے لیے جن پانچ حدیثوں کا انتخاب کیا تھا ان میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے۔ جیسا کہ وصایا الامام الاعظم کے صفحہ: ۶۴ پر ہے کہ:

﴿وَالتَّاسِعُ عَشَرَ اَنْ تَعْمَلَ بِخَمْسَةِ اَحَادِيْثَ جَمَعْتُهَا مِنْ خَمْسَةِ الْاٰفِ حَدِيْثٍ
وَمِنْهَا مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، ج:۲، ص:۳۰۵)

یعنی انسان کے اسلام کی خوبی سے یہ بات ہے کہ وہ تمام بے کار اور لایعنی قول وعمل سے دور رہے اور اس کو چھوڑ دے اور صحیح تو یہ ہے کہ جب کسی کو اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات عالی کے ساتھ گہرا تعلق قائم ہو جائے گا تو اسے اس میں ایسا لطف اور مزہ حاصل ہوگا کہ پھر اس کا دل لایعنی اور فضول کاموں میں لگے گا ہی نہیں اور ادھر ادھر قیل وقال کی محفلوں میں اسے مزہ ہی نہیں آئے گا اور اگر کبھی وہ اس طرح کی مجلسوں میں الجھ جائے تو اندر اندر گھٹتا اور کڑھتا رہے گا لیکن دل میں اسے قرار میسر نہیں آئے گا بس اس کا دل ایسی مجلسوں میں شاداں اور فرحاں رہے گا جہاں کچھ اللہ والے اپنے مولیٰ کی یاد میں مست ہوں یا خلوت ویکسوئی کے ساتھ تلاوت وذکر اللہ کا شغل ہو اور بس یہی پہچان ہے نسبت مع اللہ مل جانے کی ورنہ جب تک آدمی قیل وقال کی مجلسوں میں مزہ پاتا رہتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ابھی اس کے قلب میں تعلق مع اللہ کی پوری حلاوت پیدا نہیں ہوئی ہے جیسا کہ حضرت شاہ احمد پرتا بگڈھی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

نہیں رہتے ہیں ہم کیوں چاہیے ہم کو جہاں رہنا
کوئی رہنے میں رہنا ہے یہاں رہنا وہاں رہنا

دل کو غیر اللہ سے لگانا، بہت بڑی رکاوٹ ہے

نہ پہنچا منزلِ عشقِ خدا تک
لگایا جس نے دل کو غیر ہو سے

ہمارے کلمۂ توحید کی بنیاد ہی اس پر قائم ہے کہ غیر حق تعالیٰ کو مکمل طور پر اپنے دل سے نکال کر باہر کردیں تب اللہ تعالیٰ سے قوی تعلق قائم ہوگا۔ کفار ومشرکینِ مکہ نے عقیدہ کے درجہ میں عبادت اور نفع وضرر وغیرہ کے معاملات میں دوسروں کو حق تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا اور غیر اللہ، اصنامِ باطلہ سے دل لگایا تو وہ مشرک قرار پائے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہوگئے۔ لیکن مومن بندہ وہ اس درجے میں تو نہیں مگر جس درجے میں بھی غیروں سے دل لگا کر رکھے گا اتنے ہی درجے عشق خداوندی میں کمی باقی رہے گی اور وہ اللہ سے دور رہے گا جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَآءِ عَنِ الشِّرْکِ مَنْ عَمِلَ عَمَلاً اَشْرَکَ فِیْہِ مَعِیَ غَیْرِیْ تَرَکْتُہٗ وَشِرْکَہٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقاق، باب من اشرک فی عملہ غیر اللہ)

یعنی میں اتنا بے نیاز ہوں کہ تم نے جن شرکاء کو میرا شریک ٹھہرا رکھا ہے ان سب میں سب سے زیادہ بے نیاز ہوں اور میں شریک ٹھہرانے والوں کو ان کے شرکاء پر چھوڑ دیتا ہوں میں اپنے ساتھ کسی کی معیت گوارہ نہیں کرتا ہوں۔

حضرت جنید بغدادی کا ایک قصہ

صاحبو! جب ایک بیوی اپنے شوہر کے لیے یہ گوارہ نہیں کرتی کہ میرا شوہر کسی دوسری عورت سے شادی کر کے میرے ساتھ محبت میں کسی کو شریک کر لے اگر آپ اس سے پوچھ کے دیکھو تو آپ کو یہی جواب ملے گا کہ پہلے مجھے دنیا سے رخصت کر دو پھر ایسی سوچ دل میں لاؤ۔

چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا ایک قصہ خطبات مسیح الامت میں مذکور ہے کہ ایک عورت ان کے پاس آئی اور ان سے عرض کرنے لگی کہ میرا شوہر دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے تو حضرت نے اس سے فرمایا کہ پھر کیا بات ہے مرد کو تو دوسرے نکاح کی اجازت ہے۔ اس پر اس عورت نے سرد آہ بھری اور کہا کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو میں اپنا نقاب اٹھا کر تم کو اپنا چہرہ دکھاتی اور پوچھتی کہ جب مجھ جیسی عورت کسی کے نکاح میں ہو تو کیا اس کو دوسری طرف نظر کرنا چاہیے۔ اس میں اس نے اپنے حسن و جمال کی طرف اشارہ کیا۔ جب حضرت جنید نے یہ سنا تو غش کھا کر گر گئے۔ کسی بے تکلف نے پوچھا کہ حضرت آپ کو یہ حال کیوں آیا تو فرمایا کہ اس عورت کے اس کہنے پر مجھے حدیث یاد آ گئی، حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے بندو! اگر تم کو میرا دیکھنا ممکن ہوتا تو تم کو دکھا کر پوچھتا کہ جس کا مجھ جیسا خدا ہو کیا اس کو دوسرے کی طرف نظر کرنا روا ہے؟ (خطبات مسیح الامت، جلد:۱، صفحہ:۱۰۲)

آہ! اس عورت کو اپنے حسن پر اتنا ناز ہے کہ وہ فخر سے کہتی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے میرے شوہر کو دوسری شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہیے تو غور کرو اور سوچو کہ ہمارا اللہ اس قدر حسن و جمال والا اس اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کو مانتے ہوئے ہم ان دنیا کی حسین اور حسیناؤں پر اپنا دل دینے کی باتیں کریں تو یہ کس قدر بے غیرتی کی بات ہوگی کاش کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال کو پہچان جاتے تو پھر ان مردہ حسینوں پر کبھی نہ مرتے ایک عورت کے حسن کو تو کیا نسبت۔ ابتدائے دنیا سے لے کر قیامت تک آنے والی ساری حسین عورتوں کا حسن اور جنت کی تمام حوروں کا حسن اور جتنی روئے زمین پر حسین شکلیں اور صورتیں ہیں ان سب کا حسن اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال کے مقابلہ میں کوئی نسبت نہیں رکھتا جس نے ان ساری چیزوں کے مجموعہ کو حسن بخشا ہے انہیں حسن عطا کیا ہے تو خود اس کے جمال کا کیا عالم ہوگا۔

واللہ حقیقت تو یہی ہے کہ اگر ہماری بصیرت کی آنکھ کھل جائے اور پھر ہم اللہ کے حسن و جمال کا مشاہدہ کر لیں تو سارے غیر اللہ کو بھول جائیں گے مگر چوں کہ ہماری دل کی بینائی سلب ہو چکی ہے اس لیے ہم اپنے خالق پر فدا ہونے کے بجائے مخلوق کے فانی اور عارضی حسن پر فدا ہو رہے ہیں۔

دیدارِ خداوندی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے

جب قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ جنتیوں کو تمام نعمتیں اور آرائشیں اور حور و قصور دے چکے ہوں گے تو

پھر حق تعالیٰ اہل جنت سے سوال کریں گے کہ کسی اور نعمت کی تمہیں تمنا ہے تو اہل جنت بارگاہ خداوندی میں عرض پیرا ہوں گے کہ یا اللہ! آپ نے تو ہر طرح کی نعمتیں عطا فرمادیں اور ہر قسم کا عیش و آرام عطا کر دیا ہے تو اب مزید اور کون سی نعمت باقی ہے جس کی ہم تمنا کریں تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے اور بندے کے درمیان سے حجابات ہٹادیں گے۔

صحیح مسلم میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہوچکیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے خطاب فرمائیں گے کہ کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ، ہم اس کو پورا کریں گے۔ اہلِ جنت جواب دیں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کیے، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، جہنم سے نجات دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں۔ اس وقت درمیان سے حجاب اُٹھادیا جائے گا اور سب اہلِ جنت حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا تھا، جو رب العالمین نے محض اپنے کرم سے بے مانگے عطا فرمائی۔ بقول مولانا رومی رحمہ اللہ ؎

ما نبودیم و تقاضہ ما نبود
لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

اور پھر اہل ایمان اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور اس دیدار کا یہ اثر ہوگا کہ جنتی اس نعمت دیدارِ خداوندی کے سامنے جنت کی ساری نعمتوں کو بھول جائیں گے جس کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾

(سورۃ یونس، آیۃ: ۲۶)

کہ جو لوگ صفت احسان سے متصف تھے اور نیکوکار تھے ان کے لیے جنت ہے اور مزید ایک نعمت ہے اور وہ اللہ کا دیدار ہے بھلا حوروں کو حسن بخشنے والا اور چاند کو چاندنی اور خوبصورتی عطا کرنے والا اللہ جب اپنا دیدار کرائے گا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور نعمت کا ذہن میں خیال باقی رہے اس لیے چند دن کی بات ہے ہر ایمان والے کو اپنی نگاہوں کو غیر حق تعالیٰ سے محفوظ رکھنا چاہیے ان شاء اللہ عنقریب جب دنیا سے روانہ ہوں گے تو پھر مزے ہی مزے سامنے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی محبت اور فانی خوب رو کی محبت جمع نہیں ہو سکتی ہے

اگر رہنا ہے اختؔر ان کا بن کر
لگانا دل نہ فانی خوبرو سے

یہ مضمون کثرت سے حضرت والا کی کتابوں میں مذکور ہے اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ آج کل یہ بیماری ایک وبائی مرض کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور سالکین کے اکثر خطوط دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نوے بلکہ پچانوے فیصد سالکین اس مہلک اور خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر بے چین و پریشان رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے محبت چاہنے کی وجہ سے اس سے چھٹکارے کے متلاشی ہوتے ہیں تو اس شعر میں بھی حضرت والا یہ بات ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر واقعی پورے طور پر اللہ کا بندہ بننا ہے تو کسی فانی خوبصورت شکل والے سے دل مت لگانا گویا کہ دلیل بھی خود شعر میں مذکور ہے کہ جب کائنات کے ہر حسین کا حسن فانی ہے اور اسے مٹ کر ختم ہو جانا ہے تو پھر یہ نادانی اور جہالت ہے کہ ایسے مٹنے اور فنا ہونے والوں پر دل دے کر اپنے آپ کو فنا اور ختم کر دینا۔

یہ ایک اہم بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضرت والا نے خوبرو کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی حسین عورت ہی ہو یا حسین امرد بے ریش لڑکا ہی ہو بلکہ اگر ایسا بھی کوئی لڑکا ہو جس کے چہرے پر کچھ ڈاڑھی کے بال اُگ آئے ہوں مگر اس سے باتیں کرنے میں نفس کو مزہ ملتا ہو اور اس کو دیکھنے میں طبیعت کی رغبت ہوتی ہو تو پھر ایسی شکلوں سے دور رہنا بھی لازم اور ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق یہ بات تحریر فرمائی ہے:

﴿ فَاِنَّ بَعْضَ الطَّبَائِعِ یُقَدِّمُ ذَا اللِّحْیَۃِ الْقَلِیْلَۃِ عَلَی الْاَمْرَدِ الْحَسَنِ ﴾

(رد المحتار)

یعنی کہ بعض خبیث طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو تھوڑی داڑھی نکلے ہوئے لڑکے کے ساتھ محبت کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے اور اس سے میل جول رکھنے میں طبیعت کا زیادہ میلان ہوتا ہے بس جس سے بات کرنے میں دل کا میلان ہوتا ہو اور قلب پر گندگی اور ظلمت محسوس ہونے لگے تو سمجھ لو کہ یہ تعلق چھوڑ دینے کے قابل ہے ورنہ اس میں بڑی ہلاکت اور خسارہ ہے، جس کو حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے بڑے درد بھرے انداز سے اس طرح فرمایا:

''جس مرد سے اگرچہ وہ امرد نہ ہو گفتگو میں اس کی آواز اور اس کے نقشے اور چہرے سے اور آنکھوں سے نفس کو لطف ملنا شروع ہو فوراً اس سے ہٹ جائے اور پھر یوں ارشاد فرمایا کہ غیر محرم عورت یا مرد (خوبصورت لڑکا) سے کسی قسم کا تعلق رکھنا خواہ اس کو دیکھنا یا اس سے دل خوش کرنے کے لیے ہم کلام ہونا یا تنہائی میں اس کے پاس بیٹھنا یا اس کے پسند طبع کے موافق اس کے خوش کرنے کو اپنی وضع یا کلام کو آراستہ یا نرم کرنا یعنی آواز میں عورتوں کی سی لچک اس کو بہلانے پھسلانے کے لیے، مائل کرنے کے لیے پیدا کرنا میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اس تعلق سے جو جو خرابیاں پیدا

ہوتی ہیں اور جو جو مصائب پیش آتے ہیں احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔ (روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج، صفحہ:۶)

اجنبیہ سے خلوت کے لیے خوبصورتی شرط نہیں ہے

یہاں احقر مناسب سمجھتا ہے کہ شریعت کے ایک اہم مسئلے پر تنبیہ کرے جس سے عام طور پر غفلت برتی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی عورت غیر محرم ہو اور وہ خوبصورت نہ ہو تب بھی اس عورت سے حجاب اور پردہ کرنا اور دور رہنا از روئے مسئلہ لازم اور ضروری ہے اور اس کے ساتھ بھی اختلاط اور میل جول کرنا اور تنہائی اختیار کرنا بالکل ناجائز ہے ورنہ بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے اور ہم نے کئی واقعات ایسے دیکھے ہیں کہ احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے باہم مرد و عورت میں عشق پیدا ہوگیا اسی لیے جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب النكاح، باب النظر الى المخطوبة، ص: ۲۶۹)

کہ کسی مرد کو کسی عورت کے ساتھ تنہائی ہرگز اختیار نہیں کرنی چاہیے ورنہ ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے تو اس موقع پر خوبصورت یا بدصورت ہونے کی کوئی تفصیل نہیں ہے خواہ کوئی بھی غیر محرم عورت ہو اس کے ساتھ تنہائی کو منع قرار دیا گیا ہے۔

صاحبو! جب ایسی صورت میں وہاں شیطان موجود ہوتا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ شیطان ہمارا دشمن ہے دوست نہیں ہے تو پھر غور فرمائیں کہ وہ اپنی دشمنی نکالنے میں کوئی کسر چھوڑے گا؟ نہیں! بالکل نہیں وہ اپنی پوری دشمنی نکالے گا تو دشمن کو دشمن سمجھنا عقل مندی ہے اور اس سے بچنا اور دور رہنا سلامتی کا راستہ ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾

(سورة يوسف، اية: ۵)

ترجمہ: بلاشبہ شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

اور ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾

(سورة فاطر، اية: ۶)

ترجمہ: بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن سمجھو۔

قربان جائیں ہم اپنے پیارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ ہم کو ہمارے دشمن کی بھی خبر دے دی اور دشمن سے بچنے کا راستہ بھی بتا دیا اب یہ ہمارے اوپر ہے کہ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو مان کر اس دشمن سے کتنا بچتے ہیں اسی لیے احقر تو یہاں تک عرض کرتا ہے کہ جو ہمارے ملک جنوبی افریقہ میں گھروں

میں کام والی آیا کرتی ہیں ان کے ساتھ بھی مرد کو گھر میں خلوت کی صورت میں نہیں رہنا چاہیے جب بیوی یا بچے موجود ہوں تو ان کو گھر میں کام کرنے دے اور اگر کسی وجہ سے گھر میں کوئی موجود نہ ہوں تو پھر یا تو اس کی چھٹی کردے اور یا جب تک وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو تو خود کو گھر سے باہر کسی کام میں مشغول رکھے۔

بلکہ بقول ہمارے حضرت والا تقویٰ والی صورت اختیار کرے کہ اس کی مکمل چھٹی کردے ورنہ چونکہ قدرت کا تعلق ضدین سے ہوتا ہے تو جس طرح آپ اس پر قادر ہیں کہ گھر سے باہر بیٹھے رہیں تو یہ بھی آپ کی قدرت میں ہے کہ گھر کے اندر چلے جائیں اس لیے افضل پر عمل کرے اور مستقل طور پر جب تک آپ کے اہل و عیال گھر میں نہ ہوں تو اس کی چھٹی کردے لیکن ایسی صورت نہ ہونے دے کہ بند مکان کے اندر پورے گھر میں اس کے ساتھ تنہا موجود ہو۔ ورنہ یاد رکھئے کہ ایسی صورت میں شیطان خطرناک دشمن کی موجودگی ہمارے ایمان کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے اگرچہ عامۃً طبیعتیں ان کی طرف راغب نہیں ہوتی مگر ہمیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانتے ہوئے ایمان کی حفاظت کے لیے بھرپور تدبیر اختیار کرنی چاہیے ورنہ کئی مرتبہ ایسا دیکھا گیا کہ بعض لوگ ایسے چہروں پر عاشق ہوگئے جن کی طرف عامۃً طبیعتوں کی رغبت نہیں ہوتی عشق و محبت تو بہت دور کی بات ہے مگر پھر بھی شیطان نے ان کو اس جال میں پھنسا دیا اس لیے ہمارے ایمان کا اصل تقاضہ یہی ہے کہ ہم زیادہ علتوں اور حکمتوں کے پیچھے نہ پڑیں بلکہ آنکھ بند کر کے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر بھرپور اعتماد اور یقین رکھتے ہوئے ان باتوں کو تسلیم کریں۔

مجھے اس موقع پر اسی مضمون سے ملتی جلتی ایک حدیث شریف یاد آرہی ہے اور اس سے متعلق ایک عبرت آموز قصہ جو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

﴿اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُسَافِرِ امْرَأَۃٌ فَوْقَ ثَلَاثِ لَیَالٍ اِلَّا مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الحج، سفر المرأۃ مع محرم الی حج وغیرہ)

ترجمہ: کسی عورت کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے مگر جب کہ اس کے ساتھ کوئی اس کا محرم موجود ہو۔

یہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدار سفر شرعی تنہا طے کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ اب اصل ہمارے ایمان کا مقتضا یہ ہے کہ ہم اس کو بلا چوں و چرا قبول کرلیں اور اس کی حکمتوں کے تلاش کرنے میں نہ پڑ جائیں مگر جو لوگ عقل کو اپنا مقتدا سمجھتے ہیں اور ہر چیز کی عقلی دلیل اور حکمتیں تلاش کرتے ہیں تو ان کو اس راہ میں بڑی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جہاز میں عورت کے تنہا سفر پر ایک عبرت ناک قصہ

چنانچہ اسی کے اوپر احقر کو ایک قصہ یاد آیا کہ ایک جوان لڑکی جہاز میں سفر کر رہی تھی جس کو آج کل لوگ اپنے ذہن میں بالکل (Safe) اور محفوظ سمجھتے ہیں۔ بہرحال صورت یہ پیش آئی کہ وہ جہاز میں جس کے پاس بیٹھی تھی

اس نے اس سے بات چیت شروع کر دی اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد مزید گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اس لڑکی نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے اس لڑکے سے اس کی مالی حالت دریافت کی تو اس نے ایسے ہی فرضی اور جھوٹ اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اس سے کہنے لگا کہ میری ساؤتھ افریقہ میں (Takkies Shoes) کی کمپنی ہے اور مجھے زیادہ تر اپنی تجارت کے سلسلہ میں بیرونی ممالک کے سفر و اسفار پر رہنا پڑتا ہے اور اس طرح باتوں باتوں میں اس لڑکی کے ذہن میں عجیب و غریب نقشہ اس کے متعلق قائم ہو گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر وغیرہ بھی لے لیے اور دونوں اپنے اپنے وطن پہنچ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد اس لڑکی نے ادھر فون کرنا شروع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خیر اس لڑکے نے ٹال مٹول کر دی اور اس مصیبت سے اپنے کو بچا لیا۔

پھر اتفاق سے یہ لڑکا ایک مرتبہ سفر کرتے ہوئے اس ملک میں پہنچا جہاں کی وہ لڑکی رہنے والی تھی اور حسن اتفاق یہ کہ جو اس لڑکے کے میزبان تھے ان کے اور اس لڑکی کے والد کے آپس میں تعلقات تھے تو اس مہمان کے دو چار دن قیام کے دوران ایک دن ان کو دعوت کے لیے اس لڑکی کے والد اپنے گھر لے گئے۔ یہ صاحب جب گھر میں داخل ہونے لگے تو اس لڑکی کی ان پر نظر پڑی تو جیسے ہی ان کی نظر اس پر پڑی تو اس نے ان کو دیکھتے ہی فوراً کہا کہ تم تو وہی ہو جن سے میری ملاقات جہاز میں ہوئی تھی، اب یہ لڑکا سب کے سامنے نہایت شرمندہ اور رسوا ہوا۔ وقتی رسوائی سے بچنے کے لیے اس نے برجستہ یہ جھوٹا جواب دیا کہ بہن ایسا نہیں ہے، تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب اس نے پوری ملاقات کی تفصیل بتائی اور اس کے کاروبار و تجارت کے متعلق معلومات ذکر کی تو انہوں نے فوراً جھوٹ پر ایک جواب تیار کر کے کہا کہ اوہو! تم کو دھوکا ہو گیا ہے، ہم دو جڑواں بھائی ہیں اور وہ میرا بھائی ہے جو بہت زیادہ سفر و اسفار کرتا ہے، اسی کی وہ سب تجارتیں ہیں، میں وہ شخص نہیں ہوں۔ اور یہ قصہ خود صاحبِ قصہ نے احقر کو سنایا اور ان کا مقصد محض ایک مزاح کرنا تھا لیکن شرعی طور پر ایسے مزاح حرام ہیں۔

صاحبو! اس قصہ میں غور کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات خواہ ہمیں اس کی حکمت و وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے بلا چوں و چراں قبول کر لینی چاہیے۔ جو لوگ اس نقطے سے غافل ہیں وہ زندگی بھر بے چین و پریشان رہتے ہیں اور ساری عمر اپنی منزل تلاش کرنے کے باوجود انہیں منزل نہیں ملتی۔

نئے جام و مینا عطا ہو رہے ہیں

جو ہر دم خدا پر فدا ہو رہے ہیں
وہ فانی بتوں سے جدا ہو رہے ہیں

وہ خمرِ کہن تو قوی تر ہے لیکن
نئے جام و مینا عطا ہو رہے ہیں

کبھی قلب دے کر کبھی جان دے کر
رہِ عشق میں با وفا ہو رہے ہیں

خوشی اپنی ان کی خوشی پر لٹا کر
ہم اب اہلِ صدق و صفا ہو رہے ہیں

کبھی پی رہے ہیں لہو آرزو کا
مٹا کر خودی با خدا ہو رہے ہیں

تجھے ہو مبارک یہ اشکِ ندامت
نئے باب الفت کے وا ہو رہے ہیں

یہ شانِ کرم ہے کہ نالائقوں پر
کرم ان کے ہر دم عطا ہو رہے ہیں

محبت کی اخترؔ کرامت تو دیکھو
کہ سلطان ہو کر گدا ہو رہے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ بتوں: بت کی جمع، مراد تمام نامحرم خواتین اور وہ لڑکے جن کی طرف جنسی میلان ہوتا ہو۔ **خمرِ کہن:** پرانی شراب۔ **قوی تر:** طاقتور۔ **جام و مینا:** شراب کا پیالہ اور بوتل۔ **قلب:** دل۔ **رہِ عشق:** اللہ تعالیٰ کے عشق کا راستہ۔ **اہلِ صدق:** اللہ تعالیٰ کی محبت اور اخلاص کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنا۔ **صفا:** دل کا روحانی بیماریوں سے پاک ہونا۔ **لہو آرزو:** دل کی حرام خواہشات کا خون پینا۔ **خودی:** خود کو کچھ سمجھنا۔ **اشکِ ندامت:** ندامت کے آنسو۔ **باب:** دروازہ۔ **الفت:** محبت۔ **وا:** کھلنا۔ **سلطان:** بادشاہ۔ **گدا:** فقیر۔

جو خدا پر فدا وہ فانی بتوں سے جدا

جو ہر دم خدا پر فدا ہو رہے ہیں
وہ فانی بتوں سے جدا ہو رہے ہیں

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کرنا اور اللہ کے ہر حکم پر ہر لمحہ فدا ہونا اور جان دینا یہ بندے کو اللہ سے قریب بلکہ قریب تر کر دیتا ہے اور جس قدر بندہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اتنا ہی فانی بتوں (حسین، حسیناؤں سے) دور اور علیحدہ ہو جاتا ہے اور جو لوگ ہمت کر کے اپنی ناجائز خواہشوں کو پامال نہیں کرتے بلکہ ان کو بھی پوری کرتے رہتے ہیں کہ کبھی نظر بازی کر لی کبھی غیبت کر لی کبھی جھوٹ بول دیا وغیرہ وغیرہ تو ایسے لوگ اللہ تعالیٰ سے درمیانی درجہ کا تعلق تو رکھتے ہیں لیکن ان لوگوں میں فدا ہونے والی شان نہیں ہے تو پھر ان کے دلوں سے ان فانی بتوں کی محبتیں رخصت نہیں ہوتیں بلکہ ان کے دل ان کی محبتوں میں اٹکے رہتے ہیں لہٰذا اس شعر میں ہمیں راستہ بتا دیا گیا ہے کہ سب کچھ اپنے اللہ پر قربان کرنا سیکھ لو اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہمت کو استعمال کرو تو یہ سارا غیر غبار کی طرح ہو کر فضا میں اڑتا نظر آئے گا۔

شرابِ محبت خداوندی کا نشہ دن بدن بڑھتا رہتا ہے

وہ خمرِ کہن تو قوی تر ہے لیکن
نئے جام و مینا عطا ہو رہے ہیں

اللہ تعالیٰ نے جو ایمان بندہ مومن کے قلب میں رکھا ہے اور اس کی برکت سے اسے محبت خداوندی کا انعام ملا ہے وہ خود انسان کو اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلنے کے لیے مست و دیوانہ کرنے والا ہے مگر جب آدمی مجاہدات کرتا ہے اور گناہوں سے بچنے میں مشقتیں سہتا ہے تو ہر قدم پر اسے خاص قسم کا لطف اور عجیب قسم کی ایمانی حلاوت نصیب ہوتی ہے اور یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ مرتے دم تک قائم رہتا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ ہر دن و ہر گھڑی اپنے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور اس کے سامنے آہ و زاری کرنے میں اپنے مقام قرب کو مزید سے مزید پاتے ہیں اور تجلیات قرب میں دن بدن اور لحہ بلمحہ اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی لیے اللہ والے اپنی ہر پچھلی حالت کو اگلی حالت کے مقابلے میں غفلت سے بھری ہوئی تصور کرتے ہیں اور اس پر ہر آن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نادم و پشیمان ہو کر تائبانہ حاضر رہتے ہیں جس کی بدولت ان پر حق تعالیٰ کا خصوصی فضل شامل حال رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی محبت کے مزید جام و مینا عطا فرماتے رہتے ہیں۔ اور جس طرح شراب جتنی پُرانی ہوتی ہے اتنا ہی اس میں نشہ بھی زیادہ ہوا کرتا ہے۔ بس اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کی شرابِ کہن بھی بڑی قوی تر ہوتی ہے۔

کبھی قلب دے کر کبھی جان دے کر
رہِ عشق میں با وفا ہو رہے ہیں

اگر ضرورت پڑے تو اللہ کے یہ عشاق راہ خداوندی میں اپنی جانیں لے کر حاضر ہو جاتے ہیں اور اللہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کر کے بارگاہ رب العزت میں باوفا اور سچے قرار پاتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾

(سورۃ الاحزاب، ایۃ: ۲۳)

ترجمہ: ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اُترے پھر ان میں بعضے تو ایسے ہیں کہ جو اپنی نذر پوری کر چکے، مطلب یہ کہ شہید ہو چکے اور اخیر دم تک منہ نہیں موڑا۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۹۸)

اور جب اللہ تعالیٰ کے لیے دل دینا پڑتا ہے تو پھر اپنے دل کو پیش کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ دل میں صرف ایک اکیلے اللہ کو رکھتے ہیں اس کے غیر کو دل میں جگہ نہیں دیتے اور اگر دل میں غیر کی طرف کچھ میلان نظر آتا ہے تو اسے اللہ کے لیے قربان کر دیتے ہیں جو لوگ زبانی محبت کے دعوے دار ہوتے ہیں مگر ساتھ ساتھ نفسانی حرام

خواہشات کے تقاضے بھی پورے کرتے رہتے ہیں تو یہ اللہ کے باوفا بندے نہیں ہیں۔

اہلِ صدق وصفا کون لوگ ہیں

خوشی اپنی ان کی خوشی پر لٹا کر
ہم اب اہل صدق و صفا ہو رہے ہیں

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ مومن بندے کی اپنی خوشی درحقیقت علیحدہ سے کوئی ہے ہی نہیں اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ خوش ہوتے ہیں انہی باتوں میں اس مومن بندے کی بھی خوشی ہے اور جو اللہ رب العزت کو ناپسند ہیں وہ مومن بندے کو بھی ناپسند ہو جب ہم اس طرح سے اپنی خوشی اللہ کی خوشی پر قربان کردیں گے پھر ہمارے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم اہل صدق وصفا ہیں جیسا کہ قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کریمہ کے اندر ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

(سورۃ البقرۃ، اية:۱۷۷)

ترجمہ: کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو، یا مغرب کو (کرلو) لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات پر) یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، نور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مرگیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی (بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (کہ ان عقائد واعمال کے ساتھ (یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب (کسی امر جائز کا) عہد کرلیں اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکۂ) قتال (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں بس) یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں، غرض اصلی مقاصد اور کمالات دین کے یہ ہیں نماز کسی سمت کو منہ کرنا انہی کمالات مذکورہ میں سے ایک کمال

خاص یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حسن سے اس میں بھی حسن آ گیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا۔ (معارف القرآن، جلد: ۲، ص: ۱۷۷)

اس آیت میں تمام احکامِ شریعت، اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاق کا اجمالی طور پر ذکر کرنے کے بعد جو لوگ ان سب میں اللہ تعالیٰ کی مرضی پر چلنے والے ہیں اور اپنی طبعی چاہت کو چھوڑ دینے والے ہیں ان کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ کہ یہی وہ لوگ ہیں جو واقعی میں اہلِ صدق ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی کہے جاسکتے ہیں۔

اس لیے مومن کے لیے بنیادی چیز دین کے ہر شعبے میں اپنی من مانی نہ کرنا بلکہ اپنے مولیٰ کی مرضی پر چلنا ہے اور اپنی ہر خوشی کو اللہ کی خوشی پر فنا کرنا ہے۔ اسی کو خواجہ صاحب نے یوں فرمایا۔

یاد میں تیری سب کو بھلا دوں کوئی نہ مجھ کو یاد رہے
سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے ترے دل شاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لٹادوں خانہ دل آباد رہے
سب کو نظر سے اپنی گرا دوں تجھ سے فقط فریاد رہے

باخدا بننے کے لیے خودی کو مٹانا ضروری ہے

کبھی پی رہے ہیں لہو آرزو کا
مٹا کر خودی باخدا ہو رہے ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی آرزوؤں کا خون پی کر (جس کا مفہوم جگہ جگہ اشعار میں ذکر کیا جا رہا ہے) انسان اپنی انانیت کو مٹاتا ہے اور خود اپنے مقام اور وجود کو اپنی نگاہوں میں کچھ نہیں سمجھتا جو کہ تمام اولیاء اللہ کی خصوصیت ہے اب جب تک آدمی کچھ سمجھتا رہے گا تو اپنی انانیت اللہ تعالیٰ تک وصول میں بہت بڑی رکاوٹ رہے گی جب اپنے کو اللہ پر فدا کر دے اور ایسا فدا اور فنا کرے کہ خود اس فنا کرنے کو بھی ذہن سے نکال دے اس کا خیال بھی باقی نہ رہے تب سمجھ لو کہ اللہ والا ہو گیا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر اپنے مٹانے کا خیال ہوگا تو یہ فنا ہے اور فنا الفنا کے بعد ہی بقا حاصل ہوتی ہے کیونکہ اگر اپنی فنا کا خیال دل میں باقی ہے تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ میں کچھ تھا اور اپنے کو مٹا ڈالا جب کہ اللہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے کچھ ہونے کا خیال ہی دل سے نکال ڈالو کہ تم یہ کہو کہ میں نے اپنے کو مٹایا تبھی جا کر اللہ تعالیٰ حقیقی معنی میں ملتے ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جسے مختلف صوفیاء کی کتابوں میں وحدت الوجود کا نام دیا گیا ہے جو کہ ایک امر واقعی اور سچی حقیقت ہے لیکن بہت سے اہلِ علم حضرات اس کے معنی و مطلب غلط سمجھنے کی بنا پر وحدت الوجود کے قائلین پر سخت قسم کے

اعتراضات کرتے ہیں حالانکہ اس کی محض اتنی حقیقت ہے جو احقر نے اوپر عرض کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنے وجود کو مٹا ڈالے اور اس کے فیصلوں اور خوشیوں کے سامنے اپنے ہر فیصلے اور خوشی کو فنا کردے اور گویا اپنے وجود ہی کو بیچ میں سے ختم کر ڈالا اور اس سے بالکل صرفِ نظر کرلیا۔ اس کو حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی پیش کی گئی مثالوں سے سمجھئے:

جیسے جگنورات کی تاریکی اور اندھیرے میں چمکتا رہتا ہے اور مختلف لائٹیں رات کے اندھیرے میں اپنے محدود دائرے میں مکانات اور جگہوں کو روشن کرتی ہیں لیکن جب دن کے وقت میں سورج نکل آتا ہے تو جگنو فضا میں ہونے اور لائٹوں کے جلے رہنے کے باوجود ان کا اپنا کوئی وجود نظر نہیں آتا بلکہ بالکل معدوم اور فنا لگنے لگتا ہے مثلاً بادشاہِ حکومت اور صدرِ مملکت کہیں موجود ہو تو پھر وزیروں اور حکومت کے اہل کاروں کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان مثالوں میں قائل کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ سارے وجود مل کر ایک ہو گئے بلکہ صرف منشا یہ بتانا ہے کہ سورج کی روشنی کے سامنے جگنو اور لائٹوں کی روشنی بے اثر اور کالعدم ہے بالکل ٹھیک اسی طرح جو لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم انسانوں اور اللہ کا وجود العیاذ باللہ ایک ہو گیا ہے بلکہ منشا صرف اتنی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنی خودی کو بھول جائیں اور اپنے کو کالعدم سمجھیں اور اس کو فنا کردیں جیسا کہ خواجہ صاحب نے اپنے اس شعر میں اسی وحدت الوجود کا ذکر کیا ہے ؎

تیرا گدا بن کر میں کسی کا دست نگر اے شاہ نہ ہوں
چین نہ لوں میں جب تک راز وحدت سے آگاہ نہ ہوں

گنہگاروں کا رونا تسبیح خوانوں کی تسبیح سے زیادہ محبوب ہے

تجھے ہو مبارک یہ اشک ندامت
نئے باب الفت کے وا ہو رہے ہیں

جتنا بندۂ مؤمن اشک ندامت گراتا ہے اتنا اللہ تعالیٰ کا زیادہ محبوب ہو جاتا ہے اور اس کا قربِ حق تعالیٰ سے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت والفت کے نئے باب اسے عطا ہوتے رہتے ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿ لَاَنِیْنُ الْمُذْنِبِیْنَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ زَجَلِ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴾

(تفسیر روح المعانی، ج:۳۰)

البتہ گناہگاروں کا رونا مجھے تسبیح خوانوں کی آواز سے زیادہ پسند ہے یعنی سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے والوں کے مقابلے میں گناہگار کے اشک ہائے ندامت کے ساتھ رونے کی آواز اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے اور جب یہ ندامت کے آنسو محبوب ہیں تو ظاہر ہے کہ آنسو بہانے والا بھی محبوب ہوگا۔

اور حدیث شریف میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ مسبحین کی تسبیح کے برابر گنہگاروں کے رونے کی آواز محبوب

ہے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ زیادہ محبوب ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اشک ندامت کی کس قدر حیثیت و قیمت ہے اس لیے جتنی ہم میں یہ صفت موجود ہوگی اتنا زیادہ قرب الی اللہ نصیب ہوگا جیسا کہ الحمد اللہ ہم اپنے حضرت والا کی زندگی میں اس بات کا خاص مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ بڑی کثرت کے ساتھ خلوت میں ہوں یا جلوت میں حضرت والا کی آنکھیں آنسو بہاتی ہی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی شان کرم اور کریم کے چار معانی

یہ شان کرم ہے کہ نالائقوں پر
کرم ان کے ہر دم عطا ہو رہے ہیں

جب تک بندے کا اپنے اللہ کے ساتھ یہ تعلق قائم رہتا ہے کہ وہ یوں سمجھتا اور کہتا رہے کہ یا اللہ! جو کچھ آپ عطا فرما رہے ہیں، میں اس کا اہل اور مستحق نہیں ہوں، آپ کی یہ سب نعمتیں جو ہر آن میرے اوپر برس رہی ہیں بلا استحقاق مجھ جیسے نالائق پر آپ کا کرم ہے اور آپ کی شان کریمی کا ایک اثر ہے ورنہ میں اس قابل نہیں تھا۔ تو دراصل یہی بندے کی ادا حقیقت شکر کہلاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اور اللہ کریم ہی نہیں بلکہ اکرم الاکرمین ہیں جس کا معنیٰ یہ ہے کہ جو صرف لائقوں کو نہیں بلکہ نالائقوں کو بھی خوب عطا کرتا ہے۔ محدثین نے کریم کے چار معنی بیان کیے ہیں جس کو حضرت والا نے درسِ مثنوی مولانا روم میں ذکر فرمایا ہے:

(۱) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَیْنَا بِدُوْنِ الْاِسْتِحْقَاقِ وَالْمِنَّةِ کریم وہ ہے جو اپنے کرم سے نالائقوں کو بھی محروم نہ کرے، جس کا حق نہ بنتا ہو اس کو بھی عطا فرمادے۔

(۲) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَیْنَا بِدُوْنِ مَسْئَلَةٍ وَّلَا سُؤَالٍ جو بغیر سوال بغیر مانگے ہوئے ہم پر مہربانی کردے۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بغیر مانگے عطا فرمائی ہیں۔ جیسے ہمارا ایمان محض حق تعالیٰ کا کرم ہے، اس میں ہماری کسی محنت کا دخل نہیں، عالمِ ارواح میں ہم بے زبان تھے، ہم نے سوال نہیں کیا تھا کہ اے اللہ! ہمیں مسلمان کے گھر میں پیدا کیجئے لیکن بدون طلب اور بدون سوال مسلمان کے گھر میں پیدا کر کے ایمان عطا فرمادیا اور مفت میں جنت کا ٹکٹ دے دیا۔ اسی طرح ہر لمحہ بے شمار افضال وعنایات بدون سوال عطا فرما رہے ہیں۔

(۳) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَیْنَا فَوْقَ مَاتَتَمَنّٰی بِهٖ یعنی جو ہماری تمناؤں سے زیادہ دے دے۔ جیسا ایک کریم سے کسی نے ایک بوتل شہد مانگا۔ اس نے ایک مشک دے دیا۔ کسی نے کہا کہ اس نے تو ایک بوتل مانگا تھا۔ آپ نے پوری مشک کیوں دی؟ کہا کہ اس نے مانگا تھا اپنے ظرف کے مطابق میں نے دیا اپنے ظرف کے مطابق۔ جب دنیوی کریموں کا یہ حال ہے جن کو کرم کی ایک ذرہ بھیک مل گئی ہے تو اس کریم حقیقی کے کرم کا کیا ٹھکانہ ہے۔

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
دریا بہا دیئے ہیں در بے بہا دیئے ہیں

(۴) اَلْمُتَفَضِّلُ عَلَيْنَا وَلَا يَخَافُ نَفَادَ مَا عِنْدَهٗ کریم وہ ہے جو ہمیں بے انتہا عطا فرمادے اور اپنے خزانوں کے ختم ہونے کا جسے اندیشہ نہ ہو کیونکہ غیر محدود خزانوں کا مالک ہے اور اپنے خزانوں سے بے نیاز ہے ہمارے لیے ہی وہ خزانے ہیں۔ (معارفِ مثنوی، صفحہ: ۹۷)

محبت کی کرامت ہے کہ سلطان گدا اور گدا سلطان ہورہے ہیں

محبت کی اختر کرامت تو دیکھو
کہ سلطان ہو کر گدا ہو رہے ہیں

جب اللہ تعالیٰ اپنی محبت کسی کے دل میں ڈالتے ہیں تو پھر وہ اس کی خاطر اپنی سلطنت وحکومت بھی قربان کردیتا ہے اور حکومت چھوڑ کر فقیری اختیار کرنا پسند کرتا ہے جیسا کہ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں حضرت والا کے مواعظ وتصنیفات میں حضرت سلطان شاہ ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا قصہ خاص طور پر اس سلسلے میں مذکور ہے معارف مثنوی، صفحہ: ۱۴۱ پر بھی یہ قصہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت سلطان ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو صورت یہ پیش آئی کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ رات کو بالا خانے پر سورہے تھے کہ اچانک پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی گھبرائے کہ رات کے وقت شاہی بالا خانے پر کون لوگ ایسی جرأت کرسکتے ہیں دریافت فرمایا کہ اے واردین کرام آپ کون لوگ ہیں؟ یہ فرشتے تھے جو حق تعالیٰ کی طرف سے غفلت زدہ دل پر چوٹ لگانے آئے تھے۔فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم یہاں اپنا اونٹ تلاش کررہے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ حیرت ہے کہ شاہی بالا خانہ پر اونٹ تلاش کیا جارہا ہے۔ ان حضرات نے جواب دیا کہ ہمیں اس سے زیادہ حیرت آپ پر ہے کہ اس نازپروری اور عیش میں خدا کو تلاش کیا جارہا ہے اور شاہی تخت پر حق تعالیٰ کی ملاقات کی تمنا کررہے ہو یہ کہہ کر وہ رجالِ غیب تو غائب ہوگئے لیکن بادشاہ کے دل پر ایسی چوٹ لگ گئی کہ ملک وسلطنت سے دل سرد ہوگیا اور عشق حقیقی نے حضرت ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو ترک سلطنت پر مجبور کردیا اور عشق کائنات کی تمام لذتوں سے دل کو بیزار کردیا آخر کار آدھی رات کو بادشاہ اٹھا کنبل اوڑھا، اور اپنی سلطنت سے نکل پڑا سوزِ عشق کی ایک آہ نے زندانِ سلطنت کو پھونک دیا اور دستِ جنوں کی ایک ضرب نے گریبانِ ہوش کے پرزے اڑادیئے اور سلطنت بلخ ترک کر کے حضرت ابراہیم بن ادہم نیشاپور کے صحرا میں ذکر حق اور نعرائے عاشقانہ بلند کرنے میں مشغول ہوگئے ۔

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو بغیر ریاضت ومجاہدے کے شاہ بلخ کا کام بن گیا بلخ کی سلطنت تو چھڑادی لیکن ایسی باطنی سلطنت عطا فرمادی کہ جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بلکہ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بے حقیقت ہوگئے۔شاہ کوخود بھی خبر نہ تھی کہ سلطنت کا سرسبز وشاداب باغ آتش عشق حقیقی کی نذر ہونے والا ہے،کوڑیاں چھن کر جواہرات عطا ہونے والے ہیں اور خارستان سوختہ ہوکر چمنستان بےخزاں بننے والا ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ دس برس تک صحرائے نیشاپور میں دیوانہ وار عبادت میں مصروف رہے اور ترک سلطنت کے نتیجہ میں جو نعمت ملی اور صحرا میں دریا کے کنارے ذکر وعبادت کی جو حلاوت ان کے باطن کو عطا ہوئی اس کا لطف انہی سے پوچھنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ ظاہری سلطنت کے ترک سے حق تعالیٰ کے قرب کی سلطنت لازوال حاصل ہوگئی۔ (معارفِ مثنوی،صفحہ:۴۱تا۴۵)

مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

ان کی جانب رفتہ رفتہ لے چلا
مری کشتی کا مرا غم ناخدا

خونِ حسرت پی کے وہ عشرت ملی
عیش دو عالم ہوا جس پر فدا

میری حسرت کی بہاروں کو نہ پوچھ
اہلِ عشرت بن گئے میرے گدا

سب کی عشرت دل سے باہر ہو گئی
میری حسرت میرے دل میں ہے سدا

بے وفا عشرت ہے یا حسرت ہے میر
سوچ کر خود فیصلہ کر لو ذرا

ان کی رحمت میر پر سایہ فگن
گو بظاہر میر ہے غم میں پڑا

خواجگی ان کی ہماری بندگی
جس طرح پالے تو ان پر رہ فدا

خنجرِ تسلیم سے اے دوستو
ہو رہی ہے غیب سے صد جاں عطا

اہلِ ظاہر کو خبر اس کی نہیں
جانِ حسرت کو ہے جو عشرت عطا

عشرتیں تو دشمنوں کو بھی ملیں
عاشقوں کو اپنا غم بخشا سدا

ساری دنیا کے مزے فانی ملے
غیر فانی مجھ کو تیرا غم ملا

قبر کی جانب ہیں جن کی منزلیں
مستند ان کو نہ تو اپنا بنا

دشمنوں کو عیشِ آب و گِل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا

ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ رفتہ رفتہ: آہستہ آہستہ۔ **غم**: گناہوں سے بچنے میں دل پر جو غم گذرتا ہے وہ مراد ہے۔ **ناخدا**: کشتی چلانے والا۔ **خونِ حسرت**: حرام خواہشات کا خون۔ **عشرت**: خوشی۔ **عیشِ دوجہاں**: دونوں جہاں کا مزا۔ **خواجگی**: بادشاہت۔ **خنجرِ تسلیم**: اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی مرضی کو فنا کر دینا۔ **اہلِ ظاہر**: ظاہری حالات کو دیکھنے والے۔ **مستند**: سہارا۔ **آب و گل**: پانی و مٹی۔ **دردِ دل**: دل پر درد اٹھا کر اللہ کی نافرمانی سے بچنا۔ **طُغیانی**: طوفان۔ **ساحل**: کنارا۔

میرا غم میری کشتی کا ناخدا ہے

ان کی جانب رفتہ رفتہ لے چلا
مری کشتی کا مرا غم ناخدا

جس طرح سمندر میں چلنے والی کشتی کو اس کا ناخدا اور ملاح ساحل تک پہنچاتا ہے اور ہر طرح کے خطرات سے کشتی اور کشتی والوں کو بچا کر سمندر پار کرا دیتا ہے اسی طرح حضرت والا فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت

کا جو غم عطا فرمایا ہے وہ بڑی عافیت اور آسانی کے ساتھ مجھے میری منزل مقصود یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا تک لے کر چلا گیا اور میں نے یہ دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے کا غم اور مجاہدہ کس قدر تیزی کے ساتھ انسان کو اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے جب کہ بصورت دیگر گرچہ بندہ مومن کچھ نیک کام کرتا بھی رہے اور گناہوں کی حرام لذتوں سے کبھی کبھار مزے بھی لوٹتا رہے، ان سے بچنے کا غم اٹھانے کا اہتمام نہ کرے تو پھر اس کی کشتی طوفان کی موجوں میں پھنسی رہتی ہے جلد ساحل پر نہیں لگتی اور اسی طرح ایسے سالک کی ساری عمر الجھنوں اور پریشانیوں میں گزر جاتی ہے۔

خونِ حسرت عشرتِ دو جہاں کا ضامن ہے

خونِ حسرت پی کے وہ عشرت ملی
عیش دو عالم ہوا جس پر فدا

ظاہر بات ہے کہ جب دنیا کی لذتیں انسان کی فطرت میں رکھی گئیں اور طبیعتوں کا میلان اور رجحان بشری تقاضے کے تحت خواہشات کی طرف پایا گیا تو پھر اس جانب سے طبیعت کو روکنا دل میں حسرت اور رنج تو ضرور پیدا کرے گا اور طبیعت پر بوجھ اور دشواری تو ضرور آئے گی جس کو اس حدیث شریف میں ذکر کیا گیا ہے جس میں جنت کو طبیعت کی ناپسندیدہ اور ناگوار چیزوں سے گھیرے جانے کا ذکر ہے اور جہنم کو مرغوب طبع اور مستلذات نفس اشیاء سے احاطہ کیا جانا مذکور ہے لیکن جو آدمی اس ناگواری اور رنج وحسرت کو اٹھا لے گا تو پھر اسے دنیا میں بھی عیش اور آرام نصیب ہوگا اور آخرت کی عافیت وراحت بھی اس کا مقدر بنے گی۔

اور بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یوں کہیے کہ اس حسرت کے عوض اس کو خالق دو جہاں مل جائیں گے جو کہ ایسی عظیم الشان نعمت ہے کہ اس پر دونوں جہاں کا عیش وآرام بھی قربان کر دیا جائے اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اہل اللہ کو دنیا میں ہی جنت کا مزہ نصیب ہو جاتا ہے جیسا کہ احقر نے دوسرے مقامات پر یہ بات تفصیل سے نقل کی ہے۔ اور پھر عیش دو جہاں ان کی نظروں میں گر چکا ہوتا ہے۔

اہلِ عشرت اہلِ حسرت کے گدا بن جاتے ہیں

میری حسرت کی بہاروں کو نہ پوچھ
اہلِ عشرت بن گئے میرے گدا

اس شعر کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ جب کوئی اللہ کا ہو جائے گا تو پھر سارا عالم اس کا ہو جائے گا جو بندہ راہ خداوندی میں ہر طرح کے غم اور مجاہدے اٹھائے گا تو قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر یہ وعدے مذکور ہیں کہ اہل دنیا کو اللہ تعالیٰ اس کا خادم بنا دیں گے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے قدموں میں آئے گی ہر طرف سے اہل دنیا اس کا اعزاز واکرام کریں گے اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ جو اہل عشرت دنیا ہیں وہ سب ایسے رجال اللہ کے گدا بن

جائیں گے جیسا کہ کتاب میں دوسرے مقامات پر یہ مضمون تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ تو ہمارے لیے اس شعر میں یہ سبق موجود ہے کہ کچھ دن کے لیے دنیا کے فانی عیش وعشرت کو چھوڑ دو اور اس راہ سلوک میں چل کر نا موافق طبیعت چیزوں کو اللہ کی رضا کے لیے گوارا کر لو پھر تمہیں دنیا وآخرت کا ہر طرح کا عیش وآرام میسر آجائے گا۔

صاحبو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیَنَا وَجَوَارِحَنَا بِیَدِکَ لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْهَا شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ذٰلِکَ بِنَا فَکُنْ اَنْتَ وَلِیَّنَا وَاهْدِنَا اِلٰی سَوَآءِ السَّبِیْلِ﴾

(کنز العمال)

یعنی کائنات کے بسنے والے تمام انسانوں کے دل اور تمام اعضاء وجوارح اور پیشانیاں اور چہرے سب اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس پر قدرت اور اختیار نہیں دیا خود ہر آدمی کے اپنے دل دماغ اور اعضاء وجوارح بھی اس کے قبضے میں نہیں ہیں یعنی کہ ان کو خود بندہ جس طرف پھیرنا اور لگانا چاہے تو یہ اس کے بس سے باہر کی بات ہے ہر عضو انسانی کا رخ اسی سمت میں ہوگا جس سمت کے لیے مشیت باری تعالیٰ اس کے ساتھ ہوگی۔

عمل میں اخلاص کی ایک خاص حکمت

تو کیا اس میں ہمارے لیے یہ سبق نہیں ہے کہ ہم اپنے ہر قول وفعل سے اور ہر ادائے بندگی سے پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو حاضر رکھتے ہوئے صرف اسی ایک اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اگر ہم نے اس کو راضی کر لیا تو وہ خود لوگوں کے قلوب ہماری طرف پھیر دے گا اور ان کے دلوں میں ہماری عزت پیدا فرمادے گا ہمیں خود اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہماری فکر کا مرکز ومحور صرف ایک اللہ کو راضی کرنا ہو جس کی مشیت اور چاہت کے بغیر روئے زمین پر کوئی ایک پتہ بھی نہیں ہلتا یہی تو راز ہے اس مسئلے کا کہ بغیر ان شاء اللہ کے کسی کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں کچھ کرنے کی بات کہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(سورۃ الکہف)

ترجمہ: (ہر ہر کام میں اس کا لحاظ رکھئے کہ) آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو (مثلاً) کل کر دوں گا مگر خدا کے چاہنے کو (اس کے ساتھ) ملا دیا کیجئے (یعنی ان شاء اللہ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجئے) (معارف القرآن، جلد: ۵، صفحہ: ۵۷۰)

لباب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پہلی دو آیتوں کے شانِ نزول کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ جب اہلِ مکہ نے یہود کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصۂ اصحابِ کہف وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ بغیر ان شاء اللہ کہے ہوئے کر لیا تھا۔ مقربین

بارگاہ کی ادنیٰ سی کوتاہی پر تنبیہ ہوا کرتی ہے، اس لیے پندرہ روز تک وحی نہ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا غم ہوا، اور مشرکین مکہ کو ہنسنے اور مذاق اُڑانے کا موقع ملا۔ پندرہ روز کے اس وقفہ کے بعد جب اس سورۃ میں سوالات کا جواب نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ دو آیتیں ہدایت دینے کے لیے نازل ہوئیں کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کو کہنا ہو تو ان شاء اللہ کہہ کر اس کا اقرار کر لیا کریں کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے۔ ان دونوں آیتوں کو قصۂ اصحابِ کہف کے ختم پر لایا گیا ہے۔

اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں ان شاء اللہ کہنا مستحب ہے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے تو جب یاد آجائے اسی وقت کہہ لے۔

بعض لوگ جو یوں کہہ دیتے ہیں کہ اگرچہ میں نے ان شاء اللہ نہیں کہا لیکن میری مراد یہی ہے تو اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس آیت کا منشا اور مقصد زبان سے ان شاء اللہ کہنا ہے محض دل میں ان شاء اللہ رکھنا نہیں ہے اس لیے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان شاء اللہ نہ کہہ سکے تھے اور اس پر ایک طویل مدت کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع رہا ظاہر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں تو ان شاء اللہ تھا اور ہم سے زیادہ قوتِ یقین اور وثوق و اعتماد کے ساتھ مستحضر تھا مگر پھر بھی مذکورہ بالا حکم دیا گیا جس کا مطلب صاف یہ ہوا کہ زبان سے ان شاء اللہ کہنا مراد ہے۔

تو میرا منشا یہ بات عرض کرنے سے یہ ہے کہ اہل دنیا کے قلوب جب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں تو پھر جو اہل حسرت ہیں ان کے لیے اہل عشرت کو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کا خادم اور گدا بنا ہی دیا جائے گا۔ چنانچہ رات دن ہم اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ اللہ والوں کی خدمت میں بڑے بڑے دولت و ثروت والے لوگ نیازمندانہ اور عاجزانہ حاضری دیتے رہتے ہیں۔

عشرتیں بے وفا ہیں یا حسرتیں

سب کی عشرت دل سے باہر ہو گئی
میری حسرت میرے دل میں ہے سدا
بے وفا عشرت ہے یا حسرت ہے میرؔ
سوچ کر خود فیصلہ کر لو ذرا

حضرت والا نے عشرت و حسرت کا تقابل کر کے بڑے انوکھے اور پیارے انداز سے یہ تعلیم دی ہے کہ اے مسلمانو! تم دنیا کے عیش و عشرت کے پیچھے مت پڑو بلکہ انبیاء اور اولیاء کی وراثت جو کہ اللہ کے دین کا غم اور اس کے راستے کی حسرتیں ہیں ان کو حاصل کرنے کی فکر کرو کیونکہ وہ تمہاری وفادار دوست ہیں جو دنیا میں بھی چوبیس گھنٹہ ہر وقت ساتھ رہتی ہیں اور یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے بھی قبر و حشر و نشر اور حساب و کتاب کے وقت ہر جگہ

تمہارے ساتھ ہونگی اور جہنم سے بچانے اور جنت دلانے کے کام آئیں گی۔

جب کہ دنیا کی عشرتیں اس قدر بے وفا ہیں کہ یہاں جیتے جی دنیا میں بھی بسا اوقات سب طرح کے اسباب عیش ہوتے ہیں مگر قلب کو عیش میسر نہیں آتا اور اسباب عیش ہر وقت ہمارے ساتھ اندرونی صفت اور کمال بن کر کے نہیں بلکہ خارج اور باہر کی ایک چیز کی حیثیت سے ساتھ ہوتے ہیں جیسے ہی ہم دنیا سے رخصت ہوئے سب کی سب عیش وعشرت کی چیزیں یہیں رکھی رہ جائیں گی اور دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی نہ قبر وحشر میں کام آنے والی نہ ہی حساب وکتاب کے دن نفع دینے والی تو اب حضرت والا فرماتے ہیں کہ خود ہی فیصلہ کر کے دیکھ لو کون باوفا ہے کون بے وفا؟ اور کس کو لینا چاہیے اور کس کو چھوڑنا چاہیے؟

دنیا کا عیش وعشرت جسم کے ظاہر کو آرام پہنچاتا ہے اور اللہ کی محبت کا غم قلب وروح کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے اور جسم انسان کے مرتے ہی ختم اور فنا ہوجاتا ہے لیکن روح باقی رہتی ہے تو جو روح کے اوصاف اچھے یا برے ہوں وہ بھی ساتھ جاتے ہیں اسلیے مومن کا ایمان اور کافر کا کفر اسی طرح متقی کا تقویٰ اور فاسق کا فسق مرنے کے بعد بھی اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کے آخرت میں درجات طے ہوتے ہیں اس لیے کہ موت کی حقیقت روح کا جسم سے علیحدہ ہوجانا ہے فنا ہوجانا نہیں۔ بالفاظِ دیگر انسان کا اس عالم دنیا اور اس کے خواص سے جدا ہو کر دوسرے عالم عالم برزخ میں اس کے احکام کے ساتھ منتقل ہوجانا ہے اسی لیے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ایک بیان میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ انسان ازلی تو نہیں لیکن ابدی ہے یعنی ازل سے تو نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے معدوم تھا پھر وجود میں آیا مگر ابدی ضرور ہے کہ اب وجود میں آجانے کے بعد کبھی ختم نہیں ہوگا یہ الگ بات ہے کہ جنتی کو جنت میں اور جہنمی کو جہنم میں رہنا ہے مگر دونوں کو دونوں جگہوں میں ہمیشہ رہنا ہے لہٰذا عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ جو چیز آپ کی وفادار ہے اس کو اپنا دوست بناؤ اور اس کو قریب لگاؤ اور اسے حاصل کرنے کی فکر کرو اور اس کے لیے جان توڑ محنت کرو نہ کہ اس کے لیے کہ جس میں بے وفائی کا داغ لگا ہوا ہے حقیقت میں یہی عقل مندی اور سمجھداری ہے۔

عیش وعشرت کی بے وفائی کا عالم تو یہ ہے کہ ساٹھ ستر سال کا رات ودن کے خون پسینے سے کمایا ہوا مال و دولت اور بنایا ہوا بنگلہ اور محل اور خریدا ہوا عمدہ فرنیچر اور گاڑیاں انسان کی روح نکلتے ہی یک دم اس سے علیحدہ اور جدا ہوجاتے ہیں اور موت بھی ایک ایسا معاملہ ہے کہ بقول ہمارے حضرت والا جس کا ویزا ناقابل توسیع اور نامعلوم المیعاد ہے، ایک سال کی توسیع تو دور کی بات ہے ایک لمحہ کی بھی توسیع نہیں کی جاتی اسی طرح دس بیس سال زندہ رہنے کی گارنٹی تو کیا مستقبل کے ایک لمحہ کا بھی علم نہیں ہوتا تو ایسے ناقابل اعتماد اور بے وفا عیش وعشرت کے گھر کو اپنا گھر بنا کر زندگی گزارنا سمجھداری نہیں ہے۔

اللہ والے ظاہر میں غمزدہ ہیں اور باطن میں پُرسکون ہیں

ان کی رحمت میر پر سایہ فگن
گو بظاہر میر ہے غم میں پڑا

حضرت والا میر بول کر ایک مسلمان سامع اور سالک مراد لیتے ہیں یعنی جو سالک اللہ تعالیٰ کے راستے میں غم اور تکلیف اٹھا رہا ہو تو گو کہ وہ صورۃً کچھ غم زدہ نظر آئے اور اداس محسوس ہو اور بظاہر کچھ ناموافق طبع ناسازگار حالات میں مبتلا ہو جن میں نفس کو خوشی نہیں ملتی مگر یہ سب کچھ تو اس کا ظاہر ہے لیکن حقیقت میں ایسا سالک مردِ مومن اللہ کی رحمت کے سائے تلے ہوتا ہے اور جو شخص نفس کو حرام مزوں میں مبتلا کر کے ظاہری خوشیوں میں مگن دکھائی دے رہا ہو وہ اللہ کی رحمت کے بجائے اس کی لعنت کے سائے میں ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت سے پتہ چلتا ہے:

﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ م بِالسُّوْٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ إِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

(سورۃ یوسف، آیۃ:۵۳)

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو (بھی بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو (ہر ایک کا) بُری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے۔ (معارف القرآن، جلد۵، صفحہ۲۷)

اس لیے آیت مذکورہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی براءت کے اظہار کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا کہ میرا یہ کہنا کچھ اپنے تقویٰ اور پاکبازی کا جتلانا نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کا نفس جس کا خمیر چار عنصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنا ہے وہ تو اپنی فطرت سے ہر شخص کو بُرے ہی کاموں کی طرف مائل کرتا رہتا ہے۔ بجز اس کے جس پر میرا رب اپنی رحمت فرما کر اس کے نفس کو بُرے تقاضوں سے پاک کر دے، جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، اور ایسے ہی نفوس کو قرآن میں نفسِ مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایسے ابتلاءِ عظیم کے وقت میرا گناہ سے بچ جانا یہ کوئی میرا ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت اور دستگیری کا نتیجہ تھا، اگر وہ میرے نفس سے رذیل خواہشات کو نہ نکال دیتے تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا جیسے عام انسان ہوتے ہیں کہ خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

جس سے حضرت والا یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں 'ما' مصدریہ ظرفیہ زمانیہ ہے اَیْ فِیْ وَقْتِ رَحْمَةِ رَبِّیْ اسی طرح اس دعا نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ بِتَرْكِ الْمَعَاصِیْ" سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ معصیت میں مبتلا شخص سایۂ رحمت میں نہیں ہو سکتا ہے اس لیے معصیت کا ترک سایۂ رحمت کیلیے لازم اور ضروری ہے۔ تو جیسے کوئی بدنظری کا گناہ کر رہا ہو اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور لعنت رحمت کی ضد ہے تو جو لعنت کے سائے میں ہوگا وہ رحمت کے زیرِ سایہ نہیں ہو سکتا اس لیے گناہوں سے بچ کر اگرچہ ظاہری کچھ غم پیش آئے مگر بندہ اللہ کی رحمت کے سائے میں ہو جاتا ہے۔

اس پر حضرت والا کا ایک قیمتی ملفوظ یاد آیا کہ ارشاد فرمایا کہ ماں کی گود سے بچہ تو چھینا جا سکتا ہے مگر کون مائی کا لعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت پر کنجی تو لگا دے۔

خواجگی ان کی ہماری بندگی
جس طرح پالے تو ان پر رہ فدا

اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے سامنے بندہ کی بندگی کا تقاضہ یہی ہے کہ جو بھی حق تعالیٰ کا حکم سامنے آئے اس پر دل و جان سے فدا رہے بجز اس کے بندہ اپنی ادائے بندگی میں ناقص اور نا تمام قرار دیا جائے گا جس راہ سے بھی ہو اور جس طریق سے بھی ہو ہمارا کام صرف اپنے اللہ پر فدا ہونا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے کوئی صبر آزما حالت ڈالی تو ہم بذریعہ صبر اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے اور خوشی و مسرت اور وسعت و کشادگی والے حال میں ہمیں رکھا تو ہم بذریعہ شکر اپنے اللہ کو یاد کریں گے مگر جس طرح بھی ہو جو بھی صورت ہو ہمارا کام یہی ہے کہ ہماری نظر اپنے اللہ کے اوپر ہو۔

تسلیم و رضا کی بہار اور جانِ حسرت کو عطائے عشرت

خنجرِ تسلیم سے اے دوستو
ہو رہی ہے غیب سے صد جاں عطا

تسلیم و رضا مومن کی زندگی کا قیمتی جوہر ہے جو ایمان والا جتنے درجے میں اس وصف سے متصف ہو تو اسے جینے کا وہ مزہ حاصل ہوگا جس کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگی کیونکہ جب اپنے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہے گا تو کبھی غم زدہ و پریشان نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ہر لمحہ ایسی پرسکون حیات اور ایسی فرحت بخش زندگی عطا ہوگی کہ اس کی زندگی ہزاروں زندگیوں کے لیے قابلِ رشک ہو جائے گی اور اسے جینے کا ایسا مزہ حاصل ہوگا کہ گویا اس کی ہان کو سینکڑوں جان عطا ہو رہی ہے اور ہزاروں زندگیوں کو اکھٹا کر کے بھی وہ لطف اور مزہ نہیں ہوگا جو کہ اسے حاصل ہو رہا ہوگا اسی کو حضرت نے فرمایا ہے کہ اس کو غیب سے صد جاں عطا ہو رہی ہوگی۔

اہلِ ظاہر کو خبر اس کی نہیں
جانِ حسرت کو ہے جو عشرت عطا

ظاہر میں دیکھنے والے لوگ، ایسے بے سر و سامانی کے عالم میں جینے والے اللہ والوں کو جو پھٹے پرانے کپڑوں میں بوریا نشین رہتے ہیں اور صحراؤں، پہاڑوں اور بیابان اور جنگلوں جیسے مناظر میں یادِ خداوندی کے جلووں سے ان کو رشکِ گلستاں کئے ہوئے ہوتے ہیں وہاں اسبابِ عیش و عشرت نظر نہ آنے کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کوئی سکون زندگی اور لطفِ حیات نصیب نہیں ہے حالانکہ جو دل اندر اندر مزے لوٹ رہا ہوتا ہے اور جانِ حسرت کو جو عشرت ملی ہوتی ہے اس کی ان اہلِ ظاہر کو ہوا بھی نہیں لگتی۔

دنیا کی عیش و عشرت نصیبِ دشمناں ہے

عشرتیں تو دشمنوں کو بھی ملیں
عاشقوں کو اپنا غم بخشا سدا
ساری دنیا کے مزے فانی ملے
غیر فانی مجھ کو تیرا غم ملا
قبر کی جانب ہیں جن کی منزلیں
مستند ان کو نہ تو اپنا بنا
دشمنوں کو عیشِ آب و گِل دیا
دوستوں کو اپنا دردِ دل دیا
ان کو ساحل پر بھی طغیانی ملی
مجھ کو طوفانوں میں بھی ساحل دیا

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلدُّنْیَا دَارٌ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ وَ مَالٌ مَنْ لَّا مَالَ لَهٗ وَلَهَا یَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَهٗ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق)

کہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں اور دنیا کو وہ شخص جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں یعنی دنیا کو بے وقوف اور بے عقل آدمی جمع کرتا ہے یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ ہیں اور محدثین نے اس کی دو تشریح بیان فرمائی ہیں کہ یہ دنیا ان کافروں مشرکوں کا گھر ہے جن کو آخرت میں کوئی گھر نصیب ہونے والا نہیں ہے بلکہ ان کو جو کچھ ملنا ہے یہیں دنیا میں مل جائے گا اور ان کا آخرت میں کوئی مال بھی نہیں ہے ان کی جنت یہی دنیا ہے جب وہ آخرت میں پہنچیں گے تو ان سے وہاں یوں کہا جائے گا:

﴿اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیٰوتِكُمُ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾

(سورۃ الاحقاف، آیۃ: ۲۰)

ترجمہ: تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے (یہاں کوئی لذت تم کو نصیب نہیں ہوگی) اور انکو خوب برت چلے (حتیٰ کہ ان میں پڑ کر ہم کو بھی بھول گئے) سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی۔

تم نے دنیا میں اپنے سارے مزے لوٹ لیے اور وہیں دنیوی زندگی میں سب لطف اٹھا لیے یہاں تم کس چیز کی امید اور تلاش میں ہو اب یہاں تمہارے لیے کسی قسم کی راحت و آرام کا سوال نہیں۔ چنانچہ ایسے

لوگوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں خوب ڈھیل دیتے ہیں تا کہ وہ اس فانی و عارضی لذت سے اپنا حصہ حاصل کرلیں گناہوں میں پڑ کر ہر طرح کے عیش و عشرت کی زندگی گزار کر دنیا میں وہ کچھ لذت اٹھا لیتے ہیں مگر یہ عارضی لذتیں سکون قلبی سے خالی ہوتی ہیں:

﴿وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ﴾

(سورۃ الشوریٰ، اٰیۃ ۲۰)

ترجمہ: اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو (یعنی سارے عمل و سعی کا مقصد دنیا کی متاع ہو) آخرت کے لیے کچھ کوشش نہ کرے) تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دیدیں گے اور آخر میں اس کو کچھ حصہ نہیں۔

دوسرا اس کا معنی اور مطلب یہ ہے کہ دنیا کو گھر سمجھنے والو! حقیقت میں یہ گھر کہلانے کے قابل نہیں اور اس کا مال حقیقت میں مال کہلانے کے قابل نہیں سو جس کے پاس اس دنیا میں دار اور مال ہے تو بھی سمجھے کہ لَا دَارَ لَهُ وَلَا مَالَ لَهُ اس کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر تو دار اور مال عیش و آرام کی چیزیں ہیں لیکن یہی انسان اللہ تعالیٰ کا نافرمان بن کر اس عیش کو طیش میں بدل دیتا ہے اور سامان راحت کو سامان مصیبت بنا لیتا ہے اور چونکہ اس دار و مال کے فائدے عارضی اور فانی ہیں اس لیے اس عیش و عشرت کی اللہ کی نگاہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں اصل لطف حیات دو جہاں انبیاء و اولیاء کو حاصل ہوا ہے جو نتیجہ ہے اس درد محبت کا جس کو اللہ نے اپنے دوستوں کا نصیبہ بنایا جو انبیاء و اولیاء کی سنت رہی ہے کہ وہ سب کے سب حاملین درد محبت خداوندی تھے جس کے نتیجہ میں انسان بارگاہ خداوندی میں آہ و زاری کرتا ہے اور حالت سجدہ میں اس طرح اس کی چشم اشک بار ہوتی ہے کہ رحمت خداوندی کا آبشار اس کے سر پر ہوتا ہے یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے جو اللہ اپنے محبوبین ہی کو عطا فرماتے ہیں جب کہ دنیا کے ساز و سامان اور اسباب عیش و عشرت کی محبت اللہ تعالیٰ دشمنوں کو عطا کرتے ہیں اور اپنے دوستوں کو اس سے بچا کر رکھتے ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے:

﴿إِذَا أَحَبَّ اللهُ عَبْدًا حَمَاهُ الدُّنْيَا كَمَا يَظَلُّ أَحَدُكُمْ يَحْمِيْ سَقِيْمَهُ الْمَاءَ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الطب، باب ما جآء فی الحمیة)

کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو دنیا کی محبت اور عیش و عشرت سے ایسا بچا لیتے ہیں جس طرح تم اپنے استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو باوجود یہ کہ تمہارا وہ مریض تم سے پانی مانگتا ہے لیکن تم پانی کو اس بیماری میں اس کے لیے مضر اور نقصان دہ سمجھتے ہو اس لیے بالکل نہیں دیتے۔

اللہ کا درد محبت نصیبِ دوستاں ہے

چنانچہ قرآن کریم اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۝

(سورۃ طٰہٰ ۱۳۱)

ترجمہ:اور ہرگز اُن چیزوں کی طرف آپ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جیسا اب تک بھی نہیں دیکھا) جس سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو (مثلاً یہود و نصاریٰ و مشرکین کو) اُن کی آزمائش کے لیے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے (مطلب اوروں کو سنانا ہے کہ جب معصوم نبی کے لیے یہ ممانعت ہے جن میں احتمال بھی نہیں تو غیر معصوم کو تو اس کا اہتمام کیونکر ضروری نہ ہوگا، اور آزمائش یہ کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے) اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا (اس سے) بہتر اور دیرپا ہے (کہ کبھی فنا ہی نہ ہوگا)

(معارف القرآن، جلد:۶، ص۱۶۴-۱۶۵)

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور دراصل ہدایت کرنا اُمت کو ہے کہ دنیا کے مالداروں، سرمایہ داروں کو قسم قسم کی دنیوی رونق اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہیں، آپ ان کی طرف نظر بھی نہ اُٹھایئے کیونکہ یہ سب عیش فانی اور چندروزہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جو نعمت آپ کو اور آپ کے واسطے سے مؤمنین کو عطا فرمائی ہے وہ بدرجہا اُن کی اس چندروزہ رونقِ حیات سے بہتر ہے۔

دنیا میں کفار و فجار کی عیش و عشرت اور دولت و حشمت ہمیشہ ہی سے ہر شخص کے لیے یہ سوال بنتی رہی ہے کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مبغوض اور ذلیل ہیں تو اُن کے پاس یہ نعمتیں کیسی اور کیوں ہیں؟ اور طاعت شعار مؤمنین کی غربت و افلاس کیوں؟ یہاں تک کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے عالی قدر بزرگ کو اس سوال نے متاثر کیا جس وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے خاص حجرہ میں داخل ہوئے جس میں آپ خلوت گزیں تھے اور یہ دیکھا کہ آپ ایک موٹی موٹی تیلیوں کے بوریئے پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان تیلیوں کے نشانات آپ کے بدن مبارک پر کھڑے ہوگئے ہیں تو بے اختیار رو پڑے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ کسریٰ و قیصر اور اُن کے امراء کیسی کیسی نعمتوں اور راحتوں میں ہیں اور آپ ساری مخلوق میں اللہ کے منتخب رسول اور محبوب ہیں اور آپ کی معیشت کا یہ حال ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابن خطاب! کیا تم اب تک شک و شبہ میں مبتلا ہو۔ یہ لوگ تو وہ ہیں جن کی لذّات و محبوبات اللہ نے اسی دنیا میں اُن کو دے دی ہیں، آخرت میں ان کو کوئی حصہ نہیں۔ وہاں عذاب ہی عذاب ہے (اور مؤمنین کا معاملہ برعکس ہے) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی زینت اور راحت طلبی سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق زندگی کو پسند فرماتے تھے۔ باوجودیکہ آپ کو پوری قدرت حاصل تھی کہ اپنے لیے بہتر سے بہتر راحت کا سامان جمع کرلیں اور جب کبھی دنیا کی دولت آپ کے پاس بغیر کسی محنت مشقت اور سعی و طلب کے آبھی جاتی تھی تو فوراً اللہ کی راہ میں غرباء و فقراء پر اس کو خرچ کرڈالتے تھے اور اپنے واسطے کل کے لیے بھی کچھ باقی نہ چھوڑتے

تھے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمْ مَا یَفْتَحُ اللّٰہُ لَکُمْ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا﴾

(ابن کثیر)

یعنی مجھے تم لوگوں کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف اور خطرہ ہے وہ دولت و زینتِ دنیا ہے جو تم پر کھول دی جائے گی۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو پہلے ہی یہ خبر بھی دے دی ہے کہ آئندہ زمانے میں تمہاری فتوحات دنیا میں ہوں گی اور مال و دولت اور عیش وعشرت کی فراوانی ہوجائے گی۔ وہ صورتِ حال کچھ زیادہ خوش ہونے کی نہیں بلکہ ڈرنے کی چیز ہے کہ اُس میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کے احکام سے غفلت نہ ہوجائے۔ (معارف القرآن، جلد ۶، صفحہ ۱۶۴-۱۶۵)

تو اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے متقی بندوں کے سینوں میں جو اپنا دردِ محبت ودیعت فرماتے ہیں پھر وہ ان کو عیش آب وگل سے بچالیتے ہیں گو کہ کبھی کبھی یہ اللہ کے نیک بندے دنیا کی چیزوں کے حصول کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں اور اس کے لیے سعی وکوشش بھی کرتے ہیں یہاں تک کہ دعاؤں میں بھی مصروف ہوتے ہیں مگر اس راہ سے ان کو کامیابی نہیں دی جاتی اور ان کو ان چیزوں سے بچایا جاتا ہے تاکہ ان کے دل ودماغ خالص ایک سمت پر لگے رہیں اور وہ اللہ کی یاد اور اس کے دین کی فکر ہے ہم اپنے ذہن کے اعتبار سے اس کو مقصد میں ناکامی کہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنی شانِ ربوبیت سے رحم وکرم کا معاملہ فرما کر ایسے اپنے خاص بندوں کو علائقِ دنیویہ سے دور رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ دنیا کی عیش وعشرت اصل میں اللہ نے دشمنوں کے لیے رکھی ہیں اور ان کو دنیا کے ان فانی مزوں میں لگا دیا ہے اور وہ عیش آب وگل میں ایسے مست ہوئے کہ آخرت کو بالکل بھول گئے جن کے متعلق قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ لوگ نہ تو ہماری ملاقات پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ وہ آخرت میں جزاء وسزاء کے قائل ہیں اور دنیوی زندگی پر ہی خوش ہو کر اسی پر مطمئن ہو بیٹھے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا﴾

(سورۃ یونس: ۷)

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو اللہ کی ملاقات پر یقین نہیں رکھتے، دنیا کی زندگی سے خوش ہوگئے اور اسی (فانی) زندگی سے مطمئن ہوگئے۔

عشرت وحسرت کی تقسیم پر ایک سوال اور جواب

اب کسی کے ذہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ایسی تقسیم کیوں اختیار فرمائی کہ دشمنوں کو سب کچھ دیا اور دوستوں کو محروم رکھا ان کو صرف اپنا دردِ دل عطا کر دیا تو حضرت والا نے آخری شعر میں اس کا جواب

ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے محبوب بندوں کے لیے دردِ دل اس لیے منتخب کیا تا کہ ان کو طوفانوں میں بھی ساحل کا مزہ دے دوں اور دشمن کو ساحل پر پہنچنے کے باوجود موجوں کی طغیانی میں پھنسے ہوئے انسان کی طرح بے قرار و بے چین رکھوں اور وہ لوگ اس طرح زندہ رہتے ہیں کہ ذہنی الجھنیں اور دماغی ٹینشن ان پر سوار رہ کر زندگی کے سارے عیش و نشاط کو مکدر کیے رہتا ہے گو کہ دیکھنے میں بڑے سکون میں نظر آتے ہیں مگر اندر میں ان کو سکون کی ہوا بھی نہیں لگتی۔

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو ظاہری اعتبار سے طوفانوں میں پھنسا ہوا رکھتے ہیں کہ کبھی فقر و فاقہ ہے، کبھی دنیوی مصائب کا سامنا ہے، کبھی مال و اولاد میں کوئی نقصان درپیش ہے، تو کبھی دین پر جمنے کی سزا میں جیلوں کا رخ کرنا پڑ رہا ہے، کبھی اللہ کی راہ میں پتھر کھانے پڑ رہے ہیں تو کبھی تلواریں گردن میں ڈالے خدا کے دشمنوں کے تعاقب میں بھوک و پیاس کے عالم میں چلنا پھرنا پڑ رہا ہے، کبھی اپنوں کی ملامت کا سامنا ہے تو کبھی غیروں کی طرف سے تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے لیکن یہ خدا کا سچا عاشق اور پکا دوست بال برابر بھی اپنے مولیٰ کے حکم سے پیچھے نہیں ہٹتا تو پھر اللہ تعالیٰ ان حالات کے طوفانوں میں بھی اس کے دل کو سکون کا گہوارا بنا دیتے ہیں اور ایسی حلاوتِ ایمانی دل کو عطا فرماتے ہیں کہ جس کے سامنے ساری دنیا کے مزے کوئی حیثیت نہیں رکھتے جب یہ ان ناگوار حالات میں اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے اور اس کو آہ و زاری کے ساتھ پکارتا ہے تو اسے قرب کا وہ عالم میسر ہوتا ہے کہ جس پر دو جہاں کا عیش قربان کر دیا جائے۔

اور پھر یہ تو اس بندے کا حال دنیا میں ہے آخرت کے جو مزے ہیں وہ تو اپنی جگہ پر ہیں بہر حال محبوب محبوب کے لیے اچھا ہی چاہتا ہے برا نہیں سو وہ انبیاء و اولیاء جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی رنگ رلیوں سے محفوظ فرما کر یہ بتا دیا کہ اے میرے بندو! میں تم کو کوڑیوں کے بدلے جواہرات دینا چاہتا ہوں اور خارستان کے بدلے چمنستانِ بے خزاں عطا کرنا چاہتا ہوں اور میں تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کرنا چاہتا جو میرا سلوک دشمنوں کے ساتھ ہے کہ میں نے اپنے دشمنوں کو دنیا کے عیش و عشرت میں ایسا مگن کر دیا کہ انہوں نے یہاں کے مزوں اور لذتوں کو ہی سب کچھ سمجھا اور مجھے بالکل بھول بیٹھے وہ اپنے اعلیٰ مکانات، شاندار بنگلے، خوبصورت گاڑیاں، لمبا چوڑا خاندان وغیرہ ان چیزوں میں الجھ کر رہ گئے اور انہوں نے سراب کو پانی سمجھا اور کانٹوں کو پھول سمجھا جیسا کہ اس کتاب میں مختلف مقامات پر بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا کے مزے سب فانی ہیں ان کے سہارے جینے والا نادان و ناسمجھ ہے اور ایسی حسین، حسیناؤں پر فریفتہ ہونے والا جن کی منزلیں قبر کی جانب ہیں اگر نادان اور بے وقوف نہیں تو پھر کون بے وقوف ہوگا ؎

لطف دنیا کے ہیں گئے دن کے لیے
کھو نہ جنت کے مزے ان کے لیے
یہ کیا اے دل تو بس پھر یوں سمجھ
تو نے ناداں گل دیئے تنکے لیے

ہم اپنی اولاد کے دوست ہیں یا دشمن؟

صاحبو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی نوع آدم میں سے اپنا سب سے زیادہ محبوب اور پیارا طبقہ انبیاء علیہم السلام کو قرار دیا ہے اس لیے ان کے لیے جس چیز کا انتخاب کیا ہے وہ بھی سب سے زیادہ پیاری اور محبوب شے ہے اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت وقعت وحیثیت رکھنے والی ہے اور وہ اپنا دردِ محبت ہے اور آخرت کا غم ہے اور دنیوی عیش وعشرت سے بچانا ہے اور آخرت کی دائمی راحتوں اور ہمیشہ کی جنتوں میں اپنی رحمت کے سائے تلے ان کو جگہ دینا ہے جہاں وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی ہوں گے اور جہاں کی خوشی اصل خوشی اور راحت حقیقی راحت ہوگی اگرچہ دنیا میں کچھ عارضی مدت کے لیے ان کو ظاہری آزمائشوں سے گزارا جاتا ہے۔

سو احقر بڑی وضاحت کے ساتھ سامعینِ مجلس سے یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ کیا ہم نے آج اپنی اولاد کے ساتھ محبوبوں والا سلوک کیا ہے یا دشمنوں والا سلوک؟ یعنی کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے دوستوں کے لیے اپنے دردِ محبت کا انتخاب کیا اور دشمنوں کو عیشِ آب وگِل دے کر اس میں لگا دیا تو کیا ہم نے بھی اپنی اولاد کے لیے آخرت کی دائمی راحت اور ہمیشہ کی جنت کا سامان تیار کیا ہے اور ان کو اس کی راہ دکھلائی ہے اور اپنے اور ان کے خالق و مالک اللہ کی ذاتِ عالی کا ان سب کو تعارف کرایا ہے۔

یا اس کے برخلاف ان کے واسطے دنیا کے ہر قسم کے سامانِ عیش وعشرت جمع کرنے کی فکر کی اور ان کو اس فانی دنیا کے نقشوں اور گورکھ دھندوں میں مصروف کر دینے کی اسکیمیں اور پروگرام بنائے اور انہیں اسکولوں اور کالجوں کی نظر کر کے اللہ ورسول کی باتوں سے بے خبر اور آخرت کی فکروں سے دور رکھا۔

اگر ہم موجودہ زمانے کی صورتِ حال پر غور کریں تو ہم میں سے زیادہ بڑی تعداد ایسی ہی نظر آئے گی کہ جن کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کے لیے اس دنیائے فانی کے ہر نوع کے ساز وسامان اور اسباب عیش وعشرت جمع کرنے کی تو فکر کی اور ان کی دنیا بنانے کے لیے جان توڑ کوششیں صرف کر دیں انہیں اسکول اور کالجوں کی نذر کر کے دین سے بے خبر رکھا اور دنیوی علوم سے آگاہ کیا جس کے نتیجے میں وہ دنیا کے نقشوں میں ایسے مصروف ہو گئے کہ اپنی ساری صلاحیتیں انہیں مادی چیزوں پر صرف کر ڈالیں اور کائنات کی تہہ میں گھس کر اپنے کو اور خالقِ کائنات کو بھول گئے، جدید قسم کی عمدہ گاڑیاں، رہنے سہنے کے لیے شاندار بنگلے، اور لیٹسٹ (Latest) قسم کے سیل فون اور کمپیوٹرز (Cell Phones, Computers) اور اعلیٰ قسم کا گھر کا فرنیچر وغیرہ مادی چیزیں ان کا منتہائے جدوجہد بن کر رہ گیا۔

غرض یہ کہ اس فانی دنیا کے ناز ونعم اور عیش وعشرت کے ہر نوع کے سامان اولاد کے لیے جمع کرنے کی فکر تو کی مگر افسوس کہ اس کی آخرت کے متعلق کبھی کچھ سوچنے اور فکر کرنے کی ہمیں کوئی فرصت نہ ملی نہ تو کبھی ہم نے یہ سوچا کہ:

میرے بچے نمازیں پڑھتے ہیں یا نہیں؟
قرآن کی تلاوت کے پابند ہیں یا نہیں؟
اپنے اللہ و رسول کی معرفت و پہچان ان کو حاصل ہے یا نہیں؟
خدا اور رسول کا پیغام جو قرآن و سنت کی شکل میں ہمارے پاس ہے اس کو وہ سمجھتے ہیں یا نہیں؟
ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ان کی صحبت اور کمپنی (Company) اچھے لڑکوں کے ساتھ ہے یا برے؟
کیا ان کی زندگی میں اتنا دین ہے جو انہیں آخرت میں جنت میں لے جا سکے اور جہنم سے بچا سکے؟
کیا وہ دنیا میں رہتے ہوئے اللہ و رسول کی محبت سینے میں رکھتے ہیں یا نہیں؟
میرے دنیا سے جانے کے بعد ان کے دین پر بقا کی کیا صورت ہوگی؟
میری اولاد آخرت کی کامیابیوں اور خوشیوں میں میرے ساتھ کس طرح شریک ہو سکے گی؟
وہ زمانے کے خطرناک دینی فتنوں سے کیسے محفوظ رہ سکے گی میں نے ان کے لیے کچھ انتظام کیا کہ نہیں؟
میں نے انہیں اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین سے جوڑنے کی کوئی فکر کی کہ نہیں؟
میں نے ان کے دین و دنیا کی فلاح اور سرخروئی کے لیے اللہ کے سامنے کچھ آہیں بھری ہیں یا نہیں؟

میرے ایمان والے بھائیو! اور آخرت پر یقین رکھے والو! احقر حضرت والا کے اس درد بھرے مضمون کے تحت اپنے سے اور آپ سب سے یہ درخواست کرتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کے لیے تقریباً ان ایک درجن سوالات پر سنجیدگی سے غور کریں تاکہ ہم بھی اپنی اولاد کو وہی تحفہ پیش کر سکیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب طبقہ بنی آدم انبیاء علیہم السلام کو عطا کیا ہے اور ان کو دنیا کی فانی لذتوں اور عارضی عیشِ آب و گل سے بچایا جا سکے جس کے نتیجے میں کل ہم اور ہماری اولادیں جنت کی دائمی خوشیوں اور راحتوں میں اکھٹے جمع ہوں اور اصل کامیابی اور فلاح ہم سب کے قدم چومے یہی اصل دوستی اور محبت ہے۔

آہ! ہماری اپنی اولاد سے دُشمنی

مگر آہ! بڑے دکھ اور درد سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہم نے محبت کے روپ میں اور دوستی کی شکل و صورت میں اپنی اولاد سے عداوت اور دشمنی کی ہے اور ہم نے خود ان کو دنیا اور اسباب دنیا کی محبت بتلائی اور سکھلائی اور انہیں اس راہ پر ڈالا جو ان کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والی ہے اور ہمیشہ کے خسارے اور محرومی کا باعث ہے نہ ان کو دین کا پتہ ہے نہ دین داروں کی قدر ہے، نہ قرآن و سنت سے آگاہ ہیں، نہ ہی اللہ و رسول سے باخبر ہیں نہ انہیں اچھے اور برے میں تمیز ہے، نہ نفع نقصان کا کچھ علم ہے۔ بس ان کا مبلغ علم اور سعی و کوشش کا منتہا دنیا اور صرف دنیا ہے اسی عارضی اور فانی دنیا کو انہوں نے اپنا سب کچھ سمجھا ہے ان کی ہر سوچ و فکر بس دنیا بنانے کے ارد گرد گھومتی ہے سوتے ہیں تو اس کی فکر اور اٹھتے ہیں تو اسی کا خیال ذہن و دماغ پر چھایا رہتا ہے روز بروز دنیا کے مال و دولت میں اضافہ ہونے

سے ان کی دنیا میں مشغولی اور آخرت سے دوری بڑھتی جاتی ہے۔ افسوس صد افسوس ہم ان کی اس حالت کو دیکھ کر مطمئن اور خوش نظر آتے ہیں جیسا کہ ہمارے دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہی تھا۔

بالآخر جب اولاد کی طرف سے والدین کی نافرمانی والے معاملات اور ان کو ایذاء وتکلیف پہنچانے والے واقعات سامنے آنا شروع ہوتے ہیں نہ ان کی نگاہ میں والدین کی کوئی عزت وعظمت ہوتی ہے اور نہ ان کا کوئی خیال دل میں رہتا ہے کیونکہ انہوں نے والدین کے حقوق کو سرے سے جانا ہی نہیں نہ والدین نے ان کو اس کی تعلیم دی تو پھر آئے دن اپنی اولاد کی طرف سے شکایتوں کا ایک غیر معمولی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اب بزرگوں سے دعاؤں کی فکر اور عاملوں سے تعویذوں کی سوچ دل ودماغ پر سوار رہتی ہے اور یوں خود اپنے بگاڑے ہوئے کیس (Case) کو اس کے پورے بگڑ جانے کے بعد ہم سنوارنے کی طرف چلتے ہیں اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس کمان میں لانے کی نامعقول فکر کرتے ہیں جس کا انجام بس دنیا وآخرت کے خسارے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اس لیے میرے بھائیو! صورت حال بگڑ جانے سے پہلے اسے صحیح کرنے کی فکر کرو اور کبھی سنجیدگی سے تنہائی میں بیٹھ کر غور کرو کہ اگر یہ دنیا اور اس کا عیش وعشرت اتنا اچھا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء واولیاء کو سب سے زیادہ عطا کرتے اور دشمنوں کو کلی طور پر محروم کر دیتے سو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اولاد کے صحیح خیر خواہ اور ان سے سچی محبت رکھنے والے جب ہی کہلائیں گے، جب ہمارا سلوک اپنی اولاد کے ساتھ وہی ہو جو کہ اللہ تعالیٰ کا انبیاء واولیاء کے ساتھ ہے یہ اس شعر کا ہمارے لیے ایک عظیم الشان سبق ہے کاش کہ ہم میں سے ہر ایک وقت گزر جانے سے پہلے اس کی فکر کر لے اور پھر اپنی اور اپنی اولاد کے لیے صحیح اور درست فیصلہ کر سکے۔

ہماری جنت کی خوشیاں اور اہل وعیال کی فکر

میرے اہل ایمان بھائیو! ہم کو اولاد کے مسئلے کو اس نقطۂ نظر سے بھی سوچنا چاہیے کہ ہم رات دن نمازوں میں اور دوسرے مواقع پر اپنے لیے یہ دعائیں کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہماری قبر کی منزل اور حشر ونشر کے مراحل سہل اور آسان ہو جائیں اور ہمیں آخرت میں پہنچ کر جنت میں داخلہ اور دوزخ سے نجات حاصل ہو جائے اور وہاں کی دائمی خوشی ہمارا مقدر بنے۔

تو بھلا کیا آپ اور میں اس بات پر خوش ہونگے کہ ہم تن تنہا جنت میں خوشیاں منا رہے ہوں اور وہاں کی نعمتوں میں مزے لوٹ رہے ہوں اور ہمارے بعد اپنے اپنے وقت پر جب اولاد ہمارے پاس پہنچ رہی ہو تو اس کا رخ کسی اور سمت میں ہو اور اس کا ٹھکانا خدا کے نافرمانوں اور بے دینوں والا ٹھکانا یعنی جہنم قرار پائے اور وہاں کے سخت عذاب اور تکالیف کا ان کو سامنا ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ایمان والا اپنی اولاد کے لیے ایسا خیال دل میں نہیں لا سکتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کی خوشی پوری خوشی جب تک نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اس خوشی میں اپنے اہل و عیال کو شریک نہ دیکھ لے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بے دین رکھ کر اور قرآن وحدیث کی تعلیمات سے ناآشنا

کر کے انہیں اس راستے پر ڈال رہے ہیں جو وہاں کی خوشیوں میں اکھٹا کرنے والا نہیں بلکہ ان کو الگ کر دینے والا ہے اور راحت کے بجائے مصیبت، جنت کے بجائے دوزخ، ثواب کے بجائے عذاب، رضائے خداوندی کے بجائے ناراضگی الٰہی کا ٹھکانا ہے لہٰذا سوچنے کی اور فیصلہ کرنے کی جگہ یہی دنیا ہے ہمیں یہیں رہ کر اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے صحیح فیصلہ کرنا چاہیے۔

مال واولاد اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں

صاحبو! ہمیں دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو بھی کچھ عطا کیا ہے اس کا ہم کو کلی طور پر مالک نہیں بنا دیا گیا بلکہ وہ سب کچھ امانت کے طور پر عطا ہوا ہے خواہ ہمارا اپنا بدن ہو یا ہمیں ملنے والا مال ہو اور یا عطا کی جانے والی اولاد ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہم سے ان سب چیزوں کے متعلق قیامت کے دن سوال ہوگا اور باز پرس کی جائے گی کہ تم نے ان چیزوں کے سلسلے میں میرے احکام کی پابندی کی یا نہیں؟ اور ان سے متعلق مقرر کئے ہوئے حقوق ادا کئے ہیں یا نہیں؟ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«الا كُلُّكُم راعٍ وَكُلُّكُم مسؤولٌ عن رعيته»

(مشكاة المصابيح، كتاب الامارة والقضاء)

یعنی کہ تم میں سے ہر ایک نگراں بنایا گیا ہے اور جو چیزیں اس کی نگرانی میں دی گئیں اس کے متعلق اس سے سوال ہوگا۔ آدمی سے اس کے اہل وعیال کے متعلق باز پرس ہوگی۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سے قیامت کے دن ہماری بیوی اور بچوں کے متعلق سوال کریں گے کہ تم نے ان کو میرا دین سکھایا تھا کہ نہیں اور ان کے ایمان اور اسلام کی فکر کی تھی کہ نہیں؟ انہیں صحیح تربیت دی کہ نہیں اگر بندہ جواب میں **نعم** کہے گا اور اس نے دنیا میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہوگی پھر خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی رہا ہو تو یہ بری الذمہ ہو جائے گا اور نجات پائے گا اور اگر ایسا نہیں کیا تو پھر اس کو اس کی سزا دی جائے گی اور اس جرم میں ماخوذ کر لیا جائے گا اگرچہ خود اس کے نیک اعمال کتنے ہی ہوں مگر اہل وعیال کے سلسلے میں ذمہ داری پوری نہ کرنے کی وجہ سے وہ ماخوذ ہوگا۔

اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ ایک والد نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آ کر اپنی اولاد کی نافرمانی کی شکایت کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اولاد کو بلایا اور ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین آپ ذرا میرے والد سے پوچھو کہ انہوں نے میرا کوئی حق ادا کیا ہے؟ کیونکہ ان پر میرے تین حقوق تھے (۱) قوم کی کسی باعزت آزاد عورت سے شادی کرتے۔ (۲) میرا نام صحیح رکھتے۔ (۳) مجھے تعلیم وتربیت دیتے۔ جب کہ انہوں نے ان میں سے میرا کوئی بھی حق ادا نہیں کیا نہ تو باعزت عورت سے شادی کی نہ میرا نام صحیح رکھا بلکہ میرا نام جعل رکھا ہے جو گندگی کے کیڑے کو کہتے ہیں اور نہ میری دینی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو والد کو اپنے پاس سے نکال دیا اور یہ فرمایا اس کی

نافرمانی کرنے سے پہلے تم نے اس کے سلسلے میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے اس پر ظلم کیا ہے۔ (تربیتِ اولاد)

اسی لیے قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾

(سورۃ التحریم، آیۃ: ۶)

ترجمہ: اے ایمان والو! (جب رسول کی بیبیوں کو بھی عملِ صالح اور اطاعت سے چارہ نہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر مامور ہیں کہ اپنی ازواج کو نصیحت کر کے عملِ صالح پر آمادہ کریں تو باقی سب اُمت پر بھی یہ فریضہ اور زیادہ مؤکد ہو گیا کہ اپنے اہل وعیال کی اصلاحِ اعمال واخلاق میں غفلت نہ برتیں اس لیے حکم دیا گیا کہ) تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں (اپنے کو بچانا خود اطاعت احکام کرنا اور گھر والوں کو بچانا اُن کو احکامِ الٰہیہ کا سکھانا اور اُن پر عمل کرانے کے لیے زبان سے ہاتھ سے بقدرِ امکان کوشش کرنا ہے۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۵۰۱)

اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو دین کا علم سکھاؤ اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کا انتظام کرو جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب نے تفسیر معارف القرآن میں ذکر فرمایا ہے۔

قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ (الآیۃ) اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی پھر نارِ جہنم کی ہولناک شدت کا ذکر فرمایا اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ جو اس جہنم کا مستحق ہوگا وہ کسی زور طاقت جتھہ یا خوشامد یا رشوت کے ذریعہ اُن فرشتوں کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا جو جہنم پر مسلط ہیں جن کا نام زبانیہ ہے۔

لفظ اَهْلِيْكُمْ میں اہل وعیال سب داخل ہیں جن میں بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آ گئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکامِ الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل وعیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے اُن کاموں سے ان سب کو منع کرو اور جن کاموں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے اُن کے کرنے کا اہل وعیال کو بھی حکم کرو تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔ (روح المعانی)

حضراتِ فقہاء نے فرمایا اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اُس پر عمل کرانے کے لیے کوشش کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میرے بیوی بچو! تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری

زکوٰۃ، تمہارا مسکین، تمہارا یتیم، تمہارے پڑوسی، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔ تمہاری نماز، تمہارا روزہ، وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا خیال رکھو، اس میں غفلت نہ ہونے پائے اور مسکینکم یتیمکم وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جوحقوق تمہارے ذمہ ہیں اُن کو خوشی اور پابندی سے ادا کرو اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دین سے جاہل وغافل ہوں۔ (معارف القرآن، جلد ۸، صفحہ ۵۰۲)

مزید اس سلسلے کی تفصیل احقر کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ ایک مستقل مضمون ہے، جس پر علیحدہ سے مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں۔

اپنے گریبان میں ذرا ایک نظر

میرے دوستو اور بھائیو! آج جب ہم اپنے اردگرد کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑے افسوس اور دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ عام طور پر آج ہماری توجہ اور سعی وکوشش صرف ایک بات پر خرچ ہورہی ہے اور اسی کی خاطر ہماری قیمتی صلاحیتیں استعمال میں آرہی ہیں اور عمر عزیز اس کی خاطر پگھلتی جارہی ہے اور وہ یہ کہ ہم میں سے ہر ایک اس تمنا میں ہے کہ میں کس طرح دولت بنانے کی مشین بن جاؤں اور اپنے موجودہ راس المال کو میں کس طرح زیادہ سے زیادہ بڑھا سکوں۔ صبح اٹھتے ہی دل و دماغ پر یہی ایک فکر سوار رہتی ہے اور اسی دھن اور دھیان میں رات کو اپنے بستروں میں لیٹے ہوئے ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں کتنے ہی لوگ نیند کی نعمت سے محروم اور سکون کی لذت سے ناآشنا ہوچکے ہیں اور ان کو ہر وقت ذہنی تناؤ اور دماغی کھچاؤ اور ٹینشن وڈیپریشن جیسے حالات کا شکار ہونا پڑ رہا ہے نہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا کوئی خیال، نہ اپنے معمولات اور اوراد و وظائف کا کوئی اہتمام، نہ تعلیم وتربیت سے متعلق کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا گھر میں کوئی خاص نظام اور نہ اپنے گھر والوں میں اسلامی مزاج اور دینی طبیعت پیدا کرنے کے لیے ان کے ساتھ گھر کے اندر رہ کر کچھ اوقات گزارنے کی کوئی فکر، نہ صبح سے شام تک اس کا کوئی خیال آتا ہے کہ میرے بچوں کے اوقات کہاں، کس کے ساتھ، اور کس طرح گزر رہے ہیں جس کے نتیجے میں نسلوں کی نسلیں تباہی اور بربادی کے دہانے پر کھڑی ہیں اور فحاشی اور عریانیت اور ننگے پن اور بے حیائی کے سیلاب میں غرق ہیں اور اپنی من مانی زندگی گزار کر دین ودنیا کے خسارے میں مبتلا ہیں۔

آہ! اے آج کے مسلمان! اگر تو نے اپنے بچوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے، پلنے بڑھنے، اور پہننے اوڑھنے کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر کی اور ان کو اچھے مکان میں رکھنے اور اچھی گاڑیوں میں چلنے پھرنے کے لیے محنت اور جدوجہد کی ہے اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے شب وروز کی محنتیں اٹھا کر ان کے لیے ہر چیز بہتر سے بہتر بنانے کی فکر کی ہے تو بہت مبارک اور بہت قابل صد خوشی ہے۔

مگر دوسری طرف ان کی جو اصل غذا تھی اور جو ایمان کا جوہر تھا عمل صالح کی دولت تھی اور گناہوں سے بچا کر تقویٰ والی حیات کی نعمت عظمیٰ کا حصول تھا اس سے آخر کیوں صرف نظر کیا گیا؟ اور اس طرف آخر کیوں نظر نہ ڈالی گئی؟ جب کہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں اللہ ورسول کے کیئے گئے وعدوں پر پورا اعتماد اور بھروسہ رکھتے ہوئے اور پوری تاریخ کی اس پر شہادت اور گواہی کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ میں اور آپ اور ہمارے بچے اگر اپنی سب فکروں کو صرف ایک کام کی طرف کر دیتے جو کہ ہماری ڈیوٹی اور ذمہ داری اور منجاب اللہ ہمارا فریضہ مقرر کیا گیا تھا تو پھر ان ساری فکروں کی طرف سے اللہ تعالیٰ ہمیں مکمل طور پر کافی ہو جاتے جیسا کہ تاریخ کے اوراق کھولنے سے یہ بات اظہر من الشمس نظر آ جائے گی۔

ہم اپنا کام کریں، اللہ اپنا کام کریں گے

اور ہمارا وہ فریضہ اور ذمہ داری قرآن نے ان الفاظ میں بیان کی:

﴿وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾

(سورۃ الطلاق، آیۃ: ۳)

ترجمہ: جو شخص اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر مشکل ومصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیں گے اور اس کو بے گمان رزق عطا فرما دیں گے۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۴۸۷ تا ۴۸۸)

لفظ تقویٰ کے اصلی اور لغوی معنے بچنے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت ونسبت ہوتی ہے تو ترجمہ اللہ سے ڈرنے کا کر دیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے بچے اور ڈرے۔

اس آیت میں تقویٰ کی دو برکتیں بیان فرمائی ہیں۔ اوّل یہ کہ تقویٰ اختیار کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ بچنے کا راستہ نکال دیتے ہیں۔ کس چیز سے بچنا؟ اس میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے دنیا کی سب مشکلات و مصائب کے لیے بھی اور آخرت کی سب مشکلات ومصائب کے لیے بھی اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی یعنی گناہوں سے بچنے والے آدمی کے لیے دنیا وآخرت کی ہر مشکل ومصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں، اور دوسری برکت یہ ہے کہ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں کا اس کو خیال وگمان بھی نہیں ہوتا۔ صحیح بات یہی ہے کہ رزق سے بھی اس جگہ مراد ہر ضرورت کی چیز ہے خواہ دنیا کی ہو یا آخرت کی، مؤمن متقی کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس آیت میں یہ ہے کہ اس کی ہر مشکل کو بھی آسان کر دیتا ہے اور اس کی ضروریات کا بھی تکفل کرتا ہے اور ایسے راستوں سے اس کی ضروریات مہیا کر دیتا ہے جس کا اس کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ (کذا فی الروح)

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ سے روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے لڑکے سالم کو دُشمن گرفتار کر کے لے گئے، اس کی ماں سخت پریشان ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اور لڑکے کی والدہ کو حکم دیتا ہوں کہ تم کثرت کے ساتھ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ پڑھا کرو۔ ان دونوں نے حکم کی تعمیل کی۔ کثرت سے یہ کلمہ پڑھنے لگے، اس کا یہ اثر ہوا کہ جن دُشمنوں نے لڑکے کو قید کر رکھا تھا وہ کسی روز ذرا غافل ہوئے، لڑکا کسی طرح اُن کی قید سے نکل گیا اور اُن کی کچھ بکریاں ہنکا کر ساتھ لے کر اپنے والد کے پاس پہنچ گیا۔

بعض روایات میں ہے کہ اُن کا ایک اونٹ ان کو مل گیا، اس پر سوار ہوئے اور دوسرے اونٹوں کو ساتھ لگایا، سب کو لے کر والد کے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے والد یہ خبر لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال بھی کیا کہ یہ اونٹ بکریاں جو میرا لڑکا ساتھ لایا ہے، یہ ہمارے لیے جائز وحلال ہیں یا نہیں؟۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا.

اور بعض روایات میں ہے کہ عوف بن مالک اشجعی اور ان کی بیوی کو جب لڑکے کی مفارقت نے زیادہ بے چین کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا، اور اس میں کچھ بُعد نہیں کہ تقوے کا حکم دیا ہو اور بکثرت لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ پڑھنے کا بھی۔ (معارف القرآن، جلد ۸، صفحہ ۴۸۶)

مقاصد کے حصول کا مجرب نسخہ

حدیث مذکور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کو مصیبت سے نجات اور حصولِ مقصد کے لیے یہ تلقین فرمائی کہ کثرت کے ساتھ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ پڑھا کریں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دینی اور دنیاوی ہر قسم کے مصائب اور مضرتوں سے بچنے اور منافع ومقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کلمہ کی کثرت بہت مجرب عمل ہے اور اس کثرت کی مقدار حضرت مجدد رحمہ اللہ نے یہ بتلائی ہے کہ روزانہ پانچ سو مرتبہ یہ کلمہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ پڑھا کرے اور سو سو مرتبہ درود شریف اس کے اوّل وآخر میں پڑھ کر اپنے مقصد کے لیے دعا کیا کرے۔ (تفسیر مظہری)

اور امام احمد رحمہ اللہ، اور حاکم بیہقی، ابونعیم وغیرہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز اس آیت وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا کی تلاوت بار بار فرماتے رہے، یہاں تک کہ مجھے نیند آنے لگی، پھر فرمایا کہ اے ابوذر! اگر سب آدمی صرف اس آیت کو اختیار کرلیں تو سب کے لیے کافی ہے۔ (روح المعانی) کافی ہونے کی مراد ظاہر ہے کہ تمام دینی اور دنیوی مقاصد میں کامیابی کے لیے کافی ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، اِنَّ اللهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کرے گا اللہ اس کی مہمات کے لیے کافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کام کو جس طرح چاہے

پورا کر کے رہتا ہے، اُس کی ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے، اسی کے مطابق سب کام ہوتے ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«لَوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَّتَرُوْحُ بِطَانًا»

(سنن الترمذی، ابواب الزھد، ج: ۲، ص: [illegible])

اگر تم اللہ پر توکل کرتے جیسا کہ اس کا حق ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق دیتا جیسا پرندے جانوروں کو دیتا ہے کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس ہوتے ہیں۔

اور صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہوں گے، اُن کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہوں گے۔ (مظہری)

توکل کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے اسباب و آلات کو چھوڑ دے بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب اختیاریہ کو ضرور اختیار کرے مگر بھروسہ اسباب پر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر کرے کہ جب تک اُس کی مشیت و ارادہ نہ ہو جائے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

یعنی کہ تم اپنے کام پر لگو یعنی میرے متقی بندے بن کر زندگی گزارو، میرے احکام بجا لاؤ اور میری نافرمانیوں سے مکمل پرہیز کرو تو میں ساری مشکلات سے بچنے کا راستہ تمہارے لیے نکال دوں گا اور تمہارے رزق و روزی کا انتظام ایسی جگہ سے کر دوں گا کہ جس کا تمہیں خیال بھی نہ ہوگا۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رزق اور روزی کا انتظام ہر جاندار مخلوق کے لیے اپنی طرف سے مقرر فرمایا ہے جس میں تمام انسان اور پھر ان انسانوں میں تمام اہلِ ایمان بدرجۂ اولیٰ داخل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے رزق کی جانب سے فکرمند ہونا اور ذہنی طور پر پریشان ہونا مؤمن کی شان نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت ابو موسیٰ اور ابو مالک وغیرہ قبیلہ اشعریین کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو جو کچھ توشہ اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کے لیے بھیجا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا کچھ انتظام فرما دیں۔ یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر پہنچا تو اندر سے آواز آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھ رہے تھے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا اس شخص کو یہ آیت سن کر خیال آیا کہ جب اللہ نے سب جانداروں کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہم اشعری بھی اللہ کے نزدیک دوسرے جانوروں سے گئے گزرے نہیں، وہ ضرور ہمیں بھی رزق دیں گے، یہ خیال کر کے وہیں سے واپس ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کچھ حال نہیں بتلایا۔

واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خوش ہو جاؤ! تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد آ رہی ہے۔ اس کے اشعری ساتھیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ ان کے قاصد نے حسبِ قرارداد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا ذکر کیا ہے اور آپ نے انتظام کرنے کا وعدہ فرما لیا ہے، وہ یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھ گئے۔ وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا دو آدمی ایک (قصعہ) گوشت اور روٹیوں سے بھرا ہوا اُٹھائے لا رہے ہیں۔ (قصعہ ایک بڑا برتن ہوتا ہے جیسے تشلہ یا سینی) لانے والوں نے یہ کھانا اشعریین کو دے دیا۔ انہوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا پھر بھی بچ رہا تو ان لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ باقی کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں تا کہ اس کو آپ اپنی ضرورت میں صرف فرما دیں۔ اپنے دو آدمیوں کو یہ کھانا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد یہ سب حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ کا بھیجا ہوا کھانا بہت زیادہ اور بہت نفیس ولذیذ تھا۔'' آپ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی کھانا نہیں بھیجا۔

تب انہوں نے پورا واقعہ عرض کیا کہ ہم نے اپنے فلاں آدمی کو آپ کے پاس بھیجا تھا، اس نے یہ جواب دیا، جس سے ہم نے سمجھا کہ آپ نے کھانا بھیجا ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے نہیں بلکہ اُس ذاتِ قدوس نے بھیجا ہے جس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لیا ہے۔''

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہِ طور پہنچے اور وہاں آگ کے بجائے تجلیاتِ الٰہی سامنے آئیں اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو ۔ عون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لیے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں، اس کا کون متکفل ہوگا؟ اس خیال کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں۔ انہوں نے تعمیلِ حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا۔ حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں۔ ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا۔ اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتّہ تھا۔

حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا یقین تو موسیٰ علیہ السلام کو پہلے بھی تھا، مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہو گئے۔ زوجۂ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہے وہاں جا رہا ہوں۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۵۹۲)

اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے مختصر سے لفظوں میں ہماری ساری فکروں کا علاج یوں پیش کیا ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾

(سورۃ الطلاق، آیۃ ۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۴۷۲)

اگر تم اپنی ذمہ داری پوری کرو گے اور وہ اس طرح کہ تم تقویٰ والی حیات کے ساتھ متقی بن کر رہو گے تو میں تمہاری ہر نوع کی مشکل کو آسان کر دوں گا خواہ داخلی مشکل ہو یا بیرونی، معاشی و اقتصادی مشکل ہو یا گھریلو اور خاندانی، اجتماعی نوعیت کی ہو یا انفرادی، غرض کہ جس لائن کی بھی چھوٹی یا بڑی مشکل کا سامنا ہو تقویٰ کی برکت سے اور اللہ کا صحیح بندہ بننے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سب کو آسان فرما دیتے ہیں اور ایسے ایسے راستوں سے مشکلات کا حل نکلتا ہے کہ اللہ کا یہ نیک بندہ اس طرف کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور بظاہر اسباب کی دنیا میں نظر کرتے ہوئے ان مشکلات کے حل ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی مگر اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کے سارے کام بناتے چلے جاتے ہیں اور آفات و بلیات سے بچاتے ہوئے راستے کی سب مشکلات ہٹا دیتے ہیں۔

بس بنیادی بات یہ ہوئی کہ ہم اور ہمارے اہل و عیال اپنے فریضے کی ادائیگی پر لگ جائیں تو باقی جتنی ہماری فکریں ہیں وہ خود بخود ختم ہو جائیں گی اس طرف ہمیں سوچنے کی حاجت و ضرورت بھی نہیں رہے گی۔

توفیقِ الٰہی اور فضلِ الٰہی سے احقر تحدیث نعمت کے طور پر یہ بات عرض کرتا ہے کہ احقر نے اتوار کی صبح کی مجلس میں حضرت والا دامت برکاتہم کی موجودگی میں جب یہ مضمون ان اشعار کے ضمن میں بیان کیا اور مجمع کو خطاب کر کے یہ بات عرض کی کہ آج احقر آپ لوگوں کو ان اشعار کی تشریح کی برکت سے اولاد سے محبت کرنا سکھانا چاہتا ہے اور اپنی اولاد سے دوستی و دشمنی کا فرق ظاہر کرنا چاہتا ہے تو بحمد للہ اپنے اہل ایمان بعض مسلمان بھائیوں کی طبیعتوں پر ایسا اثر پڑا کہ ان کی چیخیں نکل گئیں اور انہیں اولاد کے سلسلے میں اپنی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد آنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ کی گئی زیادتیاں اور حقیقی بدسلوکی سامنے آ گئی۔

اے اللہ! کتاب کی ان سطروں کے پڑھنے والے کے لیے بھی اس مضمون میں ایسی ہی تاثیر پیدا کر دیجیے کہ جو بھی پڑھ لے اس کی دل کی کایا پلٹ جائے اور اولاد کے سلسلے کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد آ جائے اور عمل کی توفیق ہو جائے۔ **وما علینا الاّ البلاغ.**

اے اللہ! گواہ رہنا کہ میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔

اے اللہ! گواہ رہنا کہ میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔

اے اللہ! گواہ رہنا کہ میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔

بحمد اللہ تم

جملہ مشکلاتِ دنیویہ واُخرویہ کے سو فیصد یقینی حل کے لیے پانچ اعمال

از مرتب وشارح ''عرفانِ محبت''، حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیو بند، استاذ حدیث دار العلوم آزادول، جنوبی افریقہ

آج کل عام طور پر دنیا بھر میں مسلمان مختلف قسم کی پریشانیوں اور اُلجھنوں کا شکار ہیں۔ مگر افسوس یہ ہوتا ہے کہ اُن کے دور کرنے اور اُن سے حفاظت کی حقیقی اور صحیح تدابیر اختیار نہیں کی جاتی۔ بلکہ خود اپنے طور پر جو کچھ ذہن میں آتا ہے اُسی پر عمل کرلیا جاتا ہے جبکہ اللہ ورسول نے دنیا وآخرت کی ہر مشکل اور پریشانی سے نجات کے لیے قرآن وسنت میں ایسے اعمال بیان فرمائے ہیں کہ جن کے کرلینے کے بعد بلاشک وشبہ یقینی طور پر اس مقصود کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اپنے مسلمان بھائیوں کے فائدے کے لیے خلاصہ کے طور پر پانچ باتوں کو لکھا جاتا ہے جن کو کرلینے کے بعد ان شاء اللہ ہماری ہر طرح کی مشکل آسانی میں بدل جائے گی۔ فقر وغربت کا معاملہ ہو یا مرض وصحت کی اُلجھن ہو، اختلاف ورنجش اور دُشمنی وعداوت کی تلخیاں ہوں یا اپنے اور غیروں کی طرف سے پہنچنے والی ایذائیں اور تکلیفیں ہوں، اہل وعیال اور بیوی بچوں کی طرف سے ناگوار اور تکلیف دہ حالات کا سامنا ہو یا اولاد کے مناسب رشتے اور جوڑوں کے نہ ملنے کے باعث ذہنی پریشانی اور دماغی ٹینشن رہتی ہو۔

اعمالِ خمسہ

(۱)......سب سے اہم اور ضروری عمل یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں مکمل تقویٰ اختیار کریں۔ جس کا مطلب تمام گناہوں کو چھوڑنا اور احکامِ خداوندی کو بجالانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ قرآن کریم میں مذکور ہے: ''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یجعل له مخرجا، ویرزقه من حیث لایحتسب'' اور ارشادِ باری تعالیٰ ومن یتق الله یجعل له من امره یسرًا، کہ جو بندہ تقویٰ اختیار کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے تمام مشکلات ومصائب (دنیاویہ واخرویہ) سے نکلنے کا راستہ بنادیں گے اور اُسے ایسی جگہ سے رزق (اور دوسری جملہ ضرورتیں) عطا کریں گے جہاں سے اُس کا گمان بھی نہ ہوگا۔ اور جو تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اُس کے تمام مشکل معاملات کو آسان کردیں گے۔

صاحبو! سوچو تو صحیح کہ یہ کس کا وعدہ ہے۔ یاد رکھو! یہ وعدہ چودہ سو سال سے قیامت تک کے لیے ہے اور رہے گا۔ اور اللہ ہر زمانے اس کو پورا کرتے رہیں گے، مگر افسوس کہ ہم پورے طور پر تقویٰ اختیار نہیں کرتے اور خود اپنے حالات درست کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ جبکہ ہماری ہر چھوٹی بڑی حالت اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ تو اگر ہم نے اُس کو راضی کرلیا تو سمجھو کہ پھر ہمارے تمام مصائب حق تعالیٰ کی طرف سے آسان ہوتے رہیں گے۔

(۲)...... صلوٰۃ الحاجت پڑھنا اور سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنا یعنی جو اہم معاملہ اور مشکل کام درپیش ہو تو اس کے لیے دو رکعت نماز پڑھ کر اور سورۂ یٰسین شریف کی تلاوت کرکے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو نماز کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ سورۂ یٰسین شریف جس مقصد کے لیے پڑھی جاتی ہے تو وہ پورا ہوجاتا ہے۔

(۳)...... صدق دل سے اپنے تمام گناہوں سے توبہ واستغفار کرنا جیسا کہ قرآن کریم میں کئی آیتوں میں یہ مضمون مذکور ہے کہ اے میرے بندو اگر تم توبہ استغفار کرو تو میں تمہارے اوپر دنیا وآخرت کی نعمتوں کی بارش برسادوں گا بارشوں کا برسایا

جانا اور مال واولاد کا ملنا اور زمین وآسمان سے برکتوں کے دہانے کھول دیا جانا غرض کہ ہر نعمت وراحت کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ واستغفار پر کیا گیا ہے بس شرط یہ ہے کہ حقیقی توبہ واستغفار ہو کہ اپنے کیے پر پوری ندامت اور ہر قسم کے گناہ سے مکمل دوری اور آئندہ کے لیے دور رہنے کا پختہ عزم ہو۔

(۴)......لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین کی کثرت کیونکہ احادیث شریفہ کی روشنی میں یہ مضمون ثابت ہے کہ ان دونوں کلمات کی کثرت سے بڑی سے بڑی اور سخت سے سخت مشکل اللہ تعالیٰ آسان فرما دیتے ہیں یہاں تک کہ قید سے رہائی اور چھٹکارا بھی ان کی برکت سے نصیب ہوتا ہے۔ (معارف القرآن)

مگر اپنی صحت وقوت کے مطابق اتنی ہی مقدار پڑھے جو بسہولت اور آسانی پڑھی جا سکے جس کے لیے کم سے کم مناسب مقدار ستر ۷۰ مرتبہ پڑھنا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ درود شریف کا پڑھنا بھی ہے کہ اس کی کثرت سے ضرورتوں کا پورا ہونا اور گناہوں کا معاف کیا جانا حدیث شریف میں وارد ہے اور خاص طور پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ عشاء کے بعد ستر ۷۰ مرتبہ صلوٰۃ تنجینا کا پڑھنا مصائب وحوادث سے حفاظت کے لیے اکسیر ہے۔ (فضائل درود شریف حضرت شیخ الحدیث)

﴿اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلٰوةً تُنْجِيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْاَهْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّاٰتِ وَتَرْفَعُنَا بِهَا عِنْدَكَ اَعْلَى الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِهَا اَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

(۵)...... اپنے خاص مقصد اور ضرورت کے لیے اور ذہن میں سوچی ہوئی مشکل کے دور کرنے کے لیے کچھ اللہ کی راہ میں صدقہ اور خیرات کرنا کیونکہ از روئے حدیث شریف صدقات سے بلائیں ٹلتی ہیں اور اللہ کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔

نوٹ: جملہ فرائض وواجبات خاص طور پر پانچوں وقت کی نماز باجماعت اور سنن مؤکدہ کی ادائیگی اور گناہوں سے مکمل حفاظت کے ساتھ ان مذکورہ اعمال خمسہ پر کچھ دنوں مداومت اور پابندی سے ہی ان شاء اللہ ہر قسم کی الجھنیں اور پریشانیاں دور ہوتی نظر آئیں گی مگر ہمیں اپنے ذہن میں یہ نہ سوچنا چاہیے کہ اس قسم کے معمولات پڑھ کر ہم اللہ تعالیٰ کو مجبور کر دیں گے اور پھر ضرور ہمارے ذہن میں سوچے ہوئے ہمارے تمام پروگرام آسان ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ مومن کی اصل شان بندگی ہے اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر قدم پر اللہ ہی سے مدد چاہے اور اسی کی طرف رجوع ہو اور یہ اعمال خمسہ بھی اسی رجوع اور بندگی کی ایک شکل ہے مگر پھر جو بھی اللہ کا فیصلہ ہو اس پر دل سے راضی رہے اور اسی کو اپنے لیے خیر تصور کرے۔

صاحبو! آج بہت سے لوگ اس قسم کے تعویذات ایجاد کیے ہوئے ہیں کہ جن میں گناہوں کو چھوڑے بغیر اور طاعات کی پابندی کیے بغیر ان کی طرف سے تمام مشکلات دور کرنے کا دعویٰ ہوتا ہے یاد رکھنا یہ سراسر دھوکہ ہے اور یہ دعویٰ بے بنیاد ہے پوری شریعت اسلامیہ میں ایسا کوئی تعویذ اور عمل نہیں ہے کہ اللہ کی نافرمانیوں میں مبتلا رہ کر اس کے ذریعے انسان کو پرسکون زندگی میسر آجائے اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا آخرت کی تمام مشکلات سے نجات عطا فرمائے اور ہم سب کا مقدر عافیت دارین ہو اور ہمیں دین کی صحیح سمجھ نصیب ہو جائے۔

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو
(حضرت والا دامت برکاتہم)

حضرت والا کے سامنے مجلس میں کی گئی اشعار کی تشریحات وتقریرات کا مجموعہ

عِرفانِ مَحبت
شرح
فیضانِ مَحبت

جلد دوئم



مجموعہ کلام

شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

شارح

حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند
استاذ الحدیث دار العلوم آزادول جنوبی افریقہ

خلیفہ ومجازِ بیعت
شیخ العرب والعجم
عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ

فہرست

پیش لفظ

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اوراس کی خاص توفیق کاثمرہ ہے کہ ''عرفانِ محبت'' جلداوّل کی طرح دوسری اورتیسری جلد کا کام بھی پایۂ تکمیل کوپہنچ گیا ہےاوراس طرح ان تین جلدوں میں مکمل ''فیضانِ محبت'' کی نظموں کی توضیح وتشریح ہوچکی ہے۔

دوسری اور تیسری جلد میں خاص طور پراس امر کالحاظ رکھا گیا ہے کہ اشعار کی تشریح کے ساتھ ساتھ بعض نظموں کے مشکل الفاظ کی لغوی تشریح بھی کردی گئی ہے، جس کی ضرورت اس وقت سامنے آئی جب بعض حضرات کی طرف سے ''عرفانِ محبت'' جلداوّل کے منظرعام پرآنے کے بعداس جانب توجہ دلائی گئی کہ بعض الفاظ مشکلہ کے لغوی معانی بھی لکھ دیئے جائیں تو کتاب زیادہ مفید رہے گی۔ اس پران مخلصین حضرات کے توجہ دلانے کاشکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ خاص طور پراس سلسلہ میں اپنے رفیق محترم جناب حضرت مفتی ارشادصاحب دامت برکاتہم کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مکمل دوسری اور تیسری جلدی کے الفاظ مشکلہ کی لغوی تحقیق کا کام انہوں نے بحسن وخوبی انجام دیا ہےاورگوکہ مفتی صاحب اپنی تدریسی ذمہ داریوں میں مصروف تھے مگر پھر بھی انہوں نے احقر کی درخواست پراس کام کی ذمہ داری لے لی اور تقریباً دو ماہ کے اندراس کومکمل فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی اس سعی کونفع خلق اور رضائے خالق کا ذریعہ بنادے۔ آمین اوراسی طرح میرے لیے ضروری ہے کہ اپنے دوساتھیوں (جناب محمد عمراورسید طیب صاحبان) کا بھی شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے ان دنوں جلدوں کی کمپوزنگ میں شب و روز خوب محنت کی اور مجھے جب بھی یہ تشریحات کمپوز کرانے کی ضرورت ہوئی تو وہ فوراً تشریف لائے اور بڑی مستعدی اور اخلاص کے ساتھ میرا خوب ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کی اس سعی کومشکورفرماکر ذخیرۂ آخرت بنادے اور ہمیشہ ان کی اس صلاحیت کودینی کاموں کے لیےقبول فرمائے۔ آمین

اوراحقر اپنے اس پیش لفظ کے ختام کوختام المسک بناتے ہوئے اپنے محبوب شیخ و مرشد عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر ادام اللہ کاعظیم احسان وکرم کا ذکرکرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ محض توفیق الٰہی اور حضرت والا کی خاص دعاؤں اورتوجہات کی بدولت احقر اس کتاب کی تشریح کے کام کوانجام دے سکا ورنہ اس طرح کی صلاحیت سے احقر اپنے کو بالکل خالی پاتا ہے اوراس کام کو پورا کرنا ناممکن نہ سہی مگر مشکل ضرور تھا۔ حضرت والا نے احسان فرمایا کہ اپنے سامنے احقر کوکھڑا کرتے اور پھر ارشادفرماتے کہ چلو! اشعار پڑھواوران کی تشریح کرواوراس طرح ہوتے ہوتے تقریباً پوری کتاب کی تشریح مکمل ہوگئی۔ اس لیے یہ کتاب درحقیقت حضرت والا کی موجودگی میں کی گئی تقاریرکا مجموعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ کا سایۂ تادیر ہمارے سروں پرقائم رکھے اور حضرت والا کے علوم ومعارف سے ہم سب کونفع اُٹھانے کی توفیق عطا فرمادے اور حضرت والا کی عمر میں اورعلم میں برکت عطا فرمائے اور دونوں جہان کی عافیت وراحت کو حضرت والا کے لیےاور حضرت کے جملہ خدام اورمحبین کے لیے مقدرفرمادے۔ آمین یارب العالمین۔

محمد امجد قاسمی

مدرس دارالعلوم آزادل ول، جنوبی افریقہ

آتش غم کی ترجمانی ہے

حسن فانی ہے عشق فانی ہے
کون کہتا ہے جاودانی ہے
وقفہ وقفہ سے آہ کی آواز
آتش غم کی ترجمانی ہے
کیا بھروسہ مجازِ عالم کا
عشق ان کا ہی غیرفانی ہے
راہ تقویٰ کے غم کا کیا کہنا
دوستو! رشک شادمانی ہے
خون حسرت سے آہ و نالوں سے
اپنی دنیا الگ بنانی ہے
اپنی خوشیوں کے خون سے اے دل
شمع ایمان کی جلانی ہے
آہ سے اور چشم تر سے آہ
کیسی تقریر بے زبانی ہے
دردِ نسبت کی دوستو تدبیر
ہر نفس دل کی پاسبانی ہے
مشغلہ اہلِ دل کا اے اختر
باغِ ایماں کی باغبانی ہے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **جاودانی**: ہمیشہ رہنے والا۔ **آتش غم**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ۔ **مجاز**: عشق بازی۔ **غم**: گناہ سے بچنے کا غم۔ **شادمانی**: خوشی، رشک شادمانی یعنی خوشی کو بھی جس پر رشک آئے۔ **خونِ حسرت**: حرام تمناؤں کا خون کر دینا۔ **آہ و نالوں**: اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے رونا۔ **شمع**: موم بتی۔ **چشم تر**: روتی ہوئی آنکھیں۔ **بے زبانی**: اللہ والوں کا ایک خاص وصف جس میں ان کی خاموشی میں بھی ان کے پاس بیٹھنے والوں کو نفع ہوتا ہے۔ **درد نسبت**: اللہ تعالیٰ سے تعلق کی وجہ سے اللہ والوں کا اپنے دل پر تکلیف برداشت کرنا مگر گناہ نہ کرنا۔ **تدبیر**: طریقہ۔ **نفس**: سانس۔ **پاسبانی**: حفاظت۔ **مشغلہ**: کام یا مصروفیت۔

حسن فانی سے دھوکہ نہ کھائیے

حسن فانی ہے عشق فانی ہے
کون کہتا ہے جاودانی ہے

یوں تو اس شعر میں ذکر کردہ مضمون حضرت والا کی کتاب میں جگہ جگہ آ رہا ہے اور اس کی مضرتیں اور تباہ کاریاں بھی مختلف عنوانات سے اس کتاب عرفان محبت کے اندر موقع بموقع مذکور ہوئی ہیں مگر اس شعر میں حسن فانی کی فنائیت کا تذکرہ کرنا ایک خاص وجہ سے ہے اور وہ یہ کہ عشاقِ مجازی کا حسنِ مجازی پر قربان ہونے کا انداز بظاہر یہ بتاتا ہے کہ گویا ان کا یہ عشق پرستی کا کھیل ہمیشہ رہنے والا ہے۔

تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ اے حسن فانی پر مرنے والو! تم اپنی حالت سے دھوکا کھا رہے ہو اپنے اس دھوکے سے نکلو اور اس حسن پسندی پر حقیقت پسندانہ غور کرو کہ جس معشوق اور معشوقہ پر تم جان دینے کی باتیں کر

رہے ہو اور ان کے مل جانے کو اپنی تسکین کا سامان سمجھ رہے ہو اور منزل کو پا لینے کے مترادف قرار دے رہے ہو یہ سب سوائے دھوکے کے کچھ نہیں۔ تاریخ پر غور کرو اور پھر اس کے انجام کو سوچو سوائے فنا کے اور کچھ نہیں اور خود تمہارا محبوب اور محبوبہ ایسی حالت میں پہنچنے والا ہے کہ تم کو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ ہوگا اور پھر قبر میں ہزاروں کیڑے مکوڑے اس پر چاروں طرف سے لپٹے ہوئے ہونگے اور سوائے مٹی کے ڈھیر اور ذروں کے ساری چمک اور رنگت اڑ چکی ہوگی کیا ہی خوب حضرت والا نے اس کی ترجمانی دوسرے اشعار میں یوں فرمائی ہے ؎

پھول مرجھا گئے چاندنی ڈھل گئی
اپنا انجام بھی کہہ گئی ہر کلی
بے نشاں بے نشاں ہو گئے ہر نشاں
قبر میں خاک چھانی مگر کیا ملی
رس بھری آنکھ تھی زلف کالی ملی
ہاں بلا بھی مگر اس سے کالی ملی
میر دنیائے فانی میں ہر سو ملی
بے کلی بے کلی بے کلی بے کلی

اس لیے اے وہ لوگو! جو اپنے کردار اور حالت سے یہ بتا رہے ہو کہ تم نے اس حسن کو ہمیشہ باقی رہنے والا سمجھ لیا ہے اور تمہارا معاملہ اس کے ساتھ ویسا ہی نظر آ رہا ہے اس دھوکے سے نکلو اور اللہ تعالیٰ کے جمال لازوال پر فدا ہو جاؤ جسے کبھی فنا نہیں ہے تاکہ تمہیں بھی بقا حاصل ہو۔

آہ و فغاں بلا وجہ نہیں ہوتی

وقفہ وقفہ سے آہ کی آواز
آتشِ غم کی ترجمانی ہے

یعنی جو لوگ اپنے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم لیے ہوئے ہیں اور واقعی معنوں میں انہوں نے گناہوں اور حرام کاموں سے بچنے میں اپنے دل پر رنج و غم کے پہاڑ اٹھائے ہیں تو پھر ان کے قلب میں اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی محبت کی آگ ہی نہیں بلکہ آتش فشاں پیدا کر دیتا ہے اور ان کی زبان سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد آہ آہ نکلنا اسی اندرونی دردِ محبت خداوندی کا ترجمان ہوتا ہے۔ دراصل بات تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسا کیف ہے جس کی حقیقت کو لغت بیان کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔ جیسا کہ عربی کا جملہ ہے مَنْ لَّمْ یَذُقْ لَمْ یَدْرِ کہ جو چکھے گا نہیں وہ جانے گا بھی نہیں۔ اس کے سمجھنے کی آسان صورت بس ایک ہے ؎

قریب جلتے ہوئے دل کے اپنا دل کر دے
یہ آگ لگتی نہیں ہے لگائی جاتی ہے

کبھی یہ ترجمانی آہ وفغاں سے ہوتی ہے تو کبھی اشک بار آنکھوں سے ہوتی ہے جو اندر کے سوز اور تڑپ کا پتہ دیتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے رونقِ گلشن ننگِ خزاں بن گئے

کیا بھروسہ مجازِ عالم کا
عشق ان کا ہی غیر فانی ہے

حسن مجازی نہ تو باقی رہنے والا ہے اور نہ اس کا کسی بھی طرح کوئی بھروسہ اور ٹھکانا ہے چند لمحوں میں انسان کسی سخت قسم کی بیماری کا شکار ہو جائے یا کچھ دن کے لیے دست وغیرہ کا عارضہ لاحق ہو جائے یا خون میں کوئی بیماری پیدا ہو کر بدن میں مختلف قسم کے رنگ ونشانات پڑ جائیں تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا حسن اڑ چکا ہوتا ہے اس لیے فانی بتوں کو دل دینا نہایت غیر دانشمندانہ حرکت اور بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔

پھر اگر کوئی بیماری اور عارضہ لاحق نہ بھی ہو تو آخر عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ہی اس حسن کو بھی زوال آجاتا ہے اور بڑھاپے کی عمر میں چہرے کی ساری خوبصورتی ڈھل چکی ہوتی ہے اور وہ کتابی چہرے اب نظر التفات کے قابل بھی نہیں رہتے جیسا کہ اس کی فنائیت کا حضرت نے دوسری جگہ پر یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

ہونٹوں پہ ان کے مونچھ ہیں گالوں پہ ڈاڑھیاں
اب سب ختم ہیں عشق و جنوں کی کہانیاں
پٹری ہی جب اکھڑ گئی حسن و جمال کی
اب کس طرح چلیں گی محبت کی گاڑیاں
جو تھے شگفتہ و تر و تازہ بہ شکلِ گل
دورِ خزاں میں اب ہیں وہ کانٹوں کی جھاڑیاں

ہاں بے شک! اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے ساتھ کی جانے والی پاکیزہ اور صاف ستھری محبت ہر آن قلب میں نئی تر و تازگی پیدا کرتی رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے جلوے دل میں روز افزوں نظر آتے ہیں اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ انوارات وتجلیات الٰہیہ اہلِ دل کے چہروں پر بہت صاف اور نمایاں نظر آتی ہیں اور ان کے چہروں کی رنگت اور تر وتازگی دن بہ دن زیادہ ہی ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اسی حال میں اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں جیسا کہ عارف ہندی حضرت خواجہ صاحب نے حضرت تھانوی کے متعلق کچھ یوں ارشاد فرمایا ؎

چمکتی ہیں آنکھیں دمکتا ہے چہرہ
بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہے ہیں

راہ تقویٰ کے غم کا کیا کہنا
دوستو! رشک شادمانی ہے

یعنی جب بندہ گناہوں سے بچتا ہے تو بے شک اس کے دل پر زور تو پڑتا ہے اور اسے وقتی غم اور صدمہ تو پہنچتا ہے لیکن اس کا یہ غم اہل دنیا کی ہزاروں خوشیوں کے لیے باعثِ رشک ہوتا ہے کیونکہ اس غم سے دل کو قرار اور اطمینان میسر آتا ہے اور چین وسکون کی عجیب دولت حاصل ہوتی ہے جب کہ گناہوں میں پڑکر حاصل کی جانے والی خوشی دل کی بے چینی کا سبب ہوتی ہے اس لیے اہل اللہ کا یہ غم رشک شادمانی فرمایا گیا۔

اللہ والوں کی اپنی دنیا الگ ہوا کرتی ہے

خونِ حسرت سے آہ و نالوں سے
اپنی دنیا الگ بنائی ہے

ظاہر ہے اس شعر کا منشا یہ تو نہیں ہے کہ کوئی بھی انسان اس کائنات سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ کر زندگی گزارے اور دنیوی حیات کے ساتھ جیتا رہے بلکہ اس تعبیر کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں رہنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے ساتھ مصالحت اور (Compromise) کر کے چلنا چاہتے ہیں اور وہ دنیا کی رنگ رلیوں میں کھوئے نظر آتے ہیں فکر آخرت سے زیادہ ان کو اپنی دنیا کا غم کھائے جاتا ہے اور ہر وقت انہیں انہی دنیوی خوشیوں کی فکر پڑی رہتی ہے لیکن حضرت والا فرماتے ہیں کہ ہمیں تو ناجائز اور حرام خوشیاں چھوڑ کر اور دل پر تقویٰ کا غم اٹھا کر اور اللہ کے لیے آہ وزاری کر کے اپنے دل میں اپنے خالق کو بسا لینا ہے اور ہر آن اس کی یاد میں مست رہنا ہے کہ جس کے بعد انسان کو اپنے اردگرد کا کوئی خیال وفکر باقی نہیں رہتا اور نہ ہی ماضی پر کوئی حسرت و افسوس اور مستقبل کا کوئی اندیشہ اس کے دل کی دنیا میں خلل ڈال پاتا ہے بلکہ یہ کہنا بالکل بجا ہے اور واقعی معاملہ یہی ہے کہ اہل اللہ عام لوگوں کے ساتھ اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی دنیا الگ بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایمان کی شمع کیسے جلتی ہے

اپنی خوشیوں کے خون سے اے دل
شمعِ ایمان کی جلائی ہے

عجیب وغریب تشبیہ اختیار فرمائی گئی ہے کہ جس طرح کسی برتن میں تیل رکھ کر اور اس میں بتی لگا کر چراغ کو

روشن کیا جاتا ہے اور پھر اس سے لوگ روشنی کا فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح میں اپنی خوشیوں کا خون کر کے اس سے چراغ روشن کروں گا اور اپنے قلب میں ایمان کی شمع جلاؤں گا جس سے میرے قلب وقالب او، دل وجان منور اور روشن ہو جائیں گے اور یہ ایک سچی حقیقت ہے جس کی گواہی خود قرآن دے رہا ہے، قرآن کریم کی مختلف آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث میں یہ بات مذکور ہے کہ:

﴿اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ﴾

(سنن الترمذی، تفسیر القرآن عن الرسول، ومن سورۃ الحجر)

گناہوں کو چھوڑنے کے نتیجے میں اور اللہ کی نافرمانیوں سے بچنے کی بدولت حق سبحانہٗ وتعالیٰ قلب میں ایمان کا نور اور روشنی یعنی بصیرتِ قلبی عطا فرما دیتے ہیں اور دل ودماغ منور وروشن کر دیتے ہیں جیسا کہ اسی کتاب میں بعض دوسرے مواقع پر اس مضمون کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اپنی حرام خوشیوں کا خون کیے بغیر اور ناجائز تمناؤں کو چھوڑے بغیر گوکہ فی نفسہٖ ایمان دل میں موجود رہتا ہے مگر اس میں جلا اور روشنی پیدا نہیں ہوتی اور آدمی قلبی بصیرت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

آہ ونالوں کی تاثیر کسی تقریر سے کم نہیں

آہ ہے اور چشمِ تر ہے آہ
کیسی تقریرِ بے زبانی ہے

اہل اللہ کی مجلس میں بیٹھنے والے لوگ جب ان کی آہیں سنتے رہتے ہیں اور آنکھوں سے جاری آنسوؤں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں تو خود یہ حالت ایک طرح سے زبان بن جاتی ہے اور جس طرح مقرر تقریر کے ذریعے اپنی بات پیش کر کے سامعین کے دل ودماغ میں اتارتا ہے اور ان کو اپنی بات کا حامی بنا لیتا ہے اور لوگ سن کر اس سے متاثر ہوتے اور نفع اٹھاتے ہیں۔

ٹھیک بالکل اسی طرح اہل اللہ کی صحبت میں جب چشمِ گریاں پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے اور درد بھرے دل کی ترجمانی اس کی آہ وفغاں کے ذریعے سے لوگوں کے کانوں تک پہنچتی ہے تو یہ حالت بھی سامعین کے دلوں پر اثر انداز ہونے میں کسی تقریر سے کم نہیں ہے گوکہ یہ بیان نہیں مگر بیان سے بڑھ کر اثر رکھتی ہے آخر جو چھوٹا بچہ ہوتا ہے جس کو ابھی تک قوتِ گویائی حاصل نہیں ہوئی ہوتی وہ بھی تو اپنے دل کی مرادیں اسی طرح کچھ آہ وبکاء کر کے اپنے والدین کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اپنی اندرونی حالت یا کوئی دلی تقاضہ اپنی حالت وکیفیت کے ذریعے والدین کے سامنے رکھ دیتا ہے اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تقریرِ بے زبانی ہے۔

دل کی پاسبانی اور دردِ نسبت کا حصول

درد نسبت کی دوستو تدبیر
ہر نفس دل کی پاسبانی ہے

یعنی اپنے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد حاصل کرنے کے لیے آسان صورت یہی ہے کہ ہر سانس اپنے دل کی نگہبانی رکھے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہونے دے کہ اس غفلت کے نتیجے میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیتوں میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ ہر معصیت درحقیقت قلبی غفلت ہی کا نتیجہ ہوتی ہے تو ہر وقت اپنے دل کی نگرانی کرتا رہے غیر حق تعالیٰ کی طرف کسی بھی طرح کے خوف وطمع کے قبیل سے سوچ دل میں قائم نہ ہو یہاں تک کہ مخلوق کے نفع وضرر سے اور ان کی مدح وذم سے دل کو بالکل خالی کر لے اور اس میں ایک لمحے کے لیے بھی مخلوق کا گذر باقی نہ رہے اور جن مخلوقات کے حقوق خالق نے ہمارے ذمہ لگائے ہیں وہ بھی اسی خالق کو دل میں رکھتے ہوئے اور اس کا حکم سمجھتے ہوئے ادا کیے جائیں اور جس طرف قدم اٹھانے سے خالق ''جل وعلا'' نے ہم کو روک دیا ہے اس طرف بڑھنے کا خیال بھی دل میں نہ آئے

اور ظاہر ہے جب دل کی پاسبانی اور نگرانی کی جائے گی تو پھر بدن کے سارے اعضاء بھی ہر سانس اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع رہیں گے کیونکہ دل پورے بدن کا بادشاہ ہے جس طرف جس عضو کو دل پھیرتا ہے وہ اس طرف پھر جاتا ہے اور جس طرف سے روکتا ہے وہ اس طرف سے رک جاتا ہے اسی لیئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کے ٹھیک رہنے پر پورے جسم کے ٹھیک رہنے اور اس کے بگڑنے پر پورے جسم کے بگڑنے کی خبر دی ہے لہٰذا خلاصہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دردِ نسبت دل میں حاصل ہونے کا یہی طریقہ ہے کہ ہر لمحہ دل کی غفلت سے مکمل پاسبانی اور حفاظت ہو حضرت شاہ محمد احمد پرتاب گڈھی کی دردنسبت کی ترجمانی دیکھئے ۔

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

باغ ایمان کی باغبانی اہلِ دل کا کام ہے

مشغلہ اہل دل کا اے اخترؔ
باغِ ایماں کی باغبانی ہے

دنیا میں اگر کوئی پھولوں پھلوں کا باغ ہو تو اس کی باغبانی کے لیے مختلف ظاہری اور مادی چیزیں اختیار کرنی پڑتی ہیں تو وہ قائم رہتا ہے اور پھولتا پھلتا ہے کبھی تو اس کو پانی سے سیراب کرنا پڑے گا کبھی اس میں غیر ضروری

گھاس وغیرہ اگ جانے کے سبب ان کو وہاں سے اکھاڑ کر صاف کرنا پڑتا ہے کبھی ان میں کھاد ڈالنا پڑتا ہے اور دوسری مختلف تدابیر اس کی باغبانی کے لیے استعمال کرنی پڑتی ہیں ورنہ وہ سب درخت مردہ ہو کر پھول و پھل دینا چھوڑ دینگے کچھ اسی طرح سے ہمارے دلوں کا بھی معاملہ ہے کہ اگر اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا لگا ہوا باغ جو ایمان کی شکل میں وہاں موجود ہے اس کی صحیح طرح باغبانی نہ کی جائے اور اس کو حرام خوشیوں اور لذتوں کے خون سے سیراب نہ کیا جائے تو پھر وہ مضمحل اور پژمردہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے پھول و پھل جو عبادات اور طاعات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں وہ پھول و پھل دینا چھوڑ دیتا ہے اور اس لیے اہل اللہ اسی باغ ایمان کی باغبانی کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اہلِ دل اہل اللہ ہی کا خاصہ ہے محض کتابوں کے پڑھ لینے یا بیانات اور تقریروں کے سن لینے سے یہ کام بالکل نہیں ہو پاتے اس لیے خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے امت کو کتاب عطا فرما کر ایک نبی بھی عطا فرمایا جس سے ہم سنت اللہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب میں باغ ایمان کی باغبانی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور پھر اس کے پھول و پھل حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عبادات ومجاہدات اور قربانیوں کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

پا گئی جان سلطانِ جاں کو

پائے گا جو بھی قطبِ زماں کو — پائے گا جان میں جانِ جاں کو
جانے کیا تاج سلطانیت بھی — لذت قرب آہ و فغاں کو
اپنے مالک پہ کر لو بھروسہ — چھوڑ دو فکر ایں فکر آں کو
جانے کیا ماہ و خورشید و انجم — جو دیا حق نے بندوں کی جاں کو
پالیا کر کے ترک تمنا — مطلع قرب خورشید جاں کو
آہ فیض غلامِ مرشد — پا گئی جان سلطان جاں کو
دونوں عالم سے پاؤ گے بہتر — لذتِ نامِ ربِ جہاں کو
جانیں کیا اہل غفلت جہاں میں — قرب اہل محبت کی شاں کو
لذت آہ صحرا کی اختؔر — کیا خبر بلبلِ گلستاں کو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **قطب**: اللہ تعالیٰ کی دوستی کا ایک مقام۔ **جانِ جاں**: اللہ تعالیٰ۔ **سلطانیت**: بادشاہت۔ **لذت**: مزا۔ **قرب**: نزدیکی۔ **آہ وفغاں**: اللہ تعالیٰ کی محبت میں رونا۔ **فکر ایں فکر آں**: یہ فکر اور وہ فکر یعنی تمام فکریں۔ **ماہ وخورشید وانجم**: چاند، سورج اور ستارے۔ **حق**: اللہ تعالیٰ۔ **ترکِ تمنا**: حرام خواہشات کو چھوڑ کر۔ **مطلع**: طلوع ہونے کی جگہ۔ **سلطانِ جاں**: اللہ تعالیٰ۔ **اھل غفلت**: گناہگار لوگ۔ **اھلِ محبت**: اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے۔

قطب بینی اور کتب بینی کی تاثیر جدا جدا ہے

پائے گا جو بھی قطبِ زماں کو
پائے گا جان میں جانِ جاں کو

حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے متعلق یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی میں نے کتب بینی کے ساتھ قطب بینی بھی کی ہے یعنی کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اہلِ دل اولیاء اللہ کی صحبت اٹھائی ہے حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ اور حضرت علامہ رشید احمد گنگوہی ان حضرات کی خاص طور پر حضرت تھانوی پر نظرِ عنایت اور توجہات رہی ہیں اس لیے شعر کا منشا یہ ہے کہ قلب میں حقیقی ایمان کا مزہ اور اللہ تعالیٰ کو پالینے کی حقیقی لذت جب ہی نصیب ہوتی ہے جب کوئی آدمی اپنے وقت کے شیخ کامل ا مصلح و مرشد صاحب دل اہل اللہ سے وابستہ ہوجائے اس وابستگی اور تعلق اور اصلاحی رابطے کے بعد اس کو محسوس ہوگا کہ میں اپنی جان میں جان جاناں کو پارہا ہوں یعنی میرے دل میں مجھے اللہ تعالیٰ کی تجلیات خاصہ کے ساتھ ان کی موجودگی کا احساس ہورہا ہے۔ شیخ کامل کی رہبری میں راستہ صرف آسانی ہی کے ساتھ نہیں بلکہ مزیداری کے ساتھ طے ہوتا ہے اور منزل مقصود میسر آجاتی ہے۔

رہ گیا قطب زماں کا لفظ جو اس شعر میں استعمال کیا گیا ہے تو درحقیقت قطب زمانہ یہ بندوں کے اللہ تعالیٰ سے تعلق اور قرب خاص کے مراتب اور درجات میں سے ایک خاص درجے کا نام ہے جس کو ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقاۃ میں اس طرح ذکر فرمایا:

﴿قَالَ الشَّیْخُ زَکَرِیَّا رَحِمَهُ اللهُ فِیْ رِسَالَتِهِ الْمُشْتَمِلَةِ عَلٰی تَعْرِیْفِ غَالِبِ أَلْفَاظِ الصُّوْفِیَةِ الْقُطْبُ وَیُقَالُ لَهُ الْغَوْثُ هُوَ الْوَاحِدُ الَّذِیْ هُوَ مَحَلُّ نَظَرِ اللهِ تَعَالٰی مِنَ الْعَالَمِ فِیْ کُلِّ زَمَانٍ أَیْ نَظْرًا خَاصًّا یَتَرَتَّبُ عَلَیْهِ اِفَاضَةُ الْفَیْضِ وَاسْتِفَاضَتِهٖ فَهُوَ الْوَاسِطَةُ لِذٰلِکَ بَیْنَ اللهِ تَعَالٰی وَبَیْنَ عِبَادِهٖ فَیَقْسِمُ الْفَیْضَ الْمَعْنَوِیَّ عَلٰی أَهْلِ بِلَادِهٖ بِحَسْبِ تَقْدِیْرِهٖ وَمُرَادِهٖ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، ج: ۱۰، ص: ۱۷۹، مکتبۃ امدادیۃ)

شیخ زکریا رحمہ اللہ نے اپنے ایک رسالے میں جس میں اکثر صوفیہ کے الفاظ کی تعریف کی گئی ہے لفظ قطب کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی کہ قطب اور غوث ایک ہی چیز ہے ہر زمانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص منظورِ نظر بندہ جس کو اللہ تعالیٰ سارے عالم میں سے اپنا فیض جاری کرنے کے لیے منتخب فرماتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے فیض حاصل کرتا ہے اور اللہ کے بندوں میں واسطہ بن کر اس فیض کو تقسیم کرتا ہے اور اپنے ملک والوں پر جتنی اس کی قدرت و طاقت اور ہمت وسعت حق تعالیٰ کی مشیت اور فیصلے کے مطابق ہوتی ہے وہ فیض پہنچاتا رہتا ہے۔

رہ گیا صحبت اہل اللہ کی اہمیت کا مضمون اس کو احقر نے عرفان محبت کی آخری جلد میں سکون دل در مجلس اہلِ دل والی نظم کے تحت کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے اور مختلف دوسرے مقامات پر بھی اختصار کے ساتھ مذکور ہے۔

اللہ والوں کی لذت کو سلاطین دنیا کیا جانیں

جانے کیا تاج سلطانیت بھی
لذت قرب آہ و فغاں کو

یعنی بادشاہوں کو کچھ مادی اور ظاہری منافع تو حاصل ہوتے رہتے ہیں اور لوگوں کی نگاہوں میں ظاہری عزت وعظمت بھی خوب مل جاتی ہے دنیا کے عیش وعشرت کے سامان بھی وافر مقدار میں ان کے پاس جمع رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے قرب کی جو لذت ہے اس کی تو ان کو ہوا بھی نہیں لگتی بلکہ حقیقت تو یہ ہوتی ہے جس کو حضرت والا نے دوسرے مقام پر یوں تعبیر فرمایا ہے ؎

شاہوں کے سروں پر تاج گراں سے درد سا اکثر رہتا ہے
اور اہل وفا کے سینوں میں اک نور کا دریا بہتا ہے

یہی تو وہ بات ہے جس کو حضرت ابراہیم بن ادہم نے قسم اٹھا کر کے بڑے تاکیدی انداز سے فرمایا کہ:

﴿قَالَ اِبْرَاهِیْمُ بْنُ اَدْهَمَ: وَاللهِ اَنَا لَفِیْ لَذَّةٍ لَوْعَلِمَهَا الْمُلُوْكُ لَجَادَلُوْنَا عَلَیْهَا بِالسُّیُوْفِ﴾

(فتح الملهم، ج:۱، ص:۲۳۲)

خدا کی قسم ہم ایسی لذت میں ہیں کہ اگر سلاطین دنیا کو اس کی خبر ہو جائے تو تلواروں کے ذریعے سے اس کے لیے ہم سے لڑنے لگیں۔

مالک کائنات پر بھروسہ ہر مشکل کا حل ہے

اپنے مالک پہ کر لو بھروسہ
چھوڑ دو فکر ایں فکر آں کو

بندے کو چاہیے کہ اپنے اصل مقصد میں لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور ہر وقت اس کے راضی کرنے والے اعمال کرنا ہے پھر باقی دوسری اس کی فکریں، یہ کیسے ہوگا، وہ کیسے ہوگا اس کے سلسلے میں ان فکروں کو دل میں کوئی جگہ نہ دے بس اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرے تو خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلے گا کہ یہ ساری فکریں اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سے ہٹا دیں گے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل اور اللہ پر بھروسے کی جو حقیقت بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے اسباب کو اختیار کرو اور نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ نتیجہ اپنی پسند اور چاہت کے مطابق ہو تو بھی

راضی اور خوش رہے اور اس کے خلاف ہو تو بھی بے چین اور پریشان نہ ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَعْقِلُهَا وَأَتَوَكَّلُ أَوْ أُطْلِقُهَا وَأَتَوَكَّلُ قَالَ اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ﴾

(سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم)

ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کے متعلق دریافت فرمایا کہ میں باندھوں اور پھر اللہ پر بھروسہ کروں یا کھلا چھوڑ دوں اور پھر اللہ پر بھروسہ کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پہلے اونٹ کو باندھو اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

جس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ پہلے سبب حفاظت اختیار کرنا ہے اور پھر اللہ پر بھروسہ کرنا ہے تو جب بھی اہلِ حق علماء کی کتابوں میں توکل اور بھروسے کا لفظ بولا جاتا ہے اس کا معنی یہی ہوتا ہے کہ ہر چیز کا سبب اختیار کر کے نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا جائے جیسے مال حلال کا سبب تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت وغیرہ کو اختیار کر کے پھر اپنے معاش اور روزی کی فکر کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے زیادہ گہرائی میں پڑ کر رات ودن کی بے چینی و پریشانی اپنے دل ودماغ پر سوار نہ کرے بلکہ مطمئن رہے اور مختصر سے اسباب اپنانے کے بعد اللہ پر بھروسہ کر لے اور اپنے مقصدِ حیات یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے دین کی اشاعت وغیرہ میں لگ جائے۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ علماء اور صوفیاء اہلِ حق گھر اور کاروبار کو اور اسباب کے اختیار کرنے کو چھوڑنے کی بات نہیں کہتے کیونکہ یہ سنت اللہ کے اور دنیا کے دار الاسباب ہونے کے فطری تقاضے کے خلاف ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے جو احقر نے عرض کی ہے اس لیے نہ تو اسباب کو چھوڑنا چاہیے نہ ان کے پیچھے اس قدر انہماک سے پڑنا چاہیے کہ ہر وقت اسی کی فکر سوار ہو گویا اس کی دو جانب ہیں، افراط وتفریط۔ ان دونوں سے بچ کر اعتدال والی راہ اختیار کرنے چاہیے یہی حضرت والا کا اس شعر میں منشا ہے۔

افراط وتفریط توکل کے منافی ہے

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق ایسے واقعات ملتے ہیں کہ وہ جنگلوں میں چلے گئے اور وہاں تنہائیوں میں جا کر اللہ اللہ کرتے رہے وہ ایسے اہلِ حق اللہ والے تھے کہ جن کے اوپر حقوق واجبہ نہیں تھے یعنی وہ غیر شادی شدہ تھے اور ان کے بیوی بچے نہ تھے یا انہوں نے اس کا کوئی شرعی معقول انتظام کیا تھا اس لیے ایسے حضرات کی اتباع محض ان کے قصے پڑھ کر اور سن کر نہیں کرنی چاہیے یہی وجہ ہے کہ کتابوں کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا راستہ آسانی سے طے نہیں ہوتا اور منزل تک انسان جلدی نہیں پہنچتا بلکہ افراط وتفریط کا شکار ہو کر کسی ایک سمت میں پڑا رہ جاتا ہے اور ساری عمر منزل تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث شریف میں منقول ہے:

﴿وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَّدْعُوْ اِلَيْهِ وَقَرَأَ: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (الآية)﴾

(رواه احمد والنسائی والدارمی، مشکوٰة المصابیح: ص ۳۰)

ترجمہ: نبی کریم علیہ السلاۃ والسلام نے ایک مرتبہ ایک لمبا خط کھینچا اور پھر اس کے دائیں اور بائیں جانب بہت سے چھوٹے چھوٹے خطوط کھینچے اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ یہ جو لمبا خط ہے یہ تو میرا راستہ ہے اور یہ جو دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے خطوط ہیں یہ سب گمراہی اور افراط وتفریط والوں کے راستے ہیں اس لیے جو اس سیدھی راہ پر چل رہا ہوگا پس وہی میرے راستے پر چلنے والا ہے۔ اور دوسرے راستوں پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جو اس کی طرف بلا رہا ہے اور یہ آیت پڑھی: **وأن هذا صراطي مستقيمًا** (الآية)

صاحبو! اسی لیے تو حفظ حقوق اور حفظ حدود دین کے اندر بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور بلکہ یوں کہیے کسی کام کے دین میں شمار ہونے کے لیے یہ دونوں چیزیں معیار اور کسوٹی ہیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے مواعظ میں باقاعدہ طور پر حفظ حدود اور حفظ حقوق کے اوپر وعظ موجود ہیں بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جو لوگ دین پر عمل کرنے کے شوقین ہوتے ہیں وہ جذبات میں آکر دین کے کسی کام میں لگ جاتے ہیں اور اپنے ذمہ عائد حقوق اور فرائض کی پرواہ نہیں کرتے اور دین کے اس کام کی جو حدود مقرر ہیں ان سے تجاوز کر گزرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں وہ دین کے کام کرنے والے نہیں ہوتے تو بھلا ان کو ان کی منزل یعنی اللہ کی رضا کیسے نصیب ہوسکتی ہے۔

خورشیدِ سماء اور خورشیدِ جاں کا فرق

جانیں کیا ماہ و خورشید و انجم
جو دیا حق نے بندوں کی جاں کو
پا لیا کر کے ترکِ تمنا
مطلعِ قربِ خورشیدِ جاں کو

چاند اور سورج کی روشنی اور آسمان کے طلوع ہونے والے ستاروں کی چمک دنیا جہاں کے ظاہر کو روشن کرتی ہے مگر بندہ مومن کی جان کو عطا ہونے والا نورِ معرفت باطن کو منور اور روشن کر دیتا ہے جس کی روشنی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ باطل کے سارے اندھیرے راستے سے چھٹ کر صاف ہو جاتے ہیں اور قبر وحشر کی بھیانک ظلمات اور تاریکیوں میں ایمان کی یہ روشنی کارآمد اور نافع ہوگی اور ایک ظاہری اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا اندر ایمان کے انوار

سے چمک اٹھتا ہے جس کی بدولت اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیات خاصہ کا قلب پر ورود ہوتا ہے تو پھر آفتاب ومہتاب کی روشنی کی کچھ حیثیت نہیں رہتی اور جتنا جتنا سالک اپنی حرام تمناؤں اور خواہشات کو دل پر زور رکھ کر چھوڑتا رہتا ہے اتنا ہی اس کی جان کو اللہ تعالیٰ کا قرب خاص عطا ہوتا رہتا ہے اور وہ اس کے غیر فانی نور سے چمکتی جاتی ہے۔

آہ! فیضِ غلامیِ مرشد
پا گئی جان سلطان جاں کو
دونوں عالم سے پاؤ گے بہتر
لذتِ نامِ ربِ جہاں کو
جانیں کیا اہلِ غفلت جہاں میں
قربِ اہلِ محبت کی شاں کو

یعنی میرے شیخ ومرشد کی صحبت وخدمت اور ان کی توجہات اور دعاؤں کی برکت سے مجھ پر اللہ تعالیٰ نے یہ فضل فرما دیا ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کا قرب موجود ہے اور وہ ذات عالی اپنی تجلیات خاصہ کے ساتھ جلوہ فرما ہے جس کی برکت سے حق تعالیٰ نے دل و جان میں کیسی پاکیزگی وصفائی عطا فرمادی کہ جس وقت میں اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہوں اور اللہ کو پکارتا ہوں اور اللہ اللہ کا ذکر کرتا ہوں تو مجھے دونوں عالم کے مزے ہیچ نظر آتے ہیں اور یہ امر واقعی ہے کہ اللہ کے نام کی لذت ایسی ہی چیز ہے مگر بس شرط یہی ہے کہ ہمارے دل وجان گناہوں کی گندگی اور غلاظت سے پاک ہوں اور وہ غفلتوں اور گناہوں کے زہر سے آلودہ نہ ہوں۔

عیش وعشرت کے دیوانے آہِ صحرا کے مزوں کو کیا جانے

لذتِ آہِ صحرا کی اختؔر
کیا خبر بلبلِ گلستاں کو

جن لوگوں کی ساری زندگی دنیا کے عیش وعشرت اور حرام وفانی لذتوں میں گذر گئی ہو اور انہوں نے کبھی اللہ کے لیے گناہوں کو چھوڑ کر اور اپنے دل کو توڑ کر دیکھا ہی نہ ہو اور نہ ہی کبھی اللہ تعالیٰ کو آہ وزاری کے ساتھ پکارا ہو تو وہ اس لذت سے کیا آشنا ہو سکتے ہیں جس طرح کہ وہ بلبل جو ہمیشہ گلستاں میں رہتی ہو اسے صحراؤں کی آہ وزاری کی لذت کی کیا خبر۔

حقیقت یہ ہے کہ جب خدا کے سچے بندے اپنی شکستہ دلی کے ساتھ بے سروسامانی کے عالم میں مخلوق سے ناامیدی اور بے چارگی کی حالت میں سارے علائق دنیویہ سے دل خالی کر کے اور اپنے ارمانوں کا خون پی کر اللہ کی

بارگاہ میں آہ وفغان کرتے ہیں تو دنیاوآخرت کی کوئی چیز ان کو وہ لذت عطا نہیں کرسکتی جو ان کو اس گھڑی حاصل ہو رہی ہوتی ہے بس یہی خلاصہ ہے حضرت کے آخری شعر کا۔

نکھرتا ہے کہیں رنگِ گلستاں باغبانی سے

اگر پانی نہ پائیں گل یہ ابر آسمانی سے
نکھرتا ہے کہیں رنگِ گلستاں باغبانی سے
اسے لندن کے رنگِ گل کی کچھ حاجت نہیں ہوتی
جسے ملتا ہے دردِ دل خدا کی مہربانی سے
نہ دیکھو ان نمک پاروں کو تم ہرگز نہیں دیکھو
کہ یہ تشنہ لبی جاتی نہیں نمکین پانی سے
نہیں برباد کرتا ہے وہ اپنے دیدہ و دل کو
ملی نسبت جسے قلب و نظر کی پاسبانی سے
بہ فیضِ ذکرِ حق وہ کیف ذاکر دل میں پاتا ہے
کہاں ممکن ہے پائے گا وہ فانی گلفشانی سے
اگر دردِ محبت دل میں واعظ کے نہیں اخترؔ
حقیقت پا نہیں سکتے ہو اس کی خوش بیانی سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ ابر: بادل۔ **حاجت**: ضرورت۔ **نمک پاروں**: نمک کے ٹکڑے مراد حسین۔ **تشنہ لبی**: پیاس۔ **دیدہ و دل**: آنکھ اور دل۔ **نسبت**: اللہ تعالیٰ کا بندے سے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق۔ **ذکر حق**: اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ **کیف**: مزا۔ **گلفشانی**: پھول جھڑنا، مراد فنا ہونے والے حسین چہرے۔ **واعظ**: تقریر کرنے والا۔ **خوش بیانی**: اچھی تقریر۔

گلستانِ معرفت کا رنگ ابرِ رحمت کے پانی سے نکھرتا ہے

اگر پانی نہ پائیں گل یہ ابر آسمانی سے
نکھرتا ہے کہیں رنگ گلستاں باغبانی سے

حضرت والا کے مختلف مواعظ میں یہ بات موجود ہے کہ دنیا کے ظاہری ایئر کنڈیشن انسان کی کھال تو ٹھنڈی کرسکتے ہیں لیکن اللہ کی نافرمانیوں کی وجہ سے اس کے دل میں لگی ہوئی بے چینیوں کی آگ سے پیدا ہونے والی گرمی کو ٹھنڈا نہیں کرسکتے، دل کا چین وسکون اللہ تعالیٰ کو راضی کرکے اس کی یادوں میں زندگی گزار کر حاصل ہوتا

ہے۔ اسی کو حضرت والا اپنے مخصوص انداز سے بیان فرمارہے ہیں جب باغ کے لیے باغبان کوششیں تو کرتا رہے اور صفائی ستھرائی اوراس کی دیکھ بھال تو جاری رکھے لیکن آسمان سے پانی برس کراس کی جڑوں کو سیراب نہ کردے اور پانی اندر تک سرایت نہ کر جائے جس کے نتیجہ میں حق تعالیٰ ان پھولوں کو خاص رنگ وروغن عطا فرماتے ہیں اوران کو بہترین قسم کی پھولوں کی خوشبوؤں کا مرکز بناتے ہیں تو جب تک اللہ کی طرف سے یہ سیرابی کا انتظام نہ ہو تو اس باغبان کی باغبانی سے گلستاں کا رنگ نہیں نکھر سکتا بلکہ وہ مرجھاتا جائے گا اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نیست ونابود ہو جائے گا۔

سو اگر انسان کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت اوراس کی معرفت نہ ہو اوراس کی زندگی اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو دل کی بے چینی بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جائے گی کہ دنیا کا ظاہری چین وسکون بھی مٹتا نظر آئے گا۔

اس لیے کہ اصل چین وسکون کا تعلق دل سے ہے تو دل کی بے چینی کے ساتھ جسم کا سکون بھی جاتا رہتا ہے اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ کسی شخص کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہو اوراسے دودن کے بعد تختہ دار پر لٹکایا جانے والا ہے اب اس سے پہلے اگرچہ اسے ہر طرح کے کھانے پینے اور عیش وآرام دیئے جائیں مگر وہ یہی کہے گا کہ مجھے کوئی سکون حاصل نہیں ہے اور وہ بہت ہی بے چین اور پریشان ہوگا۔

لندن و پیرس کی اہلِ دل کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں

اسے لندن کے رنگِ گل کی کچھ حاجت نہیں ہوتی
جسے ملتا ہے دردِ دل خدا کی مہربانی سے

حضرت والا کے یہ اشعار چونکہ انگلینڈ کی سرزمین پر باٹلی سے بلیک برن جاتے وقت موزوں ہوئے تھے اس لیے بطور مثال لندن کا ذکر آیا ورنہ مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی حسن وخوبصورتی کا شہر اور عیش وعشرت کی جگہ اللہ والوں کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور نہ اس کے ساتھ ان حضرات کو کسی بھی طرح کی دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ خود گلوں کو رنگت اور مہک دینے والا اللہ ان کے دلوں میں موجود ہوتا ہے تو ہر طرح کے حسن اور خوبصورتی کا مرکز جو دل میں لیے پھرتے ہوں پھر انہیں لندن و پیرس کے ہوٹلوں اور کشمیر اور مری کی پہاڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ لوگ ایسے مواقع پر اپنے اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے اور مخلوق کے ذریعے سے خالق کی معرفت حاصل کرنے جایا کرتے ہیں ورنہ فی الحقیقت وہ تجلیات الٰہیہ میں ایسے مست وسرشار ہوتے ہیں کہ ان کو ذہنی ٹینشن دور کرنے کے لیے ہولیڈے (Holiday) منانے اور سیر وتفریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نمک پاروں کے نمکین پانی سے تشنہ لبی ختم نہیں ہوسکتی

نہ دیکھو ان نمک پاروں کو تم ہرگز نہیں دیکھو
کہ یہ تشنہ لبی جاتی نہیں نمکین پانی سے

ابھی ابھی حضرت والا کے وعظ میں ہم سب نے یہ بات سنی کہ ایک گناہ کر کے پھر سے اس کو دوبارہ اس نیت سے کرنا کہ کچھ سکون مل جائے اور پھر نہ کروں گا یہ سراسر حماقت اور بے وقوفی ہے کہ اپنے معشوق اور معشوقہ پر بس ایک نظر ڈال دوں تا کہ دل کو ذرا سکون مل جائے کیونکہ بالکل رہا نہیں جارہا ہے اور بس پھر اس مرتبہ کے بعد توبہ کرلوں گا پھر دوبارہ نظر نہ ڈالوں گا یا صرف لاسٹ (last) مرتبہ کوئی فلم دیکھ لوں اور بس یہ آخری مرتبہ دیکھنا ہوگا کیونکہ طبیعت اس کے دیکھنے کے لیے بہت بے چین ہے تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایسا ہے کہ آگ پر پٹرول چھڑک کر آگ بجھانے کی تمنا کرنا کیونکہ گناہ میں جہنم کی خصوصیت ہے جس کو حضرت والا نے یوں ارشاد فرمایا کہ برانچ میں ہیڈ آفس کی خصوصیات ہوتی ہیں اس لیے گناہوں میں ویسی ہی بے چینی کا خاصہ ہے جیسی انسان کو جہنم میں ہوگی اس لیے اس شعر میں بڑے پیارے انداز میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ تم ان نمک پاروں کو دیکھ رہے ہو اور تمہاری یہ تشنہ لبی ختم نہیں ہو رہی ہے بلکہ مزید پیاس بڑھتی جارہی ہے تو پیاس نمکین پانی سے نہیں جائے گی لہٰذا اگر تم بار بار دیکھو گے تو یہ پیاس اور بڑھتی چلی جائے گی اور جیسے جہنم هَلْ مِن مَّزِيْدٍ، هَلْ مِن مَّزِيْدٍ کچھ اور ہے کچھ اور ہے کہہ کر مانگتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا قدم رکھ دیں گے جس کا معنی حضرت والا نے بحوالہ علامہ قسطلانی یہ ذکر فرمایا ہے کہ اپنی ایک خاص تجلی فرمادیں گے تب وہ یہ کہنا بند کرے گی۔

تو دنیا میں جو انسان کا نفس ہے جب انسان گناہ کرتا ہے یہ بھی جہنم کی طرح سے هَلْ مِن مَّزِيْدٍ، هَلْ مِن مَّزِيْدٍ مانگتا رہتا ہے اسی لیے اگر کسی فاسق و فاجر کو جو کہ فانی بتوں کا عاشق ہو یہ پتہ چل جائے کہ پیرس اور لندن کے فلاں ہوٹل میں پچیس حسینائیں مصر سے آئی ہیں اور پچیس لبنان سے اور پچیس روس سے اور پچیس کشمیر سے تو اس کا نفس یہ چاہے گا کہ ان تمام سو کی تعداد سے اپنی حرام خواہش پوری کرے اور اگر پھر مزید کوئی بچی ہو اور اسے علم ہوجائے تو وہ اس کے لیے بے چین اور مضطرب رہے گا اور اس کا نفس هَلْ مِن مَّزِيْدٍ، هَلْ مِن مَّزِيْدٍ کرتا رہے گا اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ تم بھی اللہ کے قدم کو اپنے دل میں رکھ لو یعنی اللہ کے ذکر میں لگ جاؤ اللہ کی طرف متوجہ ہوجاؤ توبہ کے ذریعے سے اس کو دھولو تا کہ اس کی مزید مزید کی پکار ختم ہوجائے دوبارہ وہی گناہ کر کے اس کے تسلی دینے کی کوشش نہ کرو یہ شیطان کی طرف سے ایک چال ہے اور نفس کا ایک دھوکا ہے گناہ کی تلافی کبھی دوسرے گناہ سے اور دوسرے کی تیسرے سے ہرگز نہیں ہوسکتی یہ تو جرم بالائے جرم کرنا ہے اور آگ کی چنگاری کو شعلہ بنانا ہے تو بھلا بے چینی ختم ہونے کا کیا سوال پیدا ہوسکتا ہے۔

حضرت والاعلی الاعلان فرماتے ہیں کہ اختر کا پوری زندگی کا تجربہ ہے کہ جولوگ گناہوں کی دلدل سے نکل کر دین کی طرف آئے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا اور خود انہوں نے یہ بتایا کہ ایسا لگتا تھا کہ ہم سخت آگ کی گرمی میں جھلس رہے تھے کہ اچانک ٹھنڈے سائے میں آ گئے ہیں۔

قلب ونظر کی پاسبانی سے حصولِ نسبت بآسانی

نہیں برباد کرتا ہے وہ اپنے دیدہ و دل کو
ملی نسبت جسے قلب و نظر کی پاسبانی سے

نمک پاروں کو محض نہ دیکھنے سے اور قلب ونظر کی پاسبانی سے سالک کو کیا ملتا ہے اسے کون سی دولت ہاتھ آتی ہے؟ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ قلب ونگاہ کی حفاظت سے نسبت مع اللہ حاصل ہوجاتی ہے جس کا خلاصہ دوامِ طاعات اور کثرتِ ذکر ہے۔

بعض نادان ان سب باتوں کو صوفیوں کی اور تصوف کی بات سمجھتے ہیں اور معمولی سمجھ کر ان سے صرف نظر کرتے ہیں اور وہ بزبان خود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نظر ڈال لینے سے کچھ نہیں ہوتا اور نامحرم عورتوں کو دیکھنے سے کوئی خاص ضرر اور نقصان نہیں ہے لیکن احقر قرآن سے یہ ثابت کرسکتا ہے کہ جو آدمی اپنی نظر بچائے گا تو اس کی برکت سے وہ جنت میں داخل ہوجائے گا تو کیا جنت میں داخل ہوجانا کوئی معمولی نعمت ہے۔

نظر بچانے سے جنت کا ملنا قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے، قرآن کریم کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظر بچانا اتنا بڑا عمل ہے کہ انسان کو جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ کیسے؟ ہمارا پالنے والا اللہ ہمارے بدن کے اعضاء و جوارح کے خواص کو جتنا جاننے والا ہے اتنا ہم خود نہیں جانتے کیوں کہ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے قرآن میں اعلان فرمایا:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ﴾

(سورۃ النور، اٰیۃ: ۳۰)

ترجمہ: آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کی طرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اس کو بالکل نہ دیکھیں اور جس کو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور لواطت سب داخل ہے) یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام میں جو ترتیب ہوتی ہے اسمیں بہت سی حکمتیں اور اسرار و رموز چھپے ہوتے ہیں تو پہلے نظر بچانے اور پھر ''حفظ فروج'' شرم گاہوں کو بچانے کی بات فرمائی، کیونکہ جب انسان نگاہ بچائے گا تو شرم گاہ بچے گی۔

آگے دیکھیں اللہ نے کیا فرمایا ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ یہ تمہارے لیے قلب کی صفائی ستھرائی، نفس کے تزکیہ اور طہارت کا بہت بڑا ذریعہ ہے ازکیٰ اس سے بہت زیادہ تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔

اور قرآن کی دوسری آیت ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا کامیاب ہو گئے وہ لوگ کہ جنہوں نے نفس کا تزکیہ کرلیا ادھر آیت سے ثابت ہوا کہ نگاہ بچانے سے شرمگاہ بچی، نگاہ اور شرمگاہ کے بچنے سے تزکیہ حاصل ہوا ادھر ثابت ہوا تزکیہ سے فلاح ملی۔ اور فلاح جن لوگوں کو ملے گی قرآن کریم میں ان کے بارے میں آیا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

(سورۃ المؤمنون، آیۃ: ۱۱)

ترجمہ: جولوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے اور اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

قرآن پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ نظر بچانا اتنا بڑا انعام ہے اور اتنی بڑی نعمت ہے جسکو حاصل ہو جائے۔ ان شاء اللہ نظر بچانے کی دولت سے نفس کو بڑی صفائی ستھرائی اور بڑی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور بس جس کا نفس مزکیٰ مجلی ہو گیا تو قرآن کہتا ہے کہ وہ جنت میں چلا جائے گا جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾

(سورۃ آل عمران، آیۃ: ۱۸۵)

ترجمہ: تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا۔

جس کو جہنم سے بچا لیا گیا جنت میں داخل کر دیا گیا فَقَدْ فَازَ بس وہ کامیاب ہو گیا تو کامیابی قرآن میں اس سے ثابت ہوئی اور کامیابیوں کا معنیٰ ہے کہ وہ جنت والے ہیں لہٰذا نظر بچانے سے جنت میں جانا ثابت ہوا اس لیے یہ معمولی اور ہلکی بات نہیں۔

اور یہ بات اور عرض کرتا چلوں جو میں نے اب تک عرض نہیں کی کہ نظر بچانا یہ بشرط شئی کے درجے میں مطلوب ہے یہ تین درجے ہوتے ہیں (۱) ایک کو کہتے ہیں بشرط شئی (۲) ایک کو کہتے ہیں بشرط لا شئی (۳) ایک کو کہتے ہیں لابشرط شئی ایک درجہ اطلاق وابہام ایک درجہ تجرید ایک درجہ تقیید (قید کرنا) مطلب کیا ہے؟ یعنی غض بصر کے حکم سے یہ مطلوب ہے کہ آپ بالقصد نظر کو نیچا کر کے چلیں یہ نہیں کہ بس ہم چل رہے ہیں اگر نظر پڑ گئی ''تو پڑ گئی'' نہیں تو نظر نیچی کر لی بلکہ مقصود یہ ہے کہ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ نیچے ہی کر کے چلو! اطلاق اور ابہام کے درجے میں نہ چلو! بلکہ نیچے ہی کر کے چلنا ہے ادھر ادھر دیکھنا نہیں ہے حفاظت کا طریق یہی ہے اسی طرح حفاظت ہوتی ہے ورنہ حفاظت نہیں ہو پاتی بلکہ انسان کی نگاہیں اور دل دونوں برباد ہوتے ہیں کیونکہ جب وہ حرام کاریوں میں پڑ کر غیر محرم کی طرف نظر ڈالتا ہے، ٹیلی ویژن، وی سی آر، انٹرنیٹ، فلمیں، میگزین اور روڈوں سڑکوں پہ چلنے والی سب نامحرم عورتوں یا حسین امردوں کو دیکھتا ہے تو پھر اس کا دل محفوظ نہیں رہتا ہے کیونکہ اگر آپ کو دار السلامت کو بچانا ہو،

کیپٹل کو بچانا ہو راجدھانی کو بچانا ہو تو جو چاروں طرف سرحدیں اور بارڈرز ہیں ان کو بچایئے! ان پر مضبوطی کے ساتھ طاقتور فوج جا کھڑا کیجئے کہ کوئی دشمن ادھر سے نہ آجائے تو دوستو پھر راجدھانی کی بھی حفاظت رہے گی حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں یہ جو نگاہیں ہیں ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ بارڈر جب ان کے اندر سے کوئی چیز گزر کے آئے گی تو پھر آپ کہاں سے دل کو بچا پائیں گے۔

آپ نے اگر بارڈر کی حفاظت نہیں کی تو اب دل کی کہاں سے حفاظت ہوگی اور جسے نگاہوں اور دل کی حفاظت کے ذریعے سے نسبت مع اللہ کا خزانہ مل جاتا ہے وہ ایک لمحہ ایک سیکنڈ گوارا نہیں کرے گا کہ میں اپنے اللہ کو ناراض کروں اور ادھر ادھر اپنی نظریں ڈالوں اور اپنے اس خزانے کو گنوادوں۔

عارف ہندی حضرت خواجہ صاحب کا شعر ؎

دین کا دیکھ ہے خطر
اٹھنے نہ پائے ہاں نظر
کوئے بتاں میں تو اگر
جائے تو سر جھکائے جا

بہ فیضِ ذکرِ حق وہ کیف ذاکر دل میں پاتا ہے
کہاں ممکن ہے پائے گا وہ فانی گلفشانی سے

یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل میں حقیقی سکون میسر آتا ہے اور ذاکر ہر گھڑی عجیب کیف و سرور میں رہتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت کی گلفشانی سے ہی حاصل ہوسکتا ہے فانی اور عارضی گلفشانی جو دنیا کی باغ و بہار میں ہوتی ہے اس سے دل کو وہ کیف و سرور نہیں مل سکتا جیسا کہ مختلف واقعات اس پر شاہد ہیں۔

سینۂ میں نور رہو تو منبر پر نور برستا ہے ورنہ نہیں

اگر دردِ محبت دل میں واعظ کے نہیں اخترؔ
حقیقت پا نہیں سکتے ہو اس کی خوش بیانی سے

صرف الفاظ کو عمدہ اور شاندار اور خوب فصیح و بلیغ بنالینے سے دلوں کی کایا نہیں پلٹتی، بس کچھ وقتی طور پر واہ واہ ہوجاتی ہے لیکن زندگی میں انقلاب ان اہل اللہ اور ان رجال اللہ کے ذریعے آتا ہے جو نفوس قدسیہ لیے ہوئے اور ان کو مزکّٰی و مجلّٰی کرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ فارسی کا مقولہ ہے ؎

از دل خیزد بر دل ریزد

جس بوتل میں خوشبو ہی نہ ہو تو اسے کھول کر اہلِ مجلس کو معطر نہیں کیا جا سکتا ہے اور جو چراغ خود روشن نہ ہو وہ دوسروں کو روشن نہیں کر سکتا اس پر حضرت والا کی کتاب آئینۂ محبت کا یہ شعر ہے ؎

کیوں آہ میں کچھ تاثیر نہیں کیا عشق کا دل میں تیر نہیں
جب نور نہیں خود ہی دل میں منبر پہ وہ کیا برسائیں گے

اور جو لوگ اللہ کی معرفت و محبت کا چراغ اپنے سینے میں لیے ہوئے ہوں تو ان کا حال کچھ یوں ہوتا ہے ؎

جب شمعِ محبت دل میں لیے محفل میں ہو کوئی صاحبِ ضوء
پھر عشقِ خدا کے پروانے خود اڑ کے وہاں آ جائیں گے

اس لیے اس میں ہم سب کے لیے نصیحت ہے کہ واعظ بننے کا شوق و جذبہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے وعظ میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے اور اپنے سینے سے انوارات کی بارش اہلِ مجلس پر برسانے کے لیے خود اپنے قلب و جگر میں حق تعالیٰ کی شمعِ محبت جلائیں اور اس کے قرب کے پھولوں کی خوشبوؤں سے دل و دماغ کو معطر کریں پھر یہ نظر آئے گا کہ جس طرح شمع کی طرف پروانے اُڑے چلے آتے ہیں اسی طرح اللہ کی محبت کے پروانے ہماری طرف اُڑے آ رہے ہیں۔

رضائے حق میں اپنی آرزو ہر وقت فانی ہو

کسی عاشق کی جب بھی داستاں اس کی زبانی ہو
تو اہلِ دل کے اشکوں سے نہ کیوں پھر قدر دانی ہو

اسے تقویٰ کا اور نسبت کا پھل ملنا یقینی ہے
کہ جس کے باغِ دل میں اہلِ دل سے باغبانی ہو

جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

ولایت اہلِ دل کی صحبتوں سے گو میسر ہے
مگر یہ شرط ہے قلب و نظر کی پاسبانی ہو

نہیں آساں ہے اسرارِ محبت کو بیاں کرنا
مگر واعظ کے دل کو بھی تو حاصل رازدانی ہو

ملا کرتا ہے دردِ دل بڑی خونِ تمنا سے
رضائے حق میں اپنی آرزو ہر وقت فانی ہو

فدا لیکن ہے اس ذرہ پہ ہفت اقلیم کی دولت
بصورت دردِ دل دل میں اگر دردِ نہانی ہو

ہزاروں غم اٹھائے جس نے ان کی راہ میں اختؔر
نہ پھر کیوں دکھ بھری اے دوستو اس کی کہانی ہو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ عاشق: اللہ تعالیٰ کا عاشق۔ **اشکوں:** آنسو۔ **نسبت:** اللہ تعالیٰ کا بندے سے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق۔ **اہلِ دل:** اللہ والے۔ **شرحِ محبت:** اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں۔ **جادو بیانی:** تقریر میں جادو جیسا اثر ہونا۔ **ولایت:** اللہ تعالیٰ کی دوستی۔ **میسر:** حاصل ہونا۔ **پاسبانی:** حفاظت۔ **اسرارِ محبت:** اللہ تعالیٰ کی محبت کے راز۔ **رازدانی:** راز سے واقف ہونا۔ **خونِ تمنّا:** ناجائز تمناؤں پر عمل نہ کرنا۔ **رضائے حق:** اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ **ہفت اقلیم:** سات بادشاہتیں۔ **دردِ نہانی:** دل میں چھپا ہوا اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد۔

اہلِ مجلس کی اشک باری سے داستانِ عاشق کی قدر دانی

کسی عاشق کی جب بھی داستاں اپنی زبانی ہو
تو اہلِ دل کے اشکوں سے نہ کیوں پھر قدر دانی ہو
جو دردِ دل سے اور آہوں سے اور اشکوں سے منبر پر
کرے شرحِ محبت پھر نہ کیوں جادو بیانی ہو

اللہ تعالیٰ کے راستے کا غم اٹھائے ہوئے سچا خدا کا عاشق جس پر بہت سے مجاہدات گزرے اور اس کو دین کے لیے قربانیاں دینی پڑیں مگر وہ اللہ کی محبت میں جمار ہا دین کے تقاضوں پر قائم رہا تو اس کا دل اللہ کی محبت سے گھائل اور زخمی ہوتا ہے اور اس کی مثال ایسے مریض کی ہوتی ہے جو درد و تکلیف میں مبتلا ہو اور اپنا اندرونی گزرنے والا حال کسی ڈاکٹر کے سامنے پیش کر رہا ہو تو اس کے بیان کی کیفیت کچھ الگ ہی ہوتی ہے اس لیے اہلِ محبت محبت کی ترجمانی کرتے ہیں اور اپنے دل کا حال کہتے ہیں اس لیے سامعین اشک باری کر کے اس عاشق کی داستان کی قدر دانی کرتے ہیں اور اس کی گفتگو سے مجمع پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور اپنے گناہوں پر ندامت کے جذبات دل میں ابھرنے لگتے ہیں اور یوں ان کی داستان سن کر یہ خود بھی اہلِ دل کی صفوں میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔

باغِ دل میں باغبانی اور قلب ونظر کی پاسبانی سے حصولِ نسبت یقینی ہے

اسے تقویٰ کا اور نسبت کا پھل ملنا یقینی ہے
کہ جس کے باغِ دل میں اہلِ دل سے باغبانی ہو
ولایت اہلِ دل کی صحبتوں سے گو میسر ہے
مگر یہ شرط ہے قلب و نظر کی پاسبانی ہو

حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ والوں سے اخلاص کے ساتھ تعلق رکھنے والا کبھی محروم نہیں رہتا بلکہ ایسے شخص کو جو صحیح شرائط کے ساتھ اہلِ دل سے وابستہ ہو یعنی صحیح احوال کی اطلاع اور پھر شیخ کی تعلیمات اور ہدایات کی پوری پوری اتباع مکمل اخلاص و اعتماد کے ساتھ اپنی تجویز کو فنا کر کے انقیاد و فرمانبرداری کی صورت میں پابندی کے ساتھ کرتا ہو تو وہ ضرور منزل تک پہنچ جاتا ہے اور اسے تقویٰ و نسبت مع اللہ کی دولت حاصل ہو جاتی ہے۔

اور اگر وہ کاملین میں سے نہ بنے تو تائبین میں تو شامل رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں کل قیامت کے دن جب کاملین پر اللہ کا فضل ہوگا تو اس تعلق کی برکت سے یہ بھی محروم نہیں رہے گا۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے

یہ حدیث شریف نقل فرمائی ہے:

﴿عَنْ أَبِی ذَرٍّ أَنَّهُ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللهِ الرَّجُلُ یُحِبُّ الْقَوْمَ وَلَا یَسْتَطِیْعُ أَنْ یَّعْمَلَ کَعَمَلِهِمْ قَالَ أَنْتَ یَا أَبَا ذَرٍّ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ﴾

(سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب اخبار الرجل الرجل بمحبته ایاہ)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک شخص کسی جماعت سے محبت رکھتا ہے اور ان کے برابر عمل و عبادت نہیں کر سکتا آپ نے فرمایا اے ابوذر تم اسی کے ساتھ ہو گے جس سے محبت رکھتے ہو گے اور ترمذی میں صفوان بن عسال کی روایت سے یہ الفاظ ہیں کہ آدمی اسی کے ساتھ ہو گا جس سے محبت رکھتا ہو گا۔ (التکشف، صفحہ: ۳۲۸)

صاحبو! کیا اللہ والوں سے محبت اور تعلق رکھنے اور ان کی صحبت و خدمت میں رہنے کا یہ کوئی کم فائدہ ہے کہ باوجود اپنے کوتاہ عمل ہونے کے قیامت کے دن اللہ کے فضل و کرم کے سائے میں ان کے ساتھ ان سے محبت رکھنے والے بھی اٹھائے جائیں گے۔

بس اتنی بات ضروری ہے کہ یہ تعلق محض اللہ کے لیے ہونا چاہیے یعنی اس تعلق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا ہو کوئی غرض دنیوی نہ ہو جیسے مثلاً شہرت کا ملنا یا اپنا نام چمکانا یا بزرگوں کے پاس آنے والے مال داروں سے اپنے تعلقات اور دوستیاں بڑھانا یا کوئی اور دوسری قسم کا مادی نفع پیش نظر نہ ہو تب ہی یہ فائدہ حاصل ہو گا یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ جو اللہ کے لیے آپس میں محبت رکھے ان میں سے ایک مشرق میں رہنے والا ہو اور دوسرا مغرب میں رہنے والا ہو تو جَمَعَ اللهُ بَیْنَهُمَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ کہ اللہ ان کو قیامت کے دن اکٹھا کر دے گا۔

میرے دوستو! ہمارے باغ دل میں اہلِ دل سے باغبانی کی صورت جب ہی ہو سکتی ہے کہ ہم ان کی تعلیمات و ہدایات پر عمل پیرا ہوں اور اپنی رائے کو بیچ میں داخل نہ کریں مزاج میں خود رائی نہ ہو ورنہ ساری زندگی بھی اگر کوئی شخص اہلِ دل اولیاء کے پاس رہتا رہے اور اپنی رائے پر چلتا رہے تو اسے کوئی ترقی نہیں ہوتی اور اس کے حال دل میں کوئی تغیر نہیں آتا جیسا کہ خانقاہوں میں اللہ والوں کے پاس بہت سے رہنے والے عمر بھر رہ کر بھی وصول الی اللہ کی منزل نہیں پاتے اور اس پر تعجب کیا جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں آنے والے منافقین اخلاص و اتباع کے فقدان کی وجہ سے تاعمر محروم رہے اور ان کی شقاوت سعادت میں تبدیل نہیں ہوئی اس لیے اس صحبت و خدمت کے صحیح نافع ہونے کے لیے ان شرائط کا ہونا لازمی ہے اخلاص و اعتماد و اطلاع و اتباع۔ رہ گیا قلب و نظر کی پاسبانی اور ان کی حفاظت کا مضمون تو یہ عنقریب اوپر کے صفحات میں بھی گزر چکا اور مختلف دوسرے مواقع پر اسی کتاب میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اور یہ ہمارے حضرت والا کی زندگی کا خاص مضمون ہے اور دین کے بہت سے شعبوں میں سے منکرات سے روک ٹوک کو حضرت نے اپنا خاص زندگی کا مشن بنایا اور اس میں بھی خاص طور پر عشقِ مجازی اور حسن پرستی کے خلاف زیادہ تر تقریریں اور بیانات فرمائے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے احقر کے دل میں ایک خاص بات ڈالی جو یہاں قارئین کے نفع کے لئے سپردِ قلم کر رہا ہوں اور حضرت والا کے سامنے اس کو سنا کر تصویب و تائید کے بعد یہ قدم اٹھا رہا ہوں اور وہ یہ کہ روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شیطان نے انسان کو بہکانے کے لیے جو مختلف چیزیں اس کو ڈھیل دیے جانے کے بعد اس کے سامنے پیش کی گئی ان تمام چیزوں میں سے عورتوں کو انسان پر ڈالنے والے اپنے جال کے طور پر پسند کیا تھا جیسا کہ الفاظ حدیث ہیں:

﴿اَلنِّسَآءُ حَبَائِلُ الشَّیْطَانِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، ص ۴۴۳)

کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں اور دوسری طرف نظر کے متعلق ارشادِ نبوی ہے:

﴿اِنَّ النَّظَرَ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ اِبْلِیْسَ مَسْمُوْمٌ﴾

(کنز العمال)

بے شک یہ نظر ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔

اب اس پس منظر میں احقر عرض کرتا ہے کہ حضرت والا کی زندگی بھر کی کوششوں کا ہدف اور نشانہ بالکل شیطان کی چالوں اور مکاریوں اور اس کے جالوں اور شرارتوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے سب سے مضبوط اور سخت ہے، اور گویا جو دشمن کا اصل ہدف اور نشانہ ہے جس سے وہ بہ سہولت مسلمانوں کو دین سے دور کر دیتا ہے وہ یہی مضمون ہے جس کے خلاف حضرت کی زندگی کی ساری کوششوں کا رخ ہے، ٹی وی، وی سی آر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، فلمیں، اور دوسری عریانیت اور بے حیائی کی شکلوں والے ماہنامے اور جریدوں اور میگزینوں اور رسالوں وغیرہ سے مسلمانوں کو بچا کر ان کے قلب و نگاہ کی حفاظت کا اہم کام انجام دینا یہ شیطان کو اس کے اصل منصوبے میں ناکام کرنا ہے اس لیے اس اعتبار سے دین کی اس محنت کا کرنا ڈائریکٹ اپنے دشمن شیطان سے مقابلہ کرنا ہے اور اپنے بھائیوں کو اس کی سازش اور مکر سے بچانا ہے تو اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان شاء اللہ یہ محنت اللہ کی بارگاہ میں بہت زیادہ مقبول اور باعث اجر و ثواب ہوگی۔

فواحش، بدکاری، زنا اور اس کے مقدمات دنیا کی اُن مہلک بُرائیوں میں سے ہے جن کے مہلک اثرات صرف اشخاص و افراد کو نہیں بلکہ قبائل اور خاندانوں کو اور بعض اوقات بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں جتنے قتل و غارت گری کے واقعات پائے جاتے ہیں اگر صحیح تحقیق کی جائے تو اکثر واقعات کے پس منظر میں کوئی عورت اور شہوانی جذبات کا جال نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس میں کوئی

قوم، کوئی مذہب، کوئی خطّہ ایسا نہیں جو اس کی بُرائی اور مہلک عیب ہونے پر متفق نہ ہو۔ دنیا کے اس آخری دور میں یورپین اقوام نے اپنی مذہبی حدود اور قدیم وقوی روایات سب کو توڑ کر اگرچہ زنا کو اپنی ذات میں کوئی جرم ہی نہیں رکھا، تمدّن ومعاشرت کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جن میں ہر قدم پر جنسی انارکی اور فواحش کو دعوتِ عام ہے، مگر ان کے ثمرات ونتائج کو وہ بھی جرائم سے خارج نہ کر سکے۔ عصمت فروشی، زنا بالجبر، منظرِ عام پر فحش حرکات کو تعزیری جرم قرار دینا پڑا، جس کی مثال اس کے کچھ نہیں کہ کوئی شخص آگ لگانے کے لیے سوختہ کا ذخیرہ جمع کرے، پھر اس پر تیل چھڑکے، پھر اس میں آگ لگائے اور جب اس کے شعلے بھڑکنے لگیں تو ان شعلوں پر پابندی لگانے اور روکنے کی فکر کرے۔

ہنڈیا پکانے کے لیے اس کے نیچے آگ جلائے، پھر اس کے اُبال اور جوش کو روکنا چاہے۔ اس کے خلاف اسلام نے جن چیزوں کو جرائم اور انسانیت کے لیے مضر قرار دے کر قابلِ سزا جرم کہا ہے، ان کے مقدمات پر بھی پابندیاں عائد کیں اور ان کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اس معاملے میں مقصودِ اصلی زنا اور بدکاری سے بچانا تھا تو اس کو نظر نیچی رکھنے کے قانون سے شروع کیا۔ عورتوں مردوں کے بے محابا اختلاط کو روکا، عورتوں کو گھروں کی چاردیواری میں محدود رکھنے کی ہدایت کی اور ضرورت کے وقت باہر نکلنے کے لیے بھی برقع یا لمبی چادر سے پورا بدن چھپا کر نکلنے اور سڑک کے کنارے چلنے کی ہدایت کی، خوشبو لگا کر یا بجنے والا زیور پہن کر نکلنے کی ممانعت کی، پھر جو شخص ان سب حدود وقیود اور پابندیوں کے حصار کو پھاند کر باہر نکل جائے اس پر ایسی سخت عبرت آموز سزا جاری کی کہ ایک مرتبہ کسی بدکردار پر جاری کر دی جائے تو پوری قوم کو مکمل سبق مل جائے۔

(معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۴ ۳۰)

اسرارِ محبت کا بیان محبت کے بعد ہی ممکن ہے

نہیں آساں ہے اسرارِ محبت کو بیاں کرنا
مگر واعظ کے دل کو بھی تو حاصل رازدانی ہو

مختلف روایات میں یہ مضمون آیا ہے کہ جب بندہ تمام گناہوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ خاص علوم اور اسرار ومعرفت کا خزانہ دل میں عطا فرما دیتے ہیں جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے:

﴿مَنْ أَخْلَصَ لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ﴾

(مسند الشهاب القضاعي)

جس آدمی نے چالیس دن (چلہ) اللہ تعالیٰ کی اخلاص کے ساتھ عبادت کی اور تمام گناہوں سے بچتا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے حکمت کے سرچشمے اس کی زبان کے ذریعہ ظاہر فرما دیتے ہیں۔

اکثر بزرگوں سے چلہ نشینی کا اہتمام منقول ہے۔ یہ حدیث اُس کی اصل ہے۔ بزرگوں کے کلام میں منصوص ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض خاص بندوں کو بعض علوم وہ عطا ہوتے ہیں جو نہ منقول ہیں نہ مکتسب ہیں، کبھی اُس کو علم وہبی سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی علمِ اسرار کہتے ہیں اور خود اُن سے اس قسم کے دقائق وحقائق منقول بھی ہیں جو اُن سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں نکلے۔ یہ حدیث ایسے علوم کی تحقیق اور اعتبار کی اصل ہے۔ (التکشف :صفحہ ۳۹۹)

ایک روایت میں یوں ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾

(مرقاة المفاتيح، كتاب الدعوات، باب جامع الدعاء)

یعنی جو آدمی اپنے علم پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پھر اسے بہت سا ایسا علم خاص اپنے پاس سے عطا فرماتے ہیں جو اسے اپنی محنت اور کسب سے حاصل نہیں تھا ایسے ہی علم کو علم لدنی کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم یہاں مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں اور روزانہ آتے جاتے ہیں تو اگر ہم التزام اور پابندی کے ساتھ معمول بنالیں کہ جو بھی علم حاصل ہوگا اور جن گناہوں کے بارے میں معلومات ہوتی رہے گی اس پر عمل کرتے رہیں گے اور ہر گناہ کو پوری ہمت وطاقت کے ساتھ چھوڑ ڈالیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ قلب کو اپنے اسرار محبت عطا فرمادیتے ہیں جب ایسا عالم منبر پر بیٹھتا ہے تو پھر وہ اسرارِ محبت سامعین کے سامنے بھی پیش کرتا ہے لیکن جب خود واعظ کے دل کو اسرارِ الٰہیہ کی رازدانی حاصل نہ ہو تو پھر وہ دوسروں کے سامنے کیسے بیان کرسکتا ہے جو بعض لوگ بزرگوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے بیانات میں ویسی تاثیر نہ ہونے اور ان علوم کے عطا نہ ہونے پر کڑھتے اور بے چین رہتے ہیں ان کے لیے شعر میں یہ سبق ہے کہ اگر تم اسرار محبت کو بیان کرنا چاہتے ہو تو خود پہلے حامل درد محبت ہو جاؤ اور رازدان اسرارِ الٰہیہ بن جاؤ۔

ملا کرتا ہے دردِ دل بڑی خونِ تمنا سے
رضائے حق میں اپنی آرزو ہر وقت فانی ہو

یعنی ہر قدم پر، زندگی کے ہر سانس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے اگرچہ اپنی آرزو اور تمنا اس کے خلاف ہو اور اس کام کے کرنے کو خوب جی چاہ رہا ہو مگر اپنی تمنا کا خون کردینا چاہیے تو پھر دردِ دل نصیب ہوتا ہے چاہے طبیعت پر کتنا ہی زور پڑے مگر اللہ کو ہر صورت میں راضی رکھے۔

ذرۂ دردِ دل ہفت اقلیم سے بڑھ کر ہے

فدا لیکن ہے اس ذرہ پہ ہفت اقلیم کی دولت
بصورت درد دل دل میں اگر درد نہانی ہو

ہفت اقلیم کی دولت اگر کسی کو حاصل ہو لیکن اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی کامل اور راسخ محبت نہ ہو تو یہ سمجھو کہ اس کو جو کچھ حاصل ہے وہ سب باہر باہر کا ہے اس کا اندر خالی ہے جس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے جو حضرت والا نے معارف مثنوی میں پیش فرمائی۔

اس وقت جبکہ قلعہ کے اندر کوئی چشمہ نہ ہو اور اہل قلعہ صرف بیرونی نہروں سے پانی حاصل کرتے ہوں اور اچانک دشمن کی فوج باہر سے نہروں کو بند کردے۔ یہ تو اہل قلعہ کی زندگی کے لیے اسی قلعہ کے اندر ایک کھارا چشمہ باہر کے سیکڑوں دریائے جیحون سے بہتر ہوگا اسی طرح زندگی میں حواس خمسہ کے ذریعہ انسان عیش حاصل کررہا ہے اور موت آنکھ، کان، ناک، زبان اور جلد (باصرہ سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ) کے ذریعے باطن میں درآمد ہونے والی لذتوں کے راستوں کو کاٹ دیتی ہے اور جو یہ حواس ہیں وہ دنیا کی لذتوں کو محسوس کرنے سے عاجز اور معطل ہوجاتے ہیں۔

قضا کے سامنے بیکار ہوتے ہیں حواس اکبر
کھلی ہوتی ہیں گو آنکھیں مگر بینا نہیں ہوتیں

اب مردہ کی زبان شامی کباب کے لطف سے معطل ہے اس کی آنکھیں بچوں کو دیکھنے سے عاجز ہیں، کان ریڈیو کے نغمات نہیں سن سکتے زبان بے زبان ہورہی ہے کیا بے کسی کا عالم ہے اس وقت اگر روح میں تعلق مع اللہ کا کوئی کھارا چشمہ بھی ہوتا یعنی ناقص طاعات کا ضعیف نور بھی ہوتا تو یہ لذات فانیہ کے ان سینکڑوں دریائے شیریں سے جو بذریعہ حواس خمسہ اندر داخل ہورہے تھے بہتر ہوتا اور اس بے کسی کے وقت روح کو اس سے انس وسکون حاصل ہوتا حق تعالیٰ اپنی رحمت سے سب مسلمانوں کو چندروزہ بہار زندگی کے دھوکہ سے محفوظ فرماویں اور آخرت کی باقی ودائمی اور غیر فانی نعمتیں اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرماویں، آمین۔

عاشقِ صادق کی کہانی دُکھ بھری کیوں نہ ہو؟

ہزاروں غم اٹھائے جس نے ان کی راہ میں اختر
نہ پھر کیوں دکھ بھری اے دوستو اس کی کہانی ہو

احقر تشریح کے طور پر عرض کررہا ہے کہ ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم نے ان حسین اور حسیناؤں سے نظروں کی حفاظت کے سلسلے میں تو بہت زیادہ غم اُٹھائے ہیں اور اس راہ کے مجاہدوں سے گزرے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے ایک روز حضرت والا کے حالاتِ زندگی ذکر کرتے ہوئے یہ

بات ارشاد فرمائی کہ تقریباً سولہ سال تک حضرت کے پیچھے ایسے حاسدین لگے رہے جو طرح طرح سے آپ کے طعنے دیتے تھے اور حضرت کی طرف سے حضرت کے شیخ شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کو بدظن کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جس کے نتیجے میں حضرت والا کو بہت زیادہ غم اور صدمہ پہنچتا تھا، یہی ایذائے خلق کا غم جو حضرت نے بہت زیادہ اُٹھایا ہے اور یہ حضرت والا کے کلام میں مختلف مواقع پر بہت صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ اور بالکل واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ حضرت والا کے مجاہدات میں ایذائے خلق کا غم بھی بہت زیادہ شامل ہے۔ اور اس طرح کے معاملات اپنے اللہ کے سامنے پیش کرنا بُرا نہیں ہے۔ ہاں! لوگوں سے جا کے بتانا اور اُن کے سامنے فریادیں کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنا اس طرح کا کوئی بھی حال بارگاہِ خداوندی میں پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب اُن کے دوسرے بیٹوں نے طعنہ دیا کہ آپ یوسف کے بارے میں اتنے فکرمند اور پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ بالکل گھلے جارہے ہیں۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ'' کہ میں اپنے رنج وغم کی شکایت اور اُس کا اظہار وفریاد اپنے رب سے کررہا ہوں اور مجھے اپنے رب کی طرف سے اُن باتوں کا علم ہے جن کو تم نہیں جانتے ہو۔ اس لیے میں اپنا رنج وغم تمہیں نہیں سناتا بلکہ اپنے اللہ کو سناتا ہوں۔ جیسا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دعاؤں میں اس طرح کے جملے منقول ہیں جن سے اس مضمون کی وضاحت اور اچھی طرح سے ہوجاتی ہے۔ ''مناجاتِ مقبول'' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں ایک دعا بھی یہ شامل ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی عَدُوٍّ یَّتَھَجَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی قَرِیْبٍ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ اِنْ لَّمْ تَکُنْ سَاخِطًا عَلَیَّ فَلَآ اُبَالِیْ غَیْرَ اَنَّ عَافِیَتَکَ اَوْسَعُ لِیْ﴾

(مناجات مقبول: ص ۳۸، مکتبۃ العلم، لاہور پاکستان)

یا اللہ! تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنے ضعیف القویٰ ہونے کی اور لوگوں کی نظروں میں کم وقعتی کی، اے ارحم الراحمین کس کے سپرد کرتا ہے تو مجھے آیا کسی دشمن کے کہ سینہ زوری کرے مجھ سے یا کسی عزیز کے قبضے میں دے دے تو اس کے میرے سب کام اگر تو غصہ نہ ہو تو مجھ کو اس کی کچھ پرواہ تو نہیں مگر پھر بھی تیرے امن میں مجھ کو زیادہ گنجائش ہے۔

گویا جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ راہ دکھلائی کہ ہمارا رب جس حال میں رکھے ہم کو اُس پر راضی رہنا چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ سے اللہ کی عافیت اور امن ہی کی درخواست کرنی چاہیے اور ہم بندے بحیثیت بندے ہونے کے اسی کے مکلّف ہیں کہ اللہ سے عافیت مانگیں۔ بس اگر اُس کے بعد غیر اختیاری طور پر کوئی تکلیف اور پریشانی لاحق ہوجائے یا ایذائے مخلوق کا سامنا کرنا پڑجائے اور یا اہلِ خاندان، رشتہ داروں، بھائیوں بہنوں اور اہل وعیال کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آجائے تو اُس کو منجانب اللہ سمجھ کر اپنی خیر ومصلحت کا تصور کرتے ہوئے برداشت کرنا چاہیے، کیونکہ اس کے برداشت کرنے اور ان غموں کو اُٹھانے میں اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص عطا

ہوتا ہے۔ جس کی جانب حضرت والا شعر میں اشارا فرما رہے ہیں اور اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ دوسروں کو معاف کرتے ہوئے اپنے حقوق کو درگزر کرنے کے ساتھ زندگی گزارو جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ہمیں عزت اور رفعت عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس طرح سے آیا:

﴿مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَّالٍ وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع)

کہ صدقہ کی وجہ سے کبھی بھی مال میں کمی نہیں آتی اور اللہ تبارک وتعالیٰ بندے کو معاف کرنے سے عزت و رفعت میں ہی اضافہ فرماتے ہیں اور جو بھی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے اُس کو حق تعالیٰ سربلندی عطا فرماتے ہیں۔

البتہ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ تواضع وہی اللہ کی بارگاہ میں معتبر ہے جو حقیقت پر مبنی ہو اور دل سے ہو ورنہ آج کل عام طور پر تواضع کے جملے بولتے ہیں اور ظاہر میں یوں کہتے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں، اور میری آپ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، اور میں تو معمولی درجے کا آدمی ہوں، لیکن اگر کوئی شخص ٹھیک اسی وقت میں کوئی ایسی ناگوار بات کہہ دے جو بظاہر اُن کی شان کے مناسب نہ ہو تو فوراً جوش میں آکر چہرے کا نقشہ اور رنگ بدل جاتا ہے اور زبان سے ناشائستہ الفاظ نکلنا شروع ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ اگر حقیقت میں تواضع ہوتی تو پھر اس کی شان میں گستاخی کرنے والے سے یوں کہتے کہ جناب! آپ ہی صحیح کہہ رہے ہیں اور جو کچھ میں صورتاً دِکھ رہا ہوں یہ تو اللہ تعالیٰ کی ستاری اور پردہ پوشی ہے ورنہ میرے اندر تو بے شمار عیوب اور نقائص بھرے ہوئے ہیں۔ اور خود تم نے بھی جو کہا ہے میں تو اس سے بھی گیا گزرا ہوں۔

یہی حقیقت میں تواضع کہلاتی ہے اور ہر مؤمن کا وصف لازم بھی یہی ہے کیونکہ جب تک ایمان پر خاتمہ نہ ہو تو اپنی کوئی بھی حیثیت ذہن کے اندر مقرر کرلینا یہ دھوکہ اور جہالت پر مبنی ہے۔ کسی نے تبلیغ یا خانقاہ میں کتنے ہی چلّے لگالیے ہوں اور کیسے ہی دین پر زندگی گزر رہی ہو اور رات و دن عبادات میں اُس کے اوقات خرچ ہو رہے لیکن جب تک یہ حقیقت دل میں موجود نہ ہو تو وہ شخص متواضع نہیں کہلاتا۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کو کسی نے آکر کچھ بُرا بھلا کہا۔ تو مولانا نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ میں قسم کھا کے کہتا ہوں جتنا بُرا تم نے مجھے کہا ہے میں تو اُس سے بھی زیادہ اپنے کو گیا گزرا خیال کرتا ہوں۔

اسی لیے دوستو! مخالفتیں اور ایذاءِ خلق مانگنی تو نہیں چاہیے لیکن جب آئیں تو سمجھو کہ اس میں اللہ نے ہماری کوئی نہ کوئی خیر چھپا کر رکھی ہے بس ہم اللہ پر نظر رکھیں اور جو طریقہ اسلام نے دیا ہے اکرام کا اس پر مضبوطی سے قائم رہیں کہ ان کا حق ادا کرتے رہیں اپنا حق بھلاتے رہیں، اپنے فرائض بھول جائیں ان کے حقوق یاد رکھیں۔ بہت میٹھا اور بہت شاندار طریقہ ہے، جس کی برکت سے ساری تلخیاں مٹھاس میں بدل جاتی ہیں۔ خلق کے حقوق ادا کرتے رہیں اپنے حقوق خلق سے بھول کر خالق کی طرف نظر رکھیں اور اپنے فرائض یاد رکھیں تو ان شاء اللہ

سب شیر وشکر بن کے رہیں گے۔ ساری چیزیں کچھ دنوں کی ہوتی ہیں، بعد میں اللہ تعالیٰ سب کو تابع کر دیتے ہیں اور ایسے بندوں کو اپنی جانب سے خصوصی عزت وعظمت عطا فرماتے ہیں۔

گرم بازاری عشق

اشکہائے خون سے جب چشم تر کرتا ہوں میں
عشق کا بازار دل میں گرم تر کرتا ہوں میں

جب بتانِ حسن سے صرفِ نظر کرتا ہوں میں
درد کی لذت سے راہ عشق سر کرتا ہوں میں

کر کے خونِ آرزو خونِ جگر کرتا ہوں میں
اپنی آہوں کا اثر یوں تیز تر کرتا ہوں میں

ہر قدم پر تاکہ حاصل ہو حیاتِ نو مجھے
ہر قدم پر زیرِ خنجر اپنا سر کرتا ہوں میں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **اشکہائے خون:** خون کے آنسو۔ **چشم تر:** آنکھوں کا گیلا ہونا۔ **بتان:** بت کی جمع یعنی تمام نامحرم۔ **صرفِ نظر:** نظر بچانا۔ **راہِ عشق:** اللہ تعالیٰ کی محبت کا راستہ۔ **حیات نو:** نئی زندگی۔

اشکہائے خون سے گرم بازاری عشق

اشکہائے خون سے جب چشم تر کرتا ہوں میں
عشق کا بازار دل میں گرم تر کرتا ہوں میں

جب اللہ تعالیٰ کے لیے بندہ گناہوں سے بچنے کا غم دل پر اٹھاتا ہے بے شک اسے دل میں بڑا غم اور صدمہ ہوتا ہے کیونکہ اس نے اپنی آرزوؤں کا خون کیا ہوتا ہے تو پھر دل میں اللہ تعالیٰ اپنا عجیب محبت کا درد عطا فرماتے ہیں اور بہت ہی خصوصی محبت خداوندی اور عشق کی دولت میسر ہوتی ہے اور پھر آنکھوں سے جو آنسو نکلتے ہیں بلا شبہ وہ اشکہائے خون کہلانے کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ وہ حسرتوں کا خون کر کے دل کے ٹوٹنے کے نتیجے میں آنکھوں سے جاری ہوتے ہیں جیسا کہ مختلف مقامات پر اشعار کے تحت یہ مضمون گزر چکا۔

خونِ آرزو سے خونِ جگر کر کے شجرِ محبت کا پھل دار ہونا

جب بتانِ حسن سے صرف نظر کرتا ہوں میں
درد کی لذت سے راہِ عشق سر کرتا ہوں میں
کر کے خونِ آرزو خونِ جگر کرتا ہوں میں
اپنی آہوں کا اثر یوں تیز تر کرتا ہوں میں

یہ مضمون بھی اس روایت سے ماخوذ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب آدمی اپنی نظر کو بچاتا ہے تو دل میں ایمان کی حلاوت پاتا ہے اسی کو حضرت والا نے درد کی لذت سے تعبیر کیا ہے جس کے نتیجے میں راہِ عشقِ خداوندی بڑی تیزی کے ساتھ طے ہو جاتی ہے۔

اور اگلے شعر کا خلاصہ اور نچوڑ بھی یہی ہے کہ اپنی آرزوؤں اور امیدوں کا خون کر کے قلب و جگر کے ٹکڑے کر ڈالتا ہوں جس کی بدولت دل میں عشق کی آگ بھڑک جاتی ہے جو کہ آہ و فغاں کی شکل میں پھر ظاہر ہوتی ہے جتنا درجے کسی نے اپنے قلب و جگر کا خون کیا ہوا تنا اس کی آہوں کا اثر تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔

ان اشعار میں حضرت والا کا یہ پیغام ہے کہ گناہ کی لذتوں کو چھوڑ دو! چاہے جتنا طبیعت پر زور پڑے اب بہت سے مسلمانوں کے گھروں میں یہ معمول ہے کہ عشاء کے بعد کھانا کھایا اور سارے خاندان والے کرسیوں اور صوفوں کے اوپر ٹی وی دیکھنے بیٹھے ہیں اور مختلف چینل چلا رکھے ہیں اور اس میں بیٹھے ہوئے پتہ نہیں کیسے کیسے غلط سلط پروگراموں کو دیکھ رہے ہیں، پھر صورت حال کچھ یوں ہوتی ہے کہ ان سب حاضرین میں سے یکے بعد دیگرے اُٹھ کر اپنے سلیپنگ روم میں جا کے سو جاتے ہیں، پھر اخیر میں دو رہ جاتے ہیں، وہ کون ہوتے ہیں؟ کبھی بھائی اور بہن کبھی بھابی اور دیور اور بالآخر شیطان اپنے قبیح ارادوں اور عزائم میں کامیابی اختیار کر لیتا ہے، جاؤ جا کے دارالافتاء میں مفتی صاحب سے پوچھو تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ آج کل ایسے استفتا بھی بکثرت آرہے ہیں کہ بھائی بہن سے ملوث ہو گیا یا اہل اللہ کے پاس جا کر ان سے حالات کا پتہ لگایئے کیونکہ ان کو سب سے زیادہ حالات کا پتہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جو حقائق اور واقعات ہیں وہ کبھی بذریعہ خطوط اور کبھی بذریعہ فون اور انٹرنیٹ آئے دن ان کے سامنے طالبینِ اصلاح کی طرف سے آتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ یہ علماء اور مفتی حضرات تو ایک کمرے میں مدرسے کی چہار دیواری میں رہتے ہیں، ان کو دنیا کا کیا پتہ؟......اس لیے یہ تو بس تقریر کرتے ہیں ان کو حالات کا پتہ نہیں ہے حالانکہ اہل اللہ سب سے زیادہ حالات جانتے ہیں، کیونکہ جب لوگ ان کے پاس دعائیں کرانے آتے ہیں یا مسائل پوچھنے آتے ہیں تو جن حالات سے وہ گزر رہے ہوتے ہیں وہ ان کے سامنے بیان کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

میرے دوستو! ان کے پاس روزانہ دنیا بھر سے کتنے خطوط آتے ہیں ان میں سارے احوال لکھے جاتے ہیں، ایک قصہ نہیں، دو قصے نہیں، اٹھا کر دیکھئے! روزانہ کتنے قصے پیش آتے ہیں، اس لیے ان گناہوں اور حرام لذتوں کو چھوڑنا اپنی اصلاح کے لیے لازم اور ضروری ہے جب تک انسان انہیں نہیں چھوڑے گا ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اور تب تک اس کو ایمان کی حلاوت اور مٹھاس نصیب نہیں ہوتی اسی لیے اہل اللہ سے محبت کیجاتی ہے اور ان کی صحبت اختیار کی جاتی ہے تاکہ گناہوں کا چھوڑنا آسان ہو جائے۔

صحبتِ اہل اللہ کے چند اہم فوائد

﴿عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَسْأَلُكَ عَنْ عَلَامَةِ اللهِ فِيْمَنْ يُرِيْدُ وَعَلَامَتِهِ فِيْمَنْ لَا يُرِيْدُ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ أَصْبَحْتَ قَالَ أَصْبَحْتُ أُحِبُّ الْخَيْرَ وَأَهْلَهُ وَمَنْ يَعْمَلُ بِهِ وَإِنْ عَمِلْتُ بِهِ أَيْقَنْتُ بِثَوَابِهِ فَإِنْ فَاتَنِيْ مِنْهُ شَيْءٌ حَنَنْتُ إِلَيْهِ قَالَ هٰذِهِ عَلَامَةُ اللهِ فِيْمَنْ يُرِيْدُ وَعَلَامَتُهُ فِيْمَنْ لَا يُرِيْدُ وَلَوْ أَرَادَكَ بِالْأُخْرٰى هَيَّأَكَ لَهَا ثُمَّ لَمْ يُبَالِ فِيْ أَيِّ وَادٍ هَلَكْتَ﴾

(کنز العمال و التکشف، ص ۴۰۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! مجھے کچھ ایسی نشانی بتایئے جس سے میں اندازہ لگاؤں کہ وہ کون لوگ ہیں جنھیں اللہ چاہتے ہیں اور وہ کون ہیں جنھیں اللہ نہیں چاہتے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص سے یہ سوال کیا: ''بتاؤ! تم نے کس حال میں صبح کیا؟'' اس شخص نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں نے اس حال میں صبح کی کہ میں خیر اور اہلِ خیر کو پسند کرتا ہوں اور اُن لوگوں کو جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ یعنی دیندار اور نیک لوگوں کو اور اگر میں اس خیر پر عمل کروں تو مجھے اس کے ثواب کا یقین دل میں رہتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے چھوٹ جائے تو میں اُس کے کرنے کا شوق رکھتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: ''یہی اللہ کی علامت ہے اُن لوگوں کے بارے میں جن کو اللہ چاہتے ہیں اور اُن لوگوں کے بارے میں یہی نشانی ہے جن کو اللہ نہیں چاہتے اور اگر اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ خیر کے علاوہ دوسرا کچھ چاہتے تو تجھے اس کے لیے مہیا اور تیار کردیتے اور پھر اللہ تعالیٰ پرواہ نہ کرتے کہ تم کون سی وادی میں ہلاک ہوچکے ہو۔''

اس حدیثِ پاک سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دل میں خیر کی تمنا رکھنا اور اہلِ خیر کو محبوب رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی نشانی ہے۔ یہی بات حضرت تھانوی نے تحریر فرمائی ہے کہ اس حدیث میں مقبولیت کی علامت صراحتاً مذکور ہے اور فرمایا کہ علامتِ مقبولیت حدیث میں منصوص ہے۔ (التکشف، صفحہ:۴۰۲)

اور اہل اللہ سے محبت پر خود حلاوتِ ایمان کا وعدہ ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ اَنْ یَّکُوْنَ اللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا وَاَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلہِ وَاَنْ یَّکْرَہَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ کَمَا یَکْرَہُ اَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ﴾

(فتح الباری لابن حجر، کتاب الاکراہ، باب من اختار الضرب والقتل والھوان علی الکفر)

یعنی تین باتیں ایسی ہیں جس میں وہ ہوں گی، ان تین باتوں کی وجہ سے وہ ایمان کی حلاوت کو پالے گا ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ اور اُس کا رسول اُس کو ان دونوں کے ماسواء ہر شے سے زیادہ محبوب ہو جائے، اور دوسری یہ کہ وہ کسی بھی انسان سے محض اللہ کے لیے محبت کرنے والا ہو اور تیسری یہ کہ کفر میں لوٹنا اسے اتنا ناگوار ہو کہ جتنا آگ میں اور جہنم میں ڈال دیا جانا اس کو ناگوار ہوتا ہے۔

الحمدللہ! یہاں خانقاہ میں جتنے بیٹھے ہیں ہم سب کے لیے یہی گمان رکھتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے لیے محبت والے بیٹھے ہیں اسی لیے میں تو اپنے ذہن میں یہ سوچتا ہوں! اور زبان سے کہتا بھی ہوں کہ یہ سارا عشاقِ خداتعالیٰ کا مجمع ہے، اللہ کے عاشقوں اور اللہ تعالیٰ کے چاہنے والے لوگوں کا مجمع ہے اور اگر ایک دوسری روایت کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اللہ کے محبوبین کا بھی مجمع ہے۔ موطا امام مالک کی روایت ہے:

﴿وَجَبَتْ مَحَبَّتِیْ لِلْمُتَحَابِّیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَجَالِسِیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ﴾

(مؤطا مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء فی المتحابین فی، ص:۷۳۳)

میری محبت واجب ہوگئی ایسے لوگوں کے لیے جو میرے لیے آپس میں محبت رکھتے ہیں اور میری رضا کے لیے ایک دوسرے کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہیں اور میری رضا کے لیے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔ یہاں خانقاہ میں ساری باتیں ہیں تو یہ حدیث کیا بتارہی ہے؟ کہ جو لوگ اس محبت کو لیے ہوئے یہاں پر بیٹھے ہیں وہ محبوبین حق تعالیٰ بن گئے، خود اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا ضرور بضرور وہ میرے محبوبین ہیں اور اس روایت سے پتہ چلا کہ ان کو ایمان کی حلاوت ملے گی جو اللہ کے لیے محبت رکھتے ہوں اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یہ بات نقل کی ہے:

﴿وَقَدْ وَرَدَ اَنَّ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ اِذَا دَخَلَتْ قَلْبًا لَا تَخْرُجُ مِنْہُ اَبَدًا فَفِیْہِ اِشَارَۃٌ اِلٰی بِشَارَۃِ حُسْنِ الْخَاتِمَۃِ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، ج:۱، ص:۱۰۲)

اور یہ بھی الگ سے مضمون وارد ہوا ہے کہ جب حلاوت ایمانی کسی دل کو ملتی ہے تو پھر اس سے کبھی بھی نکلتی نہیں جب کبھی نہیں نکلتی تو وہ زندگی کی گھڑی بھی اس گھڑی میں سے ہے جس میں ہماری موت آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ اس حلاوت کو لیے ہوئے ہم سب دنیا سے جائیں گے۔

اور پھر ملا علی قاری آگے فرماتے ہیں فَفِیْہِ اِشَارَۃٌ اِلٰی بَشَارَۃِ حُسْنِ الْخَاتِمَۃِ اس میں اشارہ ہے کہ

اس انسان کا خاتمہ اچھا ہوگا تو اللہ والوں کی صحبت کا ایک بڑا انعام یہ ملا کہ انسان کا خاتمہ ایمان کے اوپر ہو رہا ہے اسی لیے ایمان پر خاتمے کے سات مدلل نسخے جو حضرت نے بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

شکوک وشبہات کی بنیاد حقائق سے لاعلمی ہے

آج لوگ شکوک وشبہات میں پڑے رہتے ہیں کہ اللہ والوں سے ملنے میں اپنے آپ کو کونے میں ڈال دینا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ یہ پیری مریدی کیا چیز ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمیں اس میں یہ اشکال ہے اور وہ اشکال ہے؟ مجھے تو اس میں یہ اشکال اور وہ اشکال ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق پر بھروسہ کر کے اور حضرت والا کی دعاؤں کی برکت سے یہ عرض کرتا ہوں آپ آئیں! تشریف لائیں اور اپنے اشکالات پیش کریں اگر ہم نے یہ ثابت نہ کر دیا کہ اس خانقاہ والے تصوف کا ایک ایک مسئلہ قرآن وسنت سے ثابت ہے تو آپ خانقاہ چھوڑ کر چلے جائیے گا اور ہم بھی آپ کے ساتھ تائب ہو جائیں گے، اور اگر ثابت کر دیا گیا تو پھر آپ کو ہر لحاظ سے تسلیم کرنا پڑے گا عملاً، قولاً، اعتقاداً۔

یاد رکھنا! حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر ابن قیم اور ابن تیمیہ بھی آج ہوتے تو وہ میرے تصوف کو مانتے۔ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے تصوف کیا ہے؟ اگر کچھ طلبہ یہاں بیٹھے ہوئے ہوں تو ان سے عرض کرتا ہوں کہ ذرا اس کتاب کا مطالعہ کر کے دیکھیں۔ اس کتاب میں حضرت مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے ابن قیم اور ابن تیمیہ کے بہت سارے ارشادات نقل کیے ہیں جن کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو جائے گا کہ جس تصوف کا ان بزرگوں نے انکار کیا ہے وہ کونسا تصوف ہے؟ وہ والا تصوف ہے جو فلاسفہ، زنادقہ، مبتدعہ کا تصوف ہے جو جاہلانہ و زندیقانہ عقائد کا مجموعہ ہے وہ درحقیقت اس کے منکر ہوئے ہیں لیکن جس تصوف کا خلاصہ اتباع شریعت وسنت ہو جو کہ ان تمام مشائخ اہل حق کی خانقاہ میں ہے، یاد رکھئے! اسکا کوئی کسی زمانے میں آج تک منکر نہیں ہوا ہے۔

اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے صاف فرمایا کہ جو کچھ سنت وشریعت کے خلاف ہو ہم اس کو تصوف نہیں سمجھتے اور اس سے اللہ کا وصول انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا ہے، بہرحال یہ باتیں ضمناً آگئیں تو حضرت کا جو مضمون ہے وہ یہ ہے کہ اپنی آرزوئیں اور تمناؤں کا خون کرو! خون کرنے کے نتیجے میں قلب میں ایک عجیب حلاوت ہوگی اللہ تعالیٰ اس دل کو اپنی خاص تجلیات کے ساتھ تعمیر کرتے ہیں اور خود اللہ تعالیٰ اس دل کے اندر تشریف لاتے ہیں، اس لیے پھر اس دل کی لذت کا کیا عالم ہوگا؟ اس لیے حضرت نے فرمایا کہ درد کی لذت سے راہ عشق سر کرتا ہوں میں۔

صاحبو! احقر ایک مثال کے ذریعے سے لذت درد محبت اور لطف خون آرزو پیش کرتا ہے جس سے ہم سب کو واسطہ پڑتا رہتا ہے اور وہ یہ کہ ایک تو وہ حج وعمرہ ہے جو آپ نے نگاہ بچا کر کیا ہو آپ دیکھیں گے کہ رات کو آپ کو رونا بھی آئے گا، دعاؤں میں بھی مزہ آئے گا، طواف میں بھی ایک عجیب لطف آئے گا۔ اس کے برخلاف

دوسرے وہ لوگ ہیں کہ جو طواف بھی کر رہے ہیں تو ادھر ادھر غیر محرموں کو دیکھ رہے ہیں تو ایسے لوگ دل سے بے چین اور پریشان ہو جائیں گے اور دل دل میں یہ کہیں گے کہ میں اتنی عبادات کر رہا ہوں پھر بھی مجھے سکون کیوں نہیں نصیب ہو رہا ہے؟

مصائب کی بنیادی وجہ معاصی کا پھیلاؤ ہے

میرے دوستو! آج امت کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ سورۂ یٰس پڑھی جارہی ہے اشراق واوابین بھی پڑھی جارہی ہے اور صبح وشام میں مختلف ختمات اجتماعی اور انفرادی طور پر ہو رہے ہیں اور تسبیحات صبح وشام بھی پڑھی جارہی ہیں اور معمولات وظائف کی بھی پابندی ہو رہی ہے۔

لیکن دوسری طرف گناہوں اور خدا کی نافرمانیوں کی صورت حال یہ ہے کہ وہی شخص سورۂ یٰس اور اشراق پڑھنے کے بعد آفس میں جا کر نامحرم عورتوں اور جوان لڑکیوں کے ساتھ بلا تکلف ہنسی مذاق اور دل لگی میں بھی دن بھر مصروف ہے اور ان کے ساتھ خلوتوں اور تنہائیوں میں ملاقات کرنے کو بھی معیوب نہیں سمجھا جارہا ہے صبح سے شام تک ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا عام معمول زندگی بن گیا ہے جس کا ایک خراب نتیجہ ہماری نگاہوں کے سامنے یہ ہے کہ معاشرے میں طلاق کی تعداد بہت ہوگئی ہے۔

اور ایسا کیوں نہ ہو جب ہم صبح سے شام تک جا کر عورتوں سے دل لگی کرتے ہیں اور ہماری عورت گھر سے نکل کر آفس میں جا کر دوسرے غیر محرموں کے ساتھ دن بھر خدا کی نافرمانی کر کے ان سے بے تکلف گفتگو اور ہنسی مذاق میں گزارتی ہے تو ہم نے خود سکون کا کونسا سامان اپنے گھر میں چھوڑا ہے؟ ایک طرف تو ہم اپنے دل اور نگاہ کو ناپاک کر رہے ہیں دوسری طرف ہماری بیوی، تو جب ہم شام کو گھر میں اکھٹے ہوں گے تو لڑائی نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟ اختلاف نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

میرے عزیزو! دوستو! لوگ آج اختلاف کے مسئلے کو لیکر بہت پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گھر میں بالکل چین نہیں ہے گھر گھر جھگڑا ہے کوئی سکون نہیں۔ بات دراصل یہ ہے جب کسی درخت کی شاخیں خشک ہونے لگیں تو شاخوں کو تر کرنے کی فکر نہ کیجئے بلکہ دیکھئے! اس درخت کی شاخیں خشک کیوں ہو رہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے خشک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درخت کی جڑ میں پانی نہیں ہے۔ تو اس درخت کو سرسبز وشاداب رکھنے کے لیے اس کی جڑ کو پانی دیجئے تب خود بہ خود شاخیں ہری بھری ہو جائینگی اور وہ درخت پھول وپھل دے سکے گا۔

اس لیے یہ جو اختلاف اور جھگڑے ہو رہے ہیں ...... ان کے اسباب اور وجوہ پر غور کیجئے کہ کیا ہیں؟ میرے گھر میں کون کون سے گناہ ہیں؟ کہیں تصویریں تو نہیں ہیں؟ بے پردگی تو نہیں ہے؟ ٹی وی، وی سی آر وغیرہ تو گھر میں نہیں ہے؟

ایک اچھے دین دار شخص نے ہماری دعوت کی اور وہ بزرگان دین کی دعوت کرتے ہی رہتے ہیں، احقر جیسے ہی کمرے میں جا کے بیٹھا تو میں نے دیکھا کہ مختلف قسم کی تصویریں ہی تصویریں ہی تصویریں طاقوں میں بجی رکھی ہیں اور دیواروں پر لٹکی ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھائی یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فوراً وہ تصویریں ہٹا دیں پھر اتفاق سے دوسری مرتبہ میں گیا تو ایک چھوٹے سے فریم کے اندر اپنے بچے کی تصویر کرا کر رکھے ہوئے تھے پھر احقر نے ان کو سمجھایا اور ان سے یہ عرض کیا کہ یہ بھی تصویر ہے اس کو بھی ہٹادو اور لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں چین وسکون نہیں۔

ملفوظ شاہ ہردوئی رحمہ اللہ

حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ نے عجیب بات ارشاد فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ٹرک ہمارے گھروں پر سامنے راستے میں کھڑا ہوا ہے اور اندر داخل ہونا چاہتا ہے مگر معاصی اور نافرمانیوں کا ٹرک راستہ روکے ہوئے ہے جو اسے اندر آنے نہیں دے رہا ہے بالکل گھر میں اندر گناہوں سے بھرا ہوا ٹرک لدا کھڑا ہے۔ وہ راستہ نہیں دیتا ہے ورنہ اللہ کی رحمت کے خزانے ہم پر برسنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا کیا ہوا ہے اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

صاحبو! یہ گھروں کے جھگڑے اور آپس کی رنجشیں اور اختلافات اور ذہنی الجھنیں اور دماغی پریشانیاں محض کوئی اتفاقی معاملات نہیں ہیں بلکہ یہ درحقیقت ہماری بداعمالیوں کی سزا ہے اس لیے جب ایسے حالات کا سامنا ہو تو فوراً توبہ کرنی چاہیے اور غور کرنا چاہیے! اور اپنے اعمال کا فوری جائزہ لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا چاہیے تو ان شاء اللہ یہ حالات قائم نہیں رہ سکتے۔

اس کا عذاب ہونا قرآن کریم میں یوں مذکور ہے:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ
أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ﴾

(سورۃ الانعام، آیۃ ۶۵)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم (یہ بھی) کہئے کہ (جس طرح وہ نجات دینے پر قادر ہے اسی طرح) اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر (تمہارے کفر وشرک کی وجہ سے) کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے (جیسے پتھر یا ہوا یا بارش طوفانی) یا تمہارے پاؤں تلے (جو زمین ہے اس) سے (ظاہر کردے، جیسے زلزلہ یا غرق ہوجانا اور ان عذابوں کے اسباب قریبہ تو اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، کبھی نہ کبھی ایسا ہوگا خواہ دنیا میں یا آخرت میں) یا کہ تم کو (اغراض کے اختلاف سے مختلف) گروہ گروہ کر کے سب کو (آپس میں) بھڑا دے (یعنی لڑوادے) اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی (کے ذریعہ مزہ) چکھادے۔

عذابِ الٰہی کی تین قسمیں

یہاں عذابِ الٰہی کی تین قسموں کا ذکر ہے۔ایک جو اوپر سے آئے، دوسرے جو نیچے سے آئے، تیسرے جو اپنے اندر سے پھوٹ پڑے۔ پھر لفظ عَذَابًا کو اس جگہ تنوین کے ساتھ نکرہ لا کر عربی قواعد کے اعتبار سے اس پر متنبہ کر دیا کہ ان تینوں قسموں میں بھی مختلف قسمیں اور صورتیں ہو سکتی ہیں۔

مفسرین نے فرمایا کہ اوپر سے عذاب آنے کی مثالیں پچھلی اُمتوں میں بہت سی گذر چکی ہیں، جیسے قومِ نوح علیہ السلام پر بارش کا سخت سیلاب آیا اور قومِ عاد پر ہوا کا طوفان مسلّط ہوا، اور قومِ لوط علیہ السلام پر اوپر سے پتھر برسائے گئے، بنی اسرائیل پر خون اور مینڈک وغیرہ برسائے گئے، اصحابِ فیل نے جب مکہ پر چڑھائی کی تو پرندوں کے ذریعہ اُن پر ایسی کنکریں برسائی گئیں جن سے وہ سب کے سب کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح ہو کر رہ گئے۔

اسی طرح نیچے سے آنے والے عذاب کی بھی پچھلی قوموں میں مختلف صورتیں گذر چکی ہیں۔قومِ نوح علیہ السلام پر تو اوپر کا عذاب طوفان، بارش کے ساتھ اور نیچے کا عذاب زمین کا پانی اُبلنا شروع ہو گیا۔غرض اوپر اور نیچے کے دونوں عذاب میں بیک وقت گرفتار ہو گئے، اور قومِ فرعون پاؤں تلے کے عذاب میں غرق کی گئی، قارون بھی مع اپنے خزانوں کے اسی عذاب میں گرفتار ہوا اور زمین کے اندر دھنس گیا۔

اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اوپر کے عذاب سے مراد ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلّط ہو جاویں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر، غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بے وفا، غدّار، کام چور، خائن جمع ہو جاویں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات سے بھی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔مشکوٰۃ شریف میں بحوالۂ شعب الایمان بیہقی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: "کَمَا تَکُوْنُوْنَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ"، یعنی جیسے تمہارے اعمال بھلے یا بُرے ہوں گے ویسے ہی حکام اور امراء تم پر مسلّط کیے جائیں گے، اگر تم نیک اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو گے تو تمہارے حکام وامراء بھی رحم دل، انصاف پسند ہوں گے، اور تم بدعمل ہو گے تو تم پر حکام بھی بے رحم اور ظالم مسلّط کر دیئے جائیں گے۔مشہور مقولہ **اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ** کا یہی مفہوم ہے۔

اور مشکوٰۃ میں بحوالۂ حلیہ ابی نعیم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب بادشاہوں کا ملک اور بادشاہ ہوں، سب بادشاہوں کے قلب میرے ہاتھ میں ہیں، جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں اور حکام کے قلوب میں ان کی شفقت و رحمت ڈال دیتا ہوں اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے

حکام کے دل اُن پر سخت کر دیتا ہوں، وہ ان کو ہر طرح کا بُرا عذاب چکھاتے ہیں، اس لیے تم حکام اور امراء کو بُرا کہنے میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ تا کہ تمہارے سب کاموں کو درست کر دوں۔

اسی طرح ابوداؤد، نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امیر اور حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دے دیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول جائے تو وہ اس کو یاد دلا دے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم و امیر کے لیے کوئی بُرائی مقدر ہوتی ہے تو بُرے آدمیوں کو اس کے وزراء اور ماتحت بنا دیا جاتا ہے۔

ان روایات اور آیتِ مذکورہ کی متذکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو جو تکالیف اور مصائب اپنے حکام کے ہاتھوں پہنچتے ہیں وہ اوپر سے آنے والے عذاب ہے، اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے، بلکہ ایک قانونِ الٰہی کے تابع انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر اور اپنی سواری کے گھوڑے اور بار برداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔ مولانا رومی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ؎

خلق را با تو چنیں بدخو کنند
تاترا ناچار رو آنسو کنند

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہارے بالادست حکام یا ماتحت ملازموں کے ذریعہ تمہارے خلافِ مزاج، تکلیف دہ معاملات کا ظاہری عذاب تم پر مسلّط کر کے درحقیقت تمہارا رُخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں تا کہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اعمال کو درست کر کے آخرت کے عذابِ اکبر سے بچ جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق حکام کا ظلم و جور اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور ماتحت ملازموں کی بے ایمانی، کام چوری، غدّاری، نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے کہ سب اپنے اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے راہ روی سے باز آجائیں تو قدرت خود ایسے حالات پیدا کر دے گی کہ یہ مصیبت رفع ہو، ورنہ صرف مادّی تدبیروں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی اُمید اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں، جس کا تجربہ ہر وقت ہو رہا ہے ؎

خویش را دیدیم و رسوائیِ خویش
امتحانِ ما مکن اے شاہ بیش

اوپر اور نیچے کے عذاب کی جو مختلف تفسیریں آپ نے ابھی سنی ہیں درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ لفظ عَذَابًا جو اس آیت میں آیا ہے درحقیقت ان تمام تفسیروں پر حاوی ہے۔ آسمان سے برسنے والے پتھر، خون، آگ اور پانی کا سیلاب اور بالادست حکام کا ظلم وجور یہ سب اوپر سے آنے والے عذاب میں داخل ہیں، اور زمین شق ہوکر کسی قوم کا اس میں دھنس جانا یا پانی زمین سے اُبل کر غرق ہوجانا، یا ماتحت ملازموں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہوجانا یہ سب نیچے سے آنے والے عذاب ہیں۔

تیسری قسم عذاب کی جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے اَوْيَلْبِسَكُمْ شِيَعًا، یعنی تمہاری مختلف پارٹیاں بن کر آپس میں بھڑ جائیں، اور باہم ایک دوسرے کے لیے عذاب بن جائیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جارہے تھے۔ ہمارا گذر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء میں مشغول ہوگئے اور بہت دیر تک دعاء کرتے رہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا۔ ایک یہ کہ یہ میری اُمت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعاء قبول فرمائی۔ دوسری یہ کہ میری اُمت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے، یہ بھی قبول فرمالی۔ تیسری دعاء یہ کی کہ میری اُمت آپس کے جنگ وجدل سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دعاء سے روک دیا گیا۔ (مظہری بحوالۂ بغوی)

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، جس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعاء یہ ہے کہ میری اُمت پر کسی دُشمن کو مسلّط نہ فرمادے جو سب کو تباہ و برباد کردے، یہ دعاء قبول ہوئی اور آپس میں نہ بھڑ جائیں اس دعاء کو منع کردیا گیا۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اُس قسم کے عذاب تو نہ آئیں گے جیسے پچھلی اُمتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے اُن کی پوری قوم تباہ و برباد ہوگئی، لیکن ایک عذاب دنیا میں اس اُمت پر بھی آتا رہے گا، وہ عذاب آپس کی جنگ وجدل اور فرقوں اور پارٹیوں کا باہم تصادم ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہوکر باہمی آویزش اور جنگ وجدل سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے۔ اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی جنگ وجدل کے ذریعہ آئے گا۔

سورۂ ہود کی ایک آیت میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے: "وَلَايَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ" "یعنی لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف ہی کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ

نے رحمت فرمائی۔''

اس سے واضح ہوا کہ جولوگ آپس میں (بلاوجہ شرعی) اختلاف کرتے ہیں وہ رحمتِ خداوندی سے محروم یا بعید ہیں۔

ایک آیت میں ارشاد ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا، دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا ان تمام آیات وروایات کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف بڑی منحوس اور مذموم چیز ہے۔ آج دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی پستی اور بربادی کے اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر مصائب کا سبب یہی آپس کا اختلاف اور تشتت نظر آئے گا۔ ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں یہ عذاب ہم پر مسلّط ہوگیا کہ وہ قوم جس کا مرکز اتحاد ایک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تھا، اس کلمہ کو ماننے والا زمین کے کسی خطّہ میں ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی نسل ونسب سے متعلق ہوسب بھائی بھائی تھے۔ کوہ ودریا کی دشوار گذار منازل ان کی وحدت میں حائل نہ تھیں، نسب وخاندان، رنگ وزبان کا تفادت ان کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا، ان کی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی۔ عربی، مصری، شامی، ترکی، ہندی، چینی کی تقسیمیں صرف شناخت اور تعارف کے لیے تھیں اور کچھ نہیں۔ بقول اقبال مرحوم ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اُس کا نہ دلّی نہ صفاہان نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی دسیسہ کاریوں اور مسلسل کوششوں نے پھران کو نسلی اور لسانی اور وطنی قومیتوں میں بانٹ دیا، اور پھر ان میں سے بھی ہر ایک قوم وجماعت اپنے اندر بھی تشتت اور انتشار کا شکار ہوکر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی۔ وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو ودرگذر اور ایثار تھا اور جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی، آج اس کے بہت سے افراد ذرا ذرا سی حقیر وذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کردیتے ہیں، یہی وہ اغراض واہواء کا اختلاف ہے جو قوم وملّت کے لیے منحوس اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ ۳۵۸-۳۶۳)

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اگر کسی کی اولاد نافرمان ہے اس کو ڈنڈے تو مار رہا ہے، گھر سے تو نکال رہا ہے اور ساری تدبیریں کررہا ہے لیکن بندہ خدا دو آنسو اللہ تعالیٰ کے سامنے نہیں گراتا کہ اے اللہ یہ میرے اعمال کا عذاب ہے جو میں اولاد کی شکل میں چکھ رہا ہوں خدایا! مجھے اس عذاب سے بچا۔

اگر اختلافات گھر میں ہیں تو فوراً غور کرے کیا کمی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ مجھ سے کیا گڑبڑ ہورہی ہے؟ اور اس کی فوراً اصلاح کریں ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گھر کے سارے افراد باہم شیر وشکر ہوجائیں گے

زندگی مزے دار بن جائے گی اور اگر اس کے بعد بھی کوئی ناموافق صورت حال سامنے رہی تو آپ کا قلب بالکل مطمئن رہے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے کا دل کبھی بے چین نہیں ہوتا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر بھی حالات آتے ہیں لیکن ان کے قلوب بالکل مطمئن رہتے ہیں بے چینی اور پریشانی کا وہاں کوئی گزر نہیں اور یہ اطمینانِ قلبی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جب مومن بندہ اللہ کو ناراض نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو راضی وخوش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کے دل کو بے چین نہیں کرتے۔

ہر قدم پر حیاتِ نو کیسے حاصل ہو

ہر قدم پر تاکہ حاصل ہو حیاتِ نو مجھے
ہر قدم پر زیرِ خنجر اپنا سر کرتا ہوں میں

یہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا خنجر ہے جس کے سامنے میں اپنا سر پیش کرنے کو تیار ہوں اگرچہ میں ذبح ہو جاؤں اور اس راہ میں مر جاؤں تو یہ شہیدِ محبت کہلاتا ہے، حدیث پاک سے اس کا ثبوت ہے شہید صرف اس کو نہیں کہا جاتا کہ جو اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے مر جائے بلکہ شہید کی بہت ساری اقسام ہیں۔ جیسا ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ذکر فرمایا ہے۔ انہوں نے بہت ساری اقسام اس کی مفصلاً نقل کی ہیں، حضرت شیخ نے بھی نقل کی ہیں اور ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''احکامِ میت'' صفحہ: ۱۱۲ تا صفحہ: ۱۱۶ پر شہید کی ۴۲ قسمیں ذکر کی گئی ہیں۔

شہید کی بیالیس اقسام

شہیدوں کی دوسری قسم جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق آخرت میں تو درجہ شہادت نصیب ہوگا اور ان کے ساتھ شہیدوں کا سا معاملہ ثواب اور اعزاز و اکرام کا کیا جائے گا لیکن دنیا میں ان پر شہیدوں کے احکام جاری نہیں ہوتے یعنی ان کا غسل و کفن عام مسلمانوں کی طرح کیا جاتا ہے شہیدوں کی طرح نہیں۔

شہیدوں کی اس قسم میں جو مسلمان داخل ہیں ان کی چالیس سے زیادہ قسمیں ہیں لیکن ان سب کا ذکر کسی ایک حدیث میں یکجا نہیں ملتا متفرق احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، اسی لیے ان سب احادیث کو جمع کرنے کے لیے علماءِ محققین نے مستقل رسالے تالیف فرمائے ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تحقیقات کا خلاصہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''حاشیہ ردالمحتار'' میں درج فرما دیا ہے ہم یہاں اسی کا لبِ لباب نقل کرتے ہیں۔ اس قسم میں مندرجہ ذیل مسلمان داخل ہیں:

(۱)......وہ بے گناہ مقتول جو شہید کی قسم اوّل (یعنی جس پر دنیا میں غسل وکفن کے اعتبار سے شہید کے احکام جاری ہوں) میں اس لیے داخل نہ ہو کہ جو شرطیں اس کے لیے بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی شرط اس میں مفقود ہو، مثلاً وہ مقتول جو مجنون، نابالغ یا جنبی ہو یا حیض ونفاس والی عورت ہو اور وہ مقتول جس کے قتل کے عوض میں

قصاص واجب نہیں بلکہ مالی عوض یعنی دیت (خون بہا) واجب ہوتا ہے اور وہ مقتول جو باغیوں، ڈاکہ زنی یا حربی کافروں کے ہاتھوں مارا جائے مگر زخم لگنے کے بعد کوئی امر راحت اور تمتع زندگی کا اسے حاصل ہوا ہو ان سب صورتوں میں مقتول اگرچہ شہید کی قسم اول میں داخل نہیں مگر قسم دوم میں داخل ہے یعنی آخرت میں اسے درجہ شہادت نصیب ہوگا۔ دنیا میں شہید کے احکام جاری نہ ہوں گے۔ (درمختار وشامی)

(۲)...... جس نے کسی کافر، باغی یا ڈاکو پر حملہ کیا مگر وار خطا ہو کر خود کو لگ گیا جس سے موت واقع ہوگئی۔ (درالمختار)

(۳)...... مسلم ممالک کی سرحد کا پہرہ دینے والا جو وہاں طبعی موت مر جائے۔

(٤)...... جس نے صدقِ دل سے اللہ کی راہ میں جان دینے کی دعا کی ہو، پھر وہ طبعی موت مر جائے۔

(۵)...... جو خود کو یا اپنے گھر والوں کو ظالموں سے بچانے کے لیے لڑتا ہوا مارا جائے۔

(٦)...... جو اپنا مال ظالموں سے بچانے یا چھڑانے کے لیے لڑتا ہوا مارا جائے۔

(۷)...... حکومت کا مظلوم قیدی جو قید کی وجہ سے مر جائے۔

(۸)...... جو (ظلم سے بچنے کے لیے) روپوش ہوا اور اسی حالت میں مر جائے۔

(۹)...... طاعون سے مرنے والا۔ اس میں وہ شخص بھی داخل ہے جو طاعون کے زمانے میں طاعون کے بغیر ہی وفات پا جائے بشرطیکہ جس بستی میں ہو وہیں ثواب کی نیت اور صبر کے ساتھ ٹھہرا رہے راہ فرار اختیار نہ کرے۔

(۱۰)...... پیٹ کی بیماری (استسقاء یا اسہال) میں وفات پانے والا۔

(۱۱)...... نمونیہ کا مریض۔

(۱۲)...... سل کا مریض۔

(۱۳)...... مرگی کے مرض سے یا کسی سواری سے گر کر ہلاک ہونے والا۔

(۱٤)...... بخار میں مرنے والا۔

(۱۵)...... جس کی موت سمندر میں الٹیاں (متلی، قے) لگنے سے واقع ہوئی ہو۔

(۱٦)...... جو شخص اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کہے اور اسی بیماری میں وفات پا جائے۔

(۱۷)...... جس کی موت اچھو لگنے سے ہوئی ہو۔

(۱۸)...... جس کی موت زہریلے جانور کے ڈسنے سے ہوئی ہو۔

(۱۹)...... جسے کسی درندے نے پھاڑ ڈالا ہو۔

(۲۰)...... آگ میں جل کر مرنے والا۔

(**۲۱**)...... پانی میں ڈوب کر مرنے والا۔

(**۲۲**)...... جس پر کوئی عمارت یا دیوار وغیرہ گر پڑی ہو۔

(**۲۳**)...... جس عورت کی موت حالتِ حمل میں ہو جائے۔

(**۲٤**)...... نفاس والی عورت جس کی موت ولادت کے وقت ہوئی ہو یا ولادت کے بعد مدت نفاس ختم ہونے سے پہلے۔

(**۲۵**)...... جو عورت کنواری ہی وفات پا جائے۔

(**۲٦**)...... جو عورت اپنے شوہر کے کسی اور عورت سے تعلق (زوجیت وغیرہ) کے غم پر صبر کرے اور اسی حالت میں مر جائے۔

(**۲۷**)...... وہ پاکباز عاشق جو اپنا عشق چھپائے رکھے اور غمِ عشق سے مر جائے۔

(**۲۸**)...... جسے غریب الوطنی میں موت آجائے۔

(**۲۹**)...... دین کا طالب علم۔

(**۳۰**)...... وہ مؤذن جو محض ثواب کے لیے اذان دیتا ہو۔ (تنخواہ یا اجرت مقصود نہ ہو)

(**۳۱**)...... اپنے بیوی بچوں کی خبر گیری کرنے والا جو اُن کے متعلق اللہ کے احکام بجالائے اور ان کو حلال کھلائے۔

(**۳۲**)...... سچا دیانتدار تاجر۔

(**۳۳**)...... جو تاجر مسلمانوں کے کسی شہر میں کھانے کی چیزیں (طعام) پہنچائے۔

(**۳٤**)...... جس نے اپنی زندگی مدارات (اچھے سلوک) میں گذاری ہو (یعنی برے لوگوں کے ساتھ بھی شرعی حکم کے بغیر برا سلوک نہ کرتا ہو)

(**۳۵**)...... اُمت کے بگاڑ کے وقت سنت پر قائم رہنے والا۔

(**۳٦**)...... جو رات کو باوضو سوئے اور اسی حالت میں انتقال ہو جائے۔

(**۳۷**)...... جمعہ کے دن وفات پانے والا۔

(**۳۸**)...... جو شخص روزانہ پچیس بار یہ دعا کرے کہ "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَفِیْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ" اے اللہ! میرے لیے موت میں بھی برکت دے اور موت کے بعد کے حالات میں بھی۔

(**۳۹**)...... جو چاشت کی نماز پڑھے اور ہر مہینہ تین روزے رکھے اور وتر نہ سفر میں چھوڑے نہ اقامت میں۔

(**٤۰**)...... ہر رات سورۂ یٰسین پڑھنے والا۔

(**٤۱**)...... جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سو مرتبہ درود شریف پڑھے۔ (بظاہر روزانہ پڑھنا مراد ہے)

(**٤۲**)...... امام ترمذی نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے صبح کے وقت "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" تین مرتبہ پڑھا

شام تک استغفار کرتے رہتے ہیں اور جس نے یہ کلمات اور آیتیں شام کو پڑھیں تو صبح تک اس کا بھی یہی درجہ ہے۔

اسی میں سے ایک حدیث پاک ہے کہ:

﴿مَنْ عَشِقَ وَ کَتَمَ وَ عَفَّ ثُمَّ مَاتَ فَهُوَ شَهِیْدٌ﴾

(مرقاۃ المصابیح، کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض)

کہ کسی شخص کو کسی سے عشق ہوگیا پھر اس کو چھپایا اور پاک دامن رہا بالکل کسی سے کوئی اظہار نہیں کیا لیکن زور بہت پڑا کیونکہ شدید عشق میں پھنس گیا تھا یہاں تک کہ اس کو موت آگئی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **وهو شهيد** کہ وہ شہید ہے تو دوستو! ہر قدم پر اپنی آرزوؤں کا خون کر کے چلنا اور اپنی گردن کو اللہ کے سامنے پیش کر دینا کہ اے اللہ! میں اپنی ساری خواہشات کا خون کرنے کے لیے حاضر ہوں تو اسے ہر قدم پر حیاتِ نو یعنی نئی زندگی عطا ہوتی ہے، لیکن خاص قسم کی حیات یعنی اس میں لطف اور مزہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انسان کو لگتا ہے کہ آنے والی گھڑی میں مجھے جو حیات حاصل ہوئی وہ پچھلی گھڑی میں نہیں تھی اور آنے والی گھڑی میں مجھے جو مزے اور لطف حاصل ہوئے وہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں چکھے تھے اس کو یہ محسوس ہوتا ہے، حضرت تائب صاحب اسی کو فرماتے ہیں ؎

ہر لمحہ شہادت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
نظروں کی حفاظت کا مزہ اور ہی کچھ ہے
ہر پل غمِ حسرت کا مزہ اور ہی کچھ ہے

جب انسان نظروں کی حفاظت کرتا ہے تو اسے اس کے نتیجے میں گویا کہ ہر لمحہ ہر گھڑی ایک طرح کی شہادت مل رہی ہوتی ہے یعنی معنوی اور حکمی شہادت تو حضرت والا بھی اس شعر میں اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں اور یہی انسان حقیقت میں اللہ کا ولی اور نیک بندہ ہے چاہے آپ اسے صوفی کہہ لو، چاہے اللہ والا کہہ لو، چاہے نیک بندہ کہہ لو، چاہے ولی کہہ لو، چاہے متقی کہہ لو، چاہے ذاکر شاغل کہہ لو! قطب، غوث، ابدال کہہ لو! چاہے آپ جو بھی کہہ لو کل پوری مومن کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر سانس اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے بس اس حکم کو بجا لائے، یہ پوری شریعت و ولایت کا خلاصہ ہے حضرت فرما رہے ہیں ہر قدم پر جس قدم پر جو حکم ہو۔

ہر قدم پر سر کا زیرِ خنجر ہونا مثالوں کی روشنی میں

مثال کے طور پر آپ بیوی کے پاس جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے، مسکرا کے، اچھے انداز سے، بشاشت کے ساتھ اپنی بیوی کے پاس جاؤ! ملو! بس اب آپ کو اسی میں ثواب مل رہا ہے اور جب آپ مسجد میں ہیں خشوع وخضوع کے ساتھ آپ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، شریعت کا حکم ہے کہ اب بیوی وغیرہ کا کوئی دھیان دل میں نہیں آنا چاہیے! خالص اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کر کے گویا کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ میرے بندے! نماز پڑھو!

میں دیکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں کہ کیسی نماز ہے۔ جیسا کہ اگر ہم دنیا کے بادشاہوں کے سامنے ہوں اور ہمارا چہرہ دائیں بائیں جانب پھرا ہوا ہو اور اس سے کوئی درخواست کر رہے ہوں، چہرہ ادھر پھرا ہوا ہے اور سامنے بیٹھے ہیں اور اس سے درخواست پیش کی جارہی ہو؟ تو دھتکار کے مار دیئے جائیں گے کہ جاؤ کیا کر رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ کے لیے چہرہ اور دل برابر ہے اگر ہمارا دل دائیں بائیں ہو اور نماز میں ہم کھڑے ہوئے ہوں تو کیا نماز ہے؟ رہ گئی یہ بات کہ وسوسوں کا آنا، خیالات کا آنا یہ برا نہیں لیکن لانا یا جمانا برا ہے۔ اگر آ جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس کے درپے نہ ہوں اور نہ اس سے پریشان ہوں۔

اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب اس کا علاج بیان فرمایا کہ جو الفاظ نماز میں پڑھے جاتے ہیں، ان کے معانی کا استحضار پہلے نمبر پر شروع کر دو! اور فلسفہ کا قاعدہ مسلمہ (اصول) ہے کہ انسان کا دل ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو بس جب معانی کا استحضار ہوگا تو عنداللہ آپ کی نماز خشوع وخضوع والی بن گئی۔ اور اگر معانی نہ جانتا ہو تو کوشش کر کے سیکھ لے اور ورنہ تو الفاظ پر غور کر لے اور دھیان رکھے تو بھی خشوع وخضوع حاصل ہو جائے گا۔ بس یہی تشریح ہے حضرت والا کے ذکر کردہ اس مضمون کی کہ ہر قدم پر میں اپنا سر زیر خنجر کرتا ہوں۔

اسی طرح اس کی ایک مثال معاملات کے سلسلے میں سمجھئے کہ مثلاً شریعت نے ایسی بیع وشراء (خرید و فروخت) کو ممنوع اور ناجائز قرار دیا ہے جس کی بنیاد ضرر یعنی نقصان اور غرر یعنی دھوکے پر ہو، کسی کو نقصان پہنچانا یا دھوکا دینا اس سے بیع میں فساد پیدا ہو جاتا ہے، بحمد اللہ تعالیٰ احقر ایک دینی مدرسے کا مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ کسی درجہ تجارت کے ساتھ بھی تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسی صورت پیش آئی (اور یہ تاجروں کو پیش آتی رہتی ہے) کہ ایک سامان خریدنے کے بعد بڑی مدت تک دکان پر پڑا رہا اور بالکل فروخت نہیں ہوتا تھا تو ایک دن بیٹھے ہوئے مجھے یہ خیال آیا کہ اس کے بیچنے کی ایک بہت اچھی ترکیب ہے جس کے نتیجے میں جلدی سے بک جائے گا اور وہ یہ کہ ہمارا فلاں دکان دار کسٹمر (Customer) اور خریدار ہے تو ایسا کرتا ہوں کہ ان کے پاس دو تین حضرات کو بطور خریدار بھیجتا ہوں آج تم جاؤ! اور اس سے یہی سامان مانگو، اگلے دن دوسرے کو بھیجوں گا کہ تم جاؤ! اور یہ سامان مانگو! تیسرے دن تیسرے کو بھیجوں گا جا کے یہ سامان مانگو، جب کئی دن تک اس سے یہی سامان مانگا جائے گا تو اس کے دل میں اس کی تلاش پیدا ہو جائے گی اور پھر چند دن کے بعد اس کے پاس یہ سیمپل (Sample) بھیجوں گا کہ آپ کو یہ آرڈر (Order) کرنا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس یہ مال ہے اگر آپ کو ضرورت ہو تو بتلایئے؟ تو وہ بہت جلد آرڈر (Order) کرے گا کہ اس کے تو روزانہ بہت کسٹمر (Customer) آرہے ہیں بہت خریدار آرہے ہیں جلدی اس کو خرید و! تو اس ناجائز طریقے اور دھوکا دہی کے ذریعے میرا تو سارا سامان بک جائے گا۔ مگر اس بھائی کو دھوکہ دے کر کتنے بھاری نقصان کا سامنا ہوگا۔

بہر حال یہ خیال دل میں سرسری طور پر آیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور میرے دل میں اللہ نے فوراً یہ ڈالا کہ یہ تو عملی دھوکا ہے اگر چہ میں نے کوئی جملہ نہیں بولا اور کوئی جھوٹ نہیں بولا لیکن یہ عملی طور پر میں نے خریدار کو دھوکا دیا ہے اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں سو الحمد للہ، ثم الحمد للہ، فضل الٰہی، توفیق الٰہی سے فوراً دل دل میں استغفر اللہ! پڑھا کہ کیا کرنے جا رہے ہو؟ جب وہ مال خرید کے اسٹاک اس کے پاس پڑا رہے گا اور کوئی خریدار خریدنے نہیں جائے گا تو اس کے دل سے جو آہ نکلے گی وہ بائع اور سیل مین کو چیر کے رکھ دے گی۔

دوستو! اللہ والا بننا اتنا آسان نہیں ہے کہ بس تسبیح پڑھی اور یہ کیا وہ کیا سورہ یٰس پڑھی اور کچھ ختمات اور معمولات اور اوراد و وظائف پورے کر لیے گئے اور ولی بن گئے بلکہ اگر آپ تجارت کرتے ہیں تو آپ کو یہ مسائل بھی سیکھنے چاہییے! بظاہر خوش ہوں گے کہ میرے پاس اتنا دو سو کا اسٹاک تھا، سارا بک گیا مگر شریعت کی خلاف ورزی کر کے، خدا کے حکم کو توڑ کر بیچ دینا گھر میں تباہی و بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بازار میں کسی تاجر کو تجارت کے لیے اجازت نہیں دیتے تھے جب تک کہ وہ کتاب البیوع کے مسائل نہ بتا دے اور آج ہم ایسے بزنس میں لگے ہوئے ہیں کہ مسائل شریعت کا کچھ علم نہیں ہے جس کا جو جی چاہ رہا ہے وہ کر رہا ہے۔ میری یہ دو باتیں یاد رکھئے! آپ اپنے دماغ سے خود سوچئے کہ میں کسی کو دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں اور میں کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا رہا ہوں۔

اسی طرح تجارتی معاملات کی ایک اور مثال ذہن میں آتی ہے کہ مثلاً یہ اطلاع ملنے پر کہ کوئی شخص باہر سے بڑی مقدار میں کھانے پینے کی اشیاء غلہ وغیرہ لے کر آیا ہے اور ابھی کراچی ایئرپورٹ پر پہنچا ہے پہلے ہی اس کے پاس پہنچ کر اس کے مارکیٹ میں جانے سے قبل تمام مال سستے داموں میں خرید لیا جبکہ ادھر لوگوں کو مارکیٹ میں ان اشیاء کی قلت کی وجہ سے بڑی ضرورت کا سامنا ہے اور بظاہر کئی مہینے تک کہیں سے مال آنے کی امید نہیں ہے اس نے سارا مال خرید لیا اور ابھی وہ سودا بیچنے والا مارکیٹ میں آیا بھی نہیں۔ اب یہ خریدار اپنی منشا کے مطابق قیمتوں میں اضافہ کر کے مال فروخت کرے گا، اسی موقع کے لیے اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

﴿لَا یَبِیْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ دَعُوا النَّاسَ یَرْزُقِ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾

(سنن الترمذی، کتاب البیوع، باب ما جآء لا یبیع حاضر لباد)

ارے بھائی! پہلے سے یہ سب چکر مت چلاؤ! اور لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ بعض سے بعض کو رزق دیں تاکہ پرائز (Prize) میں اور قیمتوں میں تسہیل، ترخیص رہے، سستا بکے، اب تم لے کے سارا جمع کر کے پوری مارکیٹ میں دادا بن کے بیٹھ گئے کہ اب مجھ ہی سے سب کو لینا پڑے گا تو میں دوگنا، تین گنا قیمت کر کے بیچوں گا یہ سارے مسائل جاننے کے ہیں، اللہ والا بننا اسی کو کہتے ہیں۔ الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے ہمارا دین کامل و مکمل کر دیا اور زندگی کے

تمام شعبوں کے لیے احکام عطا فرمائے ہیں۔

اسی لیے حضرت مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے تو فرمایا کہ جب میں اپنے متعلقین میں سے کسی کے اندر معاملات میں کوتاہی دیکھتا ہوں تو میرے دل کو شدید تکلیف ہوتی ہے اور اگر وظائف میں کوتاہی دیکھتا ہوں تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ کسی آدمی کو جانچنے کے لیے ان تین باتوں سے جانچو، معاملات کے ذریعے، نمبر۲ سفر میں ساتھ رہ کر نمبر۳ پڑوسی بن کر۔

میرے دوستو! حضرت والا کے پاس آ کر دین سیکھنا چاہیے! کہ دین کے کیا کیا تقاضے ہیں۔ ہم انکو پورا کر رہے ہیں یا نہیں؟ ایک ایک قدم پر شریعت کو دیکھنا! لاکھوں کا نفع ہو بھاڑ میں جائے! اگر اللہ ناراض ہوتے ہیں اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے خلاف ہے۔ تو پھر لاکھوں یا کروڑوں کا نفع ہو تو بھی ایک طرف پھینک دیں اور یہ یقین رکھیں کہ ہزار میں اللہ تعالیٰ وہ برکت دیں گے جو ان دھوکے والے اور غیر شرعی طریقے سے کمائے جانے والے لاکھوں میں نہیں ملے گی وہ لاکھ گھر میں آ کے بے چینی پیدا کریں گے، امراض کا سبب بنیں گے، جھگڑوں اور اختلافات اور دماغی ٹینشن اور ڈپریشن کو جنم دیں گے، آج کتنے ہی دولت والوں کو جا کر دیکھ لیجئے ذرا بھی سکون نہیں ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بس مال آنا چاہیے! چاہے جیسے بھی ہو، حدیث پاک میں ہے قیامت میں یہ سوال بھی ہوگا:

﴿عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَآ اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَآ اَبْلَاهُ وَعَنْ مَّالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَآ اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ﴾

(رواہ الترمذی، ابواب صفۃ القیمۃ)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی کے پاؤں جنبش میں نہ آئیں گے جب تک اس سے یہ پانچ باتیں دریافت نہ کر لی جائیں گی۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ اپنی عمر کو کس کام میں صرف کیا؟ اپنی جوانی کس کام میں ختم کی؟ مال کیونکر کمایا اور کیونکر خرچ کیا؟ اور جو علم حاصل کیا تھا اس کے موافق کیا عمل کیا؟

کہاں سے کمایا؟ اور کما کر کہاں خرچ کیا؟ ہم سمجھتے ہیں بس اب تو یہ سب ہمارا ہے جیسے جہاں چاہیں خرچ کر دیں لیکن یہ یاد رکھنا کہ یہ دونوں سوال باقاعدہ علیحدہ علیحدہ ہوں گے اور ان کا جواب دینا ہوگا۔ اس لیے شعر کا خلاصہ نکل کر سامنے آیا کہ مومن کا سر ہر قدم پر اللہ کے حکم کے سامنے جھکا ہوا ہو۔

چمن میں ہوں مگر آہ بیابانی نہیں جاتی

چمن میں ہوں مگر آہ بیابانی نہیں جاتی
یہ کیا آتش ہے آہوں کی فراوانی نہیں جاتی

میں گلشن میں ہوں لیکن فیض ہے یہ شیخ کامل کا
کہ میرے قلب سے ہوئے بیابانی نہیں جاتی

نہ جانے کتنی نہریں میرے دریاء سے ہوئیں جاری
مگر پھر بھی میرے دریاء کی طغیانی نہیں جاتی

رفو کرتا ہے دامن کو اگرچہ ان کا دیوانہ
گریباں سے مگر چاکِ گریبانی نہیں جاتی

مزاج عقل کو الفت ہے اپنے ساز و سامان سے
مزاج عشق سے بے ساز و سامانی نہیں جاتی

خرد کہتی ہے باتیں مختصر کر ان سے اے ناداں
محبت کی مگر تمہید طولانی نہیں جاتی

نہیں کرتا ہے صدق دل سے توبہ جو گناہوں سے
کسی بھی حال میں اس کی پریشانی نہیں جاتی

مرے دریائے الفت کا عجب ساحل ہے اے اختؔر
کہ ساحل پر بھی ان موجوں کی طغیانی نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **چمن**: باغ۔ **آہِ بیابانی**: ویرانے میں جا کر رونا۔ **آتش**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ۔ **فراوانی**: زیادہ ہونا۔ **گلشن**: باغ۔ **ھوئے بیابانی**: ویرانے کا سناٹا۔ **طغیانی**: طوفان۔ **رفو کرنا**: پھٹے ہوئے کپڑے کو جوڑنا۔ **دیوانہ**: اللہ تعالیٰ کا عاشق۔ **چاک گریبانی**: اللہ تعالیٰ کا عشق و محبت۔ **خرد**: عقل۔ **تمھید**: کسی بات کو سمجھانے کے لیے کوئی بات کہنا۔ **طولانی**: لمبائی۔ **صدقِ دل**: سچے دل سے۔ **الفت**: محبت۔

بہارِ جانِ چمن ہو تو چمن کی کیا حاجت؟

چمن میں ہوں مگر آہ بیابانی نہیں جاتی
یہ کیا آتش ہے آہوں کی فراوانی نہیں جاتی
میں گلشن میں ہوں لیکن فیض ہے یہ شیخ کامل کا
کہ میرے قلب سے ہوئے بیابانی نہیں جاتی

جہاں جنگلوں میں کوئی نہیں ہوتا تھا، نہ آس پڑوس میں کوئی رہنے والا تھا، نہ ہی دنیا داری کے چکروں اور مشغلوں کا وجود تھا نہ ادھر ادھر کے مسائل اور نہ کسی قسم کے علائق دنیویہ بلکہ وہاں بالکل خالی فضا ہوتی تھی، نیچے زمین اور اوپر آسمان۔

صرف ایک اللہ کی ذات عالی کے سوا ظاہری طور پر بھی کچھ نہ ہوتا تھا اور ایسے مقام پر میرے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے کچھ یوں صورت حال تھی جس کو مولانا رومی کے شعر سے سمجھا جاسکتا ہے۔

آہ راجز آسمان ہمدم نہ بود
راز را غیر خدا محرم نہ بود

اور وہ ہی صحرانوردی ہے جس کو اقبال مرحوم نے بڑے ایمان افروز انداز سے صحابہ کے تذکرہ کے وقت یوں ذکر فرمایا ہے۔

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھا
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

تو جیسے خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے اسی طرح آدمی اللہ والوں کے پاس رہ کر جلدی اللہ والا بنتا ہے اور محبت میں ترقی ہوتی ہے کیونکہ اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ کا اصول مسلم ہے کہ جنس، جنس کی طرف مائل ہوتی ہے خود انسان کے دل کے اندر جب محبت کا داعیہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے اللہ والوں کے پاس کھینچ کر لاتا ہے ان کو دیکھ کر انسان خود بخود ترقی کرتا رہتا ہے تو اس لیے چونکہ حضرت والا دامت برکاتہم کو اپنے شیخ کی صحبت میں اس آہ بیابانی سے واسطہ پڑا تھا اور قلب میں اللہ کی محبت کی آگ لگی ہوئی تھی جس کی ترجمانی بار بار نکلنے والی آہوں سے ہوتی تھی اور دل دنیا کی ظاہری زیب و زینت سے ایسا اچاٹ ہو چکا تھا۔ کہ گلشن میں رہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ دل لگتا نہ تھا اور وہی قلب کا عالم رہتا تھا۔ جو جنگل کی ہوئے بیابانی کی مستی میں دل میں سما چکا تھا ایک موقع پر حضرت والا نے اسی آہ بیابانی کے منظر کو بہت دل سوز انداز میں یوں پیش فرمایا ہے۔

پھر نعرۂ مستانہ ہاں اے دل دیوانہ
زنجیر علائق پر پھر ضرب ہو رندانہ
پھر اشک بداماں ہو پھر چاک گریباں ہو
پھر صحرا نوردی کا دھرا کوئی افسانہ
کیوں رشک گلستاں ہے خاموشی ویرانہ
صحرا کی طرف شاید پھر ہے رخ دیوانہ

ان تمام اشعار کا خلاصہ اور نچوڑ اہل اللہ کے قلوب میں عطا کی ہوئی اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ محبت کے ایک خاص اثر کو ذکر کرنا ہے اور وہ یہ کہ ان کا دل دنیوی علائق سے صرف درجہ ضرورت میں تعلق رکھتا ہے یعنی بوقت ضرورت اور بقدرِ ضرورت دنیا کو استعمال کرتے ہیں مگر دلی طور پر دنیا اور اس کے متعلقات سے وہ لوگ دور بھاگتے ہیں۔

دریائے علم و معرفت میں طغیانی کا راز

نہ جانے کتنی نہریں میرے دریا سے ہوئیں جاری
مگر پھر بھی میرے دریا کی طغیانی نہیں جاتی

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو نہر کسی دریا کے محدود پانی کے ساتھ جڑی ہوئی ہو تو جب اس دریا سے وہ محدود پانی ختم ہو جائے گا اس نہر کے اندر بھی پانی ختم ہو جائے گا لیکن جس کا کنکشن (Conection) اور رابطہ کسی غیر محدود نظر آنے والے سمندر کے ساتھ ہو تو پھر وہاں سے ایسی نہریں بہتی ہیں کہ وہ ختم نہیں ہوتیں اسی لیے اس شعر میں ان علماء اور طلباءِ علوم دینیہ کے لیے سبق ہے کہ جو اپنی محدود معلومات پر فخر کر کے بیٹھے ہیں کہ میں بڑا علامہ ہوں اور بہت بڑا عالم ہوں بلکہ درحقیقت بڑا عالم وہ ہے کہ جس کے علم کا کنکشن (Conection) و تعلق حق تعالیٰ کی صفت علیم کے فیض کے ساتھ جڑ جائے پھر دیکھیں کہ کیسی علوم کی نہریں جاری ہوں گی کہ پوری پوری رات بیانات ہوں گے اور جب صبح کو منبر سے اٹھے گا تو اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ ابھی تو میرے سامنے بہت سے علوم کے دریا ہیں جن کو میں نے بہایا ہی نہیں بس چند قطرے ہی پیش کیے ہیں۔

حضرتِ والا کے آج ہی کے وعظ میں یہ بات تھی کہ حضرت تھانوی نے وعظ کہتے کہتے ایک چیخ ماری اور فرمایا ہائے امداد اللہ! اور ارشاد فرمایا کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یوں کہوں۔

من مجمل از جمال حاجیم
من مکمل از کمال حاجیم

مجھے جو کچھ جمال و کمال ملا یہ سارا میرے حاجی صاحب کی برکات اور ان کے فیوض ہیں وہیں سے سب

کچھ ہوا۔ مگر اس میں اپنے کمال اور تزکیہ کا دعویٰ معلوم ہوتا تھا اس لیے یہ کہنا درست معلوم نہ ہوا۔ تو کسی نے پوچھا حضرت یہ ہائے امداد اللہ آپ نے کیوں فرمایا؟ اس پر ارشاد فرمایا کہ اتنے علوم کی بارش تھی کہ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کو بیان کروں اور کس کو چھوڑ دوں اور یہ سب کچھ حضرت حاجی صاحب کی برکات اور فیوض کا اثر تھا۔

جب انسان کے قلب کا تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قوی ہوتا ہے تو پھر علوم کی بارش ایسے ہی ہوتی ہے اور یہی علوم وہبی کہلاتے ہیں اور یہ تعلق جب ہی ہوتا ہے جبکہ سارا غیر دل سے نکل کر دل بالکل صاف ہوجائے تو بس پھر انسان رٹنے اور کتابوں سے یاد کرنے کا پابند نہیں رہتا ہے بلکہ خود حق تعالیٰ شانہ اس کی زبان پر علوم وحکم کی نہریں جاری فرمادیتے ہیں اور وہ کتنے ہی علوم بیان کردے اور خوب طویل تقریریں کردے لیکن پھر بھی اس کے علوم کی موجوں میں طغیانی برقرار رہتی ہے۔ جیسا کہ کتاب میں بعض مقامات پر اس کی تفصیل حدیث شریف کی روشنی میں گذری ہے۔

چنانچہ حضرت والا کے ہزاروں مواعظ اور بے شمار کتابیں اس حقیقت کی واضح طور پر ترجمانی کرتی ہیں کہ اس دریا سے کتنی نہریں جاری ہوچکی ہیں اور ابھی تک علوم کا حال دل کے اندر ٹھاٹیں مارتے سمندر کی طرح ہے اور یہ معاملہ ہر دور کے اہل حق علمائے کرام اور مشائخ عظام کے ساتھ رہا ہے جیسا کہ ماضی قریب کے دور میں اس کی مثال حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی شخصیت ہے جن کی زبان وقلم سے بلاشبہ علوم ومعارف کے دریا جاری ہوئے ہیں۔

اللہ کے دیوانوں کی چاک گریبانی

رفو کرتا ہے دامن کو اگرچہ ان کا دیوانہ
گریباں سے مگر چاکِ گریبانی نہیں جاتی

عربی کا مشہور مقولہ ہے کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ کہ ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے اس کی روشنی میں شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے کو کتنا ہی چھپانے کی کوشش کروں اور اپنے کو اس طرح رکھوں کہ لوگ مجھے اللہ کی محبت کا دیوانہ نہ سمجھیں اور اندازہ نہ لگا سکیں کہ میرے اندرونِ قلب کی صورت حال کیا ہے لیکن مجھ سے یہ حقیقت چھپتی نہیں ہے بلکہ وہ خود بخود ظاہر ہوکر رہتی ہے اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے جب کہیں خوشبو ہو اور آپ خوشبو کو کسی کمرے کے اندر رکھ دیں تو پھر وہ خود پھوٹے گی اور مہکے گی اور سب کو معطر کردے گی ٹھیک اسی طرح جس سینے میں اللہ کی محبت کا درد آچکا ہو وہ اس کو کتنا ہی مخفی رکھنے کی کوشش کرے مگر وہ خود ظاہر ہوکر رہتا ہے۔

میں نے اپنے دار العلوم دیوبند میں پڑھنے کے زمانے میں ایک بزرگ حضرت مولانا صدیق باندوی رحمہ اللہ کو دیکھا جنھوں نے اپنے کو بے حد مٹا رکھا تھا اور ظاہری طور پر اپنے کو بالکل چھپایا تھا لیکن طلباء دار العلوم دیوبند حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی آمد پر ایسے ٹوٹ پڑتے تھے اور دوسرے لوگ بھی اس قدر عزت کرتے تھے کہ

جس کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مرادآباد میں تشریف لائے تو لوگ ہر طرف سے ملنے کے لیے اس قدر بے چین اور مشتاق تھے کہ ہر ایک حضرت سے مصافحہ کرنا چاہتا تھا اور شہر کے بڑے بڑے اصحابِ دولت وثروت اور رئیس لوگ حضرت کی زیارت اور مصافحہ کے لیے چاروں طرف اکھٹا تھے جیسا کہ کسی وزیر یا بادشاہ کی آمد کے موقع پر ہوا کرتا ہے۔

اس کے برخلاف ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں کہ اندر سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور ظاہر میں بزرگوں کی شکل وصورت اختیار کر کے خود بزرگ بننا چاہتے ہیں مگر انہیں کوئی مانتا ہی نہیں۔ نہ وہ عزت اور عقیدت ان کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے اسی لیے اصلی بزرگی اور ولایت دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی پیدا کر لینا ہے اور اسی سے قوی تعلق کر لینے کا نام ہے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کی کایا پلٹ گئی تھی اور اس میں صرف خدائے وحدہ لاشریک لہ کی ایک اکیلی ذات موجود تھی باقی کسی کا گزر بسر نہ تھا جس کے نتیجے میں ان کے نام سے قیصر وکسریٰ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے تھرتھراتے اور کانپتے تھے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیت المقدس کی فتح کے موقع پر کچھ ظاہری شان وشوکت اور رعب و دبدبے کی صورت اختیار کرنے کی بات کہی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی پیوند لگی ہوئی قمیص کو پہنے ہوئے یہ تاریخی جملے ارشاد فرمائے **نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام** ہم وہ لوگ ہیں جن کی دونوں جہان کی عزت وعظمت کا راستہ صرف اسلام ہے اور ہماری سرخروئی اور کامیابی صرف اسلام کی بدولت ہے۔

اور یہی اصول قیامت تک کے لیے قائم اور برقرار رہے گا کہ جب بھی ہم عزت وغلبہ پائیں گے اسلام ہی کی بدولت پائیں گے دوسری کسی بھی صورت سے مسلمانوں کو عزت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا جبکہ ہائے افسوس! آج کا مسلمان مغرب کی تہذیب اور طور طریقے اور ان کے طرز زندگی اپنانے اور ان کے شانہ بشانہ چلنے میں اپنی کامیابی سمجھے ہوئے ہے جو سراسر دھوکا ہے اور قرآن وسنت اور اسلام کی تاریخ سے ناآشنائی کا نتیجہ ہے اوپر بتایا ہوا عزت وسرخروئی کا راستہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے جو کہ خلفاء راشدین میں سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

﴿فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ﴾

(المشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ص ۳۰)

تم میرے طریقے اور خلفاء راشدین مہدیین کے طریقہ کو لازم پکڑلو۔ ان کا قول مستند اور دلیل ہے، اس لیے حقیقت یہی ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اسلام کی بدولت عزت دی ہے۔ سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخن تک ہماری زندگی میں اسلام ہونا چاہیے پھر دیکھیں کہ عزت کیسی ملتی ہے پھر اپنے تو اپنے غیر بھی عزت کرنے لگتے ہیں۔

مزاجِ عقل و مزاجِ عشق کا فرق

مزاجِ عقل کو الفت ہے اپنے ساز و سامان سے
مزاجِ عشق سے بے ساز و سامانی نہیں جاتی
خرد کہتی ہے باتیں مختصر کر ان سے اے ناداں
محبت کی مگر تمہید طولانی نہیں جاتی

جولوگ دنیوی لحاظ سے ہوشیاری اور عقل مندی کے تقاضوں پر چلنے والے ہیں وہ ہر وقت دنیوی ساز و سامان اور عیش و آرام کی خاطر سوچ وفکر میں ڈوبے رہتے ہیں اور ان کا مبلغِ علم اور منتہائے جد و جہد بس دنیائے حقیر کی کچھ پونجی جمع کر لینا ہوا کرتا ہے جب کہ جن کے دلوں پر اللہ کی محبت کی چوٹ لگ گئی اور دنیا کی فنائیت ان کے دل و دماغ میں رچ اور بس گئی تو وہ ہر آن اور ہر گھڑی بس اپنے اللہ کو راضی کرنے کی فکر میں دیوانہ وار کوشاں رہتے ہیں اور ہر قول و فعل میں ان کا مطمحِ نظر اور محورِ غور وفکر بس یہی ایک بات ہوتی ہے ان کی نگاہ میں چٹائی اور بوریا اور قالین اور صوفے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جب بندہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے تو اپنے محبوب سے کلام کو طول دینا پسند کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ۝﴾

(سورۃ طٰہٰ، آیات: ۱۷-۱۸)

ترجمہ: اور حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے اے موسیٰ! انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے میں (کبھی) اس کا سہارا لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں اور بھی کام (نکلتے) ہیں۔

میرے دوستو! جب اللہ سے بندہ راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے یہ نعمتیں دیں اور فلاں فلاں نعمت عطا فرمائی اور آپ نے میرے لیے ایسا کیا، آپ کا فلاں انعام ہے، فلاں انعام ہے اور خوب اللہ سے مناجات اور گفتگو میں لگا ہوا ہے جیسا کہ حضرت شاہ عبد الغنی پھول پوری گھنٹوں تک دعائیں کرتے تھے اور آہیں بھرتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتے تھے یا ربی معاف کر دیجئے...... اے میرے رب مجھے معاف کر دینا، اے میرے رب مجھے معاف کر دینا جب بندے کو عشق و محبت ہوتی ہے تو پھر اپنے اللہ سے ایسے ہم کلام ہوتا ہے کہ وہ ہمکلامی چھوٹتی نہیں ہے لمبی اور مزید لمبی ہوتی جاتی ہے اور اللہ والوں کی شان تو حقیقت میں ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے

مولیٰ سے دل ہی دل میں باتیں کرتے رہتے ہیں اور یہ ایک ایسا راز ہے جس کو وہ اور ان کا اللہ جانتا ہے، تیسرا کوئی نہیں جانتا ہے۔

صدقِ دل سے توبہ کے بغیر پریشانیوں سے نجات ممکن نہیں

نہیں کرتا ہے صدق دل سے توبہ جو گناہوں سے
کسی بھی حال میں اس کی پریشانی نہیں جاتی

چونکہ گناہوں کا خاصہ اور اثر یہ ہے کہ گناہگار دنیا اور آخرت کی بے چینیوں اور پریشانیوں میں مبتلا کیا جاتا ہے اور اس کے دل کا چین وسکون چھین لیا جاتا ہے اور وہ ایک پریشانی سے فارغ نہیں ہوتا کہ دو چار پریشانیوں میں اور ناخوش گوار واقعات میں اس کو مبتلا کر دیا جاتا ہے جیسا کہ یہ بات قرآن کی مختلف آیتوں اور مختلف احادیث میں مذکور ہے کہ گناہوں پر آخرت کے عذاب کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی مختلف نوع کے عذاب آتے ہیں اس لیے اگر بندہ گناہوں سے صدق دل سے توبہ کرلے اور متقی بن جائے تو پھر اس کے لیے قرآن کریم کا یہ وعدہ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا﴾
(سورۃ الطلاق، اٰیۃ:۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کر دے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۴۷۲)

یعنی جو تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے معاملات میں آسانیاں پیدا کر دینگے تو دوستو! دنیا کے سارے مسائل اور مصائب سے نجات کا واحد حل اور صرف ایک ہی راستہ ہمارے اللہ کی طرف سے مقرر ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام گناہوں سے دور رہنا اور جب گناہوں سے دور رہیں گے تو جتنی غلاظتیں اور گندگیاں ہیں ان سے تو حفاظت ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ ساتھ فرائض اور واجبات اور سنن موکدہ ہیں ان کو ادا کر لیا جائے تو بس یہ بندہ ولی بن گیا اور حضرت فرماتے ہیں کچھ ذکر واذکار وغیرہ مختصر طور پر کر لیے جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا کامل ولی بن جائے گا۔

دریائے اُلفت کا بے مثال ساحل

مرے دریائے الفت کا عجب ساحل ہے اے اختر
کہ ساحل پر بھی ان موجوں کی طغیانی نہیں جاتی

جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات غیر محدود ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات بھی غیر محدود ہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کا جو راستہ ہے یہ بھی غیر محدود ہے اسی لیے دوسرے شعر میں حضرت نے فرمایا یہ وہ سمندر ہے جس کا ساحل نہیں یعنی اللہ کی محبت کا سمندر ایسا سمندر ہے جس کا ساحل نہیں لیکن سمندر کی موجوں میں چلتے ہوئے ہی اللہ تعالیٰ ساحل کا مزہ دیتے رہتے ہیں۔ اللہ والے ہر گھڑی اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ہر آن خوف زدہ رہتے

ہیں لیکن اسی خوف کے اندر اللہ انہیں ایک ایسی خوشی اور لطف عطا فرماتے ہیں کہ جس کی نافرمانوں کو ذرا بھی ہوا نہیں ہوتی اس لیے کہ آرزوؤں کے ٹوٹنے اور ناجائز تمناؤں کے پورا نہ ہونے پر جب دل ٹوٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر اپنے قرب کی ایسی خاص تجلیات ڈالتے ہیں کہ جن کا لطف اور مزہ دونوں جہان سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی لیے چونکہ مریض کا دل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے تو جو اس کی عیادت کے لیے جائے تو وہ وہاں اللہ کو پاتا ہے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف ابواب الجنائز کے حاشیہ میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔

عیادت کرنے کے فائدے

اس ضمن میں احقر کے دل میں ایک بات آتی ہے کہ مریض کی عیادت کی نیتیں پیش کروں جیسا کہ مختلف کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ سو جب کسی مریض کے پاس جائیں تو درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

(۱)...... یہ نیت کریں کہ مریض کی عیادت سے مجھے اللہ مل جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں یہ مضمون مختلف کتابوں میں موجود ہے۔ اس لیے کہ مریض کا دل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اور جن لوگوں کا دل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے تو ایسے منکسر المزاج مسکین کے پاس اللہ تعالیٰ موجود ہوتے ہیں۔

﴿كما رُوِى أنا عِندَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ لأجلِىْ قالَ الطِّيْبِىُّ وفِى الْعِبارةِ إشارةٌ إِلى أنَّ الْعِيادةَ أكثرُ ثوابًا مِنَ الْإطْعامِ والْإسْقاءِ الْآتِيَيْنِ حَيْثُ خَصَّ الْأوَّلَ بِقَوْلِه وجَدْتَنِىْ عِنْدَهُ فإنَّ فِيْهِ اِيْماءً إلى أنَّ اللهَ تعالى أقْرَبُ إلى الْمُنْكَسِرِ الْمِسْكِيْنِ﴾

(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، كتاب الجنائز، باب عيادة المريض)

(۲)...... اس بیماری سے حفاظت حاصل ہو جائے گی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وعدہ آیا ہے کہ بیمار کے پاس جا کر اگر یہ دعا پڑھے تو جتنی بھی عمر اس کو حاصل ہو جائے مگر وہ بیماری اس کو نہیں لگے گی بس اتنا خیال رہنا چاہیے کہ بیمار کے پاس یہ دعا بلند آواز سے نہ پڑھی جائے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ عَافَانِىْ مِمَّا ابْتَلاكَ بِهٖ وَ فَضَّلَنِىْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلاً"

﴿عَنْ سالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنْ عُمَرَ أنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قالَ مَنْ رَأى صاحِبَ بَلاءٍ فَقالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ عافانِىْ مِمَّا ابْتَلاكَ بِه وفَضَّلَنِىْ عَلى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلاً إلَّا عُوْفِىَ مِنْ ذٰلِكَ الْبَلاءِ كائِنًا ما كانَ ما عاشَ﴾

(سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب مايقول اذا رأى مبتلى)

(۳)...... مریض کے دل کو تسلی دے کر خوش کرنا جیسا کہ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مومن کے دل کو خوش کرنا عبادت ہے۔ اِدْخَالُ السُّرُوْرِ فِىْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ عِبَادَةٌ اور اس کے لیے لَا بَأْسَ طُهُوْرٌ پڑھنا بھی عبادت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ:

﴿عن ابن عبّاس رضی اللہ عنہما أن النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم دخل علی أعرابیّ یعودہ قال وکان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم اذا دخل علی مریض یعودہ قال لا بأس طہورٌ إن شاء اللہ فقال لہ لا بأس طہورٌ إن شاء اللہ قال قلتُ طہورٌ کلا بل ھی حمّی تفور أو تثور علی شیخ کبیر تزیرہ القبور فقال النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم فنعم إذا﴾

(صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام)

(٤)......اپنے ایک مسلمان بھائی کا حق ادا کرنا۔ حدیث پاک میں ہے:

﴿عن علیّ قال قال رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم للمُسلم علی المُسلم ستٌّ بالمعروف یُسلّمُ علیہ إذا لقیہُ ویُجیبُہ اذا دعاہُ ویُشمّتُہ اذا عطس ویعودہ اذا مرض ویتبعُ جنازتہ اذا ماتَ ویُحبُّ لہ ما یُحبُّ لنفسہ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی تشمیت العاطس، ج: ۲، ص: ۱۰۲)

(٥)...... صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرنے سے شام تک ستر ہزار فرشتوں کا اپنے واسطے دعا کرنے کی ڈیوٹی پر لگا دینا اور شام کو عیادت کرنے سے صبح تک یہی معاملہ چنانچہ آپ اور ہم جو مجلس میں آنے والے حضرات ہیں اگر حضرت والا کے پاس آتے وقت دوسری نیتوں کے ساتھ ساتھ عیادت اور مزاج پرسی کی نیت بھی کر لیں تو مفت میں ہمیں ستر ہزار فرشتوں کی دعاؤں کا خزانہ حاصل ہو جائے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عن علیّ قال ما من رجلٍ یعودُ مریضا مُمسیا إلّا خرج معہٗ سبعُون ألف ملکٍ یستغفرُون لہ حتّی یُصبح وکان لہ خریفٌ فی الجنّۃ ومن أتاہُ مُصبحا خرج معہٗ سبعُون ألف ملکٍ یَستغفرُون لہ حتّی یُمسی وکان لہ خریفٌ فی الجنّۃ﴾

(سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب فی فضل العیادۃ علی وضوء)

(٦)......اگر کوئی قرابت دار ہو تو صلہ رحمی کی نیت کر کے رشتہ جوڑنے کا ثواب حاصل کرنا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو رشتہ کو جوڑتا ہے اللہ اس کو اپنے سے جوڑ لیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿عن أبی ھُریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم قال إنّ الرّحم شجنۃٌ من الرحمٰن فقال اللہ من وصلک وصلتُہ ومن قطعک قطعتُہ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب من وصل وصلہ اللہ)

(٧)......اللہ تعالیٰ کے یہاں جنت میں اس کا ایک گھر تیار ہونا جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب کوئی کسی بیمار کی مزاج پرسی کے لیے جاتا ہے تو اس کو یوں خطاب ہوتا ہے:

﴿عن أبی ھُریرۃ قال قال رسُولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم من عاد مریضا أو زار أخا لہ فی اللہ نادَاہُ مُنادٍ أن طبتَ وطاب ممشاکَ وتبوّأتَ من الجنّۃ منزلا﴾

(سنن الترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان)

جو کسی بیمار کی عیادت کرے یا اپنے کسی بھائی کی اللہ کے لیے زیارت کرے۔ تو اس کو ایک پکارنے والا فرشتہ پکار کر کہتا ہے کہ خوش رہ اور تیرا چلنا اچھا ہوا اور تو جنت میں اپنا مقام بنالے۔

(۸)...... جنت کی نعمتوں اور پھلوں میں رہنا اور اس کے راستہ پر لگ جانا۔

﴿عَنْ ثَوْبَانَ مَوْلٰی رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ مَرِیْضًا لَمْ یَزَلْ فِیْ خُرْفَۃِ الْجَنَّۃِ حَتّٰی یَرْجِعَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل عیادۃ المریض)

(۹)...... جہنم سے ستر سال کی مسافت کی دوری کے بقدر دور کر دیا جانا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے اچھی طرح سے وضو کر کے ثواب کی نیت سے اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کی تو اُسے ستر سال کی مسافت کی دوری جہنم سے دور کر دیا جاتا ہے اور بعض حضرات نے وضو کی قید نہیں ذکر کی۔

﴿عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ وَعَادَ أَخَاہُ الْمُسْلِمَ مُحْتَسِبًا بُوْعِدَ مِنْ جَھَنَّمَ مَسِیْرَۃَ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا قُلْتُ یَا أَبَا حَمْزَۃَ وَمَا الْخَرِیْفُ قَالَ الْعَامُ قَالَ أَبُوْ دَاوٗدَ وَالَّذِیْ تَفَرَّدَ بِہِ الْبَصْرِیُّوْنَ مِنْہُ الْعِیَادَۃُ وَھُوَ مُتَوَضِّئٌ﴾

(سنن أبي داود، کتاب الجنائز، باب في فضل العیادۃ علی وضوء)

(۱۰)...... اتباع سنت کی نیت سے کہ مجھ کو سنت کی اتباع کی فضیلت حاصل ہو جائے۔ اس لیے کہ عیادت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اہم سنتوں میں سے ہے۔ اور اس کی بدولت عنداللہ محبوبیت حاصل ہوتی ہے جو کہ ہمارا مقصدِ حیات ہے۔

دوستو! اس میں ایک بات اور کہتا چلوں اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ جب ان کے بندے کو دیکھنے گئے تو اللہ نے ہمیں اپنا محبوب بنالیا اب آج گھروں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی اور جھگڑے ہو رہے ہیں، میرے بھائی! یوں سوچ کر کے برداشت کر لیا کرو، کہ یہ میرا بھائی اور یہ میری بیوی ہے یہ میرے رشتہ دار ہیں اور جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

﴿اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الشفقۃ والرحمۃ)

کہ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے تو ہر انسان، اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اگر میں نے ذرا برداشت کیا تو اللہ مجھے اپنا محبوب بنالیں گے کیونکہ کوئی باپ ہو آپ اس کے بیٹے کو درگزر کریں اور حسن سلوک کریں اس سے دوستی رکھیں تو بیٹے کی دوستی سے آپ باپ کے یہاں دوست بن جائیں گے اور بلکہ ایک ترکیب ہے جو کوئی آپ سے بہت زیادہ حسد کرتا ہو تو ایک تو آپ اس کیلئے دعا شروع کر دیں۔

اور اس کے بچوں سے الفت و محبت کا اظہار کرنے لگیں کبھی کچھ کھانے پینے کی چیز دے دیا کریں تو ان شاء اللہ رفتہ رفتہ اس کا حسد کم ہوتا چلا جائے گا۔

کسی مخلص کی ضائع کوئی قربانی نہیں جاتی

کسی مخلص کی ضایع کوئی قربانی نہیں جاتی
کسی کے قلب سے جو آہ پنہانی نہیں جاتی

اگر چہ معاف کردیتے ہیں وہ اپنی محبت سے
مگر میں کیا کروں میری پشیمانی نہیں جاتی

بتوں کی بے وفائی کا کیا ہے تجربہ تو نے
مگر اے نفس پھر بھی تیری نادانی نہیں جاتی

ترا بچپن یہ پچپن میں مجھے حیرت ہے اے ناداں
بڑھاپے میں بھی تیری خوئے طفلانی نہیں جاتی

عجب دُرویش ہیں تیرے کہ گدڑی پوش ہو کر بھی
بہ فیض نور نسبت شان سلطانی نہیں جاتی

محبت میں کبھی ایسے بھی دن آتے ہیں اے اختر
کہ رونے پر بھی غم کی اشکباری نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **آہِ پنہانی**: دل کا رونا۔ **پشیمانی**: ندامت۔ **بتوں**: بت کی جمع مراد تمام نامحرم عورتیں اور حسین لڑکے۔ **خوئے طفلانی**: بچکانہ عادت۔ **شانِ سلطانی**: بادشاہوں کی شان۔ **اشکباری**: آنسو بہانا۔

کسی بھی مخلص کی قربانی ضائع نہیں جاتی ہے

کسی مخلص کی ضائع کوئی قربانی نہیں جاتی
کسی کے قلب سے جو آہ پنہانی نہیں جاتی

حضرت والا دامت برکاتہم کا یہ کلام ہے جس کا عنوان ہے کسی مخلص کی ضائع کوئی قربانی نہیں جاتی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن پاک میں اعلان فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

(سورۃ التوبۃ: اٰیۃ ۱۲۰)

اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اس کا معنیٰ یہ نہیں ہوتا کہ ایک انسان اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرر ہا ہے اور یہ خیال کرر ہا ہے کہ اس کے ذہن اور سوچ کے مطابق اس پر مرتب ہونے والے نتائج جلد سے جلد حاصل ہو جائیں یا جو کچھ وہ اپنے ذہن میں سوچے ہوئے ہے وہ اسی کے مطابق مل جائے اور اسے حاصل

ہو جائے قربانی کے ضائع نہ ہونے کا یہ معنیٰ نہیں ہے بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اجر و ثواب تو ضرور دینگے مگر بہت سی مرتبہ بندہ اپنے لیے جلد بازی میں کوئی چیز تجویز کرتا اور سوچتا ہے کہ میں تقویٰ اختیار کر رہا ہوں اور نیک بن گیا ہوں تو اب مجھے میری فلاں فلاں ضرورت مل جانی چاہیے لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتے ہیں کہ دنیا میں اس کو اس کے مقاصد اور ضروریات میں سے کونسی دی جانی چاہیے اور کیا کچھ آخرت کے لیے ذخیرہ کر کے رکھ لینا چاہیے تو آخرت میں جو ملے گا یہ ضائع ہونا نہیں ہے بلکہ دائمی نعمت اور راحت کی صورت تو آخرت ہی میں ملنا ہے اس لیے روایت میں ہے کہ وہ لوگ کہ جن کو دنیا میں ہر طرح کی عافیت اور راحت ملی تھی وہ قیامت کے دن جب ان لوگوں کو دیکھیں گے کہ جو کبھی مرض میں، کبھی کسی مصیبت میں، کبھی کسی الجھن میں مبتلا ہوتے رہتے تھے اور اسی طرح ان کی زندگی کٹ گئی جب وہ آخرت میں دیکھیں گے کہ مصیبت میں مبتلا لوگوں کو جو اجر و ثواب دیئے جا رہے ہیں یہ تو بہت زیادہ ہیں تو وہ کہیں گے:

﴿ يَوَدُّ اَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ يُعْطَى اَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِى الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی ذهاب البصر)

کہ کاش! ان کی کھالوں کو دنیا میں قینچیوں سے کاٹا جاتا یعنی اسی طرح سے وہ بھی مصائب میں مبتلا رہتے کیونکہ اتنا اجر و ثواب دیکھیں گے کہ اس کی کثرت کو دیکھ کر یہ تمنا پیدا ہوگی۔ جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ہے:

﴿ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ بْنُ مَهْدِيّ السَّلَمِيُّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ مِّنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ ابْتَلَاهُ اللهُ فِىْ جَسَدِهِ اَوْ فِىْ مَالِهِ اَوْ فِىْ وَلَدِهِ قَالَ اَبُوْ دَاوٗدَ زَادَ ابْنُ نُفَيْلٍ ثُمَّ صَبَّرَهُ عَلٰى ذٰلِكَ ثُمَّ اتَّفَقَا حَتّٰى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِىْ سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ تَعَالٰى ﴾

(سنن أبي داؤد، کتاب الجنائز، باب الأمراض المکفرة للذنوب)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبھی بندہ اپنے عمل سے اس درجے پر نہیں پہنچ پاتا جو اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمایا ہے یعنی بہت اونچا مقام تو پھر اللہ تعالیٰ اسے کسی جانی یا مالی نقصان یا اولاد میں کمی کی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں اور پھر اسے صبر کی توفیق دے کر اسے اس درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ میں نیک بھی بن گیا اور دعائیں بھی کر رہا ہوں لیکن پھر یہ کیا ہو رہا ہے میں اپنی دعاؤں کا اثر دنیا میں کیوں نہیں دیکھ رہا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ تمہاری دعائیں بھی قبول اور تمہاری نیکیاں بھی۔ قبول وہ سب ضائع نہیں ہو رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارا جو مقام رکھا ہے اور جو اونچا مرتبہ آخرت میں تمہارے لیے طے کیا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر لے جانا چاہتے ہیں جب دنیا میں آنکھ بند ہو کر آخرت میں آنکھ کھلے گی اور وہ مرتبہ اور

مقام تمہیں نظر آئے گا تو پتہ چلے گا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتے اور قربانی ضرور رنگ لاتی ہے۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جس کو ہم قربانی سمجھتے ہیں اس پر اللہ اجر دیتے ہیں ورنہ خود ہم کو اس قربانی کے عطا کرنے والے وہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دیدے یا مال دے دے تو جان اور مال دینے کی توفیق بھی تو ہمیں اسی اللہ نے دی ہے تو وہ خود اللہ کا ممنون کرم ہے اور اللہ کا ہم اس پر شکر ادا کریں کہ اے اللہ جو توفیق دی ہے یہ آپ کا فضل وکرم ہے ورنہ ہم خود اپنی چاہت سے یہ قربانی پیش نہیں کر سکتے تھے اور پھر اس کی نسبت ہماری طرف کر کے ہمیں اس پر اجر وثواب دے رہے ہیں۔

قبولیتِ عمل کی شرائط

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا﴾

(سورۃ الاسراء، آیۃ ۱۹)

ترجمہ: اور جو شخص (اپنے اعمال میں) آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کے لیے جیسی کوشش کرنی چاہیے ویسی ہی کوشش بھی کرے گا۔

مطلب یہ ہے کہ ہر کوشش بھی مفید نہیں بلکہ کوشش صرف وہی مفید ہے جو شریعت اور سنت کے موافق ہو کیونکہ حکم ایسی ہی کوشش اور عمل کا دیا گیا ہے اور جو عمل اور سعی شریعت وسنت کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں) بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سوایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی غرض اللہ کے یہاں کامیابی کی شرطیں چار ہوئیں اول تصحیح نیت یعنی خالص ثواب آخرت کی نیت ہونا جس میں اغراض نفسانی شامل نہ ہو۔ دوسرے اس نیت کے لیے عمل اور کوشش کرنا صرف نیت وارادہ سے کوئی کام نہیں ہوتا جب تک اس کے لیے عمل نہ کرے تیسرے تصحیح عمل یعنی سعی وعمل کا شریعت اور سنت کے مطابق ہونا کیونکہ مقصد کے خلاف سمت میں دوڑنا اور کوشش کرنا بجائے مفید ہونے کے مضر اور نقصان دہ ہے۔ اور چوتھی شرط جو سب سے اہم اور سب کا مدار ہے وہ تصحیح عقیدہ یعنی ایمان ہے ان شرائط کے بغیر کوئی عمل اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

اس آیت میں سعی وعمل کے ساتھ لفظ سَعْيَهَا بڑھا کر یہ بتلا دیا گیا ہے کہ ہر عمل اور ہر کوشش نہ مفید ہوتی ہے نہ عند اللہ مقبول بلکہ عمل وسعی وہی معتبر ہے جو مقصد آخرت کے مناسب ہو اور مناسب ہونا یا نہ ہونا یہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتا ہے اس لیے جو نیک اعمال خود رائی اور من گھڑت طریقوں سے کیے جاتے ہیں جن میں بدعات کی عام رسوم شامل ہیں وہ دیکھنے میں کتنے ہی بھلے اور مفید نظر آئیں مگر آخرت کے لیے سعی مناسب نہیں اس لیے نہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں اور نہ آخرت میں کارآمد۔

اور تفسیر روح المعانی نے سَعْیَهَا کی تشریح میں سعی کے مطابق سنت ہونے کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس عمل میں استقامت بھی ہو یعنی عمل مفید مطابق سنت بھی ہو اور اس پر استقامت اور مداومت بھی ہو۔ بدنظمی کے ساتھ کبھی کرلیا کبھی نہ کیا اس سے پورا فائدہ نہیں ہوتا۔

پھر حضرت والا نے شعر میں لفظ مخلص استعمال فرمایا اس لفظ کے استعمال میں حضرت نے اس مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو مختلف کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ صحیح قول کے مطابق یہ حدیث نہیں ہے، مگر دوسرے دلائل قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور حضرت تھانوی کے خطبات الجمعہ میں بھی مذکور ہے:

﴿اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ ھَلْکٰی اِلَّا الْعَامِلُوْنَ وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَلْکٰی اِلَّا الْعَالِمُوْنَ وَالْعَالِمُوْنَ کُلُّھُمْ ھَلْکٰی اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب البر و الصلۃ)

کہ تمام لوگ ہلاکت اور خسارے میں ہیں مگر وہ لوگ جو عالم ہوں اور وہ علماء بھی ہلاکت اور خسارے میں ہیں بجز ان کے جو اس علم پر عمل کرنے والے ہوں اور وہ عمل کرنے والے بھی ہلاکت میں اور خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو کہ مخلص ہوں اور مخلصین خطرہ عظیم پر ہیں۔

تو دوستو! جب عمل اللہ کی رضا کے لیے اخلاص کے ساتھ کیا جائے تب ہی وہ معتبر ہے اور وہی عمل ہے جس پر (عنداللہ) اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ملے گا اسی لیے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے'' ارشاد فرمایا گیا ہے۔ آیت میں محسنین کا معنیٰ و مطلب وہی لوگ ہیں جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دینی اعمال کرتے ہوں اور جنہوں نے غیر اللہ کو اس میں بالکل شامل نہ کیا ہو کیونکہ اگر غیر اللہ نیت میں شامل ہو تو علماء نے لکھا ہے کہ پھر وہ احسان نہیں ہے صفت احسان میں ضروری ہے کہ صرف اللہ کی ذات پیش نظر ہو اور صرف اللہ کی ذات مقصود ہو تو پھر ایسے مخلص بندے کی قربانی اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرماتے اسی لیے اللہ کے راستے میں جو اپنی خواہشات، ناجائز تمناؤں، آرزوؤں کو قربان کرتے ہیں اور یہ تلخ اور کڑوے گھونٹ پیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے قلب کو ایک ایسی آہ پنہانی عطا فرماتے ہیں کہ وہ آہ ان اہلِ دل اللہ والوں کے چہروں سے چمکنے اور آنکھوں سے چھلکنے لگتی ہے اور ان کے حالات اور کیفیات سے ظاہر ہو جاتی ہے اور یہ جو آہ اور درد محبت ہے یہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی وراثت ہے، حضرات انبیاء کو یہ عطا ہوئی چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گر گر کس طرح آہیں بھرتے تھے پھر حضرات صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسا انسان جن کو جنت کی بشارت دی گئی اور کیا کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت کے متعلق ارشاد نہیں فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا جب دل پر غلبہ ہوتا تھا تو پھر وقتی طور پر سب مبشرات بھول جایا کرتے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے ان سے

ذہول ہوجاتا تھا اور اتنی اللہ تعالیٰ کی عظمت ان کے قلب پر چھائی تھی کہ ایک دن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی زبان پکڑے بیٹھے تھے اور کھینچ رہے تھے ایک صحابی کے پوچھنے پر جواب ارشاد فرمایا:

﴿عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ دَخَلَ عَلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ وَهُوَ يَجْبِذُ لِسَانَهُ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَهْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ إِنَّ هٰذَا أَوْرَدَنِي الْمَوَارِدَ﴾

(مؤطا مالک، کتاب الکلام، باب ما جاء فیما یخاف من اللسان)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنی زبان کو کھینچ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو تو اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائیں (یہ کیا کر رہے ہو؟) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میری زبان نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں لا کھڑا کیا ہے۔

حالانکہ یہ وہ لوگ تھے کہ ایک جملہ بھی ان کا بے مقصد اور فضول نہیں نکلتا تھا تو حضرت فرماتے ہیں جب کوئی یہ قربانی دے گا اللہ تعالیٰ قلب میں یہ دردِ محبت عطا فرمادیں گے اور پھر اسی سے آہ وفغاں ظاہر ہوتی ہے۔

اللہ کی معافی اور بندہ کی پشیمانی

اگر چہ معاف کر دیتے ہیں وہ اپنی محبت سے
مگر میں کیا کروں میری پشیمانی نہیں جاتی

اوپر کے مصرعے میں حضرت والا دامت برکاتہم نے اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کے وعدوں کا بیان فرمایا ہے جو ایک تائب کی توبہ پر اللہ تعالیٰ نے کیے ہیں اگر توبہ کے ابواب کھول کر انسان پڑھ لے تو اسے یہ محسوس ہوگا کہ اگر میں 24 گھنٹے بھی گناہوں میں گزار رہا ہوں اور ساٹھ اور ستر سال کی ساری عمر اسی طرح گناہوں میں گزاری اور اتنے گناہ کیے ہوں کہ اس زمین سے لے کر آسمان کی جو یہ چھت ہے وہاں تک ہو جائیں اور ساری زمین گناہوں سے بھر جائے بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطِيْئَةً میرے پاس لے کر کوئی آئے اور پھر وہ مجھ سے معافی مانگتا ہوا آئے تو بھی میں اس کے سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہوں اور ایک جگہ روایت میں ہے وَ لَا اُبَالِیْ اور میں پرواہ نہیں کرتا اور اتنے بڑے گناہ گار کو بھی بخش دیتا ہوں اور مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ پوچھے کہ اتنے بڑے گناہ گار کو کیوں معاف کر دیا؟ جیسا کہ حدیثِ قدسی میں یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا أُبَالِيْ. يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أُبَالِيْ. يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً﴾

(سنن الترمذی)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے انسان! تو جب تک مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور اُمید رکھے گا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا جو بھی خطا تجھ سے ہو اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اور اے انسان! اگر تیرے گناہ آسمان کی چھت تک پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے مغفرت چاہے تو بھی تجھے بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اے انسان! تو اگر میرے پاس زمین بھر کر خطائیں لائے اور پھر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا تو بھی تجھ سے زمین بھر کر مغفرت کے ذریعہ ملوں گا۔

کیونکہ میں کامل خود مختار ہوں مجھے اختیارِ کلی ہے میرے سوا اور کوئی دوسرا خدا نہیں ہے جو مجھ سے سوال کرے یا میرا کوئی پاٹنر (partner) اور شریک نہیں ہے کہ جو مجھ سے پوچھے کہ اتنے گناہ گار کو کیوں معاف کیا۔

آہ! کیسا پیارا ہمارا اللہ ہے یہ تو حضرت نے اللہ تعالیٰ کے یہاں جو بندوں کے ساتھ معاملہ ہے اس کو ذکر کیا ہے کہ اللہ غفور ہے اور آگے قرآن کریم میں لفظ ودود بھی آیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے **وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ** سبحان اللہ! دونوں مبالغے کے صیغے ہیں کہ جو بہت معاف کرنے والا، جو اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا ہے اور ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی﴾

(سورة طه، اية: ۸۲)

ترجمہ: اور میری بڑی بخشش ہے اس پر جو توبہ کرے اور یقین لائے اور کرے بھلا کام پھر راہ پر رہے۔

(معارف القرآن، ج۱ صفحہ ۱۲۷)

لیکن آگے حضرت فرماتے ہیں کہ بندے کو بھی تو چاہیے کہ ہر وقت اپنے کئے ہوئے کے اوپر پشیمان اور نادم و شرمندہ رہے اور زندگی کے اخیر سانس تک اپنے سے صادر ہوئی خطاؤں اور غفلتوں اور گناہوں پر نادم رہے کیونکہ ہم سے حق عبادت کہاں ادا ہوا؟ اور کہاں حق معرفت ادا ہوا؟ ان سب تقصیرات پر اللہ کے سامنے آہ وزاری کرتا رہے اسی لیے اللہ والا بننے کی حقیقت کیا ہے؟ میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ بس اپنے نقائص اور معائب کھل کر اس طرح سامنے آجائیں کہ اپنی حقیقت کا پتہ چل جائے، اپنی حیثیت و قیمت کا حال دل پر واضح ہو جائے اسی لیے یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اللہ والے جو ہوتے ہیں وہ اندر سے ایسے ہو جاتے ہیں کہ ہر وقت پشیمان اور نادم اور مقام توبہ میں رہتے ہیں ہم سب کو ہر وقت اسی طرح رہنا چاہیے کیونکہ ہماری عبادت بھی اس قابل ہے کہ ہم اس پر اللہ سے توبہ کریں اور غفلتوں کی معافی مانگیں کہ جس طرح ہمیں کرنی چاہیے ہم اس طرح نہیں کر پائے جب بندہ ہر وقت مقامِ توبہ میں رہے گا اور توبہ پر محبوبیت کا وعدہ ہے تو ان شاء اللہ سے موت بھی آئی گی تو محبوب خدا ہوگا۔

بتوں کی بے وفائی پھر بھی نفس کی نادانی

بتوں کی بے وفائی کا کیا ہے تجربہ تو نے
مگر اے نفس پھر بھی تیری نادانی نہیں جاتی

بتوں سے حضرت والا کی مراد غیر محرم عورتیں اور امرد (بے ریش حسین لڑکے) ہیں ان سے عشق اور تعلق کا نتیجہ بے وفائی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ حضرت والا کے مختلف اشعار کے ضمن میں یہ مضمون بکثرت آیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وفا کی صحیح حقیقت سے دنیا کا ہر ذرہ خالی ہے اس لیے کہ ہم اس سے بہت جلد جدا ہو کر سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلے جانے والے ہیں اس لیے دنیا کے چکروں میں لگنا اور اپنے کو پھنسانا یہ بہت بڑی نادانی ہے۔

پچپن میں بچپن کی عادتیں

ترا بچپن یہ پچپن میں مجھے حیرت ہے اے ناداں
بڑھاپے میں بھی تیری خوئے طفلانی نہیں جاتی

جب انسان عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کے اندر سے بچپن کی خصلتیں دور ہو کر وقار اور عزت واحترام اور سمجھ بوجھ دور اندیشی جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں مگر جو شخص اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزر جانے اور عالم آخرت سے قریب ہونے کے باوجود دنیا کے چکروں میں مشغول ومصروف اور اس کے فانی بتوں کے ساتھ دل اٹکائے ہوئے ہو تو یہ کس قدر افسوس اور تعجب کی بات ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک شخص اپنی گاڑی مشرق کی طرف لیے جا رہا ہو اور اس کی نظر مغرب کی جانب میں ہو تو کیا اس کی تباہی اور انجام کی بربادی میں کوئی شک ہوگا حضرت عارفی فرماتے ہیں ؎

قدم سوئے عقبیٰ نظر سوئے دنیا
کہاں جا رہے ہو کدھر دیکھتے ہو

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کی عمر کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿أَعْمَارُ أُمَّتِيْ مَا بَيْنَ سِتِّيْنَ إِلَى سَبْعِيْنَ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب اعمار الامۃ)

میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہیں جس کی مراد اور مفہوم یہ ہے کہ اکثر حضرات اس سے متجاوز نہیں ہونگے اس لیے پچپن اور ساٹھ برس میں پہنچنے کے بعد انسان دنیا کو چھوڑنے اور آخرت میں پہنچنے کے قریب ہو جاتا ہے جس کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ بھرپور طریقے سے رات ودن آخرت کے لیے تیاری پر لگ جائے اور جو چیز آخرت میں کام آنے والی ہے اس کو زیادہ سے زیادہ ساتھ لینے کی کوشش کرے یعنی اللہ کی خوب عبادت اور دین کے کاموں میں مشغولیت اور ذکر وتلاوت، توبہ واستغفار، صلوٰۃ ومناجات وغیرہ کا خوب اہتمام

رکھے کیونکہ یہی سب چیزیں آخرت میں ساتھ جانے والی ہیں باقی سب کچھ یہیں رہ جانے والا ہے مگر افسوس کہ پچپن میں پہنچنے کے بعد بھی ہماری حالت وہی بےفکری اور غفلت کی رہتی ہے جیسا کہ بچپن میں آدمی کی عادت ہوا کرتی ہے اسی صورت حال پر حضرت والا اس شعر میں اظہارِ افسوس فرما رہے ہیں۔

گدڑی پوش ہو کر تاج پوشوں سے زیادہ عزت

عجب دُرویش ہیں تیرے کہ گدڑی پوش ہو کر بھی
بہ فیضِ نورِ نسبت شانِ سلطانی نہیں جاتی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کے لیے جو اپنے مولیٰ پر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور اپنے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد رکھتے ہیں اور انہیں خاص نسبت مع اللہ کی شان حاصل ہوتی ہے فقیری میں بھی بادشاہی کا مزہ ہوتا ہے اور وہ بظاہر درویش ہو کر بھی کسی سلطان سے کم نہیں ہوتے بلکہ دنیا کے بادشاہوں سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ سلاطینِ دنیا کو انسانوں کے ظاہر پر حکومت حاصل ہوتی ہے جب کہ اہل اللہ کو لوگوں کے دلوں پر بادشاہت حاصل ہو جاتی ہے اور ہر طرف سے لوگ دل و جان اللہ والوں پر قربان کرنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں اور ایسی عزت واحترام لوگوں کے دلوں میں منجانب اللہ ڈال دیا جاتا ہے کہ جو دنیا میں کسی کے لیے حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ کئی احادیث مبارکہ اور مختلف آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ مذکور ہے کہ جب بندہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور پورا پورا تقویٰ اختیار کر لیتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ اپنا محبوب بنا لیتے ہیں اور پھر اہل دنیا کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے بزرگوں کی پوری تاریخ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے کہ انہوں نے اپنے کو اللہ کے لیے مٹایا اور اپنے سینوں میں نسبت مع اللہ کا خزانہ حاصل کیا تو ادھر اہل دنیا ان کی ایسی عزت کرنے لگے کہ جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی جیسا کہ کتاب میں دوسرے مختلف مقامات پر آیات واحادیث نقل کی گئی ہیں۔

محبت کی ایک نرالی ادا

محبت میں کبھی ایسے بھی دن آتے ہیں اے اخترؔ
کہ رونے پر بھی غم کی اشکباری نہیں جاتی

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اکثر صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی یاد میں رونے کی صفت حاصل تھی اور وہ راتوں میں اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اور سجدہ ریز ہو کر گزارا کرتے تھے اور دعاؤں میں بہت زیادہ آہ وفغاں کیا کرتے تھے اور احقر کے ناقص علم کے مطابق جب بھی کسی صحابی نے دوسرے صحابی کو روتا ہوا دیکھا اور پھر وجہ دریافت کی تو تقریباً ہر ایک

کے جواب سے یہی بات پتہ چلتی ہے کہ ان کے گریہ وبکا کا سبب کبھی بھی کوئی دنیا کا معاملہ اور مادی رنج وغم نہیں ہوا کرتا تھا۔ کوئی مالی نقصان پیش آجانے یا کوئی دنیاوی مفاد فوت ہوجانے کی وجہ سے وہ لوگ رونے کے عادی نہیں تھے بلکہ جب بھی کوئی صحابی روتا ہوا ملا تو وجہ دریافت کرنے پر یہی بات سامنے آئی کہ آخرت کا کوئی غم ان کے گریہ و بکا کا سبب ہے اور کوئی دینی فکر ان کو رلا رہی ہے۔ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق اور جدائی کا اندیشہ، کبھی اپنے اعمال کو سوچ کر آخرت میں پیش آنے والے واقعات کا تصور کبھی ماضی میں گزرے ہوئے زمانے کو سوچ کر اس پر ندامت اور کبھی تن تنہا آخرت کا طویل سفر کرنے کی فکر، کبھی دنیا کی محبت کا خیال، تو کبھی قبر کی منزل کا ڈر وغیرہ وغیرہ جیسے امور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رلایا کرتے تھے۔

جب کہ آج کی صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آتی ہے کہ جدھر جاؤ آہ وزاری کرنے والے تو ملیں گے مگر جو رو رہیں ہیں سب کے سب مالی معاملات اور دنیوی عیش وعشرت میں نقصان اور کمی کا درپیش ہونا اور دوسری دنیوی اور مادی وجوہات کی وجہ سے روتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جس کی وجہ سے دل ودماغ پریشانی کا شکار رہتے ہیں اور زندگی میں مایوسی اور اداسی چھائی رہتی ہے۔

بس اس موقع پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جسے اپنے لیے رلاتے ہیں تو پھر اس کو دوسروں کے در پر رونے کا موقع نہیں آنے دیتے اور جسے آخرت کے غم میں رونے کی سعادت میسر آتی ہے اسے دنیا کے غموں میں پڑ کر گریہ وزاری سے بچالیا جاتا ہے اور اسے اس رونے میں ایسا کیف وسرور اور مزہ نصیب ہوتا ہے کہ عین روتے وقت ہنسنے کا مزہ اور اللہ کی راہ کے غموں کو اٹھانے کے وقت خوشیوں کا مزہ نصیب ہوتا ہے اور یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ملنے والی ایک عظیم الشان نعمت ہے جس میں کبھی وہ حالت ہوتی ہے جو اس شعر میں مذکور ہے کہ اللہ کے سامنے خوب رو لینے کے باوجود بھی دل بھرتا نہیں ہے بلکہ مزید سے مزید رونے کو جی چاہتا ہے جس کے نتیجے میں دل کو بڑی ٹھنڈک اور سرور حاصل ہوتا ہے جیسا کہ مولانا رومی نے اس تمنا کا اظہار اس طرح سے کیا ؎

اے دریغا اشک من دریا بدے
تا نثار دلبر زیبا شدے

اور جیسا کہ حضرت خواجہ صاحب نے اسی کو یوں فرمایا ہے ؎

ہوگئی خشک چشم تر بہہ گیا ہو کے خوں جگر
رونے سے دل مرا مگر ہائے ابھی بھرا نہیں

لباس فقر میں بھی شان سلطانی نہیں جاتی

کبھی گو شان دردِ دل کی پہچانی نہیں جاتی
رخ عارف سے لیکن شان سلطانی نہیں جاتی

زمانہ ہو گیا گلشن میں رہتا ہوں مگر پھر بھی
مری فطرت سے کیوں خوئے بیابانی نہیں جاتی

ہزاروں شاخ میں تقسیم کر ڈالا محبت نے
مگر پھر بھی مرے دریا کی طغیانی نہیں جاتی

ہزاروں فتنہ دلکش میں ہوتے ہیں گھرے لیکن
جو ربانی ہیں ان کی شان ربانی نہیں جاتی

عناصر مضمحل پیری سے اہل اللہ کے بھی ہیں
مگر چہرے سے ان کے پھر بھی تابانی نہیں جاتی

اٹھا جاتا نہیں ہے بے سہارے پھر بھی یہ کیا ہے
کہ ان کے قلب سے مستی و جولانی نہیں جاتی

بظاہر فقر ہے دامن میں لیکن کیا ہے باطن میں
کہ جس سے پھر بھی ان کی شان سلطانی نہیں جاتی

کہوں میں کس طرح سے شان ان اللہ والوں کی
لباس فقر میں بھی شان سلطانی نہیں جاتی

گئے تھے بھول مرشد پھول پوری نام بھی اپنا
حضور حق میں اپنی ذات پہچانی نہیں جاتی

محبت کی کرامت میں نے اختر یہ بھی دیکھی ہے
لباس عقل میں بھی چاک دامانی نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **رُخ**: چہرہ۔ **تابانی**: چمک۔ **گلشن**: باغ۔ **بیابانی**: صحرا یا ویرانے میں رہنے کی عادت۔ **دلکش**: دل کو کھینچنے والے فتنے۔ **ربانی**: اللہ والے۔ **عناصر**: ٹکڑے۔ **مضمحل**: کمزور۔ **پیری**: بڑھاپا۔ **مستی وجولانی**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی کیفیت اور مزا۔ **فقر**: غربت۔ **باطن**: دل۔ **شانِ سلطانی**: بادشاہوں والی شان۔ **حضورِ حق**: اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری۔ **چاکِ دامانی**: دامن پھٹا ہوا ہونا۔

رخِ عارف کی تابانی اور دردِ دل کی ترجمانی

کبھی گو شان دردِ دل کی پہچانی نہیں جاتی
رخِ عارف سے لیکن شان سلطانی نہیں جاتی

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جنہیں اپنا دردِ دل عطا فرماتے ہیں اور اپنے قرب کی لذت سے آشنا کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر ایسے انوارات وتجلیات رکھ دیتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کو دیکھتے ہی فوراً مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے ہیں اور ان کے چہروں ہی پر اللہ تعالیٰ عجیب شان سلطانی کے اثرات رکھ دیتے ہیں جس کی بنیاد راتوں کی آہ وزاری اور تلاوت وعبادت وغیرہ ہے یہاں تک کہ اللہ والوں کی عمریں جتنی بڑھتی جاتی ہیں ان کے چہرے پر یہ تجلیات اور انوارات میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ اپنے تو اپنے غیر بھی جب ان کے چہرے پر نظر ڈالتے ہیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

خوئے بیابانی اور مزاجِ صحرانوردی

زمانہ ہو گیا گلشن میں رہتا ہوں مگر پھر بھی
مری فطرت سے کیوں خوئے بیابانی نہیں جاتی

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے اوپر یہ فضل فرمایا ہے کہ گلشن میں رہنے کے باوجود میں اپنی ابتدائی زندگی کے زمانے کے جو نقوش عبادت وریاضت میرے قلب پر اپنے شیخ کی صحبت میں رہ کر جم گئے تھے وہ اسی طرح قائم اور برقرار ہے یعنی ظاہری طور پر کچھ دنیا کی چیزیں اور راحت وآرام کا سامان میسر آجانے کے باوجود میرا دل ان کے ساتھ وابستہ اور جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ وہی جنگلوں میں رہ کر اللہ تعالیٰ کا نام لینے کا مزہ اور اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کی معیت میں جو راتوں کی عبادتیں اور تلاوت ومناجات کے پُر کیف مناظر دل میں رچے اور بسے تھے وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ دل کی صورت حال یہ ہے کہ اس سے یہ دنیائے دوں گر چکی ہے۔

یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دارِ فانی کا

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس حدیث شریف کے تحت اسی مضمون کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

﴿عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ عَطَاءُ بْنُ يَزِيْدَ اللَّيْثِيُّ أَنَّ أَبَا سَعِيْدٍ الْخُدْرِيَّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ حَدَّثَهُ قَالَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ قَالُوْا ثُمَّ مَنْ قَالَ مُؤْمِنٌ فِيْ شِعْبٍ مِّنَ الشِّعَابِ يَتَّقِي اللهَ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ﴾

(صحیح البخاری، والتکشف، ص: ۲۹۷)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے) سوال کیا کہ یارسول اللہ! سب سے افضل کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا جو مؤمن اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔ سوال کیا گیا کہ پھر کون شخص افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو شخص (پہاڑ کی) گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں رہتا ہو، اللہ سے ڈرتا ہو اور خلق کو اپنے شر سے فارغ کر رکھا ہو۔

اکثر اہل اللہ کی عادت رہی ہے کہ خلق سے اختلاط کم رکھا ہے اور گوشہ نشین رہے ہیں۔ اس حدیث سے اس کی اجازت اور ایک درجہ میں فضیلت ثابت ہوتی ہے اور حدیث میں اس کے محل کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب اختلاط میں احتمال ایصال شر الی الخلق کا ہو اور اسی پر قیاس کیا جائے گا وصول شر من الخلق کو اور نیز حدیث مذکور ہی میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس شخص سے خیر و نفع عام زیادہ متوقع ہو اُس کے لیے اختلاط افضل ہے۔ چنانچہ مؤمن مجاہد کو صاحبِ عزلت سے افضل فرمایا اور یہی خلاصہ ہے تحقیق کا مسئلہ مجوث عنہا میں کہ جس شخص سے مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہو اُس کے لیے جلوت بہتر ہے اور جس سے نفع متعلق نہ ہو اور جلوت میں احتمال اضرار یا تضرر کا ہو اُس کے لیے خلوت بہتر ہے۔ (التکشف ،صفحہ ۲۹۷)

اب یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب خلوت محبوب ہے اور جلوت میں رہ کر خوئے بیابانی نہیں جاتی تو پھر آخر گلشن میں رہ کر ایسی جلوت اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ کسی صحرا و جنگل میں اور یالبِ دریا اور دامنِ کوہ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے اور وہیں زندگی گزاری جائے تو اُس کا جواب بھی اس مذکورہ حدیث کی شرح میں آ گیا ہے کہ جس کے جلوت میں رہنے اور مخلوق سے اختلاط و میل و جول میں اُن کو نفع پہنچانے اور تبلیغِ دین کی نیت ہو تو پھر اُس کو یہیں رہنا زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اگرچہ دل کا حال خلوت و یکسوئی کے ساتھ وابستہ ہو۔ جیسا کہ جملہ اہل اللہ کی شان یہی ہوتی ہے۔

اور بس یہی فرق ہے اہل اللہ اور اہل دنیا میں کہ وہ گلشن میں ہوتے ہوئے خوئے بیابانی کے حامل رہتے ہیں اور اہل دنیا کو جب گلشن میسر آتا ہے اور ان کو ظاہری طور پر دنیا کے مال و دولت مل جاتے ہیں تو پھر وہ اپنے فقر و فاقہ اور بے بسی اور بے کسی کے حالات کو بھول کر دولت کے نشے میں مست ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھول بیٹھتے ہیں اور اس طرح دنیا ان کے دل میں گھس کر ان کی تباہی اور بربادی کا سبب بنتی ہے بالکل ٹھیک اسی طرح جیسے کشتی کے لیے پانی باہر رہنے کے بجائے اندر داخل ہو جائے تو پھر وہ کشتی اور کشتی والے سب غرق ہو کر ہلاک ہو جائیں گے۔

اس لیے اس شعر میں یہ سبق ہے کہ بندہ کسی بھی حال میں ہو اپنے اللہ کو فراموش نہ کرے اور ہمیشہ اپنا دل اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے ساتھ وابستہ رکھے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہری حالات بہت خوش گوار اور عمدہ کر دیئے جائیں تو بھی اپنے دل میں ان کی وجہ سے کوئی بڑائی اور تعلّی نہ آنے پائے دل سے ہر حال میں متواضع ہی

رہے اور اپنے اندر خوئے بیابانی لیے رہے جیسا کہ وہ تمام صحابہ کرام جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مال و دولت عطا فرمایا تھا مگر ان کے دل اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کی وجہ سے متواضع تھے۔

محبت کی ہزاروں شاخوں میں تقسیم

ہزاروں شاخ میں تقسیم کر ڈالا محبت نے
مگر پھر بھی مرے دریا کی طغیانی نہیں جاتی

اللہ تعالیٰ کی محبت ایسی چیز ہے کہ جسے حاصل ہو جاتی ہے وہ ہر طرح سے اللہ پر فدا ہونے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے اور اپنی ادائے محبت مختلف شکلوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے کسی کو دیکھو تو اپنی گردن خدا کی راہ میں کٹا کر ادائے محبت دکھا رہا ہے تو کوئی تختہ دار پر لٹک کر اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر رہا ہے جب کہ کوئی اپنی سلطنت و حکومت چھوڑ کر اللہ کی محبت میں فقیری کو ترجیح دے رہا ہے تو کسی کو اپنی قوم کی طرف سے ملک بدر کیا جا رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت میں سچا خدا کا عاشق ایسا مست و سرشار دکھائی دیتا ہے کہ ہر طرح کی قربانی دے کر اس کے دل میں جذبات محبت اسی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔

کیا ہی خوب حضرت نے اس کو تعبیر کیا ہے کہ مجھے محبت نے ہزاروں شاخوں میں تقسیم کر ڈالا کہیں گریہ و بکا ہے تو کہیں تلاوت و مناجات کی لذت سے محظوظ ہو رہا ہوں کہیں وعظ و بیان کے ذریعے اپنے جذبات محبت کو پیش کر رہا ہوں تو کہیں تصنیف و تالیف میں اپنے درد دل کی کہانی لکھنے پر مجبور ہوں کہیں اللہ کے عاشقوں کے بھرے مجمع میں اللہ اللہ کر کے اپنے محبوب کی یادوں میں مشغول ہوں تو کہیں دل ہی دل میں چپکے چپکے رو رو کر اپنے اللہ سے فریاد کر رہا ہوں۔

غرض یہ کہ محبت کی ہزاروں شاخوں میں تقسیم ہونے کہ باوجود مجھے اپنے دل میں حاصل دریائے محبت خداوندی کی طغیانی میں کوئی کمی نظر نہیں آتی بلکہ دن بدن اور ترقی ہی محسوس ہو رہی ہے اور یہی اس محبت کا خاصہ ہے کہ جتنا محبوب پر ادائے محبت دکھائی جائے اتنی ہی وہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اللہ کی طرف سے محبت کے نئے رنگ عطا ہوتے رہتے ہیں اس لیے جتنے حضرت والا کے مواعظ درد محبت ہیں یہ سب درحقیقت اسی محبت خداوندی کے مختلف الوان ہیں۔

فتنۂ دلکش میں بھی شانِ ربانی کا باقی رہنا

ہزاروں فتنہ دلکش میں ہوتے ہیں گھرے لیکن
جو ربانی ہیں ان کی شان ربانی نہیں جاتی

بشر بہ حیثیت بشر ہونے کے بشری تقاضوں سے خالی نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ ولایت کے کسی بھی مقام پر پہنچ جائے اس لیے جس طرح فتنوں کا سامنا دوسرے عام مومنوں کو ہوتا ہے اسی طرح جو اللہ کے خاص بندے علمائے ربانیین ہیں وہ بھی اس سے گزرتے ہیں اور کیسے ہی مجاہدات ہوں ان کے ذریعے سے تقاضوں کو معدوم کر دینا مقصود ہی نہیں ہوتا اس لیے جس نوع کے بھی فتنے سامنے آئیں وہ ہر آدمی کے لیے چیلنج ہوتے ہیں اور اس کو اپنی

طرف کھینچنے اور دعوت دینے والے ہوتے ہیں بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ جو ربانی ہیں وہ اپنے رب کی توفیق سے ایسے موقع پر اپنی شان ربانی کی بدولت عافیت اور حفاظت کے ساتھ ان فتنوں کی زد میں آنے سے اپنے کو بچا لیتے ہیں اور یہی اصل تقویٰ ہے اور یہی مقصود خداوندی ہے خواجہ صاحب نے اسی کو فرمایا ہے ؎

بہت گو ولولے دل کے ہمیں مجبور کرتے ہیں
تری خاطر گلے کا گھونٹنا منظور کرتے ہیں

اسی بات کو حضرت والا نے بڑے خوب انداز سے اپنے ایک وعظ میں اس طرح تعبیر فرمایا کہ انسان میں خواہشات تو برقرار رہیں گی خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی بن جائے کیونکہ اگر خواہشات نہ رہیں تو پھر تقویٰ کی بریانی نہیں پک سکتی، تقویٰ کی بریانی اسی طرح بنتی ہے کہ خواہشات کی لکڑیوں کو گرما کر پھر ان میں اللہ کی محبت کی آگ لگائی جاتی ہے اس آگ کے اوپر تقویٰ کی بریانی تیار ہو کر بڑی پر لطف اور باذائقہ بن جاتی ہے اور اگر خواہش ہی نہ ہو فرض کیجئے کہ ایک شخص نابینا ہے اب وہ کسی نامحرم کو دیکھ ہی نہیں سکتا اور اس سے یوں کہا جائے کہ خبردار کسی حسین کی طرف نظر نہ ڈالنا تو یہ بات اس کے حق میں فضول ہوگی اس لیے خواہشات بھی ہوں اور چاروں طرف سے فتنے بھی گھیرے ہوں اور پھر اللہ کے خوف سے اپنے کو ان فتنوں اور خدا کی نافرمانیوں میں مبتلاء نہ کرے اور جو بھی طبیعت پر غم ہو اسے اٹھالے۔

اسی لیے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں غصہ پینے والوں کی تعریف فرمائی ہے تو اس مقام پر (والکاظمین الغیظ) فرمایا ہے" العادمین الغیظ "نہیں فرمایا جس کا مطلب یہ ہے: "کظم فم القربۃ" یعنی مشک کے منہ کو بند کرنا تو انسان کے اندر غصہ تو بھرا ہوا ہو اور جذبات غیظ وغضب تو موجود ہوں لیکن ان کو اوپر سے دبا دے اور ان پر قابو پائے اور کنٹرول کرے یہ صفت قابل تعریف ہے غصے کو ختم کرنا نہ مقصود ہے اور نہ ممدوح ورنہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تعریف کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرماتے کہ جو لوگ غصے کو ختم کر چکے ہیں اور مادہ غیظ و غضب کو اپنے اندر سے نکال چکے ہیں وہ میرے متقی بندے ہیں اگر کوئی شخص اس کوشش میں لگا رہے کہ میں اپنے اندر سے غیظ وغضب کو بالکل ختم اور فنا کر دوں تو یہ بشری فطرت سے ٹکراؤ ہے اور انسانی بشری امور واوصاف میں سے ایک وصف کا فقدان ہے جس کی وجہ سے مجاہدہ متحقق نہیں ہوتا جس پر قرآن وحدیث میں بہت سے وعدے کئے گئے ہیں کہ جس مجاہدے پر بندے کو مشاہدہ حق عطا کیا جاتا ہے۔

اور یہ مجاہدہ کرتے کرتے دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں جسے بصیرت اور نسبت کہتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں اسی کو تاج ولایت کہتے ہیں جو ایک بار پہنائے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر واپس نہیں لیا جاتا۔

﴿عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ...... وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ عَنْ دِيْنِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ يَعْنِيْ فِيْهِ سَخْطَةً لَهُ فَزَعَمْتَ أَنْ لَا وَكَذٰلِكَ الْإِيْمَانُ إِذَا خَالَطَ بَشَاشَةُ الْقُلُوْبِ﴾

(بخاری و مسلم و التکشف، ص: ۳۹۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اُس حدیث کے ضمن میں جس میں ہرقل شاہ روم کی گفتگو ابوسفیان کے ساتھ منقول ہے (اور صحابہ کی جانب سے ہرقل کے ان اقوال پر انکار نہیں کیا گیا جن سے ان اقوال کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے) یہ مضمون بھی مروی ہے۔ ہرقل ابوسفیان سے کہتا ہے کہ میں نے تم سے یہ سوال کیا کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے بعد اُس کے قبول کرنے کے کوئی مسلمان اُن کے دین سے ناخوش ہوکر مرتد ہوتا ہے، تم نے جواب دیا کہ نہیں اور ایمان کی یہی کیفیت ہوتی ہے جب اُس کی تازگی قلوب میں رچ جاتی ہے۔

اور یہی مضمون دوسرے عنوان سے مشہور ہے کہ **الواصل لایرجع** یعنی بعد وصول وفنا کے پھر راجع اور مردود نہیں ہوتا۔ اس حدیث سے اس کی صاف تائید ہوتی ہے اور گو یہ ہرقل کا قول ہے مگر جب سلف نے اس پر انکار نہیں کیا تو اس قول کی صحت سلف کے تسلیم سے ثابت ہوئی اور جو سالکین بگڑ گئے ہیں وہ واقع میں مقصود تک پہنچے ہی نہ تھے۔ گو ظاہر نظر میں وہ واصل سمجھے جائیں۔

یہ حق تعالیٰ کا ایسا عطیہ اور تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جانے کے بعد عموماً سنت اللہ یہی ہے کہ واپس نہیں لیا جاتا اس لیے آپ نے نہیں سنا ہوگا کہ فلاں بزرگ بزرگ تھے اب نہیں رہے، یا فلاں شخص اللہ والے تھے اب اللہ والے نہیں رہے مگر اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جو کہ واقعی اولیاء اللہ بن جاتے ہیں اور جنہیں حق تعالیٰ کا خصوصی قرب مل جاتا ہے جن کے لیے حدیث پاک میں حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو ایسے ہی کچھ اصول دنیا میں بھی کارفرما نظر آتے ہیں کہ جب کسی کا نام ایک مرتبہ (کسی بھی ''والا'' کے ذریعے پڑ جاتا ہے تو پھر تمام لوگوں کے درمیان اس کا پورا خاندان اسی نام کے ساتھ جانا پہچانا جاتا ہے۔ جیسے سبزی والا، عطروالا، کپڑے والا، سونے والا، بس بالکل ٹھیک اسی طرح جو شخص ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی زبان پر ''اللہ والا'' کہلوادیا جاتا ہے تو پھر سنت اللہ یہی رہی ہے کہ وہ مرتے دم تک اللہ والا ہی رہتا ہے الّا ماشاء اللہ بہت ہی کم اس کے خلاف کوئی واقعہ سنا جاتا ہے۔

اہل اللہ پیری میں بھی رشکِ جوانی ہوا کرتے ہیں

عناصر مضمحل پیری سے اہل اللہ کے بھی ہیں
مگر چہرے سے ان کے پھر بھی تابانی نہیں جاتی

اسی بات کو حضرت مولانا رومی نے بڑے پیارے انداز سے ذکر کیا ہے کہ جس طرح شراب کا نشہ اس کے پرانا ہونے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح اللہ والوں کی شرابِ محبت کا نشہ بھی ان کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے اور دن بہ دن عبادات میں ترقی اور اضافہ ہونے کی بدولت ان کے چہروں پر خاص نور اور تابانی نظر آتی ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اس طرح سے آیتِ شریفہ میں آیا ہے

کہ سِیۡمَا هُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ، یعنی نماز اُن کا ایسا وظیفۂ زندگی بن گیا ہے کہ نماز اور سجدہ کے مخصوص آثار اُن کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ مراد ان آثار سے وہ انوار ہیں جو عبدیت اور خشوع وخضوع سے ہر متقی عبادت گزار کے چہرہ پر مشاہدہ کیے جاتے ہیں۔ پیشانی میں جو نشان سجدہ کا پڑ جاتا ہے وہ مراد نہیں۔ خصوصاً نمازِ تہجد کا یہ اثر بہت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابن ماجہ میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿مَنۡ كَثُرَتۡ صَلٰوتُهٗ بِاللَّيۡلِ حَسُنَ وَجۡهُهٗ بِالنَّهَارِ﴾

(سنن ابن ماجة، كتاب اقامة الصلوة والسنة فيها، باب ماجاء في قيام الليل)

یعنی جو شخص رات میں نماز کی کثرت کرتا ہے دن میں اس کا چہرہ حسین پُر نور نظر آتا ہے اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد نمازیوں کے چہروں کا وہ نور ہے جو قیامت میں نمایاں ہوگا۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۹۳)

اسی لیے دنیادار لوگوں کی عمریں بڑھ جانے کے بعد ان کے چہروں پر بڑھاپے میں جوانی کا رنگ وروغن جا چکا ہوتا ہے اور جاذبیت وکشش ماند پڑ جاتی ہے جب کہ اہل اللہ کے پُر نور چہرے مزید سے مزید چمکتے اور دمکتے رہتے ہیں اگرچہ ان کے بدن کے ظاہری اعضاء بھی پیری اور بڑھاپے میں جسمانی ضعف کا شکار ہو جاتے ہیں اور تجربہ یہی ہے کہ اس میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے جیسا کہ اپنے بزرگوں کے بعض واقعات احقر نے اسی کتاب عرفانِ محبت کے دوسرے مقام پر ذکر کئے ہیں کہ انگریز اور بہت سے غیر مسلم ان کے چہروں کو دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ یہ تو حضرت عیسیٰ کی طرح معلوم ہو رہے ہیں اور یہ کوئی عام انسان نہیں ہے۔

قلوبِ اولیاء میں مستی وجولانی کا عالم

اٹھا جاتا نہیں ہے بے سہارے پھر بھی یہ کیا ہے
کہ ان کے قلب سے مستی و جولانی نہیں جاتی

یعنی اہل اللہ جسمانی ضعف کا شکار ہو جانے کے باوجود اپنی باطنی بصیرت اور قوت اور دریائے محبت خداوندی میں مستی وجولانی کے لحاظ سے ضعیف اور کمزور نہیں ہوتے جس کو احقر یہ عرض کرسکتا ہے کہ یہ اللہ والوں کی ایک کرامت ہے اور ان کے سچا اور برحق ہونے کی ایک نشانی اور دلیل ہے کہ ایسے بندگانِ خدا انتہائی ضعیفی اور پیری کے عالم میں بھی عقل ودماغ کی سلامتی اور سوچ وفکر کی درستگی ان کے حافظہ کے بقا کے ساتھ موجود رہتی ہے کہ بڑے بڑے جوانوں کو اپنے نازک سے نازک مسائل اور پیچیدہ اور الجھے ہوئے حالات میں انہیں سے مشورے لینے پڑتے ہیں اور ان کی اتباع کرنے میں ہی ان کو کامیابی نظر آتی ہے اس لیے ہوش وحواس اور عقل وذہن کا محفوظ رہنا اسے اللہ والوں کی ایک کرامت کہا جاسکتا ہے اسی کا اثر ہے کے ہر اگلے دن میں ان کی عبادات میں اضافہ اور

طاعات کی کثرت دیکھنے میں آتی ہے جو اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ان کے قلب میں مستی و جولانی میں کمی کے بجائے اضافہ ہی اضافہ ہے۔ چنانچہ ہم نے یہی حالات ان بعض بزرگوں کے یہاں دیکھے جن کے ساتھ میں رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا جیسے حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ، حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب اور دیگر حضرات اکابر سب ہی اس وصف میں برابر تھے۔

لباسِ فقر میں شانِ سلطانی

بظاہر فقر ہے دامن میں لیکن کیا ہے باطن میں
کہ جس سے پھر بھی ان کی شان سلطانی نہیں جاتی
کہوں میں کس طرح سے شان ان اللہ والوں کی
لباس فقر میں بھی شان سلطانی نہیں جاتی

گوکہ ظاہر میں اہل اللہ فقیر بھی ہوں مگر وہ اپنے باطن میں بادشاہ ہوتے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلب میں اللہ لے لیا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے غناء اور بے نیازی ایک صفت ہے تو وہ لوگ ساری مخلوق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں حکومت و بادشاہت ان کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ جب احکم الحاکمین اور سارے بادشاہوں کا بادشاہ ان کے دلوں میں موجود ہو تو پھر اہل دنیا خود ان کے غلام اور خادم بن جاتے ہیں اور دل سے وہ توقیر و تعظیم کرتے ہیں اور ایسا جان و مال فدا کرنے کو تیار رہتے ہیں کہ جو بادشاہوں کے لیے بھی رعایا کے دلوں میں بات نہیں ہوتی اس لیے وہ فقیر ہو کر شان سلطانی سے زندگی گزارتے ہیں، کیونکہ ان کو اللہ کی طرف سے مخلوق کے دلوں پر حکومت حاصل ہوتی ہے۔

مشاہدۂ حق میں استغراقی کیفیت اور اس کا حدیث سے ثبوت

گئے تھے بھول مرشد پھول پوری نام بھی اپنا
حضور حق میں اپنی ذات پہچانی نہیں جاتی

دراصل اس میں ایک قصے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت عارف باللہ شاہ عبد الغنی رحمہ اللہ کے یہاں دفتر کا کام کاج دیکھنے کے لیے ایک شخص مقرر تھا جسے ہم منشی کہتے ہیں اس کو ایک بار کچھ کاغذات پر دستخط کرانے کی ضرورت پیش آئی تو وہ کاغذات حضرت کے پاس لے کر حاضر ہوا اور درخواست کی کہ حضرت اس پر دستخط فرمادیں حضرت سوچتے ہی رہے اور اپنا نام یاد نہ آیا پھر کچھ دیر کے بعد اسی سے پوچھا کہ میرا نام کیا ہے؟ پھر اس نے نام بتایا تو حضرت کو اپنا نام یاد آیا اور دستخط فرمائے۔

یہ بات اللہ والوں کو غایت استغراق کی حالت میں پیش آتی ہے جو ایک ایسی کیفیت ہے جس میں بندہ اللہ

تعالیٰ سے اتنا قریب ہوتا ہے اور مشاہدہ حق میں ایسا مستغرق ہوتا ہے کہ اسے اپنے ماورا کسی بھی شے کی کوئی خبر نہیں رہتی اپنے اردگرد سے بالکل غافل ہوجاتا ہے اور اس کا مأخذ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قصہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ پوچھا: من انتِ؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: انا عائشة۔ پھر ارشاد فرمایا: ''من عائشة ؟ تو حضرت عائشہ نے جواب دیا: بنت ابی بکر۔ پھر ارشاد فرمایا: من ابو بکر؟ تو جواب دیا کہ ابن ابی قحافة۔ الغرض ان سب سوالات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انتہائی درجے حیرت میں تھی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! میں بعض خاص اوقات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی قرب کے مقام مشاہدۂ ذاتِ باری تعالیٰ میں مستغرق ہوا کرتا ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جو اپنے اپنے درجاتِ قرب کے اعتبار سے اولیاء اللہ کو استغراقی کیفیت کی صورت میں پیش آتی رہتی ہے کہ اس درجہ حضورِ ذاتِ حق ہوتا ہے کہ اس میں اپنی ذات بھی نہیں پہچانی جاتی ہے۔

لباسِ عقل میں بھی چاک دامانی کا راز

محبت کی کرامت میں نے اختر یہ بھی دیکھی ہے
لباسِ عقل میں بھی چاک دامانی نہیں جاتی

جب تک آدمی کو اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں ہوتی تو وہ یا تو اپنی طبیعت کے تقاضوں پر چلتا ہے یا عقلی دلائل سے رہنمائی کہنا چاہتا ہے اور ایمانی تقاضے مغلوب رہتے ہیں لیکن جب دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہوجاتا ہے تو پھر اس کی ہر سوچ و فکر اسی کے تابع ہوجاتی ہے اور یہی انسان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ جس کو حضرت تھانوی نے مختصر اور جامع الفاظ میں یوں تعبیر فرمایا کہ بحمد اللہ میں نے اپنی طبیعت کو عقل کے، اور اپنی عقل کو شریعت کے تابع کر دیا ہے۔ اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ ایک بیمار آدمی ہے اور اس کے سامنے بڑا قیمتی اور لذیذ کھانا رکھا ہے جس کھانے سے اس کے ڈاکٹر نے اسے منع کیا ہے اب طبیعت کہتی ہے کہ اس کو کھاؤ مگر عقل کہتی ہے کہ اس کو نہ کھاؤ تو بعض لوگ طبیعت کے تقاضے پر عمل کر کے نقصان اٹھاتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ عقل کے تقاضے کے مطابق عمل کر کے مضرت اور نقصان سے بچ جاتے ہیں لیکن کہیں کسی مقام پر شریعت کے حکم کے سامنے مومن بندے کو عقل مغلوب کر کے اس کا تقاضہ چھوڑنا پڑتا ہے جیسا مثلاً بینک میں ایک لاکھ جمع کرنے سے بطور سود کے دوگنا یعنی دو لاکھ ملیں گے، دھوکا دے کر سامان فروخت کر دینے میں میرے بے کار سامان کے اچھے پیسے مل جائیں گے تو عقل ہوشیاری کا سبق پڑھا رہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور ایمان کا رشتہ ہمیں منع کر رہا ہے۔

بس یہی وہ مقام ہے کہ جہاں آ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ کون اللہ کا بندہ ہے اور اس کے کہنے پر چلتا ہے اور کون اپنی عقل کو سب کچھ سمجھ کر اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھالتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو حضرت تھانوی نے فرمایا کہ

طبیعت کو عقل کے اور عقل کو شریعت کے تابع کر دینا چاہئے جو لوگ بہت بڑے عقل مند بنتے ہیں اور اپنی عقل کے سامنے شریعت کے حکم کو پیچھے ڈال دیتے ہیں ان کو مستقبل میں حسرت و افسوس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ دین کے کسی بھی حکم کو جب تک عقل کے ذریعے نہ سمجھ لیں تو اُس پر نہ یقین کرنے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ عمل کی طرف مائل ہوتے ہیں جبکہ یہ اس قدر باطل اور غلط نظریہ ہے کہ جس کا باطل ہونا بالکل بدیہی ہے کیونکہ دین کی باتوں کا تو کیا کہنا آج ہمیں دنیا ہی کی خود کتنی باتیں عقل سے سمجھ میں نہیں آتیں۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بڑے مدلل اور عمدہ انداز سے اپنے ایک وعظ میں اس طرح ارشاد فرمایا کہ اگر ہر چیز عقل سے سمجھ میں آ جاتی تو میں ایسے عقل کے ماننے والوں کو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ان دو باتوں میں فرق کر کے عقل کے طور پر مجھے سمجھائیں کہ آخر اپنے گھر کا ایک جوان بیٹا نکاح کر کے کسی باہر کی جوان لڑکی کو گھر کے مال و دولت اور خزانوں میں شریک کر لیتا ہے جبکہ خود اُس کے گھر میں اُس کی بہن انہی تمام بدنی اعضاء کے ساتھ موجود ہے جن کو لے کر آنے والی باہر کی لڑکی ہے۔ کیا عقل کے ذریعے سے کبھی ان دونوں باتوں میں فرق سمجھا جا سکتا ہے؟ کہ ایک طرف طبیعت کا بالکل میلان نہیں ہوتا اور دوسری کے ساتھ خلوت تک کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور ہمارے روزمرہ کے مشاہدہ میں یہ بات آتی ہے کہ وضو ٹوٹنے کی جگہیں اور ہیں اور جن اعضاء کو دھویا جاتا ہے وہ الگ ہیں تو کیا وجہ ہے کہ نقضِ طہارت کی تلافی کی صورت انہی جگہوں کو دھلنے کے ساتھ نہیں رکھی گئی جو بظاہر عقل سے سمجھ میں آنے والا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن کیا کوئی دنیا کا ایمان رکھنے والا انسان اس کے عقلی طور پر سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے وضو میں دھوئے جانے والے اعضاء کو چھوڑ کر طہارت حاصل کرنے کے لیے اپنی شرمگاہ کو دھلنا ضروری سمجھ کر طہارت حاصل کرتا ہے یا کیا اس طرح سے طہارت حاصل ہو سکتی ہے؟ کبھی بھی نہیں۔ تو پھر ہر چیز کو عقل سے سمجھ کر آگے قدم بڑھانا یہ انتہائی غیر دانشمندانہ طریقہ ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ عقل کہتی ہے کہ دنیاداری اور ظاہری حالت کو بناؤ اور ترقی دو اور محبت کہتی ہے کہ اپنے اللہ پر دیوانہ وار مرمٹو، صبح وشام اسی کے گیت گاؤ اسی کی پاکی اور بڑائی بیان کرو اور اسی کا نام لے کر اپنے قلب وجگر کو ٹھنڈک اور تازگی بخشو۔ اس لیے اللہ والوں سے عقلمندی میں بھی محبت کے تقاضے نہیں چھوٹتے یہی مطلب ہے کہ لباس عقل میں بھی میری چاک دامانی نہیں جاتی کیونکہ محبت محبوب پر فدا ہونے کی طرف بلاتی ہے اور عقل اپنے بنانے سنوارنے کی فکر میں لگائے رکھتی ہے۔

مجاز......ایک سراب

آہ میرے شباب کا عالم اور دل کے کباب کا عالم
تھا مگر سب سراب کا عالم لبِ دریا حباب کا عالم

مشکل الفاظ کے معانی:۔ شباب: جوانی۔ سراب: دھوپ کے وقت میں دور فاصلے پر پانی ہونے کا شبہ ہونا، مراد دھوکہ۔ **لبِ دریا:** دریا کے کنارے۔ **حباب:** بلبلہ۔

کسی کے در پے تو یارب یہ پیشانی نہیں جاتی

کبھی حسرت کے سر سے اس کی حرمانی نہیں جاتی
کوئی سمجھائے پھر بھی دل کی حیرانی نہیں جاتی

مگر دل کے تقاضوں سے جو توبہ کی کسی دل نے
تو دل سے قرب ربانی کی تابانی نہیں جاتی

خدا کے فضل کا سایہ جنہیں حاصل نہیں ہوتا
یہ دیکھا ہے کہ ان کی خوئے شیطانی نہیں جاتی

بہ فیض مرشد کامل ملا جو فضل رحمانی
تو پھر اس نفس امارہ کی کچھ مانی نہیں جاتی

بتوں کی بے وفائی کا ہوا ہے تجربہ تجھ کو
مگر اس تجربے سے تیری نادانی نہیں جاتی

حسینوں کی نگاہوں میں کسی کی پارسائی سے
بہ جرم عشق نفسانی پشیمانی نہیں جاتی

خرد نے گو کیا ہے میرے دامن کو رفو ہر دم
مگر کیوں عشق کی یہ چاک دامانی نہیں جاتی

گناہوں پر ندامت سے یہ توبہ کی کرامت ہے
کہ تائب سے کبھی ان کی مہربانی نہیں جاتی

ہمارا مرکز امید رحمت آپ کا در ہے
کسی کے در پہ تو یا رب یہ پیشانی نہیں جاتی

مرے دل کو جو بخشی تو نے آہوں کی فراوانی
مگر حاسد سے میری آہ پہچانی نہیں جاتی

مرے مالک کرم سے آپ نے جس پر نگاہ ڈالی
پھر اس کی بندگی سے شان ربانی نہیں جاتی

کبھی مشکل میں بھی پڑتا ہے اختر تو بحمداللہ
خدا کے فضل سے امید پنہانی نہیں جاتی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **حسرت**: خواہش پوری نہ ہونے پر غم ہونا۔ **حرمانی**: محرومی۔ **قربِ ربّانی**: اللہ تعالیٰ کی نزدیکی۔ **تابانی**: چمک۔ **خوئے شیطانی**: شیطانی عادت۔ **فضلِ رحمانی**: اللہ تعالیٰ کا فضل۔ **نفسِ امّارہ**: گناہوں کا بہت زیادہ تقاضہ کرنے والا نفس۔ **بتوں**: نامحرم عورتیں اور حسین لڑکے۔ **عشقِ نفسانی**: نفسانی عشق۔ **پشیمانی**: ندامت۔ **خرد**: عقل۔ **رفو**: پھٹے ہوئے کپڑے کو جوڑنا۔ **دامانی**: دامن پھٹا ہوا ہونا۔ **تائب**: توبہ کرنے والا۔ **فراوانی**: کثرت۔ **شانِ ربّانی**: اللہ والوں والی شان۔ **اُمیدِ پنہانی**: دل پر امید ہونا۔

حسرتوں کی پامالی پر قربِ ربانی کی تابانی

کبھی حسرت کے سر سے اس کی حرمانی نہیں جاتی
کوئی سمجھائے پھر بھی دل کی حیرانی نہیں جاتی
مگر دل کے تقاضوں سے جو توبہ کی کسی دل نے
تو دل سے قربِ ربانی کی تابانی نہیں جاتی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے اندر ایک دل رکھا ہے اور اس ایک دل کو اپنی ایک اکیلی ذات کے لیے بنایا ہے۔ میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ''ایک زبان اور ایک دل ایک اللہ کے لیے ہے'' سو جو شخص اس دل کے اندر اللہ کے غیر کو بسائے گا اور فانی حرام لذتوں کو دل میں جگہ دے گا تو یہ دل پھر ہمیشہ حیران و پریشان رہے گا حسرت وافسوس اور بے چینی و پریشانی دل کو ہر سمت سے گھیرے رہے گی، لیکن جب بندہ اپنے دل کو اللہ کے لیے خالی کرے گا اور اس میں آنے والے ایسے تقاضے اور خواہشات جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو پوری ہمت اور قوت کے ساتھ جان کی بازی لگا کر ان پر عمل نہیں کرے گا اور جو کچھ تھوڑا بہت ان تقاضوں پر عمل ہو گیا ہو اس سے پکی اور سچی توبہ کر لے گا تو ایسے دل کو اللہ تعالیٰ اپنا قرب نصیب فرما دینگے چنانچہ پھر وہ قربِ ربانی کی تابانی اور اس کے جلووں کا مشاہدہ کرے گا۔

مگر اس کلام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دل کے تقاضوں کو ختم کرنے کی فکر میں لگ جائے اس لیے کہ ایسا کبھی بھی ممکن نہیں ہے، قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾

(سورۃ الشمس، آیۃ ۸)

ترجمہ: پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القاء کیا (یہ اسناد باعتبار تخلیق کے ہے یعنی قلب میں جو نیکی کا رجحان ہوتا ہے یا جو بدی کی طرف میلان ہوتا ہے دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ گو القاء اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے اور ثانی میں شیطان پھر وہ رجحان و میلان کبھی مرتبۂ عزم تک پہنچ جاتا ہے جو کہ انسان کے قصد واختیار

سے صادر ہوتا ہے۔ اسی قصد و اختیار پر عذاب و ثواب مرتب ہوتا ہے جس کے بعد صدورِ فعل بہ تخلیقِ حق ہوتا ہے اور کبھی عزم تک نہیں پہنچتا وہ معاف ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۷۵۴)

اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىo فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىo﴾

(سورة النازعات، آیات: ۴۰، ۴۱)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خوش کرنے سے سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانہ۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۶۶۱)

یعنی اپنے نفس پر کنٹرول کیا اور اس کو حکم خدا کا تابع بنا دیا تو پھر جنت اس کا ٹھکانا ہے اس لیے اس کلام کا منشاء دل کے تقاضوں کو ختم کر دینا نہیں ہے بلکہ کتنی ہی شد و مد سے گناہوں کا تقاضا ہونے کے باوجود اس کے اوپر عمل نہ کرنا ہے اور یہی بارگاہ خداوندی میں مطلوب ہے اور اسی کے اوپر بندے کے لیے سب وعدے ہیں۔

یہی تو وجہ ہے کہ اس دنیا کو متاع الغرور کہا گیا ہے یعنی یہ دھوکے کا سامان اور فریب کا گھر ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کا ظاہر جو نظر آ رہا ہے اس کا باطن ویسا نہیں ہے۔ چنانچہ ظاہر کے اعتبار سے یہ بہت اچھی اور خوشنما معلوم ہوتی ہے بڑی وفادار اور پایدار دکھائی دیتی ہے کام آنے والی اور ضرورتیں پوری کرنے والی دکھائی دیتی ہے دل کے سکون اور چین کا سامان معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں اندر سے ایسی نہیں ہے اسی لیے جب انسان کا نفس اس کی طرف چلتا اور بڑھتا ہے تو ہمارا مہربان اللہ ہمیں حکم دیتا ہے:

﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾

(سورة فاطر، آیة: ۵)

ترجمہ: اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے سو نہ بہکائے تم کو دنیا کی زندگانی اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکے باز شیطان اللہ سے دھوکے میں ڈال دے۔

یہ دنیا کی زندگی تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے اور کہیں شیطان تمہیں اس دنیا کے جالوں میں نہ پھنسا دے اور نفس کی خواہشات اور تقاضوں میں پڑ کر تم دھوکے کا شکار نہ ہو جاؤ بلکہ جب اللہ کے حکم کے خلاف کسی بھی دنیوی چیز کی جانب طبیعت کا رجحان اور میلان ہو اور وہ کتنی ہی خوب سے خوب تر نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں ہمارا دین و دنیا کا نقصان چھپا ہوا ہے گو کہ ظاہر میں بہت خوب معلوم ہو رہی ہے اسی لیے تو دنیا کو "حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ" فرمایا گیا۔

﴿عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَاِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِي النِّسَآءِ وَفِيْ حَدِيْثِ ابْنِ بَشَّارٍ لِيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب اکثر اہل الجنة الفقراء)

بے شک دنیا بڑی میٹھی اور سرسبز و شاداب اور اللہ تعالیٰ تم کو اس میں اپنا نائب بنانے والا ہے، پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح سے عمل کرتے ہو، لہٰذا دنیا سے بچ کر رہنا اور خاص طور پر عورتوں سے بچنا کیونکہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں کے ہی اندر سے واقع ہوا جس کی تفصیل شراحِ حدیث نے اس طرح لکھی ہے اور ہمارے حضرت والا نے اُسے اپنی کتاب ''روح کی بیماریاں اور اس کا علاج'' میں نقل فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

بلعم بن باعورا کی عبرتناک حکایت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے کہ ایک علام مقتدا جس کا نام ''بلعم بن باعورا'' ملک شام بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا۔ بعض روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ جب غرق فرعون اور فتح مصر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قوم جبارین سے جہاد کا حکم ملا تو جبارین خائف ہوئے اور جمع ہو کر بلعم بن باعورا کے پاس آئے اور دعا کی درخواست کی کہ ہمارے مقابلہ سے حق تعالیٰ ان کو واپس فرما دیں۔

بلعم بن باعورا کو اسمِ اعظم معلوم تھا، اس کے ذریعہ جو دعا کرتا تھا، قبول ہوتی تھی۔ بلعم نے کہا: ''افسوس! وہ اللہ کے نبی ہیں، ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے ہیں، میں ان کے خلاف کیسے بددعا کرسکتا ہوں، اس سے تو میرا دین اور میری دنیا دونوں تباہ ہو جائیں گے۔''

ان لوگوں نے جب بے حد اصرار کیا تو بلعم نے کہا: ''اچھا! میں حق تعالیٰ سے اس نوع کی اجازت لیتا ہوں۔'' اس نے کوئی عمل یا استخارہ کیا، جواب میں اس کو بتلایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے۔ اس نے قوم کو بتلایا کہ مجھے بددعا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس وقت قوم جبارین نے بلعم کو بڑا ہدیہ پیش کیا جو درحقیقت رشوت تھی، اس نے ہدیہ قبول کرلیا۔ پھر اس قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے اور اس کی بیوی نے بھی مشورہ دیا کہ رشوت قبول کرلو، پس وہ بیوی اور مال کی محبت میں اندھا ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کرنے کے لیے اپنے گدھے پر سوار ہو کر حِستان پہاڑی کی طرف چلا جس کے قریب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لشکر مقیم تھا راستہ میں کئی مرتبہ گدھا گرا جسے وہ مار مار کر اٹھاتا رہا یہاں تک کہ جب یہ سلسلہ دراز ہوا اور بلعم بھی اپنے گدھے کو مار مار کر اٹھاتا ہوا پریشان ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے گدھے کو گویائی عطا کی چنانچہ گدھا بولا کہ ''نادان بلعم! تجھ پر افسوس ہے کیا تو یہ نہیں دیکھتا کہ تو کہاں جا رہا ہے تو مجھے آگے چلانے کی کوشش کر رہا ہے اور ملائکہ آگے آ کر مجھے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ بلعم نے جب چشم حیرت سے گدھے کو بولتے دیکھا تو بجائے اس کے کہ اس تنبیہ پر اپنے ارادے سے باز آتا گدھے کو وہیں چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھا اور بددعا کرنے لگا۔ اس وقت قدرتِ الٰہیہ کا عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ جو کچھ وہ کلمات بددعا نکالتا تھا وہ کلمات جبارین کے لیے نکلتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نکلتا ہی نہ تھا۔ پس قومِ جبارین کے لوگ گھبرا گئے اور چلّا اُٹھے کہ تو ہمارے خلاف بددعا کر رہا ہے۔

بلعم نے کہا: ''میں کیا کروں، میری زبان میرے اختیار سے باہر ہوگئی ہے۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر تباہی آئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کی کہ اس کی زبان لٹک کر سینے پر آ گئی۔ اسی عذاب کا قرآن حکیم میں ذکر ہے:

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾

(سورۃ الاعراف، پارہ: ۹، رکوع: ۲۲)

پس بلعم کا حال ایسا ہے جیسے کتا کہ اس پر بوجھ لادو تو ہانپنے لگے اور اگر چھوڑ دو تو بھی ہانپے۔ پھر بلعم نے کہا: ''اے میری قوم! اب تو میری دنیا اور آخرت تباہ ہوگئی، مگر ہم تمہیں ایک چال بتاتے ہیں جس کے ذریعہ تم موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر پر غالب آ سکتے ہو، وہ چال یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزیّن کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو، یہ لوگ مسافر ہیں، گھروں سے مدت کے نکلے ہوئے ہیں، اس تدبیر سے اگر یہ حرام کاری میں مبتلا ہو گئے تو ان پر قہر و عذاب نازل ہوگا اور پھر یہ قوم فاتح نہیں ہوسکتی۔'' بلعم کی یہ شیطانی چال ان کی سمجھ میں آ گئی اور اس تدبیر سے بنی اسرائیل کا ایک شخص فتنہ میں مبتلا ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت روکا، مگر نہ مانا جس کے نتیجے میں بنی اسرائیل پر طاعون کا سخت عذاب آیا اور ستر ہزار بنی اسرائیل مر گئے۔ بعد ازاں جس شخص نے بُرا کام کیا تھا اس جوڑے کو قتل کر کے منظرِ عام پر ٹانگ دیا کہ سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور سب نے توبہ کی، اس وقت یہ عذاب رفع ہوا۔

بہر حال جس شخص کو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے قرب کا خزانہ مطلوب ہو اور اس دولت سے مالا مال ہونا چاہتا ہو تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ تمام خواہشات نفسانیہ اور دل کے گندے تقاضوں سے مکمل طور پر توبہ کر کے اللہ کے در کو مضبوطی سے پکڑ لے تو اسی وقت اس کو اپنے قلب میں ایک جلا اور روشنی محسوس ہوگی۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا واقعہ

احقر کو اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک اپنے زمانے کا بڑا ڈاکو جس کے نام سے لوگ ڈر جایا کرتے تھے ڈاکا ڈالنے کی نیت سے چلے جا رہے تھے اتنے میں کسی گھر سے ان کو قرآن کریم کی یہ آیت کانوں میں پڑ گئی:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾

(سورۃ الحدید، آیۃ: ۱۶)

ترجمہ: کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں ان کے دل اللہ کی یاد سے۔

تو ادھر سے وہ بولے ''حَانَ ذَالِکَ الْوَقْتُ یَا رَبِّیْ!'' اے میرے اللہ! وہ وقت آ پہنچا جب اللہ کے ذکر کے سامنے اہل ایمان کے دل کانپ جاتے ہیں سو انہوں نے اسی وقت توبہ کی اور یہ فیصلہ کیا کہ جہاں جہاں سے میں نے جن کے مالی حقوق لے رکھے ہیں ان سب کی واپسی کروں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو مقربین بارگاہ میں شمار کر لیا گیا اور آج تاریخ میں انہیں امت کے بڑے بڑے بزرگوں کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے جن کا نام

حضرت فضیل بن عیاض رحمہُ اللہ تعالیٰ ہے۔

حسن کا انتظام ہوتا ہے
عشق کا یونہی نام ہوتا ہے
کار فرما تو لطف ہے ان کا
ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے

اہل دنیا کے نزدیک اس طرح کے واقعات اتفاقی کہلاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ منجانب اللہ اپنے بندے کی رشد و ہدایت کے لیے ایک غیبی انتظام ہوتا ہے نہ وہ وہاں سے گزرتے، اور نہ آیت سنتے، اور نہ ہی ہدایت نصیب ہوتی مگر کیوں نہ ہوتی؟ اور کیوں ایسا سب کچھ نہ ہوتا؟ جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے حق میں یہی فیصلہ تھا اسی لیے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اکثر دعاؤں کے موقع پر اپنی ذات عالی کو رب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور نمازوں کے اندر بھی اللہ کی ربوبیت کا ذکر سب سے زیادہ آیا ہے۔ جس کا منشا و مقصد احقر کے ذہن نارسا میں یہی آتا ہے کہ بندے کو یہ بات اچھی طرح مستحضر ہو جائے کہ میں اس کے جسم و روح دونوں کا رب ہوں اس لیے اس کے جسم اور روح کو نقصان دہ چیزوں سے بچانا اور نفع بخش چیزوں کا عطا کرنا یہ میرا کام ہے تو جس کو دنیا میں جس بہانے سے بھی رزق و روزی مل رہی ہے اور اللہ کی معرفت و محبت نصیب ہو رہی ہے اسے اپنے مجاہدات یا اپنی عقلمندی اور ذہانت کی طرف منسوب نہ کرے بلکہ اپنے پالنے والے اللہ کی شان ربوبیت کا اثر سمجھے۔

سایۂ شیخ کامل بھی فضلِ الٰہی کا اثر ہے

خدا کے فضل کا سایہ جنہیں حاصل نہیں ہوتا
یہ دیکھا ہے کہ ان کی خوئے شیطانی نہیں جاتی
یہ فیض مرشد کامل ملا جو فضل رحمانی
تو پھر اس نفس امارہ کی کچھ مانی نہیں جاتی

یہ مضمون حضرت والا نے کئی مقام پر ذکر فرمایا ہے جس کا خلاصہ نہایت اعتدال پر مبنی دین کا صحیح مزاج پیش کرنا ہے کہ اصل اصلاح قلب اور تزکیہ نفس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوتا ہے، لیکن اللہ کی سنت اس طرح جاری ہے کہ کچھ رجال اللہ دنیا میں ہوتے ہیں جن کی صحبت میں حق تعالیٰ یہ تاثیر رکھ دیتے ہیں کہ انسان بڑی تیزی کے ساتھ نفس امارہ کی غلامی سے نجات پا جاتا ہے اور اس کی خوئے شیطانی اس سے چھوٹتی نظر آتی ہے اس لیے ہر شخص اپنے اصلاح و تزکیہ کی اصل نسبت تو اللہ تعالیٰ کے فضل ہی کی طرف کرے لیکن سبب کے درجے میں صحبت شیخ کی جانب کرنا بھی عین شکر نعمت ہے جو کہ مرضی خداوندی کے مطابق ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَازَكٰى مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ﴾
(سورة النور، اية: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کر کے) پاک صاف نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک وصاف کر دیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۶، ص:۳۶۹)

اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾
(سورة ال عمران، اية: ۱۶۴)

ترجمہ: اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہی میں کا پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہے ان کو یعنی شرک وغیرہ سے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات۔

اول آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا بیان فرمایا ہے اور دوسری آیت میں اپنی سنت کا بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا چاہیں اپنی قدرت سے تزکیہ فرما دیں مگر سنت اللہ یہی ہے کہ کچھ رجال اللہ کے ذریعے تزکیہ کرایا جاتا ہے اس مضمون کی بہت تفصیل حضرت مفتی شفیع صاحب نے معارف القرآن (۱) میں اس آیت کے ضمن میں ذکر فرمائی ہے۔

سنت اللہ اور قدرت اللہ کا فرق تخلیق کی چار قسموں کی روشنی میں

اس مقام پر بعض لوگوں کو اس طرح شبہ ہوتا ہے کہ کیوں صاحب اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس پر پوری قدرت ہے کہ وہ بغیر کسی شیخ ومرشد کے ہماری اصلاح وتزکیہ فرما دے لہٰذا ہمیں پیری مریدی کے چکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں اور بیعت واصلاح کے سلسلے میں داخل ہونے کی کوئی حاجت نہیں۔

تو ایسے حضرات کی خدمت میں احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف نظر رکھتے ہوئے تو دنیا کی ہر چیز ممکن ہے مگر ہم قدرت اللہ کو نہیں دیکھیں گے بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے سنت اللہ کی طرف دیکھنا لازم وضروری ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی قدرتِ تخلیق کی چار قسمیں ذکر فرمائی ہیں:

(۱)...... حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خالی مٹی سے بغیر کسی توالد وتناسل کے سلسلے کے پیدا فرمایا۔

﴿ان مثل عيسىٰ عند الله كمثل ادم خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون﴾

(۲)...... حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے بغیر عورت کے پیدا فرمایا۔

﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِىْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ﴾

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسیٰ بن مریم﴾

(۳)...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف اُن کی والدہ حضرت مریم سے بغیر والد کے پیدا فرمایا۔

﴿و خلق منھا زوجھا﴾

(٤)...... مرد و عورت کے آپس میں بطریق نکاح ایک دوسرے سے ملنے کے نتیجے میں اولاد کے وجود میں آنے کا سلسلہ قائم فرمایا گیا اور یہی قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت قرار دی۔

﴿وبث منھما رجالا کثیرا ونساء﴾

اوّل تینوں قسمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار ہے لیکن اگر کوئی شخص اس قدرت کو سامنے رکھتے ہوئے یوں دلیل پیش کرے کے میں شادی نہیں کروں گا اور مجھے اولاد کی ضرورت ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ مجھے بغیر شادی کے اولاد دے دیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی مذکورہ قدرت سے استدلال کرنے لگے اور ساری عمر اس کی انتظار میں گزر جائے اور تمام دنیا کے قطب وابدال اس کے لیے دعائیں بھی کرلیں اور وہ خود بھی تمام کوششیں اختیار کرے مگر اسے مرتے دم تک اولاد نصیب نہیں ہوسکتی اور اس کی اس بات کو بے عقلی اور گمراہی کہا جائے گا حالانکہ عقیدے کے لحاظ سے ہم سب یہ بات مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اولاد عطا کرنے کے لیے اپنی سنت اس کو قرار نہیں دیا ہے تو ہمارا اس پر نظر کر کے چلنا جائز نہیں۔

پس بالکل اسی طرح اصلاح وتزکیہ نفس کا معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ بغیر نبی کو بھیجے اور بغیر قرآن کے نازل کئے ہوئے خود ہی انسانوں کے دلوں میں ہدایت اتار دیتے اور انہیں مزکیٰ ومجلیٰ کر کے جنت میں داخل فرمادیتے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت یہ قرار دی کہ میں کتاب اللہ بھی نازل کروں گا اور اس کے ساتھ رجال اللہ کو بھی بھیجوں گا جن کے ذریعے امت کا تزکیہ ہوگا اور کتاب ان تک پہنچے گی لہٰذا اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص حقیقت میں اپنے تزکیہ نفس کا متمنی اور فکرمند ہو تو اسے اہل اللہ اور مشائخ کی صحبت ومعیت ضرور اختیار کرنی پڑے گی تبھی دین پر چلنا اور صحیح طور پر عمل کرنا اور مقبول بارگاہ خداوندی بننا آسان ہوگا۔

ملفوظ حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ ''دین سیکھنا اور پڑھنا''

حضرت شاہ ابرارالحق ہردوئی رحمہ اللہ اپنے خاص انداز میں کبھی یوں فرماتے تھے کہ ایک ہے دین کا پڑھنا اور دوسرے ہے دین کا سیکھنا صحیح دین دار بننے کے لیے اور اس پر عمل کرنے کے لیے محض اس کا پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ سیکھے ہوؤں سے اس کو سیکھنا پڑے گا اور پھر یہ بات ارشاد فرماتے تھے افسوس کہ آج امت ہر چیز کو پڑھنے کے بعد سیکھنے کے لیے تیار ہے اور کسی کو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ ڈاکٹری کی تعلیم کے بعد اس کی عملی پریکٹس

(Prectis) کے لیے مستقل سال دو سال لگائے جاتے ہیں اسی طرح گاڑی کی ڈرائیونگ (Driving) اور جہاز کے اڑانے کا معاملہ یہاں تک کہ سلائی اور بنائی جیسے چھوٹے معاملات میں بھی کسی استاذ کو مقرر کر کے سب کچھ سیکھا جاتا ہے اگرچہ پہلے کتابوں اور رسالوں میں یہ سب چیزیں پڑھ لی ہوں، اس میں کسی کو اشکال نہیں ہوتا۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ جب دین کے معاملے میں عالم دین ہو جانے کے بعد اس کو دین سیکھنے کی نصیحت کی جاتی ہے تو پھر یہ سارے اشکالات کھڑے ہو جاتے ہیں جو درحقیقت اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ نفس و شیطان ہمیں پورا دین دار مخلص ایمان والا اللہ کا ولی بننا دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے وہ اس راہ میں طرح طرح کے اعتراضات اور اشکالات دل میں ڈال دیتے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہی سب اشکالات دنیا کے دوسرے فنون کے معاملے میں پیدا نہیں ہوتے۔

جب کہ بدیہی اور واضح سی بات ہے کہ جو شخص کسی راستے پر چلا ہوا ہے اور اس راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہے تو اس کی معیت میں چلنے سے راستے کی تمام مشکلات آسانی میں بدل جائیں گی اور خطرات سے بآسانی حفاظت ہو جائے گی ورنہ نئے چلنے والے مسافر کو راستے کی پوری معلومات نہ ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح فہم اور سمجھ عطا فرمائے۔

بتوں کی بے وفائی مگر پھر بھی یہ نادانی کیسی؟

بتوں کی بے وفائی کا ہوا ہے تجربہ تجھ کو
مگر اس تجربے سے تیری نادانی نہیں جاتی
حسینوں کی نگاہوں میں کسی کی پارسائی سے
یہ جرم عشق نفسانی پشیمانی نہیں جاتی

حضرت والا اس شعر میں ان لوگوں کو تنبیہ فرما رہے ہیں کہ جو کسی لڑکے اور لڑکی کی ناجائز محبت میں پڑ کر اپنی جوانی اور زندگی کو ضائع کر دیتے ہیں جب کہ بکثرت ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ آج تم کسی کے عاشق اور کوئی تمہارا معشوق ابھی چند ہی دن کے بعد ایسا رخ بدلتا ہے کہ وہ تمہارا معشوق تمہیں چھوڑ کر کسی اور جانب عشق و محبت کے ہاتھ پھیلا دیتا ہے اور تم تکتے کے تکتے کھڑے رہ جاتے ہو۔ ایک دو واقعہ نہیں اس نوع کے بے شمار واقعات ہیں۔

اور جو عاشق و معشوق آپس میں یہ کہتے ہیں میری جان اور مال اور سب کچھ تجھ پر قربان اور میرے لیے سب کچھ تم ہو اور اس جیسے دوسرے بے شمار جملے اور باتیں آپس میں کرتے ہیں انہیں اس حقیقت سے واقف ہونا چاہیے کہ تمام انسانوں کے قلوب صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک لہ کے قبضے میں ہیں وہ جس طرح چاہتے ہیں دلوں کو پھیر دیتے ہیں اس لیے خود ہمارے اپنے دل اپنے قبضے میں نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ صبح ہو جائے تو شام کی خبر نہیں اور

شام ہوتو صبح کی خبر نہیں کہ اس دل میں کیا انقلاب برپا ہوا اور اس کا رخ کدھر پھر جائے تو بہت بڑی نادانی اور ناسمجھی کی بات ہے کہ انسان خدا سے غافل ہو کر ایسے جملے زبان سے نکالے اور انتہائی درجے ناعاقبت اندیشی ہے کہ اپنے خالق و مالک اللہ کے لیے ایسے جملے استعمال کرنے کے بجائے فانی مخلوق کی خاطر اس طرح کے جذبات پیش کرے جن کا انجام بالآخر فنا اور ختم ہو جانا اور مٹ کر خاک میں مل جانا ہے۔

اور اگر یہ بے وفائی کبھی اپنے اختیار سے بھی نہ ہو تب بھی حوادثات زمانہ کے پیش آجانے کے نتیجے میں اب تمہارا محبوب و معشوق ایسا ہو جاتا ہے کہ کل تک جان دے دینے کی بات کر دینے والا عاشق اب اسے ایک نظر دیکھ لینا بھی گوارا نہیں کرتا اور جب ان کے چہروں کی کشش اور جاذبیت ختم ہو جاتی ہے تو پھر عشق کا یہ سارا کھیل ماند پڑ جاتا ہے اور بے حیائی اور بدکاری میں گزری ہوئی زندگی اب ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر احقر عرض کرتا ہے کہ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مرتے دم تک ان کا عشق بھی صحیح سالم اور حسن بھی صحیح سالم رہا اور یہ عشق کی گاڑی برابر چلتی رہی لیکن اے ظالم! غیر اللہ کو دل دے کر تو نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ جب یہ مر کے دنیا سے چلا جائے گا یا تو اس سے پہلے دنیا سے روانہ ہوگا تو اس کے آگے بھی وفاداریوں کی گاڑی چل سکے گی؟ یا سب کچھ یہیں ختم ہے؟ جب کہ زندگی تو اصل آگے ہی کی زندگی ہے اور وہ طویل زندگی ہے اس لیے اصل اپنا عشق و محبت اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے ساتھ ہونا چاہیے جس کی وفا کا معاملہ ایسا ہے کہ دنیا اور برزخ اور قیامت تک ہر قدم اور ہر موڑ پر ہمارے کام آنے والا ہے حضرت والا بڑے درد بھرے انداز سے فرماتے ہیں کہ افسوس رات دن کے اس تجربے سے اور آنکھوں دیکھی صورت حال سے تمہاری ناعاقبت اندیشی اور نادانی اور ناسمجھی ختم نہیں ہو رہی ہے۔

نفسانی اور ربانی محبتوں کی بارہ (ایک درجن) نشانیاں

کبھی یہ نفسانی عشق ایسے رنگ و روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور ایسی شکلوں میں وجود میں آتا ہے کہ یہ عاشق اپنے ذہن میں یہ تصور کرتا رہتا ہے میری یہ محبت اللہ کے لیے ہے اور میرا یہ تعلق دین کی غرض سے ہے جب کہ حقیقت میں اندرونی طور پر اس میں نفسانیت شامل ہوتی ہے اسی لیے صحیح اللہ والا شیطان کے ایسے باریک حیلوں سے چونکنا اور ہوشیار رہتا ہے اور حق تعالیٰ اس کے قلب میں فوراً اس کا احساس ڈال دیتے ہیں جس کے بعض آثار و قرائن علماء نے لکھے ہیں:

(۱)......اس سے گفتگو میں نفس کو خاص حظ اور سرور ملتا ہو اور خوب جی لگتا ہو۔

(۲)......اس سے دوری اختیار کرنے میں طبیعت اسی کی طرف مائل رہتی ہو اور دل و دماغ پر اس کا خیال چھایا رہتا ہو۔

(۳)......چند دن ملاقات نہ ہونے کی صورت میں دل میں بے چینی و پریشانی بڑھ جاتی ہو اور اس سے ملنے کے لیے

انتہائی بے چین اور پریشان رہنے لگے کہ سونے کے وقت نیند غائب اور کھانے کے وقت بھوک مفقود رہنے لگی ہو۔

(۴)......اس سے ملتے وقت خاص وضع بنانے اور نرم و نازک انداز سے الفاظ بنا کر گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہو۔

(۵)......نمازوں اور دوسرے دینی کاموں میں دل میں اس کا خیال رہنے لگا ہو۔

(۶)......ہر وقت اس سے ملاقات کی تمنا دل میں رہتی ہو اس کی جدائی طبیعت کو ناپسند ہو۔

(۷)......اس کی ادائیں اور نقل و حرکت اگرچہ غیر شرعی ہوں مگر دل میں بہت اچھی لگتی ہوں۔

(۸)...... عنوان بہ عنوان اس کے تذکرہ کو جی چاہتا ہو جو اس کا تذکرہ کرے تو اس تذکرہ کرنے والے سے اسے قرب و محبت محسوس ہو۔ اور نفس کو ایک خاص مزہ ملتا ہو خواہ اس کے دنیوی اور غیر شرعی امور ہی کا تذکرہ ہو رہا ہو۔

(۹)......اس پر مال خرچ کرنے اور کھلانے پلانے کو جی چاہتا ہو۔

(۱۰)......اس کی جدائیگی اور فراق کے تصور سے جی گھبراتا ہو اور ملاقات کی خبر اور تصور سے دل کو خاص خوشی محسوس ہو۔

(۱۱)......اس سے خلوت میں ملنے کا حریص ہو۔

(۱۲)......اس کی ذات سے وابستہ تمام چیزوں سے دل میں محبت محسوس ہو اور اس کا شہر اور گاؤں اس کے گلی کوچے اس کے رشتہ دار اور بھائی بہن وغیرہ سے دل میں ایک طرح کا لگاؤ اور تعلق محسوس ہو اور اندر اندر نفس کو اس میں مزہ اور لذت محسوس ہو۔

یہ تقریباً ایک درجاً علامات اور نشانیاں ہیں جو کہ ایک تھرمامیٹر ہے جن کو پڑھ کر اور اپنے اوپر منطبق کر کے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرا یہ تعلق اللہ کے لیے ہے یا نفس کی خاطر ہے مگر ظاہر ہے کہ ہمیں خود جانچنے اور پرکھنے کا اختیار صرف انہی مواقع پر ہے جہاں شریعت نے صاف صاف واضح طور پر اس تعلق کے نفسانی ہونے کو نہ بتا دیا ہو ورنہ عورتوں سے تنہائی میں ملنا یا بے ریش خوبصورت لڑکوں سے ملاقات کرنا یہ صراحتاً غیر شرعی تعلق ہے فوری طور پر اس کا ترک واجب ہے اور اس کو باقی رکھنا حرام ہے۔

عورتوں کی بیعت اور اپنے شیخ سے استفادہ کی صورت

اب رہ گئی یہ بات کہ امرد لڑکے یا غیر محرم لڑکیاں اگر کسی شیخ کامل متبع سنت و شریعت سے مستفید ہونا چاہیں تو شریعت نے اس کے طریقے اور حدود کیا مقرر فرمائی ہیں؟ اس جواب یہ ہے کہ:

(۱)......ان کے مواعظ اور کتابوں سے مستفید ہوں۔

(۲)......خط لکھتے وقت اپنے کسی محرم رشتہ دار مثلاً والد، بھائی یا شوہر وغیرہ کے دستخط کا التزام کیا جائے، اگرچہ وہ پورا خط نہ پڑھیں مگر ان کے دستخط کے بغیر اپنے شیخ کو خط نہ بھیجے۔

(۳)......امرد لڑکا تنہائی میں شیخ سے نہ ملے۔

(٤)...... نامحرم عورت کم سے کم اور بقدرِ ضرورت گفتگو کرے۔

(٥)...... جانبین میں گفتگو میں نرم لہجہ اختیار کرنے سے گریز کیا جائے گو کہ ادب کا خیال قائم رہے۔

(٦)...... اگر شیخ مناسب سمجھے تو جانبین کی حفاظت کے لیے اور نفس و شیطان کے مکر سے بچنے کی احتیاطی تدبیر کے طور پر ایسے وقت میں فون پر بات کیا کرے جب تنہائی نہ ہو۔ پہلے ہی سے ایسا وقت مقرر کرے۔

بعض ایسی چیزیں جو غیر اہلِ حق مشائخ کے یہاں پائی جاتی ہیں یعنی عورتوں سے بے پردہ ہونا اور ان کے ساتھ مصافحہ کرنا اور ان کے ساتھ بے محابہ گفتگو کرنا یا خلوت و یکسوئی اختیار کرنا یہ سب امور خلافِ شرع ہیں جن کا طریقت اور تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں یہاں تک کہ بعض احادیث شریفہ میں جہاں عورتوں کی بیعت کا ذکر ہے یہ بات وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے بیعت کے وقت مصافحہ نہیں فرماتے تھے بلکہ صرف زبانی بیعت کرنے پر اکتفاء فرماتے تھے: چنانچہ مشکوٰۃ کی حدیث ہے:

﴿عَنْ عائِشَةَ قالَتْ فِيْ بَيْعَةِ النِّسآءِ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَمْتَحِنُهُنَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ (يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ) فَمَنْ اَقَرَّتْ بِهٰذَا الشَّرْطِ مِنْهُنَّ قَالَ لَهَا قَدْ بَايَعْتُكِ كَلَامًا يُكَلِّمُهَا بِهِ وَاللهِ مَا مَسَّتْ يَدُهٗ يَدَ امْرَاَةٍ قَطُّ فِي الْمُبَايَعَةِ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الجهاد، باب الصلح، ص: ٣٥٢)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قسم کھا کر فرماتی ہیں کہ عورتوں کی بیعت کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ تھا کہ صرف زبانی بیعت فرماتے تھے کبھی کسی عورت کا ہاتھ بیعت کے سلسلے میں نہیں چھوا۔

یہی بات حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے نقل فرمائی۔ اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس بیعتِ نساء کے متعلق فرمایا کہ عورتوں کی یہ بیعت صرف گفتگو اور کلام کے ذریعہ ہوئی، مردوں کی بیعت سے فارغ ہونے کے بعد کوہِ صفا پر عورتوں سے بیعت لی اور پہاڑ کے دامن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو دہرا کر نیچے جمع ہونے والی عورتوں کو پہنچا رہے تھے جو اس بیعت میں شریک تھیں۔ (معارف القرآن، جلد: ٨، صفحہ: ٤١٦)

اور اس کی بہترین صورت بیعتِ عثمانی ہے یعنی غائبانہ بیعت جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک حدیث کے تحت یوں ذکر فرمایا ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ يَعْنِيْ يَوْمَ بَدْرٍ فَقَالَ اِنَّ عُثْمَانَ انْطَلَقَ فِيْ حَاجَةِ اللهِ وَحَاجَةِ رَسُوْلِ اللهِ وَاِنِّيْ اُبَايِعُ لَهٗ فَضَرَبَ لَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَهْمٍ وَلَمْ يَضْرِبْ لِاَحَدٍ غَابَ غَيْرَهٗ﴾

(سنن ابي داؤد، كتاب الجهاد، باب فيمن جاء بعد الغنيمة لاسهم له)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوم بدر میں کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ عثمان (رضی اللہ عنہ) اللہ و رسول کے کام میں گئے ہوئے ہیں، اُن کے لیے میں بیعت کرتا ہوں۔

بیعت غائبانہ بزرگوں میں یہ رسم شائع ہے کہ اگر طالب بدون حاضری خدمت شیخ کے درخواست بیعت کی کرے تو غائبانہ اُس کی بیعت قبول کر لیتے ہیں۔ یہ حدیث بیعت غائبانہ میں صریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاضر نہ تھے، مگر اُن کی رضا و رغبت کی وجہ سے ان کو بیعت فرمالیا اور گو یہ بیعت قتال کی تھی لیکن اقسام بیعت میں اس امر میں فرق کا کوئی قائل نہیں۔ اور یہ غائب ہونا بوجوہ علالت صاحبزادی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بضرورت اُن کی تیمارداری کے تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ کے نکاح میں تھیں۔ (التکشف، صفحہ: ۲۹۸)

لہٰذا جو جعلی پیروں کے یہاں عورتوں سے متعلق خلاف شریعت و سنت معاملات ہوتے ہیں ان کا اسلامی تصوف اور طریقت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ جو چیز سنت و شریعت کے بال برابر بھی خلاف ہو وہ اسلامی تصوف نہیں ہے۔ چنانچہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **لَوْ نَظَرْتُمْ اِلٰی رَجُلٍ اُعْطِیَ مِنَ الْکَرَامَاتِ حَتّٰی یَرْتَقِیْ فِی الْھَوَآءِ فَلَا تَغْتَرُّوْا بِہٖ حَتّٰی تَنْظُرُوْا کَیْفَ تَجِدُوْنَ عِنْدَ الْاَمْرِ وَالنَّھْیِ وَحِفْظِ الْحُدُوْدِ وَاَدَاءِ الشَّرِیْعَۃِ وَقَالَ اَبُوْ حَفْصٍ مَنْ لَّمْ یَزِنْ اَفْعَالَہٗ وَاَقْوَالَہٗ فِیْ کُلِّ وَقْتٍ بِالْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ فَلَا تَعُدُّہٗ فِیْ دِیْوَانِ الرِّجَالِ** دونوں اکابر کا حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ و حضرت ابوحفص کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل چیز امر و نہی کا خیال اور سنت و شریعت کی پیروی ہے ورنہ ہواؤں میں اڑنا بھی بے کار اور لغو ہے جس کا ولایت اور بزرگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بس مردانِ خدا وہی لوگ ہیں جو ہر لحہ قرآن و سنت کے مطابق عمل کرتے ہوں۔

یعنی اصل کسی آدمی کی ولایت اور تقویٰ کا مدار اتباع سنت و شریعت پر ہے کرامتوں کے ظہور پر نہیں ہے جبکہ عام طور پر لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو جتنی کرامتوں والا ہو وہ اتنا ہی بڑا بزرگ ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ جو ہر قدم پر سنت و شریعت کا متبع ہو سب سے بڑا ولی وہی ہے۔

خرد اور عقل کی باہمی رسہ کشی

خرد نے گو کیا ہے میرے دامن کو رفو ہر دم
مگر کیوں عشق کی یہ چاک دامانی نہیں جاتی

یہ مضمون کتاب میں مختلف مقامات پر مذکور ہے اس میں دو لفظوں کا استعمال کیا جاتا ہے ایک خرد اور دوسرا عشق اختصار کے ساتھ اس کا حاصل یہ ہے کہ عشق کا تقاضہ اپنے اللہ پر سب کچھ قربان کر دینا اور اپنی ظاہری حالت بنانے اور سنوارنے سے بالکل لاپرواہ اور بے فکر ہو جانا ہے جب کہ عقل یہ چاہتی ہے کہ اپنی ظاہری حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے اور کچھ اپنی توجہ اور سعی و کوشش اس طرف خرچ کی جائے گو کہ اس میں کوئی حرج نہیں مگر اللہ کے

عاشقوں کو اتنا بھی گوارہ نہیں ہوتا اس لیے وہ ہر وقت چاک دامانی کی حالت میں نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے اہل دنیا ان کو بے وقوف اور مجنوں وغیرہ کے لقب دیتے ہیں۔

گناہوں پر ندامت کی کرامت محبوبیت ہے

گناہوں پر ندامت سے یہ توبہ کی کرامت ہے
کہ تائب سے کبھی ان کی مہربانی نہیں جاتی

حدیث پاک میں آتا ہے:

﴿اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللهِ﴾

(التیسیر بشرح الجامع الصغیر)

جو بندہ توبہ کر لیتا ہے وہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

﴿اِنَّ اللهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیۃ: ۲۲۲)

کہ بے شک اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اسی لیے بندے کو توبہ کی توفیق دینا ہی اس پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور مہربانی کا اثر ہے اس لیے جسے توبہ کی توفیق مل گئی ہو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان شاء اللہ اس کی توبہ بارگاہ الٰہی میں قبول بھی ہوگی اس پر حضرت والا دامت برکاتہم عالیہ کی دار العلوم آزادول کے بیان میں ذکر کردہ ایک بات یاد آئی اور وہ یہ کہ توبہ کا سرکاری مضمون وہ ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ میں عطا فرمایا (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ) اس لیے اپنے گناہوں کی معافی چاہنے کے لیے سب سے بہتر انہیں قرآنی الفاظ میں دعا کرنا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مشہور قول یہی ہے کہ جو کلمات توبہ حضرت آدم علیہ السلام کو دیئے گئے وہ یہی مذکورہ بالا کلمات تھے۔

بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے؟ تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم وحواء علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کیے پر ندامت اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لیے عرض کیا کہ (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا) یعنی ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا ہے اگر آپ معاف نہ کریں ہم پر رحم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہو جائیں گے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ (رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ) یعنی اے میرے پالنے والے میں نے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمایئے اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہوگئی تو عرض کیا کہ: (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ پر رحم فرمایئے۔ (معارف القرآن، جلد:۱، صفحہ ۲۰۰)

اور حضرت والا نے ارشاد فرمایا ہے کہ تائب سے کبھی ان کی مہربانی نہیں جاتی۔ دراصل ان مختلف حدیثوں کے مضمون کی ترجمانی ہے کہ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ستر مرتبہ بھی ایک دن میں ہی گناہ کرتا رہے اور توبہ کرے پھر بھی بخش دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عَبْدًا اَصَابَ ذَنْبًا وَّرُبَّمَا قَالَ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ وَرُبَّمَا قَالَ اَصَبْتُ فَاغْفِرْ لِیْ فَقَالَ رَبُّہٗ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَا شَآءَ اللّٰہُ ثُمَّ اَصَابَ ذَنْبًا اَوْ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ اَوْ اَصَبْتُ اٰخَرَ فَاغْفِرْہُ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَکَثَ مَا شَآءَ اللّٰہُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا وَّرُبَّمَا قَالَ اَصَابَ ذَنْبًا قَالَ قَالَ رَبِّ اَصَبْتُ اَوْ قَالَ اَذْنَبْتُ اٰخَرَ فَاغْفِرْہُ لِیْ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثَلَاثًا فَلْیَعْمَلْ مَا شَآءَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالٰی یریدون ان یبدلوا کلام اللہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک انسان نے گناہ کیا اور پھر یوں کہا اے اللہ مجھ سے گناہ ہوگیا ہے، آپ مجھے معاف کردیجئے۔ پھر اُس کے رب نے جواب میں یہ کہا کہ کیا میرا بندہ یہ بات جانتا ہے کہ اُس کا کوئی رب ہے جو گناہ پر پکڑتا بھی ہے اور اگر چاہتا تو معاف بھی کردیتا ہے۔ میں نے اپنے اس بندے کو بخش دیا۔ پھر یہ شخص کچھ دنوں تک اسی حال میں ٹھہرا رہا جتنا اللہ نے چاہا اور پھر گناہ میں مبتلا ہوا پھر سے اسی طرح کہا کہ اے اللہ! مجھ سے گناہ ہوگیا الخ یہاں تک کہ تین مرتبہ اسی طرح سلسلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ آخر میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندے کو تیسری بار بھی بخش دیا اور اب وہ جو چاہے کرے یعنی اگر وہ اس طرح گناہ کرتا رہے گا کہ گناہ کے ساتھ توبہ کو ملالیا کرے تو وہ جتنا بھی اور جب تک بھی کرے گا میں بھی اُتنا ہی معاف کرتا رہوں گا۔ بندہ گناہ کرنے سے تھک سکتا ہے لیکن اللہ معاف کرنے سے نہیں تھکتے، کیونکہ اللہ کی رحمت بندے کے گناہ سے بہت زیادہ بڑھ کر ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ توبہ کرنے والا بندہ اگر حالت توبہ میں دنیا سے رخصت ہوجائے تو وہ بھی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نیک صالح بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا اس پر یاد آیا کہ حافظ عبدالولی بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت میرا حال بہت خراب ہے نہ جانے قیامت کے دن میرا کیا حال ہوگا حضرت نے تحریر فرمایا کہ ان شاء اللہ بہت اچھا حال ہوگا اگر کاملین میں نہ اٹھائے گئے تو ان شاء اللہ تائبین میں ضرور اٹھائے جاؤ گے اور یہ بھی بڑی نعمت ہے اور فرمایا کہ یہ ہمارے سلسلہ کی برکت ہے جو لوگ اللہ والوں سے جڑے رہتے ہیں محروم نہیں رہتے۔ (باتیں ان کی یاد رہیں گی، صفحہ: ۱۴۰)

اس لیے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا جہاں شمار فرمایا اس میں تائبین کا خاص ذکر

فرمایا ہے اس لیے اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ تائب سے اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا خاص فضل و کرم کبھی جدا نہیں ہوتا حضرت والا نے کیا ہی خوب فرمایا ؎

جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہو گئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں

یہاں تک کہ حضرت والا دامت برکاتہم نے ''توبہ کے آنسو'' والے وعظ میں یہ بات بیان فرمائی ہے کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک صاحبِ کشف بزرگ نے کہا کہ ابلیس نے جو کہا تھا: '' اَنْظِرْنِیْ '' کہ مجھے مہلت دیجئے قیامت تک آپ کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے لیکن اگر یہ ظالم ''اُنْظُرْ اِلَیَّ'' کہہ دیتا ایک نظر رحمت مجھ پر ڈال دیجئے تو یہ بخش دیا جاتا۔

میری تمام امیدوں کا مرکز صرف میرے مولیٰ کا در ہے

ہمارا مرکزِ امیدِ رحمت آپ کا در ہے
کسی کے در پہ تو یا رب یہ پیشانی نہیں جاتی

قرآن کریم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ﴾
(سورۃ الزمر، اٰیۃ: ۳۶)

ترجمہ: کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا﴾
(سورۃ النساء، اٰیۃ: ۴۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ولی ہونے اور حامی و مددگار ہونے کے لیے کافی ہیں۔

اس مضمون کی بے شمار آیتیں قرآن کریم میں نازل ہوئی ہیں جن کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مومن کے ایمان کا تقاضہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے در کو خوب مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور ہر قسم کی امید و رجا اسی در کے ساتھ وابستہ رکھے کسی بھی غیر اللہ کے ساتھ ہماری کوئی امید اور خوف وابستہ نہیں ہونا چاہیے ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر ہو اور اسی سے اپنے سارے معاملات دنیا اور آخرت کے مانگتا رہے کیونکہ وہ اکیلا اللہ اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان ہے کہ:

﴿اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ﴾

کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہوتا ہوں جیسا وہ مجھ پر گمان کرتا ہے، سو ہم اللہ تعالیٰ کے در کے ساتھ جس قدر مضبوط گمان قائم کریں گے اور جیسا یقین اللہ کی ذات عالی کے ساتھ قائم کریں گے اللہ تعالیٰ بھی ویسا ہی معاملہ فرماتے ہیں۔

بس شرط یہ ہے کہ اپنے آنکھوں کے مشاہدہ کو اللہ تعالیٰ کی غیب کی خبر کے یقین پر ترک کر دے اور بالکل چھوڑ دے اس موقع پر اگر مگر کا معاملہ نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں میں تردد اور شک کرنے والوں کا شیوہ اور عادت ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد ایسے لوگوں کے ساتھ نازل نہیں ہوتی یہی تو وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلے میدانوں میں اترتے اور سمندروں میں اپنے گھوڑوں کو ڈالتے اور پھر اللہ کی مدد اترتے ہوئے اور وعدے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے تھے اور سمندروں میں راستے بنتے چلے جاتے تھے ایسا نہیں کہ پہلے دیکھیں کہ راستہ بن گیا ہے یا نہیں؟ اور پھر اس میں قدم رکھتے اور اس کے برخلاف جب کہ آج کا مسلمان اپنی آنکھوں کے مشاہدہ کے خلاف سینکڑوں اگر مگر دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے جو در حقیقت خدا کے وعدوں پر یقین کی کمی کی ترجمانی کرتے ہیں اور جس کی وجہ سے خدا کی مدد اٹھ جاتی ہے ورنہ حالت یہی ہونی چاہیے کہ نہ کسی اور کے سامنے جھکنا ہے اور نہ کسی سے مانگنا ہے زندگی گزارنے کا سہارا بس اپنے اللہ کا رحم و کرم ہونا چاہیے۔

اللہ نے سب کچھ مفت میں دیا ہے پھر کسی سے مفت لینے کا خیال کیسا؟

ایک دن ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ فلاں شخص سے اگر تعلق ہو جو کہ اس دکان کا مالک ہے تو پھر وہ دکان سے کچھ تھوڑا بہت سامان لینے کی صورت میں علماء اور طلباء کو مفت میں دے دیتا ہے اس لیے کبھی کبھی ان سے ملاقات کرا کر اپنا تعارف کرا لینا چاہیے کچھ تعلق قائم رکھنا چاہیے تاکہ اور دوسرے مواقع پر بھی ضرورت پڑنے کی صورت میں وہ کام آ سکتے ہیں خاص طور پر ہر سال کچھ لوگوں کو ان کی طرف سے حج و عمرہ پر بھیجنے کا انتظام ہوتا ہے تو مفت میں حج و عمرہ کرنے کا بھی موقع ہاتھ آ سکتا ہے اس لیے کبھی کبھی ان سے ملنے کے لیے آتے رہنا چاہیے۔

تو اس پر احقر نے ان ساتھی سے عرض کیا کہ جہاں تک ان سیٹھ صاحب کی علماء و طلباء کو کچھ سامان مفت میں دینے کی بات ہے تو اس سلسلے میں تو اتنا عرض ہے کہ ہمیں بحمد اللہ اللہ تعالیٰ نے اپنا در دکھایا اور پوری زندگی ہماری ساری ضرورتیں اور دوسری ہزاروں نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں سے ہمیں مفت ہی میں تو نصیب فرمائی ورنہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو ان کے بدلے کے طور پر کوئی عوض پیش نہیں کیا جس کی بدولت اللہ تعالیٰ پر لازم ہو گیا ہو کہ وہ ہمیں اس کا بدلہ بطور اجرت کے پیش کریں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بات تو یہ ہے کہ ہمارا سارا وجود ہی ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفت میں ملا ہوا ہے تو پھر کسی مخلوق سے دو چار دن کی کوئی ضرورت مفت میں پوری کرنے کی توقع اور امید رکھنا اور کچھ ضرورتوں کو مخلوق کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا یہ اللہ تعالیٰ کے درِ رحمت کے ساتھ وابستگی کی کمی کا نتیجہ ہوگا

جو حق تعالیٰ کو انتہائی نا گوار ہوگا۔ تو احقر کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ساری ہی نعمتیں مفت میں عطا فرما رکھی ہیں تو ہم دو ایک نعمتوں کو کسی انسان سے مفت لینے کے واسطے اس کے در پر کیوں جائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور سچی وفاداری کے خلاف ہے اور اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص ہے جس کے والد اپنے علاقے کے نہایت مال و دولت والے آدمی ہیں مختلف قسم کی دولتوں اور نعمتوں کے خزانوں کے مالک ہیں اب اس کی اولاد میں سے کوئی اس علاقے کے کسی معمولی درجہ کے آدمی کے پاس جا کر اپنی ضرورتوں کا سوال کرنا شروع کر دے اور ان سے اپنی حاجتیں مانگنا شروع کر دے تو غور کرنے کی بات ہے کہ اس کے والد کو اطلاع ہونے کی صورت میں کس قدر رنج اور غم ہوگا اس کا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہے اور وہ اپنے اس بیٹے سے انتہائی ناراضگی اور غصہ کا اظہار کرے گا۔

کہ جب تو میرے ساتھ وابستہ ہے اور میرے بیٹے ہونے کی نسبت تجھے حاصل ہے اور میرے پاس کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے تو پھر تو نے کسی اور کے در پر جا کر اس طرح کا سوال کیا؟

کیا تجھے اس میں کچھ شک تھا کہ میرے پاس یہ سب دولت و خزانے ہیں؟

یا تجھے اس میں شک تھا کہ تو مجھ سے مانگے گا اور میں تجھے نہیں دوں گا؟

یا تیرا یہ گمان تھا کہ تو جتنا مجھ سے مانگنا چاہتا ہے اتنی مقدار میرے پاس نہیں ہے؟

یا تو نے اپنے والد کی نسبت زیادہ رحمت و شفقت کسی دوسرے کے در پر دیکھی؟

اگر یہ سب باتوں کے جواب میں اس بیٹے کی طرف سے اپنے باپ کو جواب کے طور پر ہاں کہہ دیا جائے تو اس کے والد کو شدید تکلیف اور رنج و غم کا سامنا ہوگا اور اس کے دل کو بہت ہی صدمہ اور احساس ہوگا کہ جب کہ ساری دنیا کو میں صبح شام تقسیم کرتا ہوں اور یہ میرا بیٹا دوسروں کے در پر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔

صاحبو! ایمان والو! اس مثال میں غور کر کے ہم تھوڑا سا اپنے حالات کا جائزہ لیں کہ ہم اپنے خالق کے در رحمت کو چھوڑ کر دوسروں سے لینے اور مانگنے کی جو عادت ڈالے ہوئے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں جتنی بھی ناپسند کہی جائے وہ کم ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ سب سے زیادہ غیرت والے ہیں اور لامحدود خزانوں والے ہیں اور بلا استحقاق اپنے بندے پر رحم و کرم کا معاملہ فرما کر اسے صبح و شام بے شمار نعمتیں عطا فرماتے رہتے ہیں جن کو اگر ہم شمار کرنا چاہیں اور ان کی حیثیت و قیمت کا اندازہ لگانا چاہیں تو نہ شمار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اندازہ لگا سکتے ہیں جب کہ یہ ساری نعمتیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بلا کسی عوض کے اپنے بندوں کو مفت میں ملی ہوئی ہیں۔

کیا کوئی ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے اللہ سے جو کچھ لیا ہے اس کا بدل اللہ کو پیش کر دیا۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا اور یہ کسی انسان سے ممکن ہی نہیں۔

پھر اپنی کسی مختصر سی ضرورت یا معمولی سے کسی سامان کے خاطر کسی دولت مند انسان سے کوئی امید وطمع رکھنا اور مفت میں لینے کی خواہش دل میں رکھنا اور محض اس مقصد کے لیے اس سے اپنا تعلق پیدا کرنا اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت سے دوری کا سبب ہوگا اور خاص عنایت خداوندی ایسے بندے کے سر سے اٹھ جائے گی۔

مفت میں حج وعمرہ کے لیے مالداروں سے تعلق پر ایک نظر

رہ گیا مفت میں ہر سال حج وعمرے کا معاملہ تو اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ حج وعمرہ بذات خود کوئی مقصود چیز نہیں ہے بلکہ مومن کا مقصود اصلی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اسی لیے تمام عبادات مشروع ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمارے جس عمل سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہوتے ہوں خواہ بظاہر اس کے ذریعے ہمیں بڑی عبادت انجام دینے کا موقع میسر آرہا ہو ایسا عمل قابل ترک ہے اور ظاہر ہے کہ اہل علم وفقہ حضرات کو دنیاداروں امراء و حکام کے دروازوں پر جانے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے روایات میں منع فرمایا ہے اگرچہ ہم ان سے زبان کے ذریعے سے کوئی سوال نہ کررہے ہوں مگر دل میں کچھ ملنے کا لالچ اور امید رکھنا جس کو اصطلاح شریعت میں ''اشراف نفس'' کہا جاتا ہے یہ بھی منع ہے۔

بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ ایک سوال زبان سے ہوتا ہے اور ایک دل سے، سو جس طرح کسی سے بلاضرورت شدیدہ زبان سے سوال کرنا منع ہے ٹھیک اسی طرح دل کا سوال بھی منع ہے یعنی کسی سے امید وطمع رکھنا اور ایسی شکل اختیار کرنا کہ وہاں سے کچھ حاصل ہوجائے اور اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں ہمارے دل کے حال کو خوب جاننے والے ہیں اس لیے دل میں بھی کسی مخلوق سے کسی قسم کے نفع کے امید نہیں رکھنی چاہیے بلکہ ہمارا مرکزِ امید صرف اللہ کا در ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ عنایت فرمائیں اس کا شکر ادا کیا جائے اور جب تک حاصل نہ ہو تو صبر اختیار کیا جائے۔

البتہ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دنیا کی نعمت مال و دولت وغیرہ کسی کے ذریعے سے حاصل ہورہی اور اس میں نہ دل کا لالچ ہو اور نہ زبان کا سوال ہو تو پھر اس کو رد نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ ایک روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيْنِى الْعَطَاءَ فَأَقُوْلُ أَعْطِهِ مَنْ هُوَ أَفْقَرُ إِلَيْهِ مِنِّىْ فَقَالَ خُذْهُ إِذَا جَاءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ شَيْءٌ وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَّلَا سَائِلٍ فَخُذْهُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ قَالَ سَالِمٌ فَلِأَجْلِ ذٰلِكَ كَانَ عَبْدُ اللهِ لَا يَسْأَلُ أَحَدًا شَيْئًا وَّلَا يَرُدُّ شَيْئًا أُعْطِيَهُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الزکوۃ، باب من اعطاہ اللہ شیئا من غیر مسئلۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو کچھ ہدیہ دیتے میں عرض کرتا کہ یہ ایسے شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا حاجت مند ہو آپ فرماتے کہ اس کو لے لو اور جو مال بھی اس قسم کا

تمہارے پاس آوے اس طرح سے کہ نہ تو تم اس میں کسی کے دست نگر ہو اور نہ کسی سے سوال کیا ہو تو تم اس کو لے لو اور اپنی ملک بنالو پھر اگر چاہو تو کھاؤ اور اگر چاہو تو خیرات کرو اور جو نہ آوے تو اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو حضرت سالم کہتے ہیں کہ اسی لیے حضرت عبداللہ کا معمول تھا کہ نہ تو کسی سے کچھ مانگتے تھے اور نہ آئی ہوئی چیز کو پھیرتے تھے روایت کیا ہے اس کو بخاری ومسلم ونسائی نے۔

اسی پر فارسی کا ایک مقولہ ہے: ''چون نیاید طمع نکند وچون بیاید منع نکند وچوں بگیرد جمع نہ کند''۔ یعنی کہ جب نہ آئے تو طمع ولالچ نہ کرے اور جب آئے منع نہ کرے اور جب لے لے تو جمع نہ کرے۔ (التکشف: ۱۳۷/۴)

حاسد بوجہِ حسد میری آہ نہیں پہچان سکتا ہے

مرے دل کو جو بخشی تو نے آہوں کی فراوانی
مگر حاسد سے میری آہ پہچانی نہیں جاتی

یہ ایک خاص محبت کا مقام ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا قربِ قلب میں اتنا زیادہ ہوتا ہے اور محبت کی ایسی آگ لگی ہوتی ہے کہ اللہ کا یہ عاشق ہر دم آہ وفغاں کرتا رہتا ہے مگر جو شخص خود اس حال سے گزرا نہ ہو یا کسی رقابت اور حسد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سچے عاشق کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر اس آہ وفغاں پر بھی تنقید اور تبصرے اور طرح طرح کی طعن وتشنیع آنے لگتی ہے اور ایسا بکثرت دیکھا جاتا ہے کہ جہاں اولیاء اللہ کو دل سے ماننے والوں کی ایک جماعت ہوتی ہے وہیں کچھ لوگ اپنی محرومی قسمت اور شقاوت وبدبختی کی وجہ سے ان سے بغض وحسد کی آگ میں جلنے لگتے ہیں اور یہ معاملہ انبیاء واولیاء سب کے ساتھ پیش آنا اللہ تعالیٰ کی سنت وعادت سے ہے جیسا کہ قرآن کریم میں کئی مواقع پر ایسی آیتیں مذکور ہیں کہ ہم نے اپنے تکوینی نظام کے تحت اپنے نبیوں کے لیے کچھ مجرمین میں سے دشمن بنائے کبھی بھی ان سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ یہی سمجھتا رہے کہ یہ بے چارے ایک درجے میں معذور ہیں کہ ان کو میری حالت کا صحیح ادراک نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ چیزیں بچند وجوہ مؤمن کے ایمان اور ولی کی ولایت میں ترقی کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آپ کی قوم کی طرف سے ایذائیں پہنچائی گئیں خاص طور پر طائف کے مقام پر مخالفین کی طرف سے سخت ایذاؤں کا سامنا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جملہ ارشاد فرمایا تھا:

﴿اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

(شعب الایمان للبیهقی)

کہ اللہ میری قوم کو ہدایت دے دیجئے کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں بس ٹھیک اسی طرح سے جب اللہ کے کسی ولی اور سچے عاشق کے اندرون قلب لگی ہوئی محبت خداوندی کی آگ کی حقیقت کو کوئی نہ پہچان سکے اور قدردانی کرنے کے

بجائے بغض وحسد کا معاملہ کرے تو ہمیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سنت پر عمل کرنا چاہیے۔

مالک کا کرم ہو تو بندگی کا لطف نصیب ہوتا ہے

مرے مالک کرم سے آپ نے جس پر نگہ ڈالی
پھر اس کی بندگی سے شانِ ربانی نہیں جاتی

جس پر اللہ تعالیٰ کی خاص کرم کی نظر پڑ جاتی ہے تو پھر یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اسے جتنی بھی نعمتیں ملیں لیکن سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ یہ عطا فرماتے ہیں کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اپنی یادوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور وہ ہر وقت مختلف انداز اور طریقوں سے اپنے اللہ کی یاد میں لگا رہتا ہے اس کا دل دنیا سے اچاٹ اور آخرت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جس پر اپنی نظر کرم ڈال دیتے ہیں اسے اپنی طرف جذب فرما لیتے ہیں اور یہ جذب والا راستہ نہایت آسان اور اونچا راستہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیۃ:١٣)

ترجمہ: اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے (یعنی دین حق قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے) اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔ (معارف القرآن، جلد:٧، ص:٦٧٥)

(١)...... جس بندہ کو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس طریق کا نام ''طریق جذب'' ہے۔

(٢)...... اور ہدایت دیتا ہے اس بندہ کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و توجہ اختیار کرتا ہے۔ اس طریق کا نام ''طریق سلوک'' ہے۔

سلوک فعل اختیاری ہے اور جذب امر غیر اختیاری، پس بندہ سلوک کا مکلّف ہے لیکن عادۃً ہر سالک کو بھی اس کے مجاہدات کے صلہ میں من جانب اللہ جذب نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ بغیر عنایت و یاریِ حق کے کسی کا کام نہیں بنتا۔ جذب اور سلوک ہر دو طریق بہر حال فضل ہی سے موصل الی المقصود اور مثمر للقرب ہوتے ہیں۔

ذرۂ سایۂ عنایت بہتر است
از ہزاراں کوشش طاعت پرست

حق تعالیٰ کی عنایات کا ایک ذرہ سایہ طاعت پر ناز کرنے والے کی ہزاروں کوششوں سے افضل ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حافظ ابو القاسم طبرانی نے اپنی سند سے حضرت جریر ابن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بصیرت افروز

قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو ایک گھوڑا خرید لانے کا حکم دیا۔ وہ تین سو درہم میں گھوڑا خرید لایا اور گھوڑے کے مالک کو رقم دلوانے کے لیے ساتھ لے آیا۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو طے شدہ دام بھی بتلائے گئے اور گھوڑا بھی پیش کر دیا گیا۔ آپ نے اندازہ کیا کہ گھوڑے کی قیمت تین سو درہم سے کہیں زائد ہے۔ چنانچہ آپ نے گھوڑے کے مالک سے کہا کہ آپ کا یہ گھوڑا تین سو درہم سے زائد قیمت کا ہے، کیا آپ چار سو درہم میں فروخت کریں گے؟ اس نے جواب دیا جیسے آپ کی مرضی۔ پھر فرمایا کہ آپ کے گھوڑے کی قیمت چار سو درہم سے بھی زائد ہے، کیا آپ پانچ سو میں بیچیں گے؟ اس نے کہا کہ میں راضی ہوں۔ اسی طرح حضرت جریر رضی اللہ عنہ گھوڑے کی قیمت میں سو سو درہم کی زیادتی کرتے چلے گئے، بالآخر آٹھ سو درہم میں گھوڑا خرید لیا اور رقم مالک کے حوالے کر دی۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ جب مالک تین سو درہم پر راضی تھا آپ نے اسے آٹھ سو درہم دے کر اپنا نقصان کیوں مول لیا؟ آپ نے جواب دیا کہ گھوڑے کے مالک کو قیمت کا صحیح اندازہ نہیں تھا، میں نے خیر خواہی کرتے ہوئے اس کو پوری قیمت ادا کی ہے کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا، میں نے اس وعدہ کا ایفاء کیا ہے۔ (نووی شرح مسلم، ج:۱، ص:۵۵)

بڑی سے بڑی مشکل میں بھی اُمید پنہانی نہیں جاتی

کبھی مشکل میں بھی پڑتا ہے اخترؔ تو بحمد اللہ
خدا کے فضل سے امید پنہانی نہیں جاتی

دنیا میں جب انسان زندگی گزارتا ہے تو کبھی اسے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی آسانی اور سہولتوں میں زندگی گزرتی رہتی ہے اسی طرح کبھی راحت و عافیت میں رہتا ہے تو کبھی تکلیف و مصیبت سے گزرتا ہے یعنی کہ یہ دو قسم کے ملے جلے حالات اس دنیا میں ہر زندگی گزارنے والے کو پیش آتے رہتے ہیں اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ مگر یہ دنیا دونوں قسم کے حالات کی جگہ ہے اسی لیے صحیح سچے مومن کو اچھے حالات میں اکڑنا اور اترانا نہیں چاہیے اور مشکل حالات میں ناامید اور مایوس ہو کر دل میں بے چینیوں اور پریشانیوں کو جگہ نہیں دینی چاہیے۔

اس کی وجہ عقلی طور پر یہ ہے کہ بندہ مومن کو جو کچھ پہنچتا ہے تو اس کا ایمان اس کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ یہ خود نہیں پہنچا بلکہ میرے اللہ نے پہنچایا ہے جو کہ میرا رب اور پالنے والا ہے اور رحیم و کریم بھی ہے تو میں یہی سمجھوں گا کہ جس وقت کے مناسب میرے لیے جو حالات تھے اللہ تعالیٰ نے سو فیصد حکمت و مصلحت کے مطابق ان کو ٹھیک ٹھیک وقت پر میرے لیے بھیجا ہے کہ اگر اس سے ذرا بھی مقدم و موخر ہوتے یا اس وقت میں کچھ اور حالات ہوتے تو وہ میرے لیے مناسب نہیں تھے اس لیے جو شخص اپنے دل میں صحیح ایمان اور اللہ تعالیٰ کی سچی محبت رکھے گا تو وہ مشکل

حالات میں بھی نا امید اور مایوس نہیں ہوگا اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ بحمد اللہ مشکل حالات میں بھی میری اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ امید اسی طرح قائم رہتی ہے اور میں بالکل مایوس اور نا امید نہیں ہوتا۔ اور یہ مایوسی اور نا اُمیدی اہلِ ایمان کی شان نہیں ہے بلکہ قرآن اعلان کرتا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللهِ وَلِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾

(سورۃ العنکبوت، آیت: ۲۳)

ترجمہ: جو لوگ خدا تعالیٰ کی آیتوں کے اور (بالخصوص) اس کے سامنے جانے کے منکر ہیں وہ لوگ (قیامت میں) میری رحمت سے نا امید ہوں گے (یعنی اس وقت مشاہدہ ہوجائے گا کہ ہم محلِ رحمت نہیں ہیں) اور یہی ہیں جن کو عذاب دردناک ہوگا۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۶۸۳)

تو معلوم ہوا کہ نا اُمیدی کافروں کی خصلت اور شیطان کی حالت ہے، ایمان والوں کے لیے کسی بھی صورت میں نا اُمیدی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر قرآن کریم میں منافقین کی طرف سے مسلمانوں کو کہے جانے والی ایک بات کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا جس میں وہ مسلمانوں کو کسی موقع پر میدان جنگ میں شکست ہوجانے یا کوئی اور حادثہ پیش آجانے پر تکلیف اور رنج ودکھ اور افسوس میں ڈالنا چاہتے تھے تو حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو منافقین کے مذکورہ اقوال سے متاثر نہ ہونے اور اصل حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی:

﴿قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا کَتَبَ اللهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَی اللهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیۃ: ۵۱)

ترجمہ: آپ (جواب میں ان سے دو باتیں) فرما دیجئے (ایک تو یہ کہ) ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑسکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارا مالک ہے (پس مالک حقیقی جو تجویز کرے مملوک کو اس پر راضی رہنا واجب ہے) اور (ہماری کیا تخصیص ہے) اللہ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے سب کام سپرد رکھنے چاہئیں۔
(معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۳۸۴)

یعنی آپ ان مادی اسباب کی پرستش کرنے والوں کو بتلا دیجئے کہ تم دھوکے میں ہو یہ مادی اسباب محض ایک پردہ ہے، ان کے اندر کام کرنے والی قوت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ہمیں جو حال پیش آتا ہے وہ سب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے اور وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اسی پر اصل بھروسہ رکھیں، مادی اسباب کو صرف اسباب وعلامات ہی کی حیثیت سے دیکھیں، ان پر کسی بھلائی یا برائی کا مدار نہ جانیں۔
(معاف القرآن، ج:۴، ص:۳۸۷)

مجھ کو جینے کا سہارا چاہیے

مجھ کو جینے کا سہارا چاہیے غم تمہارا دل ہمارا چاہیے
بحرِ الفت کا کنارا چاہیے سر ہمارا در تمہارا چاہیے
غم میں بس ان کو پکارا چاہیے ان کے ہوتے کیا سہارا چاہیے
لذتِ فریاد طوفانوں میں ہے کون کہتا ہے کنارا چاہیے
حاصلِ ساحل مجھے طوفاں میں ہے ان کے جلووں کا نظارا چاہیے
اپنی آہوں سے درِ جاناں پہ میر اپنی بگڑی کو سنوارا چاہیے
آپ پر ہر دم فدا ہو میری جاں غیر کی مجھ کو نہ پروا چاہیے
دستِ بکشا جانبِ زنبیلِ ما میرے سر کو تیرا سودا چاہیے
اخترِ خستہ و دور افتادہ کو ان کی رحمت کا بلاوا چاہیے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **غم**: گناہوں سے بچنے میں دل میں ہونے والا غم۔ **بحرِ الفت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا سمندر۔ **درِ جاناں**: اللہ تعالیٰ کا در۔ **دستِ بکشا جانبِ زنبیلِ ما**: میرے کشکول کی طرف اپنی سخاوت کا ہاتھ بڑھایئے۔ **سودا**: عشق۔ **خستہ**: بدحال۔ **دُور اُفتادہ**: دور پڑا ہوا۔

مؤمن کی حیات کا سہارا اللہ کی یاد اور اس کی راہ کا غم ہے

مجھ کو جینے کا سہارا چاہیے
غم تمہارا دل ہمارا چاہیے

مومن کی اصل زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ وابستہ اور جڑی ہوئی ہے اس کی حیات کا اصل سہارا صرف یہی ہے اگر یہ نہ رہے تو پھر زندہ انسان اور مردہ انسان میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ﴾

(سورۃ فاطر، اٰیۃ: ۲۲)

ترجمہ: اور (مؤمن اور کافر میں جو تفاوت بینا و نابینا کا سا کہا گیا ہے تو اس سے مقصود نفی کمی کی ہے نہ کہ زیادتی کی، کیونکہ ان میں تفاوت مردہ اور زندہ کا سا ہے، پس ان کی برابری کی نفی کے لیے یوں بھی کہنا صحیح ہے کہ) زندے اور مردے برابر نہیں ہوسکتے۔ (معارف القرآن، جلد:۷، صفحہ:۳۳۲)

اسی طرح حدیث شریف میں بھی آیا ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْ يَذْكُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِيْ لَا يَذْكُرُ كَمَثَلِ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل)

کہ اللہ کے ذکر کرنے والے کی مثال زندہ کی طرح ہے اور ذکر نہ کرنے والے کی مثال مردہ کی طرح ہے، اس لیے مسلمان کا اصل سہارا اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے راستے کا غم یعنی ہر طرح کی حرام لذت اور معصیت سے بچنا ہے خواہ دل پر کتنا ہی زور پڑے اور کیسا ہی رنج وغم اٹھانا پڑے اسی میں مومن کو لذت وفرحت ملتی ہے اس لیے حضرت نے فرمایا کہ میرے جینے کا سہارا یہ ہے کہ میرے دل میں آپ کا دردِ محبت موجود رہے۔ تب اس کے ہوتے ہوئے زندگی زندگی کہلانے کے قابل ہو جاتی ہے اور دل واقعی معنیٰ میں دل بن جاتا ہے حضرت شاہ محمد احمد پرتا بگڈھی رحمہ اللہ کا شعر ہے ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہو گیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہوگیا
بحرِ الفت کا کنارا چاہیے
سر ہمارا در تمہارا چاہیے

یعنی کہ میں اللہ تعالیٰ پر ہر وقت ایسا فدا رہوں اور اس کے در پر سربسجود رہوں کہ جب تک مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت کے سمندر کا کنارا حاصل نہ ہو جائے اور اولیائے صدیقین کی نسبت کے خطِ منتہا تک نہ پہنچ جاؤں تب تک اے اللہ مجھے اسی حال میں رکھنا کہ بس ہر گھڑی میں تیری ہی یاد میں مست رہوں، یہاں تک کہ اس محبت کے ساحل تک میں اسی طرح جستجو کرتے کرتے زندگی کے آخری سانس تک مصروفِ عمل رہوں اور یہی بندۂ مومن کی ادائیگیِ بندگی کا تقاضہ ہے اور محبت کا آخری کنارا اور فائنل (Final) اسٹیج ہے کہ ہر گھڑی اسی کے در پر پڑا رہوں اور اسی کا ہو کر رہوں اور جب آدمی میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ اسے مقصدِ حیات حاصل ہو گیا، کیونکہ مومن کا کام ہر وقت اللہ کا در کھٹکھٹانا اور اس پر پڑے رہنا ہے۔ البتہ در کے کھلنے اور ادھر سے جواب کا آنے منتظر نہیں رہنا چاہیے اس پر نظر ہی نہیں رہنی چاہیے، خواجہ صاحب کا شعر ہے ؎

بیٹھے گا چین سے اگر
کام کے کیا رہیں گے پر
گو نہ نکل سکے مگر
پنجرے میں پھڑپھڑائے جا

اللہ کے سہارے کے بعد کسی سہارے کی ضرورت نہیں

غم میں بس ان کو پکارا چاہیے
ان کے ہوتے کیا سہارا چاہیے

یعنی مومن بندہ کیسے ہی غم میں مبتلاء ہو مگر اسے کسی طرح کا خوف اور اندیشہ اور رنج و پریشانی نہیں ہوتی۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ یہ جانتا ہے کہ غم اور خوشی سب خود آ جانے والے حالات نہیں ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔تو لہٰذا میں اسی اللہ کو پکاروں گا جس کے ہاتھ میں اس غم کا مداوا ہے اور ان کے سہارے کے ہوتے ہوئے کسی اور دوسرے سہارے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ اصل اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مومن کا قابل اعتماد سہارا ہے، باقی جتنے سہارے ہیں وہ صرف ظاہر میں حالات کے بنانے والے اور ضرورت میں کام آنے والے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان کے در پردہ اللہ تعالیٰ کی طاقت ہی کارفرما ہوتی ہے۔سو جس کی نظر خدا تعالیٰ کی طاقت پر ہو وہ پھر کسی اور سہارے کی طرف نہ تو متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کوئی امید وابستہ کرتا ہے۔ خاص طور پر غیر اللہ کا سہارا انتہائی کمزور اور ضعیف سہارا ہے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَّاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

(سورة العنكبوت، آية: ۴۱)

ترجمہ: جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں ان لوگوں کی مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے، (پس جیسا اس مکڑی نے اپنے زعم میں ایک اپنی جائے پناہ بنائی ہے، مگر واقع میں وہ پناہ انتہائی کمزور ہونے کے سبب کالعدم ہے، اسی طرح یہ مشرک لوگ معبوداتِ باطلہ کو اپنے زعم میں اپنی پناہ سمجھتے ہیں، مگر واقع میں وہ پناہ کچھ نہیں ہے) اگر وہ (حقیقتِ حال کو) جانتے تو ایسا نہ کرتے (یعنی شرک نہ کرتے، لیکن وہ نہ جانیں تو کیا ہوا) (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۶۹۲)

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، عنکبوت مکڑی کو کہا جاتا ہے، اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض ان میں سے زمین میں گھر بناتی ہیں، بظاہر وہ یہاں مراد نہیں بلکہ مراد وہ مکڑی ہے جو جالا تانتی ہے، اور اس میں معلّق رہتی ہے، اس جالے کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی جتنی قسم کے گھونسلے اور گھر معروف ہیں، یہ جالے کے تار ان سب سے زیادہ کمزور ہیں کہ معمولی ہوا سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ اس آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں اور ان پر اعتماد کرنے والوں کی مثال مکڑی کے اس جالے سے دی ہی جو کہ نہایت کمزور ہے، اسی طرح جو لوگ اللہ کے سوا بتوں پر یا کسی انسان وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ ایسا ہی ہے جیسا یہ مکڑی اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۶، صفحہ:۶۹۳)

طوفانوں میں لذتِ فریاد کا کیا کہنا!

لذت فریاد طوفانوں میں ہے
کون کہتا ہے کنارا چاہیے
حاصل ساحل مجھے طوفاں میں ہے
ان کے جلووں کا نظارا چاہیے

یہ مضمون مختلف اشعار کے ضمن میں لکھا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو طوفانوں میں ساحل کا مزہ عطا فرماتے ہیں اور نافرمانوں کو ساحل پر طغیانی کا سماں نظر آتا ہے۔ کیونکہ مومن ناگوار اور ناموافق حالات میں بھی صبر کر کے اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اور اسے کسی گھڑی بھی بے چینی اور پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ طوفانوں میں ساحل کا مزہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت وہ طوفانوں میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود ساحل پر ہی ہوتا ہے کیونکہ مومن کا ساحل اور اس کی منزل حکم خداوندی کی بجا آوری ہے خواہ اس کے نتیجہ میں حالات اچھے اور موافق ہوں، یا بظاہر برے اور ناسازگار ہوں۔ جس وقت مومن اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی منزل پر کھڑا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اتنا ہی سکون میسر آتا ہے جتنا کہ اچھے اور خوشگوار حالات کی صورت میں، اور اس وقت بھی وہ حق تعالیٰ کے جلووں کا نظارہ کرتا رہتا ہے۔

آہوں سے بڑی جلدی بگڑی سنور جاتی ہے

اپنی آہوں سے در جاناں پہ میر
اپنی بگڑی کو سنوارا چاہیے

اللہ تعالیٰ کے در پر پڑ کر آہ وزاری کرنے کے نتیجے میں مسلمان اپنی بگڑی بنالیتا ہے۔ کیونکہ یہ ادا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند اور خوش کرنے والی ہے اور جب کوئی انسان اپنے پالنے والے اللہ کو راضی کرلے تو پھر اس کی بگڑی بننے اور سنورنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کی منزلیں آہ وفغاں کے ذریعے سے بڑی تیزی کے ساتھ طے ہوتی ہیں اور اللہ سے دوری قرب میں بدل جاتی ہے، اس لیے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے در کو مضبوطی سے پکڑ کر اس پر آہ زاری کرتے رہتے ہیں جو کہ حقیقت میں دنیا و آخرت کے ہر مسئلے کا حل ہے اور ہر خوبی کے حصول کی کنجی ہے۔

اور یہ اللہ کا در ایسا در ہے جو بڑے سے بڑے کافر مشرک اور فاسق وفاجر کے لیے بھی چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ جو بھی اس در جاناں پہ آ کر سر رکھ دیتا ہے اور اپنے محبوب کو پکارتا ہے وہ ہر وقت سنتا ہے اور بڑی قدردانی کے

ساتھ اپنے بندے کے ساتھ عفو و کرم کا معاملہ فرماتا ہے، بندے نے خواہ اپنی زندگی کو کتنا ہی بگاڑا ہو اور کیسے ہی گناہوں میں لت پت رہا ہو اور کتنی ہی غفلتوں میں عمر ضائع کر دی ہو مگر اللہ کے سامنے ایک آہ بھرنے سے ہی سارے بگڑے ہوئے حالات یک دم سنور جاتے ہیں اور عمر بھر کا رنج و غم اور دکھ درد دور ہوتا نظر آتا ہے اس لیے ہر شخص کو اسی در کو مضبوط پکڑنا چاہیے۔ چنانچہ حدیثِ پاک میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیْ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اِبْلِیْسَ قَالَ لِرَبِّہٖ بِعِزَّتِکَ وَجَلَالِکَ لَا اَبْرَحُ اُغْوِیْ بَنِیْ اٰدَمَ مَا دَامَتِ الْاَرْوَاحُ فِیْھِمْ فَقَالَ اللہُ فَبِعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَا اَبْرَحُ اَغْفِرُ لَھُمْ مَا اسْتَغْفَرُوْنِیْ﴾

(مسند احمد، کتاب باقی مسند المکثرین، باب مسند ابی سعید الخدری ﷺ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے یہ بات کہی کہ مجھے آپ کے عزت وجلال کی قسم کہ میں بنی آدم کو بہکاتا رہوں گا اور اُن کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ اُن کی روحیں اُن کے جسموں میں موجود ہیں تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے بھی میری عزت وجلال کی قسم کہ میں اُن کو بخشتا رہوں گا جب تک کہ وہ مجھ سے مغفرت چاہتے رہیں گے۔ (یعنی اگر وہ مغفرت چاہنا بند کر دیں اور میرے در سے ہٹ جائیں تو الگ بات ہے ورنہ اگر وہ میری طرف متوجہ ہوں گے اور توبہ واستغفار کریں گے تو مرتے دم تک ہر ہر موقع پر کیسا ہی گناہ ہو میں بھی اُن کو معاف کرتا رہوں گا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ہرگز ہرگز کسی بھی مؤمن کو کیسی ہی حالت ہو جانے کے باوجود نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔)

غیر کی پرواہ کرنا انبیاء و اولیاء کا طریقہ نہیں ہے

آپ پر ہر دم فدا ہو میری جاں
غیر کی مجھ کو نہ پروا چاہیے

یہی کلمہ توحید ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مقصد ہے کہ اللہ کے سوا دل میں کسی کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے، بلکہ ہر لمحہ حیات اللہ تعالیٰ پر قربان ہو، اسی کو راضی کرنے کی فکر ہو اور اسی کی ناراضگی سے بچنے کا اہتمام ہو جس کی صورت یہی ہے کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جس وقت میں اللہ تعالیٰ نے جو جو کام کرنے کے لیے کہے ہیں ان کو کرتا رہے اور جو بچنے کے لیے کہے ہیں ان سے بچتا رہے، چاہے دنیا والے ناراض ہوں یا راضی ہوں، ان کی ناراضگی اور ملامتوں کا کوئی خیال دل میں نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ انبیاء و اولیاء کی سنت رہی ہے کہ جب انہوں نے مکمل طور پر دین پر چلنا چاہا تو ان کو اپنوں اور غیروں کی طرف سے ملامتوں اور طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہے، اگرچہ ان سے سب کچھ چھوٹا ان کے پیارے بھی چھوٹے ان کا وطن بھی چھوٹا اور اہل

خاندان بھی چھوٹے لیکن انہوں نے اللہ کو نہیں چھوڑا۔

عام طور پر کافروں کی طرف سے نبیوں کو جلاوطن کیے جانے اور کبھی سنگسار کیے جانے اور کبھی قوم و وطن سے الگ کردیے جانے کی دھمکیاں دی جاتی رہی ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ﴾

(سورۃ ابراھیم، اية:۱۳)

ترجمہ: اُن کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔ یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ (پھر آنا اس لیے کہا کہ سکوت قبل بعثت سے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسلی کے لیے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ بیچارے تم کو کیا نکالیں گے ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کردیں گے۔ (معارف القرآن، جلد:۵، صفحہ:۲۲۶)

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، اية:۸۸)

ترجمہ: ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے (جو یہ باتیں سنیں تو انہوں نے گستاخانہ) کہا کہ اے شعیب! (یاد رکھئے) ہم آپ کو اور آپ کے ہمراہ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ (تو البتہ ہم کچھ نہ کہیں گے۔ یہ بات مؤمنین کے لیے اس لیے کہی کہ وہ لوگ قبل ایمان کے اسی طریقِ کفر پر تھے لیکن شعیب علیہ السلام کے حق میں باوجود اس کے کہ انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا، اس لیے کہی کہ ان کے سکوت قبل بعثت سے وہ یہ ہی سمجھتے تھے کہ ان کا عتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) شعیب (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ ہم تمہارے مذہب میں آجائیں گے گو ہم (بدلیل وبصیرت) اس کو مکروہ (اور قابل نفرت) ہی سمجھتے ہوں (یعنی جب اس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے تو ہم کیسے اس کو اختیار کرلیں) (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۶۲۶)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے جو کہ متکبر اور مغرور تھے، ان کو یوں دھمکی دی کہ اے شعیب ہم تمہیں اور جو تمہارے ساتھ ایمان والے ہیں ان سب کو اپنی بستی سے نکال باہر کردیں گے، الا یہ کہ تم ہمارے دین وملت میں لوٹ آؤ۔ اسی طرح قوم نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی:

﴿قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾

(سورۃ الشعرآء، اية:۱۱۶)

ترجمہ: وہ لوگ کہنے لگے کہ اگر تم (اس کہنے سننے سے) اے نوح! باز آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔
(معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۵۴۴)

اور قومِ لوط علیہ السلام نے یوں کہا:

﴿قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ﴾
(سورۃ الشعرآء، اية ۱۶۷)

ترجمہ: وہ لوگ کہنے لگے کہ اے لوط! اگر تم (ہمارے کہنے سننے سے) باز نہیں آؤ گے تو ضرور (بستی سے) نکال دیئے جاؤ گے۔ (معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۵۴۱)

غرض یہ کہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسّلام کو ان کی قوموں کی طرف سے اس طرح کی دھمکیاں دی جاتی رہیں مگر۔ وہ دین کے اوپر جمنے اور اس کی دعوت سے ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹے، گو کہ انہیں اپنی قوموں کی طرف سے مختلف قسم کی تکالیف کا سامنا بھی ہوا، لیکن وہ اللہ کے لیے ان کو گوارا کرتے رہے مگر حق کو نہیں چھوڑا۔

صاحبو! جس طرح انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت اور طریقہ رہا ہے ٹھیک اسی طرح ہر دور میں خاصانِ خدا اولیاء اللہ آزمائش کے ان دشوار گزار مراحل سے گزرتے رہے ہیں، اپنی جان و مال اور اپنا کاروبار اور وطن سب کچھ چھوڑنا گوارا کیا مگر اللہ تعالیٰ کے دین سے ایسے جمے رہے کہ اس کو بال برابر بھی چھوڑنا منظور نہ کیا۔ ہر قسم کی تکلیف اور مشقت سہنے کے لیے اپنے کو آگے کر دیا لیکن اللہ کا نازل کیا ہوا دین صحیح شکل وصورت میں محفوظ رکھنے کے واسطے دشمنان دین کے ساتھ کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ اور مفاہمت نہیں کی۔

یہی بات ہر زمانے کے اہل حق علمائے ربانیین کی خاص پہچان اور نشانی ہے کہ وہ حق کے سامنے گردنیں کٹا دیتے ہیں اور دولتیں لٹا دیتے ہیں مگر اس کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں گھر بار چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھانا، پردیس میں زندگی گزارنا خدا کے دیوانوں کے لیے اپنے اللہ کی محبت میں معمولی بات بن جاتی ہے کیونکہ ان کی نگاہوں کے سامنے سید الاولین والآخرین اللہ کے پیارے اور چہیتے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کا نمونہ ہر وقت رہتا ہے، جس کی بدولت ان کے قلب وجگر کو دین کی راہ میں کتنی ہی تکالیف اٹھانے کے باوجود ٹھنڈک اور راحت ملتی رہتی ہے۔

ایک نیو مسلم کا عبرت آموز واقعہ

چنانچہ اس پر احقر کو ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک نیا مسلمان عیسائیوں کی کرسمس (Christmas) کے موقع پر اسلامی اخلاق پر عمل کرتے ہوئے اپنے والدین سے حسن سلوک کے طور پر ملنے کے لیے گیا مگر ان والدین کو اس کے اوپر اس قدر غصہ تھا اور وہ اتنے خفا اور ناراض تھے کہ اس کے پہنچنے کے بعد اس کو مارنے پیٹنے کی کوشش کی اور یہ نہ ہوسکا تو جو پتھر وغیرہ وہاں پڑے ہوئے تھے ان کو اٹھا کر اس کے اوپر پھینکنے شروع کیے، جس کے نتیجے میں وہ بڑی

مایوسی اور اداسی کے عالم میں وہاں سے واپس ہو گیا لیکن دل دل میں بہت ہی خوش تھا اور اسکی خوشی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس نے واپس ہونے کے بعد سیدھا مصلّے پر جا کر اللہ تعالیٰ کے شکر کی ادائیگی کے لئے دو رکعت نماز پڑھی اور دوستوں سے کہا کہ آج میری خوشی کا بہت بڑا دن ہے کہ جس طرح میرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر طائف کی گلیوں میں وہاں کے لوگوں کی طرف سے پتھر اور کنکریاں پھینکی گئی تھیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب اور پیارے نبی تھے تو میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ میری کون سی ایسی ادا تھی جو اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ میرے ساتھ بھی آج وہی معاملہ ہو گیا جو میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا تھا۔

میرے دوستو! اس واقعہ میں ہم سب کے لیے بہت بڑی عبرت اور نصیحت ہے کہ جب دین پر چلنے کے معاملے میں اور سنتوں کی اتباع کی پابندی کے نتیجے میں اپنے اور غیروں کی طرف سے کچھ باتیں سننے کو ملیں یا کچھ مشکلات کا سامنا ہو اور اس راہ میں کچھ رنج و غم آئیں اور تکالیف اٹھانی پڑیں، کچھ دنیا کے راحت و آرام کی چیزوں سے ہمیں دست بردار ہونا پڑے کہیں سے گالیاں دی جا رہی ہوں کسی کی طرف سے تہمتوں کا بازار گرم ہو تو کسی طرف بدگمانیوں اور بدظنی کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو اور کوئی پاگل اور دیوانہ کہے تو کوئی دقیانوس اور قدامت پسند کہے، اسی طرح کوئی خاندان میں توڑ پیدا کرنے کا الزام لگائے اور کوئی شدت پسندی اور تنگ نظری کا بہتان باندھے اور ہم سے یہ تقاضہ کرے کہ ہم پورا دین چھوڑ کر کچھ معاملات میں دین کو لے لیں اور کچھ معاملات میں اہل زمانہ کے ساتھ صلح کر کے انہیں خوش کرتے ہوئے چلیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی ہی صورت حال کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ ایک زمانے میں دین پر چلنا اتنا مشکل ہو جائے گا جتنا کہ چنگاری کو ہاتھ میں لینا، اس طرح کے الفاظ روایت میں وارد ہوئے ہیں:

﴿عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ وَّرَآئِكُمْ أَيَّامَ الصَّبْرِ الصَّبْرُ فِيْهِنَّ كَقَبْضٍ عَلَى الْجَمْرِ لِلْعَامِلِ فِيْهَا أَجْرُ خَمْسِيْنَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ خَمْسِيْنَ مِنْهُمْ أَوْ خَمْسِيْنَ مِنَّا قَالَ خَمْسُوْنَ مِنْكُمْ وَهٰذَا الْحَدِيْثُ لَا نَعْلَمُهُ يُرْوٰى عَنْ عَبْدِ اللهِ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ﴾

(مسند البزار، کتاب المجلد الأول، باب مسند عبد الله بن مسعود)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک تمہارے بعد کچھ صبر کے ایام آنے والے ہیں جن میں دین پر صبر اور جمار ہنا ایسا ہو جائے گا جیسے آگ کی چنگاری کو ہاتھ میں لینا اور اُن ایامِ صبر میں دین پر جمنے اور قائم رہنے والے کے لیے پچاس آدمیوں کے برابر اجر و ثواب ہوگا۔ صحابہ کرام نے پوچھا: یا رسول اللہ! پچاس اُن میں سے یا پچاس ہم میں سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پچاس تم میں سے۔

صاحبو! اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس حدیث سے ان ناموافق حالاتِ زمانہ اور فتنوں کے دور میں دین پر

عمل کرنے کی اتنی عظیم الشان فضیلت معلوم ہورہی ہے کہ اُس کے بعد مزید اور کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہوتو محض یہی ایک فضیلت اس دور میں ہمیں دین پر جمنے اور ثابت قدم رہنے کے لیے کافی ووافی ہے۔ کیونکہ اس حدیث شریف سے یہ بات ثابت ہوئی کہ پچاس صحابہ کے برابر اُس شخص کو اجر ملے گا جو ان ناگوار حالات میں مکمل دین پر جما رہے، خواہ کتنی ہی مخالفتیں اور عداوتیں سامنے آئیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دور کا کوئی آدمی کسی صحابی سے بھی فضیلت میں بڑھ سکتا ہے کیونکہ جزوی فضیلت سے کلی فضیلت لازم نہیں آتی۔ لہٰذا صحابی کو شرفِ صحبت کی وجہ سے جو فضیلت اور برتری حاصل ہے پوری اُمت کا اتفاقی مسئلہ ہے کہ بعد میں آنے والے کسی بھی شخص کو وہ مقام اور درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

تو ایسی صورت حال میں ہمیں نہ تو گھبرانا چاہیے نہ اہل دنیا کی ان باتوں سے پریشان اور مایوس اور رنجیدہ ہونا چاہیے بلکہ، بقول حضرت والا ؎

غیر کی مجھ کو نہ پرواہ چاہیے

اپنے آپ کو پورا پورا اس کا مصداق بنادے تو ان شاء اللہ عنقریب یہ ظلمات کے بادل چھٹتے ہوئے نظر آئیں گے اور رات کی تاریکی سے صبح روشن اور عیاں ہوتی نظر آئے گی اور بہت جلد ایسا نظر آنے لگے گا جیسے پانی کو بہت سے جھاگ نے گھیرا ہو اور جلد ہی ہٹ جانے کے بعد پانی نظر آنے لگتا ہے تو حق کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس کے خلاف باتیں کرنے والے اور ملامتیں کرنے والے مٹ کر رہ جاتے ہیں اور حق، اہل حق آفتاب ومہتاب کی طرح چمکتے ہوئے ایک خلق کثیر کو اپنے ایمان کی روشنی اور حق کی تابانی سے منور وروشن کیے رہتے ہیں۔ ہماری اسلام کی تاریخ ایسی داستانوں سے بھری پڑی ہوئی ہے۔

میں تو قرآن وحدیث کی روشنی میں یہاں تک کہتا ہوں کہ جب کامل دین کی اتباع کے نتیجے میں اور ہر معاملے میں سنت پر چلنے کی پابندی کرنے سے اس طرح کے جملے سننے کو ملیں تو یہ سمجھ لے کہ یہ جملے میرے متعلق بولے جانا اس بات کی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے کمال ایمان کا اور مرتے دم تک رشد وہدایت پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا جاچکا۔ کیونکہ روایت میں آیا ہے جس کو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ نے بھی فضائل اعمال میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا ذکر کرو کہ لوگ مجنوں اور دیوانہ کہنے لگیں۔ تو معلوم ہوا کہ لوگوں کی طرف سے یہ جملہ اللہ کے پیاروں اور محبوبین اور ذاکرین کو نصیب ہوتا ہے تو یہ غم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں یہ جملہ (وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ) ان حضرات کی صفات بیان کرتے ہوئے ذکر کیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ مرتدین یعنی دین سے پھر جانے والوں کے مقابلے میں لائے ہیں جس میں اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں لوگوں کی ملامتوں سے نہیں ڈرتے وہ ارتداد سے محفوظ

رہیں گے، گویا انہیں مرتے دم تک دین پر استقامت نصیب رہے گی جو درحقیقت مومن کے لیے سب سے عظیم الشان نعمت ہے اور ہر مسلمان کی دلی تمنا اور تمام اولیاء اللہ کی عمر بھر کی دعا ہے۔

آج کل عام طور پر ہمارے جوانوں کا وہ طبقہ جو دعوت وتبلیغ یا کسی اللہ والے کی صحبت کی برکت سے دین میں کامیابی کا سو فیصد کا یقین رکھنے کی وجہ سے یہی تمنا رکھتا ہے کہ سو فیصد دین پر عمل کیا جائے اور نبی کی کوئی سنت چھوٹنے نہ پائے جس کی وجہ سے اسے روزمرہ کی زندگی میں گھر والوں کی طرف سے اور خوشی کی تقریبات اور غمی کے مواقع پر غیر شرعی کاموں سے بچنے کے لیے بڑے مجاہدے اور قربانیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہیں والدین کی طرف سے مجبور کیا جارہا ہے تو کہیں رشتہ داروں کی طرف سے کچھ سنتوں اور دین کو چھوڑنے کی نصیحت کی جارہی ہے جس کا تذکرہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ بیٹھو گے۔ تو صحابہ کرام نے حیرت سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! کیا ایسا ہوگا؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہوگا اور اُس سے بھی سخت ہوگا۔ جیسا کہ پورا مضمون حدیث شریف میں یوں مذکور ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَیْفَ بِکُمْ اِذَا طَغَا نِسَآؤُکُمْ وَفَسَقَ شَبَابُکُمْ وَتَرَکْتُمْ جِھَادَکُمْ قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَائِنٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ نَعَمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ وَاَشَدُّ مِنْہُ قَالُوْا وَمَا اَشَدُّ مِنْہُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا لَمْ تَاْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ قَالُوْا اَوَکَائِنٌ ذٰلِکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ نَعَمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ وَاَشَدُّ مِنْہُ سَیَکُوْنُ قَالُوْا وَمَا اَشَدُّ مِنْہُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَّرَاَیْتُمُ الْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا قَالُوْا اَوَکَائِنٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ مِنْہُ سَیَکُوْنُ یَقُوْلُ اللّٰہُ بِیْ حَلَفْتُ لَاُتِیْحَنَّ لَھُمْ فِتْنَةً یَصِیْرُ الْحَلِیْمُ فِیْھَا حَیْرَانَ﴾

(کنز العمال)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا اُس وقت جب تمہاری عورتیں سرکش اور نافرمان ہوجائیں گے اور تمہارے جوان فسق وفجور میں مبتلا ہوں گے اور تم جہاد کو چھوڑ بیٹھو گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کیا واقعی ایسا ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا قسم اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ بالکل ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا کہ اُس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ کیا حال ہوگا تمہارا جب تم بھلائی کا حکم نہیں دو گے اور بُرائی سے نہیں روکو گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہوگا؟ فرمایا جی ہاں! اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ تم بُرائی کو بھلائی سمجھنے لگو گے اور بھلائی کو بُرائی سمجھنے لگو گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کیا واقعی ایسا ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ بالکل ایسا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

مجھ کو میری قسم کہ میں اُن پر ایسا فتنہ ڈالوں گا کہ اُس فتنے میں حلیم و برد بار بھی حیران ہو کر رہ جائے گا۔

یہ وہ حالات ہیں جن کا آج ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں اور یہ حدیث شریف پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج کے زمانے میں دنیا میں تشریف فرما ہوں اور بیٹھ کر کے ساری روئے زمین پر ہونے والے حالات وواقعات کو آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہوں اور پھر بیان فرماتے جارہے ہوں۔

یہی وجہ ہے ہمارا یہ ایمان ہے کہ اس مشاہدۂ حالات سے بھی زیادہ بڑھ کر صداقت وسچائی پر مبنی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ علوم ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی عطا فرمائے ہیں۔ اب جو اُن کو نہ مانیں یا اُن میں شک کرے یا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ اور تجربہ کر کے ماننے کی تمنا رکھتا ہو تو حقیقت میں یہ ایمان ویقین والا نہیں کہلاتا۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بات آتے ہی اپنی ہر خواہش اور تمنا اور جذبے پر بریک (Break) لگادے۔ اور سورج کی روشنی سے زیادہ سچائی پر مبنی حضور کی بات تسلیم کرتے ہوئے اُس پر عمل کرے۔

چنانچہ آج کے حالات بالکل ہمارے سامنے ہیں کہ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ داڑھی کٹانے اور ٹخنوں سے نیچے پاجامہ رکھنے کا حکم دے رہے ہیں اور اپنی تصویریں کھنچوانے اور بے پردگی اختیار کرنے کی ترغیبیں دی جارہی ہیں۔

اس لیے میں اپنے ایسے پیارے نوجوان مسلمان بھائیوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ خدارا دنیا اور اس کی خوشیاں چند روزہ ہیں، دنیا اور اس کی عزتیں خیالی اور فانی ہیں اور آخرت کی زندگی دائمی زندگی ہے وہاں کی عزتیں اور خوشیاں ہمیشہ کے لیے ہیں پس خود سوچ کر عقلمندانہ فیصلہ کیجئے اور اگر سب کچھ بھی قربان کر دینا پڑے تو قربان کر دیجئے مگر میرے نبی کے طریقہ کو بال برابر چھوڑ دینا بھی گوارا نہ کیجئے۔ یہی اصل کامیابی اور عزت کا راستہ ہے اور اسی میں سرخروئی اور نجات ہے اور ظلم و جفا اور طعن وتشنیع اور ایذاءِ خلق کی ان راہوں سے گزر کر جب انسان موت کے وقت اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو وہ زبانِ حال سے اپنی کامیابی اور خوشی ومسرت کا اظہار اس طرح کررہا ہوتا ہے جو کہ تائب صاحب کے بڑے درد بھرے اشعار میں یوں ذکر ہے ۔

پانی پانی نہ ہونگے شرم سے آج
خون میں ہم نہا کے آئے ہیں
طعن و تشنیع ہو کہ خنجر ہو
زخم ہی زخم کھا کے آئے ہیں
ساری مخلوق سے بگاڑ کے ہم

اپنی بگڑی بنا کے آئے ہیں
لوگ روئے بچھڑ کے ہم سے مگر
ہم یہاں مسکرا کے آئے ہیں

(اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ بِاَنِّیْ قَدْ بَلَغْتُ) یا اللہ گواہ رہنا میں نے آپ کی صحیح بات پہنچادی...... یا اللہ گواہ رہنا میں نے آپ کی صحیح بات پہنچادی...... یا اللہ گواہ رہنا میں نے آپ کی صحیح بات پہنچادی۔

میری خالی جھولی میں اپنی رحمت ومحبت کی بھیک ڈال دیجئے

دست بکشا جانب زنبیل ما
میرے سر کو تیرا سودا چاہیے
اخترِ خستہ و دور افتادہ کو
ان کی رحمت کا بلاوا چاہیے

اے اللہ! میں صرف آپ کا طلب گار ہوں آپ میری جھولی کو اپنی رحمت کے خزانوں سے بھر دیجئے لوگوں کی اپنی اپنی دلوں کی چاہتیں ہوتی ہیں اور ہر انسان اپنی چاہت کے مطابق اپنے لمحات حیات کا سودا کرتا ہے کوئی دنیا کے آب وگل کے عوض اپنی تمام صلاحیتوں کو برباد کر کے چلا جاتا ہے اور کوئی اپنے ہر عمل سے اللہ تعالیٰ کو ڈھونڈتا ہے اور خود اس سے اسی کا سوال کرتا ہے اور یوں کہتا رہتا ہے کہ اے اللہ! میں ایک ناکارہ انسان ہوں اور کوتاہی اور غفلتوں کے طوفان میں غرق ہوں آپ کی رحمت کا سہارا ہی مجھے کسی قابل بنا سکتا ہے اور مجھ سے بحرِ عصیان میں ڈوبے ہوئے کو بچا سکتا ہے آپ ہی سے بھیک مانگتا ہوں کہ آپ مجھ جیسے دور افتادہ کو اپنے سے نزدیک کر لیجئے اور مجھے اپنا بنا لیجئے ۔

ذوقِ طلب بھی مختلف دہر میں دیکھتا رہا
اخترِ بے قرار نے تیرا سوال کر دیا

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور شعر ہے ۔

کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

گریۂ بے کار

بعض فانی ومردہ لاشوں پر میر کو پڑھتے فاتحہ دیکھا
اور ان اشک ہائے الفت کے ضائع ہونے کا سانحہ دیکھا

نعرۂ مستانہ مارا چاہیے

زندگی کو یوں گذارا چاہیے نعرۂ مستانہ مارا چاہیے
آہ و نالوں کا سہارا چاہیے اور کوئی غم کا مارا چاہیے
فرطِ غم سے جس کے دن کٹتے نہ ہوں مجھ کو ایسا ماہ پارا چاہیے
ہر نفس پیتا ہو خونِ آرزو ایسا دیوانہ خدارا چاہیے
قتل کرتی ہو جسے شمشیرِ عشق ہاں شہید زندہ ایسا چاہیے
اب تو تنہائی سے گھبراتا ہے دل کوئی عشرت غم کا مارا چاہیے
غم کے دو مارے کہاں نالہ کریں کوئی دریا کا کنارہ چاہیے
گلستاں ہو یا بیاباں ہو مگر تیرے ہی غم کا سہارا چاہیے
حسرتوں سے بھاگتی ہے کائنات میری حسرت کو پکارا چاہیے
سارا عالَم روکشِ عشرت ہوا میری حسرت کا نظارہ چاہیے
زندگی جو زندگی سے دُور ہو دل میں اس کے تیر مارا چاہیے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ نعرۂ مستانہ: اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست ہوکر نعرہ لگانا۔ **آہ و نالوں:** اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے رونا۔ **غم کا مارا:** اللہ والا جو اپنے دل پر غم اٹھا کر گناہ سے بچتا ہو۔ **فرطِ غم:** اللہ تعالیٰ کے راستے کے غم۔ **نَفَس:** سانس۔ **خُدارا:** خدا کے لیے۔ **شمشیر:** تلوار۔ **شہیدِ زندہ:** اپنی حرام خواہشات کا ہر وقت خون کرنے والے زندہ ہوتے ہوئے بھی شہید ہوتے ہیں۔ **عشرت:** حضرت میر صاحب دامت برکاتہم۔ **نالہ:** رونا۔ **حسرتوں:** اللہ تعالیٰ کے راستے میں حرام لذتوں کو خاک میں ملانا۔ **رُوکشِ عشرت ہونا:** گناہوں کو چھوڑ دینا۔

میری زندگی کے لیے نعرۂ مستانہ اور غم کا مارا چاہیے

زندگی کو یوں گذارا چاہیے
نعرۂ مستانہ مارا چاہیے
آہ و نالوں کا سہارا چاہیے
اور کوئی غم کا مارا چاہیے

اس وقت تک انسان خوش نہیں رہ سکتا ہے جب تک کہ دیوانہ وار اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کرتا ہو اگر دنیا کی محبت میں عاشق کو ذکرِ محبوب یا لقائے محبوب کے بغیر بظاہر سکون و تسلی ملتی نظر نہیں آتی تو آخر اللہ تعالیٰ کے دیوانے اور مستانے کو اسے یاد کرنے میں جو مزہ آئے گا اور زندگی میں جو بہار محسوس ہوگی تو اسے یہ کہنا پڑے گا کہ زندگی اگر

گزرے تو یوں گزرے ورنہ اس کے بغیر جینا کوئی جینا نہیں ہے کہ زبان پر اللہ کی محبت کے اور اس کے ذکر کے نعرے ہوں اور دل سے آہیں نکل رہی ہوں اور آنکھیں اشک بار ہوں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کو حضرت والا اپنے ان الفاظ سے تعبیر فرمارہے ہیں کہ زندگی ایسی گزرنی چاہیے کہ بس اپنے مولیٰ کی یادیں ہوں اور اسی میں ہم مست رہیں اور ساتھ میں کوئی اللہ تعالیٰ کا ایسا سچا عاشق بھی مل جائے جو اللہ تعالیٰ کے راستے کے غم اٹھائے ہوئے ہو اور اس کے رگ و ریشے میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیوست ہو اور اس کے خون کا قطرہ قطرہ اللہ اللہ پکارتا ہو جس کو دوسرے لفظوں میں حضرت والا یوں تعبیر کرتے ہیں کہ میرے ہر بُنِ مو سے اللہ اللہ نکل رہا ہو تو ایسے اللہ کے دیوانے کے ساتھ یہ سفر آسان ہی نہیں بلکہ لذیذ ہو جاتا ہے اور راستے کے مشکل سے مشکل اور کٹھن مراحل سے بڑی خوبی کے ساتھ گزرنا میسر آتا ہے۔ جیسا کہ حضرت والا کا شعر ہے ؎

زندگی میری ہے تیرا ذکر و لقاء
اور میری موت ہے تجھ سے ہوں میں جدا

اور خواجہ صاحب کا شعر ہے ؎

تمنا ہے کہ اب ایسی جگہ کوئی کہیں ہوتی
اکیلے بیٹھے رہتے یاد ان کی دل نشیں ہوتی

حالاتِ جہاں کا ستایا ہوا ماہ پارا

فرطِ غم سے جس کے دن کٹتے نہ ہوں
مجھ کو ایسا ماہ پارا چاہیے
ہر نفس پیتا ہو خونِ آرزو
ایسا دیوانہ خدا را چاہیے

یعنی حضرت والا اپنے ایک ساتھی کو تلاش کررہے ہیں کہ جس کے قلب میں دنیا کے ہموم وغموم سے اور مختلف افکارِ جہاں کی وجہ سے دنیا سے بیزاری اور دوری پیدا ہو چکی ہو اور اس کا اب دنیا کے نقشوں میں دن نہ لگتا ہو بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم اُٹھائے ہوئے ہو اور نسبت مع اللہ کی دولت رکھتا ہو۔ ہر قدم پر گناہوں اور نافرمانیوں سے بچنے کا غم اُٹھاتا ہو اور خدا کا ایسا عاشق اور دیوانہ جس کو سوائے اس غم کے دوسرے تمام غموں سے نجات اور رہائی مل چکی ہو۔

صاحبو! بسا اوقات ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے دنیا کے حالات کا ستایا ہوا اور دنیوی معاملات کے سلسلے میں مختلف لائنوں میں مار کھایا ہوا کہ جدھر کو چلتا تھا اُدھر سے ناکامی کا سامنا ہوتا تھا جس کے نتیجے میں اُس کے دل میں ایک طرح کی اُداسی اور غم کا سماں چھایا رہتا تھا۔ بالآخر شدہ شدہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُس کو کسی

اللہ والے کے در پر لے آئی اور اب دنیا کے راستے کی ناکامیاں اُس کو اپنی کامیابیاں دکھائی دینے لگیں اور جن غموں نے اُسے گھیر رکھا تھا اور وہ جس مایوسی اور اُداسی کے عالم میں رہتا تھا آج انہی غموں کی بدولت کسی صاحبِ دردِ دل اللہ والے سے ملنے کی بدولت اُس کو اپنے مولا کے عشق والا راستہ طے کرنا بالکل آسان اور سہل ہوگیا۔ کل تک اُس کے دن کٹتے نہیں تھے لیکن آج اُس کو ہر قدم پر منزل نظر آرہی ہے، کیونکہ مؤمن کی کامیابی یہی ہے کہ وہ ہر سانس اپنی حرام آرزؤں کا خون پی رہا ہو اور اللہ پر فدا ہو رہا ہو ایسا ہی شخص خدا کا دیوانہ اور مستانہ کہلاتا ہے اور یہی حضرت والا کی اس شعر میں مراد ہے۔

حضرت والا کی تمنا حضرت میر صاحب کی صورت میں پوری ہوئی

اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو تمنا حضرت والا نے کی تھی وہ پوری پوری حضرت والا کو عطا ہوئی کہ ہر زمانے میں بچپن سے لے کر آج تک حضرت والا کا ساتھ ایسے اللہ کے دیوانوں کے ساتھ ہوا جو اپنے اپنے دور کے بڑے کامل مصلحین اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور پھر اُس کے بعد خود حضرت والا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت میر صاحب دامت برکاتہم کو جوڑ دیا۔ جن کا پس منظر خود ان کی زبانی بیان کیا ہوا یہ ہے کہ میں حالاتِ زمانہ سے اتنا تنگ آچکا تھا کہ مجھے احساسِ کمتری نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا لیکن جب حضرت والا کے قریب آیا اور مجھے حضرت نے تسلی دی اور حضرت والا کے اکلوتے صاحبزادے حضرت مولانا مظہر صاحب دامت برکاتہم سے میرے متعلق یہ بات فرمائی کہ میں نے تمہیں ایک دوسرا بھائی دے دیا ہے۔ اس کے تمام معاملات مثل بھائی کے رہیں گے اور حضرت میر صاحب نے فرمایا کہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے ایک نئی زندگی حاصل ہوئی۔ اور تمام احساسِ کمتری یکدم دور ہوتا نظر آیا۔ جب میرے متعلقین کو پتہ چلا تو بعض دوستوں نے اعتراضاً مجھ سے کہا کہ تم کن سے جا کے وابستہ ہوئے ہو اور کدھر اپنا اصلاحی تعلق قائم کیا ہے۔ جبکہ اور بہت سے مشہور علماء اور مشائخ موجود ہیں لیکن مجھے حضرت سے اتنی زیادہ گہری مناسبت ہوگئی کہ میں حضرت کے سوا اپنی نظروں میں اپنے لیے کسی کو مصلح اور نافع نہیں سمجھتا تھا۔ جب لوگوں نے زیادہ اعتراض کیا تو میں نے اپنے ان دوستوں کو اس شعر میں اپنے دل کی کہانی سنائی ؎

مجھ کو ترکِ عشق کا دینے چلے ہو مشورہ
اے میرے چارہ گرو تم نے اُنہیں دیکھا بھی ہے
وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
اِک نظر تم میرا محبوبِ نظر دیکھ تو لو

بالآخر انہوں نے مجھ پر اعتراض کرنا بند کر دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ مجھے شروع ہی سے حضرت والا کے مزاج سے مناسبت ہوئی جس کا نفع پوری زندگی اُٹھا رہا ہوں۔ اور یہی اس راستے کی اصل جڑ اور بنیاد ہے۔

شمشیرِ عشق کا مقتول بھی شہید ہے

قتل کرتی ہو جسے شمشیرِ عشق
ہاں شہید زندہ ایسا چاہیے

جس طرح شہید کا اطلاق اُس شخص پر ہوتا ہے جو دُشمنوں سے لڑتا ہوا اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے راہِ خدا میں جامِ شہادت نوش کر لیتا ہے اور اپنے اللہ سے جا ملتا ہے۔ اسی طرح شہید کا اطلاق بہت سارے دوسرے معنی پر بھی ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے کہ جو زندہ ہوتے ہوئے شہید ہو۔ یعنی اُس نے اللہ کے راستے میں اس قدر غم اور تکالیف اُٹھائی ہوں جو عام طور پر انسان کو موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں اور جن سے گزرنے کے بعد زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔ نیز جس طرح اللہ کے راستے میں کٹنے میں مؤمن آدمی کو تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں اس شخص نے بھی خدا کے احکام پر جمنے اور نافرمانی سے بچنے میں اسی طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں اُٹھائیں تو ایسا آدمی ''شمشیرِ عشق'' کا شہید کہلاتا ہے۔ جیسا کہ محدثین نے بعض ایسے حضرات صحابہ کے بارے میں حضور کی زبانی استعمال کیے گئے لفظِ شہید کی توجیہ کی ہے، کیونکہ وہ صحابہ زندہ رہتے ہوئے شہید کہلائے۔ وجہ یہی تھی کہ مثل شہید کے انہوں نے راہِ خداوندی کے غم و تکالیف اُٹھائی تھیں۔ جیسا کہ شہید کی بیالیس اقسام کو ماقبل میں بحوالہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احکامِ میت'' میں ذکر کیا گیا ہے اور جیسا کہ حدیث شریف میں اس طرح کے اطلاقات مذکور ہیں روایت میں آیا ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَوْتُ غُرْبَۃٍ شَہَادَۃٌ﴾

(سنن ابن ماجه، كتاب ماجاء في الجنائز، باب ماجاء فيمن مات غريبا)

یعنی اگر کوئی شخص سفر میں انتقال کر جائے تو اس کو حکماً شہید کہا جاتا ہے۔ اس لیے پردیس کی موت شہادت کا حکم رکھتی ہے۔ اور اس کے ضمن میں شراح لکھتے ہیں کہ کبھی یہ غربت جسمانی ہوتی ہے اور کبھی یہ قلبی و روحانی ہوتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں اس طرح سے زندگی گزارے کہ سارے ماسواء اللہ کو دل سے باہر رکھے اور دل میں صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو جس کو درحقیقت موتِ ارادی کہتے ہیں جو اللہ والوں کو دنیا میں جیتے ہوئے بھی حاصل رہتی ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ کے حاشیہ میں ہے وَهُوَ يَحْصُلُ بِتَحْصِيْلِ الْمَوْتِ الْإِرَادِيْ وَ تَرْكِ التَّعَلُّقِ بِمَا سِوَى اللهِ (المشکوٰۃ: ۱۳۹)

اب کوئی کہے کہ شہید بھی ہو اور زندہ بھی ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کے متعلق فرمایا کہ کسی کو چلتا پھرتا جنتی دیکھنا ہو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ انسان زندہ بھی ہے اور شہید بھی جس کی صورت یہی ہے کہ وہ اپنی ناجائز خواہشات کو راہِ خداوندی میں

قربان کرنے کی وجہ سے حکماً شہید ہے۔ جیسا ہجرت کا ایک معنیٰ تو ترکِ وطن ہے لیکن دوسرا معنیٰ حدیث پاک کے ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون)

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں کو چھوڑ دے اور منکرات ومحرمات سے دور رہے تو وہ بھی اللہ کی نگاہ میں مہاجر ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں حرام محبتوں سے باز رہنے والے کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے:

﴿مَنْ عَشِقَ وَكَتَمَ وَعَفَّ ثُمَّ مَاتَ فَهُوَ شَهِيْدٌ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض)

جس کو کسی لڑکی یا لڑکے سے عشق ہوگیا اور پھر اُسے دل میں چھپایا۔ اپنے معشوق ومعشوقہ کو اُس کے متعلق کوئی خبر نہیں کی اور مکمل پاک دامن رہا اور گناہ کے تقاضوں پر عمل نہیں کیا بلکہ پورے طور پر برداشت کرتا رہا یہاں تک کہ دل پر اتنا غم اور صدمہ ہوا کہ اُس کی موت واقع ہوگئی تو اس کو شہید کہا جائے گا۔ اس لیے ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے شہید کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ شہید تو صرف وہی ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے اُس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر تو میری اُمت کے شہید بہت کم ہوں گے۔

یہاں تک کہ روایات سے پتہ چلتا ہے جو دل سے شہادت کی دعا کرتا ہو اور پھر اُسے اس کے بستر پر موت آئے تو وہ بھی اللہ کی بارگاہ میں حکماً شہید کہلاتا ہے یا پیٹ میں دست یا اسہال (پیچش) کی شکایت ہو اُس کے نتیجہ میں موت واقع ہوجائے، جیسا کہ سیرتِ اشرف میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت کے ایک مجاز بیعت نے جن کو خوابوں سے خاص مناسبت تھی اور نصف شب کے وقت حضرت کو خواب میں دیکھا حضرت نے فرمایا کہ ''مجھے مردہ نہ سمجھو، میں زندہ ہوں، جس طرح میری حیات میں مجھ سے فیض لیتے تھے فیض لیتے رہنا فیض ہوتا رہے گا اور مجھے مقام شہداء نصیب ہوا ہے، کہہ دیا جائے'' خواب کے آٹھویں روز صبح صادق کے قریب انہیں پھر ایسا خواب آیا جس میں تاکید کی گئی کہ یہ خبر چھوٹی پیرانی صاحبہ کو پہنچا دو۔ چنانچہ انہوں نے صبح پرچہ لکھ کر حضرت مخدومہ محترمہ چھوٹی بیگم صاحبہ کی خدمت میں دونوں خواب پہنچا دیئے۔ ایک تو یہ کہ حضرت کی وفات مرضِ اسہال سے ہوئی تھی اور دوسرے فتنوں کے زمانہ میں سنت کو زندہ کرنے والے کے لیے مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی بشارت دی ہے اور حضرت کی ساری عمر احیائے سنت میں گذری ہے۔ (سیرت اشرف ج:۲،ص ۳۹۵)

تو شہید کی بہت ساری قسمیں ہیں۔

اللہ کا عاشق گروہِ عاشقاں کے ساتھ رہنے کو پسند کرتا ہے

اب تو تنہائی سے گھبراتا ہے دل
کوئی عشرت غم کا مارا چاہیے
غم کے دو مارے کہاں نالہ کریں
کوئی دریا کا کنارہ چاہیے

یعنی اللہ تعالیٰ نے جب مجھے اپنا دردِ محبت عطا فرمایا اور اُس سے میرے سینے کو بھر دیا تو اب میرا تنہائی میں جی نہیں لگتا بلکہ میرا جی یہ چاہتا ہے کہ مجھے کوئی غم کا مارا ملے ایک ہوں، چار ہوں، دس ہوں یا بیس ہوں غرض یہ کہ کوئی ایسی محفلِ دوستاں میسر آئے جہاں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کی باتیں کروں۔ گویا اس شعر میں بھی حضرت والا کسی ایسے صاحبِ نسبت اہلِ دل کی تلاش کی تمنا کا اظہار فرما رہے ہیں کہ جس کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت کی باتیں اور اُس کی یادوں کے جلوؤں کا سماں قائم کیا جائے اور کوئی دریا کا کنارہ اور سمندر کا ساحل اور کہیں پہاڑوں کا کوئی ایسا دامن میسر آئے کہ جہاں دنیا کے تعلقات کم سے کم ہوں اور ہمارے اور اللہ کے بیچ میں سوائے صاف ستھری فضا اور اس آسمان کے اور کچھ نہ ہو۔

یہی ضروری نہیں ہے کہ شروع ہی دن سے آپ کو ساتھ چلنے والے بہت سے رفقاء اور سامعین مل جائیں، بلکہ اس کی تمنا بھی دل میں غیر اللہ کی تمنا کرنا ہے۔ جیسا کہ آج کل بہت سے لوگ ذہن میں یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر اُن کے شیخ نے انہیں اجازت و خلافت عنایت فرما دی تو فوراً ایک لمبا چوڑا مجمع ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور میں ایک ایسا شیخ بن کر اُبھروں کہ میرے ہر طرف چرچے اور شہرتیں ہوں۔ میری تقریر اور خطاب سننے کے لیے بڑے بڑے مجمعے اکٹھے ہوں اور میں درس و تدریس کے لیے جس مدرسے میں بھی میں جاؤں خوب شہرت اور چرچا قائم ہو جس کے بارے میں حضرت گنگوہی نے فرمایا تھا۔

منصبِ تعلیم نوعِ شہوت است

تو بظاہر یہ بھی ایک غیر اللہ ہے کہ انسان دل میں یہ قائم کرلے کہ میں بڑا معلم و مقرر اور داعی و خطیب کی حیثیت سے پہچانا جاؤں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جو جتنے بڑے منصب پر فائز ہوگا اُس کو آخرت کے اعتبار سے اتنی ہی نزاکتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس لیے کسی عالم کی طبیعت میں اپنے مقام و مرتبہ کا خیال یہ اُس کے لیے اتنا مہلک ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی بھوکے بھیڑیے کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے اور وہ ان میں تباہی و بربادی مچائے اُس سے بھی زیادہ عالم کے علم میں تباہی مچانے والی چیز مال کی حرص اور مرتبے کا لالچ ہے جو اس کے

دین میں تباہی و بربادی پیدا کرتا ہے۔

﴿عَنْ ابْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكِ الْاَنْصَارِیِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَا فِیْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ﴾

(سنن الترمذی)

حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو بھوکے بھیڑیئے جن کو بکریوں میں چھوڑ دیا جائے اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ انسان کی حرص جاہ و دولت پر دین کو نقصان پہنچاتی ہے۔

انسان کو عزت اور مال کی لالچ اللہ تعالیٰ سے غافل کردیتی ہے اور جس شخص کا بھی دین تباہ ہوا ہے اگر اس کی تحقیق کی جاوے تو یہی دو سبب نکلیں گے۔ عزازیل کی گمراہی کا سبب عزت کی حرص تھی، حبِ جاہ نے سجدۂ آدم علیہ السلام سے اس کو روک دیا اور شیطان ہوگیا۔ قارون کو اس کے حرصِ مال نے گمراہ کیا۔ ان دونوں بیماریوں کا علاج بزرگانِ دین کی خدمت میں حاضری اور ان سے اپنے حالات کی اطلاع کرکے اُن کے ارشادات اور ہدایات پر کچھ مدت تک عمل کرنا ہے اور جو شخص شریعت کا پابند نہ ہو اور سنت کی اتباع نہ کرتا ہو اس کو بزرگ سمجھنا بھی گمراہی اور گناہ ہے۔ (دنیا کی حقیقت، صفحہ: ۵۰)

اور دوسرے شعر میں حضرت والا نے جس تمنا کا اظہار فرمایا ہے یہ حضرت والا کا بکثرت معمول رہا ہے کہ جہاں بہ آسانی ہوسکتا ہے تو سمندروں اور دریاؤں کے کنارے پر جا کر صبح کے وقت میں اپنے چند احباب کے ساتھ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر فرماتے ہیں اور وہاں ذکر کرنے میں ایک خاص سرور اور کیف حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شہروں میں گناہوں کے اڈّے اور معاصی و نافرمانی کی فضائیں قائم ہوتی ہیں جبکہ صبح سویرے وہ جگہیں بالکل خالی اور صاف شفاف ہوتی ہیں۔ اسی کو حضرت نے فرمایا کہ مجھے اور میرے ساتھ رہنے والے میر صاحب اور دوسرے احباب کو کوئی دریا کا کنارہ چاہیے۔ اس مضمون کے عملی طور پر کراچی میں بہت سے حضرات مشاہدہ کرنے والوں میں سے ہیں کہ حضرت والا صحت کے زمانے میں سمندر کے کنارے جا کر اللہ تعالیٰ کو کس طرح یاد کیا کرتے اور وہاں باقاعدہ ذکر اللہ کی مجالس قائم ہوا کرتی تھیں۔

گلستاں ہو یا بیاباں یادِ یار ہی درکار ہے

گلستاں ہو یا بیاباں ہو مگر
تیرے ہی غم کا سہارا چاہیے

جس آدمی کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے رشکِ گلستان بنادیا ہو تو اُسے ظاہر داری کی ضرورت نہیں رہتی۔ ظاہری چمن اور گلشن اور ایئر کنڈیشنوں کی موجودگی یا عدمِ موجودگی سے اُن کے اندرونِ قلب کا عالَم متغیر نہیں ہوتا

کیونکہ دنیا کے آفتاب و مہتاب ظاہر کو روشن کرتے ہیں اور عالَم کے گلستانوں کی باغ و بہار ظاہری جسم کی حد تک رہتی ہے، مگر اللہ کی یادوں میں رچا بسا ہوا قلب اندرونِ انسان کو معطّر رکھتا ہے۔

اگر ہم غور فرمائیں تو یہ اندازہ ہوگا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی پنی دنیا کے گلستاں کو چمکانے کی کوشش نہ فرمائی اور اصل چیز یعنی محبت و معرفتِ خداوندی کے خزانے سے سینہ پر تھا اور فقر اختیاری کو ترجیح دی اسی لیے اُمت کے اولیاء بھی اسی اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر چلتے ہیں اور یہی بات حضرت والا نے اس شعر میں پیش فرمائی ہے۔

تمہیں عشرت مبارک ہو میرا مطلوب حسرت ہے

حسرتوں سے بھاگتی ہے کائنات
میری حسرت کو پکارا چاہیے
سارا عالَم روکش عشرت ہوا
میری حسرت کا نظارہ چاہیے

احقر حضرت والا کی برکت سے اس کی تشریح پیش کرتا ہے اور یہ ایک ایسا مضمون ہے کہ جو میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار سنا ہے کہ جو شخص دل میں اللہ کی محبت رکھتا ہو تو اُسے ایسی بہار میسر آتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کو وَجد میں آ جائے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کے لیے غم اُٹھاتا ہے وہ چاہے حسیناؤں سے بچنے کا غم ہو یا اپنے گھر کے اندر کے مسائل کا غم ہو بیوی سے، بھائیوں سے، والدین سے، اپنے ماتحتوں سے یا ملازموں سے یا اِدھر اُدھر سے ناموافق طبع باتیں پیش آنے پر ان پر صبر کرنا اور اللہ کے لیے ان کو برداشت کر کے دل پر غم اٹھانا ہو اور ان مسائل میں گر کر پھر جو اُسے حسرت اور دُکھ پہنچتا ہو مگر وہ اُس پر اس لیے صبر کرتا ہے کہ اُسے یہ پتہ ہے کہ میرے نبی کا طریقہ یہ ہے کہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دو۔ اور اپنے دل دل میں اللہ کو پکارتا رہتا ہے کہ اے میرے اللہ! تو مجھے دیکھ رہا ہے یہ جو کچھ ہو رہا ہے تو دیکھ رہا ہے کہ حق پر کون ہے۔ تجھے پتہ ہے کہ یہ لوگ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں لیکن میں قطعاً اور قطعاً ان کا بدلہ لینے والا نہیں ہوں، کیونکہ جو کچھ بھی ہوگا تو مجھے اس کا بدلہ ضرور عطا کرے گا۔ وہ یقیناً بہتر ہی ہوگا۔

تو دوستو! اللہ تعالیٰ ایسے انسان کے قلب کی تعمیر اپنے خزانۂ معرفت سے کرتا ہے۔ حضرت کا جو مضمون ہے وہ میں آپ کو سناتا ہوں جب یہ دل ٹوٹتا ہے۔ اِدھر سے بھائی کا ستایا ہوا، اُدھر سے بیوی کا ستایا ہوا، اُدھر سے دوسرے رشتے داروں کا، اِدھر سے اُدھر سے بہت باتیں اور بہت سے حقوق، بہت تلخ باتیں اور بڑے مسائل اب اس کا دل ٹوٹا ہے لیکن یہ کہتا ہے کہ میرے نبی کا اُسوہ ہے۔ چند دن کی بات ہے، یہ کڑوے گھونٹ پی لوں گا، برداشت کرلوں گا لیکن نہ کوئی جواب دیتا نہ غصے سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتا ہے، نہ تلخ اور کڑوے انداز سے پیش آتا

ہے، کیونکہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ یہ نہیں ہے۔ اس کا یہ دل ہے جو اللہ کے لیے ٹوٹا ہوا ہے۔ اللہ کی محبت میں غم اُٹھا کر چکنا چور ہوا ہے۔ بارگاہِ خداوندی میں بڑا قیمتی ہے۔

اور ایک مثال سے حضرت اس کو سمجھاتے ہیں کہ کہیں زلزلہ آتا ہے اور مکانات گرتے ہیں اور دیواریں ہیں سب ٹوٹ پھوٹ کے خراب ہوتی ہیں۔ حکومتِ وقت اعلان کرتی ہے کہ شاہی خزانے سے اس علاقے کو اس خطے کو تعمیر کیا جائے گا۔ اب جو ہم نے وہ ٹوٹا ہوا دل اللہ کے سامنے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں اے میرے بندے! تو نے میرے لیے دل توڑا ہے۔ میں اپنی خصوصی عنایات اور خصوصی تجلیات سے اس دل کو تعمیر کروں گا اور دوستو! جو خدا کا تعمیر کیا ہوا دل ہو جہاں اس کی تجلیات ہوں۔ اللہ اکبر! اس کا کیا عالم ہوگا، اس لیے دنیا کے مسائل و حالات سے دل جتنا بھی ٹوٹے سمجھ لیں کہ جب تم حق پر ہو۔ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس ٹوٹے ہوئے دل کی تعمیر پھر اللہ کریں گے۔ سبحان اللہ کیا عجیب وغریب مضمون ہے! حضرت والا کے یہاں پوری زندگی میں اس طرح سے پہلی بار سنا ہے۔ الفاظ کی تعبیر ہے شاہی خزانے سے اور شاہی انداز سے جیسے وہ عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں وہ احکم الحاکمین اور بادشاہ اور سارے بادشاہوں کا بادشاہ اپنی خصوصی تجلیات سے خصوصی رحمتوں اور نوازشات سے اس دل کو پھر مزین کرتا اور بچاتا ہے اور میں اس پر عرض کرتا چلوں کہ جتنے اولیاء اللہ ہوئے ہیں کسی کی بھی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں حاسدین نے سب کو ستایا اور جب ان کے دل ٹوٹتے تھے تو پھر ان کی زندگی دیکھیں کہ بادشاہوں جیسی گزری ہے۔ کیا دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے دل کو حق تعالیٰ نے اور بادشاہوں کے بادشاہ نے بنایا اور تعمیر کیا تھا۔ اس لیے آپ جتنے اولیاء اللہ کو دیکھیں سب کے حالات میں ہے۔ کس طرح ستایا گیا۔ ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم کی خود ابتدائی زندگی کے جو حالات ہیں۔ میر صاحب سے آپ سنیں، پڑھیں، دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ابتدائی زندگی میں حضرت کو کس طرح سے ستایا گیا۔

میرے دوستو! پھر جو ٹوٹا ہوا دل، چورا چورا دل، اللہ کے سامنے انسان پیش کرتا ہے اور پھر آہیں نکلتی اور آنسو نکلتے ہیں لیکن کہتا کچھ نہیں۔ میرے نبی کا اُسوہ ہے قطعاً نہیں چھوڑوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ تو دنیا میں اس کے دل کی تعمیر ہوگی دوستو! یاد رکھنا کہ دنیا کی ساری عزتیں سب یہی رکھی رہ جائیں گی، لیکن یہ اللہ کی محبت سے بھرا دل یہ انسان ساتھ لے جائے گا۔ اور ایسے ہی لوگوں کو جنت میں دخول حاصل ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ۝ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۝ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝﴾

(سورۃ ق، آیات: ۳۲-۳۳-۳۴)

ترجمہ: یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے (بایں عنوان) وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لیے ہے جو (خدا کی طرف دل سے) رجوع ہونے والا (اور رجوع ہو کر اعمال وطاعات کی) پابندی کرنے والا ہو۔ (غرض یہ کہ) جو خدا سے

بے دیکھے ڈرتا ہو اور (اللہ کے پاس) رجوع ہونے والا دل لے کر آوے گا (ان کو حکم ہوگا کہ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ دن ہے ہمیشہ رہنے (کے لیے حکم ہونے) کا۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۱۴۶)

ابوبکر وراق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قلب منیب کی علامت یہ ہے کہ وہ حق جل شانہ کے ادب کو ہر وقت مستحضر رکھے اور اُس کے سامنے تواضع اور عاجزی سے رہے اور اپنے نفس کی خواہشات کو چھوڑ دے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرے اور اُن سے استغفار کرے۔ اور حضرت ابید ابن عمیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس اور ہر نشست میں اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگے۔ اور فرمایا کہ ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ اوّاب اور حفیظ وہ شخص ہیں جو اپنی ہر مجلس سے اُٹھنے کے وقت یہ دعا پڑھے: "**سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُکَ مِمَّا اَصَبْتُ فِیْ مَجْلِسِیْ هٰذَا.**" (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۱۴۶)

اے لوگو! جو قلب سلیم اور میری طرف انابت والا دل لائے ہو۔ آؤ! آج یہ جنت تمہارا محل ہے اور یہ ہمیشہ کے لیے ہے، اب اس سے کبھی تمہیں نہیں نکلنا، میرے دوستو! چند دن کی تلخیاں ہیں۔ چند دن کے کڑوے گھونٹ ہیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ صحبتِ صالحین کی برکت سے شیریں کر دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ دل کی تعمیر اللہ تعالیٰ اس طرح کرتے ہیں کہ اُس دل میں سکون قائم رہتا ہے۔ لڑائی جھگڑوں اور اختلافات اور رنجشوں سے حفاظت رہتی ہے کیونکہ یہ سب غیروں کے طریقے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ نہیں حتیٰ کہ تورات میں خود جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات آئی ہیں کہ ایک ایسے نبی آئیں گے جن کے اُسوہ اور اخلاق کیا ہوں گے۔ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہوں گے۔ بازاروں میں شور مچانے والے نہیں ہوں گے، تند و سخت مزاج نہیں ہوں گے۔ یہ سب اخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھیں ہیں تو حضرت فرماتے ہیں ؎

حسرتوں سے بھاگتی ہے کائنات
میری حسرت کو پکارا چاہیے

لیکن ہم تو خدا کے لیے اپنے ارمان توڑ کر جو حسرتیں ہوتی ہیں ان کے متلاشی ہیں کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ قلب کی تعمیر فرماتے ہیں۔ اگر ان حسرتوں میں مزہ نہ ہوتا تو حضرت میر صاحب دامت برکاتہم جو حضرت والا کی طرف اس قدر تیزی کے ساتھ آئے ہیں کبھی نہ آتے ظاہر ہے ان کو زندگی میں کچھ مزہ اور لطف آیا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگوں نے طعنے بھی دیئے تھے مگر میر صاحب نے ان کو جواب میں اشعار سنا دیئے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ جس محبوب پر میں فدا ہو رہا ہوں اگر تم بھی اُن کو ایک نظر دیکھ لو گے تو وہ تو وہ ہیں تمہیں مجھ سے محبت قائم ہو جائے گی۔ اس لیے جو اللہ والے حسرتوں سے بھرے ہوئے دل رکھتے ہیں، ان کے یہاں مزہ ہی کچھ اور آتا ہے۔ یوں

تقریر کرلینا اور قرآن و حدیث کا مطلب وغیرہ بیان کرلینا یہ تو ایک عام بات ہوتی ہے، لیکن دل پر چوٹ جیسے پڑی ہوئی ہو اور جیسے حسرتیں اللہ کے راستے میں اُٹھائے ہوئے ہوں پھر اس دل سے جو کچھ برستا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے مردوں کو زندگی نصیب ہوجاتی ہے۔ اور پھر یہ زندگی ایسی ہوتی ہے جس پر سینکڑوں حیات قربان کردی جائیں۔

دل میں محبت کا تیر مار کر زندگی زندگی بنتی ہے

زندگی جو زندگی سے دُور ہو
دل میں اس کے تیر مارا چاہیے

اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ ایسی زندگی کو زندگی نہیں گردانتے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی یاد نہ ہو اور جو حق تعالیٰ کی محبت سے خالی ہو۔ اللہ تعالیٰ پر فدا ہونے کے بجائے غیر اللہ پر فدا ہو تو ایسے لوگ جو اس طرح زندگی گزار رہے ہیں اُن کے دل میں عشق و محبت کا تیر لگ جانا چاہیے تاکہ وہ محبتِ خداوندی کا شکار ہوجائیں اور اُن کی زندگی زندگی بن جائے۔ چنانچہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں کئی مقامات پر غیر ایمان والے کو مردہ اور ایمان والے کو زندہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ذکر اللہ سے غافل کو مردہ اور ذاکر کو زندہ شمار فرمایا گیا ہے اور عقلی طور پر اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جب زندگی مقصدِ زندگی پر خرچ نہ ہو تو مردہ اور زندہ انسان برابر ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایسی حیات ننگِ صد ممات ہے۔ جیسے ایک شخص کے پاس بندوق تو ہو لیکن اُس کو وہ بندوق کے طریقے پر استعمال نہ کرتا ہو بلکہ اُس سے لاٹھی ڈنڈے کا کام لیتا ہو تو اگر کوئی کہنے والا یوں کہے کہ یہ بندوق نہیں ہے بلکہ لاٹھی ڈنڈا ہے تو یہ بجا اور درست ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح حضرت والا نے اس شعر میں زندہ غافل آدمی کی زندگی کو زندگی سے دور قرار دیا ہے۔

جان دے دی میں نے ان کے نام پر

جان دے دی میں نے ان کے نام پر — عشق نے سوچا نہ کچھ انجام پر
میر مت مرنا کسی گلفام پر — خاک ڈالو گے انہیں اجسام پر
رشک سب کرتے ہیں اس ناکام پر — جی رہا ہوں میں تمہارے نام پر
تف ہے یارو طالبِ اکرام پر — میں فدا ہوں عاشقِ بدنام پر
لڑ رہے ہو ان سے کیوں دشنام پر — کتنا پردہ ہے تمہارے کام پر
کیا تعجب ہے ترے دشنام پر — اور کیا برسے گا اس بدنام پر
کیوں فدا ہے میر تو آرام پر — عشق ہوتا ہے فدا آلام پر

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **گلفام**: پھول جیسے بدن والا حسین۔ **اجسام**: جسم کی جمع۔ **تُف**: افسوس۔ **طالبِ اکرام**: لوگوں سے ادب واحترام طلب کرنے والا۔ **دُشنام**: طعنہ۔ **آلام**: الم کی جمع یعنی مصیبت۔

عشقِ حق کی بدولت جان، جان دینے والے کو دے دی گئی

جان دے دی میں نے ان کے نام پر
عشق نے سوچا نہ کچھ انجام پر

ہمیں دنیا میں جو کچھ بھی ملا ہے وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا ہے ہمارا اپنا ذاتی کچھ نہیں ہے خواہ جان ہو یا مال سب کچھ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو اللہ ہی کے نام پر قربان بھی ہونا چاہیے اس لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا مومن بندہ جب اس کی محبت میں عشق کے درجے کو پہنچ جاتا ہے، تو پھر وہ اپنی سب سے محبوب ترین چیز یعنی جان کو بھی اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کر دیتا ہے یہی سچے عشق ومحبت کی پہچان اور نشانی ہے کے عاشق صادق اپنی مصالح اور منافع کے فوت ہونے کی طرف نظر نہیں کرتا اور نہ ہی دنیوی مفادات اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں بلکہ اس کا مقصد اپنے محبوب کو راضی کرنا ہوتا ہے اس لیے جب جس وقت محبوب کا جو حکم ہو وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور جان دے کر بھی وہ یہ نہیں سمجھتا ہے کہ میں نے کوئی بڑا کام کر دیا ہے، بلکہ بزبانِ حال وہ یوں کہتا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هَلْ أَتٰى عَلَى الْإِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝﴾

(سورۃ الانسان، آیۃ: ۲-۱)

ترجمہ: بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابلِ تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا بلکہ نطفہ تھا اور اس سے قبل غذا اور اس سے پہلے عناصر کا جزء تھا) ہم نے اس کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا (یعنی مرد اور عورت دونوں کے نطفے سے کیونکہ عورت کی منی بھی اندر ہی اندر عورت کے رحم میں گرتی ہے۔ مگر کبھی فمِ رحم سے خارج ہو کر ضائع ہو جاتی ہے اور کبھی اندر رہ جاتی ہے اور مخلوط کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اجزاء مختلفہ سے مرکب ہے۔ چنانچہ ترکیب منی کی اجزاء مختلفہ سے ظاہر ہے۔ غرض ہم نے اس کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا) اس طور پر کہ ہم اس کو مکلّف بنائیں تو (اسی واسطے) ہم نے اس کو سنتا دیکھتا (سمجھتا) بنایا۔ (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۶۳۱)

انسان پر ایک زمانہ ایسا آیا ہے جب وہ لاشے تھا کچھ نہ تھا ہم نے اس کو اپنے نظامِ تخلیق کے تحت باپ کے نطفے سے پیدا کیا لہٰذا جان اسی کی دی ہوئی ہے اسی پر قربان ہونی چاہیے ہماری اپنی خواہشات اور تمنائیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہوں اگر ان سے بچنے میں جان بھی جا رہی ہو، تو جان کی بازی لگا کر ان سے بچے، مگر اپنے

خالق و مالک کو ناراض نہ کرے۔

میر مت مرنا کسی گلفام پر
خاک ڈالو گے انہیں اجسام پر

آج کا ایک عام مرض جس میں جوانوں کی ایک بڑی تعداد مبتلاء ہے اس کے متعلق ارشاد فرمارہے ہیں کہ کسی حسین اور خوبصورت پر جان دینے کی باتیں مت کرنا اور اس سے عشق بازی نہ کرنا کیونکہ ان حسینوں کا انجام شب وروز یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ سب مرکر مٹی ہوجاتے ہیں۔

کسی خاکی پہ مت کر خاک اپنی زندگانی کو
جوانی کر فدا اس پر کہ جس نے دی جوانی کو

اگر تم ان پر فدا ہوئے تو ایک مٹی دوسری مٹی پر فدا ہو کر اس میں مل گئی جس کا انجام بجز تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ شب وروز واقعات سے یہ بات سامنے آرہی ہے یہ شکلیں جو گُل کی طرح بڑی تر و تازہ اور خوبصورت معلوم ہوتی ہیں ان کی حقیقت بس اتنی ہے کہ یہ خزاں ہے جو باندازِ بہار آئی ہے۔ یعنی اپنی اصلیت اور فطرت کے لحاظ سے ان کو مٹ کر فنا ہونا ہے، تو اس لحاظ سے اسے بہار کہنا ہی صحیح نہیں، بلکہ یہ درحقیقت خزاں ہے، کیونکہ اول بھی فنا اور آخر بھی فنا بس یہ بیچ کا مختصر سا حصہ وجود والا نظر آرہا ہے اس سے دھوکا کھا کر ان پر مرنے مٹنے کا اور اپنی زندگی ضائع کرنے کا انجام مستقبل میں کفِ افسوس ملنا ہے۔

میری ناکامی ہی کامیابی ہے

رشک سب کرتے ہیں اس ناکام پر
جی رہا ہوں میں تمہارے نام پر

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے خاص بندوں کو دنیا کی محبت اور اس کے تعلقات سے اس طرح دور رکھتے ہیں کہ اسے اس راہ میں ہر طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے جو بظاہر اہل دنیا کے ہاں ناکامی کہلاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی ناکامی کو دین کی کامیابی کا پیش خیمہ بنادیتے ہیں اور یہ دنیا کا ناکام اپنی ساری کوشش اور جد وجہد دین پر خرچ کر کے اسی کو اپنا میدان محنت بناتا ہے اور اس راستے میں خوب چمک اٹھتا ہے اللہ کی طرف سے اسے خوب عزتیں ملتی ہیں تب ہر سمت سے اہل دنیا اس ناکام پر رشک کیا کرتے ہیں جیسا کہ قرآن وحدیث میں کئی جگہوں یہ مضمون پر ذکر کیا گیا ہے اور احقر نے بھی بعض مقامات پر نقل کیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اگر منزل ملے تو بھی کامیابی اور اگر نہ ملے تو بھی کامیابی، کیونکہ ہر قدم پر ہی اس کے منزل ہوا کرتی ہے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرتے ہوئے راستہ طے

کرتا ہے اور یہی اصل مومن کی منزل ہے تو ظاہر میں خواہ وہ مقامات اور مرتبے اور اہل دنیا کی نگاہ میں دین کے بڑے بڑے القاب اسے حاصل نہ بھی ہوں تب بھی اس کا یہ سفر کامیاب کہلائے گا جیسے اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص قرآن کریم حفظ کرتا ہے اور مستقل جدوجہد اور محنت کرتا رہتا ہے اور پورے اخلاص کے ساتھ اس کی سعی وکوشش میں لگا ہوا ہے مگر سب محنتوں کے باوجود ذہن کی کمزوری کی وجہ سے وہ حافظ نہ بن سکا اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگیا تو اگرچہ وہ اہل دنیا کی نگاہ میں حافظ نہیں مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے حافظ ہی شمار کیا جائے گا اور اس طرح یہ بظاہر ناکام مگر حقیقتاً ناکام نہیں کہلائے گا۔

اسی لیے حضرت شاہ ابرارالحق صاحب ہردوئی رحمہ اللہ امت کے ہر چھوٹے بڑے اور جوان بوڑھے کے لیے حافظ بننے کا ایک آسان طریقہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ روزانہ پابندی کے ساتھ جتنا بھی ہوسکے حفظ کرنے کی کوشش میں لگ جائے تو اگر اس کی عمر نے ساتھ دیا اور دو، دو، چار چار آیتیں یاد کرکے کر دس پندرہ سال میں وہ پورے قرآن کریم کا حافظ ہوگیا تو بہت خوب ہوا۔

اور اگر اس کی عمر نے وفا نہ کی اور درمیان ہی میں اس کا انتقال ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اسے حافظ ہی کا درجہ دیا جائے گا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ وہ آخرت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی نظروں میں حافظ ہی شمار ہوگا اور یہی اصل مقصود ہے۔ چنانچہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جو آدمی کسی کام میں لگا ہوا ہو اور ایسے میں اُسے موت آجائے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں اس کام کے پورا کرنے والوں میں شامل کرکے اٹھائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی وکریمی کا تو یہ عالم ہے کہ اگر پختہ ارادہ بھی کسی کار خیر کا کیا جائے اور اس کے کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو بھی وہ عمل لکھ دیا جاتا ہے۔

عاشقِ خدا اکرام واحترام کا طالب نہیں ہوتا ہے

تف ہے یارو طالب اکرام پر
میں فدا ہوں عاشق بدنام پر

اللہ تعالیٰ کا سچا عاشق کبھی اپنے مولیٰ کو راضی کرنے کے لیے اہل دنیا کی نگاہوں میں عزت واکرام ملنے اور نہ ملنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، اسے تو صرف ایک فکر ہوتی ہے کہ مجھے تو اپنے مالک پر مرمٹنا ہے خواہ اہل دنیا مجھے کیسے ہی القاب سے یاد کریں اور وہ کچھ بھی برے سے برے الفاظ میرے لیے استعمال کریں، مجھے ان کی نگاہ میں نہ باعزت بننے کا شوق ہے اور نہ میں بڑا کہلوانا چاہتا ہوں بلکہ میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ میں محبوب کی ہر چاہت پر مرمٹوں اور قربان ہوجاؤں اگرچہ دنیا والوں کی نگاہ میں مجھے ذلیل اور بدنام ہی ہونا پڑے۔ اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ بھلا عاشق ہوکر پھر لوگوں کی نگاہوں میں عزت واکرام کا طالب ہونا یہ قابل افسوس

معاملہ ہے اور شان عاشقی کے خلاف ہے جیسا کہ دنیا کے عشاق بھی اپنے محبوب پر فدا ہونے میں کسی کے کچھ کہنے سننے کی پرواہ نہیں کرتے اور بدنامی سے بالکل بے خوف ہوجاتے ہیں۔

عاشق بدنام اور دشنام

لڑ رہے ہو ان سے کیوں دشنام پر
کتنا پردہ ہے تمہارے کام پر
کیا تعجب ہے ترے دشنام پر
اور کیا برسے گا اس بدنام پر

یہ تمام انبیاء عظام واولیاء کرام کی سنت ہے کہ جب ان کی امتوں اور قوموں کی طرف سے ان کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ ہوتا ہے تو وہ جواب میں اچھائی کا معاملہ کرتے ہیں اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، بلکہ ان کی نظر اس اللہ کی ذات عالی پر ہوتی ہے کہ جو اپنے بندوں کے عیوب چھپانے والی اور برائیوں پر پردہ ڈالنے والی ہے اور ایسے کسی بھی موقع پر جب ان کی قوم کا کوئی فرد ان کے ساتھ بے ہودہ گوئی اور گالی گلوچ کے ساتھ پیش آتا ہے، تو ان کو فوراً اپنی حقیقت نظروں میں آجاتی ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہم تو اس سے بھی زیادہ عیبوں اور خرابیوں سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ستار العیوب اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان عیبوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اہل حق اہل اللہ کی نظر ہمیشہ اسی پر ہوتی ہے تو وہ اس طرح کے جملے کہنے والوں سے کبھی انتقام اور بدلے لینے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ عفو ودرگزر سے کام لیتے ہیں، اگر چہ یہ الگ بات ہے کہ ایسے لوگ جو اللہ والوں سے برسرپیکار رہتے ہیں اور ان کے ساتھ بے ہودہ گوئی سے پیش آتے ہیں، وہ خدا کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہتے۔ اور اللہ تعالیٰ خود ان سے انتقام لیتے ہیں، ہمارے اکابر کے اس پر بے شمار واقعات ہیں۔

جب کہ اس کے برخلاف وہ شخص جو حقیقت میں نسبت باطنی سے خالی ہو اور ظاہر دارانہ طور پر بڑے عالم اور پیر کی شکل میں رہتا ہو جب اسے اس طرح کی کوئی بات کہی جائے تو وہ یہ سوچنے کے بجائے کہنے والے پر شدید ناراض اور غصہ ہوتا ہے اور اس کی باتوں کو خلاف حقیقت سمجھتے ہوئے مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں اسے ڈانٹتا اور ڈپٹتا ہے جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ اس شخص نے اپنے آپ کو بہت سے کمالات اور خوبیوں کا مالک سمجھ رکھا ہے اس لیے کسی کے نامناسب کلمات کہنے پر اس سے انتقامی کارروائی کے طور پر سخت سے سخت جوابی کارروائی کی کوشش کرتا ہے اور آپے سے باہر ہوکر خود ہی انتقامی کارروائی پر اتر آتا ہے جو کہ درحقیقت متکبروں اور مغرور انسانوں کا شیوہ اور عادت ہے جن پر اپنی حقیقت حال کھلی ہوئی نہ ہو اور انہوں نے اپنے کو اپنے ذہنوں میں بہت کچھ سمجھ لیا ہو۔

عشق کی راہ میں آلام ہے آرام نہیں

کیوں فدا ہے میر تو آرام پر
عشق ہوتا ہے فدا آلام پر

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا راستہ آزمائشوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے جو آرام پسندی اور راحت طلبی کے ساتھ طے نہیں ہوسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ﴾

(مسند احمد)

کہ آزمائش سب سے زیادہ انبیاء کی ہوتی ہے پھر جو ان سے جتنا زیادہ قریب ہو اس کی اتنی زیادہ آزمائش ہوا کرتی ہے۔

مقرباں را بیش بود حیرانی

جو جتنا مقرب ہوتا ہے اس کو اتنی حیرانی اور پریشانی ہوا کرتی ہے کہ قدم قدم پر خوب سوچ کر اور سنبھل کر چلنا پڑتا ہے ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے تو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ جو تم کہہ رہے ہو سوچ کر کہو اس نے پھر سے یہی بات کہی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنْ كُنْتَ تُحِبُّنِيْ فَأَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا فَإِنَّ الْفَقْرَ أَسْرَعُ إِلٰى مَنْ يُحِبُّنِيْ مِنَ السَّيْلِ إِلٰى مُنْتَهَاهُ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزهد، باب ماجآء فی فضل الفقر)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو فقر و فاقہ کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر و فاقہ اور آزمائشیں بڑی تیزی کے ساتھ آتی ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے:

﴿عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتّٰى يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول اللہ، باب ماجآء فی الصبر علی البلاء)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو دنیا ہی میں اس کو اعمالِ بد کی سزا پیشگی دے دیتے ہیں اور جب اللہ اپنے بندے کے ساتھ بُرائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو باوجود اُس کے گناہ کرنے کے اُس سے دنیا میں سزا کو روک لیتے ہیں یہاں تک کہ قیامت کے دن اُس کو پوری پوری سزا دیں گے۔ اس لیے عشق کے ساتھ آزمائشیں وابستہ اور جڑی ہوئی ہیں اور مؤمن کو دنیا میں رہتے ہوئے ان ناموافق حالات سے گزرنا ایک معمول اور عادت کی بات ہے۔

تقدیر بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے

کشتی کا ناخدا بھی ہے مشغول خدا سے
پالا پڑا ہے کیا اسے طوفان بلا سے

سنتا ہوں شب و روز یہ موجوں کی صدا سے
غالب ہے قضا ہم پہ تری آہ و بکا سے

عاصی جو کرے نالہ و فریاد خدا سے
ممکن نہیں دو چار ہو محشر میں سزا سے

مایوس نہ ہوں اہل زمیں اپنی خطا سے
تقدیر بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے

جب تک کہ نہ ہو آشنا تسلیم و رضا سے
زاہد کو مزہ آئے گا کیا اس کی جفا سے

پاتی ہے نظر ذوق نظر میری ندا سے
پاتا ہے جگر زخمِ جگر میری نوا سے

او بے خبرو بدگماں! رندوں کی وفا سے
دیوانہ اگر پھرتا ہوں میں تیری بلا سے

پروردۂ نعمت کو بھی اس راہ جفا سے
اختؔر تجھے مانوس بنانا ہے دُعا سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **ناخدا:** کشتی چلانے والا۔ **آہ وبکا:** رونا چیخنا۔ **عاصی:** گنہگار۔ **نالہ وفریاد:** رونا پکارنا۔ **مضطر:** بے کس و مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کو پکارنے والا۔ **آشنا:** واقف ہونا۔ **تسلیم رضا:** اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی رہنا۔ **زاھد:** اللہ تعالیٰ کی محبت سے خالی شخص مراد ہے۔ **جفا:** بے وفائی، اللہ تعالیٰ سے محبت نہ ہونا۔ **نظرِ ذوق:** مزا۔ **نوا:** آواز۔ **رندوں:** اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب پینے والے۔ **پروردۂ نعمت:** نازونعمت میں پلا ہوا۔ **مانوس بنانا:** قریب کرنا۔

کشتیٔ دین وایمان کا ناخدا بس خدا ہی ہے

کشتی کا ناخدا بھی ہے مشغول خدا سے
پالا پڑا ہے کیا اسے طوفان بلا سے
سنتا ہوں شب و روز یہ موجوں کی صدا سے
غالب ہے قضا ہم پہ تری آہ و بکا سے

دین وایمان کی کشتی اللہ تعالیٰ سے رابطے اور آہ وزاری کے بغیر بلا کے طوفان سے پار نہیں ہوسکتی زمانے میں پھیلے ہوئے طرح طرح کے دینی فتنوں کا طوفان جو ہماری کشتی کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جو کشتی چاروں طرف سے ان سمندری طوفانوں کی موجوں میں پھنسی ہوئی ہے اس کے بچنے اور نجات پانے کا راستہ بس صرف اور صرف یہی ہے کہ جس کے قبضہ میں ہماری یہ کشتی ہے اس سے لو لگائی جائے اور رابطہ مضبوط کیا جائے تو با آسانی ساحل پر پہنچنے کی امید کی جاسکتی ہے ورنہ بجز طوفانِ معصیت میں غرقاب ہوجانے کے اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔

کتنی ہی بڑی سے بڑی آزمائش ہو اور کیسے ہی ناموافق حالات ہوں مگر جو بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ پیدا کرلیتا ہے پھر اسے کوئی غم نہیں رہتا بلکہ وہ بالکل مطمئن اور بے فکر ہو کر رہتا ہے اسی کو حضرت والا نے ایک مقام پر فرمایا۔

بحرِ طوفانِ غم ہے مخالف ہوا
میری کشتی کا ہے تو ہی بس نا خدا

تو جب کشتی کا ناخدا ہم اللہ تعالیٰ کو بنالیں گے اور اسی سے آہ وزاری اور فریاد کریں گے اور ہر قدم پر جہاں کشتی طوفانون میں پھنسی نظر آئےں اسی کو پکاریں گے تو اس کے نجات پا جانے میں کیا شک وشبہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ روئے زمین پر ایک پتہ بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہلتا تو ہماری مخالف سمت جتنی ہوائیں چل رہی ہیں اور جو بھی کچھ ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ہو رہا ہے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ سے آہ وبکا کر کے اس کے فیصلوں کو اپنے حق میں کرلیں گے تو نہ یہ مخالف ہوائیں مخالف رہیں اور نہ طوفان کی موجیں ہم سے ٹکرانے کی کوشش کریں گی، اس لیے ان اشعار کا اصل پیغام یہ ہے کہ جو تمہارا کشتی چلانے والا ہے اور جس کے قضاء وقدر سے موافق ومخالف سمت ہوائیں چل رہی ہیں، اس کی قدرت وطاقت کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش اور جد وجہد کرو خود ڈائریکٹ حالات سے نہ ٹکراؤ ورنہ یہ ایک لغو اور بیکار عمل ہوگا۔ اگر ہم قرآنِ کریم کی اس آیت میں غور کریں:

﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا﴾

(سورۃ الطلاق، اٰیۃ: ۴)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کردے وہ اس کے کام میں آسانی۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۴۷۲)

اس میں یہی بات فرمائی گئی کہ ایک کام میرے کرنے کا ہے اور ایک کام میرے بندوں کے کرنے کا ہے اور وہ یہ کہ بندے مجھے راضی کرنے کی فکر کریں اور میرے رضا والے کاموں میں لگ جائیں اور میں پھر ان کے کام بناتا جاؤں گا اور ان کے راستے کی ساری مشکلات آسانیوں میں بدلتا جاؤں گا، ان کے سارے ناموافق اور ناگوار حالات خوشگوار بنادوں گا۔

اب افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ بندہ بحیثیت بندہ ہونے کے اپنی زندگی کی کشتی کو خود موافق رخ پر ڈال کر اور موجوں سے ٹکرا کر ساحل پر پہنچنے کا متمنّی ہے اور خود حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر اور اللہ کی مرضی کی پرواہ کئے بغیر صبح سے شام تک چوبیس گھنٹے اپنی بگڑی سنوارنے اور حالات درست کرنے میں لگا ہوا ہے، اور پریشانیوں اور الجھنوں سے نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہا ہے اور اندرونی اور بیرونی اختلافات وجھگڑوں کے لیے ہر ممکنہ تدابیر کرنے پر دل وجان سے لگا ہوا ہے جبکہ یہ بات اپنے پالنے والے اللہ کو راضی کیے بغیر کسی بھی قیمت پر ممکن نہیں ہے اس لیے کہ در اصل صورت حال یہ ہے کہ اس کے حالات کی کشتی کا مالک اس سے ناراض ہونے کی وجہ سے اسے طوفان کی موجوں میں الجھائے ہوئے، ہے جس سے چھٹکارا کشتی کے ناخدا (اللہ تعالیٰ) کو راضی کئے بغیر ہو ہی نہیں سکتا بس یہی ان اشعار کا سبق ہے۔ جو کہ بعینہٖ میرے محبوب ومحسن نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں موجود ہے اور اس میں بالکل وضاحت کے ساتھ ہمارے لیے رہنمائی ہے اور یہ مذکور ہے کہ اپنی جملہ مشکلات کے حل کا راستہ اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو فارغ کرلینا ہے:

﴿عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَا ابْنَ اٰدَمَ! تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِیْ أَمْلَأْ صَدْرَکَ غِنًی وَّأَسُدَّ فَقْرَکَ وَإِلَّا تَفْعَلْ مَلَأْتُ یَدَیْکَ شُغْلًا وَّلَمْ أَسُدَّ فَقْرَکَ قَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ وَأَبُوْ خَالِدٍ الْوَالِبِیُّ اسْمُهٗ هُرْمُزُ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں اے انسان! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہوجا تو میں تیرے سینہ کو غنا سے بھردوں گا اور تیرے فقر کو دور کردوں گا اور اگر تو ایسا نہ کرے گا تو میں تیرے ہاتھوں کو مشغولی سے بھردوں گا اور تیرے فقر کو دور نہ کروں گا۔

عاصی اگر تائب ہوتو پھر سزا کا مستحق نہیں

عاصی جو کرے نالہ و فریاد خدا سے
ممکن نہیں دو چار ہو محشر میں سزا سے
مایوس نہ ہوں اہل زمیں اپنی خطا سے
تقدیر بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے

قیامت کے دن جس طرح کاملین جنت میں جائیں گے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تائبین بھی جنت میں جائیں گے، اسی لیے اگر کسی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے تو، اسے بے چین اور پریشان ہوکر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ قرآن کریم میں بکثرت ایسی آیات ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے گنہگار بندوں کی توبہ قبول کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔اسی طرح احادیث شریفہ میں بھی کثرت کے ساتھ توبہ کے فوائد اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا کا مرتب ہونا وارد ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں گنہگاروں کے لیے نہایت امید افزاء آیت کریمہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾
(سورۃ الزمر، آیت: ۵۳)

مشہور تابعی حضرت سعید ابن جبیر رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے قتل ناحق کئے اور بہت کیے اور زنا کا ارتکاب کیا اور بہت کیا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جس دین کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں وہ ہے تو بہت اچھا لیکن ہمارے لیے فکر کی بات یہ ہے کہ جب ہم اتنے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہیں اب اگر ہم مسلمان بھی ہوگئے تو کیا ہماری توبہ قبول ہوجائے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ (ذکرہ البخاری بمعناہا قرطبی)

اس لیے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مرنے سے پہلے پہلے ہر بڑے سے بڑے گناہ یہاں تک کہ کفر وشرک سے بھی جو توبہ کرلے قبول ہوجاتی ہے اور سچی توبہ سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں اس لیے کسی کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت گناہگاروں کے لیے قرآن کی سب آیتوں سے زیادہ امید افزا ہے مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ رجاء وامید کی یہ آیت ہے: **اِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ**" (معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۵۶۹)

"اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰہُ لَہٗ مِنْ کُلِّ ضِیْقٍ مَّخْرَجًا وَّمِنْ کُلِّ ھَمٍّ فَرَجًا وَّرَزَقَہٗ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ﴾
(مشکاۃ المصابیح، ص: ۲۰۴)

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی استغفار کو لازم پکڑ لے اور اس کی پابندی کرے تو اس کے لیے خاص طور پر تین اہم وعدے ہیں (۱) اللہ تعالیٰ ہر تنگی سے نکلنے کا اس کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں۔ (۲) اور ہر غم سے اس کو کشادگی عطا فرما دیتے ہیں۔ اور (۳) اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں سے اس کا خیال بھی نہیں ہوتا۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ہماری تمام ضرورتوں کا مدار اور ہماری جملہ حاجات کی بنیاد یہ تین چیزیں ہیں جس کو یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں، تو اسے ہر نعمت حاصل ہوگئی کیونکہ دنیا میں بسنے والا ہر انسان رات و دن انہی تین قسم کے مقاصد کے حصول کی جد و جہد میں لگا ہوا ہے کہ اسے اچھا آسان رزق حاصل ہو جائے اور مشکلات اور پریشانیوں سے نجات مل جائے اور جہاں معاملات میں کچھ رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں، اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ استغفار کی پابندی سے دنیا ہی میں جنت کا مزہ حاصل ہونے لگے گا اور ہر قسم کے ٹینشن (Tension) اور ڈیپریشن (Depresion) وغیرہ سے حفاظت رہے گی۔

اب رہ گیا حضرت والا کا یہ فرمانا کہ مضطر کی دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے، سو اس سلسلے میں علمی طور پر بظاہر ایک اعتراض اور اس کا جواب سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ کہ اہل اسلام کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ جو بات جس کے حق میں تقدیر میں لکھی جا چکی وہ تبدیل نہیں ہوسکتی:

﴿قَدْ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا ھُوَ کَائِنٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ﴾
(کنز العمال)

کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اس کو قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے یعنی اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے تو یہ بات کہ مضطر کی دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب سمجھنے سے پہلے ایک حدیث شریف ذہن میں رہنی چاہیے:

﴿لَا یَرُدُّ الْقَضَآءَ اِلَّا الدُّعَآءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ﴾
(مشکاۃ المصابیح، ص: ۱۹۵)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قضا و قدر کو صرف دعا ٹال سکتی ہے اور نیکی کرنے سے عمر میں اضافہ (برکت) ہوتی ہے۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کی قضاء و فیصلہ ٹل جاتا ہے، اس کی مختلف توجیہات میں سے بہترین توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کو تقدیر کے ان معاملات کے لیے جو تعلیقی درجے میں ہیں سبب قرار دیا ہے، یعنی اگر یہ بندہ دعا کرے گا تو یہ مصیبت اس سے ٹل جائے گی اور فلاں چیز اس کو

حاصل ہوجائے گی اسی کو تقدیرِ معلق کہتے ہیں جو کہ بندوں کے لحاظ سے ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے طے اور مقرر کرنے کے لحاظ سے جو تقدیر ہے وہ تقدیرِ مبرم کہلاتی ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ بندہ دعا کرے گا اور اس سے یہ مصیبت ٹلے گی۔ یا یہ دعا نہیں کرے گا اور اس پر فلاں مصیبت آئے گی اور یہی وہ تقدیر ہے جس میں کسی قسم کے تغیر اور تبدل کا کوئی امکان نہیں، جس کے بارے میں امت کا اجماعی عقیدہ ہے لہٰذا اس طرح کے جملے اور تعبیرات کہ مضطر کی دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ اس کا مفہوم و مطلب بس اتنا ہی ہے اس کو ایک حسی مثال سے سمجھئے کہ کسی کو گاڑی کے ایکسیڈنٹ (Accident) کا حادثہ پیش آیا جس میں دو ساتھیوں نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی اور ایک نے باندھی ہوئی تھی، تو جس نے باندھی تھی وہ موت سے بچ گیا اور باقی دو حضرات جاں بحق ہوگئے، تو ایسی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ سیٹ بیلٹ باندھنا اس کے جان بچنے اور موت سے حفاظت کا سبب بن گیا، اگر یہ نہ باندھتا تو یہ بھی لقمہ اجل بن جاتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے یہاں طے شدہ لکھا ہوا تھا کہ ان میں سے ایک اس وجہ سے محفوظ رہے گا اور دو حضرات حادثے کا شکار ہوکر اللہ سے جاملیں گے، بس مضطر کی دعا سے تقدیر بدلنے کا مفہوم و مطلب بھی یہی ہے۔ ورنہ حقیقی اور حتمی تقدیر نہیں بدلتی ہے۔

زاہدِ خشک تسلیم و رضا کی لذت کو کیا جانے

جب تک کہ نہ ہو آشنا تسلیم و رضا سے
زاہد کو مزہ آئے گا کیا اس کی جفا سے

تسلیم و رضا اللہ والوں کو حاصل ہونے والے مقاماتِ قربِ خداوندی میں سے بڑا اونچا مقام اور مرتبہ ہے اور مؤمن کی سعادت و نیک بختی کی نشانی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

﴿عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللهُ لَهُ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهُ اسْتِخَارَةَ اللهِ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهُ بِمَا قَضَى اللهُ لَهُ﴾

(مسند احمد)

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کی نیک بختی یہ ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقدر کردیا ہے اس پر راضی رہے اور آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی کو مانگنا چھوڑ دے اور انسان کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھا ہے وہ اس سے غضب ناک اور ناخوش ہو۔

آدمی کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرتا رہے اور پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں اس پر راضی رہے اور قضائے الٰہی پر راضی ہونا بڑی نعمت ہے۔ اور ابن آدم کے لیے یہ بڑی سعادت ہے کیونکہ جب بندہ تقدیرِ

الٰہی پر راضی رہتا ہے تو عبادت کے لیے فارغ رہتا ہے۔ برعکس اس کے کہ ناراض ہو فیصلۂ الٰہی سے تو وہ ہر وقت متفکر اور پریشان رہتا ہے کیونکہ کوئی انسان مصائب اور حوادث سے خالی نہیں۔ اہل اللہ تسلیم ورضا کی برکت سے ہر حالت میں پُرسکون ہیں ؎

خوشا حوادثِ پیہم خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے
وہ تو کہیے کہ ترے غم نے بڑا کام کیا
ورنہ مشکل تھا غمِ زیست گوارا کرنا

ہر فکر اور ہر تردّد میں استخارہ اور استشارہ کرلے، پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی خطرہ نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں بشارت ہے استخارہ اللہ تعالیٰ سے مشورہ کرنا اور استشارہ اہلِ تجربہ عاقل بندوں سے مشورہ لینا ہے۔

﴿مَاخَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ وَلَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ﴾

(المرقاۃ: ج ۹، ص ۱۶)

نہیں نامراد ہوا جس نے استخارہ کیا اور نہیں نادم ہوا جس نے مشورہ کیا اور نہیں تنگدست ہوا جس نے خرچ میں میانہ روی کی یعنی فضول خرچی سے احتیاط کی اور اعتدال کی راہ پر خرچ کیا۔

حضرت مولانا حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غم سے نفس کو تکلیف ہوتی ہے مگر روح میں نور پیدا ہوتا ہے ؎

میکدہ میں نہ خانقاہ میں ہے
جو تجلی دلِ تباہ میں ہے
عارف جنونِ درد پسندی نے بارہا
ٹھکرادیا وہ غم جو غمِ جاوداں نہ تھا

انسان اپنے خیر وشر کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "عَسٰۤی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ." (سورۃ البقرہ، پارہ:۲، آیت:۲۱۶)

قریب ہے یہ کہ تم بُری سمجھو کسی چیز کو اور بھلی ہو تمہارے لیے اور قریب ہے کہ درست سمجھو کسی چیز کو اور وہ بُری ہو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔ (دنیا کی حقیقت: ۱۸۶-۱۸۹)

اہل اللہ وہی ہوتے ہیں جو اپنی ہر تجویز کو اللہ تعالیٰ کی تجویز میں فنا کردیتے ہیں اور اپنے ہر معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرکے اس کے فیصلے پر راضی رہتے ہیں اگر کوئی خوشی کا واقعہ ہو، عزت وراحت کا معاملہ ہو، آسانی اور

سہولت کی بات ہو، تو بھی وہ راضی رہتے ہیں اور کسی غمی کے موقع پر اور پریشانی کی صورت میں بھی اسی طرح راضی رہتے ہیں، گویا وہ نفع ونقصان کو نہ اپنی طرف منسوب کرتے اور نہ ہی اس میں اپنا کوئی دخل اور کمال سمجھتے ہیں بلکہ ان کی سوچ وفکر ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ جو بھی کچھ روئے زمین پر ہو رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ہو رہا ہے اور ہمارا اللہ ہر شے کا مالک بھی ہے اور خالق بھی ہے اور ہمارے لیے ہر فیصلے کا پورا حق بھی اس کو ہے، کیونکہ وہ حاکم اور ہمارا مالک ہے، ہم اس کے محکوم ومملوک ہیں اور اس کا ہر فیصلہ خیر اور بہتر ہی ہے، کیونکہ وہ حکیم ہے کہ جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے خوشی کی حالت میں مومن کو اترانا اور اکڑنا نہیں چاہیے اور رنج وغم کی حالت میں مایوس واداس ہو کر پریشان نہ ہونا چاہیے، بلکہ ہر وقت ہر غم سے بے غم رہے، بلکہ غم میں بھی شاداں رہے اور دل دل میں یہ کہتا رہے ؎

مطمئن بیٹھے ہیں یارب تو حاکم بھی ہے حکیم بھی ہے

ورنہ اگر صرف عبادت ہی عبادت ہو اور اوراد و وظائف کی کثرت ہو لیکن تسلیم ورضا کا جوہر پاس میں موجود نہ ہو تو ایسے شخص کو زاہد خشک کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر حال میں شاداں وخنداں رہے بقول حضرت والا دامت برکاتہم ؎

کیفِ تسلیم و رضا سے ہے بہارِ بے خزاں
صدمہ وغم میں بھی اختؔر روح رنجیدہ نہیں

سبحان اللہ! مسلمانوں کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا عظیم الشان تحفہ اور کیسی بے مثال نعمت ہے کہ آج کی دنیا میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ایک بیماری جس کو ٹینشن اور ڈیپریشن (Tension & Depresion) کہتے ہیں۔ تسلیم ورضا کا جوہر ہاتھ آ جانے کے بعد اس سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے۔ اس لیے کسی پکے سچے ایمان والے کو دنیا کتنا ہی ستائے اور وہ کیسی ہی آزمائشوں اور مشکلات سے گزر رہا ہو، لیکن کبھی بھی حواس باختہ اور پریشان نہیں ہوگا۔ جب کہ دنیا کے متموِل قسم کے لوگ جن کی ایمان کی جڑیں مضبوط نہیں ہیں آج اس بیماری کی وجہ سے بڑی تعداد میں خودکشی کر کر کے مر رہے ہیں، کیونکہ ان کو یہ بیماری لگنے کے بعد چین وسکون کی نیند میسر نہیں آتی، تو وہ اس قدر پریشان ہو جاتے ہیں کہ پھر جینے پر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور خودکشی کر کے بے چینی سے نکل جانا چاہتے ہیں۔

ٹینشن (Tension) کا علاج خودکشی نہیں ہے

مگر آہ! کاش کہ وہ یہ جانتے کہ انہیں مر کر بھی چین ملنے والا نہیں، کیونکہ خودکشی ایسا سخت گناہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ: جو جس طریقہ سے خودکشی کر کے مرے گا وہ قیامت تک اس کا عذاب چکھتا رہے گا:

﴿وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهُ فِيْ يَدِهِ يَجَأُ بِهَا فِيْ بَطْنِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا﴾

(صحیح البخاری، کتاب الطب، باب شرب السم والدواء بہ)

جس شخص نے اپنے آپ کو لوہے کے ذریعے سے قتل کیا جس سے وہ اپنا پیٹ پھاڑ رہا تھا تو وہ قیامت تک اسی طرح اپنے پیٹ کو پھاڑ کر اس کا عذاب چکھتا رہے گا اور جس نے زہر کھا کر خودکشی کی، وہ اسی طرح زہر کھا کر اس کی تکلیف میں قیامت تک گرفتار رہے گا اور جس نے کسی پہاڑ پر سے اپنے کو گرا کر خودکشی کی تو وہ ایسے ہی گر کر مرنے کی تکلیف قیامت تک چکھتا رہے گا۔

اس لیے خودکشی کرنے کے بعد بھی چین وسکون ملنے والا نہیں، بلکہ اور سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا راز اور حکمت یہ ہے کہ یہ جان ہماری اپنی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے تو ہم اس میں اپنی مرضی سے جو تصرف کرنا چاہیں اس کا ہمیں حق نہیں، نہ پورے بدن میں نہ بدن کے کچھ اعضاء میں، بلکہ اگر کسی عضو کو بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف استعمال کیا ہو تو یہ امانت میں خیانت کہلائے گی، جس کے متعلق کل قیامت کے دن باز پرس ہوگی۔ اسی طرح اگر ہم نے اپنی جان اللہ کے حکم کے خلاف لٹادی ہو تو اس پر بھی پکڑ ہوگی۔ یہی تو وجہ ہے کہ صحت بدنی کی حفاظت از روئے مسئلہ شریعت ہر مسلمان پر فرض ہے اس پر اتنا بوجھ ڈالنا کہ انسان بیماریوں میں مبتلاء ہو جائے اور صحت بگڑ جائے جائز نہیں ہے، بلکہ حتی الوسع احتیاطی تدابیر کر کے اپنی صحت کی حفاظت کرنا یہ ہم پر لازم کیا گیا ہے۔

کھانے کے درجات اور ان کے احکام

اس لیے تو فقہا نے لکھا ہے:

﴿اَلْاَكْلُ فَوْقَ الشِّبْعِ حَرَامٌ﴾

(المبسوط، کتاب الاشربۃ، باب مزارعۃ الحرب)

کہ اتنا کھانا جو چھک جانے اور سیراب ہونے سے اوپر ہو حرام ہے، کیونکہ وہ صحت کو خراب کر کے مرض میں مبتلاء کرنے والا ہے وراسی بنیاد پر امام غزالی رحمہ اللہ نے کھانے پینے کے سات درجے لکھے ہیں:

(۱)...... پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی اتنا شکم سیر ہو جس سے زندگی قائم رہ سکے۔

(۲)...... دوسرا درجہ یہ ہے کہ جس سے نماز، روزہ اور عبادات وحقوق ادا ہو سکیں، یہ دونوں مراتب واجب ہیں۔

(۳)...... اس قدر شکم سیری جس سے نوافل ادا ہو سکیں۔

(٤)...... جس سے کمائی کی قدرت حاصل ہو، یہ دونوں مستحب ہیں۔

(۵)...... جس سے پیٹ کا ایک ثلث بھر جائے، یہ جائز ہے۔

(٦)...... جس سے بدن بوجھل اور ثقیل ہو جائے، نیند بکثرت آنے لگے، یہ مکروہ ہے۔

(۷)......اس قدر شکم سیری جو صحت کے لیے نقصان دہ ہو، یہ حرام ہے۔ (کشف الباری، ابواب الاطعمة، صفحہ:۸۶)

اور اس اصول کا مأخذ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ہدایات ہیں، جو آپ نے ان تین صحابہ کے لیے فرمائی جنہوں نے آپس میں بہت زیادہ مجاہدہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا جو کہ اس حدیث شریف میں مذکور ہے:

﴿فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَصُوْمُ النَّهَارَ اَبَدًا وَّلَا اُفْطِرُ وَقَالَ الْاٰخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَآءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَیْهِمْ فَقَالَ اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا مَا وَاللهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ لٰكِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَ اُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ﴾

(مشکاۃ المصابیح، ص:۲۷)

پوری حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ تین صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق معلومات کررہے تھے۔ جب ان کو اس کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں تو کہنے لگے کہ ہم کہاں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ کہاں، آپ تو بخشے بخشائے ہیں اس لیے جب آپ اتنی عبادت کرتے ہیں تو ہمیں تو اور زیادہ عبادت کرنی چاہیے، لہٰذا ان میں سے ایک نے تو یہ فیصلہ کیا کہ بس آج سے میں تو ہمیشہ رات کو نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں تو دن بھر روزہ رکھوں گا کبھی بے روزہ نہیں رہوں گا اور تیسرے نے اپنے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم ہی لوگ ہو جنہوں نے اس طرح کی بات کہی ہے سن لو اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور بغیر روزے کے بھی رہتا ہوں اور میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، بس جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے:

﴿فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَ نَمْ فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَیْنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَیْكَ حَقًّا﴾

(صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لزوجک علیک حقا)

کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، اس لیے ان کے حقوق کو پورا کرنا بھی عبادت ہے۔

اس لیے مذکورہ تمام تفصیلات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس جسم پر ہمارا خود اپنا اختیار اور کنٹرول (Control) نہیں اور نہ ہی اپنے طور پر ہمیں اس میں کچھ تصرف (تبدیلی) کرنے کا حق حاصل ہے اسی لیے اسلام میں خودکشی حرام قرار دی گئی ہے اور جو ایسا کرتا ہو اس پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

اہلِ نظر سے نظر کو ذوقِ نظر اور جگر کو زخمِ جگر مل جاتا ہے

پاتی ہے نظر ذوقِ نظر میری ندا سے
پاتا ہے جگر زخمِ جگر میری نوا سے
او بے خبر و بدگماں! رندوں کی وفا سے
دیوانہ اگر پھرتا ہوں میں تیری بلا سے

اہل اللہ کی تقاریر اور بیانات سے نفع پہنچنا تو یقینی ہے اور اُن کی تاثیر بھی مسلّم ہے لیکن۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی نظر سے بھی انسان کی زندگی کے حالات بدل جاتے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم رکھتا ہو اور اپنے قلب وجگر کو راہِ خداوندی کے زخموں سے چور چور کیا ہو، تو اُس کی تاثیر دوسروں تک اس طرح پہنچتی ہے۔ جیسے کوئی خوشبو والا کسی محفل میں موجود ہو تو اُس کی خوشبو اہلِ محفل کو خود بخود معطر کر دیتی ہے۔ یا کوئی شخص چراغ لے کر کسی تاریک اور بے نور محفل میں پہنچ جائے، تو اس کے چراغ سے خود بخود وہ محفل روشن اور منور ہو جاتی ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں ؎

جب شمعِ محبت دل میں لیے محفل میں ہو کوئی صاحبِ ضوء
پھر عشقِ خدا کے پروانے خود اُڑ کے وہاں آ جائیں گے
کیوں آہ میں کچھ تاثیر نہیں کیا عشق کا دل میں تیر نہیں
جب نور نہیں خود ہی دل میں منبر پہ وہ کیا برسائیں گے

جو لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے وہ اللہ والوں سے بدگمان رہتے ہیں اور تنقید و اعتراضات کرتے پھرتے ہیں۔ کاش! ایسے حضرات شرابِ محبتِ خداوندی کو پی کر اس کے نشے کو چکھ لیتے تو وہ اعتراض اور تنقید کی جرأت نہ کرتے۔ سو: اے معترض! اگر تجھے اس شراب کے نشے کو چکھنا نہیں ہے تو مجھے اس میں مست رہنے دے، تنقید کا نشانہ نہ بنا۔ اگر میں اللہ کا دیوانہ ہوں اور اُس کی محبت کا جنون مجھ پر سوار ہے، تو یہ دیوانگی اور فریفتگی میری ایسی غذا ہے جس کے بغیر میری زندگی زندگی نہیں۔ لہٰذا اگر میں دیوانہ پھر رہا ہوں تو تو اس سے پریشان مت ہو۔

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی اس راہِ خداوندی میں اعتراضات اور ملامتوں اور تنقید و تبصرے کا نشانہ مجھے بنانا چاہتا ہے، تو وہ یہ بات سن لے کہ میرے دل کے اندرونی حصے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ اتنی شدید لگی ہوئی ہے کہ اگر ملامت کرنے والے کی ملامت میرے دل کے اردگرد آئے اور اُس کی تنقید و اعتراض قریب آنا چاہے، تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو دل سے باہر ہی باہر رہے تو اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں

کیونکہ دل کے باہر رہنے سے وہ دل پر اثر انداز نہ ہو سکے گی یا پھر وہ دل کے اندر آنے کی کوشش کرے، مگر وہاں اللہ کی محبت کی ایسی شدید آگ لگی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس میں داخل ہوگی تو بالآخر وہ اُس میں آ کر جل کر راکھ ہو جائے گی، تو بہر دو صورت اے ملامت گر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں رہے گی۔ لہٰذا وہ اہلِ دنیا جو دینداروں اور اللہ کے نیک صالح بندوں پر مختلف قسم کے اعتراضات اور اشکالات اور اُن کی شان میں مختلف نوعیت کے تنقید و تبصرے کرتے ہیں، وہ یہ بات سن لیں کہ اُن کے تنقید و تبصرے اہلِ دل اللہ والوں پر کچھ اثر کرنے والے نہیں ہیں۔

ناز و نعم کے پروردہ بھی دعاؤں اور سنتوں کے محتاج ہیں

پروردۂ نعمت کو بھی اس راہِ جفا سے
اختؔر تجھے مانوس بنانا ہے دُعا سے

جن لوگوں کی زندگی بڑے عیش و عشرت سے اور ناز و نعم میں گزری ہوئی ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ وفاداری کا تعلق نہیں رکھتے اور ربّ چاہی کے بجائے جی چاہی پر عمل کرتے ہیں اور اپنی حرام آرزوؤں اور خواہشات کو حکمِ خداوندی کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں، تو ایسے لوگوں کو بھی اہلِ دل اولیاء اللہ اپنے اخلاقِ کریمانہ کے ذریعے قریب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کے لیے دل کشادہ رکھتے ہیں۔ ہر قسم کے خیر و بھلائی جو اُن کو پہنچا سکتے ہیں اُس میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ اُن کے حق میں ہر خیر و بھلائی کی دعا کرنا اور اس طرح سے اُن کو اپنے قریب کر کے اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی پر لانا یہ اُن کا شیوہ اور عادت ہوا کرتی ہے، جس کی بدولت بڑے بڑے سخت دل کچھ ہی دنوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت سے آشنا ہو کر اُس کے صحیح بندے بن جاتے ہیں۔

اور یہی وصف جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے اوصاف میں سے بڑا اہم اور نمایاں ہے کہ آپ کی طبیعت میں ایسی رفعت و رحمت اور اُلفت و مودت رکھی گئی تھی کہ دُشمن بھی قریب آ کر یہ محسوس کرنے لگتا تھا کہ جتنی محبت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے ہے کسی اور سے نہیں ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان اخلاق میں بیان فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی خصوصی نعمت کے طور پر ذکر کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾
(سورة آل عمران، اية: ۱۵۹)

ترجمہ: سو خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے۔

اس لیے ہم اس بات کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ اللہ والوں کے یہاں دوستوں اور دُشمنوں میں محبت و شفقت اور نرمی اور مہربانی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ اُن کا سلوک ہر ایک کے ساتھ دوستوں جیسا ہی ہوتا ہے، کوئی کتنا ہی غیر ہو وہ وہاں آ کر ایسا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ میرے ہیں اور میں اِن کا ہوں۔

تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم

سارے عالم کو خاطر میں لائے نہ ہم
جانے کیا پا گئے جانِ عالم سے ہم
صبح گلشن نہ ہو کیوں میری شامِ غم
غم ہی میں پاگئے آپ کو بھی ہم
لب ہیں خنداں جگر میں تیرا درد و غم
تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم
میرا مقصود ہر گز نہیں کیف و کم
تیری مرضی پر سرا میرا تسلیم خم
ہو رہا ہے تیرا درد کیوں بیش و کم
رازدارِ محبت سے پوچھیں گے ہم
تھمتے تھمتے اگر اشک جائیں گے تھم
آتش غم میرے دل میں ہوگی نہ کم

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **جانِ عالم**: اللہ تعالیٰ۔ **خنداں**: مسکراتے ہوئے۔ **کیف و کم**: کیفیت اور کمیت۔ **تسلیمِ خم**: جھکا دینا۔ **رازدارِ محبت**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا رازدار یعنی مرشد کامل۔ **آتش غم**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ۔

جانِ عالم کو پانے کے بعد عالم نظروں سے گر جاتا ہے

سارے عالم کو خاطر میں لائے نہ ہم
جانے کیا پاگئے جانِ عالم سے ہم

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت کو مختلف انداز سے اُمت کو سمجھایا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف ارشادات منقول ہیں۔ جن میں سے بہت سے ارشادات ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''دنیا کی حقیقت'' میں ذکر فرمائے ہیں۔ بہرحال یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ جو شخص اس عالَم کی حیثیت اور حقیقت سے آگاہ ہوجائے اور اُسے دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کا اندازہ ہوجائے اور آخرت کے دائمی اور ہمیشہ ہونے کا عقیدہ دل میں راسخ ہوجائے، تو وہ اس دنیا کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے گا جیسا اُس کو حقیقت میں کرنا چاہیے۔

قرآن وحدیث کی تعبیرات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا وقتی اور عارضی نفع اُٹھانے کی جگہ اور محض برتنے اور

استعمال کرنے کی چیز ہے، دل لگانے کی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت والا نے اس شعر میں اسی مضمون کو ذکر فرمایا ہے۔ جس کی تشریح و توضیح سے پہلے ایک مثال سمجھئے کہ اگر کوئی شخص کسی دسترخوان پر بڑے عمدہ اور مختلف قسم کے متنوع اقسام کے کھانے کھانے میں مشغول ہو اور ماشاء اللہ اس کے دسترخوان پر بہترین قسم کے مرغ و کباب موجود ہوں جن کو کھانے میں وہ خوب مست ہے اور اُسے بڑا لطف آرہا ہے۔ اسی طرح مختلف قسم کے مشروبات بھی اس کے پاس رکھے ہوئے ہوں، تو ایسے آدمی کو چٹنی روٹی یا دال روٹی والی دعوت میں کیا مزہ آئے گا۔ بلکہ وہ اس طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

یا اسی کو مثلاً دوسری مثال سے اس طرح سمجھئے کہ جو شخص اصلی گلاب اور اصلی عودِ ہندی اور مشک کی خوشبو سونگھنے کا عادی ہو تو پھر وہ کول واٹر، جنت الفردوس وغیرہ مصنوعی سینٹ (seant) سے بنے ہوئے عطورات کو نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ اس کو یہ عطورات سونگھائیں گے تو اُس کے لیے دردِ سر کا باعث ہوگا۔ بس ٹھیک اسی طرح احقر عرض کرتا ہے کہ جو لوگ تلاوت و مناجات، صوم و صلوٰۃ اور ذکر و استغفار اور اللہ کے سامنے رکوع و سجود کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں اور جن نفوسِ قدسیہ کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے کے درد و غم اُٹھانے اور حرام خوشیوں کو پامال کرنے کی وجہ سے اپنے قربِ خاص کی حلاوت عطا کر دیتے ہیں اور اپنی معرفت و محبت کی خوشبو سے اُن کے دل و دماغ کو معطر اور اپنی تجلیاتِ خاص سے اُن کے قلب و جگر کو منوّر اور روشن کر دیتے ہیں تو اُن کے لیے اس پوری کائنات کے حسین و دلکش مناظر، اِس کے اونچے منصب اور عہدے اور اِس کی حسین اور خوبصورت عورتوں کی شکلیں اور مختلف انواع و اقسام کی لذاتِ دنیاویہ کی کوئی حیثیت دل میں باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اِن کو کسی طرح خاطر میں نہیں لا سکتے۔

جبکہ درحقیقت احقر نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ تقریب الی الفہم کے لیے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت کا اس دنیا کی فانی لذتوں کے ساتھ کوئی تقابل ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس دنیا کی تمام فانی لذتیں یہاں تک کہ آخرت کی بھی تمام لذتیں اور راحتیں اور دونوں جہان کی خوبصورت اور حسین شکلیں اور اُن کی چمک دمک اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس خالق حقیقی کی مخلوق ہے۔

تو جن اللہ والوں نے اِن لذات کے خالق و مالک کو اپنے دل میں سمو لیا ہو تو ان کی نگاہوں سے لذاتِ عالم کا گر جانا اور بے حیثیت ہو جانا ایک واضح اور کھلا ہوا معاملہ ہے۔ بس اتنی شرط ہے کہ دل کے نہاں خانوں اور مخفی دھڑکنوں میں بھی اُس ذاتِ پاک کے سوا کسی کا گزر بسر نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تب ہی قرب کی حقیقی لذت عطا ہوگی۔ یہی تو راز ہے کلمۂ توحید میں اول ''لا الٰہ'' کو رکھا اور اُس کے ''بعد الا اللہ'' کو رکھا ہے۔ جس کا یہ سبق نکل کر سامنے آتا ہے کہ سارا غیر دل سے اچھی طرح صاف کر لو اور دل سے غیر کے سارے کانٹے نکال کر اِسے اللہ کے سامنے

کے قابل کرلوتو پھر قربِ خداوندی اور معرفتِ الٰہی کا گلستان مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں کے ساتھ دل میں آباد ہو جائے گا۔

نابالغ کو بلوغ کی لذت کی کیا خبر

صاحبو! اگر کوئی شخص بلوغ کی عمر کے متعلق اور اُس کی جملہ حدود اور حالات و کیفیات کے بارے میں پوری خبر رکھتا ہو اور اُس کا اچھی طرح مطالعہ کر رکھا ہو، لیکن ابھی تک وہ خود بالغ نہیں ہوا تو اُسے لذتِ بلوغ کا صحیح ادراک واحساس نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اگر اُس کے سامنے بلوغ کے بعد گزرنے والے خاص احوال وامور کا تذکرہ کیا جائے تو وہ اُس پوری تقریر کو یا تو لغو و بے کار سمجھے گا یا مبالغہ آرائی سمجھے گا۔ بس دوستو! حقیقت یہ ہے کہ جو بات حضرت والا فرما رہے ہیں اُس کا بھی معاملہ کچھ اسی طرح ہے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کے قرب کو اور اُس کے دردِ محبت کو اپنے سینے میں جگہ نہ دے لیں تو اس کا حقیقی ادراک ممکن ہی نہیں ہے۔

اگر ہم پوری تاریخ میں غور کریں اور اوراق پلٹ کر اُمت کے اولیاء اللہ کے حالات پڑھیں تو اُن کی زندگی میں ہمیں اُن کا یہ وصفِ خاص بہت واضح اور صاف نظر آتا ہے کہ اُن کے دل میں اِس دنیا کی محبت ذرّہ برابر نہ تھی۔ اور انہیں دنیا کے ساتھ بالکل قلبی لگاؤ نہ تھا، بلکہ وہ اس کائنات کے بڑے سے بڑے عہدوں اور منصبوں اور اِس کی وزارتوں اور حکومتوں کو اُن کی اصل حقیقت کی نظر سے دیکھتے تھے تو اُنہیں سوائے دھوکے کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے دنیا کو جگہ جگہ دھوکے کا سامان قرار دیا ہے۔ لہٰذا حضرت والا کا یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ ہم سارے عالم کو خاطر میں نہیں لائے، کیونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایسی عجیب شے عطا فرمائی کہ سارا عالم نظروں سے گر گیا اور وہ چیز یہی ہے کہ دل کے ذرے ذرے میں اللہ تعالیٰ کی محبت رچ گئی اور بس گئی تو دوسری چیزوں کے لیے جگہ کہاں رہی؟ اس لیے کہ دل ایک ہے دو نہیں ہے کہ ایک میں اللہ تعالیٰ کو بسائیں اور دوسرے دل میں دنیا اور دنیا کی چیزیں رکھی جائیں۔

چنانچہ اس پر احقر کو یاد آیا کہ میرے شیخِ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک زبان اور ایک دل ایک اکیلے اللہ کے لیے ہیں۔ یعنی دل میں اُن کی یاد رہے اور زبان اُس کی یاد سے رطب اللسان رہے۔ یہاں تک کہ شریعت کی طرف سے بندے کے ذمے جو باہمی حقوقِ واجبہ ہیں، اُن کی ادائیگی کے وقت بھی دل میں یہی خیال غالب رہے کہ میں اِن کو اس لیے ادا کر رہا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھے ان کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو ایسی صورت میں ان حقوق کی ادائیگی بھی ذکر اللہ ٹھہری۔ اور یہ شخص عین اُس وقت بھی ذاکر ہے اور یادِ الٰہی میں مشغول ہے۔ کیونکہ یہ اگر اللہ کو یاد نہ رکھتا تو پھر اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق زندگی گزارتا۔ اور حقوق کی ادائیگی کی کوئی فکر نہ کرتا۔ لہٰذا اس سے یہ نقطہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ شب وروز میں کیے جانے والے

ہمارے بہت سے وہ کام جو بظاہر دنیا کے کام کہلاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کو سامنے رکھ کر بجالانے سے وہ بھی دین بن جاتے ہیں۔ یہی کمالِ تقویٰ ہے اور یہی وہ احسانی کیفیت ہے جو بندے سے مطلوب ہے۔ اور جس کا ''حدیث جبرئیل'' میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہی حاصلِ تصوف اور خلاصۂ اصلاح وتزکیہ ہے۔

رات کی تاریکیوں سے صبح ہوتی ہے عیاں

صبحِ گلشن نہ ہوں کیوں میری شامِ غم
غم ہی میں پاگئے آپ کو بھی ہم

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾
(سورۃ الشراح، اٰیۃ:۵)

ترجمہ: بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہو۔

اس آیت کے تحت مفسرین لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک مشکل اور تکلیف ڈالنے کے بعد دو آسانیاں اور راحتیں عطا فرماتے ہیں۔ اس لیے ہر رات کی تاریکی کے پیچھے اُجالا چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور ہر عُسرِ کے ساتھ یُسرٌ وابستہ اور جڑی ہوئی ہے۔ بالکل ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اُٹھائے ہوئے غموں کے پیچھے خوشی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

تو گویا اس شعر میں ہم حضرت والا کے مضمون کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس شعر میں دکھے دلوں کا مرہم پیش کیا گیا ہے۔ اور بیمار دلوں کی شفاء ذکر کی گئی ہے۔ اور جملہ اہلِ ایمان کے لیے عموماً اور سالکین کے لیے خصوصاً اس کو ذہن میں رکھنا اور ہر وقت مستحضر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر یہ بات مذکور ہے کہ جب بندہ مؤمن اپنی جی چاہی چھوڑ کر رب چاہی پر چلنا شروع کرتا ہے اور اپنی حرام خوشیوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اور نفس کے تقاضوں کو پامال کر کے اپنے کو حکمِ الٰہی کے قید و بند میں جکڑتا ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے دل کو ایسا گلشن بنادیتے ہیں جس میں حق تعالیٰ اپنے عشق ومحبت کے مختلف پھول اُگاتے ہیں۔ اور پھر اُن کی مہک وخوشبو سے وہ پورے عالم کو معطر فرمادیتے ہیں۔ جیسا کہ تائب صاحب نے اسی کو اپنے کلام میں یوں پیش کیا ہے۔

تم اپنی قید میں لے لو کہ ہم آزاد ہوجائیں
کچھ اپنا درد و غم دے دو کہ ہم دلشاد ہوجائیں

ایک اور شعر میں کہتے ہیں ۔

زندوں کو ہے پیغام جو زنداں میں ہیں اب تک
آزاد جو ہونا ہے تو میدان کھلا ہے

اللہ کے نام پر جان دینا اور اپنے ارمانوں کا خون کرنا یہ حقیقی حیات ہے۔ اور دنیا کے قید و بند اور اُس کے آلام ومصائب اور الجھنوں اور پریشانیوں سے آزادی کا واحد راستہ ہے۔

گو کہ حضرت والا عام طور پر اپنے اشعار میں حسینوں سے نظریں بچا کر دل پر غم اُٹھانا مراد لیتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے اس میں تمام ہی گناہوں سے بچنے اور مخلوقات کی ایذاؤں کو سہنے کا غم بھی شامل ہے۔

تلخ مزاج بیوی کا واقعہ

چنانچہ حضرت والا کے وعظ میں ایک اللہ والے بزرگ کا قصہ مذکور ہے۔ جن کا نام غالباً خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمہ اللہ تھا۔ اُن کو نہایت تلخ مزاج بیوی ملی تھی۔ اور یہ اُس کی جملہ تلخیوں کو برداشت کیا کرتے تھے۔ اُس کو کچھ جواب نہ دیتے تھے۔ تو ایک مرتبہ اُن کا ایک عقیدت منداُن سے ملنے کے لیے گھر پر آ گیا۔ اور دل میں یہ تمنا لے کر آیا کہ میں اُن سے جا کر بیعت ہو جاؤں گا۔ بظاہر یہ ایک اتفاقی معاملہ تھا کہ جب وہ ان کے گھر پہنچے تو وہاں خواجہ صاحب موجود نہ تھے۔ تو اندر سے بیوی نے پوچھا کہ کون ہو اور کیسے آئے ہو؟ اس پر آنے والے نے اُن کے سامنے اپنی پوری بات رکھ دی۔ تو اندر سے بیوی نے یہ کہنا شروع کیا کہ تمہیں دھوکا ہو گیا ہے، اور تم کسی غلط جگہ آ گئے ہو، اور یہ کوئی بزرگ نہیں ہے۔ غرض یہ کہ اس نوع کی باتیں کہہ کر اُن کو بڑے غم و صدمے میں مبتلا کر دیا۔ بالآخر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ افسوس میں اس قدر دور سے کس قدر عقیدت لے کر آیا اور اتنا طویل سفر کیا، مگر میری ساری محنت بے کار چلی گئی۔

اس سوچ و خیال میں وہ وہاں سے واپس ہو گئے۔ جب ذرا ہی دور چلے تو اُن کو ایک شخص شیر پر سوار نظر آیا۔ وہ دیکھتے ہی فوراً چونکے اور قریب ہوئے۔ تو اِن کو معلوم ہوا کہ یہ ہی وہ اللہ والے ہیں جن سے میں ملنے کے لیے آیا ہوں۔ جب انہوں نے اُن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ شیر پر سوار ہیں اور سانپ کا کوڑا اُن کے ہاتھ میں ہے۔ تو انہوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی بیوی بہت تلخ مزاج ہے، یہ کیا معاملہ ہے؟ تو حضرت شاہ ابوالحسن خرقانی نے نے جواب دیا کہ جو اللہ کے لیے بیوی کی تلخ اور کڑوی باتوں اور مخلوق کی طعن و تشنیع کو اپنے اوپر سوار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اسی طرح شیروں پر سواری دیتے ہیں۔ اور سانپ جیسے زہریلے جانور کو اُن کے تابع کر دیتے ہیں۔ بہت ہی عمدہ بات ایک شاعر نے کہی ہے ۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ وبیاں

احقر کا منشا یہ ہے کہ حضرت والا جو غم اُٹھانے کی بات ارشاد فرماتے ہیں یہ درحقیقت راہِ خداوندی کے ہر نوع کے غموں کو شامل ہے۔ کبھی کسی بڑے کو چھوٹے کی طرف سے اپنے مزاج کے خلاف کوئی ناگوار اور ناموافق بات پیش آجائے، یا والد و والدہ نے کسی ناموافق بات پر موقع یا بے موقع ڈانٹ دیا ہو اور کچھ تنبیہ کر دی ہو، یا اپنے دوستوں اور خاص متعلقین کی موجودگی میں کسی نے خلافِ حقیقت کوئی الزام لگا دیا ہو، یا کوئی نازیبا حرکت کر دی ہو، جبکہ لوگوں میں بڑی عزت و مقام و مرتبہ تھا اور خانقاہ و تبلیغ میں چلے لگانے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان حضرت حضرت کے نام سے مشہور تھا۔ انتقام اور بدلہ لینے کی بھی پوری قدرت موجود تھی۔ مگر وعدۂ الٰہی پر نظر رکھتے ہوئے اور اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر سب کو میٹھا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ اور فوراً آنکھوں کے سامنے اپنی حقیقت کھل کر آگئی کہ میری ابتداء ماءِ مہین ہے اور میری انتہا اور انجام مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ اور حقیقت میں تو میں اُس سے کہیں زیادہ گیا گزرا ہوں۔ جو لوگوں نے میرے بارے میں کہا ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بس اللہ نے ستاری فرمائی ہے کہ میرے سب عیوب لوگوں پر کھولے نہیں ہیں۔

جب تک ایمان پر خاتمہ نہیں ہوتا اُس سے پہلے اپنے ذہن میں اپنا کوئی مقام اور مرتبہ سوچ کر رکھنا بالکل حماقت اور بے کار ہے۔

اولیاء اللہ حلم و تواضع کا پیکر ہوتے ہیں

صاحبو! ایسے ہی مواقع پر انسان کو اپنے اندر کی حقیقت تواضع کا پتا چلتا ہے۔ کیونکہ اگر طبیعت میں عجب و خود پسندی اور تکبر اور بڑائی کا زہر بھرا ہوا ہو تو اپنی شان اور مقام و مرتبے کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس قسم کی باتیں برداشت نہیں ہو پاتیں۔ چنانچہ اکابر اولیاء اللہ کے اس نوع کے بے شمار قصے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایذائے خلق کو کس طرح گوارا کرتے تھے اور مختلف تکالیف اور مصائب کے غم کو کس طرح سہتے تھے۔ اور باوجود لوگوں کے درمیان اُن کے عظیم مقام و مرتبے کے وہ اپنے کو ذرۂ خاک کے برابر بھی نہیں سمجھتے تھے۔

احقر کو یاد آیا کہ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے جنوبی افریقہ کے جمعیت علماء حال میں ایک مرتبہ علماء کے فرائض منصبی پر تقریر کرتے ہوئے (حضرت شاہ اسماعیل شہید) کا قصہ ذکر فرمایا کہ کسی شخص نے حضرت کو بہت بُری گالی دی، جبکہ وہاں حضرت شاہ صاحب کے مریدین و متعلقین کا ایک بڑا مجمع تھا۔ اُس نے اسی حالت میں شاہ صاحب کے متعلق کہا کہ تم حرامی ہو اور ولدِ زنا ہو اور تمہارے والد کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ تو بقول حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم کہ شاہ صاحب نے نے اسے گالی کی بجائے ایک مسئلہ بنا کر پیش کیا اور فرمایا کہ نہیں بھائی! ایسی بات تو نہیں ہے، بلکہ میرے والد نے تو میری والدہ سے نکاح کیا تھا، اور اُس کے گواہ ابھی تک دلّی میں موجود ہیں۔ اگر تم چاہو تو جا کر تحقیق کر سکتے ہو۔

غور فرمائیے! کہ اتنا سنگین اور خطرناک الزام انسان کی طبیعت میں کس قدر غصہ اور مزاج میں کس قدر جھنجھلاہٹ کا باعث ہوتا ہے اور اس پر جتنا بھی غصہ آ جائے کم ہے۔ پھر مزید برآں یہ کہ انتقام کی پوری قدرت بھی موجود، کیونکہ سب اپنوں کا مجمع تھا۔ مگر یہ اولیاء اللہ، اللہ کی مخلوق پر مجسم شفقت اور سراپا رحمت ہوتے ہیں۔ جو خود اپنی نگاہ میں اپنی حقیقت کچھ نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کی نظر ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر رہتی ہے۔ اُس کی نعمتیں اور اُس کے وعدے اور وعیدیں ہر آن اُن کی نگاہوں کے سامنے اور دل و دماغ میں مستحضر رہتے ہیں۔ اور ایسی چیزیں ان حضرات کے لیے بہت معمولی ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بُرائی کا بدلا بُرائی سے دینا سیکھا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے ہر بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں۔ اور تکلیف دہ بُری باتوں پر صبر و حلم سے کام لیتے ہیں۔

چنانچہ معارف القرآن، صفحہ:۳۵۳ پر بحوالہ قرطبی نقل ہے کہ بعض روایت میں ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو کسی شخص نے گالی دے دی یا بُرا کہا۔ تو آپ نے اُس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم خطاوار اور بُرا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے۔ اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمادیں۔

عفو و درگزر میں اللہ کی نرالی شان

اگر غور سے دیکھیں تو درحقیقت یہ صفت اصل میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی ہے۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں یہ روایت ہے کہ:

﴿مَا اَحَدٌ اَصْبَرُ عَلٰی اَذًی یَّسْمَعُهٗ مِنَ اللّٰہِ یَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْهِمْ وَیَرْزُقُهُمْ﴾

(المرقاۃ، ج:۱، ص:۷۹)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ایسی تکلیف دہ باتوں پر جن کو وہ سن رہا ہو یہ صرف اللہ کی شانِ رحیمی و کریمی ہے کہ ایسے لوگوں پر جلد عذاب نازل نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کو مہلت دیتے رہتے ہیں کہ جو اللہ کے لیے اولاد تجویز کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ اس لغو و مہمل اور بدترین الزام کو سنتے ہیں مگر پھر بھی فوراً عذاب نازل نہیں کرتے، بلکہ مزید برآں یہ کرتے ہیں کہ اُن کو عافیت و آرام دیتے ہیں۔ اور اُن کو اُن کا رزق دیتے رہتے ہیں۔

مُلا علی قاری رحمہ اللہ اگرچہ ایک محدث کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں مگر وہ بڑے اللہ والے اور صاحبِ دردِ دل، عالمِ ربانی تھے۔ چنانچہ اس حدیث کو نقل کرکے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اُنْظُرْ فَضْلَهٗ وَاِنْعَامَهٗ فِیْ مُعَامَلَتِهٖ مع من یُّؤْذِیْهِ فَمَا ظَنُّکَ بِمَنْ یَّحْتَمِلُ الْاَذٰی عَمَّنْ یَّعْصِیْهِ وَیَمْتَثِلُ اِرْتِکَابَ طَاعَاتِهٖ وَاجْتِنَابَ مَنَاهِیْهِ وَفِیْهِ اِرْشَادٌ لَّنَا اِلٰی تَحَمُّلِ الْاَذٰی وَعَدَمِ الْمُکَافَاۃِ

﴿وَالتَّخَلُّقُ بِاَخْلَاقِ اللهِ تَعَالٰى﴾

(المرقاۃ، کتاب الایمان)

ذرا حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور اُس کے انعام و احسان کا معاملہ دیکھو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسے جملے کہتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسندیدہ ہیں، پھر بھی اُسے کھلاتے پلاتے رہتے ہیں۔ تو بھلا تمہارا کیا خیال ہے اُس شخص کے سلسلے میں جو اِس خُلق میں اخلاقِ خداوندی سے متصف ہو کہ نافرمانوں کی طرف سے تکالیف کو برداشت کرتا ہو اور حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہو اور نافرمانی سے بچتا ہو تو اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا کچھ خصوصی معاملہ ہوگا۔

ابرار و اولیاء کون؟ علامہ عینی رحمہ اللہ کی زبانی

اور پھر اِس میں ہمارے لیے رہنمائی ہے کہ ہم لوگوں کو تکالیف کو برداشت کریں اور انتقام و بدلے کی کارروائی نہ کریں۔ اور اخلاقِ الٰہیہ سے متخلق ہوں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر علامہ عینی ابرار یعنی نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْذُوْنَ الذَّرَ وَلَا يَرْضَوْنَ الشَّرَّ﴾

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، کتابُ الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون)

کہ ابرار اللہ کے وہ بندے ہیں جو ایک چیونٹی کو بھی تکلیف نہیں دیتے اور خود لوگوں کی تکالیف سہتے رہتے ہیں اور شر سے کبھی بھی راضی نہیں ہوتے۔ اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اسی کو یوں فرمایا ہے جو اوپر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے کہ:

﴿قَالَ الْحَسَنُ الْبَصَرِيُّ فِيْ تَفْسِيْرِ الْاَبْرَارِ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْذُوْنَ الذَّرَّ وَلَا يَرْضَوْنَ الضَّرَّ﴾

(مرقاۃ المصابیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان)

چنانچہ میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ حضرت کی سوانح میں لکھا ہوا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد سے بعض متعلقین کے ساتھ مجلس خانہ تشریف لے جا رہے تھے کہ سامنے کتے پر نظر پڑی جو نالی میں پانی پی رہا تھا۔ نظر پڑتے ہی فوراً وہیں رُک گئے اور ساتھیوں سے فرمایا کہ اگر ہم یہاں سے گزریں گے تو اس کے پانی پینے میں خلل پڑے گا۔ اس لیے ذرا راستہ بدل دو تاکہ ہماری وجہ سے اِس کو تکلیف نہ ہو۔

میرے دوستو! غور کرنے کا مقام ہے کہ اہل اللہ کے دلوں میں صرف اپنے مسلمان بھائیوں اور مطلق انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ جانوروں تک کے لیے بھی کس قدر راحت رسانی کی فکر ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ اُن کی ایذاء سے بھی کس قدر بچتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اُن کی نظر اس پر ہوتی ہے کہ:

﴿اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ﴾

(مشکاۃ المصابیح، کتاب الاداب، باب الشفقۃ والرحمۃ)

یعنی ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اس نسبت پر نظر رکھ کر جب وہ مخلوق کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، تو اُسی میں اُن کو خالق مل جاتا ہے۔ اور یہی خلاصہ ہے نسبت مع اللہ کے حاصل ہونے کا۔ اور یہی دلیلِ ولایت وتقویٰ ہے کہ انسان کی طبیعت میں ''اَلْاِنْقِیَادُ لِاَمْرِ اللہِ وَالشَّفَقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللہِ'' یعنی اللہ کے حکم کے سامنے جھک جانے اور مخلوق خداوندی پر دل میں شفقت پیدا ہوجانے کا جذبہ پیدا ہوجائے اور اگر کبھی کبھار اُن سے اس کے خلاف سرزد ہوجائے تو اُنہیں اس وقت تک چین نہیں ملتا جب تک وہ اُس کی معافی تلافی نہیں کرلیتے۔

چنانچہ احقر نے حضرت والا کے ایک وعظ میں حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کا یہ قصہ سنا کہ کوئی عام آدمی حضرت سے ملاقات وزیارت کے لیے آیا اور کسی بات پر حضرت نے اُس کو تنبیہ کردی اور ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے کے فوراً بعد حضرت کو یہ خیال آیا کہ نہ وہ میرا شاگرد تھا نہ مرید۔ پھر بھی میں نے اُس کو اس طرح ڈانٹ دیا اور یہ میری طرف سے زیادتی ہوگئی۔ اس لیے مجھے اُس سے معافی مانگنی چاہیے۔ اور یہ سوچ کر اندر اندر سے بے چینی ہونے لگی۔ اور حضرت اسی بے قراری و بے چینی کے عالم میں گھر سے نکل پڑے۔ اور بقول حضرت والا کہ طبیعت پر اس قدر خوفِ قیامت غالب ہوا کہ راستہ بھی پورا یاد نہ رہا اور جنگلوں میں نکلے چلے گئے۔ بالآخر اُس آدمی کے گھر پہنچ کر اُس سے معافی کی درخواست کی۔ جبکہ وہ حضرت کے اس عمل پر شرمندہ ہوا اور بڑے معذرت کے انداز میں کہا کہ حضرت! کوئی بات ہی نہیں پیش آئی تھی، آپ نے یہ تکلیف کیوں اُٹھائی؟ اِدھر دوسری جانب آپ یہ دیکھیں کہ اللہ کی رضا کے لیے اور آخرت کے خوف سے جو بے قراری اور بے چینی ہوئی اور اُس سے معافی مانگی۔ اس کے نتیجہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو کیا دولت حاصل ہوئی کہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کو اُسی رات میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی۔ اور ایسے عجیب وغریب محبت بھرے انداز میں جس کی حلاوت تاعمر محسوس ہوتی رہی۔

خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نے دیکھا سمندر میں ایک کشتی ہے جس میں میں سوار ہوں۔ اور میری کشتی سے آگے ذرا فاصلے سے ایک دوسری کشتی ہے جس میں حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سوار ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عبدالغنی کی کشتی کو ہماری کشتی سے جوڑ دو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت کی کشتی کو اپنی کشتی سے جوڑ دیا۔ اور ایسے ڈھنگ سے جوڑا کہ اُس کے اندر سے ایک کھٹ کی آواز ہوئی، جس پر حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اُس کھٹ کی آواز کے تصور سے میرے قلب میں آج تک عجیب وغریب حلاوت ولذت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت پھولپوری رحمہ اللہ شاعر نہیں تھے، مگر اس خواب کے واقعہ کو ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ ؎

مضطرب دل کی تسلی کے لیے
حکم ہوتا ہے ملا دو ناؤ کو

صاحبو! یہ واقعات سنانے سے راقم السطور کا مطلب محض واقعات کا تذکرہ نہیں، بلکہ دراصل یہ بتانا ہے کہ جب انسان اللہ کے لیے مخلوق کا غم اُٹھانے والا بن جاتا ہے اور راہِ خداوندی کی تلخیوں اور کڑواہٹوں کو میٹھا گھونٹ سمجھ کر پینا شروع کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی محبوبیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اُسے کائنات کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ اور اس طرح شبِ غم سے خوشی کی کرنیں پھوٹنی شروع ہوتی ہیں۔ اور میں بہ قسم عرض کرتا ہوں اور بڑی بصیرت اور شرح صدر سے یہ بات کہتا ہوں کہ اللہ کے راستے کا غم جو کہ انبیاء و اولیاء کی وراثت ہے اس میں حق تعالیٰ نے ایسی مٹھاس اور حلاوت رکھی ہے کہ ایک مردِ مؤمن اُس کو چکھ لینے کے بعد زندگی کے سارے مزوں کو بے مزہ اور ساری خوشیوں کو محض ایک دھوکا تصور کرنے لگتا ہے۔ اور اُسے سوائے اس راہ کے کہیں اور سکون محسوس نہیں ہوگا، خواہ اُس کے پاس کتنے ہی اسبابِ سکون اور سامانِ عیش جمع ہوں۔

لبِ خنداں دیکھ کر دھوکہ نہ کھایئے

لب ہیں خنداں جگر میں تیرا درد و غم
تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم

دنیا میں بعض لوگوں نے تصوف کا ایسا خراب اور خشک نقشہ پیش کیا ہے اور اُس کو تشدد اور سختی پر مبنی دین کا ایسا شعبہ ظاہر کیا ہے کہ کئی مسلمان نوجوان اس کے قریب آنا نہیں چاہتے ہیں۔ بلکہ تصوف کے نام سے ہی گھبراتے ہیں۔ گویا کہ اُن کے نزدیک تصوف میں داخلے کا معنی یہ ہوگا کہ ساری دنیا کو چھوڑ کر ایک خشک سا بجھا بجھا راستہ اختیار کر لیا جائے۔ جس میں نہ کوئی ہنسی خوشی کا امکان ہو اور نہ باہمی گفتگو اور آپسی مزاج پرسی کی کوئی صورت روا رکھی جائے۔ نہ ہی اچھی عمدہ غذائیں اور طیباتِ الٰہیہ کے استعمال کا کوئی تصور ہو اور نہ بیوی بچوں کے ساتھ کوئی مزاح و مذاق کی گنجائش۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب باتیں اُن لوگوں کے یہاں ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ اور اُن کے سینے اللہ کی معرفت و محبت کے خزانے سے بالکل عاری اور خالی ہوتے ہیں۔ تو اُن کو اپنی ظاہری عظمت و وقار برقرار رکھنے کے لیے بہ تکلف یہ سب صورتیں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی بزرگی اور ولایت کا رعب قائم رہے اور لوگ اُن کے اس برتاؤ اور انداز کو دیکھ کر اپنا جیسا ایک عام انسان انہیں تصور نہ کریں۔ چنانچہ احقر نے بعض مقامات پر اِن چیزوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ آج کے دور کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہنسا ہنسا کر تصوف طے کراؤ اور اللہ تعالیٰ کے دین کو ایک خطرناک راستہ بنا کر پیش نہ کرو۔ جس پر چلنے سے لوگ گھٹن اور اُلجھن محسوس کرتے ہوں اور اُس کے نام سے ہی گھبرا جاتے ہوں۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا﴾

(صحیح البخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی ﷺ یتخولہم بالموعظۃ)

کہ دین کو لوگوں کے سامنے اس انداز سے پیش کرو کہ جس میں سہولت ہو اور لوگوں کے لیے عمل کی آسان شکلیں سامنے آئیں۔ اور اُن کو دین پر چلنا آسان نظر آئے۔ خلوتوں میں آہ وزاری کیجیے، مگر جلوتوں میں خود بھی مسکرایئے اور دوسروں کو بھی ہنسایئے اور مسکرایئے اور ہنسنے دیجیے۔ اگر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کریں، تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ یہی تھی۔ جب آپ کسی سے ملتے تو آپ کے رُخِ مبارک پر مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ روایت میں آتا ہے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مسکراتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔

اور عقلی طور پر یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ باہمی تعلق اور رابطے کے لیے آسان اور سہل صورت یہی ہے، جس سے افادہ اور استفادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس کے برخلاف تصوف کو دوسرے انداز سے پیش کر رہے ہیں یہ اُن کی بہت بڑی نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ اور فی الحقیقت سراسر دھوکا ہے۔ بس حضرت والا اس شعر میں یہی بات پیش کر رہے ہیں کہ اگرچہ میں ہونٹوں سے مسکرا رہا ہوں، مگر بحمد اللہ میرے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح موجزن ہے۔

تصوف کی حقیقت اور ہمارے اکابر

تصوف کی حقیقت بس اتنی بات ہے کہ شب وروز میں ایک لمحے کے لیے بھی انسان کا دل اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ اور وہ کسی بھی گناہ کا ارتکاب نہ کر رہا ہو۔ اور اگر بشری تقاضے سے ایسا ہو جائے تو اُسے تب تک چین نہ ملے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرلے۔ اور اُس کی زندگی کی ہر ادا قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ اور حق تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہر قول وفعل سے اتنا بچتا اور دُور بھاگتا ہو۔ جیسے کوئی انسان بھوکے شیر سے دور بھاگتا ہے۔ اسی کو حضرت والا مختصر لفظوں میں یوں تعبیر فرمایا کرتے ہیں کہ اے مسلمانو! فرائض وواجبات اور سننِ مؤکدہ ادا کرنے کے بعد بس ایک کام کرلو تو ولی اللہ بن جاؤ گے۔ اور وہ کام یہ ہے کہ ''کام نہ کرو'' یعنی گناہ کا کام نہ کرو۔ باقی ہنسی خوشی رہو۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کے قریب نہ جاؤ اور اُس کی نافرمانیاں ہرگز سرزد نہ ہونے پائے۔

قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ اتنے علوم ومعارف اور کمالاتِ علمیہ اور عملیہ کے حامل ہوتے ہوئے اپنے طلبہ وتلامذہ میں اس غرض سے بے تکلف رہا کرتے تھے کہ یہ لوگ مجھے بہت بڑا اور بزرگ نہ سمجھنے لگیں۔ اور ان کے ذہنوں میں میرے متعلق کوئی بزرگی اور بڑائی کا نقشہ قائم نہ ہو۔ حالانکہ حال یہ تھا کہ ایک ایک رات میں نفلوں میں کھڑے ہو کر پورا قرآن تلاوت کرلیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت کے حالات میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک دن کسی شخص کو یہ خیال ہوا کہ میں مسجد میں نماز عشاء کے بعد حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ساتھ ٹھہروں گا اور یہ دیکھوں گا کہ مولانا روزانہ مسجد میں ٹھہر کر عشاء

کے بعد کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ حضرت روزانہ ٹھہر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اُس شخص نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ ایک صف میں لپٹ کر مسجد کے کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ حضرت نے سب مصلیوں کے جانے کے بعد مسجد کا دروازہ بند کیا اور حسبِ معمول نفلوں میں کھڑے ہو کر قرآن کریم کی تلاوت شروع کی تو اُس شخص نے بھی نماز کی نیت باندھ کر حضرت کے پیچھے نماز شروع کر دی، مگر ظاہر ہے کہ حضرت کی نماز اتنی طویل تھی کہ اُس سے برداشت نہ ہوا اور اُسے درمیان میں نماز کی نیت توڑنی پڑی۔

غرض یہ کہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے بے شمار عجیب وغریب قسم کے واقعات ہیں جن سے اُن کے مقامِ بلند اور اعلیٰ درجے کے تقویٰ وطہارت کا اندازہ ہوتا ہے، مگر ان سب کے باوجود اس طرح رہنا اخفائے حال کی بنا پر تھا جو کہ اللہ کے مخلص بندوں کا خاص شیوہ اور عادت رہی ہے۔

صاحبو! احقر بڑی صفائی اور وضاحت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آج ہم لوگ ذرا سا سلوک طے کر کے یا دعوت وتبلیغ کی محنت سے کچھ دنوں وابستہ رہ کر یا کسی اور دینی کام میں کسی بھی نوع سے اپنی خدمات پیش کر کے اپنے لیے ایک خاص وجاہت وحیثیت اور عظمت وبزرگی والا مقام اپنے دماغ میں مقرر کر لیتے ہیں اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں۔ یہ سراسر بے دینی اور مبتدعین اہلِ بدعت کا تصوف اور اُن کا طریقۂ کار ہے۔

ظاہرداری کا نام ولایت نہیں ہے

اب چونکہ یہ لوگ اندر سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا وہ غم اور درد وکڑھن نہیں ہوتا جو حقیقت میں اللہ کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں عزت کا ذریعہ بنتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ کے بندے اولیاء اللہ کے ساتھ خصوصی عزت وعظمت کا معاملہ کرتے ہیں۔ تو پھر ان مصنوعی اور جعلی پیروں کو ایسی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں کہ اُن کا چہرہ خاص انداز سے بنا ہوا ہو یعنی پیشانی میں بل پڑے ہوئے ہوں۔ ہونٹوں پر بالکل مسکراہٹ نہ ہو۔ مصافحہ بھی پورے ہاتھ کے ساتھ نہ کیا جائے، بلکہ ہاتھوں کے آگے انگلیوں کے کچھ حصے سے سرسری انداز سے مصافحہ کرنے کی عادت بنائی جائے۔ گفتگو کے وقت الفاظ صاف اور واضح نہ ہوں اور وہ خود چل رہے ہوں اور دوسرا شخص اُن کے ساتھ ساتھ کھنچا چلا جا رہا ہو اور چہرہ کی پوری توجہ مخاطب کی طرف نہ ہو اور درمیانِ گفتگو ایک دم ایسے روکھے سوکھے انداز سے رخصت ہو جائیں کہ سامنے والا حیران وپریشان کھڑا کا کھڑا رہ جائے جس کا مقصد اپنا رنگ وروپ بڑے بزرگوں جیسا بنانا ہو اور گویا اپنے دل ودماغ میں خود اپنے متعلق یہ تصور قائم کیے ہوئے ہوں کہ میں بھی لوگوں کے درمیان بہت بڑے "حضرت جی" کے مقام پر فائز ہوں اور لوگوں کے درمیان میرا بڑا بلند مرتبہ ہے۔

متبع سنت اولیاء اللہ کے بعض خاص احوال وصفات

میرے بھائیو! احقر نے یہ جتنی باتیں عرض کی ہیں اگر اِن کا واقعی میں بزرگی اور نیکی یا ولایت وتقویٰ سے کوئی تعلق ہوتا تو اِن کو سب سے پہلے اختیار کرنے والے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے اور یہ سارے اوصاف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بدرجہ اکمل واتم پائے جانے چاہیے تھے۔ اس لیے کہ ہم سب مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے جو بالکل برحق، بجا اور صحیح ہے کہ بشریت کی کوئی خوبی ایسی نہیں ہے اور صفاتِ کمالِ بشری میں سے کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکمل درجہ میں عطا نہ ہوئی ہو۔ کسی شاعر نے اسی مضمون کو ایک چھوٹے سے شعر میں بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے ۔

نہ تھا معلوم کوزے میں سمندر بھی سماتا ہے
محمد مصطفیٰ ﷺ کو دیکھ کر سب کو یقین آیا

حالانکہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں مذکورہ باتوں میں سے ایک بھی بات نہیں ملتی۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل حمیدہ اور عاداتِ طیبہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ کسی سفر میں چند صحابہ نے ایک بکری ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اور اُس کا کام تقسیم فرمالیا۔ ایک نے اپنے ذمے ذبح کرنا لیا اور دوسرے نے کھال نکالنا، کسی نے پکانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پکانے کے لیے لکڑی اکھٹی کرنا میرے ذمے ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کام ہم خود کرلیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ اسے بخوشی کرلوگے لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں مجمع میں ممتاز رہوں اور اللہ جل جلالہ بھی اس کو پسند نہیں فرماتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضَ وَيَشْهَدُ الْجَنَازَةَ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ وَيُجِيْبُ دَعْوَةَ الْعَبْدِ﴾

(الشمائل المحمدیۃ للترمذی)

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مریضوں کی عیادت فرماتے خواہ کسی درجے کا بیمار ہو شریف ہو یا معمولی آدمی ہو۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں کی بھی عیادت فرماتے تھے۔ جنازے میں بھی شرکت فرماتے تھے خواہ وہ کسی معمولی آدمی کا ہو یا کسی کا بھی۔ اور گدھے پر سوار ہوتے اور غلاموں کی بھی دعوت قبول فرماتے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا ہی مبارک اور پیاری عادتِ شریفہ ہے، جو ایک طویل حدیث میں مذکور ہے۔ جس کا ایک حصہ یہ ہے:

﴿يُعْطِيْ كُلَّ جُلَسَائِهِ بِنَصِيْبِهِ لَا يَحْسَبُ جَلِيْسُهُ أَنَّ أَحَدًا أَكْرَمُ عَلَيْهِ مِنْهُ مَنْ جَالَسَهُ أَوْ فَاوَضَهُ فِيْ

حَاجَةٍ صَابِرَةٌ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ الْمُنْصَرِفُ عَنْهُ وَمَنْ سَأَلَهُ حَاجَةً لَمْ يَرُدَّهُ إِلَّا بِهَا أَوْ بِمَيْسُوْرٍ مِنَ الْقَوْلِ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

خلاصۂ ترجمہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضرینِ مجلس میں سے ہر ایک کا حق ادا فرماتے تھے یعنی بشاشت اور بات چیت میں جتنا اُس کا حق ہوتا اُس کو پورا فرماتے کہ آپ کے پاس ہر بیٹھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرا سب سے زیادہ اکرام فرما رہے ہیں اور جو آپ کے پاس بیٹھتا یا کسی معاملے میں آپ کی طرف مراجعت کرتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ وہی خود اُٹھنے کی ابتدا کرے اور جو آپ سے کوئی چیز مانگتا، آپ اس کو مرحمت فرماتے یا اگر نہ ہوتی تو نرمی سے سمجھاتے۔ اس سے آگے حضرت عمرو بن العاص کی روایت میں اخلاقِ نبوی کے متعلق مذکور ہے:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقْبِلُ بِوَجْهِهٖ وَحَدِيْثِهٖ عَلٰى أَشَرِّ الْقَوْمِ يَتَأَلَّفُهُمْ بِذٰلِكَ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

یعنی قوم کے بدترین شخص کی طرف بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تالیفِ قلب کے لیے اپنی توجہ اور اپنی خصوصی گفتگو مبذول فرماتے تھے جس کی وجہ سے اس کو اپنی خصوصیت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ چنانچہ خود میری طرف بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہاتِ عالیہ اور کلام کا رُخ بہت زیادہ رہتا تھا حتی کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ میں قوم کا بہترین شخص ہوں کہ میری طرف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ توجہ فرماتے ہیں۔ اس کے آگے پھر حضرت حسن کی روایت ہے کہ حضرت حسین بن علی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ابا جان حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اہلِ مجلس کے ساتھ طرزِ عمل پوچھا تو ابا جان نے فرمایا:

﴿كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَائِمَ الْبِشْرِ سَهْلَ الْخُلُقِ لَيِّنَ الْجَانِبِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ: آپ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے ساتھ پیش آتے یعنی چہرۂ انور پر تبسم اور بشاشت کا اثر نمایاں ہوتا تھا۔ آپ نرم مزاج تھے یعنی کسی بات میں لوگوں کو آپ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تو آپ سہولت سے موافق ہو جاتے تھے نہ آپ سخت گو تھے اور نہ سخت دل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں اسی حدیث میں آگے ہے:

﴿يَضْحَكُ مِمَّا يَضْحَكُوْنَ مِنْهُ وَيَتَعَجَّبُ مِمَّا يَتَعَجَّبُوْنَ مِنْهُ﴾

(الشمائل المحمدیة للترمذی)

جس بات سے سب ہنستے تو آپ بھی ان کے ساتھ تبسم فرماتے اور جس بات سے سب کو تعجب ہوتا تو آپ بھی تعجب میں شریک رہتے۔ یہ نہیں کہ سب سے الگ چپ چاپ بیٹھے رہیں، بلکہ معاشرت اور طرزِ کلام میں شرکاءِ مجلس کے شریکِ حال رہتے۔ اجنبی مسافر آدمی کی سخت گفتگو اور بے تمیزی کے سوال پر صبر فرماتے، یعنی گاؤں کے لوگ جا و بیجا

سوالات کرتے، آداب کی رعایت نہ کرتے، ہر قسم کے سوالات کر لیتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پر گرفت نہ فرماتے، ان پر صبر کرتے۔ اسی طرح آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں ہے:

﴿وَلَا يَقْطَعُ عَلٰى اَحَدٍ حَدِيْثَهٗ حَتّٰى يَجُوْزَ فَيَقْطَعُهٗ بِنَهْيٍ اَوْ قِيَامٍ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذی)

یعنی کسی کی گفتگو قطع نہ فرماتے تھے کہ دوسرے کی بات کاٹ کر اپنی شروع فرمائیں۔ اگر کوئی حد سے تجاوز کرتا تو اسے روک دیتے تھے یا مجلس سے تشریف لے جاتے تاکہ وہ خود رُک جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

﴿قَالَتْ كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ يَفْلِيْ ثَوْبَهٗ وَيَحْلُبُ شَاتَهٗ وَيَخْدُمُ نَفْسَهٗ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذی)

مقصود یہ ہے کہ اپنی ضروریات اور گھر کے کاروبار کے کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ گرانی اور تکبر مانع نہ ہوتا تھا۔ اپنے کپڑے میں خود ہی جوں تلاش کر لیتے تھے اور خود ہی بکری کا دودھ نکال لیتے تھے، اور اپنے کام خود ہی کر لیتے تھے۔ (جوں عرق گلاب جیسے بدن و پسینہ میں کہاں ممکن، مقصد کسی اور سے چڑھ آئی ہو یا محض تعلیم اُمت کے لیے اہتمام کرتے تھے۔) اسی طرح آپ کے گفتگو کا خاص وصف یہ تھا:

﴿يَفْتَتِحُ الْكَلَامَ وَيَخْتَتِمُهٗ بِاَشْدَاقِهٖ﴾

(المعجم الكبير للطبرانی)

یعنی آپ کی تمام گفتگو ابتداء سے انتہا تک منہ بھر کر ہوتی تھی۔ یہ نہیں کہ نوکِ زبان سے کٹتے ہوئے حروف کے ساتھ آدھی بات زبان سے کہی اور آدھی متکلم کے ذہن میں رہی۔ جیسا کہ متکبرین کا شیوہ ہے۔

میرے دوستو! حضرت والا کے شعر میں جو لبوں پر تبسم اور مسکراہٹ کی بات آئی ہے۔ دراصل یہ ایک تعبیر ہے کہ ظاہری طور پر جب لوگ ہنستے ہیں تو اللہ والے بھی اُن کے ساتھ مسکراتے ہیں اور ظاہری اُمور میں عام انسانوں کی طرح وہ بھی سب کام انجام دیتے ہیں لیکن اُن کے سینے میں ایسا تڑپتا ہوا دل ہوتا ہے جو اُن کو ایک لحظہ اور لمحہ بھی خدا کی یاد سے غافل ہونے نہیں دیتا۔ اسی لیے جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف اُوپر ذکر کیے گئے ہیں اُن تمام کے ساتھ ساتھ آپ کا حال یہ تھا کہ ایک لمحہ کے لیے اللہ سے غافل نہ رہتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

﴿كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ﴾

(صحيح البخاری، كتاب الاذان، باب هل يتتبع المؤذن)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر گھڑی اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے۔ بعینہٖ یہ حال اہلِ دل اللہ والوں کا ہوا کرتا ہے۔

میرے دوستو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ صفات کو سامنے رکھ کر آپ خود فیصلہ کیجیے کہ اگر کوئی انسان بظاہر ہواؤں میں بھی اُڑتا ہو، اور پانی پر چلتا ہو، اور اُس کے اردگرد مخلوق کا ایک جم غفیر جمع رہتا ہو، مگر ان صفات سے

خالی ہو تو کیا وہ بزرگ اور ولی ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ سب سے اونچا ولی وہی شخص ہے جو سب سے زیادہ سنتوں کا اتباع کرنے والا ہو۔

جعلی پیروں کے مخصوص احوال اور مصنوعی بزرگی کی ایک جھلک

احقر کو اس صورتِ حال کا انتہائی افسوس اور دُکھ ہوتا ہے، آج ہم عجمیوں میں ایک ایسا طبقہ ہے کہ اُس کے ذہن میں بس یہی بات ہے کہ بزرگ لوگ وہی ہوتے ہیں جن میں اِس طرح کے اوصاف موجود ہوں کہ وہ بولتا نہ ہو، اور جب بولے تو منہ بسوڑ کر پرتکلف انداز سے بولے اور چہرے پر جلالی کیفیات ہوں، ہنستا بالکل نہ ہو، نہ ہی بالکل دوڑ نا بھاگنا کرسکتا ہو کیونکہ آج کل لوگ اس کو بزرگی کے خلاف سمجھتے ہیں، لوگوں سے میل جول نہ رکھتا ہو، سلام میں پہل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو، کسی سے خیر خیریت پوچھ لینے کو اپنے وقار کے خلاف سمجھتا ہو بلکہ جواب بھی بڑی آہستگی سے دینے کا مزاج ہو، نہایت روکھا سوکھا انداز اپنائے ہوئے ہو، بات مکمل ہوئے بغیر مخاطب سے درمیانِ گفتگو بلا سلام علیحدہ ہو جاتا ہو، اپنی خاص شان کے ساتھ رہتا ہو، بازاروں میں جا کر اپنے کام کرنا ولایت کے خلاف سمجھتا ہو اور نہ ہی اپنے ذاتی کام کرسکتا ہو، جہاد وغیرہ کے لیے ورزش اور ایکسرسائز (Exercise) کرنے کو بزرگی کی شان کے خلاف جانتا ہو، ہتھیاروں کو مکمل چھوڑ کر صرف ایمان بنانے اور اصلاحِ نفس بنانے کی بات کرتا ہو اور ہتھیار وغیرہ رکھنے کو غلط اور بدمعاش لوگوں کی عادت سمجھتا ہو، کسی کی بیماری میں عیادت اور وفات کے وقت میں تعزیت کو اپنی خاص شان میں خلل کا باعث سمجھتا ہو، خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا جلنا معیوب جانتا ہو، اور گویا کہ اپنی ذہن میں بنائی ہوئی مفروضہ شان کے اعتبار سے لوگوں میں اپنے کو مستغرق فی اللہ باور کراتا ہو، ہر مجلس میں اپنی ایک امتیازی اور خصوصی شان رکھتا ہو، اپنے اردگرد لوگوں کے ہجوم کو پسند کرتا ہو، چلتے وقت لوگوں کے گروہ کے ساتھ چلتا ہو، کسی سے پورے طور پر متوجہ ہو کر بات نہ کرے، جلد جلد ادھوری بات کرنے کا مزاج رکھتا ہو۔

ہائے افسوس! اگر کسی کے اندر یہ اوصاف نہ ہوں، لیکن اُس کی پوری زندگی اتباعِ سنت اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے میں گزری ہو، باقی وہ اپنے کام بھی کر رہا ہے، ہنسی خوشی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، لوگوں کی خدمت کرنے اور راحت رسانی کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ اور دوسرے اوصافِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں رچا بسا ہوا ہو، تو انسانوں کا ایک طبقہ اُس کو بزرگ اور ولی ماننے کو تیار نہیں ہوتا جو کہ انتہائی غلط سوچ وفکر ہے اور اس نوع کے خیالات جوگیانہ اور ہندوانہ ذہن کی پیداوار ہیں جن کا اسلامی تصوف سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے حضرت والا نے فرمایا۔

لب ہیں خنداں جگر میں تیرا درد و غم
تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم

احقر نے حضرت والا کے ایک وعظ میں یہ بات سنی کہ ایک مرتبہ بڑے بڑے علماء کے مجمع میں جن میں حضرت مفتی شفیع صاحب، حضرت مفتی محمد حسن امرتسری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر عثمانی رحمہم اللہ وغیرہ جیسے اکابر موجود تھے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب بھی اُن کے درمیان تشریف فرما تھے۔ تو خواجہ صاحب نے بعض باتوں پر اِن حضرات کو خوب ہنسایا۔ پھر فوراً تھوڑے وقفے کے بعد رُک کر سوال کیا کہ بتاؤ! اس ہنسی کے دوران کون ہے جو اللہ کی یاد سے غافل نہ تھا؟ حضرت مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ سب علماء خاموش رہ گئے۔ حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بحمد اللہ عزیز الحسن اس حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ تھا اور پھر یہ اشعار پڑھے؎

ہنسی بھی ہے گو لبوں پہ ہر دم
اور آنکھ بھی میری تر نہیں ہے
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم
کسی کو اُس کی خبر نہیں ہے

محبتِ الٰہی کی حقیقت مرضئ مولیٰ پر ہر لمحہ فدا رہنا ہے

میرا مقصود ہر گز نہیں کیف و کم
تیری مرضی پر سر میرا تسلیم خم

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اصل بندگی یہ ہے کہ مؤمن اپنی ہر خواہش اور چاہت کو اللہ کی مرضی پر فدا کردے۔ ایک دو واقعات یا دس بیس امور اور سو پچاس و ہزار لاکھ معاملات کی بات نہیں اور نہ یہ کہ زندگی کے چند گنے چنے معاملات اور شعبے صرف مرضی الٰہی کے تحت ہوں اور باقی میں بزعمِ خود انسانیت کام کر رہی ہو اور اپنی من مانی پر عمل ہو رہا ہو یہ کامل عبدیت نہیں ہے اور یہ نسبت الٰہی کا مقصود نہیں ہے، اسلیے حضرت قاری امیر حسن صاحب نے غالباً حضرت شاہ احمد پرتاب گڈھی کا شعر سنایا تھا کہ؎

نسبت اسی کا نام ہے نسبت اسی کا نام
ان کی گلی سے آپ نکلنے نہ پائیے

یعنی ہر شعبۂ زندگی میں اور زندگی کی ہر سانس میں صرف مرضی الٰہی پر عمل ہو نہ یہ کبھی کہ ذکر و درود کی مجلس قائم ہوتی تو کبھی لایعنی باتوں کی محفل سجائی اور نری شعروشاعری ہوئی اور کچھ کیفیات طاری ہوئیں اور لوگ وجد میں آ کر جھومنے لگے اور عشاق بن کر نہ معلوم کہاں کہاں کی پروازیں کرنے لگے، لیکن دوسری طرف نہ نماز باجماعت کا خیال نہ پردہ کا اہتمام، وہیں لڑکے لڑکیاں مخلوط بھی محفلوں میں موجود ہیں اور خوب دھوم دھام سے فضول خرچیاں ہو رہی ہیں۔ صرف کیفیات میں مست ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا کوئی خیال و دھیان نہیں، تو یہ کوئی بندگی اور

عبدیت نہیں ہے۔

آج بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے کیفیات کو مقصود سمجھ کر انہیں میں اپنے کو مشغول کر رکھا ہے اور اسی کو نیکی و بزرگی کی معراج اور ولایت کی دلیل مانا جاتا ہے۔ جبکہ مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے صاف صاف بہانگِ دہل اعلان فرمایا ہے کہ اصل دین یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی شریعت وسنت کے مطابق ہو اور ہر قدم پر فکرِ آخرت اور خوفِ خدا دل پر غالب ہو اور اس کی ہر خواہش دین وشریعت کے تابع ہو۔

اس طرح حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے کہ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ وہ ہے کہ جو دین کا تعلق صرف مسجدوں کی حد تک سمجھے ہوئے ہے اور ان کی نظر میں دین دار ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نماز باجماعت پڑھتا ہو اور اس کی پابندی کرتا ہو اور کبھی ذکر وقرآن کی تلاوت کا معمول ہو اور کبھی حج وعمرہ وغیرہ کو بھی چلا جاتا ہو۔ بس یہ ان کی نگاہ میں کمالِ ایمان ہے اور متقی وولی ہونے کے لیے اتنی بات بہت ہے اور اس سے آگے اگر ان سے کوئی بات کہی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو دین کے اندر سختی ہے اور مولویوں کی بنائی ہوئی باتی ہیں اور یہ کوئی اتنی اہم نہیں ہے۔

حالانکہ دوستو! حضرت والا کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے احقر عرض کرتا ہے کہ اصل دین یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہر قدم پر اور ہر سانس میں اپنی جملہ خواہشاتِ نفسانیہ امرِ الٰہی پر قربان ہو رہی ہوں۔ خواہ وہ عبادات ہوں یا معاملات ہوں، معاشرت ہوں یا اخلاق ہوں اور جب ان تمام شعبوں میں انسان دین پر چلتا ہے اور ان تمام شعبوں میں اوامرِ الٰہی کو زندہ کرتا ہے اور نواہی سے اپنے کو بچاتا ہے تب جا کر اس کو مؤمن کامل اور مسلم کامل کہا جاسکتا ہے اور اس کے بعد ہی ولایت وتقویٰ کی صفات کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے گو کہ ایک گونہ ولایت وتقویٰ اس شخص کو بھی حاصل ہے مگر وہ کامل متقی نہیں ہے۔

جملہ شعبہائے حیات میں اسلام پر عمل لازم ہے

اور حضرت اشعار میں کوئی بات اپنی طرف سے پیش نہیں فرماتے ہیں بلکہ وہ سب قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ قرآن کریم کی آیات کو دیکھیں تو بعینہٖ یہ مضمون موجود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیۃ: ۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر

میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) اور مت چلو قدموں پر شیطان کے بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (معارف القرآن، ج:۱،ص:۴۹۷)

تو قرآن اپنے ماننے والوں سے کہتا ہے کہ مجھے پورے طور پر مانو، یہودیوں کی طرح نہیں کہ کچھ احکام پر تو عمل کرلیا اور ان کو لے لیا اور کچھ کو چھوڑ دیا بلکہ پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ تم سر سے پاؤں تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندگی اور غلامی میں داخل ہو جاؤ یعنی تمہارے بدن کے جملہ اعضاء زبان، آنکھ، کان، ناک، شرمگاہ، دل و دماغ سب کے سب دائرۂ اسلام اور طاعت الٰہیہ میں داخل ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکامِ اسلامیہ بجالا رہے ہو، مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں یا دل و دماغ کو اس پر مطمئن ہو، مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء وجوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو، بعض میں پس و پیش ہے اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظامِ حیات کا جو قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے۔ خواہ اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو یا معاملات ومعاشرت سے ہو، حکومت وسیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت وصنعت وغیرہ سے اسلام کا جو مکمل نظامِ حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

(معارف القرآن، جلد:۱، صفحہ:۴۹۹)

ایک اہم تنبیہ

آگے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے۔ معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزو ہی نہیں سمجھتے۔ اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے۔ حقوق ومعاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بے گانہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے نہ ان کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، نہ ان پر عمل کرنے کا۔ **والعیاذ باللہ من ذٰلک**۔ کم از کم مختصر رسالہ ''آدابِ معاشرت'' حضرت سیدی حکیم الامت رحمہ اللہ کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

اسی طرح قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾

(سورۃ الھود، اٰیۃ:۱۱۳)

ترجمہ: (اے مسلمانو! ان) ظالموں کی طرف (یا جو ان کی مثل ہوں ان کی طرف دلی دوستی سے یا اعمال واحوال میں مشارکت ومشابہت سے) مت جھکو، کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جاوے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمہارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر تمہاری حمایت کسی طرف سے بھی نہ ہو کیونکہ رفاقت تو حمایت سے سہل ہے جب رفاقت

کرنے والا بھی کوئی نہیں تو حمایت کرنے والا کون ہوتا۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۶۶۹)

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لیے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ سے زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے، کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اور فرمایا کہ شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے اور امام اوزاعی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی سے ملنے کے لیے جائے۔ اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہلِ کفر اور اہلِ معصیت اور اہلِ بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے۔ بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے۔
(معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۶۷۳)

حدیث شریف میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ﴾

(مشكاة المصابيح، كتاب الايمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

ترجمہ: تم میں سے کوئی مؤمن کامل نہیں ہوسکتا جب کہ اس کی خواہشات اس دین کے مطابق نہ ہوجائیں جو میں نے کہا ہے۔

میرے دوستو! یہ سب آیات اور بہت سی احادیث اس مضمون پر واضح دلیل ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہر قدم پر اور زندگی کے ہر شعبہ میں میرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔ اسی کو کامل بندگی کہتے ہیں اور یہی چیز اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مطلوب ہے اور آج کل استعمال ہونے والے تسلی کے کلمات کہ چلو کم سے کم اتنا تو ہے اور انگلش میں (A tleast) جیسے جملوں کا استعمال اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے، اسی لیے جو شخص اپنی ساری فکروں اور معاملات ومسائل کو حق تعالیٰ کے سپرد کرکے پورے طور پر ان کا ہو رہتا ہے، تو پھر حق تعالیٰ پورے طور پر اس کے ہوجاتے ہیں اور اس کی جملہ حاجات دنیویہ اور ہر نوع کے ہموم و غموم کے لیے کافی ہوجاتے ہیں، وگرنہ انسان جب خدا کی طرف پورا رجوع نہ ہوا تو اُسے ایسی فکروں اور الجھنوں میں ڈالا جاتا ہے کہ ان سے اسے نجات نہیں ملتی۔ کچھ افکار سے فراغت ملتی ہے، تو دوسرے فکروں کا دل ودماغ پر ہجوم ہوجاتا ہے۔ اور اسی طرح پوری زندگی پریشانیوں اور الجھنوں کی نذر ہوکر رہ جاتی ہے۔

ایمانی کیفیات کم وبیش ہوتی رہتی ہیں

ہو رہا ہے تیرا درد کیوں بیش و کم
رازدار محبت سے پوچھیں گے ہم

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ بات ثابت ہے کہ جب وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلسِ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تھے، توان کے دلوں پر ایسی رقت وگریہ اور ایسا خوف وخشیت چھایا رہتا تھا کہ جب وہ وہاں سے چلے جاتے اور بیوی بچوں میں لگتے تو پھر وہ حال نہ رہتا تھا تو اس کی اطلاع صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور بڑے گھبرائے کہ نہ معلوم ایسا کیوں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا کہ ساعةً فساعةً یعنی یہ حالت کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح، اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور اگر تم اسی حالت پر ہر وقت رہو تو لصافحتکم الملائکة پھر تو فرشتے تم سے مصافحہ کرنے لگیں۔

حضراتِ صحابہ کرام کو جب ایسی باتیں پیش آتی تھیں، تو وہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے دلوں کا حال پیش کر کے اس کا علاج دریافت کر لیتے تھے، مگر آج جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام موجود نہیں ہے، تو اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نائبین علماء ربانیین اور مشائخ عظام ہیں ان کی خدمت میں سالکین ومریدین اپنے احوال پیش کر کے اپنا علاج تلاش کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس طرح سونے چاندی کے ماہرین سے سونے چاندی کی معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور جسمانی امراض کے ماہرین سے جسمانی نظامِ صحت میں خلل پڑنے کی صورت میں رجوع کیا جاتا ہے۔ تو اسی طرح جو لوگ محبت خداوندی کے میدان کے کھلاڑی اور اس راہ کو طے کیے ہوئے ہیں ان سے اس راہ کی بات معلوم کی جائے گی اور پھر ان کی ہدایات پر عمل کیا جائے گا۔

آنسو اگر تھم بھی جائیں تب بھی

تھمتے تھمتے اگر اشک جائیں گے تھم
آتش غم میرے دل میں ہوگی نہ کم

احقر دوسرے مقام پر یہ مضمون عرض کر چکا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں جو آنسو گرتے ہیں ان آنسوؤں کی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں بڑی قدر و قیمت ہے اور درحقیقت یہ آنسو ترجمان درد دل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مقولہ ہے کہ "کل اناء یترشح بمافیه" جس برتن کے اندر جو ہوتا ہے اس سے وہی ٹپکتا ہے تو جس سینہ میں اللہ کے عشق ومحبت کی آگ لگی ہوئی ہے تو وہ آنسوؤں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر وقت روتے رہنے سے انسانی اور بشری حقوق کی ادائیگی ممکن نہیں اور نہ یہ بندوں سے مطلوب ہے اور اگر بعض اولیاء اللہ

سے اس قسم کے واقعات ثابت ہیں تو وہ درحقیقت غلبۂ حال ہے جس کی پیروی اُمت کے لیے نہیں ہے۔ ورنہ اصل انسانوں کے لیے یہ ہے کہ اللہ کی یاد میں تنہائی میں آنسو بہائے اور جلوت میں لوگوں سے مسکرا کر پیش آئے اور اپنے اہل وعیال اور دوست واحباب کے حقوق ادا کرے۔

لیکن یہ ادائیگی حقوق بھی اصل میں اللہ کی محبت کی وجہ سے ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس لیے ان کی ادائیگی بھی درحقیقت مظہرِ محبتِ خداوندی ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ جتنی عبادات وطاعات ہیں خواہ وہ کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں وہ سب کی سب مظاہر یادِ الٰہی ہیں اور اللہ کو یاد کرنے کی مختلف شکلیں ہیں، للہٰذا کبھی آنسو بہا کر اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، تو کبھی اپنے اہل وعیال میں ہنس کر اور مسکرا کر اور ان کے دل کو بہلا کر اللہ کو یاد کیا جاتا ہے اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی یاد اور اطاعت میں لکھتے ہیں، اسی لیے یہ سارے امور سنت نبویہ ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کو یاد کیا کرتے تھے۔

اور اللہ کے خوف سے رونا اور آنسو بہانا ہر وقت نہیں رہتا ہے۔ ہاں قلب میں اللہ کی محبت ہر وقت رہنی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت اور عشق ومحبت کا اصل محل قلب ہی ہے۔ کبھی کیفیت غالب ہوتی ہے اور آنکھیں آنسو بہانا شروع کر دیتی ہیں اور کبھی وہ آنسو رُک جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اصل چیز استقامت ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف ایک منٹ ایک سیکنڈ بھی نہ گزرے اور یہی اصل تقویٰ ہے جو زندگی کے آخری سانس تک مطلوب ہے۔ اور مدارِ نجات یہی امر ہے۔ تو اگر ہم بعض اولیاء اللہ کو دیکھیں کہ وہ زیادہ آہ وزاری اور گریہ وبکاء والے نہیں ہیں اور اُن کی آنکھیں بیانوں اور تقریروں میں زیادہ آنسو نہیں گراتی ہیں، تو اس کا یہ مطلب سمجھنا سخت غلطی ہے کہ یہ کامل اللہ والا اور بزرگ نہیں ہے، کیونکہ اگر بزرگ ہوتے تو بات بات میں رویا کرتے، کیونکہ جو آدمی کسی گناہ میں مبتلا نہیں ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی معصیت کے قریب نہیں جاتا ہے اور ہر حال کے اوامر کو بڑی استقامت کے ساتھ پورا کرتا رہتا ہے بس یہی دلیل ہے کہ اس کے سینہ میں وہ خزانۂ محبتِ الٰہی موجود ہے اور اس کا دل خوف وخشیتِ خداوندی سے لبریز ہے، باوجود گناہوں کی ظاہری زیب وزینت اور لذت ومزہ کے وہ ان کے قریب نہیں جاتا۔ ورنہ بعض لوگ ایسے دیکھے گئے کہ رونے میں بہت آگے ہیں اور بڑی جلدی آنسو نکل آتے ہیں، مگر احکام شریعت کے پورے طور پر پابند نہیں ہوتے نہ اوامر کو پوری توجہ اور دھیان سے پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور نہ معاصی سے بچنے کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں تو یاد رکھیے کہ یہ لوگ اللہ کے صحیح بندے اور ولی کہلانے کے لائق نہیں ہیں۔

اپنے مالک کو راضی کریں خوب ہم

جس کے دل میں نہیں ہے تیرا درد و غم
ہو کے انسان نہیں جانور سے وہ کم

دوستو سن لو تم کچھ میری داستاں
ایک دن پھر نہیں ہوں گے دنیا میں ہم

خاکِ تن میں نہیں ہے اگر دردِ دل
کوئی قیمت نہیں خاک ہیں صرف ہم

دو جہاں میں کوئی میری قیمت نہیں
ہاں اگر آپ کی ہو نگاہ کرم

صحبتِ اہل دل سے ملا دردِ دل
ورنہ پاتے کہاں سے یہ دولت بھی ہم

دردِ دل سیکھنا ہے اگر دوستو
ساتھ میرے رہو پھر سکھائیں گے ہم

سارے ارض و سما اور شمس و قمر
دیکھ کر پاگئے اپنے خالق کو ہم

دل کے ملنے کی ہے بات کچھ اور ہے
ساتھ رہتے ہیں گو ایک مدت سے ہم

سختیاں شیخ کی ہیں فنا کے لیے
مت سمجھ مت سمجھ ان کو ہر گز ستم

اختؔر بے نوا کی صدائیں سنو
اپنے مالک کو راضی کریں خوب ہم

مشکل الفاظ کے معانی:۔**خاکِ تن**: جسم، انسان مراد ہے۔ **ارض وسما**: زمین اور آسمان۔ **شمس وقمر**: سورج اور چاند۔ **خالق**: پیدا کرنے والا۔ **فنا کے لیے**: نفس کو مٹانے کے لیے۔ **ستم**: ظلم۔ **بے نوا**: بے آواز، عاجزی اور انکساری کا اظہار ہے۔

ایمان ومحبت سے خالی انسان حیوان سے کیا گذرا ہے

جس کے دل میں نہیں ہے تیرا درد وغم
ہو کے انسان نہیں جانور سے وہ کم

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد وغم نہ ہو، وہ ظاہری شکل وصورت اور اپنے نام کے اعتبار سے بنی نوع انسان میں داخل تو ہے، لیکن حقیقی معنی میں اس پر انسان کا اطلاق درست نہیں ہے، بلکہ جانور اور اس کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ یہ تعبیر بڑی بھاری اور سخت ہے تو اس سلسلہ میں احقر اتنا عرض کرنا چاہتا ہے کہ درحقیقت آپ اگر غور فرمائیں، تو اس تعبیر کو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، اٰیۃ: ۱۷۹)

ترجمہ: یہ لوگ (آخرت کی طرف سے بے توجہ ہونے میں) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (اس حیثیت سے کہ چوپایوں کو آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا مکلّف تو نہیں بنایا گیا سو ان کا متوجہ نہ ہونا مذموم نہیں اور ان کو تو اس کا حکم ہے پھر بھی بے توجہی کرتے ہیں سو اس اعتبار سے) یہ لوگ (ان چوپایوں سے بھی) زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ یہ لوگ (باوجود توجہ دلانے کے آخرت سے) غافل ہیں (بخلاف چوپایوں کے) (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۲۴)

قرآن تو مزید ان کے جانوروں سے بھی زیادہ بے راہ ہونے کا فیصلہ کر رہا ہے اور ان سے دیکھنے، سمجھنے اور سننے کی نفی کر رہا ہے، اگرچہ وہ ظاہر کے خلاف ہے۔

اس موقع پر حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بڑی بصیرت افروز گفتگو فرماتے ہیں۔ احقر اس کا نقل کرنا مناسب سمجھتا ہے تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے کہ اللہ کو بھولنے والے لوگ جانوروں کے مانند کیوں قرار دیئے گئے ہیں؟ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان لوگوں کی سمجھ بوجھ اور بینائی وشنوائی سب چیزوں کی بالکل نفی کی گئی ہے کہ یہ نہ کچھ سمجھتے ہیں نہ کوئی چیز دیکھتے ہیں، نہ کوئی کلام سنتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہ پاگل و دیوانے ہوتے ہیں جو کچھ نہ سمجھیں اور نہ نابینا ہوتے ہیں کہ کچھ نہ دیکھیں اور نہ بہرے ہوتے ہیں کہ کچھ نہ سنیں بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا کے کاموں میں یہ اکثر لوگوں سے زیادہ چالاک اور ہوشیار نظر آتے ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کے اندر اس کی ضرورت کے مطابق اور اس کے مقصدِ حیات کے مناسب عقل وشعور رکھا ہے، جن چیزوں کو ہم بے عقل اور بے حس وبے شعور کہتے اور سمجھتے

ہیں در حقیقت وہ بھی حس وادراک اور عقل وشعور سے خالی نہیں۔ البتہ یہ چیزیں ان میں اسی مقدار سے ہیں جو مقدار ان کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو۔ سب سے کم عقل وشعور اور حس جمادات یعنی مٹی اور پتھر وغیرہ میں ہے جن کو نہ کچھ بڑھنا ہے نہ اپنی جگہ سے نکلنا اور چلنا پھرنا ہے۔ وہ اتنی قلیل ہے کہ ان میں حیات کے آثار کا پہچاننا بھی بہت دشوار ہے۔ اس سے کچھ زائد نباتات میں ہیں، جن کے مقصدِ وجود میں بڑھنا، پھلنا، پھولنا داخل ہے۔ اسی کے مناسب عقل وادراک ان کو دے دیا گیا۔

اس کے بعد حیوانات کا نمبر ہے جن کے مقصدِ وجود میں بڑھنا بھی داخل ہے، چلنا پھرنا بھی اور چل پھر کر اپنی غذا حاصل کرنا بھی اور مضر ومہلک چیزوں سے بچنا بھاگنا بھی اور نسل پیدا کرنا بھی، اس لیے ان کو جو عقل وشعور ملا وہ اوروں سے زیادہ ملا، مگر وہ اتنا ہی کہ جس سے وہ اپنے کھانے پینے، پیٹ بھرنے، سونے جاگنے وغیرہ کا انتظام کریں اور دُشمن سے اپنی جان بچالیں۔

سب کے بعد انسان کا نمبر ہے جس کا مقصدِ وجود سب چیزوں سے آگے یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو پہچانے۔ اس کی مرضی کے مطابق چلے۔ اس کی ناپسند چیزوں سے پرہیز کرے، ساری مخلوقات کے حقائق پر نظر ڈالے اور ان سے کام لے اور ہر چیز کے نتائج اور عواقب کو سمجھے، کھرے کھوٹے، اچھے بُرے کو پرکھے۔ بُرائیوں سے بچے، اچھائیوں کو اختیار کرے۔ اسی نوعِ انسانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو ترقی کرنے کا بڑا میدان ملا ہے جو دوسری نوع کو حاصل نہیں۔ یہ جب ترقی کرتا ہے تو فرشتوں سے آگے مقام پاتا ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اعمال وافعال پر جزاء وسزا ہے، اس لیے اس کو عقل وشعور تمام انواع مخلوقات سے زیادہ ملا ہے تاکہ وہ عام حیوانات کی سطح سے بلند ہو کر اپنے مقصدِ وجود کے مناسب کاموں میں لگے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مخصوص عقل وشعور اور اس کی بخشی ہوئی۔ بینائی وشنوائی کو اسی کام میں صرف کرے۔

جب یہ حقیقت سامنے آ گئی تو ایک انسان کا سمجھنا، دیکھنا، سننا، دوسرے جانوروں کے سمجھنے سننے دیکھنے سے مختلف ہونا چاہیے۔ اگر اس نے بھی صرف انہی چیزوں میں اپنی عقل اور بینائی وشنوائی کی طاقتوں کو لگا دیا جن میں دوسرے جانور لگاتے ہیں اور جو کام انسان کے لیے مخصوص تھا کہ ہر چیز کے نتائج وعواقب پر نظر رکھے اور بُرائیوں سے بچے، بھلائیوں کو اختیار کرے۔ اگر ان پر دھیان نہ دیا تو اس کے باوجود عقل رکھنے کے بے عقل اور باوجود بینا ہونے کے نابینا اور باجود سننے والا ہونے کے بہرا ہی کہا جائے گا، اس لیے قرآن کریم نے دوسری جگہ ایسے لوگوں کو ''صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ''، یعنی بہرے، گونگے اندھے فرمایا ہے۔

اس میں اس کا بیان نہیں ہے کہ وہ اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کی ضروریات کو سمجھتے نہیں یا یہ کہ ان کے متعلق چیزوں کو دیکھتے سنتے نہیں بلکہ خود قرآنِ کریم نے ان لوگوں کے بارے میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ:

﴿یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ﴾

(سورۃ الروم، اٰیۃ: ۷)

دنیاوی زندگی کی ظاہری چیزوں اور امور و معاملات سے تو واقفیت رکھتے ہیں لیکن آخرت اور اس کی باتوں سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور فرعون اور ہامان اور ان کی قوموں کے بارے میں فرمایا کہ وَ كَانُوۡا مُسۡتَبۡصِرِيۡنَ یعنی یہ لوگ بڑے روشن خیال تھے، مگر چونکہ ان کی دانائی و بینائی کا سارا مصرف اتنا ہی رہا جتنا عام جانوروں کا ہوتا ہے کہ اپنے تن بدن کی خدمت کرلیں، روح کی خدمت اور اس کی راحت کے متعلق کچھ نہ سوچا نہ دیکھا۔ اس لیے وہ ان معاشیات اور عمرانیات میں کتنی ہی ترقی کرلیں۔ چاند اور مریخ کو فتح کرلیں، مصنوعی سیاروں سے دنیا کی فضا کو بھردیں، لیکن یہ سب خدمت تن بدن کے ڈھانچے اور پیٹ ہی کی ہے۔ اس سے آگے نہیں جو روح کے لیے دائمی چین و راحت کا سامان ہے، اس لیے قرآن کریم ان کو اندھا بہرا کہتا ہے اور اس آیت میں ان کے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کو جو سمجھنا چاہیے تھا وہ نہیں سمجھے، جو دیکھنا چاہیے تھا وہ نہیں دیکھا، جو سننا چاہیے تھا وہ نہیں سنا اور جو کچھ سمجھا اور دیکھا اور سنا وہ عام حیوانات کی سطح کی چیزیں تھیں جن میں گدھا، گھوڑا، بیل، بکری سب شریک ہیں۔

اس لیے آیتِ مذکورہ کے آخر میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ کہ یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں کہ بدن کے صرف موجود ڈھانچہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ روٹی اور پیٹ ان کے فکر کی آخری معراج ہے۔ پھر فرمایا کہ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ بلکہ یہ لوگ چوپاؤں اور جانوروں سے بھی زیادہ بے وقوف ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جانور احکامِ شرعیہ کے مکلّف نہیں۔ ان کے لیے جزا و سزا نہیں۔ ان کا مقصد اگر صرف موجودہ زندگی اور اس کے ڈھانچہ کی درستی تک رہے تو صحیح ہے، مگر انسان کو تو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس پر جزا و سزا ہونے والی ہے، اس لیے اس کا ان کاموں کو اپنا مقصد سمجھ بیٹھنا جانوروں سے زیادہ بے وقوفی ہے۔ اس کے علاوہ جانور اپنے آقا و مالک کی خدمت پوری بجالاتے ہیں اور نافرمان انسان اپنے ربّ اور مالک کی خدمت میں قصور کرتا ہے، اس لیے وہ زیادہ بے وقوف اور غافل ٹھہرا۔

خود میری داستاں میری زبانی سنو تو بات ہی الگ ہے

دوستو! سن لو تم کچھ میری داستاں
ایک دن پھر نہیں ہوں گے دنیا میں ہم

حضرت والا اپنے مریدین و مستفیدین کو ''دوست'' فرماتے ہیں اور یہ حضرت کا خاص اندازِ شفقت ہے کہ اس انداز سے ہم سب کو توجہ دلا رہے ہیں کہ یہ داستان درد و غم جو میری زبان سے رات و دن، صبح و شام جاری ہے، اس کو غور سے سن لو اور اس کی قدر کرلو، ورنہ ایک دن اس نعمت کی قدر نہ کرنے پر افسوس کروگے اور وہ وہ دن ہوگا کہ

جب ہم اس دنیا سے رخصت ہوکر اپنے وطن اصلی پہنچ گئے ہوں گے۔

اس کے ضمن میں احقر ایک بات عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اپنی باتوں کو داستانِ دردوغم اور بڑی قابلِ توجہ سمجھنا کیا یہ درست ہے؟ اور کیا یہ عُجب اور خوش خیالی نہیں ہے؟

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت مولانا شاہ احمد پرتا بگڑھی اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہوگیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہوگیا

اپنے قلب کے متعلق ارشاد فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب میرا دل اللہ کی محبت کے درد کے قابل ہوگیا ہے اور میرا دل اب اس قابل ہوگیا ہے کہ اس کو دل کہا جاسکے، تو اس کو عجب وغیرہ سے تعبیر نہ کریں گے، بلکہ اس کی حقیقت حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمائی ہے حضرت کے ملفوظات کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''انفاسِ عیسیٰ'' اس میں حضرت کا ملفوظ ہے کہ اکمل ہونا الگ ہے اور افضل ہونا الگ ہے۔ اوّل کا تعلق امر محسوس ومشاہد سے ہے۔ جیسے ایک شخص صرف حافظ ہے اور ایک حافظ بھی ہے اور عالم بھی ہے تو حافظ اور عالم شخص اپنے آپ کو صرف حافظ کے مقابلے میں اکمل سمجھ سکتا ہے اور افضل ہونا امر مخفی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں کہ انسان اللہ کی بارگاہ میں مقرب ہو اور اس کا بڑا مرتبہ اور اونچا درجہ ہو اور یہ بات قبل الموت کسی کو بھی معلوم نہیں ہوسکتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق امر مخفی سے ہے جس کا علم سوائے وحی الٰہی کے اور کسی صورت سے نہیں ہوسکتا، اس لیے اپنے کو کسی دوسرے سے اکمل سمجھنا جائز ہے بشرطیکہ دعویٰ نہ ہو، مگر افضل سمجھنا جائز نہیں ہے۔

تو اب اس ملفوظ کی روشنی میں احقر عرض کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا کی ہو اور اس کے کسی دوسرے بھائی اور ساتھی کو وہ نعمت نہ ملی ہو تو ایسے موقع پر اگر اس کو یہ احساس ہو اور ہونا بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا ہے کہ مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے تو یہ امر محمود و مطلوب ہے، کیونکہ بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اگر اس کو اس کا احساس نہ ہوگا تو پھر وہ شکر یہ کیسے ادا کرے گا۔

اس لیے حاصل شدہ نعمت کا استحضار ہو اور اس کا احساس ہو، مگر اپنا استحقاق نہ سمجھے اور اس پر غرور وفخر نہ کرے اور اس کی وجہ سے دوسروں کی تحقیر نہ کرے تو پھر یہ استحضار واحساس اس نعمت کی ترقی اور اس میں مزید جلا اور زیادتی کا سبب ہے۔ جیسا کہ حضرت تھانوی نے ایمان پر خاتمہ کا ایک طریقہ یہ ذکر کیا ہے کہ حاصل شدہ نعمت پر اظہارِ شکر کیا جائے۔

تو جب یہ بات واضح ہوگئی تو اس کی روشنی میں احقر یہ عرض کرتا ہے کہ اگر حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

محبت کے بیان کا خاص درد بھرا انداز عطا کیا ہے اور حضرت بطورِ شکر یہ کے اس کو بیان کرتے ہیں تو اس کو نہ عُجب کہتے ہیں، نہ یہ مذموم اور بُرا ہے، بلکہ درحقیقت عین مطلوب و مراد خداوندی ہے۔ بس اس کو اپنا کمال اور اپنا استحقاق نہ سمجھا جائے۔ جیسا کہ حضرت کے اشعار میں جگہ جگہ اس کا سبب توفیقِ الٰہی اور فیض صحبت اولیاء اللہ بیان فرمایا ہے۔

خاکِ تن میں دردِ دل نہ ہو تو وہ مثلِ خاکِ ارض ہے

خاکِ تن میں نہیں ہے اگر دردِ دل
کوئی قیمت نہیں خاک ہیں صرف ہم

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اس جسم خاکی میں ہم نے اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت حاصل نہ کی اور اس کی محبت کا غم ہمارے قلب کو عطا نہ ہوا تو بس پھر یہ انسان مٹی کا ڈھانچہ ہے۔ اس سے آگے اس کی اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اگر اپنی تمام حرام آرزوؤں اور خواہشوں کو اللہ کی مرضی پر قربان کر کے ہم نے اپنے مولیٰ کو راضی کر لیا، تو حق تعالیٰ اس کی بہت قیمت لگاتے ہیں اور اس قیمت کا اندازہ آپ قرآن کریم کی اس آیت سے لگا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾

(سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۶)

ترجمہ: جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو، تاکہ بدلہ میں دیں اپنے قیامت کے دن عذاب سے، تو ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے۔

(معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۱۲۴)

اس آیت سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ایمان والے کے ایمان کی کیا حیثیت ہے کہ اس ایمان کے فقدان اور نہ ہونے کے سبب اگر وہ اس کے بدلے ساری دنیا کے خزانے اور دولت بھی پا لے تو اس کو اس عذاب سے نجات نہیں ہوگی۔

تو گویا اللہ کی نگاہ میں ایک مؤمن کے ایمان کی اس قدر قیمت ہے کہ ساری زمین کے خزانے اور دوگنے ہوں تب بھی اس کے برابر نہیں، مگر یاد رکھیے کہ یہ ایمان جس کی قدر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں اتنی ہے وہ ایمان ہے جو صحابہ کو عطا ہوا تھا کہ لوگ ان کو بیوقوف اور پاگل اور مجنون اور سفیہ کہتے تھے، مگر ان کو اس کی کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی اور بیٹے اپنے باپ کو جنگوں کے موقع پر بوجہِ دینی دُشمنی وبغض فی اللہ کے اس طرح قتل کرتے تھے کہ ذرا اثر ان پر نہ ہوتا تھا اور جن کی ساری خواہشات اللہ کی مرضی پر قربان ہوتی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ناجائز محبتوں کے ساتھ کبھی جائز محبتوں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے

آج حضرت والا کی موجودگی میں اپنی اصلاح کے لیے ایک بات اور مزید آگے بڑھ کر عرض کرتا ہوں کہ اگر غلط اور خطا ہو تو اصلاح ہو جائے اور وہ یہ کہ آپ حضرات سنتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت ہو کہ اس پر اپنی ساری خواہشات کو قربان کر دے، یہ مضمون تو بار بار کانوں میں پڑتا ہی رہتا ہے، مگر اس سے بھی آگے ایک بات ہے کہ ایمان تو وہ ہے کہ حرام خوشیوں کو تو قربان کرنا ہی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاں جائز خوشیاں بھی حکمِ الٰہی سے ٹکرائیں ان پر بھی نشتر چلا دے اور ان کو بھی قربان کر دے۔ جیسا کہ صحابہ کے یہاں حرام کا تو تصور ہی نہ تھا، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آتے ہی اپنے بیوی بچوں میں رہنے کی جائز خوشی بھی فوراً قربان کر کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے سرنگوں ہو جاتے تھے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی راہ میں نکل پڑتے تھے اور یہ جائز محبتیں بھی ان کے لیے رکاوٹ نہ ہوتی تھیں۔ اپنے بیوی بچوں اور اپنے کاروبار اور اپنی ماؤں بہنوں کی محبت جائز ہے، لیکن قرآن اعلان کرتا ہے کہ اگر ان کی محبت اللہ و رسول کے حکم سے زیادہ محبوب ہو گئی تو بس عذابِ خداوندی کے منتظر رہنا۔

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ بیوی بچوں کی محبت شدید بھی ہو تو گنجائش ہے، مگر اشد نہیں ہونا چاہیے۔ کاروبار سے محبت ہو، مگر ایسی نہیں کہ جو خدا کی یاد سے غافل کر دے۔ یعنی ۴۹ فیصد چیزوں کی محبت ہو لیکن اس پر ۵۱ فیصد اللہ کی محبت غالب رہے اور جب انسان اس طرح زندگی گذارتا ہے کہ ہر قدم پر اللہ کی مرضی کو اپنی مرضی پر غالب رکھتا ہے اور ساری محبتیں حق تعالیٰ کی محبت پر قربان کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسا درد بھرا دل عطا فرماتے ہیں کہ جس کے سامنے اس کے لیے دونوں جہان کی نعمتیں بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی اور پھر اسے اللہ تعالیٰ آہ وزاری کی لذتیں عطا فرماتے ہیں اور اس کو عبادات کی حلاوت اور انوار عطا فرماتے ہیں اور اس کے دل میں غیر کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی ہے، بلکہ وہ محبتِ خداوندی سے لبریز ہوتا ہے، کیونکہ اگر غیر کی ذرا بھی جگہ باقی ہو تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل میں نہیں آتے ہیں۔ اس غیر کے تصور سے کیا ہوا کوئی عمل نہ اللہ کی رضا و قرب کا ذریعہ بنتا ہے اور نہ اس پر کوئی اجر موجود ہے، بلکہ عذاب اور سزا کی وعید ہے۔

اس لیے اگر کوئی مصنف اپنی تصنیف سے، مقرر اپنی تقریر سے اور مدرس اپنی تدریس سے یہ چاہے کہ لوگ میرے معتقد ہو جائیں اور میرا احترام کریں اور میری ہر طرف شہرت ہو جائے، لوگ مجھے خوب جان جائیں اور خوب ماننے لگیں اور مجھے بزرگ سمجھنے لگیں تو یاد رکھنا کہ یہ تصنیف و تالیف اور تقریر و تدریس نہ صرف یہ کہ باعث اجر و ثواب نہیں ہے بلکہ موجبِ سزا اور باعثِ عتاب و عذاب ہے۔

اسی لیے اللہ کی پوری عظمت اور اس کی بڑائی و بزرگی کی شایانِ شان یہ ہے کہ ہر عمل سے صرف اس کی رضا

مقصود ہو اور اِدھر اُدھر کا کا کوئی التفات نہ ہو اور نہ ہی اس کے غیر کا کوئی خیال ذہن میں آئے، اور اس امر یعنی اخلاص کے مکمل حصول کے لیے انسان صرف اتنا غور وفکر کر لے کہ آج میں جن سے عزت چاہ رہا ہوں، کل کو جب ایک دن نہ میں ہوں گا اور نہ یہ سب ہوں گے تو پھر یہ عزت ساری کہاں جائے گی؟ اور اس سے کیا حاصل ہوگا یہ تو محض ایک خیالی عزت ہوئی کہ صرف لوگوں کا خیال ہے کہ میں بہت اچھا ہوں، بزرگ ہوں۔

اللہ راضی ہوتو عزت نصیب ہوتی ہے

ورنہ حقیقی عزت وہ ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان سے زمین پر اُتارتا ہے اور اگر بندہ اپنے اعمالِ صالحہ اور تنہائیوں میں کی ہوئی گریہ وزاری کے نتیجہ میں اللہ کی نگاہ میں مقبول بنتا ہے تو سارے عالم میں اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهُ قَالَ فَيُحِبُّهُ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ يُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَيَقُوْلُ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيْلَ فَيَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَيُبْغِضُهُ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ يُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَيُبْغِضُوْنَهُ ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِی الْاَرْضِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة الادب، باب اذا احبّ الله عبدا، ج: ۲، ص: ۳۳۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب بناتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم فلاں شخص سے محبت رکھتے ہیں، تم بھی اس سے محبت رکھو۔ پس جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر جبرئیل علیہ السلام آسمان میں ندا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو چاہتے ہیں تم سب اس سے محبت رکھو۔ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اہلِ زمین میں اس شخص کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کو کسی شخص سے بغض ہوتا ہے تو اسی ترتیب مذکور سے اہلِ زمین کے قلوب تک اس کی مبغوضیت آجاتی ہے۔ روایت کیا ہے اس کو مسلم نے۔

فائدہ: تو درحقیقت اس حدیث کو یہاں ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ دراصل انسان کو چاہیے کہ رات ودن صرف ایک اللہ کی رضا کی فکر میں لگا رہے اور بس یہی دھن اور دھیان رہے کہ میرے کسی عمل سے اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہوجائے اور کوئی کام مجھ سے اللہ کو ناراض کرنے والا نہ ہوجائے، اس صورت میں اوپر ذکر کیا ہوا وعدہ مکمل طور پر وجود میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ مخلوق کی پرواہ کو دل سے بالکل باہر کردے نہ ان کی مدح وذم کی پرواہ ہو اور نہ ان سے نفع وضرر کا خیال ہو اور نہ ان کی ملامت اور طعن وتشنیع کا ڈر ہو تو پھر یہ باقی رہنے والی محبت نصیب ہوتی ہے۔

غور فرمائیں کہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے کبھی ساؤتھ افریقہ نہ دیکھا تھا اور نہ وہاں گئے تھے، مگر آج گھر گھر یعنی تقریباً ہر دیندار مسلم گھرانے میں حضرت تھانوی کی کوئی نہ کوئی کتاب آپ کو ضرور مل جائے گی اور دنیا بھر میں مختلف خانقاہوں اور مدارس میں وعظوں اور تقریروں میں حکیم الامت کا نام اور ان کے ارشادات کس طرح ذکر ہورہے ہیں اور یہی حال حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ کا ہے کہ پوری دنیا میں کیا کچھ ان کی عزت ہے کہ قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب ''فضائلِ اعمال''۔

تو معلوم یہ ہوا کہ حقیقی عزت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کا نظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہے کہ وہ آسمانوں سے زمین کی طرف آتی ہے۔ زمین سے آسمانوں کی طرف نہیں جاتی ہے۔ یعنی اصل یہ ہے کہ انسان اس کی فکر کرے کہ اس کی تنہائیاں اور اس کی محفلیں سب یکساں ہوجائیں اور اس کی خلوتیں اس کی جلوتوں سے زیادہ خداترسی میں گذرے اس کا مصداق نہ ہو۔

بہت آساں ہے مجلس میں معاذ اللہ کہہ دینا
بڑا مشکل ہے خلوت میں گل گلگوں سے بچ رہنا

کہ جلوتوں میں تو بہت لاحول پڑھی جارہی ہو اور بہت استغفر اللہ و معاذ اللہ کہا جارہا ہو اور خلوتوں میں ہر قسم کی نافرمانی اور عیاشی میں مبتلا ہو۔ یہ درحقیقت نفاق کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ منافق کی حالت ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو ان کی حالت الگ ہوتی ہے اور جب وہ تنہائیوں میں ہوتے ہیں، تو ان کے حالات الگ ہوتے ہیں۔

مقبولینِ بارگاہِ حق کی پہچان

اور جب انسان تنہائیوں میں خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہوتا ہے تو پھر وہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر اہلِ زمین میں اس کی محبت ڈالی جاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے اور اس حدیث سے حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ایک عجیب وغریب نکتہ نکالا ہے۔ فرماتے ہیں پر کہ ''علامتِ مقبول وغیر مقبول'' اس حدیث میں اولیاء کی غیر اولیاء سے ایک شناخت مذکورہ ہے۔ اس علامت سے طلبِ شیخ میں کام لینا چاہیے و نیز غیر مقبول سے احتراز لازم سمجھنا چاہیے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ بلا کسی سبب وتعلق ونفع یا ضرر دنیوی کے اکثر خلائق کا کسی کی طرف میلانِ قلبی اور گمان نیک ہونا علامت ہے اس شخص کے محبوب ومقبول ہونے کی۔ اسی طرح بلا کسی لوث ونفع وضرر ظاہری کے اکثر لوگوں کا کسی سے نفرت کرنا اور اس کو اچھا نہ سمجھنا علامت ہے غیر مقبول عند اللہ ہونے کی اور جو صداقت یا عداوت کسی احسان یا رشتہ داری یا نقصان اور ناموافق حالات سے ہو اس کا اعتبار نہیں ہے۔ اور یاد رہے کہ جن لوگوں کی طینت میں خبث وفساد غالب ہے ان کا ادراک بھی غیر معتبر ہے۔ (التکشف، صفحہ: ۲۶۸)

چنانچہ ہمارے اکابر علمائے کرام اور بزرگانِ دین رحمہم اللہ اپنے آپ کو اپنے خیال میں کچھ نہ سمجھتے تھے، مگر اس تواضع کے سبب عنداللہ مقبول ومحبوب تھے مذکورہ نشانی ان پر پوری پوری صادق آتی ہے کہ بس لوگ ان کے ایسے دیوانے ہوتے تھے اور ایسی محبت لوگوں کے دلوں میں ان سے قائم تھی کہ اپنی جان و مال ان پر لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ درحقیقت وہی چیز ہے کہ جو بظاہر عالم بالا میں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں میں قبولیت کا مظہر ہے۔ اس قسم کے واقعات حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی اور حضرت حاجی صاحب اور خود تھانوی رحمہ اللہ کے بہت ہیں جن پر مستقل کتابیں تصنیف ہوسکتی ہیں۔

جبکہ تصویر کا دوسرا رُخ ہمارا حال عام طور پر یہ ہے کہ جس نے جماعت میں دو چار چلّے لگا لیے یا جس نے کسی اللہ والے کے پاس چند دن خانقاہ میں گذار لیے اور کچھ دو چار کتابیں تصنیف کردیں اور چند بیانات اور وعظ و تقریر کردیے تو اب وہ یہ سوچنے لگتا ہے اور اس کو یہ فکر لگ جاتی ہے کہ جلد سے جلد میرے بزرگ اور حضرت جی ہونے کا اعلان ہونا چاہیے اور کب لوگ مجھے بحیثیت شیخ و پیر تسلیم کرنا شروع کریں گے اور کیوں لوگ میری طرف رجوع نہیں ہورہے ہیں؟ حالانکہ میرے اندر یہ خوبی ہے اور وہ خوبی ہے؟ آخر کب لوگ مجھے اپنی نگاہوں میں مقام دیں گے اور مجھے مخدوم ومکرم اور محترم ومعظم سمجھنا شروع کریں گے اور پھر اس کے نتیجہ میں دوسروں سے حسد وبغض کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور ناز وغرور اور فخر وکبر میں پڑکر اپنے سارے اعمال کو ضائع کرڈالتا ہے اور احقر بہت وضاحت سے اس موقع پر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ درحقیقت یہ خواص اور علماء اور خدامِ دین کا انتہائی خطرناک اور بھیانک فتنہ ہے اور دل کی ایسی مہلک بیماری ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ساری عمر کی خدمت دین عنداللہ رائیگاں اور بے کار رہے، اسی لیے ملاعلی قاری نے بھی شرح مرقاۃ میں فرمایا ہے کہ:

﴿وَقَدْ قَالَتِ السَّادَةُ الصُّوْفِيَةُ رَحِمَهُمُ اللهُ اِنَّ اٰخِرَ مَا يَخْرُجُ مِنْ رَأْسِ الصِّدِّيْقِيْنَ مَحَبَّةُ الْجَاهِ﴾

(المرقاۃ، کتاب الرقاق)

کہ اللہ والوں کے دلوں سے سب سے آخر میں نکلنے والی بیماری حب جاہ (عہدہ ومصب کی محبت) ہے۔

صاحبو! کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب ہماری آج 'کل' میں تبدیل ہوگی تو نہ ہمارے نام باقی رہیں گے نہ نشان باقی رہیں گے اور کیا یہ روزمرّہ کا مشاہدہ نہیں ہے کہ بڑے مضبوط محلوں میں رہنے والے، بڑی بڑی عمریں پانے والے اور بڑی دولتوں اور حکومتوں والے بھی آج کیسے افسانوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو اس پر یقین نہیں آتا ہے تو آیئے ہم اپنی نگاہوں کے سامنے موت کی آغوش میں جانے والوں کی قبریں کھودیں اور ذرا یہ دیکھیں کہ سوائے مٹی کے ڈھیر کے وہاں کچھ ہے۔ حضرت والا کا شعر ہے کہ ؎

آہ جب دنیا سے کوئی آخرت کو جائے ہے
بس اکیلا جائے ہے اور سب دھرا رہ جائے ہے

آخرت کا سفر اکیلے اور تنہا کرنا ہے

تو آخر جب ہماری حقیقت یہ ہے تو پھر اس دنیا میں جیتے جی صرف اللہ کی محبت وعظمت کا نعرہ لگاؤ اور اس کی بزرگی وتقدس کے گیت گاؤ اور کبھی کبھی اپنی زبان سے دل کے استحضار کے ساتھ کہا کرو کہ یا اللہ! عزت تیرے لیے ہے، تجھے جچتی بجتی ہے۔ بزرگی تیری شان ہے اور ہر نوع کا تقدس و پاکی صرف تیرے لیے ہے۔ عظمت و شہرت کی مستحق بس تیری ذات ہے۔ بقاء وحیات درحقیقت تیری صفت ہے۔ ہم مخلوق سے ان چیزوں کو چاہ کر کیا کریں گے جو کچھ تو اپنے خزانہ سے ہمیں عطا کردے تو یہ تیرا احسان اور کرم ہے۔ اور تو نے اپنی مخلوقات میں جو ہمیں شرفِ انسانیت بخشا ہے یہ تیری بڑی نعمت ہے۔ پھر اس پر مزید احسان فرمایا کہ مسلمان بنایا ہے اور حضرت نبی پاک محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے بنایا، یہ تیری بے شمار نعمتیں ہیں۔

کلمۂ توحید کا اہم سبق

اگر انسان اپنی حقیقت پر غور کیا کرے کہ میرا مبداء کیا ہے؟ اور میرا معاد کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ اور کہاں لوٹ کر جاؤں گا؟ تو پھر اپنی شہرت وعظمت اور اپنے مقام وعزت کے بتوں کو اپنے دل سے بڑی جلد نکال کر باہر کردے گا اور بس جب یہ مکمل طور پر دل سے رخصت ہوجائیں گے تو پھر اس دل کے مہمان اللہ تبارک وتعالیٰ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنی پوری تجلیات کے ساتھ اس دل میں آجائیں گے، اسی لیے کلمۂ توحید میں ''لَا اِلٰہَ'' کو ''اِلَّا اللّٰہ'' پر مقدم رکھا گیا ہے کہ پہلے سارا غیر نکل جائے گا تو پھر اللہ ملے گا۔

اس پر حضرت والا کا ایک واقعہ ہے کہ کسی فوجی افسر نے حضرت سے پوچھا کہ میرا ''اِلَّا اللّٰہ'' کیسے مضبوط ہوگا؟ تو حضرت والا نے فرمایا کہ اپنی ''لَا اِلٰہَ'' کو مضبوط کرلو تو الا اللہ مضبوط ہوجائے گی۔ حضرت کا شعر ہے ؎

لا الہ ہے مقدم کلمۂ توحید میں
غیرِ حق جب جائے ہے تب دل میں حق آجائے ہے

اور حب جاہ کی شکل میں جب غیر اللہ دل میں موجود ہو تو اللہ نہیں ملتا ہے۔ اس پر بھی حضرت والا کا دوسرا شعر ہے ؎

کیسے سمجھ لوں پاگیا وہ جام معرفت
رکھتا ہے خود کو جو بھی نمایاں کیے ہوئے

اس مذکورہ گفتگو سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ساری دنیوی عزتیں اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑائی اور شہرت کی چاہت یہ سب خواب وخیال ہے اور محض خیالی عزتیں ہیں جن کا نفس الامر (حقیقت) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے بڑے ہی پیارے انداز سے اس مضمون کو اپنے اشعار میں پرویا ہے کہ ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی یہ فقط وقت کا گذرنا ہے
مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

عزت تو وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جو پائیدار ہوتی ہے اور جس کی بنیاد پر انسان کو سرخروئی سعادت مندی نصیب ہوتی ہے اور جس کی بنیاد پر عنداللہ اس کے لیے نعمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور جنت کی نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا مقدر بنتی ہیں ورنہ خود لوگوں میں اپنے مقام وشہرت کا خیال یہ محض خیالی چیز ہے اور شاعر کہتا ہے کہ جہاں تک دنیا کی رنج وراحت اور خوشی وغمی کی باتیں ہیں، تو یہ تو وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔

ایک وہ انسان ہے کہ جس کی آج بڑی شان وشوکت سے گذری ہے اور ایک وہ ہے کہ جس کی آج پریشانیوں اور مصائب میں گذری ہے لیکن جب ان کی یہ آج، کل میں بدلتی ہے تو پھر عیش وعشرت والا اور تنگی و پریشانی والا سب برابر ہوتے ہیں اور دونوں کے درمیان فرق کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے، اس لیے جس دن دونوں کے جنازے ترتیب سے رکھے ہوں تو ان میں کوئی فرق نہیں کرسکتا ہے۔ ایک خوشحال ڈاکٹر اور لویر(L a w e) اور بادشاہ ووزیر کا جنازہ ہو اور دوسری طرف کسی فقیر ومسکین اور کسی یتیم و بے کس و بے بس انسان کا جنازہ ہو، دونوں کو دیکھو اور دونوں کی شکلوں پر بغور نظر ڈالو، لیکن کون عیش وعشرت میں تھا اور کون فقر وفاقہ کی مصیبت میں تھا، اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکتا ہے اور نہ ہی دونوں مین کوئی فرق ہوسکتا ہے۔

مگر افسوس کہ انسان اس وقتی خوشی وعیش کے لیے اپنی قیمتی زندگی کے ان قیمتی لمحات کو ضائع کرتا ہے کہ جن کی بدولت اگر وہ چاہتا تو آخرت کی دائمی اور ابدی نعمتوں کو حاصل کرتا اور ہمیشہ کے ایسے چین وسکون کا سودا کرتا کہ جس کے ملنے کے بعد پھر بے چینی اور بے سکونی کا تصور بھی نہیں ہے اور تکلیف وپریشانی اور دُکھ درد اور فکر وغم کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ بس جب انسان اپنے پیشِ نظر صرف اپنے محبوب حقیقی اللہ تعالیٰ کی رضا کو رکھ کر چلتا ہے اور غیر اللہ سے ہر قسم کے نفع وضرر کا التفات بھی نہیں رکھتا تو یہ انسان محض خاک اور مٹی کا ایک ڈھیر نہیں ہوتا بلکہ پھر اسے بارگاہِ الٰہی میں وہ مقام عطا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اس پر رشک آنے لگتا ہے اور یہ فرشتوں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ خواص بشر خواص ملائکہ سے اور عوام بشر عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ چنانچہ شرح عقائد، صفحہ:۱۷۶ پر ہے کہ **وَرُسُلُ الْبَشَرِ اَفْضَلُ مِنْ رُسُلِ الْمَلَائِكَةِ وَرُسُلُ الْمَلَائِكَةِ اَفْضَلُ مِنْ عَامَّةِ الْبَشَرِ وَعَامَّةُ الْبَشَرِ اَفْضَلُ مِنْ عَامَّةِ الْمَلَائِكَةِ** اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر حضرت فرماتے ہیں کہ بس ہم خاک اور مٹی کا ایک ڈھیر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہماری کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ جانور اور جانوروں سے بھی بدتر اور گئے گذرے ہیں۔

حق تعالیٰ کی نظرِ کرم ہی سے قیمت وحیثیت ہے

دو جہاں میں کوئی میری قیمت نہیں
ہاں اگر آپ کی ہو نگاہِ کرم

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اس شعر میں جس سوچ اور فکر کو پیش کیا ہے۔ یہ وہ سوچ ہے کہ جو تمام انبیاء واولیاء حضرات صحابہ وتابعین غرضیکہ جملہ اسلاف اُمت کی وراثت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ بات بہت ہی پسند ہے کہ انسان اپنی نگاہ میں اپنی قیمت نہ لگائے اور اپنے کو بے قیمت سمجھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی بڑی اونچی قیمت لگاتے ہیں اور لوگوں میں بھی اللہ تعالیٰ اس کی قیمت وحیثیت کو بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس پر خصوصی کرم کا معاملہ فرماتے ہیں اور اس کو عزت ومرتبہ عطا فرماتے ہیں۔

اس مضمون کو حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے قسم کے ساتھ مؤکد کر کے فرمایا ہے کہ اللہ کے لیے جو تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سربلندی عطا فرماتے ہیں۔ اور یہ عقلی طور پر بھی بالکل درست ہے کہ خود انسان اگر اپنے ذہن میں اپنی قیمت لگالے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی عورت کو زیور سے آراستہ کیا گیا تھا اور بڑے عمدہ کپڑے اور ساری چیزیں بہت اچھی تھیں، تو عورتوں نے اس کی تعریف شروع کی کہ تم بہت اچھی معلوم ہوتی ہو شوہر کو بڑی پسند آؤ گی اور بہت تعریف کی تو اس نے کہا کہ اگر میں اپنے شوہر کی نگاہوں میں بھا گئی اور پسند آ گئی تو تمہاری ساری تعریفیں ٹھیک ہیں ورنہ سب بے کار ہے۔

تو ٹھیک بالکل اسی طرح انسان کو خود کیا معلوم ہے کہ میرا کوئی عمل بارگاہ الٰہی میں قبول ہے یا نہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ مجھ پر نظرِ کرم فرمائیں گے یا نہیں اور کیا میں بخشا جاؤں گا یا نہیں؟ اور میرا شمار سعادتمندوں میں سے ہو یا اہلِ شقاوت میں سے؟ یہ سب کچھ ہماری نظروں سے اوجھل اور مخفی ہے تو پھر اپنی قیمت لگانا تو عقلی طور پر بھی بڑی نادانی ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ جب ہم نے اعمال کیے ہیں، نماز پڑھی ہے، روزے رکھے ہیں اور دوسرے بہت سے خیر کے کام کیے ہیں، تو آخر ان کی قیمت تو ہوگی، اس لیے اپنی قیمت لگانے کو کیسے عقلی طور پر خلاف عقل کہہ سکتے ہیں تو اولاً تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آخران اعمال کی توفیق کس نے دی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ توفیق بھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے دی ہے، اس لیے حضراتِ علماء نے لکھا ہے کہ جو نیکی ہو جائے اسے اپنی عقل وفہم اور سمجھ کا نتیجہ یا اپنا ذاتی کمال نہ سمجھے بلکہ تصور کرے کہ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فلاں خیر کا کام کروادیا اور اس کے ہونے کو محض بلا استحقاق فضلِ خداوندی سمجھے اور یہی حقیقت بھی ہے۔ حتیٰ کہ کسی کارِ خیر کی سوچ اور خیال تک بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم ہی کا اثر ہوتا ہے تو جب بات یوں ہے تو پھر اپنی کسی نیکی کی اپنے طور پر کیسے قیمت لگائی جاسکتی ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی کیا ضمانت اور گارنٹی ہے کہ وہ عمل جتنے اخلاص اور صدقِ دل سے اللہ کی عظمت کے شایانِ شان ہونا چاہیے تھا وہ ویسا ہوا کہ وہ قبول ہو سکے یا ویسا نہ ہو سکا۔

ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ کسی انسان کے لیے جائز ہی نہیں، کیونکہ جب یہ امر ہماری نگاہوں سے مخفی ہے، تو پھر اس کو سوچنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ہاں! بس اللہ تعالیٰ سے اُمید قائم کی جاسکتی ہے اور یہ اُمید لازم بھی ہے کیونکہ کہ مومن کی شان ہی یہی ہے کہ خوفِ عدم قبول بھی رہے اور اُمید قبولیت بھی قائم رہے اور اسی کا نام ایمان ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ۔

الغرض اس تمام تفصیل کا منشا حضرت والا کے اس شعر کی تشریح ہے کہ یااللہ! میری تو کوئی قیمت اور حیثیت دونوں جہاں میں نہیں ہے۔ بس آپ کی نگاہِ کرم اگر ہو جائے گی تو نجات کی اُمید ہے ورنہ اپنے اعمال کی تو کیا حقیقت ہے اور اس شعر میں ہمارے لیے اور حضرت کے متعلقین اور دوستوں کے لیے بڑی نصیحت ہے کہ اپنی پوری جوانی مجاہدات کی نذر کر دینے کے باوجود حضرت والا ایسی بات فرما رہے ہیں اور اپنے اعمال سے اس طرح صرفِ نظر کر کے فضلِ الٰہی پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور اپنے مجاہدات وعبادات سے نظر ہٹا کر اللہ کے فضل وکرم کے اُمیدوار ہو رہے ہیں، پھر آخر ہم سب کے لیے ناز اور فخر کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے اور اپنے اعمال پر نظر کر کے ان پر اعتماد کے کیا معنی رہتے ہیں۔

دردِ دل بس اہلِ دل سے ہی ملتا ہے

صحبتِ اہلِ دل سے ملا دردِ دل
ورنہ پاتے کہاں سے یہ دولت بھی ہم
دردِ دل سیکھنا ہے اگر دوستو
ساتھ میرے رہو پھر سکھائیں گے ہم

اوّل شعر میں حضرت والا یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ بحمد اللہ میں نے اپنے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اللہ تعالیٰ کی محبت پائی ہے اور دردِ دل کی نعمت حاصل کی ہے اور اگر یہ صحبت اولیاء اور خدمت اہل اللہ نہ ملی ہوتی تو ہمیں اس دولت کی ہوا بھی نہ لگتی۔ چنانچہ حضرت والا کی زندگی کے ابتدائی تین سال پندرہ سال کی عمر سے اٹھارہ سال تک حضرت شاہ احمد پرتا بگڈھی کی خدمت میں گذرے اور پھر سولہ برس حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ کی خدمت میں اور پھر باقی زندگی تا حیات حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ سے اصلاحی تعلق میں گذاری ہے۔

حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت پھولپوری رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد ہمارے حضرت والا کو خط لکھا: ''حضرت شاہ پھولپوری کی خدمت از اوّل تا آخر مبارک ہو۔'' اور حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ نے یہ بھی

فرمایا کہ جیسی خدمت اپنے بزرگوں کی اور شیخ کی پہلے زمانہ میں لوگ کیا کرتے تھے، وہ (حضرت مولانا شاہ) حکیم اختر نے اس دور میں کر کے دکھائی ہے۔

اور پھر اگلے شعر میں حضرت والا ارشاد فرما رہے ہیں کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کی محبت کی باتیں سننا اور بولنا اور لکھنا پڑھنا ہے اور ان باتوں پر کتابیں تصنیف و تالیف کرنا ہے اور ایک اللہ کی محبت کو سیکھنا ہے، دونوں میں فرق ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ آج دنیا کی چیزوں کے سلسلہ میں تو ہم نے پڑھنے اور سیکھنے کو الگ الگ کر رکھا ہے یعنی صرف پڑھنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کو پھر کسی ماہر کے پاس وقت دے کر سیکھتے ہیں، مگر دین کے سلسلہ میں صرف پڑھنے کو کافی سمجھ لیا ہے اور سیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جیسے دنیا کی چیزیں سیکھے بغیر نہیں آتی ہیں۔ اسی طرح دین کی باتیں بھی سیکھے بغیر نہیں آتی ہیں، ڈاکٹری ہے یا سلائی، وبنائی وکڑھائی کا کام ہو یا اور دوسرے بے شمار کام ہوں۔ صرف کتابیں ہی دیکھ کر کوئی نہیں کرتا ہے بلکہ پہلے کسی ماہر کے پاس چند دن رہ کر ان کاموں کو سیکھتا ہے، اس لیے کسی ڈاکٹر کو گورنمنٹ کی طرف سے اس کے پیشے کو باقاعدہ شروع کرنے کی اجازت نہیں ملتی ہے جب تک وہ کسی ماہر کے پاس رہ کر پریکٹس نہ کر چکا ہو اور نہ اسے باقاعدہ سرٹیفکیٹ (Certificate) دیا جاتا ہے۔

اصلاح وتزکیۂ کے باب میں ہمارے اکابر کا حال اور موجودہ افسوسناک صورتحال

اسی لیے ہمارے اکابر دارالعلوم دیوبند کے یہاں شروع میں باقاعدہ یہ معمول رہا ہے کہ دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد طلبہ کو کسی بزرگ صاحب سلسلہ سے ضرور تعلق قائم کرنا ہے، ورنہ اس کے بغیر ان کو سندِ فضیلت نہیں دی جاتی تھی۔ گویا کہ یہ بھی نصاب کا ایک حصہ تھا۔ جیسا کہ حضرت محمد مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''دینی مدارس کا نصابِ تعلیم'' میں اس موضوع پر لکھا ہے کہ بہت ہی کم کوئی مدرس ایسا ہوتا تھا کہ جس کا تعلق اصلاحی اس وقت کے کسی ولی اللہ سے نہ ہو۔ چنانچہ اس کا اثر یہ تھا کہ اس مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے استاذ و طالب علم کا تو کیا کہنا، دربان بھی اس دور میں صاحبِ نسبت ولی اللہ ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ دارالعلوم کی تاریخ میں لکھا ہوا ہے اور یہی چیز اس دینی درسگاہ کا وصف امتیازی تھا، اس لیے میں آج آپ کے سامنے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے بزرگوں میں سے بلا استثناء کسی کا نام لیجیے کہ جس نے کوئی اہم خدمت اور دینی کارنامہ انجام دیا ہو اور وہ کسی بزرگ سے وابستہ نہ ہو جتنے بزرگان دیوبند وسہارنپور گزرے ہیں تقریباً سب کا معاملہ یہی تھا۔

میں بہت حیران ہوتا ہوں کہ آج کل کی نئی نسل کے جوان جنہوں نے دین کی الف ب (''الف، ب'') کو جان لیا۔ یہ بزرگوں سے ملنے، ان سے اصلاحی تعلق اور بیعت کو شخصیت پرستی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کے علاوہ دوسرا کام کہنے لگتے ہیں اور طرح طرح کے شکوک وشبہات اور اعتراضات واشکالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ بعضوں کی زبانوں سے ایسے زہریلے جملے بھی سنے گئے کہ اب خانقاہوں اور ملفوظات کا وقت نہیں رہا۔ اب میدانوں میں نکلنے کا وقت ہے۔

حالانکہ اپنے وقت کا مجدد الملۃ اور حکیم الامۃ جن کو بالاتفاق اپنے ملک کے تمام طبقوں میں حکیم الامت تسلیم کیا گیا ہے یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں: جیسا کہ پہلے بھی گذرا ہے کہ میں تو اہل اللہ کی صحبت اور ان سے تعلق کو اس دور میں فرضِ عین کہتا ہوں اور یہ فتویٰ دیتا ہوں یعنی وہ صرف از روئے تقویٰ نہیں بلکہ حضرت از روئے فتویٰ و مسئلہ یہ بات فرمارہے ہیں کہ یہ فرض ہے اور فرمارہے ہیں کہ ایمان کی سلامتی کا یہ واحد ذریعہ ہے۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کے ملفوظات میں ہے کہ ارشاد فرمایا کہ طریقۂ تبلیغ میرا ہوا اور طریقۂ تعلیم حضرت تھانوی کا ہوا اور حضرت تھانوی کے طریق میں خاص چیز بزرگوں سے اصلاحی تعلق اور رابطہ ہے۔ اور اس پر دلائل تو ماقبل میں گذر چکے ہیں لیکن مزید ایک بات کہتا ہوں کہ پوری تاریخ گواہ ہے کہ اللہ والوں سے تعلق رکھنے والا کبھی محروم نہیں رہتا ہے۔ بشرطیکہ تعلق صحیح طور پر اخلاص و اتباع کے ساتھ ہو ویسے اس مسئلہ پر احقر دوسری نظموں کے ضمن میں مفصل کلام پیش کر چکا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہ تھے اور علمِ ظاہر کے لحاظ سے اس درجہ کے عالم تھے کہ حضرت علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ ان کے شاگرد تھے اور بڑے بڑے وقت کے علماء ان کے شاگرد ہوتے تھے، مگر جب اللہ کی محبت حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور ایک خلا دل میں محسوس ہوا تو پھر اس پیاس کو بجھانے کے لیے شیخ کی تلاش شروع کردی اور بالآخر شمس تبریزی سے ملے، اس پر آپ دیکھئے کہ کیا سے کیا ہوگئے ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

یہ مولوی جلال الدین جب تک کہ شمس تبریزی کا غلام نہیں ہوا، تب تک مولائے روم نہیں بنا۔ اسی کو خود فرماتے ہیں کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

کہ ذرا کچھ قال کو چھوڑ کر صاحبِ حال بن جا اور کسی اللہ والے متبعِ سنت و شریعت ولی کامل کے پاس رہ کر اپنے کو اور اپنی شان بان کو فنا کردے اور ان کے ارشادات اور ہدایات کے مطابق اپنے کو چلا اور پھر دیکھ کہ کیا سے کیا ہوجاؤ گے۔ اسی پر تائب صاحب کا شعر ہے حضرت والا سے تعلق پر کہ ؎

یہ نہیں کہتے کہ یکدم پارسا ہوجائے گا
کم سے کم بے دردیاں درد آشنا ہوجائے گا

بس اس مضمون کو حضرت والا اس شعر میں فرما رہے ہیں کہ دردِ دل اگر سیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ رہو۔ ان شاء اللہ پھر ہم تمہیں دردِ دل سکھائیں گے، مگر شرط یہی ہے کہ سفر و حضر میں ساتھ رہ کر سیکھنا پڑے گا اور ہمت سے عمل اور پابندیٔ تعلیمات کرنی ہوگی تب یہ چیز ملے گی۔

کائنات کا ہر ذرّہ وجودِ خالق پر دلیل ہے

سارے ارض و سما اور شمس و قمر
دیکھ کر پاگئے اپنے خالق کو ہم

اس شعر میں حضرت والا نے وہ مضمون ذکر فرمایا ہے کہ جس کے متعلق قرآن کریم نے جگہ جگہ انسانوں کو توجہ دلائی ہے یعنی خود انسان اپنے اندر غور کرے اور ساری کائنات میں اس کے نظام واستحکام میں غور کرے تدبر اور تفکر سے کام لے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوجائے گا کہ اس کا کوئی خالق اور کوئی رب ہے۔ تو ارض و سماء و شمس وقمر بڑی مخلوقات ہیں جن کے متعلق غور وفکر کرنے کا حکم خود قرآن میں ہے کہ:

﴿إِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾

(سورة آل عمران، آية: ۱۹۰)

کہ جو سمجھدار لوگ ہیں وہ ارض وسماء کی تخلیق اور رات و دن کے اختلاف کے نظام میں غور کریں، تو ان کے لیے بڑی نشانیاں ہیں اور یہ عقلمندوں ہی کا کام ہے کہ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ زمینوں اور آسمانوں کی تخلیق میں غور کرتے ہیں اور پھر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اے اللہ! یہ سارا نظام مستحکم اور مضبوط اور شاندار نظام یہ کبھی بھی بلا فائدہ اور عبث اور بے کار نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ درحقیقت یہ انسانوں کی خدمت میں لگا ہوا ہے اور انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لیے بنایا ہے اور اپنی عبادت ومعرفت کے لیے بنایا ہے اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ البتہ اس غور وفکر اور تدبر وتفکر کا محل صرف مخلوقات ہیں خالق نہیں، اس لیے قرآن کہتا ہے کہ خالق کا ذکر کرو اور مخلوق میں فکر کرو:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

(سورة آل عمران، آية: ۱۹۱)

ترجمہ: وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور اس زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی قوتِ عقلیہ سے) غور کرتے ہیں۔ (معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ ۲۵۸)

ورنہ خالق میں غور وفکر کا انجام خطرناک اور مہلک ہے اور انسان کو دین سے بے دین کر دینے والا ہے اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اس پر مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری عقل محدود ہے اور مخلوق ہے۔ اس کی خاص حد اور لمٹ (Limit) ہے۔ اگر اس سے زیادہ اس کے اندر ڈالیں گے تو وہ پھٹ کر چورا چورا ہوجائے گی۔

جیسے اگر کسی برتن میں ایک کیلو سامان آتا ہے تو اگر آپ اس کے اندر پانچ دس کیلو بھرنا چاہیں گے تو بالآخر وہ برتن ٹوٹ پھوٹ کر چورا چورا ہو جائے گا تو بھلا ایک محدود غیر محدود کو کیسے اپنے اندر لے سکتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تیری پہچان یہی ہے

درحقیقت یہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی بڑی نشانی ہے کہ وہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکا ہے اور جس نے اُن کو سمجھنا چاہا وہ گمراہ ہو گئے۔ جادۂ حق سے ہٹ گئے، مگر سمجھ نہ سکے۔ اسی کو ایک شاعر نے فلسفیوں کی موشگافیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سِرا ملتا نہیں ہے

اس لیے اس سلسلہ میں بحث کو چھوڑنا واجب ہے اور بحث کرنا حرام ہے۔ ہاں! ہم اللہ کی مخلوقات اور سارے عالم کے نظام میں غور وفکر کریں، تو اس سے ہم خدا کو پائیں گے اور اللہ کی وحدانیت کو سمجھ سکیں گے۔ اس مضمون کو حضرت والا فرما رہے ہیں کہ سارے ارض وسما اور شمس وقمر کو دیکھ کر اے اللہ! ہم یہ پہچان گئے ہیں کہ تو ہمارا خالق ہے اور ہم تجھے پا گئے۔

ایمان دل میں سما جائے تو پھر رنگ لائے

اور اس پر یہ عرض کرتا چلوں کہ جب انسان اللہ کو پالیتا ہے اور اس کا ایمان قوی وراسخ ہو جاتا ہے کہ تو اُس کے سامنے اس کے کتنے ہی جذبات خون ہوتے ہوں، وہ اس کے لیے تیار رہتا ہے، مگر ایک لمحہ کے لیے اپنے اللہ کو ناراض نہیں کرتا تو پھر یہ انساں گویا کہ ساری کائنات کو پائے ہوئے ہوتا ہے اور جب خالق کسی کو مل جائے یعنی اس کی رضا وتائید اس کو حاصل ہو جائے، تو یہ ارض وسما اور یہ شمس وقمر اور یہ درندے پرندے اور یہ حشرات الارض اور جانور سب اس کے ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کو سب کچھ اپنا معلوم ہوتا ہے، اس لیے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

جو تو میرا تو سب میرا فلک میرا زمیں میری
اگر اک تو نہیں میرا تو کوئی شئے نہیں میری

میں اس مضمون کی مناسبت سے عرض کرتا چلوں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی کیا بات تھی اور ان کو کیا ملا تھا کہ وہ اپنی ساری دنیا کو بھولے ہوئے تھے اور اس سے منہ موڑے ہوئے تھے۔ میرے دوستو! تاریخ سے پوچھو تو بتائے گی کہ صحابہ اپنے خالق کو پا گئے تھے، اس لیے درندے ان کے مطیع ہو گئے۔ سمندروں پر ان کا حکم چلنے لگا۔ دُشمنوں کے دلوں پر ان کا رعب پڑنے لگا۔ چنانچہ واقعات میں لکھا ہے۔

صحابۂ کرام کے چند ایمان افروز واقعات

آیئے! حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ کی کتاب ''اسلامی سیاست'' سے خود حضرت شیخ کے الفاظ میں آپ کے سامنے کچھ پیش کروں۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ''یہی چیز تھی جس نے اس وقت مسلمانوں کو نہ صرف آدمیوں ہی پر غالب بنا رکھا تھا بلکہ بحر و بر شجر و حجر چرند و پرند سب ہی چیزوں پر ان کو فتح حاصل تھی۔ تاریخیں ان واقعات سے پر ہیں۔ تفصیلات کے لیے بڑے دفتروں کی ضرورت ہے۔ افریقہ کے جنگل میں مسلمانوں کو چھاؤنی ڈالنے کی ضرورت پیش آئی اور ایسے جنگل میں جہاں ہر قسم کے درندے اور موذی جانور بکثرت تھے۔ حضرت عقبہ امیرِ لشکر چند صحابہ کو ساتھ لے کر ایک جگہ پہنچے اور اعلان کیا:

﴿أَيَّتُهَا الْحَشَرَاتُ وَالسِّبَاعُ نَحْنُ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْحَلُوْا عَنَّا، فَإِنَّا نَازِلُوْنَ فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ قَتَلْنَاهُ﴾

(معجم البلدان، حرف القاف والياء وما يليهما، ج:۴، ص:۴۲۱، دار الاحیاء التراث العربی)

اے زمین کے اندر رہنے والے جانورو اور درندو! ہم صحابہ کی جماعت اس جگہ رہنے کا ارادہ کررہی ہے، اس لیے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اس کے بعد جس کو تم میں سے ہم پائیں گے، قتل کردیں گے۔ یہ اعلان تھا یا کوئی بجلی تھی جوان درندوں اور موذی جانوروں میں سرعت سے دوڑ گئی اور اپنے بچوں کو اُٹھا اُٹھا کر چل دیئے۔ (اسلامی سیاست، صفحہ:۱۱۲)

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کسی لڑائی میں یا کسی دوسرے موقع پر راستہ بھول گئے۔ اتفاق سے ایک شیر سامنے آگیا۔ انہوں نے اس شیر سے فرمایا کہ میں حضور کا غلام ہوں، مجھے یہ صورت پیش آگئی ہے۔ وہ شیر دُم ہلاتا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔ جہاں کہیں کوئی خطرہ کی بات پیش آتی وہ دوڑ کر اُس طرف جاتا اور اُس سے ہٹ کر پھر ان کے پاس آجاتا اور اسی طرح دُم ہلاتا ہوا ساتھ ہولیتا۔ حتیٰ کہ لشکر تک ان کو پہنچا کر واپس چلا گیا۔

فارس کی لڑائی میں جب مدائن پر حملہ ہونے والا تھا تو راستہ میں دجلہ پڑتا تھا۔ کفار نے وہاں سے کشتیاں وغیرہ بھی سب ہٹالیں کہ مسلمان ان پر نہ آسکیں۔ برسات کا موسم اور سمندر میں طغیانی، امیرِ لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ مسلمان سمندر میں گھوڑے ڈال دیں۔ دو دو آدمی ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور سمندر میں گھوڑے بے تکلف تیر رہے تھے۔ امیرِ لشکر حضرت سعد کے ساتھی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ بار بار فرماتے تھے کہ **واللہ لینصرن اللہ ولیہ ولیظھرن دینہ ولیھزمن عدوہ مالم یکن فی الجیش بغی او ذنوب تغلب الحسنات** یعنی خدا کی قسم! اللہ جل شانہٗ اپنے دوستوں کی مدد ضرور کرے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا اور دُشمنوں کو مغلوب کرے گا جب تک کہ لشکر میں ظلم (یا زنا) نہ ہو اور نیکیوں پر گناہ غالب نہ ہوجائیں۔

صحابہ کے لیے آسمان کا برسنا اور سمندر میں راستہ بنانا

مرتدین کی لڑائی میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت علاء حضرمی کو امیرِ لشکر بنا کر بحرین کی طرف بھیجا۔ ایک ایسے جنگل پر گذر ہوا جہاں پانی کا نشان تک نہ تھا۔ لوگ پیاس کی وجہ سے ہلاکت کے قریب پہنچ گئے۔ حضرت علاء رضی اللہ عنہ گھوڑے سے اُترے، دو رکعت نماز پڑھی۔ اُس کے بعد دعا کی جس کے الفاظ یہ ہیں: ''یاحلیم، یاعلیم، یاعلی، یاعظیم، اعطنا الماء'' اے حلم والے، اے علم والے، اے برتری والے، اے بڑائی والے ہمیں پانی عطا فرما۔ ایک نہایت معمولی سا بادل اُٹھا اور فوراً برسا اور اس زور سے کہ سب لوگوں نے خوب پیا، برتنوں کو بھرلیا۔ سواریوں کو پلایا، یہاں سے فارغ ہو کر چونکہ مرتدین کی جماعت نے دار بن میں جا کر پناہ لے رکھی تھی اور وہاں پہنچنے کے لیے سمندر کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ مرتدین نے کشتیاں بھی جلا دی تھیں تاکہ مسلمان ان کا تعاقب نہ کرسکیں۔ حضرت علاء سمندر کے کنارے پہنچے۔ دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کی کہ ''یاحلیم، یا علیم، یا علی یاعظیم اَجِزْنَا'' اے حلم والے، اے علم والے، اے علی وعظیم ہمیں پار کردے۔ یہ دعا کی اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر سمندر میں کود پڑے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم پانی پر چل رہے تھے۔ خدا کی قسم! نہ قدم بھیگا، نہ موزہ بھیگا، نہ گھوڑوں کے سم بھیگے اور چار ہزار کا لشکر تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ پانی اس قدر کم ہو گیا تھا کہ گھوڑوں اور اونٹوں کے صرف پاؤں بھیگے تھے۔ کیا بعید ہے کہ جب چار ہزار کا لشکر تھا، اس میں بعض کے ساتھ ایسا معاملہ ہوا ہو اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے موزے بھی نہ بھیگے ہوں۔

اس قصہ کی طرف عفیف بن منذر نے جو خود اس لڑائی میں شریک تھے۔ دو شعروں میں اشارہ کیا ہے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا تو دیکھا نہیں ہے کہ اللہ نے سمندر کو مطیع کر دیا اور کفار پر کتنی سخت مصیبت نازل کی۔ ہم نے اس پاک ذات کو پکارا جس نے (بنی اسرائیل کے واسطے) سمندر کو ساکن کر دیا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل سے بھی زیادہ اعانت کا معاملہ فرمایا۔ سمندروں اور دریاؤں پر پیدل اور سواریوں پر گزرنے کے واقعات کثرت سے ہیں۔ (اسلامی سیاست، صفحہ:۱۱۴)

ان تمام واقعات سے احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ جب یہ ایمان والا حقیقی طور پر اللہ والا بنتا ہے اور اللہ کا فرمانبردار بنتا ہے تو پھر خدا کی تائید و نصرت ہمہ وقت اس کے ساتھ شامل ہوتی ہے اور وہ نہ دنیا کو اپنے نفع کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور نہ نقصان کا۔ اُس کی نظر ہمہ وقت اس اکیلے اللہ پر رہتی ہے، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جس نے اللہ کو پالیا ہے، اس نے سب کچھ پالیا ہے۔ حضرت والا کا شعر ہے کہ ؎

پالیا جس نے خدا کو پالیا سارا جہاں
کون کہتا ہے کہ اہلِ دل جہاں دیدہ نہیں

اس لیے اس دنیا میں سب سے اچھا اور بالطف اور حلاوتوں سے بھرا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان صرف ایک کو راضی کرنے کی فکر میں لگ جائے اور ظاہر ہے کہ ایک کو راضی کرنا بہت آسان ہے۔ بنسبت سارے دوستوں اور گھر والوں اور خاندان والوں کو راضی کرنے کے، کیونکہ اگر آپ کوئی کام کریں اور کسی دوست کی رضا کو سامنے رکھیں تو ایک کو راضی کریں دوسرے چند ناراض ہوں گے اور ان چند کو راضی کریں، تو دوسرے ناراض ہوں گے اور اگر آپ سب کو راضی کرلیں یعنی ان کی چاہتوں کے مطابق آپ نے زندگی گذاری تو ذرا کوئی ناگوار اور خلافِ مزاج بات سامنے آنے پر ساری زندگی کا اعتقاد ختم ہوا اور بالآخر سب آپ کو چھوڑ بیٹھے۔ لیکن اللہ کو راضی کرنے میں ایسا نہیں ہوتا، وہ آپ کی خوشیوں کے وقت میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا ہے اور آپ کی غمی کے موقع پر بھی ساتھ ہوتا ہے اور صحت کی حالت میں آپ کا حامی و مددگار رہے۔ ویسے ہی وہ آپ کے مرض و بیماری میں بھی آپ کا رفیق و ساتھی ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی آپ کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی۔ وہ قبر و حشر و نشر میں بھی آپ کا معین و مددگار ہوگا اور آپ کو نعمتوں اور عنائیتوں کے ذریعے یاد رکھے گا اور جب سب خوف و غم میں مبتلا ہوں گے تو وہ آپ کو بے غم رکھے گا۔ جب ہر ایک کو فکر لاحق ہوگی وہ آپ کو بے فکر کر دے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ذکر ہے کہ:

﴿يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ﴾

(سورۃ الزخرف، آیۃ: ۶۸)

ترجمہ: اے میرے بندو! آج تم پر نہ کچھ ڈر و خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو۔

اے میرے بندو! تم نے میرے لیے بڑے غم اور خوف دنیا میں اُٹھائے تھے اب تم کو ہمیشہ کے لیے غم و خوف سے نجات دی جا رہی ہے اور فری و بری کیا جا رہا ہے۔ تم نے بڑا خونِ حسرت پیا ہے اور میرے لیے بڑے غم اُٹھائے ہیں اور میری رضا پر تم نے سب کی ناراضگی کو گوارا کیا، تم نے بہت طعنے سہے تھے اور تم نے بہت مرتبہ زبانِ حال سے یہ کہا تھا۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو تیرے قابل بنانا ہے مجھے

حضراتِ صحابہ کرام نے بس یہی کیا تھا کہ اپنی حسرتوں کو پامال اور اپنی آرزوؤں کا خون کیا تھا اور اللہ کی مرضی پر اپنے اہل و عیال اور اپنی جانوں اور مالوں کو ایسا قربان کیا تھا کہ جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور انہوں نے پوری اُمتِ محمدیہ کے لیے یہ راز فاش کر دیا تھا کہ اہلِ ایمان کی کامیابی کا راز صرف ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا بنانے میں ہے اور اللہ تعالیٰ تب تک ہمارے ساتھ نہ ہوں گے جب تک گناہ اور اس کی نافرمانیاں ہم میں موجود ہوں، اس لیے طاعات پر استقامت اور گناہوں سے دائمی احتراز و پرہیز ان کی زندگی کا خاصہ تھا اور یہی ہر قدم پر ان کی کامیابی کا راز تھا۔

شیخ سے مکمل استفادہ مناسبت پر موقوف ہے

دل کے ملنے کی ہے بات کچھ اور ہی
ساتھ رہتے ہیں گو ایک مدت سے ہم

اس شعر کے ضمن میں حضرت والا نے تصوف کے ایک اہم مسئلہ کا ذکر کیا ہے کہ شیخ اور مرید کے درمیان آپس میں قلبی مناسبت استفادۂ باطنی اور کسب فیض کے لیے بہت ہی اہم اور ضروری ہے اور حقیقی نفع جبھی حاصل ہوتا ہے کہ جب باہمی قلبی مناسبت ہو، اسی لیے ایک بڑی تعداد مشائخ تصوف کی بالخصوص اس سلسلہ تھانوی میں اس وقت تک بیعت نہیں کرتے ہیں جب تک مرید کی مناسبت کا اندازہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ احقر نے اپنے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ سے جب اصلاحی تعلق قائم کیا، تو قصہ یہ ہوا کہ احقر نے حضرت کی خواب میں زیارت کی اور اس خواب کو از اوّل تا آخر حضرت والا کی خدمت میں تحریر کردیا تو ادھر سے جو جواب آیا، بڑا عجیب پُر کیف تھا کہ ''خواب پر مدار اعتماد و اعتقاد کا رکھنا لاحاصل، بذریعہ مکاتبت مناسبت کا علم ہونے پر اصلاحی تعلق قائم کرلیا جائے۔'' کیونکہ درحقیقت اگر باہمی مناسبت نہ ہو تو پیر کتنا ہی بڑا ولی اللہ ہو، مگر مرید کو پورا نفع نہیں ہوتا اور یہ مضمون جو احقر اس شعر کی تشریح میں پیش کررہا ہے۔ درحقیقت ایک حدیث شریف سے ماخوذ ہے جو کو حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَ مَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ﴾

(مشکاة المصابیح، کتاب الآداب، باب الحب فی اللہ ومن اللہ، ص: ۴۲۵، قدیمی کتب خانہ)

یعنی ارواح لشکر ہیں جو عالمِ ارواح میں مجتمع تھیں جن میں (وہاں) باہم جان پہچان ہوئی ہے۔ ان میں (یہاں بھی) باہم الفت ہے اور جن میں وہاں جان پہچان نہیں ہوئی ان میں یہاں بھی اختلافِ مزاج ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ یہ امر تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوض باطنی کے لیے پیر و مرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ بس یہی بات حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب کسی اللہ والے سے واقعی معنی میں دل مل جائے تو پھر اس مرید کو بہت ہی نفع پہنچتا ہے اور وہ بہت ہی فیض حاصل کرتا ہے ورنہ بغیر اس کے کبھی بعض لوگ مدتوں مشائخ کے یہاں عمریں گذار دیتے ہیں، مگر جہاں تھے وہیں کے وہیں رہتے ہیں، کوئی خاص معتد بہ نفع نہیں ہوتا ہے، اسی لیے بیعت سے پہلے اس مناسبت کا پتہ کرلینا چاہیے، پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سلوک میں آگے بڑھنا چاہیے۔ (التکشف، صفحہ: ۳۲۸)

شیخ کی سختیاں مرید کے نفع کے لیے ہیں

سختیاں شیخ کی ہیں فنا کے لیے
مت سمجھ مت سمجھ ان کو ہرگز ستم

اللہ والے اپنے مریدین اور متعلقین کی حقیقی فلاح ودائمی کامیابی کی فکر کرتے ہیں، اس لیے وہ محض رسمی اخلاق اور ظاہری خوش خلقی کے حامل نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے یہاں یہ چیز سکھائی جاتی ہے، اس لیے اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو کہ جو بظاہر چھوٹی ہو، مگر اس کا منشا اہم ہو تو اس پر شدید پکڑ ہوتی ہے۔ جیسے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ جب مرید غلطی کرتا ہے تو میں اس غلطی کو نہیں دیکھتا ہوں بلکہ منشا غلطی کو دیکھتا ہوں۔ کبھی بظاہر غلطی چھوٹی، مگر اس کا منشا بہت اہم ہے یعنی جس وجہ سے وہ غلطی ہوئی ہے، جیسے احقر نے ایک واقعہ پڑھا ہے کہ ایک شخص حضرت کی خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر دوسرے شخص کے پاس آ کر بیٹھ گئے جو کہ قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول تھے اور مقصد یہ تھا کہ ان کا قرآن میں بھی سنوں۔ جب ان پر حضرت کی نظر پڑی تو فوراً بلوایا اور فرمایا کہ کیا تم نے ان سے اجازت لی ہے؟ اور اگر اجازت نہیں لی ہے تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہے کہ ان کو تمہارے قرآن سننے سے تکلف نہ ہوگا تو اپنے اس عمل سے تم اس کے لیے تکلیف کا سبب بنے ہو اور کسی مؤمن کو ایذا پہنچانا سخت گناہ ہے، لہٰذا خانقاہ سے نکل جاؤ۔ اس قصہ میں آپ اگر بظاہر دیکھیں تو اتنی بڑی غلطی نہیں ہے بلکہ چھوٹی سی غلطی ہے لیکن اس کا منشا اہم ہے، اس لیے حضرت نے سخت سزا دی تا کہ اس منشاء خطا کی اصلاح ہو جائے۔ اسی لیے حضرت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ کے خلفاء میں آپ خاص طور پر دیکھیں گے کہ یہ حضرات معاشرت کی اعلیٰ صفات کے حامل ہوتے تھے اور ان کی معاشرت و معاملات کے شعبوں میں ہونے والی بے اعتدالیوں کی اصلاح پر خاص نظر ہوتی تھی کیونکہ عبادات کو تو لوگ دین سمجھتے ہی ہیں، مگر معاشرت و معاملات میں بھی کچھ شرعی اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ اس سے لوگ بڑی تعداد میں بے خبر ہوتے ہیں۔

غیر منکر پر نکیر خود منکر اور گناہ ہے

بہرحال میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ جب شیخ اپنے مرید کو تنبیہ کرے اور ڈانٹے، تو درحقیقت یہ عینِ رحمت ہے۔ اس کو ستم نہ سمجھیں اور شیخ کی طرف سے ظلم وتشدد مت سمجھو اور یہ اصلاح کے لیے ضروری ہے۔ البتہ اس موقع پر ایک بات ضمناً عرض کرنا ضروری ہے تا کہ اہلِ علم کی موجودگی میں میری اصلاح ہو جائے اور وہ یہ کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے تفسیر معارف القرآن اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ترمذی کی شرح درسِ ترمذی میں یہ بات لکھی ہے کہ نکیر کرنا اور روک ٹوک کرنا منکر پر ہے اور جو چیز شرعی طور پر منکر نہیں ہے، گناہ نہیں ہے، اس پر نکیر کرنا جائز ہی نہیں یعنی اس پر نکیر کرنا خود گناہ ہے۔ بالفاظ دیگر اَلنَّکِیْرُ عَلٰی غَیْرِ الْمُنْکَرِ

مُنکَرٌ یعنی غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک گناہ ہے۔ اب میں بہت وضاحت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض خانقاہوں میں اپنے احباب مجلس کی طرف سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو کہ از قبیلِ محبت وادب ومستحب ہے، اس طرح نکیر کی جاتی ہے کہ وہ بالکل کوئی فرض وواجب درجہ کی چیز ہو حالانکہ وہ امور از خود انسان کے اپنے طور پر اپنانے یا زیادہ سے زیادہ ترغیب دینے اور شوق دلانے کے ہیں لیکن شرعی طور پر ان پر روک ٹوک کرنا نہیں ہے۔ ہاں! اگر کوئی بڑا ہو جیسے حضرت مفتی تقی عثمانی نے دفتر جمعیۃ العلماء ٹرانسوال جنوبی افریقہ کے اجلاس میں فرمایا کہ والد وشیخ و استاذ یعنی جو بڑا ہے اور دوسرا اس سے نیاز مندانہ تعلق رکھتا ہے، اس کے لیے یہ گنجائش ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی روک ٹوک اور تنبیہ کرے کیونکہ اس سے خود وہ شخص بھی بُرا محسوس نہیں کرے گا اور اس کی طبیعت میں بھی بوجہِ اس نسبت کے کوئی انقباض نہ ہوگا لیکن اگر کوئی دوسرا کرے تو بسا اوقات یہ چیز اس کے لیے سلوک کو چھوڑنے کا سبب بن سکتی ہے اور وہ اس کو ایک طرح کی دین میں تنگی تصور کرنے لگتا ہے۔

پھر میرے دوستو! آپ ذرا اس پہلو سے غور فرمائیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کے رب ہیں، ان کے لیے جسمانی اور روحانی دونوں غذائیں عطا کرتے ہیں تو اگر کوئی خاص چیز روح کی تربیت کے لیے اتنی ضروری ہوتی تو اس کو فرض وواجب کیا جاتا، آخر جب اللہ تعالیٰ نے اس کو فرض وواجب نہیں کیا ہے تو اس میں کوئی تو مصلحت ہے اور منجملہ مصلحتوں کے ایک بڑی مصلحت یہی ہے کہ میرے بندوں پر توسع رہے اور وہ تنگی میں نہ پڑیں اور آپ اپنے رویہ اور طرز وطریق سے ان کو تنگی میں ڈال رہے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر لباس ایسا ہو، ایسا نہ ہو۔ ایک تو اس کی وہ شرعی حدود ہیں کہ جن سے وہ جواز کی حدود میں رہتا ہے وہ تو ضروری ہے اور اس پر تو روک ٹوک بھی واجب ہے، مگر اب دوسری چیز کہ مختلف مباح اور جائز درجہ لباسوں میں سے اور مختلف مباح ٹوپیوں اور رومال وغیرہ میں سے آپ کسی خاص قسم پر اتنا زور دیں اور اس پر روک ٹوک کریں تو یہ شرعاً تضییق فی الدین یعنی دین میں تنگی پیدا کرنا ہے، جو گناہ ہے۔ اس لیے آج حضرت والا کی موجودگی میں احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آج سے ہم آپس میں ایک دوسرے کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر روک ٹوک کرنا بند کریں کیونکہ اس سے دلوں میں دوری پیدا ہوتی ہے اور اصلاح کے بجائے ایک دوسرے سے نفرت اور بعد کا راستہ کھلتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے کل قیامت کے دن آپ سے یہ سوال کرلیا کہ آخر میں نے جب دین میں گنجائش رکھی تھی اور آسانی پیدا کی تھی تو تم نے یہ تضییق کا معاملہ کیوں کیا؟ تو میرے دوستو! کیا جواب ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی تصریح اور قرآن میں استعمال لفظِ منکر اس کی ترجمانی کے لیے کافی دلیل ہے کہ منکر اگر نہ ہو تو پھر اس پر نکیر نہ کیجیے۔

بسا اوقات ہم اپنے زعم میں بڑا کام کر رہے ہیں کہ اونچے درجہ کا ولی بنا رہے ہیں حالانکہ ہم خود ایک منکر ہیں، مبتلا ہیں اور دوسروں کے دلوں کو ان چیزوں کے ذریعہ ایذاء پہنچا کر ایذائے مسلم کا کام کر رہے ہیں جو بہت بڑا گناہ ہے۔

ہمارے اکابر کے یہاں ایذائے مسلم تو بہت بڑی بات ہے۔ ایذائے مخلوق ہی سے بچنے کا اس قدر اہتمام تھا کہ جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ میں آپ کے سامنے اپنے شیخ اول حضرت جلال آبادی کا ایک قصہ سناتا ہوں کہ ایک مرتبہ وہ مسجد سے خانقاہ کی طرف آنے لگے تو وہ راستہ میں ایک چھوٹی نالی ہے، اس میں کتا پانی پی رہا تھا تو حضرت کی اس پر نظر پڑ گئی۔ بس دیکھتے ہی فوراً فرمایا کہ ارے! راستہ بدل دو کیونکہ اگر ہم ادھر سے جائیں گے تو اس بیچارے کتے کے پانی پینے میں خلل پڑے گا، اس لیے حضرت نے وہ راستہ بدل دیا اور دوسرے راستہ کو اختیار کیا۔ بظاہر وہ محض کتا تھا، مگر ان حضرات کی نظر اس پر ہوتی ہے کہ درحقیقت یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اس کو بھی ایذاء نہ پہنچنی چاہیے۔ اسی لیے حضرت مولانا علی میاں کا ایک ملفوظ میں نے ایک جگہ ایک جلسہ میں ایک بینر پر لکھا ہوا دیکھا کہ جس میں انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر مجھے کوئی شخص اس بات کی ضمانت دے کہ مجھ سے کسی مخلوق کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی تو میں اس کی ولایت کی گارنٹی دیتا ہوں۔

ایک ایسی حدیث جو ہر وقت پیشِ نظر ہو تو زندگی کے تمام غموں کے لیے کافی ہے

اختر بے نوا کی صدائیں سنو
اپنے مالک کو راضی کریں خوب ہم

یہ حضرت والا کا مقطع ہے اور اس میں حضرت پوری زندگی کا خلاصہ اور ساری تعلیمات کا نچوڑ پیش کر رہے ہیں اور ایک خاص انداز میں فرمارہے ہیں کہ یہ اختر تو پوری دنیا میں ایک ہی صدا لگاتا پھر رہا ہے اور ساری دنیا کے بسنے والے انسانوں کو یہ پیغام بابانگِ دہل سناتا ہے کہ بس ایک اللہ کو راضی کرو اور خوب راضی کرو یعنی ایسا نہ ہو کہ کبھی اپنے نفس کی مان لی اور کبھی اللہ تعالیٰ کی مان لی بلکہ ہر قدم پر اور ہر آن اور ہر گھڑی اپنے اللہ کو راضی کرنے کی فکر کرو۔

اور یہ ایسا راز ہے کہ جو اس دھن اور دھیان میں لگ جاتا ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو ساری فکروں سے آزاد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ روایت میں ارشاد ہے کہ:

﴿مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ﴾

(سنن ابن ماجة، باب الانتفاع بالعلم)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو انسان اپنے سارے غموں کو چھوڑ کر بس ایک فکر میں پڑ جائے کہ کہیں میرا اللہ مجھ سے کسی عمل سے ناراض نہ ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے دوسرے سارے غموں کو ختم فرما دیتے ہیں اور اس کے لیے ان غموں سے کفایت فرماتے ہیں اور جس کی طرف سے اللہ کافی ہو تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی غم و ہم پریشان نہیں کرسکتا ہے۔ اس پر بھی حالات آئیں گے، مگر وہ جسم کے اوپر سے ہو کر گذر جائیں گے اور اس کے دل کے قرار و جماؤ میں ذرا خلل نہ ڈال سکیں گے اور وہ بزبانِ حال یہ شعر پڑھتا ہوا ہو گا کہ ؎

بے کیفی میں بھی ہم نے تو ایک کیفِ مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اُثقل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے چلتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے

دستگیریٔ حق

داستاں سن مری فقیری کی ... دستگیری کی مہربانی سے
تھک گیا جب بھی راہ میں اختؔر ... لاج رکھ لی ہے اس نے پیری کی

عشق جب بے زبان ہوتا ہے

عشق جب بے زبان ہوتا ہے ... رشکِ صدہا بیان ہوتا ہے
سر بوقتِ سجود عارف کا ... فوقِ ہفت آسمان ہوتا ہے
دردِ دل کا زبانِ بسمل سے ... آہ کیسا بیان ہوتا ہے
فیضِ مرشد سے ہوگیا محروم ... جب کوئی بدگمان ہوتا ہے
جو محافظ نہیں نظر کا آہ ... زیرِ تیر و کمان ہوتا ہے
کیسے پائے گا قرب کی منزل ... جب کوئی وقفِ نان ہوتا ہے
دیکھ لو شانِ فیضِ پیغمبر ... شترباں حکمران ہوتا ہے
منزلِ قرب سے جو گذرے گا ... منزلوں کا نشان ہوتا ہے
سارا عالم کرے گا کیا اختؔر ... جس پہ حق مہربان ہوتا ہے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **صدہا:** سینکڑوں۔ **سجود:** سجدہ۔ **عارف:** اللہ والا۔ **فوق:** اوپر۔ **ھفت آسمان:** سات آسمان۔ **بسمل:** زخمی، مراد جس نے اللہ کی نافرمانی سے بچنے کے لیے دل پر زخم کھائے ہوں۔ **زیر تیر و کمان:** لعنت و ملامت ہونا۔ **قرب:** اللہ تعالیٰ کی نزدیکی۔ **وقفِ نان:** روٹیاں کھانے میں مصروف۔ **شترباں:** اُونٹ چرانے والا۔ **حق:** اللہ تعالیٰ۔

عشقِ بے زبان رشکِ صد ہا بیان

عشق جب بے زبان ہوتا ہے
رشکِ صد ہا بیان ہوتا ہے

اس شعر میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اللہ کے عشاق اور اولیاء اللہ بیان کریں یا نہ کریں بہر صورت ان کے وجود اور دیدار اور ان کی صحبت سے فیض پہنچتا رہتا ہے۔ ان سے کسبِ فیض ان کی تقریر و بیان پر موقوف نہیں ہے۔ اصل بنیادی چیز ان کی صحبت ہے، اسی لیے قرآن نے عجیب تعبیر اختیار فرمائی ہے کہ **کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** یعنی ان کے ساتھ رہو۔

غالباً یہی نکتہ اور راز ہے کہ حضراتِ صحابہ کو صحابہ کا نام دیا گیا ہے ورنہ ان کے کارناموں اور قربانیوں کے لحاظ سے بہت سے نام دیئے جا سکتے تھے۔ جیسے مثلاً معلم، مقرر، واعظ، مبلغ، مجاہد، داعی، عالم وغیرہ وغیرہ یعنی وہ ان سب صفات کے حامل تھے، مگر ان کا نام جس وصف کے ساتھ خاص کہلاتا ہے وہ وصف صحبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کا سب سے اعلیٰ اور قیمتی وصف یہی شرف صحبت ہے۔

اس لیے حضراتِ علمائے اُمت نے یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ صحبت نبی سے بڑا شرف اُمتی کے لیے کچھ نہیں اور کوئی بھی شخص اپنے کارناموں اور مجاہدات و ریاضات کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی اونچا ہو جائے اور کیسے ہی درجہ پر پہنچ جائے، مگر وہ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا ہے اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا ہے اور یہ اُمت کا اجماعی مسئلہ ہے۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا منشاء ہے کہ اہل اللہ کے پاس جا کر خواہ ان سے بیان و تقریر سننے کو ملے یا نہ ملے، مگر انسان نفع سے خالی نہیں رہتا ہے۔ خود حدیث شریف میں اللہ والوں کو دیکھتے ہی اللہ کی یاد آنا مذکور ہے کہ:

﴿اِذَا رُاُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ﴾

(مسند احمد، مسند الشامیین)

کہ جب ان کی زیارت ہوتی ہے تو اللہ یاد آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد کتنا اونچا نفع ہے۔ اس لیے کہ اہلِ عشق و وفا اپنے سینوں میں جو خدا تعالیٰ کی محبت کا خزانہ رکھتے ہیں اور ان کے پاکیزہ و صاف شفاف قلوب پر جو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے تو اس کا اثر خود بخود اہلِ مجلس پر ہوتا ہے، اسی لیے ہم نے کتنے ہی اللہ والے دیکھے ہیں کہ باوجودیکہ وہ اپنی مجالس میں کچھ زیادہ گفتگو اور تقریر و وعظ نہیں کرتے ہیں، مگر لوگ جوق در جوق ان کے یہاں آتے رہتے ہیں اور جمع رہتے ہیں اور ان کے دیدار و زیارت اور ملاقات کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اور وہ ان کے پاس بیٹھ کر دنیا کے سارے غموں کو بالکل بھول جاتے ہیں اور عجیب قلبی اطمینان و سکون محسوس کرتے ہیں۔

مقصود صحبت اہل اللہ ہے نہ کہ تقریر و بیان

چنانچہ ہم جب دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے تو وہاں حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی کی مجلس ہوا کرتی تھی اور حضرت اکثر ہر وقت ذکر میں مشغول رہتے تھے اور خود ذاکر رہ کر کوئی بیان و تقریر نہیں کرتے تھے، مگر لوگ کثرت سے آتے تھے اور وہاں بیٹھ کر عجیب سکون و اطمینان ملتا تھا اور بعض اوقات بہت سی علمی باتیں فرمایا کرتے تھے اور کتابوں کی باتیں پوری پوری عبارتوں کی عبارتیں حضرت پڑھتے چلے جاتے تھے۔ تو بہرحال بے زبان عشق بھی ہزار زبانوں اور بیانوں اور تقریروں سے زیادہ مؤثر اور نافع ہوتا ہے، اسی لیے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عجیب ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿لِكُلِّ شَيْءٍ مَعْدِنٌ وَمَعْدِنُ التَّقْوٰى قُلُوْبُ الْعَارِفِيْنَ﴾

(الجامع الصغير لسيوطي، ج:۲، ص:۱۲۵)

یعنی ہر چیز کی کان ہوتی ہے اور تقویٰ کی کان اللہ والوں کے دل ہیں تو اگر آپ غور سے دیکھیں تو اس حدیث میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اصل خزانہ اولیاء اللہ کے سینوں میں ہے اور ان کے سینوں سے وہ حاصل کیا جاتا اور نکالا جاتا ہے۔ اس میں نہ تو کتب العارفین فرمایا ہے نہ بیان العارفین و وعظ العارفین فرمایا ہے۔ اور اس حدیث کے متعلق کنز العمال اور طبرانی وغیرہ کا حوالہ کتابوں میں موجود ہے اس حدیث پر محدثانہ بحث کرتے ہوئے جو بھی تفصیل ہے مگر اخیر میں حضرت شیخ یونس مظاہری لکھتے ہیں: ''باقی ظاہری معنیٰ صحیح ہیں اس لیے کہ عارفین کے قلوب انوار معرفت سے منور ہوتے ہیں جس سے وہ حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات عظمت و جلال کا ہر وقت عکس پڑتا ہے اس لیے تقویٰ ہمہ وقت ان کے دلوں کا مونس و مکین بنا رہتا ہے واللہ اعلم'' (الیواقیت الغالیہ، ج:۱، ص:۶۰)

اور اس سے بھی زیادہ واضح دلیل اس پر وہ حدیث ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ مجھے دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں بہت پسند ہیں:

﴿عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ الطِّيْبُ وَالنِّسَآءُ وَقُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ وَقَالَ أَبُوْبَكْرِنِ الصِّدِّيْقُ وَأَنَا حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ الْجُلُوْسُ بَيْنَ يَدَيْكَ وَالنَّظَرُ إِلَيْكَ وَإِنْفَاقُ مَالِيْ عَلَيْكَ﴾

(نزهة المجالس)

(۱) خوشبو (۲) عورت (۳) میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے تو اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی اسی طرح تین چیزیں بہت پسند ہیں۔ النظر الیک میری نظریں آپ پر پڑا کریں اور میں آپ کو دیکھا کروں۔ (۲) الجلوس بین یدیک میں آپ کے سامنے بیٹھا رہوں۔ (۳) وَإِنْفَاقُ مَالِيْ عَلَيْكَ کہ میرا جو مال ہو وہ آپ پر خرچ ہوا کرے اور سیرت کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ

نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تمنا بدرجۂ اکمل واتم پوری فرمائی کہ ان کو یہ سب کچھ عطا ہوا اور خوب عطا ہوا تو اس میں بھی ہمارا مضمون موجود ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ میں آپ کا بیان سنوں اور تقریر سنوں اور آپ کی باتیں سن کر پھر دوسروں کو پھیلاؤں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور آپ کے سامنے بیٹھے رہنا یعنی آپ کی صحبت و ساتھ نصیب ہونا، اسی لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ روایات منقول نہیں ہیں بلکہ بہت ہی کم روایات منقول ہیں، مگر اس کے باوجود مقام و مرتبہ کے لحاظ سے وہ افضل الصحابہ ہیں۔

بہرحال حاصلِ کلام یہ ہے کہ اللہ والوں سے نفع کے لیے بیانات اور تقریریں ضروری نہیں بلکہ ان کے سینے اللہ کے عشق و محبت کے خزانے سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں تو خود بخود دوسرا انسان متاثر ہوتا جاتا ہے۔ ان کی دعاؤں اور صحبتوں سے اس میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت والا نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ ؎

مگر دولت یہ ملتی ہے کہاں سے
بتاؤں میں ملے گی یہ جہاں سے
یہ ملتی ہے خدا کے عاشقوں سے
دعاؤں سے اور ان کی صحبتوں سے

اس لیے اصلاح و تزکیۂ نفس کے لیے مشائخ کے یہاں ایک مدت تک مسلسل اور مستقل رہنا چاہیے محض دو دن یا چار دن آتے جاتے رہنا اگرچہ نفع سے خالی نہیں ہے مگر مقصود کے حصول کے لیے کافی نہیں ہے۔

صحبت اہل اللہ پر محبوبیت کا وعدہ ہے

اور اُن کے پاس بیٹھنے سے اہلِ مجلس کو اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایسی دولت نصیب ہوتی ہے کہ جو سینکڑوں بیانات سے بھی لوگوں کو میسر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے اللہ والوں سے ملاقات کے وقت تقریر و بیان مقصود نہیں ہونا چاہیے۔ خود جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی میں جس مضمون کو ذکر فرمایا ہے اُس میں یہ بات آئی ہے کہ:

﴿وَجَبَتْ مَحَبَّتِیْ لِلْمُتَحَابِّیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَجَالِسِیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ وَ الْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ﴾

(موطا مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء فی المتحابین فی، ص ۷۴۳)

کہ جو لوگ میرے لیے محبت رکھتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور میرے لیے ہی ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں اُن سب کے لیے میری محبت واجب ہوگئی۔ تو اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھنا اور آپس میں بیٹھنا بھی نافع اور مفید

ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر حضرت والا نے فرمایا۔

میری زبان حال بھی میرے بیاں سے کم نہیں
میرا سکوت عشق بھی میرے بیاں سے کم نہیں

مومن بحالت سجدہ فرش پر رہتے ہوئے عرش پر ہوتا ہے

سر بوقتِ سجود عارف کا
فوق ہفت آسمان ہوتا ہے

اللہ والوں کے سجدوں کا عالم عجیب عالم ہوتا ہے اور ان کو دنیا کی سب سے لذیذ ترین چیز اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہوتا ہے اور جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو ان کو خدا تعالیٰ سے ایسا قرب حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ساتوں آسمانوں کے حجابات اُٹھ چکے ہوں اور گویا کہ اپنی ادائے بندگی بصورت سجدہ ریزی میں بالکل اپنے خالق و مالک کے سامنے ہوں اور بیچ کے سارے حائل اور حجابات اُٹھ چکے ہوں اور سب دوری قرب میں بدل چکی ہو۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ بندہ میرا سب سے زیادہ قرب بذریعۂ سجدہ حاصل کرتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا ہے کہ واسجد واقترب ابوجہل کی بات پر کان نہ دھریں اور سجدہ اور نماز میں مشغول رہیں کہ یہی اللہ تعالیٰ کے قرب کا راستہ ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

«اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ وَھُوَ سَاجِدٌ فَاَکْثِرُوا الدُّعَاءَ»
(صحیح مسلم، کتاب الصلٰوۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، ج:۱، ص:۱۹۱)

یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ سجدہ میں ہو، اس لیے سجدہ میں بہت دعا کیا کرو اور ایک دوسری صحیح حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔

«وَاَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَھِدُوْا فِی الدُّعَاءِ فَقَمِنٌ اَنْ یُّسْتَجَابَ لَکُمْ»
(صحیح مسلم، کتاب الصلٰوۃ، باب النہی عن قراءۃ القرآن فی الرکوع والسجود)

یعنی سجدہ کی حالت میں دعا قبول ہونے کے لائق ہے۔

مسئلہ: نفل نمازوں کے سجدہ میں دعا کرنا ثابت ہے۔ بعض روایاتِ حدیث میں اس دعا کے لیے خاص الفاظ بھی آئے ہیں۔ وہ الفاظِ ماثورہ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔ فرائض میں اس طرح کی دعائیں ثابت نہیں کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۸، صفحہ:۷۸۹)

اور حضرت مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں ''یاد رہے کہ تنہا سجدے کی کوئی عبادت معروف نہیں اس لیے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک کثرتِ سجود سے مراد یہ ہے کہ کثرت سے نوافل پڑھا کریں جتنی نفلیں زیادہ

ہوں گی سجدے زیادہ ہوں گے لیکن اگر کوئی شخص تنہا سجدہ ہی کر کے دعا کر لے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور سجدے میں دعا کرنے کی ہدایت نفلی نمازوں کے لیے مخصوص ہے، فرائض میں نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ جب آدم کا بیٹا کوئی آیتِ سجدہ پڑھتا ہے اور پھر سجدہ تلاوت کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا بھاگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ملا اور اس نے تعمیل کر لی تو اس کا ٹھکانہ جنت ہوا، اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا میں نے نافرمانی کی تو میرا ٹھکانہ جہنم ہوا۔

(معارف القرآن، ج:۴، ص:۱۷۰)

اور یہ قربِ سجدہ ہر عارف کو اس کے مقامِ معرفت کے لحاظ سے اور ہر عابد کو اس کے مجاہدہ کے لحاظ سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اَلْمُشَاهَدَةُ بِقَدْرِ الْمُجَاهَدَةِ یعنی جتنا مجاہدہ ہوگا اتنا ہی مشاہدہ والی کیفیت نصیب ہوگی۔

جیسا کہ حضرت والا کا ایک اور شعر ہے کہ مہربانیاں جیسی قربانیاں ہیں۔ اگرچہ یہ قربانیاں بھی درحقیقت ان کی مہربانیاں ہیں، مگر باری تعالیٰ خود ہی توفیق دے کر ان کی نسبت بندوں کی طرف فرماتے ہیں۔ یہ صرف ان کا فضل ہے اور ان کی عطا ہے، اس لیے قرآن میں ایک موقعہ پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ جو جنت کی نعمتیں ہیں، اگرچہ صورتاً یہ جزاء ہے، مگر درحقیقت ہماری عطا ہے۔ جَزَآءً مِّن رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا۔

تو عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ یہ مقامِ قربِ سجدہ اور یہ حلاوتِ عبادت درحقیقت اپنے اپنے مجاہدوں کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہے، اسی لیے اگر کوئی انسان نظر بچاتا ہے اور حسینوں سے نظر نہیں لڑاتا، تو اس کو عبادت کی جو حلاوت ملتی ہے وہ دوسروں کو نہیں ملتی کہ جو نظر کے چور ہوتے ہیں اور گناہوں میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو یہ مقامِ قرب عطا فرمادے، آمین۔

حاملِ دردِ دل کی زبانِ بسمل کا بیانِ دردِ دل

دردِ دل کا زبانِ بسمل سے
آہ کیسا بیان ہوتا ہے

حضرت والا دامت برکاتہم نے اس شعر میں اللہ والوں کے وعظ و نصیحت اور ان کے تقریر و بیان کی تاثیر کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو انسان اللہ کی راہ کا غم اُٹھائے ہوئے ہو اور اپنی خواہشاتِ نفس کو اللہ کی محبت کی تلوار سے ذبح کیے ہوئے ہو اور ہر قدم پر اپنی حرام خوشیوں اور لذتوں کا خون کرتا ہو اور اللہ کی محبت کی شراب کا نشہ اس کے دل و دماغ پر ایسا سوار ہو کہ پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ کی نافرمانی میں اس کا وقت نہ گذرتا ہو تو پھر ایسے صاحبِ دل دیوانۂ حق کی داستانِ عشق و جنوں اور ایسے حاملِ دردِ نسبت کا بیان دردِ دل اور ایسے خدا کی محبت میں بے قرار تڑپتے ہوئے دل سے نکلنے والے جملے کیا کچھ زبردست تاثیر رکھتے ہیں۔ اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا

ہے۔لغت والفاظ اس کیفیت کی ترجمانی سے عاجز ہے۔ یہ تجربہ سے سمجھنے کی چیز ہے کہ کسی خدا کے سچے عاشق کی صحبت میں چند لمحات گذار کر بیٹھ کر اس کی داستان درد وغم سنے اور پھر دیکھے کہ ان کی یہ داستاں کیسے دلوں کو چیرتی اور تڑپاتی ہوئی جارہی ہے۔اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں ؎

خرد ہے محوِ حیرت اس زباں سے
بیان کرتی ہے جو آہ و فغاں سے
جو لفظوں سے ہوئے ظاہر معانی
وہ پاسکتے نہیں دردِ نہانی

کیوں؟اس لیے کہ ؎

لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

میرے دوستو! یہ ایک بات یاد رکھنا کہ جو انسان خود صاحبِ دل ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی تقریر ظاہری فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے پُر نہ ہو،مگر اس میں اللہ تعالیٰ بڑی تاثیر رکھ دیتے ہیں اور ایسے ہی بیانات اور تقریریں لوگوں میں انقلاب برپا کرتی ہیں اور ان کو معصیتوں کی ظلمتوں سے نکال کر طاعات کے انوار سے منور کردیتی ہیں، اسی لیے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اپنے وقت کے علامہ مخدوم العرب والعجم جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جس کا قصہ احقر دوسری جگہ لکھ چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا مقصود ہے کہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بار بار درخواست پر کہ کچھ نصیحت فرمادیں تو آخر میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ایک مختصر سا جملہ ارشا فرمایا تھا کہ ''ہم نے تو اپنے حضرت حاجی صاحب سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ ہے اپنے کو مٹانا۔''بس اسی بات پر آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے حالانکہ یہ کوئی لمبی چوڑی فصیح و بلیغ تقریر نہ تھی۔ اندازہ لگائیں کہ دردِ دل سے نکلے جملوں کی کیا تاثیر ہوتی ہے؟اور ان میں کیا نور رہوتا ہے۔

بدگمان ہمیشہ محروم رہا کرتا ہے

فیض مرشد سے ہوگیا محروم
جب کوئی بدگمان ہوتا ہے

اس شعر میں حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اللہ والوں سے بدگمانی رکھتا ہو تو پھر اسے فیض نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ محروم رہتا ہے یعنی گویا اس شعر کا مقصود موانعِ اکتسابِ فیض میں سب سے بڑے مانع اور رکاوٹ کو پیش کرنا

ہے کہ اگر کوئی کسی کے ساتھ لگا رہے اور تعلق بھی رکھے لیکن اندر دل میں بدظن رہے تو ایسے شخص کو اس شیخ سے کوئی نفع نہیں ہوتا ہے۔

اس لیے شیخ سے حسنِ ظن اور اپنے لیے پوری دنیا میں سب سے زیادہ نافع ہونے کا اعتقاد رکھنا واجب اور ضروری ہے۔ ورنہ مطلقاً شیخ کے بیانات سے معلومات میں اضافہ تو ہوسکتا ہے مگر صاحبِ نسبت ولی اللہ بننا نہ صرف یہ کہ مشکل بلکہ ناممکن ہے اور اس راہِ سلوک کی ترقی مکمل طور پر رک جاتی ہے۔

احقر عرض کرتا ہے کہ یہ حضرت والا کا شعر اس بدگمانی شیخ کے جرم کی شناعت وقباحت کو بیان کرنے کے سلسلہ میں احتیاط پر مبنی ہے ورنہ اس سلسلہ میں جو وعیدیں احادیث مبارکہ میں آئی ہیں وہ تو بہت ہی سخت ہیں۔ چنانچہ احقر عرض کرتا ہے کہ اللہ والوں سے کینہ وعداوت یا ان کی ایذا رسائی پر بہت ہی سخت ارشاداتِ نبوت ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ اسلامی سیاست صفحہ: ۱۲ پر فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ جل جلالہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ﴾

(صحیح البخاری، کتابُ الرِّقاق، باب التواضع، ج:۲، ص:۹۶۳)

جو شخص میرے کسی ولی سے دُشمنی رکھے، میری طرف سے اس کو اعلانِ جنگ ہے۔ تم خود سمجھ لو کہ اللہ جل جلالہ سے لڑائی کر کے دنیا میں کون شخص فلاح پا سکتا ہے اور آخرت کا تو پوچھنا ہی کیا ہے اور یہ مضمون کئی حدیثوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں مختلف الفاظ سے اس پر متنبہ فرمایا ہے۔ چنانچہ الفاظِ بالا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بخاری شریف میں نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ روایت حضرت عائشہ، حضرت میمونہ، حضرت معاذ، حضرت انس، حضرت ابوامامہ وہب بن منبہ سے بھی نقل کی گئی ہے۔ بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ جس شخص نے میرے کسی ولی کو ستایا وہ میرے ساتھ لڑائی پر اُتر آیا۔

ایک حدیث میں آیا ہے جو میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے، وہ میرے ساتھ مقابلہ کے لیے سامنے آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے قریب بیٹھے رو رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ معاذ کیوں رو رہے رہو؟ عرض کیا کہ میں نے اس (پاک) قبر والے (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایک بات سنی تھی اور اس کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ (مبادا کہیں میں مبتلا نہ ہو جاؤں) میں نے آپ کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ تھوڑا سا دکھلاوا بھی شرک ہے اور جو شخص اللہ کے کسی ولی کے ساتھ دُشمنی کرتا ہے وہ اللہ کے ساتھ لڑائی کے لیے مقابلہ کرتا ہے۔ (مستدرک حاکم)

ایک حدیث میں آیا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ جل جلالہ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے وہ مجھ سے لڑنے کے لیے مقابلہ میں آتا ہے، میں اپنے اولیاء کی حمایت میں ایسا ناراض ہوتا ہوں جیسا غضبناک شیر۔ (درمنثور)

صرف دو گناہوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ کی وعید ہے

کتنا سخت اندیشہ ناک معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جس کی لڑائی ہو اس کا بھلا ٹھکانا کہاں؟ اور پھر اگر اس کے معاوضہ میں ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں، ناک کان آنکھ جاتے رہیں تب بھی سہل ہے کہ دنیا کی تکلیف بہر حال ختم ہونے والی ہے اور اس نوع کے نقصان سے توبہ کی اُمید ہے لیکن خدانخواستہ کوئی دینی نقصان پہنچ جائے، کسی بددینی میں مبتلا ہو جائے، تو کیا ہو؟ ائمہ نے کہا ہے کہ گناہوں میں کوئی گناہ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے کرنے والے کو اللہ جل شانہ نے اپنے ساتھ لڑائی سے تعبیر کیا ہو۔ بجز اس گناہ کے اور سود کھانے کے کہ حق تعالیٰ شانہ نے ان دونوں کو اپنے ساتھ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا گناہ بہت ہی زیادہ بڑھا ہوا ہے اور ان لوگوں کے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

صاحبِ مظاہرِ حق نے بھی لکھا ہے کہ اللہ سے بندہ کی لڑائی دلالت کرتی ہے سوء خاتمہ پر۔ ایک مسلمان کے لیے خاتمہ بالخیر ہونا انتہائی مرغوب اور لازوال نعمت ہے اور جس چیز سے خاتمہ کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، تم ہی سوچو کہ کتنی خطرناک چیز ہوگی؟

میرے دوستو! اپنے وقت کے عالمِ ربانی حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کی یہ تحریر اسلامی سیاست صفحہ: ۱۴ پر ہے جو کہ احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں حضرت نے تحریر کی ہے، اس پر اگر کوئی واقعی معنی میں نظرِ عبرت ڈالے تو اسے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء اور مقربین بارگاہ کا اپنی نظروں میں کیا مقام رکھا ہے۔ اس لیے احقر اپنے ناقص علمی مطالعہ کی روشنی میں عرض کرتا ہے کہ جس شخص کی تاریخ پر نظر ہوگی وہ یہ فیصلہ بآسانی کر سکے گا کہ جس طرح اس دنیا میں کبھی بھی وہ قوم عزت و رفعت حاصل نہ کر سکی جس نے نبی کو ستایا ہو اور اس کو تکلیف پہنچائی ہو، بالکل ٹھیک اسی طرح وہ قوم یا وہ فرد کہ جس نے اپنے زمانہ کے عالمِ ربانی کی توہین و تحقیر کی ہو یا اس کو ایذاء پہنچائی ہو یا اس کے ساتھ بدگمانی و بدسلوکی کی ہو، کبھی عزت و سرخروئی حاصل نہیں کر سکا ہے۔

اہل اللہ سے بدگمانی اور ان پر اعتراض بدنصیبی کی نشانی ہے۔

اس کو حضرت شیخ لکھتے ہیں کہ چنانچہ علامہ شعرانی رحمہ اللہ طبقات کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ امام ابوتراب بخشی رحمہ اللہ جو مشائخ صوفیہ میں سے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ جب کسی شخص کا دل اللہ جل شانہ سے اعراض کے ساتھ مانوس ہو جاتا ہے تو اہل اللہ پر اعتراض کرنا اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے نامانوس ہو جاتا ہے تو

وہ اہل اللہ پر اعتراض کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں زند

یہاں ایک بات اور بھی سمجھ لو کہ اہل اللہ بعض مرتبہ اپنے بُرا بھلا کہنے والے سے انتقام لیتے ہیں اور یہ چیز ظاہر بینوں کے لیے حجاب کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ بھی عوام کی طرح جذبات سے مشتعل ہو جاتے ہیں حالانکہ بعض اوقات یہ بڑی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے والد شیخ عبدالاحد کی شان میں کسی عورت نے گستاخی کی۔ انہوں نے صبر و سکون کیا۔ اتنے میں دیکھا کہ غیرتِ الٰہی جوشِ انتقام میں ہے۔ شیخ نے فوراً ایک شخص سے جو اس وقت موجود تھا کہا کہ اس عورت کو ایک تھپڑ مارے۔ اس کو تردد ہوا۔ ادھر وہ عورت گر کر مر گئی۔

اس قسم کے واقعات مشائخ کے حالات میں کثرت سے ملتے ہیں اور میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک تو اس نوع کی سزا دینا مصیبت میں ابتلاء سے بہت سہل ہے۔

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ کسی سے محبت اور تعلق رکھنے کے لیے یہ شرط تو ضروری ہے کہ اس کے دینی حالات معلوم ہوں اور شریعت کے موافق ہونا اس کا محقق ہو جائے لیکن جس شخص کا حال معلوم نہیں، نہ یہ معلوم کہ وہ شریعت کے موافق ہے یا مخالف اس سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ البتہ محض سنی سنائی باتوں سے اس پر کوئی حکم لگانا یا بُرا بھلا کہنا برا ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیٹا! اگر تو اس پر قادر ہو کہ تیرے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہ ہو تو اس کو اختیار کر، یہ میری سنت ہے اور جو میری سنت کو پسند کرتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ (اسلامی سیاست، صفحہ:۲۱)

اس مذکورہ تحریر سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اہل اللہ کے ساتھ کیا محبت وعظمت کا معاملہ کرنا لازم اور ضروری ہے ورنہ الٹا نفع کے بجائے ضرر اور ضرر بھی ضررِ شدید کا خطرہ ہے۔

بلا وجہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے

یہ پورا مضمون تو اپنے شیخ اور کسی بھی ولی اللہ سے بدگمانی و بدظنی اور ان سے عداوت و ایذاء رسانی کے عنوان پر تھا، مگر بدگمانی تو ایسا خطرناک مرض ہے کہ کسی بھی مسلمان سے جائز نہیں ہے اور اس کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے اور اس مرض کا آج کل بہت ہی شیوع و عموم ہے حالانکہ بغیر کسی قوی دلیل کے کسی ایسے مسلمان سے بدگمانی

کرنا جو ظاہر میں نیک اور باشرع ہو بالکل جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''ایسے مسلمان جو ظاہری حالت میں نیک دیکھے جاتے ہیں، ان کے متعلق بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

﴿ اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ ﴾

(الجامع الصغیر للسیوطی، ص: ۴۴۴)

یعنی گمان سے بچو کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔ یہاں ظن سے مراد بالاتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۱۲۰)

اور بدظنی پر عنداللہ مواخذہ ہوگا جبکہ حسنِ ظن پر کوئی مواخذہ نہیں ہے تو جب کسی کی طرف سے کوئی بات اور واقعہ پیش آئے تو اگر اس میں اچھائی اور بُرائی کے دونوں احتمال نکلتے ہوں تو ہم کو چاہیے کہ اسے اچھائی پر محمول کریں ورنہ خواہ مخواہ بلا وجہ انسان گناہ میں گرفتار ہوتا ہے۔

اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جو مجھ کو بچپن سے یاد ہے کہ ایک جگہ ایک خاندان والے مہمان تھے۔ تو انہوں نے ان کو کھانا وغیرہ کھلایا اور جب وہ فارغ ہو گئے تو امرود کی چاٹ بنائی جس کو ہم لوگ فروٹ سیلڈ (Fruit sealed) کہتے ہیں، مگر اس میں انہوں نے کچھ مصالحے اور چینی ڈالی تو چند منٹ کے لیے اس کو ایک طرف اُٹھا کر رکھ دیا تاکہ اس کے اندر وہ چینی اور مصالحے اچھی طرح گھل کر لذیذ ہو جائے، ور پھر اس کو مہمانوں کے سامنے پیش کریں۔ تو اسی موقعہ پر ایک عورت بڑے عجیب لہجہ میں کہتی ہے کہ وہ چاٹ ہم سے کیوں چھپالی؟ اور چھپا کر ایک طرف اُٹھا کر رکھ لی، جب کھلانی نہیں تھی تو پھر ہمیں یہ دکھلائی کیوں؟ آپ حیران ہوں گے کہ میز بان سکتہ کے عالم میں رہ گئے کہ افسوس ہم نے کس نیت سے اس کو ایک طرف رکھا ہے اور اس نے اس کو کس نیت پر محمول کیا ہے؟

اور ایسے واقعات زندگی میں بے شمار پیش آتے ہیں اور عوام مسلمین ہی سے نہیں بلکہ خواص علماء ومشائخ کی ایک بڑی تعداد اسی مرض کا شکار ہے کہ ویسے تو ماشاءاللہ بڑی خوبیوں کے حامل ہیں لیکن کسی کی طرف سے محض کوئی بات سامنے نقل ہونے پر یا ناموافق طبع کوئی قصہ پیش آجانے پر یا کسی خالف کی بعض شکایتوں پر مختلف قسم کی بدگمانیاں دل میں لے کر ہی جاتے ہیں، حالانکہ اس بندۂ خدا کے دل میں ان باتوں کا گذر بھی نہیں ہوتا ہے تو بالآخر کسی موقعہ پر وہ باتیں جب اس کے سامنے آتی ہیں تو وہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا ہے کہ افسوس یہ شخص میرے متعلق ایسے ایسے خیالات میں مبتلا ہے کہ جو کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہیں گذرے اور اس طرح اس کو اس سے شدید تکلیف پہنچتی ہے اور جانبین کو سخت نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ غم کی بات یہ ہے کہ اس نوع کی تحریر پڑھنے کے وقت بھی اپنے اوپر تطبیق نہیں کی جاتی بلکہ اپنی بدگمانیوں کے لیے شیطان کی طرف سے ایسے

مزین کردہ دلائل ذہن میں گھومنے لگتے ہیں کہ وہ اپنی باتوں کو حقائق تصور کرتا ہے، صرف بدگمانی نہیں سمجھتا۔ بس وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ وَ اِلَى اللهِ الْمُشْتَكٰى یعنی لوگ ایسی باتوں اور واقعات ومعاملات میں جانب مخالف کا مفہوم جو بدظنی والا ہے بڑی جلدی مراد لے کر آپ سے ناراض وخفا ہو جاتے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مرض سے اور جملۂ امراض جسمانی وروحانی سے محفوظ فرمائیں حالانکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تو ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ ہماری زندگی کی ایک صبح وشام بھی اس طرح نہ گذرے کہ ہمارے دل میں کسی کی طرف سے کوئی کینہ، عداوت اور بدگمانی ہو۔ جیسا کہ اوپر حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت ذکر کی گئی ہے۔

اس لیے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کوئی ہمیں گالی بھی دے اور بُرا بھلا بھی کہے تو ہم کو تو یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ آدمی بہت اچھا ہے۔ بس وقتی طور پر کچھ غصہ آ گیا تھا اس لیے اس نے مجھے بُرا بھلا کہہ دیا ہے ورنہ وہ تو بہت نیک صالح ہے اور دل کا بہت بھلا آدمی ہے اور ایسی سوچ پر ہمارا کوئی مواخذہ نہیں۔ ہاں البتہ اس مقام پر ایک دوسری چیز ہے جس کو مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

﴿اِنَّ مِنَ الْحَزْمِ سُوْءَ الظَّنِّ﴾

یعنی انسان کی احتیاطی تدابیر میں سے یہ ہے کہ لوگوں پر بے جا اعتماد کر کے ان سے اپنی زندگی میں دھوکہ نہ کھائے اور ان کو اپنے راز دے کر ان سے نقصان نہ اُٹھائے۔ اس کا مطلب لوگوں کو چور ڈاکو سمجھے یہ نہیں ہے۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ بدون قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے اور نہ یہ کہ اس کی تحقیر کرے یا اسے چور وغدار سمجھے بلکہ اپنے معاملہ میں احتیاط برتے۔ (معارف القرآن)

نظر شیطان کا زہر آلود تیر ہے

جو محافظ نہیں نظر کا آہ
زیرِ تیر و کمان ہوتا ہے

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص حسینوں سے خواہ وہ نامحرم عورتیں ہوں یا حسین امرد بے ریش لڑکے ہوں، یا وہ ہلکی ہلکی ڈاڑھی والے امارد ہوں، مگر ان کو دیکھ کر نفس کو حظ وسرور ملتا ہو ان کو دیکھنے سے نظر کی حفاظت نہیں کرتا ہے، آہ! وہ اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے اور خود اپنے چین وسکون کا سودا کر رہا ہے۔ خود وہ اپنے دل پر تیر وکمان کی بارش برسا کر اس کو زخمی ولہولہان کر رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں پورا بدن اور سارے اعضاء وجوارح بیمار وزخمی ہو رہے ہیں۔

ابن الجوزی کی کتاب ''ذم الھویٰ'' کے ترجمہ عشقِ مجازی کی تباہ کاریاں صفحہ ۷۰ پر ہے کہ حضرت علی رضی

اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿یَاعَلِیُّ! اِتَّقِ النَّظْرَۃَ بَعْدَ النَّظْرَۃِ فَاِنَّھَا سَھْمٌ مَسْمُوْمٌ یُوْرِثُ الشَّھْوَۃَ فِی الْقَلْبِ﴾

اور آگے حضرت انس رضی اللہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿نَظْرُ الرَّجُلِ اِلٰی مَحَاسِنِ الْمَرْأَۃِ سَھْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ﴾

اور حضرت علامہ ابن زیاد فرماتے ہیں کہ اپنی نگاہ کو عورت کی چادر پر بھی مت ڈال کیونکہ نگاہ دل میں شہوت کا بیج بوتی ہے۔

زہریلا تیر اگر انسان کے بدن میں لگ جائے تو پورے جسم میں وہ زہر پھیل کر موت کا سبب بنتا ہے تو دوستو! بس اسی طرح یہ زہریلا تیر جب انسان کے ایمان میں داخل ہوگا اور اس کے دل میں جا کر لگے گا تو اس کا زہر اس کے ایمان میں پھیل کر اس کی ساری ایمانیات اور عبادات اور طاعات کی حقیقی لذت کو اس سے دور کر دے گا۔ جیسا کہ جسمانی زہر پھیلنے سے جسم کی صحت بگڑتی ہے۔ اسی طرح روح میں زہر پھیلنے سے قلب و روح کی سلامتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

حضرت والا کی یہ تعبیر درحقیقت ایک حدیث شریف سے ماخوذ ہے جو حضرت کی کتابوں وعظوں میں کئی جگہ مذکورہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ النَّظْرَ سَھْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ مَسْمُوْمٌ مَنْ تَرَکَھَا مَخَافَتِیْ اَبْدَلْتُہٗ اِیْمَاناً یَجِدُ حَلَاوَتَہٗ فِیْ قَلْبِہٖ﴾

(کنز العمال، ج:۵، ص: ۱۳۰، دار الکتب العلیمۃ)

کہ یہ نظر ایک زہریلا تیر ہے۔ شیطان کے تیروں میں سے اور جو اس کو چھوڑ دے میرے خوف سے تو اس کو اس کے بدلے ایسا ایمان عطا کرتا ہوں کہ جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں موجود پاتا ہے۔ دوسری جگہ بھی یہ مضمون آچکا ہے کہ ملا علی قاری ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَقَدْ وَرَدَ اَنَّ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ اِذَا دَخَلَتْ قَلْبًا لَا تَخْرُجُ مِنْہُ اَبَدًا فَفِیْہِ اِشَارَۃٌ اِلٰی بَشَارَۃِ حُسْنِ الْخَاتِمَۃِ

(مرقاۃ المفاتیح)

کہ حلاوتِ ایمانی جب دل میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر اس سے نہیں نکلتی ہے لہٰذا اس میں حسنِ خاتمہ کی طرف اشارہ موجود ہے یعنی گویا حفاظت نظر اتنا بڑا عمل ہے کہ اس میں ایمان پر خاتمہ کی بشارت موجود ہے، اسی لیے قرآن کریم میں اگر غور سے دیکھیں تو غضِ بصر سے حفظِ فرج و شرمگاہ اور اس کے نتیجہ میں طہارتِ قلب اور تزکیۂ نفس کا ہونا اور تزکیۂ نفس پر فلاح کا موقوف ہونا اور فلاح و کامیابی والوں کا اہلِ جنت سے ہونا مذکور ہے تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حفاظتِ نظر دخولِ جنت کی ضامن ہے۔ اسی کو حضرت عارف ہندی حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب فرماتے ہیں کہ

دین کا دیکھ ہے خطر اُٹھنے نہ پائے یاں نظر
کوئے بتاں میں تو اگر جائے نظر بچائے جا

نظر بڑے بڑے بہادروں کو زیر کر دیتی ہے

اس نظر کی بنیاد پر دل قیدی ہوتا ہے اور وہ جال میں پھنستا ہے اور پھر انسان بظاہر لاچار و مجبور دکھائی دیتا ہے، اسی لیے ہم نے دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب کی ایک کتاب پڑھی ہے جس کا نام ''دیوانِ متنبّی'' ہے۔ اس میں ایک عجیب شعر اس نظر کی تاثیر اور عشقِ مجازی کی قید میں پھنس کر انسان کی حالت پر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ؎

یَسْتَاسِرُ الْبُطَلَ الکَمِیَّ بِنَظْرَۃٍ

وَیَحُوْلُ بَیْنَ فُؤَادِہٖ وَعَزَائِہٖ

کہ بڑے سے بڑا بہادر ہتھیاروں سے مسلح اور میدانوں کو زیر کرنے والا ہر طرف سے بہادری کی داد پانے والا لیکن جب معشوق و محبوب پر نظر پڑتی ہے تو ایک نظر میں اس کا ایسا قیدی ہوتا ہے کہ پھر اس سے اس کے فراق وجدائی پر صبر نہیں ہو پاتا اور وہ اس کے صبر اور دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے کہ وہ صبر کو دل تک پہنچنے نہیں دیتا ہے۔

ایک نظر سے جب ایسا حال ہوتا ہے تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظر کی حفاظت کس قدر اہم ہے، اس لیے بڑے بڑے نیک لوگ بھی جب اس سلسلہ میں احتیاط نہیں کرتے تو ان سے وہ سب سننے کو ملتا ہے جس کو ان کے متعلق نہ کبھی کسی نے سوچا ہوتا ہے اور نہ اس کا گمان کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں کہ نظر کی بے احتیاطی کے نتیجہ میں انسان ایمان تک سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور کفر پر موت آتی ہے۔

صالح مؤذنِ بغداد کا عبرتناک واقعہ

چنانچہ اسی طرح کا ایک واقعہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ''ذم الھوی'' میں نقل کیا ہے جو مترجم کتاب عشقِ مجازی کی تباہ کاریاں، صفحہ: ۲۱۰ پر ذکر فرما رہے ہیں کہ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ مجھے ایک شخص کی حکایت معلوم ہوئی ہے جو بغداد میں رہتا تھا۔ نام اس کا صالح تھا۔ اس نے چالیس سال تک اذان دی تھی اور یہ نیک نامی میں بھی بہت مشہور تھا۔ یہ ایک اذان دینے کے لیے منارہ پر چڑھا اور مسجد کے پہلو میں ایک عیسائی کے گھر میں اس کی بیٹی کو دیکھا اور اس کے فتنہ میں مبتلا ہو گیا اور اُتر کر اس کے دروازے پر آیا اور اس کے دروازہ کو کھٹکھٹایا تو اس کی لڑکی نے پوچھا کہ کون ہے؟ اس نے کہا میں صالح مؤذن ہوں۔ تو اس نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ تو اس مؤذن نے فوراً اس کو اپنے سے چمٹالیا۔ تو لڑکی نے کہا تم مسلمان بڑی دیانت امانت والے ہو۔ پھر یہ خیانت کیسی تو مؤذن نے جواب دیا کہ اگر میری بات مانتی ہو تو ٹھیک ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ لڑکی نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔ ہاں اگر تم اپنا دین چھوڑ دو تو۔ مؤذن نے کہا کہ میں اسلام سے بری ہوں اور اس سے بھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ پھر وہ اس کے قریب ہوا تو لڑکی نے کہا کہ تم نے یہ اس لیے کیا کہ اپنا مقصد پورا کرلو۔ پھر اپنے دین کی طرف لوٹ جاؤ۔ اب میری شرط ہے کہ تم خنزیر کا گوشت کھاؤ۔ تو اس نے اس کو

کھایا۔ پھرلڑکی نے کہا کہ اب شراب پیئو۔ تو اس نے شراب بھی پی لی۔ جب اس پر شراب نے اثر کیا تو لڑکی کے قریب ہوگیا۔ تو لڑکی نے کمرہ میں داخل ہوکر اندر سے کنڈی لگالی۔ اور اس نے کہا کہ تم چھت پر چڑھ جاؤ حتیٰ کہ میرا والد آجائے اور میرا تیرا نکاح کردے تو وہ چھت پر چڑھ گیا اور اس سے گر کر مر گیا۔ پھر وہ لڑکی کمرہ سے باہر نکلی اور اس کو کپڑے میں لپیٹا۔ یہاں تک کہ اس کا باپ بھی آگیا۔ تو اس نے اس کو سارا قصہ سنایا تو اس نے اس کو رات کے وقت نکال کر ایک گلی میں پھینک دیا اور اس کا قصہ مشہور ہوگیا اور اس کو گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْ سُوْءِ الْخَاتِمَۃِ.

میرے دوستو! کیا یہ واقعہ نظر بازی کے سنگین اور خطرناک نتائج کے لیے پیش خیمہ ہونے کو ثابت کرنے میں کوئی معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ یہی نظر ایمان سے کفر میں لے گئی اور عمر بھر کا کیا ہوا، سارا سب کچھ ضائع ہوکر رہ گیا ہے۔ کیونکہ نظر سے دل شکار ہوا اور دل نے آگے حرام کاری کی طرف بڑھنے کے لیے دعوت دی جس کے نتیجے میں وہ اپنے دین و ایمان کو قربان کرنے پر راضی ہوگیا۔

آہ! آج کا مسلمان اور بدنظری کے گناہ سے لاپرواہی

آج کے ہمارے نوجوان اس مرض کے شکار ہوکر اپنی جوانیاں تباہ کررہے ہیں اور کیا کچھ نہیں ہورہا ہے کہ اس کے تصور سے روح کانپ اُٹھتی ہے کہ بے حیائی میں مسلم و غیر مسلم کا کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دُکھ اور تکلیف کی بات یہ ہے کہ بظاہر دینداری کا لبادہ اوڑھے ہوئے جماعتوں، مدرسوں اور خانقاہوں سے جُڑے ہوئے لوگ، مگر عورتوں سے نظر بازی کے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے ہیں، اس لیے اپنی دکانوں، آفسوں، کارخانوں اور سرجریوں میں جدھر بھی جاؤ تو جوان عورتوں کو اپنا نوکر اور سکریٹری (Secretary) بنا رکھا ہے اور پورے دن ان کی طرف نظر ڈال ڈال کر نظر کے زنا میں مبتلا ہورہے ہیں اور بظاہر اپنے خیال میں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو کوئی خاص گناہ کی بات نہیں ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ کیا یہ کم حرج اور گناہ ہے کہ آپ نے اپنے اللہ کے حکم کو توڑا ہے اور اس کی نافرمانی کی ہے اور از روئے قرآن و سنت نظر بازی کرنے والے اللہ و رسول کے نافرمان اور ملعون اور آنکھوں کے زناکار کہلاتے ہیں۔ اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو چھوڑنے والے کہلاتے ہیں، اب اگر آگے اور کچھ بھی نہ ہو تو کیا ایک مؤمن کے لیے یہ کچھ کم ہے، اس لیے حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کو کسی نے لکھا کہ نماز پڑھ کر کیا ملا تو فرمایا کہ بس نماز ہی ملی ہے، یہی کیا کم نعمت ہے اور اس سے زیادہ مزید جو کچھ ملے وہ سب من اللہ ہے، مگر نماز پڑھ کر نماز ملی اور خدا کے سامنے اظہارِ بندگی کی نعمت حاصل ہوئی۔ یہ ہمارے حضرت والا کا خاص مضمون ہے اور یہ اس دور کا خاص پھیلا ہوا مرض ہے، اس لیے حضرت نے خلاصہ کے طور پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی پاک صلی اللہ

علیہ وسلم کے ذریعہ مسلمان مردوں اور عورتوں سے کہلوایا اور حکم دیا ہے کہ اپنی نگاہوں کو بچا کر رکھو اور پست رکھو اور فرمایا کہ:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾

(سورۃ النور، آیت: ۳۰)

ترجمہ: مسلمانوں سے کہیے کہ اپنی بعض نگاہوں کو پست رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

اور حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَيْهِ﴾

(مشکوۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب النظر الی المخطوبۃ، ص: ۲۷۰)

جو کسی پر نظر ڈالے اور اپنے کو دیکھنے کے لیے پیش کرے تو ان دونوں پر اللہ کی لعنت ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

﴿زِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الاستیذان، باب زنا الجوارح دون الفرج، ج: ۲، ص: ۹۲۲)

یعنی نظر بازی آنکھوں کا زنا ہے تو اس آیت وحدیث کو سامنے رکھ کر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو نظر نہیں بچاتا ہے تو وہ ایک لقب پاتا ہے کہ اللہ ورسول کا نافرمان ہے۔

اور حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اس کو دوسرے دو لقب ملتے ہیں ایک ملعون اور دوسرا آنکھوں کا زناکار۔ کس قدر بُرے اور مذموم القاب ہیں کہ اگر کوئی اس نظر باز کو ان ناموں سے پکارے تو اسی وقت لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے گا، مگر حقیقی طور پر عنداللہ وہ ان بُرے ناموں کا مستحق ہو جاتا ہے، اس لیے حضرت والا نظر کی حفاظت نہ کرنے والے پر آہ ورحم وشفقت بھر کر فرما رہے ہیں کہ افسوس! ایسا انسان اپنے کس قدر دنیا وآخرت کے خسارہ میں ہے۔ اگر وہ نظر کی حفاظت کرے تو اس کے دل ودماغ بھی راحت وسکون سے رہیں اور وہ دل میں عجیب حلاوتِ ایمانی محسوس کرے گا۔ اس کے ضمن میں یہ بھی عرض کرنا مناسب ہے کہ یہاں جس نظر بازی کی بات ہو رہی ہے کہ وہ صرف نامحرم عورتوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ جو جوان امرد لڑکے ہوتے ہیں جن کی طرف دیکھنے سے جی لگتا ہے اور نفس کو حظ وسرور ملتا ہے وہ بھی اس حکم میں ہیں، اس لیے ایسے اَمردوں کا حکم شرعی طور پر لڑکی ہی کا حکم ہے۔

اکابر واسلافِ امت کی حفاظتِ نظر کے سلسلہ میں احتیاط

چنانچہ جملہ اکابرین واولیائے اُمت ان سے اسی طرح پرہیز کرتے تھے جیسے لڑکی سے پرہیز کرتے تھے، اس لیے امام ابوحنیفہ کے متعلق آتا ہے کہ:

﴿وَكَانَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ صَبِيْحًا وَكَانَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ يُجْلِسُهٗ فِيْ دَرْسِهٖ خَلْفَ ظَهْرِهٖ﴾

مَخَافَةَ خِيَانَةِ الْعَيْنِ مَعَ كَمَالِ تَقْوَاهُ﴾

(رد المحتار، كتاب الحظر والاباحة)

امام محمد کے خوبصورت ہونے کی وجہ سے ان کو امام ابوحنیفہ ان کو پیچھے بٹھایا کرتے تھے۔

چنانچہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ کی کتاب مترجم میں صفحہ:۳۰۷ پر حدیث نقل ہے کہ:

﴿نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُحِدَّ الرَّجُلُ النَّظَرَ اِلَى الْغُلَامِ الْاَمْرَدِ﴾

(الرد المفحم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ انسان کسی بے ریش لڑکے کی طرف نگاہ ڈالے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سماعِ حدیث کے لیے بے ریش لڑکوں کو اپنی مجلس میں بیٹھنے سے منع کرتے تھے۔ ہشام ابن عمار حیلہ کر کے لوگوں کے مجمع میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت وہ بے ریش تھے اور امام مالک سے سولہ حدیثیں سن لیں۔ امام مالک کو جب اس کی خبر دی گئی تو انہوں نے اس کو بلایا اور سولہ دُرّے مارے۔ حضرت ہشام فرماتے ہیں کہ کاش! کہ میں ان سے سو حدیثیں سنتا اور مجھے سو دُرّے مارتے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت امام احمد بن حنبل کی خدمت میں آیا۔ اس کے ساتھ ایک حسین چہرہ والا لڑکا بھی تھا۔ آپ نے اس شخص سے پوچھا کہ یہ کون لڑکا ہے؟ عرض کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کو دوبارہ اپنے ساتھ مت لانا جب وہ شخص چلا گیا تو امام صاحب سے محمد بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ محدّث نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی مدد کرے وہ پاکدامن تھا اور اس کا بیٹا (بے ریش لڑکا) اس سے افضل تھا تو حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے جس مقصد کا ارادہ کیا ہے اس کو ان کا پاکدامن ہونا نہیں روکتا ہے۔ ہم نے شیوخ اساتذہ کو اسی طرزِ عمل پر دیکھا ہے اور انہوں نے ہمیں اپنے اسلاف سے اس کا پتہ دیا ہے۔

حضرت ابوسہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں عنقریب اس اُمت میں ایک قوم ہوگی جن کو لونڈے باز کہا جائے گا۔ ان کی تین قسمیں ہوں گی۔ (۱) ایک قسم صرف (حسین لڑکوں) کو دیکھنے والی ہوگی۔ (۲) دوسری قسم ان سے ملاقات کرے گی، مصافحہ کرے گی۔ (۳) تیسری قسم یہ گھناؤنا فعل کرے گی۔

حضرت ابراہیم حربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اپنی اولاد کی بُرے دوستوں سے حفاظت کرو۔ اس سے پہلے کہ تم ان کو گناہ میں مبتلا کر دو کیونکہ سب سے پہلے بچوں میں خرابی آپس میں شروع ہوتی ہے۔

ابوعبداللہ بن الجلاء کہتے ہیں کہ میں کھڑے ہو کر ایک حسین صورت عیسائی لڑکے کو دیکھ رہا تھا تو میرے پاس سے حضرت ابوعبداللہ بلخی رحمہ اللہ گذرے اور پوچھا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اے چچا!

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ حسین صورت کافر ہونے کی وجہ سے دوزخ میں جلائی جائے گی تو انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا تم اس بدنظری کے وبال کو دیکھو گے اگرچہ کچھ مدت کے بعد چنانچہ ابن الجلاء فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا وبال چالیس سال بعد دیکھا کہ مجھے قرآن پاک بھلا دیا گیا۔ (۴۳ سے ۸۱ کتاب ذم الہوی مترجم)

یہ چند واقعات ہیں جو اسلاف اُمت کے عمل اور ان کے احتیاط اور تقویٰ کو بیان کرنے اور اپنی عبرت کے لیے پیش کیے ہیں۔ افسوس کہ آج ایک طبقہ یہ کہہ کر اس میں مبتلا رہتا ہے کہ یہ تو گناہِ صغیرہ ہے حالانکہ خود صغیرہ گناہ پر اگر اصرار ہو تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ اور بہت سے تو اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے اور نہ اس موضوع پر تقریر و بیان اور وعظ و نصیحت کو پسند کرتے ہیں بلکہ اسے دین میں تشدد اور سختی سے تعبیر کرتے ہیں جو بالکل دین سے ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے۔

اخلاص کے بغیر منزل نہیں مل سکتی

کیسے پائے گا قرب کی منزل
جب کوئی وقفِ نان ہوتا ہے

ظاہر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں بڑے سے بڑا عمل بھی اگر رضائے الٰہی کی غرض اور نیت سے نہ کیا جائے تو پھر اس عمل کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے اور انسان بڑی سے بڑی عبادت کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب نہیں پاتا ہے۔ ہم سب کی منزل مقصود اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب و رضاء ہے اور اس کے حصول کے لیے دونوں باتیں ضروری ہیں، جو بھی عمل کیا ہے وہ شریعت و سنت کے مطابق ہو اور دوسری چیز کہ وہ نیت صحیح یعنی اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضاء کے لیے کیا جائے۔ ان میں سے اگر کوئی بھی مفقود ہو تو پھر وہ عمل بے کار اور باعثِ مؤاخذہ و عتاب ہوتا ہے۔

اوّل کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص بڑی ہی خشوع و خضوع والی نماز پڑھے اور اس میں خوب آہ و زاری کرے اور بڑی توجہ الی اللہ بھی ہو، مگر عصر کی نماز کے بعد نفل کی نماز ہو یا عید کے دن روزہ ہو تو اس طرح کے عمل میں خواہ کتنا ہی اخلاص ہو وہ غیر معتبر اور غیر مقبول ہے اور ٹھیک اسی طرح اگر کوئی شخص صحیح حقیقی جہاد واقعی شرعی طریقوں کے مطابق کر رہا ہو اور بہت صحیح جگہوں میں اپنی دولت خرچ کر رہا ہو، مگر اس سے اس کی نیت صحیح نہ ہو تو روایت بہت ہی مشہور ہے کہ شہید و سخی و قاری کو لا کر ان کو اوّل جہنم میں منہ کے بل گھسیٹ کر ڈالا جائے گا کیونکہ ان کی قراءت و جہاد و سخاوت اللہ کی رضا کے لیے نہ تھی، اس لیے اہل اللہ سے تعلق اور ان کی صحبت میں بھی اپنی نیت کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ کیا میں اس لیے یہاں آتا ہوں کہ یہاں کھانے کا بہت اچھا نظم ہے یا اس لیے آتا ہوں کہ یہاں بڑے مالدار لوگ ہیں، ان سے تعلق ہونے میں آسانی رہے گی یا اس لیے آتا ہوں کہ یہاں آ کر بڑی جلدی عالمی

شہرت حاصل ہوجائے گی وغیرہ وغیرہ یہ ساری نیتیں قابلِ اصلاح ہے۔ صرف اللہ کو پانے اور اپنی اصلاح کی نیت سے آنا چاہیے اور کسی اللہ والے کی صحبت میں اسی نیت کے ساتھ ایک مدت رہنا چاہیے۔

اخلاص کی ایک الہامی حکمت

احقر ایک بات عرض کرتا ہے تاکہ اگر اس میں کچھ غلطی ہو تو اصلاح ہوجائے وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اخلاص کا حکم دے کر احسانِ عظیم فرمایا ہے کیونکہ اگر ہم کو یہ کہا جاتا کہ اتنے اتنے لوگوں کو خوش کرو اور ان کے سامنے ان کے لیے کام کرو کہ یہاں تک کہ وہ خوش ہوجائیں تو بڑا مشکل ہوجاتا۔

میرے دوستو! غور کرو کہ ایک ایسی ہستی کو خوش کرنا کہ جو ہر گھڑی ہمارے دل کی دھڑکنوں سے بھی واقف، جو ہمارے خفیہ وعلانیہ ظاہر وباطن کا جاننے والا، جو سارے انسانوں اور ساری مخلوقات کا کنٹرول کرنے والا ہے اور جس کے حکم کے بغیر درخت پر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کرتا ہے اور جس کے فیصلہ کے بغیر نہ کسی میں نفع کی طاقت اور نہ نقصان وضرر کا اختیار تو ایسے ایک رب کو راضی کرنا کتنا آسان ہے۔

جبکہ مختلف انسانوں کی سوچ مختلف، ان کا مزاج مختلف، طبیعتیں مختلف، اور چاہتیں الگ، پسند و ناپسند کا معیار جدا جدا، ایک کو راضی کرو تو دوسرا ناراض، دوسرے کو راضی کرو تو پہلا ناراض تو سب کو راضی کرنا انسان کے لیے بہت ہی مشکل ہوجاتا۔ پھر انسان کا علم ناقص، اس کی عقل وفہم ناقص، اس لیے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو واقعی آپ کا خیر خواہ ومخلص وہمدرد ہو، مگر کسی نے ایک دو بات اس کے متعلق آپ کے کانوں میں ڈال دیں بس آپ بدظن ہوگئے اور اپنی بیسیوں سال کی عقیدت ومحبت اور دوستی کو ایک طرف ڈال دیا۔

بس احقر درد بھرے دل سے کہتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اسلام کا راستہ اللہ نے بہت آسان کر دیا ہے کہ ایک مجھے راضی کرو، باقی کسی کی پرواہ نہ کرو کیونکہ ہر سانس کے بدلے دوسرا سانس دینے والا، ہر صبح وشام روزی ورزق دینے والا میں ہوں۔ اگر تم نے مجھے راضی کیا تو سمجھو کہ سب کچھ تم نے پالیا۔ رزق بھی، عزت بھی، سکون بھی، راحت بھی کیونکہ سب کچھ کا میں اکیلا مالک ہوں اور میرا کوئی شریک وساجھی نہیں ہے۔ اسی لیے تو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿یَا مَعَاذُ اَخْلِصِ الْعَمَلَ یَکْفِکَ الْقَلِیْلُ مِنْهُ﴾

(تفسیر القشیری)

اے معاذ! عمل کو خالص اللہ کے لیے کرو تو تھوڑا سا بھی کافی ہوجائے گا، اس لیے اصل چیز، ہر عمل کی جان اخلاص ہے، اسی لیے جگہ جگہ قرآن وحدیث میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اور یہ بھی احقر بہت صاف لفظوں میں عرض کردینا چاہتا ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اُٹھائے بغیر اور ان سے

تعلق کیے بغیر اخلاص کی حقیقت کا پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ بس لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں، مگر اخلاص کامل کیا ہے؟ اس کا پتہ صرف اللہ والوں کے پاس رہ کر ہی ہو پاتا ہے، اسی لیے ایک بہت بڑے عالم حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ سے ملے اور عرض کیا کہ یہ تصوف کیا ہے؟ مجھ کو سمجھا دیں اور ان کا یہ خیال تھا کہ حضرت گھنٹوں تقریر کریں گے اور پھر شاید سوال و جواب کی نوبت بھی آئے گی اور اگر حضرت شیخ نے یوں فرمایا تو میں یوں اعتراض کروں گا اور یوں فرمایا تو یوں اعتراض کروں گا لیکن صورت وحال یہ ہوئی کہ حضرت نے فرمایا کہ بس تصوف کی حقیقت تصحیح نیت ہے۔ یعنی اس کی ابتداء تصحیح نیت ہے اور انتہاء احسان و اخلاص ہے۔ چنانچہ حدیثِ جبرئیل میں ایمان و اسلام کے بعد جس احسان کا تذکرہ ہے بس اسی احسان کو ہم اپنی اصطلاح میں تصوف کہتے ہیں اور اصطلاحات بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کا دھیان اور خیال رہنے لگے۔ ہر عمل کی ابتدا و بقاء دونوں میں صرف مرضی محبوب پیش نظر ہو۔ اس کے غیر سے نظر بالکل اُٹھ جائے اور یہی چیز سالک کو سب سے اخیر میں جا کر حاصل ہوتی ہے۔ اور مدار نجات یہی ہے۔ باقی سب کے لیے ہلاکت و بربادی اور نقصان وخسران ہے۔

شتر باں حکمراں کیونکر بنے؟

دیکھ لو شانِ فیض پیمبر
شتر باں حکمران ہوتا ہے

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا کمال ہے کہ ایسی قوم جو جہالت و گمراہی میں اور قتل و غارت گری میں اعلیٰ درجہ پر فائز تھی جن میں تہذیب و تمدن کا نام ونشان نہ تھا اور وہ ایسے گئے گذرے شمار ہوتے تھے کہ ان پر اس وقت کی حکومتوں کے بادشاہ حکومت کرنے کو باعث عار سمجھتے تھے، مگر حق تعالیٰ نے ایسی ہی جگہ پر اپنے سب سے محبوب نبی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں میں سے پیدا فرمایا اور پھر آپ کی تعلیمات کو قبول کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی برکت سے یہ لوگ جو کل تک اونٹوں کو چراتے تھے اور راعی الابل کہلاتے تھے۔ اب راعی القوم اور ایسے بادشاہ بنے کہ قیامت تک دنیا ان کو یاد رکھے گی اور ایسی تہذیب و تمدن والے بنے کہ اس دور کے سارے ترقی یافتہ ممالک اور قومیں ان کی غلام بنیں اور ان کے نام سے کانپنے اور تھرانے لگے۔

چنانچہ ہمارے دارالعلوم آزادول کی مسجد میں پاکستان کے ایک عالمِ دین نے بیان فرمایا تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مقام سے گذرتے ہوئے وہاں ذرا ٹھہرے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ تو صحابہ نے دریافت کیا کہ یا امیر المؤمنین! ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ تو ارشاد فرمایا اور بڑی عجیب بات فرمائی۔ ارشاد فرمایا کہ مجھے اس جگہ پر پہنچ کر اپنے ماضی کا ایک قصہ یاد آ گیا ہے کہ ٹھیک اس جگہ پر میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ تجھے تو اونٹوں اور بکریوں کا چرانا اچھی طرح نہیں آتا تو زندگی کیسے بسر کرے گا اور اپنی زندگی میں کیا کرے گا؟ تجھ سے کچھ

نہ ہو سکے گا۔ تو مجھے وہ جملے یاد آئے اور آج حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور اتباع کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا کچھ عطا کیا ہے اور کیا عزت و شرف بخشا ہے، اس لیے آنکھوں میں آنسو ہیں۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی کے پاس رہ کر جاہل اور سرکش افراد کا درست اور ٹھیک ہو جانا اور اخلاقِ حمیدہ اور اوصاف عالیہ کا حامل ہو جانا، یہ درحقیقت خود مربی کا کمال ہوتا ہے اور اس میں اس کے طرقِ تربیت اور انداز اصلاح کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمالات اور ان کے اخلاقِ عالیہ اور ان کی صفاتِ حمیدہ جتنی بیان کی جائیں یہ درحقیقت خود حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف ہے اور اس سب میں خود بخود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا عالی ہونا اور آپ کا واقعی نبی برحق اور مؤید من اللہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور آپ کی تربیت و اصلاح کی باتوں کا وحی ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ جو لوگ جیسے اہلِ تشیع روافض صحابہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں وہ نادان یہ نہیں سوچتے کہ یہ سب وشتم صحابہ پر درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تربیت میں تنقیص اور اس میں کیڑے نکالنا ہے یا ان کے ارتداد کی باتیں کرنا یہ سب شیطانی راستے ہیں اور ڈائریکٹ (Direct) حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا ہے۔ اس لیے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پورے تیئس سالہ دورِ نبوت میں انسانوں کی اصلاح ہو کر ان کو اعلیٰ مقامِ قرب حاصل نہ ہوا ہو تو پھر میں یہ کہوں گا کہ کسی ولی اللہ کی تربیت میں تو سینکڑوں اور ہزاروں سالوں میں بھی کسی کی تربیت ممکن نہ ہوگی۔

اس لیے حضرت والا کے اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہی حضرات جو شتربان تھے حکمران اور صحابہ بنے اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے سرٹیفکیٹ (Certificate) کے مستحق قرار پائے یعنی قیامت تک کے لیے اللہ کی رضا کا سٹوفکلیٹ قرآن نے ان کو دیا۔ یہ سب کچھ فیضان نبوت کا اثر ہے کہ حقیقی انسان بننا نصیب ہوا اور ظاہر و باطن کی کایہ پلٹ گئی۔

صحابہ مسلمان ہو کر معزز تھے تو ہم خوار کیوں؟

یہاں یہ بھی داستان درد و غم چھیڑنی ضروری ہے کہ ایک طرف وہ شتربان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور دل و جان سے سچی اتباع کی برکت سے ذلت و خواری سے نکل کر رفعت و عزت حاصل کرتے تھے اور دوسری طرف آج کا مسلمان ہے۔ نامعلوم کہ اس نے کہاں سے یہ سیکھا؟ اور جانا ہے کہ اللہ کے باغی اور دُشمن یہود و نصاریٰ کی تہذیب و تمدن ان کے طور و طریق ان کے رہن سہن سے محبت کرو اور اس کو رواج دو اور اس میں تفاخر کرو اور اس کو اپناؤ تو تم باعزت ہو جاؤ گے۔ خواہ ہماری تجارتیں ہوں یا معاشرتیں اور معاملات ہو یا اخلاقیات ہوں سب میں ان کی اتباع و پیروی ہمارا شعار بن چکی ہے اور ہم نے ذلت کی راہوں میں عزتیں ڈھونڈنا شروع کر دی ہیں۔ اور بس اگر دینداروں کا بھی ذکر کروں تو انہوں نے بھی دین کو صرف مسجد اور نماز تک منحصر کر دیا ہے کہ نماز و روزہ اور

حج وعمرہ وغیرہ چند عبادات کو ادا کر کے باقی اسلام کی جامع اور مکمل تعلیمات سے کلی طور پر انحراف پایا جارہا ہے، حالانکہ دینِ اسلام ایک مکمل جامع نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے۔ جس کے کسی بھی شعبہ میں کوئی کمی اور کسر نہیں ہے کہ جس میں اسلام کی تعلیمات موجود نہ ہوں۔ پیدا ہونے سے مرنے تک۔

بلکہ میں تو آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ پیدا ہونے سے بھی پہلے سے اسلامی تعلیمات آپ کے متعلق موجود ہیں اور اسی طرح مرنے تک نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی آپ کے لیے اسلامی تعلیمات موجود ہیں۔ افسوس صد افسوس! اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ایسے جامع اور مکمل دستورِ حیات کو چھوڑ کر خود یہود ونصاریٰ کے گھڑے ہوئے طریقوں کو اختیار کر کے ان میں اپنی عزت محسوس کرنا، اس سے بڑی تباہی اور بربادی کیا ہوسکتی ہے، اسی لیے آج مسلمان ہر طرف ذلیل وخوار ہیں اور اس لیے آج بھی ہم مسلمانوں کے لیے عزت کا وہی پرانا راستہ ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے لَنْ یَصْلَحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا یعنی اس اُمت کا اخیر ہرگز درست نہیں ہوسکتا، مگر انہیں چیزوں سے کہ جن چیزوں سے اس اُمت کا اوّل اچھا ہوا ہے یعنی جن بنیادوں پر یہ اُمت عزت پائی تھی اور اس کے شتربانوں نے شاندار حکمرانی کی تھی۔ بس آج کے دور میں بھی اس اُمت کی فلاح وصلاح اور اس کی کامیابی وکامرانی اور اس کی عزت ورفعت کے لیے وہی راستہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے راستوں میں اس اُمت کی تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

صاحبو آہ! کس دردِ دل سے کہوں کہ آج ہماری بنیادی تباہی وبربادی کی وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات کو چھوڑ کر دُشمنوں کے طریقوں کو اختیار کرلیا ہے حالانکہ ہمیں اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کیونکہ اگر کسی ملک کے پاس اپنی ساری چیزیں ملک سے پیدا ہونے والی موجود ہوں اور وہ ملک ہر طرح سے خودکفیل ہو تو وہ اپنے اس خودکفیل ہونے پر فخر کرتا ہے اور اس کو باہر سے درآمدات اور امپورٹ (Import) کی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ اگر باہر والوں کو ضرورت ہو تو وہاں سے ضروری اشیا برآمد اور ایکسپورٹ (Export) کی جاتی تو آخر میرے بھائیو! جب ہمارے اللہ نے ہمیں ایسا دین نہیں دیا ہے کہ جس میں کوئی کمی ہو کہ اس کو ہم دوسروں سے حاصل کریں بلکہ بحمداللہ مکمل اور جامع نظامِ حیات عطا فرمایا ہے کہ جس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے احکام اور طریقے موجود ہیں تو پھر ہمیں دوسروں کے طریقوں کو اپنے اندر لانے کی کیا ضرورت ہے اور جبکہ وہ دوسرے ہمارے حقیقی دُشمن ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اور کمی نہیں چھوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوری اُمت کی حفاظت فرمائے۔

منزلِ قرب سے گذرے بغیر نشانِ منزل نہیں بن سکتے

منزلِ قرب سے جو گذرے گا
منزلوں کا نشان ہوتا ہے

جو انسان اللہ تعالیٰ کے قرب ومحبت کو حاصل کرنے کے لیے مجاہدات وریاضتوں سے گذرتا ہے اور خون آرزو پیتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی جی چاہی پر ربّ چاہی کو غالب کر دیتا ہے۔ تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ایسا عظیم مرتبہ عطا فرماتے ہیں کہ لوگ اس کو دیکھ کر اس کے اعمال وافعال کو دیکھ کر اس کی صورت وسیرت کو دیکھ کر دین پر آنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک ایک ادا ایسی سنت وشریعت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے کہ لوگ اس کو اپنا مقتدا اور شیخ ورہبر بنانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کی زندگی کا سامان فراہم کرتے ہیں اور اس کے شب وروز میں ہونے والے معمولات مؤمنین کے لیے قابلِ اتباع ہوتے ہیں اور گویا حضرت والا کے الفاظ میں کہ اللہ تعالیٰ اسے منزلوں کا نشان بنا دیتے ہیں۔

گویا کہ جس طرح وہ منزلِ قرب خداوندی تک پہنچا ہوا ہوتا ہے تو جو اس سے جُڑ جاتا ہے وہ بھی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے اور اگر خود انسان ان راہوں سے گذرا ہوا نہ ہو تو پھر کیا دوسرے کے لیے نمونہ اور قابلِ اتباع ہوگا گویا حضرت والا اس شعر میں ہم کو یہ نصیحت فرمارہے ہیں کہ اگر ہمیں دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عشق ومحبت کو پھیلانا اور لوگوں کو اس کا سبق دینا ہے اور پورے عالم میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اللہ کا دیوانہ بنانا ہے تو پھر خود بھی فرزانگی کے اصولوں کو چھوڑ کر دیوانگی کی راہوں پر آنا پڑے گا اور ساری حرام لذتوں اور آرزوؤں کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر فنا کرنا پڑے گا، تب جاکر یہ مرتبہ قرب وقبول حاصل ہوگا ورنہ یاد رکھیے کہ صرف آرزوؤں سے یہ راستہ طے نہیں ہوتا ہے۔

اللہ کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا پرواہ

سارا عالم کرے گا کیا اخترؔ
جس پہ حق مہربان ہوتا ہے

جو مضمون حضرت والا نے اس شعر میں پیش کیا ہے، اس مضمون سے قرآن وحدیث بھرے ہوئے ہیں۔ جیسے اس میں سے چند احقر پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ:

﴿وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾

(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۱۳۹)

ترجمہ: اور تم ہی بلند وبرتر رہوگے اگر تم مومن ہو۔

اگر تم میرے سچے عاشق اور حقیقی چاہنے والے اور مجھے دل وجان سے ماننے والے رہوگے تو پھر میں کسی

کو تم پر غالب نہ کروں گا بلکہ ہمیشہ تم ہی سر بلند رہو گے اور عزت و رفعت تمہارا مقدر ہوگی اور ہر قدم پر نصرت وتائید خداوندی سے تم منصور و موئید رہو گے، مگر اس کے لیے شرط یہی ہے کہ تم نیک و صالح اور واقعی اہلِ ایمان رہو۔ جیسے دوسری آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۲۰)

ترجمہ: اور اگر تم صبر اختیار کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازشیں تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔

(معارف القرآن، ج:۲،ص:۱۵۶)

اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ اگر تم صبر وتقویٰ کے ساتھ متصف رہو گے تو پھر تم کو ان دُشمنوں کی سازشیں اور ان کی تدبیریں بالکل نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ قرآن کریم نے تیسرے ایک مقام پر جہاں شیطان کے تصرف اور شیطانی چالوں سے متاثر ہونے والوں کا ذکر ہے اس مقام پر یہ بھی مذکور ہے **اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ** کہ میرے خالص و مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی اثر نہیں چلے گا۔ تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ سارا عالم ایسے شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور عنایتیں ہوں اور اللہ کہ مہربانیاں اور عنایتیں کن کے ساتھ ہیں؟ تو قرآن نے اس کا بھی اعلان فرمایا ہے کہ:

﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین سے قریب ہے۔

اس لیے جو خاصانِ خدا اور اللہ کے نیک و صالح اور مخلصین بندے ہیں، ان کے دُشمن ان کے خلاف کتنی بھی سازشیں کریں، مگر پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ دُشمن مٹتے چلے جاتے ہیں اور یہ اللہ والے چمکتے چلے جاتے ہیں اور دنیا اُن کے قدموں میں آتی ہے۔

تو میرے دوستو! اللہ والا بننے اور نیک صالح بننے کے بے شمار دنیوی اور اخروی فائدے ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، مگر ان سارے فائدوں میں سب سے اعلیٰ اور اونچا فائدہ اور نفع یہی ہے کہ ہر قدم پر نصرت الٰہی اور تائیدِ ربانی اس کے ساتھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کے دُشمنوں کی طرف سے اس کو کافی ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا فائدہ اور نفع عظیم ہو سکتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اللہ کی مہربانیوں اور عنایتوں کی بارش میں رہتا ہے اور جو وعدۂ حدیث پاک کے اندر آیا ہے کہ:

﴿وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقاق)

کہ دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے۔ وہ اس کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوا دیکھتا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک شخص کچھ ہدیہ لے کر آیا اور اس کی نیت مخلصانہ نہ تھی جس کو حضرت نے اپنی فراستِ ایمانی سے تاڑ لیا اور اپنے قلب میں محسوس کر لیا کیونکہ یہ اللہ والے لوگ خاص فراستِ ایمانی رکھتے ہیں جس کو فرمایا گیا ہے کہ:

﴿اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن)

کہ مؤمن کی فراستِ ایمانی سے بچو اور ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

تو بہر حال حضرت نے اپنا چہرہ پھیر لیا اور منع فرما دیا تو اس شخص نے دوسری طرف سے جا کر حضرت کو دینا چاہا تو حضرت نے ادھر سے بھی رُخ پھیر لیا۔ بالآخر وہ شخص حضرت کے جوتوں میں وہ پیسے رکھ کر چلا گیا تو حضرت اُٹھے اور پیسوں کو جوتوں سے جھاڑا اور چلتے بنے۔

یہ وہ چیز ہے کہ جب کوئی حقیقی معنی میں اللہ والا بنتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ دنیا کو اس طرح اس کے قدموں میں لاتے ہیں اور پھر وہ دنیا کو کوئی اہمیت و وقعت نہیں دیتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص نیک و صالح بننا چاہے اور وہ سلوک طے کر رہا ہو اور اس نیت سے اس راہ کو طے کر رہا ہو کہ لوگ میرے نیک بننے کے بعد اس طرح میرے بھی پاس آیا کریں گے اور میری تعظیم و تکریم کریں گے اور میں خوب مشہور ہوں گا اور مجھے خوب ہدایا و تحائف پیش کیے جایا کریں گے اور لوگ مجھے بزرگ سمجھیں گے تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس نیت کا دل میں رکھنا خود غیر اللہ ہے اور ایسے بتوں کو دل میں رکھتے ہوئے پھر اللہ کی محبت کا دل میں آنا یہ محض خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ میں لا الٰہ کو مقدم رکھا ہے اور الا اللہ کو بعد میں رکھا ہے کہ پہلے دل سے سارے الٰہ نکالو اور سارا غیر نکالو تب جا کے اللہ دل میں آئیں گے۔

لا الٰہ ہے مقدم کلمۂ توحید میں
غیرِ حق جب جائے ہے تب دل میں حق آجائے ہے

اور یہ سارا عزتوں اور عظمتوں کا نقشۂ مظنونہ یہ سب غیرِ حق ہے یہ سب کچھ دل و دماغ کے حاشیوں سے بھی باہر ہو، بس صرف پیشِ نظر اللہ ہی اللہ ہو۔ تب انسان خدا کا محبوب بنتا ہے اور تب ان سب فضیلتوں اور وعدوں کا مستحق ہوتا ہے، لیکن آج ہماری کمی یہی ہے کہ انتظار بڑی بڑی بشارتوں کے نزول کا ہے، مگر جو صحابہ کے مجاہدات و قربانیاں ہیں، ہم ان کے پاسنگ بھی نہیں ہیں تو ہمارا حال ایسا ہے۔ بقول حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کہ ہم کھیت کے اندر گیہوں کا بیج ڈال دیں اور پھر انتظار کریں کہ اس میں چاول اُگنے لگے۔ صحابہ نے جو بویا تھا وہ کاٹا تھا اور جیسا دیا ویسا لیا تھا۔

دردِ دل کا امام ہوتا ہے

جذب جس کا امام ہوتا ہے راہ میں تیزگام ہوتا ہے
دل سے ان کا غلام ہوتا ہے عشق جس کا امام ہوتا ہے
جس کا رہبر نہ ہو تو پھر اُس کا نفس بھی بے لگام ہوتا ہے
دوستو! دردِ دل کی مسجد میں درد دل کا امام ہوتا ہے
یہ کرامت ہے شیخِ کامل کی فیض طالب کا عام ہوتا ہے
رائیگاں آہ تو نہیں ہوتی فضل اس پر بھی تام ہوتا ہے
کار فرما تو لطف ہے اُن کا ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے
عالمِ غیب کے ہیں جام و سبو جام اُن کا ہی جام ہوتا ہے
گر نہ ہو دوستو کرم ان کا عمر بھر عشق خام ہوتا ہے
اشک باری پہ فضل باری ہو تب کہیں جا کے کام ہوتا ہے
گر مُربی نہ ہو کوئی اُس کا عشق بھی بے نظام ہوتا ہے
ذکر و تقویٰ کے نور سے اختؔر نورِ نسبت تمام ہوتا ہے

مشکل الفاظ کے معانی: جذب: اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی طرف کھینچ لینا۔ **تیز گام:** تیز تیز قدم چلنے والا۔ **رہبر:** مرشدِ کامل۔ **بے لگام:** بے قابو۔ **جام و سبو:** شراب پینے کا پیالہ۔ **خام:** کچا۔ **اشکباری:** آنسو بہانا۔ **مربی:** تربیت کرنے والا۔

خالق جسے جذب فرمالے پھر اس کی اڑان کا کیا پوچھنا

جذب جس کا امام ہوتا ہے
راہ میں تیزگام ہوتا ہے

جذب جس سالک کا امام ہوجائے تو پھر وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف ایسی تیزی کے ساتھ قدم بڑھا کے چلتا ہے اور اتنی جلد منزلیں طے کرتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے مواعظ میں ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی طرف کسی کو جذب فرماتے ہیں تو چونکہ قادرِ مطلق ہیں اور تمام طاقتوں اور تمام قدرتوں اور تمام شہنشاہوں اور بادشاہوں میں سب سے زیادہ قدرت وطاقت رکھنے والے اللہ ہیں تو جب اللہ کسی کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو کوئی کتنی ہی طاقت والا ہو وہ اللہ سے اُسے چھڑا نہیں سکتا۔ اس لیے جب اللہ اپنی طرف کھینچیں گے تو یہ نفس وشیطان جو ہمارے دُشمن ہیں اور یہ غلط تعلق والے جو اگرچہ بظاہر تو دوست دِکھتے

ہیں، لیکن حقیقت میں دُشمن ہیں۔ یہ امرد لڑکے، حسین عورتیں وغیرہ ہمیں اپنی طرف کھینچ کر گناہ کرانا چاہتی ہیں۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں تو پھر اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور پھر اسے کسی ضرور نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا جیسا کہ قرآنِ کریم کی اس آیت میں ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۱۳)

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ''جبیٰ'' حضرت والا فرماتے ہیں ''جذبؒ'' کے معنی میں ہے۔ یعنی اپنی طرف کھینچ لینا، اپنی طرف جذب کر لینا جس کو اللہ اپنی طرف ''پُل'' (Pul) کر کے کھینچ لیں، اُسے پھر کوئی طاقت نہیں چھڑا سکتی۔

جیسا کہ حضرت والا نے اپنی کتاب ''معارفِ مثنوی'' میں اس کے دو طریقوں کو ذکر فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ تک وصول کے دو طریقے ہوتے ہیں جن کے متعلق قرآن کریم سے استدلال پیش کرتا ہوں:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾

اللہ جس بندہ کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس طریق کا نام طریقِ جذب ہے۔

﴿وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾

اور ہدایت دیتا ہے اس بندہ کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وتوجہ اختیار کرتا ہے۔ اس طریق کا نام طریقِ سلوک ہے۔

سلوک فعلِ اختیاری ہے اور جذب امرِ غیر اختیار۔ پس بندہ سلوک کا مکلّف ہے لیکن عادۃً ہر سالک کو بھی اس کے مجاہدات کے صلہ میں من جانب اللہ جذب نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ بغیر عنایت ویاریٔ حق کے کسی کا کام نہیں بنتا۔ جذب اور سلوک ہر دو طریق بہرحال فضل ہی سے موصل الی المقصود اور مثمر للقرب ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی عنایت کے ایک ذرّہ سایۂ طاعت پر ناز کرنا دنیا والوں کی ہزاروں کوششوں سے افضل ہے۔

اسی لیے جب شیطان نے یہ کہا تھا کہ میں تیرے بندوں کو بہکاؤں گا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو گمراہ کرتا رہوں گا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا تھا:

﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾

(سورۃ الحجر، آیت: ۴۰)

جو اللہ کے خاص بندے ہیں اُن پر شیطان کا کوئی اثر نہیں چل سکے گا، کیونکہ شیطان کو اللہ نے ڈھیل دی ہے اور اس نے ڈھیل مانگی تھی، لیکن شیطان کی قدرۃ، شیطان کا پاور، شیطان کی طاقت، اللہ کے سامنے جا کر رُک جاتی ہے۔ وہاں یہ بھی کہہ اُٹھتا ہے:

﴿وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾

(سورۃ الانفال، آیت: ۴۸)

جنگ کے موقع پر وہ لڑاتا ہے اور لڑا کر جب دُشمن کو اہلُ اللہ اور مؤمنین اور اللہ کے لیے لڑنے والوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے پھر وہاں سے بھاگتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ بس اب آگے میرا کام نہیں تمہیں جہنم کے اندر جھونک دینا اتنا ہی میرا کام تھا۔ تو پھر وہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کے سامنے اس کے سارے حیلے اور حربے فیل ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی طرف کھینچ لے بس وہ بڑی جلدی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی نشانی کیا ہوتی ہے کہ اللہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟ اس کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس آدمی کے دل میں جذباتِ خیر آنے لگتے ہیں جیسے توبہ کا جذبہ، شکر وصبر کا خیال، خیر کے کاموں کی سوچ اور لگن، اللہ والوں سے ملنے کا خیال اور داعیہ، قلب میں اُبھرنے لگتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ اندر سے اُسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، اسی لیے یہ ساری چیزیں اس کے دل میں ڈالی جارہی ہیں کہ وہاں چلو، اُن سے ملو، اللہ کے نیک صالح بندوں کے پاس بیٹھو، اُٹھو اور اس طرح ہوتے ہوتے ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ بھی اللہ والا بن جاتا ہے۔ یعنی اپنے شیخ سے جس درجہ محبت وعقیدت اور عشق ہوگا اتنی جلد یہ راستہ بھی بآسانی طے ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنے خالق ومالک پر فدا ہوگا، اس لیے راہِ سلوک کی سب سے قیمتی سوغات عشق ہے نہ کہ عقل۔

رہبر کے ساتھ ساتھ عشق امام ہو تو نفس بے لگام نہیں ہوتا

دل سے ان کا غلام ہوتا ہے
عشق جس کا امام ہوتا ہے
جس کا رہبر نہ ہو تو پھر اُس کا
نفس بھی بے لگام ہوتا ہے

اسی لیے حضرت والا نے ابھی جو وعظ میں قصہ بیان فرمایا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا جلیل القدر صحابی غلام کو مار رہا ہے۔ پٹائی کر رہا ہے۔ توجہ نہیں ہو پارہی ہے کہ میرے اللہ کو میرے اوپر اتنی قدرۃ ہے۔ میں اپنی تھوڑی سی قدرۃ کو استعمال کر کے غلام کی پٹائی کر رہا ہوں۔ اگر اللہ مجھ پر ناراض ہو گئے اور اللہ نے انتقام لینا شروع کر دیا تو کیا ہوگا؟ حضرتِ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے توجہ دلانے سے فوراً ذہن متوجہ ہوا اور فرمایا کہ یارسول اللہ! میں اس غلام کو اللہ کے لیے آزاد کر رہا ہوں۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہاری طرف لپک کر تمہیں چھو لیتی۔

﴿عَنْ أَبِیْ مَسْعُوْدِ الْأَنْصَارِیِّ قَالَ كُنْتُ أَضْرِبُ غُلَامًا لِّیْ فَسَمِعْتُ مِنْ خَلْفِیْ صَوْتًا اِعْلَمْ أَبَا مَسْعُوْدٍ

لَلّٰہُ اَقْدَرُ عَلَیْکَ مِنْکَ عَلَیْہِ فَالْتَفَتُّ فَاِذَا ھُوَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللہِ ھُوَ حُرٌّ لِوَجْہِ اللہِ فَقَالَ اَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ لَلَفَحَتْکَ النَّارُ اَوْ لَمَسَّتْکَ النَّارُ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب صحبۃ الممالیک و کفارۃ من لطم عبدہ)

حضرت والا نے اس سے استنباط فرمایا کہ بڑے بڑے اچھے اچھے لوگوں کو بھی شیخ کی حاجت اور ضرورت رہتی ہے تاکہ وقت پر کبھی ذرا اِدھر اُدھر کو ہو جائے تو متوجہ کیا جا سکے۔ اسی لیے اگر خلافت واجازت بھی مل گئی اور اس کے بعد بہت سے مریدین بھی ہو گئے تو اس شیخ اور خلیفۂ وقت کو پھر بھی کسی اللہ والے سے رابطہ رکھتے رہنا چاہیے۔ ہمارے اکابر رحمہم اللہ اسی طرح کرتے چلے آئے۔ اپنے اوپر اعتماد نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ خطوط کے جو علاج اور معالجات مریدین کے لیے تجویز کرتے تھے انہیں اپنے بزرگوں اور اکابر کے سامنے پیش کر کے پھر مریدین کو ارسال کیا کرتے تھے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ صحیح لکھ رہا ہوں۔

اسی لیے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تین تین شیخ بدلے اور اس میں ہمیں اس طرف بھی اشارہ دے دیا کہ شیخ کی ذات فی نفسہٖ مطلوب نہیں۔ بلکہ مطلوب اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے۔ جب اللہ کی ذاتِ عالی مقصود ہے تو اگر ایک شیخ دنیا سے چلے جائیں تو دوسرے، دوسرے چلے جائیں تو تیسرے لیکن اخیر تک اپنے سر کے اوپر کوئی سرپرست اور کوئی اپنا بڑا رکھنا چاہیے تاکہ خودرائی کے مرض سے حفاظت رہے، خودرائی کی کیا حقیقت ہے؟ یہی تو حقیقت ہے۔ کتنے ہی انسان خودرائی میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن ان کو اپنے بارے میں یہ گمان نہیں ہوتا۔ خیال نہیں جاتا کہ میں اپنی رائے پر عمل کر رہا ہوں، لیکن جب کوئی بڑا اللہ والا سر پر ہو اور اس کے سامنے اپنے حالات رکھتے رہیں تو جہاں خودرائی ہو تو وہیں وہ بریک لگا دیں گے۔ اور جو صحیح رُخ ہے۔ اس طرف ہمارا رُخ پھر جائے گا تو

جس کا رہبر نہ تو پھر اُس کا
نفس بھی بے لگام ہوتا ہے

مسجدِ دردِ دل میں درد کی علامت

دوستو! دردِ دل کی مسجد میں
درد دل کا امام ہوتا ہے

جب اللہ کی محبت قلب میں پیدا ہو گئی۔ تو اب آپ کا دل ان معشوقوں، ان حسیناؤں، امردوں اور ان دنیا کی فانی چیزوں، حسین لذتوں، آب وگل، مٹی پانی کے نقشوں کے اوپر نہیں جائے گا بلکہ دل آپ کے درد کی اقتدا کرے گا اور آپ کے اندر اللہ کی محبت کا درد ہے۔ تو دل بھی اُسی میں مشغول رہے گا۔ دائیں بائیں کی چیزوں کی چکر میں نہیں لگے گا، کیوں کہ جس کا امام اللہ کی محبت کا درد ہو پھر دل بھی انہیں چیزوں میں مزہ پاتا ہے اور دل کو بھی

انہیں چیزوں میں لطف آتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی چیزوں میں نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں۔

اس کے ضمن میں تشریح کے طور پر احقر یہ عرض کرنا بھی مناسب سمجھتا ہے کہ اس میں اس بات کی جانب بھی تنبیہ ہے کہ اللہ کی محبت اور اُس کا درد سیکھ لو، پیدا کرلو، ان شاء اللہ بڑی جلدی بڑی آسانی سے ولایت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاؤ گے جس کو حضرت والا یوں بیان فرماتے ہیں کہ میں پہلے قلب میں اللہ کی محبت کی آگ پیدا کرتا ہوں تو دل میں گناہوں کے جو جھاڑ جھنکاڑ۔ لگے ہوتے ہیں وہ سارے جل کے ختم ہوجاتے ہیں بلکہ یہ چیزیں کھاد کا کام دیتی ہیں۔ حضرت نے مثال بیان فرمائی۔ اگر آپ کو کسی زمین میں کاشت کرنی ہو اور اس میں بڑے جھاڑ وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ اس کو صاف کرائیں تو دس بیس نوکروں کو لاؤ اور دو، چار، دس دن تک ایک ایک نکلواؤ۔ اور نکال کر پھر اُسے بہہ کر اور جوت کر اس قابل بناؤ کہ اس میں کاشت کی جائے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے، لیکن ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سارے کے سارے جھاڑ میں آگ لگادو اور آگ لگا کر کے سب کو راکھ بنادو۔ تو وہ راکھ بھی بنے گی اور راکھ بن کر زمین کے اندر کھاد کا کام بھی دے گی۔ اور آسانی بھی آپ کے لیے ہوجائے گی کہ صرف ایک تیلی ماچس لگائی اور پورا جتنا جنگل تھا وہ آسانی سے جل گیا۔ اب آپ آسانی سے اس میں بوؤ اور کاشت کرلو۔ تو حضرت اسی طرح فرماتے ہیں دل میں جس قسم کے گناہوں کی یہ سب جھاڑ جھنکاڑ لگے ہوئے ہیں، اللہ کی محبت کا درد پیدا کرواور اس کی آگ ان درختوں میں لگادو، تو یہ سارے جل کر خود بخود ختم ہوجائیں گے اور کھاد کا کام دیں گے۔ اسی لیے حضرت والا نے فرمایا کہ اپنے قلب میں اللہ کی محبت پیدا کرلو۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے جو تمہارا دل اس میں مشغول رہے گا تو خود بخود گناہوں کو چھوڑتا چلا جائے گا۔

طالبین کا بفیضِ مرشدِ کامل کاملین بن جانا

یہ کرامت ہے شیخِ کامل کی
فیض طالب کا عام ہوتا ہے

حکیم الامت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے لکھا ہے کہ شیخِ کامل اور ولی برحق کو پہچاننا ہو تو اس کے متعلقین میں دیکھو کہ کیا احوال ہیں؟ اگر متعلقین میں یہ احوال ہیں کہ قربِ خداوندی، اللہ کی محبت اور اتباعِ سنت وشریعت ان کے اندر پائی جارہی ہے تو سمجھ لو بس یہ اس بات کی نشانی ہے کہ جس شیخ سے وہ وابستہ ہیں وہ شیخ برحق ہے۔ اسی لیے جو منتسبین و متعلقین ہیں اگر ان کے قلب میں دنیا کی محبت گھٹ رہی ہو، اللہ کی محبت بڑھ رہی ہو اور پھر ان کا فیض بھی عام ہورہا ہو۔ جیسا کہ بحمد اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ بات ہم حضرتِ والا میں دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں حضرت والا کے متعلقین جہاں جہاں بھی دیکھو ماشاء اللہ خوب کام میں لگے ہوئے ہیں۔ خود یہاں کتنے بیٹھے

رہتے ہیں۔ بظاہر ہمیں ایک دوسرے کو پتہ نہیں ہوتا لیکن اپنی اپنی جگہ میں وہ کتنا کام کرتے ہیں، ان کی مجالس کس طرح سے چل رہی ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفًا وعظمۃً جیسی مقدس جگہ میں بھی ماشاء اللہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے بارہ تیرہ خلفاء ہیں اور باقاعدہ ان کی مجالس اور پروگراموں کا مستقل نظم چلتا رہتا ہے۔ بس یہی دلیل ہے شیخ کامل کے کمال اور اس کی ولایت اور شیخ برحق ہونے کی اور یہی نشانی ہے اس بات کی کہ ایسے شیخ سے متعلق ہو کر اور تعلق جوڑ کر ان شاء اللہ، اللہ کے ساتھ تعلق اور قرب بہت جلد نصیب ہو جائے گا۔

اصل تو اللہ کا لطف ہی کار فرما ہوتا ہے

رائیگاں آہ تو نہیں ہوتی
فضل اس پر بھی تام ہوتا ہے
کار فرما تو لطف ہے اُن کا
ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے

میرے دوستو! یہی وہ چیز ہے جو بارگاہِ رب العزت میں سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ پسند ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جہاں بڑے بڑے انعامات کا ذکر آیا ہے وہاں اکثر مقامات پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ اسی صفت (صفتِ عبدیت) سے کیا ہے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے اور اپنے سے کچھ نہ ہونے کا اعتراف اور اقرار کیا جائے۔ جب شیطان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو اس نے اپنی طرف نظر کی اور کیا کہا کہ میں تو دلیل کے اعتبار سے یہ ظاہر کر سکتا ہوں کہ میں اس آدم سے اعلیٰ اور ارفع اور اونچا ہوں۔ اور آپ اعلیٰ وارفع کو حکم دے رہے ہیں کہ ادنیٰ وکمتر کو سجدہ کرے تو یہ کیسے۔

تو اُس کی اپنی طرف نظر گئی کہ میں ایسا اور ویسا ہوں، اس لیے سجدہ نہیں کیا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک چوک ہوئی جس کے بارے میں خود باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾
(سورۃ طٰہٰ، آیت:۱۱۵)

ترجمہ: سو ان سے غفلت ہوگئی اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۱۵۴)

لیکن اس کے باوجود حضرتِ آدم علیہ السلام نے یوں نہیں کہا کہ اے اللہ! میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی بلکہ کیا کہا؟

بالفاظ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کہ حضرتِ آدم علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے خدا! مجھ سے اگر خطا ہوئی تو بھی میں مجرم ہوں اور اگر خطا نہیں ہوئی تو بھی میں

مجرم ہوں۔ بس میری حالت تو یہ ہے کہ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو پھر میری تباہی و بربادی میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۲۳)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا کہ پوری احتیاط اور تامل سے کام نہ لیا اور اگر آپ مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارے میں پڑ جائیں گے۔ (معارف القرآن، ج:۳، ص:۵۳۱)

گویا اس بات کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں کچھ نہیں ہوں، اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا تو پھر میرا خسارہ ہی خسارہ ہے۔ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ نے فرمایا کہ ہم تو آدم علیہ السلام کے بیٹے ہیں، ہمیں تو بحیثیت نسبتِ الیٰ آدم کے یہ شان رکھنی چاہیے کہ ہر وقت یہی کہتے رہیں کہ اے الٰہی! میں نے کیا تو میں مجرم، نہ کیا تو میں مجرم۔ میرا کام صرف آپ کے عفو وکرم سے بنے گا، لطف وکرم سے بنے گا۔ حضرت والا یہی بات فرماتے ہیں اصل تو اللہ کا لطف ہے، میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، لیکن ذریعہ بن کر بظاہر نام ہو جاتا ہے۔ فلاں کے مریدین فلاں کے متعلقین فلاں کی کتابیں فلاں کا فیض۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اے میرے ماننے والو! یہ اپنے دل میں جما کے رکھنا کہ کام محض ان کے لطف وکرم سے بنتا ہے، اسی لیے میرے دوستو! میں ابھی بیٹھ کے تقریر کر رہا ہوں۔ اگر میں یہ سمجھوں کہ ''میں میں میں'' تو یہ میں، مجھے کھا جائے گی، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ حضرات بیٹھے ہیں اور حضرت والا تشریف فرما ہیں تو حضرت والا کی دعائیں اور توجہات ہیں۔ آپ حضرات کے قلب میں اپنی اپنی نوعیت کی طلبیں ہیں۔ وہ طلب مجھے بلواتی ہے۔ میرا کوئی بھی کمال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیضان ہے اور وہ فضل فرماتے ہیں جب کوئی بندہ طلب لے کر آتا ہے، بولنے والا بولتا ہے۔ اگر اپنی طرف نسبت کر کے ''میں میں'' کا دل میں خیال آئے تو میں نے مظفر نگر میں ایک بیان میں عرض کیا کہ آدمی جب یہ بکنے لگتا ہے میں ایسا، میرا بیان ایسا، میری کتاب ایسی، میرے پروگرام ایسے تو ''میں''، ''میرا''، ''میری''، ''میرے'' بس یہ تباہی کے جملے ہیں اور سمجھو کہ انسان شیطان کی گود میں جا بیٹھا۔ اب اُس کی تباہی میں شک وشبہ نہیں رہے گا، کیونکہ اپنی انانیت کے اوپر اُس کی نظر جانے لگی خواہ بظاہر کیسی ہی تقریری و بیان کا ملکہ رکھتا ہو اور کتنا ہی قابل اور باصلاحیت ہو تاریخ میں ایسے بے شمار قابل نظر آئیں گے کہ جن کو ان کی انا نے تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔ حضرت والا کے اکثر اشعار میں آپ کو ملے گا کہ اخیر میں جب مضمون ختم کرتے ہیں تو فرماتے ہیں اس میں میرا کوئی دخل نہیں، کوئی کمال نہیں ہے۔ میرے مرشد اور میرے شیخ کی صحبتوں کا یہ سب فیض ہے جو کچھ ہو رہا ہے جب انسان نے اپنی طرف نسبت کر لی تو پھر وہ شکر گذار بندوں میں شامل نہ رہا۔

تشکر اور تکبر ایک دوسرے کی ضد ہیں

چنانچہ حضرت والا کا ایک ٹیلیفون پر وعظ تھا ''ٹیلیفونک وعظ'' حضرت مولانا عبدالحمید صاحب کو جبکہ مولانا نے حضرت والا سے یہ بات عرض کی تھی کہ حضرت لوگ اصلاح کے سلسلہ میں کافی رجوع ہو رہے ہیں۔ ''تشکر'' اور ''تکبر'' دونوں میں تضاد ہے۔ اور یہ تضاد کیوں ہے؟ تضاد اس لیے ہے کہ تکبر کی حقیقت ہے کسی چیز پر اپنا استحقاق سمجھنا اور تشکر کی حقیقت ہے کہ اے اللہ! میں تو مستحق نہیں تھا، آپ نے میرے اوپر محض فضل فرمایا تو اس حقیقت پر اگر غور کریں تو دونوں میں تضاد ہے، دونوں جمع نہیں ہو سکتے اور ایک بات بتا دوں اگر اپنے اوپر ہم نظر رکھیں کہ میں اتنا جید عالم ایسا ویسا؟ فلاں فلاں؟ تو مجھے تو خلافت مل جانی ہی چاہیے تھی تو اگر حضرت نے دے دی تو کون سی بڑی بات ہے۔ بھئی! میں تو اتنا بڑا عالم ہوں، حدیث کی کتابیں پڑھاتا ہوں، تفسیر جانتا ہوں تو خلافت تو مجھے ملنی تھی ہی۔ اسے کہیں گے کہ اس نے اپنا استحقاق سمجھا تھا۔ اب اگر وہ یوں کہتا ہے کہ شکر ہے مجھے خلافت مل گئی تو یہ صرف زبان پر شکر کا جملہ ہے لیکن حقیقتِ تشکر وہاں موجود نہیں ہے۔ حقیقتِ شکر تو دوستو! یہ ہے کہ میں تو اس قابل بالکل نہ تھا اور واقعی دل سے سوچے۔ آج کل ہم لوگ رسمی تواضع اختیار کرتے ہیں۔ نہیں نہیں! میں تو کچھ نہیں ہوں، میں تو ایسا ہوں اور کسی نے دو چار جملوں میں ذرا حقیقت کھول کے رکھ دی، کہہ کر تو دیکھو اسی وقت شعلہ جوالہ بن جاتے ہیں۔ اتنا طیش اور اتنا غصہ۔

میں نے مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ کے حالات میں کہیں پڑھا تھا: کسی نے بڑی گالیاں دیں اور بڑا بُرا بھلا کہا۔ فرمایا کہ بھئی میں تو قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں جتنا تو نے کہا ہے میں اس سے بھی زیادہ بُرا ہوں۔ اور ہمارے سارے اکابر کا حال یہ تھا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا میں نے مجلس میں سنایا تھا۔ کیا فرمایا؟ امداد اللہ کے اترے پترے کھول کر اگر اللہ رکھ دے تو لوگ قریب بھی نہ لگیں۔ یہ حال ہے ''امداد اللہ'' کا۔ مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا ''اشرف علی'' کا ایک خلق بھی ابھی تک صحیح نہیں ہوا۔ اندازہ لگائیے کہ یہ بات مجددِ زمانہ نے فرمائی۔ تو میری اور آپ کی کیا حیثیت کہ ہم اپنی طرف نظر کریں۔

حضرت والا دامت برکاتہم کے اس شعر میں ہم سب کے لیے یہ تعلیم ہے جو کچھ ہو رہا ہے اے اللہ! جو کام آپ لے رہے ہیں ہماری اگر زبان چل رہی ہے، ہمارا قلم چل رہا ہے، ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں یہ اے اللہ! سب تیرا فیضان ہے ورنہ ہم کہاں اس لائق؟ حضرت اسی کو فرماتے ہیں کہ ؎

کار فرما تو لُطف ہے اُن کا
ہم غلاموں کا نام ہوتا ہے

اصل جام تو شراب محبت الٰہیہ کا جام ہے

عالم غیب کے ہیں جام و سبو
جام اُن کا ہی جام ہوتا ہے
گر نہ ہو دوستو کرم ان کا
عمر بھر عشق خام ہوتا ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ نفس کی اصلاح میرے فضل اور رحمت ہی سے ہوتی ہے اگر میرا فضل اور رحمت نہ ہو تو کسی کا بھی تزکیۂ نفس نہیں ہوسکتا ہے۔

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾

(سورۃ النور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا۔

(معارف القرآن، جلد:۶، ص:۳۶۹)

اگر اللہ کا فضل و کرم شامل نہ ہو تو کوئی دنیا میں نہیں ہے جو تزکیہ پا سکے۔ یہی حقیقت ہے کمالِ عشق کی کہ انسان کا نفس تمام رذائل سے صاف ستھرا ہو جائے اور مزکیٰ اور مجلّی ہو جائے۔ حضرت والا فرماتے ہیں یہ صرف ان کے کرم سے ہوتا ہے، اللہ کے فضل سے ہوتا ہے اور اللہ کا فضل اور کرم میرے دوستو! شاملِ حال کیسے ہوتا ہے؟

قرآن کی دوسری آیت اس کے ساتھ شامل کرلو:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۶۴)

یعنی اللہ نے نبی کو بھیجا اور نبی کو یہ یہ کام دیئے۔ ان میں سے ایک کام یہ دیا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام حضراتِ صحابہ کا تزکیہ فرماتے ہیں۔ تو دونوں آیتوں کو جوڑنے سے کیا ثابت ہوا؟ اصل اللہ کے فضل سے ہوتا ہے، لیکن شیخ کی صحبت کی برکت سے (اللہ کی سنت و عادت جاری ہے) کہ لوگوں کا تزکیہ فرما دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کاموں میں شیخ مثل نبی کے ہوتا ہے جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِهٖ كَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِهٖ.

تو خلاصہ دونوں آیتوں کو جوڑ کر یہ نکلا کہ اصل مزکّی تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے لیکن سبب کے درجے میں دنیا میں اللہ کی سنت اور اللہ کا نظام یہ چل رہا ہے کہ جب کوئی کسی ولی کامل سے ملتا ہے، اب نبی نہیں ہے، نبی کے وارثین ہیں اور وارثین کون ہیں؟ علمائے صالحین، علمائے اولیاء اللہ جب ان سے کوئی ملتا ہے تو ان کے توسط سے

اللہ تعالیٰ تزکیہ فرمادیتے ہیں۔ اب نتیجہ یہ نکل کے سامنے آیا کہ اہل اللہ سے ملاقات، ان سے ملنا جلنا اوران کی صحبت میں رہنا، گویا یہ نشانی ہے اللہ تعالیٰ کے کرم کے شامل ہوجانے کی کہ ان بندوں پر اللہ کا خصوصی کرم ہورہا ہے۔ اوران شاء اللہ اس کی بدولت تزکیہ بھی حاصل ہوجائے گا۔

اشکباری پہ فضل باری ہو
تب کہیں جا کے کام ہوتا ہے

اورحق تعالیٰ جب کسی کوآنسو بہانانصیب کرتے ہیں تو دوستو! حدیث قدسی میں ہے:

﴿ لَاَنِیْنُ الْمُذْنِبِیْنَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ زَجَلِ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴾

(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج:۳۰، ص:۱۹۹)

یہ جوگنہگارروتے ہیں اُن کی آواز مجھے اتنی پسند ہے کہ تسبیح پڑھنے والے جوسبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ رہے ہیں، اس سے بھی زیادہ ان کے رونے کی آواز پسند ہے۔ معلوم ہوارونا جسے اللہ عطا کرتے ہیں اُسے اپنا محبوب بنانا چاہتے ہیں۔ اوراُسے اپنا محبوب بنالیتے ہیں، اسی لیے حضراتِ انبیاء کرام، صحابۂ عظام اورتابعین سب کے حالات میں آپ اُٹھاکے دیکھیے کس طرح سے روتے تھے۔ ایک کتاب ہے ''دُموعُ الصَّالحین'' یعنی ''اللہ والوں کے آنسو'' اس میں صحابہ کرام اوراولیاءعظام کی بہت بڑی تعداد کے رونے کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح سے یہ لوگ رویا کرتے تھے تو جب اشک باری ہوتی ہے۔ میرے دوستو! تو پھراللہ کا فضل اس کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے۔

یہ عشق کی بے نظامی کیوں؟

گر مُربی نہ ہو کوئی اُس کا
عشق بھی بے نظام ہوتا ہے

بغیراہل اللہ کی صحبت اورکسی مربی کی تربیت کے صورت حال ایسی ہی ہوتی ہے کہ اگر سالک کبھی جوش میں آیا تو بہت تہجد اورنوافل اورتسبیح وتلاوت شروع کردیا۔ کبھی جوش ٹوٹا تو بالکل ایک دم نیچے چلا گیا۔ اورفرائض تک چھوڑ بیٹھا اورتم کسی کو دیکھو کہ وہ میانہ روی اوراعتدال کے ساتھ دین پہ چل رہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ وہ شخص ہے جو کہ صحیح آدمی ہے اورجو دین پر قائم رہ سکے گا تو دوستو! اس کا احساس اصل میں اولیاء اللہ کے بغیر نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان اِفراط وتفریط کا شکار رہتا ہے، جب اللہ والوں کے ساتھ مل کے چلتا ہے تب اعتدال پر رہتا ہے۔ اور یہاں عتدال ہی پر رہنا مذکور ہے۔

ذکر وتقویٰ کے دو تار ہوں تو روشنی ضرور پیدا ہوگی

ذکر و تقویٰ کے نور سے اختؔر
نورِ نسبت تمام ہوتا ہے

دو لفظ حضرت والا نے استعمال فرمائے۔ یہ جو روشنی جس میں ہم بیٹھے ہیں یہ بھی دو تاروں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے ان میں ایک مثبت اور ایک منفی ''پوزیٹو (Positive) اور نگیٹو (Negative)'' ہوتے ہیں اور ان دونوں سے مل کر بجلی کی روشنی وجود میں آتی ہے اور دنیا کی ساری چیزوں کا حال یہی ہے۔ اگر آپ ایک گلاس میں دودھ لینا چاہتے ہیں تو پہلے اس گلاس کو ذرا اس کی گندگیوں سے صاف شفاف تو کرلو۔ پھر اس کے بعد گلاس میں دودھ لے لو۔ اگر آپ نے گندے گلاس میں دودھ لے لیا اور کسی کو پیش کیا، لیجیے یہ دودھ پی لیجئے تو وہ تمہیں دھتکارے گا کہ کیا تمہیں اتنا سلیقہ نہیں ہے، کیسے گندے گلاس میں دودھ پیش کررہے ہو؟ اگر تم نے بڑی قیمتی نعمت یعنی دودھ کو پیش کیا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو تقویٰ ہو یعنی روحانی گندگی اور غلاظتوں یعنی گناہوں سے اپنے دل کو بالکل صاف کرو۔ تمام اعضا، بالکل صاف ستھرے بنالو اور پھر ذکر کا نور ان کے اوپر چڑھالو۔ بس اسی کا نام ہے ''نسبتِ تامہ'' اور انہی دو باتوں کی برکت سے آپ کی نسبت ''نسبتِ تامہ'' ہوجائے گی۔ اسی لیے حضرت نے بار بار فرمایا اور فرماتے رہتے ہیں کہ بھائی اللہ والا بننا بہت آسان ہے، سب گناہوں کو چھوڑ دو اور فرائض و واجبات و سنن ادا کرلو، کچھ ذکر واذکار وغیرہ کرلو اور ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو اور اپنے سونے کا خاص خیال رکھو اور اگر دماغ پر زور محسوس ہو تو وظائف ملتوی کردو، کیونکہ وظائف فی نفسہا مقصود نہیں ہیں، حفاظتِ صحت فرض ہے۔ یاد رکھیئے! اگر نفلی وظائف کی وجہ سے آپ کی صحت متاثر ہورہی ہو، دماغی خشکی بڑھ رہی ہو۔ جیسا کہ آج بہت سے لوگ انہیں وظائف کی کثرت میں لگ کر اپنا دماغ کھو بیٹھتے ہیں۔ تو اس صورت میں ان وظائف کا ترک واجب ہے یاد رکھیئے! ہمارے یعنی اہلِ حق مشائخ کی خانقاہوں میں یہ چیز نہیں سکھائی جاتی۔ گناہوں کو چھوڑ دو۔ فرائض و واجبات وسنن ادا کرو۔ اگر آپ کی صحت اس قابل نہیں ہے اور اگر صحت میں کچھ قوت و ہمت ہے تو پھر تھوڑے سے وظائف ذکر اذکار وغیرہ بھی کرلو۔ اللہ کے ولی بن گئے۔ اسی کو حضرت والا فرماتے ہیں؎

ذکر و تقویٰ کے نور سے اختؔر
نورِ نسبت تمام ہوتا ہے

جو خانقاہ میں آتا رہے۔ لیکن گناہوں کی عادت کو نہ چھوڑے وہ حضرت والا کا سچا عاشق نہیں ہے۔ اگر چہ وہ اپنے زعم وگمان میں سمجھ رہا ہو کہ مجھے حضرت والا سے بہت محبت ہے تو یہ اُس کا محض دعویٰ ہے جو کہ بالکل غلط اور

جھوٹ ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعُ

جو کسی کا عاشق ہوتا ہے، وہ اس کی ہر ادا کا بھی عاشق ہوتا ہے۔ اسے اس کی ہر ادا اچھی لگتی ہے۔ اگر عشق کا دعویٰ ہے تو یہ کیا بات ہے کہ جو تعلیمات حضرت والا کی ہیں۔ ان سے ہم دور دور بھاگ رہے ہیں اور ان سے کٹ رہے ہیں اور اپنی جان بچا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پکا سچا عاشق نہیں۔ مجددِ تھانوی نور اللہ مرقدہ نے فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے دور رہ رہا ہو لیکن وہ میری تعلیمات پر عمل کر رہا ہو تو وہ میرے قریب ہے اور کوئی قریب رہ رہا ہو مگر میری تعلیمات پر عمل نہیں کر رہا ہے وہ حقیقت میں مجھ سے دور ہے۔ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سے حضرات قرب وجوار میں رہے، لیکن اتباع نہیں تھی، انقیاد نہیں تھا، تسلیم نہیں تھی، کوئی نفع نہیں اُٹھا سکے۔

میرے دوستو! اس لیے حضرت والا کے دو جملے (۱) ایک تو ذکر ہو اور (۲) ایک تقویٰ ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ ان شاء اللہ ولایتِ تامہ اور معرفتِ کاملہ نصیب ہو جائے گی۔ اللہ ہم سب کو استقامت کے ساتھ اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

گر خدا چاہے تو پہلے عاشق ابرار ہو

عشق کا اے دوستو! ہم سب کا یہ معیار ہو
متبع سنت ہو اور بدعت سے بھی بیزار ہو

اتباع سنت نبوی سے دل سرشار ہو
نورِ تقویٰ سے سراپا حاملِ انوار ہو

عاشقِ کامل کی بس ہے یہ علامت کاملہ
جاں فدا کرنے کو ہر دم سر بکف تیار ہو

عشق سنت کی علامت ہر نفس سے ہو عیاں
خواہ وہ رفتار ہو، گفتار ہو، کردار ہو

صحبت مرشد سے نسبت تو عطا ہوگی مگر
اجتناب معصیت ہو ذکر کی تکرار ہو

عشقِ کامل کی علامت یہ سنا کرتا ہوں میں
آشنائے یار ہو بے گانۂ اغیار ہو

ہے یہی مرضی خدا کی ہم مٹادیں نفس کو
گرچہ وہ سارے جہاں کا بھی کوئی سردار ہو

اس کی صحبت سے نہیں کچھ فائدہ ہوگا کبھی
بے عمل کوئی محبت کا علمبردار ہو

جب کسی بندہ پہ ہوتا ہے خدا کا فضل خاص
دم میں وہ ذوالنور ہوگا گرچہ وہ ذوالنار ہو

عمر بھر کا تجربہ اخترؔ کا ہے یہ دوستو
گر خدا چاہے تو پہلے عاشقِ ابرار ہو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **بدعت**: جوکام سنت نہ ہواسے دین کا حصہ سمجھنا۔ **سرشار**: مست۔ **سراپا**: سر سے پیر تک۔ **انوار**: نور کی جمع۔ **سر بکف**: سر ہاتھوں میں لیے ہوئے۔ **نفس**: سانس۔ **رفتار**: چلنا۔ **گفتار**: بات کرنا۔ **معصیت**: گناہ سے بچنا۔ **تکرار**: مسلسل کرنا۔ **آشنائے یار**: دوست کے واقف۔ **اغیار**: اللہ کے غیر سے انجان۔ **علم بردار**: دعویدار۔ **ذوالنور**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی روشنی رکھنے۔ **ذوالنّار**: جہنمی۔ **عاشق ابرار**: اللہ والے۔

معیارِ عشق سنت کی تابعداری اور بدعت سے بیزاری ہے

عشق کا اے دوستو! ہم سب کا یہ معیار ہو
متبعِ سنت ہو اور بدعت سے بھی بیزار ہو
اتباعِ سنتِ نبوی سے دل سرشار ہو
نورِ تقویٰ سے سراپا حاملِ انوار ہو
عشقِ سنت کی علامت ہر نفس سے ہو عیاں
خواہ وہ رفتار ہو، گفتار ہو، کردار ہو

اس دنیا میں رہنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد وہ ہے کہ جو اللہ و رسول سے عشق و محبت کے دعوے دار ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے دعوے پر مختلف قسم کی دلیلیں بھی اپنے ذہن میں تیار کیے ہوئے ہے لیکن کیا واقعی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ دلیلیں معتبر اور مستند ہیں یا نہیں؟ اور کس کی دلیل از روئے قرآن و حدیث درست ہے اور کس کی غلط ہے؟ آیئے اس سلسلے میں ہم قرآن و حدیث کی طرف نظر ڈالیں۔

قرآن کریم میں اس سلسلے میں ایک بنیادی آیت کریمہ موجود ہے جس سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ محبت کے دعوے میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے اور وہ آیت کریمہ یہ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۳۱)

ترجمہ: آپ لوگوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ (خدا تعالیٰ) بھی تم سے محبت کرے تو تم لوگ اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں میری اتباع کرو کیونکہ میں خاص اسی تعلیم کے لیے مبعوث ہوا ہوں جب ایسا کرو گے) خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے (کیونکہ میں اس معافی کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہوں، اس پر عمل کرنے سے لامحالہ حسب وعدہ گناہ معاف ہو جائیں گے، مثلاً گناہوں سے توبہ، اللہ تعالیٰ کے حقوق جو فوت کئے ہیں ان کو پورا کرنا، حقوق العباد کا ادا کر لینا یا معاف کرا لینا) اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی عنایات فرمانے والے ہیں۔

محبت ایک مخفی چیز ہے، کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں اور کم ہے یا زیادہ ہے اس کا کوئی پیمانہ بجز اس کے نہیں کہ حالات اور معاملات سے اندازہ کیا جائے اور محبت کے کچھ آثار اور علامات ہوتی ہیں ان سے پہچانا جائے، یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویدار اور محبوبیت کے متمنی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان آیات میں اپنی محبت کا معیار

بتلایا ہے، یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کو اتباعِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا جو شخص اپنے دعویٰ میں جتنا سچا ہوگا اتنا ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بنائے گا اور جتنا اپنے دعوے میں کمزور ہوگا اسی قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں سستی اور کمزوری دیکھی جائے گی۔ (معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۵۴)

احیائے سنت کی اہمیت پر بعض اسلاف کے اقوال

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ بندہ عاجزی اور زاری اور التجا اور محتاجی اور ذلت وخواری کے ساتھ ظاہر اور پوشیدہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کرتا ہے کہ جو کچھ اس دین میں محدث اور مبتدع پیدا ہوا ہے جو خیر البشر اور خلفائے راشدین علیہ وعلیہم الصلاۃ والسلام کے زمانہ میں نہ تھا، اگر وہ روشنی میں صبح کی سفیدی کی مانند ہو، اس ضعیف کو ان لوگوں کے ساتھ جو اس بدعت سے منسوب ہیں۔ اس محدث کے عمل میں گرفتار نہ کرے اور مبتدع کے حسن پر فریفتہ نہ کرے۔ بحرمة سيد المرسلين واٰله الابرار عليه الصلاة والسلام.

علماء نے کہا ہے کہ بدعت دو قسم پر ہے حسنہ اور سیئہ۔ حسنہ اس نیک عمل کو کہتے ہیں جو آنحضرت اور خلفائے راشدین علیہ والسلام کے زمانہ کے بعد ہوا ہو اور وہ سنت کو رفع نہ کرے اور بدعت سیئہ وہ ہے جو سنت کی رافع ہو۔

یہ فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت میں حسن اور نورانیت مشاہدہ نہیں کرتا اور ظلمت وکدورت کے سواء کچھ محسوس نہیں کرتا۔ اگرچہ آج مبتدع کے عمل کو ضعف بصارت کے باعث طراوت وتازگی میں دیکھتے ہیں لیکن کل جب کہ بصیرت تیز ہوگی تو دیکھ لیں گے کہ اس کا نتیجہ خسارت وندامت کے سواء کچھ نہ تھا۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

بوقت صبح ہو جائے گا روشن روز کی مانند
کہ تو نے عشق میں کس کے گزاری رات ہے ساری

حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

﴿مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيْهِ فَهُوَ رَدٌّ﴾

(صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود)

جس نے ہمارے امر میں ایسی نئی چیز پیدا کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے بھلا جو چیز مردود ہو وہ حسن کہاں

پیدا کرسکتی ہے۔ (مکتوبات امام ربانی، جلد:۱، صفحہ:۴۱۴)

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ کا ایک مکتوب نقل کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اصل عشق ومحبت اور تصوف وطریقت کا معیار اتباع سنت ہی ہے۔

''اس وقت عہد نبوت سے دوری اور قرب قیامت کی وجہ سے بدعت شائع ہوتی جارہی ہے اور بدعت کی ظلمتیں عالم پر محیط ہیں۔ سنت غریب ونادر ہوگئی ہے اور اس کے انوار مستور ہورہے ہیں۔ سنن متروکہ کے زندہ کرنے اور علوم شرعیہ کے پھیلانے کے لیے خوب ہمت باندھو، اور اس امر کو وسیلہ کمال رضامندی حق تعالیٰ بنالو نیز قرب بارگاہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی عمل سے ڈھونڈو۔ یہ مضمون حدیث ہے کہ جو میری سنت کو جو متروک العمل ہوگئی ہے۔ زندہ کرے گا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ احیائے سنت کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اس سنت پر خود عمل کرے اور اعلیٰ اس سنت کی نشر واشاعت اور دوسروں کو اس پر عمل کرانے کی کوشش کرنا ہے۔''

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر تم ایسا آدمی دیکھو کہ کرامتیں دیا گیا ہے یہاں تک کہ ہوا پر اڑتا ہے تو دھوکہ میں نہ آجاؤ جب تک یہ نہ دیکھو کہ امر ونہی اور حفظِ حدود اور پابندئ شریعت میں کیسا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ سب راہیں بند ہیں کل مخلوق پر سوائے اس کے جو قدم بقدم چلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ (زادالسالکین ،ص:۸۸۳-۸۸۴،مرتبہ مولانا عبدالحفیظ مکی)

یعنی اصل کسی آدمی کی ولایت اور تقویٰ کا مدار اتباع سنت وشریعت پر ہے کرامتوں کے ظہور پر نہیں ہے جبکہ عام طور پر لوگ اس سے دھوکہ کھاجاتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو جتنی کرامتوں والا ہو وہ اتنا ہی بڑا بزرگ ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ جو ہر قدم پر سنت وشریعت کا متبع ہو سب سے بڑا ولی وہی ہے۔

اس لیے اللہ ورسول کا سب سے بڑا عاشق وہی شخص کہلائے گا جس کے ہر قول وفعل میں اس کی رفتار و گفتار میں سنت کی اتباع پائی جائے یعنی کوئی قول وعمل خلاف سنت وشریعت نہ ہو اسی کو تقویٰ کہتے ہیں اور یہی تصوف ہے اور یہی سچا عشق اور ولایت ہے اور خلاف سنت وشریعت چل کر بہت سے مجاہدات اور ریاضتوں کا کرنا اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور استدراج اور ڈھیل کے اس دنیا میں کچھ ثمرات اور نتائج کا حاصل ہوجانا یہ ولایت کی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ کیفیات تو بہت سی مرتبہ کفار ومشرکین کے مندروں میں بیٹھنے والے ہندوؤں، جوگیوں کو بھی حاصل ہوجاتی ہیں اور ان کو ان کے مجاہدات پر دنیا میں اس کا ثمرہ دے دیا جاتا ہے لیکن اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول اور مقرب ہونے سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے بزرگوں کا مشہور مقولہ ہے ''الاستقامة فوق الف كرامة'' کہ دین پر جمے رہنا ہزار کرامتوں سے افضل ہے اگر کوئی شخص پوری زندگی ہر کام شریعت کے مطابق گزار رہا ہو مگر اس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو تو وہ اللہ کا مقبول بندہ کہلائے گا۔

کشف والہام سے متعلق مکتوب شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ

جہاں تک اچھے اچھے خواب اور عمدہ کیفیات اور کشف والہام کا معاملہ ہے تو ان کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کا ایک مکتوب ملاحظہ فرمائیں جس سے اتباع سنت وشریعت کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوجائے گا۔

''جو احوال جناب نے تحریر فرمائے ہیں اطمینان بخش اور امید افزا ہیں (الاستقامۃ فوق الکرامۃ) خواب یا انوار یا الہامات وغیرہ صرف دل بڑھانے کے لیے سالک کو پیش کئے جاتے ہیں جیسے بچے کو لبھانے کے لیے گنگھنا دے دیا جاتا ہے۔ اکابر کا مقالہ تلک خیالات تربی بھا اطفال الطریقۃ (یہ سب خیالات ہیں جن سے سلوک کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے) مشہور ہے۔ عبادت اور ذکر پر مداومت، اتباع سنت اور شریعت پر قیام یہی امور ہیں جن کے ہم مکلّف ہیں اور جن پر استقلال سے عمل پیرا ہونا، درجاتِ احسان کا حاصل ہونا کمال ایمانی ہے۔ خوفِ خداوندی اور رجاء دونوں ایمان کے کمال کی نشانیاں ہیں۔ بکاء اور گریہ کا غلبہ چشتیہ نسبت کا ظہور ہے۔ **اللّٰھم زد فزد**'' (مکتوبات شیخ الاسلام، جلد:۳، ص:۱۶۸، مکتوب:۵۷)

متبع سنت ہی کے محبوب ہونے پر ایک عقلی دلیل

صاحبو! اس مسئلے پر ایک عقلی دلیل سے غور کرنے کے بعد یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ جو جتنا سنتوں کا متبع ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنا ہی زیادہ محبوب ہاجائے گا چاہے اس کی عبادات اور ریاضت و مجاہدات بہ نسبت دوسروں کے کم ہوں لیکن اس کا اتباع سنت پر جمنے کا مجاہدہ ہی سب پر بھاری اور اہم ہے کیونکہ تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء میں سب سے افضل اور اللہ کے سب سے زیادہ محبوب نبی ہیں تو لہٰذا آپ کے جو طریقے اور اقوال وافعال ہیں وہ بھی سب طریقوں سے افضل اور اعلیٰ ہوں گے اسی طرح آپ کے خصائل وعادات کا ہر ہر گوشہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے زیادہ اونچا اور پسندیدہ ہوگا لہٰذا جو آدمی اس طریقے کو اپنائے گا تو وہ افضل الانبیاء کے افضل الطرق (یعنی سب سے افضل نبی کے افضل طریقہ) کو اپنا رہا ہے لہٰذا اس کے سب سے زیادہ مقرب الی اللہ اور محبوب عند اللہ ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے اس لیے سلوک طے کرنے والوں کو سب سے زیادہ اتباع سنت کا خیال رکھنا چاہیے اور وہ اس طرح کے شب وروز کے اپنے تمام معمولات کو سنتیں تلاش کر کر کے ان کے مطابق ڈھال دے۔

اس موضوع پر خاص طور پر ہمارے حضرت والا کا ایک مختصر سا رسالہ موجود ہے جس کا نام ہے ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنتیں'' اور اسی موضوع پر ایک ضخیم اور موٹی کتاب حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی رحمہ اللہ کی تصنیف کردہ ہے جس کا نام ''اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم'' جو سیرت کے عملی پہلو کے اعتبار سے جذبہ اتباع

سنت رکھنے والوں کے لیے ایک انوکھی اور بے مثال کتاب ہے کہ جس کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع فرما دیا گیا ہے اور ایک عاشق رسول کے لیے مرتے دم تک کے شب و روز کے ہر قول و فعل میں کوئی نہ کوئی سنت اس کتاب میں لکھ دی گئی ہے اس لیے ہر دین دار ذہن رکھنے والے آدمی کو یہ کتاب اپنے پاس رکھ کر کچھ نہ کچھ حصہ کا روزانہ مطالعہ کر لینا چاہیے تا کہ ہمارا ہر قول و فعل سنت کے سانچے میں ڈھل جائے کہ اس سے بڑی بزرگی اور ولایت کچھ نہیں ہے۔ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے غرض کے ہر معاملے میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اتباع پیش نظر ہو یہاں تک کے چلنے پھرنے میں بھی اس لیے حضرت والا نے فرمایا رفتار ہو یا گفتار ہو یا کردار ہو ہر ایک میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی اتباع کیا جا رہا ہو۔

سنت کے مطابق گفتار و رفتار کیسی ہوا کرتی ہے؟

اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آوے کہ کیا چلنے پھرنے کے سلسلے میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت ہے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ دین اسلام کامل اور مکمل دین ہے ہماری زندگی کا کوئی چھوٹا یا بڑا معاملہ ایسا نہیں ہے جس میں شریعت و سنت سے روشنی موجود نہ ہو یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمائل و خصائل میں اس طرح کی آپ کی تمام باتوں کا تذکرہ موجود ہے اور قرآن کریم میں بھی عباد الرحمٰن (رحمٰن کے خاص مقبول بندوں) کی صفات ذکر کرتے ہوئے ان کی چال کا تذکرہ کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾

(سورة الفرقان، ۶۳)

ترجمہ: کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں مطلب یہ کہ ان کے مزاج میں تواضع ہے تمام امور میں اور اسی کا اثر چلنے میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

لفظ ہون کا مفہوم اس جگہ سکینت و وقار اور تواضع ہے کہ اکڑ کر نہ چلے، قدم متکبرانہ انداز سے نہ رکھے بہت آہستہ چلنا مراد نہیں کیونکہ وہ بلا ضرورت ہو تو خلاف سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی جو صفت شمائل نبویہ میں منقول ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چلنا بہت آہستہ نہیں بلکہ کسی قدر تیزی کے ساتھ تھا۔ حدیث میں ہے کانما الارض تطوی له یعنی آپ ایسا چلتے تھے کہ گویا زمین آپکے لیے سمٹتی ہے (ابن کثیر) اسی لیے سلف صالحین نے بتکلف مریضوں کی طرح آہستہ چلنے کو علامت تکبر و تصنع ہونے کے سبب مکروہ قرار دیا ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت آہستہ چل رہا ہے، پوچھا، کیا تم بیمار ہو۔ اس نے کہا نہیں، تو آپ نے اس پر درہ اٹھایا اور حکم دیا کہ قوت کے ساتھ چلا کرو۔ (ابن کثیر)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت یمشون علی الارض هونا، کی تفسیر میں فرمایا مومنین

مخلصین کے تمام اعضاء و جوارح آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں سب اللہ کے سامنے ذلیل عاجز ہوتے ہیں ناواقف ان کو دیکھ کر معذور عاجز سمجھتا ہے حالانکہ نہ وہ بیمار ہیں نہ معذور بلکہ تندرست قوی ہیں مگر ان پر حق تعالیٰ کا خوف ایسا طاری ہے جو دوسروں پر نہیں ہے۔ ان کو دنیا کے دھندوں سے آخرت کی فکر نے روکا ہوا ہے اور جو شخص اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور اسکی ساری فکر دنیا ہی کے کاموں میں لگی رہتی ہے تو وہ ہمیشہ حسرت ہی حسرت میں رہتا ہے (کہ دنیا ساری ملتی نہیں اور آخرت میں اس نے حصہ نہیں لیا) اور جس شخص نے اللہ کی نعمت صرف کھانے پینے کی ہی چیزوں کو سمجھا ہے اور اعلیٰ اخلاق کی طرف دھیان نہیں دیا، اس کا علم بہت تھوڑا ہے اور عذاب اس کے لیے تیار ہے۔ (ابن کثیر ملخصا)

اس سے معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار کا بھی ایک خاص انداز تھا عاشق رسول کو چاہیے کہ اس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے اور آپ کی گفتار کا انداز بھی حدیث کی کتابوں میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب گفتگو فرماتے تھے تو بڑی واضح اور صاف گفتگو ہوتی تھی اور مخاطب کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو کے گفتگو فرماتے تھے۔

متکبر لوگوں کی طرح نہیں کہ بات کاٹ کاٹ کر جلد بازی میں گفتگو کرتے ہیں اور الفاظ کو صحیح طرح نہ ادا کرتے اور نہ مخاطب کو سنانے کی پرواہ کرتے ہیں بلکہ ان کی طرف پورے طور پر متوجہ ہونے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں یہاں تک کے سننے والا پوری طرح نہ سننے اور نہ سمجھنے کی وجہ سے تکلیف کا شکار ہو جاتا ہے، حضور علیہ الصلاۃ والسلام زیادہ تر خاموش رہا کرتے تھے:

﴿وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سُمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَوِيْلَ الصَّمْتِ﴾

(الشمائل المحمدية للترمذي، باب كيف كان كلام رسول ﷺ)

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر ضرورت کہ خواہ مخواہ قیل وقال میں مشغول نہ ہوتے تھے بلکہ دیر تک خاموش رہا کرتے تھے۔

اور ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلد بازی سے گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ اس طرح صاف صاف اور واضح گفتگو فرماتے تھے کہ پاس بیٹھنے والا آسانی کے ساتھ سن کر اس کو یاد کر سکے اسی طرح آپ کی گفتگو میں فحش اور بے حیائی والے جملے اور گالی گلوچ کا کلام شامل نہیں ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا انداز پروقار اور الفاظ انتہائی شستہ اور شائستہ اور با مقصد اور واضح ہوتے تھے اگر کوئی بری بات کہہ دیتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش اسلوبی سے عمدہ پیرائے میں اس کو جواب دیتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے مسکرا کر پیش آتے تھے خواہ دوست ہو یا دشمن یہی وجہ ہے کہ آپ سے ملنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ جیسا کہ مجھ ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبت ہے باقی آپ کی

صفات شمائل کی کتابوں میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ کوئی انسانی خوبی اور کمال ایسا نہیں ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی میں موجود نہ ہو۔

آہ! آج ہم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں

میرے بھائیو! اس مقام پر بڑے دکھ اور درد سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ آج عشق و محبت کے دعوے بھی ہر طرف ہو رہے ہیں اور سنتوں میں کامیابی کی تقریریں بھی خوب کی جا رہی ہیں لیکن جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگیوں میں کتنی سنتیں زندہ ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے طریقے ہماری عملی زندگی میں موجود ہیں تو بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو ہم نے کتابوں میں لکھنے یا تقریروں میں بیان کرنے کے لیے تو باقی رکھا مگر اپنی زندگیوں سے نکال دیا۔ چنانچہ اس مقام پر احقر ذرا تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہم دین کے قبیل سے جو کچھ بھی کریں گے اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

یا تو وہ دین کے حکموں میں سے کوئی حکم فرض و واجب و سنت و مستحب ہوگا

یا پھر حرام مکروہ اور ناجائز ہوگا

یا تیسرا درجہ ایسا مباح اور جائز کام ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور دین کا کوئی حکم تو نہیں ہے لیکن خلافِ سنت اور ممنوع و حرام بھی نہیں ہے بلکہ ایک مباح درجے کا معاملہ ہے کیونکہ سنت کے خلاف ہونا الگ چیز ہے اور سنت کے مطابق نہ ہونا الگ چیز ہے جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ترمذی کی شرح، تقریرِ ترمذی، ج:۲، صفحہ:۳۶۱ پر یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ کسی نے حضرت کو کف والا کرتا پہنے ہوئے دیکھا تو حضرت کو خط لکھ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اس طرح سے کیا کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہو کر خلافِ سنت لباس پہنتے ہیں کیونکہ آپ کف والا کرتا پہنے ہوئے ہیں جس پر حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے جواب لکھا کہ ''اس سے تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ کچھ لوگ میری حرکات و سکنات پر نظر رکھنے والے ہیں تاکہ اگر مجھ سے کوئی نامناسب بات سرزد ہو تو مجھے اطلاع کر سکیں لیکن پھر اس میں یہ بات بھی لکھی کہ خلافِ سنت ہونا الگ چیز ہے اور مطابقِ سنت نہ ہونا الگ چیز ہے اگرچہ وہ خلافِ سنت نہ ہو، بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو سنت کے مطابق تو نہیں ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو استعمال نہیں فرمایا لیکن وہ چیزیں خلافِ سنت بھی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہو یا ان کے مقابل دوسری چیز کی ترغیب دی ہو اور کوئی اس کے خلاف کرے بلکہ ان کو مباح اور جائز بنا کر چھوڑ دیا جس کا جی چاہے اس پر عمل کر سکے اس اعتبار سے جو مباح و جائز چیزوں پر عمل کر رہا ہو گو کہ وہ سنت کا متبع تو نہیں لیکن وہ سنت کے خلاف کرنے والا بھی نہیں۔ جیسے کہ اس کی مثال پیش فرمائی ہے کہ مثلاً بجلی کا استعمال سنت نہیں ہے اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ بجلی جلانا یا بجلی کا پنکھا استعمال کرنا خلافِ سنت ہے تو یہ بات

درست نہیں ہے۔ آگے حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہاں البتہ اس میں شبہ نہیں کہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے جتنا قریب رہے گا اتنا ہی اس عمل میں نور برکت اور اجر وثواب ملے گا اور جتنا سنت سے دور رہے گا اتنی ہی اس کے اندر بے برکتی ہوگی۔ (تقریرِ ترمذی، جلد:۲، صفحہ:۲۶۳)

ارشاد حضرت مولانا منظور نعمانی ''اب دیوبندیت بریلویت سے ایک بالشت کے فاصلہ پر''

پس اس مقام پر احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ سالکین علماء وطلباء کو اول درجے کو اپنانا چاہیے یعنی جو کام جس انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس کو اسی طرح اپنائے اور اختیار کرے۔ یہ جو آج کل نیا ایک مزاج پیدا ہوا ہے کہ سنتوں کو چھوڑ کر نئے نئے طریقے اور عبادت کے نئے نئے انداز ایجاد کر لیے گئے اور جب اُن کو اس غلطی پر توجہ دلائی جائے تو جواب میں کہتے ہیں کہ یہ بدعتِ حسنہ ہے اور فی نفسہٖ جائز تو ہے سو جب کہ مباح اور جائز ہے تو اس کے کرنے میں کیا حرج ہے اور اسی طرح بہت سے نئے نئے قسم کے ختمات اور وظائف ایجاد کیے گئے ہیں جن کا دورِ نبوت اور دورِ صحابہ وتابعین میں کوئی وجود نہیں ملتا۔

انتہائی دُکھ اور افسوس سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ دیوبندی مسلک پر چلنے والے اور اپنے کو علمائے دیوبند سے وابستہ قرار دینے والے لوگ بھی اس میں کثرت کے ساتھ مبتلا ہیں۔ چنانچہ احقر نے استادِ محترم حضرت مفتی سعید صاحب پالن پوری دامت برکاتہم سے یہ بات سنی جو کہ حضرت نے دورانِ درس بیان فرمائی اور ایک مرتبہ ''رابطۃ المدارس'' کے جلسے کے موقع پر اسی بات کا تذکرہ کیا اور لکھنے سے پہلے جنوبی افریقہ سے حضرت کو بذریعۂ فون معلوم کی اور عرض کیا کہ کتاب میں آپ کے حوالہ سے لکھ سکتا ہوں تو ارشاد فرمایا کہ ضرور لکھو کہ حضرت مولانا منظور نعمانی دامت برکاتہم نے اُن سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اب دیوبندیت اور بریلویت میں ایک بالشت کے برابر فاصلہ رہ گیا ہے۔ اور دیوبندیت بریلویت کے انتہائی قریب پہنچ چکی ہے۔ تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جب اس طرح کے مسائل اور ختمات اور نئی نئی باتوں پر ان کو روک ٹوک کی جاتی ہے تو وہ دلیل اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا عبادت ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ مگر یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو ثابت ہونا چاہیے کہ اس ہیئت اور کیفیت کے ساتھ ان خاص مواقع پر خاص انداز سے ان کاموں کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین میں سے کسی نے کیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کیا تو پھر ہمیں اُن کے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

کیا خیر کی طرف سبقت لے جانے میں ہم اُن سے بڑھ کر ہیں یا وہ ہم سے آگے تھے۔ اور کیا دین پر عمل کرنے میں ہمیں زیادہ شوق اور جذبہ ہے یا اُن حضرات کو زیادہ تھا۔ اور کیا اللہ ورسول کی محبت اُن کے قلوب میں زیادہ تھی یا ہمیں اُن سے زیادہ محبت ہے اور کیا اللہ تعالیٰ کے قرب ومعرفت کی کچھ ایسی اعلیٰ درجہ کی حدود تھیں کہ جو نہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئیں اور نہ صحابہ وتابعین کو بلکہ وہ صرف بعد میں آنے والے علماء واکابر کے قلوب پر القاء ہوتی ہیں العیاذ باللہ کیا یہ کھلا ہوا کمالِ دین اور اتمام نعمت کے خلاف دعویٰ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب باتوں میں یہی جواب ہوگا کہ وہ ہی حضرات ان سب چیزوں میں ہم سے زیادہ سبقت لے جانے والے تھے تو اگر اس طرح کسی خاص موقع پر کوئی عبادت ثابت ہوتی تو آخر اُن لوگوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟

میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ آج خود ہمارے دیوبندی حضرات میں کثرت کے ساتھ یہ رواج ہو گیا ہے کہ جیسے ہی کسی کے انتقال کی خبر سنتے ہیں تو اجتماعی ختم قرآن شریف یا آیتِ کریمہ کرنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں جبکہ خیر القرون میں سے کسی بھی زمانے میں کوئی شخص کوئی ضعیف سے ضعیف درجے میں بھی روایت یا کسی کا عمل ثابت نہیں کرسکتا جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ اُن لوگوں نے اجتماعی ختم قرآن کیا ہے اسی لیے حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی وصایا میں یہ بات لکھی ہے کہ مجھے ثواب پہنچانے کے لیے لوگ جمع نہ ہوں اگر پہلے سے جمع ہوں تو الگ ہو جائیں اور بدعات عوام وخواص میں سے کسی کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ یا اسی طرح کثرت سے یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ عنوان بہ عنوان مختلف کاموں کے لیے لوگوں کو جمع کر کے یٰسین شریف کا ختم کرنے کا اہتمام لوگوں میں رواج پکڑ گیا ہے جس کے نتیجے میں اصل اُمت کے بگاڑ کے سبب اور تباہی وبربادی کی وجوہات سے صرفِ نظر کرلیا گیا جو کہ اُمت کا گناہوں میں مبتلا ہونا اور اللہ کے احکامات کی پرواہ نہ کرنا ہے۔ ان ختمات کے نتیجے میں اُمت کو سخت نقصان پہنچا اور پریشانیاں اور مشکلات جوں کی توں قائم رہیں کیونکہ بے شک اس کا انکار نہیں ہے کہ سورۂ یٰسین جس مقصد سے پڑھی جاتی ہے وہ اس میں کارآمد اور نافع ہے بلکہ یقیناً نافع ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں صراحت کے ساتھ یہ مضمون وارد ہوا ہے۔

لیکن میرے دوستو! پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال تو بتاؤ کہ خیر القرون کے زمانے میں کسی ایک مسئلے میں بھی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے یہ بات ارشاد فرمائی ہو کہ سب مسجدِ نبوی میں جمع ہو جائیں ایک اہم کام درپیش ہے اُس کے لیے یٰسین شریف کا ختم ہوگا۔ اور اس کے علاوہ ان گنت اور بے شمار چیزیں ہمارے عوام وخواص نے ایجاد کرڈالیں ہیں جن کو مجدد زمانہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی وصایا کے تحت میں اس طرح سے ذکر فرمایا کہ میرے انتقال کی خبر سن کر بدعاتِ عوام وخواص میں سے کسی کا ارتکاب نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ختم یٰسین شریف کی شرعی حیثیت

مسلک دیوبند کی بعض مساجد میں یٰسین شریف کے اجتماعی ختم نے ایک التزامی رواج کی صورت اختیار کرلی ہے۔ صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ برطانیہ میں مقامی طور پر کسی کی وفات ہو جائے یا ہندو پاک یا کسی جگہ سے

کسی عزیز کی وفات کی خبر آجائے تو مسجد میں کسی نماز کے بعد اعلان کیا جاتا ہے کہ بعد نماز یٰسین شریف کا ختم ہوگا، بعض جگہ یہ اعلان بلیک بورڈ پر لکھ دیا جاتا ہے اور نماز کے بعد مصلی اجتماعی طور پر یٰسین پڑھتے ہیں آخر میں امام صاحب یا کوئی اور اجتماعی دعا کرتا ہے۔ اس کے التزام واہتمام نے یہ صورت اختیار کرلی ہے کہ اگر اسے روکا جائے تو روکنے والے سے لڑائی جھگڑا کیا جاتا ہے۔ اگر مسجد کی انتظامیہ اسے روکے تو انتظامیہ کو مجبور کرنے کے لیے ممبران کو اس کے خلاف اُکسایا جاتا ہے۔ ختم یٰسین جاری کرانے کے لیے انتظامیہ کے خلاف ممبران سے احتجاجی طور پر دستخط کرائے جاتے ہیں حتیٰ کہ اگر انتظامیہ اس کے بعد بھی یٰسین شریف کا ختم جاری نہیں کرتی تو مختلف بہانوں سے اس کمیٹی ہی کو بدلنے کی مہم چلائی جاتی ہے اور خواہی نخواہی اپنی مقدور بھر کوشش یہ ہوتی ہے کہ ختم یٰسین شریف کی یہ اجتماعی بدعت ختم نہ ہو اور جاری رہے۔ اس میں علماء وآئمہ مساجد بھی جانتے ہوئے اسے نہیں روکتے۔

جہاں تک قرآنِ کریم یا یٰسین شریف کی تلاوت کے بعد مرحوم کو ایصال ثواب پہنچانے کا تعلق ہے تو اس بارے میں مطلق بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا التزام کے بغیر انفرادی طور پر بغیر اجتماع کے تلاوت کرنے والا اپنے طور پر تلاوت کا اجر وثواب مرحوم کو بخش دے تو اس کے جواز میں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اجتماعی ختم یٰسین شریف کی جو صورت اوپر بیان کی گئی ہے شریعتِ مطہرہ میں قطعاً اس کی کوئی اصل نہیں اور یہ بدعتِ سیئہ قبیحہ ہے اس کا ترک لازم ہے اور روکنے والے سے اختلاف وجھگڑا دین سے مقابلہ کرنے والی بات ہے۔

بدعتی ایجاد بدعت سے دو دعوے کرتا ہے

(۱)...... وہ دعویٰ کرتا ہے کہ دین نعوذ باللہ ناقص تھا، بدعت کے اضافہ سے وہ اس کی تکمیل کررہا ہے۔

(۲)...... یا مبتدع اس بات کا مدعی ہے کہ نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین پہنچانے میں خیانت کی اور دین کی یہ بات (بدعت) نہیں پہنچائی جسے وہ اب دین میں شامل کررہا ہے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ جو شخص بھی کسی بدعت کو ایجاد کرے اور اسے نیکی سمجھے وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت میں خیانت کی (اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے) کیونکہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ آج ہم نے مکمل کردیا تمہارے لیے تمہارا دین پس جو بات اس زمانہ میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے اندر یہ بات لکھی ہے کہ اسلام میں بدعت کو اس لیے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریفِ دین کا راستہ ہے پچھلی امتوں میں یہی ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اضافے کرلیے اور ہر آنے والی نسل اضافے کرتی رہی یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دین کیا تھا اور لوگوں کے اضافے کیا ہیں، تحریفِ دین کے دنیا میں کیا

کیا اسباب پیش آئے ہیں اور شریعت نے ان سب کے دروازوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا کہ کسی سوراخ سے یہ وبا اُمت میں نہ پھیلے۔ (معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۴۲۱)

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بدعتی سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نیک اعمال مٹا دیتا ہے اور اسلام کا نور اس کے دل سے نکال دیتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود بدعتی کا کیا حال ہوگا۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مخلوق پر اللہ کی طرف پہنچنے کے تمام راستے بند ہیں سوائے اس راستہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لیے توحید وسنت کی پیروی لازم ہے اور اسی طرح شرک وبدعت سے پرہیز لازم ہے۔ بدعت یہی ہے کہ اپنے پاس سے بے سند چیزیں ایجاد کر کے دین وشریعت سے منسوب کر دی جائیں اور ان کی پیروی کو اسلام کی پیروی سمجھا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کے متعلق فرمایا ان لوگوں نے رہبانیت کا ایک طریقِ عمل ایجاد کر کے اسے اپنے لیے لازم سمجھا حالانکہ رہبانیت یعنی گوشہ گیری اور دنیا کی جائز وحلال نعمتوں کا استعمال ترک کر دینا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا اور نہ اس کا حکم دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پھر وہ لوگ اپنے اس خلافِ فطرت عمل کی پیروی بھی نہ کر سکے۔ اس لیے ہر وہ عقیدہ یا عمل جس کی کتب سماوی اور شریعت میں کوئی سند نہ ہو بدعت ہے، اختراعِ نفس ہے اور اس کی پیروی عینِ گمراہی اور راہِ سنت سے منحرف ہونا ہے۔ بدعت کے مقابل سنت ہے اور سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا وہ دستورالعمل ہے جسے اللہ تعالیٰ ''اسوۂ حسنہ'' سے موسوم کرتے ہیں۔ (فتوح الغیب)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ رسوم وبدعات کی تردید میں اپنے معروف رسالہ اصلاح الرسوم میں تحریر فرماتے ہیں:

کسی امر غیر ضروری کو اپنے عقیدہ میں ضروری اور مؤکد سمجھ لینا یا عمل میں اس کی پابندی اصرار کے ساتھ اس طرح کرنا کہ فرائض وواجبات کے مثل یا زیادہ اس کا اہتمام ہو اور اس کے ترک کو مذموم اور تارک کو قابل ملامت وشناعت جانتا ہو یہ دونوں امر ممنوع ہیں، کیونکہ اس میں حکم شرعی کو توڑ دینا ہے اور تقید وتعین وتخصیص والتزام وتحدید وغیرہ اسی قاعدہ اور مسئلہ کے عنوانات وتعبیرات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص تجاوز کرے گا اللہ کی حدوں سے پس ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

چونکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ضرر سے بچانا فرض ہے اس لیے اگر خواص کے کسی مشروع فعل سے عوام کے عقیدے میں خرابی پیدا ہوتی ہو تو وہ فعل خواص کے حق میں بھی مکروہ وممنوع ہو جاتا ہے خواص کو چاہیے کہ وہ فعل

ترک کردیں۔ (اصلاح الرسوم)

مجددالف ثانی کے سنت کی اہمیت پر بعض مکاتیب

اور اسی بات کو حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ بڑے اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا ہے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ افسوس آج عالم کا عالم بدعات کے سمندر میں غرق ہے۔ غور کرنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ کوئی خیر کی چیز تھی تو خیر القرون کے زمانے میں ایسا کیوں نہیں کیا گیا۔ جبکہ وہ لوگ خیر کی طرف سبقت لے جانے میں ہم سے کہیں آگے تھے۔

اور ایک مقام پر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں: اے فرزند! جو بات کل قیامت کے دن کام آئے گی وہ صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے اور احوال ومواجید اور علوم ومعارف اور اشارات ورموز اگر اس متابعت کے ساتھ جمع ہو جائیں تو بہتر اور زہے قسمت ورنہ سوائے خرابی اور استدراج کے کچھ نہیں۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو مرنے کے بعد کسی شخص نے خواب میں دیکھا اور ان کا حال پوچھا۔ انہوں نے جواب میں کہا: ''طَارَتِ الْعِبَارَاتُ وَفَنِيَتِ الْاِشَارَاتُ وَمَا نَفَعَنَا اِلَّا رُكَيْعَاتٌ رَكَعْنَاهَا فِيْ جَوْفِ اللَّيْل کہ سب عبارتیں اُڑ گئیں اور سب اشاراتیں فناء ہوگئیں اور ہم کو دو رکعتوں کے سواء جو رات کے درمیان پڑھا کرتے تھے کسی چیز نے نفع نہ دیا۔'' (مکتوباتِ امام ربانی، دارالاشاعت کراچی، جلد اول، صفحہ:۴۱۲)

اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ بہت سی خانقاہوں کا موضوع آج صرف چند ختمات اور مختلف مجالس اور اوراد و وظائف ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کو میرے شیخِ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ یوں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کی خانقاہیں خوامخواہیں ہوگئی ہیں۔ جن کی غرض وغایت اصلاح وتزکیۂ نفس تھی۔ اور لوگ اسی نسبت پر جمع ہوا کرتے تھے مگر اب اپنے تمام اوقات خانقاہ میں رہ کر انہی مجالس اور ختمات میں گزار کر چلے آتے ہیں۔ اور اصل مقصد کی طرف ذہن تک نہیں جاتا۔ حالانکہ ابنِ بطال رحمہ اللہ اور دیگر محدثین نے بھی مختلف کتابوں میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ جتنی فضائل کی باتیں ہیں اُس فضیلت کا حصول اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ آدمی گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہ ہو۔ اسی لیے حضرت مفتی رشید لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ کو کسی نے خط میں یہ بات لکھی کہ حضرت میں نے فضائلِ استغفار نامی کتاب چھپوا کر اتنی اتنی مقدار میں تقسیم کی ہے۔ شاید اُن کے ذہن میں یہ رہا ہو کہ میرے شیخ مجھے مبارکباد پیش کریں گے، مگر وہ حقیقی شیخ کامل اور مصلحانہ شان کے حامل تھے، اس لیے انہوں نے افسوس کے ساتھ جواب لکھا کہ افسوس مجھ سے تعلق کیے ہوئے تمہیں ایک عرصہ گزر گیا اور ابھی تک یہ خیال نہ آیا کہ ایسی کوئی کتاب چھپوا کر تقسیم کرتے جس میں اُمت کے اصل بگاڑ اور خرابی اور اس کی تباہی و بربادی کے اسباب اور اُن کے علاج کو پیش کیا گیا ہو جس سے اصل نفع کا ہونا متوقع تھا۔

سلف صالحین کا بدعت سے سخت نفرت کا نمونہ

حضرت ابنِ وضاح رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ کا مؤذن امام مالک رحمہ اللہ کے زمانہ میں صبح صادق کے وقت لوگوں کو آواز دیا کرتا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس کو بلا کر دریافت فرمایا کہ تو یہ کیا حرکت کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا لوگوں کو صبح صادق کی خبر کرنے کے لیے یہ عمل کرتا ہوں تاکہ لوگ اٹھ جائیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تو ایسا نہ کر، ہمارے اس شہر میں ایسی بات ایجاد نہ کر جو اس میں نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مبارک شہر میں دس سال قیام فرمایا اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم نے بھی (یہاں قیام فرمایا ہے) انہوں نے یہ کام نہیں کیا۔ اس لیے تو بھی ایسی چیز ایجاد نہ کر جو آج تک یہاں نہیں کی گئی تو مؤذن رُک گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد صبح صادق کے وقت منارے پر کھنکھارنا شروع کر دیا۔ امام مالک نے فرمایا کیا تم کوئی چیز ایجاد کرنے سے منع نہیں کیا تھا؟ (پھر یہ نئی حرکت کیوں شروع کر دی؟) اس نے جواب دیا آپ نے تثویب (یعنی اذان کے بعد لوگوں کو نماز کے لیے پکارنا) سے منع فرمایا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا نہیں یہ کام بھی مت کرو۔ پھر کچھ مدت اس سے رکا رہا اس کے بعد لوگوں کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کر دیئے۔ امام مالک نے اس کے پاس ایک شخص کو بھیجا اور دریافت کیا کہ پھر تم نے یہ کیا کرنا شروع کر دیا؟ تو اس سے کہا میں نہ تثویب کرتا ہوں نہ کھنکھارتا ہوں اور آپ نے مجھے اس سے منع فرمایا تھا اب تو میں لوگوں کو صبح صادق کی اطلاع دینے کے لیے دروازے کھٹکھٹاتا ہوں۔ آپ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ جو چیز اس شہر میں نہیں ہوئی تو اسے یہاں جاری مت کر۔

(الاعتصام از شاطبی، جلد: ۲، صفحہ: ۲۲۲)

امام مالک کا اس شدت سے بار بار اس مؤذن کو منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مبتدع اور بدعتی دونوں پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت فرمائی ہے:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْدَثَ فِیْھَا حَدَثًا اَوْ اٰوٰی مُحْدِثًا فَعَلَیْہِ لَعْنَۃُ اللہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، باب حرم المدینۃ حرسھا اللہ تعالٰی، ص: ۲۳۸)

ہر منصف اور عادل کے لیے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد مشعلِ راہ ہے

غور فرمائیں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

﴿عَنْ نَافِعٍ اِنَّ رَجُلاً عَطَسَ اِلٰی جَنْبِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللہِ قَالَ ابْنُ عُمَرَ وَاَنَا اَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللہِ وَلَیْسَ ھٰکَذَا عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلْ اَنْ نَّقُوْلَ اَلْحَمْدُ لِلہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۰۶)

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے برابر میں چھینکا اور چھینکنے کے بعد اس نے کہا الحمدللہ والسلام علی رسول اللہ تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ بولے کہ یہ تو میں بھی بول سکتا ہوں الحمدللہ والسلام علی رسول اللہ مگر ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ نہیں سکھایا بلکہ ہم کو یہ سکھایا کہ ہم یہ کہیں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ''

میرے دوستو! سب قارئین کو سنجیدگی سے اس مضمون کو پڑھنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہوں کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف بھیجنے کو کوئی مؤمن کسی بھی وقت اور کسی بھی درجے میں نامناسب یا ناپسندیدہ سمجھ سکتا ہے؟ اور کیا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے العیاذ باللہ کوئی نفرت تھی؟ کیا درود شریف کی فضیلت حدیثوں میں موجود نہیں ہے؟ تو آخر کیا وجہ ہے کہ اس موقع پر حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس شخص پر تنقید اور اعتراض کیا اور اس کو منع فرما کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ اس موقع پر صرف الحمدللہ پڑھنا چاہیے جس کے مختلف صیغے روایات میں وارد ہوئے ہیں اور مزید کسی چیز کا اضافہ یہ غلط ہوگا اور دین میں زیادتی ہوگی۔

مسلمانوں کے لیے جن چیزوں کا مجھے خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو چیز وہ دیکھیں اس کو اس پر ترجیح دینے لگیں جو ان کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہے دوسرے یہ کہ وہ غیر شعوری طور پر گمراہ ہو جائیں۔ (سنت وبدعت، صفحہ:۲۶)

اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''خدا کی قسم آئندہ زمانہ میں بدعتیں اس طرح پھیل جائیں گی کہ اگر کوئی شخص اس بدعت کو ترک کرے گا تو لوگ کہیں گے کہ تم نے سنت چھوڑ دی۔'' (اعتصام، جلد:۱، صفحہ:۹۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اے لوگو! بدعت اختیار نہ کرو اور عبادت میں مبالغہ اور تعمق نہ کرو پرانے طریقوں کو لازم پکڑے رہو اس چیز کو اختیار کرو جو از روئے سنت تم جانتے ہو اور جس کو اس طرح نہیں جانتے اس کو چھوڑ دو۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''بدعت والا آدمی جتنا زیادہ روزہ اور نماز میں محنت کرتا جاتا ہے اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جاتا ہے نیز یہ بھی فرمایا کہ صاحب بدعت کے پاس نہ بیٹھو کہ وہ تمہارے دل کو بیمار کردے گا۔'' (سنت وبدعت، صفحہ:۲۷)

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''کوئی قول بغیر عمل کے مستقیم نہیں اور کوئی قول وعمل بغیر نیت کے مستقیم نہیں اور کوئی قول اور عمل اور نیت اس وقت تک مستقیم نہیں جب تک کہ وہ سنت کے مطابق نہ ہو'' (سنت وبدعت، صفحہ:۲۷)

آخر کیوں دنیا میں کوئی بھی مؤذن اذان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے کے ساتھ درود شریف کا

اضافہ نہیں کرتا۔ آپ کے پاس جتنے دلائل اور جوابات نئی نئی چیزوں کے ایجاد کے لیے ہیں وہ سب دلائل اور جوابات یہاں بھی موجود ہیں۔ پھر بھی ان مقامات پر درود شریف کے اضافے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس واقعہ کو درس ترمذی میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جوا کھٹے بیٹھ کر بلند آواز سے درود شریف پڑھا کرتے تھے مسجد سے باہر یہ کہہ کر نکال دیا تھا کہ یہ نئی بدعت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم نے یہ سب نہیں دیکھا۔ (درسِ ترمذی، جلد: ۲، صفحہ: ۲۵۷)

مکمل اور جامع دین ہوتے ہوئے نئی چیزوں کی ضرورت کیا ہے؟

اس لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نئی نئی چیزیں خواہ ہم ان کو بدعات نہ کہیں اور فی نفسہ جائز ہی ہوں لیکن ہمیں اُن کو اختیار کرنے کے بجائے سنت کو اختیار کرنا چاہیے۔ اُس کی روشنی اور نور جدا اور الگ ہے۔ اُس کی خوشبو اور مہک بالکل نرالی ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ بہت سے معاملات اور کام ایسے ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اسوہ اور نمونہ ہمیں ملا نہیں اس لیے ہم اُن میں اپنی رائے کے مطابق جو مناسب سمجھتے ہیں اختیار کرتے ہیں تو یہ بات قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ سوائے اُن چیزوں کے جو نئی ایجاد ہیں باقی اور کسی بھی معاملے میں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روشنی ہمیں نہ ملی ہو ورنہ یہ دین اسلام کے مکمل اور متمم ہونے کے خلاف ہوگا۔ بس صرف وہ نئی چیزیں کہ جو بعد کے دور کی ایجاد ہیں اُن کے سلسلے میں بلا واسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اگرچہ کوئی عمل موجود نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بالواسطہ اُن میں بھی کوئی نہ کوئی حضور کا نمونہ اور اسوہ موجود ہے۔

لہٰذا اے میری قوم! مہربانی کر کے اپنے اوپر ہم رحم کھائیں اور اپنے ہر ہر قول و فعل کو سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی فکر کریں۔ یہاں تک کہ زبان سے جو بولیں، جو دعائیں مانگیں یا حالاتِ مختلفہ میں سے کسی بھی حال میں جو بھی کام بطور عبادت کے کریں تو یہ ضرور دیکھ لیں کہ اس کام کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے زمانے میں کس طرح، کس حال کے ساتھ اور کیفیت کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ اُس سے بال برابر بھی نہ گھٹائیں نہ بڑھائیں۔ ان شاء اللہ اگر ہم پورے پورے سنت پر رہیں اور اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کریں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا قرب بدرجہ اتم اور اکمل حاصل ہوگا اور بسہولت و آسانی منزل ہاتھ آ جائے گی۔ جیسا کہ ہمارے حضرت والا کا شعر ہے ؎

نقشِ قدم نبی ﷺ کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

بس ہم اپنے اوپر ایک فکر سوار کر لیں کہ جیسے ہی ہمیں کہیں سے کوئی بات معلوم ہو یا کسی کا بتایا ہوا کوئی عمل سامنے آئے اور اس کا کیسا ہی چھوٹا یا بڑا فائدہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے مگر ہمارے دل میں ایک ہی فکر لگی ہوئی

ہو کہ کیا یہ کام، یہ دعا، یہ وظیفہ، یہ عبادت، یہ معمول وغیرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا یا نہیں؟ اور اگر کیا تھا تو کس طرح کیا تھا؟ کیونکہ میرا ایمان وعقیدہ ہے کہ جینے سے لے کر مرنے تک زندگی کا کوئی اہم اور غیر اہم، معمولی اور غیر معمولی معاملہ ایسا نہیں ہوسکتا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود نہ ہو۔ جب ہمیں یہ بات تسلیم ہے تو پھر کیوں اپنی ایجاد کی ہوئی نئی چیزوں پر اصرار کیا جارہا ہے۔

بطور علاج کوئی عبادت مقرر کرنا اور اس کی حقیقت

رہ گیا یہ استدلال کہ بطور مقصد کے نہیں بلکہ بطور علاج کے فلاں فلاں معمولات تجویز کیے گئے ہیں تو آپ خود اپنے ذہن سے یہ سوال کرکے پوچھیں کہ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روحانی معالج نہ تھے؟ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علاج بطور وحی دیا گیا یا نہیں؟ اور جب یہ واقعی علاج تھا تو کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور کو جامع شریعت دینے کے باوجود یہ علاج نہ دیا جاتا؟ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اگر یہ علاج تھا تو جنھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا تو کیا وہ لوگ اپنے ایمان میں کوئی ضعف یا بیماری لے کر ناقص ایمان کے ساتھ دنیا سے مرے؟ اَلْعَیَاذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ

لہٰذا اگر آپ اس کے جواب میں یوں کہتے ہیں کہ اُن حضرات کو اس علاج کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بعد والوں کے لیے تھا تو پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اور شریعت قیامت تک کے لیے تھی تو ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اس کی اطلاع ضرور دی جانی چاہیے تھی کہ میرے زمانے کے گزرنے کے بعد تم کو کچھ فلاں فلاں قسم کے نئے نئے معمولات ووظائف بطور علاج ومعالجے کے اختیار کرنے ہوں گے جو اگرچہ میری سنت نہیں مگر کامیابی کے لیے اور وصول الی اللہ کے لیے لازم اور ضروری ہوں گے۔ حالانکہ اس طرح کی کوئی بات پورے حدیث کے ذخیرے میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتی ہے اس لیے کہ کائنات میں جو شے خوبی اور بھلائی کی ہوسکتی تھی وہ ہر ایک آپ کی عادات کا حصہ بنی۔ اور جن میں کوئی خیر وخوبی اور بھلائی نہ تھی اُن سے آپ کو محفوظ رکھا گیا۔ خواہ اہلِ دنیا اُن کو کتنا ہی بہتر اور اچھا بنادیں۔ اور معیار شرف وعزت سمجھیں۔

یہ مضمون مزید کچھ تفصیلی گفتگو کا حامل ہے لیکن اس موقع پر احقر اتنی ہی باتیں پیش کرکے سامعین اور قارئین کو غور وفکر کی دعوت دے رہا ہے کہ خدارا! اپنی پوری جماعت کو بدعات اور خرافات کے گرداب میں پھنسنے سے بچائیے اور جو لوگ اس سمندر میں ڈوبے ہیں ان کا ہاتھ پکڑ کے وہاں کے اندھیروں سے سنت کی روشنی کی طرف لائیے تاکہ جلد منزل تک پہنچنا آسان ہو۔ اور اس کے سلسلے میں احقر کے ناقص علم کے مطابق ہماری جماعتِ دیوبند کے سرخیل اور شانِ تجدید پر فائز، وقت کے حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ

مرقدہ کی کتابیں اور مواعظ وملفوظات اور کتب ورسائل کے پھیلانے کا خاص اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ وہ شخصیت ہے کہ جہاں بدعات کا شائبہ بھی نظر آیا تو فوراً اُس پر روک ٹوک فرما کر بدعت اور سنت کو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ جن کے مسلک ومشرب کی بنیاد خالصتاً اتباعِ سنت پر ہے۔ اور جن سلسلے کی خانقاہیں جہاں تک احقر کی نظر ہے اُس طرز پر قائم ہیں وہ حقیقتاً اصلاح وتزکیۂ نفس کا کام انجام دے رہی ہیں۔ یہاں کسی کی تنقیص اور نفی مقصود نہیں بلکہ احقر کو جس سلسلے سے واسطہ پڑا ہے اُس کا صحیح حال اپنے علم کے مطابق بیان کر کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ ان شاء اللہ کسی موقع پر ان باتوں کو ایک مستقل رسالہ کی شکل میں لکھا جائے گا تاکہ اُمت میں پھیلی ہوئی غیر مسنون چیزیں مسنون چیزوں سے جدا ہو جائیں۔ وَاللّٰہُ الْمُعِیْنُ وَھُوَ الْمُوَفِّقُ لِلصَّوَابِ.

امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے لَنْ یَّصْلَحَ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا'' کہ اس امت کا اخیر انہیں چیزوں سے درست ہوگا جن چیزوں سے اس کا اول صحیح ہوا ہے یعنی قرآن سنت کی اتباع اور دین صحیح کی پیروی کرنے سے اس کے علاوہ خواہ کتنی ہی نئی نئی چیزوں کی ایجاد کر لی جائے اور ان پر عمل کیا جائے مگر جو امت میں بگاڑ آ چکا ہے وہ نہیں سدھر سکتا ہے:

﴿یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ الصَّابِرُ فِیْھِمْ عَلٰی دِیْنِہٖ کَالْقَابِضِ عَلَی الْجَمْرِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۵۹)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان لوگوں میں دین پر جمنے والا ایسا ہوگا جیسے آگ کا شعلہ اپنے ہاتھ میں لینے والا'' اس لیے آج صحیح دین یعنی سنت وشریعت پر چلنا اتنا ہی دشوار ہو چکا ہے کیونکہ اس کے علاوہ طرح طرح کے فتنے اور دین کے نام پر طرح طرح کی نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی گئی ہیں۔

عشق کامل کی علامت کاملہ

عاشقِ کامل کی ہے بس یہی علامت کاملہ
جاں فدا کرنے کو ہر دم سر بکف تیار ہو

اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کی نشانی یہی ہے کہ اپنی سب سے پیاری اور قیمتی چیز جان بھی اگر اللہ کے لیے دینی پڑے تو وہ اس پر تیار رہے تو جتنی نفس کی حرام آرزوئیں اور خواہشات ہوں ان کو قربان کیے بغیر عشق کا دعویٰ بے بنیاد ہے کیونکہ یہ اندر دل میں چھپی ہوئی ایک صفت ہے اور ہر مخفی شے کی کچھ علامات اور نشانیاں ہوا کرتی ہیں بس اسی طرح اس کی بھی یہ نشانی ہے کہ انسان اپنے محبوب کی خاطر سب کچھ لٹانے کو تیار رہے جیسا کہ یہ علامت حضرات صحابہ کرام میں کامل درجے میں پائی جاتی تھی کہ گھریلو اور خاندانی معاشی اور تجارتی کیسے ہی تقاضے سامنے ہونے

کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر اپنی جان ہتھیلیوں پر (سر بکف) میدان میں نظر آتے تھے اس لیے قرآن کریم نے ان کے ایمان کی گواہی دی۔

صحبت مرشد کے مفید ہونے کی شرطیں

صحبت مرشد سے نسبت تو عطا ہوگی مگر
اجتناب معصیت ہو ذکر کی تکرار ہو
اس کی صحبت سے نہیں کچھ فائدہ ہوگا کبھی
بے عمل کوئی محبت کا علم بردار ہو

یہ مضمون کئی مقامات پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اور کسی شیخ کامل سے اصلاحی تعلق اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ گناہوں سے بچنے پر دوام اور ذکر اللہ کا التزام منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے لازم وضروری ہے اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی فقدان ہوگا تو ساری عمر اس راستے میں لگے ہونے کے باوجود وصول الی اللہ کی دولت نصیب نہیں ہوگی۔

جسمانی بیمار کو شفا پانے کے لیے جس طرح کسی اچھے ڈاکٹر یا حکیم سے رابطہ کرنا اور اس کے زیر علاج رہنا ضروری ہے اسی طرح دوائی کا استعمال اور پرہیز بھی پوری صحت کے لیے از حد لازم اور ضروری ہے ورنہ خواہ طبیب کتنے ہی عالی درجے کا ہو لیکن اگر مضر چیزوں سے پرہیز نہ ہو یا جو دوائی اس نے دی ہے اسی کا استعمال نہ کیا جائے تو صحت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ مثال ہمارے سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ شیخ اگرچہ کتنے ہی کامل درجے کا ہو مگر گناہوں سے بچنے اور ذکر اللہ کی پابندی کے بغیر ہمارے قلب وروح کو شفاء وتزکیہ حاصل نہ ہوگا مختلف اشعار میں حضرت والا نے اس توازن اور اعتدال کو پیش فرمایا ہے۔

آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتنے ہی لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور ملتے جلتے تھے یہاں تک کے اہل خاندان میں سے تھے مگر اتباع نہ ہونے کی وجہ سے نفع نہیں ہوا اور نجات ان کا مقدر نہ بنی تو پھر کوئی کتنا ہی بڑا ولی اللہ ہو اس کی باتوں پر اگر عمل نہ کیا جائے تو کیسے نفع پہنچ سکتا ہے بڑے دکھ اور تکلیف سے کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے لوگ خانقاہوں اور تبلیغی مرکزوں میں ایک طویل مدت تک پڑے رہتے ہیں لیکن اپنے مشائخ اور اکابر کی تعلیمات پر نہ تو وہ عمل کرتے ہیں اور نہ ان کے وہاں پڑے رہنے میں یہ نیت پیش نظر ہوتی ہے بلکہ ایسے ہی زندگی گزارتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طویل عرصہ وہاں گزارنے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو واپس ہوتے ہیں تو وہ اپنے کو ویسا ہی پاتے ہیں جیسا کے وہاں شروع میں پہنچے تھے روحانی رذائل اور برائیاں اسی طرح نظر آتی رہتی ہیں جیسا کہ سابقہ زندگی میں وہ ان کا شکار تھے۔

عاشق آشنائے یار اور بیگانۂ اغیار ہوتا ہے

عشق کامل کی علامت یہ سنا کرتا ہوں میں
آشنائے یار ہو بے گانۂ اغیار ہو

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾

(صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب حب الرّسول ا من الايمان، ج: ١، ص: ٧)

تم میں سے کوئی اس وقت تک پکا سچا مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ یہاں تک کہ خود اس کی اپنی ذات سے بھی میں اس کے نزدیک زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ جیسا کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں اس طرح سے آیا ہے:

﴿اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ هِشَامٍ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ اٰخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَاَنْتَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِلَّا مِنْ نَفْسِيْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ فَاِنَّهُ الْاٰنَ وَاللّٰهِ لَاَنْتَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاٰنَ يَا عُمَرُ﴾

(صحيح البخاري، كتاب الايمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبي صلى الله عليه وسلم)

حضرت عبداللہ بن ہشام سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! بے شک آپ مجھ کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں بجز میری جان کے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مرتبہ کمال کا (جو تم کو مطلوب ہے) کبھی حاصل نہ ہوگا جب تک کہ میں تم کو تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے: ''اس وقت یہ حالت ہے کہ آپ مجھ کو میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''تو بس اب وہ کمال بھی (جو تم کو مطلوب ہے) حاصل ہوگیا (آپ کے اس ارشاد کی برکت سے وہ دولت فی الفور نصیب ہوگئی) اور یہ محبت عقلی نہ تھی ورنہ استثناء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صحیح نہ ہوتا، طبعی تھی سو طبعاً ایسی محبت ہونا شرطِ ایمان نہیں ہے۔ ہاں! بعض کمالات کے لیے شرط ہے۔ اسی محبت کا نام فناء فی الشیخ ہے۔ (التکشف، صفحہ: ۳۵۷)

ایک ان سے کیا محبت ہو گئی
ساری دنیا ہی سے نفرت ہو گئی

اس لیے اللہ تعالیٰ سے سچی دوستی اسی وقت شمار ہوگی جب کہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی پر نظر رہے اور غیر

اللہ دل سے بالکل باہر ہو جائے اس کی پرواہ ہی دل میں قائم نہ رہے چاہے کتنا ہی بڑا نفع چھوٹ رہا ہو اور یا کیسے ہی ظاہری نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو لیکن اپنے اللہ کو ناراض کرنا ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ ہو یہی سچے اور کامل عشق کی نشانی ہے جس کے بغیر عشق کا دعویٰ خود اپنے کو دھوکے میں رکھنا ہے اس لیے خلاف شرع کاموں میں لگے رہنے کے ساتھ اور اللہ کے حکموں کو توڑنے اور مختلف رسومات اور بدعات کی پابندی کرنے کے باوجود کسی کو اللہ کا سچا عاشق نہیں کہا جا سکتا۔

نفس مٹا دو اور مولیٰ کو پا لو

ہے یہی مرضی خدا کی ہم مٹا دیں نفس کو
گرچہ وہ سارے جہاں کا بھی کوئی سردار ہو

بڑے بڑے امراء وسلاطین دنیا میں ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اللہ کے لیے اپنے کو مٹایا اور اس کے واسطے اپنی حکومت وسلطنت کو قربان کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی پوری پوری مرضیات پر مرتے دم تک چلتے رہے تو اس کی بدولت حق تعالیٰ نے ان کو ظاہری فقیری میں حقیقی سلطنت کا مزہ عطا فرما دیا کہ انہیں ایسی عزت نصیب ہوئی جو بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں ہوتی اگر چہ یہ نفس کو مٹانا اور اللہ تعالیٰ پر فدا ہونا ان عزتوں کے حصول کی نیت سے نہیں ہونا چاہیے ورنہ پھر یہ مٹانا نہیں ہے بلکہ دل میں غیر اللہ کی نیت ہے جس کے ہوتے ہوئے اللہ کے لیے اپنے کو مٹانا نہیں کہا جائے گا بلکہ اپنے کو ایسا فنا کرنا چاہیے کہ اپنے فنا ہونے کا احساس بھی ختم کر دے اسی کو اصطلاح میں فناء الفناء کہتے ہیں جس کے بعد حقیقی بقاء انسان کو حاصل ہوتی ہے

کیونکہ اگر اپنے کو فنا کرنے کا احساس ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں کچھ تھا اور پھر میں نے اپنے کو مٹا دیا اور جس نے اپنے کو کچھ سمجھا تو وہ حقیقتاً مٹا نہیں ہوا جیسے کوئی آدمی یہ تصور کرے کے میں ہوں تو بہت کچھ لیکن تواضع اختیار کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ حقیقی تواضع نہیں ہوئی بلکہ در پردہ اس میں تکبر چھپا ہوا ہے اس لیے جب تک انسان اپنے کو اس طرح نہ مٹا دے کہ اس مٹانے کا احساس بھی دل میں باقی نہ رہے اور جو ہماری حقیقت ہے وہ دل میں رچ اور بس جائے کہ نہ میں کچھ تھا اور نہ رہوں گا اور جو بھی کچھ ہے سب اللہ کی عطا ہے میری ذات کی حقیقت تو لا شے ہے نہ ہی میرا اپنا کوئی کمال اور خوبی ذاتی ہے بلکہ سب عطاء ربانی ہے اس لیے حقیقت کے لحاظ سے میں کچھ بھی نہیں ہوں جب اس طرح ہم اپنے کو مٹا دینگے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں محبوبیت ومقبولیت نصیب ہوگی اور دلوں پر بادشاہت عطا ہو جائے گی۔

عشق میں ذلت بھی عزت ہو گئی
لی فقیری بادشاہت ہو گئی

جب کسی بندے پہ ہوتا ہے خدا کا فضلِ خاص
دم میں وہ ذوالنور ہوگا گرچہ وہ ذوالنار ہو

اللہ تعالیٰ کی شان جذب ایسی ہے کہ اگر وہ کسی کو اپنی طرف کھینچ کر اپنا بنانے پر آجائیں تو کیسا ہی کفر و شرک کی وادیوں میں پھنسا ہوا ہو منٹوں سیکنڈوں میں تقویٰ اور ولایت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ کر وہ ناری، نوری بن جاتا ہے کہ کل تک جہنم کا مستحق تھا اور اس کے دل میں کفر و شرک کی ظلمات بھری ہوئی تھیں مگر آج وہ جنت کے اعلیٰ مقامات کا مستحق ہو چکا ہے اور اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات خاصہ اور انوارات کی بارش ہو رہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت والا کے وعظ میں یہ واقع مذکور ہے۔

پیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا زمانہ ہے دو بجے رات کو حکم ہوا کہ بغداد سے **موصل** جاؤ۔ وہاں سے **موصل** پہنچے ایک ابدال کا انتقال ہو رہا تھا، سارے ابدال جمع تھے۔ خواجہ خضر علیہ السلام نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے زمانہ کے غوث تھے۔ علماء اور محدثین نے لکھا ہے کہ غوث کو روزانہ اللہ تعالیٰ سے ایک وقت خاص قرب کا عطا ہوتا ہے کہ پوری دُنیا میں ایسا قرب کسی کو نہیں عطا ہوتا۔ جب شیخ عبدالقادر جیلانی کا وہ وقت آیا کہ جس وقت روئے زمین پر اتنا مقرب کوئی نہیں تھا، اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ جو ابدال انتقال کر گیا اب دوسرا ابدال کہاں سے لاؤں، اب کس کو آپ اس کرسی پر بٹھانا چاہتے ہیں......اور ابدال کون ہیں؟ اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک گاؤں کے آدمی نے کہا میں ابدال ہو گیا ہوں حالانکہ جو اصلی ابدال ہوتا ہے وہ اپنے کو جتا تا نہیں ہے۔ یہ نقلی تھا اس لیے جب حکیم الامت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو خبر دی گئی کہ ایک گاؤں میں ایک شخص کہتا ہے کہ میں ابدال ہو گیا ہوں تو فرمایا کہ یہ ظاہر کرنے والا اور اکڑنے والا ابدال ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں پہلے گوشت تھا اب دال ہو گیا ہے یعنی تکبر کی نحوست سے اب دال ہو گیا یعنی اس کا درجہ گر گیا۔

تو پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو حکم ہوا کہ آپ جائیے ایک بستی ہے اور وہاں ایک عیسائی ایک گرجا گھر میں اپنے عیسائی مذہب پر ذوالنار پہنے ہوئے مشغول عبادت ہے آپ جائیے اور اس سے کہئے ذوالنار توڑ ذوالنور بن۔ ذوالنار توڑ دے اور کلمہ پڑھ اور اس کو ابدال کی کرسی پر بٹھا دیجئے۔ اس بڑے ولی اللہ کے درجہ پر اس کو بٹھا دو جو ابھی حالت کفر میں ہے۔

جوش میں آئے جو دریا رحم کا
گبر صد سالہ ہو فخر اولیاء

اللہ کی رحمت کے دریا میں جب جوش آتا ہے تو سو برس کے کافر کو فخر اولیاء بنا رہے ہیں۔ بڑے پیر صاحب شیخ

عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کوگرجا گھر میں جا کر پکڑا اور فرمایا جلدی توبہ کر عیسائی مذہب سے۔اب اسلام کے سوائے کوئی مذہب قبول نہیں۔اللہ کے نزدیک اسلام ہی مقبول دین ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ اِسلام کے سوا اگر کوئی عیسائیت، یہودیت، ہندویت یا کوئی بھی مذہب اختیار کرے گا، اللہ کے یہاں اس کی قبولیت کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ وہ دین مردود ہے جو اسلام کے علاوہ ہو۔ جلد عیسائیت سے توبہ کر اور ذوالنار توڑ دے اس نے فوراً توڑ دیا۔ یہ اس نے اتنی جلدی ہدایت کیوں قبول کر لی؟ اللہ میاں نے پہلے ہی اس کا کام بنادیا تھا اور اس کے دل کو ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت عطا فرمادی تھی۔ پھر اس نے کہا اب کیا پڑھوں؟ فرمایا پڑھ لَااِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا فرض ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کو پیغمبر ماننا بھی ضروری ہے، ہمارے ذمہ ہر نبی کو ماننا فرض ہے، کسی نبی کی توہین حرام اور کفر ہے لیکن تعمیل احکام نبوت اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی چلے گی۔ قیامت تک اب ان کی شریعت ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو آخری نبی نہیں مانے گا وہ کافر اور مردود ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے کلمہ پڑھا اور کہا اب کیا کروں؟ فرمایا اب کرنا کیا ہے چل ایک ابدال کا انتقال ہو گیا ہے اس کی کرسی پہ جا کے بیٹھ جا۔

سُن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

(تجلیاتِ جذب، جلد:۳)

عمر بھر کا تجربہ اختر کا ہے یہ دوستو
گر خدا چاہے تو پہلے عاشقِ ابرار ہو

یہ مضمون پوری کتاب میں بکثرت ذکر ہوا ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کے بغیر اللہ تعالیٰ کا یہ راستہ طے نہیں ہوتا۔ ساری عمر گزر جانے کے باوجود منزل نگاہوں سے اوجھل اور مخفی رہتی ہے راستے کی ہر قسم کی زحمتیں اٹھانے کے باوجود منزل میسر نہیں آتی اس لیے حضرت والا مختلف نظموں میں اس طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں کہ اگر اللہ کو پانا چاہتے ہو تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ پہلے اللہ والوں سے تعلق پیدا کر لو میری اسی سالہ زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ اللہ والوں کی محبت اور ان سے تعلق پیدا ہونے کے بعد حق تعالیٰ سے تعلق بڑا آسان اور سہل ہو جاتا ہے اسی لیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی محبت کے ساتھ اللہ کے عاشقوں کی محبت کو بھی مانگا ہے ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّبَلِّغُنِیْ اِلٰی حُبِّکَ﴾

(سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جآء فی عقدۃ التسبیح بالید، ج:۲، ص:۱۸۷)

یا اللہ مجھے اپنی محبت اور اپنے عاشقوں کی محبت دے دے اور ایسے عمل کی محبت عطا فرمادے جو مجھے تجھ تک پہنچادے۔

فیضِ شیخِ کامل

مری رسوائیوں پہ آسماں رویا زمیں روئی
مری ذلت کا لیکن آپ نے نقشہ بدل ڈالا
بہت مشکل تھا میرے نفس امارہ کا چت ہونا
تری تدبیر الہامی نے اس کا سر کچل ڈالا

رحمت کا تری سر پہ مرے آبشار ہو

سجدہ میں سر ہو چشم بھی یوں اشکبار ہو — رحمت کا تری سر پہ مرے آبشار ہو
غالب نہ نفس پر کبھی شہوت کی نار ہو — دل میں نہ مرے غیر کا کوئی بھی خار ہو
میرے لبوں پہ ذکر ترا بار بار ہو — پھر دل بہ فیض ذکر مرا پُر بہار ہو
ہم سب کو تیری یاد سے حاصل قرار ہو — دل بھولنے سے تجھ کو بہت بے قرار ہو
ہر اک گناہ سے مجھے یارب فرار ہو — یک لمحہ عاصیوں میں نہ میرا شمار ہو
بستی ہو یا چمن ہو کہ وہ کوہسار ہو — جاؤں جدھر بھی دل مرا تجھ پر نثار ہو
اپنے کرم سے بھیک مجھے مغفرت کی دے — بندہ ترا محشر میں نہ یہ شرمسار ہو
یارب ترے کرم سے یہ کچھ بھی نہیں بعید — رحمت بروز حشر تری بے شمار ہو
عاصی اگر ہو متقی ترک گناہ سے — پھر تاج ولایت کا وہی تاج دار ہو
یارب فدا ہو تجھ پہ اس اخترؔ کا ہر نفس — توفیق ایسی آپ کی لیل و نہار ہو

مشکل الفاظ کے معانی:۔ چشم: آنکھ۔ **شہوت:** حرام لذت۔ **نار:** آگ۔ **خار:** کانٹا۔ **لبوں:** لب کی جمع یعنی ہونٹ۔ **قرار:** سکون۔ **فرار:** دور بھاگنا۔ **عاصیوں:** عاصی کی جمع یعنی گنہگار۔ **چمن:** باغ۔ **کوھسار:** پہاڑ۔ **نثار:** قربان۔ **شرمسار:** شرمندہ۔ **بعید:** دور۔ **متقی:** ہرقسم کے گناہ سے بچنے والا۔ **ولایت:** اللہ تعالیٰ کی دوستی۔ **نفس:** سانس۔ **لیل و نہار:** رات و دن۔

چشم کی اشکباری پر رحمت کی آبشاری

سجدہ میں سر ہو چشم بھی یوں اشکبار ہو
رحمت کا تری سر پہ مرے آبشار ہو

سجدے کی حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جیسا کہ حدیث پاک میں یہ بات ذکر کی گئی ہے پھر اس حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آخرت کے خوف سے رونا اور آنکھوں سے آنسو بہانا جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض مرتبہ لمبے لمبے وقت کے لیے سجدے میں گر کر اللہ کے سامنے آہ وزاری کیا کرتے تھے اور تقریباً تمام ہی اولیاء امت کی یہ عادت رہی ہے چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے متعلق واقعات میں آتا ہے کہ کبھی کبھی پوری رات سجدے میں گر کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے ۔

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن
گر بدم من سر من پیدا مکن

اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے پر اس کی کتنی رحمت برستی ہے اس کا اندازہ ان روایات سے لگایا جا سکتا ہے جن میں اللہ کے خوف سے رونے پر جہنم کی آگ حرام کر دیے جانے کی بات ارشاد فرمائی گئی ہے جیسا کہ علامہ منذری کی الترغیب والترھیب کتاب کے اندر اللہ کے خوف سے رونے کے متعلق متعدد روایات نقل کی گئی ہیں اس لیے جب آدمی سجدے میں گر کر خوف خدا سے روئے گا تو یقیناً اس کے سر پر رحمت خداوندی کا آبشار ہوگا جس سے باران رحمت خداوندی اس کو سیراب کر رہی ہوگی ۔

نفس کی چاہتیں جہنم میں لے جانے والی ہیں

غالب نہ نفس پر کبھی شہوت کی نار ہو
دل میں نہ مرے غیر کا کوئی بھی خار ہو

اگر آدمی گناہوں سے بچتا رہے اور نفس کے گندے تقاضوں اور اس کی خواہشات پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے جنت کا راستہ بالکل آسان ہو جاتا ہے اس لیے کہ شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا اور نفس کے کہنے پر چلنا بمقتضائے حدیث شریف انسان کو جہنم میں لے جانے والا ہے ۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ ڈھانکی گئی ہے شہوات سے (یعنی دوزخ پر شہوتوں اور لذتوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں پس جو شخص شہوت نفسانی میں

اپنے کو مبتلا کر دیتا ہے وہ دوزخ کا پردہ چاک کرتا ہے یعنی اس میں داخل ہو جاتا ہے) اور جنت ڈھانکی گئی ہے سختیوں اور تکلیفوں سے (پس جو شخص اعمال صالحہ پر دوام اور گناہوں سے صبر کی تکلیف کو برداشت کرتا ہے وہ جنت کے پردہ کو چاک کرتا ہے یعنی اس میں داخل ہو جاتا ہے) اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ حفت یعنی دوزخ کو شہوتوں سے اور جنت کے تکلیفوں سے گھیر دیا گیا ہے۔

تشریح: خلاصہ حدیث مذکور کا یہ ہے کہ دوزخ تک کوئی شخص نہ پہنچے گا جب تک وہ شہوات کا یعنی گناہوں کا ارتکاب نہ کرے گا اسی طرح کسی شخص کو جنت تک رسائی نہ ہوگی جب تک کہ وہ عبادات کی اور معاصی سے حفاظت کی محنت نہ برداشت کرے گا۔ جو شخص جس حجاب کو چاک کرے گا وہ اس حجاب کے محجوب تک واصل ہو جاوے گا۔ فَمَنْ هَتَكَ الْحِجَابَ وَصَلَ اِلَى الْمَحْجُوْبِ ترجمہ جس نے پردہ پھاڑا وہ پردہ کے پیچھے والی شے سے ملا (خلاصہ مرقات) اس سے معلوم ہوا کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ اللهِ علم اللہ کا پردہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے علم حاصل کرنا ضروری ہے جب علم تک رسائی ہوگی خدا کی معرفت عطا ہوگی۔ اس حدیث میں شہوت سے مراد خواہش حرام ہے جیسے شراب، زنا اور غیبت ہے اور جائز راحت میں حرج نہیں مگر عیش کی زیادہ فکر و کاوش مانع قرب ولایت ہے۔ (رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی حقیقت، ص:۱۷)

شہوت کا گناہ آج ایک وبائی مرض ہے

عام طور پر آج کل شہوت فرج والا گناہ دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے اور زیادہ تر لوگ اسی مرض کے بیمار دکھائی دیتے ہیں جب انسان حرام محبتوں میں پڑتا ہے اور قرآنی احکام کا خیال نہیں کرتا تو پھر اس کے نتائج دنیا و آخرت کی تباہی و بربادی ہوا کرتی ہے۔

قرآن کریم نے تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا بڑا واضح اور صاف اعلان فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے قریب تک مت جاؤ کیونکہ جو قریب جائے گا وہ مبتلاء ہو ہی جائے گا۔

اگر ہم بغور دیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے کر ہم پہ یہ احسان فرمایا ہے کہ اے میرے بندو! میں تمہاری خیر اور بھلائی کے لیے تم کو جہنم سے بچانے کے واسطے ایسی صورت بتا رہا ہوں کہ جس پر چل کر حرام کاریوں اور خاص طور پر شہوت رانیوں کے گناہوں سے تمہاری حفاظت رہے گی اور اس طرح تم جنت میں جا سکو گے۔

جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

﴿اِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللهِ مَحَارِمُهٗ﴾

(صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات)

ہر بادشاہ کے لیے ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی حمیٰ اور چراگاہ اس کے حرام کیے ہوئے کام ہیں پس اگر کوئی چراگاہ

کے اردگرد جانوروں کو چرائے گا تو قریب ہے کہ جانور چراگاہ میں منہ ڈال کر اسے چرنے لگیں۔

اس لیے دل میں کسی محبوب اور محبوبہ کا خیال گزرنے بھی نہیں دینا چاہیے اپنی نگاہوں اور کان وزبان کی بہت مضبوطی سے حفاظت کرنی چاہیے کہ دل میں اللہ کے سوا کسی کا گزر ہی نہ ہو جو کسی گناہ میں مبتلا کردے بلکہ دل ہر وقت اللہ کی یاد میں مست ہو جس کی بدولت نفس کی شرارتوں اور خباثتوں سے میں محفوظ رہے۔

جو لوگ شہوت کے گناہوں سے احتیاط نہیں کرتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ دین سے بالکل دور ہو جاتے ہیں۔

ذکر سے رطب اللسانی، ایک جامع نصیحت

میرے لبوں پہ ذکر ترا بار بار ہو
پھر دل پہ فیض ذکر مرا پر بہار ہو

یوں تو اسلام کے احکام قولی اور عملی بہت سارے ہیں لیکن خاص طور پر اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد کرتے رہنا اور زبان کا اللہ کی یاد میں تروتازہ رہنا یہ اللہ تعالیٰ کا نہایت پسندیدہ عمل ہے جس کے متعلق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو خاص طور پر نصیحت فرمائی تھی چنانچہ روایت میں ہے:

﴿عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ شَرَائِعَ الْإِسْلَامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ فَأَخْبِرْنِیْ بِشَیْءٍ أَتَشَبَّثُ بِهٖ قَالَ لَا یَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص:۱۹۸)

یعنی ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات عرض کی یا رسول اللہ اسلام کے احکام مجھ پر بہت زیادہ ہو چکے ہیں کوئی ایک جامع بات مجھے ارشاد فرمائیے جس کو میں مضبوطی سے پکڑلوں جو زیادہ دشوار بھی نہ ہو اور جس میں کسی خاص وقت کی یا جگہ کی پابندی بھی نہ ہو اور وہ کسی خاص حالت کے ساتھ مقید بھی نہ ہو اور دوسری عبادات کی طرف سے وہ کافی بھی ہو جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر میں ''تر'' رہنی چاہیے یعنی یہ کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر حالت میں زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر اللہ پر ایک عظیم الشان انعام عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے کہ جب کوئی اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یاد کرتے ہیں جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ معارف نے القرآن میں اس آیت کے تحت ذکر کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِیْ أَذْكُرْكُمْ﴾

ذکر کے اصلی معنی یاد کرنے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لیے کہا جاتا ہے

کہ زبان ترجمان قلب ہے اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رومی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے ؎

بر زباں تسبیح در دل گاؤخر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں دل نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمان سے کسی نے ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو، کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعات میں لگا لیا۔ (قرطبی)

ذکر اللہ کے فضائل

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں لوگوں نے کہا کہ اپ کو یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے، فرمایا کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں اس لیے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری سے کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ فَمَنْ لَّمْ يُطِعْهُ لَمْ يَذْكُرْهُ وَاِنْ كَثُرَ صَلٰوتُهٗ وَ تَسْبِيْحُهٗ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی اس نے اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کیا، اگر چہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو۔

ذکر اللہ کی اصل حقیقت

قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خویز منداذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے جس کا ترجمہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، یعنی اس کے احکام حلال وحرام کی اتباع کی اس نے اللہ کو یاد کیا، اگر چہ اس کی (نفل) نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا اگر چہ (بظاہر) اس کی نماز روزہ تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کر رہا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لیے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے

ہیں اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں،

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں اور ایک حدیث قدسی بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ”میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر میں اس کے ہونٹ ہلتے رہیں۔“ ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا ہے۔ (معارف القرآن جلد اول ص ۳۹۲)

قرآن کی اصطلاح میں اہل عقل کون لوگ ہیں؟

اب یہاں یہ مسئلہ غور طلب تھا کہ عقل والوں سے کون لوگ مراد ہیں کیونکہ ساری دنیا عقلمند ہونے کی مدعی ہے کوئی بے وقوف بھی اپنے آپ کو بے عقل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے قرآن کریم نے عقل والوں کی چند ایسی علامات بتلائی ہیں جو درحقیقت عقل کا صحیح معیار ہیں پہلی علامت اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے غور کیجئے تو محسوسات کا علم کان، آنکھ، ناک، زبان وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے جو بے عقل جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے اور عقل کا کام یہ ہے کہ علامات وقرائن اور دلائل کے ذریعہ کسی ایک ایسے نتیجہ تک پہنچ جائے جو محسوس نہیں ہے اور جس کے ذریعے سلسلۂ اسباب کی آخری کڑی کو پایا جاسکے۔

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کائنات عالم پر غور کیجئے، آسمان اور زمین اور ان میں سمائی ہوئی تمام مخلوقات اور ان کی چھوٹی بڑی چیزوں کا مستحکم اور حیرت انگیز نظام عقل کو کسی ایسی ہستی کا پتا دیتا ہے جو علم وحکمت اور قوت وقدرت کے اعتبار سے سب سے زیادہ بالاتر ہو اور جس نے ان تمام چیزوں کو خاص حکمت سے بنایا ہو اور جس کے ارادہ اور مشیت سے یہ سارا نظام چل رہا ہو، اور وہ ہستی ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہ ہی کی ہوسکتی ہے کسی عارف کا قول ہے۔

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہ لا شریک لہ گوید

انسانی ارادوں اور تدبیروں کے فیل ہونے کا ہر جگہ اور ہر وقت مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس انسان کو نظام چلانے والا نہیں کہا جاسکتا اس لیے آسمان اور زمین کی پیدائش اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات کی پیدائش میں غور وفکر کرنے کا نتیجہ عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی اطاعت وذکر ہے جو اس سے غافل ہے وہ عقلمند کہلانے کا مستحق نہیں، اس لیے قرآن کریم نے عقل والوں کی یہ علامت بتائی:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾

(سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۱)

یعنی عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کریں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے مراد یہ ہے کہ ہر حالت اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کی دنیا نے جس چیز کو عقل اور عقل مندی کا معیار سمجھ لیا ہے وہ محض ایک دھوکہ ہے کسی نے مال و دولت سمیٹ لینے کو عقلمندی قرار دیدیا کسی نے مشینوں کے کل پرزے بنانے یا برق اور بھاپ کو اصل پاور سمجھ لینے کا نام عقلمندی رکھ دیا لیکن عقل سلیم کی بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء ورسل لے کے آئے کہ علم و حکمت کے ذریعہ سلسلہ اسباب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے درمیانی مراحل کو نظر انداز کیا، خام مواد سے مشینوں تک اور مشینوں سے برق اور بھاپ کی قوت تک تمہیں سائنس نے پہنچایا، عقل کا کام یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھو تا کہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ اصل کام نہ پانی، مٹی، لوہے، تانبے کا ہے، نہ مشین کا نہ اس کے ذریعہ پیدا کی ہوئی اسٹیم کا، بلکہ کام اس کا ہے جس نے آگ اور پانی اور ہوا پیدا کی جس کے ذریعہ یہ برق و بھاپ تمہارے ہاتھ آئی ۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے برآہوئے چین بستہ اند

اس کو ایک عامیانہ محسوس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک جنگل کا رہنے والا جاہل انسان جب کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور یہ دیکھے کہ ریل جیسی عظیم الشان سواری ایک سرخ جھنڈی کے دکھانے سے رک جاتی ہے، اور سبز کے دکھانے سے چلنے لگتی ہے تو اگر وہ یہ کہے کہ یہ سرخ اور سبز جھنڈی بڑے پاور اور طاقت کی مالک ہے کہ اتنی طاقت والے انجن کو روک دیتی اور چلا دیتی ہے تو علم وعقل والے اس کو احمق کہیں گے اور بتلائیں گے کہ طاقت ان جھنڈیوں میں نہیں بلکہ اس شخص کے پاس ہے جو انجن میں بیٹھا ہوا ان جھنڈیوں کو دیکھ کر روکنے یا چلانے کا کام کرتا ہے لیکن جس کی عقل کچھ اس سے زیادہ ہے وہ کہے گا کہ انجن ڈرائیور کا پاور یا طاقت کا مالک سمجھنا بھی غلطی ہے، کیونکہ درحقیقت اس کی طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ایک قدم اور بڑھ کر اس طاقت کو انجن کے کل پرزوں کی طرف منسوب کرے گا لیکن ایک فلاسفر یا سائنس داں اس کو بھی یہ کہہ کر بیوقوف بتلائے گا کہ بے حس کل پرزوں میں کیا رکھا ہے، اصل طاقت اس بھاپ اور اسٹیم کی ہے، جو انجن کے اندر آگ اور پانی کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے، لیکن حکمت وفلسفہ یہاں آکر تھک جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کہ ظالم! جس طرح جھنڈیوں کو یا ڈرائیور کو یا انجن کے کل پرزوں کو طاقت اور پاور کا مالک سمجھ بیٹھنا اس جاہل کی غلطی تھی، اسی طرح بھاپ اور اسٹیم کو طاقت کا مالک سمجھ لینا بھی تیری فلسفیانہ غلطی ہے ایک قدم اور آگے بڑھ، تا کہ تجھے اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ آئے اور سلسلۂ اسباب کی آخری کڑی تک تیری رسائی ہوجائے کہ دراصل ان ساری طاقتوں اور پاوروں کا مالک وہ ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کیے، اور یہ اسٹیم

تیار ہوئی اس تفصیل سے آپ نے معلوم کرلیا کہ عقل والے کہلانے کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور ہر وقت ہر حالت مین اس کو یاد کریں، اسی لیے اُولِی الْاَ لْبَابِ کی صفت قرآن کریم نے یہ بتلائی ''اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ''

اس لیے حضرات فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انتقال سے قبل یہ وصیت کر جائے کہ میرا مال عقلاء کو دیدیا جائے تو کس کو دیا جائے گا؟ اس کے جواب میں حضرات فقہائے کرام نے تحریر فرمایا کہ ایسے عالم زاہد اس مال کے مستحق ہونگے جو دنیا طلبی اور غیر ضروری مادی وسائل سے دور ہیں، کیونکہ صحیح معنی میں وہی عقلاء ہیں۔ (درمختار، کتاب الوصیۃ)

اس جگہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شریعت میں ذکر کے علاوہ کسی اور عبادت کی کثرت کا حکم نہیں دیا گیا لیکن ذکر کے متعلق ارشاد ہے کہ ''اُذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا''، وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر کے سوا سب عبادات کے لیے کچھ شرائط اور قواعد ہیں جن کے بغیر وہ عبادات ادا نہیں ہوتیں، بخلاف ذکر کے کہ اس کو انسان کھڑے، بیٹھے لیٹے ہوئے باوضو ہو یا بے وضو ہر حالت میں اور ہر وقت انجام دے سکتا ہے اس آیت میں شاید اس حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ (معارف القرآن، ج:۲،ص:۲۶۳)

چونکہ ذکر اللہ ایمان والوں کے دل کی غذا ہے جس طرح مختلف قسم کے کھانے پینے کی چیزیں انسان کے بدن کی غذا ہیں اس لیے ذکر اللہ کے فیض سے دل میں ایک تر و تازگی اور اطمینان نصیب ہوتا ہے اور ایسی بہار بے خزاں ملتی ہے کہ جو کیسے ہی موافق و ناموافق حالات میں ختم نہیں ہوتی اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ میرا دل ذکر اللہ کے فیض سے پر بہار ہو جائے۔

ہم سب کو تیری یاد سے حاصل قرار ہو
دل بھولنے سے تجھ کو بہت بے قرار ہو

یہ وہی بات ہے جس کو قرآن کریم کی اس آیت میں فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾
(سورۃ الرعد، آیت:۲۸)

اس آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات بتادی گئی ہے کہ دل میں سکون اور قرار اور چین و اطمینان صرف اللہ کی یاد ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اس کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے اس لیے جار و مجرور کو مقدم کر کے حصر کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی گئی جس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان میسر آتا ہے اور جو لوگ اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں ان کے دلوں کو غفلت گھیر لیتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنی زندگی کے ہر میدان میں

بے چین و پریشان دکھائی دیتے ہیں۔

خاص طور پر اولیاء اللہ کی تو غذا ہی اللہ کا ذکر ہوتی ہے تو اگر کوئی وقت ذرا بھی غفلت میں گزر جائے تو وہ ان کے لیے بہت ہی شاق اور دشوار ہوتا ہے جس کے بدلے وہ لوگ رو رو کر توبہ کرتے ہیں اور پھر اس کمی کو پورا کرتے ہیں حق سبحانہ وتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے ذکر سے اعراض کرے گا تو اس کی معیشت تنگ ہوگی اگرچہ یہاں ذکر سے رسول یا قرآن مراد ہے مگر مقصد یہی ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت واتباع سے اعراض کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے منہ موڑ لینا جس کا خلاصہ دین سے دوری اختیار کرنا ہے تو اس پر یہ سزا ذکر فرمائی گئی ہے جس کو حضرت مفتی شفیع صاحب نے معارف القرآن میں یوں ذکر فرمایا ہے کہ **ومن اعرض عن ذکری** یہاں ذکر سے مراد قرآن بھی ہوسکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بھی جیسا کہ دوسری آیات میں ''**ذکرا رسولا**'' آیا ہے دونوں کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص قرآن سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کرے یعنی قرآن کی تلاوت اور اسکے احکام پر عمل سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اعراض کرے اسکا انجام یہ ہے کہ ''**فان له معيشة ضنكا و نحشره يوم القيمة اعمىٰ**''، یعنی اسکی معیشت تنگ ہوگی اور قیامت میں اسکو اندھا کر کے اٹھایا جائیگا پہلا عذاب دنیا ہی میں اسے مل جائیگا اور دوسرا یعنی اندھا ہونے کا عذاب قیامت میں ہوگا۔

کافر اور بدکار کی زندگی دنیا میں تلخ اور تنگ ہونے کی حقیقت

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ دنیا میں معیشت کی تنگی تو کفار و فجار کے لیے مخصوص نہیں، مومنین صالحین کو بھی پیش آتی ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ شدائد ومصائب وغیرہ سے اس دنیا کی زندگی میں اٹھانے پڑتے ہیں۔ صحیح بخاری اور تمام کتب حدیث میں بروایت حضرت سعد رضی اللہ عنہ وغیرہ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی بلائیں اور مصیبتیں سب سے زیادہ انبیاء پر سخت ہوتی ہیں ان کے بعد جو جس درجہ کا صالح اور ولی ہے اسی کی مناسبت سے اسکو یہ تکلیفیں پہنچتی ہیں، اسکے بالمقابل عموماً کفار و فجار کو خوشحال اور عیش و عشرت میں دیکھا جاتا ہے تو پھر یہ ارشاد قرآنی کہ ان کی معیشت تنگ ہوگی آخرت کے لیے تو ہوسکتا ہے دنیا میں خلاف مشاہدہ معلوم ہوتا ہے۔ اسکا صاف بے غبار جواب تو یہ ہے کہ یہاں دنیا کے عذاب سے قبر کا عذاب مراد ہے کہ قبر میں انکی معیشت تنگ کردی جاوے گی، خود قبر جو ان کا مسکن ہوگا وہ ان کو ایسا دبائے گی کہ ان کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں گی جیسا کہ بعض احادیث میں اسکی تصریح ہے اور مسند بزار میں بسند جید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس آیت کے لفظ **معيشة ضنكا** کی تفسیر فرمائی کہ اس سے مراد قبر کا عالم ہے۔ (مظہری)

اور حضرت سعد بن جبیر رحمتہ اللہ نے تنگی معیشت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ ان سے قناعت کا وصف سلب کرلیا جاویگا اور حرص دنیا بڑھادی جاویگی (مظہری) جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے پاس کتنا ہی مال و دولت جمع ہو جائے کبھی قلبی سکون اسکو نصیب نہیں ہوگا ہمیشہ مال بڑھانے کی فکر اور اسمیں نقصان کا خطرہ اسکو بے چین رکھے گا اور یہ بات عام اہل تمول میں مشاہر و معروف ہے جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس سامان راحت تو بہت جمع ہو جاتا ہے مگر جسکا نام راحت ہے وہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ وہ قلب کے سکون و اطمینان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن، ج:۶،ص:۱۶۰)

گناہوں سے فرار اور مولیٰ کی یاد سے قرار لقائے مولیٰ کی پہچان ہے

ہر ایک گناہ سے مجھے یا رب فرار ہو
یک لمحہ عاصیوں میں نہ میرا شمار ہو
بستی ہو یا چمن ہو کہ وہ کوہسار ہو
جاؤں جدھر بھی دل مرا تجھ پر نثار ہو

ہر قدم پر اس بات کی فکر رکھنا کہ مجھ سے اللہ کی کوئی نافرمانی نہ ہو جائے اور کوئی گناہ سرزد نہ ہو جائے خواہ خلوتوں میں ہوں یا جلوتوں میں شہر اور بستی میں ہوں یا گلستان و چمنستان میں ہوں یا کہیں سمندروں اور دریاؤں کے کناروں اور کوہساروں میں ہوں زمین پر ہوں یا فضاؤں میں بس مجھے ہر جگہ ایک ہی بات کی دھن وار دھیان ہو کہ میرا اللہ جن چیزوں سے ناراض ہے کہیں وہ مجھ سے سرزد تو نہیں ہو رہی ہیں چاہے میرے دل پر کتنا ہی زور پڑے لیکن میں کبھی بھی اور کسی بھی جگہ پر اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا گوارا نہیں کروں گا۔

اسی بات کو میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ یوں فرماتے تھے کہ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی دھن اور دھیان لگ جائے تو اسے اللہ تعالیٰ ضرور مل جاتے ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے راضی کرنے کی فکر اور لگن اسی شخص کو عطا کرتے ہیں جسے یہ تحفہ رضائے خداوندی ملنا مقدر ہوتا ہے۔

اسی لیے بعض سالکین متعلقین احباب میں سے اس طرح کی بات وقتاً فوقتاً پوچھتے رہتے ہیں کہ میں سو فیصد دین دار بننا چاہ رہا ہوں اور مجھے اپنے بزرگوں کے طریقے پر سو فیصد زندگی کو ڈھالنا ہے لیکن میں کوشش میں لگے ہونے کے باوجود ان کی طرح کیوں نہیں بن پا رہا ہوں؟ اور کیوں مجھے وہ سب اولیاء کی صفات حاصل نہیں ہو رہی ہیں؟ اور مجھے اپنے اندر بڑی کمی اور خلا محسوس ہو رہا ہے جس کے پورا کرنے کے لیے میں مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں اور بڑی بے تابی کے ساتھ میں اس کی خاطر مچل رہا ہوں۔

تو احقر یہی جواب عرض کرتا ہے کہ میرے بھائی یہ طلب اور تڑپ پیدا کیا جانا مطلوب کے حصول کا پیش

خیمہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ پہلے اپنی تڑپ پیدا فرماتے ہیں اور پھر کچھ راستے کی آزمائشوں اور مجاہدوں سے گزارنے کے بعد اپنے قرب کی دولت عطا فرمادیتے ہیں اس لیے میں ایسے تمام لوگوں کو خوش خبری سناتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی اس حالت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں بلکہ طلب مل جانے پر خوشی منائیں خواجہ صاحب نے کیا ہی خوب فرمایا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

بس یہی دل میں اللہ تعالیٰ کو پانے کی طلب آجانا مطلوب کے ملنے کی نشانی ہے اور یہی فکر ہر وقت لگے رہنا تقویٰ کہلاتا ہے اور اللہ والے ہر وقت گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری قوت کا استعمال فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف صرف چلتے ہی نہیں بلکہ فرار اختیار کرتے ہیں یعنی خوب دوڑ کر اور بھاگ کر چلتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین“ یعنی دوڑو اللہ کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مراد یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے بھاگو اللہ کی طرف توبہ کے ذریعہ، ابوبکر وراق اور جنید بغدادی رحمہما اللہ نے فرمایا کہ نفس و شیطان معاصی کی طرف دعوت دینے والے ہیں اور بہکانے والے ہیں تم ان سے بھاگ کر اللہ کی طرف پناہ لو تو تمہیں ان کے شر سے بچالیں گے۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۱۷۰)

گناہوں کی جگہوں سے دور بھاگئے

جب بندہ اپنی پوری قوت و ہمت استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بھاگتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لیے بچنے کے لیے راستے فراہم کر دیتے ہیں لیکن مومن کو اپنی طرف سے پوری قوت و ہمت گناہوں کے چھوڑنے اور نافرمانی سے بچنے میں خرچ کرنی چاہیے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام کو جب زلیخا نے غلط حرکت کے لیے دعوت دی تو حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام نے صرف زبانی انکار پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہاں سے فرار اختیار کیا اور اس جگہ ہی کو چھوڑ دیا جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ﴾

(سورۃ یوسف، آیت:۲۵)

ترجمہ: جب اس عورت نے پھر وہی اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور وہ ان کو پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے چلی اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور (دوڑنے میں جوان کو پکڑنا چاہا تو) اس عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا یعنی اس نے کرتہ پکڑ کر کھینچنا چاہا اور یوسف علیہ السلام آگے کی طرف دوڑے تو کرتہ پھٹ گیا مگر یوسف علیہ السلام دروازے سے باہر نکل گئے اور عورت بھی ساتھ تھی تو دونوں اتفاقاً اس

عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس کھڑا پایا۔ (معارف القرآن، ج:۵،ص:۴۰)

چنانچہ اس آیت کے تحت حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ آیت فاستبقا الباب سے اول تو یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہو اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہیے جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے، نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازے سے بند ہونے اور تاریخ روایات کے مطابق مقفل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑنے میں اپنی پوری قوت خرچ فرمادی ایسی صورت میں اللہ جل شانہ کی طرف سے امداد و اعانت کا بھی اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرمادیتے ہیں مولانا رومی نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے ۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لیے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں ۔

گر مرادت را مذاق شکر ست
نا مرادی نے مراد دلبرست

ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جمعہ کے روز اپنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھو لیتے اور پھر جمعہ کے لیے تیار ہو کر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہنچ کر عرض کرتے کہ یا اللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی کرامت سے جیل کا دروازہ کھل جاتا اور یہ نماز جمعہ ادا کر لیتے، لیکن اس نے اپنی حکمت سے اس بزرگ کو وہ مقام عالی عطا فرمایا، جس پر ہزاروں کرامتیں قربان ہیں، کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جیل کا دروازہ نہ کھلا، مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے کام میں ہمت نہیں ہاری، ہر جمعہ کو مسلسل یہی عمل جاری رکھا یہی وہ استقامت ہے جس کو اکابر صوفیا نے کرامت سے بالاتر فرمایا ہے۔ (معارف القرآن، ج:۵،ص:۴۴)

صاحبو! ہم اس سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کے باوجود گناہ کے مقام پر ٹھیرے نہیں بلکہ وہاں سے دوڑے تو پھر ہمیں گناہوں سے بچنے کے لیے کتنی احتیاط اور مضبوطی کی ضرورت ہے اس

لیے وہی شخص گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ جو اسباب گناہ کے بھی قریب نہ جائے اور قلباً اور قالباً ہر طرح سے دور ہو جائے لہذا جو لوگ کسی معشوق و معشوقہ کی حرام محبت میں پڑے رہتے ہیں اور گرل فرینڈ اور بوئے فرینڈ (Girl Friend Boy Friend) کے چکروں میں پڑ کر اپنی دنیا و آخرت کو برباد کئے ہوئے ہیں اور اگر ان کو ان گناہوں کے چھوڑنے اور ان سے دور رہنے کی نصیحت کی جاتی ہے تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ میں نے بہت کوشش کی مگر مجھ سے چھوٹتا نہیں ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسی کوشش اختیار کی جائے کہ قلب و قالب دونوں سے دور ہو جائیں اور معشوق و معشوقہ کی جگہ سے فرار اختیار کر لے تو ضرور اس گناہ سے چھٹکارا مل جائے گا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ایک طرف گناہ کے چھوڑنے کی بات ہوتی ہے تو دوسری جانب ان سے sms کے ذریعے سے رابطہ رکھنا اور Cell Phone سیل فون پر باتیں کرنا برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اگر اپنے فون نمبر کو تبدیل کرتا ہے تو اس کو اطلاع دے کر تبدیل کیا جاتا ہے کہ میں اپنا نمبر بدل چکا ہوں تم مجھے فون کرنے کی کوشش نہیں کرنا اور میں تم سے الگ ہو چکا ہوں مجھ سے رابطہ مت جوڑنا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اگر یہ نادان دل سے اس بات کا متمنی تھا کہ میں اس حرام تعلق کو کلی طور پر چھوڑ دوں اور ہر قیمت پر اس محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کروں تو پھر اُسے خاموشی کے ساتھ ان حرام تعلقات کو چھوڑنا چاہیے کہ نہ اپنے محبوب و محبوبہ کو کسی طرح کی مثبت و منفی اطلاع دی جائے اور نہ اس بارے میں کسی سے کوئی بات کی جائے بلکہ اپنی جگہ کو چھوڑ دے اور رابطے کے تمام نمبرات اس طرح ختم کر دیے جائیں کہ ان کے ختم کرنے کی کسی کو کوئی اطلاع نہ دی جائے اور اس بارے میں سوچنا اور گفتگو کرنا بھی مکمل طور پر بند کر دیا جائے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ کوئی دوسرا مناسب جائز اچھا شغل اختیار کر کے اپنے ذہن کو اس میں مشغول کر لیا جائے یا پھر ایک لمبی مدت کے لیے دعوت و تبلیغ کے واسطے اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکل جائے یا کسی صاحب نسبت اللہ کے ولی کی خدمت میں کسی خانقاہ وغیرہ میں وقت گزارا جائے یہاں تک کہ اس کے آثار دل و دماغ سے بالکل ختم اور صاف ہو جائیں۔

بقول ہمارے ایک مشفق دوست کے یہ ایک آخری چنگاری راکھ کے ڈھیر کے نیچے ایسی دبی رہتی ہے کہ اگر اس کو نہ بجھایا جائے تو پھر چند ہی دن کے بعد یہی شعلہ بن کر ابھر جاتی ہے اور پھر سے وہی سارے رنگ و روپ لوٹ آتے ہیں اور جانبین کو وہیں لا کھڑا کرتی ہے جہاں سے وہ بچنا چاہتے تھے یہی طریقہ ہے جس سے گناہوں سے مکمل فرار اختیار کیا جا سکتا ہے اور یہی طریقہ اصحاب عزیمت اہل اللہ کا ہے۔ حضرت خواجہ صاحب نے کیا ہی خوب فرمایا۔

طبیعت کی رو زور پر ہے تو رک
وگرنہ یہ سر سے گزر جائے گی

ذرا دیر کو تو ہٹا لے خیال
یہ ندی چڑھی ہے اتر جائے گی

تقویٰ کی تعریف متعدد تعبیرات سے کی گئی، لیکن سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر فرمائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! کبھی آپ کا ایسے راستہ پر بھی گذر ہوا ہوگا جو کانٹوں سے پُر ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کئی بار ہوا ہے۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لیے اور نہایت احتیاط سے چلا۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بس تقویٰ اسی کا نام ہے۔ یہ دنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں سے بھری پڑی ہے، اس لیے دنیا میں اس طرح چلنا اور زندگی گزارنا چاہیے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے نہ اُلجھے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے جو سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ۔

يَقُوْلُ الْمَرْءُ فَائِدَتِيْ وَ مَالِيْ
وَتَقْوَى اللهِ اَفْضَلُ مَا اسْتَفَادَا

''یعنی جو لوگ اپنے دنیوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں حالانکہ تقویٰ سب سے بہتر سرمایہ ہے۔''
(معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۲۴۱)

ٹھیک اسی طرح مسلمان اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے ہوئے گناہوں سے بہت چوکنا اور ہشیار رہتا ہے خواہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا گناہ ہو ہر ایک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے کہ اگر کوئی صغیرہ سے نہیں بچتا تو اس سے کبیرہ گناہوں کا ترک بھی مشکل ہوتا ہے لہٰذا اس سے بچنے کی آسان ترکیب یہی ہے کہ صغیرہ و کبیرہ سے بچنے کا پورا اہتمام رکھے مختصر تفسیر ابن کثیر میں یہ اشعار نقل ہیں ۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاتَ التُّقٰى
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

یعنی چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دو یہی تقویٰ ہے اور کبھی بھی چھوٹے گناہوں کو معمولی مت سمجھنا کیونکہ پہاڑ چھوٹی چھوٹی کنکریوں ہی سے بنا ہوتا ہے اور اللہ کے راستے میں اس طرح چلو جس طرح کہ کوئی شخص کانٹوں کی زمین پر چل رہا ہو کہ وہ کانٹوں سے بڑی احتیاط اور بچاؤ اختیار کرتا ہے۔

اس لیے جس کو یہ فکر لاحق ہو کہ میں ایک لمحہ اللہ کے نافرمانوں میں شامل نہ ہو جاؤں تو وہ ہر قدم پر تمام

گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے گا کیونکہ معصیت و نافرمانی ہی پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب وغصہ نازل ہوتا ہے نوافل کی کمی پر واقع نہیں ہوتا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿اِیَّاکَ وَالْمَعْصِیَةَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِیَةِ حَلَّ سَخَطُ اللهِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۱۸)

کہ اللہ کی نافرمانی سے بچو کیونکہ نافرمانی ہی سے اللہ تعالیٰ کا عذاب اور ناراضگی اترتی ہے۔

مغفرت مولیٰ کے کرم کا صدقہ ہے

اپنے کرم سے بھیک مجھے مغفرت کی دے
بندہ ترا محشر میں نہ یہ شرمسار ہو
یارب تیرے کرم سے یہ کچھ بھی نہیں بعید
رحمت بروزِ حشر تری بے شمار ہو

﴿عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ قَالَ اللهُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّکَ مَا دَعَوْتَنِیْ وَرَجَوْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ عَلٰی مَا کَانَ فِیْکَ وَلَا اُبَالِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُکَ عَنَانَ السَّمَآءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ وَلَا اُبَالِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّکَ لَوْ اَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَایَا ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ لَا تُشْرِکُ بِیْ شَیْئًا لَاَتَیْتُکَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۲۰۴)

حضور اکرم صلی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے انسان جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور معافی کی امید رکھتا رہے گا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا جو بھی اور جیسے بھی گناہ تجھ میں ہوں اور میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا، اے انسان اگر تیرے گناہ آسمان کے بادلوں تک پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرے تو پھر تجھے بخش دوں گا اور کوئی پرواہ نہیں کروں گا، اور اے انسان اگر تو میرے پاس زمین کے مقدار بھر کر گناہ لے کر آئے اور پھر تو مجھ سے اس کی مغفرت چاہنے کے لیے ملے اس حال میں کہ تو میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھراتا اور موت ایمان اور توحید کامل پر ہوئی ہو تو میں تجھے اس کے برابر مغفرت عطا کرونگا۔

اس لیے بندے کو ہر حالت میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیے اور قبولیت کا یقین رکھنا چاہیے یہی بات شعر میں حضرت والا سکھار ہے ہیں کہ کوئی کسی مقام پر بھی پہنچ جائے لیکن اس کی بخشش اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم سے ہی ہوگی لہٰذا مومن کی نظر ہمیشہ اسی پر رہنی چاہیے اعمال کی بنیاد پر بخشش نہیں ہوگی جیسا کہ مختلف روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے اور حضرت والا کا ایک شعر اسی مضمون پر ہے۔

روزِ محشر اے خدا رسوا نہ کرنا فضل سے
کہ ہمارا حال تجھ پر کوئی پوشیدہ نہیں
جس کو استغفار کی توفیق حاصل ہوگئی
پھر نہیں جائز یہ کہنا کہ وہ بخشیدہ نہیں

اس لیے انبیاء و اولیاء کی سنت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اپنی مغفرت کی بھیک بلا استحقاق اس کے فضل و کرم کے سہارے مانگتے رہنا چاہیے جو بھی جنت میں جائے گا اور جہنم سے بچے گا یہ صرف اللہ کے فضل سے ہی ممکن ہوگا میدانِ محشر کی رسوائی اور ذلت سے حفاظت صرف اور صرف حق تعالیٰ کے خاص کرم کی بدولت ہوگی بس مومن کامل کی شان یہ ہے کہ اپنے اعمال اور عبادات اور مجاہدوں اور ریاضتوں پر بالکل نظر نہ رکھے ہر وقت صرف اللہ کے فضل و کرم پر نظر رہے یہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا صحیح شکر ہے۔

اولیاء اللہ دنیا و آخرت کے غموں سے محفوظ ہوتے ہیں

عاصی اگر ہو متقی ترکِ گناہ سے
پھر تاجِ ولایت کا وہی تاجدار ہو
یا رب فدا ہو تجھ پہ اس اخترؔ کا ہر نفس
توفیق ایسی آپ کی لیل و نہار ہو

﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝﴾

(سورۂ یونس، آیات: ۶۲، ۶۳، ۶۴)

ترجمہ: یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ناک واقع پڑنے والا) ہے اور نہ وہ کسی مطلب کے فوت ہونے پر مغموم ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو خوف ناک اور غم ناک حوادث سے بچاتا ہے اور اللہ کے دوست وہ ہیں جو ایمان لائے اور معاصی سے پرہیز رکھتے ہیں (یعنی ایمان اور تقویٰ سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور خوف وحزن سے ان کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (من جانب اللہ خوف وحزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللہ کی باتوں میں یعنی وعدوں میں کچھ فرق ہوا نہیں کرتا پس جب بشارت میں ان سے وعدہ کیا گیا اور وعدہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اس لیے عدمِ خوف و عدمِ حزن لازم ہے اور یہ بشارت جو مذکور ہوئی) بڑی کامیابی ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۵۴۵)

آیاتِ مذکورہ میں اولیاء اللہ کے مخصوص فضائل اور ان کی تعریف اور پہچان پھر دنیا و آخرت میں ان کے

لیے بشارت کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی ناگوار چیز کے پیش آنے کا خطرہ ہوگا اور نہ کسی مقصد کے فوت ہو جانے کا غم اور اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ور جنھوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔

اس میں چند باتیں قابل غور ہیں اول یہ کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونے کے کیا معنیٰ ہیں؟ دوسرا یہ کہ اولیاء اللہ کی تعریف کیا ہے اور ان کی علامات کیا ہیں؟ تیسرا یہ کہ دنیا و آخرت میں ان کی بشارت سے کیا مراد ہے؟

پہلی بات کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہیں ہوتا اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آخرت میں جب حساب کتاب کے بعد جب ان کو ان کے مقام جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو خوف وغم سے ان کو ہمیشہ کے لیے نجات ہو جائے گی نہ کسی تکلیف و پریشانی کا خطرہ رہے گا نہ کسی محبوب و مطلوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہوگا، بلکہ جنت کی نعمتیں دائمی اور لازوال ہوں گی اس معنی کے اعتبار سے تو مضمون آیت پر کوئی اشکال نہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کی کوئی خصوصیت نہ رہی بلکہ تمام اہل جنت جن کو جہنم سے نجات مل گئی ہوگی وہ بھی اسی حال میں ہوں گے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ انجام کار جنت میں پہنچ گئے وہ سب اولیاء اللہ ہی کہلائیں گیا گرچہ دنیا میں ان کے اعمال کتنے ہی مختلف رہے ہوں مگر دخول جنت کے بعد سب کے سب اولیاء اللہ کی ہی فہرست میں شمار ہونگے لیکن بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونا دنیا و آخرت دونوں کے لیے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف وغم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف وغم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہل جنت داخل ہیں۔

اللہ والوں کے بے خوف و بے غم ہونے پر سوال و جواب

مگر اس پر حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ اشکال ہے کہ دنیا میں تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ اولیاء اللہ تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں خوف وغم سے محفوظ نہیں بلکہ ان کا خوف وخشیت اوروں سے زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾

(سورۃ الفاطر، آیت: ۲۸)

یعنی اللہ تعالیٰ سے پوری طرح علماء ہی ڈرتے ہیں اور دوسری جگہ میں اولیاء اللہ کا یہ حال بیان فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُوْنٍ﴾

(سورۃ المعارج، آیات: ۲۷-۲۸)

یعنی یہ لوگ اللہ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے فکر ہو کر بیٹھ سکے۔

اور واقعات بھی یہی ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حالات میں متفکر وغمگین نظر آتے تھے اور آپ نے خود فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

صحابہ کرام میں سب سے افضل حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہ وتابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ وزاری اور خوف آخرت کے واقعات بے شمار ہیں۔

اس لیے روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف وغم سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف وغم میں عام طور سے اہل دنیا مبتلا رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام وراحت عزت و دولت میں ذراسی کمی ہوجانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف و پریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوئے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سے سے بلند و بالا ہوتا ہے، ان کی نظر میں نہ دنیا کی فانی عزت و دولت، راحت وآرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں اور نہ یہاں کی محنت وکلفت اور رنج کچھ قابل التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیش ماہر چہ آمد بود مہمانے

نہ ہمیں خوشی سے کوئی اثر اور غم سے کوئی نقصان بلکہ ہم تو یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا سامان سمجھتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کی عظمت ومحبت اور خوف وخشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج وراحت سود وزیاں پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے بقول کسی شاعر کے کہ ؎

یہ ننگ عاشقی ہیں سود حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

اولیاء اللہ کی تعریف اور علامات

دوسری بات اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کی علامات سے متعلق ہے اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست ومحب کے معنیٰ میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب ومحبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا ئی انسان وحیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آسکتی تمام عالم کے وجود کی اصلی علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے۔

مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت ومحبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے یہ قرب ولایت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ

اولیاء اللہ کہلاتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے میں ہی اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی گھڑی اور کوئی کام میری رضاء کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایت خاصہ کے درجات بے شمار اور غیر متناہی ہیں اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے کیونکہ ہر نبی کا ولی ہونا لازمی ہے اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لیے کرتا ہے جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لیے کرتا ہے اس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو۔

اسی حالت کی علامت ہے کثرت ذکر اور دوام طاعت یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم و بیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ولایت حاصل کرنے کا طریقہ

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجہ ولایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہوسکتا ہے اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے پھر یہ فیض صحبت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو بلاواسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام امت کے اولیاء واقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنت کے پیرو ہیں۔

ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو یہی نسخہ ہے درجہ ولایت حاصل کرنے کا جو تین ۳ جز، سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت ۱، اس کی اطاعت ۲ اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرت ذکر مسنون طریقہ پر ہو کیونکہ کثرت ذکر سے آئینہ قلب کو فلاح ہوتی ہے تو وہ نور ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لیے صیقل اور صافی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل فرمایا ہے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجے تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا:

﴿اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الادب، باب علامۃ حب اللہ عزّوجلّ، ج:۲، ص:۹۱۱)

یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے اس سے معلوم ہوا اولیاء اللہ کی صحبت انسان کے لیے حصول ولایت کا ذریعہ ہے۔

اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت زرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نے حضرت زرین سے فرمایا میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی حاصل کرسکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہل ذکر کی مجلس وصحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ

ہو سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لیے کرو جس سے نفرت کرو اللہ کے لیے کرو۔ (مظہری)

مگر یہ صحبت و مجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبع سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں چاہے کشف و کرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہو اگر چہ اس سے کبھی کوئی کشف و کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ کا ولی ہے (مظہری) اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماء رضی اللہ عنہ بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی اِذَا رُأُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف و کرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

آخر آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ اولیاء کے لیے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی آخرت کی خوش خبری تو یہ ہے کہ موت کے وقت جب اس کی روح کو اللہ کے پاس لے جایا جائے گا اس وقت اس کو خوش خبری جنت کی ملے گی پھر قیامت کے روز قبر سے اٹھنے کے وقت جنت کی خوش خبری دی جائے گی۔

جیسا کہ طبرانی نے بروایت ابن عمر نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل لا الہ الا اللہ کو نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوگی نہ قبر میں اور نہ قبر سے اٹھنے کے وقت، گویا میری آنکھیں اس وقت کا حال دیکھ رہی ہیں جب یہ لوگ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے'' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ''یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا، اور دنیا کی بشارت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سچی خوابیں، جو انسان خود دیکھے یا اس کے لیے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کے لیے خوش خبری ہو۔
(رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اور دنیا کی دوسری بشارت یہ ہے کہ عام مسلمان بغیر کسی غرض کے اس سے محبت کریں اور اچھا سمجھیں، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تلک عاجل بشرٰی المومن'' یعنی عام مسلمانوں کا اچھا سمجھنا اور تعریف کرنا مومن کے لیے نقد خوش خبری ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۵۴۵)

زندگی کے دو رُخ

گئی وہ بھول جمال رُخ مہ و انجم
مری نظر جو رُخ آفتاب سے گذری
یہ کائنات اسے تنگ تھی بہ ایں وسعت
کوئی حیات جو اس کے عتاب سے گذری

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **جمال**: خوبصورتی۔ **مہ وانجم**: چاند اور ستارے۔ **آفتاب**: سورج۔ **وسعت**: لمبائی چوڑائی کے ساتھ۔ **حیات**: زندگی۔ **عتاب**: غضب۔

جام و مینا کی ہے فراوانی

جس پہ ہوتا ہے فضلِ رحمانی ترک کرتا ہے کارِ شیطانی
دوستو درد دل کی دولت کو دل میں پاتے ہیں صرف ربانی
حامل درد اہل نسبت کو خلق کہتی ہے دل سے یزدانی
شیخ کامل سے جو ہے مستغنی پائے گا کیسے ظل رحمانی
فسق کرتا ہے دور منزل سے پیر تیرا ہو گرچہ لاثانی
فیض مرشد کی یہ کرامت ہے کوئی رومی ہے کوئی خاقانی
مست رکھتی ہے سارے عالم سے دل میں لذت درد پنہانی
کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں جس کو ملتا ہے جام عرفانی
میر میرے دل شکستہ میں جام و مینہ کی ہے فراوانی
رنگ دیکھو تو بزم عارف کا کیسی مستی ہے کیسی جولانی
رشک کرتے ہیں اہل ساحل سب دیکھ کر موج دل کی طغیانی
رند پاتا ہے خانقاہوں سے اپنے ایماں میں کیف احسانی
جب ملا درد خونِ حسرت سے کیا کہوں اس کا ذوق ایمانی
صحبت اہل دل کی برکت سے دل میں اخترؔ ہے کیسی تابانی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **فضلِ رحمانی**: اللہ تعالیٰ کا فضل۔ **کارِ شیطانی**: شیطان والے کام یعنی گناہ۔ **حامل**: رکھنے والا۔ **یزدانی**: اللہ والا۔ **مستغنی**: بے پروا۔ **ظلِّ رحمانی**: اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا سایہ۔ **فسق**: گناہ۔ **منزل**: مراد اللہ تعالیٰ۔ **لاثانی**: جس کے جیسا کوئی دوسرا نہ ہو۔ **خاقانی**: رومی وخاقانی دونوں اللہ والوں میں سے ہیں۔ **مست**:

بے پرواہ۔ **دردِ پنہانی**: دل ہی دل میں گناہوں سے بچنے کا غم اور درد اٹھنا۔ **حلاوت**: مٹھاس۔ **جامِ عرفانی**: اللہ تعالیٰ کی پہچان اور محبت کی شراب۔ **دلِ شکستہ**: گناہوں سے بچنے کے غم کی وجہ سے ٹوٹا ہوا دل۔ **جام و مینا**: اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب کے پیالے۔ **فراوانی**: زیادہ ہونا۔ **بزمِ عارف**: اللہ والے کی محفل۔ **جولانی**: مستی اور لذت۔ **اھلِ ساحل**: حرام خواہشات سے لطف اندوز ہونے والے۔ **طغیانی**: گناہوں سے بچنے میں دل پر گذرنے والا طوفان۔ **رند**: دنیا کی گندی شراب پینے والا۔ **خانقاھوں**: اللہ والوں کے رہنے کی جگہ۔ **ذوقِ ایمانی**: ایمان کا مزہ۔ **تابانی**: چمک، روشنی۔

کارِ شیطانی کا ترک فضلِ رحمانی کی نشانی ہے

جس پہ ہوتا ہے فضلِ رحمانی
ترک کرتا ہے کارِ شیطانی

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو انسان اللہ کی نافرمانیوں کو چھوڑتا ہے اور معاصی اور گناہوں سے اپنے کو محفوظ رکھتا ہے تو سمجھ لو کہ اس پر خدا تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور اسی فضلِ الٰہی کی برکت سے وہ گناہوں سے بچا ہوا ہے۔ تو اگر غور سے دیکھیں تو ایک بات تو اس شعر میں یہ مذکور ہے کہ جو لوگ متقی ہیں اور گناہوں سے محفوظ رہنے والے ہیں وہ اس کو اپنا کمالِ عقل نہ سمجھیں اور اپنی ذہانت و سمجھ کی طرف منسوب نہ کریں بلکہ درحقیقت تقویٰ و طہارت اور تزکیہ و اصلاح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی مرہونِ منت ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾

(سورۃ النور، آیت: ۲۱)

ترجمہ: اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کر کے) پاک صاف نہ ہوتا۔

(معارف القرآن، جلد: ۶، ص: ۳۶۹)

اس لیے اس کی نسبت صرف فضلِ الٰہی اور توفیقِ الٰہی کی طرف ہونی چاہیے اور یہی سوچنا چاہیے۔

اور دوسری بات اس شعر میں یہ مذکور ہے کہ جو لوگ گناہوں سے بچنے والے ہیں اور ہر قسم کی معصیت سے اپنی حفاظت کرنے والے ہیں بس یہی وہ لوگ ہیں کہ جو درحقیقت فضلِ الٰہی والے لوگ ہیں اور یہی لوگ حقیقت میں متقی اور ولی اللہ ہیں ورنہ اگر کوئی بندہ عبادات اور نوافل اور بہت سی دینی خدمات انجام دیتا ہو اور مختلف میدانوں میں دینی کاموں میں لگا ہوا ہو لیکن وہ گناہوں سے نہیں بچتا ہے۔ جیسا کہ آج کل عمومی طور پر ایسا ہو رہا ہے کہ نیکیاں کرنے والے بہت ہیں اور نیکیاں خوب ہو رہی ہیں، مگر گناہوں اور معصیتوں سے حفاظت کی فکر اور اہتمام نہیں ہے اور امورِ خیر کی دعوت و ترغیب دینے والے بھی بہت ہیں مگر بڑے بڑے گناہ جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، وہ اعلانیہ طور پر کیے جا رہے ہیں اور افسوس کہ ان پر کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ عورتوں سے

اختلاط، سودی کاروبار، جاندار کی تصویروں میں بے احتیاطی وغیرہ جیسے گناہ کثرت سے ہورہے ہیں۔

تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب تک انسان گناہوں سے نہیں بچتا ہے، خواہ بظاہر کتنا ہی نیک اور صالح ہو لیکن حقیقت میں عنداللہ وہ مقبولین بارگاہِ الٰہی اور منعم علیہم بندوں میں شامل نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ ''اِنْ اَوْلِيَآءُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ اور فرمایا کہ ''اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۖۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ پہلی آیت میں فرماتے ہیں کہ میرے دوست صرف متقی بندے ہیں اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ سنو اللہ کے اولیاء پر نہ کوئی خوف وڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور گناہوں سے بچتے تھے۔

یہ شعر دعویٰ مع دلیل ہے

پھر حضرت والا کی تعبیر ایسی ہے کہ جس میں دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی ہے کہ گناہوں کو کیوں چھوڑنا چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ وہ شیطانی کام ہیں اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا کہ شیطان تمہارا دُشمن ہے، تم اس کو دُشمن گردانو اور قرار دو یعنی دُشمن سمجھ کر اس سے دُشمن جیسا سلوک کرو اور ظاہر ہے کہ اہلِ دنیا بھی اپنے دُشمن کے سلسلہ میں یہ اصول اپناتے ہیں کہ اس کی بات نہیں مانتے ہیں اور جس چیز میں دُشمن کی خوشی ہو اس کو اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف کرتے ہیں تو اس پہلو سے بھی ہم پر لازم ہے کہ ہم گناہوں سے بچیں کیونکہ جتنے گناہ ہیں وہ سارے اللہ کی ناراضگی اور دُشمن شیطان کی خوشی کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت ہے کہ:

﴿اِيَّاكَ وَالْمَعْصِيَةَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِيَةِ حَلَّ سَخَطُ اللّٰهِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص ۱۸)

کہ نافرمانی اور گناہ سے بچتے رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غصہ معصیت ونافرمانی ہی سے اُترتا ہے، اسی لیے آپ اقوامِ عالم کا مطالعہ کریں جب جب معصیت اور نافرمانی کسی قوم میں آئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا عذاب آیا۔ محض طاعات کی کمی کی وجہ سے عذاب نہیں آتا ہے۔ اسی لیے آج حضرت والا کی زندگی کی تمام تعلیمات کا اصل رُخ گناہوں کو مٹانے پر اور بالخصوص اس وقت کے سب سے بڑے سنگین مرض عشقِ مجازی کے خطرناک گناہ کے مٹانے اور اس کی خرابیوں اور مذمتوں اور نقصانات وفسادات پر مشتمل مضامین کے نشر کرنے کی طرف ہے کیونکہ آج کے دور کا یہ وہ مرض ہے کہ اگر بغور دیکھیں تو آج کے جدید جدید آلات وذرائع جو بظاہر منافع کی صورت لیے ہوتے ہیں، مگر ان میں عشقِ مجازی کی بیماری کا زہریلا تیر ضرور ہوتا ہے اور یہود ونصاریٰ اس خواہش وتمنا میں ہیں کہ مسلم نوجوان کو میدان کارزار کے بجائے اس راہ سے زیر کیا جائے کیونکہ عشقِ مجازی میں لگ کر انسان دین کا اور

آخرت کا تو رہتا ہی نہیں ہے، مگر وہ دنیا کے مطلب کا بھی نہیں رہ پاتا ہے۔ اس لیے آج کے دور میں مختلف طریقوں اور تدبیروں سے اس خطرناک مرض کو اُمت سے دور کرنے کے لیے کوششیں کرنا اس وقت کا بڑا جہاد ہے، کیونکہ بہت سے تاریخی واقعات ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس مرض کا منتہا سلبِ ایمان اور خاتمہ علی الکفر پر ہوا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُ.

دردِ دل کی دولت صرف ربانی کو ملتی ہے

دوستو دردِ دل کی دولت کو
دل میں پاتے ہیں صرف ربانی

جو اللہ والے لوگ ہیں اور واقعی معنی میں اولیاء اللہ ہیں اور ہر قسم کے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی صبر اور مجاہدہ کرنا پڑے مگر وہ ہر حال میں ثابت قدم رہتے ہیں ہر مسئلہ میں صرف اللہ کو پکارتے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جو حقیقی طور پر جینے کا لطف اور مزہ پاتے ہیں اور ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی محبت کا درد و غم عطا کرتا ہے اور اس دولت سے ان کو مالا مال کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ احمد صاحب رحمہ اللہ پرتا بگڈھی فرماتے ہیں کہ ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہو گیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہو گیا

اور اسی کو ایک شاعر بڑے درد بھرے انداز سے یوں پیش کرتا ہے کہ ؎

میں نے لیا ہے دردِ دل کھو کے بہارِ زندگی
اِک گُلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

ظاہر ہے کہ انسان میں گناہوں کی طرف فطری میلان و رغبت رکھی گئی ہے تو جب بندۂ مؤمن اپنی طبیعت پر ہر قدم پر اور ہر موڑ پر جبر کر کے مجاہدہ کر کے تمام گناہوں سے بچنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حق تعالیٰ اسے اپنی محبت کا نور عطا فرماتے ہیں اور اس کے قلب کو روشن کر دیتے ہیں۔ ورنہ محض کچھ نوافل و طاعات کر کے اور گناہوں بالخصوص بدنظری اور شہوت کے گناہ میں ملوث رہنے سے اصل ایمان تو انسان کا رہتا ہے لیکن جو خاص قلب کی حلاوت اور لذت قربِ خداوندی ہے، وہ اس کو حاصل نہیں ہوتی ہے اور درحقیقت قلب کا قلبِ سلیم وقلب منیب ہونا یہ انبیاء کی وراثت ہے اور جنت میں دخول کی ضمانت و گارنٹی کا سبب ہے۔

خلق خود پکار اٹھتی ہے

حاملِ دردِ اہلِ نسبت کو
خلق کہتی ہے دل سے یزدانی

جو لوگ اپنے سینوں میں اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت کا درد وغم رکھتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ سے نسبت وولایت عطا ہو جاتی ہے تو ہر طرف لوگ ان کو اللہ والا کہنا شروع کر دیتے ہیں اور لوگوں میں ان کے چرچے اسی نام سے ہونے لگتے ہیں۔ آپ نے کسی حقیقی اللہ والے کو نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنا اشتہار اور ایڈورٹائز (Advertise) کرتا پھر رہا ہو کہ میں اللہ والا بن گیا ہوں، مجھے اللہ والا تسلیم کرو، مجھے بزرگ مانو، مجھے ولی اللہ کہو اور میری قدر واحترام کرو، بلکہ ہمارے جملہ اکابر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جیسا کہ ان کی پوری زندگی اور تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ ہمیشہ گمنامی واخفاء کو پسند کرتے تھے اور اخلاص وللّٰہیت کے پہاڑ تھے۔ میں سمجھتا ہوں یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں اگر بنظرِ غائر دیکھو تو سب سے زیادہ دین کا کام انہیں حضرات کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ انجام دے رہے ہیں اور یہ ایسا معاملہ ہے کہ جس کے اپنے اور پرائے سب کے سب گواہ ہیں اور سب اس کے قائل ہیں۔

لیکن بات دراصل یہ ہے کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو کہ جب اللہ کسی کو محبوب بنا لیتے ہیں تو پھر حدیثِ شریف میں یہ مضمون ہے کہ فرشتوں اور انسانوں میں بھی اس کی محبوبیت ڈال دی جاتی ہے۔ (الکشف، صفحہ:۲۶۹، مظہری)

چنانچہ پوری حدیث یوں ہے کہ:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ قَالَ فَیُحِبُّهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللهَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَیُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَیُبْغِضُهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللهَ یُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَیُبْغِضُوْنَهٗ ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِی الْاَرْضِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ الادب، باب اذا احبّ اللہ عبدًا، ج:۲، ص:۳۳۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب بناتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم فلاں شخص سے محبت رکھتے ہیں، تم بھی اُس سے محبت رکھو۔ پس جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر جبرئیل علیہ السلام آسمان میں ندا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو چاہتے ہیں تم سب اس سے محبت رکھو۔ سو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اہلِ زمین میں اس شخص کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کو کسی شخص سے بغض

ہوتا ہے تو اسی ترتیبِ مذکور سے اہلِ زمین کے قلوب تک اس کی مبغوضیت آ جاتی ہے۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

علامت مقبول و غیر مقبول اس حدیث میں اولیاء کی غیر اولیاء سے ایک شناخت مذکور ہے۔ اس علامت سے طلبِ شیخ میں کام لینا چاہیے۔ نیز غیر مقبول سے احتراز لازم سمجھنا چاہیے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ بلا کسی سبب و تعلق و نفع یا ضرر دنیوی کے اکثر خلائق کا کسی کی طرف میلانِ قلب اور گمانِ نیک ہونا علامت ہے۔ اس شخص کے محبوب و مقبول ہونے کی اسی طرح بلا کسی لوث نفع و ضرر ظاہری کے اکثر لوگوں کا کسی سے نفرت کرنا اور اس کو اچھا نہ سمجھنا علامت ہے۔ غیر مقبول عند اللہ ہونے کی اور جو صداقت یا عداوت کسی احسان یا رشتہ داری یا ضرر و نا موافقتِ معاملہ سے ہو اس کا اعتبار نہیں۔ اور یاد رہے کہ جن لوگوں کی نیت میں خبث و فساد غالب ہے ان کا ادراک بھی غیر معتبر ہے۔

احقر راقم سطور کے عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ حقیقی طور پر جو اللہ کو راضی کرنے والے اہل اللہ ہیں تو آسمانوں سے ان کی عزت زمین کی طرف چل کر ساری مخلوق میں ڈال دی جاتی ہے اور لوگ بلا کسی قرابت داری اور رشتہ و نفع دنیوی کے اس کی محبت اپنی جان سے زیادہ کرنے لگتے ہیں اور خلق میں ان کی مقبولیت اور محبوبیت بڑھتی چلی جاتی ہے اور لوگوں میں ان کا احترام اور ان کی خدمت کا جذبہ بڑھتا چلا جاتا ہے تو یزدانی یعنی اللہ والا ہونے کا چرچہ و شہرت خود بخود حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ خلق ہوتا چلا جاتا ہے۔

حدیث پاک میں ریاکاروں کے لیے ایک اہم نصیحت

میرے دوستو! اس حدیث سے میں اپنے لیے اور ہم سب کے لیے ایک قیمتی خزانہ نکال کر پیش کرتا چلوں کہ اس میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ہر قدم پر اور ہر موڑ پر بس اپنے اللہ کو راضی و خوش کرنے کی فکر کرے۔ خواہ کتنا ہی خونِ تمنا اور خونِ آرزو کرنا پڑے، مگر کرتا چلا جائے۔ کتنے ہی مجاہدے اُٹھانے پڑے اُٹھاتا چلا جائے۔ ذاتِ باری تعالیٰ سے کچھ مخفی نہیں ہوتا جب اللہ کی نگاہوں میں محبوبیت ہو جائے گی تو اول تو ہمیں وہ کافی ہے، مگر اس کا یہ انعام و احسان اور فضل و کرم ہے کہ وہ اپنے محبوبوں کو اپنی خلق خاص کی نگاہوں میں بھی محبوب بنا دیتا ہے جس کے نتیجہ میں ان کے لیے آخرت کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ دنیا کا لطف و مزہ بھی مقدر ہو جاتا ہے۔ اور اس حدیث شریف سے ریاکاری اور شہرت طلبی اور خلق کی نگاہ میں اپنا مقام تلاش کرنا ان سب امور کا علاج ہے اور اس میں اخلاص کامل کی تعلیم ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ اور ہم اصل اپنے عمل کا ایک مقصد بنائیں اور وہ ہے رضائے خداوندی۔ باقی چیزیں حسبِ حال و مصلحت حق تعالیٰ خود عطا فرماتے ہیں۔

اور اس حدیث میں یہ سبق ہے کہ عزت زمین سے آسمان کی طرف نہیں چلتی بلکہ آسمان سے زمین کی طرف آتی ہے۔ یعنی اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی اور شریعت کی اتباع نہ کرتا ہو اور گناہوں میں مبتلا رہتا ہو،

مگر بظاہر لوگوں میں بہت پارسا اور نیک بن کر رہتا ہو اور مختلف اسباب و ذرائع سے اپنی عزت واحترام اور محبت و عظمت کو لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہو اور پھر یہ سب کر کے محبتِ خداوندی کے خواب بھی دیکھ رہا ہو تو یہ خواب اب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا ہے۔ بس وہ اپنے زعم میں بڑا بن کر رہے گا، لیکن اللہ کی نگاہوں میں اور مخلوق کی نظر میں وہ ذلیل و بے حیثیت کر دیا جاتا ہے۔

ہاں! اس کے برعکس کرنے سے اسے سب کچھ حاصل ہوتا ہے یعنی ظاہری طور پر اپنی عزت وعظمت کے لیے کوئی طریقے اختیار نہیں کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کوئی کام نہیں کرتا ہے بلکہ اس سے اپنے کو مکمل بچا کر رکھتا ہے تو یہ شخص عنداللہ تو محبوب ہو ہی گیا۔ لوگوں کے دلوں میں بھی اس کو معزز و مؤقر بنا دیا جاتا ہے۔

میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت کی وفات پر ایک ہندو کا قول

تو خلاصہ یہ کہ انسان کو ہر وقت یہ فکر کرنی چاہیے کہ میرا اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ چنانچہ مجھے اس پر اپنے شیخ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی نور اللہ مرقدہ کا قصہ یاد آیا کہ جب حضرت کا وصال ہوا تو ایک بات تو خود مجھ کو پیش آئی کہ میں دیوبند سے نانوتہ آیا تو جلال آباد کے لیے بس کے انتظار میں کھڑا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہندو مسلم سب اپنے کاروبار بند کر کے جلال آباد کی طرف رواں دواں ہیں اور لاکھوں کا مجمع اکھٹا ہو گیا اور وہ ہندو مجھ سے اپنی خاص اصطلاح میں حضرت والا سے غایت درجۂ محبت وعقیدت کا اظہار کرنے لگا اور حتیٰ کہ حضرت کی وفات کا اثر خود ان کے دلوں پر اتنا پڑا کہ انہوں نے اپنے مندر سے گائے جانے والی آواز کو بالکل آہستہ کر دیا بلکہ بعض حضرات نے یہاں تک بتایا کہ کئی دنوں تک انہوں نے اپنے مندر کے لاؤڈ اسپیکر کو سوگ کے طور پر بند رکھا۔

یہ وہ عزت ہے کہ جو اہل اللہ اور خاصانِ خدا کو اطراف عالم میں تمام مخلوق کے دل میں حاصل ہوتی ہے اور یہ درحقیقت ان سے اللہ کے راضی اور خوش ہونے کی اس دنیا میں ایک نشانی اور علامت ہے۔ جیسا کہ حکیم الامت نے فرمایا ہے اور قرآن کریم میں حق سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾

(سورۃ مریم، آیت: ۹۶)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ (ان کو علاوہ نعم مذکورہ اخرویہ کے دنیا میں نعمت دے گا کہ) ان کے لیے خلائق کے دل میں محبت پیدا کر دے گا۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خود مؤمنین صالحین میں آپس میں بھی الفت ومحبت ہو جاتی ہے۔ ایک نیک صالح آدمی دوسرے نیک آدمی سے مانوس ہو جاتا ہے اور دوسرے تمام لوگوں اور مخلوقات کے دلوں میں

بھی اللہ تعالیٰ ان کی محبت پیدا فرما دیتے ہیں اور تفسیر قرطبی کے حوالہ سے فرمایا کہ ہرم بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے پورے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کے دل اس کی طرف متوجہ فرما دیتے ہیں۔ (معارف القرآن، صفحہ:۵۹)

مؤمنین کے قلوب اللہ والوں کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں

اسی مضمون کی روایت حضرت تھانوی نے التکشف صفحہ ۳۸۳ مظہری میں بھی نقل فرمائی ہے کہ:

﴿وَمَا أَقْبَلَ عَبْدٌ بِقَلْبِهٖ إِلَى اللهِ إِلَّا جَعَلَ اللهُ قُلُوْبَ الْمُؤْمِنِيْنَ تَنْقَادُ إِلَيْهِ بِالْوُدِّ وَالرَّحْمَةِ وَكَانَ اللهُ إِلَيْهِ بِكُلِّ خَيْرٍ أَسْرَعَ﴾

(المعجم الکبیر للطبرانی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث طویل میں ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنے قلب سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے، مگر حق تعالیٰ اہلِ ایمان کے قلوب کو اس کی طرف محبت اور مہربانی کے ساتھ متوجہ اور مطیع کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر طرح کی خیر اس کی طرف جلدی پہنچاتے ہیں۔

میرے دوستو! اس لیے احقر عرض کرتا ہے کہ ہمیں اپنے اعلام کے ذریعہ لوگوں میں اپنا مقام بنانے اور اپنی شان وعزت ورفعت بڑھانے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تدریس وتقریر اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ لوگوں میں اپنے چمکانے کی سوچ وفکر پیدا کر کے اپنی خدمات کو ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر قدم پر تمام گناہوں سے پرہیز ہو۔ خواہ ایئرپورٹوں پر ہوں یا جہازوں میں یا بس اسٹاپ (Bus stop) پر ہوں یا پارکوں میں ہوں اور یا بازاروں اور مارکیٹوں میں ہوں، نظریں اُٹھنے نہ پائیں اور دل میں حرام لذت ومزے کا گذر نہ ہو اور رات ودن اللہ تعالیٰ کی رضا کی فکر ہو اور کسی کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ لوگ مدحت کریں یا مذمت اور ملامت کریں یا محبت سب سے بالاتر ہو کر اپنے مولیٰ کی رضاء کی دھن اور دھیان سوار ہو۔ اگر وہ اللہ راضی ہو گیا اور پھر ہمیں شہرت دے تو اور گمنام رکھے تو، مالدار کر دے تو، غریب رکھے تو، راحت و آرام دے تو، پریشانیوں میں رکھے تو۔ غرض یہ کہ وہ جس حال میں بھی رکھے تو بندہ کی شان یہ ہے کہ وہ اس پر راضی رہے۔

بعض اولیاء اللہ گمنام ہوتے ہیں

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی محبوب بندے اور بڑے مقرب اللہ والے ہیں مگر ان کی لوگوں میں شہرت نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ پاک کے اندر آیا ہے کہ اللہ کے بعض بندے اللہ کو بڑے پیارے ہوتے ہیں، مگر وہ بظاہر بالکل پراگندہ حال ہوتے ہیں لیکن اگر وہ اللہ پر کسی بات کے پورا ہونے کی قسم اُٹھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کرتے ہیں جس کے الفاظ ترمذی شریف سے حضرت تھانوی نے التکشف صفحہ ۳۶۷ پر یوں نقل

فرماتے ہیں کہ:

﴿عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمْ مِنْ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِيْ طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهُ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ مِنْهُمْ﴾

(سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب البراء بن مالک رضی اللہ عنہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہت سے بندگانِ خدا ایسے ہیں کہ بال بھی گرد آلود اور بدن بھی گرد آلود کیونکہ اتنا سامان نہیں کہ بال اور بدن کی خدمت کرسکیں، دو پرانی چادر والے کہ ایک باندھیں، ایک اوڑھیں اور کوئی ان کی ذرا بھی پرواہ نہ کرے، مگر رُتبہ اتنا بڑا کہ اگر خدا پر قسم کھا بیٹھیں اس طرح کہ واللہ خدا تعالیٰ یوں کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم سچی کردیں یعنی وہ کام اسی طرح کردیں۔ اور بعض روایت میں مدفوع بالابواب کا بھی ذکر ہے کہ ان کو دروازوں پر دھکے دیئے جاتے ہیں یعنی کوئی حیثیت نہیں دی جاتی ہے۔

مجدد تھانوی فرماتے ہیں کہ اغبر اشعث وغیرہ شرط نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض ناواقفوں کا زعم ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہ ہیئت منافی کمال نہیں ہے۔ جیسا کہ اہلِ کبر اس ہیئت کو حقیر سمجھتے ہیں تو احقر کا مدعا اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ بہت سے اللہ کے مقرب بندے ہیں اور اللہ ان کو گمنام رکھتے ہیں تو اس میں ان کی مصالح ہوتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں تو ہم پر اللہ تعالیٰ جیسا چاہے تصرف کریں اور ہر تصرف میں ضرور حکمت ہوگی۔ اللہ کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا ہے یہ محال ہے۔

میرے دوستو! اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ سے راضی ہوجانا یہ ایسی نعمت ہے کہ اگر یہ حاصل ہوجائے تو پھر سارے مسائل ٹھیک ہوتے چلے جاتے ہیں کیونکہ حدیث پاک میں حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص فکرِ آخرت کو اپنے اوپر سوار کرلیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی باقی دنیا کی ساری فکروں کی طرف سے کفالت فرمادیتے ہیں۔ اور پھر وہ اگر ظاہری فقر و فاقہ اور تنگی میں بھی ہوتا ہے، مگر وہ ایسی راحتِ قلبی اور سکون وچین سے جیتا ہے کہ دنیا بھر کے دولت والے بھی اس پر رشک کرتے ہیں کیونکہ دنیا و آخرت کا چین و سکون اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی رضا کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی اور اونچی نعمت انسان کے لیے رضائے الٰہی ہے اور سنت اللہ یہی ہے کہ ایسے لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ مخلوق کے اندر بھی ایسا مقام و عزت عطا فرماتے ہیں کہ ہر انسان اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

صحبت شیخ کامل گرچہ حاصل مگر فسق سے ہے دور منزل

شیخ کامل سے جو ہے مستغنی
پائے گا کیسے ظل رحمانی
فسق کرتا ہے دور منزل سے
پیر تیرا ہو گرچہ لاثانی

حضرت والا نے ان اشعار میں اپنے بزرگوں اور اکابر اہل اللہ کے اس مسلک کو پیش کیا ہے کہ جس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط ہے بلکہ بالکل اعتدال پر مبنی ہے۔ جہاں ایک طرف شیخِ کامل اور مرشد دینی کی ضرورت بڑی قوت سے اپنے خصوصی انداز میں پیش فرمائی ہے وہیں دوسری جانب انسان کے اپنے تقویٰ و طہارت کو قربِ خداوندی کے حصول کی اصل بنیاد اور کنجی قرار دیا ہے۔ اس لیے دونوں جانب کا لحاظ و خیال پیش نظر رکھا ہے۔ جیسا کہ احقر نے ایک مقام پر حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کے معارف القرآن، جلد: ۲، صفحہ: ۶۱۹ سے دونوں طبقوں کی گمراہی اور افراط و تفریط کو خود حضرت مفتی صاحب کے الفاظ میں پیش کیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں کہ جو لوگ اہل اللہ اور مشائخ اہلِ حق میں سے کسی کو اپنا مرشد و شیخ نہیں بناتے اور ان سے مستغنی بے نیاز ہو کر زندگی گذارتے ہیں، ان پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے علوم و معارف اور اسرار و رموز کا دروازہ نہیں کھلتا ہے اور وہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ کا مظہر نہیں بن پاتے یعنی بالفاظ دیگر ان کی اصلاح مرشد تھانوی کی تعبیر میں ناممکن ہے اور محال ہے۔ اس لیے مولانا رومی نے فرمایا کہ ؎

قال را بگذار مردِ حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

احقر نے دوسری مختلف جگہوں پر اسی مسئلہ پر تفصیلی کلام کیا ہے اور شیخِ کامل سے تعلق کی ضرورت و اہمیت پر بفضلہٖ تعالیٰ روشنی ڈالی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کو قدرت ہے کہ بغیر شیخ کے اصلاح کر دے مگر سنت اللہ یہی جاری ہے کہ کتاب اللہ کے لیے رجال اللہ بھیجے گئے اور پھر قوموں میں رشد و ہدایت پھیلی ہے۔ جیسا کہ بغیر ماں و باپ اللہ تعالیٰ انسان کے پیدا کرنے پر قادر ہیں، مگر سنت اللہ یہی ہے کہ مرد و عورت کے جوڑے سے اولاد وجود میں آتی ہے۔ اب دوسرا پہلو جو حضرت نے پیش کیا ہے کہ اگر کوئی کیسے ہی بڑے پیر و مرشد سے جوڑا ہوا ہے لیکن اگر خود ہمت کر کے گناہوں سے نہیں بچتا ہے، نظر بازی اور عشق حرام میں اِدھر اُدھر لگا پھرتا ہے تو پھر وہ اپنی منزل سے قریب ہونے کے بجائے دور ہی ہوتا چلا جائے گا اور اسے قربِ خدا کی منزل تک رسائی نہ ہو سکے گی اور ایسا انسان خواہ کتنا ہی قریب رہے مگر حقیقت میں یہ دور ہے۔

یہ وہ نظریہ ہے کہ جو تصوف کی حقانیت کو ثابت کرتا ہے اور جو کہ بالکل عین قرآن وسنت پر مبنی ہے کہ اصل انسان کا اپنا کیا ہوا عمل و کوشش اور استعمال ہمتِ تقویٰ ہے ورنہ تباہی و بربادی سے کوئی انسان نہیں بچا سکتا ہے۔ خواہ وہ اپنے وقت کا کتنا بڑا ولی اللہ ہو۔ بالکل واضح بات ہے کہ اگر کوئی انسان بڑے ماہر ڈاکٹر اور طبیب کے ہسپتال میں داخل ہو اور بالکل ڈاکٹر کے پاس رہتا ہو لیکن ڈاکٹر کی دوائی کو نہ تو پورے طور پر استعمال کرتا ہے اور نہ جو پرہیز ڈاکٹر نے تجویز کیا ہے اس پر بالکل عمل کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا مریض جلد ہی اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کو دعوت دے دے گا اور اس کو ہلاکت سے کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ اس تصوف صحیح کے مقابلہ میں عجم میں کچھ ایسا تصوف ایجاد ہوا اور اس کے ماننے والے آج بھی دنیا بھر میں بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ جن کا نظریہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، بس اگر ہمارا پیر بڑا ہو تو پھر نہ ہمیں نمازوں کی ضرورت ہے اور نہ روزوں کی اور نہ دوسری چیزوں کی بلکہ ان تمام چیزوں کے لیے آخرت میں ہمارے پیر صاحب کافی ہوں گے۔

تصوفِ حق اور تصوفِ باطل پر ایک نظر

یہی وہ تصوف باطل اور مخترع و مبتدع یعنی نئی ایجاد ہے کہ جس نے عربوں کو مطلقاً تصوف اور علمائے اہلِ تصوف سے بدظن کر دیا ہے ورنہ بحمد اللہ ہمارا یہ تصوف جس کی تعبیر آپ تزکیۂ نفس سے کریں یا اصلاحِ نفس سے، زہد سے کریں یا احسان سے تصحیح نیت سے کریں یا تصفیۂ اخلاق سے حقیقت سب کی ایک ہی ہے اور اسی لیے حکیم الامت مجدد الملت جیسا عالمِ ربانی اس راہ... کھڑا نظر آتا ہے اور مجدد تھانوی رحمہ اللہ نے بڑے واضح اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جو چیز قرآن وسنت میں نہ ہو وہ تصوف نہیں ہے، بلکہ وہ سراسر وہ بدعت ہے، گمراہی و بے دینی ہے۔

چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی کتاب التکشف عن مہمات التصوف اس موضوع پر خاص اہم تالیف ہے کہ جس کے اندر تصوف کے جملہ مسائل کو احادیث شریفہ سے ثابت کیا ہے اور جو بات خانقاہوں یا بزرگوں کے متبعین میں خلافِ سنت و شریعت رائج ہے اس پر بالکل دوٹوک انداز میں رد اور نکیر کی ہے اور اس پر کسی کی کوئی پرواہ نہیں کی اور یہی اہلِ حق علماء کی شان ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم بحمد اللہ بڑے انشراحِ صدر اور قلبی بصیرت کے ساتھ تصوف و طریقت کے حق ہونے کو مانتے ہیں اور ان مبارک سلسلوں میں الحاق کو ہمارے اکابر علماء اصلاح و تزکیہ کے لیے اور احسانی کیفیات کے حصول کے لیے بہت مؤثر اور اہم سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کی تلقین کی جاتی ہے اور آج تک یہ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ان سلسلوں میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے اندر تقویٰ و نیکی اور اتباعِ سنت و شریعت کے جذبات دوسروں کی بنسبت کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔

رہ گیا وہ تصوف باطل جو سراسر بے دینی ہے، اس سے ہم کلی طور پر براءت کا اعلان کرتے ہیں اور بزرگوں اور اولیاء اللہ کے متعلق صرف اتنی عظمت واحترام کو صحیح سمجھتے ہیں کہ جو قرآن وسنت سے ثابت ہے اور اس سے آگے

شرک و بدعت اور گمراہی قرار دیتے ہیں۔

واقعۂ تصوف باطل

جیسے اس کو آپ کے سامنے ایک قصہ سے سمجھاتا ہوں۔ یہاں جنوبی افریقہ میں میرے ایک دوست ہیں وہ ایک بستی میں گئے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بعض ان کے خاندانی افراد بھی تھے، مگر ان کا تعلق اہلِ بدعت سے تھا تو جب عصر کی نماز کا وقت ہوا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ چلو اب عصر کی نماز کا وقت ہے تو ان میں سے ایک بولے کہ ارے تم ہمارے پیر کی شان میں کیسی گستاخی کررہے ہو، ابھی ہم اپنے پیر کی مجلس میں ہیں اور جب ہم اپنے پیر کی مجلس میں ہوتے ہیں تو ان کی طرف ایک نظر بھر کر دیکھنا تمہاری ہزاروں نمازوں سے بہتر ہے تو اسپر پیر صاحب نے ان کو دیکھا اور مسکرائے اور کچھ نہ بولے تو یہ صاحب جو اہلِ حق میں سے تھے وہاں سے اُٹھے اور گھر سے باہر نکل کر نماز کے لیے گئے تو ایک صاحب گھر سے باہر نکل کر ان سے کہنے لگے کہ آج تم نے ہمارے پیر کے بارے میں بڑی گستاخی کی ہے، خبردار! آئندہ ایسا نہ کرنا۔

مگر جب انہوں نے یہ پوچھا کہ تم نماز نہیں پڑھو گے تو قبر وحشر میں کیا جواب دو گے؟ تو وہ فوراً برجستہ بولے کہ ارے میاں وہاں جواب دینے کے لیے تو ہمارے پیر موجود ہوں گے اور ہمارے پیر بڑے پاورفل (Powerfull) ہیں۔ ہماری طرف سے یہ جوابات دیں گے، ہم کو وہاں کوئی پریشانی نہیں ہونے دیں گے، اس لیے ہمیں دنیا میں اس کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ العیاذ باللہ من ذالک.

یہ محض ایک واقعہ پیش کیا گیا ہے تا کہ باطل اور مخترع تصوف با آسانی سمجھ میں آجائے ورنہ اس نوع کے واقعات بڑی کثرت سے ہیں۔ ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور مقصود بھی نہیں ہے۔ میں تو اصل میں یہ عرض کررہا تھا کہ اگر مرید گناہوں میں مبتلا رہے اور خود کچھ کرنے کو تیار نہ ہو تو پھر خواہ کیسا ہی پیر ہو وہ شخص کبھی منزلِ قربِ خداوندی کو نہیں پہنچ سکتا ہے، اور نہ ہی اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

نسبت مفید ہے مگر کافی نہیں

یہ تو اولیاء اللہ و مشائخ تصوف کی بات ہورہی ہے۔ خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ **وانذر عشیرتک الاقربین** تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ التکشف صفحہ ۴۱۸ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَمَّا نَزَلَ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ دَعَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُرَیْشًا الحدیث وَفِیْہِ یَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِیْ نَفْسَکِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ لَا اَمْلِکُ لَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص: ۴۵۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ''وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ'' اپنے

قریب والے خاندان کو عذابِ الٰہی سے ڈراؤ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو پکارا اور جمع کیا اور اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہ کو فرمایا: اے فاطمہ! اپنے کو دوزخ سے بچاؤ کیونکہ میں تم کو اللہ تعالیٰ سے بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا ہوں۔

اصلاحِ عدم غرور بشرف نسبت بعضوں کو یہ ناز ہوتا ہے کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد میں ہیں یا فلاں خاندان میں بیعت ہیں اور اس بنا پر اصلاح عقائد و اعمال سے بالکل بےفکر ہو جاتے ہیں۔ اس دعویٰ اور ناز کی اس حدیث سے جڑ کٹتی ہے۔ (التکشف، صفحہ: ۴۵۲، مظہری)

یہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے الفاظ ہیں جس سے صاف طور پر حضرت والا کے اس شعر کا مطلب و مفہوم اس آیت و حدیث سے مدلل ہو گیا کہ محض پیرو شیخ بڑا ہونا کافی نہیں ہے، اصل چیز اپنا عمل ہے۔

اس حدیث شریف کا تعلق انکارِ شفاعت سے نہیں ہے بلکہ وہ اپنی جگہ پر احادیث سے ثابت ہے اور انبیاء وعلماء وشہداء وحفاظ کی شفاعت کا مفہوم مختلف دوسری احادیث سے ثابت ہے بلکہ منشاء یہ ہے کہ ان نسبتوں پر اعتماد کر کے اپنے آپ کو گناہوں میں لگائے رکھنا اور دین کی محنت وجدوجہد سے الگ رہنا یہ قطعاً درست نہیں ہے۔ اس طرح کے خیالات کی اس حدیث سے جڑ کٹ جاتی ہے۔

شیخ سے قرب جسمانی کے ساتھ اصل تعلیمات کی اتباع ہے

حکیم الامت مجدد تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا ہے اور بڑی عجیب بات فرمائی ہے کہ جو میرا تعلق والا اور مجھ سے محبت رکھنے والا، میری تعلیمات پر عمل پیرا ہو گا اگرچہ وہ مجھ سے دور ہو لیکن وہ حقیقی طور پر مجھ سے قریب ہے اور جو میرے نزدیک رہ کر میری تعلیمات پر عمل نہیں کرتا ہے تو وہ باوجود میرے قریب رہنے کے اپنے کو مجھ سے دور سمجھے۔

میرے دوستو! حضرت والا کے اس شعر اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ملفوظ میں ہم سب کے لیے بڑی عبرت اور نصیحت ہے کہ جو ہم لوگ یہاں خانقاہ میں رہ کر وقت گذارتے ہیں اور بظاہر جسمانی طور پر ہم حضرت سے قریب ہیں لیکن اصل حضرت سے نزدیکی والا اور پاس رہنے والا وہ ہے جو حضرت والا کی درد بھری ہوئی محبت خداوندی سے لبریز تعلیمات پر عمل پیرا ہو اور ان تعلیمات کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہو ورنہ صحبت کی حقیقی منفعت اور اصل خانقاہ میں وقت گزارنے کے مقاصد سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے بلاوجہ ایک دوسرے سے تعلقات اور دوستیاں بڑھانا اور پھر رات گئے دیر تک بیٹھے اِدھر اُدھر کی بےمقصد باتیں کرتے رہنا اور صبح کو اُٹھنے کا اہتمام نہ رکھنا اور لایعنی امور سے اجتناب و پرہیز نہ کرنا، باہر نکلیں تو بقصدِ حفاظتِ نظر اپنی نظروں کے بچانے کا اہتمام نہ کرنا یہ سب امور ہیں جو ہمیں منزل سے دور کرنے والے ہیں۔

الحمدللہ تحدیثِ نعمت خداوندی کے طور پر اس شعر کے ضمن میں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ بعض امورِ تربیت واصلاح میں حضرت والا کا انداز بظاہر احقر کے ناقص علم کے مطابق بالکل لاثانی اور بے نظیر ہے۔ جیسا کہ اس سلسلہ میں بہت سے ایسے حضرات علماء سے بھی احقر نے سنا کہ جو باقاعدہ طور پر حضرت والا سے کوئی اصلاحی تعلق کا سلسلہ نہیں رکھتے جیسے مثلاً اللہ تبارک وتعالیٰ کے عشق ومحبت کو اپنے بے مثال انداز اور خاص طریق سے پیش کرنا اور اس پر مرتب ہونے والے انعاماتِ خداوندی کو عجیب عجیب مثالوں سے بڑے مؤثر اور دلنشین انداز میں بیان کرنا یہ حضرت والا کا خاص امتیازی انداز ہے اور عشقِ مجازی یعنی فسق کو عشقِ حقیقی میں بدلنا اور اوّل کی بُرائی اور گندگی اور ثانی کی لذت وحلاوت کو دل میں اُتار دینا یہ خاص عطائے الٰہی ہے۔ اس لیے تائب صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ ؎

کب کہا کہ یہ دنیا اہلِ دل سے خالی ہے
لیکن اپنے مرشد کی بات ہی نرالی ہے

اور حضرت مولانا منصور الحق صاحب کا شعر ؎

میرے پیارے مرشد سے ملنے سے پہلے
کیا کرتے تھے جو شقاوت کی باتیں
میرے پیارے مرشد سے ملنے کے بعد
اب کیا کرتے ہیں وہ سعادت کی باتیں

حضرت والا کے فیض کی تاثیر مثل اپنے مرشد کے ہے

فیضِ مرشد کی یہ کرامت ہے
کوئی رومی ہے کوئی خاقانی

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ اپنے مرشد کے فیض صحبت کو پیش فرمارہے ہیں کہ میرے مرشد کی صحبت سے مختلف بزرگ اور اولیاء اللہ پیدا ہوتے ہیں، کوئی رومی ہوتا ہے تو کوئی خاقانی اور کوئی رازی ہوتا ہے تو کوئی غزالی بن کر سامنے آتا ہے۔

اور احقر بحمد اللہ تعالیٰ یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کو وہی انداز عطا فرمایا ہے کہ جو مولانا رومی کا تھا اور وہی دردِ محبت اور وہی سوزِ عشق اور وہی آنسو بہانے والی آنکھیں عطا فرمائی ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ حضرت مفتی حسین بھیات نے جب حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کو حضرت والا کی معارفِ مثنوی دکھلائی تو حضرت بنوری نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ لَا فَرْقَ بَینَہٗ وَبَیْنَ مَوْلَانَا رُوْم اسی لیے

حضرت والا کو رومیٔ عصر کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا اور حضرت مولانا رومی اس اُمت کے ایسے ولی اللہ گذرے ہیں کہ جن کو سارے اولیاء اللہ خدا تعالیٰ کا بڑا عاشق تسلیم کرتے ہیں اور اسی لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت تھانوی و نانوتوی وغیرہ رحمہم اللہ باقاعدہ طور پر اس کا درس دیا کرتے تھے اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی تو فرمایا کرتے تھے کہ اول درجہ پر قرآن اور پھر بخاری شریف اور پھر مثنوی شریف یعنی جامعیت وعلوم وکمالات میں یہ درجہ بتایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ تینوں کتابیں الہامی ہیں۔

یقینی طور پر کسی کی ولایت کا قائل ہونا جائز نہیں

یہاں پر ایک اہم بات حضرت والا کے سامنے اپنی اصلاح کے لیے عرض کرتا چلوں کہ کسی بھی انسان کو دوسرے انسان کے متعلق حتمی طور پر اس کے درجہ اور فضیلت کی بات کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿عن ابی بکرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان مادحا اخاہ فلیقل احسب فلانا واللہ حسیبہ ولا یزکی علی اللہ احدا احسب فلانا کذا وکذا ان کان یعلم منہ ذلک

اخرجہ الشیخان وابو داؤد﴾

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو اپنے مسلمان بھائی کی ضرور ہی تعریف کرنی ہو تو اس طرح کہنا چاہیے کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ہے، آگے خدا کافی جاننے والا ہے اور خدا کے نزدیک کسی کے پاک ہونے کا دعویٰ نہ کرے اور یہ جو کہے گا کہ فلاں شخص میرے گمان میں ایسا ایسا ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ شخص ایسا ہو ورنہ اس عنوان سے بھی مدح جائز نہیں۔ (روایت کیا اس کو بخاری ومسلم وابوداؤد نے)

اصلاحِ ترکِ جزم بولایت کسے حدیث کے عموم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو بدون نص محض گمان سے ولی قطعاً کہنا جائز نہیں۔ جیسا کہ اکثر کو اس میں بے احتیاطی ہے۔ البتہ اگر ظناً کہہ دے تو مضائقہ نہیں اور بہتر یہ ہے کہ اس ظنیت کی تصریح بھی کردے لیکن اگر اعتماداً علی قرینۃ المقام والکلام تصریح نہ بھی کرے تب بھی مضائقہ نہیں۔ ہاں شیخ کہنا کسی کو جزم سے بھی جائز ہے کیونکہ مشیخت امر مشاہد ہے یعنی طریقِ تربیت کا جاننا بخلاف ولایت کے کہ امر غیبی ہے یعنی مقبول عند اللہ ہونا۔ (التکشف، صفحہ:۳۸۶)

یہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی عبارت ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ حتمی طور پر کسی کے ولایت کی بات اور اس کے عند اللہ مقام ومرتبہ کی بات صرف نبی کو معلوم ہوسکتی ہے اور اب نبوت کا سلسلہ ختم ہے تو اب اس کے علم کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہاں صرف ظن غالب اور گمان قائم کیا جاسکتا ہے اور اسی بات کو ظن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے۔

تو اب سوال یہ ہے کہ آج کل جو عموماً اس میں بے احتیاطی ہوتی ہے اور خود مذکورہ شعر میں جو رومی وخاقانی

کہا جارہا ہے تو اسطرح قطعی طور پر گویا کہ ولایت کا فیصلہ کرنا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو رومی و خاقانی کے ساتھ تشبیہ دینا ان بعض امور کے اعتبار سے ہے جو کہ ان بزرگوں کو حاصل تھے اور یہ امر محسوس و مشاہد ہے تو اس لیے یہ تو جائز ہوگا اور ثانیاً یہ عرض ہے کہ یہ کلام ظنیت پر ہی محمول ہے۔ اس میں قطعیت مراد ہوتی ہی نہیں۔ ہاں بس اتنی بات ضرور ہے کہ افضل اور اچھا ہے کہ ظنیت کی تصریح کردی جائے۔

چنانچہ حضرت والا کے ایک وعظ میں احقر نے خود سنا کہ فرمایا کہ میرے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ جن کو لوگ ولی گمان کرتے ہیں اور ہمارا بھی یہی گمان ہے۔ اس طرح نام لے کر تذکرہ کیا ہے تو اس لیے کسی ایک مقام پر آئی ہوئی بات کی تشریح و توضیح متکلم کے دوسرے کلام کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

اسی لیے جو لوگ اپنے اپنے مشائخ کے بارے میں بے احتیاطی سے عجیب عجیب خیالات قائم کر لیتے ہیں اور بسا اوقات زبان سے کہتے بھی ہیں، یہ سب بالکل غلط ہیں۔

جیسے ایک مجلس میں ایک بار بعض حضرات کہہ رہے تھے کہ ہمارے حضرت باقی موجودہ حضرات مشائخ سے بازی لے گئے ہیں اور سب سے بڑھ گئے ہیں تو احقر نے اس پر عرض کیا کہ مجھے اس میں کچھ لقمہ ہے اور کچھ کہنا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا ہے؟ تو احقر نے عرض کیا کہ مقامات و درجات کا علم اور مراتب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور ہم سے مخفی ہے اور احقر نے فوراً حدیث پاک سنائی اور یہی مضمون پیش کیا تو ماشاء اللہ سب چونکہ اہلِ حق تھے اس لیے خاموش ہوگئے اور اس طرح احقر کی اس رائے کو قبول کرلیا اور قطعی طور پر کسی کے متعلق ولایت کی بات از روئے شرع درست نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

البتہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ میرے نفع کے لیے، میرے لیے علم کی حد تک میرے شیخ سے بڑھ کر میرے لیے کوئی نہیں ہے۔ جیسا کہ احقر نے دوسرے مقام پر حضرت گنگوہی کا یہی ملفوظ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کے متعلق تحریر کیا ہے۔

عارف تو اپنی مستیٔ قلب میں مست رہتا ہے

حضرت والا نے بڑی اونچی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت اور قرب کا مزہ اور لطف ایسا ہے کہ انسان کو اس کے ماسوا سے بالکل مستغنی اور بے نیاز کردیتا ہے اور جو لوگ اِدھر اُدھر کی چیزوں میں پڑے رہتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے اللہ کی معرفت و قرب حاصل ہے، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کی لذت کو بالکل نہیں چکھا ورنہ دل میں اِدھر اُدھر کی چیزوں کا گذر بھی نہ ہوتا۔ جیسا کہ حضرت والا نے ایک

دوسرے مقام پر اسی کو یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

کیسے سمجھ لوں پاگیا وہ جامِ معرفت
رکھتا ہے خود کو جو بھی نمایاں کیے ہوئے
رکھتا ہے مجھ کو مست خزانہ یہ قلب کا
ہوں دفن اپنے دل میں کچھ ارماں کیے ہوئے

یعنی خدا کا سچا عاشق تو اپنے اللہ کی محبت کے درد میں مست رہتا ہے اسے تو دوسری چیزوں کا خیال بھی دل میں نہیں گذرتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کی محبت اور ایمان کا سودا ساری کائنات کے عوض بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اہل اللہ نے اس بات کو بارہا فرمایا اور لکھا ہے کہ اگر سلاطینِ دنیا کو یہ پتہ چل جائے کہ ان خدا کے عاشقوں کو قربِ خداوندی میں کیا لذت اور مزہ مل رہا ہے تو یہ لوگ بادشاہوں سے لڑائی لڑنے کی جگہ میں ان اولیاء سے جنگ پر اُتر جائیں۔

جامِ عرفانی نصیب ہو تو جینے کی حلاوت ہے

کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں
جس کو ملتا ہے جامِ عرفانی

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب انسان کے اندر تین باتیں پیدا ہو جائیں تو پھر اس کو ایمان کی حلاوت و مٹھاس نصیب ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس حلاوت ایمانی کا محل اور مورد قلب ہے اور دل ہی حاکمِ بدن ہے جب اس کو حلاوت ایمانی اور جامِ عرفانی ملے گا تو پھر بدن کے رگ ریشہ اور روئیں روئیں میں ایک نور اور روشنی اور حلاوت و مٹھاس محسوس ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ مَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ اِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ كَرِهَ اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّنْقَذَ فِي النَّارِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان)

تین باتیں جس شخص میں ہوں گی اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہوگی (یعنی وہ واجد ہوگا اور ایمانی حلویٰ اس کے قلب میں موجود ہوگا محض تشبیہ و تخیل کے طور پر نہیں) اوّل یہ کہ انسان جب کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے اور دوسرے یہ کہ اللہ و رسول اس کو باقی تمام چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہو جائیں اور جو کفر میں لوٹنا اس قدر ناگوار رکھتا ہو جیسا کہ آگ میں ڈالا جانا ناگوار ہوتا ہے۔

جس شخص میں یہ تین باتیں پیدا ہو جائیں تو اس کو ایمانی حلاوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو حضرت والا فرماتے ہیں کہ جسے اللہ کی معرفت مل جاتی ہے تو پھر اس کو جینے میں یہ مٹھاس اور حلاوت نصیب ہو جاتی ہے۔

اس لیے ہمارے دارالعلوم آزادول میں حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی نے دومرتبہ میری موجودگی میں اپنے بیان میں یہ بات ارشادفرمائی کہ جس کی عربی عبارت کچھ یوں ہے جس کو احقر نے یہاں خانقاہ میں حضرت مولانا مکی دامت برکاتہم سے ایک باران کی آمد کے موقع پر دریافت فرمایا تو حضرت نے ارشادفرمایا کہ اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ:

﴿يُغَادِرُ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ الدُّنْيَا وَلَمْ يَذُوْقُوْا اَلَذَّ مَا فِيْهَا فَسَأَلَ سَائِلٌ وَمَا ذَاكَ يَا ابْنَ الْمُبَارَكِ قَالَ مَعْرِفَةُ اللهِ﴾

حضرت عبداللہ ابن المبارک نے بڑی حسرت سے فرمایا افسوس کہ لوگ دنیا میں آئے اور مرکر چلے گئے مگر دنیا کی جو سب سے زیادہ قیمتی اور لذیذ چیز تھی اور سب سے زیادہ حلاوت ولذت والی دولت تھی اس کو چکھے بغیر مر گئے تو کسی نے پوچھا وہ کیا نعمت ودولت تھی تو فرمایا کہ وہ اللہ کی معرفت اور اللہ کی محبت وقرب کی حلاوت ولذت تھی جس کے سامنے ساری لذات عالم ہیچ ہیں۔

خاص مضمون عطائے الٰہی ہے

میرے دوستو! ایک مضمون فضلِ الٰہی اور حضرت والا کی توجہ اور سامعین وحاضرین کی طلب صادق کی برکت سے پیش کرتا ہوں اور اس کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مثال ذہن میں ڈالی ہے کہ دیکھئے گاڑی اور جہاز و ٹرین اور دوسری سواریاں ہیں، ان کے پارٹس (Parts) اور پُرزے ہیں ان سے مل کر گاڑی چلتی ہے اور اگر کسی پرزے میں کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو گاڑی کا نظام ٹھیک نہیں رہتا ہے اور وہ جس مقصد کے لیے آپ نے خریدی تھی اس مقصد میں یا تو بالکل بے کار ہوجائے گی اور یا پھر پورے طور پر کارآمد نہ رہے گی۔ اس کے بگاڑ اور فساد کے مطابق اس کے مقصد کی تکمیل میں خلل واقع ہوجائے گا۔

بس ٹھیک اسی طرح قرآن وسنت کی روشنی میں احقر عرض کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس انسان کے بدن کو چند اعضاء وپرزوں سے بنایا ہے اور ہر عضو کے لیے ایک مقصد متعین کیا ہے اور اسی مقصد کی تکمیل اور پورے طور پر اسے حاصل کرنے کے لیے اس عضو کو اس کے خالق وصانع کے اصول کے مطابق استعمال کرنا ضروری ہے اور اس کو اس کی صحیح غذا دینا اور اس کے مخالف اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ پھر وہ عضو حقیقی طور پر بے کار اور فاسد کہلائے گا۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ اپنا کام کررہا ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جابجا یہ مضمون آیا ہے کہ جس میں ایمان نہیں ہے وہ مردہ ہے اور جس کے عقل وفہم اور سمع وبصر دین کے سمجھنے اور ایمان لانے کے لیے دلائل انفس ودلائل آفاق میں غور کرنے سے قاصر ہیں اور وہ ان کو اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرتے ہیں تو قرآن ان کو بے عقل اور صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ قرار دیتا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان دلوں سے کچھ سمجھتے نہیں ہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور ان کے کان

ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔

تو درحقیقت یہ نفی اسی اعتبار سے کی جارہی ہے کہ ان اعضاء کا جو مقصد تھا انہوں نے اس کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اس کے خلاف میں استعمال کیا تو اس اعتبار سے یہ اعضاء بے کار ہوگئے۔

تو اس لیے جب دل کو دل کی غذا نہیں ملے گی تو پھر یہ دل زندہ نہ رہے گا بلکہ مردہ ہوجائے گا اور انسان کی گاڑی پورے جسم والی سکون واطمینان سے چلنے کے بجائے اس میں خلل پڑے گا اور وہ بے چین واضطراب کا شکار ہوگا کیونکہ بدن کے اعضاء کا غلط استعمال شروع کردیا تو گویا یہ مشین صحیح رُخ پر کام کرنا بند کردے گی اور آج پوری انسانیت کے بگاڑ کا یہی سبب ہے ورنہ ہم پورے بدن کو بالکل اس مقصد میں استعمال کرنا شروع کردیں کہ جس کے لیے اس کا ہر عضو بنا ہے تو پھر پورا بدن اور قلب ودماغ سب کچھ سکون سے رہیں گے اور یہ انسانی گاڑی اپنے مقصد حقیقی کی طرف تیزی تیزی سے رواں دواں رہے گی اور دنیا وآخرت کی راحتیں ضرور بضرور اس کو مل کر رہیں گی۔ اور جس کو دنیا میں جامِ معرفت نہیں ملا ہے وہ اپنے مقصدِ حیات ہی میں ناکام اور نامراد ہے۔

اسی لیے انسان کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت وعبادت ہے اور انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ دنیا میں آنے کے بعد ساری چیزوں کو جانتا ہو لیکن اللہ کو نہ جانے اگر اس سے پوچھو کہ تمہارا مکان، گاڑی، سیل فون، کمپیوٹر، تجارت، زراعت، صنعت وحرفت کیا ان امور کو تم جانتے ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ان سب سے واقف ہوگا اور بعض میں ماہر ہوگا اور دنیا کی مختلف لائنوں اور میدانوں میں اس کو بڑی مہارت حاصل ہوگی اور اسی کو وہ اپنا مقصدِ حیات اور زندگی کا قیمتی خزانہ سمجھے بیٹھا ہوتا ہے اور بظاہر اس کی حالت اس حقیقت کی ترجمانی ہوتی ہے کہ شاید اب اسے کبھی موت آکر یہ ساری عیش وعشرت اس سے ختم ہونے والی نہیں ہے اور اس کو اس میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے، مگر افسوس صد افسوس یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں کوئی نہ رہ سکا، بڑے بڑے بادشاہ وسلاطین اور بڑے تخت وتاج والے سب زیرِ زمین چلے گئے۔

اے انسان! تو نے سب کو پہچانا، مگر اس اللہ کو نہ پہچانا کہ جن کے امر وحکم سے تو انسان بنا اور جس کے امر وحکم سے پھر مٹی کا ڈھیر ہوکر اسی کی طرف لوٹ کر جائے گا۔ اگر اس کو پہچانتا تو خوشی خوشی اس آقا ورب، اپنے محبوب کی طرف نفسِ مطمئنہ لے کر جنت کی نعمتوں اور رضا دائمی کے تحفہ سے مالا مال ہوجاتا۔

دلِ شکستہ میں جام ومینا کی فراوانی

میر میرے دل شکستہ میں
جام و مینا کی ہے فراوانی

میر حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے خادم خاص حضرت مولانا عشرت جمیل صاحب دامت برکاتہم کا

لقب ہے اور حضرت والا جب اس سے مخاطب کرتے ہیں تو اسے مراد و مقصود صرف حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت ہر شخص ہی مخاطب ہوتا ہے، مگر یہ خاص اندازِ کلام حضرت والا کا ہے۔ زیادتی قرب وزیادتی تعلق کی بنیاد پر ان کو مخاطب بناتے ہیں۔ تو حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے بفضلہٖ تعالیٰ اپنی بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کیا ہے اور اس کی وجہ سے میرا دل چورا چورا ہو جاتا تھا، مگر چونکہ یہ سب رضاءِ الٰہی کے سبب تھا تو اس لیے مجھے اپنے اس دل کو توڑنا گوارا تھا حق تعالیٰ کے لیے جب کوئی دل کو توڑتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ خود اپنے محبت و عشق کے خزانوں سے اس دل کی تعمیر کرتے ہیں اور اسے اپنے قابل بنا کر اس کے مہمان ہوتے ہیں ؎

تیرے ہاتھ سے زیرِ تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

یہ حضرت والا دامت برکاتہم ہی کا شعر ہے کہ مجھے اپنی ظاہری ویرانیاں مبارک ہیں اور میں ان پر خوش ہوں کیونکہ ان ویرانیوں کے نتیجہ میں جو آبادکاریاں ہوتی ہیں وہ پروردگار کے ہاتھ سے ہوتی ہیں اور پھر وہ ایسا عالی شان محل بنتا ہے جس کا مہمان خود اللہ ہوتا ہے جس کو حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں کہ ؎

در دل مؤمن بگنجیدم چوں ضیف

کہ میں مؤمن کے دل میں مہمان کی طرح سما جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھئے کہ حرام آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کرنا پڑتا ہے اور عیش و عشرت کو پامال کر کے اللہ کے راستوں کی کڑواہٹوں اور تلخیوں کو چکھنا پڑتا ہے۔

بزمِ عارف کی مستی و جولانی

رنگ دیکھو تو بزمِ عارف کا
کیسی مستی ہے کیسی جولانی

اللہ والوں کی محفلیں اور مجالس چونکہ ذکر اللہ پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان میں خداوند قدوس کے کلام اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے تذکرے ہوتے ہیں اور اللہ کی عظمت و محبت کی بات کی جاتی ہے، اس لیے وہاں بیٹھنے والوں پر اس اللہ والے کے قلب پر القاء ہونے والے علوم و معارف کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ فیاضِ حقیقی کی طرف سے اور فیضانِ انوارِ محبت و معرفت ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے سب شرکائے مجلس پر عجیب سرور و نشاط اور عجیب کیف چھایا ہوا ہوتا ہے اور وہ اپنے اس کیف ولذت میں مست رہتے ہیں اور دنیادار جن لذتوں میں پڑے ہوتے ہیں وہ ان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں اور اس کا ثبوت حدیث پاک کے اس مفہوم سے ہے کہ جن محفلوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کو ڈھانپ لیتی ہے خصوصی رحمت اور سکینہ نازل ہوتا ہے اور فرشتے چاروں طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں تو اللہ والوں کی محفلوں کا رنگ ڈھنگ عام دنیاداروں یا

عام علماء وفضلاء کی محفلوں کی طرح نہیں ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم بحمد اللہ خود اس مجلس میں حضرت والا پر علوم وفیض کی جو جولانی اور بارش ہوتی رہتی ہے اور جس طرح وجس انداز میں ہمحضرات اللہ کی محبت کی شراب سے مست رہتے ہیں اور حاضرین کو مست رکھتے ہیں وہ بالکل نا قابلِ بیان کیفیت ہے جس کا خود تجربہ کر کے دیکھنے سے تعلق ہے۔ اسی لیے اس کی کچھ جھلک حضرت کی کتابوں میں لوگ دیکھ دیکھ کر دنیا بھر سے دیوانہ وار چلے آتے ہیں۔

اہلِ ساحل کو موجِ دل کی طغیانی پر رشک کیوں؟

رشک کرتے ہیں اہلِ ساحل سب
دیکھ کر موجِ دل کی طغیانی

سبحان اللہ! کیا عجیب وغریب مضمون ہے اور کیا ہی اونچی حقیقت کا بیان ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے اپنے ذہنوں میں اپنے لیے تجویز کی ہوئی منزلیں رکھتے ہیں اور جو ارمان اور تمنائیں اپنے سینوں میں رکھتے ہیں اور جو اُمیدوں کا محل اپنے دل ودماغ میں بنائے ہوئے ہوتے ہیں جب وہ ان امیدوں کو پورا ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور وہ پوری ہو جاتی ہیں اور ان کو ان کے مقاصد دنیویہ عیش وعشرت کی چیزیں اور کچھ دنیوی لذات اور راحتیں حاصل ہو جاتی ہیں یا ذہن میں بنایا ہوا مال منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے یا اولاد و کاروبار کے متعلق ان کے بنائے ہوئے پروگرام عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

مثلاً کہ اتنا بڑا کاروبار ہو کہ جس سے ہر سال ایک ملین کی آمدنی ہو یا دو ملین کی آمدنی ہو اور اسی طرح مثلاً یہ کہ میری اولاد ڈاکٹر اور انجینئر اور پائلٹ و پروفیسر بنے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ان کو مل چکا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب انسان اسی لیے چاہتا ہے کہ وہ عیش وآرام اور چین وسکون اور عزت وراحت کی زندگی گذارے لیکن اس ساحل پر پہنچ کر بھی اسے یہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ میری مال کی طلب وحرص ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ہے بلکہ دو سے چار اور چار سے آٹھ ملین اور آٹھ سے سولہ غرض یہ کہ نفس مجھے کسی منزل پر چین سے بیٹھنے نہیں دیتا ہے بلکہ اس کے دل کا مرض حرصِ مال اسے ہر وقت بے چین ومضطرب رکھتا ہے اور مشغولیات بڑھتی جاتی ہیں۔ ہر وقت دیکھو تو مشغول اور بزی، نہ کسی سے ملنے کا وقت، نہ عیادت وتعزیت کا وقت، نہ صلہ رحمی اور والدین کی دیکھ بھال وغیرہ کی فکر اور اس طرح اپنے کو ایسا الجھا ہوا اور مشغول پاتا ہے کہ اس کا جو کچھ سکون تھا وہ بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

اور جس اولاد کو ڈاکٹر وانجینئر بنا کر اس پر اپنی امیدوں کا پل کھڑا کیا تھا وہ پل ڈھاتا ہوا نظر آتا ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہائے افسوس جس اولاد کو ہم نے بڑی اُمیدوں سے پالا تھا اور ان سے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں اور اپنی زندگی کے آخری دور میں آج جبکہ ہمیں ان کی ضرورت تھی تو وہ قریب لگنے کو تیار نہیں، حال پوچھنے اور

خبر گیری تک کی ان کو فرصت نہیں ہے کیونکہ ہر ایک اپنے اپنے معاملات اور مشاغل حیات میں لگا ہوا ہے نہ ان کے پاس عیادت کے لیے وقت ہے، نہ خدمت کے لیے نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ والدین کی راحت رسانی کیا نعمت ہے اور اس سے محرومی کتنی بڑی محرومی ہے۔ نہ وہ یہ جانتے کہ ہم کس لیے پیدا ہوئے ہیں؟ ہمارا اصل مقصد حیات کیا ہے؟ کیونکہ ان کو نہ تو دین سکھایا گیا اور نہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے ان کو روشناس کرایا گیا۔ اس لیے حضرت والا انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ بظاہر گوکہ وہ انسان اپنے ساحل پر کھڑا ہوا ہے لیکن جب وہ کسی اللہ والے کو باوجود قلت سامانی اور بے کسی و بے بسی اور رات و دن کے مجاہدوں کے دیکھتا ہے اور اس کے پُر سکون جینے کو اور اطمینان و راحت والی حیات کو دیکھتا ہے تو اسے اس پر رشک آنے لگتا ہے۔

کیونکہ میرے دوستو! جس نے یہ سیکھ لیا کہ میری زندگی کا اصل مقصد صرف ایک اللہ کو راضی کرنا ہے اور اس نے اپنی ساری فکروں اور غموں کو چھوڑ کر بس اپنے لیے ایک آخرت کے غم کو اپنا غم بنالیا تو پھر باقی سارے غموں اور فکروں کی طرف سے حق تعالیٰ کفالت و کفایت فرماتے ہیں اور اس کے ذمہ دار ہوجاتے ہیں اور اسے دنیا کی فکروں سے بالکل مطمئن و بے فکر کردیتے ہیں۔ اس لیے اس کے دل کو اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہے کہ اہلِ دنیا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی ہے۔

اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اہلِ دل اللہ والوں کو جب یہ دنیا میں ڈوبے ہوئے لوگ دیکھتے ہیں اور اہل اللہ کے قلوب میں جو نور وسکون کی بارش برستی ہے جب ان کے پاس بیٹھ کر خود یہ اس کی کرنوں سے روشن ہوتے اور ان کے دلوں سے مہکنے والی عشق ومحبت خداوندی کی خوشبوؤں کو سونگھتے ہیں تب یہ بے چارے رشک کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کاش! یہ دولت ہمیں بھی نصیب ہوجاتی۔

حتیٰ کہ احقر حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے ''تحفۃ العلماء'' میں لکھے ہوئے ملفوظات کی روشنی میں عرض کرتا ہے کہ جب وہ لوگ جو صرف علم نبوت لیے ہوتے ہیں اور قرآن وسنت کو صرف پڑھ کر سند فراغت لیے ہوتے ہیں اور اکابر اہل اللہ اور مشائخ عظام کی صحبت میں رہ کر اس علم پر عمل کی مشق نہیں کرتے اور وہ دردِ محبت اور انوارِ معرفت جو مشائخ کے سینوں میں ہیں ان کے پاس رہ کر ان کو حاصل نہیں کرتے تو پھر وہ بھی اسی رشک میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ جو حق تعالیٰ سے قوی اور مضبوط تعلق اپنے سینہ میں رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم اور اسرارِ معرفت عطا فرماتے ہیں کہ جو عام علماء وفضلاء کے دل ودماغ میں نہیں آتے ہیں۔ حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اس کی عجیب مثال پیش فرمائی ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کے وزراء مملکت ہوتے ہیں کہ امورِ مملکت رسمی طور پر اور ضابطہ کے طور پر ان کے سپرد ہوتے ہیں اور وہ ان کو انجام دیتے ہیں لیکن ایک وہ شخص ہے کہ جو بادشاہ کی خدمت کرکے اور اسکو راحت پہنچا کر اس کے دل کو اس قدر خوش کردیتا ہے کہ پھر وہ بادشاہ اپنے ایسے امور بھی اس شخص پر ظاہر کردیتا

ہے کہ جو اس کے خصوصی اسرار و راز ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ شخص رسمی طور پر اس مملکت کا وزیر نہ ہو لیکن وہ ہر لحاظ سے ان تمام وزراء سے مافوق ہوتا ہے۔

علمِ وہبی اور چلہ کشی کی دلیل

بس بالکل یہی حال اس بندۂ خدا کا ہے کہ جس نے ہر آن اور ہر گھڑی اللہ تبارک وتعالیٰ پر فدا ہو کر اور اپنی ساری خواہشات کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی پر قربان کر کے اللہ تعالیٰ کو اس قدر خوش کیا ہوتا ہے کہ پھر حق تعالیٰ اپنے غیبی علوم اور اسرار معرفت اس کے سینہ پر کھولتے ہیں اور اس کی زبان پر ان کو جاری کرتے ہیں کہ جو رسمی علماء وفضلاء مدارس ہوتے ہیں وہ ان کو دیکھ کر عش عش کرتے رہ جاتے ہیں۔ اور اس مضمون کی دلیل کے طور پر احقر دو حدیثیں پیش کرتا ہے جن کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے التکشف صفحہ:۴۱۴ پر پیش کیا ہے:

﴿اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَیْتُمُ الْعَبْدَ یُعْطٰی زُھْدًا فِی الدُّنْیَا وَقِلَّۃَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْہُ فَاِنَّہٗ یُلَقَّی الْحِکْمَۃَ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۳۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابی خلاد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی شخص کو دیکھو کہ زہد فی الدنیا اور قلت کلام اس کو عنایت ہوا ہے تو اس سے نزدیک رہا کرو کیونکہ اس کو حکمت (علم اسرار وہبیہ) کی تعلیم (تلقین منجانب اللہ) کی جایا کرتی ہے۔ روایت کیا ہے اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں۔

مسئلہ: اثبات علم اسرار غیر منقولہ اس کو علم اور علم وہبی لدنی بھی کہتے ہیں جس کا عطا ہونا اہل اللہ کو بکثرت وتواتر منقول ہے اور ان حضرات کی کتب بھی ان علوم کی مدون ومحفوظ ہیں جس پر اہلِ تقشّف بے سمجھے بوجھے انکار کر کے اس شعر کے مصداق ہوتے ہیں ۔

وَ کَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلاً صَحِیْحًا
وَ اٰفَتُہٗ مِنَ الْفَھْمِ السَّقِیْمِ

(التکشف،۴۱۴)

اور دوسری روایت:

﴿مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا ظَھَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ اَخْرَجَہٗ رَزِیْنٌ﴾

(مرقاۃ المفاتیح - التکشف، ص: ۳۹۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص چالیس روز تک اللہ کے لیے خلوص کے ساتھ عبادت اختیار کر لے تو علم کے چشمے اس کے قلب سے جوش زن ہو کر اس کی زبان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ روایت کیا اس کو رزین نے۔

(ف) عادۃ چلہ اکثر بزرگوں سے چلہ نشینی کا اہتمام منقول ہے۔ یہ حدیث اس کی اصل ہے۔
(ف) مسئلہ اثبات علم اسرار بزرگوں کے کلام میں منصوص ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو بعض علوم وہ عطا ہوتے ہیں جو نہ منقول ہیں نہ مکتوب ہیں۔ کبھی اس کو علم وہبی سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی علم اسرار کہتے ہیں اور خود ان سے اس قسم کے دقائق وحقائق منقول بھی ہیں جو ان سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں نکلے یہ حدیث ایسے علوم کی تحقیق اور اعتبار کی اصل ہے۔ (التکشف ،صفحہ:۴۰۰)

یہ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے دو روایات پیش کی ہیں جن سے ایسے علوم کا ملنا ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے یہ علوم واسرار ومعرفت کی جولانی جب ایسے مٹے ہوئے قلب پر ہوتی ہے تو پھر دوسرے رشک کرتے ہیں۔

حصولِ کیف احسانی کا مرکز خانقاہ ہے

رند پاتا ہے خانقاہوں سے
اپنے ایمان میں کیف سانی

خانقاہیں اللہ کی محبت کے شراب خانے ہیں یہاں مئے محبت پلا کر اللہ کا دیوانہ بنایا جاتا ہے اور سالک مجاہدے کر کر کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے کیف احسانی پیدا ہو جاتا ہے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسانی کیفیت کو دو درجوں میں ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک تو یہ کہ انسان ہر وقت اس حالت میں ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اللہ اس کے سامنے ہے، صرف عبادت ہی کے وقت نہیں بلکہ ہر آن اور ہر گھڑی انسان پر یہ حال طاری ہو جائے اور یا پھر دوسرا درجہ ہے کہ جس کو درجۂ مراقبہ کہتے ہیں کہ انسان اس حالت میں رہنے لگے کہ اسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو پھر اس سے گناہوں کا صدور نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو حفاظت من اللہ عطا ہوتی ہے۔ اور اگر بدنظری کی نوبت آئے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى اور دوسرا ارشاد ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ ۔

جو کرتا ہے تو چھپ کے اہلِ جہاں سے
کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے

اور یاد رکھئے کہ پورے تصوف کی حقیقت یہی صفت احسانی پیدا ہونا ہے۔ اس لیے اگر کوئی تصوف سے چڑتا ہو تو وہ شعبۂ تزکیہ واحسان، شعبۂ زہد واصلاح نفس کہہ سکتا ہے کیونکہ یہی تصوف کی حقیقت ہے۔ اور اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے خواہ وہ اجتماعی ہو یا انفرادی، قول ہو یا فعل اس لیے احسان فی العبادات احسان فی المعاملات، احسان فی المعاشرۃ یہ سب شعبوں میں ہے۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن میں احکام دینے کے بعد جگہ جگہ اس مشاہدہ ومراقبہ کی تعلیم کرتے ہیں۔ کہیں پر فرماتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اور کہیں پر ہے

وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ظاہر ہے کہ اس کا منشاء ومقصد یہی ہے کہ جو حکم دیا ہے اسے مانو ورنہ ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں۔اس کی سزا بھگتنی ہوگی اس لیے ان احکام پر عمل کرو۔

خونِ حسرت کے بدلے ذوقِ ایمانی

جب ملا دردِ خونِ حسرت سے
کیا کہوں اس کا ذوقِ ایمانی

حضرت والا دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے راستہ میں غمِ حسرت برداشت کر کے اور خونِ حسرت کر کے اللہ کے فضل سے ایمانی ذوق عطا ہوا تو میرے بیان سے باہر ہے کہ اس کا صحیح معنی میں تذکرہ کرسکوں اور اس کو بیان کرسکوں اور خونِ حسرت میں یہ سب باتیں شامل ہیں کہ جب کوئی حسین صورت سامنے آجائے تو فوراً اپنی نگاہ بچالے۔خواہ کتنا ہی زور پڑے اور دل ٹوٹے یا مثلاً کسی نے ایذاء وتکلیف کی بات کہہ دی مگر آپ اللہ کی رضاء کے لیے اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر اور حضور کی سیرت سمجھ کر اس کی تلخی وکڑواہٹ کو سہہ جائیں اور برداشت کرلیں تو پھر ان کڑوے گھونٹوں کے بدلے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ملأ اللہ قلبہ امنًا وایمانًا کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو امن وایمان سے بھر دیتے ہیں اور یہ حلاوت ایمانی کا وعدہ ہے کہ اس خونِ حسرت سے حلاوتِ ایمانی ملتی ہے۔بس یہی ذوقِ ایمانی ہے۔حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نقل فرماتے ہیں کہ ایک نبی کا واقعہ التکشف،صفحہ:۴۱۶ پر فرماتے ہیں کہ:

﴿قَالَ عَبْدُ اللّٰہِ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَحْکِیْ نَبِیًّا مِّنَ الْاَنْبِیَآءِ ضَرَبَہٗ قَوْمُہٗ فَاَدْمَوْہُ وَھُوَ یَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْھِہٖ وَیَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک نبی کی انبیاء میں سے حکایت فرماتے تھے جن کو ان کی قوم نے مارا تھا اور خون آلودہ کر دیا تھا اور وہ اپنے چہرہ سے خون پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں۔روایت کیا اس کو بخاری مسلم نے۔

احقر کا منشا اس حدیث شریف کو لاکر یہ ہے کہ ایک طرف قوم کا معاملہ اور ایک طرف نبی کا معاملہ تو یہ شان اہل اللہ اور خاصانِ خدا کی ہوا کرتی ہے، وہ ان سب کو اللہ کے لیے برداشت کرتے ہیں اور پھر اللہ کے نزدیک ان کے درجات بڑھادیئے جاتے ہیں۔

حضرت میر صاحب دامت برکاتہم نے اس کے ضمن میں یہیں مجلس میں فرمایا کہ حضرت والا کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جو غم اُٹھانے پڑے تو وہ دونوں لائنوں اور دونوں راہوں کے غم تھے یعنی باطنی بھی اور ظاہری طور پر

حاسدین کے حسد اور دشمنوں کی ایذا رسانی کا بھی سامنا کرنا پڑا حضرت والا نے مجھ سے خود اڑتیس سال پہلے فرمایا کہ میرا مزاج بچپن ہی سے عاشقانہ تھا جب میں جوان ہوا تو خواہشات کا ایک سمندر میرے دل میں تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی شیخ کا دامن نہ پکڑا تو میں بہہ جاؤں گا۔ چنانچہ فوراً ہی حضرت پھولپوری رحمہ اللہ سے بیعت ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ اس کی برکت سے فائدہ یہ ہوا کہ اس عاشقانہ مزاج کے باوجود بھی مجھ سے زندگی میں ایک بار بھی اس راہ کی لغزش نہیں ہوئی۔

اور دوسرا مجاہدہ یہ تھا کہ حاسدین پیدا ہوگئے تھے کہ سولہ سال تک ہر وقت حضرت والا کو ستاتے رہے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ حضرت والا یہاں سے بھاگ جائیں۔ یہ ایک پوری داستان ہے یہاں تک کہ جب حضرت پھولپوری رحمہ اللہ کے ساتھ سفر میں تانگہ میں بیٹھے۔ ایک حصہ آگے ایک پیچھے۔ حضرت پھولپوری پیچھے بیٹھتے تھے اور حضرت والا آگے بیٹھتے تھے تو حاسدین آگے آ کر منہ چڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ مالٹا چوسی، مرغی کھائی شیخ کو چھوڑ کر کا ہے کو جائے۔ یہ طعن و تشنیع کرتے۔ حضرت نے یہ برداشت کیا۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا کیونکہ مجھے شیخ سے محبت تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ مجھے شیخ سے دور نہ کردیں اور میں شیخ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ میں حضرت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ایک دفعہ بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لایا۔ اس کو حضرت نے اس شعر میں فرمایا ہے کہ ؎

جفائیں سہہ کر دعائیں دینا یہی تھا مجبور دل کا شیوہ
زمانہ گذرا اسی طرح سے تمہارے در پر دلِ حزیں کا

صحبت اہلِ دل کی برکت سے
دل میں اخترؔ ہے کیسی تابانی

بعض حضرات کے ذہنوں میں یہ سوال کھٹکتا رہتا ہے کہ یہ سلسلۂ سلوک کی بیعت جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایمان کے اوپر بیعت یا جہاد کے اوپر مذکور ہے لیکن اس طرح کسی مسلمان اور مؤمن کو دوسرے اعمال پر بیعت کرنا جیسا کہ مشائخ صوفیاء بیعت کرتے وقت عہد و پیمان کراتے ہیں، یہ حضور سے ثابت نہیں۔ اسی طرح کا دھوکہ بعض عرب علماء کو ہوا اور انہوں نے اس بیعت کے ناجائز ہونے کا حکم لگایا، جبکہ صورتحال ایسی نہیں بلکہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اسلافِ اُمت سے اس کا ثبوت موجود ہے۔

بیعت لینے کی حقیقت

جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمہما اللہ کی تحریر سے یہ بات

صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے وہ بھی اسی سنتِ الٰہیہ کا اتباع ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی جن میں سے ''بیعتِ رضوان'' کا تذکرہ قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے: ''لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ'' یعنی اللہ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جنھوں نے ایک خاص درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ہجرت سے پہلے انصارِ مدینہ کی بیعتِ عقبہ بھی اسی قسم کے معاہدات میں سے ہے۔

بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایمان اور عملِ صالح کی پابندی پر بیعت لی۔ صوفیائے کرام میں جو بیعت مروّج ہے وہ بھی ایمان اور عملِ صالح کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام کا عہد ہے اور اسی کو سنت اللہ اور سنت الانبیاء کا اتباع ہے۔ اسی وجہ سے اس میں خاص برکات ہیں کہ انسان کو گناہوں سے بچنے اور احکامِ شرعیہ بجالانے کی ہمت اور توفیق بڑھ جاتی ہے۔ بیعت کی حقیقت کے معلوم ہونے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جس طرح کی بیعت عام طور پر ناواقف جاہلوں میں رواج پا گئی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینے ہی کو نجات کے لیے کافی سمجھ بیٹھتے ہیں، یہ سراسر جہالت ہے۔ بیعت ایک معاہدہ کا نام ہے۔ اس کا فائدہ جبھی ہے جب اس معاہدہ کو عملاً پورا کیا جائے ورنہ وبال کا خطرہ ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۱۲)

کیا بیعت کے بغیر کامل اصلاح نہیں ہو سکتی؟

سوال: کسی بزرگ سے تعلق قائم کیے بغیر کیا براہ راست شریعت پر عمل کر کے کامل اصلاح نہیں ہو سکتی؟

جواب: حامدًا وَّ مصلیًا کسی ولی کامل سے رابطہ قائم کیے بغیر اوّل تو تو عامۃً پوری طرح احکام شریعت پر عمل ہوتا ہی نہیں۔ دوسرے اس میں اخلاص نہیں پیدا ہوتا۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے هَلُمَّ جرًّا رابطہ کیا اور بیعت باطن کے استحکام کے لیے بھی ہوتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کے اکابر، علماء رحمہم اللہ اور ان کے خاندان کے علماء کا حال معلوم ہے۔ اخیر دور میں مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے بیعت کی ضرورت سمجھی اور اس بیعت کی بدولت بہت کچھ باطنی منافع حاصل کیے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (فتاویٰ محمودیہ، باب السلوک، جلد:۱، صفحہ:۱۳۴)

میں نے غم بھی بہت اُٹھائے ہیں

داغِ حسرت سے دل سجائے ہیں | تب کہیں جا کے اُن کو پائے ہیں
قلب میں جب وہ جس کے آئے ہیں | اپنا عالم الگ سجائے ہیں
ان حسینوں سے دل بچانے میں | میں نے غم بھی بہت اُٹھائے
حسنِ فانی کے چکروں میں میر | کتنے لوگوں نے دن گنوائے ہیں
شکل بگڑی تو بھاگ نکلے دوست | جن کو پہلے غزل سنائے ہیں
منزلِ قرب یوں نہیں ملتی | زخمِ حسرت ہزار کھائے ہیں
کام بنتا ہے فضل سے اخترؔ | فضل کا آسرا لگائے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی:۔داغِ حسرت: گناہ سے بچنے میں دل پر لگنے والے زخم کا داغ۔**حسنِ فانی:** ختم ہونے والی خوبصورتی۔**منزلِ قرب:** اللہ تعالیٰ کی نزدیکی۔**آسرا:** اُمید۔

داغِ حسرت وخونِ آرزو کا کرشمہ

داغِ حسرت سے دل سجائے ہیں
تب کہیں جا کے اُن کو پائے ہیں

یہ بات ظاہر ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے کہنے کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور اُس کی نافرمانیوں اور گناہوں سے بچتا ہے تو پھر اُسے حسرت وغم تو ہوتی ہی ہے اور اس کے دل پر زور تو ضرور پڑتا ہے کیونکہ حدیثِ پاک کے لحاظ سے جنت کو ایسی چیزوں سے گھیرا ہے جو طبیعت کو ناگوار ہوتی ہے، مگر مؤمن بندہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان ناگواریوں اور حسرتوں اور غموں کو اُٹھاتا چلتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ قلب میں حلاوتِ ایمانی عطا فرماتے ہیں۔جیسا کہ یہ مضمون مختلف اشعار کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔اسی کو حضرت والا نے یہاں بھی بیان فرمایا کہ میرے دل پر مختلف قسم کی حسرتوں کے داغ لگے ہوئے ہیں جس کی بدولت میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اللہ کو پالیا۔جیسا کہ شاہ محمد احمد پرتا بگڈھی نے فرمایا۔

شکر ہے دردِ دل مستقل ہوگیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہوگیا

اگر غور سے دیکھا جائے تو تمام مجاہدات وریاضتوں کی حقیقت بس اتنی ہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کی تکلیف اور غم دل پر سہنا آسان ہوجائے۔جب اس کی مشق ہوجاتی ہے تو پھر پورے دین پر عمل آسان ہوجاتا ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں بندے کو احکام عطا فرمائے وہیں اپنی کچھ ایسی صفات ذکر فرمائی

ہیں کہ جن سے بندے کے لیے اُن احکام پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ جیسے جہاں دنیا کی حقیقت کا ذکر فرمایا تو وہیں یہ بھی ذکر فرمادیا کہ میری طرف لوٹ آنے کے بعد آخرت کی نعمتوں کا کیا حال ہے۔اور جہاں اللہ تعالیٰ نے نامحرم عورت یا بے ریش امردلڑکے کی طرف دیکھنے کو منع فرمایا ہے وہیں قرآن وحدیث میں یہ بھی بتادیا گیا کہ میں تمہاری آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہوں اور تم جو کچھ کررہے ہو سب میں دیکھنے والا ہوں۔اور کہیں یوں ارشادفرمایا کہ تمہارارب گھات میں ہے۔غرض یہ کہ ان سب مضامین سے سب حکموں پر عمل کرنا آسان ہوگیا۔حضرت والا نے اس مضمون کو اپنے ایک شعر میں اس طرح ذکر فرمایا۔

سارے عالم میں یہی ہے اخترؔ کی آہ و فغاں
چند دن خونِ تمنا سے خدا مل جائے ہے

مہمان کے مناسب مکان کا انتظام

قلب میں جب وہ جس کے آئے ہیں
اپنا عالم الگ سجائے ہیں

یہ بات ہرآدمی جانتا ہے کہ جس شخص کا مہمان جس درجے رتبے کا اور جس شان اور مقام کا ہوتا ہے اُسی کے لحاظ سے میزبان اپنے گھر کو صاف ستھرا اور آراستہ و پیراستہ کرتا ہے اور اچھی طرح اُس کو بناتا اور سنوارتا ہے تو چونکہ دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اُس دل میں آنے سے پہلے اُسے اپنی شان کے مطابق خوب عمدہ اور صاف ستھرا فرماتے ہیں کہ اُس کے اندر کسی غیر کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔ مال ودولت کی محبت ہو یا جاہ ومنصب کی، اہل وعیال اور خاندان کا تعلق ہو یا اپنے عمدہ بنگلوں اور بہترین تجارتوں سے وابستگی ہو سب چیزوں سے دل کو صاف کردیا جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ اس دل سے ہر غیر نکل چکا ہے تو پھر اُس دل کے مہمان بنتے ہیں۔اور اس کی دلیل کلمۂ لا الٰہ میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الا اللہ سے پہلے لا الٰہ کو رکھا ہے جس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ پہلے ہر غیر کو دل سے نکال دو پھر اللہ تعالیٰ کا وصول ممکن ہے۔

حضرت والا کے بعض مواعظ میں ہے کہ ایک عام آدمی سے کسی بادشاہ کی دوستی تھی۔اُس نے ایک دن عام آدمی سے کہا کہ ہم تمہارے یہاں آئیں گے۔تو وہ شرم کے مارے کہنے لگا کہ میرا گھر تو اس قابل نہیں ہے کہ بادشاہ کی سواری اُس میں داخل ہوسکے۔اس پر بادشاہ نے اُس سے یوں کہا کہ تم جانتے نہیں ہو کہ بادشاہ جب کہیں جاتے ہیں پہلے اُس گھر کو اس قابل بناتے ہیں،اس لیے پہلے ہم اُسے اس قابل بنائیں گے پھر ہم اُس طرف آئیں گے۔سو اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب اللہ کسی دل میں متجلی ہوتے ہیں تو پہلے اُسے اس قابل بناتے ہیں اور پھر وہاں جلوہ فرما ہوجاتے ہیں۔اسی کو حضرت نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی دل میں آتے ہیں تو وہاں وہ اپنا الگ عالَم سجاتے ہیں۔

شریعت کی پابندیوں سے کوئی باہر نہیں ہے

ان حسینوں سے دل بچانے میں
میں نے غم بھی بہت اُٹھائے

اگر غیر محرم سے نظر کا بچانا عظیم الشان عمل نہ ہوتا اور اللہ کی نگاہ میں بہت زیادہ قیمتی نہ ہوتا تو اس عمل کی وجہ سے قرآن میں جنت کا وعدہ نہ کیا جاتا۔ جب کہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن یہ اعلان کررہا ہے تم نظر بچاؤ تو تمہاری شرمگاہیں محفوظ رہیں گی جس کی بدولت قلب کی طہارت وتزکیہ حاصل ہوگا۔ اور جو قلب مزکی ومجلی ہو اُس کے لیے جنت میں دخول کا وعدہ ہے۔

اور چونکہ دل پورے بدن کا بادشاہ ہے اس لیے اگر کسی کی محبت دل کے اندر سرایت کرجائے تو سارے بدن کے اعضاء پھر اُس کے کہنے کے مطابق اُس کی خدمت کے لیے گھومتے پھرتے ہیں لہٰذا مؤمن بندے کو چاہیے کہ جن راہوں سے دل پر شیطان کا حملہ ہوسکتا ہے اُن پر پہرہ بٹھادے اور اُنہیں محفوظ کرلے۔ مثلاً آنکھیں اور زبان اور کان اور ان میں بھی سب سے زیادہ سخت آنکھ ہے۔ اس لیے کہ ایک روایت میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر کو شیطان کا زہریلا تیر قرار دیا ہے۔ جو نظر بچالے گا اُس کی برکت سے ان شاء اللہ اُس کا دل محفوظ رہے گا۔ اگرچہ یہ بات تو اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس عمل میں طبیعت میں بہت زیادہ زور پڑتا ہے، بالخصوص جبکہ سامنے کوئی حسین یا حسینہ گزررہی ہو تو دل اُس کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے لہٰذا ایسے وقت میں اپنے دل کو بچالینا بہت بڑا مجاہدہ اور دشواری کا کام ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انعام بھی بہت کچھ مقرر فرمایا۔ حدیثِ پاک کے الفاظ ہیں یَجِدُ حَلاَوَۃَ الْاِیْمَانِ ایسے آدمی کو ایمان کی حلاوت مل جاتی ہے۔ اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ ان حسینوں سے دل کو بچانے کے لیے مجھے غم تو بہت اُٹھانے پڑے لیکن میں نے فیصلہ کرلیا کہ چاہے جان چلی جائے لیکن اپنے اللہ کو ایک لمحہ ناراض نہیں کروں گا۔

کبھی کسی کے ذہن میں یہ بات گزر سکتی کہ اللہ والوں کے لیے یہ کیا مشکل ہے۔ اُن کو تو عورتوں کی طرف دیکھنے کی کوئی رغبت یا خواہش نہیں ہوتی ہوگی کیونکہ وہ تو بزرگ اور اللہ والے ہوتے ہیں اور گویا اُن کی دنیا تو بالکل ہی الگ ہوتی ہے جس میں وہ ہر وقت مست رہتے ہیں، مگر یہ سوچ درست اور صحیح نہیں اور ایسا خیال کرنا بالکل بے بنیاد اور غلط ہے کیونکہ کوئی انسان اپنی بشری فطرت سے جدا نہیں ہوسکتا۔

قرآن پاک میں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ جو انسان اپنے کو خواہشات سے علیحدہ کردے گا اور اُن کا بالکل ازالہ کردے گا تو اُس کو جنت ملے گی بلکہ یہ فرمایا ہے کہ نفس کو خواہشات کے مقتضیٰ پر عمل سے روک دے یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف اتنا غالب آجائے کہ جب نفس شرارتوں اور خباثتوں کی طرف چلے تو فوراً اُس پر بریک لگادے۔

﴿وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰىۙ۝ فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِىَ الۡمَاۡوٰى۝﴾

(سورۃ النازعات، آیت: ۴۰-۴۱)

ترجمہ: اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے جی کو خوش کرنے سے سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانہ۔ (معارف القرآن، جلد: ۸، صفحہ: ۶۶۱)

اس لیے ابن قیم رحمہ اللہ نے ایک مقام پر لکھا ہے اِنَّ شَهْوَةَ الْمُتَّقِي اَشَدُّ کہ متقی اور نیک لوگوں کی شہوت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ شہوت رانی میں حرام طریقے میں مبتلا نہیں رہتے بلکہ جائز مقام کے لیے اُس کو محفوظ رکھتے ہیں۔

اس لیے بعض بیچارے بھولے بھالے ذرا تصوف کے راستے میں چل کر صوفی بن جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں ہے یا بعض دوسرے لوگ خیال کرتے ہیں کہ گو ہماری بچی جوان ہو چکی ہے لیکن ہمارے گھر پر آئے ہوئے مہمان تو بزرگ ہیں اُن سے پردے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات سراسر بے دینی ہے اور بدفہمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرت والا اُن تمام متعلقین کو جو تعویذات اور عملیات کے کاموں میں لگے ہیں ان چیزوں سے خاص طور سے بہت زیادہ روکتے اور تنبیہ فرماتے ہیں، یہاں تک کہ اب تو حضرت والا نے اس عملیات کے فن میں اشتغال ہی کو مطلقاً منع فرما دیا، کیونکہ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ اس فن میں لگنے سے نسبت مع اللہ باقی نہیں رہتی ہے۔ اس لیے حضرت والا اس سے مطلقاً منع فرما رہے ہیں۔

عشقِ مجازی ایک وبائی مہلک بیماری ہے

حسنِ فانی کے چکروں میں میر
کتنے لوگوں نے دن گنوائے ہیں
شکل بگڑی تو بھاگ نکلے دوست
جن کو پہلے غزل سنائے ہیں

حضرت والا آج کے دور میں جوانوں کے اوپر گزرنے والے اُن حالات کا نقشہ کھینچ رہے ہیں کہ جو گھر گھر کا شکوہ اور شکایت ہے اور نوے پچانوے فیصد خطوط خانقاہوں میں اسی بیماری میں مبتلا لوگوں کے آتے ہیں کہ جنھوں نے حسنِ فانی کے چکروں میں پڑ کر اپنی زندگی کے قیمتی دن گنوا ڈالے۔ اور جب وہ شکل وصورت کے نقشے بگڑے تو پھر یہ حسن پرستی اپنے اصل رنگ کی طرف لوٹ آئی اور جن پر جان دینے کے دعوے کیے جاتے تھے اب اُن کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں رہی اور جن کو ہر وقت غزل سنائی جاتی تھی اب ان کے قریب جانا بھی منظور نہیں۔ ان اشعار میں ایک خاص سبق اور عبرت ہے کہ جب یہ شکل بدلنے اور بگڑنے والی ہے تو پھر ان کو اپنا دل دینا یہ کتنی

بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔

خود احقر کے علم میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جو لوگوں نے اپنے خطوط کے ذریعے بتائے کہ انہوں نے کس طرح سے اپنی جوانی کو ان چکروں میں پڑ کر تباہ و برباد کر دیا۔ بالآخر نتیجہ سوائے افسوس وحسرت کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ جیسا کہ احقر کو ایک واقعہ یاد آیا کہ احقر رشتہ داروں میں سے ایک ڈاکٹر ہیں جو سرکاری ہسپتال میں جنوبی افریقہ میں کام کر رہے تھے تو اُن کے پاس ایک ایسا پیشنٹ (Patient) آیا جس نے کانچ کی بوتل کو شراب سمیت توڑ کر چورا کر کے پی لیا تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اُن سے صورت حال پوچھی اور اُن سے وجوہات معلوم کی تو انہوں نے یہ بتلایا کہ آج وعدے پر میری گرل فرینڈ (Girl Friend) نہیں پہنچی اور جب میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا وہ کسی دوسرے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ مجھے یہ خبر ملتے ہی میں پاگلوں کی طرح ہو گیا اور مجھ سے یہ خبر برداشت نہ ہوئی جس کے نتیجے میں میں نے وہ شراب جو مجھے اور گرل فرینڈ (Girl Friend) دونوں کو پینی تھی اُس کو اُس کی بوتل سمیت چورا کر کے اس لیے پینا گوارا کیا کہ مجھ سے یہ غم برداشت نہیں ہو رہا تھا، اس لیے میں خودکشی کر لینا چاہتا تھا، مگر اب اُس کی حالت اس قدر چیخ و پکار کی تھی کہ دیکھنے والے سے دیکھا نہ جائے اور سننے والے سے سنی نہ جائے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اِن چکروں میں پڑ کر جوانوں نے کتنی جوانیاں اور زندگی کے کتنی قیمتی فرصتیں ضائع کر ڈالیں۔

حرام آرزوؤں سے وہ نہیں ملتے

منزلِ قرب یوں نہیں ملتی
زخمِ حسرت ہزار کھائے ہیں

یعنی اللہ تعالیٰ کو پانے اور اس کا قربِ خاص حاصل کرنے کے لیے اُس کے راستے کے غم اور تکلیفیں تو اُٹھانی ہی پڑتی ہیں۔ گویا اس شعر میں اُن لوگوں کے لیے علاج بتایا جا رہا ہے جو اپنی زندگیوں کو حرام کاریوں میں گنوا رہے ہیں اور بے کار و بے فائدہ کاموں میں ضائع کر رہے ہیں کہ تم اگر اس حالت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے قریب لگنا چاہتے ہو تو یہ یہ آرزوؤں اور تمناؤں سے نہیں ہوگا اس کے لیے کچھ تکلیف اور غم اُٹھانا پڑے گا۔

آرزوؤں سے وہ نہیں ملتے
شرط ہے خونِ آرزو پینا

لہٰذا صرف تمناؤں اور آرزوؤں سے اللہ تعالیٰ مل جائیں اور اُس کے لیے خونِ حسرت نہ پینا پڑے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے حضرت والا نے وضاحت کے ساتھ یہ بات فرمادی کہ اللہ کے راستے کے شیر بنو اور نفس کی خواہشات اور تقاضوں پر شیر کی طرح دلیرانہ حملہ کرو، پھر یہ راستہ طے ہوگا۔ اور اللہ کے قرب کی دولت کے مل جانے کا خواب ان شاء اللہ شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔

بخشش صرف فضلِ خداوندی سے ہوگی

کام بنتا ہے فضل سے اختر
فضل کا آسرا لگائے ہیں

کوئی بھی انسان خواہ کتنا ہی بڑا ولی اللہ اور کیسا ہی مجاہدے اور ریاضتیں کیے ہوئے ہو، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بخشش کا معاملہ صرف اُس کے فضل وکرم سے ہوگا۔ لہٰذا نہ تو کسی گنہگار کو مایوس ہونا چاہیے اور نہ کسی نیکوکار کو اپنی نیکیوں پر گھمنڈ اور تکبر ہونا چاہیے، بلکہ ہر وقت ڈرتا رہے کہ پتہ نہیں اللہ کا فضل شاملِ حال ہو یا نہ ہو۔

چنانچہ جب حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کسی آنے والے شخص کو بیعت کی درخواست کرنے پر سلسلے میں داخل فرماتے تو ارشاد فرماتے کہ میں اس نیت سے بیعت کرلیتا ہوں کہ کل قیامت کے دن اگر اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا تو اُس کی برکت سے میں بھی بخش دیا جاؤں اور اگر مجھ پر فضل ہوا تو چونکہ شیخ سے محبت ہوتی ہے اور اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی کا حشر اُس کے ساتھ ہوگا جس سے اُس کو محبت ہو) کے اصول اور ضابطے کے مطابق مرید کو اپنے شیخ سے محبت ہونے کی وجہ سے اُس پر بھی فضل ہوجائے۔

اس پر احقر کو ایک بات یاد آئی جو آج ہی حضرت مولانا محمد مظہر صاحب دامت برکاتہم نے عصر کے بعد بائیسویں روزے کو ختم بیان کے دوران سنائی۔ نواب چھتاری صاحب جو علیگڑھ میں رہتے تھے اُن کے ایک بھائی تھے جو کافی بڑے دیندار تھے۔ لیکن ایک زمانے میں اُن کے اوپر خوف کا اتنا غلبہ ہوا کہ اُن کو ہر وقت یہ لگنے لگا کہ میری بخشش نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ یہ حالات اتنے شدت اختیار کر گئے کہ نماز تک پڑھنا اُن کے لیے مشکل ہوگیا۔ نیت باندھتے ہی پھر سے نیت توڑ دیتے تھے اور دل میں قوت سے یہ خیال آتا تھا کہ میری نماز مقبول نہیں ہے۔ اپنے وقت کے بہت سے بڑے بڑے علماء سے ملتے رہے لیکن دل کو تسلی نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر بابا نجم الحسن جو حضرت تھانوی کے مجازِ صحبت تھے اور شاعر تھے، اُن سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اتنی بات کہی کہ کسی کی بھی بخشش اُس کے عمل سے نہیں ہوگی بلکہ اللہ کی رحمت سے ہوگی اور پھر یہ فرمایا کہ جب بھی شیطان تمہارے پاس آکر اس طرح کے وسوسے ڈالے تو تم یہ شعر پڑھ لیا کرو۔

مجھے اُس کریمِ مطلق کے کرم کا آسرا ہے
ارے او گناہ کے بچے مجھے کیوں ڈرا رہا ہے
جنتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

چنانچہ اُن کے اس جواب کے بعد اور یہ اشعار سننے کے بعد ایسا اللہ کا فضل ہوا کہ اُن کے وہ سارے

وساوس اور خیالات دور ہو گئے اور بہت اچھی زندگی گزارنے کے بعد ایمان پر خاتمہ والی عبادت کرتے ہوئے موت نصیب ہوئی۔ حدیث پاک میں ہے کہ:

﴿عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ اَحَدًا مِّنْکُمْ عَمَلُہُ الْجَنَّۃَ وَلَا یُجِیْرُہُ مِنَ النَّارِ وَلَا اَنَا اِلَّا بِرَحْمَۃِ اللہِ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدًا مِّنْکُمْ عَمَلُہُ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللہِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللہُ مِنْہُ بِرَحْمَتِہٖ﴾

(مشکوۃ المصابیح: ص۲۰۷)

یعنی کسی کی بھی بخشش اور جنت میں داخلہ اُس کے عمل سے نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا حتیٰ کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے متعلق یہ بات ارشاد فرماتے ہیں کہ میری بخشش بھی اللہ کے رحم وکرم سے ہوگی۔ اس لیے خواہ کوئی کتنا ہی بڑا اولی ہو جائے وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میرے اعمال اتنے اونچے ہیں کہ میں اُن کی وجہ سے جنت میں جاؤں گا۔

ہاں بے شک یہ ایک دوسری بات ہے کہ اللہ کا فضل جنت میں لے کر تو جائے گا مگر اللہ کا فضل اعمالِ صالحہ والوں پر ہی ہوگا کیونکہ قرآن میں اس کا اعلان کر دیا گیا کہ اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہوتی ہے لہٰذا اس سے گمراہ لوگ استدلال نہ کریں کہ پھر ہمیں اعمالِ صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

اُڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا

جن کا نقشہ تھا کل جوانی کا ہے لقب آج نانا نانی کا
کیسا دیکھا تھا ہوگئے کیسے کیا بھروسہ ہے اس جوانی کا
مل گئے خاکِ قبر میں کتنے ناز تھا جن کو زندگانی کا
یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے جب کھلا حال دارِ فانی کا
میر اب دل کو کس سے بہلائے اُڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا
دل لگا بس خدا سے اے ظالم خوف کر موت ناگہانی کا
شیخِ کامل کے فیض سے دل ہے حاملِ کیفِ جاودانی کا
خاکِ تن کو عطا ہوا ان کا غم ہے صلہ ان کی مہربانی کا
حال دیکھو تو اللہ والوں پر مستیِ خمرِ آسمانی کا
سن لو قصہ زبانِ اخترؔ سے اس کے دل کے غم نہانی کا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **زندگانی**: زندگی۔ **دار فانی**: ختم ہونے والا گھر یعنی دنیا۔ **ناگہانی**: اچانک۔ **کیفِ جاودانی**: ہمیشہ کا مزا۔ **صلہ**: انعام۔ **خمرِ آسمانی**: آسمان سے اتری ہوئی شراب یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب۔ **غمِ پنہانی**: دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کا غم اٹھانا۔

ناز و انداز والوں کا رنگ اڑ گیا

جن کا نقشہ تھا کل جوانی کا
ہے لقب آج نانا نانی کا
کیسا دیکھا تھا ہوگئے کیسے
کیا بھروسہ ہے اس جوانی کا
مل گئے خاکِ قبر میں کتنے
ناز تھا جن کو زندگانی کا
یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دارِ فانی کا
میر اب دل کو کس سے بہلائے
اڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا

ان تمام اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم نے دنیا کی فنائیت اور اُس کے نقش و نگار کا عارضی اور اس کے زیب و زینت کا ناپائیدار ہونا ذکر کیا ہے۔ آج جو کھلا ہوا چمن نظر آ رہا ہے کل کو وہی خزاں کے عالَم میں مرجھایا ہوا کھڑا ہے اور جہاں آج باغ و بہار ہے کل کو وہی ننگِ خزاں بنا ہوا ہوگا۔ اور جو نقشے جوانی لیے ہوئے بڑے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے آج بڑھاپے کے وقت میں وہ نانا نانی کہلا کر کسی عاشق کے لیے دیکھنے کے قابل بھی نظر نہیں آ رہے ہیں۔

اور یہ سلوک میں قدمِ اوّل ہے کہ یہ عالَم اور اس کی چیزوں کی محبتیں دل سے باہر ہو جائیں اور اِس دارِ دنیا اور دارِ فانی کی حقیقت ہر وقت نظر کے سامنے مستحضر ہو جائے تو پھر انسان اس کے دھوکوں میں اُلجھ نہیں سکتا اور اس کی رنگ رلیوں پر اپنا دل دے نہیں سکتا۔ ہمارا اللہ کس قدر مہربان ہے کہ اس دنیا کا لقب دار الغرور اور متاع الغرور فرمایا ہے۔ یعنی یہ دنیا دھوکے کا گھر اور دھوکے کی ایسی چیز ہے جو محض استعمال کرنے کے قابل ہے دل میں جگہ دینے کے قابل نہیں۔ جس طرح کشتی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے پانی ضرورت کے درجے میں استعمال کی ضرورت تو ہوتا ہے لیکن اندرونِ کشتی سے پانی کا کوئی ربط وضبط نہیں ہوتا۔ تو بس دنیا کی حیثیت اس سے آگے اور کچھ نہیں۔ روئے زمین پر بسنے والے تمام اہل اللہ دنیا کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحب نے معارف القرآن میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ ایک اللہ والے کہیں سے گزر رہے تھے تو راستے میں اُن کو کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ جس کی ایک جانب کوڑا کرکٹ وغیرہ پڑا ہوا تھا اور دوسری جانب قبرستان تھا۔ تو انہوں نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ تم دو خزانوں کے درمیان بیٹھے ہو۔ ایک طرف تو انسانوں کا خزانہ اور ایک طرف مال و دولت کا خزانہ ہے۔ انسانوں کا انجام قبرستان ہے سو یہ انسانوں کا خزانہ ہے اور مال و دولت کا انجام کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ہے سو یہ دولت کا خزانہ ہے۔

اڑ گیا رنگ حسنِ فانی کا

یہ رنگ تو اڑنا ہی ہے باقی رہنے والی صرف اللہ کی ذات ہے اگر ہم اللہ کی ذات پر فدا ہوں تو جس دن ہمارا آخری سانس ہوگا وہ اللہ اس دن بھی ساتھ ہوگا، وہ اللہ قبر میں بھی ساتھ ہوگا وہ اللہ میدانِ محشر میں بھی ساتھ ہوگا وہ اللہ جنت میں بھی ساتھ ہوگا تو کتنی حماقت کی بات ہے کہ مٹنے والوں، مرنے والوں، گلنے سڑنے والوں پر ہم اپنا دل دے کر اپنی زندگی کو تباہ کر لیں ؎

جن کا نقشہ تھا کل جوانی کا
ہے لقب آج نانا نانی کا

حضرت والا توجہ دلا رہے ہیں کہ جن کی خوبصورتی اور چہرے کی رونق اور آب و تاب پر آج تم دل دے

رہے ہو ذرا سوچ لو تصور کرلو کہ کل کو جب یہ بڑھے بڈھی ہو جائیں گے تو پھر کیا عالم ہوگا اپنے ماضی پر پچھتاؤ گے اور بیٹھ کر یہ کہو گے ہائے میں نے کیا کیا، میں نے کتنا غلط کام کیا، کس کے اوپر میں نے اپنا دل دیا؟ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے شرم کرو گے۔ کیونکہ دنیا اور اُس کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

دنیا کی لذتیں دھوکہ ہیں

جیسا کہ قرآن دنیا کی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿اعْلَمُوٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾

(سورۃ الحدید، آیت: ۲۰)

ترجمہ: تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات (ہرگز قابل اشتغال چیز نہیں کیونکہ) وہ محض لہو لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے (یعنی مقاصد دنیوی ہنر و کمال میں) اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ جتلانا ہے (یعنی مقاصد دنیا کے یہ ہیں کہ بچپن میں لہولعب کا غلبہ رہتا ہے اور جوانی میں زینت و تفاخر کا اور بڑھاپے میں مال و دولت، آل و اولاد کو گنوانا اور یہ سب مقاصد فانی اور خواب و خیال محض ہیں جس کی مثال ایسی ہے جیسے مینھ (برستا) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشت کار کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے (اسی طرح دنیا چندروزہ بہار ہے پھر زوال و اضمحلال، یہ تو دنیا کی حالت ہوتی اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں (دو چیزیں ہیں ایک تو کفار کے لیے) عذاب شدید ہے (اور دوسری اہل ایمان کے لیے) خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے (اور یہ دونوں باقی ہیں، پس آخرت تو باقی ہے) اور دنیوی زندگانی محض (فانی ہے، جیسے فرض کرو کہ دھوکہ) کا اسب ہے۔ ان آیات میں دنیائے فانی کا نا قابلِ اعتماد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ابتداءِ عمر سے آخر تک جو کچھ دنیا میں ہوتا، اور جس میں دنیا دار منہمک و مشغول اور اس پر خوش رہتے ہیں اس کا بیان ترتیب کے ساتھ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کا خلاصہ بترتیب چند چیزیں اور چند حالات ہیں، پہلے لعب پھر لہو پھر زینت پھر تفاخر پھر مال و اولاد کی کثرت پر ناز و فخر، لعب وہ کھیل ہے جس میں فائدہ مطلق پیش نظر نہ ہو، جیسے بہت چھوٹے بچوں کی حرکتیں، اور لہو وہ کھیل ہے جس کا اصل مقصد تو تفریح اور دل بہلانا اور وقت گزاری کا مشغلہ ہوتا ہے ضمنی طور پر کوئی ورزش یا دوسرا فائدہ بھی اس میں حاصل ہو جاتا ہے جیسے بڑے بچوں کے کھیل، گیند شناوری یا نشانہ بازی وغیرہ حدیث میں نشانہ بازی اور تیرنے کی مشق کو اچھا کھیل فرمایا ہے، زینت بدن اور لباس

وغیرہ کی معروف ہے، ہر انسان اس دور سے گزرتا ہے، اس کے بعد اس کو اپنے تن بدن اور لباس کی زینت کی فکر ہونے لگتی ہے اس کے بعد ہمعصروں ہم عمروں سے آگے بڑھنے اور ان پر فخر جتلانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

اور انسان پر جتنے دور اس ترتیب سے آتے ہیں غور کرو تو ہر دور میں وہ اپنے اسی حال پر قانع اور اسی کو سب سے بہتر جانتا ہے، جب ایک دور سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو سابقہ دور کی کمزوری اور لغویت سامنے آجاتی ہے، بچے ابتدائی دور میں جن کھیلوں کو اپنا سرمایہ زندگی اور سب سے بڑی دولت جانتے ہیں کوئی ان سے چھین لے تو ان کو ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے جیسا کہ کسی بڑے آدمی کا مال واسباب اور کوٹھی بنگلہ چھین لیا جائے، لیکن اس دور سے آگے بڑھنے کے بعد اس کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے اس وقت مقصود زندگی بنایا ہوا تھا وہ کچھ نہ تھیں، سب خرافات تھیں، بچپن میں لعب، پھر لہو میں مشغولیت رہی جوانی میں زینت اور تفاخر کا مشغلہ ایک مقصد بنا رہا بڑھاپا آیا، اب مشغلہ فی الاموال والاولاد کا ہو گیا، کہ اپنے مال و دولت کے اعداد وشمار اور اولاد و نسل کی زیادتی پر خوش ہوتا رہے ان کو گنتا رہے، مگر جیسے جوانی کے زمانے میں بچپن کی حرکتیں لغو معلوم ہونے لگی تھیں بڑھاپے میں پہنچ کر جوانی کی حرکتیں لغو و ناقابل التفات نظر آنے لگیں، اب بڑے میاں کی آخری منزل بڑھاپا ہے اس میں مال کی بہتات اولاد کی کثرت وقوت اور ان کے جاہ ومنصب پر فخر سرمایہ زندگی اور مقصود اعظم بنا ہوا ہے، قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ حال بھی گزر جانے والا ہے اور فانی ہے اگلا دور برزخ پھر قیامت کا ہے اس کی فکر کرو وہی اصل ہے، قرآن کریم نے اس ترتیب کے ساتھ ان سب مشاغل ومقاصد دنیویہ کا زوال پذیر ناقص، ناقابل اعتماد ہونا بیان فرما دیا اور آگے اس کو ایک کھیتی کی مثال سے واضح فرمایا كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا غیث کے معنی بارش کے ہیں، اور لفظ کفار جو مومنین کے مقابلہ میں آتا ہے اسکے یہ معنی تو معروف ومشہور ہی ہیں، اس کے ایک دوسرے لغوی معنی کاشتکار کے بھی آتے ہیں اس آیت میں بعض حضرات نے یہی معنی مراد لیے ہیں اور مطلب آیت کا یہ قرار دیا ہے کہ جس طرح بارش سے کھیتی اور طرح طرح کی نباتات اُگتی ہیں اور جب وہ ہری بھری ہوتی ہیں تو کاشتکاران سے خوش ہوتا ہے۔

اور بعض دوسرے حضرات مفسرین نے لفظ کفار کو اس جگہ بھی معروف معنی میں لیا ہے کہ کافر لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں اس پر جو یہ اشکال ہے کہ ہری بھری کھیتی دیکھ کر خوش ہونا تو کافر کے ساتھ مخصوص نہیں، مسلمان بھی اس سے خوش ہوتا ہے، اس کا جواب حضرات مفسرین نے یہ دیا ہے کہ مومن کی خوشی اور کافر کی خوشی میں بڑا فرق ہے مؤمن جو ہوتا ہے تو اس کی فکر کا رضاء حق تعالیٰ کی طرف پھر جاتا ہے وہ یقین کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی قدرت و حکمت اور رحمت کا نتیجہ ہے وہ اس چیز کو زندگی کا مقصود نہیں بناتا پھر اس خوشی کے ساتھ اس کو آخرت کی فکر بھی ہر وقت لگی رہتی ہے اس لیے جو مومن ایمان کے تقاضے کو پورا کرتا ہے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت پر بھی وہ ایسا خوش

اور مگن اور مست نہیں ہوتا جیسا کافر ہوتا ہے اس لیے یہاں خوشی کا اظہار کفار کی طرف منسوب ہے۔

آگے اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کھیتی اور دوسری نباتات پھول پھلواریاں جب ہری بھری ہوتی ہیں سب دیکھنے والے خصوصاً کفار بڑے خوش اور مگن نظر آتے ہیں، مگر آخر کار پھر وہ خشک ہونا شروع ہوتی ہے، پہلے زرد پڑ جاتی ہے پھر بالکل خشک ہوکر چورا چورا ہو جاتی ہے یہی مثال انسان کی ہے کہ شروع میں تر و تازہ حسین خوب صورت ہوتا ہے بچپن سے جوانی تک کے مراحل اسی حال میں طے کرتا ہے مگر آخر کار بڑھاپا آ جاتا ہے جو آہستہ آہستہ بدن کی تازگی و حسن و جمال سب ختم کر دیتا ہے اور بالآخر مر کر مٹی ہو جاتا ہے دنیا کی بے ثباتی اور زوال پذیر ہونے کا بیان فرمانے کے بعد پھر اصل مقصود آخرت کی فکر کی طرف توجہ دلانے کے لیے آخرت کے حال کا ذکر فرمایا۔ وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللہِ وَرِضْوَانٌ یعنی آخرت میں انسان دو حالوں میں سے کسی ایک میں ضرور پہنچے گا، ایک حال کفار کا ہے ان کے لیے عذاب شدید ہے، دوسرا حال مومنین کا ہے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے

یہاں عذاب کا ذکر پہلے کیا گیا کیونکہ دنیا میں مست و مغرور ہونا جو پہلی آیات میں مذکور ہے اس کا نتیجہ بھی عذاب شدید ہے اور عذاب شدید کے مقابلہ میں دو چیزیں ارشاد فرمائیں، مغفرت اور رضوان، جس میں اشارہ ہے کہ گناہوں اور خطاؤں کی معافی ایک نعمت ہے جس کے نتیجہ میں آدمی عذاب سے بچ جاتا ہے مگر یہاں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عذاب سے بچ کر پھر جنت کی دائمی نعمتوں سے بھی سرفراز ہوتا ہے جس کا سبب رضوان یعنی حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے،

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی ان سب باتوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد ایک عاقل و بصیر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی نتیجہ دنیا کے بارے میں نہیں رہ سکتا، کہ وہ ایک دھوکہ کا سرمایہ ہے اصلی سرمایہ نہیں جو آڑے وقت میں کام آ سکے، پھر آخرت کے عذاب و ثواب اور دنیا کی بے ثباتی بیان فرمانے کا لازمی اثر یہ ہونا چاہیے کہ انسان دنیا کی لذتوں میں منہمک نہ ہو آخرت کی نعمتوں کی فکر زیادہ کرے۔ (معارف القرآن، ج:۸،ص:۳۱۲)

اگر غفلت و امید نہ ہوتیں تو دنیا ویران خانہ بن جاتی

میں آج بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا اگر ہم دنیا کے زوال پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ہم منٹوں سیکنڈوں میں دنیا کو کتنی تیزی سے چھوڑ دیتے ہیں، پچاس پچاس سال کی محنت ستر ستر سال کی محنت بڑے بڑے بنگلے اور سب کچھ لیکن اتنی تیزی سے رخصت ہوتے ہیں کہ ابھی انتقال ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے کہ میں اور آپ زمین کے نیچے جاکے مٹی کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔ تو میں یہ سوچتا تھا کہ اگر غفلت کے پردے ہمارے دلوں پر پڑے نہ ہوتے تو

میں آپ کو بتاؤں ہمیں یہاں بیٹھ کے تقریریں کرنی پڑتیں کہ اے لوگو! تم چوبیس گھنٹے کیوں سجدے میں پڑے ہو کچھ آؤ ذرا فیکٹری تو لگالو! آؤ ذرا کچھ کام دھام بھی دیکھ لو تو آپ لوگ جواب میں یہ کہتے کہاں کا کام دھام دیکھ لیں! ارے اس دنیا کے کام دھام ہم کریں گے؟ یہ تو بہت جلد ہم سے چھوٹنے والی ہے تو ہمیں اس کے لیے تقریریں کرنی پڑتیں کہ اٹھو ذرا کچھ تو کرلو! دیکھو! دنیا میں جینا بھی تو ہے۔ تو بس اخیر میں آپ یہی کہتے کہ بس جینے کے بقدر ہمیں تو تھوڑا سا کچھ کرنا ہے، باقی ہمارے پاس فرصت کہاں؟ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ دنیا سے کیسے منٹوں میں انسان چلا جاتا ہے۔

میرے گھر کے برابر میں ایک شخص تھا۔ کافی مدت سے ہمارا پڑوسی تھا۔ تو میں اچانک گھر پہنچا تو برابر مکان سے رونے کی آواز آئی۔ جب پتہ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ صبح سویرے بالکل ٹھیک ٹھاک ناشتہ کھانا وغیرہ کھایا۔ اور پھر سینے میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی اور ہارٹ اٹیک (Heart attack) ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں چند منٹوں میں چلتا بنا۔ اس کی بہت سی گاڑیاں، ٹرک، بسیں وغیرہ تھیں اور مختلف پراپرٹی اور زمین و جائیداد تھی، مگر سب کو یکدم چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور اپنے ساتھ کچھ لے کر نہیں گیا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

﴿ لَوْلاَ الْاَمَلُ لَفَاتَ الْعَمَلُ وَ لَوْلاَ الْغَفْلَةُ لَخَرَبَ الْعَالَمُ ﴾

(مرقاۃ المفاتیح)

اگر انسانوں کے دل میں تھوڑی غفلت نہ ڈالی جاتی تو یہ عالم سارا ویران پڑا ہوا ہوتا۔ دنیا میں کون لگتا سب یہ کہتے ارے بھائی! کاہے میں لگنا چاہتے ہو؟ اسی حقیقت کی ترجمانی کے لیے حضرت والا کا ایک قیمتی ملفوظ ہے ؎

جس جہاں سے ہمیشہ کو جانا
اور کبھی لوٹ کر پھر نہ آنا
یہ ہے ارشادِ قطبِ زمانہ
ایسی دنیا سے کیا دل لگانا

اس کو حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِقَدْرِ مَقَامِکَ فِیْھَا وَ اعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِقَدْرِ مَقَامِکَ فِیْھَا﴾

دنیا کے لیے اتنا کرو جتنا اس میں ٹھہرنا ہے اور آخرت کے لیے اتنا کرو جتنا تمہیں اس میں ٹھہرنا ہے۔

کوئی کمپیوٹر دنیوی واخروی زندگی میں پرسنٹیج (Percentage) نہیں نکال سکتا

تو میرے دوستو! کیا دنیا کا کوئی کمپیوٹر ایسا ہوسکتا ہے جو دنیا کی زندگی کا آخرت کی زندگی کے ساتھ مقابلہ کر کے کوئی Percentage نکال سکے۔ احقر اپنے علم کی حد تک یہ بات کہہ سکتا ہے کہ ایسا کوئی کمپیوٹر آج تک نہ ہی

ایجاد ہوا اور نہ ہی ہوسکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر محدود کا محدود کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ سو دنیا کی زندگی محدود ہے اور آخرت کی زندگی لامحدود۔ لہٰذا ان میں تقابل کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ذرا کمپیوٹر لا کر ساٹھ سال اور پھر چھ سو اور چھ ہزار اور چھ لاکھ اور چھ کروڑ اور چھ ارب اور چھ کھرب سال وغیرہ وغیرہ ایک لامحدود سلسلے تک آخرت کے دنوں کی گنتی ہے تو پھر کسی بھی کمپیوٹر پر اُس کا پرسنٹیج کیسے نکل سکتا ہے؟

میرے دوستو! یہ بات سن کر یونہی گزر جانے کی نہیں بلکہ عبرت ونصیحت کی ہے کہ دنیا کے لیے اتنا کیجئے جتنا یہاں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اُتنا وقت نکالیں جتنا وہاں رہنا ہے۔ آج ہم بیٹھ کر ذرا غور کریں تو چوبیس گھنٹے ہمارے دنیا کے کاموں میں چلے جا رہے ہیں۔ جلدی جلدی تھوڑا بہت وقت دین کے لیے نکال پاتے ہیں کہ چلو جلدی جلدی نماز پڑھ کے آ جائیں، جبکہ ہونا اس کے برخلاف چاہیے تھا کہ چوبیس گھنٹے اللہ کے لیے وقف کیے جاتے۔ اور پھر بقدرِ ضرورت دنیا کی ضرورت اور تقاضوں کو پورا کرلیا جاتا۔ مثلاً ذرا بھوک لگی ہے تو کچھ کھانے پینے کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ چلو ایک دو گھنٹہ کچھ کر کے آ جائیں۔ دس بیس دن مہینے دو مہینے کے لیے کچھ کما لیں، فارغ ہو جائیں گے، پھر اپنا سارا ٹائم اللہ اللہ کرنے میں لگائیں گے۔ اس لیے کہ دنیا کا اتنا بھی تناسب آخرت کے مقابلے میں نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت والا نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا۔

یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دارِ فانی کا

کیونکہ اللہ والوں پر جب دارِ فانی کا حال کھلتا ہے تو حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا کے متعلق جو روایات ہیں اگر ہم انہیں غور سے پڑھیں تو یہ پتہ چل جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے معمولی سی بھی محبت نہیں تھی نہ آپ کے صحابہ کو دنیا کے ساتھ کوئی تعلق اور لگاؤ تھا۔ جیسا کہ مختلف روایات اسی ''عرفانِ محبت'' میں کئی جگہ ذکر کی گئی ہیں اور اوپر قرآنِ کریم کی آیت کی تفصیل کے ذیل میں بھی دنیا کی حقیقت کا مضمون آ چکا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا محسن ہمارا کوئی نہیں

تو میرے دوستو! غور سے بتاؤ روئے زمین پر آج تک ہمارا سب سے بڑا محسن، خیر چاہنے والا، بھلائی کا طلبگار، ہماری عافیت و آرام وراحت کے لیے تڑپنے والا، آہیں بھرنے والا کون تھا؟ آپ سب یہی کہیں گے کہ بجز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کوئی نہیں۔ تو جب آپ کا حال دنیا کے ساتھ تعلق ومحبت کا بالکل نہ تھا تو پھر اُمت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ دنیا کے ساتھ محبت رکھے اور اُس کو دل میں بسائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

﴿مَا لِي وَ لِلدُّنْيَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا﴾
(مشكاة المصابيح، كتاب الرقاق، ص: ۴۴۲)

میری مثال ایسے مسافر کی ہے جو چلا جا رہا ہو اور ایک درخت کے نیچے ذرا سایہ حاصل کرنے کے لیے کچھ دیر آرام کیا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہاں سے آگے چلتا بنا اور اُس کو چھوڑ دیا۔ جیسا کہ ہم لوگ ساؤتھ افریقہ میں دو سو تین سو کلومیٹر چلنے کے بعد اپنی گاڑی کو روک کر بعض ایسے مقامات پر جہاں درختوں کا اچھا سایہ ہوتا ہے ٹھہر جاتے ہیں اور پھر وہاں پندرہ بیس منٹ یا آدھا گھنٹہ ٹھہرنے کے بعد وہاں سے آگے چل دیتے ہیں۔ تو گویا کہ دنیا کا قیام بس اتنا سا ہے جتنا کہ اس درخت کے نیچے سایہ لینے کے لیے ٹھہرنا۔ ایک روایت میں یوں ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی سمندر میں اپنی انگلی کو ڈالے اور پھر دیکھے کہ وہ کتنے پانی کے ساتھ لوٹتی ہے، تو دنیا کو آخرت کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو کہ اس انگلی کے پانی کو سمندر کے پانی کے مقابلے میں ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کم ہے۔

ہم تھوڑی سی دنیا لینے کے لیے بالفاظ دیگر (از روئے حدیث پاک) یوں کہہ لیجئے کہ مچھر کے پر کا اربوں کھربوں والا حصہ لینے کے لیے اپنا ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔

محبوب ومحبوبہ پر جان وایمان قربان کرنے کی بات کرنا

ایک جگہ میں نے عرض کیا تھا جو لوگ اپنے محبوب ومعشوق کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ میری جان بھی تجھ پر قربان، میرا ایمان بھی تجھ پر قربان تو ایسی صورت میں ایمان قربان کرنے سے یہ شخص دائرۂ ایمان سے نکل جائے گا۔ کسی مخلوق کی محبت میں یوں کہنا کہ تجھ پر میرا ایمان بھی قربان، ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کو مستلزم ہے اور ایسے شخص کو ایمان کی تجدید کرنی چاہیے۔ یہ آجکل کے جوان ان کو پتہ تو ہے نہیں نہ اہل اللہ کی صحبت حاصل ہے اور نہ علماء کرام سے ملنا جلنا۔ اپنے محبوبوں کو ایسے ایسے جملے بولتے پھرتے ہیں کہ میرا دل تجھ پر قربان، میرا سب کچھ قربان۔ ارے ظالم! یہ تو تجھے صرف اللہ کو کہنا چاہیے تھا کیوں کہ اس کی دی ہوئی جان، اس کا دیا ہوا ایمان، اس کی دی ہوئی صحت، اس کا دیا ہوا چین وسکون وراحت اسے کہنا چاہیے تھا کہ اے اللہ! سب تیرے اوپر قربان تب تو یہ جملہ جچتا اور سمجھ میں آتا کہ ہاں تم نے صحیح جگہ قربان کیا ہے، لیکن یہ غیر کے اوپر قربان کرنا کیسی نادانی اور جہالت ہے اور یہ بات یاد رکھیئے کہ جب تک یہ دار فانی نگاہوں سے نہ گرے تب تک اللہ کی محبت اور ایمان کامل قلب میں نہیں آتا۔ فرماتے ہیں کہ ؎

یہ جہاں گر گیا نگاہوں سے
جب کھلا حال دار فانی کا

دل بہلانے کا سامان ختم ہوا تو پھر؟

میر اب دل کو کس سے بہلائے
اڑ گیا رنگ حسن فانی کا

اہلِ مجلس میں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضرت میر صاحب کسی کے عاشق تھے اور اس کے حسن کا رنگ اُڑ گیا

اور اب حضرت اُن کے متعلق فرما رہے ہیں بلکہ دراصل حضرت کا یہ تکیۂ کلام ہے۔ میر صاحب کو مخاطب بنا کر پوری امت کو یہ بات پہنچاتے ہیں اور امت کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ ہم سب اہل مجلس اس کے مخاطب ہیں اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ پورے کلام میں جہاں جہاں بھی حضرت والا نے یہ خطاب کیا ہے تو اس کا منشا میر صاحب کو مخاطب بنانا نہیں بلکہ میر صاحب کے عنوان سے دراصل سب کو خطاب کرنا ہے کہ اے وہ انسان! جو کسی کے حسن مجازی پہ عاشق ہے تو کس سے دل بہلائے گا جب اس کا حسن اڑ چکا ہوگا، اس لیے خالق حسن اور خالقِ لذات کائنات کے اوپر فدا ہو جا کہ اُس کے حسن و جمال کو کبھی زوال نہیں اور وہ ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

دل لگا بس خدا سے اے ظالم
خوف کر موت ناگہانی کا

اس مصرع میں حضرت والا یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ سب گزر گیا۔ اس سب کو دل سے نکال دے اور اللہ سے دل لگا لے۔ اب سامعین اور قارئین کو یہ بات ذہن میں آ سکتی ہے کہ ہفتے کے بعد جمعہ کو توبہ کر لیں گے یا رمضان میں توبہ کر لیں گے یا کسی اور خاص موقع پر اپنے گناہوں کو چھوڑ کر اللہ والے بن جائیں گے۔ اس لیے حضرت والا نے فوراً دوسرے مصرع میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ اللہ سے دل لگانے کے لیے اور مخلوق سے دل ہٹانے کے لیے کسی خاص دن اور وقت کے انتظار میں مت رہ۔ جیسا کہ لوگ سوچتے ہیں جمعرات جمعہ آ رہا ہے، بس غسل کر کے توبہ کر لوں گا۔ حضرت فرماتے ہیں ایسا نہ کر! ابھی اسی گھڑی میں جب یہ بات سنی اور دل میں نیکی کی طرف داعیہ پیدا ہوا تو اسی وقت فوراً توبہ کر لے۔ کیونکہ موت کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ کب آ پہنچے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ رات سر کے اوپر سے صحیح گزرے یا صبح اس حال میں ہو کہ دنیا سے جا چکے ہوں۔ غرض یہ کہ موت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تو پھر ہر وقت اس حال میں رہنا چاہیے کہ ہمارا دل اللہ تعالیٰ سے لگا ہوا ہو اور غیر کا دل میں گزر نہ ہو۔ چنانچہ اولیاء اللہ ہر گھڑی اسی طرح زندگی گزارتے ہیں اور اپنے سارے معاملات بالکل صاف ستھرے رکھتے ہیں کہ جب بھی موت کا فرشتہ آئے تو وہ سفرِ آخرت کے لیے تیار ہوں۔

شیخ کامل کے فیض سے دل ہے
حامل کیف جاودانی کا
خاک تن کو عطا ہوا ان کا غم
ہے صلہ ان کی مہربانی کا

اس شعر میں حضرت والا نے اعتدال والا مسلک پیش کیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی محبت کا دردِ غم حاصل کرنے کے لیے اہل اللہ کی صحبت اور ان کا فیض بہت ضروری ہے، لیکن اہل اللہ کی صحبت اور ان کی برکت سے جو کچھ حاصل

ہو رہا ہے اس میں اصل جو دخل ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو ہے۔ اسی لیے خالی مشائخ کو سب کچھ سمجھنا اور بس اُن سے تعلق کر لینے پر تکیہ لگا لینا غلط ہے اور کلی طور پر مشائخ سے بالکل صرفِ نظر کر کے اپنی اصلاح کا تصور کرنا اور قلب میں خاص حلاوتِ ایمانی کے مل جانے کا خواب دیکھنا یہ بھی فضول ہے۔ اس لیے اصل اللہ تعالیٰ کے فضل سے کام بنتا ہے مگر اللہ نے شیخ کو دنیا میں واسطہ بنایا ہے۔ ان دونوں باتوں سے مل کر بندۂ مؤمن حاملِ کیفِ جاودانی ہوتا ہے اور اُسے نورِ ایمانی عطا ہو جاتا ہے۔

دعویٰ وتحدیثِ نعمت اور اکمل وافضل کا فرق

بظاہر اس شعر میں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت والا اپنے متعلق اپنی اصلاحِ قلب کے ہو جانے کا دعویٰ کر رہے ہیں جو نصِ صریح کے خلاف ہے، کیونکہ حدیث شریف میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے آپ کو خود مزکّی مجلّٰی ومصفّٰی مت کہو اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بھی اس بات سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا اپنے متعلق اس طرح کی بات کہنا کہ میرے دل کو کیفِ جاودانی حاصل ہے، بظاہر صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے، جس کو حضرت تھانوی قدس سرہ نے ''انفاسِ عیسیٰ'' اور ''التکشف'' میں ذکر کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ بات تو کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ آخرت کے اعتبار سے اپنے کو کسی دوسرے کے مقابلے میں افضل کہے اور زیادہ بڑے درجے والا کہے۔ لیکن یہ بات جائز ہے کہ کسی محسوس حاصل ہونے والی نعمت کے متعلق بندہ اپنی زبان سے اظہارِ شکر کے طور پر بطریقِ تحدیثِ نعمت کوئی بات عرض کر دے۔ جیسے مثلاً اگر ایک شخص حافظِ قرآن ہے تو وہ غیر حافظ کے مقابلے میں یہ کہہ سکتا کہ میں حافظ ہوں۔ یا اسی طرح ایک شخص حافظ اور عالم بھی ہے تو وہ صرف حافظ کے مقابلے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ میں عالم بھی ہوں۔ مگر یہ بات تحدیثِ نعمت کے طور پر ہونی چاہیے، دعویٰ اور خود پسندی یعنی عُجب اور تکبر کے طور پر نہ ہو جس کی پہچان حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ لکھی ہے کہ اُس نعمت کو بیان کرتے وقت میں یہ خطرہ دل میں لگا رہے کہ نامعلوم میرا یہ وصف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول بھی ہے یا نہیں؟ اور پتہ نہیں میں اس پر مرتے دم تک قائم رہوں یا نہیں جبکہ میرے مقابل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت سے نواز دیا جائے؟ نیز مجھ میں کوئی ایسی بُرائی ہو جس کی وجہ سے میں اللہ کی بارگاہ سے دور کر دیا جاؤں اور سامنے والے میں کوئی ایسا کمال ہو جس کی وجہ سے وہ اللہ کی بارگاہ کا مقرب قرار پائے۔

لہٰذا اس اصول کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان خطرات کے دل میں قائم رکھنے کے ساتھ استحضارِ عظمتِ خداوندی اور خوفِ بے نیازئ باری تعالیٰ کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص اس طرح کی بات کہہ دے تو یہ عین تحدیثِ نعمت ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ کیونکہ اگر نعمت ملنے کے بعد اُس کے ملنے کا احساس نہ ہو تو اُس پر بندہ شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا احساس ہونا لازم اور ضروری ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے لیے دل میں جذباتِ شکر پیدا

ہوں۔ جولوگ بظاہر زبان سے یہ کہتے ہوئے ہوتے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں یعنی رسمی تواضع دکھاتے ہیں اور حقیقی متواضع نہیں ہوتے تو وہ بظاہر اس طرح کی چیزوں کے زیادہ پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

شیخ صرف ذریعہ ہے دینے والا اکیلا اللہ ہے

لہٰذا میرے دوستو! اگر اللہ والوں سے ملو گے تو یہ دولتِ معرفتِ خداوندی حاصل ہوگی ورنہ سنت اللہ یہی ہے کہ راہ رو تھک کر بیٹھ جاتا ہے مگر اُسے منزل نظر نہیں آتی۔ البتہ منزل تک پہنچانے والا اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہی ہوگا، کیونکہ خود کسی شیخِ کامل اور مصلحِ باطن سے تعلق کا پیدا ہوجانا یہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے جس میں ہمارا ذاتی کوئی کمال نہیں ہے۔ بس اپنے محبوب بندے کے دل کو اللہ تعالیٰ متوجہ فرما دیتے ہیں کہ جاؤ! میرے فلاں بندے کے ساتھ تعلق قائم کرواور اس سے میرا راستہ پوچھو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡئَلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا﴾

(سورۃ الفرقان، آیت: ۵۹)

کہ میرے متعلق کسی میرے باخبر بندے سے پوچھ لو۔ اس لیے کسی اللہ والے کے پاس اپنی اصلاح کے لیے پہنچ جانا یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اس پر اللہ کا فضلِ خاص ہو چکا ہے۔

یہ دعا کہ میرا حشر میرے شیخ کے ساتھ ہو

اس موقعہ پر ایک اور اہم بات ہے جس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعا کرنا کہ ہمارا حشر حضرت کے ساتھ ہو یا ہم حضرت والا کی طرح ہوجائیں۔ احقر کو پورے قرآن وسنت میں اس طرح کی دعا کی کوئی ایک نظیر بھی نہیں ملتی اور اگر اس کو جائز کہا جائے تو صرف اُن صحابۂ کرام کے متعلق کہا جا سکتا ہے جن کو بزبانِ نبوت جنت کی بشارت دی جا چکی تھی۔ اور اس لحاظ سے اُن کا جنت میں جانا یقینی ہو چکا تھا یا صحابہ کے ایمان اور تقویٰ کے مانند اللہ تعالیٰ سے دعا میں ہم درخواست کر سکتے ہیں کیونکہ خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے ایمان کو معیار قرار دے کر ہمیں حکم دیا ہے کہ اٰمنوا کما اٰمن الناس یعنی ویسا ایمان لاؤ جیسا ایمان صحابہ لائے ہیں۔ تو یہ تشبیہ اس اعتبار سے درست ہوسکتی ہے۔

یا پھر شیخ ومرشد کے خاص اوصاف وکمالات کو اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے مانگنا یہ بھی درست کہا جا سکتا ہے لیکن اپنی ذات کو اُن کی ذات کی طرح کرنے کی دعا کرنا جبکہ اللہ تعالیٰ اُس سے بہت اوپر کے درجات دینے پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور دیتے ہیں اور دیتے رہیں گے اور مقامات ودرجاتِ تقربِ خداوندی غیر محدود ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے بغیر کسی شخصیت کی تشبیہ سے دعا مانگی جائے تو یہ طریقہ سب سے بہتر ہوگا۔

اور سب سے افضل بات تو یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر دنیا وآخرت کی خیر مانگنے کے

لیے دعائیں اور اُن کے الفاظ اور انداز اور اپنی حاجات و مقاصد سب کچھ احادیثِ مبارکہ میں ماثورہ دعاؤں میں پیش فرمادیا ہے۔ تو پھر ہمیں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ زیادہ اہتمام اُنہی دعاؤں کا کرنا چاہیے۔

ہاں! اگر کسی کو اسی طرح کے الفاظ میں دعا مانگنی ہو تو یہی الفاظ معمولی تغیر و تبدل سے بالکل درست اور صحیح ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہم یوں کہیں ''اللہ تعالیٰ میرا اور میری اولاد کا حشر کل قیامت کے دن اپنی جنتوں اور رحمتوں میں میرے شیخ کے ساتھ کردے۔'' یا مثلاً دعا یوں مانگے ''اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ کی طرح نیک اور صالح اور متقی و پرہیزگار بنادے۔'' اس جملے میں گویا آپ نے اپنے لیے دعا مانگنے کے ساتھ سامنے والے کے لیے بھی دعا مانگ لی جو ظاہر ہے کہ ہر لحاظ سے بہتر ہی بہتر ہے۔ کیونکہ شیخ کے لیے دعا کرنے اور قبول ہونے کے فوائد آپ کو بھی حاصل ہو گئے۔

اور ہم سب کو اس نقطۂ نظر سے بھی اس پر غور کرنا چاہیے کہ متقدمین اسلاف میں یا ہمارے اکابر علمائے دیوبند میں اُن کی تصنیف و تالیف اور ان کی تحریر و تقریر میں اس طرح کے جملوں کا کتنا استعمال ہوا ہے؟ مثلاً لفظ لفظ میں میرے شیخ کی برکت یا میرے شیخ کا صدقہ یا میں شیخ کی طرح ہو جاؤں وغیرہ وغیرہ الفاظ حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ یا حضرت گنگوہی یا حضرت قاسم نانوتوی اور دیگر ہمارے اکابر کے کلام میں کتنا استعمال ہوا ہے؟

میری ان باتوں سے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ میں حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اکابر رحمہم اللہ سے فیض حاصل ہونے اور اُن کی برکات کا منکر ہوں، بلکہ مقصد صرف اتنی بات ہے کہ بندۂ مؤمن کو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کے لحاظ سے ہر خیر و خوبی کی نسبت اوّلاً اپنے خالق و مالک کی طرف کرنی چاہیے اور پھر ثانوی درجے میں دوسرے حضرات کی طرف نسبت کر دی جائے تو کوئی حرج نہیں اور گفتگو اور تعبیر میں بھی اس کا لحاظ ہو تو بہتر ہوگا۔

میری گفتگو پر ایک شبہہ اور اس کا جواب

اس پر بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہماری مراد و مقصد بولتے وقت میں یہی ہوتا ہے کہ اصل تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور ہم اس کے منکر نہیں ہیں، صرف بار بار زبان پر اس لفظ کو نہیں لاتے لیکن مراد دل میں یہی ہوتی ہے، مگر ان حضرات کی تاویل درست نہیں ہے کیونکہ جس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات ارشاد فرمائی:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(سورۃ الکہف، آیت ۲۳)

کہ آپ ہرگز کسی بات کے متعلق یہ نہ کہیں کہ میں اس کو آئندہ کرنے والا ہوں مگر ان شاء اللہ کے ساتھ۔ ظاہر ہے

اس آیت کے شانِ نزول کے وقت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم زبان ہی سے تو ان شاء اللہ کہنا بھول گئے تھے ورنہ دل میں تو ان شاء اللہ موجود تھا جو کہ ایک واضح اور یقینی چیز ہے۔ جس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ وحی کو روک کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باخبر کیا گیا۔

تصویر کا دوسرا رخ اور دو افسوسناک قصے

اس کے بالکل برخلاف بعض لوگ بزرگوں سے تعلق رکھنے کو اپنی نگاہوں میں اتنا معیوب اور خراب سمجھتے ہیں کہ وہ یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ جیسے ہی بزرگوں سے تعلق ہوا تو پھر یہ آدمی ایک طرف کونے میں یکسو ہو کر رہ جائے گا اور دین کی کوئی خدمت نہ کر سکے گا اور نہ قوم کے کسی خاص کام کا رہے گا۔ نہ لوگوں کے ایمان وعمل کی فکر اس کے دل میں برقرار رہے گی۔

جیسا کہ ایک شخص نے اپنی جہالت اور نادانی کی بنیاد پر حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے بارے میں یہ بات کہی کہ افسوس مولانا اشرف علی تھانوی ایک خانقاہ کے اندر بند ہو کر رہ گئے۔ قصبہ تھانہ بھون میں خانقاہ سے نکل کر یہ بھی نہ دیکھا کہ لوگوں کا کلمہ صحیح ہے کہ نہیں۔ جو کہ ایسی مہمل اور جاہلانہ بات ہے کہ جس کو دنیا کا ہر ایک اہلِ حق عالم خواہ اس کا کسی شعبے سے تعلق ہو اس شخص کی حماقت اور جہالت پر مبنی جملہ قرار دے گا۔

اور اس سے آگے بڑھ کر ایک قصہ میرے ایک شاگرد نے مجھ کو سنایا کہ وہ ہمارے حضرت والا کے پاس سے جیسے ہی خانقاہ سے باہر نکلے تو کسی شخص کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر حضرت مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب کے یہاں جارہے تھے اور اتفاق یہ تھا کہ وہ گاڑی والے بھی وہیں جارہے تھے۔ انہوں نے اس طالب علم سے پوچھا ابھی کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت والا کے پاس سے آیا ہوں۔ تو فوراً بولے کہ حضرت والا نہیں کہنا چاہیے، یہ اللہ تعالیٰ کے وزن پر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ ویسے حضرت والا۔ اس لیے انہوں نے بڑے خیر خواہانہ انداز سے نصیحت کی کہ بھئی ایسے لفظ سے بچنا چاہیے۔

بہر حال یہ خاموشی کے ساتھ چلتے رہے۔ جب یہ حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچے، پروگرام سے فارغ ہو کر ملاقات کی تو وہیں مفتی صاحب نے اس طالب علم سے یہ دریافت کیا کہ حضرت والا کی طبیعت کیسی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا الحمدللہ ٹھیک ہے۔ مگر بڑی سمجھداری اور ہوشیاری کے ساتھ اسی مجلس میں اُن دوسرے معترض صاحب کی موجودگی میں حضرت مفتی صاحب سے اس طالب علم نے یہ مسئلہ پوچھ لیا کہ کیا حضرت والا کا لفظ اپنے شیخ کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج ہے؟ تو حضرت مفتی صاحب نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ تو اس طالب علم نے عرض کیا کہ حضرت بعض لوگ اس طرح سے کہتے ہیں کہ حضرت والا، اللہ تعالیٰ کے وزن پر ہے۔ مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ یہ اُن کے دماغ کی خشکی کی بات ہے۔ بالآخر وہ صاحب وہاں سے دُم دبا کر بھاگے۔

ظاہر ہے کہ یہ دوسری جانب مسئلہ میں حد سے تجاوز کی بات ہے جبکہ اسلام اعتدال والا مذہب ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں شریعت کا دیا ہوا ہر حکم اعتدال پر مبنی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر پڑھ کر دیکھنے سے پتہ چل جائے گا کہ ہم نے تم کو درمیانی اُمت بنایا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت:۱۴۳)

ہر ہر شعبۂ حیات میں دیا جانے والا حکم افراط وتفریط سے خالی ہے اور یہی اس مذہب کی حقانیت کی دلیل ہے۔ لہٰذا افراط وتفریط کی بات کرنے والے دونوں حضرات کو اپنے موقف پر غور اور فکر کرنا چاہیے۔

مستی خمرِ آسمانی

حال دیکھو تو اللہ والوں پر
مستیٔ خمرِ آسمانی کا
سن لو قصہ زبانِ اخترؔ سے
اس کے دل کے غمِ نہانی کا

اللہ والوں کو اللہ کا خاص قرب عطا ہوتا ہے کہ جس کی بدولت وہ عجیب کیف وسرور کے عالم میں رہتے ہیں اور بظاہر دنیا کی شراب سے وہ دور ہوتے ہیں لیکن اللہ کی محبت کی شراب پی کر اُن کے دل میں عجیب مستی چھائی رہتی ہے۔ حضرت والا نے ایک مقام پر یوں فرمایا۔

میرے پینے کو دوستو سن لو
آسمانوں سے مے اُترتی ہے

جس کا نشہ اُس وقت میں ظاہر ہوتا ہے جب اہلِ دنیا اِن اللہ والوں سے دنیاوی مفادات کے چھوڑ دینے اور آخرت کو ترجیح دینے کے معاملات میں اِن کو پاگل اور مجنون اور دیوانہ وغیرہ کہتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ اللہ کی محبت کی شراب پیئے ہوئے ہر وقت اسی نشے میں مست رہتے ہیں۔

پھر حضرت والا اخیر میں یہ بات ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا خاص غم عطا فرمایا ہے۔ اس لیے جو کچھ اختر تمہیں سنا رہا ہے یہ محض الفاظ کی جمع وترتیب نہیں ہے بلکہ اُس کے اندرونِ قلب کا حالِ غم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اور بزرگوں کی دعاؤں سے اختر کو عطا فرمایا ہے۔ کہیں حضرت والا اسی کو یوں فرماتے ہیں۔

میں تھک جاتا ہوں اپنی داستانِ درد سے اخترؔ
مگر میں کیا کروں چپ بھی نہیں مجھ سے رہا جاتا

یہ جتنے مضامینِ عشق ومحبت اور مواہبِ علم وحکمت حضرت والا کے قلب پر القا ہوئے ہیں اور پھر اشعار کی شکل میں موزوں ہوگئے۔ نیز حضرت والا کے جملہ مواعظ وبیانات وغیرہ یہ سب اسی دردِ دل کی داستان کی ترجمانی ہیں۔

ہے عجم اس کا پھر مدینے میں

میر رہتا تھا جو نگینے میں دیکھو بیٹھا ہے کس سفینے میں
زندگی گر فدا ہے مالک پر کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں
بے بیانی بھی ہے بیاں اس کا دردِ نسبت ہے جس کے سینے میں
ہے خفا جس سے پالنے والا کوئی جینا ہے اس کے جینے میں
دوستو سب کرم ہے مالک کا خوبیاں کیا ہیں اس کمینے میں
راہِ سنت پہ جو چلے اختؔر ہے عجم اس کا پھر مدینے میں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ مالک: اللہ تعالیٰ۔ **حلاوت**: مٹھاس۔ **خفا**: ناراض۔ **عجم**: عرب کے علاوہ دنیا کا باقی حصہ۔

میر صاحب کا سفینہ نگینہ سے بہتر

میر رہتا تھا جو نگینے میں
دیکھو بیٹھا ہے کس سفینے میں

اللہ تعالیٰ نے حضرت میر صاحب کو یہ سعادت بخشی ہے کہ بچپن سے لے کے ابھی تک تقریباً چالیس سال سے حضرت والا دامت برکاتہم کے ساتھ خادمانہ طور پر مستقلاً سفر وحضر میں ساتھ رہتے ہیں اور مولد ومسکن کے اعتبار سے ہندوستان کے شہر مرادآباد کے پاس نگینہ ایک قصبہ ہے اس کے رہنے والے ہیں پھر پاکستان ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے تو کراچی آنے کے بعد مختلف بزرگوں کی خدمت میں آتے جاتے مگر اپنے مزاج میں مناسبت صرف حضرت والا کے ساتھ پاتے تھے اس لیے حضرت کے ساتھ مضبوطی سے جم کر رہتے رہے۔

یہاں تک کہ بعض حضرات کو محض اس وجہ سے اعتراض بھی ہوا کہ اس وقت تک حضرت بزرگوں کی صفوں میں اس قدر مشہور نہ تھے تو میر صاحب کو بعض ان کے رشتہ دار حضرت والا کے پاس آنا جانا چھوڑ دینے کو کہا کرتے تھے اور دوسرے بزرگوں کے پاس جانے کا مشورہ دیتے تھے مگر بہرحال یہ حضرت میر صاحب کی بصیرت کہیے کہ مستقبل قریب میں تمام بزرگوں کی نگاہوں کا تارہ اور قلب کی ٹھنڈک بننے والے ہمارے شیخ ومرشد عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم کو اسی وقت سے اپنی اصلاح کے لیے اپنا شیخ بنالیا اور ہر وقت سفر وحضر میں ساتھ رہنے لگے۔

بالخصوص کیونکہ حضرت میر صاحب کے ذمہ بوجہ اہل وعیال نہ ہونے کے گھر والوں کے حقوق واجبہ نہیں تھے اس لیے شب وروز حضرت ہی کے ساتھ رہتے تھے جس کی بدولت میر صاحب کو عالم نہ ہونے کے باوجود اللہ

تعالیٰ نے علماء کا شیخ و مصلح اور مرشد و مربی بنایا ہے خود احقر کے بہت سے خطوط کے جوابات اور مختلف امور کے مشورے حضرت میر صاحب ہی سے ملا کرتے ہیں اور بظاہر حضرت میر صاحب اور حضرت والا کے جوابات اور مشوروں میں کوئی خاص بین فرق نظر نہیں آتا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت میر صاحب نے حضرت والا سے غایت درجہ مناسبت کی بنیاد پر شان استفادہ بہت ہی غالب رہی کہ ہوتے ہوتے حضرت والا کی تعلیمات میر صاحب کے زبان و قلم میں سرایت کرگئی۔

اور چونکہ دین پر چلنا اور اللہ کی محبت سیکھ لینا اور اس کے قرب و معرفت کا حاصل کر لینا انسان کے لیے گناہوں کے سمندر میں ڈوب کر تباہ ہو جانے سے بچانے اور بخیر و عافیت اپنی منزل اور ساحل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اس لیے یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ میر صاحب دین کی ایسی کشتی میں سوار ہیں جو انہیں ان کی منزل یعنی اللہ کی رضا اور خوشنودی اور آخرت میں جنتوں کے حصول تک پہنچانے والی ہے۔

حلاوتِ حیات اور دردِ نسبت

زندگی گر فدا ہے مالک پر
کیا حلاوت ہے اس کے جینے میں

چونکہ انسان کے ظاہر اور باطن کے سکون کا دارومدار اور بنیاد دل کے سکون اور راحت پانے پر ہے اور اسی طرح بے چینی اور پریشانی کی جڑ دل کی بے چینی اور پریشانی ہے اس لیے جو آدمی اللہ تعالیٰ پر پورے طور پر فدا ہوگا اور اس کا ظاہر و باطن سب اللہ کے احکام کے مطابق ڈھلا ہوا ہوگا اس کے دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مست ہوں گے تو روح کے قرار پانے کی جو غذا ہے وہ اسے میسر آرہی ہوگی تو پھر اس کے جینے میں حلاوت کا ہونا یقینی بات ہے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اَھْلُ اللَّیْلِ فِیْ لَیْلِھِمْ اَلَذُّ مِنْ اَھْلِ اللَّھْوِ فِیْ لَھْوِھِمْ یعنی راتوں میں اللہ کے سامنے عبادت کرنے والے زیادہ مزے اور لطف میں ہیں بہ نسبت کھیل تماشہ کرنے والوں کے ان کے کھیل میں جیسا کہ کتاب میں مختلف مقامات پر یہ موضوع مذکور ہوا ہے۔

بے بیانی بھی ہے بیاں اس کا
دردِ نسبت ہے جس کے سینے میں

مختلف اشعار کے ضمن میں یہ بات آئی ہے کہ اہل اللہ کے پاس محض بیٹھنے سے بیان و تقریر کا نفع حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے سینے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایسی آگ لیے رہتے ہیں یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ ان کے سینوں میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات قرب کے انوارات اس قدر ہوتے ہیں کہ جو دل ان سے قریب ہو تو وہ بھی اس آگ سے جلنے اور ان انوارات سے روشن ہونے لگتا ہے اگرچہ بیان اور تقریر کی نوبت نہ آئی ہو اس لیے بزرگوں کا فیض

تقریر و وعظ پر موقوف نہیں ہوتا جیسا کہ یہ چیز روزانہ ہمارے مشاہدے میں ہے مختلف احادیث بھی اس پر دلیل ہیں کہ جن میں صرف اہل اللہ کے پاس بیٹھنے اور ان سے ملنے نیز محبت رکھنے کو نافع قرار دیا گیا ہے اور اس پر فضیلت و اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ہے خفا جس سے پالنے والا
کوئی جینا ہے اس کے جینے میں

یعنی جو شخص اس طرح زندگی گزارتا ہو کہ وہ اپنے پالنے والے کو گناہوں اور نافرمانیوں کے ذریعے ناراض کیے ہوئے ہو تو پھر اس کی زندگی زندگی کہلانے کے قابل نہیں اور اس کا جینا کوئی جینا نہیں یعنی بے مقصد حیات اور بے فائدہ زندگی ہے اور بے وجہ جینا ہے اسی لیے تو قرآن نے کافر کو زندہ بھی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کو مردہ سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ (یعنی گمراہ) تھا پھر ہم نے اس کو زندہ یعنی مسلمان بنا دیا۔

مومن زندہ اور کافر مردہ کیوں؟

حضرت مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس تمثیل میں مومن کو زندہ اور کافر کو مردہ بتلایا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ انسان اور حیوانات اور نباتات وغیرہ میں اگرچہ حیات اور زندگی کی قسمیں اور شکلیں مختلف ہیں لیکن اتنی بات سے کوئی سمجھدار انسان انکار نہیں کرسکتا کہ ان میں سے ہر ایک کی زندگی کسی خاص مقصد کے لیے ہے، اور قدرت نے اس میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھی ہے، ارشاد قرآنی ہے قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی میں اسی کا بیان ہے کہ اللہ جل شانہ نے کائنات عالم کی ہر چیز کو پیدا فرمایا اور اس کو جس مقصد کے لیے پیدا فرمایا تھا اس تک پہنچنے کی اس کو پوری ہدایات دے دیں، جن کے ماتحت ہر مخلوق اپنے اپنے وظیفۂ زندگی اور اپنی اپنی ڈیوٹی کا حق ادا کر رہی ہے۔

اس عالم میں زمین، پانی، ہوا اور آگ، اسی طرح آسمانی مخلوقات اور چاند، سورج اور کل ستارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح پہچان کر اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں اور یہی ادائے فرائض ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے اور جس وقت جس حال میں ان میں سے کوئی چیز اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے پانی اگر اپنا کام پیاس بجھا دینا اور میل کچیل دور کرنا چھوڑ دے تو وہ پانی نہیں کہلائے گا، آگ جلنا اور جلانا چھوڑ دے تو وہ آگ نہیں رہے گی، درخت اور گھاس اگنا اور بڑھنا پھر پھل پھول لانا چھوڑ دے تو وہ درخت اور نبات نہیں رہے گی کیونکہ اس نے اپنے مقصد زندگی کو چھوڑ دیا تو وہ ایک بے جان مردہ کی طرح ہوگئی۔

تمام کائنات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک انسان جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو اس بات پر غور کرنے کے

لیے مجبور ہوگا کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی ڈیوٹی کیا ہے اور یہ کہ اگر وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر رہا ہے تو وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے، اور اس کو پورا نہیں کرتا تو وہ ایک مردہ لاش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

اب سوچنا یہ ہے کہ انسان کا مقصد زندگی کیا ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں اور مذکور الصدر اصول کے مطابق یہ متعین ہے کہ اگر وہ اپنے مقصد زندگی اور ڈیوٹی کو ادا کر رہا ہے تو زندہ ہے ورنہ مردہ کہلانے کا مستحق ہے، جن بے بصیرت لوگوں نے انسان کو دنیا کی ایک خودرو گھاس یا ایک ہوشیار قسم کا جانور قرار دیدیا ہے اور ان کے نزدیک ایک انسان اور گدھے، کتے میں کوئی امتیاز نہیں، ان سب کا مقصد زندگی انہوں نے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنا، کھانا پینا سونا جاگنا، پھر مرجانا ہی قرار دے لیا ہے، وہ تو اہل عقل وشعور کے نزدیک قابل خطاب نہیں عقلاء دنیا خواہ کسی مذہب وملت اور کسی مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہوں ابتداء عالم سے آج تک انسان کے مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات ہونے پر متفق چلے آئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ افضل واولیٰ اسی چیز کو سمجھا اور کہا جاسکتا ہے، جس کا مقصد زندگی اعلیٰ وافضل ہونے کے اعتبار سے ممتاز ہو اور ہر سمجھ بوجھ والا انسان یہ بھی جانتا ہے کہ کھانے پینے، سونے جاگنے، رہنے سہنے، اوڑھنے پہننے میں انسان کو دوسرے جانوروں سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں بلکہ بہت سے جانور اس سے بہتر اور اس سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں اور جہاں تک اپنے نفع نقصان کے پہچاننے کا معاملہ ہے اس میں بھی ہر جانور بلکہ ہر درخت ایک حد تک باشعور ہے، مفید چیزوں کے حاصل کرنے اور مضر چیزوں سے بچنے کی خاصی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے، اسی طرح دوسروں کے لیے نفع رسانی کے معاملہ میں تو تمام حیوانات اور نباتات کا قدم بظاہر انسان سے بھی آگے نظر آتا ہے کہ ان کے گوشت، کھال ہڈی، پٹھے اور درختوں کی جڑ سے لے کر شاخوں اور پتوں تک ہر چیز مخلوق کے لیے کارآمد اور ان کی ضروریات زندگی پیدا کرنے میں بے شمار فوائد کی حامل ہے، بخلاف انسان کے کہ نہ اس کا گوشت کسی کے کام آتا ہے نہ کھال نہ بال نہ ہڈی نہ پٹھے۔

انسان اشرف المخلوقات کیوں؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں پھر حضرت انسان کس بناء پر مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات ٹھیرتے ہیں، اب حقیقت شناسی کی منزل قریب آ پہنچی۔ ذرا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان ساری چیزوں کے عقل وشعور کی رسائی صرف موجودہ زندگی کے وقتی اور ہنگامی نفع نقصان تک ہے اور اسی زندگی میں وہ دوسروں کے لیے فائدہ بخش نظر آتی ہے اس دنیا کی زندگی سے پہلے کیا تھا اور بعد میں کیا آنے والا ہے اس میدان میں جمادات، نباتات تو کیا کسی بڑے سے بڑے ہوشیار جانور کی عقل وشعور بھی کام نہیں دیتی اور نہ اس میدان میں ان میں سے کوئی چیز کسی کے لیے کارآمد یا مفید ہوسکتی ہے، بس یہی وہ میدان ہے جن میں مخدوم کائنات اور افضل المخلوقات انسان کو کام کرنا ہے اور اسی سے اس کا امتیاز دوسری مخلوقات سے واضح ہوسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصد زندگی پورے عالم کی ابتداء وانتہاء کو سامنے رکھ کر سب کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالنا اور یہ متعین کرنا کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے، اور کونسی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لیے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے تاکہ دائمی راحت وسکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہو سکے اور جب انسان کا مقصد زندگی اور کمال انسانی یہ معیاری فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہنچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور عالم کی ابتداء وانتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع ونقصان کو وحی الٰہی کی روشنی میں پہچانے، کیونکہ نری عقل انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو سر کیا ہے نہ کر سکتی ہے، بڑے بڑے عقلاء وحکماء اور فلسفیانِ عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے ؎

زیر کان موشگافان دہی
کردہ ہر خرطوم خط ابلہی

اور جب مقصد زندگی کے اعتبار سے زندہ صرف وہ شخص ہے جو وحی الٰہی کا تابع اور مومن ہو تو یہ بھی متعین ہو گیا کہ جو ایسا نہیں وہ مردہ کہلانے کا مستحق ہے مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے ؎

زندگی از بہر طاعت و بندگی است　　بے عبادت زندگی شرمندگی ست
آدمیت لحم وشحم و پوست نیست　　آدمیت جز رضائے دوست نیست

(معارف القرآن، ج:۳،ص:۴۳۵)

زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کے لیے ہے اگر یہ زندگی اللہ کی عبادت سے خالی ہو تو پھر باعث شرمندگی ہے آدمیت، گوشت، چربی اور کھال کا نام نہیں ہے حقیقی آدمی وہ ہے جو اپنے دوست کے رضا کے سوا کچھ اور مطلب ہی نہ رکھتا ہو بلکہ اسی کو اپنا مطلب سمجھتا ہو۔

علمی وعملی سب کمالات حق تعالیٰ کی دین ہیں

دوستو سب کرم ہے مالک کا
خوبیاں کیا ہیں اس کمینے میں

یعنی جو بھی کچھ عطا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے کسی بھی قسم کی کوئی بھی خوبی بندہ کا اپنا ذاتی کمال نہیں ہے، صرف اور صرف ہمارے خالق ومالک اللہ کا کرم ہے اگر یہ حقیقت سامنے رہے تو پھر تکبر قریب آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا اور عجب وخود پسندی سے حفاظت ہو جائے گی اور یہ ایک سچی حقیقت ہے کیونکہ انسان

جب پیدا ہوتا ہے تو ہر قسم کے علمی و عملی کمالات سے خالی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۷۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تا کہ تم شکر کرو۔ (معارف القرآن، ج:۵،ص:۳۶۸)

قولہ تعالیٰ **لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْــًٔا** اس میں اشارہ ہے کہ علم انسان کا ذاتی ہنر نہیں، پیدائش کے وقت وہ کوئی علم و ہنر نہیں رکھتا، پھر ضرورتِ انسانی کے مطابق اس کو کچھ کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ سکھایا جاتا ہے جس میں نہ ماں باپ کا دخل ہے نہ کسی معلّم کا۔ سب سے پہلے اس کو رونا سکھایا۔ اس کی یہی صفت اس وقت اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے۔ بھوک پیاس لگے تو وہ روتا ہے۔ سردی گرمی لگے تو رو دیتا ہے۔ کوئی اور تکلیف پہنچے تو رو دیتا ہے۔ قدرت نے اس کی ضروریات کے لیے ماں باپ کے دلوں میں خاص اُلفت ڈالی ہے کہ جب بچے کی آواز سنیں تو وہ اس کی تکلیف کے پہچاننے اور اس کے دور کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر بچے کو منجانب اللہ یہ رونے کی تعلیم نہ دی جاتی تو اس کو کون یہ کام سکھا سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے تو اس طرح چلّایا کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر یہ بھی سکھا دیا کہ اپنی غذا کو ماں کی چھاتی سے حاصل کرنے کے لیے اپنے مسوڑھوں اور ہونٹوں سے کام لے۔ اگر یہ تعلیم فطری اور بلا واسطہ نہ ہوتی تو کس معلّم کی مجال تھی جو اس نومولود کو منہ چلانا اور چھاتی کو چوسنا سکھا دیتا۔ اسی طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی گئیں، قدرت نے اس کو بلا واسطہ ماں باپ کے خود بخود سکھا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس میں یہ سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے آس پاس کے آدمیوں کی بات سن کر یا کچھ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سیکھنے لگتا ہے اور پھر اُن سنی ہوئی آوازوں اور دیکھی ہوئی چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی لیے آیت مذکورہ میں **لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْــًٔا** کے بعد فرمایا **وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ** یعنی اگرچہ ابتدأ پیدائش میں انسان کو کسی چیز کا علم نہیں تھا، مگر قدرت نے اس کے وجود میں علم حاصل کرنے کے عجیب و غریب قسم کے آلات نصب کر دیئے تھے۔ ان آلات میں سب سے پہلے سمع یعنی سننے کی قوت کا ذکر فرمایا، جس کی تقدیم کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان کا سب سے پہلا علم اور سب سے زیادہ علم کانوں ہی کے راستہ سے آتا ہے۔ شروع میں آنکھ تو بند ہوتی ہے، مگر کان سنتے ہیں اور اس کے بعد بھی اگر غور کیا جائے تو انسان کو اپنی پوری عمر میں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ کانوں سے سنی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنکھ سے دیکھی ہوئی

معلومات اس کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد نمبر اُن معلومات کا ہے جن کو انسان اپنی سنی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور وفکر کر کے معلوم کرتا ہے اور یہ کام قرآنی ارشادات کے مطابق انسان کے قلب کا ہے۔ اس لیے تیسرے نمبر میں اَفئدة فرمایا جو فواد کی جمع ہے جس کے معنی قلب کے ہیں۔ فلاسفہ نے عام طور پر سمجھ بوجھ اور ادراک کا مرکز انسان کے دماغ کو قرار دیا ہے، مگر ارشاد قرآنی سے معلوم ہوا کہ دماغ کو اگرچہ اس ادراک میں دخل ضرور ہے، مگر علم وادراک کا اصلی مرکز قلب ہے۔

اس موقع پر حق تعالیٰ نے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ گویائی اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ نطق اور گویائی کو حصولِ علم میں دخل نہیں بلکہ وہ اظہارِ علم کا ذریعہ ہیں۔ اس کے علاوہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لفظ سمع کے ساتھ نطق بھی ضمناً آ گیا کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص سنتا ہے وہ بولتا بھی ہے، گونگا جو بولنے پر قادر نہیں وہ کانوں سے بھی بہرا ہوتا ہے اور شاید اس کے نہ بولنے کا سبب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی آواز سنتا نہیں جس کو سن کر بولنا سیکھے۔ واللہ اعلم۔ (معارف القرآن، ج:۵، ص:۳۸۱)

راہِ سنت پہ جو چلے اختر
ہے عجم اس کا پھر مدینے میں

کوئی شخص جسمانی طور پر مدینہ منورہ سے دور ہو لیکن اتباعِ سنت کے ساتھ زندگی گزارتا ہو اور اپنے قول و فعل کے ذریعے سے احیائے سنت اور نشرِ دین میں مشغول ہو تو ایسا شخص عجم میں رہتے ہوئے بھی گویا کہ مدینے ہی کا باشندہ ہے اس لیے کہ اگرچہ وہ شخص قربِ جسمِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رکھتا مگر وہ شخص قربِ کارِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سے مالا مال ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی مشن اور پیغام کو سارے عالم میں پھیلانے میں مشغول و مصروف ہے تو ایسے شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زیادہ بڑھا ہوا ہوگا بنسبت اس شخص کے جو مدینے میں پڑا ہوا تو ہے لیکن دین کی نشر واشاعت اور سنت کی روشنی پھیلانے میں مشغول نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہی نقطہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا جس نے ان کو مدینہ چھوڑ کر دنیا کے مختلف ملکوں میں دین پھیلانے کے لیے جانے پر مجبور کیا اور یہاں تک کہ بے شمار صحابہ کرام کی قبریں اسی دین کو پھیلاتے پھیلاتے دنیا کے مختلف ملکوں میں الگ الگ مقامات پر بن گئیں اور چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اس لیے جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا اور دین کے مزاج سے یہ حضرات واقف تھے کوئی دوسرا ان کے مقابلے میں کبھی بھی نہیں ہوسکتا ہے۔

اسی لیے غالباً یہی وجہ رہی ہے کہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ دینی خدمات انجام دینے کے لیے اور امت مسلمہ

کے ایمان واسلام کی حفاظت و بقا کی خاطر باوجود مدینہ منورہ میں مستقل قیام کے مواقع فراہم ہونے کے بھی ہندو پاک اور دوسرے ممالک میں قرآن وسنت کی تعلیمات کو پھیلانے میں لگے رہے جس کی بدولت مدینے سے دور رہتے ہوئے ان کو مدینہ اور مدینے والے یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کی دولت نصیب ہوگئی اور پھر اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق بہت سے اخیر میں ہجرت کر کے وہیں پہنچ گئے اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں قیامت تک کے لیے جابسے اور وہاں کی دائمی نیشنلٹی (Nationality) حاصل کر لی۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ سعادت کسی کے اپنے اختیار سے نہیں ہوتی بس اسی کو ملتی ہے جسے خدائے کریم ورحیم عطا فرمادیتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اسی طرح زندگی گزارنے کی توفیق دے کہ زندگی بھر سارے عالم میں پھر پھر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین پھیلاتے رہیں اور جب دنیا سے جانے کا وقت قریب آئے تو اللہ تعالیٰ مدینے میں بلا کر جنت البقیع میں ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں دفن کی سعادت میسر فرمائے۔

میر مرنا نہ حسن فانی پر

میر مرنا نہ حسن فانی پر حسن فانی کے رنگ فانی پر
جس کا پانی بدلنے والا ہو میر مرنا نہ ایسے پانی پر
ہے گلستاں میں جس سے شادابی ہوں فدا اس کی باغبانی پر
جو جوانی فدا خدا پر ہو میں ہوں قربان اس جوانی پر
دل فدا اپنے رب پہ کر اختر کر بھروسہ نہ زندگانی پر

مشکل الفاظ کے معانی:۔شادابی: ہریالی۔فدا: قربان۔زندگانی: زندگی۔

عشقِ مجازی کا مؤثر علاج

ان تمام اشعار میں حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنے ایک خاص موضوع زندگی کے متعلق بڑے مدلل انداز سے گفتگو فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے حسنِ فانی پر مرنے والا انتہائی نادان اور ناعاقبت اندیش ہے۔ حضرت والا کی زندگی کا یہ خاص موضوع ہے جس پر حضرت والا دنیا بھر میں بیان فرماتے پھرتے ہیں اور بہت سارے مواعظ میں اس مضمون کا تذکرہ ہے کیونکہ جب انسان حسنِ فانی پر دل دے دیتا ہے اور اس پر مرتا ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ سے وہ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے جتنا حسنِ فانی سے دور ہوگا تو حسن باقی سے قریب حاصل ہوگا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ اُس کا تعلق اتنا ہی گہرا اور قوی اور مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔

میرے دوستو! حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے کلام میں دعویٰ مع دلیل موجود ہے۔ اور وہ اس طرح کہ حسنِ فانی پر نہ مرنے کی وجہ خود اُس کا فانی ہونا ہے۔ یعنی مٹنے والا اور ختم ہونے والا ہونا، لہٰذا اگر کسی نے اُس پر دل دیا تو گویا ایسی چیز کا عاشق اور شیدائی بنا جو چند دن کے بعد مٹ کر ختم ہو جائے گی۔ اور بالآخر اِس کو کفِ افسوس ملنے پڑیں گے اور پچھتانا پڑے گا کہ ہائے! کہاں گیا میرا معشوق ومحبوب۔

اور اگر حضرت والا کے اس مضمون میں مزید وسعت پیدا کرتے ہوئے ہم اس اشعار میں پوری دنیا کے ظاہری حسن اور اس کے زیب وزینت، چمک دمک، رنگ و رونق اور سجاوٹ بجاوٹ مراد لے لیں تو یہ ہمارے خوبصورت بنگلے اور اعلیٰ درجے کی عشرت گاہیں ہر ایک کو دل نہ دینا اس کلام کا مصداق ہوگا کیونکہ یہ سبھی فنا ہو کر مٹ جانے والی چیزیں ہیں اور جب انسان دنیا کی ان چیزوں سے محبت نہیں کرے گا بلکہ اُس کا دل ہر غیر اللہ سے خالی ہوگا پھر یقیناً اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جائے گی کیونکہ حُبُّ الدُّنیَا رَأسُ کُلِّ خَطِیئَۃٍ یعنی دنیا کی محبت ہر خطا اور بُرائی کی جڑ ہے۔ اس لیے عمر کی ہر حالت دوسری حالت میں بدل جانے والی ہے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا اور بالآخر فنا ہو کر مٹ جانا اور ختم ہو جانا۔ جس کو ایک موقع پر حضرت والا نے جب وہ نواب

چھتاری کے یہاں مہمان تھے اپنے خاص درد بھرے انداز سے یوں پیش فرمایا۔

بہت خوشنما ہیں یہ بنگلے تمہارے
یہ گملوں کے جھرمٹ یہ رنگین نظارے
ارے جی رہے ہو یہ کس کے سہارے
کہ مرنے سے ہوجائیں گے سب کنارے

معشوق ہوں یا دنیا کی دوسری چیزیں مثلاً مال و دولت، منصب و عہدہ، نام و نمود، عزت و وقار، لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بننے کی فکر کی غرض سے تصنیف، تقریر اور وعظ وغیرہ کرنا کہ میں لوگوں میں مشہور ہو جاؤں۔ میرے دوستو! یہ ساری دنیا ہے، سارا غیر اللہ ہے، سب کچھ مٹ کے ختم ہونے والا ہے جب ہم دنیا سے جائیں گے تو خالی ہاتھ ہوں گے۔ سوائے اُن اعمال کے جو اخلاص کے ساتھ کیے گئے ہوں ان کے سوا اور کچھ نافع اور کارآمد نہ ہوگا۔

جیسا کہ حضرت والا کے وعظ میں ہم نے یہ سنا کہ شاہ محمد احمد پرتا بگڈھی یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

مال و اولاد تیری قبر میں جانے کو نہیں
تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے چھڑانے کو نہیں
جز عمل گور میں کوئی بھی تیرا یار نہیں
کیا قیامت ہے کہ تو اس سے خبردار نہیں

اسی موضوع پر یہ شعر ہم نے حضرت والا کے وعظ میں سنا۔

کئی بار ہم نے یہ دیکھا
کہ جن کا معطر بدن تھا مبیض کفن
جو قبرِ کہن اُن کی اکھڑی تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

اللہ والوں کے اشعار میں ایسی عجیب تاثیر ہوتی ہے کہ اُن کو سن کر سامعین کے دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔

حضرت والا کے اشعار سن کر ایک شاعر کا تأثر

چنانچہ ایک مقام پر احقر ہندوستان کے سفر کے موقع پر حضرت والا کے اشعار سنانے کے لیے بیٹھ گیا اور عشاء کے بعد کافی دیر تک عشقِ مجازی اور حسنِ مجازی کے زوال و فنائیت کے عنوان پر حضرت والا کے کچھ اشعار سنا کر کچھ تشریح پیش کی تو ایک شاعر مجلس سے واپس جا کر بعض احباب کے سامنے یہ تذکرہ کرنے لگے کہ جناب شعر و اشعار تو ہم بھی کہتے اور سنتے ہیں لیکن آج یہ جو ہم نے سنے ہیں یہ تو بالکل الگ قسم کے اشعار ہیں، یہ تو عام اشعار کی

طرح نہیں ہے۔

اور احقر نے خود بارہا مختلف ممالک میں اس نوع کے سفر کرنے کے بعد یہ بات محسوس کی کہ جب حضرت والا کے اشعار کسی بھی جگہ پڑھ کر سنائے گئے تو لوگ اس طرح دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے تھے جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے امیر و سردار مکھی کے پیچھے گروہ در گروہ جاتی ہیں اور ایسے مجلس میں دل جمعی کے ساتھ بیٹھ کر سنتے تھے کہ جو کبھی وہاں متوقع نہیں ہوتا تھا۔

جس کی وجہ درحقیقت حضرت والا کے اشعار میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا خاص درد و غم موجود ہونا ہے۔ اسی لیے اہلِ علم کو حضرت شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمہ اللہ خاص طور پر یہ نصیحت فرماتے تھے کہ علم کا پڑھنا اور ہے اور اس کو عملی طور پر سیکھنا اور ہے۔ علماء کو چاہیے کہ وہ اہل اللہ کے پاس رہ کر دین کو عملی طور پر سیکھیں تاکہ اصل جینے کا مزہ اور حلاوت نصیب ہو۔ اسی لیے حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے نصابِ تعلیم کے موضوع پر لکھی گئی کتاب میں یہ بات لکھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں کوئی بھی مدرس ایسا نہیں رکھا جاتا تھا جس کا کسی اللہ والے سے اصلاحی تعلق نہ ہو اور اس اُم المدارس دیوبند کا دربان اور چپڑاسی بھی صاحبِ نسبت ولی اللہ ہوا کرتا تھا۔

بہرحال حضرت والا کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ جو کچھ فنا ہو کر ختم ہو جانے والا ہے اس پر مرنا اور اس کو دل دینا نہیں چاہیے بلکہ وہ اللہ جو ساری کائنات کی تمام خوبصورت اشیاء کو خوبصورتی دینے والا اور تمام حسین چیزوں کو حسن بخشنے والا ہے۔ گلستانوں میں شادابی اور چمن کی رونقیں سب اُس کی عطا ہیں۔ اُسی اللہ پر فدا ہونا چاہیے کیونکہ ہمیں جوانی دے کر تمام صلاحیتیں دینے والا وہی اللہ ہے لہٰذا صرف وہی اس لائق ہے کہ ہم اُس پر اپنی جوانی کو فدا کریں اور فوراً بلا کسی تاخیر ہر غیرِ خدا سے اپنے دل کو پاک وصاف کر لیں۔

اس کے لیے کوئی مدت اور وقت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہم اپنی زندگی پر ایک لمحہ بھروسہ نہیں کر سکتے جو صبح کو زندہ ہے اُسے اپنی شام کا بھروسہ نہیں اور جو شام کو زندہ ہے اُسے صبح کا بھروسہ نہیں۔ اس لیے اس گفتگو کو پڑھتے اور سنتے ہی فوراً ہمیں اپنے دل میں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اب یہ زندگی اور جوانی صرف ایک اکیلے اللہ پر فدا اور قربان کروں گا اور جتنا جو کچھ ہوا ہے اسی لمحے اُس سے تائب ہو جائے، ندامت کے ساتھ اُس کو ترک کر دے اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نصیحت ہے:

﴿إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الزهد)

جب صبح ہو تو دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام ہو تو دل میں صبح کا خیال نہ لاؤ یعنی چوبیس گھنٹے میں ہر وقت آخرت کے لیے مستعد رہو۔ سچے پکے مؤمن کی شان یہی ہوا کرتی ہے اور اس پوری نظم کا نچوڑ اور خلاصہ بھی یہی ہے اور اس میں یہی سبق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے۔

خاک پر منزل آسماں مل گئی

رخصت دردِ عشق بتاں مل گئی
قربتِ صاحبِ آسماں مل گئی

نسبتِ اولیاءِ زماں مل گئی
دولتِ فیضِ پیرِ مغاں مل گئی

ان کی یادوں کی آہ و فغاں مل گئی
دوستو! دولتِ دو جہاں مل گئی

راہ میں صحبتِ رہبراں مل گئی
خاک پر منزلِ آسماں مل گئی

دامنِ کوہ میں دامنِ فقر میں
لذتِ قربِ سلطانِ جاں مل گئی

مل گئی جب سے توفیقِ ذکرِ خدا
روح کو راحتِ دوجہاں مل گئی

ربطِ گلشن کی کیا یہ کرامت نہیں
دشت میں راحتِ آشیاں مل گئی

ان کی خاطر اٹھایا جو حسرت کا غم
روح کو عشرتِ دو جہاں مل گئی

صحبتِ شیخِ کامل سے اختر کو بھی
لذتِ راہِ ربِ جہاں مل گئی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **رخصتِ عشق**: نامحرم حسین لڑکیوں اور امارد کے ناپاک عشق میں ہونے والی تکلیف سے چھٹکارا۔ **قربت**: نزدیکی۔ **صاحبِ آسمان**: اللہ تعالیٰ۔ **پیرِ مغاں**: شیخ کامل۔ **رہبران**: اللہ والے۔ **خاک**: زمین۔ **کوہ**: پہاڑ۔ **فقر**: غربت۔ **سلطان**: اللہ تعالیٰ۔ **ربط**: تعلق۔ **گلشن**: باغ۔ **دشت**: صحرا۔ **راحت**: سکون۔ **آشیاں**: گھونسلہ۔ **حسرت کا غم**: گناہ سے بچنے کا غم۔ **عشرت**: خوشی۔

عشق بتاں سے رخصت پر صاحبِ آسمان سے قربت ملتی ہے

رخصت دردِ عشق بتاں مل گئی
قربتِ صاحبِ آسماں مل گئی

حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ بتوں کا دردِ عشق جب دل سے رخصت ہوا اور نامحرم لڑکیوں یا بے ریش امرد لڑکوں کی محبت سے دل بالکل مکمل طور پر صاف اور خالی ہوگیا تو اللہ تعالیٰ سے تعلق کا مزہ دل میں محسوس ہونے لگا کیونکہ غیر اللہ دل سے نکلتے ہی اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آنا شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ عشق بتاں میں ایسے چہروں سے محبت بھی شامل ہے کہ جو اگرچہ بہت خوبصورت نہ ہوں یا ان کے چہروں پر ہلکی داڑھی ہو لیکن طبیعت کا ان کی طرف میلان ہوتا ہو جس کو حضرت والا اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ جو بخار بدن میں اندر اندر تھوڑا تھوڑا رہتا ہے وہ بھی خطرناک ہوتا ہے کیونکہ وہ ہڈیوں میں سرایت کر جاتا ہے اس سے بھی بے فکر نہیں ہونا چاہیے تو اسی طرح ایسے موقع پر سالک کو دل کے میلان اور طبیعت میں لذت محسوس ہونے کی وجہ سے ایسے تعلقات چھوڑ دینے چاہیے ورنہ خوبصورت چہروں کے مقابلے میں کبھی کبھی ایسی شکلیں ہی خطرناک قسم کے عشق کا باعث بن

کر دین وایمان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔

اس میں مدارس کے اہل علم اساتذہ کے لیے بھی ایک خاص نصیحت ہے کہ ایسے طلبہ کو بلا کر تنہائی میں خدمت لینا یا بدن دبوانا یا تنہائیوں میں ان کو کمروں میں بلانا اوران سے ملنا یہ زہر قاتل سے کم نہیں کیونکہ حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے نقصانات اتنے ہیں کہ میرے احاطہ تحریر سے باہر ہے اور خود حضرت تھانوی نے اپنے متعلق احباب سے یہ سخت تاکید کر رکھی تھی کہ تنہائی میں کبھی کسی بے ریش لڑکے کو میرے پاس ہرگز نہیں بھیجنا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ خالی علم پڑھ کر اور مدرسوں سے سندیں لے کر حاصل نہیں ہوتیں بلکہ اس طرف ذہن بھی نہیں جاتا بعض مقامات پر ہندوستان میں حضرت والا دامت برکاتہم کا جب سفر ہوا اور حضرت نے مدارس میں اس موضوع پر بیان کیا تو بعض خاص لوگ حضرت سے بیان کے بعد ملنے کے لیے آئے اور فرمانے لگے کہ حضرت اس مرض کا ہمیں احساس تک نہیں تھا، آپ کے بیان میں توجہ دلانے کے بعد اس کا احساس دل میں پیدا ہوا کیونکہ عام طور پر عورتوں سے بچنا اوران سے پردہ رکھنا تو ذہن میں آتا ہے لیکن امردلڑکوں سے یہ معاملات نہ کرنا اس طرف ذہن نہیں جاتا۔

بہرحال جب یہ غیر اللہ دل سے نکل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں داخل ہو جائے گی اور عشق بتاں کے مفہوم میں مزید توسع کرتے ہوئے اگر یوں کہا جائے تو بھی غلط نہیں ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ہر غیر کو شامل ہے خواہ وہ کسی بھی شکل میں دل میں موجود ہو، اس لیے سب کچھ دل سے نکال دیا جائے جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب نے تحریر فرمایا ہے ''اور اگر عبادت اصنام کا لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بت ہے اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کر لینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے، تو اس دعا یعنی عبادتِ اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آجاتا ہے، بعض صوفیائے کرام نے اسی معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت ومعصیت پر ملامت کی ہے۔

سودہ گشت از سجدہ ٔ راہ بتاں پیشانیم
چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہم

اور عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

ہر خیال شہوتے در رہ بتے ست

(معارف القرآن، ج:۵،ص:۲۵۰)

حب جاہ بھی ایک بت ہے

اس لیے اپنے کسی عمل سے اپنا مقام ومرتبہ اور نام ونمود اور شہرت وعزت وغیرہ لوگوں کی نگاہوں میں چاہنا یہ بھی ایک طرح کا بت ہے جب تک اس سے دل صاف نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا صحیح قرب حاصل نہیں ہوتا ایک مرتبہ احقر گنگوہ میں حضرت علامہ رشید احمد گنگوہی کے خاندان میں ایک بزرگ حکیم عبد الرشید (ننو میاں) سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو حضرت اس وقت بیمار تھے اور چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے ہماری نصیحت کی درخواست پر حضرت نے اسی جملے پر تقریر فرمائی:

﴿وَقَدْ قَالَتِ السَّادَةُ الصُّوْفِيَّةُ اِنَّ اٰخِرَمَا يَخْرُجُ مِنْ رَّأْسِ الصِّدِّيْقِيْنَ مَحَبَّةُ الْجَاهِ﴾

(المرقاۃ، ج: ۵، ص: ۵۴)

اسی جملہ پر تقریر فرمائی کہ صالحین صدیقین کے دلوں سے بھی سب سے اخیر میں نکلنے والی چیز جاہ اور مقام کی محبت ہے کہ مال کو تو ٹھکرا دیا جائے گا لیکن اپنی بڑائی اور عظمت کا چاہنا یہ دل کے نہاں خانوں میں موجود رہتا ہے چنانچہ ایک مقام پر ہمارے ایک دوست نے یہ واقعہ سنایا کہ کسی نے ایک عالم کو ایک گاڑی نئی لاکر اس کی چابی پیش کی اور ان سے عرض کیا کہ یہ گاڑی آپ کے لیے ہدیہ ہے مگر انہوں نے اس کو لینے سے انکار کر دیا لیکن پھر اسی واقعہ کو جگہ جگہ نقل کرتے پھرتے تھے اور کوئی اس کو نقل کرتا تو اس سے خوش ہوتے تھے کہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو کہ میں دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہوں اور ان کے دلوں میں میرا مقام پیدا ہوا اور اب لوگوں نے مجھے پہچانا کہ میں کیسا زاہد انسان ہوں جب کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کہ ایک غیر اللہ کو دل سے نکالا اور دوسرے کو دل میں بسالیا۔

ثناءِ خلق کا ملنا نعمت اور بشارت ہے

البتہ اگر اعمال صالحہ اختیار کرنے کی بنیاد پر اور تقویٰ و دین داری کے سبب اللہ تعالیٰ لوگوں میں اچھا نام پیدا کر دیں اور ان کی زبانوں پر تعریفی کلمات اور مدح وثناء کے جملے جاری ہونے لگیں اور خود اپنے اعمال سے اس کی خواہش اور تمنا نہ کی ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کو ملنے والی ایک عطا اور تحفہ اور دنیا میں پیشگی حاصل ہونے والی خوش خبری ہے۔ جس کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ نے یہ حدیث شریف نقل فرمائی کہ:

﴿قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَيْرِ وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ قَالَ تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب)

ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں یا رسول اللہ اگر کوئی اچھا عمل کرے اور پھر لوگ اس پر اس کی تعریف

کریں تو اس کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ مومن کو پیشگی ملنے والی بشارت اور خوش خبری ہے اور گویا موت کے بعد پیش آنے والے اچھے حالات کا پیش خیمہ ہے۔

اسی لیے اپنے اعمال سے لوگوں میں تعریف چاہنا تو مذموم اور برا ہے لیکن اسی بات کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنا اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی عزت اللہ تعالیٰ سے مانگنا برا نہیں ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف دعاؤں میں یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگی:

﴿اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَّ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا﴾

(کنز العمال)

کہ اے اللہ! مجھے میری نگا میں چھوٹا کر دے اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا کر دے اور دوسری دعا اس طرح سے ہے

﴿وَفِيْ نَفْسِيْ لَكَ رَبِّيْ فَذَلِّلْنِيْ وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِيْ﴾

(کنز العمال)

کہ اے اللہ! آپ اپنے لیے مجھے میرے دل میں کمتر بنا دے اور لوگوں کی نگاہوں میں مجھے عظمت و عزت عطا فرما دے اس لیے ان دو باتوں میں فرق کرنا ضروری ہے کہ اپنے عمل سے لوگوں کی نگاہوں میں عزت چاہنا عنداللہ ناپسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس چیز کو مانگنا یہ مطلوب ہے اور عبادت ہے۔

اولیاء ومشائخ سے للہ محبت کی عظیم فضیلت

نسبت اولیاء زماں مل گئی
دولت فیض پیر مغاں مل گئی

جب کسی سچے اللہ والے سے تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اس کے فیض صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسے بھی اولیاء اللہ میں شمار کر لیتے ہیں اور وہی نسبت اولیاء اس شخص کو بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سارا فیض اصل فیاض حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات سے آتا ہے باقی شیخ اور استاذ صرف دنیا میں ذریعہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی سنت دنیا میں اسی طرح سے ہے کہ وہ اپنے اولیاء کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو ان کی صحبت کی برکت سے ولی بنا دیتے ہیں یہی تو وجہ ہے کہ آپس میں اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھنے پر اتنی عظیم الشان فضیلت وارد ہوئی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَاُنَاسًا مَا هُمْ بِاَنْبِيَآءَ وَلَا شُهَدَآءَ يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَآءُ وَالشُّهَدَآءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ قَالَ هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ عَلٰى غَيْرِ اَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَلَا اَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا فَوَاللّٰهِ اِنَّ وُجُوْهَهُمْ لَنُوْرٌ وَّاِنَّهُمْ عَلٰى نُوْرٍ لَا يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ

أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝

(سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب الرھن)

ترجمہ:''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں ایسے بھی لوگ ہیں جو نہ پیغمبر ہیں اور نہ شہید ہیں اور پیغمبر اور شہید قیامت کے روز ان پر ان کے ایک خاص رتبے کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کو حاصل ہوگا رشک کریں گے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہم کو خبر دیجئے کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو محض حق تعالیٰ کے تعلق سے باہم محبت رکھتے ہیں نہ تو آپس میں کوئی رشتہ ناطہ ہے اور نہ کچھ روپیہ پیسے کا لین دین ہے۔ بخدا ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور نور کے مکانات پر جلوہ گر ہوں گے جب لوگ مبتلاء خوف ہوں گے وہ خائف نہ ہوں گے اور جب لوگ مغموم ہوں گے تو وہ مغموم نہ ہوں گے اور یہ آیت پڑھی أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ

فائدہ: اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ لوگ انبیاء سے افضل ہو گئے کیونکہ یہ ایک جزوی معاملہ ہے کبھی کسی خاص وجہ سے اکابر بھی اصاغر کی خاص حالت کی تمنا کیا کرتے ہیں مثلاً انبیاء غم امت میں مشغول ہیں اور یہ عین دلیل ان کی افضلیت کی ہے اور ممکن ہے کہ یہ لوگ اس سے خالی ہوں۔ و نحو ذالک۔ (التکشف، ص:۳۲۸)

اسی لیے یہ خانقاہ میں آمد و رفت والی محبت کیونکہ اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی محبت ہے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے یقین ہے کہ یہ محبت اس فضیلت کی مصداق ہے اس لیے عام طور پر نہ تو ہمارا خونی رشتہ ہے اور نہ کوئی دنیوی غرض ہے کہ یہاں مال و دولت اور عہدے اور منصب کی تقسیم ہوتی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع کا سیکھنا سکھانا یہی اصل یہاں کے قیام کا مقصود ہوتا ہے اس لیے ان شاء اللہ قیامت کے دن یہاں آنے جانے والے اس فضیلت کے مصداق ہوں گے۔

معرفت ومحبت کا دینا کسی پیر کے بس میں نہیں ہے

ہاں البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ کی محبت وعشق اور کمال ایمان وتقویٰ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے دینے سے حاصل ہوسکتا ہے کوئی بڑے سے بڑا بزرگ اور غوث وقطب وابدال بھی اپنے ارادے اور اختیار سے کسی کو بزرگی اور تقویٰ نہیں دے سکتا اور نہ ہی کسی کو محبت خداوندی کی شراب پلا سکتا ہے۔

اس لیے جو لوگ بزرگوں سے اس طرح کی چیزوں کی توقع اور امید رکھتے ہیں یا ان سے درخواست کرتے ہیں جیسا کہ بعض مواقع پر دیکھا گیا ہے احقر کی ناقص رائے میں شرعی طور پر اس کی گنجائش نہیں مثلاً اس طرح کے الفاظ کہ حضرت جو خزانہ آپ کے سینے میں ہے ہمیں عطا کر دیجئے یا یہ کہ حضرت جو شراب محبت کا دریا آپ نے پیا ہے اس میں سے کچھ ہمیں پلا دیجئے وغیرہ وغیرہ اس نوع کے جملے کسی انسان سے ہدایت اور تقویٰ مانگنے کے معنیٰ

میں ہیں اور یہ کام ولی تو کیا نبی کو بھی سونپا نہیں گیا ورنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کو موت سے پہلے پہلے ضرور کلمہ پڑھا دیتے کیا کسی میں یہ جرات وہمت ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ کسی ولی میں تو توجہ ڈال کہ مرید کے دل کو بدلنے کی طاقت ہے لیکن العیاذ باللہ حضور کو یہ طاقت میسر نہ تھی تو پھر آخر اس طرح کے غلط معنیٰ کا احتمال لیے ہوئے الفاظ اہل حق حضرات کو اپنے مشائخ کے لیے استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ دوسرے عزت و عظمت والے الفاظ موجود ہیں مثلاً حضرت خاص دعاؤں میں یاد فرمائیں، میری جانب خاص توجہ فرمائیں، میری اصلاح فرما دیجئے اور اس ناکارہ کی جانب اپنی نظر عنایت کا رخ پھیر دیجئے وغیرہ وغیرہ۔ اور جو کبھی بزرگوں کے ایسے واقعات ہیں تو حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ وہ ان کے اختیار سے نہیں ہے بلکہ وقتی طور پر من جانب اللہ بطور کرامت ان سے صادر ہوا اس لیے اس سے غلط شبہ نہ کیا جائے۔

کبھی کبھی معمولی جملوں کے ہیر پھیر سے ہدایت وضلالت اور حق و باطل کا فرق پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اولیا اللہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خدا نہیں مگر خدا سے جدا بھی نہیں اسی کو ذرا لفظ بدل کر کوئی یوں کہہ دے کہ وہ خدا نہیں تو وہ غیر خدا بھی نہیں تو یہ جملہ بولتے ہی انسان نے اپنے آپ کو بہت خطرناک موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا جس کا فیصلہ علمائے اہل حق کے فتاویٰ سے کیا جا سکتا ہے اس لیے اس طرح کے معاملات میں توحید کی حفاظت پہلے درجے میں فرض ہے جس کی خاطر ہمیں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اور اگر بعض مواقع پر ہمارے اکابر واسلاف سے اس طرح کی درخواستیں ثابت ہیں۔ جیسا کہ حضرت والا کے بعض اشعار میں اور ایک موقعہ پر خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حضرت حاجی صاحب سے کچھ اسی انداز سے درخواست پیش کی تو اس کے معانی وہی توجہ کرنا اور اللہ تعالیٰ سے خصوصی دُعائیں کرنا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ان کی یادوں کی آہ و فغاں مل گئی
دوستو! دولت دو جہاں مل گئی

جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوگئی ہو اور اس کی یاد میں آہ وفغاں کرنے کی دولت حاصل ہوگئی ہو تو سمجھو کہ اسے دنیا وآخرت کی ساری نعمتیں مل گئی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت اتنی اونچی دولت ہے کہ اس کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے اور جو اللہ کو پالے گا تو سمجھو اس نے دونوں جہاں پالیے بلکہ اس سے بھی بڑی دولت پالی ہے کیونکہ دونوں جہاں تو مخلوق ہیں ان کے ملنے میں وہ لطف کہاں حاصل ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پالینے سے مومن کو دنیا میں حاصل ہوتا ہے۔

آخر یہی تو وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آپ کی قوم کے کفار ومشرکین دعوت توحید و رسالت سے روکنے کے لیے آئے تھے اور آپ کو سب کچھ پیش کرنے کی پیشکش کی تھی اور ہر مطلوبہ تمنا پوری کر دینے

کا لالچ دیا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا تھا کہ اگر ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج رکھ دیا جائے تب بھی میں اس دعوت الی اللہ سے باز نہیں آؤں گا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق میں کچھ ایسا ہی مزہ نصیب ہوتا ہے کہ پھر اسے دنیا کے مال و دولت کا کوئی لالچ اور خیال دل میں قائم نہیں رہتا نہ اس کی حرص وطمع دل و دماغ میں باقی رہتی ہے۔ (معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۴۱۹)

ہمارے استاذ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی نے ایک مرتبہ تبلیغی جماعت کے ایک پروگرام میں دارالعلوم دیوبند کی چھتہ مسجد میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی کا یہ قصہ سنایا کہ جب ان کے بیٹے حضرت مولانا احمد کی شادی ہوئی تو انہوں نے لکڑی کا ایک (سوٹ کیس) بنوالیا تاکہ اس میں اپنے اور بیوی کے کپڑے وغیرہ رکھیں تو اس پر بھی حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ احمد اگر قاسم کے ساتھ رہنا ہے تو یہ تکلفات نہیں چلیں گے جاؤ یہ اٹیچی کسی غریب فقیر کو صدقہ کرکے آجاؤ۔

صحبت رہبر سے خاک پر منزل آسماں

راہ میں صحبت رہبراں مل گئی
خاک پر منزل آسماں مل گئی

میرے دوستو! ایک فطری بات ہے کہ جو شخص کسی راستہ پر چل کر اس کے نشیب وفراز کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے ہو اور اس کے جملہ احوال وکوائف سے واقف ہو تو جو راہرو اس کی معیت میں اس راستہ کو طے کرے گا وہ بڑی جلدی سے منزل پر پہنچ جائے گا یہ ایک بالکل واضح اور کھلی ہوئی سی بات ہے لیکن بعض لوگوں کو اس سلسلۂ سلوک وارشاد پر اور شعبۂ اصلاح وتزکیہ نفس پر طرح طرح کے شکوک وشبہات پیش آتے رہتے ہیں اور وہ پیری مریدی اور خانقاہ کے لفظ سے ایک طرح کی گھبراہٹ اور الجھن محسوس کرتے ہیں حالانکہ پوری دنیا کا کوئی بھی فن بغیر سیکھے اور عملی مشق کئے ہوئے نہ معتبر ہوتا اور نہ ہی مفید ہوتا ہے اس لیے جہاں کتابوں سے ان کو پڑھایا جاتا ہے وہیں ایک مخصوص مدت اس کی عملی پریکٹس (Practice) کی بھی ہوتی ہے جو اپنے بڑوں اور فن کے ماہروں کے ساتھ رہ کر کی جاتی ہے اور بڑی عجیب بات ہے کہ اس پر کسی کو کوئی اعتراض اور اشکال نہیں ہوتا مگر اسی مقصد کے لیے جب مشائخ کے پاس جا کر خانقاہوں میں کچھ وقت گزارنے کی کوئی بات کی جاتی ہے اور کتابوں میں پڑھی ہوئی باتوں کو عملی مشق میں ڈھالنے کا میدان آتا ہے تو اشکالات شروع ہوجاتے ہیں۔

حالانکہ احقر تو یہاں تک عرض کرتا ہے کہ اگر کسی شخص کو تصوف اور پیری مریدی وغیرہ جیسے الفاظ سے طبیعت میں کچھ تکدر اور دوری ہو جو کہ اصلاً تو ہونی نہیں چاہیے مگر پھر بھی اگر ایسا ہے تو پھر وہ تزکیہ واحسان اور اصلاح وسلوک اور زہد وتربیت وغیرہ جیسے الفاظ سے اسی مقصد کو تعبیر کرسکتا ہے جیسا کہ ایک مقام پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ

نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر معاملہ میں آدمی کو کسی مشیر کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ راستہ دین پر چلنے والا بھی ایسا ہے کہ اس میں ایک مشیر دینی کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ جو مشیر ہو اس پر اعتماد لازم ہے اور ایسے ہی شخص کو دوسرے لفظوں میں شیخ کہا جاتا ہے یہ درحقیقت الفاظ بدلنے کی بات ہے ورنہ مقصد اور حقیقت وہی ہے جیسا کہ اس مسئلے پر عرفان محبت جلد اول میں تفصیل سے گفتگو کی گئی۔

ورنہ اگر آدمی خود دین کے راستے پر چلتا ہے کہ کبھی تو وہ اتنے جوش میں ہوتا ہے کہ دین کی ہر چھوٹی بڑی بات پر عمل پیرا رہتا ہے اور کبھی کلی طور پر سب کچھ چھوڑ بیٹھتا ہے لیکن جب وہ شیخ کی صحبت میں رہے تو وہ اس کو تدریجاً تدریجاً (آہستہ آہستہ) اس طرح آگے لے کر چلتا ہے کہ پھر وہ محض جوش وجذبہ کی بات نہیں رہتی بلکہ اس کی طبیعت کے اندر استقامت اور جماؤ پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ شِرَّةً وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً فَإِنْ كَانَ صَاحِبُهَا سَدَّدَ وَقَارَبَ فَارْجُوْهُ وَإِنْ أُشِيْرَ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ فَلَا تَعُدُّوْهُ﴾

(سنن الترمذی، ابواب صفة القيامة، ج: ۴، ص: ۷۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر چیز میں حرص ونشاط ہے یعنی زیادتی وانہماک) اور ہر زیادتی میں سستی ہے (یعنی ہر اس فعل میں جو زیادتی کے ساتھ کیا جاوئے سستی پیدا ہو جاتی ہے) پس اگر عمل کرنے والے نے میانہ روی سے کام لیا اور میانہ روی کے قریب رہا (یعنی افراط وتفریط سے بچا رہا) تو اس کی نجات پا جانے کی امید ہے (یعنی اس کی کامیابی کی امید ہے) اور اگر اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا گیا یعنی مشہور ہونے کے لیے اس نے عبادت میں زیادتی اور مبالغہ کیا اور وہ مشہور ہو گیا تو تم اس کو (صالح اور عابد) شمار نہ کرو۔

تشریح: شرۃ میں ش پر زیر ہے اور را پر تشدید وزبر ہے جس کا ترجمہ حرص ورغبتِ شدیدہ ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بعض عابد شروع میں عبادت میں اس قدر مبالغہ اور انہماک کرتے ہیں کہ کچھ ہی دن میں تھک کر سست ہو کر بیٹھ جاتے ہیں پس یہ زیادتی سببِ کمی ہی نہیں بلکہ سبب ترکِ عبادت کا بن جاتی ہے اسی لیے دوسری حدیث میں وارد ہے:

﴿فَإِنَّ خَيْرَ الْعَمَلِ أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ﴾

(مسند احمد)

سب سے بہتر وہ عمل ہے جو تھوڑا ہے مگر ہمیشہ ہوتا رہے پس عبادت میں میانہ روی اور اعتدال رکھے تاکہ ہمیشہ اس عمل کا نباہ ہو سکے اور بہت مبالغہ کرنے والا کچھ دن میں صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے اور بزرگوں کا تجربہ ہے کہ اعمال میں میانہ روی اور اعتدال اہل اللہ اور کاملین کی صحبت اور ان کی مجلس میں حاضری کی برکات سے حاصل ہوتا

ہے اور استقامت کی نعمت اہل اللہ سے تعلق اور مصاحبت ہی سے عطا ہوتی ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**کونو مع الصادقین**'' ترجمہ: صادقین کے ساتھ رہو مراد صادقین سے مشائخ و بزرگانِ دین ہیں۔ (دنیا کی حقیقت، ص:۲۱۲)

حضرت جلال آبادی کی مجلس کا احقر کا ایک واقعہ

اسی پر احقر کو اپنا ایک واقعہ یاد آیا کہ جب حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ سے بیعت ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور حضرت کی مجلس میں جانا شروع کیا تو حضرت رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ مجلس میں یہ بات فرمائی کہ جو تہجد میں نہیں اٹھ سکتے ہیں تو وہ عشاء کے بعد دو چار رکعات تہجد کی نیت سے وتر اور سنتوں کے درمیان پڑھ لیا کریں تو اسی سے تہجد کا ثواب حاصل ہو جائے گا:

﴿فَاِنَّ سُنَّةَ التَّهَجُّدِ تَحْصُلُ بِالتَّنَفُّلِ بَعْدَ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ قَبْلَ النَّوْمِ﴾

(رد المحتار، کتاب الحظر والاباحة)

لیکن مجلس میں بیٹھے بیٹھے ہی احقر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ نہیں میں تو ایسا نہیں کروں گا کیونکہ اصل تو رات کو اٹھ کر ہی تہجد پڑھنا ہے اس لیے اسی وقت اٹھ کر پڑھا کروں گا ابھی دل میں خیال ہی آیا تھا کہ حضرت والا نے فوراً اس خیال کی تردید کی چونکہ حضرت کو کشف بہت ہوتا تھا اس لیے فوراً یہ بات فرمائی کہ شیخ کی بات پر یہ خیال دل میں نہ لانا کہ یہ تہجد نہیں ہے چنانچہ بظاہر یہ معمولی بات لگتی ہے لیکن اس کا اثر یہاں پڑتا ہے کہ جب آدمی عشاء کے بعد کی تہجد کی پابندی کرنے لگتا ہے اور رات کو اٹھنے کی کوشش بھی جاری رکھتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کو اس کی پختہ عادت ہو جاتی ہے اور یوں مستقبل قریب میں وہ تہجد کا پورا پابند ہو جاتا ہے اسی کا نام استقامت ہے ورنہ اپنی رائے پر چل کر چند دن جوش و جذبے میں رات کو اٹھا اور جب وہ جوش ختم ہوا تو نماز چھوڑ کر بیٹھ گیا اس لیے اپنی رائے کا دخل نہ دے کر شیخ کی رائے پر چلنے میں استقامت کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

دامن کوہ میں دامن فقر میں
لذت قرب سلطان جان مل گئی

یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہونے کے بعد انسان کو فقیری میں بھی وہی مزہ آتا ہے جو بادشاہی میں آتا ہے اور اُس کی بوریہ نشینی اُس کے لیے محلوں اور بنگلوں میں رہنے والوں کے لیے باعثِ رشک ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ دامنِ کوہ میں ہو اور یا فقر و فاقہ میں اُس کے دن کٹ رہے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کا قرب مل جانے کے بعد اُسے ایسی لذت حاصل ہوتی ہے جو کسی لمحے اُس کے قلب سے جدا نہیں ہوتی اور یہی چین و سکون کی جڑ اور بنیاد ہے۔

اس لیے حضرت والا کا منشا یہ ہے کہ اللہ والا بن جانے کے بعد ظاہری حالت کیسی بھی ہو اور آدمی کہیں بھی ہو اُسے ہر حال میں اور ہر گھڑی اللہ تعالیٰ سے تعلق اور قرب کا مزہ ملتا رہتا ہے۔ جبکہ جو لوگ غیر اللہ کو اپنا دل دیئے

رہتے ہیں اور حسین حسیناؤں کے چکروں میں ساری عمر گزار دیتے ہیں وہ جب تک اُن کے پاس رہتے ہیں تو بظاہر اُنہیں سکون محسوس ہوتا ہے لیکن جب جدا ہو جاتے ہیں اور تنہائیوں میں ہوتے ہیں تو پھر ان کے دل کی بے چینی اور پریشانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہر جگہ اور ہر لمحہ اپنے مؤمن بندوں کے ساتھ ہوتی ہے اور اُن کے قلب و روح کی تسکین و تسلی اور اطمینان و انبساط کا ذریعہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ یہ مضمون حضرت کے شعروں میں بکثرت آیا ہے۔

مل گئی جب سے توفیق ذکرِ خدا
روح کو راحتِ دوجہاں مل گئی

قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے ذکر پر قلب کو اطمینان میسر ہونا اور دل کو چین وسکون نصیب ہونا مختلف مواقع پر مذکور ہوا ہے کیونکہ اصل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی روح کی غذا ہے تو جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اُس کی توفیق کی دولت سے ذکر اللہ میں مشغولی کی نعمت میسر آگئی ہو یقیناً اُس کی روح کو دوجہاں کی راحت نصیب ہو جائے گی۔

ربطِ گلشن کی کیا یہ کرامت نہیں
دشت میں راحتِ آشیاں مل گئی

اصل میں انسان کو راحت وآرام اپنے گھر میں نصیب ہوتا ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے خاص بندوں کے قلب میں اپنے قرب کی ایسی حلاوت عطا فرماتے ہیں کہ جس کی برکت سے وہ زمین کے جس کونے اور جس حصے پر بھی رہیں حتیٰ کہ ایسے جنگلوں اور بیابانوں اور دریاؤں اور سمندروں کے کنارے جہاں کوئی شاندار محل اور بنگلہ موجود نہ ہو انہیں اس قرب کی بدولت وہاں بھی بنگلوں کا مزہ آتا ہے۔

اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ وہ زمین کے ہر حصے پر اپنے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ذکر وتسبیح اور تلاوت ومناجات میں لگ جاتے ہیں جو کہ قلبی چین وسکون اور راحت وآرام کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ جہاں آپ نے کوئی نیکی کی وہ زمین کل قیامت کے دن آپ کے حق میں اُس کی گواہی دے گی۔ جیسا کہ جس زمین پر کسی نے کوئی گناہ کیا ہو وہ زمین اس کے خلاف گواہی دے گی۔ ہماری زبانیں بند ہو جائیں گی جن اعضاء سے ہم نے کوئی غلط حرکت کی ہوگی وہ اعضاء خود گواہی دیں گے:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

(سورۃ یٰس، پارہ: ۲۳)

ترجمہ: آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے ان کے پاؤں جو کچھ

وہ کماتے تھے۔

اور دوسری جگہ ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾

(سورۃ بنی اسرآئیل، آیت: ۳۶)

ترجمہ: اور جس بات کی تم کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل مت کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب سے (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی۔ (معارف القرآن، جلد:۵، ص:۴۶۹)

ایک اور جگہ پر ارشاد ہے کہ:

﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا﴾

(سورۃ الزلزال، پارہ:۳۰)

ترجمہ: اس روز زمین اپنی سب (اچھی، بری) خبریں بیان کرنے لگے گی۔

ان کی خاطر اُٹھایا جو حسرت کا غم
روح کو عشرتِ دوجہاں مل گئی

اللہ تعالیٰ کے دین پر چلتے وقت یہ تو یقینی بات ہے کہ دل پر کچھ غم تو اُٹھانے پڑیں گے، کبھی مخلوق کے طعن و تشنیع کی شکل میں تو کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسری آزمائشوں کی صورت میں لیکن یہ بھی بالکل سچ اور برحق ہے جس کا اللہ کی طرف سے وعدہ ہے کہ جو شخص اپنی حسرتوں کو پامال کرتا ہے اور آرزوؤں کا خون پی لیتا ہے تو اُس کے دل کو اللہ تعالیٰ باغ و بہار کر دیتے ہیں اور پھر روح کو عشرتِ دوجہاں میسر ہو جاتی ہے۔

صحبتِ شیخِ کامل سے اخترؔ کو بھی
لذتِ راہِ ربِ جہاں مل گئی

یہ درحقیقت حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کے اُس ملفوظ کی تشریح ہے جس میں حضرت نے ہمارے حضرت والا کو مخاطب کر کے یہ بات فرمائی کہ اللہ والوں سے تعلق کے بعد یہ راستہ یعنی راہِ سلوک طے کرنا صرف آسان ہی نہیں بلکہ لذیذ ہو جاتا ہے۔ یعنی خود طے کرتے ہوئے طبیعت پر دشواری محسوس ہونے کے بجائے خوشی خوشی انسان آگے قدم بڑھاتا رہتا ہے اور منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے وقت ہر قدم پر مؤمن کو اُس کی منزل ملتی ہے کیونکہ جب وہ مضبوطی سے اُس راہ پر چل رہا ہے تو یہی عینِ مقصدِ حیات ہے جس کو وہ انجام دے رہا ہے۔ اس لیے اُسے اللہ تعالیٰ کے راستے کی لذت کا ملنا یقینی بات ہے۔

آہ و نالوں سے مٹ گئے ظلمات

آہ نالوں سے مٹ گئے ظلمات ان کی یادوں کے مل گئے نفحات
ہر نفس میر ان سے باتیں ہیں ان کے عاشق کے ہیں یہی درجات
غیر فانی بہار عشرت ہے تلخ حسرت کے ہیں یہی ثمرات
میر کہتے ہیں سرد آہوں پر گرمی وصل کی ملی سوغات
کس قدر تلخیاں ہیں غیروں میں کاش اپنوں میں رہتے ہم ہیہات
مرنے والوں پہ مرنے والوں پر سینکڑوں غم ہیں سینکڑوں آفات
کاش مرتے ہم اپنے خالق پر اور پاتے ہم ان سے انعامات
نار شہوت کو نور حق سے بجھا پیر رومی کے ہیں یہ ارشادات

مشکل الفاظ کے معانی: **آہ و نالوں**: اللہ تعالیٰ کو یاد کرکے رونا۔ **ظلمات**: اندھیرے۔ **نفحات**: اللہ تعالیٰ کے کرم کے جھونکے۔ **نفس**: سانس۔ **غیر فانی**: ختم نہ ہونے والی۔ **ثمرات**: ثمر کی جمع یعنی پھل۔ **سرد آہوں**: اللہ تعالیٰ کو یاد کرکے آہیں بھرنا۔ **وصل**: اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق۔ **سوغات**: تحفہ۔ **تلخیاں**: کڑواہٹیں۔ **غیروں میں**: اللہ تعالیٰ کے علاوہ۔ **ہیہات**: اسم فعل ہے یعنی ہائے ہم اللہ والوں سے دور رہے۔ **آفات**: مصیبتیں۔ **نارِ شہوت**: حرام لذت کی آگ۔

آہ نالوں سے مٹ گئے ظلمات
ان کی یادوں کے مل گئے نفحات

جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اُس کے خوف سے یا محبت سے رونا میسر آجائے اور اس کی آنکھیں اشکبار ہوجائیں اور آہ و زاری کی دولت اُسے حاصل ہوجائے تو یقیناً اُس کے قلب کی ظلمتیں دور ہوکر بالکل ختم ہوجائیں گی اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کی محبتوں اور یادوں میں ایسی زندگی گزارے گا کہ اُسے بے شمار خوشیاں محسوس ہوں گی اور ایسا لگے گا جیسے رحمت کی ہوا کے جھونکے اُس کے دل و دماغ کی طرف چل رہے ہیں اور اُس کے قلب و جگر میں اُس کی بہاریں پہنچ رہی ہیں اور قربِ خداوندی کی خوشبو سے اُس کے دل و جان معطر ہو رہے ہیں۔

ہر نفس میر ان سے باتیں ہیں
ان کے عاشق کے ہیں یہی درجات

اللہ تعالیٰ کے جو لوگ سچے عاشق ہوتے ہیں وہ بظاہر دنیا کے مشغلوں میں لگے رہتے ہیں لیکن اندر اندر وہ ایک سانس بھی اللہ سے غافل نہیں رہتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص رازدارانہ انداز سے اُسے یاد کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور اُس کا ذکر کرتے رہتے ہیں جسے خواجہ صاحب نے اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا۔

تم سا کوئی ہمدم کوئی دم ساز نہیں ہے
باتیں تو ہیں ہر دم مگر آواز نہیں ہے

خاصانِ خدا کا یہ ایسا ذکر ہے کہ جس کا فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلتا اور اُن سے بھی مخفی رہتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں اس ذکرِ خفی سے متعلق یہ بات وارد ہوئی ہے کہ اُس کی فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی موت سے محبت

غیر فانی بہار عشرت ہے
تلخ حسرت کے ہیں یہی ثمرات

جتنے کڑوے گھونٹ پی کر اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر جما جائے گا اور جس درجے کا شدید اور قوی مجاہدہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اختیار کیا جائے گا اور جتنی ایذائیں اور تکلیفیں حق تعالیٰ کے لیے برداشت کر کے اُس کو راضی رکھنے کی فکر کی جائے گی تو اُس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کو جنت میں اور آخرت میں ایسی بہار عطا فرمائیں گے جس کو کبھی فنا لاحق ہونے والی نہیں ہے، لہٰذا نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہے کہ وقتی خواہشات کی تکمیل کے لیے کچھ مزہ اُٹھا کر مجرمانہ لذت کا ارتکاب کیا جائے اور اُسی کو عیش سمجھ لیا جائے۔ بھلا وہ عیش کیا عیش ہے کہ جہاں سب سامانِ عیش ہو لیکن اُس میں فنا ہونے کا داغ لگا ہوا ہو، جو ختم ہونے والی ہو اور جو مٹنے والی ہو اور وہ بہار کیا بہار ہے جسے جلد ہی خزاں لگ کر بے نام ونشان کر دے گی۔ اس لیے دنیا کے ہر عیش اور مزے میں یہ خرابی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کرام کا دل دنیا سے قطعاً نہیں لگا ہوا تھا کہ اُن کے سامنے دائمی اور ابدی حیات اور وہاں کی جنتیں اور اُس کی باغ و بہار ایسی ہوگئی تھی جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

آخر کوئی تو بات تھی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحابی پوچھتے ہیں کہ میں بازار جا رہا ہوں، اگر کچھ لانا ہو تو بتائیے۔ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب ارشاد فرمایا کہ اگر موت مل رہی ہو تو لے آنا کیونکہ وہ میرے لیے میرے محبوب سے ملنے کا ذریعہ ہے اور یہی بات ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابہ کو میدانِ جہاد میں جانے کے لیے پکارتے تھے تو وہ حضرات دائیں بائیں نہ دیکھتے بلکہ وہ فوراً لبیک کہہ کر بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے دوڑتے ہوئے جاتے تھے اور مزید برآں یہ کہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ کاش! میرا نام جانے والے مجاہدین میں آجائے اور میں اپنی جان اللہ کی راہ میں پیش کر دوں اور پھر ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ثمرات اور پھل بھی بڑے اونچے ہیں اور وہ جنت کی لازوال نعمتیں ہیں۔

میر کہتے ہیں سرد آہوں پر
گرمی وصل کی ملی سوغات

یہ حضرت والا کی ایک تعبیر وتشبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے جب آ ہیں بھری جاتی ہیں تو حق تعالیٰ اُسے وصول الی اللہ کی دولت عطا فرما دیتے ہیں، مگر ظاہر ہے یہ اپنی خواہشات کو پامال کرنے کے نتیجے میں بھری جانے والی ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس ٹھنڈی آہ کا استقبال گرمیٔ وصل کی سوغات عطا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ تحفہ اور سوغات لومڑیانہ چال چلنے والوں کو میسر نہیں آتی کہ جیسے ہی دل نے چاہا کہ اِسے دیکھوں فوراً آنکھیں اُدھر دوڑا دیں۔ تمنائیں بہت ہوں اور آرزوؤں سے دل بھرا ہو مگر خدا کا حکم ٹوٹتا ہوا دیکھ کر اللہ کا سچا عاشق ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہے، مگر حکم توڑنا گوارا نہیں کرتا تو اُسے اللہ تعالیٰ کی محبت کی سوغات اور تحفہ عطا کیا جاتا ہے۔

کس قدر تلخیاں ہیں غیروں میں
کاش اپنوں میں رہتے ہم ہیہات

یعنی ہائے افسوس! غیروں کو دل دے کر اور اُن پر فدا ہونے کے نتیجے میں زندگیاں کس قدر تلخ اور کڑوی کر دی جاتی ہیں کہ وہ جینے میں جینا نہیں رہتا۔ چین وسکون کی دولت اللہ تعالیٰ چھین لیتے ہیں اور یہاں دنیا ہی میں جہنم کا سا منظر سامنے آجاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اپنی نگاہوں سے بہت سے عشاق مجازی کو اس طرح بے چین اور پریشان اور تڑپتے ہوئے اور پاگلوں کی طرح پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اس لیے حضرت والا ہیہات وشتان فرماتے ہیں کہ غیر اللہ سے بہت دور رہیے ورنہ تلخیاں ہی تلخیاں ملیں گی اور اگر کوئی شخص اہل اللہ میں رہے، اُس کا اُٹھنا بیٹھنا خاصانِ خدا کے ساتھ ہو تو پھر اُس کی زندگی بھی زندگی بن جاتی ہے اور اُسے حسرت وافسوس کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ جیسا کہ حضرت والا کے آس پاس بیٹھنے والے حضرات کی ایک بڑی تعداد اصلاحی تعلق قائم کرنے کے بعد جب ماضی کی داستانیں اپنی زبانی سنانے پر آتے ہیں تو یہ واضح فرق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پہلی زندگی میں کتنی تلخیاں تھیں اور اب ہم کتنے مزے اور لذت میں جی رہے ہیں۔

مخلوق پر مرو تو آفات اور زندۂ خالق پر فدا ہو تو انعامات

مرنے والوں پہ مرنے والوں پر
سینکڑوں غم ہیں سینکڑوں آفات
کاش مرتے ہم اپنے خالق پر
اور پاتے ہم ان سے انعامات

کیا ہی خوب حضرت والا کا یہ شعر ہے کہ ایک طرف یہ نصیحت فرما رہے ہیں کہ تم اُن لوگوں کو دل مت دو جو

عنقریب مر کر ختم ہو جانے والے ہیں اور وجہ بھی خود شعر میں ذکر کی جا رہی ہے کہ جب وہ مرنے والے ہیں تو اُن کو دل دینا عقلمندی اور سمجھداری نہیں ہے لیکن جنھوں نے عقل وفہم سے کام نہیں لیا اور اِن مرنے والوں کو دل دے کر اُن پر مر گئے ہیں افسوس در افسوس! وہ کتنے غم اور بے چینیوں میں مبتلا ہیں اور آئے دن کیسی آفات و بلیات اور مصائب وحوادث نے اُنھیں گھیر رکھا ہے۔ کہیں خودکشی کی نوبت آ رہی ہے، کہیں ڈپریشن اور ٹینشن سے راتوں کی نیندیں اُن پر حرام ہو چکی ہیں اور کہیں غموم و ہموم کے ایک عظیم طوفان میں اُن کی کشتی پھنسی ہے تو کہیں دل و دماغ بے چینی اور پریشانی میں مبتلا ہو کر ہر شے سے مایوس ہو چکے ہیں۔

اس لیے نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے خدارا! اپنی جوانی کو ان حسین مرنے والوں پر ختم نہ کرو اور تمھیں مرنا ہے تو اللہ کی ذاتِ پاک کے اوپر مرو کہ جس پر مرنے کے نتیجے میں ہمیشہ زندگی والی حیات نصیب ہو جاتی ہے اور جو اپنے ارادہ اور اختیار سے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے لڑتے لڑتے اور جدوجہد کرتے کرتے اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کرتے ہیں تو اُن کے بارے میں قرآنِ پاک نے اعلان فرمایا کہ میں اُن کو خاص قسم کی زندگی عطا کرتا ہوں اور مخصوص قسم کے انعامات عالمِ برزخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن لوگوں کو عطا کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۝ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝﴾

(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۶۹)

ترجمہ: اور (اے مخاطب!) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کیے گئے ان کو (اور مردوں کی طرح) مُردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں (اور) اپنے پروردگار کے مقرب (یعنی مقبول ہیں) ان کو رزق بھی ملتا ہے (اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے عطا فرمائی۔

شہدا کے فضائل اور ان کی خصوصی حیات برزخی

اس آیت میں شہداء کے خاص فضائل کا بیان ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کی بڑی تفصیل وارد ہوئی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شہداء کے بھی درجات اور حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لیے روایاتِ حدیث میں جو مختلف صورتیں آئی ہیں، وہ مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں۔

یہاں شہداء کی پہلی فضیلت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مرے نہیں بلکہ دائمی زندگی کے مالک ہو گئے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بظاہر ان کا مرنا اور قبر میں دفن ہونا تو مشاہد اور محسوس ہے۔ پھر قرآن کی متعدد آیات

میں ان کو مردہ نہ کہنے اور نہ سمجھنے کی جو ہدایت آئی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کہا جائے کہ حیات برزخی مراد ہے تو وہ ہر شخص مؤمن و کافر کو حاصل ہے کہ مرنے کے بعد اس کی روح زندہ رہتی ہے اور قبر کے سوال و جواب کے بعد مؤمنین صالحین کے لیے سامانِ راحت اور کفار فجار کے لیے قبر کا عذاب قرآن وسنت سے ثابت ہے تو یہ حیات برزخی جب سب کے لیے عام ہے تو شہداء کی کیا خصوصیت ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی اسی آیت نے یہ بتلایا ہے کہ شہداء کو اللہ کی طرف سے جنت کا رزق ملتا ہے اور رزق زندہ آدمی کو ملا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا سے منتقل ہوتے ہی شہید کے لیے رزقِ جنت جاری ہو جاتا ہے اور ایک خاص قسم کی زندگی اسی وقت سے اس کو مل جاتی ہے جو عام مُردوں سے ممتاز حیثیت کی ہے۔ (قرطبی)

اب رہا کہ وہ امتیاز کیا ہے؟ اور وہ زندگی کیسی ہے؟ اس کی حقیقت سوائے خالقِ کائنات کے نہ کوئی جان سکتا ہے نہ جاننے کی ضرورت ہے۔ البتہ بسا اوقات ان کی حیاتِ خاص کا اثر اس دنیا میں بھی ان کے ابدان پر ظاہر ہوتا ہے کہ زمین ان کو نہیں کھاتی، وہ صحیح سالم باقی رہتے ہیں۔ (قرطبی) جس کے بہت سے واقعات مشاہدہ کیے گئے ہیں۔

شہداء کی پہلی فضیلت اس آیت میں ان کی ممتاز دائمی حیات ہے۔ دوسری یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق ملتا ہے۔ تیسری فضیلت فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ میں یہ بیان کی گئی کہ وہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے ان نعمتوں میں جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں۔ چوتھی فضیلت یہ ہے مِنۡ فَضۡلِهٖ وَیَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ یعنی وہ اپنے جن متعلقین کو دنیا میں چھوڑ گئے تھے ان کے متعلق بھی اُن کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر نیک کام اور جہاد میں مصروف رہیں تو ان کو بھی یہاں آ کر یہی نعمتیں اور درجاتِ عالیہ ملیں گے اور سدّی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ شہید کا جو کوئی عزیز دوست مرنے والا ہوتا ہے شہید کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دی جاتی ہے کہ فلاں شخص اب تمہارے پاس آ رہا ہے، وہ اس سے ایسا خوش ہوتا ہے جیسے دنیا میں کسی دور افتادہ دوست سے بعد مدت ملاقات کی خوشی ہوتی ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول جو ابوداؤد رحمہ اللہ نے باسناد صحیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ جب واقعہ احد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے جسم میں رکھ کر آزاد کر دیا۔ وہ جنت کی نہروں اور باغات کے پھلوں سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں اور پھر اُن قندیلوں میں آ جاتے ہیں جو اُن کے لیے عرشِ رحمٰن کے نیچے معلّق ہیں۔ جب ان لوگوں نے اپنی راحت وعیش کی یہ زندگی دیکھی تو کہنے لگے کہ (ہمارے متعلقین دنیا میں ہمارے مرنے سے غمگین ہیں) کیا کوئی ہمارے حالات کی خبر ان کو پہنچا سکتا ہے تاکہ وہ ہم پر غم نہ کریں اور وہ بھی جہاد میں کوشش کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہاری یہ خبر اُن کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل فرمائی گئی۔

(معارف القرآن، جلد:۲، صفحہ:۲۳۷)

اور مشکوٰۃ صفحہ: ۳۳۳ پر روایت ہے جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلشَّہِیْدِ عِنْدَ اللہِ سِتُّ خِصَالٍ یُغْفَرُ لَہٗ فِیْ اَوَّلِ دَفْعَۃٍ وَیَرٰی مَقْعَدَہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ وَیُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَیَأْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْاَکْبَرِ وَیُوْضَعُ عَلٰی رَأْسِہٖ تَاجُ الْوَقَارِ اَلْیَاقُوْتَۃُ مِنْھَا خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا وَیُزَوَّجُ اثْنَتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ زَوْجَۃً مِّنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ وَیُشَفَّعُ فِیْ سَبْعِیْنَ مِنْ اَقَارِبِہٖ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الجہاد، باب فی ثواب الشہید)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہید کو اللہ تعالیٰ کے یہاں چھ انعام ملتے ہیں۔ (۱) فوراً اُس کی بخشش کر کے اُس کا ٹھکانہ جنت سے دکھایا جاتا ہے۔ (۲) اُسے عذابِ قبر سے مکمل محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ (۳) قیامت کے دن کی بڑی گھبراہٹ سے وہ محفوظ رہے گا۔ (۴) اُس کے سر پر عزت وعظمت کا ایسا تاج رکھا جائے گا کہ جس کا ایک یاقوت دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ (۵) جنت کی بہتر بڑی آنکھوں والی بیبیوں سے اُس کی شادی کر دی جائے گی۔ (۶) ستر رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت منظور کی جائے گی۔

نارِ شہوت کو نورِ حق سے بجھاؤ

نارِ شہوت کو نورِ حق سے بجھا
پیر رومی کے ہیں یہ ارشادات

اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہونے کے بعد شہوت کے تقاضوں پر عمل کرنے سے بچنا آسان ہو جاتا ہے اور آدمی ذکر اللہ کی پابندی کرے اور دل کو اللہ تعالیٰ کے انوارات اور تجلیات سے منور اور روشن کر دے تو پھر نارِ شہوت بجھ جائے گی، لیکن جو لوگ اس آگ کو اس پر پیٹرول چھڑک کر بجھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ذہن میں وہ یہ سوچتے ہیں کہ بس صرف ایک بار اور محبوب ومحبوبہ کی دوبارہ ملاقات یا اُن سے گفتگو اور اُن کے دیدار سے یہ آگ بجھ جائے گی اور مجھے کچھ تسلی مل جائے گی یہ محض شیطان کی چال اور نفس کا دھوکہ ہے۔ بچنے کی آسان صورت یہی ہے کہ ہمت کر کے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد میں لگے اور دل کو اُس سے روشن اور منور کرے اور اُدھر سے ذہن کو پوری قوت اور مجاہدہ کر کے بالکل ہٹالے۔ تب ہی اس سے بچا جاسکتا ہے اور شہوت کی آگ بجھ سکتی ہے۔ جیسا کہ مولانا رومی نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے اور یہ مضمون درحقیقت حضرت مولانا رومی کے بعض اشعار کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

وہی لمحہ بہارِ زندگی ہے

غمِ پنہاں متاعِ زندگی ہے
رموزِ عاشقی و بندگی ہے

میری آنکھوں کی ٹھنڈک جانِ عالم
تیری چوکھٹ پہ سرافگندگی ہے

متاعِ ہر دو عالم اس کو حاصل
جسے حاصل کمالِ بندگی ہے

موانع نذر ہیں دستِ جنوں کے
بڑے ہی کام کی دیوانگی ہے

اگر بیگانگی ہے تجھ کو گُل سے
چمن میں بھی تجھے افسردگی ہے

جو ان کی یاد میں گذرا ہے اختؔر
وہی لمحہ بہارِ زندگی ہے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **غم پنہاں**: دل ہی دل میں غم اٹھا کر گناہوں سے بچنا۔ **متاع**: ساز و سامان۔ **رموز**: نشانیاں۔ **جانِ عالم**: اللہ تعالیٰ۔ **سرافگندگی**: سر جھکانا۔ **کمالِ بندگی**: اللہ تعالیٰ کی مکمل تابعداری۔ **موانع**: رکاوٹیں۔ **نذر**: قابو میں ہیں۔ **دستِ جنوں**: اللہ تعالیٰ کے عاشق کا ہاتھ۔ **بیگانگی**: انجانا پن۔ **افسردگی**: غمزدہ۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم ہی متاع زندگی ہے

غمِ پنہاں متاعِ زندگی ہے
رموزِ عاشقی و بندگی ہے

یہ غم جس کا اس شعر میں ذکر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا حاصل وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اُس کے راستے کے اُٹھائے ہوئے غم کہ جن کی بدولت اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں اور نفس کی خواہشات پر نہ چلنے سے جو دل پر رنج اور صدمہ پہنچتا ہے یہی دراصل زندگی کی اصل متاع اور سامان ہے اور اسی میں بندۂ مؤمن کی بندگی کا راز چھپا ہوا ہے کیونکہ جو شخص اپنے آقا کے کہنے کو ماننے کو تیار نہ ہو جہاں چاہا جیسا چاہا اپنی مرضی سے کرتا پھر رہا ہو، آقا راضی ہے یا ناراض اس کی کوئی پرواہ نہ ہو تو اُسے غلام بننا نہیں آتا اور وہ آقا کے ساتھ رہنے کا سلیقہ نہیں جانتا۔ پکا اور وفادار غلام وہ ہوتا ہے کہ جیسے آقا کہے اور جو چاہے اور جس وقت چاہے بس وہ اس کے لیے فوراً تیار رہے۔ اُس کی اپنی کوئی تجویز نہ ہو بلکہ ہر معاملے میں تفویض ہی تفویض ہو۔

اس لیے بندگی کا راز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہ ٹوٹے اور نہ چھوٹے، اگرچہ اُس کے لیے دل ٹوٹ ٹوٹ کے چورا ہو جائے اور صدمہ و غم سے دل انتہائی غم زدہ اور رنجیدہ ہو۔ مگر یہ اللہ کا دیوانہ اپنے ہر حال و قال سے اللہ کے فیصلے پر خوش اور راضی نظر آتا ہو اور ہر حکمِ خداوندی بجالانے پر دل و جان سے مسرور ہو۔ یہی صحیح بندگی اور عاشقی کی پہچان اور نشانی ہے۔ بقول حضرت والا ؎

صدمہ و غم میں میرے دل کے تبسم کی مثال
جیسے غنچہ گھرے کانٹوں میں چٹک لیتا ہو

میری آنکھوں کی ٹھنڈک جانِ عالم
تیری چوکھٹ پہ سرافگندگی ہے
متاعِ ہر دو عالم اس کو حاصل
جسے حاصل کمالِ بندگی ہے

خلاصہ یہ کہ میری آنکھوں کو ٹھنڈک اور میرے دل کو چین و سکون اسی صورت میں میسر آتا ہے کہ میرا سر آپ کی چوکھٹ پر پڑا ہوا ہے اور میں ہر وقت آپ کے در پر سجدہ ریز ہو کر آپ ہی کو پکارتا رہوں، ایسی نوبت میری زندگی میں کبھی نہ آئے کہ میرا سر ہو اور کسی اور کا در، کیونکہ خلاصۂ بندگی اور کمالِ طاعتِ خداوندی کا حق یہی ہے اور اسی میں دونوں عالم کی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے کہ مسلمان اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اور ہر آرزو اور تمنا میں اللہ تعالیٰ کے در کو کھٹکھٹا رہے ہیں۔ جیسے کہ حضرت والا کا شعر ہے ؎

ہمارا مرکزِ اُمیدِ رحمت آپ کا در ہے
کسی کے در پہ تو یاربّ یہ پیشانی نہیں جاتی
سوا تیرے نہیں ہے کوئی میرا سنگِ در اپنا
کوئی حاجت ہو رکھتا ہوں تیری چوکھٹ پہ سر اپنا

دستِ جنوں کی طاقت دیکھئے

موانع نذر ہیں دستِ جنوں کے
بڑے ہی کام کی دیوانگی ہے

اہلِ خرد اپنی عقل کو آڑ بنا کر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی پر مکمل طور پر فدا ہونے سے بچتے ہیں اور اہلِ جنوں بغیر کسی کے طعن و تشنیع کی پرواہ کیے ہوئے اپنے مولا کے ہر حکم پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس لیے حضرت والا نے یہ بات فرمائی کہ اس راہ کی جتنی رکاوٹیں ہیں وہ دستِ جنوں کی نظر ہیں۔ اس لیے مجھے اس راہ پر چلنے سے کوئی موانع روک نہیں سکتے کیونکہ میں نے اپنے لیے دیوانگی کے طریق کو اختیار کیا ہے، فرزانگی کو نہیں۔ اور پوری تاریخ گواہ ہے کہ جو زیادہ عقل سے سوچنے سمجھنے کے عادی ہو جاتے ہیں تو انہیں ہر بات میں ''اگر، مگر'' نظر آتی ہے۔ اور وہ اپنے مقتداء و رہبر اور شیخ و مرشد کی تعلیمات پر پورے طور پر عمل نہیں کر پاتے اور قرآن و حدیث کے

احکام پر بھی جہاں اپنے ظاہری مصالح اور مادّی منافع کے خلاف کوئی چیز نظر آتی ہے تو وہ اُس سے پہلوتہی کر جاتے ہیں۔ کیا ہی خوب خواجہ صاحب کا یہ شعر ہے ؎

فرزانہ جسے بننا ہو جائے وہ کہیں اور
دیوانہ جسے بننا ہو آئے یہاں آئے
سو بار بگڑنا جسے منظور ہو اپنا
آئے وہ یہاں اور بچشم و بسر آئے

اگر بیگانگی ہے تجھ کو گُل سے
چمن میں بھی تجھے افسردگی ہے

پورے چمن کی جان پھول پھلواریاں ہوتی ہیں اگر کسی کو گلشن اور چمن میں رہتے ہوئے انہی سے مناسبت نہ ہو تو پھر اُس کے لیے یہ چمن اور یہ گلشن، گلشن و چمن نہیں رہتا بلکہ دشت و بیابان کے مانند ہو جاتا ہے، لہٰذا اے مردِ مؤمن! اگر کائنات کے اس چمن میں تجھے اللہ تعالیٰ سے تعلق حاصل نہیں ہے تو پھر یاد رکھنا یہ بنگلے اور محلات بھی تیرے لیے دشت و بیابان کی طرح بے چینی و پریشان کا سامان بنیں گے۔ ان میں تجھے سکون میسر نہ ہوگا۔ لہٰذا اصل بات سکون پانے کے لیے اپنے اللہ سے رابطہ اور تعلق مضبوط پیدا کر کے اُس سے بیگانگی والے رشتے کو ختم کرنا ہوگا۔

جو ان کی یاد میں گذرا ہے اختؔر
وہی لمحہ بہارِ زندگی ہے

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان کے دنیا میں پیدا ہونے کے بعد اُس کے جو لمحاتِ زندگی اِدھر اُدھر کی چیزوں اور دنیا کے مشغلوں میں گزر جائیں گے وہ دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے پریشانی اور ناکامی اور حسرت و مایوسی کا سبب ہیں۔ حقیقت میں انسان کے لیے زندگی کی بہار وہی لمحاتِ حیات ہوتے ہیں جو اللہ کی یاد میں گزرتے ہیں اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ ان لمحاتِ حیات کی بدولت اُسے آخرت میں بھی بالطف زندگی ملتی ہے اور اِس دنیا کے اندر بھی اُسے بڑی حلاوت و لذت والی حیات نصیب ہوتی ہے اس لیے حضرت والا کا یہ فرمانا بالکل بجا اور درست ہے کہ بس وہی لمحۂ حیات بہارِ زندگی ہے جس میں میں نے اللہ کو یاد کیا۔ اس لیے آخرت میں اللہ کے خاص بندے بھی اس لمحۂ زندگی پر جو اللہ کی یاد کے بغیر گزرا ہوگا افسوس کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا و آخرت کے افسوس والی صورتحال سے اور ندامت و پشیمانی سے محفوظ فرمالے۔

رشک کرتا ہے زمیں پر آسماں

کیا کہوں میں دردِ دل کی داستاں — جس کی برکت سے ملی آہ و فغاں
ہو مبارک تجھ کو اے آہ و فغاں — ان کی جانب سے کرم پایا عیاں
جب سنو گے داستان عاشقاں — پھر ملے گی تم کو بزم دوستاں
دوستو یہ درد دل کا بوستاں — ہے عطائے دوست بہر دوستاں
جب زمیں پر روتے ہیں مستغفراں — رشک کرتا ہے زمیں پر آسماں
سیکڑوں جاں کی ہے بارش ہر زماں — ایسی جاں پر جو فدا ہو تجھ پہ یاں
جب بھی دیکھا ہے سکوت عاشقاں — ان کی خاموشی ہے رشک صد بیاں
جس کے آب و گل میں درد دل نہ ہو — جسم خاکی ہے فقط اے دوستاں
دل مرا مضطر رہے تیرے لیے — ہے یہی بس حاصل ہر دو جہاں
جب سے تیراغم ملا ہے اے خدا — رہتا ہے ہر وقت اختر شادماں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **عیاں**: کھلا ہوا۔ **داستانِ عاشقاں**: اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کی داستان۔ **بزمِ دوستاں**: اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی محفل۔ **بوستاں**: باغ۔ **عطائے دوست**: اللہ تعالیٰ کی عنایت۔ **بھر دوستاں**: اولیاء اللہ کے لیے۔ **مستغفراں**: اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے والے۔ **ھر زماں**: ہرلمحہ۔ **صدبیاں**: سینکڑوں بیاں وتقریریں۔ **آب و گل**: پانی اورمٹی۔ **جسم خاکی**: مٹی کا جسم۔ **مضطر**: بےچین۔ **شادماں**: خوش وخرم۔

کیا کہوں میں درد دل کی داستاں
جس کی برکت سے ملی آہ و فغاں
ہو مبارک تجھ کو اے آہ فغاں
ان کی جانب سے کرم پایا عیاں

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اپنی محبت کا دردعطا فرما دیا، اپنی یاد میں کی جانے والی آہ وفغاں کی دولت عطا فرمادی ہے جو واضح طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق بخشی کہ میں نے اس کے راستے کے غم اٹھائے تو اس کی برکت سے دل میں ایک خاص تڑپ، اور سوز وگداز حاصل ہوگئی اور اسی کی ترجمانی کے طور پر میری زبان سے آہ وفغاں ہوتی رہتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور عنایت نازل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

عطائے دوست بہر دوستاں

جب سنو گے داستانِ عاشقاں
پھر ملے گی تم کو بزمِ دوستاں
دوستو یہ دردِ دل کا بوستاں
ہے عطائے دوست بہرِ دوستاں

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت دنیا میں اس طرح قائم فرمائی ہے کہ جو شخص خاصان خدا اہل اللہ کے ساتھ رہتا ہے اور ان کی صحبت اٹھاتا ہے تو پھر اسے بھی اللہ تعالیٰ کا خاص تعلق نصیب ہو جاتا ہے اور انتہائی گہرے درجے کی محبت دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور جب عاشقوں کی داستان ان کی زبانی سننا نصیب ہوتا ہے تو پھر بسہولت بزم دوستاں کی نعمت بھی مل جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر جو رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتے ہیں تو ان کے ساتھ رہنے والا بھی پھر اس سے محروم نہیں رہتا اس لیے جو شخص دردِ دل کا بوستاں حاصل کرنا چاہے اس کی صورت یہی ہے کہ اللہ والوں کی دوستی حاصل کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی یہ چیز عطا فرما دیں گے۔ جیسے ایک روایت میں ہے:

﴿فَعِنْدَ ذِكْرِ الصَّالِحِيْنَ تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ﴾

(مرقاة المفاتيح، باب الجنازة)

کہ اللہ والوں کے تذکرے کے وقت میں رحمت نازل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جہاں وہ خود موجود ہوں وہاں کتنی رحمتیں نازل ہوں گی۔ اسی لیے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر دل کا سوز وگداز تجھے حاصل کرنا ہے تو اللہ والوں کے ساتھ رہ ۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا ترا بخشش خدا سوز و گداز

کہ پیر رومی کو راستہ کا ساتھی بنالو تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی دل کا سوز وگداز اور خاص تڑپ اور لگن عطا فرما دے کیونکہ یہ دولت اللہ والوں کی صحبت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی ہے تاریخی واقعات اور قرآن وحدیث کے دلائل اس پر شاہد ہیں۔

جب زمیں پر روتے ہیں مستغفراں
رشک کرتا ہے زمیں پر آسماں

جب گناہ گار لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور زمین پر رہ کر آہ وزاری کرتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ان کے اوپر برستی ہیں اور وہ آسمان کے لیے قابل رشک بن جاتے ہیں کہ وہ آنکھوں سے گرنے والے آنسو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان ستاروں سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں جن سے آسمان مزین ہے اس لیے کہ ان ستاروں سے دنیا کا ظاہر چمکتا ہے اور روشن ہوتا ہے اور آنسوؤں کے ان قطروں سے قلب وجان چمک اٹھتے ہیں۔

سیکڑوں جاں کی ہے بارش ہر زماں
ایسی جاں پر جو فدا ہو تجھ پہ یاں

چونکہ وہ شخص جو کہ اپنی جان اللہ تعالیٰ پر فدا کرتا ہے وہ مقصد حیات میں لگا ہوا ہوتا ہے اس لیے اسے دل میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسا کہ سینکڑوں اور ہزاروں جانیں اسے عطا ہو رہی ہوں یعنی ایسے آدمی کو ایک عجیب و غریب قسم کی لطف اندوز حیات نصیب ہو جاتی ہے اس لیے وہ ہر دم خاص مزہ پا تا رہتا ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہوتا ہے کہ ہر گھڑی سینکڑوں جانوں کی بارش ہو رہی ہو۔

جس کے آب و گل میں دردِ دل نہ ہو
جسم خاکی ہے فقط اے دوستاں

یعنی جو آدمی اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے سینے میں نہ رکھتا ہو اور گناہوں سے بچ کر حرام خواہشات قربان کر کے خاص دردِ دل اس کے سینے میں موجود نہ ہو تو وہ مٹی کا محض ایک ڈھیر ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے اور مر کر مٹی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہونے والا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہیے کہ عام مٹی کا ڈھیر تو اللہ تعالیٰ کے عقاب و عذاب کا مستحق نہیں ہے لیکن یہ انسان جو اپنے دل میں ایمان کی دولت نہیں رکھتا یہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہوگا اس لیے یہ جسم خاکی دوسری خاک اور مٹی سے بھی بدتر ہوگا۔

اس کی راہ کی بے قراریاں کیا ہی خوب ہیں

دل مرا مضطر رہے تیرے لیے
ہے یہی بس حاصلِ ہر دو جہاں
جب سے تیرا غم ملا ہے اے خدا
رہتا ہے ہر وقت اختؔر شادماں

یہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضطرار اور بے قراری ایسی عظیم نعمت ہے کہ اس کی بدولت انسان کو لطف دو جہاں نصیب ہو جاتا ہے اور اس بے قراری میں قرار پوشیدہ ہے اور اس غم خداوندی میں بے شمار خوشیاں مضمر اور پنہاں ہیں اس لیے جس کو یہ دولت مل جائے اسے زندگی میں کبھی بے چین و پریشان نہیں پاؤ گے بلکہ اس کے چہرے کی زیارت کر کے اور چند لمحے اس کے پاس بیٹھ کر دنیا کے بے چین لوگ چین وسکون پا جاتے ہیں اور یہ غم انسان کو بے غم کر دیتا ہے اس لیے جسے یہ عطا ہو تو وہ ہر وقت فرحاں وشاداں رہتا ہے جیسا کہ مختلف اشعار میں یہ مضمون تفصیل سے گزر چکا یہی وجہ ہے کہ حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب سے مجھے آپ کا غم مل گیا ہے تو دنیا کا ہر غم مجھ سے رخصت ہو گیا اور میں ہر وقت شادماں رہتا ہوں اس کی واضح سی حکمت یہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ کا یہ عاشق پیش آنے والی ہر حالت کو اپنے محبوب خداوند تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے تو ہر حالت میں راضی اور خوش رہتا ہے۔

تم نے دیکھی برکتِ آہ وفغاں

اہل ظاہر مبتلائے این و آں قلب عارف عاشق رب جہاں
ہیں سلامت اہل دل کی کشتیاں تم نے دیکھی برکت آہ و فغاں
جس نے دی غیر خدا پر اپنی جاں عمر بھر پایا اسے نوحہ کناں
بے اثر ہے اہل ظاہر کا بیاں بے زباں عاشق ہے رشک صد بیاں
ہاتھ پھیلائے کھڑے در پر ہیں یاں کر نہ خالی ہاتھ واپس شاہ جاں
دوست یاد دوست میں گریہ کناں عرش اعظم پر ہے ساکن اس کی جاں
آپ کا بے حد ہے اختر پر کرم ورنہ یہ گھر آپ کا اور میں کہاں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **اہلِ ظاہر**: ظاہری حالات کو دیکھ کر چلنے والے۔ **این و آں**: مختلف فکروں میں مبتلا۔ **نوحہ**: روتا ہوا۔ **شاہِ جہاں**: اللہ تعالیٰ۔ **گریہ کناں**: رونا۔ **ساکن**: رہنے والا۔

ظاہری دنیوی علوم حقیقی علم کا مصداق نہیں

اہل ظاہر مبتلائے این و آں
قلب عارف عاشق رب جہاں

قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ظاہری علم رکھنے والوں کی حالت کا بیان کیا ہے:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾

(سورۃ الروم، آیت:۷)

ترجمہ: یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کی ظاہر (حالت) کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے (بالکل ہی) بے خبر ہیں (کہ وہاں کیا ہوگا، اس لیے ان کو دنیا میں نہ اسباب عذاب سے بچنے کی فکر ہے نہ اسباب نجات ایمان اور عمل صالح کی تلاش ہے)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ایک پہلو کو تو خوب جانتے ہیں کہ تجارت کس طرح کریں، کس مال کی کریں، کہاں سے خریدیں، کہاں بیچیں اور کھیتی کس طرح کریں، کب بیج ڈالیں کب کاٹیں، تعمیرات کیسی کیسی بنائیں، سامان عیش وعشرت کیا کیا مہیا کریں لیکن اسی حیات دنیا کا دوسرا پہلو جو اس کی حقیقت اور اس کے اصلی مقصد کو واضح کرتا ہے۔ اس حیات کا چند روزہ قیام درحقیقت ایک مسافرانہ قیام ہے انسان یہاں کا مقامی آدمی (نیشنل) نہیں، بلکہ دوسرے ملک آخرت کا باشندہ ہے، یہاں کچھ مدت کے لیے ویزا پر آیا ہوا ہے، اس کا اصلی کام یہ ہے کہ اپنے اصلی وطن کے لیے یہاں سے سامان راحت فراہم کر کے وہاں بھیجے اور وہ سامان راحت

ایمان اور عمل صالح ہے اس دوسرے رخ سے بڑے بڑے عاقل کہلانے والے بالکل غافل اور جاہل ہیں۔

قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیجئے کہ یعلمون کے ساتھ ظاہرا من الحیوۃ الدنیا فرمایا ہے، جس میں لفظ ظاہر کو تنوین کے ساتھ نکرۃ لاکر قواعد عربیت کی رو سے اس طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت یہ لوگ حیات ظاہر کو بھی پورا نہیں جانتے، اس کے صرف ایک رخ کو جانتے ہیں دوسرے رخ سے غافل ہیں اور آخرت سے بالکل ہی غافل و جاہل ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۷۲۲)

اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو اپنے ظاہری مادی علوم، جو کہ حقیقت میں فنون ہیں ان پر ناز اور فخر کرتے ہیں اور حقیقت میں علوم سے بے خبر ہیں جس کے نتیجے میں وہ جہل مرکب میں گرفتار ہیں اور ایسے دنیوی علوم تو پہلی کافر قوموں کے پاس بھی رہے اور انہوں نے انبیاء سے اسی بنیاد پر معاندانہ رویہ اختیار کیا اور متکبرانہ انداز سے اپنے ان فنون پر ناز کرنے لگے اور آخرت کے علوم وحی آسمانی پر ایمان نہ لائے جس کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا اور ان پر آنے والے عذاب کا تذکرہ کیا:

﴿فَلَمَّا جَآئَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾

(سورۃ الغافر، آیت:۸۳)

ترجمہ: جب ان کے پیغمبران کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے (اس) علم (معاش) پر بڑے نازاں ہوئے جو ان کو حاصل تھا (یعنی معاش کو مقصود سمجھ کر اور اس میں جو ان کو لیاقت حاصل تھی اس پر خوش ہوئے اور معاد کا انکار کر کے اس کی طلب کو دیوانگی اور اس کے انکار پر وعید عذاب سے تمسخر کیا) اور (اس کے وبال میں) ان پر وہ عذاب آپڑا جس کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

یعنی ان ناعاقبت اندیش منکرین کے پاس جب اللہ تعالیٰ کے رسول واضح توحید وایمان لے کر آئے تو یہ لوگ اپنے علم کو انبیاء کے لائے ہوئے علم سے بہتر اور حق سمجھ کر انبیاء کے کلام کا رد کرنے لگے۔ یہ علم جس پر کفار خوش اور مگن تھے اور اس کے مقابلہ میں انبیاء کے علوم کو رد کرتے تھے یا تو ان کا جہل مرکب تھا کہ ناحق اور باطل کو حق وصحیح سمجھ بیٹھے تھے۔ جیسے یونانی فلاسفہ کے بیشتر علوم وتحقیقات جو الٰہیات سے متعلق ہیں اسی نمونہ کی ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کو جہل مرکب تو کہہ سکتے ہیں۔ ان کا نام علم رکھنا علم کی توہین ہے۔ یا پھر ان کے اس علم سے مراد دنیا کی تجارت، صنعت وغیرہ کا علم ہے جسمیں یہ لوگ فی الواقع ماہر تھے۔ اور قرآن کریم نے ان کے اس علم کا ذکر سورۂ روم کی آیت میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾

(سورۃ الروم، آیت:۷)

یعنی یہ لوگ دنیا کی ظاہری زندگی اور اس کے منافع حاصل کرنے کو تو کچھ جانتے سمجھتے ہیں، مگر آخرت جہاں ہمیشہ

رہنا ہے اور جہاں کی راحت وکلفت دائمی ہے اس سے بالکل جاہل وغافل ہیں۔ اس آیت میں بھی اگر یہی علم ظاہر دنیا کا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ چونکہ قیامت اور آخرت کے منکر اور وہاں کی راحت وکلفت سے جاہل وغافل ہیں اسی لیے اپنے اسی ظاہری ہنر پر خوش اور مگن ہو کر انبیاء کے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

(معارف القرآن، جلد: ۷، صفحہ: ۶۲۲)

علم کا مصداقِ حقیقی، علمِ وحی ہے

صاحبو! دنیوی زندگی گزارنے کے لیے کچھ معاشی اور تجارتی فنون جاننا اور سیکھنا اور جدید ٹیکنالوجی (Technaology) حاصل کرنا یا کسی بھی لائن (Line) شعبہ میں انجینئرنگ (Engeering) کا درس کرنا یا ڈاکٹر وغیرہ بننا اور پھر اپنے متعلق یہ تصور کرنا کہ میں عالم ہوں اور تعلیم کے فضائل اپنے اوپر چسپاں کرنا یا ایسے اداروں پر جہاں یہ دنیوی علوم وفنون پڑھائے جاتے ہوں، علوم کی فضیلت کی حدیثیں لکھنا، تختیاں آویزاں کرنا، یہ بلاشک وشبہ دین میں تحریف ہے۔

علم اللہ کی نگاہ میں صرف وحی آسمانی والا علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان حاصل ہوتی ہو اور انسان کو اپنے مقصدِ حیات کا علم حاصل ہو اور اپنی حقیقت سے آشنائی ہو ورنہ دنیا کی زندگی گزارنے کے لیے تو پوری کائنات میں بسنے والے حیوانات بھی اپنے لیے مستقل ایک نظام رکھتے ہیں یہاں تک کہ ایک چھوٹا سا پرندہ جسے ہم اپنی زبان میں ''بوا'' کہتے ہیں جو بظاہر معمولی سا ایک پرندہ ہے مگر وہ اپنے رہنے کے لیے اتنا مضبوط اور شاندار گھر بناتا ہے اور اسے تنکوں سے اتنا عمدہ بُنتا ہے کہ باوجود معمولی معمولی کمزور تنکے ہونے کے وہ گھر مضبوطی کے ساتھ موجود رہتا ہے اور مزید مجھے اس کی تفصیل نہیں بتانی بس مقصد گفتگو اتنی بات عرض کرنی ہے کہ دنیا میں جینے کے لیے اپنی ضرورت کے بقدر علم تو حیوانات کے پاس بھی ہے۔ شہد کی مکھی کا مستقل ایک عظیم الشان وزارت وحکومت کا نظام ہے اور دوسرے پرندوں اور دوسرے جانوروں کا بھی اپنے اپنے طور پر اپنی ضرورت کے مطابق اور حفاظت و دفاع کی خاطر کچھ نہ کچھ مخصوص نظام موجود ہے۔

انسان کا وصف امتیازی اور حیوانات کا نظام زندگی

احقر کے پاس حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کا ایک بیان کیسٹ میں محفوظ موجود ہے جس میں حضرت نے انسان کے امتیازی وصف اور خصوصی کمال کو ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا وصفِ امتیازی تعلیم وتربیت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا وَاِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ﴾

(السنن الکبریٰ للبیہقی)

کہ مجھ کو دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا اور اچھے اور پاکیزہ اخلاق کو پورا کروں اس لیے بھیجا گیا۔ اور اسی میں حضرت رحمہ اللہ نے یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے بقدرِ ضرورت اپنے رہنے سہنے کا انتظام اور اپنے بقا کے لیے دفاع اور حفاظت کی تدابیر تو عام جانوروں کو بھی سونپی گئی۔ چنانچہ حضرت نے مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شہد کی مکھیوں کا نظامِ حکومت و وزارت اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی غلط جگہ پر بیٹھنے کی وجہ سے کوئی زہریلا مادّہ لے کر چھتے پر آ کر بیٹھے تو اُس کی مخبری اُن کا جاسوس فوراً متعلقہ محکمے کو کرتا ہے اور وہاں سے اُس کو قتل کرنے کا حکم صادر ہوتے ہی فوراً مار کر گرا دیا جاتا ہے۔ اسی لیے شہد کی مکھیوں کے چھتے کے نیچے بہت سی کٹی ہوئی مکھیاں گری پڑی ہوتی ہیں۔ اُس کا راز دراصل یہی ہے۔

اور دوسری ایک مثال میں ارشاد فرمایا کہ ایک موقع پر کسی آدمی نے بندروں سے تنگ آ کر کھانے میں زہر ملا یا اور اُن کے سامنے رکھ دیا۔ چنانچہ ایک دو بندر آئے، انہوں نے یہ صورت حال دیکھ کر اُس کو نہیں چھوا اور ذہن ذہن میں سوچنے لگے کہ روزانہ ایسا نہیں ہوتا تھا آج کیوں ایسا ہے؟ بالآخر اپنے چند ساتھیوں کو بلا کر لائے اور وہاں بیٹھ کر کچھ دیر تک میٹنگ ہوتی رہی جب اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو پھر مزید خاص افراد لائے گئے۔ اُس کے بعد وہاں بیٹھ کر صورت حال کے بارے میں جائزہ لیا اور فوراً سب کے سب وہاں سے تیزی سے رواں دواں ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دیکھا کہ سب بندر اپنے ہاتھ میں ایک درخت کی شاخ لیے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اور سب نے آ کر وہ زہر ملا یا ہوا کھانا کھایا اور اُس کے بعد وہ شاخ چبالی۔ گویا اُن کے محکمہ صحت کی تحقیق کے مطابق یہ شاخ اُس زہر کے لیے تریاق کا کام کرتی تھی کہ اگر اُس کے بعد اسے کھالیا جائے تو وہ زہر کے اثر کو بے اثر کر دے۔

بہرحال مجھے اس تفصیل میں نہیں جانا صرف اتنی بات بتانی مقصود ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کھائے پیئے، اچھے مکانات تعمیر کرے اور عمدہ گاڑی اور فرنیچر گھر میں لائے اور زندگی گزار کر عالمِ آخرت کی طرف روانہ ہو جائے، بلکہ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کسی نہ کسی کام میں استعمال ہو رہی ہے اور نظامِ عالم کا ایک حصہ ہے لیکن یہ حضرتِ انسان کسی مقصد کے لیے نہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿فَاِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ وَالدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ﴾

(شعب الایمان للبیهقی)

کہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی لیکن تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ اسی لیے جو خصوصیت اور امتیاز بنی آدم کو حاصل ہے وہ کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ اس لیے مقصد بھی یقیناً دونوں کا الگ الگ ہوگا۔

تو بھلا اتنا باشعور اور عقل والا انسان اگر محض اپنے دنیا کے فنون اور دنیوی علوم ہی کو اپنا مبلغ علم قرار دے دے اور اسی کو سب کچھ سمجھ لے اور خود کس لیے پیدا ہوا تھا؟ کس نے پیدا کیا تھا؟ اس سے بالکل غافل ہو جائے شب و روز دنیا میں پورا پورا انہماک اور مشغولی ہو اور مستقبل کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو تو پھر آخر اس میں اور دوسرے حیوانوں میں کیا فرق رہے گا اس لیے عقل مند اور سمجھدار انسان وہ کہلاتا ہے جو اپنے ظاہر داری کے چکر کو ایک طرف ڈال دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر چل کر اپنی ابدی اور ہمیشہ کی سرخروئی کو پانے کے لیے جد و جہد اور کوشش میں لگا رہے اور اپنے خالق و مالک کا دل و جان سے عاشق ہو اور اسی پر فدا ہو اور چونکہ دو چیزوں کی محبتیں ایک ساتھ دل میں جمع نہیں ہوتیں اس لیے جب اللہ کا عاشق اس کے عشق و محبت کو دل میں بسالیتا ہے تو پھر وہ مبتلائے این وآں نہیں رہتا۔

ہیں سلامت اہل دل کی کشتیاں
تم نے دیکھی برکت آہ و فغاں

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی برکت سے اللہ والے جس راہ پر چلتے ہیں اُس میں سلامتی ہی سلامتی اور عافیت ہی عافیت ہوتی ہے اور اُن کی روز و شب کی جانے والی آہ و فغاں کی برکت سے انہیں ظاہری رنج و غم کی شکلوں میں بھی اطمینان اور سکون ہی میسر رہتا ہے اس لیے بہر صورت اُن کی کشتیاں سلامت ہی رہیں گی۔

قبولیت دعا یقینی مگر شرائط کے ساتھ

ہاتھ پھیلائے کھڑے در پر ہیں یاں
کر نہ خالی ہاتھ واپس شاہِ جاں

اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان رحم و کرم کی ہے اور کریم کے کئی معنی بیان کیے گئے ہیں۔ ہر معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا در ایسا در ہے کہ جس کو کھٹکھٹانے والا خالی ہاتھ نہیں جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ اُس کو اس کی مراد ضرور عطا فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ رَبَّکُمْ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِیْ بِہٖ عَبْدَہٗ اِذَا رَفَعَ یَدَیْہِ اَنْ یَّرُدَّھُمَا صِفْرًا﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۱۹۵)

کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا اللہ بہت زیادہ شرم کرنے والا اور کریم ہے، اپنے بندے کے ہاتھ جب کہ وہ اُس کے سامنے اُٹھائے خالی لوٹانے سے شرماتا ہے۔

بس یہ الگ بات ہے کہ مراد دنیا ہی میں دے دی جائے یا اُس کے لیے آخرت میں جمع کر دی جائے۔ اس لیے اس مقام پر یہ بات جاننی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے در پر مانگنے والا محروم تو کبھی نہیں ہوتا لیکن قبولیتِ دعا کے لیے کچھ شرطیں ہیں، اگر وہ شرطیں نہ ہوں تو بندے کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کمی مجھ میں ہے نہ کہ اللہ کے وعدوں میں، اللہ تعالیٰ تو ہر دعا کو قبول کر رہے ہیں، مگر میں اُن شرائط کو پوری نہیں کر رہا ہوں جن پر اللہ نے دعا کی قبولیت کا وعدہ فرمایا

ہے۔ مثلاً:

(**۱**)...... کھانا، پینا، پہننا سب کچھ حلال ہونا چاہیے ورنہ ملتزم پکڑ کر بھی دعا کی جائے تو قبول نہیں ہوتی۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شخص پراگندہ حال ہے، بال بکھرے ہوئے اور سفر لمبا (بظاہر قابلِ رحم) اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یارب! یارب! لیکن اُس کا کھانا حرام، اُس کا پینا حرام اور اُس کا نشو ونما حرام سے ہوا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس کی دعا اللہ کی بارگاہ میں قبول کرلی جائے؟

﴿عَن أَبِی هُرَیرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ طَیِّبٌ لَا یَقبَلُ إِلَّا طَیِّبًا وَإِنَّ اللّٰهَ أَمَرَ المُؤمِنِینَ بِمَا أَمَرَ بِهِ المُرسَلِینَ فَقَالَ یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعمَلُوا صَالِحًا إِنِّی بِمَا تَعمَلُونَ عَلِیمٌ وَقَالَ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُلُوا مِن طَیِّبَاتِ مَا رَزَقنَاکُم ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیلُ السَّفَرَ أَشعَثَ أَغبَرَ یَمُدُّ یَدَیهِ إِلَی السَّمَاءِ یَا رَبِّ یَا رَبِّ وَمَطعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالحَرَامِ فَأَنّٰی یُستَجَابُ لِذٰلِکَ﴾

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتها)

(**۲**)...... دعا اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگنی چاہیے کہ اُس کی قبولیت کا دل میں یقین ہو۔

(**۳**)...... دل کو مستحضر رکھ کر دعا مانگنی چاہیے۔ غافل دل کی دعا بھی اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ ادعُوا اللّٰهَ وَاَنتُم مُوقِنُونَ بِالاِجَابَةِ وَاعلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ لَایَستَجِیبُ دُعَآءً مِن قَلبٍ غَافِلٍ﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص: ۱۹۵)

کہ تم اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگو کہ تمہیں قبولیت کا پورا یقین ہو اور یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں فرماتے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی دعا کا مانگنا پسند نہیں ہے کہ اے اللہ! اگر آپ چاہیں تو بخش دیں، اگر آپ چاہیں تو رحم فرمادیں، اگر آپ چاہیں تو روزی دے دیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خوب پختگی کے ساتھ اپنی رغبت کا اظہار کرے اور پوری قوت ویقین کے ساتھ دعا مانگے۔

(**٤**)...... استعجال یعنی جلدی مچانا نہ ہو کہ کسی دعا کو مانگ کر جب اپنی آنکھوں سے اپنے مقصد میں کامیابی نظر آتی دکھائی نہ دے تو یہ کہنے لگے کہ میں نے دعا مانگی مگر قبول ہی نہیں ہورہی ہے۔

(**٥**)...... کسی گناہ کی دعا نہ ہو۔

(**٦**)...... قطع رحمی کی دعا نہ ہو کہ مثلاً اے اللہ! مجھے فلاں کو قتل کرنے کی قدرت دے دے یا فلاں اور فلاں رشتہ دار

میں تفریق پیدا کرادے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ يَسْتَعْجِلْ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَيُسْتَجَابُ لِيْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَآءَ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۱۹۴)

یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن بندے کی دعا جب تک قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ مانگے، بشرطیکہ جلدی نہ مچائے۔ ایک صحابی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! جلدی مچانا کیا ہے؟ تو ارشاد فرمایا کہ وہ یوں کہنے لگے کہ میں نے تو بار بار دعا مانگی لیکن مجھے تو نہیں لگ رہا ہے کہ میری دعا قبول ہورہی ہے اور پھر دعا مانگنا چھوڑ دے۔

(**۷**)...... جہاں کے علماء، لوگوں کے کھلم کھلا منکرات میں مبتلاء ہونے کے باوجود اُن پر روک ٹوک و نکیر نہیں کریں گے تو اُن کے متعلق یہ ارشاد آیا ہے کہ:

﴿وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللهُ أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ﴾

(سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب ماجآء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر)

اُن کی دعائیں بھی قبول نہیں کی جائیں گی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکر پر نکیر کرنے کو بھی اس بارے میں بہت دخل ہے۔

دوست یاد دوست میں گریہ کناں
عرش اعظم پر ہے ساکن اس کی جاں
آپ کا بے حد ہے اخترؔ پر کرم
ورنہ یہ گھر آپ کا اور میں کہاں

قرآنِ پاک میں خود اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اپنا دوست قرار دیا ہے۔ پھر اس ولایت اور دوستی کے درجات ہیں ادنیٰ، درمیانی اور اعلیٰ۔ اور جو اہلِ دل اور اہل اللہ ہر لمحہ اپنی جان اللہ پر فدا کرتے رہتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوستی گاڑھی اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ تو حضرت والا اللہ تعالیٰ سے بڑے حسنِ ظن اور محبت کی بنیاد پر عاجزانہ اور نیازمندانہ انداز سے یہ بات پیش فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! میں محض آپ کی توفیق اور فضل سے آپ کے گھر پر آکر آپ کے در پر کھڑا ہوا ہوں، گو کہ میں زمین پر ہوں لیکن چونکہ میرا مقصود آپ کی ذاتِ عالی اور آپ

ہی میرے مسجود اور مقصود ہیں اس لیے میں اس حال میں بھی ایسا ہوں جیسا کہ میری جان عرش اعظم پر ٹھہری ہوئی ہو اور میں آپ کے سامنے سجدہ ریز ہوں ا ر آپ سے گریہ وزاری کے ذریعے اپنی ادائے بندگی پیش کررہا ہوں۔ حقیقت یہی ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوکر اور بڑے خشوع وخضوع اور تضرع وعاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اُس کا حال ایسا ہی ہوتا ہے۔

اسی لیے ایک بزرگ فرماتے تھے جب میں دو رکعت نماز کی نیت باندھ کر اللہ اکبر کہتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا جسم تو زمین پر لیکن میں خود عرشِ اعظم پر پہنچ چکا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک میرے سامنے ہے اور پھر میں یہ کلمات پڑھ رہا ہوں سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ الخ۔

صحبتے با اہلِ دل باعاشقاں

طائرِ خستہ کا خستہ آشیاں　　کیوں حسد ہے اس سے تجھ کو باغباں
کر نظر اپنے عذابِ ظلم پر　　لگ نہ جائے آہ! آہِ بے کساں
طائرِ مسکیں کو گلشن میں نہ چھیڑ　　سنگ دل کچھ سن بھی فریاد و فغاں
جو نہیں ڈرتا ہے اپنے ظلم سے　　اس کو پایا ہم نے ہر دم سرگراں
روئے زرد و آہ سرد و چشم تر　　دوستو یہ ہے نشانِ عاشقاں
دردِ دل کے واسطے درمانِ دل　　صحبتے بااہل دل باعاشقاں
جو بھی اختؔر صاحبِ نسبت ہوا　　اُس کو پایا ہم نے ہر دم شادماں

مشکل الفاظ کے معانی:۔**طائرِ خستہ**: بدحال پرندہ۔**خستہ آشیاں**: بدحال گھونسلہ۔**بے کساں**: لاچار،ضعیف۔ **طائرِ مسکین**: بے کس پرندہ۔**فریاد وفغاں**: پکارنا اور رونا۔**سرگراں**: پریشان۔**روئے زرد**: پیلا چہرہ۔ **درماں**: علاج۔**شادماں**: خوش۔

اللہ والوں سے دشمنی اپنی تباہی و بربادی ہے

طائر خستہ کا خستہ آشیاں
کیوں حسد ہے اس سے تجھ کو باغباں
کر نظر اپنے عذابِ ظلم پر
لگ نہ جائے آہ! آہِ بے کساں
طائر مسکیں کو گلشن میں نہ چھیڑ
سنگ دل کچھ سن بھی فریاد و فغاں
جو نہیں ڈرتا ہے اپنے ظلم سے
اس کو پایا ہم نے ہر دم سرگراں

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ﴾

(سورة الانعام، آیت: ۱۱۲)

ترجمہ: اور (یہ لوگ جو آپ سے عداوت کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے نہیں ہوئی، بلکہ جس طرح یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کیے تھے، کچھ آدمی (جن سے اصل معاملہ تھا) اور کچھ جن (ابلیس اور اس کی اولاد)۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۴۱۷)

اس آیت کریمہ اور مختلف دوسری آیتوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کے قصوں اور واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنے انبیاء اور اولیاء کے لیے کچھ ایسے خاص دُشمن اپنے تکوینی نظام کے تحت پیدا کیے ہیں جو ان کی مخالفت اور عداوت اور ایذاء و تکلیف میں آگے آگے رہتے تھے اور جن کا کام شیطان کے ایجنٹ بن کر بے دینی اور گمراہی اور مکر و فریب اور کفر و شرک کو پھیلانا رہا اور اللہ کے نبیوں اور ولیوں کو مختلف انداز سے ستانا اور ایذائیں پہنچانا اُن کی عادت بنی رہی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے اُن کو پکڑ لیا اور یہی اللہ تعالیٰ کی سنت آج بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہر اللہ والے کے کچھ ایسے محروم القسمت لوگ دُشمن بن کر اُبھرتے ہیں جو اُس کو بظاہر خستہ حال اور ظاہری ساز و سامان کی قلت و کمی کا شکار دیکھ کر اُس کو ذلیل اور بدنام کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور اُن کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ میری یہ کارروائی اور سلوک ان اہلِ دل اولیاء اللہ کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں انہیں چھیڑ کر اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا شکار ہو جاؤں گا کیونکہ اُن

کے آشیانے سے ہر دم اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی آوازیں اور آہ وفغاں سنائی دے رہی ہے۔

تو اے سخت سنگ دل ظالم! اپنے اوپر رحم کھا کر ان مسکین درویشوں کے گلشن کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرو رنہ اگر آہ لگ گئی تو پھر سرگردانی و پریشانی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ جب ظالم کا ظلم زیادہ ہو جاتا ہے اور حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اُس پر اللہ تعالیٰ کی پکڑ ضرور آتی ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ مظلوم کی دعا رد نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ يَرْفَعُهَا فَوْقَ الْغَمَامِ وَتُفَتَّحُ لَهَا أَبْوَابُ السَّمَآءِ وَيَقُوْلُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ وَعِزَّتِیْ لَأَنْصُرَنَّکِ وَلَوْ بَعْدَ حِيْنٍ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفة الجنة)

میں ضرور بضرور تیری مدد کروں گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہو۔ یعنی جب تک میری مصلحت نہیں ہے تو میں اس ظلم کو چلنے دوں گا ورنہ انتقامی کارروائی کر کے ظالم سے تیرے لیے بدلہ ضرور لوں گا۔

اس لیے حضرت والا نے فرمایا کہ آہ! کیسا نادان ہے اللہ والوں کو ستانے والا، اسے یہ پتہ نہیں ہے کہ ان مظلوم اور بے کس و بے بس لوگوں کی آہ نکل کر چیرتی ہوئی آسمانوں پر پہنچتی ہے اور وہاں سے ظالم کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ انجام کے اعتبار سے دنیا ہی میں اُس کے بدترین نتائج دیکھ لیتے ہیں اور ہم نے ایسے لوگوں کو ہمیشہ سرگرداں اور پریشان دیکھا ہے اور اس قسم کے لوگ تقریباً ہر دور میں اللہ والوں کے مخالفین اور حاسدین رہے ہیں جو درحقیقت اولیاء اللہ کی باطنی ترقی کے لیے حق تعالیٰ کا ایک تکوینی غیبی نظام ہے اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

حضرت والا کی دو خاص ادائیں چشمِ گریاں اور قلبِ بریاں

روئے زرد و آہ سرد • چشم تر
دوستو یہ ہے نشانِ عاشقاں
دردِ دل کے واسطے درمانِ دل
صحبتِ بااہلِ دل باعاشقاں
جو بھی اختر صاحبِ نسبت ہوا
اُس کو پایا ہم نے ہر دم شادماں

اللہ والوں کا بدن عام طور پر فکرِ آخرت کی وجہ سے موٹا پا لیے ہوئے نہیں ہوتا بلکہ ظاہری اعتبار سے وہ نڈھال اور کمزور معلوم ہوتے ہیں لیکن باطنی قوت کے لحاظ سے وہ بہت طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اس لیے

حضرت والا نے اہل اللہ کی یہ تین نشانیاں بیان فرمائی کہ خدا کے سچے عاشقوں کے یہ تین نشان ہیں۔ روئے زرد اور آہِ سرد اور چشمِ تر گو کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس میں یہ باتیں نظر نہ آئیں تو ہم اس کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیں کہ یہ تعلق مع اللہ کا حامل نہیں ہے بلکہ مقصود صرف اتنا ہے کہ درحقیقت اگر آخرت کا خوف اور اللہ تعالیٰ کی عظمت واقعی دل میں اُتر جائے تو پھر چہرہ زرد ہونا اور بدن پر موٹاپے کا نہ ہونا اور وقفے وقفے سے آہِ سرد کا نکلنا اور معمولی معمولی باتوں پر آنکھوں کا اشکبار ہو جانا اور آخرت میں اپنی حالت کا استحضار ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتے رہنا یہ تقریباً تمام ہی اہل اللہ کی نشانی ہے اور جس کو یہ باتیں حاصل کرنی ہوں اور دل کو واقعی دل بنانا ہو تو اُسے چاہیے کہ اہلِ دل عاشقانِ خدا کے ساتھ صحبت اختیار کرے۔ تو پھر پتہ چلے گا کہ اس دنیا میں بھی اہل اللہ کس قدر شاد ماں اور خوش رہتے ہیں اور جینے کا وہ مزہ ملے گا کہ اپنی ماضی کی زندگی کی تمام لذتوں پر حسرت و افسوس کیا کرے گا۔

اس ضمن میں احقر یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم کے ساتھ جو حضرات بیعت وارشاد کا تعلق رکھتے ہیں اور اصلاح وتزکیہ کے شعبے میں حضرت کو اپنا مقتداء اور شیخ ومرشد مانتے ہیں تو انہیں اس مسئلے پر خاص غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اپنے شیخ کی خاص ادائیں اپنے اندر منتقل کی ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ خاص ادائیں جو حضرت والا کی عجیب وغریب امتیازی صفات میں سے ہیں کیا ہیں؟ میری مراد اس سے یہ ہے کہ حضرت والا اپنی زندگی کے اکثر اوقات میں اس حال میں رہتے ہیں کہ قلب بریاں وچشم گریاں یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں جلا بھنا دل اور موسلا دھار بارش کی طرح آنسو برسانے والی آنکھیں۔ اس لیے ہمیں خاص طور پر اپنے اندر یہ دو صفتیں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر اب تک پیدا نہیں ہوئی تو اُن اسباب وموانع پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ جن کی وجہ سے ہمیں یہ دو خاص حضرت والا کی صفتیں اب تک حاصل نہیں ہوسکیں۔ کیونکہ یہ دونوں اللہ والوں کی بڑی عجیب وغریب صفات ہیں جو کہ حق تعالیٰ اپنے خاص مقربین بارگاہ کو عطا فرماتے ہیں۔

حسرتیں دل کی ہیں دل میں میہماں

حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں عشق کا ہوتا ہے یوں ہی امتحاں
میرے خونِ آرزو کا یہ سماں رو رہا ہے دیکھ کر کے آسماں
ہیں زمیں پر ایسی بھی کچھ ہستیاں رشک جن پر کرتے ہیں کروبیاں
جس جگہ گرتا ہے خونِ آرزو لے نہ لے بوسہ کہیں خود آسماں
بستیاں حسرت زدوں کی دیکھ لو ان کی ویرانی میں ہے جنت نہاں
حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں اب نہ لو یارو ہمارا امتحاں
عشرتیں اختؔر ہیں دل سے دور دور حسرتیں دل کی ہیں دل میں مہماں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ سماں: منظر۔ کرو بیاں: فرشتے۔ خونِ آرزو: حرام خواہشات پر عمل نہ کرنا۔ نہاں: پوشیدہ۔

بعض مجاہدات پر انعامِ ربانی

حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں
عشق کا ہوتا ہے یوں ہی امتحاں
میرے خونِ آرزو کا یہ سماں
رو رہا ہے کہ دیکھ کر کے آسماں

جب بندے کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اُس کا قدم بہ قدم اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان اور آزمائش کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں بھی یہ دستور ہے کہ آپس میں عشق ومحبت کے امتحان لیے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح اپنے بندوں سے موقع بہ موقع اُن کی محبت کا امتحان لیتے ہیں مثلاً ایک حسین بے ریش لڑکا یا عورت سامنے سے گزر رہی ہے، اب نفس کا تقاضا ہے کہ ان کو دیکھو اور اللہ کا حکم ہے کہ ہرگز نہ دیکھو تو نفس کے تقاضے اور اللہ تعالیٰ کے حکم میں مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ تو بندہ کا امتحان اُسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لیا یا اُس سے باتیں کر کے نفس کو خوش کیا یا اُس سے تعلقات اور محبتیں بڑھانے کی کوششیں کیں تو سمجھو یہ اللہ کے امتحان میں ناکام ٹھہرا۔

اور اگر اُس نے اپنے دل پر ہزار صدمے اور غم اُٹھائے اور اپنی تمام حسرتوں کا خون کر دیا اور گویا دل کے اندر ہی حسرتوں کو لیے ہوئے اُن کے خون کے دریا میں نہا رہا ہے تو یہ وہ امتحان ہے کہ جس کے بارے میں حضرت

فرما رہے ہیں کہ حسرتوں کے زخموں سے خون کا دریا بہہ رہا ہے۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش و امتحان کا ایک طریقہ ہے اور اس میں کامیاب ہونے پر بندے کا جو مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں ہوتا ہے وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ فرشتوں کے یہاں اُس بندے کا تذکرہ فرماتے ہیں اور پھر فرشتوں کو وہ جملہ یاد دلاتے ہیں کہ جب انہوں نے ابن آدم کی پیدائش پر کہہ دیا تھا کہ یہ تو خون بہانے والی قوم ہوگی۔ اور اس امتحان کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دل پر خوب رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

چنانچہ حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی محبت اشد ہونے کا اور زیادہ ہونے کا یہی معیار بیان فرمایا کہ دنیا و آخرت کے تقاضوں میں تقابل ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کو ترجیح دے اور دنیا کے تقاضوں کو پیچھے ڈال دے جسے ایک دوسری مثال سے اس طرح سمجھئے کہ اگر آپ کسی دکان کے اوپر مال بیچنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور نماز باجماعت کا وقت آ گیا۔ دوسری جانب بڑے گاہک بڑی مقدار میں زیادہ خریدنے والے آپ کی دکان پر موجود ہیں تو اگر ایسی صورت میں آپ دکان کو تالا ڈال کر مسجد کی طرف چل دیتے ہیں اور ہزار، دس ہزار اور لاکھ کی پرواہ نہیں کرتے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو مال و دولت کی آرزوئیں آپ کے دل میں ہیں اُن پر آپ نے اللہ کے حکم کو غالب کر دیا۔ اسی لیے حضرت مفتی شفیع صاحب قرآن کریم کی اس آیت کہ جس میں مختلف چیزوں کو ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِنَ اللہِ وَرَسُوْلِہٖ کے تحت یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ جب تک اللہ و رسول کی محبت ساری دنیا اور خود اپنی جان سے زیادہ نہ ہو تو تب تک ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔

اس لیے ایک صحیح حدیث میں جو صحیحین میں بروایت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿لا یُؤمِنُ احدُکُم حتّیٰ اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ج: ۱، ص: ۷)

کوئی آدمی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اور ابوداؤد، ترمذی میں بروایت ابوامامہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی سے دوستی کی تو اللہ کے لیے کی اور دُشمنی کی تو وہ بھی اللہ کے لیے کی اور مال کو خرچ کیا تو وہ بھی اللہ کے لیے اور کسی جگہ خرچ کرنے سے رُکا تو وہ بھی اللہ کے لیے، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

ان روایاتِ حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو اور انسان کی دوستی دُشمنی، دینا یا نہ دینا سب حکم خداوندی اور رسول کے تابع ہو۔
(معارف القرآن)

میری حسرتیں تمہاری عشرتوں کے لیے قابل رشک ہیں

ہیں زمیں پر ایسی بھی کچھ ہستیاں
رشک جن پر کرتے ہیں کرو بیاں
جس جگہ گرتا ہے خونِ آرزو
لے نہ لے بوسہ کہیں خود آسماں
بستیاں حسرت زدوں کی دیکھ لو
ان کی ویرانی میں ہے جنت نہاں
حسرتوں کے زخم سے ہے خوں رواں
اب نہ لو یارو ہمارا امتحاں
عشرتیں اخترؔ ہیں دل سے دور دور
حسرتیں دل کی ہیں دل میں مہماں

اور ایسے باخدا لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں کے لیے باعث رشک ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے بندوں کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اُن کا حال اللہ تعالیٰ فرشتوں سے سنتے ہیں ظاہر ہے اس لیے نہیں کہ اللہ کو علم نہیں ہے بلکہ اپنے اس مخلوق یعنی فرشتوں پر بنی آدم کے اعزاز واکرام کو ظاہر کرنے کے لیے اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پہنچ کر انسان فرشتوں سے بھی افضل قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ فرشتوں نے عبادت وطاعت تو کی ہے مگر خونِ حسرت میں نہانے کی بات نہیں، کیونکہ اُن کے اندر گناہ کرنے اور نافرمانی کرنے کا مادّہ اور جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ یہ کمال تو صرف انسان کو ہے کہ یہ بُرائی کا مادّہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حکم کو سامنے رکھ کر امتحان میں پاس ہوتا ہے۔

نیز دوسری یہ خصوصیت جو ابنِ حجر رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے کہ زمین پر رہنے والے اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کا غیب میں ذکر کرتے ہیں کہ اللہ کی ذات آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور فرشتے وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ کر ذکر کرتے ہیں اس لیے فرشتوں کے مقابلے میں اللہ والوں کے ذکر کی زیادہ فضیلت حاصل ہوئی۔

نیز اسی طرح سے ایک خزانہ ایسا ہے جو صرف اللہ کے ایمان والے بندوں کے پاس ہے، فرشتوں کے پاس نہیں ہے۔ وہ یہ کہ اپنے گناہوں پر توبہ کر کے ندامت کے آنسو بہانا چونکہ فرشتے گناہوں سے معصوم ہیں تو اُن کے پاس ندامت کے آنسو نہیں ہیں۔ یہ خزانہ صرف زمین سے آسمان پر پہنچتا ہے اور پھر اس کی وہاں وہ قیمت لگتی

ہے کہ جو کسی ملک میں پہنچنے والے کسی نایاب موتی اور ہیرے جواہرات کی قیمت لگائی جائے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ ایسی ہستیوں پر کروبیاں یعنی اللہ کے خاص مقرب فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

اور بقول حضرت تھانوی کہ خواصِ مؤمنین خواص ملائکہ سے **افضل** اور عوام مؤمنین عام ملائکہ سے **افضل** ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں دیکھنے والوں کے لیے اللہ والوں کا حال زیادہ عیش وعشرت وناز ونعم میں نظر نہیں آئے گا اور اُن کے چہرے بظاہر کچھ حسرت زدہ ہوں گے اور ظاہری طور پر وہ ویرانوں میں رہنے والے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی اِن ویرانیوں میں جنتیں نہاں اور پوشیدہ ہوتی ہیں اور وہ حسرتوں کا خون کر کے جس امتحان سے گزر چکے ہوتے ہیں اُس کے بعد انہیں دنیا کی عیش وعشرت کا دور دور تک کوئی خواب وخیال ہی نہیں آتا بلکہ دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی حسرتیں اپنے اندر ہزار عشرتوں سے بڑھ کر مزے اور لطف رکھتی ہے۔ پھر اہل اللہ کو دنیا کے عیش وعشرت کا خیال بھی نہیں گزرتا بلکہ جو اُمیدیں کبھی خواب وخیال میں رہتی تھیں وہ بھی دل سے ایسی دور ہوتی ہیں کہ بزبانِ حال ہر اہلِ دل یہ کہتے ہوئے ہوتا ہے ؎

یہ پوچھتا ہے میرے دل میں اب تیرا جلوہ
کہاں ہے اور کدھر آرزو کا عالم ہے

اور انہیں اپنے خونِ آرزو کی وجہ سے ایسا مقامِ بلند عطا ہوتا ہے کہ گویا کہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرے اور آسمان کے درمیان سارے حجابات اُٹھا دیئے گئے اور تمام پردے اور فضائیں ہٹ کر میں اللہ کے عرش کے سامنے کھڑا ہوں اور اس طرح خود آسمان زمین کا بوسہ لے رہا ہے کیونکہ روتے اور تڑپتے ہوئے ایمان والا بندہ جب سجدے میں پڑا ہوا ہے تو اس کی کچھ کیفیت اسی طرح ہو جاتی ہے اور یہ لوگ ظاہر سے بالکل بے خبر اور ناآشنا رہتے ہیں، صرف اپنے باطن میں ہی حسرتوں کا قیمتی خزانہ دفن کیے رہتے ہیں، کیونکہ عشرتیں تو دشمنوں کو بھی میسر آتی ہیں مگر یہ حسرتیں اور دردِ دل صرف اللہ اپنے خاص بندوں کو دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والا کا دوسرا شعر ہے ؎

تیرے ہاتھ سے زیرِ تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

اور انہی حسرتوں کے طوفانوں میں اللہ والوں کو ساحل کا لطف ملتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ اب عشرتیں میرے دل سے دور ہیں کیونکہ میرے دل میں حسرتیں مہمان بنی ہوئی ہیں اور یہ دونوں باتیں اکٹھی اور جمع نہیں ہوتیں۔

چشمِ تر نعرہ ہو چاک گریباں پایا

عشق اصنام سے ہر دل کو پریشاں پایا
شکل بگڑی تو انہیں سخت پشیماں پایا

ذکر کے فیض سے دل رشک گلستاں پایا
اور غفلت سے گلستاں کو بیاباں پایا

رہ تقویٰ کے غموں سے نہ تو گھبرا سالک
نفس کو غم ہو مگر روح کو شاداں پایا

نفس دُشمن کے غموں سے جو تو گھبرائے ہے
لذتِ عشقِ خدا سے تجھے ناداں پایا

جس نے مرشد سے لیا خونِ تمنا کا سبق
اس کے دل میں ہمہ دم جلوۂ جاناں پایا

کیا کہوں آہ وہ مرشد تھا مرا کیا اخترؔ
چشمِ تر نعرۂ ھُو چاپ گریباں پایا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ عشقِ اصنام: صنم کی جمع بمعنی بت۔ **پشیماں**: نادم افسردہ۔ **ہمہ دم**: ہر وقت۔ جلوۂ جاناں: اللہ تعالیٰ کا جلوہ۔ **نعرۂ ھو**: اللہ کا نعرہ۔ **گریباں**: کنایہ ہے اللہ تعالیٰ کا عشق سے۔

عشقِ اصنام سے پشیمان ہوئے

عشق اصنام سے ہر دل کو پریشاں پایا
شکل بگڑی تو انہیں سخت پشیماں پایا
ذکر کے فیض سے دل رشک گلستاں پایا
اور غفلت سے گلستاں کو بیاباں پایا
رہ تقویٰ کے غموں سے نہ تو گھبرا سالک
نفس کو غم ہو مگر روح کو شاداں پایا
نفس دُشمن کے غموں سے جو تو گھبرائے ہے
لذتِ عشقِ خدا سے تجھے ناداں پایا

جس نے مرشد سے لیا خونِ تمنا کا سبق
اس کے دل میں ہمہ دم جلوۂ جاناں پایا
کیا کہوں آہ وہ مرشد تھا مرا کیا اختر
چشم تر نعرۂ ھُو چاک گریباں پایا

اس پوری نظم کے تمام اشعار کی تشریح مختلف دوسری نظموں کے اشعار کی تشریح کے ضمن میں تفصیل سے آ گئی جس کا خلاصہ یہ مضامین ہے: حرام ناجائز محبتیں اور اُن کا فنا ہونا، ذکر اللہ سے دل کا باغ و بہار ہو جانا اور اللہ کی یاد سے غافل ہونے سے دل کا بیاباں ہو جانا، راہِ خداوندی کے غم اُٹھانے کے نتیجے میں روح کو ایک خاص نشاط اور سرور اور انبساط و کیف حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے عشق کی لذت بغیر اُس کے راستوں کا غم اُٹھائے حاصل نہیں ہو سکتی، مگر یہ چیز اپنے شیخ و مرشد سے سیکھنے کی ہے۔ اس کے بغیر میسر نہیں ہوتی جسے یہ نعمت لینی ہو وہ اپنے ایسے شیخ کا ساتھ لازم پکڑ لے جو ہر وقت چشم تر رہتا ہو اور اللہ اللہ زبان پر ہو اور اُس کا چاک گریبان رہتا ہو اور خدا کا مست و دیوانہ ہو تو پھر یہ صحبت رنگ لائے گی اور خود انسان زبانِ حال سے یہ کہہ اُٹھے گا ؎

تو نے مجھ کو کیا سے کیا شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جان پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

پھر اس کو بھی یہ کیفیت حاصل ہو گی کہ وہ بزبان حال یوں کہے گا ؎

میری یہ گرمیٔ ایمان تیرے آتش فشاں سے ہے
میرے کانٹوں پہ شان گل بھی تیرے گلستاں سے ہے

دعوتِ حق کے واسطے محفل دوستاں ملی

عشق بتاں کے کرب سے غفلت دوجہاں ملی
ذکر خدا کے نور سے فرحت دو جہاں ملی

اے مرے خالق جہاں تجھ پہ فدا ہو میری جاں
لذت ذکر سے ترے راحت دو جہاں ملی

جو بھی فدا ہے دوستو! خالق کائنات پر
اس کی خزاں میں بھی مجھے خوشبوئے بوستاں ملی

دیکھ کے میری چشم تر سن کے ہماری آہ کو
ان کو ہمارے عشق کی مفت میں داستاں ملی

آپ کی یاد اے خدا حاصل کائنات ہے
آپ کے نام سے مجھے نعمت دو جہاں ملی

اخترؔ بے نوا کو بھی تیرے کرم سے اے خدا
دعوت حق کے واسطے محفل دوستاں ملی

مشکل الفاظ کے معانی: **کلفت**: تکلیف۔ **فرحت**: خوشی، راحت۔ **خالقِ کائنات**: ساری مخلوق کو پیدا کرنے والا۔ **بوستان**: باغ۔ **بے نوا**: بے آواز، عاجزی۔ **دعوتِ حق**: اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لیے۔ **محفلِ دوستاں**: متعلقین، اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھنے والے۔

عشق بتاں کے کرب سے غفلت دوجہاں ملی
ذکر خدا کے نور سے فرحت دو جہاں ملی

حضرت والا کی یہ پوری نظم کا مضمون بھی قدر مشترک وہی چیزیں ہیں جو دوسرے اشعار کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ آئی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر اللہ کی محبت میں پھنس کر اور خاص طور پر نامحرم لڑکیوں یا حسین بے ریش لڑکوں کی دوستی میں الجھ کر نہ انسان دنیا کا رہتا ہے نہ دین کا رہتا ہے بلکہ دونوں جہاں کی کلفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوجاتا ہے کیونکہ اس بیماری سے اس کو دل کی بے چینی شروع ہوجاتی ہے اور جب کسی کا دل بے چین ہو جائے تو پھر اس کے ظاہری جسم کو بھی سکون نہیں مل سکتا بقول حضرت والا دامت برکاتہم ائیر کنڈیشن (air condition) ہماری کھالوں اور جسموں کو تو ٹھنڈا کرسکتا ہے لیکن دل میں ٹھنڈک اور تازگی پیدا نہیں کرسکتا یہ بات صرف اور صرف گناہوں سے بچنے اور ذکر اللہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر اس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا

کے چین وسکون کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اس انسان کو آخرت کا چین وسکون بھی عطا فرما دیتے ہیں۔

اے مرے خالقِ جہاں تجھ پہ فدا ہو میری جاں
لذتِ ذکر سے ترے راحتِ دو جہاں ملی
جو بھی فدا ہے دوستو! خالقِ کائنات پر
اس کی خزاں میں بھی مجھے خوشبوئے بوستاں ملی

لیکن فرحتِ دو جہاں ملنے کے لیے شرط کے درجہ کی جو چیز ہے وہ اس شعر میں مذکور ہے کہ بندہ اپنے خالق و مالک پر پورے طور پر فدا ہو اور خواہشات نفس کو مکمل طور پر کنٹرول کر کے ان پر اللہ تعالیٰ کے حکم کو غالب رکھے اس کے بعد ہی ذکر کی حقیقی لذت سے آشنائی حاصل ہوتی ہے اور دنیا وآخرت کا چین وسکون نصیب ہوتا ہے۔

اللہ کے ذکر سے چین وسکون ملنے کی ایک خاص حکمت یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ذاکر کا ہم نشین خود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی ہے:

﴿اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ﴾

(شعب الایمان)

میں اس شخص کا ہم نشین ہوں جو مجھے یاد کرے اور اللہ تعالیٰ ہی دنیا وآخرت کی ساری لذتوں اور راحتوں کے خالق ہیں تو جب ذاکر کو خالق لذاتِ عالم مل گئے تو پھر دونوں جہاں کی لذت وراحت کیوں میسر نہ ہوگی۔

اور ان دونوں اشعار میں اللہ تعالیٰ پر فدا ہونے کی نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ بھی ذکر فرما دی گئی ہے کہ جب مجھے پیدا ہی اللہ تعالیٰ نے کیا اور جوانی بھی اسی نے دی ہے تو اس کا تقاضہ یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ ہی پر اپنے جوانی کو فدا کروں گو یا فدا کرنے کی دلیل بھی شعر ہی میں ذکر کر دی گئی۔

حضرت ایوب علیہ السلام خزاں میں خوشبوئے بوستاں پا رہے تھے

اور یہ بھی یاد رکھیے کہ جو اللہ تعالیٰ پر فدا ہوتا ہے تو حق تعالیٰ پھر اس کی خزاں میں بھی بوستاں کی خوشبو مہکا دیتے ہیں کیونکہ وہ اللہ والا مصائب وآلام اور پریشانیوں میں گھر کر بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اس قدر مطمئن اور پر سکون نظر آتا ہے کہ جیسے تمام حالات اس کے عین مطابق ہوں جیسا کہ حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب بیماری کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمایا گیا جس کی تفسیر بحوالہ ابن کثیر حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس طرح ذکر فرمائی ہے تو اس وقت بھی حضرت ایوب علیہ السلام اپنے اللہ کے ساتھ دل سے خوش اور راضی تھے اس لیے انبیاء واولیاء کی ذات ایسی ہوتی ہے کہ ان کی خزاں میں بھی بوستاں کی خوشبو ملتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ابتدا میں مال ودولت اور جائیداد اور شاندار مکانات اور سواریاں

اور اولاد اور حشم و خدم بہت کچھ عطا فرمایا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبرانہ آزمائش میں مبتلا کیا، یہ سب چیزیں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں اور بدن میں بھی ایسی سخت بیماری لگ گئی جیسے جذام ہوتا ہے کہ بدن کا کوئی حصہ بجز زبان اور قلب کے اس بیماری سے نہ بچا، وہ اس حالت میں زبان وقلب کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھتے اور شکر ادا کرتے رہتے تھے اس شدید بیماری کی وجہ سے سب عزیزوں، دوستوں اور پڑوسیوں نے ان کو الگ کر کے آبادی سے باہر ایک کوڑا کچرہ ڈالنے کی جگہ پر ڈال دیا کوئی ان کے پاس نہ جاتا تھا صرف ان کی بیوی ان کی خبر گیری کرتی تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیٹی یا پوتی تھیں جن کا نام لیا بنت میشا بنت یوسف علیہ السلام بتلایا جاتا ہے (ابن کثیر) مال و جائداد تو سب ختم ہو چکا تھا ان کی زوجہ محترمہ محنت مزدوری کر کے اپنے اور ان کے لیے رزق کی ضروریات فراہم کرتی اور ان کی خدمت کرتی تھیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا یہ ابتلاء و امتحان کوئی حیرت و تعجب کی چیز نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

﴿اَشَدُّ النَّاسِ بَلاءً اَلْاَنْبِيَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ﴾

(مسند احمد)

یعنی سب سے زیادہ سخت بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں ان کے بعد دوسرے صالحین کو درجہ بدرجہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہر انسان کا ابتلاء اور آزمائش اس کی دینی صلابت اور مضبوطی کے اندازے پر ہوتا ہے جو دین میں جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے اتنی اس کی آزمائش و ابتلاء زیادہ ہوتی ہے (تاکہ اسی مقدار سے اس کے درجات اللہ کے نزدیک بلند ہوں)

حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں دینی صلابت اور صبر کا ایک امتیازی مقام عطا فرمایا تھا (جیسے داؤد علیہ السلام کو شکر کا ایسا ہی امتیاز دیا گیا تھا) مصائب و شدائد پر صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام ضرب المثل ہیں۔ یزید بن میسرہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو مال و اولاد وغیرہ سب دنیا کی نعمتوں سے خالی کر کے آزمائش فرمادی تو انہوں نے فارغ ہو کر اللہ کی یاد اور عبادت میں اور زیادہ محنت شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے مال جائیداد اور دولت دنیا اور اولاد عطا فرمائی جس کی محبت میرے دل کے ایک ایک جز پر چھا گئی پھر اس پر بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ان سب چیزوں سے فارغ اور خالی کر دیا اور اب میرے اور آپ کے درمیان حائل ہونے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔

حافظ ابن کثیر یہ مذکورہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہب بن مُنَبِّہ سے اس قصہ میں بڑی طویل روایات منقول ہیں جن میں غرابت پائی جاتی ہے اور طویل ہیں اس لیے ہم نے ان کو چھوڑ دیا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا صبر کے خلاف نہیں

حضرت ایوب علیہ السلام اس شدید ابتلا میں کہ سب مال و جائیداد اور دولت دنیا سے الگ ہو کر ایسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ لوگ پاس آتے ہوئے گھبرائیں، بستی سے باہر ایک کوڑے کچرے کی جگہ پر سات سال چند ماہ پڑے رہے کبھی جزع وفزع یا شکایت کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں آیا۔ نیک بی بی لیاز وجہ محترمہ نے عرض بھی کیا کہ آپ کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے اللہ سے دعا کیجئے کہ یہ تکلیف دور ہو جائے تو فرمایا میں نے ستر سال صحیح تندرست اللہ کی بے شمار نعمت و دولت میں گزارے ہیں کی اس کے مقابلے میں سات سال بھی مصیبت کے گزارنے مشکل ہیں۔ پیغمبرانہ عزم وضبط اور صبر وثبات کا یہ عالم تھا کہ دعا کرنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں صبر کیخلاف نہ ہو جائے (حالانکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور اپنی احتیاج وتکلیف پیش کرنا بے صبری میں داخل نہیں)

بالآخر کوئی ایسا سبب پیش آیا جس نے ان کو دعا کرنے پر مجبور کر دیا اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے یہ دعا دعا ہی تھی کوئی بے صبری نہیں تھی حق تعالیٰ نے ان کے کمال صبر پر اپنے کلام میں مہر ثبت فرمادی ہے فرمایا أنّا وجدناه صابرا اس صبر کے بیان میں روایات بہت مختلف اور طویل ہیں اس لیے ان کو چھوڑا جاتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب ایوب علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور ان کو حکم ہوا کہ زمین پر ایڑیاں لگائیے یہاں صاف پانی کا چشمہ پھوٹے گا اس سے غسل کیجئے اور اس کا پانی پیجئے تو یہ سارا روگ چلا جائیگا۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کے مطابق کیا تمام بدن جو زخموں سے چور تھا اور بجز ہڈیوں کے کچھ نہ رہا تھا اس چشمہ کے پانی سے غسل کرتے ہی سارا بدن کھال اور بال یکا یک اپنی اصل حالت پر آ گئے تو) اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت کا ایک لباس بھیج دیا وہ زیب تن فرمایا اور اس کوڑے کچرے سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ زوجہ محترمہ حسب عادت انکی خبر گیری کے لیے آئی تو ان کو اپنی جگہ پر نہ پا کر رونے لگی، ایوب علیہ السلام جو ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے ان کو نہیں پہچانا کہ حالت بدل چکی تھی۔ انہیں سے پوچھا کہ اے خدا کے بندے (کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ بیمار مبتلاء جو یہاں پڑا رہتا تھا کہاں چلا گیا، کیا کتوں یا بھیڑیوں نے اسے کھا لیا اور کچھ دیر تک اس معاملے میں ان سے گفتگو کرتی رہی۔ یہ سب سن کر ایوب علیہ السلام نے ان کو بتلایا کہ میں ہی ایوب ہوں مگر زوجہ محترمہ نے اب تک بھی نہیں پہچانا، کہنے لگی اللہ کے بندے کیا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں تو ایوب علیہ لاسلام نے پھر فرمایا غور کرو میں ہی ایوب ہوں اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی اور میرا بدن از سرِ نو درست فرما دیا، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا مال و دولت بھی ان کو واپس دے دیا اور اولاد بھی، اور اولاد کی تعداد کے برابر مزید اولاد بھی دیدی۔ (معارف القرآن، جلد:۶، ص:۲۱۵)

اللہ کے سچے عاشق بیماری اور تکلیف میں بھی بزبان حال یوں کہتے ہوتے ہیں ۔

عیادت کو آئے شفاء ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی
تماشائے مقتل کو آئے جو وہ
تڑپنے کی لذت سوا ہو گئی

اللہ ہی کے سامنے آہ وزاری ہو

دیکھ کے میری چشم تر سن کے ہماری آہ کو
ان کو ہمارے عشق کی مفت میں داستاں ملی

اللہ تعالیٰ کے سچے عاشقوں کی یہ خاص عادت ہوتی ہے کہ اکثر و بیشتر ان کی آنکھیں اشک بار رہتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں آہ وفغاں کرتے رہتے ہیں یعنی بلا تصنع وتکلف دل سے آہ آہ نکلتی رہتی ہے بقول حضرت شاہ عبدالغنی پھول پوری رحمہ اللہ کے اللہ تعالیٰ کی محبت کا درد دل میں آنے کے بعد آنکھوں سے چھلکنے اور چہرے سے جھلکنے لگتا ہے۔ حضرت خواجہ صاحب اسی کو فرماتے ہیں ۔

ہو گئی خشک چشم تر
بہہ گیا ہو کہ خوں جگر
رونے سے دل مرا مگر
ہائے ابھی بھرا نہیں

جو اللہ کے سامنے رونا سیکھ لیتا ہے اور اس کے سامنے جھکنا اور اسی سے مانگنا عادت بنالیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ دوسرے دروں سے اس کو بے نیاز کر دیتے ہیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں قحط پڑ گیا تھا تو انہوں نے اپنے ماتحت گورنر کو خط لکھا کہ تم یہاں کچھ غلہ وغیرہ بھیج دو جواب آیا کہ میں اتنا غلہ بھیجوں گا کہ غلے سے لدے اونٹوں کی قطار لگا دوں گا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور بطور عتاب فرمایا کہ عمر تجھے کیا ہو گیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت مختلف صحابہ کرام کو جمع کر کے صورت حال بیان کی اور ساتھ میں یہ واقعہ بھی بتایا اور صحابہ سے یہ دریافت فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت تنبہ ہوا کہ میں نے ان گورنر کو کیوں لکھا مجھے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے التجا کرنی چاہیے تھی اور پھر جیسے ہی اللہ تعالیٰ سے آہ وزاری کی تو فوراً آسمان پر بادل آ کر برسنا شروع ہو گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ایک عجیب واقعہ اپنے بہت سے بزرگوں سے سنا تھا لیکن کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذرا تھا۔ آج ابن تغری بردی رحمہ اللہ کی ''النجوم الزاہرۃ'' میں اس کی تفصیلات نظر پڑ گئی، حاضرِ

خدمت ہیں۔ابن تغری بردی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جب حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا اور اس کے گورنر تو کچھ عرصہ بعد بؤونہ کا مہینہ آ گیا (یہ ماہِ جون کا قبطی نام ہے) مہینہ کے شروع ہوتے ہی مصر کے قدیم قبطی باشندوں کا ایک وفد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''جناب امیر! ہمارے دریائے نیل کو ایک عادت ایسی پڑی ہوئی ہے کہ اگر اسے پورا نہ کیا جائے تو وہ چلنا بند ہو جاتا ہے۔'' حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کیا؟'' کہنے گے: ''عادت یہ ہے کہ بؤونہ کے مہینہ کی بارہ راتیں پوری ہو جاتی ہیں تو ہم ایک نوجوان دوشیزہ کو تلاش کر کے اس کے والدین کو راضی کرتے ہیں اور اسے بہترین زیور اور کپڑوں سے آراستہ کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔اس کے بعد وہ خوب بہنے لگتا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہوسکتا، اسلام تمام پچھلی (جاہلانہ) رسموں کو منہدم کرتا ہے۔'' وفد یہ سن کر چلا گیا، لیکن ہوا واقعتاً یہی کہ بؤونہ (جون)، ابیب (جولائی) اور مسری (اگست) تینوں مہینے گذر گئے اور دریائے نیل خشک پڑا رہا، یہاں تک کہ لوگ وہاں سے دوسرے مقامات کی طرف جانے کا ارادہ کرنے لگے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر مشورہ طلب کیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''تم نے ٹھیک کیا، اسلام واقعی پرانی (جاہلانہ) رسموں کو منہدم کرتا ہے، میں تمہارے ایک پرچہ بھیج رہا ہوں، اسے دریائے نیل میں ڈال دینا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ پرچہ کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا ''مِنْ عَبْدِ اللّٰہِ عُمَرَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِلٰی نِیْلِ مِصْر اَمَّا بَعْدُ اِنْ کُنْتَ تَجْرِیْ مِنْ قِبَلِکَ فَلَا تَجْرِ وَاِنْ کَانَ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ الَّذِیْ یُجْرِیْکَ فَنَسْأَلُ اللّٰہَ الْوَاحِدَ الْقَھَّارَ اَنْ یُّجْرِیَکَ. اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر کی طرف سے مصر کے دریائے نیل کے نام۔حمد وصلوٰۃ کے بعد۔اگر تو اپنی مرضی سے بہا کرتا ہے تو بہنا بند کردے اور اگر خدائے واحد و قہار ہے جو تجھے چلاتا ہے، تو ہم اسی خدائے واحد وقہار سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تجھے بہنے پر مجبور کردے۔''

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ پرچہ نصاریٰ کی عیدِ صلیب سے ایک دن پہلے دریا میں ڈال دیا، مصر کے باشندے وہاں سے بھاگنے کی پوری تیاریاں کر چکے تھے، اس لیے کہ ان کی زندگی کا دارومدار نیل کے پانی پر تھا، لیکن عیدِ صلیب کے دن جب صبح کو جا کر دیکھا تو نیل پوری آب وتاب کے ساتھ بہنا شروع ہو چکا تھا اور ایک رات میں پانی کی سطح سولہ ذراع بلند ہوگئی تھی۔(تراشے،صفحہ:۳۸-۳۹)

آپ کی یاد اے خدا حاصل کائنات ہے
آپ کے نام سے مجھے نعمت دو جہاں ملی

اختر بے نوا کو بھی تیرے کرم سے اے خدا
دعوتِ حق کے واسطے محفل دوستاں ملی

ساری کائنات کے وجود کا مقصد اور اس کے بقا کا منتہیٰ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی یاد ہے جس دن روئے زمین سے یہ چیز ختم ہوگی تو یہ کائنات بھی ختم کردی جائے گی اور جو لوگ دنیا میں رہتے ہوئے ذکر اللہ کے ساتھ لگے رہیں گے وہ دنیا میں بھی بامراد اور کامیاب ہوں گے اور آخرت کی عزتیں جنتیں بھی ان کا مقدر بنیں گی پھر اخیر میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے ایسے دوست احباب عطا فرمادیئے جن میں بیٹھ کر میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کی باتیں بیان کرتا ہوں اور ان کو خدائے وحدہ لاشریک لہ کی ذات عالی پر مرنے مٹنے کی تلقین کرتا رہتا ہوں اگر یہ نہ ہوتے تو پھر ایسی محفل اور مجمع کیسے میسر آتا جہاں میں اس دعوتِ حق کا کام انجام دیتا اسی لیے حضرت والا نے بعض اشعار میں اللہ تعالیٰ سے محفلِ دوستاں باقاعدہ طور پر مانگی ہے۔

اور آثار وقرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت کی دعائیں قبول ہوئیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پورے عالم میں جہاں بھی حضرت والا تشریف لے جاتے ہیں تو اچھے خاصے احباب حضرت کی محبت میں اپنی مشغولیات اور مصروفیات چھوڑ چھوڑ کر حضرت والا کے پاس جمع ہو جاتے ہیں جن کے سامنے حضرت احیائے سنت اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے خاص درد بھرے انداز سے بڑی آہ وفغاں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ حضرت والا کا یہ فرمانا کہ یہ محض آپ کا کرم ہے ورنہ میں اس کا مستحق نہیں تھا، یہ وہی سبق ہے جو ہمارے اہل اللہ اور مشائخ شب وروز خانقاہ کی چہار دیواری میں اپنے متعلقین کو پڑھاتے رہتے ہیں کہ کوئی بھی نعمت اپنا ذاتی کمال نہیں ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اس سے کبھی ذہول نہیں ہونا چاہیے ورنہ انسان بارگاہ خداوندی میں متکبر قرار پائے گا اور جب تک وہ ہر نعمت کو بلا استحقاق اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے گا تو تکبر اس کے قریب نہیں آسکتا ہے کیونکہ اسی سے تکبر کی جڑ کٹ جاتی ہے یہ اشعار حضرت والا نے ری یونین میں فرمائے جو حکومت فرانس کے تحت ایک جزیرہ ہے وہاں بھی ماشاء اللہ حضرت والا کے کافی متعلقین ہیں جن کے ذریعے وہاں محفلِ دوستاں قائم ہوا کرتی ہے۔

اثر ظاہر ہوا آہ سحر کا

ہے بدلا رنگ دشمن کی نظر کا اثر ظاہر ہوا آہ سحر کا
وہ آ کر میر مجھ سے پوچھتے ہیں میاں کیا حال ہے درد جگر کا
برنگ فق ملے تو میں نے پوچھا گیا ہے نور خورشید و قمر کا
ہونق سی وہ صورت سامنے ہے کبھی شہرہ تھا جس کے کر و فر کا
پڑا پالا جسے عشق بتاں سے نہ پوچھو خون دل خون جگر کا
ملو تو جا کہ اہل درد دل سے عجب ہے کیف واں شام و سحر کا
سکون قلب ہے انعام اختر حسینوں سے میاں صرف نظر کا

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **آہِ سحر**: تہجد کے وقت کی دعا۔ **برنگِ فق**: رنگ اڑ جانا۔ **خورشید وقمر**: سورج و چاند۔ **ہونق**: بیوقوف، احمق۔ **شہرہ**: شہرت۔ **کروفر**: شان وشوکت۔ **کیف**: لذت اور مزا۔ **شام وسحر**: شام وصبح۔ **حسینوں**: حسین کی جمع، تمام نامحرم عورتیں اور امارد۔ **صرفِ نظر**: نظر بچانا۔

آہ سحر کی برکت سے دشمن کی نظر بدل جاتی ہے

ہے بدلا رنگ دشمن کی نظر کا
اثر ظاہر ہوا آہ سحر کا

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سنت اور عادت رہی ہے کہ جن بندوں سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں انہیں ایسے اخلاق اور صفات عطا فرما دیتے ہیں جن کی بدولت ان کے دشمن بھی دوست بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کل تک ان کے راستے میں کانٹے بچھانے والا آج پھول بچھانے والا ہوتا ہے اور جو دشمنی میں ہر وقت تکلیف پہنچانے کے درپے رہا کرتے تھے اب وہی سب سے زیادہ راحت رساں بن جاتے ہیں اور قرآن کریم نے اپنے ماننے والوں کو ایسی تعلیمات دی ہیں کہ جن کی بدولت دشمن ضرور دوست بن جائیں گے ارشاد باری تعالیٰ ہے اِدْفَعْ بِا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال دیا کیجئے پھر یکایک آپ دیکھیں گے کہ آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ کوئی دلی دوست ہوتا ہے یعنی بدی کا بدلہ بدی سے دینے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے سے بشرط سلامت طبع دشمن کی عداوت گھٹتی ہے یہاں تک کہ اکثر تو بالکل ہی عداوت جاتی رہتی ہے اور اس معاملہ میں مثل دوست کے ہو جاتا ہے گو دل سے دوست نہ ہوا اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اخلاق کے اعتبار سے بڑے مستقل مزاج ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو ثواب کے اعتبار سے بڑا صاحبِ نصیب ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ داعیان حق کی خصلت یہ ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں کی برائی کو طریق احسن سے دفع کریں۔ وہ یہ کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ لینا اور معاف کردینا تو عمل حسن ہے اور احسن یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تم اس کو معاف بھی کردو اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم یہ ہے کہ جو شخص تم پر غصے کا اظہار کرے تم اس کے مقابلے میں صبر سے کام لو جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آوے تم اس کے ساتھ حلم و بردباری کا معاملہ کرو اور جس نے تمہیں ستایا اس کو معاف کردو (مظہری) بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی شخص نے گالی دی یا برا کہا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم وخطاوار اور براہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے اور اگر تم نے جھوٹ بولا تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمادے۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۶۴۸)

برائی کا بدلہ اچھائی کے ذریعے سے دیجئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو دشمن ہے وہ بھی جگری دوست بن جائے گا چنانچہ ہمارے محبوب نبی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی اوصاف تھے کہ گالی کا بدلہ دعا سے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دیا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے آپ کی جان کے دشمن آپ کے سب سے بڑے عاشق بن گئے چنانچہ بعض ایسے حضرات جو کل تک یہ کہتے تھے کہ آپ روئے زمین پر مجھے سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسند تھے وہی آپ سے ملنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ آپ مجھے روئے زمین پر سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

وہ آ کر میر مجھ سے پوچھتے ہیں
میاں کیا حال ہے درد جگر کا

اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جو محبت عطا فرماتے ہیں اور جو درد دل ان کا حصہ ہوتا ہے وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہوتا اور جو دشمن کل تک مخالفت پر اترے ہوئے تھے بالآخر ایک دن ان کو بھی اس کا قائل ہوجانا پڑتا ہے اور وہ بھی اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہتے جب کہ اس کے برخلاف جو بتوں کے عشق میں مبتلا رہتا ہے اور حسین شکلوں صورتوں کو اپنا دل دیئے ہوا ہوتا ہے اس کا قصہ اور داستان کچھ بالکل اس سے مختلف ہوتی ہے جس کو حضرت والا نے اگلے اشعار میں یوں ذکر کیا ہے۔

برنگ فق ملے تو میں نے پوچھا
گیا ہے نور خورشید و قمر کا
ہونق سی وہ صورت سامنے ہے
کبھی شہرہ تھا جس کے کر و فر کا

چہروں کی سب چمک دمک اڑ کر ختم ہو جاتی ہے اور ظاہری ٹھاٹھ باٹ اور کروفر اور زیبائش و آرائش سب زوال پذیر اور مٹ کر ایسی بے نشان ہوتی ہے کہ جیسا کہ کبھی کوئی رونق و چمک دمک تھی ہی نہیں۔ اس لیے بڑی حواس باختہ حالت اور بالکل بگڑی ہوئی شکل و صورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے اس خورشید و قمر کا ظاہری نور اور روشنی اور چمک و دمک کہاں جاتی رہی اور وہ حسین شکل و صورت جس کا بڑا شہرہ تھا آج اس کا نام و نشان مٹ کر کہاں ختم ہو گیا، نہ وہ رنگ و روغن نظر آرہا ہے، نہ وہ گلاب کی پنکھڑیاں کہیں دکھ رہی ہیں بلکہ شکلیں بگڑ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا دورِ خزاں میں کانٹوں کی جھاڑیاں ہوتی ہیں اس لیے نا سمجھ ہیں وہ لوگ جوان زوال پذیر شکلوں کو دل دینے کی باتیں کرتے ہیں اور ان پر فدا ہو کر اپنی زندگی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔

ترکِ عشقِ مجازی کے انعامات

پڑا پالا جسے عشقِ بتاں سے
نہ پوچھو خونِ دل خونِ جگر کا
ملو تو جا کے اہلِ دردِ دل سے
عجب ہے کیف واں شام و سحر کا
سکونِ قلب ہے انعام اختر
حسینوں سے میاں صرفِ نظر کا

جس آدمی کو حسین لڑکے یا لڑکیوں کے عشق سے پالا پڑا ہو اور وہ اس میں مبتلا ہوا ہو تو اسے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی محبت میں پڑ کر قلب و جگر کا کیسا خون ہوتا ہے رات و دن ان کی یاد میں تڑپنا اور بے چین رہنا اور ان کے فراق اور جدائی کے تصور سے نیند اور بھوک اڑ جانا اور رات و دن دل و دماغ پر ان کا خیال چھایا رہنا اور اس محبت کو چھوڑنے اور اس سے بچنے میں دل کا چورا چورا ہو جانا۔

لیکن جو لوگ ہمت کر کے پوری جرأت کے ساتھ آگے قدم بڑھاتے ہیں اور عشقِ بتاں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کی طرف پوری جان کی بازی لگا کر چلنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے دل کو حق تعالیٰ کی رضا کے لیے توڑنا منظور کرتے ہیں تو پھر وہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے اور نظر و قلب کی حفاظت کی بدولت پھر اسے ایسا سکونِ قلب اور دردِ دل نصیب ہوتا ہے کہ وہ صبح و شام عجیب کیف و سرور پاتا ہے اور اسے دل دل میں ایسی بہار میسر ہوتی ہے جس کی لذت بے مثال ہوا کرتی ہے اور یہ قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے وعدوں کا اثر اور نتیجہ ہے کہ جو لیلیٰ سے نظر اور دل بچالے گا تو مولیٰ کو اپنے دل میں پالے گا بقول حضرت والا ؎

سارے عالم میں یہی اخترؔ کی ہے آہ و فغاں
چند دن خونِ تمنا سے خدا مل جائے ہے

اور یہ وہ دولت ہے کہ انسان کو ایمان پر موت دلانے کا ذریعہ بنتی ہے کیونکہ حسینوں سے نظر بچانے پر دل میں حلاوت ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور جب کسی کو حلاوت نصیب ہو جاتی ہے تو پھر وہ دل سے نکلتی نہیں ہے۔ اس لیے اس میں اس بات کی طرف بشارت ہے کہ اس کا ایمان پر خاتمہ ہوگا جو ایک مومن کے لیے بہت عظیم دولت ہے اور جو جتنے درجے میں کسی نامحرم عورت یا حسین لڑکے کا عاشق رہا ہو اور بعد میں تائب ہو گیا ہو لیکن اس معشوق کو چھوڑنا اس کے لیے سخت مجاہدہ کا سبب بن رہا ہو وہ یہ بات بغور سن لے کہ اس مجاہدہ سے اس کو جتنی تکلیف ہوگی اس کے دل کو اتنا ہی درجہ کا حلوۂ ایمانی بھی نصیب ہوگا۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ کی راہ میں جو بندہ جس قدر مشقت اور تکلیف اٹھاتا ہے اس کو اسی قدر اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب اور بدلہ مرحمت فرمایا جاتا ہے تو ان لوگوں کو جو اس وادی میں بہت دور جا چکے ہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ؎

ظالم ابھی ہے فرصتِ توبہ نہ دیر کر
وہ بھی گرا نہیں کہ جو گر کر سنبھل گیا

اور فوراً بغیر کسی تاخیر کے اپنے مالک کو راضی کرنے میں اسی طرح قوت و ہمت کے ساتھ لگ جائیں کہ جس طرح اب تک ان بتوں کے عشق میں رات و دن اور شب و روز دل کو لگائے ہوئے تھے اور بزبانِ حال یہ کہہ رہے ہوں کہ یا اللہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اب ان حرام محبتوں سے دور ہونے کا فیصلہ کر چکا ہوں ؎

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو ترے قابل بنانا ہے مجھے

نہ کر توہین تو تاثیر آہ بے زبانی کی

جسے بخشی ہے دولت حق نے اپنی رازدانی کی
محبت ہو نہیں سکتی اسے دنیائے فانی کی

بدلتا ہے کبھی جغرافیہ ایسا حسینوں کا
کہ تاریخیں بدل جاتی ہیں جس سے حسن فانی کی

جنازہ حسن کا جب دفن ہو پیری کی قبروں میں
سنوں کیا آہ ان کی داستاں عہد جوانی کی

میں اب تاریخ ان کے حسن کی کس طرح دہراؤں
نہیں وقعت ہے کوئی حسن رفتہ کی کہانی کی

نہ ہوتا بد گماں ناداں کبھی اہل محبت سے
جو ہوتی آگہی ظالم کو کچھ درد نہانی کی

رہا تا عمر وہ محروم اہل دل کی صحبت سے
کہ جس نے کبر کے باعث ہمیشہ بدگمانی کی

ہزاروں بستیاں ویران ہیں از آہ مظلوماں
نہ کر توہین تو تاثیر آہِ بے زبانی کی

نہیں پاتا شفا دکتور خود اپنی دواؤں سے
کرے ہے جستجو دکتور بھی دکتور ثانی کی

بدون صحبت مرشد تجھے کیسے شفا ہوگی
نہیں جب شیخ اوّل جستجو کر شیخ ثانی کی

ہمارے پھول پھل جو دیکھتے ہو دیکھنے والو
ہمارے شیخ نے اختؔر کے دل میں باغبانی کی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **فانی**: ختم ہونے والی۔ **جغرافیہ**: ناک ونقشہ۔ **پیری**: بڑھاپا۔ **عھد جوانی**: جوانی کا زمانہ۔ **حسنِ رفتہ**: گیا ہوا حسن۔ **دکتور**: ڈاکٹر۔

دولت راز دانی ہو تو دنیائے فانی پھر کہاں

جسے بخشی ہے دولت حق نے اپنی رازدانی کی
محبت ہو نہیں سکتی اسے دنیائے فانی کی

اللہ تبارک وتعالیٰ جسے اپنے خاص علوم اور اسرار و رموز عطا فرماتے ہیں اس کے دل سے دنیائے فانی کی محبت کو نکال دیتے ہیں کیونکہ جب تک دنیائے فانی کی محبت دل میں موجود رہے گی تو اللہ تعالیٰ کی محبت پورے طور پر دل میں نہیں آسکتی ہے اور جب تک دل میں اللہ تعالیٰ کی پورے طور پر محبت نہیں ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے خاص علوم اور اسرار و رموز دل کو عطا نہیں ہوتے:

﴿عَنْ اَبِیْ ذَرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَازَھِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلَّا اَنْبَتَ اللہُ الْحِکْمَۃَ فِیْ قَلْبِہٖ وَاَنْطَقَ بِھَا لِسَانَہٗ وَبَصَّرَہٗ عَیْبَ الدُّنْیَا وَدَائَھَا وَدَوَائَھَا وَاَخْرَجَہٗ مِنْھَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ﴾

(المشکوٰۃ، کتابُ الرِّقاق، ص: ۴۴۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بندہ نے دنیا میں زہد اختیار کیا (یعنی دنیا سے بے رغبتی کی) اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں حکمت پیدا کی اور حکمت کے ساتھ اس کی زبان کو گویا کیا اور دنیا کے عیوب اور اس کی بیماری اور ان بیماریوں کا علاج اس کو دکھایا اور نکالا اس کو حق تعالیٰ نے دنیا اور آفات سے سالم دارالسلام کی طرف۔ (دنیا کی حقیقت، ص: ۷۰)

اس حدیث شریف سے یوں تو بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں مگر ایک بنیادی بات جس کا اس حدیث شریف سے پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ جس بندے کو زہد یعنی دلی طور پر دنیا سے دوری اور بے رغبتی عطا فرمادی جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے دل میں اپنے خاص علوم وحکم عطا فرماتے ہیں اور ان علوم وحکم کا بیان بھی اس کی زبان پر جاری فرمادیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی رازدانی کی حقیقت پانے والا مومن دنیا سے محبت کرنے والا نہیں ہوسکتا اور جو دنیا سے محبت کرے گا اسے یہ نعمت نصیب نہیں ہوگی اسی لیے جو اہل اللہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر لیتے ہیں اور دنیا کی محبت دل سے نکال دیتے ہیں تو بسا اوقات وہ مدرسے کے اصطلاحی عالم نہ ہونے کے باوجود علوم وھبیہ میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ظاہری اصطلاحی عالم ان کا بیان وتقریر سن کر حیران کھڑا رہ جاتا ہے۔

جغرافیۂ حسن کا برا حال وانجام

بدلتا ہے کبھی جغرافیہ ایسا حسینوں کا
کہ تاریخیں بدل جاتی ہیں جس سے حسن فانی کی
جنازہ حسن کا جب دفن ہو پیری کی قبروں میں
سنوں کیا آہ ان کی داستاں عہد جوانی کی
میں اب تاریخ ان کے حسن کی کس طرح دہراؤں
نہیں وقعت ہے کوئی حسن رفتہ کی کہانی کی

حضرت والا دامت برکاتہم اشعار میں حسین چہروں کو دل دینے والے حضرات کے لیے نصیحت آموز انداز سے حسن کے زوال اور مٹ جانے کا تذکرہ فرما رہے ہیں کہ وہی حسن جس پر اپنی جان و دل اور دین و ایمان فدا کیا جاتا ہے تھوڑے ہی دنوں میں ان حسینوں کا جغرافیہ ایسا بدلتا ہے کہ اس کی تاریخیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں اور وہ اس لائق بھی نہیں رہتا کہ اسے حسن کہا جائے وہی چہرے جو کل تک بڑے آب وتاب کے ساتھ نظر آتے تھے جیسے ہی ان کو بڑھاپے نے آگھیرا تو اب کوئی عاشق جوانی کی داستان دہرانے کو بھی تیار نہیں ہوتا بلکہ ان سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے کیونکہ حسن رفتہ کی کوئی وقعت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک وقتی جوش وجنون ہوتا ہے. جس میں پڑ کر اُمّت کے جوان اپنی جوانی کو ضائع کر ڈالتے ہیں اور یہ حال ہر حسین اور حسینہ کا ہونا ہے کہ ان کے حسن کو ایک نہ ایک دن زوال لاحق ہوگا کبھی تو ان کے حسن کا جنازہ پیری کی قبروں میں دفن ہوگا تو پھر وہ سب قصے داستانِ فانیہ بن جائیں گے اور کبھی اس سے پہلے ہی قبر میں گلنے سڑنے والی لاشوں میں تبدیل ہو کر وہاں کے سینکڑوں کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جائیں گے۔

اسی لیے ہم نے بارہا دیکھا کہ عشقیہ مزاج رکھنے والے کبھی کسی سے عشق لڑا کر شادیوں کی باتیں کرتے ہیں اور پھر شادی کے بعد چند ہی دن میں طلاق کی نوبت آتی ہے کیونکہ اب ان کا عشق کسی اور چمکتے چہرے کے ساتھ لگ چکا ہوتا ہے. جس کے نتیجہ میں وہ صحیح اسلامی نکاح کی ذمہ داری کو نبھانے کا متحمل نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک قصہ اس پر یاد آیا۔ احقر سفر کے دوران اپنے ایک جاننے والے صاحب کے یہاں ایک دن کے لیے مہمان ٹھہرا ہوا تھا تو دوران گفتگو ان صاحب نے اپنی بیٹی کے ساتھ پیش آنے والے پریشان کن واقعات کا تذکرہ کیا جو اس کے شوہر کی طرف سے روز بروز پیش آرہے تھے کہ میری بیٹی کو طلاق دینے کی باتیں کرتا ہے اور کبھی اس کا سامان اٹھا کر لا کر ہمارے گھر چھوڑ دیتا ہے جب کہ کل تک یہ کہتا پھرتا تھا کہ یہ مجھے اتنی پسند ہے کہ میں اس کی خاطر مر جاؤں گا۔

اور صورت یہ پیش آئی تھی کہ ان کی شادی شدہ بیٹی نے اپنے اس شادی شدہ شوہر سے عشق لڑایا اور دونوں میں خوب محبت قائم ہوگئی یہاں تک اس شوہر نے سابقہ بیوی کو طلاق دی اور اس لڑکی نے اپنے سابق شوہر سے زبردستی طلاق لی اور اس طرح دونوں نے آپس میں نکاح کیا لیکن جن کا مزاج عشق بازی کا ہوتا ہے وہ ہر آنے والے دن ایک نئے چہرے کے اوپر مرنے مٹنے کی باتیں کرنے لگتے ہیں چنانچہ ویسا ہی یہاں ہوا کہ اب اس لڑکے نے کسی اور لڑکی سے عشق لڑایا تو وہ دوسری والی بیوی اس کی طبیعت سے اتر گئی۔ اسی لیے یہ جناب احقر کے سامنے بیٹھے ہوئے اس غرض سے تذکرہ کر رہے تھے کہ کوئی تعویذ وغیرہ ایسا دے دیا جائے کہ جس سے وہ شوہر میری بیٹی کو پھر سے اسی طرح چاہنے لگے جیسے پہلے چاہتا تھا اور نئی لڑکی سے عشق چھوڑ دے۔

افسوس صد افسوس! آج اُمت گناہوں سے بچنا نہیں چاہتی اور نہ اپنی اولاد کو بچانے کی فکر کرتی ہے لیکن جب حالات آ کر پڑتے ہیں اور مصائب میں گھرتے ہیں تو پھر عاملوں کے پاس ایسے تعویذ لینے جاتے ہیں جو ان کے سارے مسائل حل کر دے اور انہیں مشکلات سے نجات دے دے۔

حالانکہ احقر اپنی پوری زندگی کے قرآن وسنت کے مطالعہ اور تاریخی حقائق کے نتیجے میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ گناہوں اور حق تعالیٰ کی نافرمانیوں میں لگے رہنے کے باوجود دنیا کے کسی بڑے سے بڑے عامل کے پاس ایسا کوئی تعویذ موجود نہیں ہے جو مصائب اور پریشانیوں سے نجات دلا سکے کیونکہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ رکھا ہے اور وہ یہ کہ بندہ پورے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو جائے اور مکمل تقویٰ اختیار کر لے اور تمام گناہوں سے توبہ کر لے تو پھر ضرور اس کی ہر مشکل آسان کر دی جائے گی۔

اہلِ دل سے بدگمانی اپنی ناکامی ومحرومی ہے

نہ ہوتا بدگماں ناداں کبھی اہلِ محبت سے
جو ہوتی آگہی ظالم کو کچھ دردِ نہانی کی
رہا تا عمر وہ محروم اہلِ دل کی صحبت سے
کہ جس نے کبر کے باعث ہمیشہ بدگمانی کی

اللہ تعالیٰ کی محبت کا غم کیا چیز ہے جب تک آدمی کو اس کی خبر نہ ہو تو اہل اللہ کے مقام اور ان کی صحیح حالت سے ناواقف اور بے خبر رہتا ہے جس کی وجہ سے بہت سی مرتبہ اہل اللہ کے اوپر اعتراضات اور اشکالات دل میں آنے لگتے ہیں اور ان سے بدگمانیاں شروع ہو جاتی ہیں جیسا کہ بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جو مدارس سے صرف ظاہری علوم درس نظامی کی صورت میں پڑھ لیتے ہیں اور وہ اہل اللہ کی صحبت نہیں اٹھاتے تو ان کا یہ علم ان کے لیے حجاب بنا رہتا ہے اور وہ اہل اللہ سے بدگمان رہتے ہیں اور بدگمانی درحقیقت کبر اور بڑائی سے مترشح ہوتی ہے اور

اس طرح یہ کبر ان کو اللہ کی محبت سیکھنے سے مانع بن جاتا ہے۔

چنانچہ احقر کے سامنے بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ جو لوگ شروع شروع میں بزرگوں سے بدظن رہے لیکن جب ان کے قریب پہنچے اور حقیقت ان کے سامنے کھلی تو پھر وہ دل و جان اہل اللہ پر فدا کرنے کو تیار نظر آنے لگے جیسا کہ حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے متعلق یہی بات ہے کہ شروع میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے جب ملنے کے لیے تشریف لائے تو کچھ اعتراضات اور اشکالات دل میں لیے ہوئے تھے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ان سے اتنی درخواست کی کہ پہلے چند دن غالباً دس ایام تک آپ میری گفتگو سنیں گے اور اس کے بعد میں آپ کے اشکالات سنوں گا بالآخر ابھی دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ اس سے پہلے ہی ان کے تمام اشکالات حل ہو گئے اور پھر جب حضرت نے ان سے فرمایا کہ اب آپ اپنی بات پیش کریں تو انہوں نے یہ عرض کیا کہ حضرت وہ سب اشکالات اور اعتراضات اب ختم ہو چکے ہیں۔

اور پھر ایسے حضرت تھانوی کے عاشق ہوئے کہ حضرت تھانوی کے حالات پر ایک نہایت ضخیم کتاب تحریر فرمائی جس کا نام ''حکیم الامت اور نقوش تاثرات'' ہے جس کو پڑھنے کے بعد ان کے حضرت تھانوی سے والہانہ تعلق اور غایت درجے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر جب تک حضرت تھانوی کے قریب نہیں آئے تھے تو وہ اعتراضات اور اشکالات رہتے تھے اس لیے حضرت والا دامت برکاتہم ارشاد فرما رہے ہیں کہ جس شخص کو تکبر کے باعث اہل اللہ سے بدگمانی ہو وہ ساری عمر ان کے فیض سے محروم رہتا ہے بس اس کی زندگی ان پر تنقیدوں اور تبصروں میں اور اعتراضات اور اشکالات میں گزر جاتی ہے جب کہ دوسرے لوگ ان سے مل کر اللہ تعالیٰ کی محبت سیکھتے ہیں اور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔

اور حضرت والا نے ایسے شخص کو ناداں اور ظالم کہا ہے جو بالکل ظاہر ہے اس لیے کہ بدگمانی سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً منع فرمایا ہے چہ جائیکہ اہل اللہ سے بدگمانی یہ تو اور مزید اللہ تعالیٰ کے عذاب اور پکڑ کا باعث ہے کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ سے دشمنی رکھنا یا ان کو ستانا اور تکلیف پہنچانا اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اس قدر برا ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات عالی سے جنگ کا اعلان فرمایا ہے اس لیے اہل اللہ سے بدگمانی کرنا اپنی تباہی اور بربادی کا سبب ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ﴾

(سورۃ الحجرات، آیت: ۱۲)

کہ ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِ خَیْرًا﴾
(تفسیر کبیر، ج:۱۴، ص:۱۳۴)

کہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا گمان کرو۔

اس لیے جب عام مسلمانوں اور مومنوں کے ساتھ اچھا گمان رکھنے کا حکم ہے تو پھر اہل اللہ سے بدگمانی کتنا بڑا جرم ہوگی اور اس بدگمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس کی محبت سے محروم رہنا یہ خود اس جرم کی ایک سزا ہے۔

آہ بے زبانی کی تاثیر کو نادان کیا جانے

ہزاروں بستیاں ویران ہیں از آہ مظلوماں
نہ کر توہین تو تاثیرِ آہِ بے زبانی کی

جس وقت مظلوم کی آہ نکلتی ہے تو وہ آسمانوں کو چیرتی ہوئی جاتی ہے اور اس آہ پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے صادر ہو کر کتنی ہی بستیاں اور شہروں کی ویرانی اور بربادی کا سبب بنتے ہیں اور پوری ظالم قوم نیست و نابود کر دی جاتی ہے کیونکہ مظلوم کی آہ وفریاد اس حاکم و منصف احکم الحاکمین اور ملک الملوک کے دربار میں سنی جاتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ مظلوم کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب اور پردہ نہیں ہوتا جیسا کہ فارسی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

بترس از آہ مظلوم کہ ہنگامے دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

کہ مظلوم کی آہوں سے ڈرو کیونکہ جس وقت ان کی آہ وفریاد نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قبولیت اس کے استقبال کے لیے آتی ہے سو جس طرح مظلوموں کی آہوں میں اللہ نے اثر رکھا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں غم اٹھائے ہوئے اہل اللہ کی آہوں میں بھی اللہ نے بہت زبردست تاثیر رکھی ہے وہ زبان کھولیں یا نہ کھولیں لیکن ان کی آہیں ڈائریکٹ آسمان پر پہنچتی ہیں اور ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بھی کوئی حجاب اور آڑ نہیں ہوتی جیسے مولانا رومی نے فرمایا ؎

آہ را جز آسمان ہم دم نبود
راز را غیرِ خدا محرم نہ بود

کہ جلال الدین رومی اپنے اللہ کو ایسے جنگل و بیابان اور دامن کوہ اور صحرا میں جا کر پکارتا ہے جہاں اس کی پکار کو سننے والا سوائے اس کے اللہ کے اور کوئی نہیں ہوتا۔

اس لیے نادان ہیں وہ لوگ جو اللہ والوں کی آہوں کی قدر و قیمت سے واقف نہیں اور ان کی تاثیر بے

زبانی کے قائل نہیں حالانکہ حق اور سچ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں جلا بھنا دل لیے ہوئے اہل اللہ کے پاس محض اٹھنے بیٹھنے ہی سے اور صرف ان کی آہ و نالوں کا حال دیکھنے سے کئی ظلمت سے بھرے ہوئے دل روشن ہو جاتے ہیں اور چمک اٹھتے ہیں اور انہیں حقیقی حیات نصیب ہو جاتی ہے کیونکہ جس طرح ایک آدمی سردی کے موسم میں حرارت اور گرمی کے مقام سے اگر دور بیٹھا ہو تو اسے اس کی گرمی نہیں پہنچتی اسی طرح اللہ والوں کے دلوں سے جو لوگ دور رہیں گے انہیں گرمی کا احساس اس طرح نہیں ہو سکتا جس طرح کہ ان لوگوں کو جو اس کے قریب بیٹھے ہوں کیونکہ ان کے دلوں میں بھی اسی طرح اللہ کی محبت کی آگ لگی ہوتی ہے اور اس کی حرارت و گرمی معنوی اور روحانی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

صحبتِ شیخ کی ضرورت کی حکیمانہ وجہ

نہیں پاتا شفا دکتور خود اپنی دواؤں سے
کرے ہے جستجو دکتور بھی دکتور ثانی کی
بدون صحبتِ مرشد تجھے کیسے شفا ہوگی
نہیں جب شیخ اوّل جستجو کر شیخ ثانی کی
ہمارے پھول پھل جو دیکھتے ہو دیکھنے والو
ہمارے شیخ نے اختؔر کے دل میں باغبانی کی

ان تمام اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کو خواہ وہ جسمانی بیمار ہو یا روحانی کسی طبیب جسمانی و روحانی کی ضرورت ضرور پڑتی ہے حتی کے خود طبیب بھی اگر کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو دنیائے طب اور فن ڈاکٹری کا یہی اصول ہے کہ وہ خود اپنے مرض کی تشخیص اور دواؤں کی تجویز کے لیے کسی دوسرے طبیب و ڈاکٹر کی خدمت میں جانا ضروری سمجھتا ہے خود اپنے طور پر اپنی بیماری کا علاج کرنا پسند نہیں کیا جاتا اور خود علاج کرنے میں عام طور پر خطا و چوک واقع ہو جاتی ہے۔

تو آخر کیا وجہ ہے کہ روحانی بیمار اپنے علاج کے لیے خود ہی بیماریوں کی تشخیص اور دواؤں کی تجویز پر اکتفاء کرتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امراض جسمانی کے مقابلے میں امراض روحانی کا معاملہ سخت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تشخیص طبیب ماہر، معالج روحانی، شیخ کامل کے بغیر بالکل ممکن نہیں اسی لیے تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہی رہی ہے کہ کتاب اللہ بھیجے جانے کے ساتھ ساتھ اس پر صحیح طور پر عمل کرنے کے لیے امتوں کے لیے رجال اللہ یعنی انبیاء بھی بھیجے گئے۔

اب چونکہ یہ امت آخری امت ہے اس لیے رجال اللہ بشکل انبیاء تو مبعوث نہیں کیے جائیں گے لیکن انبیاء کے نائبین علمائے دین اس فریضے کی انجام دہی میں قیامت تک لگے رہیں گے اس لیے خلاصہ یہ ہے کہ ہر سالک کو اگر چہ وہ اپنے وقت کا شیخ بھی بن گیا ہو اپنے سر کے اوپر کسی اپنے بڑے شیخ و مربی کو رکھنا چاہیے تا کہ نفس و شیطان کی چالوں سے اور اس کی سازشوں سے بسہولت آگاہی حاصل ہوتی رہے ورنہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی عمل کو دین سمجھتے رہتے ہیں حالانکہ وہ طریق دین پر نہ ہونے کی وجہ دین نہیں ہوتا اور بسا اوقات بعض اعمال واشغال کو بعض امراض روحانی کا علاج سمجھتے رہتے ہیں جبکہ وہ اس کا علاج نہیں ہوتے۔

احقر کا واقعہ اور علاج وساوس کا آزمودہ نسخہ

مثال کے طور پر احقر خود اپنا واقعہ پیش کرتا ہے کہ ایک مرتبہ وساوس کی کثرت کے علاج کے طور پر احقر نے حضرت والا کو خط لکھا اور اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ بندہ اس کے لیے روزانہ دو رکعت نماز پڑھ کر خوب الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرتا رہتا ہے کہ یہ وساوس ختم ہو جائیں اور اس طرح اپنے طور پر ازالۂ وساوس کے لیے صلوٰۃ الحاجۃ کو تجویز کر لیا مگر حضرت والا کی طرف سے جب جواب آیا تو پھر اپنے اس علاج کے غلط ہونے پر تنبہ ہوا کیونکہ اس میں حضرت والا نے یہ تحریر فرمایا کہ صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنا اور دعائیں مانگنا اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہے مگر یہ ازالۂ وساوس کا علاج نہیں ہے بلکہ اس کا علاج وساوس سے مکمل طور پر صرفِ نظر کر لینا ہے اور اس سے بے توجہ ہو جانا ہے ورنہ اگر تم نماز پڑھتے رہے اور اس نماز میں بھی وسوسے آئے تو پھر مزید دو رکعت پڑھنی پڑے گی یہاں تک کہ شیطان وساوس کے ذریعے تم کو تھکا ڈالے گا اور بالآخر تم پریشان ہو کر نماز بھی چھوڑ بیٹھو گے اس لیے اس کا اصل علاج اس طرف سے اپنے ذہن کو ہٹا دینا ہے۔

یہ خط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا اور بآسانی وساوس کا علاج ہو گیا چنانچہ احقر نے حضرت تھانوی قدس سرہ کی سوانح میں پڑھا کہ خود حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کو جب ایک زمانے میں وساوس کی بڑی کثرت تھی تو حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ نے یہی جواب ارشاد فرمایا تھا کہ وساوس کا علاج اس طرف سے توجہ ہٹا لینا ہے۔

اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ جس شخص کو وساوس آتے ہوں وہ صرف اتنا سوچ لے کہ میں وساوس سے پریشان ہو رہا ہوں؟ یا مطمئن ہوں اور سکون سے بیٹھا ہوں؟ ظاہر ہے کہ تمام ہی سالکین وساوس سے پریشان ہوتے ہیں یہی ان کے صریح اور واضح ایمان کی دلیل ہے ورنہ ان کو وساوس پر مطمئن ہونا چاہیے تھا جیسا کہ حدیث پاک میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے منقول ہے:

﴿وَعَنْهُ قَالَ جَآءَ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَ قَدْ وَجَدْ تُمُوْهُ

﴿قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص:۱۸)

یعنی خلاصہ یہ ہے کہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب بعض صحابہ نے آ کے یہی بات عرض کی تھی اور فرمایا تھا کہ یا رسول اللہ ہم اپنے دلوں میں ایسے بعض وساوس پاتے ہیں کہ جن کا زبان سے بولنا ہمارے اوپر بڑا دشوار ہے اس پر حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے ان سے پوچھا کہ کیا واقعی تم نے اس بات کو اپنے دلوں میں محسوس کیا؟ تو صحابہ نے فرمایا کہ جی ہاں یا رسول اللہ تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ''ذاک صریح الایمان'' کہ یہ تو تمہارے واضح ایمان کی دلیل ہے کیونکہ اگر ایمان نہ ہوتا تو پھر ان وساوس پر مطمئن رہتا، پریشان نہ ہوتا۔

نیز اسی طرح ایک اور حدیثِ پاک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب ایک شخص نے آ کر حضور سے یہی وسوسوں کی شکایت کی تھی اور یوں فرمایا تھا کہ میرے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ مجھے جل کر کوئلہ ہو جانا اچھا لگتا ہے بنسبت اس کے میں اس کو اپنی زبان سے بولوں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر خوشی کا اظہار فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ﴾

(مشکوٰۃ المصابیح، ص:۱۹)

کہ شکر ہے اس خدائے پاک کا جس نے اس کے معاملے کو وسوسے کی طرف پھیر دیا یعنی اُس کا جل کر کوئلہ ہو جانے کی تمنا کرنا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دل میں ایمان موجود ہے ورنہ وہ اس وسوسے کے اوپر پرسکون اور مطمئن رہتا۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ سالک کو اس سے ہرگز گھبرانا نہیں چاہیے۔

اور وساوس کی طرف توجہ نہ کرنا اس کا یہ علاج حدیث شریف میں مذکور ہے کہ وساوس میں غور کرنے سے رک جائے اور استعاذہ پڑھے۔ اس حدیث شریف سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ وساوس میں غور و فکر کرنا چھوڑ دینے سے اور اس طرف سے بے التفاتی کے نتیجے میں شیطان بندۂ مؤمن کو پریشان کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اس لیے وساوس کا یہ سب سے قیمتی علاج ہے کہ اس طرف توجہ نہ کی جائے۔

اور حضرت والا نے اپنی ایک کتاب میں جہاں حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کے ملفوظات جمع فرمائے ہیں اس میں یہ بات بھی تحریر فرمائی کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ پڑھ لینے سے بھی وساوس کا علاج ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ الفاظ ایک روایت میں بھی آئے ہیں۔

نیز یہ بھی ایک بہت قیمتی علاج وساوس کے سلسلے میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ جس کو وساوس آتے ہوں وہ یوں غور کرے کہ چور ایسے مکان کی طرف رُخ کرتا ہے جہاں اُسے خزانہ معلوم ہوتا ہو اور جو گھر مال و دولت سے خالی ہو اُس میں چور جا کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تو شیطان کا اس آدمی کے پاس آ کر دل

میں وساوس ڈالنا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معرفت ومحبت کا خزانہ نصیب ہورہا ہے۔ تو یہ اس کے لیے خوش ہونے کی بات ہے، غمگین ہونے کی بات نہیں۔

اور حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے بڑی قیمتی بات ارشاد فرمائی ہے کہ وساوس کا اپنے اختیار سے لانا تو بُرا ہے مگر آنا بُرا نہیں۔ لہٰذا اگر کسی کو وساوس آتے ہوں تو اُس کی بالکل پرواہ نہ کرے اور اپنی عبادات اُسی طرح جاری رکھے۔ ایک مرتبہ میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادر حمہ اللہ کے پاس ایک شخص نے آکر اس طرح کی شکایت کی کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسا کہ میں شیطان ہوگیا ہوں اور کبھی یہ لگتا ہے کہ میرے دل میں ایمان نہیں ہے، میں کافر ہو چکا ہوں۔ تو حضرت رحمہ اللہ نے اس سے یہ پوچھا کہ کیا تم نماز پڑھتے ہو؟ سجدہ کرتے ہو؟ تلاوت کرتے ہو؟ اللہ کا نام لیتے ہو؟ اس طرح کے چند سوالات کیے۔ اس شخص نے جواب دیا جی ہاں! میں یہ سب کچھ کرتا ہوں۔ تو حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ کیا شیطان اور کوئی کافر بھی یہ سب کام کرتا ہے؟ اُس نے کہا کہ نہیں۔ تو پھر حضرت نے فرمایا کہ لہٰذا معلوم ہوگیا کہ تم نہ شیطان ہو نہ کافر ہو۔ یہ جواب سن کر اُس کی یہ بیماری ختم ہوگئی۔

سایۂ شیخ تا حیات سر پر رکھئے

بہرحال یہ بات ضمناً آگئی تھی کہ اپنے طور پر کسی بیماری کا علاج تجویز کرنے کے بجائے اپنے شیخ ومرشد کے سامنے بیماری رکھ کر اس سے علاج دریافت کیا جائے کیونکہ وہ ان راہوں سے گزرا ہوا تجربہ کار شخص ہوتا ہے اور نفس وشیطان کی چالوں سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ اگر شیخ اوّل دنیا سے رخصت ہوجائے تو شیخِ ثانی سے رابطہ رکھا جائے اور کسی نہ کسی مصلح اور مرشد کو اپنے سر پر رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ خود حضرت والا سب سے اوّل حضرت شاہ احمد پرتا بگڈھی رحمہ اللہ سے پھر حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ اور پھر حضرت شاہ ابرارالحق ہردوئی رحمہ اللہ سے وابستہ رہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مشائخ مقصود نہیں ہوتے مقصود صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ مشائخ صرف راستہ دکھلانے والے اور اُس کے نشیب وفراز سے آگاہ کرانے والے ہیں اور اس کی ضرورت آدمی کو مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔ اخیر میں حضرت والا اپنی عادت کے مطابق وہی بات دہرارہے ہیں جو کتاب میں جگہ جگہ مذکور ہے کہ میرے پھول وپھل اور تقریر وتالیف اور وعظ وبیان اور دین کی محبت کی شکل میں جو پھول وپھل ہیں یہ سب میرے شیخ نے جواختر کے دل میں باغبانی کی تھی اسی کا اثر اور نتیجہ ہے گویا اس میں میرا اپنا کوئی کمال نہیں ہے۔ اس شعر میں ہم سب کے لیے تواضع کا سبق ہے کہ آدمی اپنے کمالات کو اصل اور حقیقی طور پر تو اللہ تعالیٰ کی طرف اور سبب کے درجے میں اپنے شیخ اور مصلح کی طرف منسوب کرے۔ اپنی کوششوں کا اثر اور کمال نہ سمجھے۔

سیمیں تن کو دے کر سیمیں جاں خریدا
تن دفن ہے لحد میں جاں ہے فلک پہ تاباں
اس تن میں کیا دھرا ہے اک دن اسے فنا ہے
اس جان و تن کو لے کر چل میرے سُوئے جاناں

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **سیمین تن**: چاندی جیسا جسم۔ **لحد**: قبر۔ **تاباں**: چمکتی ہوئی۔ **سوئے جاناں**: اللہ تعالیٰ کی طرف۔

خوب گزریں گے تیرے لیل ونہار

حسن سے جس کے میر تھے سرشار
اس کی صورت سے اب ہیں کیوں بے زار

عشق فانی کے لطف خواب ہوئے
سر پہ ہے بار معصیت کا سوار

ان کی نظروں میں میر ہیں رُسوا
دین و ایماں کیا تھا جن پہ نثار

میر رہتے ہیں عشق کے بیمار
مجھ کو پاتے ہیں اپنا وہ تیمار

ان بتوں کو نہ دیکھ تو زنہار
عقل کھو دے گا ورنہ تو اے یار

عشق لے چل بجانب صحرا
حسن والوں سے قلب ہے بے زار

مے کدہ میر کا ہے ٹنڈو جام
اور صحرا وہاں کا ہے گُل زار

میر آفت ہے صورت گلفام
ترک صورت کرو یہ ہیں سب خار

ایسی عشرت کہ جس سے ہو کلفت
اپنی حسرت ہے اس سے بہتر یار

خار کھاتے ہیں میر کیوں گل سے
دے گی کیا ان کو وادی پُرخار

جب ملے مے حلال کی، پی لے
پڑ نہ پیچھے حرام کے زنہار

چند حسرت بھرے دلوں کے ساتھ
خوب گذریں گے تیرے لیل و نہار

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **معصیت**: گناہ۔ **رسوا**: بدنام۔ **نثار**: قربان۔ **تیمار**: بیمار کی دیکھ بھال کرنے والا۔ **زنہار**: ہرگز۔ **میکدہ**: اللہ تعالیٰ کی محبت کا شراب خانہ۔ **گلفام**: پھول جیسا جسم۔ **ترکِ صورت**: چہرہ نہ دیکھو۔ **خار**: کانٹے۔ **کلفت**: تکلیف۔ **پر خاکی**: کانٹوں سے بھری ہوئی وادی۔

حسن سے بیزاری اور اختر کی تیمار داری

حسن سے جس کے میر تھے سرشار
اس کی صورت سے اب ہیں کیوں بے زار
عشق فانی کے لطف خواب ہوئے
سر پہ ہے بار معصیت کا سوار
ان کی نظروں میں میر ہیں رُسوا
دین و ایماں کیا تھا جن پہ نثار
میر رہتے ہیں عشق کے بیمار
مجھ کو پاتے ہیں اپنا وہ تیمار
ان بتوں کو نہ دیکھ تو زنہار
عقل کھو دے گا ورنہ تو اے یار
عشق لے چل بجانب صحرا
حسن والوں سے قلب ہے بے زار

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ ان تمام اشعار میں حسنِ مجازی کی فنائیت اور اس میں اپنی زندگی ضائع کرنے والے حضرات کو اپنے ایک خاص انداز میں ایک اہم نصیحت فرمارہے ہیں کہ اے حسنِ مجازی کے عاشق اور اس سے اپنے دل کو خوش کرنے والے تجھے چند ہی دن کے بعد اس سے بیزاری کا اظہار کرنا پڑے گا اور جو بظاہر تو لطف اور مزے اُٹھا رہا ہے وہ عنقریب خواب بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کی وجہ سے تجھے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہاں تک کہ خود وہ شخص جس کے ساتھ عشق لڑایا تھا اور اُس پر اپنا دین وایمان قربان کیا تھا اُس کی نگاہوں میں بھی سوائے ذلت ورسوائی کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُس نے مجھے اس بیماری میں مبتلا لوگوں کے لیے اور عشقِ مجازی کے بیماروں کے واسطے تیمارداری کرنے والا اور معالج بنادیا اور توفیقِ الٰہی سے اور اپنے مشائخ کی صحبت وخدمت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے احقر کو ایسے طریقے سکھلائے ہیں کہ جن پر عمل کرکے اس مرض میں مبتلا شخص بہت جلد شفا پا جاتا ہے۔ انہی میں سے ایک سب سے اہم علاج کا حصہ اور جزیہ ہے کہ ہرگز ان حسینوں کو نہ دیکھا جائے اور ان سے اپنی نظروں کو بچالیا جائے تاکہ دل بھی محفوظ رہے اور پھر آگے قدم نہ بڑھ سکے۔ قرآنِ کریم اسی کو یوں ارشاد فرماتا ہے:

تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَقۡرَبُوۡهَا'' کہ یہ اللہ کی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جانا۔ سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کس قدر رحیم و کریم ہیں کہ لاتقربوھا کا حکم دے کر اپنے بندوں پر عظیم الشان احسان فرمادیا ورنہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب وہ گناہوں کے قریب جاتا ہے تو پھر اُن میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اسی کو حضرت والا اپنے الفاظ میں یوں فرماتے ہیں کہ لاتقربوھا کی لا ہٹنے سے تعملوھا ہوجائے گا یعنی قریب جانے سے اس عمل میں جلد ابتلاء بھی ہوجائے گا۔ اس لیے ان حسینوں کو نہ دیکھو کہ وہ آنکھوں کا زنا ہے اور نہ ان سے گفتگو کرو کہ وہ زبان کا زنا ہے اور نہ ان سے دل دل میں مزے لوٹو کہ دل کا زنا یہی مزے لوٹنا ہے۔

اس لیے اگر اس کا علاج کرنا چاہتے ہو تو اپنی نظر اور دل کو بچا کر رکھو ورنہ نظر پڑتے ہی یہ کیفیت ہوتی ہے جو دیوانِ متنبّی کے اس شعر میں ہے ؎

یَسۡتَأۡسِرُ الۡبُطَلَ الۡكَمِیَّ بِنَظۡرَةٍ
وَیَحُوۡلُ بَیۡنَ فُؤَادِهٖ وَعَزَائِهٖ

یعنی ایک نظر پڑتے ہی بڑا طاقتور، مضبوط، مسلح بہادر انسان بھی اُس کا قیدی ہوجاتا ہے اور پھر اُس کے صبر اور دل کے درمیان اُس کی وہ محبت اور عشق ایسا حائل ہوتا ہے کہ اگر صبر دل تک پہنچنا چاہتا ہے تو وہ اُسے پہنچنے نہیں دیتا بلکہ بیچ میں محبوب کی محبت کی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے ہزاروں لاکھوں ملامتیں بھی کی جائیں تو وہ بھی سب بے اثر ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس لیے یہ نظر بازی معمولی معاملہ نہیں ہے، یہ اتنا سنگین اور بھاری معاملہ ہے کہ جس کی وجہ سے آج بے شمار جوان اپنی جوانیوں کو تباہ و برباد کرچکے ہیں۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿مَا رَأَیۡتُ مِنۡ نَاقِصَاتِ عَقۡلٍ وَّ دِیۡنٍ اَذۡهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الۡحَازِمِ مِنۡ اِحۡدَا كُنَّ﴾

(صحیح البخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحیض الصوم، ج: ۱، ص: ۴۴)

اگرچہ وہ ناقصات العقل ہیں لیکن بڑے سمجھدار اور عقل مند انسان کی عقل کو لے اُڑتی ہیں۔ سو بہت خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنی نظر کو بچا کر دل کی حفاظت کرلے اور ان بتوں کی محبت کو دل میں جگہ نہ دے ورنہ عقل ٹھکانے نہ رہے گی اور دیوانوں اور پاگلوں کی طرح رات و دن بے چین اور پریشان پھرے گا۔ جیسا کہ حضرت والا کا شعر ہے ؎

صلہ عشقِ مجازی کا یہ کیسا ہے ارے ناداں
کہ عاشق روتے رہتے ہیں صنم خود سوتا رہتا ہے

ہاں! اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کا عشق جو کہ پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے اُسی شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جو کہ ان ظاہری حسن رکھنے والوں کو اپنا دل دیئے ہوئے نہ ہو اور اُن سے اس کا دل بے زار ہو تو پھر یہ ظاہری رونق اور چمک دمک کو

چھوڑ کر جنگلوں و بیابانوں اور دریاؤں اور صحراؤں کے کنارے جا کر اپنے اللہ کو پکارتا ہے۔ جس کو حضرت فرمار ہے ہیں اے میرے عشقِ مولا مجھے صحرا کی جانب لے چل کیونکہ میرا دل حسن والوں سے بیزار ہے۔

حضرت والا کی تربیت کی اہم باتیں

مے کدہ میر کا ہے ٹنڈو جام
اور صحرا وہاں کا ہے گُل زار
میر آفت ہے صورت گلفام
ترک صورت کرو یہ ہیں سب خار
ایسی عشرت کہ جس سے ہو کلفت
اپنی حسرت ہے اس سے بہتر یار
خار کھاتے ہیں میر کیوں گل سے
دے گی کیا ان کو وادی پُرخار
جب ملے مے حلال کی، پی لے
پڑ نہ پیچھے حرام کے زنہار
چند حسرت بھرے دلوں کے ساتھ
خوب گذریں گے تیرے لیل و نہار

ان اشعار کی تشریح سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ حضرت میر صاحب نے تحریر فرمایا ہے یہ اشعار حضرت والا دامت برکاتہم پر ریل گاڑی میں وارد ہوئے جبکہ حضرت اپنے بعض خاص احباب کی دعوت پر ٹنڈو جام تشریف لے جا رہے تھے جو سندھ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اسی لیے شعر میں حضرت والا نے اس طرح خطاب فرمایا کہ ٹنڈو جام یا اس جیسی رہنے کی جگہیں یہ تو اُن لوگوں کا میکدہ ہے اور بسنے اور رہنے کی جگہ ہے جن کو دنیا کی عمارتوں اور بلڈنگوں اور شاندار مکانات اور بنگلوں کے ساتھ تعلق اور وابستگی ہے اور اسی جگہ پر جو صحرائی علاقہ ہے جہاں ظاہری دنیاوی علائق اور روابط سے کنارہ کشی اور یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور دل دنیا کی ظاہری چیزوں کے ساتھ مربوط نہیں رہتا، اس کے متعلق حضرت فرماتے ہیں کہ وہاں کا صحرا گلزار ہے۔

پھر حضرت والا وہی نصیحت ارشاد فرماتے ہیں کہ صورت کے عشق کو چھوڑ دو ورنہ اس کی بدولت کلفت و زحمت مقدر بنے گی اور ایسی ظاہری عشرت کہ جس کی بدولت مستقبل تاریک ہوتا ہو اور زحمت و تکلیف کا سامنا کرنا

پڑتا ہو اُس کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوا کرتا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے راستے کا وہ غم وحسرت کہ جو عارضی اور وقتی ہوتا ہے لیکن اس کی بدولت دائمی اور ہمیشہ کی خوشی اور راحت میسر آتی ہے۔ وہ اس عشرت و راحت کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر اور اُس سے بڑھ کر ہے۔ بقول حضرت والا ؎

میں نے مانا ہے بہارِ عارضی تجھ کو لذیذ
دائمی راحت کی خاطر عارضی راحت کو چھوڑ

بھلا عقل سے سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص کانٹوں اور پھولوں میں سے کانٹوں کا انتخاب کر رہا ہو اور اپنے مستقبل کو ایک وادیٔ پُر خار بنا رہا ہو تو یہ کوئی عقل مندی اور سمجھداری کی بات ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو گل اور پھول عطا فرمائے ہیں کہ وقتی حسرت اور غم راہِ خداوندی کا اُٹھا کر اللہ تعالیٰ کے قرب کے پھول اپنے دل میں کھلا لو اور عارضی لذتوں میں پڑ کر جو صورتِ گل نظر آ رہی ہے جبکہ حقیقت میں وہ جھاڑیوں کا جنگل ہے اُس میں اپنے کو مت ڈالو ورنہ ہمیشہ کے لیے تباہی اور بربادی اور حسرت وافسوس مقدر بنے گا۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی صحیح محبت کی شراب تقسیم کی جاتی ہو اور اُس کے راستے کے غم اُٹھانے کی لذتیں میسر آتی ہوں وہاں جا کر شریک ہو جاؤ اور اُس شرابِ محبتِ خداوندی سے جتنا جی چاہے اُتنا پی لو اور جو بھی حق تعالیٰ کی جائز کردہ خوشیاں اور لذتیں ہیں اُن میں دل کھول کر اپنے ارمان نکال لو لیکن جیسے ہی حرام سامنے آئے تو اُس سے فوراً پیچھے ہٹ جاؤ اور یہ فیصلہ کر لو کہ کسی حرام لذت اور خوشی کی شراب کو پینا گوارا نہ کروں گا چاہے جان جاتی رہے۔

اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے اور شب و روز اللہ تعالیٰ کی محبت میں گزارنے کے واسطے یہ بات ضروری ہے کہ تم کچھ اللہ والوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرو اور اُن کے ساتھ اپنے رات و دن گزارو تو تم دیکھ لوگے کہ پھر اس راستے کی آسانی ہی نہیں بلکہ لذتوں سے لطف اُٹھاؤ گے اور بڑی خوبی سے تمہاری دنیاوی زندگی دین پر پابندی کے ساتھ گزر جائے گی مگر شرط یہی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے کچھ سچے عاشق حسرت بھرے دل لیے ہوئے نصیب ہو جائیں اور اُن کا ساتھ میسر آ جائے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کی یہ تمنا خود حضرت والا اور میر صاحب اور دوسرے متعلقین کے حق میں منجانب اللہ قبول ہوئی ہے کہ ہر وقت حسرت بھرے دل لیے ہوئے اللہ تعالیٰ کی محبت کے طلبگار عشاقِ خداوندی ہر وقت حضرت والا کے ساتھ نظر آتے ہیں اور سب مل کر اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت کے ترانے گاتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اس شعر میں حضرت کی یہی تمنا ہے ؎

سارے عالم کو مجنوں بنا کر
میرے مولا تیرے گیت گائیں

مقامِ مؤمن

یہ زمین و آسمان شمس و قمر
میری خاطر ہے جہانِ بحر و بر
ہے میرے ہی واسطے ان کا وجود
میں نہ ہوں گا ہوں گے یہ زیر و زبر

میر رکھا ہے کیا نظاروں میں

میر آؤ بھی گلعذاروں میں ہے کہاں چین بے قراروں میں
اِک حسیں ہو تو دل اسے دے دوں سخت مشکل ہے ان ہزاروں میں
خونِ ارماں سے قلب رنگیں کر میر رکھا ہے کیا نظاروں میں
ایک پل کو سکوں نہیں ملتا دیکھ بلبل کو ان بہاروں میں
اپنے قلب و نظر بچا لینا کون جیتا ہے ان سہاروں میں
دل خدا پر فدا کرو اخترؔ کچھ نہیں عارضی بہاروں میں

حسن فانی کے عاشق کو حرم میں بھی سکون نہیں ملتا

میر آؤ بھی گلعذاروں میں
ہے کہاں چین بے قراروں میں
اِک حسیں ہو تو دل اسے دے دوں
سخت مشکل ہے ان ہزاروں میں
خونِ ارماں سے قلب رنگیں کر
میر رکھا ہے کیا نظاروں میں
ایک پل کو سکوں نہیں ملتا
دیکھ بلبل کو ان بہاروں میں
اپنے قلب و نظر بچا لینا
کون جیتا ہے ان سہاروں میں
دل خدا پر فدا کرو اخترؔ
کچھ نہیں عارضی بہاروں میں

اس نظم کے اشعار کا مضمون بھی تقریباً حضرت والا کے باقی نظموں کے اشعار کے مفہوم کی طرح ہے۔ ارشاد فرمارہے ہیں کہ اے میر! یعنی اے مردِ مؤمن ومسلم اور اے اللہ کے چاہنے والے! اور دین پر چلنے کا شوق رکھنے والے! اگر تجھے دنیا وآخرت کا قرار اور سکون چاہیے تو گلعذاروں یعنی اللہ والوں میں آجا اور ایک ذاتِ وحدہ لاشریک لہ کو دل دے دے۔ اپنے سب ناجائز ارمانوں کا خون کرکے اپنے قلب کو خون میں رنگ دے کیونکہ ان مردہ حسینوں کو دل دینے میں اس پہلو سے بھی سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے کہ آج کسی ایک حسین وحسینہ پر فریفتہ اور عاشق ہوئے تو کل کو دوسرے رنگ وشکل والا سامنے ہوتا ہے اور پھر اگلے دن ایک تیسرا سامنے ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ اسی طرح شکلوں کا عاشق ان ہزاروں مختلف شکلوں میں پریشان ہوتا رہتا ہے۔ اور اُن کے نظارے کرکے اپنے دل ودماغ کو بے چین کرکے رکھ دیتا ہے۔ اسے ایک لمحہ سکون میسر نہیں آتا۔

حضرت والا کے اس شعر کی پوری تشریح سمجھنی ہو تو حرمین میں جاکر ایسے شخص کے حالات کا پتہ لگایا جائے کہ جو وہاں پہنچ کر بھی بیت اللہ کے سامنے بیٹھے ہونے کے باوجود دنیا بھر سے آنے والی مختلف رنگ وشکل کی حسین وجمیل عورتوں کے حسن وجمال کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اور وہ اس قدر بے چین ہوجاتا ہے کہ نہ اُس کا عبادت اور تلاوت میں دل لگتا ہے اور نہ ذکر ومناجات سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات نے حضرت والا کو خطوط لکھ کر اپنی اس بیماری کا علاج کرایا اور شفایاب ہونے کے بعد اُن کے دل کو ایسا سکون وقرار میسر آیا اور ایسی بہار ملی جسے بہارِ بے خزاں کہا جاسکتا ہے۔ بلبل کو موسمِ بہار میں عارضی بہار اور خوشی مل جاتی ہے لیکن وہ بچاری موسمِ خزاں آتے ہی اُس بہار کے جانے سے اور اُس کو دل دینے کی وجہ سے ہونے والی تکلیف کی بدولت روتی پھرتی اور آنسو بہاتی ہے۔ یہی حال اُس شخص کا ہوتا ہے جو اپنی نظر نہیں بچاتا اور اِدھر اُدھر نظریں ڈالتا پھرتا ہے اور ایک کو دل میں بسانے کے بجائے ہزاروں شکلوں کی طرف للچاتا رہتا ہے۔

غور سے سن لیجئے! یہ دنیا کے سارے سہارے چاہے وہ معشوق ومعشوقہ کے ہوں یا مال ودولت کے ہوں ایک دن سب چھوٹ جائیں گے۔ یہ سب عارضی اور فانی ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ پہ دل دینا چاہیے اور اسی پر فدا ہونا چاہیے کہ اُسے کبھی فنا لاحق نہیں ہوتی۔ جو دنیا کی عارضی رنگت وچمک دمک پر دل دیتا ہے تو جب مرتے وقت میں وہ سب سہارے اُسے چھوٹتے نظر آتے ہیں جن پر وہ سہارا لگائے ہوئے تھا تو پھر اُس کی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ بالکل وہی بلبل والا حال اُس کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت والا کے اس شعر میں اس کی ترجمانی ہے ؎

درسِ عبرت ہے چشمِ عنادل
کس طرح نم ہے غم سے خزاں میں

لبِ دریا ہے کوہ کا دامن

جو حسیں کل تھے رونقِ گلشن
لگ رہے ہیں وہ آج دشت و دمن
میں فدا قلب و جان سے اُن پر ہوں
جن کی صحبت سے دل ہوا روشن
رب ہے کافی میری حفاظت کو
لاکھ چاہے بُرا اگر دُشمن
کر حفاظت نظر کی اے ظالم
کر نہ ویراں قلب کا گلشن
حسن فانی ہے گر نہ مانے تو
حسن کو جا کے دیکھ درِ مدفن
یاد ان کی ہے چشم بھی ہے نم
لب دریا ہے کوہ کا دامن
مری قسمت کا میر کیا کہنا
ہاتھ میں گر نبی کا ہو دامن
راہ حق کا ہر ایک خار اخترؔ
رشک ریحان و سنبل و سوسن

مشکل الفاظ کے معانی:۔رونقِ گلشن: باغ کی رونق۔دشت: جنگل۔دمن: کوڑا پھینکنے کی جگہ۔دامن: اتباع سنت مراد ہے۔خار: کانٹا۔ریحان و سنبل و سوسن: پھولوں کے نام ہیں۔

آج رونقِ گلشن چہرے کل ننگ دشت و دمن ہو جائیں گے

جو حسیں کل تھے رونقِ گلشن
لگ رہے ہیں وہ آج دشت و دمن
میں فدا قلب و جان سے اُن پر ہوں
جن کی صحبت سے دل ہوا روشن
رب ہے کافی میری حفاظت کو
لاکھ چاہے بُرا اگر دُشمن
کر حفاظت نظر کی اے ظالم
کر نہ ویراں قلب کا گلشن
حسن فانی ہے گر نہ مانے تو
حسن کو جا کے دیکھ درِ مدفن

ان تمام اشعار میں حضرت والا اُسی مہلک بیماری اور وبائی مرض کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں اور اُس کے نقصانات بھی بیان فرما رہے ہیں۔خاص طور پر یہ حسین اور خوبصورت چہرے جو کل تک رونقِ گلشن نظر آتے ہیں چند

دن گزرنے کے بعد جنگل کی جھاڑیوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرح بے حیثیت ہو جاتے ہیں جن کی طرف کسی کو کوئی التفات نہیں رہتا۔

اس کے برخلاف وہ اللہ کے نیک صالح بندے کہ جن کے قلوب ایسے منور اور روشن ہوتے ہیں کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے والے اور ان کے ساتھ خاص استفادے کا تعلق رکھنے والے لوگ اپنے دل میں ایک خاص جلا اور روشنی پاتے ہیں اور ان کی صحبت تاریک دلوں کے لیے اجالے اور روشنی کا کام دیتی ہے ایسے لوگوں سے دوستی رکھنا اور ان پر فدا ہونا سمجھداری اور عقل مندی کی نشانی ہے کہ ان کی بہار کبھی خزاں کا شکار نہیں ہوتی اور ان کے چمکتے چہرے دشت و دمن کے مانند نہیں ہوتے بلکہ دن بدن ان کے چہرے کی ضیاء اور تابانی بڑھتی جاتی ہے۔

ہاں کبھی ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ ان اولیاء اللہ کے ساتھ رہنے کی صورت میں جب ان کی نظرِ عنایت اور نظرِ التفات زیادہ پڑنے لگتی ہے تو بعض حاسدین دشمن وہاں سے ہٹانے اور اولیاء اللہ سے دور کرنے کے لیے کوششوں میں لگ جاتے ہیں جیسا کہ حضرت والا کے ساتھ اس طرح کی باتیں پیش آئی تھیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کی حفاظت فرمائیں تو پھر کسی بڑے سے بڑے دشمن کی دشمنی نقصان نہیں پہنچا سکتی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے ''الیس اللہ بکاف عبدہ'' کہ کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں یعنی ضرور بضرور تن تنہا اللہ اپنے بندے کو کافی ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ساری امت کسی ایسی چیز سے نقصان پہچانے پر جمع ہو جائے جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر نہیں کی ہے تو وہ نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اگر ساری امت کسی ایسی چیز سے نفع پہنچانے پر اکھٹی ہو جائے جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر نہیں فرمائی تو وہ نفع نہیں پہنچا سکتی:

﴿وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى أَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ﴾

(سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة)

اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾

(سورة آل عمران، آیت: ۱۲۰)

ترجمہ: کہ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو دشمنوں کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی اس لیے آدمی کو دشمنوں کی دشمنی اور حاسدین کے حسد سے ڈرنا نہیں چاہیے۔

اس کے بعد حضرت والا وہی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ اپنی نظر کی حفاظت کرلو ورنہ دل کا گلشن ویران ہو جائے گا اور حسن فانی پر اپنا دل دینے سے سوائے حسرت و افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اس کا انجام ایک دن قبر میں جا کر دفن ہو جانا اور مٹ کر فنا ہو جانا ہے۔

راہِ حق کے کانٹے رشک ریحان و سنبل ہیں

یاد ان کی ہے چشم بھی ہے نم
لب دریا ہے کوہ کا دامن
مری قسمت کا میر کیا کہنا
ہاتھ میں گر نبی کا ہو دامن
راہ حق کا ہر ایک خار اختر
رشک ریحان و سنبل و سوسن

یعنی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرتا ہوں کہ جیسا دریا کے کنارے پر کسی پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر تمام دنیا کے علائق اور روابط سے یکسو ہو کر ایسی فضاؤں میں اللہ کو پکارنا اور وہاں آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کرنا کہ گویا خلوت و یکسوئی اس درجہ نصیب ہو کہ غیر اللہ کے ساتھ دل کا کسی طرح کا کوئی تعلق ہی قائم نہ رہے جس کو حضرت والا نے اپنے ایک خاص انداز میں یوں ذکر فرمایا۔

خلوت غار حرا سے ہے طلوع خورشید
کیا سمجھتے ہو تم اے دوستو ویرانوں کو

اسی لیے اس طرح کے کلام کا منشا خلوت و یکسوئی کی پرفضا جگہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے ساتھ پورے اخلاص اور حضوری کو لیے ہوئے عبادت کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اور کبھی کبھی حضرت والا ایسے مقام پر باقاعدہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔

لیکن اس سے کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے پھر ایسے طریقوں کو اختیار کرنا ایک مسلمان کے لیے کس طرح درست ہو سکتا ہے کیونکہ یہاں رہبانیت سے وہ عیسائیوں والی رہبانیت مراد نہیں ہے بلکہ ایسی تنہائی، خلوت و یکسوئی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کی اتباع کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اختیار کی جائے یعنی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے گھر والوں اور متعلقہ افراد کے جملہ حقوق اور ضروریات پوری کرتے ہوئے گاہ بگاہ ایسی جگہوں پر جا کر اپنے اللہ کو یاد کرنا یہ نہ رہبانیت ہے اور نہ اسلام میں ممنوع ہے بلکہ ایسا شخص خوش قسمت اور خوش نصیب ہے جو اپنی خلوتوں اور جلوتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو لیے ہوئے ہو اور دین کے راستے پر مضبوطی سے گامزن ہو اور اس کی ہر مشقت و تکلیف کو آسانی کے ساتھ برداشت کرتا ہوا یہ راستہ طے کر رہا ہو اگرچہ راستے میں کانٹوں سے بھی گزرنا پڑے لیکن

انہیں بھی وہ پھول سمجھ کر گوارا کر جاتا ہو کیونکہ یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے راستے کا ہر کانٹا دنیا کے مختلف قسم کے پھولوں کے لیے باعثِ رشک ہے یہاں تک کہ راہِ حق کا وہ خار رشکِ ریحان و سنبل و سوسن ہو جاتا ہے کیونکہ ان کانٹوں سے گزر کر جنت کی ابدی اور ہمیشہ باقی رہنے والی خوشیوں کو پالینا میسر ہوتا ہے جب کہ ان پھولوں کی خوشبو اور رونق اور ان کی آب و تاب محض ایک وقتی اور عارضی ہوتی ہے جو موسم کے بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہے جیسا کہ حضرت والا کے اسی نظم سے متصل یہ دو شعر ہیں ؎

جہانِ رنگ و بو میں رنگ گوناگوں کا منظر تھا
مگر ہر اہل رنگ و بو کا حال رنگ ابتر تھا
نظام رنگ و بو سے ہو کے جو مافوق جیتا تھا
اسی مست خدا کا رنگ ہر دم رنگ خوشتر تھا

اس لیے جو سمجھ دار انسان ہے وہ اللہ کے راستے کی تکلیفوں کو راحت سمجھ کر برداشت کر جاتا ہے اور اس کے تلخ اور کڑوے گھونٹوں کو شیر و شکر کی طرح پی جاتا ہے کیونکہ اس کی انجام پر نظر ہوتی ہے اسی لیے حسینوں سے نظریں بچانے میں بھی کتنے ہی کانٹوں سے گزرنا پڑے اور کیسے ہی دل پر صدمے اٹھانے پڑیں مگر اللہ کے سچے عاشق کے لیے یہ سب کچھ بالکل آسان اور سہل ہو جاتا ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ لذیذ اور لذیذ تر بن جاتا ہے ؎

خوشی کو آگ لگا دی خوشی خوشی ہم نے
خوشا نصیب کسی کا ملا ہمیں غم ہے

اور حضرت والا کا اسی مضمون پر دوسرا ایک شعر ؎

نفس کے گندے تقاضوں سے جو ان بن ہو گئی
روح میری سنبل و ریحان و سوسن ہو گئی

مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

زباں سے تو اے دوست شہبازیاں ہیں
بہ باطن مگر آہ خفاشیاں ہیں

حقارت سے مت دیکھ ان عاصیوں کو
کہ توبہ کی برکت سے درباریاں ہیں

جو پرہیز کرتا نہیں معصیت سے
انہیں راہ میں سخت دشواریاں ہیں

گناہوں کے اسباب سے دور ہو گے
تو منزل میں ہر وقت آسانیاں ہیں

دوائے دل سالکاں عشق حق
دلوں میں بہت گرچہ بیماریاں ہیں

رہ حق میں ہر غم سے کیوں ہے گریزاں
رہ عشق میں کب تن آسانیاں ہیں

یہ خون تمنا کا انعام دیکھو
جو ویرانیاں تھیں وہ آبادیاں ہیں

فدا ان کی مرضی پہ اپنی رضا کر
فقیری میں دیکھے گا سلطانیاں ہیں

ترے ہاتھ سے زیر تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں

جو پیتا ہے ہر وقت خون تمنا
اسی دل پہ نسبت کی تابانیاں ہیں

تجلی ہر ایک دل کی اختر الگ ہے
مہربانیاں، جیسی قربانیاں ہیں

مشکل الفاظ کے معانی: **شہبازیاں**: نفس اور شیطان۔ **باطن**: مراد دل ہے۔ **خفاشیاں**: چمگادڑ جیسی خصلتیں۔ **عاصیوں**: گنہگار۔ **معصیت**: گناہ۔ **راہ**: اللہ تعالیٰ کا راستہ۔ **سالکاں**: اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرنے والا۔ **گریزاں**: بچنا۔ **آسانیاں**: بدن کی راحتیں۔ **سلطانیاں**: بادشاہتیں۔ **تابانیاں**: روشنیاں۔ **تجلّی**: چمک، روشنی۔

ظاہر میں شاہبازیاں اور باطن میں خفاشیاں

زباں سے تو اے دوست شہبازیاں ہیں
بہ باطن مگر آہ خفاشیاں ہیں

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاللهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ﴾

(سورة المائدة، آيت: ۹۹)

اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں جو تم ظاہر کرتے ہو اور اس کے بھی جانتے ہیں جسے تم چھپاتے ہو اور دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾

(سورة النمل، آيت: ۷۴)

بے شک آپ کا رب اس کو بھی جانتا ہے جس کو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور اسے بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں اس مضمون کی قرآن کریم میں مختلف آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ تم جن چیزوں کو چھپاتے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ویسی ہی ہیں جیسا کہ وہ چیزیں جن کو تم ظاہر کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چھپی ہوئی چیز چھپی ہوئی نہیں اور کوئی مخفی اور پوشیدہ شے پوشیدہ نہیں ہے اس لیے انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات اور اس کی دل کی دھڑکنوں میں آنے والی کوئی نقل وحرکت ہر ایک سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

پس وہ لوگ جو بظاہر زبان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عاشق ہے اور حی وقیوم ذات خداوندی پر فدا ہونے والا اور مر مٹنے والا ہے اور اپنے اندر شہباز کی خصلت رکھتا ہے کہ جس کا کام زندہ جانوروں پر گرنا اور ان کا شکار کرنا ہوتا ہے اور وہ مردار کی طرف قطعاً مائل نہیں ہوتا اور اپنی پرواز بلند رکھتا ہے اور اپنا شیوہ وعادت بلندی میں رہنے کو بنائے ہوئے ہوتا ہے۔

لیکن یہ لوگ اندر اندر سے بالکل اس سے مختلف ہوتے ہیں اور اپنے دل میں مردار کو رچائے اور بسائے رہتے ہیں اور ان پر گرتے ہیں اور انہیں کو اپنا دل دے کر خود اپنی تباہی اور بربادی کو دعوت دیتے ہیں اور اپنی چمگادڑ والی خصلت سے باز نہیں آتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کی تجلیات اور انوارات سے اپنے قلب کو منور وروشن کرنے کے بجائے مردہ لاشوں پر مر کر اپنے دل کو ظلمت کدہ بنا دیتے ہیں اور پیشاب و پاخانے کے مقام پر اپنے دین و ایمان اور عقل ودماغ کو لگا کر ان کو گندگی اور غلاظت سے بھر دیتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ اور صاف شفاف ذات کے متجلی ہونے کا مقام ہے اور اس طرح اپنی روشنی اور اجالے کے دشمن بن کر ظلمت وتاریکی میں پڑ جانا پسند کرتے ہیں اگر یہ بات ظاہر ہے کہ محض زبانی جمع خرچ اور قیل وقال باطن کو منور اور روشن کرنے کے لیے کارآمد اور

کافی نہیں، ہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کی محبت والفت کا مرکز ہو اور اس کو صرف حق تعالیٰ کے لیے سارے غیر سے خالی کرلیا گیا ہو تب کہیں جا کے شہبازی کا فن اور ہنر حاصل ہوسکتا ہے۔

عاصیوں کی تحقیر حرام ہے

حقارت سے مت دیکھ ان عاصیوں کو
کہ توبہ کی برکت سے درباریاں ہیں

خلاصہ شعر یہ ہے کہ کسی گناہگار پر ایک لمحہ کے لیے بھی حقارت کی نظر ڈالنا جائز نہیں اس لیے کہ جس دم گناہگار کو توبہ کی توفیق مل جاتی ہے تو وہ اسی لحظہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے اور حق تعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب قرار پاتا ہے جب کہ دوسری جانب کتنا ہی بڑے سے بڑا عابد و زاہد انسان ہو وہ اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی عبادات اللہ کے یہاں قبول ہیں یا نہیں؟

ثانیاً وہ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان اعمال پر مرتے دم تک قائم رہ سکتا ہوں کیونکہ اس کا علم کسی کو نہیں۔

ثالثاً یہ بات کہ ممکن ہے اس گناہ گار کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اتنا محبوب اور پسندیدہ ہو کہ وہ اس کی بخشش اور مغفرت کا سامان ہو جائے جب کہ اس کے برخلاف مجھ سے کوئی ایسا نامناسب اور غلط کام ہوا ہو جس کی وجہ سے میں اللہ کے دربار میں مستحق سزا اور عقاب قرار دیا جا چکا ہوں لہٰذا ایک مومن کے لیے جس کو حق تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے کسی بھی قیمت پر اپنے مسلمان گناہگار بھائی کو حقیر سمجھنا جائز نہیں ہے ہاں البتہ یہ الگ بات ہے کہ ان کو گناہوں اور معصیتوں پر نکیر ضرور کی جائے گی مگر بقول حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ کے منکر پر نکیر بلا تحقیر ہونی چاہیے بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اس عمل سے تو ناپسندیدگی ہو مگر عامل سے نہیں یعنی معصیت سے نفرت ہو عاصی سے نہیں ہونی چاہیے۔ باقی توبہ کے عنوان پر مختلف دوسرے مقامات پر آیات و آحادیث ذکر کی جا چکی ہیں۔

معصیتوں سے راہ میں دشواریاں ہوتی ہیں

جو پرہیز کرتا نہیں معصیت سے
انہیں راہ میں سخت دشواریاں ہیں
گناہوں کے اسباب سے دور ہو گے
تو منزل میں ہر وقت آسانیاں ہیں

صاحبو! کسی کے پاس کتنا ہی بڑا شیخ اور مرشد ہو اور وہ کیسا ہی خانقاہوں اور تبلیغ میں چلے لگا رہا ہو لیکن اگر وہ گناہوں اور گناہوں کے مقدمات و اسباب سے پرہیز نہیں کرے گا تو اسے منزل تک پہنچنے کے لیے راستے میں

سخت دشواریوں کا سامنا ہوگا ہاں اگر گناہوں سے بچا جائے اور گناہوں کے اسباب سے بھی دور رہا جائے تو پھر بڑی آسانی سے بہت جلد یہ راستہ طے ہو جاتا ہے اور سالک اپنی منزل مقصود یعنی اللہ کا قرب پالیتا ہے۔

کئی لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ جو پوری زندگی دین دار کہلاتے رہتے ہیں اور دین کی محنتوں میں ہر وقت بہت آگے نظر آتے ہیں لیکن ان کی گھر بار کی زندگی مختلف قسم کے گناہوں میں گھری ہوتی ہے تو وہ دین کے اعتبار سے جہاں شروع میں تھے وہاں کے وہاں رہتے ہیں اور آئے دن مصائب اور حوادث اور ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ کی نافرمانیوں کے وجود میں آنے کے سبب وہ اپنے اوپر خصوصی رحمت خداوندی کے نزول سے مانع اور رکاوٹ بن جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کی یہ پریشانی حد سے بڑھ کر دین میں شکوک وشبہات کا سبب بن جاتی ہے۔

اس لیے میرے بھائیو! میری یہ نصیحت کبھی نہ بھولنا کہ قرآن کریم کے بالکل شروع سے لے کر اخیر تک ایک یا دو جگہ نہیں بلکہ بہت بڑی تعداد میں ہمارے دنیا و آخرت کے جملہ مسائل کا حل پیش کرنے والی آیات نازل ہوئی ہیں اور ان سب کی جڑ تقویٰ قرار دیا گیا ہے اور یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ تقویٰ کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی نافرمانی اور گناہ سے بچنے پر ہے خواہ زیادہ نوافل اور مستحبات نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، آمین۔

عشق حق دوائے دل سالکاں ہے

عشقِ حق دوائے دل سالکاں
دلوں میں بہت گرچہ بیماریاں ہیں

یہ حضرت مولانا رومی والا طریق ہے کہ اگر کسی جنگل کو قابلِ کاشت بنانا ہو تو بجائے اس کے کہ ایک ایک جھاڑی اور درخت کو اکھاڑ کر صاف کیا جائے اور پھر قابل کاشت بنایا جائے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ جنگل میں آگ لگا دو یہاں تک کہ سب جھاڑ جھنکاڑ جل کر راکھ ہو جائیں، اس طریقہ میں زیادہ محنت بھی خرچ نہیں ہوگی اور راکھ کھاد کا کام بھی دے گی۔

ٹھیک اسی طرح جن کے دلوں میں بہت سی بیماریاں ہیں اگر ان کو ایک ایک کر کے نکالنا شروع کیا جائے تو اس کے لیے بڑی محنت و مشقت اٹھانی پڑے گی اس لیے عمدہ اور بہتر صورت یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت کی آگ لگا دو تا کہ سب بیماریاں اس آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں اور کھاد کا کام بھی دیں جس کی صورت یہ ہوگی کہ جب دل میں حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی تو کل تک جس دنیوی معشوق کے لیے تڑپتا تھا اور اس کے لیے غم اٹھاتا تھا آج اس کا اِمالہ ہو جانے اور رخ پھر جانے کی صورت میں اپنے محبوبِ حقیقی اللہ رب العزت کی ذات کے لیے

راتوں کو اٹھ کر روئے گا اور تڑپے گا اور اس کو راضی کرنے کے لیے اس کی راہ کے غم برداشت کرے گا۔ اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ سالکین کے دلوں کی سب سے بہترین دوا اللہ تعالیٰ کا عشق ہے جس کی بدولت دل کی ساری بیماریاں بہت جلد آسانی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔

میری ویرانیاں ہی میری آبادیاں ہیں

فدا ان کی مرضی پہ اپنی رضا کر
فقیری میں دیکھے گا سلطانیاں ہیں
ترے ہاتھ سے زیر تعمیر ہوں میں
مبارک مجھے میری ویرانیاں ہیں
جو پیتا ہے ہر وقت خون تمنا
اسی دل پہ نسبت کی تابانیاں ہیں
تجلی ہر ایک دل کی اختر الگ ہے
مہربانیاں، جیسی قربانیاں ہیں

دنیائے عشق و محبت کا یہ اصول اور ضابطہ ہے کہ اس میں بڑے ناز اٹھانے پڑتے ہیں اور محبوب کے قرب کو حاصل کرنے کے لیے بہت سے غموں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے، تن آسانی کے ساتھ عشق کا راستہ کبھی طے نہیں ہوتا۔ پس وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے حقیقی عشاق بننا چاہتے ہیں ان کو حق تعالیٰ کے راستے کے غم اٹھانے پڑیں گے اور اپنی دنیوی ناجائز اور حرام تمناؤں کا خون کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے نتیجے میں دل ٹوٹ کر چورا ہو جائے گا اور دنیا کا بھی یہ ضابطہ ہے کہ جو گھر گر جاتا ہے یا بستیاں ویران ہو جاتی ہیں تو پھر ان کو نئے سرے سے جدید نقشوں کے ساتھ نہایت عمدہ اور اچھے انداز میں تعمیر کیا جاتا ہے اور وہی جو کل تک ویرانیاں تھی اب آبادیوں کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

پس وہ دل جس کو کسی نے اللہ کے لیے توڑا ہو اور وہ اللہ کے لیے ویران ہوا ہو اور اس کے درودیوار ٹوٹ ٹوٹ کے چورا چورا ہو چکے ہوں تو پھر حق تعالیٰ شہنشاہِ کائنات اسے اپنے خاص دست کرم و عنایت سے اپنی شایان شان تعمیر فرماتے ہیں اور اسے اس قابل بناتے ہیں کہ اس میں پھر اللہ تعالیٰ سما سکے اور اپنی تجلیات خاصہ کے ساتھ متجلی ہو سکے جس کی بدولت اس مردمومن کو اللہ تعالیٰ پر فدا ہونے اور اپنا دل توڑنے کے نتیجے میں خدا تعالیٰ مل جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جسے خدا مل جائے تو پھر اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی فقیری میں بھی بادشاہی کا مزہ نصیب ہوگا اور اس کی نگاہ میں دنیا کی ظاہری سلطنت و حکومت کی کوئی وقعت اور اہمیت نہ رہے گی۔

اسی کو حضرت والا نے بڑی عمدہ مثال سے یوں سمجھایا کہ اگر کبھی کسی ملک میں کوئی آسمانی آفت آ جانے کی وجہ سے کسی گاؤں یا شہر کے کچھ مکانات گر گئے ہوں تو حکومتِ وقت کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم ان گرے ہوئے مکانوں کی تعمیر شاہی خزانے سے کرائیں گے لہٰذا وہ دل جس کو بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے توڑ رہا ہو یعنی کہ دل کے ناجائز ارمانوں اور حرام تمناؤں کو پورا نہ کر کے اس کا خون کر رہا ہو تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس ٹوٹے ہوئے دل میں خود اپنی شان کے مطابق موجود ہو جاتے ہیں جیسا کہ روایت میں ہے:

«اَنَا عِنْدَ الْمُنْکَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ لِاَجْلِیْ»

(المرقاة، کتاب الجنائز، باب عیادة المریض)

کہ میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتا ہوں۔

اس لیے مسلمانوں کو اور بالخصوص سالکین کو دل توڑ دینے والی چیزوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیے مثلاً کسی کی طرف سے طعن وتشنیع ہو یا دین کی بنیاد پر ملامت کا سامنا ہو اور نفرت وحقارت کا سلوک ہو یا اپنی نظر اور دل بچانے میں اور حسین شکلوں کو بازاروں اور ٹی وی، وی سی آر اور انٹرنیٹ وغیرہ پر نہ دیکھنے سے جتنا بھی دل پر زور پڑے اسے گوارا کر لینا چاہیے اور خوش ہونا چاہیے کہ اس کی بدولت مجھے میرے خالق ومالک کی رضا حاصل ہو رہی ہے کیونکہ جو جس قدر خونِ آرزو پیتا ہے اسے اتنی ہی نسبتِ خداوندی میں جلا اور روشنی نصیب ہوتی ہے اور قرب ومعرفتِ خداوندی کا خاص مقام ملتا ہے اور ایمان میں عجیب قسم کی حلاوت ومٹھاس نصیب ہوتی ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا صرف جو چکھنے والا ہے وہی اس کی کیفیت کا صحیح ادراک کر سکتا ہے۔ جیسا کہ عربی کا مشہور مقولہ ہے: ''مَنْ لَمْ یَذُقْ لَمْ یَدْرِ'' کہ جو نہ چکھے وہ نہ جان سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ خود اہل اللہ کے مقاماتِ قرب جدا جدا ہوتے ہیں کیونکہ جیسی جس کی قربانیاں اور مجاہدات ہوتے ہیں ویسی ہی حق تعالیٰ کی طرف سے مہربانیاں اور انعامات عطا کیے جاتے ہیں یہی تو راز ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے اور پھر جو ان سے جتنا قریب ہو درجہ بدرجہ معاملہ ہوتا ہے اسی کو حضرت والا نے یوں فرمایا کہ ہر ایک دل کی تجلی اور قرب جدا جدا ہے کیونکہ جیسی جس نے قربانیاں پیش کی ہیں ویسی اسے اللہ کی طرف سے مہربانیاں حاصل ہوئی ہیں۔

مگر اس موقع پر ہرگز یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں ہماری قربانیوں کا نتیجہ ہے کیونکہ پورے عالم میں جس بندے کو بھی جو کچھ خیر وخوبی اور نیکی وبھلائی حاصل ہو رہی ہے قرآن وسنت کی روشنی میں صرف اسے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی طرف ہی منسوب کیا جانا صحیح اور درست ہے اور وجہ یہ ہے کہ خود وہ قربانیاں بھی تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اسی کی توفیق سے انسان کو دین پر استقامت اور جمنا نصیب ہوتا ہے اور مجاہدات

کی ہمت عطا ہوتی ہے ورنہ اگر فضل الٰہی شامل نہ ہوتو ہمارے بس میں ایک معمولی سی نیکی کرنا بھی نہیں ہے اس لیے یہ جملہ محض سبب کے درجے میں سنتُ اللہ کا بیان ہے یعنی جسے اللہ تعالیٰ دنیا میں قربانیاں پیش کرنے کی توفیق دے دیتے ہیں پھر اسی پر اللہ کی مہربانیاں بھی اترتی ہیں۔

جیسا کہ احقر کو حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی کا واقعہ یاد آیا کہ ایک دن شیطان ان کو بہکانے کے لیے آیا اوران سے یوں کہا کہ تم ہماری بارگاہ میں مقرب اور محبوب قرار پا چکے ہواس لیے اب تم سے تمام عبادات معاف کر دی گئیں ہیں، تو وہ فوراً بولے، کہ مردود یہاں سے دور ہوجا، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تاحیات عبادات معاف نہیں کی گئیں تو مجھ سے کیسے معاف کردی گئیں اس پر شیطان بولا، کہ جا عبدالقادر تمہیں تمہارے علم نے بچالیا، تو شاہ عبدالقادر بولے کہ مردود جاتے جاتے بھی مجھے بہکانا چاہتا ہے کون کہتا ہے کہ مجھے میرے علم نے بچایا میرے اللہ کے فضل نے مجھے بچایا ہے اوراس طرح شیطان ناکام ہوگیا۔

اس لیے جو بھی خیر وجود میں آئے اس سب کی نسبت حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے صرف اللہ کے فضل کی جانب کی جانی چاہیے چنانچہ حضرت والا کی کتابوں میں بحوالہ یہ بات موجود ہے کہ:

﴿اِنَّ بَعْضَ الْمُغْتَرِّیْنَ مِنَ الصُّوْفِیَآءِ وَالسَّالِکِیْنَ یَنْسِبُوْنَ کَمَالَاتِہِمْ اِلٰی مُجَاھَدَاتِہِمْ فَھٰذَا عَیْنُ الْکُفْرَانِ﴾

(بیان القرآن، مسائل السلوک)

جو بعض سالکین اپنے کمالات کو اپنے مجاہدات کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ عین اللہ کی نعمت کی ناشکری ہے۔

زمیں کو کام ہے کچھ آسماں سے

کیا ہے رابطہ آہ و فغاں سے
زمیں کو کام ہے کچھ آسماں سے

ندامت تجھ پہ ہو رحمت خدا کی
دلا دی مغفرت ربِ جہاں سے

تو کرلے خوش خدائے گلستاں کو
نہیں پالا پڑے گا پھر خزاں سے

وہ چھا جاتا ہے ہر اہلِ لغت پر
بیاں کرتا ہے جو دردِ نہاں سے

اگر مطلوب ہے دردِ محبت
تعلق کر گروہ عاشقاں سے

ہزاروں غم اٹھا کر جانِ سالک
مقرب ہو گئی مولائے جاں سے

سنو پیغامِ اخترؔ گوشِ دل سے
فدا ہو تم خدا پر قلب و جاں سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔**اھلِ لغت**: زبان کا ماہر۔ **دردِ نہاں**: اللہ تعالیٰ کی محبت کے درد کے ساتھ۔ **مطلوب**: چاہت۔ **گروہِ عاشقاں**: اللہ والوں کا طبقہ۔ **سالک**: اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرنے والا۔ **مقرب**: قریب۔ **مولائے جاں**: اللہ تعالیٰ۔ **گوشِ دل سے**: دل کے کان سے۔

اس نظم کے اشعار کے مضامین قدرے مشترک ما قابل میں ذکر کردہ مضامین سے ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جب بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کی یاد میں زمین پر رہتے ہوئے آہ وفغاں کرتا ہے تو اس کا رابطہ آسمان سے جڑ جاتا ہے۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہیے کہ عرش تک پہنچ جاتا ہے اور درمیان کے جتنے حجابات اور پردے ہیں وہ اس کے درمیان سے اور اللہ کے درمیان سے اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اسی کو حضرت والا نے بعض مقامات پر اس طرح ارشاد فرمایا کہ یہ زمین رشکِ آسمان بن جاتی ہے۔ کیونکہ آسمان میں ستارے سجے ہوئے ہیں اور یہ زمین ندامت کے آنسوؤں سے مزین ہوتی ہے۔ جن کی قیمت آسمان کے ستاروں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسی طرح یہ زمین ندامت کے آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہے اور آسمان میں ملائکہ اور فرشتے گو کہ عبادت کرتے ہیں مگر ندامت کے آنسوؤں کے خزانے سے آسمان خالی ہے۔ یہ ایسا قیمتی موتی ہے جو صرف زمین کے پاس ہے، آسمان کے نہیں۔ بہرحال یہ آہ وفغاں انسان کو عالمِ بالا سے جوڑ دیتی ہے اور اس طرح زمین پر رہتے ہوئے بندۂ مؤمن آسمانوں کی رفعتوں اور بلندیوں میں پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت والا فرماتے ہیں کہ میری گناہوں پر حاصل ہونے والی ندامت کس قدر قیمتی چیز ہے کہ اُس کی برکت سے ربِ جہاں سے مغفرت کا تحفہ حاصل ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑا عقل مند اور سمجھدار وہی انسان ہے کہ جو ربِ جہاں کو راضی کرلے اور خدائے گلستاں کو خوش کرلے تو پھر اُسے کبھی خزاں کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ اور جب وہ ہر لحہ اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے اُس کی راہ کے غم اُٹھائے گا کہ جس کی بدولت اُس کے قلب کو دردِ محبتِ خداوندی حاصل ہوجائے گا تو پھر اس کے بیان اور تعبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوگی کہ تمام اہلِ لغت سن کر حیران رہ جائیں گے۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ اگر یہ نعمت حاصل کرنی ہو تو سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہے کہ گروہِ عاشقاں سے تعلق قائم کیا جائے اور اللہ والوں کی صحبت اُٹھائی جائے اور ان کی خدمت کے موقع کو غنیمت سمجھا جائے۔ ہاں لیکن یہ شرط ضرور ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کے ساتھ ساتھ گناہوں سے بچنے کا غم اُٹھانا پڑے گا۔ ورنہ کسی کا خوب تعلق گروہِ عاشقاں سے رہا ہو اور وہ راہِ خداوندی کے غم اُٹھانے سے بچتا ہو، جہاں جی چاہے اپنی خواہشات کی تکمیل کرلیتا ہو تو پھر ایسے سالک کی جاں مولائے جاں کی مقرب نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ حضرت والا نے یہ بات کئی جگہ فرمائی کہ شیخ کامل کے ہونے کے ساتھ ساتھ سالک کے لیے یہ ضروری ہے کہ دل وجاں سے اللہ پر فدا ہوجائے اور ایک لمحہ حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف گناہوں اور نافرمانیوں میں نہ گزارے۔ یہی حقیقت ہوتی ہے اللہ پر دل وجاں سے فدا ہونے کی۔ کیونکہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو تو اگرچہ درمیانی درجہ کا مؤمن رہتا ہے مگر خاص قربِ خداوندی کی حلاوت اور لذت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔

کیا ہے ربط اپنے آسماں سے

گلوں سے ہے نہ ہم کو گلستاں سے
ہمارا کام ہے آہ و فغاں سے

لرزتی برق بھی ہے آشیاں سے
پڑا پالا ہے طائر کی فغاں سے

مری فریاد ہے اے ربِ عالم
بچا مجھ کو بلائے دو جہاں سے

دلِ عشاق میں ہے آگ پنہاں
یقیں کرتا ہوں آہوں کے دھواں سے

یہ کیوں ہے سُرخ سجدہ گاہ عاشق
دعا کرتے ہیں چشمِ خونفشاں سے

یہ ہے انعام تسلیم و رضا کا
کہ ہیں آزاد فکر این و آں سے

بہت خونِ تمنا سے زمیں نے
کیا ہے ربط اپنے آسماں سے

یہ ہے توفیق بس اُن کے کرم سے
کہ ہے صرفِ نظر حسنِ بتاں سے

کرم ہے آپ کا اخترؔ پہ یارب
فدا ہوں آپ پر گر جسم و جاں سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔**طائر** : پرندہ، مراد اللہ والا۔**بلائے** :مصیبت۔**پنہاں** : چھپی ہوئی۔**خونفشاں** :خون برساتی ہوئی۔**تسلیم و رضا** : اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے اپنی مرضی کو چھوڑ دینا۔**فکرِ این و آں** : طرح طرح کی فکریں۔**زمیں** : مراد اللہ والے ہیں۔**آسماں** : مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔**صرفِ نظر** : نظر پھیر لینا۔

اللہ کے عشاق کو دنیا کے رنگ و بو سے کیا مطلب

گلوں سے ہے نہ ہم کو گلستاں سے
ہمارا کام ہے آہ و فغاں سے

جن کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنی محبت عطا فرماتے ہیں تو پھر اُن کا دل دنیا کے رنگ و بو میں اٹکا نہیں رہتا اور نہ اُنہیں یہاں کے گلوں اور گلستانوں سے کوئی مطلب رہتا ہے۔ بلکہ میں بڑی بصیرت سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ گلوں اور گلستان کے بیچ میں رہتے ہوں تب بھی اُن کا دل خالقِ گلستاں سے وابستہ رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ باہر کی کائنات ہوتی ہے۔ لیکن اُن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی گرمی اُسی طرح قائم رہتی ہے جس کا اثر آہ و فغاں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

لرزتی برق بھی ہے آشیاں سے
پڑا پالا ہے طائر کی فغاں سے

جہاں کوئی اللہ والا رہتا ہو اور اُس آشیانے سے اُس کی آہ و فغاں نکلتی ہو تو ظالم ظلم کرتے وقت اور حاسد حسد کرتے وقت کانپ اُٹھتا ہے، کیونکہ جب وہ اس آشیانے سے آہ و فغاں کی آواز سنتا ہے تو اُسے یہ پتہ چل جاتا

ہے کہ اِس میں کوئی خدا کا دیوانہ ہے جس کو ایذا اور تکلیف پہنچانا اپنی تباہی و بربادی کو دعوت دینا ہے۔ اس لیے ظالم کے ظلم کی برق اور بجلی بھی ایسے آشیانے پہ گرنے سے لرزتی ہے۔

ربِ دو جہاں ہی بلائے دو جہاں سے بچا سکتا ہے

مری فریاد ہے اے ربِ عالم
بچا مجھ کو بلائے دو جہاں سے

آگے حضرت والا دنیا وآخرت میں ہر قسم کی برائی اور مضرتوں کے نقصان سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے رہے ہیں اور اُس خدائے وحدہ لاشریک لہ سے فریاد کر رہے ہیں کہ جس کی ذات ایسی ہے جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ جملہ منقول ہے: "یااحد من لا احد له ویاسند من لا سندله" کہ جس کا کوئی نہ ہو وہ ذات اُسی کی حامی و مددگار ہو اور جس کا کوئی سہارا نہ ہو وہ ذات اُس کا سہارا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ کائنات کی ہر مخلوق کی رب اور پالنے والی ذات وہی ایک اکیلے اللہ کی ہے۔ جس کی تعریف یہی ہے کہ رب اُسے کہا جاتا ہے جو اپنے بندے کو ہر قسم کی مضرت اور نقصان سے بچاتے ہوئے اور اُس کے منافع اور مصالح عطا کرتے ہوئے اُسے اُس کی منزل تک پہنچادے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اس لائق ہے کہ اسی سے بلائے دو جہاں سے پناہ چاہی جائے اور حاسدین کے حسد اور دُشمنوں کی دُشمنی سے اُسی سے فریاد کی جائے اور اُس کی پناہ حاصل کی جائے کیونکہ سوائے اُس کے کوئی محفوظ اور بچا ہوا نہیں کہ جس کو اللہ نے بچایا ہو اور سوائے اس کے کوئی مبتلا نہیں کہ جس کو اللہ کی طرف سے ابتلاء اور آزمائش میں ڈال دیا جائے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے دونوں جہاں کی ابتلاء اور مصیبت سے پناہ مانگنی چاہیے اور عافیت کی درخواست کرنی چاہیے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ہم کو یہی سکھایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾
(سورة البقرة، اٰية: ۲۰۱)

ترجمہ: اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔

اس میں لفظ حَسَنَةً تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے۔ مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت، دنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ، علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں۔ اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب

چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آ جاتے ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت وسکون میسر آتا ہے۔ آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعاء مانگا کرتے تھے کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار اور حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مسنون ہے۔ اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا مانگنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ درحقیقت یہ اُن کا دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے۔ انسان اپنے وجود اور بقاء اور عبادت وطاعت سب میں ضروریاتِ دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اسی لیے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہترین اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں۔ جو شخص دنیوی حاجات کے لیے دعا مانگنے کو زہد و بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقامِ انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے۔ ہاں! صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے، اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لیے دعا مانگے۔ (معارف القرآن، جلد:۱، صفحہ:۴۹۴)

دلِ عشاق میں ہے آگ پنہاں
یقیں کرتا ہوں آہوں کے دھواں سے
یہ کیوں ہے سُرخ سجدہ گاہ عاشق
دعا کرتے ہیں چشم خونفشاں سے
یہ ہے انعام تسلیم و رضا کا
کہ ہیں آزاد فکر این وآں سے
بہت خونِ تمنا سے زمیں نے
کیا ہے ربط اپنے آسماں سے
یہ ہے توفیق بس اُن کے کرم سے
کہ ہے صرفِ نظر حسنِ بتاں سے
کرم ہے آپ کا اخترؔ پہ یارب
فدا ہوں آپ پر گر جسم و جاں سے

ان اشعار میں بھی قدرِ مشترک وہی مضامین ہیں جو دوسرے اشعار کے تحت گزر چکے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وقت اللہ والوں کی آہ وفغاں سن کر بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ کی پوری بھٹی گرم ہے کہ جہاں سے آہ وفغاں کی شکل میں دھواں نکل کر آرہا ہے۔ اور میں جب بھی کہیں زمین پرخون پڑا دیکھتا ہوں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ کسی اللہ والے سچے عاشق کی سجدہ گاہ ہے کہ جس نے یہاں سجدے میں گر کر اپنے اللہ کے سامنے چشمِ خونفشاں سے خون بہایا ہے کیونکہ یہ آنسو جو اللہ کی محبت اور خوف سے نکلتے ہیں شہیدوں کے خون کے برابر ہیں۔ اور یہ بات جب تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آدمی اپنی تمناؤں کا خون نہ کرلے اور اپنے دل کو حق تعالیٰ کے لیے غم اُٹھا کر ریزہ ریزہ نہ کرڈالے۔ بس جب یہ مقام حاصل ہوتا ہے تو پھر وہ ہروقت اِدھر اُدھر کی تمام فکروں سے آزاد اور محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر تسلیم ورضا کا انعام لیے ہوئے رہتا ہے کہ اے اللہ! میں آپ کے ہر فیصلے سے خوش ہوں اور اُس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں نہ میری اپنی کوئی خوشی، خوشی ہے اور نہ اپنا کوئی غم، غم ہے۔ بس آپ جو کچھ مجھے عطا فرمائیں میں اُسی پر خوش ہوں۔ آپ اگر راضی ہوں تو چاہے فقیر بنا کر رکھیں یا امیر، غلام بنا کر رکھیں یا بادشاہ، خادم بنا کر رکھیں یا مخدوم، گمنام کر کے رکھیں یا شہرت عطا فرما کر، صحت کی نعمت عطا فرمادیں یا مرض و بیماری میں مبتلا کردیں، گوکہ میں تو آپ سے صحت و عافیت کا طالب ہوں مگر آپ کے ہر فیصلے پر راضی بھی ہوں۔ بس میری زندگی کی بنیاد آپ کا راضی ہونا ہے۔ اور مجھے جو بھی کچھ حاصل ہوا یہ سب آپ کا کرم ہے۔ ہر وقت میرا دل وجان آپ کے حکم پر قربان ہے۔ یہ بھی آپ کے کرم کا صدقہ ہے اور جس طرح آپ نے مجھے بتوں یعنی حسین معشوق اور معشوقاؤں سے نظر بچانے کی توفیق عطا فرمائی ہے یہ بھی آپ کے فضل وکرم سے ہے۔ ورنہ اختر سے یہ کبھی ممکن نہ تھا۔

جیسا کہ قرآن کریم میں یہ مضمون متعدد جگہ پر ذکر ہوا ہے کہ ہر نعمت اور بھلائی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی بدولت ہے اور ہمارے دل کا پاکیزہ کردیا جانا اور نفس کا مزکّٰی اور مجلّٰی ہوجانا یہ بھی صرف توفیقِ الٰہی اور فضلِ خداوندی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

نہیں کچھ فائدہ اس گلستاں سے

ہٹایا جس نے سر اُس آستاں سے — وہ ٹکرایا بلائے ناگہاں سے
گناہوں سے اگر توبہ نہیں کی — تو وہ محروم ہے دونوں جہاں سے
نہیں کرتا ہے جو رب کی اطاعت — وہ جیتا ہے حیاتِ رائیگاں سے
اگر ناراض ہے وہ خالقِ کُل — تو کیا حاصل اُسے کون و مکاں سے
جہاں ہو گل کے بدلے خارِ صحرا — نہیں کچھ فائدہ اس گلستاں سے
نہ بلبل ہو نہ گل ہو جس چمن میں — تو باز آیا میں ایسے بوستاں سے
خدا سے گر نہیں ہے ربط اخترؔ — عبث ہے ربط ماہ و اختراں سے

مشکل الفاظ کے معانی:۔**آستاں**: اللہ تعالیٰ کا در۔**ناگھاں**:اچانک۔ **رائیگاں**: بیکار۔ **خالقِ کُل**: ہر چیز کا پیدا کرنے والا۔ **کون ومکاں**:دنیا۔**گل**: پھول۔ **خارِ صحرا**: ریگستان کا کانٹا۔**بوستاں**: باغ۔**ربط**:تعلق۔ **عبث**: بے کار۔**ماہ**: چاند۔ **اختراں**: ستارے۔

اللہ کے در کو مضبوطی سے پکڑنا تمام مسائل کا حل ہے

اس پوری نظم میں چند باتوں کی طرف حضرت والا نے توجہ دلائی ہے۔سب سے پہلی یہ ہے کہ جولوگ اللہ تعالیٰ کے در کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے ہیں اور اُس خالقِ کائنات سے اپنا تعلق مضبوط نہیں کرتے تو اُنہیں ایسی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات کے تمام مسائل کا حل صرف اللہ تعالیٰ کے فیصلوں سے ہوتا ہے۔جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق توڑ کر خود اپنے مسائل حل کرنے میں لگے گا تو وہ بدیہی اور واضح طور پر انتہائی درجہ کی جاہلانہ اور غیر دانشمندانہ حرکت میں مبتلا ہے۔عقلمندی یہ ہے جس کے ہاتھ میں ہمارے مسائل ہیں اور دنیا وآخرت کی تمام مصیبتیں اور راحتیں ہیں اُس سے مضبوط رشتہ جوڑا جائے اور اپنا سر اُس آستاں سے نہ ہٹایا جائے۔جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت چھوڑ دی جائے اور گناہوں میں مبتلا ہو جائے۔یہی نافرمانی اور گناہوں میں مشغول رہنا رحمتوں اور برکتوں کے اُٹھ جانے کا سبب ہے۔ہاں!اگر گنہگار بھی توبہ کر کے پھر سے اللہ کی طرف لوٹ جائے تو بھی اُسے دو جہاں کی سرخروئی اور عزت حاصل ہو جاتی ہے۔ورنہ بصورتِ دیگر اُسے دونوں جہاں کی راحتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اُسے ایسی زندگی ملتی ہے کہ وہ بالکل رائیگاں اور بے کار اور بے فائدہ ہوتی ہے۔جس کو احقر بعض مقامات پر لکھ چکا ہے کہ وہ زندگی، زندگی کہلانے کے قابل بھی نہیں ہوتی، بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہیے کہ خالق کائنات کی ناراضگی سے اُسے نہ دنیا سے کچھ حاصل اور نہ آخرت سے۔اُس کی دنیا بھی برباد اور آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

خار و گل اور ظلمت و روشنی میں فرق کیجئے

افسوس صد افسوس! اُن لوگوں پر کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے خار اور گل کی تمیز بخشی ہو اور اتنا شعور عطا فرمایا ہو کہ حقیقت میں یہ دنیا اور چمک دمک اور کھلے ہوئے پھول اور رنگ و روپ جو حسین اور حسیناؤں کی شکل میں دکھائے دے رہے ہیں یہ تمہارے لیے خار ہیں۔ اور ان کو چھوڑ کر دل کو حاصل ہونے والا رنج و غم اور تھوڑی دیر کی تکلیف و پریشانی یہ تمہارے لیے حقیقت میں انتہائی اعلیٰ درجے کی خوشبو رکھنے والے پھول ہیں۔ اس لیے دنیا میں وہی شخص جینے کا لطف اُٹھاتا ہے اور مقصدِ حیات میں کامیاب ہوتا ہے کہ جو اس فرق کو سمجھ کر خارِ صحرا لینے کے بجائے گلستاں کے عمدہ پھول چنتا اور اختیار کرتا ہے۔ اور وہ یہ جانتا ہے کہ جن پھولوں پر آج بلبل چہچہار ہی ہے، موسمِ خزاں میں یہ بلبل رو رہی ہوگی اور وہ گل اور پھول بے نام و نشان ہو جائیں گے اور سارا چمن اُجڑا ہوا نظر آئے گا۔ اس لیے اپنے کو اُس بلبل کی حالت سے فائدہ پہنچاتا ہے اور اُس سے اپنے لیے سبق نکال لیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے ایسے گلستاں اور بوستاں سے باز رہتا ہے۔ بس اُس کے سامنے ایک ہی ہدف اور نشانہ ہوتا ہے کہ میرے اللہ سے میرا ربط کتنا قوی ہے۔ اور خالقِ گل و گلشن، اور مالکِ ماہ و انجم سے میں کتنا جڑا ہوا ہوں اور اُس کے حکموں کی کتنی اتباع کر رہا ہوں، کیونکہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ سے ربط نہ ہو تو پھر ماہ و انجم سے میرا تعلق بالکل بے کار اور خسارے اور ناکامی کا باعث ہے۔

زمیں میری ہو جیسے آسماں میں

کہاں پھرتے ہو فکرِ این و آں میں
کبھی آؤ تو بزمِ دوستاں میں

اگر ہے برق و باراں اس جہاں میں
کرو فریاد اپنے آشیاں میں

مزہ پاتے ہو کیوں اس کے بیاں میں
کوئی تو بات ہے دردِ نہاں میں

مزہ پایا جو صحرا کی فغاں میں
نہیں پایا مزہ وہ گلستاں میں

وہ ظاہر ہوگیا اس کی زباں میں
اثر پنہاں تھا جو زخم نہاں میں

نہیں پایا چراغِ راہِ منزل
مگر بس عاشقوں کی داستاں میں

عطائے خالقِ دونوں جہاں ہے
اثر پاتے ہو جو میرے بیاں میں

رہے لپٹا گلوں کے دامنوں سے
اگرچہ خار ہے وہ گلستاں میں

سنا تو سب نے میری داستاں کو
اثر پایا نگاہِ دوستاں میں

نہ پوچھو لذتِ فریادِ سجدہ
زمیں میری ہو جیسے آسماں میں

کوئی پوچھے یہ جاکر باغباں سے
گذرتی ہے تری کیسے خزاں میں

اگر ہے ربط خلّاقِ چمن سے
تو اخترؔ گل لیے ہوگا خزاں میں

مشکل الفاظ کے معانی:۔فکرِ این و آں: طرح طرح کی فکریں۔ **دوستاں**: اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی محفل۔ **برق و باراں**: بجلی چمکنا اور بارش ہونا۔ **آشیاں**: گھونسلہ۔ **فُغاں**: رونا۔ **گلستان**: باغ۔ **پنہاں**: چھپا ہوا۔ **زخمِ نہاں**: چھپا ہوا زخم۔ **خلاّق**: پیدا کرنے والا۔ **چمن**: باغ۔

بزمِ دوستاں کون سی بزم ہے

کہاں پھرتے ہو فکرِ این و آں میں
کبھی آؤ تو بزمِ دوستاں میں
اگر ہے برق و باراں اس جہاں میں
کرو فریاد اپنے آشیاں میں

حضرت والا نصیحت فرما رہے ہیں کہ دنیا کی فکروں کو چھوڑ کر اور اِدھر اُدھر کی مجلسوں اور محفلوں میں قیل و قال اور بے فائدہ گفتگو میں نہ پڑ کر کبھی اللہ والوں کی محفل میں آ کر دیکھو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ اس محفل کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اور تم پر یہ واضح ہو جائے گا کہ حقیقت میں دوستی رکھنے کے قابل صرف اللہ والے ہی لوگ ہوتے ہیں، کیونکہ دوستی کا حق یہی لوگ ادا کرتے ہیں جو کہ اپنے دوست کو بُرے انجام اور تباہی و بربادی سے بچاتے ہیں۔ یہ بات صرف اللہ والے نیک صالح لوگوں میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ رہنے والے کے لیے قبر و حشر اور جنت تک کی بھلائیوں کی سوچ اور فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس لیے تمہیں آنے کے بعد یہ پتہ چلے گا کہ حقیقت میں بزمِ دوستاں کہلانے کے قابل اہلِ دل اولیاء اللہ کی مجلسیں ہیں۔ اور میں تم کو یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ ذرا اپنے آشیاں میں بیٹھ کر دنیا بھر کی مختلف فکروں اور اُلجھنوں سے یکسو ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کو یاد کرو اور اُسی سے فریاد کرو تو اس کفر و شرک اور ظلمت و بدعت اور جہالت و ضلالت کے دور میں بھی تمہیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ امن اور سکون کی جگہ وہ اپنی جھونپڑی اور معمولی سا گھر ہے جہاں ایک بندہ بیٹھ کر اپنے خالق و مالک سے فریاد کرتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں تم سارے عالم میں پھیلی ہوئی برق و باراں کی زد میں آنے سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

میرا بیاں ترجمانِ دردِ نہاں

مزہ پاتے ہو کیوں اس کے بیاں میں
کوئی تو بات ہے دردِ نہاں میں
وہ ظاہر ہوگیا اس کی زباں میں
اثر پنہاں تھا جو زخمِ نہاں میں

یعنی ایک بیان صرف زبانی جمع خرچ ہوا کرتا ہے کہ آدمی لغت کے اوپر قادر ہو جائے اور کچھ ظاہری علوم سے واقفیت ہو جانے کے بعد فصاحت و بلاغت کے قواعد سیکھ لینے سے منبر و محراب سے ایک عمدہ قسم کا بیان لوگوں کو سنا دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک وہ بیان ہے کہ جو اپنے دل میں گزرنے والے حالات کی ترجمانی کرتا ہے اور جو اُس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا دردِ نہاں ہے اُس کی تعبیر کرتا ہے جسے بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ ؎

لغت تعبیر کرتی ہے معانی
محبت دل کی کہتی ہے کہانی

اس لیے اللہ والوں کے بیان میں سامعین کو ایسا سرور اور لطف حاصل ہوتا ہے کہ کئی کئی گھنٹے بیان سننے کے باوجود وہ لوگ اُکتاتے نہیں جبکہ بارہا یہ دیکھا گیا کہ ایسی جگہ پر کسی اللہ والے کا بیان ہوا جہاں کے لوگوں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ زیادہ دیر تک بیان سننا پسند نہیں کرتے اور درمیان سے اُٹھ کر جانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن وہی لوگ ایسے جڑ کر بیٹھے رہے جیسے زمین کے ساتھ ان کو کسی چیز کے ذریعہ چپکا دیا ہو۔ درحقیقت یہ سب کچھ اسی دردِ نہانی کا اثر ہوتا ہے۔ اور اس کو ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ جیسے بدن کا زخمی انسان جب ڈاکٹر کے سامنے حالت بیان کرتا ہے تو بغیر سیکھے ہوئے وہ اتنے صاف اور واضح طریقے سے بیان کر دیتا ہے کہ ڈاکٹر کو اس کی حالت جاننے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا۔ تو اللہ کی محبت بھی دل پر لگا ہوا ایک زخم ہے، لہٰذا محبتِ خداوندی کا گھائل انسان جب اس زخم کو بیان کرے گا تو وہ اپنے دل کی کہانی کہے گا، اس لیے اس کی تاثیر ہی جدا ہوگی۔

مزہ پایا جو صحرا کی فغاں میں
نہیں پایا مزہ وہ گلستاں میں

اللہ والوں کو دنیا کے مکانات و بلڈنگوں اور ظاہری ٹیپ وٹاپ والی چیزوں میں نہ مزہ آتا اور نہ ہی چین و سکون نصیب ہوتا ہے، بلکہ وہ لوگ خلوتوں میں رہ کر جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور وہاں آہ و فغاں کرتے ہیں اُس میں اُن کو وہ حلاوت میسر آتی ہے کہ جو دنیا کی چیزوں اور ساز و سامان میں نصیب نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ لوگ آہِ صحرا کا مزہ اُٹھانے کو اپنے لیے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ایسی عیش وعشرت کی جگہوں سے اپنے کو دور رکھتے ہیں۔

داستانِ عاشقاں چراغِ راہِ منزل ہوا کرتی ہے

نہیں پایا چراغِ راہِ منزل
مگر بس عاشقوں کی داستاں میں

یہ مضمون اس سے پہلے بھی بعض مقامات پر گزر چکا ہے کہ اللہ والوں کی داستانِ دردِ دل جب لوگوں کے سامنے بیان کی جاتی ہے تو اُس سے عشاقِ خداوندی کے لیے راہِ منزل کے بہت سے چراغ جل جاتے ہیں۔ اور

اُن کے قصوں میں اس قدر عبرتیں اور نصیحتیں اور ہدایت کا اتنا سامان جمع ہوتا ہے کہ اُن کو دیکھ کر اور پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا کا طالب انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے انبیاء و رسل کے قصوں کو بیان کرنے کے فوائد کا تذکرہ قرآنِ کریم کی اس آیت میں کچھ اس طرح کیا ہے:

﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

(سورة هود، اية: ۱۲۰)

ترجمہ: اور پیغمبروں کے قصوں میں ہم یہ سارے (مذکورہ) قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں (ایک فائدہ بیانِ قصص کا تو یہ ہوا جس کا حاصل آپ کو تسلی دینا ہے) اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہنچا ہے جو خود بھی راست (اور قطعی) ہے اور مسلمانوں کے لیے (بُرے کاموں سے روکنے کے لیے) نصیحت ہے اور (اچھے کام کرنے کے لیے) یاددہانی ہے۔ (یہ دوسرا فائدہ بیانِ قصص کا ہوا، ایک فائدہ نبی کے لیے، دوسرا اُمت کے لیے)

گلوں کے دامنوں سے لپٹے رہنے کے فائدے

رہے لپٹا گلوں کے دامنوں سے
اگرچہ خار ہے وہ گلستاں میں

ہم سب جانتے ہیں کہ جو لوگ تھوڑی بہت کنکریاں گندم اور غلّے میں ملی ہوتی ہیں وہ غلّے کے بھاؤ سے فروخت ہوتی ہیں جبکہ اُن کو اگر الگ کر دیا جائے تو پھر اُن کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ اور ٹھیک اسی طرح پھولوں کے دامن میں جو کانٹے بسے ہوتے ہیں اُن کو پھولوں کی صحبت مل جانے کی وجہ سے انہی پھولوں کی قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے۔ اور جب پھول کی شاخ کسی کو پیش کی جاتی ہے تو ساتھ میں وہ کانٹے بھی چلے جاتے ہیں۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ پھر ان کو صاف کر دیا جائے۔

لہٰذا اے وہ انسان! جو اللہ والوں کے بغیر مثلِ ایک کانٹے کے ہے اُسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اہل اللہ کی صحبت کا کس قدر عظیم الشان فائدہ ہے کہ ان شاء اللہ قیامت کے دن اہل اللہ کے دامن میں ہمارے عیوب کو چھپا دیا جائے گا اور ہمارا حشر بھی اُنہی کے ساتھ کر کے اللہ تعالیٰ وہی قیمت لگا دیں گے۔ اور اگر بظاہر دیکھا جائے تو دنیا میں بھی اہل اللہ کے خادموں کے ساتھ ساری دنیا وہی معاملہ کرتی ہے اور وہی سب کچھ عنایات اور توجہیں اُن کے ساتھ ہوتی ہیں جو کہ اہل اللہ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس لیے حضرت والا نصیحت فرماتے ہیں کہ گلوں کے دامنوں سے لپٹے رہنا کیونکہ کانٹا بھی گلستان میں رہ کر جب گلوں کے دامن سے لپٹا ہوتا ہے تو مالی اور باغبان اُن کو نکال کر باہر

نہیں پھینکتا۔ اور اس مضمون پر وہ تمام احادیث دلیل ہیں جن میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ جس کو جس سے محبت ہوگی قیامت کے دن اُس کا حشر اُسی کے ساتھ ہوگا۔ اور اُس محبت کی بناء پر اللہ وہاں اُن کو اکٹھا جمع فرمادیں گے۔ جیسا کہ اَلْمَرءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کہ جس کو جس سے محبت ہوگی اس کا حسر اس کے ساتھ ہوگا۔

نفع کا مدار باہمی مناسبت پر ہے

سنا تو سب نے میری داستاں کو
اثر پایا نگاہِ دوستاں میں

جس کو جس شیخ سے مناسبت ہوتی ہے اُس کی تعلیمات اور تقریرات اُس کے لیے زیادہ نافع ثابت ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اللہ والوں سے محبت و مناسبت اور عقیدت وعظمت کے ساتھ ملتا ہے تو وہ اُن اللہ والوں کی زندگی سے بہت سے قیمتی موتی چن لیتا ہے۔ اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے لوگ کسی صاحبِ دل کی صحبت اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے فیضِ صحبت سے مستفید ہیں۔ لیکن جس کو نہ تو مناسبت ہو اور نہ وہ محبت وعقیدت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو تو پھر ایسے لوگ پورے طور پر بزرگانِ دین کی صحبت سے نفع نہیں اُٹھا پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے معترضین اور معاندین کو نفع نہ پہنچ سکا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ محض تنقید وتبصرہ کو اپنی عادت بنانے والے لوگ ہر جگہ محروم ہی رہتے ہیں اور اسی طرح محض حسنِ کلام کے عادی حضرات جو کہ عمل سے دور ہوں تو وہ بھی محض باتوں کا ہو کر رہ جاتا ہے اور راہِ سلوک طے کر کے ساری زندگی منزل تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ بقول حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ ؎

کامیابی تو بس کام سے ہوگی
نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی
فکر کے اہتمام سے ہوگی

خلّاقِ چمن سے ربط ہو تو ہر وقت چمن کی بہار ملے گی

کوئی پوچھے یہ جا کر باغباں سے
گذرتی ہے تری کیسے خزاں میں
اگر ہے ربط خلّاقِ چمن سے
تو اختؔر گل لیے ہوگا خزاں میں

جس طرح دنیا کے گلستان کا باغبان موسمِ خزاں میں فرحاں وشاداں نہیں رہتا اور اُس کے دل بہلانے کا سامان جو کہ اُس گلستان میں بہار کے موسم میں رہتا ہے وہ اُس وقت اُس کے پاس موجود نہیں ہوتا تو وہ پریشان حیران نظر آتا ہے۔ لیکن جس آدمی کا تعلق خلّاقِ چمن سے ہوتو اُس کو کسی وقت بھی خزاں کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا بلکہ اُس کے دل کا گلستان ہر وقت پُر بہار رہے گا اور اُس میں پوری زندگی ہر حالت اور ہر وقت میں پھول اور پھل کھلتے رہیں گے۔ اس لیے کہ وہ ایسی ذات ہے کہ جو چمن کو چمن بناتی ہے اور موسمِ بہار کو موسمِ بہار بنانے والی ہے تو اس سے تعلق ہوجانے کی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خزاں کا سامنا کرنا پڑے۔ ہاں اگر خلّاقِ چمن سے ربط کٹ جائے اور تعلق ٹوٹ جائے تو پھر یہ سارا چمن ہی اُجاڑ اُجاڑ معلوم ہوتا ہے اور اُس کی زندگی زندگی نہیں رہتی۔ کیا ہی خوب حضرت والا نے فرمایا ؎

کس قدر ظلمت کدہ تھی انجمن اُن کے بغیر
اُن کے آتے ہی سراپا بزمِ روشن ہوگئی

ذرا دیکھو تو فیضِ خانقاہی

مچادے گی وہ باہی میں تباہی ۔۔۔ نہ کرے اے دوست ہرگز بدنگاہی
چٹائی پر ملے گا تختِ شاہی ۔۔۔ اگر حاصل کرو عشقِ الٰہی
غضب سے تو اگر مغلوب ہوگا ۔۔۔ بکے گی پھر زباں واہی تباہی
حسینوں سے اگر ملنا نہ چھوڑا ۔۔۔ نہیں پہنچے گا دربارِ الٰہی
وہی پہنچا ہے دربارِ خدا میں ۔۔۔ ملی ہے جس کو آہِ سحر گاہی
ہوئے ہیں رند کتنے اولیاء بھی ۔۔۔ ذرا دیکھو تو فیضِ خانقاہی
کھلا کیا راز سلطانِ بلخ پر ۔۔۔ فقیری لی ہے دے کر تاج شاہی
غذا اس نفس سرکش کی تو کم کر ۔۔۔ نہ کھا ہر روز ظالم مرغ و ماہی
جو اہلِ دل کی صحبت میں رہے گا ۔۔۔ وہی پائے گا بس عشقِ الٰہی
ملی اخترؔ جسے نسبت خدا کی ۔۔۔ مٹادی اس نے باہی اور جاہی

مشکل الفاظ کے معانی:۔ باهی: مردانہ قوت۔ **آہِ سحر گاهی:** تہجد میں رونا اور دعا کرنا۔ **رند:** دنیا کی شراب کے عادی۔ **سلطانِ بلخ:** سلطان ابراہیم ابن ادھم مراد ہیں۔ **مرغ و ماهی:** مرغی اور مچھلی۔ **باهی:** شہوت کے گناہ۔ **جاهی:** لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام چاہنا۔

قوتِ شہوت و غضب پر کنٹرول کے فوائد

مچا دے گی وہ باہی میں تباہی
نہ کرے اے دوست ہرگز بدنگاہی
چٹائی پر ملے گا تختِ شاہی
اگر حاصل کرو عشقِ الٰہی
غضب سے تو اگر مغلوب ہوگا
بکے گی پھر زباں واہی تباہی

حضرت والا کے کلام میں بدنظری کے نقصانات اور اُس سے ہونے والی تباہی و بربادی کا ذکر جا بجا کیا جارہا ہے۔ یہاں اس موقع پر ایک خاص انداز سے حضرت نے اُس کے نقصان کو پیش کیا ہے کہ وہ قوتِ شہوانی جو انسانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فطری طور پر رکھی گئی ہے بدنظری کرنے سے اُس کے استعمال کی غلط صورتیں اور شکلیں دل و دماغ سوچنے لگتا ہے اور بالآخر ایک آدھ واقعات نہیں بلکہ سینکڑوں واقعات ہیں کہ جوان اس کا شکار ہوکر اپنی اس قوت کو اس حد تک تباہ کرچکے ہوتے ہیں کہ وہ صحیح طریقہ یعنی نکاح کے طور پر اپنی خوشگوار زندگی کسی مناسب رفیقۂ حیات کے ساتھ گزارنے کے قابل نہ رہتے۔ جس کے نتیجے میں اُن کی یہ دنیا اُن کے لیے جہنم کی طرح بن جاتی ہے۔ اس لیے حضرت والا کی یہ نصیحت سن لینی چاہیے کہ انسان اِدھر اُدھر حسینوں کو تانکتا اور جھانکتا نہ پھرے۔

میرے شیخِ اوّل مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ کا بڑا پیارا جملہ ذہن میں آیا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ نظر اُٹھی اُٹھی نہ رہے اور زبان چلی چلی نہ رہے۔

اور اگر ان حسیناؤں کو چھوڑ کر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرلے اور اُس کے عشق میں اپنی ساری خواہشاتِ نفس کو قربان کردے تو میرے دوستو وہ چٹائی پر بیٹھا ہوا ہوگا لیکن اُسے وہیں تختِ شاہی کا مزہ مل رہا ہوگا۔ اور وہ فقیری میں گدڑی پوش ہوگا لیکن تاجِ سلطانی سے زیادہ عزت و عظمت حق تعالیٰ کی طرف سے اُسے حاصل ہورہی ہوگی۔

اور جس طرح قوتِ شہوت کو محفوظ رکھنا چاہیے اور بدنگاہی کے ذریعے اُسے غلط راستوں پر ڈال کر برباد نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح ایک قوت انسان میں اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر غضب اور غصے کی رکھی ہے۔ جس کو پی جانے اور برداشت کرجانے کے متعلق روایات میں اس کثرت سے فضیلتیں وارد ہوئی ہیں کہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو غصہ پینے کی اپنی عادت بنالے اور ہر اپنے اور پرائے سے حلم و بردباری سے کام لے تو اُس کے لیے جنت ضروری

قرار دے دی گئی۔ جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ جو اپنے غصے کو قابو میں کر لے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب کو قیامت کے دن اُس سے ہٹالیں گے۔

﴿عن أنس بن مالك يقول: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَزَنَ لِسَانَهُ سَتَرَ اللهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهُ كَفَّ اللهُ عَنْهُ عَذَابَهُ وَمَنِ اعْتَذَرَ إِلَى اللهِ قَبِلَ اللهُ مِنْهُ عُذْرَهُ﴾

(مسند أبي يعلى الموصلي، كتاب سعيد بن نسان، باب من خزن لسانه ستر الله عورته، ومن كف غضبه)

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے اپنی زبان کو محفوظ رکھا اللہ تعالیٰ اُس کے عیوب کو چھپا دیں گے اور جس نے اپنے غصے کو روک لیا اور اس پر کنٹرول کیا تو اللہ تعالیٰ اُس سے اپنے عذاب کو روک لیں گے۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا عذر پیش کیا تو اللہ تعالیٰ اُس کے عذر کو قبول فرمالیں گے۔

اے ابن آدم! اگر غصے کے وقت تو مجھے یاد رکھے گا یعنی میرا حکم مان کر غصہ پی جائے گا تو میں بھی اپنے غصہ کے وقت تجھے یاد رکھوں گا۔ (ابن ابی حاتم)

ایک اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص اپنا غصہ روک لے اللہ تعالیٰ اُس پر سے اپنے عذاب کو ہٹالیتا ہے اور جو شخص اپنی زبان (خلافِ شرع باتوں سے) روک لے اللہ تعالیٰ اُس کی پردہ پوشی کرے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف معذرت لے جائے اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول فرماتا ہے۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں بھی کلام ہے۔ (مسند ابویعلیٰ)

حدیث شریف میں ہے آپ فرماتے ہیں پہلوان وہ نہیں جو کسی کو بچھاڑ دے بلکہ حقیقتاً پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ (مسند احمد)

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم میں سے کوئی ایسا ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ لوگوں نے کہا: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)! کوئی نہیں۔ آپ نے فرمایا میں تو دیکھتا ہوں کہ تم اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال چاہتے ہو، اس لیے کہ تمہارا مال تو درحقیقت وہ ہے جو تم راہِ للہ اپنی زندگی میں خرچ کردو اور جو چھوڑ کر جاؤ وہ تمہارا مال نہیں بلکہ تمہارے وارثوں کا مال ہے تو تمہارا راہِ اللہ کم خرچ کرنا اور جمع زیادہ کرنا، یہ دلیل ہے اس امر کی کہ تم اپنے مال سے اپنے وارثوں کے مال کو زیادہ عزیز رکھتے ہو۔ پھر فرمایا تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اُسے جسے کوئی پچھاڑ نہ سکے۔ آپ نے فرمایا نہیں! بلکہ حقیقتاً طاقت ور پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے جذبات پر قابو رکھے۔ پھر فرمایا: بے اولاد کسے کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا: جس کی اولاد نہ ہو۔ فرمایا: نہیں! بلکہ فی الواقع بے اولاد وہ ہے جس کے سامنے اس کی کوئی اولاد مری نہ ہو۔ (صحیح مسلم)

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: جس کے پاس مال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا بلکہ وہ جس نے اپنا مال اپنی زندگی میں راہِ اللہ میں نہ دیا ہو۔ (مسند احمد)

حضرت حارثہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ سعدی رضی اللہ عنہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ حضور! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے کوئی نفع کی بات بتایئے اور مختصر ہو تا کہ میں یاد بھی رکھ سکوں۔ آپ نے فرمایا: غصہ نہ کر۔ اُس نے پھر پوچھا: آپ نے پھر یہی جواب دیا۔ کئی کئی مرتبہ یہی کہا سنا۔ (مسند احمد)

کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا غصہ نہ کر۔ وہ کہتے ہیں میں نے جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ تمام بُرائیوں کا مرکز غصہ ہی ہے۔ (مسند احمد)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ کو غصہ آیا تو آپ بیٹھ گئے اور پھر لیٹ گئے۔ ان سے پوچھا گیا یہ کیا؟ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے جسے غصہ آئے وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی غصہ نہ جائے تو لیٹ جائے۔ (مسند احمد)

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ عمروہ بن محمد کو غصہ آیا۔ آپ وضو کرنے بیٹھ گئے اور فرمانے لگے میں نے اپنے استادوں سے یہ حدیث سنی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ بجھانے والی چیز پانی ہے۔ پس تم غصہ کے وقت وضو کرنے بیٹھ جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو شخص کسی تنگدست کو مہلت دے یا اپنا قرض اسے معاف کر دے، اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔ لوگو! سنو! جنت کے اعمال سخت اور مشکل ہیں اور جہنم کے کام آسان اور سہل ہیں، نیک بخت وہی ہے جو فتنوں سے بچ جائے، کسی گھونٹ کا پینا خدا کو پسند نہیں جتنا غصہ کے گھونٹ کا پی جانا۔ ایسے شخص کے دل میں ایمان رَچ جاتا ہے۔ (مسند احمد)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں جو شخص اپنا غصہ اُتارنے کی طاقت رکھتے ہوئے پھر بھی ضبط کر لے اللہ تعالیٰ اس کا دم امن وامان سے پُر کر دیتا ہے۔ جو شخص باوجود موجود ہونے کے شہرت کے کپڑے کو تواضع کے پیش نظر چھوڑ دے اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کرامت اور عزت کا حلہ (سوٹ) پہنائے گا۔ اور جو کسی کا سر چھپائے اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن بادشاہت کا تاج پہنائے گا۔ (ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص باوجود قدرت کے اپنا غصہ ضبط کر لے اُسے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔ (تفسیر ابن کثیر اُردو، سورۂ آل عمران: آیت ۳، صفحہ: ۴۷۹)

اور بہت سی روایات غصہ پینے کی فضیلت پر وارد ہوئی ہیں اور عام طور پر غصہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب آدمی غصے میں مغلوب ہوتا ہے تو پھر وہ زبان کو قابو میں نہیں رکھ پاتا اور اس سے واہی تباہی بکنا شروع کرتا ہے جس کے

نتیجے میں جھگڑے اور لڑائیاں وجود میں آتی ہیں حدیث شریف میں ہے کہ دو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لڑ جھگڑ رہے تھے اور ایک شخص غصے میں بے قابو ہو رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا یہ اشتعال جاتا رہے فرمایا وہ کلمہ یہ ہے ''اَعُوْذُ باللہ من الشیطان الرجیم'' اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر فوراً یہ کلمہ پڑھ لیا تو فوراً ہی سارا غصہ اور اشتعال ختم ہو گیا اور شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے جہاں جھگڑے کا کوئی موقع پیش آتا ہے شیاطین اس کو اپنی شکارگاہ بنا لیتے ہیں اور بڑے سے بڑے بردبار باوقار آدمی کو غصہ دلا کر حدود سے نکال دینے کی کوشش کرتے ہیں اس کا علاج قرآن شریف میں یہی بتایا گیا ہے کہ جب غصہ قابو میں نہ آتا دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس سے پناہ مانگے۔ (معارف القرآن، جلد:۴، صفحہ:۱۵۸)

دربارِ الٰہی اور آہِ سحر گاہی کا گہرا ربط ہے

حسینوں سے اگر ملنا نہ چھوڑا
نہیں پہنچے گا دربارِ الٰہی
وہی پہنچا ہے دربارِ خدا میں
ملی ہے جس کو آہِ سحر گاہی
ہوئے ہیں رند کتنے اولیاء بھی
ذرا دیکھو تو فیضِ خانقاہی

اگر حضرت والا کی نصیحت نہ سنی اور دنیا کے معشوق اور معشوقہ اور حسین وخوبرو چہروں سے ملنا جلنا اور دوستی نہ چھوڑی اور دل میں ان کو بسائے رکھا تو یہ یاد رکھ لینا چاہیے کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہمیں یہ سکھا رہا ہے کہ دل سے ہر غیر اللہ کو باہر کر کے ہی دربارِ الٰہی تک رسائی ممکن ہے اس کے بغیر وصول الی اللہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا کیونکہ خاص اہل اللہ کی جو ایک صفت ہے یعنی آہِ سحر گاہی وہ اسے کبھی بھی میسر نہیں آ سکتی ہے اس لیے کہ جو دل اپنے اندر مردے بسائے ہوئے ہو تو پھر اس دل میں خدا کی تجلیات قرب نہیں آتی ہیں جس کی بدولت دل میں انوارات اور روشنی نہیں رہتی تو پھر آہِ سحر گاہی سے بھی محرومی رہتی ہے اور دل کو غفلت گھیر لیتی ہے اس لیے غفلت سے بچنے اور قربِ خداوندی کے حصول کے لیے کسی خانقاہ میں اللہ والے کی صحبت اٹھانا لازم اور ضروری ہے تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کتنے ہی رند خانقاہ کے فیض سے اولیاء کی صفوں میں شامل ہو گئے جو کل تک دنیا کی حرام شراب کے نشہ میں مست تھے آج وہی اللہ کی محبت کی صاف شفاف شراب کے نشے میں مزے لوٹ رہے ہیں۔

سلطان بلخ نے شاہی کے بدلے فقیری کیوں لی؟

کھلا کیا راز سلطان بلخ پر
فقیری لی ہے دے کر تاج شاہی

حضرت سلطان بلخ شاہ ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا واقعہ ہمارے حضرت والا کے مواعظ وتصنیفات میں مختلف جگہ پر آیا ہے یہاں اس موقع پر اختصار کے ساتھ معارف مثنوی صفحہ: ۴۱ سے نقل کیا جارہا ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر بھی بعض اشعار کی تشریح میں گزر چکا ہے، کہ جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت سلطان ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو صورت یہ پیش آئی کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ رات کو بالا خانے پر سو رہے تھے کہ اچانک پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی گھبرائے کہ رات کے وقت شاہی بالا خانے پر کون لوگ ایسی جرأت کرسکتے ہیں دریافت فرمایا کہ اے واردین کرام آپ کون لوگ ہیں؟ یہ فرشتے تھے جو حق تعالیٰ کی طرف سے غفلت زدہ دل پر چوٹ لگانے آئے تھے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم یہاں اپنا اونٹ تلاش کررہے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ حیرت ہے کہ شاہی بالا خانہ پر اونٹ تلاش کیا جارہا ہے۔ ان حضرات نے جواب دیا کہ ہمیں اس سے زیادہ حیرت آپ پر ہے کہ اس ناز پروری اور عیش میں خدا کو تلاش کیا جارہا ہے اور شاہی تخت پر حق تعالیٰ کی ملاقات کی تمنا کررہے ہو یہ کہہ کر وہ رجال غیب تو غائب ہوگئے لیکن بادشاہ کے دل پر ایسی چوٹ لگ گئی کہ ملک وسلطنت سے دل سرد ہوگیا اور عشق حقیقی نے حضرت ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو ترک سلطنت پر مجبور کردیا اور عشق کائنات کی تمام لذتوں سے دل کو بیزار کردیا آخر کار آدھی رات کو بادشاہ اٹھا کمبل اوڑھا، اور اپنی سلطنت سے نکل پڑا سوزِ عشق کی ایک آہ نے زندان سلطنت کو پھونک دیا اور دست جنوں کی ایک ضرب نے گریبان ہوش کے پرزے اڑادیئے اور سلطنت بلخ ترک کرکے حضرت ابراہیم بن ادہم نیشا پور کے صحرا میں ذکر حق اور نعرہ ہائے عاشقانہ بلند کرنے میں مشغول ہوگئے۔

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھاٹ ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

جب حق تعالیٰ کی رحمت وعنایت حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئی تو بغیر ریاضت و مجاہدے کے شاہ بلخ کا کام بن گیا بلخ کی سلطنت تو چھڑادی لیکن ایسی باطنی سلطنت عطا فرمادی کہ جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بلکہ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بے حقیقت ہوگئے۔ شاہ کو خود بھی خبر نہ تھی کہ سلطنت کا سر سبز وشاداب باغ آتشِ عشقِ حقیقی کی نذر ہونے والا ہے، کوڑیاں چھن کر جواہرات عطا ہونے والے ہیں اور خارستان سوختہ ہوکر چمنستان بے خزاں بننے والا ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ دس برس تک صحرائے نیشاپور میں دیوانہ وار عبادت میں مصروف رہے اور ترکِ سلطنت کے نتیجہ میں جو نعمت ملی اور صحرا میں دریا کے کنارے ذکر وعبادت کی جو حلاوت ان کے باطن کو عطا ہوئی اس کا لطف انہی سے پوچھنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ ظاہری سلطنت کے ترک سے حق تعالیٰ کے قرب کی سلطنت لازوال حاصل ہوگئی۔ (معارفِ مثنوی، صفحہ: ۱۴۱ تا ۱۴۵)

شہوت کے گناہ سے حفاظت کا طبی علاج

غذا اس نفسِ سرکش کی تو کم کر
نہ کھا ہر روز ظالم مرغ و ماہی

حضرت والا ایک ظاہری تدبیر نفس سرکش کی شرارتوں سے حفاظت کے لیے بیان فرما رہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو جسم وروح دونوں کا حکیم بنایا ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب گرم غذائیں کھائیں جائیں گی تو انسان کی طبیعت میں شہوت کے جذبات اور مادے زیادہ پیدا ہوں گے اور طبیعت میں جوش اور ابھار کا سبب بنیں گے پھر اس کے نتیجہ میں شہوت کے گناہ کا واقع ہوجانا بہت ہی ممکن ہوگا اس لیے اس ظاہری جسمانی تدبیر کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔

مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کسی حلال اور پاکیزہ غذا کو اپنے اوپر حرام کرلینا کہ میں گوشت یا مرغی یا انڈا او مچھلی نہ کھاؤں گا، شرعی طور پر اس کو اسلام میں جائز رکھا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو اُس کے متعلق ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اُسے حرام کردیں یا اُس کے ساتھ حرام جیسا برتاؤ کریں۔ جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾
(سورۃ المائدۃ، اٰیۃ: ۸۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں (خواہ وہ کھانے پینے اور پہننے کی قسم سے ہوں یا منکوحات کی قسم سے ہوں) ان میں لذیذ (اور مرغوب) چیزوں کو (قسم وعہد کرکے اپنے نفسوں پر) حرام مت کرو اور حدود (شرعیہ) سے (جو کہ تحلیل وتحریم کے باب میں مقرر ہیں) آگے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ حدِّ (شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (معارف القرآن، جلد: ۳، صفحہ: ۲۱۹)

اس سوال کا جواب اس آیت کی تفسیر دیکھ کر صاف سمجھ میں آجائے گا کہ علاجاً وقتی طور پر کسی چیز سے بچنا یہ تحریمِ حلال میں داخل نہیں۔ اس لیے وہ شرعی طور پر گناہ نہیں۔ چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ ترکِ دنیا اور ترکِ شہوات ولذات ایک درجہ میں محبوب وپسندیدہ ہے، مگر

اس میں بھی حدودِ الٰہیہ سے تجاوز کرنا مذموم اور حرام ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لیے حرام کر لے۔ مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا۔ تیسرے یہ کہ اعتقاد قول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لیے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کر لے۔

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانونِ الٰہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

اور دوسری صورت میں اگر الفاظِ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے تو قسم ہو جائے گی۔ قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتبِ فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا یا فلاں کام نہ کروں گا۔ یا یہ کہے کہ میں فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بلاضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے، اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارۂ قسم ادا کرے۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو بدعت اور رہبانیت ہے، جس کا گناہِ عظیم ہونا قرآن وسنت میں منصوص ہے۔ اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے۔ ہاں! اگر ایسی پابندی بہ نیتِ ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس کے لیے اُن چیزوں کو مضر سمجھا، یا کسی بزرگ نے مضر بتلایا، اس لیے بطور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ یعنی اللہ کی حدود سے آگے نہ بڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

حد سے بڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ کسی حلال چیز کو بلا کسی عذر کے ثواب سمجھ کر چھوڑ دے، جس کو ناواقف آدمی تقویٰ سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ تعدّی اور ناجائز ہے۔ (معارف القرآن، جلد:۳، صفحہ:۲۲۰-۲۲۱)

باہی و جاہی مٹاؤ تو پھر عشقِ الٰہی پاؤ

جو اہلِ دل کی صحبت میں رہے گا
وہی پائے گا بس عشقِ الٰہی
ملی اخترؔ جسے نسبت خدا کی
مٹادی اس نے باہی اور جاہی

اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر ہی انسان کو کمالِ عشقِ خداوندی حاصل ہوسکتا ہے اس لیے حضرت نے فرمایا ہے کہ بس! وہی شخص عشقِ الٰہی پائے گا یعنی اس میں حصر مقصود ہے جیسا کہ ایک موقع پر میرے شیخ اول حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تبلیغ تشویق کا کام دیتی ہے اور خانقاہ تکمیل کا کام دیتی ہے یعنی تبلیغ میں لگ کر آدمی کو دین کا شوق پیدا ہوجاتا ہے لیکن اس کی تکمیل خانقاہ کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

اور اسی بات کو ایک مرتبہ حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمہ اللہ نے ایک تبلیغی اجتماع کے موقع پر وہیں اجتماع میں ایک بیان کیا کیونکہ کہ حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب اور حضرت ہردوئی رحمہ اللہ دونوں درستی تھے اس لیے حضرت جی نے موقع دلوایا، وہاں یہ بات ارشاد فرمائی کہ تبلیغ نافع تو ہے کافی نہیں اور اس کو خوب وضاحت سے بیان فرمایا اسی لیے اس دور کے اہل حق علماء کے متفق علیہ بزرگ مجدد وقت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اہل اللہ کی صحبت کو فرض عین قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے بغیر اصلاح کا کوئی امکان ہی نہیں ہے یوں درمیانی درجے کا مومن بن کر زندگی گزارنا کہ کبھی اچھے کام کر لیے کبھی برے یا زیادہ نیکیاں کر لی اور کچھ تھوڑے بہت گناہ بھی کر لیے یا طاعات بھی خوب کرتے رہے اور معاصی سے بھی بچتے بھی رہے مگر صرف ظاہری معاصی سے بچے اور باطنی معاصی کی طرف نظر ہی نہ گئی جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اور چھوڑ دو تم ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے گناہوں کو ان باطنی گناہوں کا پتہ اہل دل کی صحبت میں رہے بغیر نہیں چلتا اس لیے عشق خداوندی کی تکمیل اہل اللہ کی صحبت کے بغیر ممکن نہیں ہے جن لوگوں کو بھی یہ نسبت مع اللہ حاصل ہوئی ہے انہیں صرف اہل دل کی صحبت ہی کی برکت سے ہوئی البتہ یہ شرط ہے کہ ہر قسم کے گناہوں سے مکمل پرہیز ہو بالخصوص جاہی اور باہی گناہوں سے یعنی شہوت کے گناہوں سے اپنی پوری حفاظت کر رہا ہو اور جاہ اور مقام و منصب کی ہوس دل سے نکل چکی ہو ورنہ اس کے بغیر صحبت اہل دل بھی کارآمد نہیں ہے۔

دشت کو خواب گاہ کرتا ہوں

جب کبھی دل سے آہ کرتا ہوں
منزلیں پیش راہ کرتا ہوں

عشق کی نامراد وادی میں
اپنے غم سے نباہ کرتا ہوں

صبر کو شکوہ و گلہ کیوں ہے
ضبطِ غم بے پناہ کرتا ہوں

گریۂ اشک عشق میں کیا ہیں
گریۂ خون بھی گاہ کرتا ہوں

ساری خلقت سے دور ہو کے کبھی
دشت کو خواب گاہ کرتا ہوں

دردِ دل جب شدید ہوتا ہے
یاد میں ان کی آہ کرتا ہوں

لذتِ ذکر کیا کہوں اخترؔ
جھوم کر واہ واہ کرتا ہوں

مشکل الفاظ کے معانی:۔**نامراد**: اللہ تعالیٰ کے عشق میں اپنی حرام خواہشات کو نامراد کرنا۔ **نباہ**: دوستی۔ **ضبطِ غم**: گناہوں سے بچنے میں غم کو برداشت کرنا۔ **اشک**: آنسوؤں سے رونا۔ **گریۂ خون**: خون کے آنسو رونا۔ **خلقت**: مخلوق۔ **دشت**: جنگل۔ **دردِ دل**: دل پر دردوغم اٹھا کر گناہ سے بچنا۔

جب کبھی دل سے آہ کرتا ہوں
منزلیں پیش راہ کرتا ہوں

یعنی جب میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں آہ کرتا ہوں تو ہر آہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھا کرلے چلتی ہے اور میری منزلیں میرے سامنے کر کے مجھے اس تک پہنچنے کی خوشی کا پتہ دیتی ہے اس لیے اہل اللہ کی آہ وفغاں اور گریہ وزاری یہ اس راہ کی ترقی کا بہت بڑا سامان ہے جسے یہ چیز حاصل ہوتی ہے تو اسے قرب کی خاص لذت ملتی ہے اور سامعین کو بھی اس کی آہوں کے نتیجے میں منزلیں نظر آنے لگتی ہیں اور انہیں بھی قربِ حق تعالیٰ کا مزہ ملنے لگتا ہے کیونکہ وہ آہ دل سے نکل کر سامعین کے دلوں میں جا کر اثر کرتی ہے۔

عشق کی نامراد وادی میں
اپنے غم سے نباہ کرتا ہوں

اس میں حضرت والا جس کو عشق کی نامراد وادی فرما رہے ہیں یہ نامرادیاں دراصل اللہ کی مراد ہوا کرتی ہیں کیونکہ بندہ اسی نامراد وادی سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا خاص قرب پالیتا ہے اگر سالک اپنی تمام مرادوں کو پاتا ہوا چل رہا ہو اور بظاہر وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے سب کچھ مل جاتا ہو تو وہ اپنی ان دنیوی مرادوں اور تمناؤں کے پورے ہو جانے کی وجہ سے دنیا کے عیش وعشرت کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے لیکن جسے نامراد وادی سے گزارا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف جذب کرنا چاہتے ہیں اور اپنا بنانا چاہتے ہیں تو ہر اس کی وہ مراد جو مراد

خداوندی کے علاوہ ہوتی ہے اس سے اس کو محروم کردیا جاتا ہے اور اسی کی برکت سے پھر دل پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حسرتیں اور تمنائیں پورا نہ ہونے کا عجیب وغریب قسم کا غم ہوتا ہے جو خوشی سے بھرا ہوتا ہے اور جو عجیب وغریب لذتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت والا نے فرمایا ہے کہ میں عشق کی نامرادوادی میں اپنے مولیٰ کی محبت کے غم سے نباہ کرتا رہتا ہوں۔ یہ محبتِ الٰہیہ کی راہ میں دل پر گذرنے والی وہ عجیب وغریب کیفیات ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ کے عشاق ہی سمجھ سکتے ہیں۔

صبر کو شکوہ و گلہ کیوں ہے
ضبطِ غم بے پناہ کرتا ہوں
گریۂ اشک عشق میں کیا ہے
گریۂ خوں بھی گاہ کرتا ہوں

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں میں اس درجہ اس کے راستے کے غم اٹھاتا ہوں اور انہیں اپنے دل میں لیے رہتا ہوں کہ خود صبر کو یہ شکایت ہونے لگتی ہے کہ آخر کب تک ضبطِ غم کیا جائے گا اور کتنی خوشیوں کو پامال کیا جائے گا کچھ نہ کچھ تو دنیا کی خوشیاں بھی منالینی چاہیے اور تھوڑے بہت تو مزے اٹھالینے چاہیے لیکن مجھے یہ منظور نہیں ہوتا بس میں رضائے مولیٰ کے لیے ہر خوشی کو اللہ پر قربان کردیتا ہوں اور اس کے بدلے اس کے راستے غموں کو لے لیتا ہوں جس کے نتیجے میں صبر کو بھی شکوہ وگلہ ہونے لگا ہے کیونکہ اس قدر برداشت کرنا اور اس کے لیے ہمت کرکے آگے بڑھنا یہ خاص اولیاء اللہ کا حصہ ہوا کرتا ہے جیسا کہ ہمارے اکابر اور اسلاف کے واقعات اللہ کے لیے دل پر ہر قسم کی ایذاؤں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے اور سہنے کے کثرت سے تاریخ میں موجود ہیں اور اسی کا یہ اثر ہے کہ میری آنکھیں ہی اشک باری کرکے اس بے پناہ غم کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ جس طرح میں اللہ کے عشق میں آنکھوں سے آنسو بہاتا ہوں اسی طرح کبھی کبھی خون کا رونا بھی روتا ہوں۔

اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص آنکھوں کے آنسوؤں سے تو رولیتا ہے لیکن جب وہ بازاروں اور دوسرے مقامات پر جاتا ہے تو نامحرموں کو خوب دل بھر کر دیکھتا ہے اور وہاں عشق بازی بھی کرتا ہے تو گو کہ یہ شخص اشک باری تو کررہا ہے لیکن اپنی آرزوؤں کا خون کرکے اور حرام تمنائیں چھوڑ کر ناجائز خواہشات کے خون کے سمندر بہانے کے لیے تیار نہیں ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا وہ مزہ نصیب نہیں ہوگا۔ اسی کو حضرت والا نے یوں ارشاد فرمایا۔

ساری خلقت سے دور ہو کے کبھی
دشت کو خواب گاہ کرتا ہوں
دردِ دل جب شدید ہوتا ہے
یاد میں ان کی آہ کرتا ہوں

لذتِ ذکر کیا کہوں اختؔر
جھوم کر واہ واہ کرتا ہوں

خلاصہ ان اشعار میں ذکر کردہ مضمون کا یہ ہے کہ حضرت والا کبھی خلق خدا سے دور دراز جا کر جہاں مکمل خلوت ویکسوئی حاصل ہو کسی جنگل و بیابان میں یا دریا کے کنارے اور یا کسی دامنِ کوہ میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور وہاں جا کر یکسوئی کے ساتھ آرام فرما ہوتے ہیں اور اس جگہ کو خواب گاہ بناتے ہیں جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت والا کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا اور جب اللہ تعالیٰ کی محبتِ شدیدہ دل میں زور مارتی ہے اور مجبور بیان کرتی ہے تو کبھی اس دردِ دل کی شدت اللہ کے عشاق میں بیان فرما کر سکون حاصل کرتے ہیں اور کبھی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد میں آہ آہ کر کے اس شدید محبتِ خداوندی کو پیش کرتے ہیں اور آگے فرماتے ہیں کہ جب میں اللہ کا ذکر کرنے بیٹھتا ہوں تو حق تعالیٰ کے نام میں ایسی لذت ملتی ہے کہ بس اس کی ترجمانی کے لیے الفاظ نہیں ہیں میں مست ہو کر اپنے اللہ کے نام لیتے ہوئے جھوم جاتا ہوں اور سوائے واہ واہ اور خوشی میں جھومنے کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے
اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے
عاشقوں کا مینا اور جام ہے

پھرتا ہوں دل میں دردِ محبت لیے ہوئے

ظاہر میں اہلِ دل ہیں گو حسرت لیے ہوئے
باطن مگر ہے دولتِ نسبت لیے ہوئے

مانا کہ میر گلشنِ جنت تو دور ہے
عارف ہے دل میں خالقِ جنت لیے ہوئے

صحراؤں میں کبھی، کبھی دامانِ کوہ میں
پھرتا ہوں دل میں دردِ محبت لیے ہوئے

اک قلب شکستہ کے اور آہ فغاں کے ساتھ
میں چل رہا ہوں مشعلِ سنت لیے ہوئے

روئے زمیں پہ جو بھی ہے عہد وفا کے ساتھ
وہ ہر نفس ہے سایۂ رحمت لیے ہوئے

جو بے وفا کہ نفس کا اپنے ہوا غلام
جیتا ہے سر پہ سینکڑوں لعنت لیے ہوئے

اپنے تو کیا ہیں غیر بھی کرتا ہے احترام
چہرہ پہ جو ہے داڑھی کی زینت لیے ہوئے

اک میر خستہ حال بھی اخترؔ کے ساتھ ہے
گذرے ہے خوب عشق کی لذت لیے ہوئے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ **عارف:** اللہ والا۔ **دامانِ کوہ:** پہاڑ کے دامن۔ **عہدِ وفا کے ساتھ:** اللہ تعالیٰ سے گناہ نہ کرنے کے وعدے کے ساتھ۔ **نفس:** سانس۔

گلشن جنت دور مگر خالق جنت دل میں موجود

ظاہر میں اہلِ دل ہیں گو حسرت لیے ہوئے
باطن مگر ہے دولتِ نسبت لیے ہوئے
مانا کہ میر گلشنِ جنت تو دور ہے
عارف ہے دل میں خالقِ جنت لیے ہوئے

عام طور پر ظاہر میں اہل اللہ کی حالت اتنی اچھی اور خوشگوار نہیں ہوتی اور وہ ظاہری زیبائش اور آسائش کے ساتھ دلچسپی نہیں رکھتے نہ ہی اُنہیں ظاہری دنیاوی خوشیوں کے ساتھ قلبی تعلق ہوتا ہے بلکہ اُن کا دل حقیقت میں اِن سے گھبراتا ہے۔ بظاہر تو وہ بجھے بجھے اور ہلکی پھلکی شکل وصورت والے ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمالِ تعلق اور نسبتِ خاصہ حاصل ہونے کی وجہ سے اُن کا باطن اور اندرونِ قلب دنیا کے ظاہری گلستان اور گلشنوں سے زیادہ پُر کیف اور پُر بہار ہوتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ گلشنوں اور ظاہری زیبائش اور آرائش سے دور ہیں لیکن دنیا کے سارے پھولوں میں خوشبو ڈالنے والا اور حسینوں کو حسن دینے والا اور گلشنوں وگلستانوں کو مختلف پھولوں سے سجانے والا اللہ ان اہل اللہ کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ بمقتضائے حدیث شریف اللہ تعالیٰ اولیاء اللہ کے دل میں موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی وقت بھی بے چین اور بے سکون نظر نہیں آتے۔ تو اس لیے اسی دنیا میں رہتے ہوئے نقد اور کیش اُن کو خالقِ جنت سے تعلق کا لطف ملتا رہتا ہے۔ رہ گئی آخرت کی جنت اور اُس کی بہاریں تو اگرچہ وہ دور ہیں اور دیر سے ملنے والی ہیں لیکن وہ بھی یقینی ہیں اور اُن جنتوں کے خالق کے دل میں ہونے کی وجہ سے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اہل اللہ کو دنیا میں رہتے ہوئے جنت اور خالقِ جنت دونوں کا مزہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔

صحرا ہو یا دامنِ کوہ میری جنت میرے ساتھ ہے

صحراؤں میں کبھی، کبھی دامانِ کوہ میں
پھرتا ہوں دل میں دردِ محبت لیے ہوئے
اک قلب شکستہ کے اور آہ فغاں کے ساتھ
میں چل رہا ہوں مشعلِ سنت لیے ہوئے

اللہ والوں کو دنیا کے بنگلوں اور شاندار عمارتوں سے دلچسپی نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ خلوتوں کی جگہوں کو اور دنیا سے دوری اور بے رغبتی والے مقامات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ گو کہ کبھی ان عمارتوں میں ان کا مسکن ہو مگر کبھی صحراؤں میں اور کبھی دامنِ کوہ میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے بھرا دل لیے پھرتے ہیں۔ اور وہ دل وہی ہوتا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مختلف ارمانوں اور حسرتوں کا خون کر کے توڑ دیا گیا ہو۔ اور جب کوئی اس دل کے ساتھ پھرتا ہے تو پھر اس کی تجلّی اور اس کی آہ وفغاں کا رنگ بھی الگ ہوتا ہے۔ ہمارے مشائخِ اہلِ حق اور خاص طور پر ہمارے حضرت والا دامت برکاتہم اللہ تعالیٰ کی محبت میں تڑپتا ہوا دل لیے ہونے کے ساتھ ہر وقت اپنے شیخ والی فکر فکرِ احیائے سنت بھی ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت نے اس پر ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا جس کا نام ہے ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنتیں'' اور حضرت والا کا کیا ہی خوب شعر ہے۔

نقشِ قدمِ نبی ﷺ کے جنت کے راستے
اللہ جل جلالہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

مشعلِ سنت ہو تو پھر راہ بھٹکنا ممکن نہیں

اور یہی مشعلِ سنت لیے پھرنا ہمارے مشائخ اہلِ حق کا خاص امتیازی وصف ہے اور یہی معیارِ بزرگی اور للّٰہیت ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ اتباعِ سنت پر بڑی شد و مد کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ میں نے بڑے بڑے مقامات طے کیے اور علومِ ظاہرہ، فقہ و تفسیر و حدیث وغیرہ بھی حاصل کی ہے۔ اور پھر چاروں سلسلوں کے مجاہدات اور ریاضتیں برداشت کیں۔ اور پھر سب کچھ سے فارغ ہو کر عجیب عجیب مقامات حاصل ہوئے۔ یہاں تک کہ میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا کہ اگر میں علمائے ظاہر پر ظاہر کردوں تو مجھے کافر کہہ دیں گے۔ اور اگر اُن اسرار و رموز کو علمائے باطن پر کھول دوں تو وہ مجھے زندیق کہیں گے۔ لیکن پھر سب سے گذر کر ایک اگلا مقام آیا جہاں پہنچ کر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خلعت و لباس پہنایا۔ اور اب میں کہتا ہوں کہ اُن سارے مقامات کی میری نگاہ میں کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ بس اب ایک ہی دعا کرتا ہوں اور جو بھی اُس پر آمین کہے تو وہ بھی فلاح پائے اور کامیاب ہو اور پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اتباعِ سنت کی توفیق عطا فرما اور آگے فرماتے ہیں کہ سارے مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ مقامِ ولایت کا نچوڑ اور لبِّ لباب اتباعِ سنت ہے کہ سنت پر زندہ رہنا اور سنت ہی پر مرنا نصیب ہو۔ اس لیے احقر مختلف مقامات میں یہ بات لکھ چکا ہے کہ کشف و کرامت بزرگی کی دلیل نہیں۔ اور ایک مقام پر حضرت مجدد الف ثانی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی ساری رات نفلیں پڑھتا رہے لیکن صبح کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھے تو اُس کی لاکھوں کروڑوں تہجد سے بہتر فجر کی نماز باجماعت پڑھنا ہے۔ اسی طرح کروڑوں صدقات دینے سے بڑھ کر زکوٰۃ کے ایک درہم کی ادائیگی ہے۔ اور تائب صاحب نے اسی کو اپنے خاص انداز سے یوں ذکر فرمایا۔

ہواؤں میں اُڑنا نہ پانی پہ چلنا
شریعت و سنت کے سانچے میں ڈھلنا
یہی کچھ سکھاتے ہیں مرشد ہمارے
یہی سب ہیں اُن کی کرامت کی باتیں

اللہ کے باوفا بندے ہر سانس اُس کے سایہ کے نیچے ہیں

روئے زمیں پہ جو بھی ہے عہدِ وفا کے ساتھ
وہ ہر نفس ہے سایۂ رحمت لیے ہوئے
جو بے وفا کہ نفس کا اپنے ہوا غلام
جیتا ہے سر پہ سینکڑوں لعنت لیے ہوئے

کتاب میں بعض مقامات پر یہ مضمون بھی گزر چکا ہے کہ جو بندے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے اور اُس کی نافرمانی اور گناہوں سے بچتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں تو اُن کے اوپر حق تعالیٰ کی خاص رحمت کا سایہ ہوتا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''ان رحمت اللہ قریب من المحسنین'' کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے۔ اس لیے ایسے لوگ سایۂ رحمت میں ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور آگ سے دنیا و آخرت میں محفوظ ہوجاتے ہیں کہ نہ وہ دنیا میں بے چین ہوں گے اور نہ آخرت میں پریشان ہوں گے۔ اور شعر میں جس عہدِ وفا کا تذکرہ کیا گیا ہے ظاہر ہے اس سے وہی عہد الست مراد ہے جو تمام بنی آدم سے لیا گیا تھا کہ صرف میری ہی عبادت کرنا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''الست بربکم قالوا بلیٰ'' اللہ تعالیٰ نے سب ارواح کو اکٹھا جمع فرما کر وہیں عالمِ ارواح میں یہ سوال پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا تھا کہ بے شک کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''الم أعهد الیکم'' اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ شیطان تمہارا صریح دُشمن ہے اور صرف میری ہی عبادت کرو، بس یہی سیدھا راستہ ہے۔ اس لیے عہد کی پابندی اور پاسداری یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزارے اور جو نفس کی فرمانبرداری اور اُس کی غلامی میں زندگی گزارتا ہے اور اللہ کا بے وفا بن کر رہتا ہے تو اُس کے سر پر سینکڑوں لعنتیں برستی رہتی ہیں، کیونکہ بہت سے گناہ تو ایسے ہیں جن پر صراحتاً جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور اللہ اور فرشتوں کی لعنت کا تذکرہ فرمایا ہے اور باقی دوسرے گناہوں کے کرنے کے وقت بھی انسان کے اوپر سے رحمت کا سایہ ہٹ جاتا ہے تو وہ خود بخود لعنت کے زیرِ سایہ پہنچ جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کی صورت ہو تو اپنے تو اپنے غیر بھی احترام کرتے ہیں

اپنے تو کیا ہیں غیر بھی کرتا ہے احترام
چہرہ پہ جو ہے داڑھی کی زینت لیے ہوئے

ایک میر خستہ حال بھی اختؔر کے ساتھ ہے
گذرے ہے خوب عشق کی لذت لیے ہوئے

حضرت والا دامت برکاتہم دین کی پابندی اور اپنے ظاہری و باطن کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق سجا لینے اور کر لینے کا ایک خاص فائدہ بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں یہ اثر رکھا ہے کہ جو پکا دیندار ہو جاتا ہے تو اپنے اور پرائے سب اُس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ بالخصوص جس شخص کا چہرہ ڈاڑھی کی سنت کے ساتھ آراستہ ہو جائے تو حق سبحانہ وتعالیٰ اُس کی برکت سے اُس شخص کو لوگوں میں معزز فرما دیتے ہیں۔

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت احادیث مبارکہ کی روشنی میں

بخاری شریف کی حدیث ہے:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوا اللُّحٰى وَأَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهٗ﴾

(صحیح البخاری، باب تقلیم الاظفار، ج: ۲، ص: ۸۷۵)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرکین کی مخالفت کرو، ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو کٹاؤ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب حج یا عمرہ کرتے تھے تو اپنی ڈاڑھی کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیتے تھے پس جو مٹھی سے زائد ہوتی تھی اس کو کاٹ دیتے تھے۔

اور بخاری شریف کی دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْهَكُوا الشَّوَارِبَ وَأَعْفُوا اللُّحٰى﴾

(صحیح البخاری، باب اعفاء اللحی، ج: ۲، ص: ۸۷۵)

یعنی مونچھوں کو خوب باریک کتراؤ اور ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ۔

پس ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنا واجب ہے جس طرح وتر کی نماز واجب ہے، عید الفطر کی نماز واجب ہے، بقرعید کی نماز واجب ہے، اسی طرح ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور چاروں اماموں کا اس پر اجماع ہے۔ کسی امام کا اس میں اختلاف نہیں۔ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

﴿اَمَّا اَخْذُ اللِّحْيَةِ وَهِيَ مَادُوْنَ الْقَبْضَةِ كَمَا يَفْعَلُهٗ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُبِحْهُ اَحَدٌ﴾

(فتاوی شامیہ، ص: ۱۲۳)

﴿وَاَمَّا الْاَخْذُ مِنْهَا وَهِيَ دُوْنَ ذٰلِكَ كَمَا يَفْعَلُهٗ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُجِزْهُ اَحَدٌ وَاَخْذُ كُلِّهَا فِعْلُ الْيَهُوْدِ الْهِنْدِ وَمَجُوْسِ الْاَعَاجِمِ﴾

(فتح القدیر، الدر المختار)

یعنی ڈاڑھی کا کترانا جبکہ وہ ایک مٹھی سے کم ہو جیسا کہ بعض اہلِ مغرب اور ہیجڑے لوگ کرتے ہیں کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی کا منڈانا یا ایک مٹھی سے کم پر کترانا دونوں حرام ہیں اور ڈاڑھی ڈاڑھ سے ہے اس لیے ٹھوڑی کے نیچے سے بھی ایک مٹھی ہونی چاہیے اور چہرہ کے دائیں اور بائیں طرف سے بھی ایک مٹھی ہونا چاہیے یعنی تینوں طرف سے ایک مٹھی ڈاڑھی رکھنا واجب ہے۔ بعض لوگ سامنے یعنی ٹھوڑی کے نیچے سے تو ایک مٹھی رکھ لیتے ہیں لیکن چہرہ کے دائیں اور بائیں طرف سے کترا دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لیں کہ ڈاڑھی تینوں طرف سے ایک مٹھی رکھنا واجب ہے۔ اگر ایک طرف سے بھی ایک مٹھی سے چاول برابر کم یعنی ذرا سی بھی کم ہوگی تو ایسا کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ (بہشتی زیور، جلد:۱۱، صفحہ:۱۱۵)

کسریٰ کے قاصدوں سے حضور ﷺ کا منہ پھیر لینا اور ہمارے لیے عبرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسریٰ بادشاہ کے دو قاصد آئے، اُن کی ڈاڑھیاں منڈی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے چہرہ مبارک پھیر لیا، ان کی صورتوں کو دیکھنا تک گوارا نہ فرمایا اور ان سے پوچھا کہ تمہیں ڈاڑھی منڈانے کا حکم کس نے دیا؟ وہ بولے کہ ہمارے ربّ کسریٰ نے۔ عجمی لوگ اپنے بادشاہوں کو رب کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے تو میرے رب نے ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھیں کاٹنے کا حکم فرمایا ہے۔“ (البداية والنهاية وغيرهما)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے رب نے تو یہ حکم فرمایا ہے کہ ڈاڑھی بڑھاؤ۔ اب جو لوگ ڈاڑھی منڈاتے ہیں وہ کہنے کو تو مسلمان ہی ہیں مگر تنہائی میں بیٹھ کر ذرا غور کریں اور دل کی گہرائیوں سے سوچیں کہ اپنا رشتہ کس سے جوڑ رہے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرما دیا ہے: ”میرا رب اللہ ہے جس نے مجھے ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھیں کاٹنے کا حکم فرمایا ہے۔“ آتش پرست مجوسیوں نے کہا کہ ہمارا رب کسریٰ جس نے ڈاڑھی منڈانے اور مونچھیں بڑھانے کا حکم دیا ہے۔

اب ڈاڑھی منڈے ذرا انصاف سے بتائیں ان کا رب اللہ ہے یا کسریٰ؟ یا اللہ! تو ہمارا رب ہے، ہمیں دل و جان سے ظاہر و باطن سے صورت و سیرت سے اپنی ربوبیت کا تابع کر دے، کفار کی مشابہت سے دُور رکھ۔

کسریٰ سے متعلق جانتے بھی ہیں یہ کون تھا؟ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دُشمن، جس ملعون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک چاک کر دیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں حد درجہ گستاخی کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو جواب دیا: ”وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) میرا غلام ہو کر مجھے خط لکھتا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مزق الله ملكه''، یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو یونہی ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔'' (صحيح البخاری)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حرف بحرف سچا ثابت ہوا۔ اس ملعون کو اس کے بیٹے نے قتل کردیا اور خود تخت نشین ہوگیا۔ اس ملعون کا ملعون جانشین بھی چھ ماہ سے زائد زندہ نہ رہ سکا۔ تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ چار سال کے اندر اندر دس بادشاہ تبدیل ہوئے۔ آخر چند سال بعد یہ ملک مسلمانوں کے زیرِ نگین آ گیا۔ اس صدیوں پرانی سلطنت کا نام ونشان مٹ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی (اذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعدهٗ (مسلم) ''اس کسریٰ کے مرنے کے بعد کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا۔) کی تصدیق پوری دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لی۔

ڈاڑھی منڈے اس ملعون کا انجام سامنے رکھ کر سوچیں کہ اپنا رشتہ کس سے جوڑ رہے ہیں؟ اپنا رب کس کو تسلیم کررہے ہیں؟ اگر کسی نے اب تک اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے شیطان سے ناتا جوڑے رکھا تو اب بھی کچھ گیا نہیں کہ ابھی وقت ہے ؎

ظالم ابھی ہے فرصتِ توبہ نہ دیر کر
وہ بھی گرا نہیں جو گرا پھر سنبھل گیا

اس قصہ میں چند باتیں سوچنے کی ہیں:

(۱)...... ایک یہ کہ دونوں قاصد کافر تھے اور قاعدہ یہ ہے کہ کسی بھی کافر کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کی جاتی ہے، اسے احکامِ اسلام کی تلقین نہیں کی جاتی کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو بلکہ اسے تو یہی کہا جاتا ہے کہ اسلام قبول کرو، اگر کرلے تو اب اَحکام کی تبلیغ کی جائے گی، وہ دونوں ڈاڑھی منڈے کافر تھے۔

(۲)...... دوسری بات یہ کہ مہمان تھے، مہمان کوئی بھی ہو اس کی خاطرداری کی جاتی ہے۔

(۳)...... تیسری بات یہ کہ بادشاہ کے قاصد تھے۔ قاصدوں کا ویسے ہی احترام کیا جاتا ہے خواہ دُشمن کے ہی بھیجے ہوئے ہوں۔ یہ احترام اس پہلو سے بھی ضروری ہے کہ شاید ان کی اور ان کے بھیجنے والے سلاطین کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر سوچیں کہ وہ مسلمان نہیں، ہیں بھی مہمان اور بادشاہ کے بھیجے ہوئے قاصد! لیکن رعایت کے ان سب اسباب کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف التفات نہیں فرماتے۔ ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں فرماتے۔

صورت شفاعت کے قابل نہ ہوئی تو

اس سے اندازہ لگائیں کہ جو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صورت اختیار کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں وہ خود کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے امیدوار کیوں کر سمجھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا چہرہ دیکھنا بھی گوارا نہ فرمائیں، ان کی سفارش کیوں کر فرمائیں گے؟

حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کو حوضِ کوثر پر پانی پلا رہے ہوں گے ایک قوم حوضِ کوثر پر آنا چاہے گی لیکن فرشتے انہیں روک دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ یہ تو میری اُمت کے لوگ ہیں اُن کو آنے دو۔ فرشتے عرض کریں گے اِنَّکَ لاَ تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا بدعات ایجاد کیں۔ یہ بظاہر آپ کو اپنے اُمتی نظر آ رہے ہیں مگر آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے دین میں کیسی نئی نئی باتیں داخل کر دیں؟ یہ جنہیں آپ اپنی اُمت سمجھ رہے ہیں بدعتی ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَیَّرَ بَعْدِیْ جن لوگوں نے میرے بعد لایا ہوا دین تبدیل کر دیا انہیں دُور ہٹاؤ، دور ہٹاؤ۔ (صحیح البخاری)

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان بدعتیوں کی شکل وصورت تو مسلمانوں کی سی ہوگی، اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اشتباہ ہوگا، ان کی ڈاڑھیاں اور معصوم چہرے دیکھ کر فرشتوں سے فرمائیں گے انہیں کیوں ہٹاتے ہو؟ یہ تو میرے اُمتی ہیں۔ پھر حقیقت کھلنے پر انہیں دفع کر دیں گے لیکن جن کے چہرے پر ڈاڑھی ہی نہیں، شکل وصورت ہی مسلمانوں سے مختلف ہے، ان کو حوضِ کوثر تک رسائی کیسے ہوگی؟ بدعتیوں کی صورت تو مسلمانوں کی سی ہوگی اس لیے وہ کسی طرح حوضِ کوثر تک پہنچ جائیں گے لیکن قریب پہنچنے پر انہیں دھکیل کر دور کر دیا جائے گا، اور جن کی صورت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ سے مختلف ہوا نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے بلائیں گے؟ انہیں دیکھ کر تو کسی قسم کا اشتباہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ ڈاڑھی منڈے ابھی سے سوچ لیں کہ اگر خدانخواستہ! دور سے ان کی شکل دیکھ کر ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ سُحْقًا سُحْقًا انہیں دور ہٹاؤ، دور ہٹاؤ۔ لے جاؤ جہنم میں، تو کیا بنے گا؟ (خطبات الرشید، ''اللہ کے باغی مسلمان''، صفحہ ۳۵-۳۸)

ایرانی اور مرزا قتیل کا واقعہ

دِلی کے مشہور شاعر مرزا قتیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثناء میں بہت اعلیٰ درجے کی نعتیں کہا کرتے تھے۔ عشق ومحبت میں ڈوبا ہوا ان کا فارسی کلام کسی ایرانی نے سنا تو اسے خیال گزرا کہ شاید کوئی بڑے عارف اور صاحبِ نسبت بزرگ ہیں۔ اس لیے ایران سے سفر کر کے دِلی ان کی زیارت کو پہنچا۔ ان کے گھر جا کر پتا کیا تو گھر والوں نے بتایا کہ مرزا صاحب حجام کی دکان پر گئے ہیں۔ حجام کی دکان پر گیا وہاں دیکھا کہ عاشق رسول شاعر صاحب ڈاڑھی

منڈوا رہے ہیں۔ یہ گریہ نظر دیکھ کر اس کے نادیدہ عاشق بے چارے ایرانی کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور پوچھا کہ ''آغا! ریش می تراشی؟'' اے عاشقِ رسول! یہ کیا؟ ڈاڑھی منڈا رہا ہے؟ اس نے بھی شاعرانہ انداز سے جواب دیا ''بلے ریش می تراشم و لے دل کسے نمی خراشم''۔ ہاں ڈاڑھی ہی منڈا رہا ہوں کسی کا دل تو نہیں دُکھا رہا۔ آگے اس ایرانی کا جواب بھی سنیئے! یا اللہ! تجھے تیری اس رحمت کا صدقہ تو اس ایرانی کا جواب ہم سب کے دلوں کی گہرائی میں اُتار دے۔ وہ بولا: ''نادان! دلِ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی۔'' ارے نادان! تو کہتا ہے میں کسی کا دل نہیں دُکھا رہا تو تو دونوں جہانوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دُکھا رہا ہے۔

جادوگروں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت کا اثر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جادوگر اپنی رسیاں اور چھڑیاں لے کر آئے۔ انہیں پھینکنے کی دیر تھی کہ وہ سب کے سب سانپ بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عصا پھینکا جو بہت بڑا اژدھا بن گیا اور جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر تمام جادوگر ایمان لے آئے۔ ایمان بھی کتنا پختہ کہ فرعون نے جب دھمکی دی کہ تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوادوں گا، تمہیں سولی پر لٹکادوں گا تو وہ للکار کر کہتے ہیں:

﴿فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾

(سورۂ طٰہٰ، آیۃ: ۷۲)

ترجمہ: اے مردود! تو کس چیز سے ہمیں ڈرا رہا ہے؟ جو چاہے فیصلہ کردے تو ہمارا کر کیا لے گا؟ زیادہ سے زیادہ ہماری جان لے لے گا، دنیوی زندگی ختم کر دے گا۔

انداز ہ لگایئے! دنیوی زندگی کی قدر و منزلت ان کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ رہی تھی، دنیا کی زندگی ختم بھی ہوگئی تو کیا ہو گیا وطن پہنچ جائیں گے۔ بس اِدھر ایمان لائے اور اُدھر انہیں اتنا اونچا مقام حاصل ہو گیا، وقت کے سب سے بڑے جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر کہتے ہیں کہ ہمارا جو چاہے کر لے، جادوگروں کو تو اللہ تعالیٰ نے اتنا اونچا مقام عطا فرمایا، مگر ان کے مقابلہ میں فرعون جو سالہا سال موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہا بلکہ انہیں اپنی گود میں پالا، راندۂ درگاہ ہی رہا۔ ہوتا تو سب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے لیکن حضراتِ مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس کا ایک ظاہری سبب یہ تھا کہ جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لباس میں آئے تھے۔ اس زمانہ میں یہ مقابلہ کا ایک طریقہ تھا۔ شاید اب بھی دنیا میں کہیں اس کا رواج ہو۔ بہر حال اس وقت یہی دستور تھا کہ مقابلہ کے دونوں فریق ایک لباس میں ہوں۔ جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو پابند نہ کر سکتے تھے کہ ہمارے جیسا لباس پہنیں، اس لیے انہوں نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا لباس پہن لیا، بس لباس میں مشابہت پر ہی اللہ کی رحمت کو جوش آ گیا اور ایک لمحہ میں ہی ان کی کایا پلٹ دی۔ انداز ہ لگایئے! محبوب کی صورت اختیار کرنے کا کیا اثر ہوتا ہے؟ (خطبات الرشید ''اللہ کے باغی مسلمان'' صفحہ ۵۱-۵۷)

جب نبی ﷺ محبوب تو آپ کی ہر ادا بھی محبوب

اور ڈاڑھی کٹانے والے حضرات کو اس اعتبار سے بھی اپنے اس عمل پر غور کرنا چاہیے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب اور پیارے نبی تھے تو آپ کی ظاہری اور باطنی جتنی خوبیاں اور کمالات ہیں وہ بھی اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہیں۔ اس لیے آپ کی شکل وصورت اور آپ کے اخلاق وعادات بھی اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ شادی وغیرہ کے موقع پر اکثر جوان اپنی محبوب بیوی کے لیے خوبصورت اور عمدہ قسم کا لباس ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور اپنی پسند اور چاہت کے مطابق اُس کا رنگ اور مٹیریل (Materia l) پسند کر کے لاتے ہیں اور بیوی کو پیش کرتے ہیں کہ میں تمہیں جس صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں اور جو لباس مجھے پسند ہے تم میری پسند کے مطابق اس کو پہنو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اپنے بندے کو اُسی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں جو اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ محبوب اور پیاری صورت ہے۔ اور وہ وہی صورت ہے جو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی۔ اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور علمائے صالحین کو عطا کی گئی۔ یعنی جس میں ایسا چہرہ شامل ہے جو ڈاڑھی کی خوبصورت زینت اپنے اوپر سجائے ہوئے ہے لہٰذا اے وہ لوگو! جو اللہ کی نگاہ میں محبوب اور پیارے بننا چاہتے ہوں تو پھر اللہ کے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت بنالو۔ تو ان شاء اللہ ہم اور آپ بھی اللہ کے محبوب بن جائیں گے۔

ڈاڑھی کٹا کر کھلم کھلا اللہ کا باغی بننا

اور اے ڈاڑھی کٹانے والے قابلِ رحم بھائیو! کیا آپ نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دو قسم کے گنہگاروں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک وہ گنہگار جو کسی گناہ کو چھپ کر کرتا ہے اور اگر توبہ کی توفیق ہو جائے تو توبہ کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم اُسے حجاب اور شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور دوسرا وہ گنہگار جو کھلم کھلا اور برسرِ عام گناہوں کو کرتا پھرتا ہے اور اُن پر اُس کی جسارت ودلیری اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اُسے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اور نہ اُس کے کرنے میں کوئی عار اور شرم لاحق ہوتی ہے۔ تو ایسے گنہگار کے اوپر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت ترین وعید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

﴿كُلُّ اُمَّتِىْ مُعَافًى اِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ﴾

(متفق علیہ)

کہ میری ساری اُمت قابلِ معافی ہے اور اللہ کی شانِ رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو بخش دے۔

یعنی اگر اللہ کی رحمت جوش میں آئے تو وہ پھر کسی ضابطے کی پابند نہیں بلکہ ہر ایک کو اللہ کی معافی شامل ہو جائے گی۔ گو کہ ضابطہ اور قانون کی بات تو شریعت میں صاحبِ شریعت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ بتائی گئی ہے کہ بڑے گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے اگرچہ صغیرہ گناہ دوسرے نیک اعمال کے ذریعے معاف ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن کس قدر قابلِ رحم ہیں وہ لوگ جو اللہ کے اس عام معافی کے اعلان میں شامل ہونے سے بھی بزبانِ نبوت مستثنیٰ اور علیحدہ کر دیے گئے کہ اس عام معافی کے اعلان سے بھی وہ لوگ مستثنیٰ جو کھلم کھلا گناہ کرنے والے ہیں اور سرعام اللہ کی نافرمانی کرنے والے ہیں۔ یعنی ایسے گنہگاروں کا ٹولہ اور گروہ جو نہ خالق سے شرماتے ہیں اور نہ مخلوق سے اُنہیں یہ والی معافی بھی نہیں ملے گی۔ اب آپ غور سے اس معاملے میں سوچیں کہ ڈاڑھی کٹا کر مسلمان کھلے عام اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا اعلان کرتا پھرتا اور وہ ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوتا ہے کہ جو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اور دوسرے گناہ اگرچہ گناہ ہیں اور باعثِ عذابِ خداوندی ہیں مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اور جیتے مرتے ہر حال میں انسان کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب قبر میں اُتر رہا ہے تو اس گناہ کو ساتھ لے کر اُتر رہا ہے۔ اس پہلو سے اس گناہ کی شدت اور سنگینی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ احقر کے ایک دوست جنوبی افریقہ میں رہتے ہیں اور زندگی بھر ڈاڑھی کٹاتے رہے تو ایک دن ملاقات کے دوران جب اُن سے اس موضوع پر بات کی گئی تو مسکرا کر کہنے لگے کہ ہاں! یہ بات بالکل صحیح ہے اور ڈاڑھی رکھنی چاہیے۔ لیکن جب احقر نے اس کھلم کھلا گناہ کے پہلو اُن پر واضح کیا اور یہ کہ اس گناہ کے ذریعے سے مسلمان ہر وقت عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے باغی ہونے کا اعلان کرتا رہتا ہے تو وہ یہ سن کر یکلخت چونک اُٹھے اور کہنے لگے کہ اس انداز سے میں نے کبھی اس پر سوچا ہی نہیں تھا۔ بہت ہی نادم اور شرمندہ ہوئے اور اپنی حالت پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔

اس لیے احقر ہر شخص کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ آخری لمحۂ حیات آنے سے پہلے اپنی حالت پر سنجیدگی سے غور کریں اور محض ان باتوں کو مولوی یا صوفیوں کی بات کہہ کر ایک طرف نہ ڈال دے بلکہ یہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے یہ سارا قرآن و حدیث ہے اور صرف اللہ اور رسول کی بات ہے۔ کوئی بھی مولوی یا عالم اپنی کسی فیکٹری میں کسی بات کو بنا کر پیش نہیں کرتا بلکہ وہ صرف بتاتا ہے۔ یعنی بنانا اللہ کا کام ہے اور انبیاء و علماء کا کام بتانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح فہم اور سمجھ عطا فرما کر اُس پر عمل استقامت کے ساتھ نصیب فرما دے۔

حضرت میر صاحب دامت برکاتہم کو لذتِ حیات مل گئی

اس کے بعد حضرت والا فرماتے ہیں کہ احقر کے ساتھ رہنے کی برکت سے جو میر عشرت جمیل صحبتوں اور خدمتوں کے ذریعے سے دل خوش کر کے عشقِ خداوندی کی لذت اُٹھا رہے ہیں تو کوئی خود اُن سے پوچھ کر دیکھے کہ وہ کیسی بہاروں میں ہیں۔ اور گویا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے پیرائے میں حضرت والا نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور حضرت میر صاحب کے اس وصفِ خاص محبتِ خداوندی کو ایک خاص انداز سے ذکر فرمایا ہے۔ اور اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ جو کسی اللہ کے عاشق کے ساتھ رہے گا اُسے خود بخود عشق کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

انعامِ خونِ آرزو

جہانِ رنگ و بو میں ہر طرف بس آب و گل پایا
مگر عاشق کے آب و گل میں ہم نے دردِ دل پایا
ہمارے خونِ حسرت پر فلک رویا زمیں روئی
مگر اے دل مبارک ہو کہ تو نے دردِ دل پایا

پھرتا ہوں دل میں درد بھرا دل لیے ہوئے

پھرتا ہوں دل میں درد بھرا لیے ہوئے
اور ہر نفَس میں قربِ منازل لیے ہوئے
پھرتا ہے مجھ کو عشق لیے چاک گریباں
گرچہ خرد ہے طوق و سلاسل لیے ہوئے
جی چاہتا ہے ایسی جگہ میں رہوں جہاں
جیتا ہو کوئی درد بھرا دل لیے ہوئے
مانا کہ ہے طوفاں میں محبت کا سفینہ
لیکن ہے ساتھ لطف سوا حل لیے ہوئے
غفلت کا ان کے دل پہ نہ کرنا کبھی گماں
ہنستے ہیں ایک درد بھرا دل لیے ہوئے
میں ڈھونڈتا ہوں تجھ کو محبت کہاں ہے تو
اک قلب شکستہ ترے قابل لیے ہوئے
اخترؔ اُسی کا فیض ہے عالم میں چار سُو
پھرتا ہے جو بھی درد بھرا دل لیے ہوئے

مشکل الفاظ کے معانی:۔ منازل: اللہ تعالیٰ کے محبت کے درجات۔ **چاک گریباں**: کنایہ ہے اللہ تعالیٰ کے عشق سے۔ **خرد**: عقل۔ **طوق**: کڑا۔ **سلاسل**: زنجیریں۔ **سفینہ**: کشتی۔ **سواحِل**: ساحل۔ **قلبِ شکستہ**: ٹوٹا ہوا دل۔ **چار سُو**: چاروں طرف۔

میرا سفر و حضر اور خلوت و جلوت اللہ پر فدا ہے

پھرتا ہوں دل میں درد بھرا لیے ہوئے
اور ہر نفَس میں قربِ منازل لیے ہوئے
پھرتا ہے مجھ کو عشق لیے چاک گریباں
گرچہ خرد ہے طوق و سلاسل لیے ہوئے

لوگ دنیا میں مختلف اپنے دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے ہر طرف سفر کرتے اور چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ کوئی اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے اپنے مال و دولت کے نشے میں اور کوئی کسی حسین و حسینہ کے چکر میں

مختلف دور دراز ملکوں کے سفر کرنا گوارا کرتا ہے۔ کوئی وزارتوں وحکومتوں اور منصبوں اور عہدوں کی خاطر صبح سے شام اور شام سے صبح سفر و اسفار میں سرگرداں و پریشان پھرتا رہتا ہے، تو کوئی اپنے نام ونمود اور شہرت وعظمت کی چاہت میں ہر سمت بھاگا پھرتا ہے، مگر اللہ کے وہ نیک بندے جو اپنے سینے میں ایسا دل رکھتے ہیں جو حقیقت میں دل کہلانے کے قابل ہے یعنی جو اللہ کی محبت کے درد سے بھرا ہوا ہے، اُن کے چلنے پھرنے اور اُن کی نقل وحرکت کا مقصد اور غرض وغایت بس ایک بات ہوتی ہے کہ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی تدبیریں اور طریقے سالکین کو بتائے جائیں اور ہر سانس قدم بہ قدم لحہ بہ لحہ منزلِ مقصود کی طرف خود بھی بڑھ رہے ہوں اور لوگوں کو بھی بڑھایا جارہا ہو، کیونکہ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا ہر سانس اللہ تعالیٰ کی یاد میں رچا بسا ہوتا ہے۔ چاہے خلوتوں میں اللہ کا ذکر ہو یا جلوتوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت کے تذکرے ہوں۔ اسی لیے ایسے لوگوں کی زندگی ہی زندگی کہلانے کے قابل ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا جینا، جینا ہے اور مرنا، مرنا ہے۔

اور جب یہ دولت کسی کے دل کو میسر آجاتی ہے اور وہ عشقِ خداوندی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے تو پھر مال ودولت کی محبت اور اولاد وگھر بار کے ساتھ تعلق اور لگاؤ اُس کو اللہ کی راہ میں چلنے پھرنے سے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتا۔ اس سے تو انکار نہیں ہے یہ محبتیں انسان کے اندر فطری طور پر رکھی گئی ہیں لیکن ''والذین اٰمنوا اشد حبًّا لِلّٰہ'' کے اعلان کے مطابق اللہ تعالیٰ کا سچا عاشق ان محبتوں پر حکمِ الٰہی کو غالب کرکے آگے بڑھتا ہے۔ اور بظاہر عقل وخرد کے تقاضوں اور چاہتوں کو ٹھکراتا ہوا اپنے مولا کے راستے میں دیوانہ وار اللہ تعالیٰ کی محبت پھیلاتا ہوا پھرتا ہے۔ جیسا کہ دیوانگی اور عقل وخرد کے عنوان سے کئی جگہ مضمون گزر چکا ہے کہ اہلِ ایمان کی نظر ظاہری مفادات پر نہیں ہوتی اور اُن کا نقصان کوئی نقصان نہیں سمجھا جاتا اور اہلِ خرد اپنی دنیا کے بننے اور بگڑنے کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اور اُسی اصول پر اپنے ہر فیصلے کی بنیاد رکھتے ہیں۔

اہل دل اللہ والوں کے بعض خاص احوال کا تذکرہ

جی چاہتا ہے ایسی جگہ میں رہوں جہاں
جیتا ہو کوئی درد بھرا دل لیے ہوئے

مانا کہ ہے طوفاں میں محبت کا سفینہ
لیکن ہے ساتھ لطف سواحل لیے ہوئے

غفلت کا ان کے دل پہ نہ کرنا کبھی گماں
ہنستے ہیں ایک درد بھرا دل لیے ہوئے

میں ڈھونڈتا ہوں تجھ کو محبت کہاں ہے تو
اک قلبِ شکستہ ترے قابل لیے ہوئے
اختر اسی کا فیض ہے عالم میں چار سُو
پھرتا ہے جو بھی درد بھرا دل لیے ہوئے

ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے قلب کو صرف ایسی جگہوں سے اور وہاں کے رہنے والوں سے مناسبت ہے کہ جہاں کچھ اللہ کا نام لینے والے اُس کی یاد میں اپنے مولا کو پکار رہے ہوں، کیونکہ فطرت کا اصول ہے کہ **اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ** کہ جنس جنس کی طرف مائل ہوا کرتی ہے۔ اس لیے حضرت والا ایسی جگہوں کو ڈھونڈتے اور تلاش کرتے پھرتے ہیں جہاں کوئی درد بھرا دل لیے ہوئے رہتا ہو کیونکہ خود حضرت کے سینے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا ہی درد بھرا دل عطا فرمایا ہے۔

پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا معاملہ اگرچہ ظاہری مشکلات اور پریشانیوں کا ہوا کرتا ہے اور ہر سمت مخالف ہواؤں کا طوفان ہے جس میں محبت کا سفینہ پھنسا ہوا ہے، مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اللہ کے عاشقوں کو اپنے مولا کے راستے میں جس طرح موافق حالت میں مزہ ملتا ہے اسی طرح ناموافق حالت میں بھی ان کے دل میں کیف وسرور کا عجیب عالم رہتا ہے۔ اور جس طرح وہ ساحل پر پہنچ کر خوش رہتے ہیں اسی طرح وہ اپنے مولا کے اوپر اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو قربان کرنے کی صورت میں اگرچہ منزلِ مقصود حاصل نہ ہو رہی ہو اور ساحل بظاہر نظر نہ آرہا ہو مگر اُن کو پھر بھی ساحل کا مزہ ملتا ہے۔ کیونکہ اللہ کے راستے میں چلنے والا مؤمن اور ہر قدم پر اللہ کو راضی کرنے والا وہ ہر آن اپنی منزل ہی پر ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو حق تعالیٰ ساحل ہی کا لطف عطا فرمادیتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ والوں کو اگر کبھی ہنستا ہوا دیکھو تو یہ یاد رکھنا کہ اُن کی ہنسی بھی عبادت ہے۔ اس لیے کہ وہ ہنسنا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ ہنسنے کی حالت میں آخرت سے غافل ہیں بلکہ مولا کی یاد تو ہر وقت اُن کے قلب میں رچی بسی ہوتی ہے۔ صرف ظاہر میں اپنے اردگرد رہنے والے انسانوں سے اُنس اور تعلق اور بے تکلفی کی خاطر وہ کبھی کبھی ہنسی خوشی والا معاملہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ خواجہ صاحب نے ایک مشہور موقع پر کئی بڑے علماء کی موجودگی میں یہ شعر پڑھا تھا ؎

ہنسی بھی ہے گو لبوں پہ ہر دم
اور آنکھ بھی میری نم نہیں ہے

مگر جو دل رو رہا ہے پیہم
کسی کو اُس کی خبر نہیں ہے

اُس کے بعد اشعار میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ اے محبت! میں تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ تو صرف اُسی دل میں آتی ہے جو ٹوٹا ہوا اور تیری خاطر شکستہ ہو تو میں نے تو اپنی ساری آرزوؤں کا خون کر کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں لہٰذا میں تیرے قابل دل لیے پھر رہا ہوں۔ اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ واقعتاً آثار و قرائن سے یہی پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کے قلب میں اپنی عظیم محبت کا خزانہ عطا فرما دیا ہے۔ اور جس کے دل میں یہ محبت اور درد بھرا دل نہ ہو تو پھر گو کہ وہ مقرر و واعظ بن جائے اور مصنف و مدرّس بن جائے لیکن صاحبِ فیض اولیاء اللہ کی جماعت میں اُس کا شمول نہیں ہوتا۔ چنانچہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہی پتا چلتا ہے کہ اطرافِ عالَم میں جن اکابر و مشائخ کا فیض ہے وہ وہی ہیں جو اپنے سینے میں اللہ کی محبت سے بھرا ہوا دل لیے ہوئے پھر رہے ہیں۔

نفس کے بندے

چین اک پل کو بھی دلوں میں نہیں
گردنوں میں عذاب کے پھندے
دفن کر کے جنازہ عزت کا
خوار پھرتے ہیں نفس کے بندے

آہ وفغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں

دونوں جہان کی خوشی تیری خوشی میں ہے نہاں
دونوں جہان کا الم تیرے غضب میں ہے عیاں

دیکھ جہاں بھی تو دھواں آگ بھی ہے وہاں نہاں
کہتا ہوں بار بار میں سنتا نہیں ہے بدگماں

آشیاں اہلِ دل کا ہے دیکھ نہ برق گر یہاں
تجھ سے وگرنہ انتقام لے گا ضرور آسماں

اے مرے خالقِ حیات تجھ پہ فدا ہو میری جاں
تیرے بیانِ حمد سے قاصر ہے یہ مرا بیاں

دیکھ کے اپنے ضعف کو اور قصورِ بندگی
آہ و فغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں

میری وفا ہے ناتمام دونوں جہاں میں اے خدا
آپ کے نام پر اگر کردوں فدا میں دو جہاں

دل میں خدائے پاک کی لذت قرب کیا کہوں
جیسے مری زمیں ہے اور، اور ہے میرا آسماں

یارب ہماری آہ کو فضل سے کردے بااثر
سارے جہاں میں نشر ہو اخترؔ کی آہِ بے زباں

مشکل الفاظ کے معانی: اَلَمْ: تکلیف۔ **عیاں**: ظاہر۔ **قاصر**: کوتاہ یعنی نہیں کرسکتا۔ **ضعف**: کمزوری۔ **قصورِ بندگی**: اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرپانا۔ **ناتمام**: نامکمل۔

اللہ کی خوشی میں دنوں جہاں کی خوشی ہے

دونوں جہان کی خوشی تیری خوشی میں ہے نہاں
دونوں جہان کا الم تیرے غضب میں ہے عیاں
دیکھ جہاں بھی تو دھواں آگ بھی ہے وہاں نہاں
کہتا ہوں بار بار میں سنتا نہیں ہے بدگماں
آشیاں اہلِ دل کا ہے دیکھ نہ برق گر یہاں
تجھ سے وگرنہ انتقام لے گا ضرور آسماں

قرآن وحدیث میں ایک یا دو جگہ نہیں بلکہ متعدد آیات وحدیث میں دنیا وآخرت کی چین وسکون اور راحت وآرام اسی طرح دونوں جہاں کی زحمت وعذاب اور تکلیف ومصیبت اللہ تعالیٰ کی رضا اور عدمِ رضا میں منحصر ہے۔ یعنی جو حق تعالیٰ کو راضی کردے اور اللہ تعالیٰ اُس سے خوش ہوں تو اُسے دنیا وآخرت میں خوشی حاصل ہوگی۔ اور جو اپنے اعمالِ بد میں مبتلا ہوکر اور معصیت ونافرمانی میں پڑکر اللہ کا نافرمان بنے گا اور اُس کی لعنت وغضب کو دعوت دے گا تو اُس کی جس طرح آخرت برباد ہوگی اسی طرح یہ دنیا بھی اُس کے لیے جہنم کدہ بن جائے گی۔ جیسا کہ آئے دن سامنے آنے والے واقعات اور خط وکتابت سے بھیجے جانے والے حالات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آہ وفغاں کے آشیاں پر برق نہ گراؤ ورنہ

اس کے بعد حضرت والا ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح دھوئیں کو دیکھ کر یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں آگ ہے میں بھی یہ بات کہتا ہوں کہ جہاں تم آہ آہ کی آوازیں سنو اور دردِ دل سے نکلنے والی آہ وفغاں کانوں میں پڑے تو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں کوئی اپنے سینے میں عشق ومحبتِ خداوندی کی آگ لیے ہوئے ہے۔ افسوس! اُس شخص پر کہ شب وروز کی آہ وفغاں سننے کے باوجود وہ بدگمانی کا شکار ہوتا ہے اور اُسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ وقفے وقفے سے نکلنے والی آہیں اندر گرمیِ محبت کا پتہ دے رہی ہے۔

اور ایسے بدگمانوں اور ناعاقبت اندیشوں سے یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے ظلم وستم اور حسد وکینہ اور بغض وعداوت کا نشانہ اہلِ دل کو نہ بناؤ اور اُن کا آشیاں تمہارے ظلم کا شکار نہ ہوجائے ورنہ پھر آسمان والا رب العرش خود اُن کا حامی ہوکر اُن کی طرف سے بدلہ لے لے گا۔ درحقیقت یہ شعر اُسی روایت کی ترجمانی ہے کہ جو پہلے کئی اشعار کے ضمن میں پیش کی جاچکی ہے کہ جو اللہ کے کسی ولی سے دُشمنی رکھے اور اُسے ستائے تو اللہ تعالیٰ اُس سے اعلانِ

جنگ کردیتے ہیں اور خود اُس کی طرف سے حامی ہو کر خود اس سے بدلہ لے لیتے ہیں۔ اس لیے اگر مناسبت نہ ہو، عقیدت نہ ہو، عظمت و محبت نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں، لیکن کم سے کم بغض و کینہ اور عداوت و دُشمنی تو نہیں رکھنی چاہیے، بلکہ حسنِ ظن کا معاملہ کر کے نیکی کمانی چاہیے۔

خالقِ حیات پر فدا ہو کر اعتراف قصور بڑا عالی وصف ہے

اے مرے خالقِ حیات تجھ پہ فدا ہو میری جاں
تیرے بیانِ حمد سے قاصر ہے یہ مرا بیاں
دیکھ کے اپنے ضعف کو اور قصورِ بندگی
آہ و فغاں کا آسرا لیتی ہے جانِ ناتواں
میری وفا ہے ناتمام دونوں جہاں ہیں اے خدا
آپ کے نام پر اگر کردوں فدا ہیں دو جہاں

اے میرے اللہ! آپ ہی نے مجھے زندگی بخشی ہے تو آپ ہی اس کے حق دار ہیں کہ جو خالقِ حیات ہو اُسی پہ یہ حیات فدا ہونی چاہیے اس لیے میں ہر دم اپنی جان آپ پر فدا کرنے کا جذبہ رکھتا ہوں اور گو کہ میں آپ کی کیسی ہی عظمت و بڑائی بیان کردوں اور میری زبان ہر وقت کتنا ہی آپ کی حمد و ثناء میں رطب اللسان رہے مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ کی عظمتوں کے شایانِ شان میری زبان سے کیے جانے والے بیان میں یہ طاقت ہی نہیں کہ وہ کماحقہٗ آپ کی حمد بیان کر سکے۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں آپ کی کماحقہٗ حمد بیان کرنے میں قاصر و کوتاہ ہوں۔

اور ایسا کیوں نہ ہو کہ میں بہت کمزور ہوں اور آپ بہت قوی ہیں اور میں آپ کا ایک ناکارہ بندہ ہوں جو ادائے بندگی میں بھی کمال کا مدعی نہیں بلکہ اس میں بھی اپنے قصور کا اقرار کرتا ہوں، اور جب اس قصورِ بندگی کو اور طاعت کی کمی کو سوچتا ہوں تو رہ رہ کے میرا دل بھر آتا ہے۔ اور پھر زبان سے آہیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں کیونکہ اُس ادائیگیٔ بندگی میں کمی کی وجہ سے اور ادائے حقوقِ محبت میں کوتاہی کی وجہ سے دل پر جو ایک غم آتا ہے میری جانِ ناتواں اُسے اندر سہنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ جس کی وجہ سے وقفے وقفے سے میری جانِ ناتواں کو آہ و فغاں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

واہ کیا کہوں! کہ حضرت والا نے اس شعر میں اللہ والوں کے قلب کی کس عجیب و غریب حالت کا کیسے بالطف انداز میں تذکرہ فرمایا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے ذرا واسطہ پڑا ہو اور اس راہ کے غم اُٹھائے ہوں تو وہ

بہت جلد اس کو سمجھ لے گا کیونکہ یہ وہ حقیقت ہے جو ہر اللہ کے عاشق پر ضرور گزرتی ہے کہ جب سب کچھ کرنے کے باوجود اور ہر لمحہ خدا پر فدا ہونے کے بعد بھی عاشقِ حقیقی کا دل نہیں بھرتا تو پھر وہ آہوں کا سہارا لے کر ایک نہایت عمیق اور گہرے انداز سے اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے کہ اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس وقت وہ آہ بھر رہا ہے تو بدن کا رواں رواں نہایت درجہ حلاوت ومٹھاس محسوس کر رہا ہے۔

اے میرے مالک اللہ میں اگر سب کچھ آپ پر قربان کر دوں اور دونوں جہان کی نعمتیں آپ کو پانے میں لٹادوں تب بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آپ سے وفاداری کا حق ادا کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی آپ سے وفاداری کا حق ادا نہیں ہو سکے گا کیونکہ جو کچھ بھی توفیق ملے گی وہ بھی آپ کے کرم کا صدقہ ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ بندہ یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے پورا پورا حق ادا کر دیا ہے اور مکمل وفاداری پیش کر دی ہے۔

بس اے سالکو! یاد رکھو! یہ قصور وعجز ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وفا کا انتہائی مقام ہے۔ اور اس کے حاصل ہونے پر حق تعالیٰ اُس بندے سے بے انتہا خوش ہوتے ہیں اور یہی ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے۔ اور آدمی کے آدم زاد ہونے کی فطری خصوصیت ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت میں یہی مضمون مذکور ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾

''اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (باوجود اللہ کی راہ میں دینے اور خرچ کرنے کے) ان کے دل اس سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ وہ رب کے پاس جانے والے ہیں (دیکھئے وہاں جا کر ان صدقات کا کیا ثمرہ ظاہر ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دینا حکم کے موافق نہ ہو، مثلاً مال حلال نہ ہو یا نیت اللہ کے لیے خالص نہ ہو اور نیت میں اخلاص کامل نہ ہو نا یا مال کا حرام ہونا ہمیں معلوم نہ ہو تو اُلٹا اس پر مواخذہ ہونے لگے تو جن لوگوں میں یہ صفات ہوں) (معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۳۱۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کام کر کے ڈرنے والے لوگ وہ ہیں جو شراب پیتے یا چوری کرتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے صدیق کی بیٹی! یہ بات نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقات دیتے ہیں، اس کے باوجود اس سے ڈرتے ہیں کہ شاید ہمارے یہ عمل اللہ کے نزدیک (ہماری کسی کوتاہی کے سبب قبول نہ ہو، ایسے ہی لوگ نیک کاموں میں مسارعت اور مسابقت کیا کرتے ہیں۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مظہری)

اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیک عمل کر کے اتنے ڈرتے تھے کہ تم بُرے عمل کر کے بھی اتنا نہیں ڈرتے۔ (معارف القرآن، جلد: ۶، صفحہ: ۳۱۷)

اہلِ دل کی زمین وآسمان جدا ہوتے ہیں

دل میں خدائے پاک کی لذتِ قرب کیا کہوں
جیسے مری زمیں ہے اور، اور ہے میرا آسماں
یارب ہماری آہ کو فضل سے کردے باثر
سارے جہاں میں نشر ہو اختر کی آہِ بے زباں

اس شعر میں حضرت والا اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت کے بیان کو ایک خاص انداز میں ذکر فرمارہے ہیں کہ گویا یہ ایسی کیفیت ہے کہ جس کا حقیقی بیان تو نہیں کیا جاسکتا ہے مگر مختصراً اتنا کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہونے کے بعد اور اُس کا قرب ملنے کے بعد متقی بندے کی زمین بھی اور ہوجاتی ہے اور اُس کا آسمان بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ اور گو کہ وہ اس دنیا کی زمین پر چل رہا ہو اور یہی دنیا کا آسمان سایہ فگن ہو مگر وہ حق تعالیٰ کی عظمتوں میں ایسا دل سے مٹا ہوا اور مستغرق ہوتا ہے کہ سب کچھ میں رہتے ہوئے سب کچھ سے بے خبر رہتا ہے۔ اُس کی نگاہ میں ہر وقت جلوۂ حق ہی بسا رہتا ہے، اُس کا غیر دل ودماغ میں گزر ہی نہیں پاتا۔

اخیر میں حضرت والا دعا فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! میں کوئی رسمی مقرر وواعظ نہیں ہوں، لیکن جس طرح تو نے مجھ پر فضل فرما کر میرے سینے میں اپنی محبت عطا فرمائی اور اُس کی برکت سے مجھے آہ وفغاں نصیب ہوئی ہے اے اللہ! تو ایسی صورت پیدا کردے کہ میری آہِ بے زبان سارے جہان میں نشر ہو اور اس آہ کی ایسی تاثیر کردے جو اسے سن لے تیرا دیوانہ بن جائے۔ یہاں تک کہ حضرت والا کے سارے اشعار بھی درحقیقت اُسی آہِ سحر کی ایک جھلک ہے ؎

جو بشر بھی سن لے میری آہ کو
بس تڑپ جائے وہ تیری چاہ کو

بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی اس دعا کو قبول فرمایا اور سارے عالَم میں آج حضرت والا کی آہِ بے زباں نشر ہوکر لوگوں کو آہ وفغاں کا حامل بنارہی ہے اور اللہ کی محبت اور عشق میں بسمل ہورہے ہیں۔

تدفینِ عشق

جس کے چہرے پہ میر مرتے تھے
سرد آہیں بھی میر بھرتے تھے
کس نے جغرافیہ بدل ڈالا
عشق کو اپنے دفن کرتے تھے

میری آہِ دل کے یہی ہیں منازل

پہاڑوں کا دامن سمندر کا ساحل — مری آہ دل کے یہی ہیں منازل
جنازہ ہوا قبر میں آج داخل — ہوئی خاک تن آج مٹی میں شامل
ترا فیض ہے صحبت شیخ کامل — ہوا سب کا دل دردِ نسبت کا حامل
نہیں کوئی رہبر ہے راہِ جنوں کا — مگر سایۂ رہبرِ شیخ کامل
مرے دوستوں ذکر کی برکتوں سے — سکینہ ہوا دل پہ ہم سب کہ نازل
عجب درد سے کس نے تفسیر کی ہے — کہ قرآن ہوا آج ہی جیسے نازل
خدا شیخ کو میرے رکھے سلامت — کہ ناقص ہوے ان کی صحبت سے کامل
یہ امید ہے تیرے لطف و کرم سے — کہ اخترؔ بھی ہو اہلِ جنت میں شامل

مشکل الفاظ کے معانی:۔ راہِ جنوں: اللہ تعالیٰ کی دیوانگی کا راستہ۔ سکینہ: سکون رخاص رحمت۔

آہِ عاشق کو لبِ دریا اور دامن کوہ کی تلاش ہے

پہاڑوں کا دامن سمندر کا ساحل
مری آہ دل کے یہی ہیں منازل

اس شعر میں حضرت والا اسی مضمون کی ترجمانی کر رہے ہیں کہ اللہ والوں کا دل شہر کے اعلیٰ درجے کے مکانات اور بنگلوں کے بجائے کہیں ایسی جگہ جا کر جہاں مکمل یکسوئی اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی غیر سامنے موجود ہی نہ ہو اور پھر وہاں اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو خوش کیا جائے، اب میرے دل کی یہی تمنا ہے اور آرزوئیں ہیں۔ گو کہ اللہ کی محبت حاصل ہونے سے پہلے انسان کے دل میں سینکڑوں تمناؤں کے طوفان بپا رہتے ہیں۔ لیکن جب حق تعالیٰ سے محبت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر صرف اللہ تعالیٰ کی یاد ہی دل کی ایک تمنا بن کے رہ جاتی ہے۔ بقول حضرت والا ؎

یہ پوچھتا ہے میرے دل میں اب تیرا جلوہ
کہاں ہے اور کدھر آرزو کا عالم ہے

خاکِ تن خاکِ ارض میں شامل

جنازہ ہوا قبر میں آج داخل
ہوئی خاکِ تن آج مٹی میں شامل
نہیں کوئی رہبر ہے راہِ جنوں کا
مگر سایۂ رہبر شیخِ کامل

عنقریب انسان کو اس صورتحال کا سامنا کرنا ہے کہ اُس کا جنازہ قبر میں داخل ہو رہا ہوگا اور یہ بدن کی خاک دوسری خاک میں مل کے اُسی طرح مٹی ہو جائے گی لیکن اگر خاکِ تن میں دردِ دل شامل کر لیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ قیمتی بن جاتی ہے۔ ورنہ محض ایک مٹی کا ڈھیر ہے۔ اس لیے اس شعر میں حضرت والا اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ یہ آہِ دل حاصل کرنے کی چیز ہے اور یہی کام آنے والی ہے۔ باقی جو کچھ ظاہری ساز و سامان اور تن پروری ہے یہ عنقریب مستقبل میں مٹی کا ڈھیر بنا ہوا ہوگا۔ جس کے حصول کا طریقہ جگہ جگہ حضرت والا نے اپنے کلام میں ذکر فرمایا ہے کہ بلاصحبتِ شیخِ کامل کے کسی انسان کو دردِ نسبت کا حامل دل نصیب نہیں ہوتا۔ اور جو بھی اللہ کے راستے کو طے کرتا ہے اُس کا رہبر صحبتِ شیخِ کامل کا سایہ ہی ہوا کرتا ہے۔ اس کے بغیر تکمیل حاصل نہیں ہوتی۔

جیسا کہ آپ اگر انجینئر بننا چاہتے ہیں اور آپ نے انجینئرنگ کالج میں پوری تعلیم حاصل کی ہے لیکن پھر کسی ماہر انجینئر کے تحت آپ کو پریکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ نے امریکا و برطانیہ وغیرہ بڑی یونیورسٹی میں جا کر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہو تب بھی آپ جب تک کسی ماہر ایکسپرٹ ڈاکٹر کے ماتحت پریکٹس نہیں کریں گے تو آپ مسلّم ڈاکٹر نہیں مانے جاتے اور نہ کوئی حکومت آپ کو مطب کھولنے کی اجازت دے گی۔ معلوم ہوا دنیا کا نظام بھی اس طرح سے جو کہ محض پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ کسی تجربہ کار کے ساتھ رہ کر آگے بڑھا جائے۔ اسی لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ والوں کے قریب رہنے کا باقاعدہ حکم دیا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

﴿إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ قَدْ أُعْطِيَ زُهْدًا فِي الدُّنْيَا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَإِنَّهُ يُلَقَّى الْحِكْمَةَ﴾

(سنن ابن ماجة، كتاب الزهد، باب الهم بالدنيا)

جب تم دیکھو کہ کسی کو زہد عطا ہوا ہے یعنی وہ دنیا دار نہیں ہے۔ دنیا کی محبت سے اس کا قلب خالی ہے اور قِلَّةَ مَنْطِقٍ بہت کم بولنے والا صرف اللہ کی باتیں بولتا ہے، اِدھر اُدھر کی باتوں سے اس کو دلچسپی نہیں ہے۔ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ تو اس سے قریب رہا کرو۔ ایک دن میں نے عرض کیا تھا کہ کسی کے ذہن میں آتا ہے کہ بھائی سب ہی علماء اور سب ہی اللہ

والوں کے پاس جایا کریں اور سب ہی کی باتیں سنا کریں، لیکن آپ خود دیکھئے اگر جسم کو کوئی بیماری لگی ہو، فرض کیجئے کہ کوئی ہارٹ کا پیشنٹ ہے، ہارٹ دل کی بیماری ہے اور کراچی میں پچاس ہارٹ اسپیشلسٹ ہوں۔ کیا آپ اپنے دل کی بیماری کا علاج کروانے کے لیے پچاسوں ہارٹ اسپیشلسٹ کے پاس جا کر اپنی چوائس وانتخاب (Choice) سے دوائی کو استعمال کریں گے؟ اگر مریض ایسا کرے گا تو وہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مار رہا ہے اور اپنے کو ہلاک کر رہا ہے۔ بے شک اگر وہ ان کے پاس گیا اور کچھ مفید باتیں سن لیں تو ٹھیک ہے لیکن ایک کو اپنے لیے مقرر کرنا ضروری ہے جس کی رائے اور مشورے پر اُس کو چلنا ہوگا جس کی میڈیسن اور دوائی مریض کو لینی ہوگی۔ اس سے بالکل ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ دوسروں کے پاس جانا حرام ہے یا ناجائز ہے یا اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے، لیکن یہ ایک نظام اور طریقہ ہے۔ پوری تاریخ گواہ ہے کہ اس کا بھی ایک نظام اور طریقہ ہے کہ کسی ایک اللہ والے سے جس سے مناسبت ہو، تعلق قائم کیا جائے اور پھر وہ جو کچھ بتائے، اس کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیا جائے۔ صرف آ کے پڑ جانا کافی نہیں، عمل ضروری ہے۔

دوستو! جب تک عمل نہ ہو تب تک کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا، لیکن اتنے فائدہ سے یہ بھی خالی نہیں ہے کہ صحبت عمل پر اُبھارتی ہے۔ اللہ والوں کی صحبت سے طاعات کی طرف طبیعت راغب ہوتی ہے اور معاصی و نافرمانیوں سے طبعاً نفرت ہونے لگتی ہے۔ اس لیے دل میں اس نوع کی باتیں آتی ہیں جو درحقیقت شیطانی وساوس ہوتے ہیں اور یہ نفس اور شیطان ہمیں آگے چلنے نہیں دینا چاہتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ راہ راہِ جنوں ہے اس راہِ جنوں اور محبتِ خداوندی میں اگر سفر کرنا اور چلنا ہو تو کسی ایک کو ساتھ لے لو اور پھر اس کے بعد چل کر دیکھو کیا مزہ آتا ہے۔ حضرت کا ایک دوسرا شعر ہے ؎

دردِ دل سیکھنا ہے اگر دوستو
ساتھ میرے رہو تب سکھائیں گے ہم

دوستو! ذرا ان سے جا کر پوچھو ان کو کیا ملا؟ کیا کھویا؟ اور کیا پایا؟ میں ہمیشہ طلبہ سے کہتا رہتا ہوں کہ فراغت کے بعد صرف کم از کم چالیس روز غیر اللہ کو چھوڑ کر کسی اللہ والے کی صحبت میں لگا کر دیکھو کہ کیا چین پاؤ گے اور تم جو یہ سمجھتے ہو کہ اگر تقویٰ کی لائن میں آئیں گے تو سارے مزے چھوٹ جائیں گے، ساری لذتیں چھوٹ جائیں گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ تم خود مجھے بتانا ''چالیس'' دن کے بعد جو تم نے چھوڑا وہ لذت والا راستہ تھا یا جو تم نے پایا وہ لذت والا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ میں نے مولانا رومی کا مضمون کہیں پڑھا ہے کہ یہ میرا جوتا لے کر میرے سر پر بجانا اگر لذت حاصل نہ ہو بلکہ اتنا ہی نہیں، یہ کہے گا وہ کہنے والا کہ ہائے افسوس! جن کو میں نے لذت سمجھا تھا وہ تو تلخیاں اور کڑواہٹ کے گھونٹ تھے، لیکن وہ لذت کیوں محسوس ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

جب بدن میں زہر پھیل جاتا ہے تو نیم کی کڑوی پتی کڑوی نہیں لگتی ہے اور جب ملیریا بخار ہوتا ہے تو بریانی و کباب کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا ہے اور حضرت مثال دیتے ہیں کہ گندگی کا جو کیڑا ہوتا ہے اُسے خوشبو سونگھاؤ تو اُسے احساس نہیں کیونکہ اس کو گندگی کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے اور وہ اس کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ وہی اس کی کائنات عطریات بن جاتی ہے۔

مجالس ذکر اللہ کے چند فوائد

مرے دوستو ذکر کی برکتوں سے
سکینہ ہوا دل پہ ہم سب کے نازل

میرے دوستو! جن مجالس میں اللہ تعالیٰ اور ایمان کی باتیں ہوں اور اللہ کی طرف بلانے کی باتیں قرآنی آیات اور نبوی ارشادات کی صورت میں بیان کی جارہی ہوں تو ان کے متعلق حدیث شریف کا مضمون ہے کہ اس کے اوپر خاص سکینہ نازل ہوتا ہے اور اس میں بیٹھنے والوں کو، خاص اطمینان ملتا ہے اور حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ اور ملائکہ ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مجلس ہم یقین رکھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے روشنی میں کہ ملائکہ ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور ذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ آسمانوں پر فرشتوں میں اللہ ان مجالس کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کس طرح سے لگے ہوئے ہیں اور ایک روایت میں تو یہاں تک آیا۔ فرشتے پوچھتے ہیں کہ اے اللہ! آپ کا فلاں بندہ وہ تو گزر رہا تھا اور سوچا کہ چلو یہاں گزرتے ہوئے کچھ دیر بیٹھ لوں، اصل میں تو مجھے کچھ اور کام تھا لیکن چلو وہ سب بیٹھے ہیں، میں بھی بیٹھ جاتا ہوں۔

حدیث شریف کا مضمون ہے کہ یہ ایسی مجلسیں ہوتی ہیں اور اللہ والوں کے پاس بیٹھنا ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی محروم نہیں کرتے۔ هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا جو ہم نشین ہوتا ہے وہ بھی محروم نہیں رہتا۔ اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بھی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایسے ہی آیا تھا لیکن جب بیٹھ گیا ہے تو جب ان کی مغفرت ہوتی ہے تو ساتھ میں اس کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے اور جو باقاعدہ اس نیت سے آتا ہے کہ میں اللہ کے دین کی باتیں سنوں گا اور ملتا ہے، ملاقات کرتا ہے، بیٹھتا ہے، سنتا ہے تو اس کے لیے تو بہت زبردست ثواب اور فضیلت کی بات ہے۔ ہمارے ہاں بیٹھنا اور اسی طرح دوسری جماعتوں کا آپس میں ایک دوسرے سے ملنا یہ سب اس میں داخل ہے تو اس کی فضیلت تو بہت ہی اونچی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں جب ذکر ہوتا ہے تو ذکر کی برکتوں سے عجیب سکینہ نازل ہوتا ہے۔

صفائی قلب کے بعد قرآن کا مزہ ہی الگ ہے

میرے دوستو! جب اہلِ دل اولیاء اللہ کسی مضمون کو بیان کرتے ہیں اور اپنا دردِ محبت پیش کرتے ہیں اور جب قرآن کی کسی آیت کی شرح کرتے ہیں وہ ایسے دردِ دل سے کرتے ہیں کہ سننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

جیسے ہم نے کبھی یہ مضمون قرآن میں سنا اور پڑھا ہی نہیں تھا اور حضرت جو مضمون بیان کرتے ہیں میں آپ کو اس کا ریفرنس اور حوالہ دے کر بتاتا ہوں کہ علامہ سید سلیمان ندوی جو کہ اپنے وقت کے اتنے بڑے عالم گزرے ہیں کہ جو عرب وعجم کے علماء ومشائخ ہیں، ان سب میں وہ برابر درجہ کی مقبولیت کے حامل تھے اور عرب بھی ان کے علم کا لوہا مانتے تھے اور ان کے صاحبزادہ پروفیسر سلمان صاحب جو اس وقت ڈربن جنوبی افریقہ میں مقیم ہیں ہمارے حضرت والا کے مجاز خلیفہ ہیں، اتنے بڑے عالم وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب ان کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تو کیا عالم ہوا۔ جا کر کہتے ہیں غور سے پڑھنے کی چیز ہے، بار بار پڑھی جاچکی ہے لیکن تذکیر مؤمن کے لیے نافع ہے اس لیے دوبارہ ذکر کرتا ہوں۔ فرمایا کہ حضرت مجھے کچھ نصیحت فرمادیں۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ میں ایک طالبعلم اور آپ کو نصیحت؟ پھر سے یہی فرمایا کہ حضرت نہیں کچھ نصیحت ضرور فرمادیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے دوبارہ سے یہی بات فرمائی کہ میں ایک طالبعلم اور آپ کو نصیحت؟ تیسری یا چوتھی مرتبہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت فرمائی، تو اس وقت میرے شیخِ اوّل حضرت مسیح الامت جلال آبادی رحمہ اللہ اس مجلس میں موجود تھے۔

اور میں نے خود حضرت مسیح الامت جلال آبادی کی زبان سے مجلس میں سنا تو بیچ میں صرف ایک واسطہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت کی اور یہ ارشاد فرمایا کہ ''ہم نے تو اپنے حضرت حاجی صاحب سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ ہے اپنے کو مٹانا۔''

جتنا اپنے کو مٹا سکے، خلق میں شہرت اور جاہ اور نام اور بلندی اور ہر طرف آ ؤ بھگت یہ سارا غیر اللہ ہے سب غیر ہے۔ سارا دل سے نکل جائے اور اپنے کو بالکل مٹادے اور مثل مٹی کے متواضع ہوجائیں تو پھر ہم ایسے زرخیز ہوں گے جیسا کہ مٹی زرخیر ہے کہ اس کے اندر سے قیامت تک کی نسلوں کے لیے رزق نکلتا ہی رہے گا اور جو لباس ہم نے پہنا ہے وہ بھی مٹی کی دین ہے، جو گھر کھڑا ہے، یہ گاڑی، یہ کھانے پینے کی چیزیں، یہ کُرتے، یہ لباس، یہ کتابیں ساری مٹی کی دین ہے۔ اگر یہ مضمون جاننا اور سیکھنا ہو تو القراۃ الراشدۃ میں بعنوان "أنا ترابٌ" دیکھیں جو کہ حضرت مولانا علی میاں ندوی کی مدرسہ میں پڑھائی جانے والی کتاب ہے۔ اس میں پورا مضمون ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب علامہ نے یہ سنا تو سنتے ہی آنکھوں سے آنسو کے دریا بہنے لگے۔ اتنے بڑے علامۂ وقت نے فرمایا مٹانا اور اس کے بعد جو چند اشعار پڑھے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ

آج وہ آیا مزہ قرآن میں
جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا

عالم و معلم ہو کر بھی عالم و معلم نہ ہوئے

دین کی خدمتیں عمر بھر بھی اگر کسی نے کی ہوں اور اپنے کو یہ سمجھتا ہو یا دوسروں کے سامنے ظاہر کرتا ہو یا عنوان بعنوان لوگوں میں پھیلاتا ہو، میں نے اتنا یہ کام کیا، میں نے اتنا یہ کام کیا، میں یہ کر رہا ہوں، میں وہ کر رہا ہوں، مگر اللہ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اللہ والوں سے ملے بغیر اخلاصِ کامل کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ آدمی سمجھتا ہے میں دین کا کام کر رہا ہوں، مگر وہ دین نہیں ہوتا ہے کیونکہ صحیح حدیث شریف میں ہے کہ ریاکار جو شہید ہوگا تو شہادت بظاہر کتنا بڑا عمل ہے اور سخی کی سخاوت بظاہر کتنا بڑا عمل ہے اور قاری اور عالم تینوں کو سب سے پہلے جہنم میں منہ کے بل گھسیٹ کر ڈالا جائے گا، کیا ان کا عمل نہیں۔ کیا عمر بھر انہوں نے مال خرچ نہیں کیا۔

تو دوستو! معلوم یہ ہوا کہ عمل کو مقبول بنانے کے لیے اخلاص کی ضرورت ہے اور اخلاص اللہ والوں سے سیکھنے کی چیز ہے، انہی اللہ والوں کے پاس بیٹھ کر اخلاص سمجھ میں آتا ہے۔ ورنہ تو انسان سمجھتا رہتا ہے کہ میں بہت دین کا کام کر رہا ہوں اور فخر یہ بیان بھی کرتا رہتا ہے کہ میں یہ کر رہا ہوں، میں وہ کر رہا ہوں، میں نے یہ کیا، وہ کیا اور شیطان اُسی میں اس کو مار ڈالتا ہے، کیونکہ وہ دکھا رہا ہے، شہرت چاہ رہا ہے، نام چاہ رہا ہے، بس گیا اس کا یہ عمل۔ اسی لیے حضرت شاہ ہردوئی رحمہ اللہ فرماتے تھے وجودِ عمل مطلوب نہیں، قبولِ عمل مطلوب ہے اور قبولِ عمل کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ عمل شریعت کے مطابق ہو اور دوسری شرط یہ کہ وہ عمل اخلاص کے ساتھ ہو۔ اگر شریعت کے مطابق نہ ہو تو بھی قبول نہیں اور اگر اخلاص نہ ہو تو وجودِ عمل تو ہوا لیکن قبول عمل نہیں ہوا۔

یہی مضمون حضرت والا بیان فرماتے ہیں۔

عجب درد سے کس نے تفسیر کی ہے
کہ قرآن ہوا آج ہی جیسے نازل

مولانا منصور الحق ناصر صاحب کا اسی کے اوپر ایک شعر ہے کہ۔

میرے پیارے مرشد سے ملنے سے پہلے
کیا کرتے تھے جو شقاوت کی باتیں
میرے پیارے مرشد سے ملنے کے بعد اب
کیا کرتے ہیں وہ سعادت کی باتیں

یہ جو امرد لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلقات ہیں اور آج کا جوان ان میں پڑ کر اپنی زندگی ویران کر رہا ہے، کبھی فون پر بات کر رہا ہے تو رات کو نیند نہیں آ رہی ہے۔ کبھی انٹرنیٹ سے سلسلہ جاری ہے، بس یہ ہے وہ شقاوت کی زندگی اور یہ ہے وہ شقاوت کی باتیں اور اس میں انسان اپنا ایمان اپنی صحت، اپنے قلب اور دل کا ستیاناس کر لیتا ہے جوان

راہوں میں پھنسے اور پھر اللہ نے حضرت شیخ کی برکت سے اور دوسرے مشائخ کی برکت سے ان کو اس راہ سے نکالا۔

خدا شیخ کو میرے رکھے سلامت
کہ ناقص ہوئے اُن کی صحبت سے کامل

یہ امید ہے تیرے لطف و کرم سے
کہ اختؔر بھی ہو اہل جنت میں شامل

اور حضرت والا دامت برکاتہم کا مقطع ہے۔ اس میں ہم سب کے لیے سبق ہے کہ اصلاح کرانے کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے کو اللہ والا اور بڑا مقام والا اور مرتبے والا سمجھیں۔ میرے دوستو! اصلاح کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے اوپر اپنی حقیقت کھل جائے کہ یا اللہ! میں کچھ نہیں ہوں، میرے اعمال کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر میری بخشش ہوگی تو صرف تیرے فضل سے ہوگی۔ اکثر حضرت والا ہر کلام کے اخیر میں یہ مضمون رکھتے ہیں اور منشاء یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! جو کچھ بھی ہوا یا آگے بخشش کی اُمیدیں قائم ہیں، وہ صرف تیرے فضل سے وابستہ ہیں، اپنے عمل پر کوئی نظر نہیں۔ یہ اُمید ہے کہ تیرے لطف کرم سے اختر ہو اہل جنت میں شامل۔

ایک نہایت مجرب اور آزمودہ عمل

از مرتب وشارح ''عرفان محبت''، حضرت مولانا مفتی محمد امجد صاحب فاضل دیوبند، استاذ حدیث دارالعلوم آزادول، جنوبی افریقہ

مختلف علاقوں میں دین کی نسبت سے سفر کرنے کے بعد اپنے مسلمان بھائیوں کی جو حالتیں اور پریشانیاں سامنے آئیں اُن کو دیکھتے ہوئے احقر کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اپنی زندگی کا ایک انتہائی مفید اور مجرب عمل لکھ دیا جائے تاکہ لوگ غیر شرعی عملیات سے محفوظ رہیں اور قرآن وحدیث کے دائرے میں رہ کر اپنی ہر مشکل اور پریشانی کا حل تلاش کریں کیونکہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے شفا قرار دیا ہے۔ لوگوں کی طرف سے شدید تقاضے اور اصرار کی وجہ سے نفع عام کی خاطر اس کو اس کتاب کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں شائع کیا جارہا ہے۔

نوٹ: جس طرح انسان کو بیماری کی وجہ سے پریشانی اور طبعی اُلجھن پیش آتی ہے اسی طرح قرآن و سنت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بسا اوقات سحر یعنی جادو اور شیطانی اثرات یا نظرِ بد کی وجہ سے بھی بچوں اور بڑوں کی طبیعت میں نہایت شدید قسم کا تغیر آجاتا ہے۔ اکثر لوگ اس کو بیماری سمجھ کر ڈاکٹروں سے علاج ومعالجہ میں مشغول رہتے ہیں مگر کوئی خاص معتد بہ نفع نہیں ہوتا کیونکہ اُس طبعی تغیر اور تبدیلی کی بنیادی وجہ بیماری نہیں ہوتی بلکہ دوسری وجوہِ ثلاثہ میں سے کوئی وجہ ہوتی ہے، مگر اس کی طرف عام طور پر ذہن نہیں جاتا۔ اس لیے سالہا سال تک پریشانی کا شکار رہ کر بالآخر ذہنی ٹینشن اور ڈپریشن میں ابتلاء کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر پریشان ہو کر یہ دیکھا گیا کہ بہت سے غیر شرعی عملیات میں مبتلاء ہوجاتے ہیں اور بعض نامناسب جملے بھی زبان پر آجاتے ہیں۔

اس حالت کی بعض علامات

(۱) ذہنی کسی سوچ اور فکر میں بغیر کسی خاص وجہ کے ہر وقت مشغول رہنا، یہاں تک کہ دماغی طور پر حد درجہ تھکاوٹ اور گراوٹ پیدا ہوجائے۔

(۲) سینے پر ایک قسم کا بھاری پن اور خاص بھوک محسوس نہ ہونا بلکہ بظاہر پیٹ کے اندر گیس کی کیفیت رہنا۔

(۳) دل میں بلا کسی وجہ کے ہر وقت گھبراہٹ کا رہنا۔

(۴) کسی ناگوار واقعہ پیش آنے مثلاً کسی کی موت یا ہارٹ اٹیک وغیرہ کی خبر سن لینے سے طبیعت کا انتہائی بے چین ہوجانا اور ایسا لگنا کہ جیسے یہ چیزیں مجھ ہی کو پیش آنے والی ہیں۔ کسی بیمار کی عیادت یا جنازے میں شرکت یا کسی نومولود بچے کے گھر پر آمد ورفت وغیرہ سے طبیعت میں ایک طرح کی بے چینی اور پریشانی پیدا ہونے لگے۔

(۵) سوتے وقت میں دیر تک نیند نہ آنا اور اُس وقت خاص طور پر دل ودماغ پر کسی سوچ وفکر کا مسلط ہوجانا۔

(۶) سر میں عام طور پر درد اور بے چینی کی کیفیت رہنا۔

(۷) ڈراؤنے خواب نظر آنا، بالخصوص اوپر سے نیچے گرنا یا نجاستوں اور مردوں کا نظر آنا، یا کفن دفن کے معاملات خواب میں زیادہ دیکھنا۔

(۸) طبیعت میں ایسی اُداسی رہنا کہ کسی کام میں دل نہ لگتا ہو، جو بھی کام شروع میں شوق و ذوق سے شروع کیا جاتا ہو اُس کی طرف سے جلد ہی طبیعت میں نفرت پیدا ہو کر اُس کو چھوڑ دینا۔

(۹) اندھیرے میں رہنے یا لیٹنے یا سونے سے طبیعت میں وحشت اور گھبراہٹ پیدا ہونا۔

(۱۰) ہنسی خوشی کی مجلسوں اور محفلوں میں طبیعت میں انبساط اور سرور اور نشاط کا پایا جانا اور یکسوئی اور خلوت سے گھبراہٹ اور بے چینی کا محسوس کرنا۔

اگرچہ ان میں سے بعض علامات بیمار کے اندر بھی ہوتی ہیں مگر مجموعی طور پر یہ علامتیں ان تینوں چیزوں میں سے کسی ایک کے شکار کو بھی رہتی ہیں۔ اس لیے اپنے علاج معالجے سے بھی غفلت نہ برتی جائے اور صحیح ڈاکٹر کی تجویز اور تشخیص پر اعتماد کر کے اس کو جاری رکھا جائے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ اس عمل کو بھی کم سے کم چالیس دن تک پابندی کے ساتھ معمول بنالیا جائے جس میں الحمدللہ بیماری اور نظرِ بد اور سحر و جادو تمام چیزوں کا علاج موجود ہے۔ اور احقر بڑے وثوق اور اعتماد اور اپنے اوپر گذرے ہوئے سخت حالات میں کیے ہوئے تجربے کی بنیاد پر عرض کرتا ہے کہ ان قرآنی آیات کو جس قدر اعتماد اور بھروسے کے ساتھ پڑھا جائے گا، ان شاء اللہ اُتنا ہی نفع ہوگا۔

عمل یہ ہے:

۷ مرتبہ درود شریف ۷ مرتبہ سورہ فاتحہ ۷ مرتبہ آیت الکرسی

۷ مرتبہ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَاجِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ط اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ○ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ○ (سورۂ یونس، پارہ ۱۱)

۷ مرتبہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ○ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ط اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ○ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ○ (سورۃ المؤمنون، پارہ ۱۸)

۷ مرتبہ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ○ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ○ (سورہ القلم، پارہ: ۲۹)

۷ مرتبہ سورۃ الفلق ۷ مرتبہ سورۃ الناس ۷ مرتبہ درود شریف

طریقہ: صبح بعد نمازِ فجر اور شام بعد نمازِ مغرب اور اگر نیند نہ آنے کا معاملہ ہو تو پھر بجائے مغرب کے

رات کو سوتے وقت میں ان آیتوں کو مذکورہ ترتیب سے پڑھیں اور اپنے اوپر دم کریں اور ایک گلاس پانی پر دم کر کے پی لیں اور اُس کے کچھ چھینٹیں اپنے چہرے پر ڈال لیں اور سوتے وقت میں ہاتھوں پر دم کر کے اپنی چارپائی یا بیڈ وغیرہ کا حصار کرلیں اور پھر سو جائیں۔ اور بچوں پر بھی دم کرنا ہو تو زیادہ پانی لے کر اُس میں سے خود پئیں اور اُن کو بھی پلا دیں۔

نوٹ: اور اگر اس دعا کا بھی اضافہ کرلیں تو بہتر ہوگا اور اس کو صبح وشام تین مرتبہ مذکورہ عمل کے ساتھ پڑھا کریں۔ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے جو موطا مالک میں مذکور ہے کہ اگر یہ کلمات مجھے یاد نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔

أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِیْ لَيْسَ شَیْءٌ أَعظَمَ مِنْهُ وَ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَايُجَاوِزُهُن بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَ بِاَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَ مَالَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ. (موطاامام مالک، معارف القرآن: جلد اول، صفحہ: ۲۷۶)

مسئلہ: کسی متبع سنت وشریعت عامل سے اپنی حالت بتانے کے بعد آیاتِ قرآنیہ اور ادعیہ نبویہ کے ذریعے علاج کرانا ممنوع اور حرام نہیں ہے مگر چونکہ آج کل ایسے عاملوں کا تقریباً فقدان ہے اور وہ نہ پائے جانے کے برابر ہیں اس لیے یہ ایک مختصر سا عمل لکھ دیا گیا ہے۔